زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

○

طنز و مزاح نمبر

۷۱ ، ۷۲

جنوری ، فروری سنہ ۱۹۵۹ء

○

مرتب

محمد طفیل

فی پرچہ
۲۰۰ روپے

○

ادارہ فروغِ اردو ، لاہور

200780
13.12.2007

ترتیب

خصوصی نمبر
طنز و مزاح

طلوع	محمد طفیل، ۷

مقالے

۱ —	ہنسنے کی ابتدا اور اس کی اہمیت	ڈاکٹر سید اعجاز حسین،	۱۱
۲ —	طنز و مزاح	ڈاکٹر خورشید الاسلام،	۱۷
۳ —	مزاح اور مزاح نگاری	ڈاکٹر وزیر آغا،	۲۵
۴ —	اردو ادب میں طنز و ظرافت	پروفیسر کلیم الدین احمد،	۴۹
۵ —	اردو شاعری میں طنز	ڈاکٹر شوکت سبزواری،	۸۵
۶ —	ہجو گوئی کی تاریخ	قاضی ظہور الحسن،	۹۶
۷ —	پیروڈی اردو ادب میں	ظفر احمد صدیقی،	۱۱۳
۸ —	فارسی ادب میں طنز و مزاح	پروفیسر علیم الدین سالک،	۱۲۲

9 7 8 0 2004

دنیا کی بڑی زبانوں کا طنزیہ و مزاحیہ ادب

۱ —	بروڈنگ کا سفر	(انگریزی)	۱۴۹
۲ —	کینڈائڈ	(فرانسیسی)	۱۶۰
۳ —	تعریفات	(فارسی)	۱۷۳
۴ —	کتا اور ریل	(روسی)	۱۷۷
۵ —	آزادی تقریر	(چینی)	۱۸۴
۶ —	ملاجی اور ان کا خلیفہ	(عربی)	۱۸۷
۷ —	سنہرا گدھا	(اطالوی)	۱۹۳
۸ —	ڈان کوئکزوٹ	(ہسپانوی)	۱۹۷
۹ —	حکایات ملا نصیر الدین ہدلی	(ترکی)	۲۰۴
۱۰ —	ایک رات	(بنگالی)	۲۰۸
۱۱ —	ہم لکھنؤ گئے	(ہندی)	۲۲۰

طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ابتدائی نمونے

۱ —	رفیق ہند	۲۲۵
۲ —	پنجاب پنچ	۲۳۴
۳ —	دہلی پنچ	۲۳۶
۴ —	مکی مخبر	۲۴۰
۵ —	ملا دو پیازہ	۲۴۳
۶ —	لاہور پنچ	۲۴۵
۷ —	جالندھر پنچ	۲۴۷
۸ —	بنارس پنچ	۲۴۸
۹ —	آگرہ پنچ	۲۴۹
۱۰ —	دکن پنچ	۲۵۱

اودھ پنچ کا دور

۱ - کچھ اودھ پنچ کے بارے میں — چکبست ۲۵۳
۲ - اودھ پنچ — اکبر الہ آبادی ۲۶۰

۳ - اودھ پنچ کا ایک شمارہ ۲۶۵
۴ - اودھ پنچ کے شاعر ۲۸۱
۵ - اودھ پنچ کے لطیفے ۲۸۷
۶ - اودھ پنچ کے کارٹون ۲۹۲

۷ - اندر سے نچے والی چپل چلماٹر — منشی سجاد حسین، ۲۹۷
۸ - کھلے و سربستہ مضامین — منشی سجاد حسین، ۲۹۹
۹ - نشہ کی ترنگ — تربھون ناتھ ہجر، ۳۲۰
۱۰ - دو دو چونچیں — تربھون ناتھ ہجر ۳۲۲
۱۱ - ہو گیا زندگی سے جی بیزار — مچھو بیگ ستم ظریف، ۳۲۵
۱۲ - البرٹ بل — جوالا پرشاد برق، ۳۲۹
۱۳ - مثنوی بہار — جوالا پرشاد برق، ۳۳۱
۱۴ - کیا یہی ہے لن ترانی آپ کی — رتن ناتھ سرشار، ۳۳۹
۱۵ - جنگی پتنگ کا میدان — رتن ناتھ سرشار، ۳۴۰
۱۶ - کوئی کہتا ہے دیوانہ کوئی کہتا ہے سودائی — اکبر الہ آبادی، ۳۴۲
۱۷ - سسرال کی گالی — اکبر الہ آبادی، ۳۴۵
۱۸ - خارستان کا ڈنر — نواب سید محمد آزاد، ۳۴۷
۱۹ - ہندوستانی بی بی — نواب سید محمد آزاد، ۳۵۰
۲۰ - عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہیے — احمد علی شوق، ۳۵۳
۲۱ - نمائش گاہ — احمد علی شوق، ۳۵۶
۲۲ - تہذیب قیس — عبد الغفور شہباز، ۳۵۹
۲۳ - تاوان حسرت — عبد الغفور شہباز، ۳۶۰
۲۴ - مغلق آپا بیگم — حکیم ممتاز حسین عثمانی، ۳۶۵

فتنہ اور عطر فتنہ کا دور

۱ - فتنہ و عطر فتنہ — عقیل احمد جعفری، ۳۶۹
۲ - ریاض الاخبار — ریاض خیرآبادی، ۳۷۰
۳ - بلبل کی سرگزشت — ریاض خیرآبادی، ۳۷۵
۴ - چٹکیاں اور گدگدیاں — ریاض خیرآبادی، ۳۷۸
۵ - فتنہ اور عطر فتنہ کے مضمون نگار — رمضانی، حکیم برہم، نثار، ۳۸۲
۶ - بے نام مضمون نگار — افیونی میکش ازال مورہ، ۳۸۵

شیرازہ کا دور

۱ - جدید جغرافیہ پنجاب — سندباد جہازی، ۳۹۰
۲ - میں ایک معتبر نائی ہوں — عبدالمجید سالک، ۴۰۰
۳ - سالک صاحب سے پہلی ملاقات — باری، ۴۰۳

۴ ۔ عاشق جالندھری محمود نظامی، ۴۰۶
۵ ۔ اگر شیطان مر جائے عطاء اللہ سجاد، ۴۱۲
۶ ۔ درباری شاعر محمد فاضل، ۴۱۵
۷ ۔ استاد بجّے خاں گلوکار خاں کا حال خضر تمیمی، ۴۱۷
۸ ۔ جہاں رمضان رہتا تھا سندباد جہازی، ۴۲۲
۹ ۔ ماڈرن غزل حاجی لق لق، ۴۲۴
۱۰ ۔ ماڈرن غزل ضمیر جعفری، ۴۲۵
۱۱ ۔ چل راوی کے پار عاشق محمد غوری ۴۲۶

طنزیہ و مزاحیہ ادب کا دور

۱ ۔ خطوط غالب غالب، ۴۲۷
۲ ۔ بحث و تکرار سر سید احمد خاں، ۴۳۲
۳ ۔ ابن الوقت ڈپٹی نذیر احمد، ۴۳۸
۴ ۔ سائنس کمیشن محمد علی جوہر، ۴۴۳
۵ ۔ معاصرانہ چشمک مہدی افادی، ۴۴۷
۶ ۔ شیخ سمار اللہ کی صاحبزادیاں محفوظ علی بدایونی، ۴۵۸
۷ ۔ حدیث الغاشیہ ابو الکلام، ۴۶۲
۸ ۔ آسان اردو مولوی عبد الحق، ۴۶۷
۹ ۔ الفاظ کا جادو مولانا عبد الماجد دریا بادی، ۴۷۰
۱۰ ۔ خدا حافظ قاضی عبد الغفار، ۴۷۴
۱۱ ۔ چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ نیاز فتحپوری، ۴۷۸
۱۲ ۔ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ سجاد حیدر یلدرم، ۴۸۶
۱۳ ۔ کم اِن مائی ڈیئر ۱۹۱۶ء خواجہ حسن نظامی، ۴۹۳
۱۴ ۔ گھریلو مشاعرہ تاجور نجیب آبادی، ۴۹۶
۱۵ ۔ قرض و مقروض سلطان حیدر جوش، ۵۰۰
۱۶ ۔ اجتہاد و تحقیق سجاد انصاری، ۵۰۲
۱۷ ۔ معترضہ جملے فلک پیما، ۵۰۷
۱۸ ۔ کاہلی علی عباس حسینی، ۵۱۱
۱۹ ۔ ہم نہیں جیتے تمکین کاظمی ۵۱۶

طنزیہ و مزاحیہ ادب کا زرّیں دور

۱ ۔ میں ایک میاں ہوں پطرس، ۵۲۱
۲ ۔ پھول والوں کی سیر فرحت اللہ بیگ، ۵۲۷
۳ ۔ ارہر کا کھیت رشید احمد صدیقی، ۵۵۰
۴ ۔ الشّذہ سی عظیم بیگ چغتائی، ۵۵۵
۵ ۔ سودیشی ریل شوکت تھانوی، ۵۶۰
۶ ۔ لندن کا پنجابی دربار ملا رموزی، ۵۶۷
۷ ۔ غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں کنہیا لال کپور، ۵۷۰
۸ ۔ غسلیات کرشن چندر ۵۸۱
۹ ۔ تزک نادری شفیق الرحمٰن، ۵۸۵

۱۰ - سویرے جو کل آنکھ میری کھلی — سعادت حسن منٹو، ۶۰۹
۱۱ - ہم ایک موڑ خریدیں گے — احمد ندیم قاسمی، ۶۱۴
۱۲ - دماغ چاٹنے والے — ابراہیم جلیس، ۶۱۷
۳ - قصہ پہلے درویش کا — اے حمید، ۶۲۳
۱۴ - جشن جمہوریت کی ایک دوپہر — فرقت کاکوروی، ۶۲۹
۱۵ - ماتم عیبل — احمد جمال پاشا، ۶۲۷

اُردو کے طنزیہ ومزاحیہ شاعر

اُردو کے طنزیہ ومزاحیہ شاعر — محمد عبداللہ قریشی، ۶۴۲
۱ - جعفر زٹلی ۶۴۴
۲ - سودا ۶۵۳
۳ - میر ۶۵۸
۴ - انشا ۶۶۵
۵ - مصحفی ۶۷۵
۶ - رنگین ۶۸۱
۷ - معروف ۶۸۷
۸ - بعث ۶۸۹
۹ - میر ضاحک ۶۹۰
۱۰ - میر حسن دہلوی ۶۹۲
۱۱ - کمترین ۶۹۳
۱۲ - صدصد الشعرا ۶۹۴
۱۳ - شاکر ناجی ۶۹۶
۱۴ - نظیر اکبرآبادی ۶۹۹
۱۵ - نازنین ۷۱۵
۱۶ - بیگم ۷۱۶
۱۷ - عصمت ۷۱۷
۱۸ - محسن وعنقا ۷۱۷

۱۹ - اکبر الہ آبادی ۷۲۲
۲۰ - شبلی ۷۴۱
۲۱ - حالی ۷۴۹
۲۲ - ریاض خیرآبادی ۷۵۸
۲۳ - اقبال ۷۶۷
۲۴ - ظفر علی خاں ۷۷۸
۲۵ - فوق ۷۸۴
۲۶ - جوش ملسیانی ۷۹۱
۲۷ - ظریف لکھنوی ۷۹۶
۲۸ - احمق پھپھوندی ۸۰۳
۲۹ - جوش ملیح آبادی ۸۰۷
۳۰ - شاد عارفی ۸۱۰

۳۱ چراغ حسن حسرت ۸۱۴
۳۲ مجید لاہوری ۸۱۶
۳۳ حسینی پیر کاظمی ۸۲۰
۳۴ خضر تمیمی ۸۲۶
۳۵ عاشق محمد غوری ۸۳۳
۳۶ اکبر لاہوری ۸۳۷
۳۷ نازش رضوی ۸۴۱
۳۸ پنڈت ہری چند اختر ۸۴۳
۳۹ سید محمد جعفری ۸۴۵
۴۰ ظریف جبلپوری ۸۴۹
۴۱ ضمیر جعفری ۸۵۲
۴۲ فرقت کاکوروی ۸۵۳
۴۳ راجہ مہدی علی خاں ۸۵۴

مزاحیہ کردار

۱ خوجی رتن ناتھ سرشار، ۸۵۷
۲ حاجی بغلول منشی سجاد حسین، ۸۶۱
۳ چچا چھکن امتیاز علی تاج، ۸۶۵
۴ مرزا جی ایم۔ اسلم، ۸۶۸
۵ قاضی جی شوکت تھانوی، ۸۷۱

مزاحیہ کالم

ہمدرد محمد علی جوہر، ۸۷۵
زمیندار ظفر علی خاں، ۸۷۸
انقلاب عبدالمجید سالک، ۸۸۲
صدق عبدالماجد دریابادی، ۸۹۲
امروز چراغ حسن حسرت، ۸۸۷
نوائے وقت ؟ ۸۹۵
امروز احمد ندیم قاسمی، ۸۹۹
چٹان ؟ ۹۰۳
نمکدان مجید لاہوری، ۹۰۶

لطائف

اردو ادیبوں کے عجیب لطائف شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

غالب، سرسید احمد خاں، وحیدالدین سلیم، ذوق، ناسخ، انشا، سودا، فغاں، داغ، کیفی، اقبال، میر حسن، فیض الحسن سہارنپوری، محمد علی جوہر، مولانا شوکت، مولوی عبدالحق، اکبر الہ آبادی، عشرت لکھنوی، ریاض خیرآبادی اور ابوالکلام آزاد ——

محمد طفیل ایڈیٹر پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغ اردو ایبک روڈ، لاہور سے شائع کیا۔

میں اپنی اس ناچیز کوشش کو پطرس مرحوم کے نام معنون کرتا ہوں جن کی زندگی کا آفتاب غروب ہوا ہے

محمد طفیل

طلوع

خاکساری برتتے برتتے، بال سفید ہوگئے ہیں۔ کسی نے کہا: "خوب ہیں آپ کے نمبر" تو ہم مارے انکسار کے کہتے ہیں "جی کس قابل ہیں"۔ غرض جھوٹ بولتے بولتے یہ دن آگئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کوئی ہمیں اب لاکھ زخود غلط کہے ہم بھی اپنے جرم کا اقرار کریں۔ "جی ہاں! ہم نے خوب نمبر نکالے ہیں"۔

تکلف سے یارانہ نہیں رہا تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم کسی ایسی بات میں پکڑے جائیں جس پر پچ ہی پچ کا اطلاق ہو اور سرے سے سچی بات ہی کوئی نہ ہو۔ ہم اپنے نمبروں کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ ہم نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ کہنا ہے تو صرف یہ کہ —— اب تک کسی نے کیا نہیں۔

اچھے رسالوں نے بے شک اچھے نمبر نکالے ہیں مگر ان کے موضوعات محدود رہے۔ جیسے کسی ایک شاعر پر، ایک ادیب پر، یا پھر کسی بھی مخصوص موضوع پر۔ اس کام کی افادیت سے انکار مجھے بھی نہیں مگر یوں کسی ایک بڑے موضوع کو چن کر اُسے شیشے میں کسی نے نہیں اتارا۔

اقرار کرتے ہی چلیں تاکہ یہ الزام عائد نہ ہو کہ ہم کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ نگار، مخزن، ادبی دنیا، نیرنگِ خیال، ہمایوں، ساقی، عالمگیر اور ادبِ لطیف نے اپنی اپنی جوانی میں کام کے نمبر نکالے ہیں اور ان سب کا باوا آدم ہے نگار —— یہ ہماری رائے ہے —— آپ کو اختیار ہے مانیں نہ مانیں —— ان میں سے اگر کسی سے ڈر لگتا بھی ہے تو مدیرِ نگار ہی سے۔ ممکن ہے وہ یہ کہہ دیں کہ نکالیے تو جناب! آپ نے میرے پایہ کے کون کون سے نمبر نکالے ہیں —؟

بزعمِ خود، یہ نمبر بھی ایک طرح سے طنز و مزاح کی تاریخ ہے۔ جب سے اس نے گھٹنوں چلنا سیکھا، اس وقت سے لے کر اس کی جوانی تک کا تمام کچا چٹھا —— کچا چٹھا کا لفظ، زیادہ تر ہمیں سوداؔ، جرأتؔ، رنگینؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ کے ساتھ ریختی گو شعرا کی وجہ سے لکھنا پڑا ہے ورنہ یہ موضوع بذاتِ خود شریفانہ بھی ہے اور صحت بخش بھی۔

طنزیہ و مزاحیہ چیزیں پڑھتے پڑھتے، خواہ مخواہ کچھ شوخ قسم کے فقرے قلم کی زبان پر آگئے ہیں ورنہ مجھ ایسا انکسار مآب یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے وہ کام کیا ہے جو کسی اور سے نہیں ہوا۔ ہاں اتنی دعا آپ بھی کریں کہ میں اُن موضوعات پر بھی کام کرسکوں جن کے لیے میرا دل انگڑائیاں لیتا رہتا ہے تاکہ اِس وقت کی جھوٹی بات، کل کلاں کو سچی ہو جائے۔

جب سے دُنیا بنی ہے پریشانیوں سے چھٹکارا کوئی نہیں پاسکا۔ بادشاہ ہو تو، فقیر ہو تو، وزیر ہو تو، غریب ہو تو، کوئی سلطنت کے عشق میں روتا رہا، کوئی اپنی دال روٹی کے غم میں۔ یہ سب کچھ ازل سے چلا ہے، ابد تک چلے گا۔ ایسے میں انسان، اگر اپنے لئے ہنسی خوشی کے چند لمحے بھی نہ نکال سکتا تو پھر کیا ہوتا۔ سوچیے نہیں، غش آجائے گا۔

ہمارے لیے بھی مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جھٹ پٹ بقراطانہ قسم کی باتیں چھوڑ اصل موضوع پر آجائیں ورنہ کہیں واقعی وہ بات نہ ہو جائے جو اوپر لکھ آئے ہیں۔

لیجئے جناب! یہ نمبر ۱۲ عنوانات کے تحت مکمل ہوا ہے۔ اب اس کی ترتیب کے بارے میں حسب وعدہ جلدی جلدی باتیں سن لیں اور ہمیں چھٹی دیں۔

۱۔ **مضامین۔** اس عنوان کے تحت اب تک جتنے بھی کار آمد مضمون چھپے تھے وہ سب بر آمد کیے۔ جو گوشے تشنہ رہے ان پر نئے مضامین لکھوائے۔ اب یہ حصہ اتنا مکمل ہے کہ اس موضوع پر اس سے بھی زیادہ کیا ہوتا! اس حصہ میں کلیم الدین احمد جیسے پڑھے لکھے انتہا پسند بھی ہیں (جو میں نہ مانوں، میں نہ مانوں قسم کی تنقید کے امام ہیں) ڈاکٹر خورشید الاسلام ایسے نکتہ شناس بھی اور ڈاکٹر اعجاز حسین ایسے اعتدال پسند بھی اور پروفیسر محمد علم الدین سالک ایسے عالم بھی۔ غرض اس حصہ میں جتنے بھی مقالہ نگار ہیں انہوں نے اس موضوع کو پانی کر دیا ہے۔ واضح رہے ہم نے 'پانی پھیر دیا ہے' نہیں کہا۔

۲۔ **دنیا کی بڑی زبانوں کا طنزیہ و مزاحیہ ادب۔** ہمارے بعض مزاح نگار بدنام ہیں کہ انھوں نے فلاں انگریز مصنف کا ترجمہ اپنے نام سے کر ڈالا۔ فلاں نے فلاں فرانسیسی ادب کی تخلیق کو اپنے الفاظ میں ڈھال دیا۔ فلاں فارسی کے مصنف کا لفظی ترجمہ فلاں صاحب نے کر ڈالا۔ یہ باتیں سچی ہوں یا جھوٹی، اس بحث میں خواہ مخواہ الجھ کر کیوں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی ٹھانیں۔ ہمیں عرض صرف یہ کرنا ہے کہ انگریزی اور فارسی کا اردو مزاح نگاری پر بڑا اثر ہے۔ بڑا ہی اثر ہے۔ ہمارے ادیب ان زبانوں سے متاثر ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم نے انگریزی، فارسی اور فرانسیسی کے علاوہ دنیا کی دیگر بڑی بڑی زبانوں کے بھی تراجم پیش کر دیے ہیں تاکہ یہ تراجم پس منظر کا کام دیں یا نہ دیں، دنیا کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا تو ہلکا سا تصور سامنے آجائے۔

۳۔ **طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ابتدائی نمونے۔** یوں تو شروع سے لے کر اب تک سینکڑوں ہی مزاحیہ پرچے نکلے ہیں بلکہ ایک علامہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اودھ پنچ سے بھی پہلے، ڈیڑھ سو سے زیادہ پنچ اخبار نکلا کرتے تھے۔ بہرحال ہم نے بھی محنت سے کچھ ابتدائی نمونے اکٹھے کئے ہیں۔ ان سے بس اتنا ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پہلے پہل نثر میں کس معیار کی چیزیں لکھی جاتی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو نمونے اودھ پنچ سے پہلے کے ہیں، کچھ اسی دور کے۔

۴۔ **اودھ پنچ کا دور۔** اودھ پنچ سے اردو مزاح نگاری کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ جس معیار کا مزاحیہ پرچہ تھا اس معیار اور انداز کا کوئی دوسرا پرچہ اب تک نہیں نکلا۔ اس پرچے کا کام لوگوں کو صرف ہنسانا نہ تھا بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی بیدار کرنا تھا۔ ہمارے نزدیک تو اس پرچے کا زیادہ تر مقصد سیاسی بیداری ہی تھا مگر اس نے آڑ لی طنز و ظرافت کی۔ اودھ پنچ کے اب تک جتنے انتخابات چھپے ہیں ہم نے ان سے مدد لی۔ اس کے علاوہ خود بھی اودھ پنچ کی فائلوں میں غوطہ زن رہے۔ ہمارے اس انتخاب میں دوسرے انتخابات سے زیادہ مواد ملے گا اور پھر مختلف، ہم نے خواہ مخواہ انتخاب پر زیادہ زور نہیں دیا بلکہ اس پر کہ معلوم ہو سکے کہ اس پرچے کا عام معیار اور انداز کیا تھا اور اس میں کیا کچھ چھپتا تھا اس کمی کو ہمارے علاوہ اب تک کسی نے پورا نہیں کیا۔ اس اخبار کے بارے میں اودھ پنچ ہی کے شاعر کا کہنا یہ بھی ہے ؎

مزا عجب ہے کچھ اس پرچے میں کہ صورت طفل
جوان و پیر کے منہ سے ٹپک رہی ہے رال

۵۔ **فتنہ اور عطر فتنہ۔** یہ پرچے ریاض خیر آبادی نے نکالے اور اودھ پنچ کے زمانے ہی میں نکالے۔ یہ پرچے اودھ پنچ کی ٹکر کے تو نہ تھے مگر ریاض کی شگفتہ بیانیوں نے ان کی حیثیت کو منوا ضرور دیا۔ اودھ پنچ کے ساتھ تو لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی ٹیم تھی، یہی اس کی جیت بھی تھی، اور یہ اکیلے

سجاد حسین کیا کرتے، مگر ادھر قریب قریب ریاض اکیلے ہی تھے۔ ان پرچوں کے بارے میں بھی ہماری یہی کوشش رہی کہ ان پرچوں کے انتخابات سے زیادہ اس پرچے کے عام معیار اور روش کا اندازہ ہو سکے۔ بہر حال طنز و مزاح کے سلسلے میں ان پرچوں کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جب خوبصورت ریاض نے اپنے آپ کو بھی نہ بخشا ہو تو اوروں کی تو بات ہی جانے دیں۔ اگر آپ نے ریاض کی تصویر دیکھی ہے تو پھر ان کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

بڑے نیک طینت، بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

۶۔ **شیرازہ** ۔ اودھ پنچ سے زیادہ سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ فتنہ اور عطر فتنہ میں تھا اور فتنہ، عطر فتنہ سے زیادہ شیرازہ میں۔ چراغ حسن حسرت جیسے بالغ نظر اور بذلہ سنج اس کے مدیر تھے۔ یہ پرچہ اودھ پنچ کے کوئی نصف صدی کے بھی بعد نکلا۔ اتنا نکھار اور بانکپن، کچھ تو دیا زمانے نے اور کچھ حسرت صاحب کی عبقریت نے۔ اس پرچے میں زیادہ تر حسرت صاحب ہی چھائے رہے۔ اگر فتنہ، عطر فتنہ ریاض کی وجہ سے مقبول ہوا تو شیرازہ حسرت صاحب کی وجہ سے۔ بہر حال اسے یہ امتیاز ضرور حاصل رہا کہ اس کی ہر بات میں وقار اور اس کی ہر چیز میں فنی اور علمی شان تھی۔ حسرت صاحب نثار کی حیثیت ہی سے زیادہ ابھرے مگر جب کبھی وہ نظم میں کچھ کہہ گئے ہیں تو وہ بھی مزے کی چیز ہو گئی۔ مثلاً اتحاد پارٹی کی شان میں ؎

تیرے گورے گورے گال   اتحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال   اتحاد پارٹی   وغیرہ

۷۔ **طنزیہ و مزاحیہ ادب کا دور** ۔ جس ادیب نے بھی نثر میں لکھا ہے اس کے ہاں ڈھونڈے سے شگفتہ، طنزیہ اور مزاحیہ چیزیں مل ہی جاتی ہیں جب مصورِ غم علامہ راشد الخیری کے ہاں بھی اس نوع کی چیزیں مل جاتی ہیں تو پھر بھلا اور کون پیچھے رہا ہو گا۔ ہم نے اس سلسلے کو غالب سے شروع کیا ہے اور یہ چاہا ہے کہ جن کی تحریروں میں اس موضوع سے متعلق نمایاں حصہ ہو صرف انہی کو لیا جائے۔ اس حصے میں بڑے بڑے ادیبوں کے نام سامنے آتے ہیں مگر سب کے سب باقاعدہ قسم کے طنز نگار یا مزاح نگار نہ تھے۔ اگر ہم ان میں سے کچھ کو چھوڑ دیتے تو اس موضوع کی ارتقائی کڑیاں ملانے میں دشواری ہوتی۔ بہر حال اس حصے میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب تبرک نہیں ہے، کام کی چیزیں ہیں۔ انہی سے بعد کے مزاح نگاروں کو نئی راہیں ملی ہیں۔

۸۔ **طنزیہ و مزاحیہ ادب کا زریں دور** ۔ ہم چونکہ خود اس دور سے گزر رہے ہیں یہی وجہ ہے شاید کہ ہم اپنے سے ذرا پہلے دور ہی کو طنزیہ مزاحیہ ادب کا زریں دور سمجھتے ہیں۔ جب اس دور میں پطرس، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج اور شوکت تھانوی ہوں تو ہم کیوں نہ اس دور کو زریں دور کہیں۔ یہ حصہ پطرس سے شروع ہو کر زمانۂ حال کے لکھنے والوں تک آ جاتا ہے۔

۹۔ **اردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر** ۔ حصۂ نظم کے بارے میں فاضل مقالہ نگار محمد عبداللہ قریشی نے ابتدا ہی میں اس کی ترتیب کے بارے میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اس لیے میں چپ بھی رہوں، جب بھی حرج کچھ نہیں۔ اردو نثر سے پہلے اردو نظم میں ہی طنزیہ و مزاحیہ چیزیں ظہور میں آئیں پھر جو جو شاعروں نے گل کھلائے وہ سب ہم پیش کر دیتے تو ڈر یہ تھا کہ بعض نستعلیق قسم کے دوست کہہ دیتے "ہمارے شاعر بڑے

بدمعاش تھے"۔ ہم نے حتی الامکان سُبک پوچ اور لغو شعروں سے اس حصہ کو بچایا ہے اور پھر زمانہ حال کے شاعروں سے زیادہ مرحوم شعرا پر پوری توجہ دی۔ موجودہ شعرا پر غیر جانبداری سے کام کرنے کا یہ موقع ہے بھی نہیں۔ کون بُری بھلی باتیں سُنے۔ آخر میں اس حصّے کے بارے میں یہ بات اور سن لیں۔ خوب ہے یہ چیز!

۱۰۔ مزاحیہ کردار۔ جب تک کوئی بڑا لکھنے والا نہ ہو وہ کسی کردار کو زندہ جاوید بنا ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں مزاح نگار پیدا ہوئے مگر وہ سیکڑوں زندہ کردار نہ دے سکے۔ کھینچ تان کر آپ زیادہ سے زیادہ چھ سات کردار پیش کر سکتے ہیں جیسے خوجی، حاجی بغلول، چچا چھکن، میرزا جی اور قاضی جی، بس! — مجید لاہوری نے کئی کرداروں کو روشناس کرانا چاہا مگر وہ زیادہ کردار روشناس کرانے کی دھن میں مارے گئے۔

۱۱۔ مزاحیہ کالم۔ شروع سے لے کر اب تک اخباروں میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ اس کا ایک کالم تو ضرور مزاحیہ ہو۔ بے شمار اخبار نکلے، بے شمار ہی مزاحیہ کالم لکھے گئے۔ اگر ان سب کے مزاحیہ کالموں کو یہاں درج کر دیتے تو وہ بھی ہزارہا صفحوں میں پھیلتے۔ ہم نے صرف چند نمایاں اخباروں کے مزاحیہ اور طنزیہ کالموں کو یہاں جگہ دی ہے۔ یہاں ایک بات کہنے کی ہے۔ نہ کہوں تو کوئی گڑبڑ بھی نہ ہو گی، وہ یہ کہ یہ کالم بڑے بڑے ادیب ہی لکھتے رہے ہیں۔ ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی نہ ہے۔

۱۲۔ ادیبوں کے لطائف۔ یہ موضوع بھی بڑا لمبا چوڑا ہے مگر فاضل مضمون نگار شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے تو نمایاں ادیبوں کے اچھے اچھے لطیفے جمع کر دیے ہیں۔ اگر ہمارا پرچہ پہلے ہی زیادہ ضخیم نہ ہو جاتا تو اس موضوع پر اور بھی کچھ پیش کرتے۔

آخر میں مجھے ان چیزوں کے انتخاب کے بارے میں یہ اعتراف کرنا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ میں نے جتنی چیزیں چُنی ہوں وہ سب اس موضوع پر لکھنے والوں کی شاہکار ہی ہوں۔ میں نے انھیں صرف اپنی عینک سے دیکھا ہے۔ اگر میری عینک کا نمبر ٹھیک نہیں ہے تو اس پر آپ بے شک ماتم کر لیں۔ بہرحال یہ چیزیں مجھے کسی نہ کسی وجہ سے پسند ضرور ہیں۔ پسند کے علاوہ ایک مجبوری کو اور بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔ وہ یہ کہ بعض لکھنے والوں کی سب کی سب تخلیقات میرے سامنے نہ تھیں۔ ایسا ممکن ہی نہ تھا۔ اللہ کی شان! یوں ٹھوکر کھانا بھی میری ہی نالائقیوں میں شمار ہو گا۔

کچھ نام ایسے ضرور نکل آئیں گے جن کا اس نمبر میں آنا ضروری ہو مگر میں کیا کروں، اس نمبر کی ضخامت کے ہاتھوں موجودہ صورت میں بھی پریشان ہوں، جب تو اور پریشان ہوتا۔ اور تو اور میں نے خود اس نمبر کے لیے ایک بڑا "معرکۃ الآرا" مضمون لکھا تھا مگر وہ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے روکنا پڑا۔ اور تو کسی کا ذکر ہی کیا — پنجابی میں ایک مثل ہے: "ملاح دا حقہ سدا ای سُکا[1]"

محمد طفیل

---

[1] ملاح کا حقہ پانی سے محروم ہی رہتا ہے۔

ہنسنے کی ابتدا اور اہمیت[1]

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

قدرت کا کرم سمجھیے یا ستم کہ ہر آدمی رونے یا ہنسنے پر مجبور ہے۔ زندگی کے لیے دونوں ازبسکہ ضروری ہیں، ان دونوں کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پہلے کون پیدا ہوا اور بعد میں کون؟ اس کا فیصلہ کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ زیادہ تر تو لوگوں نے جھگڑے سے بچنے کے لیے میر درد کی طرح کہہ دیا ہے کہ ع

شادی و غم جہاں میں توام ہے

موضوع کے اعتبار سے فی الحال ہم اپنے لیے بھی یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ تقدیم و تاخیر کی بحث سے الگ ہو کر اہمیت پر غور کریں حالانکہ یہ گفتگو بھی الجھن اور دماغ ریزی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ لیکن یہ عام خیال کہ رونے کے لیے بھی خوشدلی کی ضرورت ہے، مسئلہ کو سلجھانے میں بڑی مدد کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر خوشدلی کے گریہ و بکا بھی تشنہ رہ جاتا ہے اور اندازہ بھی یہی ہوتا ہے کہ دنیا زیادہ تر خوشی کی طالب ہے۔ ہنسنے کے مقابلے میں رونے سے گریز کرتی ہے اس لئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جذبات کے لحاظ سے ہنسنے کی اہمیت زیادہ اور اتنی عظیم ہے کہ اگر خوشی دنیا سے اٹھ جائے تو غالباً محفلِ عالم کو پہچاننے میں فرشتوں کو بھی تکلف ہو، انسان کا جینا دوبھر ہو جائے اور خدا جانے کیا کیا ہو جائے۔

ہنسنے کی اہمیت مسلّم مان کر آئیے اس پر غور کریں کہ اس کی ابتدا کب اور کیوں ہوئی۔ اس سلسلے میں ہم کو اس دور کی زندگی پر نظر ڈالنی ہوگی جس کی تاریخ پر ناواقفیت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ بقول مومن؎

یادِ ایام کہ بے رنگ تھی تصویرِ جہاں　　دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں

انسانی حالات و واقعات پردۂ اخفا میں ہیں۔ قیاس و خیال آرائی کے سوا کوئی تحریری ثبوت نظر نہیں آ سکتا مگر خیال آرائی بے بنیاد نہیں، اس کے پس پشت عقل و نفسیات کا شائبہ بھی ہے چنانچہ بغیر تاریخ و تحریر کے بھی یہ بات قابلِ قبول نظر آتی ہے کہ ہنسنے کی ابتدا آدمی نے اس وقت کی جب وہ تہذیب و تمدن سے بیگانہ تھا۔ ہنوز وہ عہدِ حجری میں بھی قدم نہ رکھ سکا تھا۔ بال و ناخن بڑھائے لحیم شحیم پیکر کے ساتھ بغیر قیام گاہ کے جنگل جنگل تلاش میں پھرتا تھا، اپنی حفاظت کے لیے برق و باراں سے لڑتا تھا، خونخوار جانوروں سے مقابلہ کرتا تھا، اپنے ہم جنسوں سے بھی نبرد آزما ہوتا تھا اور جب دشمن پر فتح پا جاتا تھا تو چاہے اس کے پاس معنی خیز الفاظ رہے ہوں یا نہ رہے ہوں وہ خوشی کے نعرے لگاتا تھا اور بازی جیت کر دشمن کو مغلوب اور اپنے کو غالب دیکھ کر شادمانی کے ساتھ زور زور سے ہنستا تھا۔

---

[1] اس مضمون کی تیاری میں مغرب کے بعض ممتاز مصنفین مثلاً برگساں، جیمس سلی، البرٹ راپ وغیرہ کے خیالات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

قہقہوں سے اپنی فتح مندی کا اعلان کرتا تھا۔ احساسِ برتری کے نشہ میں سرشار ہو کر پوری فضا کو شاداں و خنداں محسوس کرتا تھا۔ خود بھی ہنستا اور دوسروں کو بھی ہنساتا اور ان سے داد اور ہمت افزائی کا حوصلہ پاتا۔

اس ہنسی کے پسِ پشت غرور، تذلیل، تضحیک وغیرہ کے ملے جلے جذبات ہوتے گویا ہنسنے کی ابتدا وحشیانہ، جارحانہ اقتدار پر قائم ہوئی جو صدیوں بعد شائستہ تہذیب ہوئی۔ بالکل اسی طرح معاشرہ نے اس ہنسی کی تربیت کی۔ جس طرح وحشی ہاتھی گھوڑوں کو رفتہ رفتہ انسان نے محنت کرکے کارآمد و خوبصورت بنایا اسی طرح اس وحشیانہ فعل کو بھی مدتوں کے ریاض سے خاصہ کی چیز بنا دیا۔ ہر مہذب سوسائٹی کے لیے ہنسنا ہنسانا ضروری سا ہو گیا یہاں تک کہ بزرگانِ دین کی پسندیدگی کا باعث ہوا چنانچہ "مزاح المومنین" ایک مخصوص و مقبول ذہنیت و ذکاوت کی علامت سمجھی گئی۔

ہنسنے کے ارتقا میں جو کچھ انسان نے محنت کی وہ قدرت کا قابلِ قدر کارنامہ ہے لیکن اگر ہنسی میں بذاتِ خود ترقی کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو اس کی گیرائی اس پایہ کی نہ ہو سکتی کہ اس کو آدمی کا جوہرِ خاص سمجھا جائے اور دوسری مخلوق سے تمیز کرنے میں انسان کی شناخت یہاں لی جائے کہ وہ صرف حیوانِ ناطق نہیں بلکہ ہنسنے والا جانور بھی ہے۔ علاوہ اور خصوصیات کے ہنسی ایک فعل متعدی کی صفت سے متصف تھی کسی کو ہنستے دیکھ کر دوسرا شخص بھی ہنسنے لگتا اور اس ہنسی میں کچھ دیر کے لیے سہی غمِ دنیا بھول جاتا۔ ذہنی خلفشار کی شدت خود بخود محو ہو جاتی، کش مکش سے نجات کا احساس ہوتا بلکہ کچھ دیر کی ہنسی اس کو ایک ایسی تازگی بخش دیتی کہ غمِ دنیا کو برداشت کرنے کی از سرِ نو قوت آ جاتی۔ وہ اپنی الجھنوں کو حال کی وقتی مسرت سے مستقبل قریب میں مردانہ وار برداشت کرنے کی طاقت محسوس کرتا۔

جس ہنسنے کی بنیاد غیر مستحسن جذبات پر سمجھی گئی ہے اسی کے بطن سے ظرافت اور اس سے متعلق جملہ اجزا کی پیدائش بھی ہوتی رہی ہے۔ طنز، بذلہ سنجی، پھبتی، فقرے بازی وغیرہ سب اسی ہنسنے ہنسانے کی مختلف صورتیں یا علامتیں ہیں گویا ہنسنا ایک برگد کا درخت ہے جس کی جٹائیں رفتہ رفتہ خود ایک درخت بن گئیں۔ سایہ کی لطافت و نزاکت کا مزا پا کر اہلِ علم و طبیعت سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تمام متمدن مہذب معاشرے کچھ دیر اس کی چھاؤں میں آرام کر لینا ضروری تصور کرنے لگے لیکن باوجود نفاست و دلکشی کی صفتیں و جلد کے اصل سے فروع کی نسبت باقی رہی۔ اس خندۂ دنداں نما کے خمیر میں دل آزاری شامل تھی وہ کسی نہ کسی تناسب سے صورت میں غور کرنے پر اب بھی نظر آتی ہے۔ ظرافت کتنے ہی معصوم انداز میں آئے مگر عموماً کسی بات پر ہنسنا مقصود ہوتا ہے۔ ہنسنے والے خوش ہوتے ہیں مگر جس پر مذاق کا نشتر لگایا جاتا ہے اس کے دل سے پوچھیے تو باوجود ظاہری اظہارِ مسرت کے بباطن وہ رو رہا ہو گا گویا اس ترقی یافتہ صورت میں بھی ظرافت دل آزاری سے باز نہ آ سکی۔ اب یہ اور بات ہے کہ جارحانہ انداز نے شرافت کا بھیس بدل لیا ہو اور دل شکنی جمہوری شعور اور مذاقِ عام میں شدت نہ محسوس ہونے دے۔ دکھ درد کے باوصف مجروح شخص اس کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے اپنے کو مجلسی ہونے کا ثبوت دے۔

ہنسی کی ابتدا جیسے بھی ہوئی ہو لیکن قرینہ یہ کہتا ہے کہ اس کا دائرہ اور بنیاد دونوں ارتقائی منازل میں متغیر ہوتے رہے ہیں۔ صرف دشمن پر کشت و خون سے فتح پانا ہی ہنسی کا واحد سبب نہیں رہا بلکہ مختلف و متعدد وجوہات نئے بھیس میں ہنسنے ہنسانے کا سرمایہ بنتے رہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ اس کی بنیاد تضحیک و تذلیل پر قائم ہوئی لیکن تدریجی نشوونما سے بعد میں ہنسنا اصلاح و تربیت کا ذریعہ بھی بن گیا۔ اکثر مقامات پر ہمدردی و بہی خواہی کی بھی جھلک ہنسی میں نظر آنے لگی۔ اس ہنسی کو برقرار رکھنے کے لئے تقریر، تحریر، عمل، صورت، الفاظ، حرکات و سکنات وغیرہ کا سہارا لیا گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ فنونِ لطیفہ کی حد میں داخل ہو گیا چنانچہ طربیہ بن کر ڈرامہ کی جان بن گیا اور ادب کے محاسن میں شمار ہونے لگا۔

ہنسنے ہنسانے نے انسان کے جس شعور کو بیداری عطا کی اس کا تقاضا تھا کہ اس کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے ظرافت کو علمی و ادبی سانچے میں ڈھالا جائے۔ موقع و محل کے لحاظ سے الفاظ و لہجہ کا اس طرح پیش کرنا کہ مجلس ہنس پڑے اور بجا ابلی کو نہ چھوڑتے ہوئے ادبی جملوں سے سرسبز ہو جائے مستقل ایک فن بن گیا۔ مواد و ہیئت کے لحاظ سے مذاق کے مختلف پہلو ہو گئے۔ امتیازی خصوصیات کی بنا پر اہلِ علم نے ظرافت کو سمجھ بوجھ کر خانوں میں بانٹ دیا چنانچہ ہجو سے لے کر طنز تک اسی کی بکھری ہوئی حکایتیں ہیں۔ ان میں سے بعض اجزا اپنے اصل سے زیادہ قریب ہیں یعنی ان کی سرشت میں دلجوئی سے زیادہ دل آزاری ہے مثلاً ہجو، طنز، پھبتی وغیرہ، ان کا مقصد کسی کو دکھ پہنچانا ہوتا ہے برخلاف اس کے مزاح کے پیشِ نظر زیادہ تر ہمدردی و اصلاح کا جذبہ ہوتا ہے۔ البرٹ راپ نے مزاح (HUMOR) کے سلسلے میں جو لکھا ہے اس کا مفہوم یہ ہے[لہ]:

"مزاح کے تبسم میں ترحم شامل ہوتا ہے۔ جس پر وہ طعن کرتا ہے اس سے اس کو محبت ہو جاتی ہے۔"

یہی مصنف آگے چل کر کہتا ہے کہ مزاحیانہ ہنسی میں محبت کے جزو کو غالب ہونا چاہیے مگر کچھ مصنفین ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ مزاح بھی اپنے اصل کی خصوصیات سے مبرا نہیں یعنی اس میں بھی کچھ نہ کچھ قابلِ گرفت خرابیاں موجود ہیں مثلاً اور کچھ نہ ہو تو مزاح میں احساسِ برتری کا جذبہ ضرور پایا جاتا ہے۔ بہرحال صدیوں کی محنت و ترقی کے باوجود ظرافت میں کثافت کا پرتو شامل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جیسے جیسے انسانی تہذیب بڑھتی گئی سماج نے اپنے طور پر ظرافت کو حسبِ توفیق ایسی فن کاری سے سنوارا کہ اکثر اوقات وہ کثافت نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے مگر اس کے وجود سے انکار کلیتاً نہیں کیا جا سکتا۔ سوچنا ہے کہ جب اس کے خمیر میں خرابیاں موجود تھیں تو معاشرہ نے اس کو قائم رکھنے کی ہزاروں سال سے جد و جہد کیوں کی؟ اس کے وجود میں تھوڑی سی بھی کثافت تھی تو ختم کرنے کی فکر کیوں نہ کی گئی۔ غالباً اس میں فائدہ اتنا زیادہ ہے کہ خفیف سے نقصان کو برداشت کرنا دنیا نے گوارا کر لیا۔ آئیے ذرا دیر کے لیے اس کے فوائد پر بھی نظر کر لیں اور یہ بھی سوچیں کہ سماج میں اس کی گیرائی کے اسباب کیا ہیں اور ممکن ہو تو یہ بھی دیکھ لیں کہ یہ فوائد جذباتی تصورات کے نتائج ہیں یا سچ مچ ان سے دنیا کو فائدہ پہنچتا ہے۔

سفرِ زندگی میں ہنسنا ہنسانا ایسا ہی ہے جیسا کڑی دھوپ کے بعد شجرِ سایہ دار کا میسر آجانا۔ تلخیٔ غم جب لذتِ حیات کو ناخوشگوار بنا دیتی ہے تو تھوڑی دیر کی خوش دلی از سرِ نو تازگی عطا کر دیتی ہے۔ نہ صرف سفر کی تکان دور ہو جاتی ہے بلکہ جن حادثات و واقعات کو بوجھ سمجھ کر راہرو اپنی زندگی سے پریشان تھا اس کو پھر ایک نئی قوت سے اٹھانے کی ہمت اپنے میں پاتا ہے۔ جتنی دیر وہ ہنسنے ہنسانے میں رہتا ہے اتنا وقت وہ روزمرہ کے غموں سے الگ ہو کر زندگی کی بھیانک تصویر کے بجائے اس کے حسین و دلکش رُخ کو دیکھتا ہے اور خوشی خوشی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے گویا اسے ایک ایسی قوی ڈھال مل گئی جس کے سہارے وہ غمِ فردا کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا ہے اس لیے کہ اس کو ایک تبدیلی ملی جو بجائے خود چاہے تفریح ہو مگر اس تفریح میں اور بھی لوگ شامل تھے جو کسی نہ کسی غم سے چھٹکارا حاصل کرنے یا زندگی کو زیادہ خوشگوار بنانے کی فکر میں تھے۔ وہ ان سب کو ہم جماعت اور ساتھی سمجھ کر تنہائی و کسمپرسی کے پنجہ سے اپنے کو آزاد پاتا ہے۔ سب کو ہنستے دیکھ کر وہ بھی اپنے کو ہنسنے پر مائل پاتا ہے علاوہ اور باتوں کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہنسی بذاتہٖ ایک کشش ہے یا یوں سمجھیے کہ اس میں وہ مقناطیسی اثر ہے کہ دوسروں کو بے تحاشا اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ عام اس سے کہ سننے والا راز کو سمجھ کر ہنس رہا ہے یا بے سمجھے بوجھے شریکِ بزم ہو گیا ہے۔ دوسروں کو ہنستے دیکھ کر اس طرح ہنسنے لگتا ہے گویا سب کچھ بھول کر وہ صرف ہنسنا ہی جانتا ہے۔ جملہ اہلِ محفل ایک دوسرے کو اپنا ہم نوا خیال کرنے لگے ہیں

[لہ] ORIGIN OF WIT AND HUMOR

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوش دل جماعت میں بغیر امتیاز و اختلاف سب کے سب ہنسنے والے ایک دل ایک خیال ایک رائے ہیں۔ اس طرح گویا ہنسی میں متحد و منسلک کرنے کی بے نظیر صلاحیت ہے اس لحاظ سے ہنسنا لازمی طور پر مجلسی ہوا کیونکہ یہ وقفہ مختصر ہونے کے باوجود بھی اتفاق و اتحاد کا ایک مستقل رابطہ بن جاتا ہے ۔

ہنسنے کا دوسرا سماجی پہلو بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ کسی مجلس میں کسی فرد پر ہنسنا دلآزاری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً ہنسے جانے والے پر اس لحاظ سے ظلم ہوتا ہے کہ اس کی دل شکنی ہو رہی ہے ایسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ ہنسنا اتحاد و اتفاق کی جگہ افتراق و اختلاف کا باعث ہے لہٰذا وہ غیر سماجی فعل ہے لیکن غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلآزاری کے پسِ پشت اصلاحی و تربیتی خصوصیات لے کر ہنسی آئی تھی۔ عموماً ان ہی لوگوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے جو برخود غلط یا گندم نما جَو فروش ہوتے ہیں جن کی مثالیں آپ کو سودا کی ہجو سے لے کر اکبر کی مزاحیہ شاعری تک میں ملتی ہیں مثلاً اکبر ایک جگہ کہتے ہیں ؂

اب کہاں تک بتکدے میں صرفِ ایماں کیجئے
تا کجا عشقِ بتاں میں سستِ پیماں کیجئے
ہے یہی بہتر علی گڈھ جا کے سید سے کہوں
مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے

اکبر ایک زمانے تک سر سید کو برخود غلط انسان سمجھتے تھے مگر ان کی خدمات کے قائل بھی تھے اس لیے ہمدردی بھی تھی۔ چاہتے بھی تھے کہ وہ راہِ راست پر آ جائیں ۔

سودا کے زمانے میں ایک برخود غلط مولوی نے "حلتِ غراب" کا فتویٰ دے دیا تھا۔ سودا کہاں ضبط کر سکتے تھے، ایک مخمس اس کی ہجو میں کہہ کر عوام و خواص کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک بند اس مخمس کا یہ ہے ؂

بگڑا ہے آج مجتہدوں بیچ کیا یہ نیسل ملا لطیف بولے کہ کھانا روا ہے چیل
کہتا ہے چاند خاں کیا کن نے حرام فیل حلت پہ مینڈکی کی میاں جی کی تو دلیل
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

اس طرزِ عمل میں جس کو بظاہر دل آزاری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے حقیقتاً ایک غلط کار کی اصلاح کرنے کا بھی جذبہ ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کو متنبہ کرنے کا بھی خیال رہتا ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑے۔ اس بات کو جب ہم سوچتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسی دلآزاری جو اتنے فوائد پر مشتمل ہے اس خاموشی سے بہتر ہے جو کسی ایک فرد کو اور اس کی تقلید سے ایک بڑی جماعت کو نقصان پہنچانے والی ہے —

ہنسی اور سماج کا تعلق ایک اور معرکے میں نمایاں ہوتا ہے زندگی کے نقشہ میں جب کبھی نئے حالات، جدید رسوم یا فیشن نے رنگ آمیزی کی ہے تو ہنسنے نے سب سے آگے بڑھ کر حصہ لیا ہے اس نے نئی باتوں کا مذاق اڑایا ہے۔ مخالفت میں قہقہے بلند کئے ہیں، لوگوں کو کورانہ تقلید سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے چنانچہ ڈارون کے عظیم و اہم نظریہ کو کہ انسان آدمی ہونے سے پہلے ارتقا کی منزل میں بندر رہا، ابتداً مشرق میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا، تحریر و تقریر سے اس مسئلہ کی اتنی مخالفت نہ ہوئی ہو گی جتنا ہنس ہنس کر لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا چنانچہ

اردو کے سب سے بڑے مزاح پسند شاعر اکبرؔ نے کہا ؎

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے   میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے
نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں   اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے

ممکن ہے کہ یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر ہنسنے سے اتنے بڑے مسئلہ کی مخالفت کی گئی تو ہنسی کو بجائے مجلسی کے غیر مجلسی کہنا چاہیے۔ بظاہر اعتراض صحیح ہے مگر غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہنسنے والے کی مصلحت علم یا تحریک کی تذلیل یا مخالفت نہ تھی بلکہ اس کی حمایت و اشاعت تھی وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ اتنے عظیم الشان انکشاف کو ہر کس و ناکس بغیر غور و فکر کے اندھے پن سے قبول کر کے سماج کو تفکر و تفحص سے بیگانہ نہ کر دے جو کوئی اس نظریہ کو مانے وہ فلسفیانہ نظر سے مطالعہ کر کے تب رد و قبول کی منزل میں قدم رکھے۔

ہمارے اس خیال کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ جب کوئی لباس یا فیشن یا خیال نیا ہوتا ہے تو سماج میں پہلے اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے لیکن جب اس کو قبولِ عام کی سند مل جاتی ہے تو وہ ان پرانی باتوں کو جو ابتدائے زمانہ سے بے جان اور نئے ماحول میں نامانوس نظر آتی ہیں جن کی موافقت میں پہلے اس نے ہنس ہنس کر تازہ واردانِ بساطِ دل کو رُلا دیا تھا اب ان ہی باتوں اور نئی چیزوں کو مقبول و مروج ہو جانے پہ ان کی مخالفت میں فرسودہ وضع قطع خیال پر اپنا نشتر صرف کرتا ہے گویا ہنسنا سماج کی ارتقا کا ایک سہارا بن کر چلتا ہے حسبِ ضرورت کبھی آگے ہوتا ہے کبھی پیچھے، وہ مذمت و مدحت دونوں پہلو اختیار کر لیتا ہے لیکن ہر حال میں معاشرہ کی اصلاح و تربیت پیشِ نظر رہتی ہے۔ معاشرے کی بہبود کے سلسلہ میں ہنسی کبھی کبھی بڑی کشمکش میں پڑ جاتی ہے۔ جب رفتارِ ارتقا سے وہ اس مقام پر بھی آ جاتی ہے جہاں سماج خود تذبذب میں ہوتی ہے کہ اب کون سا راستہ اختیار کیا جائے آگے بڑھنے والے اشارہ کرتے ہیں کہ راہِ راست ہمارے زیرِ قدم ہے اور پیچھے والے اپنی طرف بلاتے ہیں کہ آباواجداد کی بتائی ہوئی منزل پر ہم ہی ہیں، آگے بڑھنا خطرناک ہو رہا ہے پر کھڑے ہو کر آسانی سے ہنسنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اس ذہنی کشمکش کو اکبرؔ نے بڑی خوبصورتی سے ایک موقع پر واضح کر دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبرؔ   تو صاف کہتے ہیں سید کہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں   خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر   زیادہ حد سے دیے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے   اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحیِ مے لا
اِدھر ہے دفترِ تدبیر و مصلحت ناپاک   اِدھر ہے وحیِ ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را   بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

بہرحال ہنسنا اور قوم کی ترقی کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے جہاں تقریر و تحریر کا عمل جاری نہیں ہو سکتا وہاں بھی اپنی جماعت و افراد کو ایک خاص راستہ پر ظاہر ہے کہ یہ کام ہنسی کرتی ہے لیکن اس کا دائرۂ اثر عمل دونوں سے وسیع ہے۔ تقریر وہیں کام کر سکتی ہے جہاں پڑھے لکھے لوگ ہوں لیکن ہنسنا بے نیاز ہے

ہو سکتا وہاں بھی اپنا جھنڈا گاڑ دیتا ہے۔ جاہل بلکہ جنگلی قبائل اسی کا سہارا لے کر آگے بڑھتے رہے یہاں
اس کا جنم ہنگامی دور میں ہوا لیکن اس کو جنم دینے
کہ باپ دادا کے مذہب رسوم وغیرہ کو قائم رکھتے ہیں۔ علاوہ اور محرکات کے ہنسنا بھی ان کے بہت

کام آیا ہے۔ سماج کی ترقی میں ہنسی ایک زبردست قوت رہی ہے چاہے طبقہ پڑھے لکھے لوگوں کا رہا ہو یا جاہل اور جنگلی افراد کا۔

یہاں تک ہنسنے اور سماج کے ربط کا بیان ہے جو ہمارے خیال سے تشنہ و نامکمل ہے اس لیے کہ جتنا غور و مطالعہ کیا جاتا ہے معاشرہ اور ہنسی کے ارتباط کے سیکڑوں پہلو نکلتے آتے ہیں مگر وقت کی قلت کے ساتھ ساتھ کوتاہی دامن کا بھی گلہ ہے اور نہ شاید رسالہ اتنی گنجائش کا متحمل ہو سکے چنانچہ اس ضمن میں متعدد گوشے نظر انداز کر دیے گئے ہیں کیونکہ اگر وضاحت کے ساتھ پیش کیے جائیں تو ایک پوری کتاب کی ضخامت درکار ہوگی۔ اب اور باتوں کو چھوڑ کر یہ دیکھنا ہے کہ ہنسنے سے دماغی اور جسمانی فوائد بھی ہیں یا نہیں؟ کہا یہ جاتا ہے کہ ہنسنا صحت کے لیے مفید ہے اس سے دماغ و جسم پر صحت مند اثر پڑتا ہے۔ اس خیال کی تائید میں مختلف نظریے پیش کیے جاتے ہیں اور تجربہ کرنے سے دعوائے بے دلیل کی حد سے نکل کر ہم طبی لحاظ سے اس کو صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ تو مسلّم ہے کہ تردّد، کشمکش، غیظ و غضب اور خوف کے جذبات معدہ تک ہاضم رطوبت کو پہنچنے نہیں دیتے جس کی کمی انسان کو نحیف و مجہول بنا دیتی ہے۔ برخلاف اس کے ہنسنا ان تمام مخالفِ صحت جذبات کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ غذا صحیح راستہ پر صالح اجزا کے ساتھ معدہ تک پہنچ جاتی ہے۔ نشوونما کے مراحل طے کر کے انسان کو صحت مند جسم و دماغ کا مالک بنا دیتی ہے
ڈاکٹر جیمس کا کہنا ہے کہ :

> "ہنسنا ایک طرح کی مالش ہے جس سے پھیپھڑے، دل، جگر، آنت وغیرہ سب متاثر و متحرک ہو جاتے ہیں چنانچہ اکثر ادھیڑ عمر کے آدمی کم ہنستے ہیں اس لیے بھی ان کی صحت خراب رہتی ہے۔"

اسی ڈاکٹر کی رائے ہے کہ یہ مالش ایسے لوگوں کے لیے خاص طور پر ضروری ہے جو دوڑ دھوپ نہیں کرتے یا کاہل رہتے ہیں لیکن ہنسنے میں جو مالش ہوتی ہے وہ سب ہی کے لیے مفید ہے کیونکہ ہاضمہ کی راہ میں جو رکاوٹیں جالے کی طرح پھیلی رہتی ہیں ان کو نہ صرف یہ صاف کر دیتی ہے بلکہ گوشوں تک صالح اجزا پہنچا دیتی ہے جو کسی وجہ سے اب تک محروم تھے۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی ہنسنا اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف جسمانی فوائد حاصل ہوتے ہیں بلکہ دماغ کی بھی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ احساسِ کمتری کو برتری میں تبدیل کرنے کے لیے ہنسنا جتنا کارآمد ہے شاید ہی کوئی تحریک اتنا اثر کرتی ہو منجملہ دیگر وجوہ کے ایک بات یہ ہوتی ہے کہ ہنس کر آپ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم احساسِ کمتری کا شکار نہیں اور اسی اعلان کے پردے میں آپ اپنی عزت و وقار کا سہارا لے کر پھر راہِ اعتدال پر آ جاتے ہیں۔ ذہنی کمزوریوں کی تلافی خودداری کے احساس سے ہو جاتی ہے۔ اس پر اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے عالم میں ہنسی فرار و خود فریبی کی دلیل ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اعتراض صحیح ہو لیکن باوجود اس کے بھی نتیجہ اچھا ہوتا ہے ہنسنے سے احساسِ کمتری تو دور ہو جاتا ہے چاہے راستے اس نے کوئی بھی اختیار کیے ہوں۔ بقول غالب ع

کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

اس سے بحث نہیں ہے کہ آپ میں احساسِ کمتری پیدا کرنے والے کو شکست ہوئی یا نہیں، انجام یہ ضرور ہوا کہ ہنسنے ہنسانے میں آپ کا جذبۂ خود اعتمادی برقرار رہا، آپ کے دل و دماغ کو مجہول و مرعوب ہونے سے اس نے بچا رکھا، آپ کی انفرادیت کو اُبھرنے کا موقع دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ خودداری کے ساتھ خطرناک راستوں سے بچتے ہوئے اپنے ارادوں اور حوصلوں کی بھیڑ میں آگے بڑھتے چلے گئے!

طنز و ظرافت

ڈاکٹر خورشید الاسلام

"میرے لیے ایمان میں دل کشی ہے مگر میں کفر کو بری نگاہ سے نہیں دیکھتا، عمل کرتا ہوں مگر کاہلی کو عزیز رکھتا ہوں اپنے نفس کا احترام کرتا ہوں مگر آپ نشے میں ہوں تو آپ کی رفاقت کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ اور آپ پر قہقہہ لگانے میں کوئی تامل نہیں، مجھے اپنے ماحول سے محبت ہے لیکن اپنے ماحول پر حکمران نہیں ہوں۔ میں دنیا کی مسلمہ قدروں کو نہیں مانتا مگر پھر بھی میری معقولیت میں کوئی شبہ نہیں۔ میں عام طور سے بزدل ہوں لیکن ہمت اور جوانمردی سے یکسر محروم بھی نہیں ہوں، یہ دونوں حالات پر منحصر ہیں۔ میں چور نہیں ہوں لیکن کبھی کبھار کوئی چیز چرا لینے میں بھی مجھے عار نہیں۔ میں زندگی کے ہر پہلو سے آشنا ہوں لیکن صراط مستقیم کے مقابلے میں پرپیچ راہیں مجھے زیادہ پسند ہیں۔ میں جنوب کی سمت چلتا ہوں تو مجھے فوراً شمال کا خیال آتا ہے اور شمال کی طرف جاتا ہوں تو دفعتاً میرا رخ جنوب کی طرف ہو جاتا ہے۔

"ایمان مجھے کھینچے ہے تو روکے ہے مجھے کفر"

کچھ اس قسم کے تضاد میری شخصیت کی سرشت میں ہیں۔ میں شیکسپیئر کا ظریف کردار فالسٹاف ہوں۔ اگر آپ مجھے جانتے اور پہچانتے ہیں تو آپ ظرافت اور ظرافت کی شریعت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ آپ نے ڈان کوئزو کا نام بھی سنا ہوگا اس میں اور مجھ میں بیّن فرق ہے۔ میں ظریف کردار ہوں وہ ظریفانہ کردار ہے۔ جو بات میری فطرت ہے وہ اس کی فضا ہے اور یہی بات خوجی میں بھی ہے۔ میں فریب میں مبتلا ہوں یہ خود ظریف نہیں ہیں۔ اپنے حماقتوں کی بدولت ایک خاص فضا میں پہنچ کر ظرافت کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ میں واقعات پیدا کرتا ہوں یہ واقعات میں محصور ہیں۔ میں بھی ایک حد تک غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہوں لیکن میرے مبالغے میں فنی واقعیت ہے۔ یہ دونوں بھی ایک حد تک غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہیں لیکن ان میں فنی واقعیت کی کمی ہے اور اسی لئے کچھ مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔

یہ باتیں میں نے فالسٹاف کی زبانی ادا کی ہیں۔ اب آپ تھوڑی دیر کے لئے فالسٹاف کو غائب اور مجھے حاضر ناظر مان لیں۔ تو مشکل آسان ہو جائے۔ ہمارے ادب میں بالخصوص نثر میں طنز و ظرافت کی روایت پرانی نہیں اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہمارا ادب ہی کچھ ایسا پرانا نہیں۔ اردو نثر نے اپنے فنی شرائط کے ساتھ انیسویں صدی کے آغاز میں جنم لیا۔ اس کا جنم ہنگامی دور میں ہوا لیکن اس کو جنم دینے والے وہ لوگ تھے جو نغمہ کو "اندوہ ربا" کہتے تھے۔ خیالات

اور جذبات میں قدیم معاشرت کی آسودگی یعنی زمانہ واقفیت، تجزیہ اور استدلال کا تقاضا مغرب کا اثر غیر شعوری طور پر زندگی کے ہر گوشے پر پڑ رہا تھا لیکن چونکہ ابھی تک قدیم اور جدید متوازی چل رہے تھے۔ اس لئے نثر بھی کچھ عرصہ تک قدیم اور جدید کے دام میں گرفتار رہی جس کی بہترین مثال "باغ و بہار" اور "فسانہ عجائب" ہیں لیکن آہستہ آہستہ مغرب کا اثر دل و دماغ تک پہنچ گیا۔ سیاست بدلی تو اخلاق اور عقائد میں تزلزل پیدا ہوا۔ شاعری کے موضوعات بھی تبدیل ہوئے اور معاشرت کے اندرون میں وہ تصادم رونما ہوا جو طنز و ظرافت کا اصل الاصول ہے۔ غدر کے بارہ سال بعد غالب کے خطوط اور نذیر احمد کی "مراۃ العروس" شائع ہوئے۔ اور ان کے پانچ سال بعد یعنی ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" مشرق و مغرب کے تصادم کا پہلا مظہر ہے اس کے لکھنے والوں میں چار حضرات کے نام سرفہرست ہیں۔ رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین، نواب آزاد اور اکبر الہ آبادی' ان سب کی منزل ایک ہے اور وسیلہ سفر بھی ایک ہے۔ لیکن صلاحیت اور موضوع کے حدود میں فرق ہے۔ اسی لئے ان کے تخلیقی کارنامے' فنی ہیئت' مجموعی اثر اور قوت حیات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اودھ پنچ کے بارے میں رشید صاحب کا خیال ہے کہ وہ معاشرت میں قدامت اور سیاست میں جدیدیت کا قائل تھا۔ اس تنقید کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ "اودھ پنچ" کے نصب العین میں توازن کی سخت کمی تھی۔

بہرحال یہ مسئلہ بہت طویل ہے اور یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ بحیثیت مجموعی "اودھ پنچ" کی ظرافت میں گہرائی اور طنز میں گیرائی کی کمی ہے۔ لیکن ہمیں زمانہ کی پابندیوں اور مجبوریوں کو ذہن سے یکسر محو نہیں کر دینا چاہیے "اودھ پنچ" کی ظرافت ثقیل ہے مگر نمک سے خالی نہیں۔ کہیں کہیں عریاں ہے مگر پھر بھی ناگوار نہیں ہوتی۔ الفاظ کی بازی گری ہے۔ لیکن اس میں فطری روانی بھی ہے وہ قہقہوں سے فروغ پاتی ہے۔ لیکن بدسلیقہ نہیں۔ اس کا طنز تیز ہے لیکن زہرناک نہیں۔ اس میں یکسانیت ہے مگر ہر چار قدم کے بعد فضا کچھ اس طور سے بیدار ہوتی ہے جیسے اندھیرے میں یک بہ یک جگنو چمک اٹھے ہوں۔ "اودھ پنچ" کے صفحات میں آپ کو موضوعات کی رنگارنگی "الفاظ کی کثرت، خیالات و جذبات کی بے جا فراوانی' کمتر مسکراہٹوں اور بیشتر قہقہوں کی وہ طغیانی نظر آئے گی کہ الامان' اور ایسا معلوم ہوگا کہ فطرت نے خزانوں کے در کھول دیئے ہیں اور یہ ساری دولت بے ضرورت اور بے خیال لٹائی جا رہی ہے۔

سجاد حسین کا سیاسی طنز دلچسپ ہے مگر سطحی ہے وہ محاورات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں' واقعہ اور خیال سے کم، مگر کہیں کہیں ان کی طبعی خوش دلی طنز میں وہ شادابی اور جدت پیدا کرتی ہے کہ دھوپ میں بوندیں پڑنے کا سماں دکھائی دے جاتا ہے۔ ان کی شہرت کا دارومدار ان کے ناول "حاجی بغلول" پر ہے جو ڈکنس کے "پک وک ابراڈ" (Pick Wick ABROAD) کا چربہ ہے۔ ڈکنس کی بساط بہت وسیع ہے۔ سجاد حسین کی بساط محدود ہے۔ ڈکنس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا کردار زندہ اور واضح ہے۔ یہ بات سجاد حسین کو نصیب نہیں پھر بھی اس میں شگفتہ ظرافت ہے۔

"اودھ پنچ" کے دوسرے کامیاب رکن نواب آزاد ہیں جن کے متعلق رشید صاحب کی رائے یہ ہے کہ

> "نواب آزاد نے جس دل نشین اور معقول پیرائے میں طنز کی ہے اس کا جواب
> بہ حیثیت مجموعی اردو ادب میں ملنا دشوار ہے۔"

یہ رائے قطعی طور پر آخری ہے۔ ان کے طنز میں گہرائی بھی ہے اور شگفتگی بھی ہے۔ اس میں ظرافت ہے برہمی کا احساس اور غیظ و غضب نامعلوم حد تک کم ہے۔ ان کے وہ خطوط جو "لندن" سے لکھے گئے ہیں "بہت رواں، سادہ اور خیال انگیز ہیں۔ بیوی کو لکھتے ہیں۔

"میں تو یہاں پڑھنے آیا ہوں مگر کیا خاک کتاب دیکھوں، کوئی
آن، کوئی وقت، کوئی لحظہ بھی تو آئینۂ خیال کسی پری وش کے
جلوے سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگن کی وائٹ سلک
کی گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے مجھے تمہارا گرنٹ کا پاجامہ نفرت
سے یاد آجاتا ہے۔"

آزاد نے تعریفات کی ایک لغت بھی مرتب کی ہے جس میں عبید زاکانی اور ڈاکٹر جانسن کا تتبع کیا گیا ہے لیکن ان کا سا ایجاز و اختبار پیدا نہیں ہو سکا۔ بعض تعریفیں دلچسپ ہیں مثلاً:

تعلیم نسواں = عام جلسوں میں اپنی بہو بیٹیوں کو لے جانا
یا پارلیمنٹ = وہ پالی جہاں کے اصیل اور ٹمینی دونوں کڑے

سجاد حسین اور نواب آزاد نے جو کچھ لکھا ہے نثر میں لکھا ہے، اکبر نے نظم میں لیکن اکبر کی وسعت نظر، فنی شعور اور جذبہ کی شدت ان میں سے کسی کے حصے میں نہیں۔ ان عناصر اربعہ میں رتن ناتھ سرشار ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں ان کی مشہور داستان "فسانۂ آزاد" تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسے دیوزاد کا کارنامہ ہے جس سے دنیا نے انکار کر دیا، جس نے خود کبھی اپنے آپ کو نہ سنبھالا اور جو اپنے افسانہ کے ہیرو کو بھی نہ سنبھال سکا۔ لیکن اس کے باوجود ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آزاد، رتن ناتھ سرشار کی مخلوق ہے لیکن مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خالق و مخلوق میں پردے حائل نہ تھے آزاد مشرقی ہے لیکن مغرب کی ہر چیز کا استقبال کرتا ہے۔ اس میں خیال اور عمل کی بے پناہ قوتیں ہیں۔ لیکن چونکہ ماحول میں ان کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے وہ لاابالی ہو گیا ہے وہ زندگی کے ہر پہلو سے آشنا ہے۔ اور بیشتر تعمیری تنقید کرتا ہے اور اس تنقید میں صحت مند طنز بھی ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کو خود پر قابو حاصل نہیں ہے اس لئے الفاظ اور جذبات دونوں کو فراخ دلی سے لٹاتا ہے وہ مذہب، مکتب، میکدہ اور محلسراؤں کے ہر گوشے کو چھو کر دیکھتا ہے اور دیکھ کر چھیڑتا ہے اور جب لکھنؤ کی محدود معاشرت میں اس کی قوت عمل کا اظہار نہیں ہو پاتا تو وہ عشق کر بیٹھتا ہے اور گرفتار بلا رہنے کے بعد روم و روس کی جنگ میں شریک ہوتا ہے اور آخر میں پرانی داستانوں کے ہیروؤں کی مثال بن جاتا ہے۔ جس کے معنی خیال کی وسعت اور میدان کی تنگی کے ہیں۔ آزاد اس زمانے کی معاشرت کا دماغ اور رتن ناتھ سرشار کا ہمزاد ہے۔ خوجی ظریفانہ کردار ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں وہ خاص واقعات میں محصور ہو کر ہی ظریف معلوم ہوتا ہے وہ ہر جگہ ظریف ثابت نہیں ہو سکتا۔

میری رائے میں خوجی لکھنؤ کی وہ قدیم معاشرت ہے جو اپنی آخری سانسیں پوری کر رہی ہے۔ اس میں روحانی

قوت کا فقدان ہے۔ جس کی کمی توہم پرستی سے پوری ہوتی ہے۔ اعتماد کی کمی ہے جس کی تلافی بے جا فخر سے ہوتی ہے۔ وہ صحت مندانہ خواہشوں سے محروم ہے۔ اس لیئے بھبنوں کا استعمال ناگزیر ہے۔ اس کے لیئے گزرا ہوا زمانہ چاند کا غار، حال صبح کاذب اور مستقبل ٹوٹا ہوا ستارہ ہے۔ اس لیئے زندگی خود فریبی کے سہارے گزرتی ہے۔ سرشار نے خوجی کا کردار بڑی خوبی سے تراشا ہے۔ ڈان کوئزد میں یہ حوصلہ تھا کہ پن چکی پر نیزہ سے حملہ کرے۔ خوجی ذرا ذرا سی بات پر اپنی قرولی مانگتے ہیں جو لکڑی کی ہے ،محض کھوکھلا، ہے، کبھی کام نہیں آتی، ہمیشہ ادھر ادھر چھوڑ جاتے ہیں اور وقت پڑنے پر زور سے پکارتے ہیں۔ لانا میری "قرولی" وہ کبھی نہیں لائی جاتی، اس سے کبھی وار نہیں ہوتا، وہ محض واہمہ ہے۔ خوجی حرکات اور سکنات سے الفاظ اور مبالغے سے اور کبھی کبھی معصومیت کا لباس پہن کر ظرافت پیدا کرتا ہے لیکن اس کے ظریف ہونے کا راز اس کی خود فریبی اور اس کے ماحول میں ہے۔ مثال ملاحظہ ہو!

> "حضور بات یہ ہوئی کہ غلام لب چشمہ سار ایک پیالی میں افیون گھول رہا تھا کہ بس درخت کی طرف نظر کرتا ہوں تو نور کا عالم۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ یا خدا کیا اسرار ہے۔ غور کر کے دیکھتا ہوں تو روشنی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ چنار کا درخت ہے مگر دم کے دم میں ہمارے حضور صف شکن پھر سے آن کر ہاتھ پر بیٹھ گئے۔

بہر حال فسانۂ آزاد کے حدود افق سے جا ملتے ہیں۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جس کا رشتہ انسان، خدا اور ماحول سے ہے لیکن اس میں کچھ واضح اور جاندار ہے اور بہت کچھ دھندلا اور بے جان ہے۔

۱۹۱۲ء میں پنچ بند ہو گیا، دو سال بعد شیخ ممتاز حسین نے اسے پھر زندہ کیا۔ اس بار لکھنے والوں میں صرف ایک شاعر کا نام یاد رکھنا چاہیئے اور وہ سید مقبول حسین ظریف ہیں جنہیں محاکات میں کمال حاصل ہے۔

ریاض الاخبار کے ساتھ ریاض خیرآبادی نے دو مزاحیہ رسالے "فتنہ" اور عطرِ فتنہ" کے نام سے نکالنے شروع کئے جن کا مقصد انقلاب یا اصلاح نہیں آسودگی تھا۔ ان کے بارے میں یہ تبصرہ کافی ہے ؎

بلبل چہک رہا تھا ریاض جمال میں

آپ چاہیں تو اس جمال کو فریب بھی کہہ سکتے ہیں۔

مغربی تعلیم اور مغربی ادب کا اثر بڑھتا رہا اور روز بروز گہرا ہوتا چلا گیا۔ انقلاب فرانس کی تاریخ اور روسو والٹر کی تحریریں خواص میں عام طور سے مقبول ہوئیں۔ قومیت کا وہ جذبہ جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا کی سیاست اور قوموں کے اخلاق کا محرک تھا، تعلیم یافتہ طبقہ کا دین و ایمان ہو گیا۔ آزادی اور جمہوریت کے تصورات ٹام پین گوڈون اور اسپنسر اور اسٹورٹ مل کے واسطے سے درس گاہوں میں نفوذ کر گئے۔ ذہنی آزادی اور قومی تشخص اور اپنے تہذیبی سرمائے کو کھنگالنے پرکھنے اور پیش کرنے کا حوصلہ اور تصور پیدا ہو۔ طنز و ظرافت میں ایک بنیادی تبدیلی یہ ہوئی کہ خیال جائز

اب معاشرت اور سیاست ہی نہیں بلکہ ذہنی اور اخلاقی اور مابعد الطبیعیاتی قدریں بھی طنز و ظرافت کا مواد اور نشانہ بن گئیں تیسرے یہ کہ انگریزی، فرانسیسی اور روسی ادب کے اسالیب اور موضوعات سے ہمارا ادب متاثر ہونے لگا۔ چوتھے یہ کہ ایک آفاقی نقطۂ نظر بھی پیدا ہونے لگا۔ اس پیچیدہ تحریک کو سمجھنے کے لئے جنگ عظیم تک لکھنے والوں کے تین گروہ ذہن میں رکھیے۔ سجاد انصاری، مہدی افادی اور قاضی عبد الغفار، دوسرے میر محفوظ علی اور عبد الماجد دریابادی، تیسرے ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں۔

سجاد انصاری اور مہدی افادی کی تحریروں میں اگرچہ اتنا ہی فرق ہے جتنا فلسفہ اور شاعری میں، لیکن ان کے یہاں انسانی اور آفاقی قدریں ملتی ہیں، یہ کسی محدود نقطۂ نظر کے قائل نہیں، امارت کے خلاف ہیں، وہ امارت عقیدے کی ہو، علم کی ہو یا پرہیزگاری کی۔ یہ دونوں حسن کی امارت کے قائل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سجاد انصاری کے خیال میں قرۃ العین کو شہید نہ کرنا چاہیے اور مہدی افادی کے خیال میں عورت چھونے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ایک طنز نگار ہے، دوسرا بذلہ سنج اور خوش مذاق۔ دونوں نفاست کے قائل ہیں اور مولوی کے دشمن، دونوں کے یہاں تکنیک ہے، دونوں چھوٹے پیمانے پر تصویریں بناتے ہیں اور اپنے فن میں کمال رکھتے ہیں۔ سجاد مشرق اور مغرب دونوں کی شراب ملا کر پیتے ہیں۔ مہدی مشرق کے آب و انگور سے پرتگالی شراب بناتے ہیں، فرد کی آزادی، عقیدہ کی آزادی اور حسن پرستی ان کی بہترین قدریں ہیں اور ان کے خلاف جو کچھ ہے وہ ان کے طنز و ظرافت کا نشانہ ہے۔

قاضی عبد الغفار کا طنز مغرب کی سیاست اور مشرق کے اخلاق پر ہے لیکن ان کے طنز میں تبلیغ کم اور ترغیب زیادہ ہے۔ خطابت نہیں ہے۔ دلاسائی ہے ہیجان نہیں ہے ضبط ہے اور طنز نگار کی حیثیت سے انہیں عبد الماجد اور ظفر علی خاں پر ترجیح حاصل ہے۔ "نقشِ فرنگ" میں طنز کا موضوع وہی مغرب کی سیاست اور مشرق کا اخلاق ہے، سیاست کی ریاکاری اور اخلاق کی زبوں حالی ہے۔ لیکن "لیلےٰ کے خطوط" میں وہ سجاد انصاری اور مہدی الافادی کے ہم جلیس ہو جاتے ہیں اور ان پر نئے شعور اور چبھتے ہوئے اسلوب کا اضافہ کرتے ہیں۔ ان کا طنز آفاقی ہے۔ وہ بھی حسن پرست ہیں۔ نفاست پسند ہیں۔ عقیدہ، زہد، علم اور دولت کی امارت کے خلاف ہیں۔ مشرقیت اور مغربیت کا خوشگوار امتزاج چاہتے ہیں۔ انہوں نے ایک ایسی طوائف کی تصویر کھینچی ہے جو ماں، بہن اور بیوی بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ ہمیں "یاما دی پٹ (YAMATHE PITT)" کی جینی (JENNY) سے خیال کے لحاظ اور کردار کے لحاظ سے کچھ پھیکی معلوم ہوتی ہے "لیلیٰ کے خطوط" میں محدود معاشرتی اور اقتصادی حد بندنظر نہیں ہے اور اس لئے قاضی عبد الغفار، میر محفوظ علی اور عبد الماجد سے برتر ہیں۔ یوں ان سب حضرات کے طنز کا نشانہ انگریز، مغربیت، مغربی سیاست اور وہ یگانے ہیں۔ جو بیگانوں سے بدتر ہیں۔

میر محفوظ علی کا طنز مولویانہ ہے اور مقصد بھی وہی ہے۔ ان کے یہاں زاویۂ نظر محدود، واقفیت سطحی اور جذبات کا تنوع مفقود ہے۔ "شیخ سمار اللہ کی صاحبزادیاں" کامیاب نہیں ہے، پھر بھی کہیں کہیں اس ویرانہ میں جو ثقیل الفاظ اور غیر ضروری اظہار علمیت کے بگولوں کی زمین ہے، شگفتہ طنز نظر آتا ہے۔

ظفر علی خاں، صحافی ہیں۔ ان میں وہ ہمدردی نہیں جو وسعتِ علم سے پیدا ہوتی ہے۔ مغرب کی سیاست پر انہوں نے چند کامیاب طنزیہ عبارتیں لکھی ہیں۔

عبد الماجد دریا بادی کے طنز میں خشونت بھی ہے اور گریہ بھی۔ خشونت تیور میں پائی جاتی ہے اور گریہ تہ میں۔ ان کا طنز انتہائی سطحی، انتہائی محدود اور انتہائی بے جان ہوتا ہے۔ ان کے طنز کے بارے میں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ان کی نیت بخیر ہے۔ دیکھئے، میں نے نیت شب بخیر نہیں کہا ہے۔ ممکن ہے آپ غلط فہمی میں پڑ جائیں۔

ابوالکلام آزاد کی معلومات میں شبہ نہیں، شخصیت کی عظمت میں شبہ نہیں، ان کی زبان میں کلام نہیں۔ ان کی زبان عہد نامہ عتیق کی زبان ہے۔ ان کا طنز بھی عہد نامہ عتیق کا طنز ہے۔ جس میں ہیجان، خطابت اور ظاہری شان و شوکت سبھی کچھ ہے وہ اعصاب پر مسلط ہو جاتی ہیں، مرعوب کن ہیں۔ ان کے طنز میں تیزی بھی ہے اور تلخی بھی۔ ان میں آفاقیت بھی ہے اس لیئے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ علی گڑھ، شملہ کانفرنس اور اس قسم کی دوسری تحریریں زبان و بیان کی چٹانیں ہیں۔ جن میں طنز کا لہو گردش کر رہا ہے۔

اس منزل پر پہنچ کر ہم ان ظرافت نگاروں کے حلیے پر ایک نظر ڈال سکتے ہیں جو ہم سے قریب ہیں اور جن میں سے بعض نے صحیح معنی میں اردو کو ظرافت، ظرافت کو ادبی رنگ اور ادبی رنگ کو آفاقیت بخشی ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں غلط مبحث نہ ہو جائے۔ اس لیئے ملا رموزی، عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی پر ایک نظر ڈالتے چلئے۔ اور فرحت اللہ، رشید صدیقی اور پطرس کو تھوڑی دیر کے لیئے بالائے طاق رکھ دیجئے۔

ملّا رموزی خیالات کے لحاظ سے قدامت پرست اور زبان کے لحاظ سے ازل پرست ہیں، گلابی اردو لکھتے ہیں لیکن لکھنے میں روانی اور اسلوب میں جان ہوتی ہے۔ کچھ مضامین گلابی اردو سے بچ کر بھی لکھے ہیں۔ وہ بیشتر زبان سے کمتر واقعہ سے اور شاذ و نادر خیال سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ ان کا موضوع وہی پامال مشرقیت ہے جنہیں ان کی نظر میں مذہب کا درجہ حاصل ہے۔ مغربیت کی سطح پر نظر ڈالتے ہیں اور کائنات کو خدا کی مخلوق نہیں سمجھتے۔ الفاظ بنانے اور ترکیبیں وضع کرنے پر کافی توجہ صرف کرتے ہیں مگر بیشتر ایجاد بندہ کی مثل صادق آتی ہیں۔ ان میں فنی ضبط کی شدید کمی ہے۔ ورنہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ ان کی ظرافت ادب میں اچھی جگہ پاتی۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "زندگی" ہے، جس میں بیوی، مشاعرہ، ریل کا سفر اور کئی مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے بعض اچھے ہیں۔ ان کا طنز ضرورت سے زیادہ واضح اور ان کی ظرافت زبان کی بدولت فطری ہونے کے باوجود مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔

عظیم بیگ چغتائی کھلنڈرے ہیں۔ انہیں ہر بات میں ہنسی کا پہلو اور ہر واقعہ میں مضحک بات نظر آجاتی ہے۔ خود ہنستے ہیں اور دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ وہ خیال کی آفت سے بری ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ ذہنی کاوشوں کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھتے۔ واقعہ میں ان کے لیئے وہ سب کچھ ہے جو اناطول فرانس کے لیئے مذہب ہیں اور مولوی کے لیئے شیطان میں ہے۔ ہلکی پھلکی پیروڈیاں لکھتے ہیں لیکن ان میں جوانوں کی زندگی کی جوانی کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں کولتار چمکی، فل بوٹ، کھرپا بہادر اور اس قسم کی دوسری کتابیں اور مضامین ان بالغوں کے لیئے لکھے ہیں جو بلوغت کی حسرت

ہیں مر گئے یا پھر ان لوگوں کے لئے جنہیں پیر نابالغ کہتے ہیں۔ بہر صورت ریل کے سفر میں وقت گزارنے کے لئے اچھے ہیں۔

شوکت تھانوی نام سے پیرزادے، صورت سے نوجوان اور تحریر سے کبھی کبھی افتاں وخیزاں اور کہیں کہیں رواں دواں معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں زبان کا مزا بھی ہے، واقعہ کا بھی اور خیال کا بھی۔ ان میں برتری کا احساس بھی نہیں جو ملا رموزی کی دنیا اور آخرت میں ہے نہ وہ اصلاحی جذبہ ہے جو پڑھنے والے کو دنیا اور آخرت دونوں سے بیزار کر دیتا ہے نہ خیال کی وہ پیچیدگی ہے جو رشید صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ روزانہ کے معاملات، اشخاص کے کردار اور واقعات کے موزوں انتخاب سے کام لیتے ہیں اور بعض چھوٹی چھوٹی باتوں سے وہ طنز پیدا کرتے ہیں۔ جس میں ظرافت ہوتی ہے اور وہ ظرافت جو محض دل بہلانے کے لئے ہوتی ہے "بُرے بھلے" اور "شیش محل" ان کی قابل قدر کتابیں ہیں۔

فرحت اللہ بیگ ماضی کو حال میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ حال میں مستقبل کا جلوہ دیکھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ مشرقیت کے دلدادہ ہیں۔ وہ اشخاص سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ لیکن ہمدردی میں شگفتہ تنقید کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ان کی زبان ظرافت کی جان ہے۔ فرحت اللہ محاوروں سے وہی کام لیتے ہیں جو رشید صدیقی قول محال (PARA DOX) سے لیتے ہیں۔ ان کی مرقع نگاری اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ "نذیر احمد کی کہانی" "پھول والوں کی سیر" "آخری وصیت" ان کے نمایاں کارنامے ہیں۔

پطرس روزمرہ زندگی کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہیں وہ تماشا دیکھتے ہیں۔ خود کبھی تماشا نہیں بنتے۔ ان کے یہاں ذہنی کش مکش کا عنصر بہت کم ہے لیکن ان کی ظرافت میں خوشگوار طنز اور ان کے طنز میں گہری انسانیت ہے انہوں نے استاد، طالب علم، دوست، بیوی، سیاست اور شہریت پر انتہائی لطیف انداز میں تنقید کی ہے جو عام انسانی تجربوں پر مبنی ہے اور اس کے باوجود خاصہ کی چیز ہے۔ ان کی سادگی میں کبھی کبھی سعدی کی گلستان کا مزا آجاتا ہے۔

"کتے" "سائیکل" "استاد" اور "لاہور کا جغرافیہ" ان کے اچھے مضامین ہیں۔ لیکن ہر مضمون واقعیت، حسن تعبیر اور دھیمی ظرافت کی بدولت ہزار ظریفانہ مضامین کا حریف ہے۔ غالب کے بعد زیر لب تبسم کی شانِ محبوبی پطرس کا حصہ ہے۔

رشید احمد صدیقی کے فن اور ان کے خیال میں پیچیدگی ہے لیکن ان کا مطالعہ غیر ضروری نہیں " ان کے طنز میں پہلی نظر میں ظرافت کا، دوسری میں بلاغت کا اور تیسری میں انفرادی اور اجتماعی شامت کا احساس ہوتا ہے اور بعد میں یہ تینوں مل کر آسیب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

رشید صاحب میں "سوئفٹ کی تیزی، اناطول فرانس کا کنایہ اور ڈکنس کی خوش طبعی" نہیں ہے۔ البتہ قول محال کی برجستگی ان کا حصہ ہے۔ بات میں سے بات نکالنا اور ہر بات میں نئی بات پیدا کرنا ان کا فن ہے۔ ہارنے کے باوجود زندگی گزارنا اور خوش دلی سے زندگی پر فتح پانا، رشید صاحب کے بہترین مضامین کی بہترین قدریں ہیں۔ وہ ہر اس چیز پر طنز کرتے ہیں جو فرد کی آزادی، سکون اور آسودگی کو تباہ کرتی ہے۔ وہ پولیس ہو یا گواہ، ڈپٹی کلکٹر ہو یا مزدور، مولوی ہو یا سیاستدان

ایڈیٹر ہو یا استاد، فن کار ہو یا روشن خیال بیوی، شاعری ہو یا عدم تعاون اپنی کمزوری ہو یا دوسروں کی حماقت۔ ان کی بہترین کتابیں "مضامین رشید" اور "گنجہائے گرانمایہ" ہیں۔

رشید صاحب کا صرف ایک جملہ یاد رکھیے!

"اس زمانے میں لوگ اپنی کمزوریوں اور دوسروں کی بیویوں کو آرٹ سمجھتے ہیں۔"

اس ایک جملہ میں ان کی شخصیت، بصیرت اور فن سب کچھ ہے۔

چچا چھکن امتیاز علی تاج کے قلم کا مرہونِ منت ہے یہ J. K. JEROME کی مخلوق کا چربہ ہے۔ یہ مضامین گاہے گاہے شائع ہوئے ان کا مکمل مجموعہ ابھی تک پردہ غیب میں ہے۔ یہ مرقعے ہلکی پھلکی، رواں اور شگفتہ زبان میں لکھے گئے ہیں اور بقول سرور صاحب اگرچہ دوسروں نے بھی اور یہاں دوسروں سے مراد اغیار نہیں ہیں، اس کردار کے خاکے اڑائے مگر مولوی مدن والی بات کسی کو نصیب نہ ہوئی۔

تاج کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس کردار کو ہندوستانی فضا، ہندوستانی لباس اور ہندوستانی مزاج میں ڈھال دیا ہے۔ چربہ اتارنے کا فن محمد حسین کے بعد اگر کسی کے حصے میں آیا ہے تو وہ امتیاز علی تاج ہیں۔ افسوس ہے کہ انہوں نے اظہارِ کمال کے لئے نئی وادیاں تلاش نہیں کیں۔

بہرحال ہمارے طنز و ظرافت پچھلے اٹھتر برس میں نشوونما کی بہت سی منزلوں سے گزرے۔ چند لکھنے والوں نے ان میں اپنے ماحول کی بیدار، بے باک اور بے لوث ترجمانی کی۔ رتن ناتھ سرشار کے زمانے میں اس فن کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ اکبر نے اسے فنی نقطہ نظر سے معراجِ کمال کو پہنچایا۔ ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار نے اسے حقائق سے لبریز کیا۔ فرحت اللہ نے اسے پیار کیا، بطرس اور رشید صدیقی نے اسے خوش سلیقگی سے برتا۔

لیکن ابھی تک ایک مربوط اور عظیم کارنامے کی کمی ہے۔ ممکن ہے یہ اسی قسم کی خواہش ہو جو مولانائے روم کو تھی سے

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مزاح اور مزاح نگاری

وزیر آغا

سنجیدگی کائنات کی ازلی و ابدی خصوصیت ہے اور اس کے تمام اجزا میں ایک برقی رو کی طرح سرایت کر چکی ہے نتیجتہً کائنات کا ہر واقعہ کسی مجبور ستارے کی اڑان سے لے کر کڑی کے جالے کی تعمیر تک اور زندگی کی ہر رو جنسی کشش کی پراسرار تپش سے لے کر بیج کی حرارت پنہاں تک ایک عجیب سی سنجیدگی سے ہم آہنگ ہے۔ زندگی مجموعی طور پر ایک تیز رہوار کی طرح دشت و جبل اور بحر و بر کو عبور کرتی کسی نامعلوم منزل کی طرف اس والہانہ انداز سے بڑھ رہی ہے کہ ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ایسی سنجیدہ کائنات اور ایسی منہ زور زندگی کے زیر سایہ انسان کا سنجیدہ کاوشوں اور ٹھوس تعمیری کاموں میں یکسر منہمک ہو جانا ایک بالکل فطری امر ہے تاہم یہاں یہ خطرہ ضرور ہے کہ سنجیدہ زندگی کا ایک انتہائی سنجیدہ جزو ہونے کے باعث اس کی انفرادیت کہیں یکسر ختم نہ ہو جائے اور وہ محض ایک مشین کی طرح فطرت کے اشاروں پر ناچتا چلا جائے۔ خوش قسمتی سے قدرت نے انسان کو ایک ایسی قوت بھی بخشی ہے جس سے کام لے کر وہ کائنات کی خوفناک سنجیدگی اور زندگی کی صبر آزما کشمکش پر ہنس سکتا اور یوں مسکرا کر بلکہ قہقہہ لگا کر اپنی اس دیوانہ وار پیش قدمی میں دھیما پن پیدا کر سکتا ہے جو زندگی کے تیز بہاؤ سے ہم آہنگ ہے۔

چنانچہ زندگی کی بے رحم سنجیدگی اور ماحول کی ٹھوس مادیت جو قریب قریب ہر شے کو اپنے فولادی بازوؤں میں جکڑے ہوئے ہے۔ انسان کے احساسِ مزاح کی حدت سے پگھل کر لچکیلی اور ملائم ہو جاتی ہے۔ یہ احساسِ مزاح ماں کے اس لطیف و دلنواز تبسم کی طرح ہے جو بچوں کی طفلانہ کاوشوں اور "ٹھوس تعمیری کارناموں" کے پیش نظر نمودار ہوتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ماں کا تبسم تو بچوں کو مزید انہماک کی ترغیب دیتا ہے لیکن احساسِ مزاح کے طفیل انسان ایک لحظہ رک کر اپنی "سنجیدہ کاوشوں اور جذباتیت سے سینچی ہوئی قدروں پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ اور اسے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ لامحدود و لازوال کائنات میں یہ کاوشیں اور قدریں کتنی معمولی حیثیت کی حامل اور کتنی طفلانہ صورت کی امین ہیں۔ مشہور لطیفہ ہے کہ کسی نے ہائیڈروجن بم کے بارے میں پروفیسر آئن سٹائن سے اس کے خیالات دریافت کئے تو آئن سٹائن نے مسکرا کر جواب دیا

> "ہائیڈروجن بم سے ہماری زمین کے تباہ ہو جانے کا قطعاً کوئی امکان نہیں اور بالفرض اگر یہ
> تباہ ہو بھی گئی تو اس سے اتنی بڑی کائنات میں قطعاً کچھ فرق نہیں پڑے گا

یہ احساسِ مزاح اور اس کے مظہر یعنی تبسم، ہنسی اور قہقہہ ہی دراصل ہمیں اس سنجیدہ کائنات میں زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں اور انہی کے سہارے ہم زندگی سے سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مگر ایک اور طرح بھی یہ احساسِ مزاح انسانی زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کا ذمہ دار ہے وہ اس طرح کہ انسان کائنات میں سب سے بڑا خواب پرست ہے اور اکثر و بیشتر اپنی امنگوں اور آرزوؤں کے تانے بانے سے ایک ایسا رنگ محل تیار کر لیتا ہے جس کی اساس محض خوابوں پر قائم ہوتی ہے اس کے برعکس زندگی خواب ہو یا نہ ہو ایک سپاٹ اور ٹھوس حقیقت ضرور ہے۔ چنانچہ جب اس کی امنگوں اور آرزوؤں کے رنگ محل اس کرخت اور خوفناک حقیقت سے زود یا بدیر ٹکراتے ہیں تو کائنات کی سب سے زیادہ بے بس اور غم زدہ ہستی بن جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی خودکشی کے ذریعے اپنی غمگین زندگی کا خاتمہ کرنے پر بھی تل جاتا ہے۔ احساسِ مزاح کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کی بے لگام آرزوؤں، منہ زور امنگوں اور پُراسرار خوابوں پر تبسم انداز سے تنقید کرے اور یوں اسے حقائق کی کرخت اور خوفناک صورت دکھا کر اس شدید مایوسی سے بچا لے جو اس کی خوابوں کی منزل پر ہمیشہ سے اس کی منتظر ہے اور جس سے اس کا بچ نکلنا ایک امرِ محال ہے۔ دیکھا جائے تو احساسِ مزاح کا یہ کارنامہ ایک بہت بڑی انسانی خدمت ہے۔

زندگی کی کرخت سنجیدگی سے انسان کو بچانے اور اسے شکستِ خواب سے بیدار ہونے والے ناقابلِ برداشت صدموں کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے کے علاوہ احساسِ مزاح کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا وجود سوسائٹی کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ وہ مثل کہ "ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دنیا۔ بیٹھ اکیلے رونا ہوگا"[1] اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ مزاح کے طفیل انسان اور انسان کے درمیان ایک ناقابلِ شکست رشتہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ عام زندگی میں بھی دیکھئے کہ ہنسی ایک متعدی بیماری کی طرح پھیلتی ہے اور جہاں چند لوگ ہنس رہے ہوں وہاں راہگیر بے جانے بوجھے بھی ان کی ہنسی میں شریک ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہنسی نہ صرف افراد کو باہم مربوط ہونے کی ترغیب دیتی ہے بلکہ ہر اس فرد کو نشانۂ تمسخر بھی بناتی ہے جو سوسائٹی کے مروجہ قواعد و ضوابط سے انحراف کرتا ہے دیکھا جائے تو مزاحیہ کردار صرف اس لئے مزاحیہ رنگ میں نظر آتا ہے کہ اس سے بعض ایسی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں جن سے سوسائٹی کے دوسرے افراد محظوظ ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ایسا کردار چچا چھکن کی طرح اپنی اس عینک کی تلاش کرے جو اس نے اپنی ناک پر لگا رکھی ہو۔ تو خواہ مخواہ اس پر ہنسنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ قدیم قبائل میں اجنبیوں کے لباس، گفتار اور عادات و اطوار کو نشانۂ تمسخر بنانے کی جو بے شمار مثالیں ملتی ہیں وہ اسی زمرے میں شامل ہیں دراصل ہنسی اس فرد کا مذاق اڑاتی ہے جو سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے ذرا بھی بھٹکے اور اس غرض سے اڑاتی ہے کہ وہ پھر سے اس لکیر میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ یہ بات ہنسنے والوں کے لئے تو باعثِ انبساط ہوتی ہے لیکن اس فرد کو رنج و ندامت سے ضرور ہمکنار کرتی ہے جس کے خلاف یہ عمل میں آئے۔ بہرحال یہ بات طے ہے کہ ہنسی ایک ایسی لاٹھی ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا گلہ بان محض غیر شعوری طور پر ان تمام افراد کو ہانک کر اپنے گلے میں دوبارہ شامل کرنے کی سعی کرتا دکھائی دیتا ہے

---

[1] ہنری برگساں لافٹر صفحہ ۱۷۷ (HENRY BERGSON – LAUGHTER P. 177.)

جو کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے گلے سے علیحدہ ہو کر بھٹک رہے تھے۔ یعنی ہنسی ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے سوسائٹی ہر اس فرد سے انتقام لیتی ہے جو اس کے ضابطہ حیات سے بچ نکلنے کی سعی کرتا ہے۔ سماجی لحاظ سے ہنسی کا یہ پہلو اس لئے زیادہ اہم ہے کہ اس کی بدولت سوسائٹی ان تمام بیرونی لیکن مضر اثرات سے محفوظ رہتی ہے جن کو یہ نشانۂ تمسخر بناتا ہے۔ اس کے علاوہ ہنسی ان تمام اندرونی نقائص کے استیصال کی طرف بھی توجہ دلاتی ہے جو مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اُردو ادب میں اکبر الہ آبادی کے ہاں مزاح کا جو افادی پہلو بڑے نمایاں انداز میں کارفرما نظر آتا ہے وہ ہنسی کے اسی اصلاحی رجحان کی غمازی کرتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کائنات پر سنجیدگی مسلط ہے۔ اور یہاں ہر ذی روح سنجیدہ زندگی کے پُراسرار اشاروں پر سرگرم عمل ہے۔ انسان کی امتیازی خصوصیت البتہ یہ ہے کہ وہ اس سنجیدگی کو چند لمحات کے لئے یوں ہی سانپ کی کینچلی کی طرح اتار پھینکتا ہے۔ اور ہنسی جیسے خالص حیاتیاتی تعیش (BIOLOGICAL LUXURY) سے زندگی کے کھردرے کناروں کو ہموار کر لیتا ہے مگر ہنسی سے جو مسرت اسے حاصل ہوتی ہے وہ آرٹ اور فلسفے سے حاصل شدہ مسرت سے اس حد تک مختلف ہوتی ہے کہ اس سے ساتھ عضویاتی مظاہر بھی شریک کار ہوتے ہیں۔ آرتھر کوسلر کے الفاظ میں۔

> ”خیالات و احساسات ایک خوبصورت تصویر کو دیکھ کر یا ایک اعلیٰ نظم پڑھ کر ہمارے دلوں میں ضرور متحرک ہوتے ہیں لیکن ایسا خاص عضویاتی مظاہرہ پیدا نہیں ہوتا جو ہنسی کے وقت معرضِ وجود میں آتا ہے اور یہ چیز محض ہنسی سے مخصوص ہے کہ انسان ایک لطیفے کو سن یا پڑھ کر اپنے جذبات و احساسات کا اتنے نمایاں انداز میں اظہار کرتا ہے [1]“

ہنسی کے اس عضویاتی مظاہرہ کی تشریح کرتے ہوئے چارلس ڈارون رقم طراز ہے۔

> ”ہنسی کے دوران میں منہ کھل جاتا ہے اور ہونٹوں کے کنارے پیچھے اور اوپر کی طرف ہٹ آتے ہیں اسی طرح اوپر والا ہونٹ قدرے اوپر کو اٹھ جاتا ہے اور شدید ہنسی کے دوران میں تو سارا جسم کانپنے لگتا ہے، سانس میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے اور آنسو بہ نکلتے ہیں [2]“

اسی طرح پروفیسر سلی نے اپنی کتاب ”انجوائمنٹ آف لافٹر“ میں ہنسی کے تدریجی ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے اور خفیف تبسم، مسکراہٹ اور قہقہے کا ایک ہی کیفیت مدارج قرار دیا ہے لیکن اس سلسلے میں جی۔ وائی۔ ٹی۔ گریگ نے جو نکتہ پیدا کیا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ گریگ لکھتا ہے [3]

> ”دروازہ پر سے چھلانگ لگانے یا بندوق کی لبلبی دبانے سے ذرا قبل آپ ایک لمبا سانس لیتے ہیں اور پھر اسے اپنے سینے میں روکے رکھتے ہیں ہنسی کے وقت بھی آپ اسی

---

[1] ARTHUR KOESTLER – INSIGHT AND OUTLOOK, P. 3 & 4.

[2] CHARLES DARWIN – EXPRESSION OF EMOTNS, P. 208, 214.

[3] J.Y.T. GREIG – THE PSYCHOLOGY OF LAUGHTER & COMEDY P 214

طرح ایک لمبا سانس لیتے ہیں مگر اسے روکنے کی بجائے آواز کے چھوٹے چھوٹے تیز دھماکوں کی صورت میں خارج کر دیتے ہیں۔

ہنسی کے اس عضویاتی مظاہرے کے پس پشت ان تحریکات کا مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے جن سے احساسِ مزاح کو تحریک ملتی ہے اور ہنسی کا سیلاب پھوٹ بہتا ہے۔ چنانچہ یہ سوال کہ ہنسی کیوں پیدا ہوتی ہے ایک خاصا اہم سوال ہے اور ازمنۂ قدیم سے مفکرین کے لئے بحث و تمحیص کا موضوع بنا رہا ہے۔ گریگ نے مزاح پر اپنی مشہور کتاب میں تین سو تریسٹھ (۳۶۳) ایسی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جن میں اس موضوع کو زیرِ بحث لایا گیا ہے مگر اس سب کے باوصف یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ابھی تک ہنسی کے مسئلے کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پوری طرح حل نہیں کیا جا سکا۔ تاہم اگر ہنسی کے موضوع پر پیش کردہ اہم نظریات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے تو اس سے مسئلہ زیرِ بحث کا ایک قریبی جائزہ لینے میں کچھ مدد مل سکتی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل انسانی فکر کی تاریخ میں مزاح کے مسئلے پر دو نہایت دلچسپ نظریے ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ تو یونان کے مفکرِ اعظم ارسطو اور سترھویں صدی کے انگریز مفکر تھامس ہابز کا ہے اور دوسرا نظریہ جرمن فلاسفر امانوئل کانٹ کا جسے بعد ازاں شوپنہار نے اپنے نظریے میں سمویا ہے۔ پہلے نظریے کے خالق ارسطو نے ہنسی کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہنسی کسی کمی یا بدصورتی کو دیکھ کر معرضِ وجود میں آتی ہے جو درد انگیز نہ ہو۔ اسی طرح سترھویں صدی عیسوی میں ہابز نے یہ نظریہ پیش کیا کہ:

> ہنسی کچھ نہیں سوائے اس جذبۂ افتخار یا احساسِ برتری کے جو دوسروں کی کمزوریوں
> یا اپنی گزشتہ خامیوں سے تقابل کے باعث معرضِ وجود میں آتا ہے۔[لہ]

بنیادی طور پر ارسطو کے نظریہ کمتری اور ہابز کے نظریہ برتری میں بہت کم فرق ہے کیونکہ ہنسی چاہے دوسروں کی بدصورتی یا کمزوری سے تحریک پائے یا اس بدصورتی اور کمزوری کے طفیل ایک احساسِ برتری کی صورت میں وارد ہو بہرحال وہ دوسروں کی خامیوں ہی سے تحریک پائے گی۔ ہابز کا نظریہ دراصل ایک اخلاقی نظریہ تھا۔ جس کا سہارا لے کر اس نے اس بات پر زور دیا کہ ہر وہ ہنسی غیر اخلاقی ہے جو دوسروں کی توہین کرے اور جس میں تحقیر کا عنصر موجود ہو۔ یہاں اگر ہابز کے نظریے پر تنقید کریں اور کہیں کہ گدگدی سے پیدا ہونے والی ہنسی یا بچوں کے معصوم قہقہوں میں جذبۂ افتخار کہاں؟ تو بحث طول پکڑ جائے گی۔ یہاں محض اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ ہابز کا نظریہ اس زمانے کے اخلاق کی نمائندگی کرتا ہے۔ جب اچھی سوسائٹی میں بلند آواز میں ہنسنا ہی معیوب سمجھا جاتا تھا۔

ہنسی کے متعلق دوسرا نظریہ ایمونیول کانٹ کا ہے جس کے مطابق ہنسی اس وقت نمودار ہوتی ہے جب کوئی چیز ہوتے ہوتے رہ جائے اور ہماری توقعات اچانک ایک بلبلے کی طرح پھٹ کر ختم ہو جائیں۔ کانٹ کے اس نظریہ کی توضیح اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہماری توقعات ایک غبارے کے اندر ہوا کی مانند لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی ہوتی ہیں اور ہم کسی خاص نتیجے پر بڑی بے تابی

[لہ] HOBBES – HUMAN NATURE IN WORKS (MOLESWORTH 1840) Vol. IV, P. 46

سے پہنچ رہے ہوتے ہیں کہ اچانک غبارے میں ایک سوراخ پیدا ہو جاتا ہے اور ہماری توقعات کا سارا دباؤ غبارے کو پھیلانے کی بجائے اس سوراخ کے راستے پھوٹ نکلتا ہے ۔ یہ پھوٹ نکلنا ہی ہنسی کہلاتا ہے ۔

قریب قریب اسی نظریے کا دوسرا علمبردار شوپنہاور ہے جس کے مطابق ہنسی تخیل اور حقیقت کے مابین ناہمواری کے وجود کو اچانک محسوس کر لینے سے جنم لیتی ہے[ٹہ] اس کی دانست میں جتنی خلافِ توقع یہ ناہمواری ہوگی اتنی ہی شدید طور پر ہنسی بھی نمودار ہوگی ۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میکس ایسٹ مین نے ارسطو اور کانٹ کے ان بظاہر متضاد نظریات کی ایک بڑے اچھوتے انداز سے توضیح کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ دونوں نظریے اپنی اپنی جگہ ہنسی کو سمجھنے میں ہمارے معاون ہیں ۔ ایسٹ مین نے لکھا تھا کہ بچے کو ہنسانے کے دو آسان طریقے ہیں ۔ پہلا تو یہ کہ آپ ہنسیں اور جب بچہ آپ کی طرف متوجہ ہو جائے تو اپنے چہرے کے خطوط کو یوں سکیڑیں کہ آپ کی صورت خوفناک دکھائی دے ، اس پر بچہ ہنس دے گا ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز پکڑ کر بچے کے قریب لے جائیں جسے وہ پسند کرتا ہو اور جب بچہ ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے لگے تو مسکرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیں بچہ اسے زندگی کا سب سے بڑا لطیفہ قرار دے گا ۔

ایسٹ مین کی رائے میں بچے کو محظوظ کرنے کے یہ دونوں طریقے ارسطو اور کانٹ کے نظریات سے شدید مماثلت رکھتے ہیں چنانچہ ارسطو کا نظریہ کہ ہنسی کسی ایسی کجی یا بدصورتی سے نمودار ہوتی ہے جو درد انگیز نہ ہو اس چہرے کی طرح ہے جس کے خطوط کو مسکرا کر خوفناک بنا لیا جائے ۔ اور کانٹ کا نظریہ کہ ہنسی توقع کے پیدا ہونے اور پھر اچانک ختم ہو جانے سے نمودار ہوتی ہے اس ہاتھ کی طرح ہے جو کسی شے کو تھامنے کے لئے بڑھے اور پھر دیکھے کہ وہ شے وہاں نہیں ہے ۔ دیکھا جائے تو سرکس کا مسخرہ بھی ان دونوں طریقوں سے ہی تماشائیوں کو ہنسانے میں کامیاب ہوتا ہے ۔ وہ پہلے تو اپنے چہرے پر سفید اور سرخ رنگ مل کر اور ایک بیہودہ سا لباس پہن کر آتا ہے اور پھر جب کوئی شہ زور کسی وزنی شے کو اٹھانے کا مظاہرہ کر چکتا ہے تو یہ مسخرہ بڑے اہتمام سے اسی شے کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھتا ہے اور پھر اچانک اسے ہاتھ لگا کر پیچھے ہٹ آتا ہے اور لوگ مارے ہنسی کے بے حال ہو جاتے ہیں ۔

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل مزاح کے مسئلے پر جن اور مفکرین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں ہربرٹ اسپنسر (HERBERT SPENCER) ، جوزف ایڈیسن (JOSEPH ADDISON) ، الیگزنڈر بین (ALEXANDER BAIN) اور پروفیسر لپس (LIPPS) کے نام خاصے اہم ہیں ۔ لیکن دراصل اس طویل دور میں مذکورہ بالا دو نظریے ہی ایسے تھے جو دو مختلف اسالیبِ فکر کے طور پر قائم ہوئے اور مفکرین کے مابین بحث و تمحیص کا موجب بنے ۔

بحث و تمحیص کا یہ سلسلہ نہ جانے کتنا عرصہ جاری رہتا کہ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی پروفیسر سلّی نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف AN ESSAY ON LAUGHTER میں نہ صرف ان دونوں نظریوں کو یکجا کر دیا بلکہ چند نئے قابلِ قدر نکات بھی پیش کئے ۔ اس سلسلے میں پروفیسر مذکور نے ہنسی کی وجوہ میں گدگدی ، انتہائی مسرت اور عملی مذاق کو خاصی اہمیت

[لہ] KANT – CRITIQUE OF JUDGMENT, 2ND ED, 1914. P. 223.

SCHOPENHAUER – THE WORLD AS WILL & IDEA. P. 130

دی اور قابلِ تمسخر اشیاء اور واقعات میں اخلاقی عیوب، انوکھاپن، جسمانی نقائص، بے قاعدگی، پھبتی اور بے حیائی وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا۔ مجموعی طور پر پروفیسر سلی نے ہنسی اور کھیل میں قرابت پر خاص زور دیا اور ہنسی کے اجزاء میں بچے کی سی مسرت آمیز حیرت اور کھیل کی طرف نمایاں رجحان کو مقدم جانا۔

ہنسی کے محرکات کے ضمن میں پروفیسر مذکور نے لکھا کہ ہنسی مسرت کے اس اچانک سیلاب سے معرضِ وجود میں آتی ہے جو کسی بیرونی دباؤ کے ہٹ جانے یا کسی غیر متوقع شے کی اچانک آمد سے پیدا ہوتا ہے اور جو ہمیں یکایک زندگی کے ایک بلند مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو پروفیسر سلی نے یہ لکھ کر بیسویں صدی سے پہلے کے نظریات کو انتہائی خوبی سے مربوط کیا اور اپنے اعلیٰ تجزیاتی مطالعے سے ہنسی کے سلسلے میں نہایت قیمتی اضافے کئے۔

لیکن شاید یہ زمانہ مزاح پر نت نئی تحقیقات کا زمانہ تھا کیونکہ پروفیسر سلی کی معرکۃ الآرا کتاب کے فوراً بعد مزاح پر دو نہایت گرانقدر کتابیں منصۂ شہود پر آئیں اور ان کی بدولت مزاح کے مسئلے پر اس قدر روشنی پڑی جو اس سے قبل کئی صدیوں کی تحقیقات سے بھی نہیں پڑی تھی۔ یہ کتابیں تھیں ——— ہنری برگسان کی کتاب "ہنسی" (LAUGHTER) اور سگمنڈ فرائڈ کی کتاب
WIT & LTS RELATION TO THE UNCONSCIOUS

برگسان نے لکھا کہ زندگی لچک اور تحریک سے عبارت ہے۔ یہ ایک ایسے صبا رفتار گھوڑے کی مانند ہے جو افق کی تلاش میں سرگرداں کسی مقام پر ٹھہرے بغیر بڑھتا چلا جا رہا ہو۔ برگسان کے مطابق زندگی کسی مقام پر ٹھہرنا یا پلٹ کر دیکھنا یا مکرر انداز میں کسی شے کو پیش کرنا جانتی ہی نہیں لیکن یہی زندگی جس کی خصوصیت تحریک اور لچک ہے جب کسی مقام پر ٹھہراؤ، جمود اور میکانکی عمل کا نقشہ دکھائے تو بے اختیار ہماری ہنسی کو تحریک مل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سرکس کا مسخرہ جو بحیثیت انسان زندگی کا مظہر ہے جب کسی جامد شے کا تصور پیش کرتا ہے اور کسی فرضی کرسی پر بیٹھے ہوئے دھڑام سے فرش پر گر پڑتا ہے تو ہم بے اختیار ہنس دیتے ہیں ——— برگسان کے الفاظ میں، ہر بار جب کوئی شخص کسی جامد شے کی طرح خود کو پیش کرے وہ مزاحیہ رنگ اختیار کر جاتا ہے:

ہنری برگسان نے ہنسی کو خالص ذہنی عمل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جذبات مثلاً ترحم کے جذبات کی ہلکی سی رَو بھی اسے ختم کر دیتی ہے۔ مزید برآں یہ کہ ہم کبھی اشیاء پر نہیں ہنستے۔ حیوانوں پر صرف اس وقت ہنستے ہیں جب ان کی حرکات بعض انسانی حرکات سے مشابہت پیدا کر لیتی ہیں اور انسانوں پر ہم اس وقت ہنستے ہیں جب وہ اشیاء کے مانند خود کو پیش کرتے ہیں۔ یعنی جب ان کی لچک میکانکی عمل میں مبتدل ہو جاتی ہے۔

برگسان کی رائے میں ہنسی نہ صرف سوسائٹی کے ہر اس عمل کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے جو میکانکی صورت اختیار کرنے اور جمود کو مسلط ہو جانے میں مدد بہم پہنچاتا ہے بلکہ اس کا کام فراریت کے ان تمام رجحانات کا قلع قمع کرنا بھی ہے جن کے زیر اثر فرد سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے بھٹکتا نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہنسی فرد کو دوبارہ "کل" میں مدغم ہو جانے کی ترغیب دیتی ہے۔

اسی زمانے میں مزاح کے مسئلے پر قلم اٹھانے والا دوسرا شخص مشہور ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائڈ تھا جس نے وٹ (WIT) کو اس لئے تجزیاتی مطالعے کے لئے منتخب کیا کہ اس کے باعث اس کے نظریۂ لاشعور پر روشنی پڑ سکتی تھی لیکن اس کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ

ضمناً اس عظیم مفکر نے مزاح کے مسئلے پر بھی گہری نظر ڈالی اور ایک ایسا نظریہ پیش کر دیا جس کی بنیادوں پر آج بھی افکار کے نئے نئے محل استوار کئے جا رہے ہیں۔

فرائڈ نے مزاح کی چار صورتیں پیش کیں۔ بے ضرر لطایف، افادی لطایف، مضحک اور خالص مزاح۔ بے ضرر لطایف کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ الفاظ یا افکار کی جادوگری سے سامان انبساط بہم پہنچائیں۔ دوسری طرف افادی لطایف وہ ہیں جو طریقِ کار تو وہی اختیار کرتے ہیں جو بے ضرر لطایف کا ہے لیکن جو ساتھ ہی ساتھ کسی جنسی یا تشدد آمیز خواہش کی بھی تسکین کرتے ہیں نتیجتہً یہ لطایف کسی نہ کسی کے خلاف ضرور صف آرا ہوتے ہیں۔

فرائڈ کے مطابق بے ضرر لطایف سے حصولِ مسرت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں کھو کر انسان واپس اپنے بچپن کے ماحول میں پہنچ جاتا ہے اور وہی طریقِ فکر و استدلال اختیار کرتا ہے۔ یوں عام زندگی بسر کرنے کے لئے جو ضروری قوت درکار ہوتی ہے اس میں ایک بچت (ECONOMY) پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بچت ہنسی کی صورت میں بہ نکلتی ہے۔

اس کے برعکس افادی لطایف ان جنسی یا تشدد آمیز خواہشات کو آزاد کرتے ہیں جو عام زندگی میں ماحول اور سوسائٹی سے ہم آہنگ نہ ہونے کی صورت میں دبائی جا چکی ہیں۔ یہ خواہشات افادی لطایف کا خوش نما لباس زیبِ تن کئے اور یوں سنسر کے پہرے داروں کو دھوکا دے کر اپنے قید خانہ میں سے اس دیدہ دلیری سے ساتھ باہر نکل آتی ہیں کہ باہر کی پبلک کو بھی ان کے قیدی ہونے کا گمان نہیں ہوتا۔ لطایف کے ذریعے ان جنسی یا تشدد آمیز خواہشات کی تسکین اس دبا دینے والی قوت (ENERGY PEPRESSIVE) میں بچت پیدا کرتی ہے جو ان خواہشات کی عدم تسکین کی صورت میں انتہائی ضروری تھی۔ اور یہی بچت ہنسی کی صورت میں بہ نکلتی ہے۔

مزاح کی تیسری صورت مضحک سے متعلق ہے۔ مضحک سے حصولِ مسرت کے متعلق فرائڈ نے لکھا ہے کہ یہاں مسرت قوتِ تخیل (IMAGINATIVE ENERGY) میں بچت سے پیدا ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ مضحک تحریک ہمیں یقین یہ دلاتی ہے کہ ایک خاص کام کی تکمیل کے لئے ہمیں اس قدر قوت کی ضرورت ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہمیں بہت جلد اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کام تو اس سے بہت کم قوت کے صرف سے بھی انجام دیا جا سکتا ہے چنانچہ فاضل قوت ہنسی کی صورت میں یہ نکلتی ہے "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" اس کی بہترین مثال ہے۔

آخر میں فرائڈ نے خالص مزاح کا ذکر کیا ہے اور اس سے حصولِ مسرت کو قوتِ جذبات (EMOTIONAL ENERGY) میں بچت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر الف ایک مصیبت میں گرفتار ہے اور ب کو اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے لیکن الف کی کسی بات سے ب کو محسوس ہوتا ہے کہ الف اپنی مصیبت کا مذاق اڑا رہا ہے تو ب بھی الف کا ہمنوا بن جاتا ہے۔ یوں ب کی جمع شدہ ہمدردی میں ایک بچت پیدا ہوتی ہے اور یہ بچت ہنسی کی صورت میں بہ نکلتی ہے۔

اوپر ہنسی کے بارے میں فرائڈ کے نظریات کو نسبتاً تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ اگرچہ اس نصف صدی میں ہنسی کے بارے میں کئی نئے نظریات پیش ہوئے ہیں تاہم دراصل اس ضمن میں فرائڈ کے نظریات ہی نے اکثر و بیشتر بنیاد کا کام دیا ہے۔ چنانچہ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ فرائڈ کے بعد آج تک مزاح کے مسئلے پر جو تین نہایت قابل

قدر کتابیں شائع ہوئیں (ہماری مراد گریگ[1]، ایسٹ مین[2] اور آرتھر کوئسلر[3] کی کتابوں سے ہے) ان میں سے کم از کم دو یعنی گریگ اور کوئسلر کی کتابوں میں فرائڈ کے نظریات ہی نے بنیادی کام سر انجام دیا ہے۔

گریگ نے جہاں فرائڈ کے بنیادی نظریوں سے اتفاق کیا وہاں اس نے مزاح کے پس پشت فرائڈ کی پیش کردہ جنسی یا تشدد آمیز خواہش کی بجائے محبت یا نفرت کے جذبات کو نمایاں جگہ دی اور کہا کہ چونکہ عام زندگی میں ہم ان رجحانات کی کھلے بندوں تسکین نہیں کر سکتے لہذا یہ مزاح کے ذریعے اس انداز سے تسکین حاصل کر لیتے ہیں کہ سوسائٹی کی اقدار کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ مجموعی طور پر گریگ نے فرائڈ کے نظریات میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

البتہ ایسٹ مین نے اس مسئلے کو ایک بالکل مختلف زاویے سے دیکھا اور مزاح کو ایک قطعاً علیحدہ انسانی جبلت (LNSTINCT) قرار دے دیا۔ اس نے لکھا کہ مزاح کھیل کی جبلت (PLAY LNSTINCT) ہے اور اس کا بڑا کام یہ ہے کہ انسان کو صدمے یا مایوسی کا ہنس کھیل کر مقابلہ کرنے کی ترغیب دے۔

اس سلسلے میں ایسٹ مین نے مزاح کے مندرجہ ذیل چار اصول پیش کیے[4]۔

الف: اشیاء صرف اس وقت مزاحیہ رنگ اختیار کرتی ہے جب ہم خود مزاح کے موڈ میں ہوں۔ اگر ہم بہت سنجیدہ ہوئے تو مزاح کا نام و نشان تک نہیں ملے گا۔

ب: جب ہم مزاح کے موڈ میں ہوتے ہیں تو خوش گوار چیزوں کے ساتھ ساتھ ناخوشگوار چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں۔

ج: ہنسی کھیل کا رجحان بچپن کا امتیازی نشان ہے اور بچوں کی ہنسی مزاح کو اس کے سادہ ترین انداز میں پیش کرتی ہے۔

د: بالغوں میں ہنسی کھیل کا یہ رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ لہذا وہ ناخوشگوار اشیاء کو مزاحیہ رنگ میں دیکھنے اور ان سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔

فرائڈ کے بعد مزاح کے مسئلے پر گریگ اور ایسٹ مین کے علاوہ جس تیسرے مصنف نے طبع آزمائی کی اس کا نام آرتھر کوئسلر ہے۔ ضمناً یہ بتا دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آرتھر کوئسلر کے نظریات مزاح پر جدید ترین تحقیقات کا حکم رکھتے ہیں۔

آرتھر کوئسلر کے نظریات کے مطابق[5] انسانی زندگی پر دو رجحانات مسلط ہیں۔ تشدد اور مدافعت کا رجحان جسے اس نے SELF ASSERTIVE کا نام دیا ہے۔ پھیلاؤ اور آفاقیت کا رجحان جسے اس نے SELF-TRANSCENDING سے معنون کیا ہے۔ تشدد اور مدافعت کے رجحان کے زیر سایہ انسان برتری، جنسی تشدد اور خود غرضی کے جذبات کا اظہار

---

[1] L.Y.T. GREIG – THE PSYCHOLOGY OF LAUGHTER & COMEDY

[2] MAX EASTMAN – ENJOYMENT OF LAUGHTER

[3] ARTHUR KOESTLER – LNSIGHT & OUTLOOK

[4] EASTMAN – ENJOYMENT OF LAUGHER. 1937 ED P. 19

[5] ARTHUR KOESTLER LNSIGHT & OUTLOOK 1949 ED.

کرتا ہے اور آفاقیت کے رجحان کے تحت ہمدردی، محبت اور بے غرضی کا۔ آرتھر کوئسلر کے مطابق اول الذکر طربیہ اور مؤخر الذکر المیہ کی تخلیق کا ضامن ہے۔ مگر ان دونوں کی آمد کا راستہ ایک ہی ہے اور یہ دونوں ایک سا طریق اختیار کرتے ہیں۔

اس طریقِ کار کو مصنفِ مذکور نے "عمل رابطہ" (BISOCIATION) کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ جس طرح مزاح کی تخلیق دو مختلف ذہنی منازل کے مابین ایک ربط کی رہینِ منت ہے۔ اسی طرح آرٹ بھی ایک عملِ رابطہ سے معرضِ وجود میں آتا ہے چنانچہ تشبیہ یا استعارہ جو آرٹ کی جان ہے محض دو اشیاء کے مابین ایک ایسے ربط کا نام ہے جو اس سے قبل کبھی دریافت نہیں ہوا تھا۔ یہی ربط مزاح اور لطیفے کی جان ہے۔ جس کی مدد سے ہمارا تخیل (جو بالعموم جذبات سے ہم آہنگ رہتا ہے) یکایک جذبات سے دامن چھڑا لیتا ہے۔ اور جذبات کے منہ زور بہاؤ کو ایک تماشائی کی طرح دیکھنے لگتا ہے۔ یوں ہماری ہنسی کو تحریک ملتی ہے۔

سطور بالا میں ہم نے ہنسی کے مسئلے پر مفکرین کے خیالات کو مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی سعی کی ہے لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ ہنسی کا یہ مسئلہ بتدریج وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ دورِ جدید میں اس کی وسعتوں کو سمیٹنے کے لئے اہلِ فکر کو کڑی آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا۔ اس ضمن میں پروفیسر سلی، فرائڈ، الیسٹ مین اور آرتھر کوئسلر کے نظریات خاص طور پر ہنسی کے مسئلے کے بیشتر پہلوؤں اور زاویوں کو زیرِ بحث لانے میں کامیاب ہوئے۔ اور ہمیں محسوس ہوا کہ وہ مسئلہ جس کی طرف قدیم مفکرین نے محض چند جملوں میں اشارہ کیا تھا۔ آج ایک "باقاعدہ مطالعے" کا درجہ اختیار کر چکا ہے اور وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اس کے چھپے ہوئے پہلو یقینی طور پر ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔

مگر جہاں مزاح کے پس پشت مختلف تحریکات کا جائزہ لیا گیا ہے وہاں ضروری ہے کہ مزاح کے تدریجی ارتقاء کو بھی زیرِ بحث لایا جائے تا کہ مزاح کی ارتقائی کیفیات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔

مزاح کے تدریجی ارتقاء کو اس طوفانی ندی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو پتھروں اور چٹانوں سے ٹکرتی شور مچاتی اور جھاگ اڑاتی آخرش ایک وسیع کشادہ اور پرسکون دریا کی صورت اختیار کر لے اور پھر وسیع و بے پایاں سمندر میں مل کر ابدیت سے ہم کنار ہو جائے لیکن چونکہ اس کی کشادگی اور وسعت کا صحیح اندازہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے اس کے طوفانی آغاز کا جائزہ لیا جائے لہٰذا ہم مزاح کو اس کے اولین ماحول، اس کی جنم بھومی میں دیکھنے پر مجبور ہیں۔

غور کریں تو بچے یا وحشی کے پاس بلند بانگ قہقہوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے مزاح میں وسعت اور گہرائی کا فقدان ہوتا ہے۔ اس کا مزاح محض اس طوفانی ندی کی طرح ہے جو معمولی پتھر سے بھی ٹکرائے تو شور مچاتی ہے چنانچہ وہ ایسی باتوں پر بے اختیار قہقہہ لگاتا ہے جو بالغ نظر انسانوں کے ذوقِ مزاح سے کافی پست ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر وحشی انسان کا وہ اولین قہقہہ جو اس نے دشمن کی کھال ادھیڑتے وقت لگایا تھا آج کی مہذب دنیا میں قطعاً ناقابلِ قبول ہے لیکن چونکہ ساری تاریخ انسان کی مختصر سی زندگی میں خود کلیتہً دہرا دیتی ہے لہٰذا وحشی انسان کے ان قہقہوں کی صدائے بازگشت بچوں کے ان نقرئی قہقہوں میں سنائی دے گی۔ جو وہ کسی شے کو ٹوٹتے یا گرتے یا بدشکل ہوتے دیکھ کر لگاتے ہیں۔

بہر حال انسان مزاح کے نشو و نما میں ایک تاریخی انداز کار فرما نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہی دیکھئے کہ قہقہے کا آغاز

ہی اس وقت ہوا جب انسان نے حیوان کی میکانکی زندگی سے نجات پائی۔ حیوانی زندگی کا مابہ الامتیاز جبلت اور طبعی رجحان کا تسلط تھا۔ یہاں تخیل محض جبلت کے سائے کی حیثیت رکھتا تھا۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ اس کے تخیل نے طبعی رجحان سے اپنا دامن جھٹک کر علیحدہ کر لیا اور طبعی رجحان کے میکانکی عمل کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے لگا۔ اس عمل سے انسان کو اس بات کا اچانک احساس ہوا کہ اس کی زندگی لغو اور بے معنی بھی ہو سکتی ہے۔ اس احساس نے اس کے قہقہے کو تحریک دی۔

مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ”اولین“ انسان کے اس قہقہے میں شدت اور گونج تو بہت تھی لیکن گہرائی اور لطافت کا فقدان تھا۔ اس کا مزاح زیادہ تر عملی مذاق تک محدود تھا یا پھر ان باتوں کو نشانۂ تمسخر بناتا تھا جو اس کے اپنے ماحول سے مختلف تھیں۔ آج بھی اجنبیوں خاص طور پر سفید رنگ کے لوگوں کے لباس، چال، میل جول اور عادات و اطوار کی نقلیں کرنا وحشی قبیلوں میں بہت عام ہے اور ان پر دل کھول کر قہقہے لگائے جاتے ہیں۔ نہ صرف قہقہے بلکہ بعض اوقات تو یہ لوگ مارے ہنسی کے تالیاں بجانا اور پاؤں کو زور زور سے زمین پر پٹخنا بھی شروع کر دیتے ہیں ـــ دور کیوں جائیے یہاں پنجاب کے دور دراز دیہات میں آج بھی جب کوئی نووارد سر پر سولا ہیٹ رکھے نظر آتا ہے تو دیہاتیوں کے لبوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ ضرور کھیلنا شروع ہو جاتی ہے۔

دراصل وحشی انسان کا ذوقِ مزاح ہمارے ہاں کے اسکول کے بچوں کے ذوقِ مزاح سے شدید مماثلت رکھتا ہے وہی عملی مذاق اور تخریبی انداز لیکن ہمدردی کی افسوسناک کمی دراصل مزاح میں ہمدردانہ پہلو کی نمود بہت بعد کی بات ہے جب وحشی قبیلوں کی تنگ اور گھٹی ہوئی فضا نے ہر لحظہ وسیع ہونے ہوئے سوشل نظام کے لئے جگہ خالی کر دی۔ چنانچہ سوسائٹی میں طبقاتی حد بندی مزاح کے نشو و ارتقاء کے لئے از بس ضروری ہے اور چونکہ وحشی قبائل میں اس طبقاتی حد بندی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا لہذا زیادہ سے زیادہ اجنبیوں ہی کو نشانۂ تمسخر بنانے اور دل کھول کر قہقہے لگاتے ہیں۔

طبقاتی کشمکش کے علاوہ ہمارے سوشل ارتقاء کی ہر نہج ذہنی وسعت، اخلاقی اقدار، سیاسی اور سماجی آزادی اور دولت کے تصور نے بھی ہمارے ذوقِ مزاح پر بڑے نمایاں اثرات مرتسم کیے ہیں۔ اب ہمارا مزاح یقینی طور پر گروہ کی ہنسی CHORAL LAUGHTER سے ترقی کرکے فرد کی ہنسی (INDIVIDUAL LAUGHTER) تک جا پہنچا ہے۔ دراصل سوشل ارتقاء نے کہیں صدیوں کے مد و جزر کے بعد جا کر ایسی فضا پیدا کی ہے جس میں انفرادی آزادی کے تصور نے اپنے پاؤں مضبوط کر لئے ہیں۔ اور فرد کے قہقہے یا تبسم میں نہ صرف گہرائی اور انفرادیت کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ بلکہ اس کے مزاح میں بھی پہاڑی ندی کی پُرشور راگنی کی بجائے پُرسکون دریا کی دھیمی لے سنائی دے رہی ہے۔

بس آج ہمارا مزاح ان مدارج تک جا پہنچا ہے جہاں سے پلٹ کر ہم اپنی سنجیدہ زندگی پر اس بے نیازی سے نگاہیں دوڑا سکتے ہیں جس طرح کوئی بوڑھا اپنے شباب کی ان داستانوں پر نظریں دوڑائے جو ایک وقت اتنی سنجیدہ اور جذباتی تھیں لیکن جو آج اسے محض حماقتیں نظر آتی ہیں اور جن پر وہ اب آسانی سے قہقہے لگا سکتا ہے، اس کے علاوہ آج مزاح ایک ایسے مقام پر بھی جا پہنچا ہے۔ جہاں اس نے یاس کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں۔ اب جہاں یاس مزاح کو

بے اختیار ہو کر قہقہے لگانے سے باز رکھتی ہے۔ وہاں مزاح بھی یاس کو ہچکیوں میں تبدیل ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔" ان دو دھاتوں کا یہ حیرت انگیز ملاپ ہے — ایک بہت سخت دوسری بہت نرم۔ دنیا میں آنسوؤں کی فراوانی ہے لیکن یہ کتنی خوفناک جگہ ہوتی۔ اگر یہاں آنسوؤں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا![4]

(۲)

گزشتہ فصل میں احساسِ مزاح کی اہمیت، ہنسی کے پس پشت مختلف تحریکات اور وحشی سے مہذب انسان تک مزاح کے تدریجی ارتقاء کا مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے۔ اب ہم مزاح نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھنے کی سعی کرتے ہیں کہ مزاحیہ و طنزیہ ادب جن کیفیتوں مثلاً خالص مزاح (HUMOUR) طنز (SATIRE) تحریف (PARODY) رمز (LRONY) وغیرہ سے اپنی بقاء کے لیے خونِ گرم حاصل کرتا ہے وہ خود کن عناصر کے اجتماع سے مرتب ہوئی۔ اور کس انداز سے مزاحیہ و طنزیہ ادب کی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے خالص مزاح کو لیجیے جس کی تعریف اسٹیفن لی کاک (STEPHAN LEACOCK). نے ان الفاظ میں کی ہے۔

> ”مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور
> کا نام ہے، جس کا فن کارانہ اظہار ہو جائے۔“[5]

مزاح کی یہ توضیح دراصل مزاح کی تخلیق سے متعلق ہے اور اس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ مزاح نگار اپنی نگاہِ دوربین سے زندگی کی ان ناہمواریوں اور مضحک کیفیتوں کو دیکھ لیتا ہے جو ایک عام انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ دوسرے ان ناہمواریوں کی طرف مزاح نگار کے ردعمل میں کوئی استہزائی کیفیت پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ ان سے محظوظ ہوتا اور اس ماحول کو پسند بھی کرتا ہے جس نے ان ناہمواریوں کو جنم دیا ہے چنانچہ ان ناہمواریوں کی طرف اس کا زاویہ نگاہ ہمدردانہ ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ مزاح نگار اپنے "تجربے" کے اظہار میں فن کارانہ انداز اختیار کرتا ہے۔ اور اسے سپاٹ طریق سے پیش نہیں کرتا لیکوک کی رائے میں خالص مزاح کی پیش کش ان تینوں عناصر کی رہین منت ہے۔

جیسا کہ لی کاک کی توضیح سے معلوم ہوا۔ مزاح نگار اس فرد کے ساتھ جس کا وہ مضحکہ اڑاتا ہے ایک ”ذہنی کھیل“ میں شریک ہو جاتا اور اس سے محظوظ ہونے لگتا ہے لیکن طنز نگار کا معاملہ اس سے کچھ جدا ہے۔ دراصل طنز کے پس پشت مرکزی خیال یہ ہوتا ہے کہ خود طنز نگار ان تمام حماقتوں سے محفوظ ہے جن کا وہ خاکہ اڑا رہا ہے۔ نتیجتاً اسے اپنے نشانۂ تمسخر سے کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ یہاں اگر رونالڈ ناکس (RONALD KNOX) کا ایک فقرہ مستعار لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ”مزاح

---

[4] STEPHEN LEACOCK -- HUMOR & HUMANITY. P. 233

[5] STEPHEN LEACOCK - HUMOR & HUMANITY. P. 11

نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے[1]" چنانچہ جہاں مزاح نگار کا طریق کار یہ ہے کہ وہ ناہمواریوں سے محظوظ ہوتا ہے وہاں طنز نگار ان ناہمواریوں سے نفرت کرتا ہے۔ اور انہیں خندہ استہزا میں اڑا دینے کی طرف مائل رہتا ہے۔ البتہ طنز کے کئی مدارج ضرور ہیں۔ چنانچہ کبھی تو یہ محض ایک فرد کو نشانۂ تمسخر بناتی ہے اور کبھی ان ارتقائی منازل پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں یہ انسان اور سماج کی مستقل حماقتوں اور عالم گیر ناہمواریوں کو طشت از بام کرتی اور انسان کو انسانیت سے قریب تر لانے میں مدد دیتی ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری اور مناسب ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک طنز کو اپنی افادیت کے باعث مزاح پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں مزاح ایک قومی کارنامہ ہے وہاں طنز ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے لوگ مزاح برائے مزاح کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کی دانست میں طنز ہی ادب میں مستقل اقدار کی حامل ہے۔ لیکن درحقیقت یہ نظر محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طنز سماج اور انسان کے رستے ہوئے زخموں کی طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتی ہے لیکن دوسری طرف خالص مزاح بھی تو ہماری بجھی ہوئی پھیکی اور بدمزا زندگیوں کو منور کرتا اور ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے۔ فی الواقع افادیت کے نقطۂ نظر سے دونوں ہمارے رفیق و غمگسار ہیں۔ اور ہم ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے سے قاصر۔ پس اپنی تحقیقات کے دوران میں ہم اسی درمیانی راستے کو اختیار کریں گے۔

مزاح نگاری اپنے نمود کے لیے جن عناصر کی رہین منت ہے ان میں سے ایک موازنہ (COMPARISON) ہے دو چیزوں کی آپس میں بیک وقت مشابہت اور تضاد سے وہ ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں جو ہنسی کو بیدار کرنے میں مدد دیتی ہیں چنانچہ مزاح نگار بالعموم مزاح کی تخلیق کے لیئے اس حربے سے بدرجہ اتم فائدہ اٹھاتا ہے۔ عام زندگی میں موازنہ کی مثال کسی شریر آئینے کا وہ عکس ہے جو کسی فرد کے حلیے کو مضحکہ خیز حد تک بگاڑ دیتا ہے۔ یہ عکس بیک وقت اس فرد کا اصلی عکس بھی ہے اور اس سے قطعاً مختلف بھی اور اسی لیئے یہ ہنسی کو بیدار بھی کرتا ہے۔ اردو ادب میں کنہیا لال کپور کی کتاب "چنگ و رباب" کا ایک جملہ "شیخ سعدی سے لے کر اور شیخ چلی تک" اس کی نمایاں مثال ہے کہ اس کی تخلیق میں اس مشابہت اور تضاد کے بیک وقت وجود نے حصہ لیا ہے۔ شیخ سعدی اور شیخ چلی میں "شیخ" کا لفظ مشترک ہے لیکن اس وقت چلی اور سعدی کا تضاد ایک ایسی شدید ناہمواری پیدا کرتا ہے کہ ہم بے اختیار ہو کر ہنسنے لگتے ہیں۔ اسی طرح پطرس کے مشہور مضمون "کتے" کے آغاز میں بھی مزاح کو تحریک اس مشابہت اور تضاد کے بیک وقت وجود سے ملی ہے جو مشاعروں اور کتوں کے ہنگامے کے مابین ہے۔

مزاح نگاری کا دوسرا کارآمد حربہ زبان و بیان کی بازیگری ہے۔ لفظی بازیگری سے مزاح پیدا کرنے کے کئی ایک طریق ہیں جن میں شاید سب سے پرانا طریق تکرار (REPETITION) ہے مگر اس ضمن میں جس طریق کو از منۂ قدیم سے اہمیت ملی ہے رعایت لفظی (PUN) کے نام سے مشہور ہے۔ رعایت لفظی کا مقصد یہ ہے کہ کسی لفظ کو اس انداز سے استعمال کیا

---

[1] RONALD KNOX -- ESSYS ON SATIRE. P.31

جائے کہ ناظر کو اس لفظ کے دو مختلف مطالب کا احساس ہو، چنانچہ اس کی مدد سے بالعموم ایک ایسی بات کہی جاتی ہے جو عام انداز سے کہی جائے تو ایک شدید تر ردعمل کے سوا اور کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ لیکن رعایت لفظی کے لئے جدت شرط ہے ورنہ تکرار سے بالعموم اس کی مزاحیہ کیفیت انحطاط پذیر ہو جاتی ہے۔ لفظی بازی گری کا اور نمونہ مضحکہ خیز املا سے مزاح کی تخلیق ہے۔ لیکن اس کا افق اس وجہ سے محدود ہے کہ یہاں مضحک پہلو تک صرف انسانی آنکھ ہی رسائی حاصل کر پاتی ہے۔ ان کے علاوہ لطائف سے پیدا ہونے والا مزاح بھی بڑی حد تک الفاظ ہی کا رہین منت ہے کہ یہاں الفاظ کی بچت (ECONOMY) سے مضحک نکات کو بڑی تیزی اور شدت سے پیدا کیا جاتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی لفظی بازیگری کے یہ تمام نوکیلے لیکن مضحک نکات بذلہ سنجی (WIT) کے زمرے میں شامل ہیں۔ بذلہ سنجی کو مزاح سے بہ آسانی ممیز کیا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ مزاح ایک کیفیت ہونے کے باعث سارے ادب پارے میں ایک برقی رو کی طرح سرایت کر جاتا ہے اور ہم جس مقام سے اسے چھو لیں یہ برقی رو ہمیں صاف طور پر محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ مزاح کو علیحدہ کر کے دکھانا بہت مشکل ہے۔ دوسری طرف اگرچہ بذلہ سنجی کا نمایاں ترین عنصر مزاح ہے اور اسی لیے مزاح نگار اسے حربے کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے تاہم بذلہ سنجی کا رشتہ الفاظ کے ساتھ اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ مزاح کے برعکس یہ علیحدہ کر کے بھی دکھائی جا سکتی ہے۔ اس گذارش کو زیادہ واضح طور پر اشکال الف اور ب کے ذریعے بیان کیا جا سکتا ہے۔

(ل)

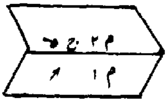

(ب)

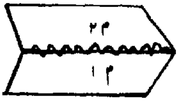

ان دونوں اشکال (ل اور ب) میں م ۱ اور م ۲ ہمارے تصورات کے دو میدان ہیں۔ شکل ل لطیفے سے متعلق ہے اور بتاتی ہے کہ لطیفہ کس طریق سے ہنسی کو بیدار کرتا ہے۔ اس شکل کے مطابق جب دو مجرد تصورات (جن میں سے ایک م ۱ اور دوسرا م ۲ کا تصور ہے) ج کے نقطے پر جا کر ملتے ہیں تو ایک برقی جھٹکا لگتا ہے جو لطیفے کی جان ہوتا ہے مثال کے طور پر یہ لطیفہ لیجئے۔

"گورنر کو پاگل خانے کا ملاحظہ کرنا تھا چنانچہ پاگل خانہ میں بڑے انتظامات کئے جا رہے تھے ایک پاگل نے جو دیر سے کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، ایک آفیسر سے پوچھا۔

پاگل : کیوں جی کون آ رہا ہے؟

آفیسر : گورنر!

پاگل : کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جب آیا تھا تو وائسرائے تھا۔"

یہاں تصورات کے دو میدان موجود ہیں۔ گورنر کی پاگل خانہ میں آمد برائے ملاحظہ (م ۱) اور گورنر کی پاگل خانہ میں آمد بطور پاگل (م ۲) چنانچہ جب ان دو تصورات کا مقام ج پر ٹکراؤ ہوتا ہے اور ہم پاگل کے یہ الفاظ پڑھتے ہیں کہ وہ

بھی شروع شروع میں خود کو دانشرائے سمجھتا تھا تو ہنسی کا ایک شرارہ پیدا ہوتا ہے۔

دوسری شکل یعنی ب میں ایسا کوئی خاص شرارہ موجود نہیں۔ یہ شکل مزاح سے متعلق ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ مزاح م ۱ اور م ۲ کی حد انضمام کے ساتھ ساتھ چلتا اسے قدم قدم پر کاٹتا اور اپنے سفر کے دوران میں ہلکے ہلکے شرارے پیدا کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ مزاح کی امتیازی کیفیت یہ ہے کہ اس کے باعث جو تبسم معرضِ وجود میں آتا ہے وہ ایک نمایاں مسکراہٹ میں تبدیل ہو کر دیکھتے دیکھتے قہقہہ بن جاتا ہے اور پھر بجھتے بجھتے سنجیدگی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے لیکن یہ سنجیدگی ابدی نہیں ہوتی، اگلے ہی موڑ پر اسے پھر دھیمے تبسم کی رفاقت میسر آ جاتی ہے اور یوں یہ چکر برقرار رہتا ہے۔ مغربی ادب میں ڈان کوالکزوٹ (DON. QUIXOTE) اور مسٹر پک وک (MR. PICKWICK) اور ہمارے اپنے ادب میں خوجی اور چچا چھکن کے مطالعے میں مزاح کی یہ کیفیت بڑی واضح ہے۔

مزاح نگاری کا تیسرا حربہ مزاحیہ صورتِ واقعہ (HUMOROUS SITUATION) ہے۔ یہ صورتِ واقعہ تین اہم عناصر کی رہینِ منت ہوتی ہے — ناہمواریوں کی اچانک پیدائش، الجھن میں اسیر انسان کے مقابلے میں ناظر کا احساس برتری اور یہ تسکین دہ احساس کہ اس واقعے میں صدمے یا دُکھ کا پہلو موجود نہیں۔ یہی بات ایک مثال سے اس طرح واضح ہو سکتی ہے۔

> ”اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبعِ نازک پر گراں گزری، چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے رہا تھا لیکن میرا تمام جسم بائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدّی دفعتاً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کرنے لگا تو میرے گھٹنے ٹھوڑی تک پہنچ گئے۔“
>
> (مرحوم کی یاد میں — پطرس)

یہاں زندگی کی روانی میں دفعتاً ناہمواری سی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک بھلا چنگا آدمی دیکھتے دیکھتے عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گیا ہے — ایک ایسی الجھن جس نے چند لحظوں کے لئے اس کے عام انسانی وقار کو ختم کر کے ہمارے احساس برتری کو تحریک دے دی ہے لیکن چونکہ ظاہر ہے کہ یہ شخص کسی سخت چوٹ یا شدید ذہنی صدمے سے محفوظ ہے اس لئے اگر اس کی ہیئت کذائی ہماری ہنسی کو بیدار کر دیتی ہے تو یہ حالات کے عین مطابق ہے۔ اس کے برعکس اگر یہی شخص سائیکل سے گر پڑتا ہے اور اس کی ایک ٹانگ سخت مجروح ہو جاتی ہے۔ تو ایک وحشی انسان تو شاید بے اختیار ہنس دے لیکن ایک مہذب انسان کے ہونٹوں سے خفیف سے تبسم کا نمودار ہو جانا بھی بعید از قیاس ہے۔

صورت واقعہ سے پیدا ہونے والا بہترین مزاح وہ ہے جو کسی شعوری کاوش کا رہینِ منت نہ ہو بلکہ از خود حالات و واقعات کی ایک مخصوص نہج یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں سے پیدا ہو جائے۔ چنانچہ صورتِ واقعہ کی تعمیر میں ایک اچھا مزاح نگار غلطی، غلط فہمی اور اتفاقِ وقت (COINCIDENCE) سے بھی کام لیتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ عملی مذاق (PRACTICAL JOKES) سے بہت کم مدد طلب کرے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عملی مذاق مزاح کی ایک کھردری

صورت ہے اور چونکہ اس کی تعمیر میں بڑی حد تک شعوری کاوش کو دخل حاصل ہے۔ لہٰذا اس سے پیدا ہونے والے مزاح میں وہ گہرائی اور لطافت موجود نہیں ہوتی جو صورتِ واقعہ کے مزاح کا مابہ الامتیاز ہے۔

مزاح نگاری کا چوتھا حربہ مزاحیہ کردار (HUMOROUS CHARACTER) ہے وہ مزاحیہ کردار جس کی بدولت تمام کا تمام ماحول مضحکہ خیز صورت اختیار کر جاتا ہے۔ بے شک مزاحیہ کردار کو نمایاں کرنے کے لئے پہلے ایک مناسب ماحول پیش کرنا ازبس ضروری ہے تاہم جب ایک بار اس انوکھے کردار کی تخلیق ہو جاتی ہے تو پھر اس کا سرسری سا تذکرہ ہی ماحول کی ساری سنجیدگی کو انحطاط پذیر کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈان کوگزوٹ (DON QUIXOTE) یا خوجی کا نام ہی لیا جائے تو ہم ہنسنے کے لئے غیر ارادی طور پر تیار ہو جاتے ہیں۔ عام زندگی میں بھی دیکھئے کہ مولویوں، فلاسفروں یا نہنگ سکھوں کے متعلق لطائف محض مولوی، فلاسفر یا سکھ کے لفظ ہی سے ایک غیر سنجیدہ فضا کی تعمیر کر لیتے اور ناظر کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی لکیر پیدا کر دیتے ہیں۔

جہاں تک مزاحیہ کردار کی پیش کش کا تعلق ہے ایک کامیاب مزاح نگار، کردار کے مختلف اجزا یا عناصر کے مابین اس خلیج کو نمایاں کر کے دکھاتا ہے۔ جس سے ناظر کو کردار کی ناہمواریوں کا احساس ہو سکے۔ چنانچہ مزاح نگار کی نظرِ انتخاب ایک ایسے کردار پر پڑتی ہے جس میں لچک کا فقدان ہوتا ہے۔ اور جو ایک نارمل انسان کی طرح بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکتا۔ پس ایک مکمل مزاحیہ کردار کو قدم قدم پر انوکھے واقعات کا سامنا ہوتا ہے۔ (کیونکہ واقعے کی نمود کا مطلب ہی یہ ہے کہ کردار ماحول کی اچانک تبدیلی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکا) ایسے موقعوں پر مزاحیہ صورتِ واقعہ اور مزاحیہ کردار ایک ہو جاتے اور اعلیٰ مزاح کی تخلیق میں مدد بہم پہنچانے لگتے ہیں۔

مزاح نگاری کا آخری حربہ پیروڈی یا تحریف ہے۔ لیکن پیروڈی صرف مزاح سے ہی متعلق نہیں بلکہ طنز نگار بھی اس حربے سے فائدہ اٹھاتا ہے تاہم یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تحریف ایک علیحدہ صنفِ ادب کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور نتیجۃً ایک علیحدہ مطالعے کی طالب ہے ___ پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی لفظی نقالی کا نام ہے۔ جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ اپنے عروج پر اس کا منتہا ادبی یا نظریاتی خامیوں کو منظرِ عام پر لانا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے درے یہ حالاتِ زمانہ کا مضحکہ اڑاتی، کسی بلند پایہ مضمون کو خفیف مضمون میں تبدیل کرتی یا محض لفظی تبدیلیوں سے تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچاتی ہے چنانچہ تحریف کے مقصد کا تعین کرنے والوں میں خاصا بُعد باہم ہے۔ بعض کے نزدیک تحریف کا مقصد نہ صرف معاصر ادیبوں کی بے اعتدالیوں کو روکنا اور ان کی اصلاح کرنا ہے بلکہ زندگی کی ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بنانا بھی ہے۔ دوسروں کے نزدیک تحریف صرف تفریح پر مبنی ہے اور اس کا مقصد بجز تفریح اور کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر داؤد رہبر کی یہ رائے بڑی وزنی ہے کہ ان دونوں گروہوں کو ایک طرح کا سمجھوتہ کر لینا چاہیئے ___ وہ یوں کہ گروہِ اول اصلاحی تنقید کی شرط چھوڑ دے اور گروہِ ثانی تفریحِ محض کی[1] ___ پیروڈی کے ساتھ چند الفاظ تقلیبِ خندہ آور BURLESQUE کے بارے میں بھی لکھنے انتہائی ضروری ہیں۔ تحریف کی طرح تقلیبِ خندہ آور

---

[1] ''فارسی اور اردو میں پیروڈی کا تصور'' از ڈاکٹر داؤد رہبر ادبی دنیا ستمبر ۱۹۴۶ء

ٹہ

بھی لفظی نقالی ہے لیکن جہاں تحریف کے پیش نظر بالعموم اصل کی تکنیک ہوتی ہے وہاں تقلیب خندہ آور کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ کسی ادب پارے کو دوبارہ اس انداز سے لکھا جائے کہ مزاح کی تخلیق ہو سکے[1] نیو آکسفورڈ ڈکشنری میں لکھا ہے کہ پیروڈی کو مصنف کی کسی خاص تخلیق تک محدود ہونا چاہیے۔ اس طرح کہ اس کے پیش نظر اصل کی مزاحیہ انداز میں تنقید ہو۔ لیکن تقلیبِ خندہ آور ایک وسیع تر چیز ہے۔ جو کسی مصنف کے عام انداز یا کسی جماعت کی خاص نہج کی نقل اتارتی ہے۔ محض اس لئے کہ ہنسی مذاق کو تحریک ہو[2]

اور اب طنز ——— ! طنز جو بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور، حساس اور دردمند انسان کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے۔ جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختۂ مشق بنا لیا ہو۔ اردو ادب میں طنز کا عروج بھی بڑی حد تک اسی ردعمل کا رہین منت ہے۔ جو ایک غیر ملکی حکومت کے تشدد، مسلسل سماجی الجھنوں اور فرد کی زندگی میں مسلسل ناکامیوں کے باعث پیدا ہوا اور جس نے طنز نگار یعنی ایک اور دردمند انسان کو اپنے ماحول کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی بے اعتدالیوں کی طرف متوجہ کر دیا۔ چنانچہ اس ردعمل کے زیر اثر طنز نگار نے ان تمام ناسوروں پر تیز تیز نشتر چلانے کا آغاز کیا جو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کی پیداوار تھے اور جن کے باعث معاشرہ سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ طنز کا استعمال تخریب پسندی کی علامت ہے۔ دراصل طنز کی تخریبی کارروائی صرف ناسور پر نشتر چلانے کی حد تک ہے۔ اس کے بعد زخم کا مندمل ہو جانا اور فرد یا سوسائٹی کا اپنے مرض سے نجات حاصل کر لینا یقیناً اس کا بہت بڑا تعمیری کارنامہ ہے۔ لیکن طنز کے لئے ضروری ہے کہ یہ مزاح سے بیگانہ نہ ہو بلکہ کونین کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرے۔ دوسرے پردہ دری اور عیب جوئی کرتے وقت لطیف فنکارانہ پیرایۂ اظہار اختیار کرے اور تیسرے کسی خاص فرد کے عیوب کی پردہ دری کو زندگی اور سماج کی عالمگیر ناہمواریوں کی پردہ دری کا وسیلہ بنائے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا طنز طنز نہیں رہتی۔ محض پھبتی، استہزاء یا ہجو کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور شاید اسی لئے اپنے صحیح راستے سے بھٹک کر اس خار دار میں جا نکلتی ہے۔ جہاں تخریب کا جواب تخریب سے ملتا ہے اور نشانۂ تمسخر وار کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی بجائے غضبناک ہو کر جوابی حملہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

طنز کے بارے میں آرتھر کوئسلر[3] کا خیال ہے کہ ہمارے اذہان زندگی کی بیزار کن یکسانیت اور بے رنگ تکرار سے اس قدر بے حس ہو چکے ہیں۔ اور ہم زندگی کے ناسوروں کو دیکھ دیکھ کر ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جب تک طنز نگار انہیں مبالغہ آمیز انداز سے پیش نہ کرے، ہماری نگاہیں ان پر جمنے ہی نہیں پاتیں۔ پس طنز نگار کی جیت اسی میں ہے

---

[1] "TO BURLESQUE ANYTHING MEANS TO MAKE FUN OUT OF IT, NOT OF IT" — STEPHEN LEACOCK (HUMOR & HUMANITY) P. 65

[2] NEW OXFORD DICTIONARY XXII. INTRODUCTIONS.

[3] ARTHUR KOESTLER — LNSIGHT & OUTLOOK P. 95

کہ وہ زندگی اور سماج کی ناہمواریوں کو یوں بڑھا چڑھا کر اور ایسے مزاحیہ انداز سے پیش کرے کہ ہم ان ناہمواریوں کی طرف متوجہ بھی ہو جائیں اور ہمیں طنز نگار کی بات بُری بھی نہ لگے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مزاح کی طرح طنز بھی موازنہ، مبالغہ، لفظی بازیگری اور تحریف وغیرہ کے حربے استعمال کرتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مزاح کے برعکس طنز میں ”نشتریت“ کا پہلو ضرور غالب رہتا ہے اور یہ اپنے نشانۂ تمسخر کے خلاف نفرت کے جذبات کا اظہار ضرور کرتی ہے۔

مزاح اور اس کے اماثل کی یہ بحث طنز و مزاح کے قبیلے کے ایک آخری رکن کا تذکرہ کئے بغیر شاید تشنہ رہ جائے ہماری مراد اس صنفِ ادب سے ہے جسے اصطلاحِ عام میں رمز (IRONY) کہتے ہیں اور جو تخریب کا کامیاب حربہ یعنی ”مبالغہ“ کے برعکس کم بیانی (UNDER STATEMENT) کا سہارا لے کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ آج رمز ادب میں ایک مستقل اور اہم مقام حاصل کر چکی ہے اور اس کا طریق کار یہ ہے کہ مخالف کے دلائل، نظریات اور طریقِ استدلال کو بظاہر تسلیم کر کے یوں بیان کیا جائے کہ اس کے کمزور پہلو نمایاں ہو کر سامنے آجائیں۔ چنانچہ بظاہر یہ کسی شے کا نہایت سنجیدگی اور عقیدت سے ذکر کرتی ہے اور اس سے مکمل اتفاق کرتی ہے لیکن در پردہ اس کی جڑیں بڑی تیزی سے کاٹتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی پیٹو شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ اس بیچارے کو تو آج بھوک ہی نہیں لگی۔ اس نے صرف دس انڈوں، پانچ پراٹھوں اور دودھ کے آٹھ گلاسوں کے ساتھ ناشتہ کیا۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ نہیں جو بیان ہوا بلکہ اس کا قطعی الٹ ہے۔ دوسرے لفظوں میں رمز کرنے والا (LRONIST) مخالف کے نقطۂ نظر کو اپنا کر اس طریق سے بیان کرتا ہے کہ یہ نقطۂ نظر ایک مہمل صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اور دراصل اسی میں رمز کرنے والے کی جیت بھی ہے۔

2007 8
13-12-2011

(۳)

اوپر مزاح اور اس کے اماثل (طنز، تحریف، رمز وغیرہ) کا مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ دیکھنے کی سعی کی گئی ہے کہ اظہار و بیان کے یہ مختلف انداز کیونکر طنزیہ و مزاحیہ ادب کی تخلیق میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اب ہم اردو ادب کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اور ان معلومات کی روشنی میں جو اب تک حاصل ہوئی ہیں اردو ادب میں طنز و مزاح کے ارتقاء کا ایک تاریخی اور تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اس سے قبل کہ ایسا کیا جائے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اردو ادب کی نشوونما میں دو زبانوں کی ادبیات نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ انگریزی اور فارسی۔ چنانچہ اردو کے طنز و مزاحیہ ادب کا جائزہ لینے سے قبل یہ نہایت ضروری ہے کہ انگریزی اور فارسی کے طنز و مزاحیہ ادب کی اہم ترین خصوصیات کا بھی مختصر سا جائزہ لے لیا جائے تاکہ آگے چل کر یہ معلوم ہو سکے کہ طنزیات و مضحکات کے میدان میں ہماری اپنی نگارشات نے کہاں کہاں سے اثرات قبول کئے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے انگریزی ادب کو لیجیے جس کی نمایاں ترین خصوصیت ”خالص مزاح“ کی ابتداء

اور اس کا تدریجی ارتقاء ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں طنز کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اور اگرچہ انگریزی ادب میں بھی طنز کے اچھے نمونے ملتے ہیں تاہم یہ بات شاید انگریزی ادب ہی سے مخصوص ہے کہ یہاں مزاح طنز کا لبادہ اوڑھے بغیر نمودار ہوا اور ادب اور معاشرے میں ایک مخصوص مقام حاصل کرتا چلا گیا۔ انگریزی ادب میں خالص مزاح کی اس بے محابا آمد کی پہلی وجہ تو انگریزی فضا کا وہ گھریلو پن ہے جو اس ملک کی ہر شئے پر ایک لطیف دھند کی طرح مسلط ہے۔ دوسری وجہ انگریزی کردار کی وہ انفرادیت اور ناہمواری ہے جو انگریزی فضا، انگریزی خاندان اور نتیجتہً انگریزی ادب میں ایک ''مزاحیہ کردار'' کی صورت میں بڑے بھرپور انداز میں موجود ہے اور تیسری وجہ سکون اور عافیت کی وہ فضا ہے جو بیرونی حملوں اور ملکی انقلابوں سے بڑی حد تک محفوظ رہی اور جس کے باعث انگریزی خاندان کے حلقے میں بھی سکون و عافیت کا دور دورہ رہا۔

لیکن انگریزی ادب کا خالص مزاح آغاز کار ہی سے انگریزی ادب کا طرۂ امتیاز نہیں رہا۔ دراصل یہاں ''خالص مزاح'' کا عروج نسبتاً ایک جدید تر واقع ہے۔ اور انیسویں صدی سے قبل اس کا وہ مخصوص رنگ غائب ہے جو انیسویں صدی کے خمس اول میں جین آسٹن کی تحریروں سے نمودار ہوا۔ اور جو کال ورلے تک پہنچتے پہنچتے بمشکل اپنے بھرپور انداز سے ظاہر ہو سکا۔ مگر یہ بات مستثنیات کے تابع ضرور ہے۔ چنانچہ مزاح کے ہلکے رنگوں کو شیکسپیئر، سٹرن، شیریڈن اور ایڈیسن کی تحریروں میں بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر اس طویل دور میں طنز، تحریف اور رمز ہی کا تسلط نظر آتا ہے۔

انگریزی ادب میں طنزیات و مضحکات کا آغاز چاسر سے ہوا۔ چاسر کے اشعار میں بلند قہقہوں کے پہلو بہ پہلو لطیف رمز کے بھی خاصے اچھے نمونے ملتے ہیں وہ ہم پر بھی ہنستا ہے اور خود پر بھی اور بہ حیثیت مجموعی زندگی کی طرف اس کا ردعمل ہمدردانہ ہے۔

چاسر کے بعد انگریزی ادب میں اگلا اہم نام شیکسپیئر کا ہے۔ دراصل شیکسپیئر ہمارے انگریزی ادب میں ایک روشنی کے مینار کی طرح سربلند کھڑا ہے۔ اور جس صنف ادب میں بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے اس کے نقوش ابدی طور پر ثبت ہو گئے ہیں۔ چنانچہ طنز و مزاح کے ضمن میں بھی شیکسپیئر کے ہاں ایک انفرادی رنگ نظر آتا ہے وہ اگر عیب جوئی بھی کرتا ہے تو اس مقصد کے ساتھ نہیں کہ کسی کا مضحکہ اڑایا جائے بلکہ اس لیئے کہ محظوظ ہوا جائے۔ اس کی دنیا میں تحمل، حسن سلوک اور ہمدردی کے عناصر بہ کثرت ملتے ہیں اور یہی چیزیں دراصل مزاحیہ ادب کی جان ہیں۔

شیکسپیئر کا دور انگلستان کی عظمت کا دور ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے ایک ایسا انحطاط پذیر زمانہ آتا ہے۔ جس میں مذہبی جنون اور بدلے ہوئے سماج نے زندگی کو نئے نئے رنگ تفویض کر دیے ہیں چنانچہ اس دور میں یا تو ملٹن (   ) جیسے بے حد سنجیدہ فن کار ملتے ہیں یا ڈرائیڈن (DRYDEN) پیپس (PEPYS) اور بٹلر (BUTLER) جیسے طنز کے گرویدہ۔ مجموعی طور پر اس زمانے کے ادب میں طنز اور رمز ہی کی فراوانی ہے۔

یہ دور سترھویں صدی اور ریسٹوریشن کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں طنز کے لئے جو میدان تیار ہوا وہ اس سے اگلی صدی

میں کچھ اور بھی وسعت اختیار کر گیا۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی میں شعر کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی طنز، تحریف اور رمز کی دخل اندازی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں شعری تخلیقات میں پوپ (POPE) کی تیز طنز اور نثر میں سوئفٹ (SWIFT) کی شدید رمز کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ وہاں ڈرامے میں ہم شیریڈن (SHERIDAN) اور گولڈسمتھ (GOLDSMITH) کے پرلطف قہقہوں اور ناول میں فیلڈنگ کی سنجیدہ رمز اور اسٹرن (STERNE) کے ہمدردانہ مزاح سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ اسی دور کی ایک اور نمایاں خصوصیت انگریزی مضمون نگاری (ESSAY-WRITING) کا وہ عروج بھی ہے جو ایڈیسن (ADDISON) اور اسٹیل (STEELE) کی تحریروں کا رہینِ منت ہے۔ ان دونوں مضمون نگاروں نے نہ صرف انگریزی نثر میں سادگی اور جاذبیت پیدا کی بلکہ اسے وہ خوشگوار اور پرلطف اندازِ نگارش بھی بخشا جو آگے چل کر خالص مزاح کی نمو میں ایک بنیادی عنصر ثابت ہوا۔

انگریزی ادب میں اٹھارھویں صدی کا ربع آخر اور انیسویں صدی کا خمسِ اوّل اس لحاظ سے خاصے اہم ہیں کہ اس عرصے میں دو ایسے فن کار پیدا ہوئے جنھوں نے ادب میں خالص مزاح کے نقوش کو نمایاں کرنے میں ایک اہم حصہ لیا۔ ان میں سے ایک مرد تھا، چارلس لیمب (CHRLES LAMB) اور دوسری عورت، جین آسٹن (JANE AUSTEN) چارلس لیمب کے مضامین ایڈیسن اور اسٹیل کی سی خوشگوار لطافت کے حامل ہیں۔ لیکن یہاں مزاح نسبتاً زیادہ لذیذ ہے۔ چارلس لیمب کی اپنی زندگی ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو آزادی اور مسرت سے محروم کسی تنہا سڑک پر بڑھتا چلا جائے اور سڑک کے اختتام پر ایک تاریک کنواں منہ کھولے اس کا منتظر ہو۔ لیکن اس کی تصانیف میں بلا کی زندگی اور زندگی سے انتہائی شغف کی ایک داستان مضمر ہے اور اسی چیز نے اس کے مزاح میں بھی توانائی پیدا کر دی ہے۔

اس دور کی ناول نگار جین آسٹن کے ناولوں میں پہلی بار خالص مزاح کا نکھرا رنگ ملتا ہے۔ وہ رنگ جس کو بعد ازاں شوخ ہو کر انگریزی میں خالص مزاح کی تکمیل یافتہ صورت میں نمودار ہونا ہے۔ جین آسٹن کے مزاح کا مزاج انتہائی ٹھنڈا ہے اور یہ مزاح بیشتر اوقات مضحک کرداروں کے گرد گھومتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ انگریزی کے مخصوص مزاح سے قریب تر ہے۔

انگریزی ادب میں انیسویں صدی ناول کے آغاز و عروج کا زمانہ ہے اور ناول کی وساطت سے مزاحیہ کردار کی تخلیق کا بھی دور ہے۔ چنانچہ جین آسٹن کے مزاحیہ کرداروں کے فوراً بعد چارلس ڈکنس کے بے شمار ایسے کردار ملتے ہیں جو اپنی کسی نہ کسی ناہمواری کے باعث مزاحیہ رنگ اختیار کر جاتے ہیں۔ ڈکنس کردار نگاری کا بادشاہ ہے اور اس کے ناولوں میں جو کم و بیش ایک ہزار نو سو (۱۹۰۰) کردار ملتے ہیں ان میں سے بیشتر مزاحیہ کرداروں کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ کردار اس شدید ہمدردی اور شفقت کی غمازی کرتے ہیں جو ان کی تعمیر میں صرف ہوتی ہے اور جو بالعموم صحیح مزاحیہ کردار کی تخلیق کی ضامن ہوتی ہے علاوہ ازیں ڈکنس کے ناولوں میں واقعے سے پیدا ہونے والا مزاح کردار کے مزاح سے ہم آہنگ بھی نظر آتا ہے اور یہی وہ انفرادی انداز ہے جس نے ڈکنس کے مزاح کو تقویت بخشی ہے۔

اس دور میں ڈکنس کے ساتھ ساتھ تھیکرے (THACKERY) کا نام بھی ہماری توجہ کا طالب ہے۔ تھیکرے کے مزاح کا مخصوص رنگ یہ ہے کہ وہ مسکراتا ہے، پھر سنجیدہ ہو جاتا ہے، پھر مسکراتا ہے، اپنے شانوں کو جھٹکتا ہے اور زندگی کی

بوالعجبیوں کو بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے۔ تھیکرے کے آرٹ میں بڑی حقیقت نگاری ہے اور یہی چیز اسے زندگی کے بہت بڑے محتسب کا درجہ بخش دیتی ہے۔ علاوہ ازیں تھیکرے ہی نے پہلی بار نثر میں تحریف کے رنگ کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔

انیسویں صدی میں چارلس ڈکنس کے علاوہ پی کاک (PEACOCK) کے ناولوں میں بھی مزاح کی کارفرمائی نظر آتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پی کاک کے ناول دس میں سے نو حصے محض مزاح ہیں تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

اسی دوران میں شاعری کے ضمن میں بھی بعض شعراء نے مزاح نگاری کو پروان چڑھایا ان میں کالورلے (CALVRLEY) سٹیفن (STEPHEN) اسکوائر (SQUIRE) اور سوئن برن (SWINBURNE) کے نام خاصے اہم ہیں۔

اور اب ہم اس رہگذر کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں انگریزی مزاح نے اپنے قدم پوری طرح سے جما لئے ہیں اور اس میں تنوع، گہرائی اور نکھار پیدا ہو چکا ہے۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کے طویل عہد حکومت کا وہ درمیانی زمانہ ہے جب انگریزی مزاح ایک ایسی نئی روش اختیار کرتا ہے جسے بے معنی مزاح (NONSENSE HUMOUR) کے نام سے پکارا جاتا ہے بے معنی مزاح ایک پُراسرار طریق سے انگریزی ادب کی دونوں ممتاز خصوصیات کو یکجا کر کے پیش کرتا ہے۔ دراصل یہ ایک طرح کا فرار ہے جو ناظر کو عقل و خرد کے جہان سے رخصت دلا کر ایک پاگل دنیا میں لے جاتا ہے — ایک ایسی دنیا میں جہاں حماقت (ABSURDITY) نے شاعرانہ لباس پہن لیا ہے اور بے ڈھنگا پن ابھر کر یوں نمایاں ہوا ہے کہ قہقہے ہونٹوں کے قفل توڑ کر باہر نکل آئے ہیں اور ساری فضا بہجت سے لبریز ہو گئی ہے۔ اس مزاح کو عام کرنے والوں میں ایڈورڈ لیئر (EDWARD LEAR) لیوس کارول (LEWIS CARROLL) اور گلبرٹ (GILBERT) کے نام خاصے اہم ہیں

اور اب بیسویں صدی — وہ صدی جس کے انگریزی ادب میں خالص مزاح کا رنگ دن بدن نکھرتا چلا جا رہا ہے اور مزاح طنز کی نشتریت سے آزاد رہ کر ایک بالکل نئی صورت اختیار کر رہا ہے۔ جیکب[1] (JACOBS) جیروم کے جیروم (LEROME - K - JEROME) سٹیفن لی کوک (STEPHEN LEACOCK) ووڈھاؤس (WOODEHOUSE) اور مارک ٹوئن یہ سب اس نئے مزاح کے نمائندے ہیں۔

انگریزی ادب کے برعکس فارسی ادب میں طنز و مزاح کی داستان ایک تشنہ اور نامکمل سرگزشت کی حیثیت رکھتی ہے۔ فارسی ادب میں نہ صرف طنز و مزاح کے تدریجی ارتقاء کا قطعی فقدان ہے بلکہ یہاں وہاں ایسے طنز نگار اور مزاح نگار بھی نظر نہیں آتے جن کا زوردار الفاظ میں ذکر کر دیا جائے۔ ایران میں طنز کے فروغ نہ پانے کی وجہ یہ ہے کہ طویل اسلامی عہد کی ثقاہت ہزل آمیز پیرایۂ اظہار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے طنز اغماض و درگزر کی طالب ہوتی ہے اور سرزمین ایران کے ادباء اور عوام میں وہ فراخ حوصلگی موجود نہیں تھی جو اس کے فروغ میں مدد دیتی۔ جہاں تک مزاح کا تعلق ہے اس کے فقدان کا باعث یہ ہے کہ ایران کی مجلسی اور سماجی زندگی مسلسل انتشار، اور افراتفری، پیہم قتل و غارت گری اور یکے بعد دیگرے چنگیزی و تیموری حملوں سے

---

[1] ہم نے امریکن اور انگریز مزاح نگاروں کو یہاں ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور یہ اس لئے کہ یہ سب جدید انگریزی مزاح کے نمائندے ہیں ویسے انگریزی اور امریکی مزاح کے رنگوں میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے لیکن یہاں اس فرق کو زیر بحث لانا مسئلے کو غیر ضروری طور پر طول دینے کے مترادف ہوگا۔

اس درجہ متاثر رہی کہ سکون و عافیت کا وہ طویل دور اسے نصیب ہی نہ ہو سکا جو مزاح کے نشو و ارتقا کے لئے ازبس ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ فارسی ادب میں جو تھوڑا بہت مزاح پیدا ہوا وہ کچھ تو محض "ہنگامی فرار" کی حیثیت رکھتا تھا اور باقی ماندہ نے گالی گلوچ، پھکڑپن اور ہجو کی صورت اختیار کر لی اور یوں مزاح کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے سے قاصر رہا۔

پس جس وقت فارسی زبان میں طنز و مزاح کا ذکر آتا ہے تو لامحالا ہم فارسی طنز و مزاح کے تدریجی ارتقاء کی بجائے ان طنزیہ و مزاحیہ روشوں کے تذکرے کی طرف مائل ہوتے ہیں جو فارسی زبان کے طویل دور میں اُبھری ہیں اور جو بلاشبہ اردو شاعری میں طنز و مزاح کے پہلے دور پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔

ان میں سے پہلی رَو ہجو کی رَو ہے۔ ہجو کی اس رَو کا آغاز فارسی شاعری کے باوا آدم رودکیؔ سے ہوتا ہے لیکن رودکیؔ کے کلام میں ہجویہ اشعار کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ پھر بھی رودکیؔ کی ہجو میں متانت اور واقعیت ضرور ہے۔ ہجو کے سلسلے میں اگلا نام فردوسیؔ کا ہے اور اگرچہ فردوسیؔ کو بھی ہجو گو شاعر کا درجہ نہیں دیا جا سکتا تاہم فردوسیؔ کے نام کے ساتھ محمود غزنوی کی جو ہجو وابستہ ہے وہ اس قدر زبان زد خاص و عام ہو چکی ہے کہ اس ضمن میں اسے نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ اس ہجو کے یہ اشعار خاص طور پر مشہور ہیں ؎

بکے بندگی کردم اے شہریار　　کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
بپے افگندم از نظم کاخ بلند　　کہ از باد و باراں نیابد گزند
بسے رنج بردم دریں سال سی　　عجم زندہ کردم بدیں پارسی
اگر شاہ را شاہ بودے پدر　　بسر بر نہادے مرا تاج زر
دگر مادر شاہ بانو بدے　　مرا سیم و زر تا بزانو بدے
ازاں گفتم ایں بیت ہائے بلند　　کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا　　بماند ہجا تا قیامت بجا

فارسی زبان میں ہجو دراصل پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی اور سلجوقیہ کے زمانۂ عروج میں نمودار ہوئی۔ بقول شبلی نعمانی ـــ
"شاعری کے چمن میں ہجو کا خارزار اسی عہد کی یادگار ہے جس کے چمن آرا انوریؔ اور سوزنیؔ ہیں[1]"، لیکن انوریؔ اور سوزنیؔ کے ہاں ہجو کا مزاج بہت تیز ہے۔ اور یہ بیشتر اوقات فحش گوئی اور گالی گلوچ کی سرحدوں تک جا پہنچتی ہے۔ انوریؔ کے متعلق تو یہ بات خاص طور پر مشہور ہے کہ ذرا کسی سے رنجیدہ ہوا اور اس کی ہجو لکھ ڈالی۔ اردو شاعری کے سوداؔ نے تو خاص طور پر انوری سے اثر لیا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ سوداؔ کی گھوڑے کی ہجو انوریؔ کے گھوڑے کی ہجو کی صورت میں نمودار ہوئی بلکہ انوریؔ کے پست ہجویہ انداز کو بھی سوداؔ نے تقلید کے قابل سمجھا اور ایسی بہت سی ہجویں لکھیں جو آج کے زمانے میں قطعاً ناقابل قبول ہیں۔

فارسی ہجو کے مزاج میں تبدیلی کمال اسماعیل خلاق المعانی اصفہانی کی رہین منت ہے۔ ہجو جو سوزنیؔ اور انوریؔ کے ہاں اوباشوں کی زبان کا درجہ اختیار کر گئی تھی کمالؔ نے اس میں اعتدال اور توازن پیدا کیا۔ اور اسے اس درجہ قابل قبول بنایا کہ جس

---

[1] شبلی نعمانی۔ شعر العجم جلد اول صفحہ ۱۸۱

شخص کی ہجو کی جاتی تھی وہ خود بھی اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ چنانچہ کمالؔ کو یہ کمال حاصل ہے کہ اس کی ہجو کے ڈانڈے ابتذال اور فحش گوئی سے کٹ کر مزاح اور سچی ظرافت کی سرحدوں سے جا ملتے ہیں۔ کمالؔ کے ہجو یہ انداز کی قدر و قیمت کا ہلکا سا اندازہ اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے جس میں کمالؔ نے ایک بخیل کی ہجو کی ہے۔

دے مرا گفت دوستے کہ مرا   با فلاں خواجہ از پئے سرکار
سخنے چند ہست واو از پئے آں   خلوتے مے ببایدم ناچار
خلوتے آں چناں کہ اندر وے   ہیچ مخلوق را نباشد بار
گفتم ایں فرصت از توانی یافت   وقتِ نان خوردنش نگہ مے دار

کمالؔ اسماعیل کے زمانے میں ان کے معاصر سلمان ساوجیؔ نے بھی ہجویات لکھیں لیکن ان کی ہجویات میں کمالؔ کی سی بات کہاں؟

فارسی ادب میں طنز و مزاح کی دوسری رو زاہد سے چھیڑ چھاڑ اور رندی و سرمستی کے اشعار کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں پہلا نام عمر خیامؔ کا ہے جس کے کلام میں رندی و سرمستی کے عناصر کی فراوانی ہے۔ عمر خیام نہ صرف مئے ارغواں اور ساقی گلفام کا دلدادہ ہے بلکہ وہ بالعموم زندگی کی ہماہمی انتشار اور بد مزگی کو "غرقِ مئے ناب" بھی کرتا ہے۔ پھر خیام کے ہاں زندگی کی مسلمہ اقدار کو ایک ایسے نئے زاویے سے دیکھنے کا رجحان بھی ملتا ہے کہ ان اقدار کے مضحکہ خیز پہلو ابھر کر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں خدا کے ساتھ شریر لڑکوں کا سا برتاؤ اس کے بہت سے اشعار میں موجود ہے اور غالباً یہی شریر انداز ہے جس سے خیام نے زاہد کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے میں خیامؔ کی یہ رباعی بہت مشہور ہے۔ ؎

زاہد بزنِ فاحشہ گفتا مستی   بگزر کہ بگسستی و چوں پیوستی
زن گفت چنانکہ مے نمایم ہستم   تو نیز چنانکہ مے نمائی ہستی

لیکن اگرچہ زاہد سے چھیڑ چھاڑ کا رحجان خیامؔ کے ہاں موجود ہے تاہم دراصل اس ضمن میں اوّلیت کا سہرا سعدیؔ شیرازی کے سر ہے اور وہ اس طرح کہ خیامؔ نے جو بات اپنی رباعیوں میں صاف صاف اور کھلے انداز میں کہی سعدیؔ نے اسے ذرا چھپا کر پیش کیا اور یوں بالواسطہ انداز اختیار کر کے طنز کے ایک اہم اصول کی پیروی کی۔ سعدیؔ کا مشہور شعر ؎

گر کند میل بہ خوباں دلِ من خوردہ مگیر
کیں گناہ ایست کہ در شہر شما نیز کنند

طنز میں ایک نئے رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بات کو کھلے ہوئے اور سپاٹ انداز سے پیش کرنے کی بجائے بالواسطہ طریق سے پیش کرنے کی کوشش صاف ظاہر ہے۔

رندی و سرمستی اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ کی اس رو کے ترجمان خیامؔ اور سعدیؔ کے علاوہ خسروؔ اور حافظؔ بھی ہیں لطف ادا اور جدتِ اسلوب کے موجد سعدی تھے۔ لیکن اس ضمن میں امیر خسروؔ نے بھی اسلوب کے سینکڑوں نئے پیرائے پیدا کئے خسروؔ کا مشہور شعر ؎

زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

اس کے اسلوب کی جدت کا نمایاں ثبوت ہے۔

لیکن فارسی ادب میں رندی و سرمستی اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے میں سب سے اہم نام حافظؔ شیرازی کا ہے حافظؔ کے کلام میں مسرت و بہجت کا عام انداز، ان کے بات کرنے کا انوکھا ڈھنگ اور ان کی زاہد اور محتسب پر برجستہ اور مہذب چوٹیں اپنی مثال آپ ہیں ؎

ساقیا برخیز و درده جام را ـــــ خاک بر سر کن غم ایام را
واعظ شہر کہ مردم ملکش می خوانند ـــــ قول ما نیز ہمیں است کہ او آدم نیست
گر ز مسجد بہ خرابات شدیم عیب مگیر ـــــ مجلس وعظ دراز است و زمان خواہد شد

طنزیات و مضحکات کی تیسری قابلِ ذکر رو پیروڈی یا تحریف کی رو ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ایران میں ایسے تحریف نگار پیدا ہوئے جن کی تحریفیں پیروڈی کے معیار پر پورا اترتی ہیں بلکہ صرف یہ کہ فارسی زبان کے محدود طنزیہ و مزاحیہ ادب میں یہ رَو موجود ضرور ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں اسے وہ فروغ حاصل نہیں ہوا جو اس کا قدرتی حق تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگرچہ ایران کی فضا تحریف کے لئے بے حد سازگار تھی اور تحریف نگاری کے بیشتر عناصر بھی ایرانی معاشرت میں موجود تھے تاہم جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ایک تو بعض مذہبی قیود نے طنز و تحریف کو پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ اور دوسرے ایرانی عوام اور ادبا میں اغماض و درگزر کی وہ جملہ خصوصیات بھی موجود نہیں تھیں جو طنز و تحریف کے فروغ بے مثال کے لئے بے حد ضروری ہیں چنانچہ فارسی ادب میں طنز کی طرح پیروڈی کے فروغ کی ممکنات بھی دب کر رہ گئیں۔

لیکن اس سب کے باوجود فارسی ادب میں تین ایسے تحریف نگار ضرور ملتے ہیں جن کا تذکرہ یہاں ضروری ہے ـــ عبید زاکانی، ابو اسحاق اطعمہ اور نظام الدین محمود قاری یزدانی البسہ ـــ ان میں سے عبید زاکانی اپنی تحریفات کے علاوہ نظم و نثر میں طنزیہ طریق کار کے لئے بھی مشہور ہیں۔ جہاں تک تحریفات کا تعلق ہے۔ عبید زاکانی نے زیادہ تر ان کا سہارا لے کر بعض فارسی شعرا کے کلام کا اس طریق سے مضحکہ اڑایا ہے کہ خود ان شعرا کی تضحیک ہو سکے۔ براؤن[1] کے قول کے مطابق ان تحریفات میں سے بیشتر نچلے درجے کی ہیں اور اہل فارس انہیں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ البتہ طنزیات و مضحکات کے ضمن میں عبید زاکانی کی بعض تصنیفات یقیناً قابلِ قدر ہیں۔ مثلاً "اخلاق الاشراف" میں انہوں نے اپنے زمانے کے پست اور غیر اخلاقی رجحانات پر زوردار طنز کی ہے۔ اسی طرح انہوں نے "تحریفات" میں بعض چھپی ہوئی بے اعتدالیوں کو منظرِ عام پر لانے اور سماج کے بعض مخصوص میلانات کو ہدفِ طنز بنانے کی کوشش کی ہے۔ عبیدؔ کی دوسری تصانیف "ریش نامہ" اور "موش و گربہ" بھی طنز و مزاح کے سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔

فارسی زبان کے دوسرے اہم تحریف نگار ابو اسحاق اطعمہ ہیں۔ اطعمہ نے بہت سے فارسی شعرا کا کلام تحریف کیا ہے اور اپنی تحریفات میں التزاماً کھانوں کے نام گنوائے ہیں۔ اطعمہ کی تحریفوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں اور اصل کلام میں اگر کوئی ربط ہے تو صرف اس قدر کہ اصل کلام اور تحریف دونوں کی زمین ایک ہی ہے۔ چنانچہ یہ تحریفیں پیروڈی کا کوئی بلند

---

[1] BROWNE-LITERARY HISTORY OF PERSIA. VOL III, P. 299

نمونہ پیش نہیں کرتیں۔ اطعمہ تحریف کا انداز کچھ اس قسم کا ہے۔ شاہ نعمت اللہ کا ایک قطعہ تھا ؎

گوہر بحر بے کراں مائیم   گاہ موجیم و گاہ دریائیم
ما بدین آمدیم در دنیا   کہ خدا را بخلق بنمائیم

اطعمہ نے اس کی تحریف یوں کی ؎

رشتۂ لاک معرفت مائیم   گہ خمیریم و گاہ بغرائیم
ما ازاں آمدیم در مطبخ   کہ بابا بچہ قلیہ بنمائیم

اطعمہ کی بیشتر تحریفات ان کی کتاب "کنز الاشتہا" میں موجود ہیں۔ یہ کتاب پہلے نایاب تھی لیکن ۱۸۸۵ء میں مرزا حبیب اصفہانی نے اس کا ایڈیشن نکالا اور عوام پہلی بار اس سے متعارف ہوئے۔

ابو اسحٰق اطعمہ نے تو پھر بھی ایک نیا راستہ نکالا۔ لیکن فارسی زبان کے تیسرے تحریف نگار یعنی البسہ نے محض اطعمہ کی نقل پر ہی اکتفا کیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جہاں ابو اسحاق اطعمہ تحریف کرتے ہوئے مختلف کھانوں کے نام لیتا تھا وہاں البسہ نے ان کی جگہ مختلف لباسوں کے نام لینے شروع کئے اور اسی نسبت سے اپنا تخلص البسہ رکھا۔ ان کے علاوہ فارسی زبان میں اور کوئی قابلِ ذکر تحریف نگار نہیں۔ البتہ جدید ترین فارسی ادب میں صحیح پیروڈی کی طرف رجحان عام ہو رہا ہے اس ضمن میں میرزا ابو الحسن خندہ یغما، مرزا جلال الدین اور ذبیح اللہ بہروز کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فارسی زبان و ادب میں طنز و مزاح کی آخری دورہ[1] ہے جو ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۹ء کے انقلاب کے بعد نمودار ہوئی اور جو آج بھی سرزمین ایران میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ طنز و مزاح کی اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر پہلی بار ایران کی سیاسی بیداری نے نمایاں اثرات مرتسم کئے ہیں۔ چنانچہ اس کا مزاج بھی زیادہ تر صحافتی ہے۔ دوسری خصوصیت اس دور کی یہ ہے کہ اس پر پہلی بار طنز و مزاح کے مغربی نظریات نے اثر ڈالا ہے۔ نتیجتہً ایرانی ادباء کے ہاں طنز و مزاح کے مغربی حربوں کے استعمال کی طرف ایک تازہ رجحان بھی ملتا ہے۔

آج کے فارسی ادب اور صحافت میں طنز و مزاح کے سلسلے میں مرزا علی اکبر دہخدا کا نام قابلِ ذکر ہے کہ روزنامہ "صور اسرافیل" کا فکاہی کالم "چرند و پرند" ان ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ویسے دہخدا نے اپنے ملک کے ان طبقات کو زیادہ تر ہدفِ طنز بنایا ہے جو ایران کی ترقی میں سدِ راہ تھے۔ اسی طرح صادق ہدایت اور مسعود فرزاد نے سیاست اور سماج پر نکتہ چینی کے سلسلے میں نام پیدا کیا ہے ــــ اور فریدون تولّلی نے ترقی پسند نقطۂ نظر سے طنز کا وسیع استعمال کیا۔ ان کے علاوہ طنز و مزاح کے سلسلے میں ابو القاسم حالت اور مہدی سہیلی کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں

جدید فارسی دور کی ایک خصوصیت بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس میں بعض مزاحیہ روزنامے مثلاً "حاجی بابا" "بابا شمل" "توفیق" اور "چنگر" بھی منصۂ شہود پر آئے لیکن اب ناگزیر حالات کے باعث یہ سارے روزنامے بند ہو چکے ہیں۔

---

[1] اس سلسلے میں "نخستین کنگرہ نویسندگان ایران" تیر ماہ ۱۳۲۵ء مطبوعہ تہران میں ڈاکٹر پرویز خانلری کے مقالے "نثر فارسی در دورہ اخیر" کا مطالعہ ضروری ہے۔

اُردو ادب میں طنز و ظرافت

کلیم الدین احمد

(۱)

زندگی درد و غم کا دوسرا نام ہے۔ ہماری زندگی ہی ہماری مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔ ہم اس دنیا میں ستائے جانے کے لئے لائے گئے ہیں۔ انسان کمزور ہے اور اس کا ماحول لاپروا۔ انسان حساس ہے اس لئے اس کا دل بہ آسانی رنج و الم کا نشانہ ہو سکتا ہے۔ اس کے دل میں فطرت نے ایسی امنگیں، ایسی تمنائیں ڈال دی ہیں کہ وہ فطری طور پر ان امنگوں، ان تمناؤں کو عملی جامہ پہنانے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن جہاں اس کی تمناؤں نے عملی صورت اختیار کی وہیں اس کی تکلیفوں کی داستان شروع ہو گئی کیونکہ جس دنیا میں اسے لایا گیا ہے وہ اس کی تمناؤں کی مطلق پروا نہیں کرتی۔ یہ دنیا اس کی تمناؤں سے آگاہ ہے اور نہ ان سے آگاہ ہونا چاہتی ہے۔ کمزور لیکن حساس انسان اس بے حس لیکن طاقتور دنیا سے ٹکراتا ہے اور تکلیفیں سہتا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت ہے لیکن یہ پوری حقیقت نہیں۔ اگر یہی پوری حقیقت ہوتی تو شاید زندگی دشوار ہو جاتی۔ زندگی میں ایسے واقعات ایسے مناظر، ایسے لمحے بھی آتے ہیں۔ جب انسان اس تلخ حقیقت کو وقتی طور پر بھول جاتا ہے۔ پس منظر میں ہمیشہ یہی تلخ حقیقت ایک مہیب دیو کی طرح موجود رہتی ہے۔ لیکن پیش منظر میں اکثر ایسے واقعات، ایسے مناظر، ایسے متبسم لمحے بھی ملتے ہیں کہ انسان اس خوفناک اور تاریک پس منظر کے باوجود بھی مسکرا اٹھتا ہے یا قہقہے بلند کرتا ہے۔ یہ واقعات، مناظر اور لمحے بھی زندگی کے اجزا ہیں اور جو حضرات انہیں پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ یونان کے گریاں فلسفی کی طرح زندگی سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے۔

کہا گیا ہے کہ انسان ہنسنے والا جانور ہے۔ یہ پوری حقیقت نہیں لیکن اس مقولے میں انسان کی ایک اہم خصوصیت کا انکشاف ہے۔ فطرت نے انسان کو ہنسی کا مادہ عطا کیا ہے۔ اور ہنسی مختلف وجوہ کی بنا پر آتی ہے۔ یہاں ہنسی کی ماہیت اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے کا موقع نہیں۔ یہ بات مسلّم ہے کہ ہم ہنستے ہیں جیسے ہم غصہ کرتے ہیں، نفرت یا محبت کرتے ہیں، جاگتے یا سوتے ہیں اور ہنسی ہماری صحت کے لئے ضروری ہے۔ اگر ہنسی کا مادہ انسان سے سلب کر لیا جائے اگر وہ اسباب نیست و نابود ہو جائیں جن کی وجہ سے ہم ہنستے ہیں تو پھر انسان ممکن ہے کہ فرشتہ ہو جائے لیکن وہ انسان باقی نہ رہے گا۔ غالباً فرشتے ہنستے نہیں اور ہنسی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جہاں ہر شے مکمل، موزوں و متناسب ہو وہاں ہنسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہنسی عموماً عدم تکمیل، بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے جسے اس کا احساس نہیں یعنی جسے ہنسی نہیں آتی اسے ہم انسان شمار نہیں کرتے۔ ادب میں انسان کے تمام دماغی اوصاف، اس کے سارے حواس کو بروئے کار

لایا جاتا ہے۔ ہنسی بھی ایک انسانی خصوصیت اور زندگی کی ناتمامی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ادب میں اس کا بھی وجود ناگزیر ہے ادب زندگی کے ہر شعبے، زندگی کے نشیب و فراز، زندگی کے جملہ محاسن و معائب کی ترجمانی کرتا ہے، ہنسی بھی انسانی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے اس لئے ادب ہنسی کا ترجمان ہے۔ زندگی کے تمسخر انگیز پہلو کی عکاسی ادب میں اسی قدر ضروری ہے جس قدر زندگی کے رقت انگیز پہلو کی۔ زندگی میں روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، خوشی بھی ہے اور غم بھی، ہم روتے بھی ہیں اور پھر ہنستے بھی ہیں۔ ادب اس روشنی اور تاریکی، اس خوشی اور غم، اس ہنسی اور آنسو کا آئینہ ہے۔ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ ادب کا وہ حصہ جو ہنسی کا ترجمان ہے زیادہ اہم نہیں، یہ محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے اور بس۔ کہا جاتا ہے کہ انسان ہمیشہ سنجیدہ متین زندگی بسر نہیں کر سکتا ہے، وہ ہر وقت اہم پیچیدہ اور گہرے امور میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ اس لئے اسے ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تفریح طبع کی، دل بہلانے کی، دماغ میں شگفتگی پیدا کرنے کی۔ جس طرح ہم روزانہ کام کی تھکن، یک رنگی دشواری سے وقتی نجات حاصل کرنے کے لئے سینما چلے جاتے ہیں۔ بجنسہ اسی طرح ہم سنجیدہ، مشکل تحریروں کے مطالعہ سے تنگ آجاتے ہیں تو ان ہلکی، لطیف تحریروں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن سے سنجیدہ تحریروں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ نقطہ نظر غلط ہے۔ موضوع سنجیدہ ہو یا غیر سنجیدہ، بوجھل ہو یا ہلکا، دشوار ہو یا آسان، پیچیدہ ہو یا سیدھا سادہ، غرض ہر قسم کا موضوع محض خام مواد ہے جس سے ادیب مصرف لیتا ہے، اگر وہ صحیح معنوں میں ادیب ہے تو وہ ہر قسم کے موضوع پر اپنے آرٹ کے سارے ساز و سامان صرف کرتا ہے اور پڑھنے والا دونوں قسم کی تحریروں (سنجیدہ اور مزاحیہ تحریروں) کو ایک نظر سے دیکھتا ہے موضوع مزاحیہ سہی لیکن اگر ادیب نے اپنے موضوع پر بحث کرنے میں صنعت کارانہ سنجیدگی سے کام لیا ہے تو پڑھنے والا بھی اسے سنجیدگی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ موضوع سنجیدہ یا غیر سنجیدہ ہو سکتا ہے لیکن آرٹ ہمیشہ سنجیدہ ہوتا ہے۔ اردو انشاپرداز اس حقیقت سے واقف نہیں۔

میں نے کہا ہے کہ ہنسی عدم تکمیل اور بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ تکمیل سے خالی ہے۔ انسان اور انسانی فطرت میں بھی یہی ناتمامی ہے اس لئے ہنسی کے مواقع کی کمی نہیں۔ دنیا اور زندگی کی ناتمام اور ناموزونیت مسلم ہے ہم محض اس ناتمامی کے احساس کا اظہار کر سکتے ہیں یا اس احساس کے ساتھ ساتھ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ دوسرے احساس کا نتیجہ خالص ظرافت ہے، دوسرے کا نتیجہ ہے طنز اور ہجو۔ خالص ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی شے کو دیکھ کر ہنستا ہے۔ اور دوسروں کو ہنساتا ہے۔ وہ اس نقص، خامی، بدصورتی کو دور کرنے کا خواہش مند نہیں۔ ہجو گو اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اس ناقص و ناتمام منظر سے اس کا جذبۂ تکمیل حسن موزونیت، انصاف جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبے سے مجبور ہو کر اس مخصوص مذموم منظر کو اپنی ظرافت اور طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ نظری اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ خالص ظرافت اور ہجو کی راہیں الگ الگ اور منزلیں جدا جدا ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کو الگ کرنا عموماً دشوار ہے۔

خالص ظرافت نگار ہو یا ہجو گو دونوں صناع ہیں۔ دونوں کے کارنامے تخلیقی ہوتے ہیں۔ ظرافت نگار محض کسی بے آہنگی کا مضحکہ خیز بیان نہیں کرتا وہ اس بے آہنگی کی تخلیق بار دگر کرتا ہے اور اسے دلچسپ سے دلچسپ تر بنا دیتا ہے۔ اس

لحاظ سے ظرافت نگار اور کسی دوسرے صناع میں کوئی بنیادی فرق نہیں وہ بھی مشاہدہ سے کام لیتا ہے۔ اس کی آنکھیں دنیا اور زندگی کے وسیع اور بوقلموں مناظر کو دیکھتی ہیں اور ان میں ایسی چیزوں کا انتخاب کر لیتی ہیں جو اس کے مخصوص آرٹ کے لئے موزوں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے وسعت نظر ضروری ہے وہ دنیا کے ہر گوشے' زندگی کے ہر شعبے سے واقف ہوتا ہے کیونکہ اس کا مواد ہر جگہ اور اگر اسے اپنے فن کی اہمیت کا صحیح احساس ہے تو وہ کسی چیز سے قصداً احتراز نہیں کرے گا وہ اپنا مواد کاوش کے ساتھ جمع کرتا ہے، اس پر غور کرتا ہے، مشاہدہ کی کمی یا بے رنگی کو رنگینی تخیل، رعنائی خیال کی مدد سے پورا کرتا ہے اور دیکھی ہوئی یا تصور کی ہوئی چیزوں کو صنعت کارانہ حسن و صداقت سے مزین کرتا ہے اس کے دل میں اصلاح کا جذبہ موجزن نہیں ہوتا وہ صناع ہے حامی اصلاح نہیں اس کے کارنامے بھی صحیح معنوں میں تخلیقی ہوتے ہیں۔ یہ کارنامے ہماری تفریح کا باعث ہوتے ہیں لیکن تفریح اصل مدعا نہیں۔ اس کا مقصد ایک حسین' مکمل و موزوں کارنامے کی تخلیق ہے جو تفریح ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ ایک حد تک اتفاقی ہے۔

ظرافت نگار کسی مشاہدہ کو دیکھ کر مسکرا اٹھتا ہے لیکن اور کسی قسم کا جذبہ اس کے دل میں نہیں ابھرتا۔ اسی جگہ ظرافت نگار اور ہجوگو کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ہجوگو بے ڈھنگے' ناقص' بدصورت مناظر کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے، ناانصافی، بے رحمی، ریاکاری کی مثالیں دیکھ کر اس کے دل میں نفرت، غضب' حقارت اور اسی قسم کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔ اس کی ہجویں انہی جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں وہ بھی صناع ہے اس لئے وہ اپنے جذبات کو محض سیدھے سادے طور پر بیان نہیں کرتا وہ اپنے جذبات سے ان کی شدت کے باوجود علیحدگی اختیار کر لیتا ہے اور ان سے الگ تھلگ ہو کر انہیں اپنے قابو میں لا کر ان کا صنعت کارانہ اظہار کرتا ہے اور اس صنعت کارانہ اظہار کی وجہ سے جذبات کی شدت میں کمی نہیں زیادتی ہوتی ہے۔ ہجوگو ایک بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوریوں، خامیوں' فریب کاریوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے لیکن ہجوگو انسان ہے اور انسانی حدود میں گھرا ہوا ہے اس لئے اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر اس کی ہجوؤں کی ابتدا کسی ذاتی جذبہ سے ہوتی ہے لیکن اگر وہ اپنے فن کی اہمیت اور اس کی ضروریات سے آگاہ ہے تو وہ اپنے ذاتی جذبہ سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور اسے ایک قسم کی عالمگیری عطا کرتا ہے۔ بہرکیف ہجوگو سارے جذبات پر تصرف رکھتا ہے۔ وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔ وہ ہمدردی، ترحم، انصاف' فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ، بغض، حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے۔ ظرافت نگار کے مقابلے میں اس کی جذباتی دنیا زیادہ وسیع و کشادہ ہے۔

(۲)

ہجو کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ نظم و نثر، عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان دونوں صورتوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں اور جو فرق ہے تو اسے ایک لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی وزن۔ اگر وزن نہ ہو تو پھر ہجو بہ نظم و نثر میں تمیز ممکن نہیں۔ شاعر اور نثر نگار دونوں ہجو کے میدان میں ایک ہی مقصد لے کر گامزن ہوتے ہیں۔ دونوں کی راہیں اور منزلیں ایک ہیں۔ صرف ایک اشہب وزن پر سوار اور دوسرا پیادہ ہے۔ یہ طرز خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شعر اور نثر میں اہم اور بنیادی فرق ہے۔ وزن شعر میں ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں۔ دور حاضر میں بعض مغربی شعراء نے ثابت کر دکھایا ہے کہ وزن شعر کی لازمی خصوصیت نہیں۔ وہ ایک مخصوص صورت

میں اپنے احساسِ شعری کی ترجمانی کرتے ہیں جسے نظم معریٰ کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی نثر کے جملہ کو وزن کے جامہ سے آراستہ کر دیا جائے تو وہ شعر کے زمرہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ شعر ہمارے تجربات، حسین و بیش قیمت تجربات کا حسین و موزوں اور کامل ترجمان ہے۔ نثر میں ہمارے خیالات کا صاف، مختصر اور بے کم و کاست اظہار ہوتا ہے۔ دونوں کی راہیں جدا جدا اور منزلیں الگ الگ ہیں۔ جس طرح غزل یا نظم اور مقالہ میں صنفی اور بنیادی فرق ہے بجنسہٖ اسی طرح ہجویہ نظم اور ہجویہ نثر میں بھی صنفی اور بنیادی فرق ہے۔ اس جگہ ایک دوسری غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ عموماً یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ہجویہ نظم میں شاعری، بلند پایہ شاعری کا وجود ممکن نہیں۔ عام گفتگو میں شاعری جذبات کی ترجمانی کا دوسرا نام ہے۔ ہجویہ نظم میں کسی شخص کے معائب یا کسی عام انسانی نقص کا طنزیہ انکشاف ہوتا ہے۔ اس لئے ان نظموں میں بظاہر جذبات کا (اور جذبات سے خاص قسم کے جذبات مراد ہوتے ہیں) وجود نہیں ہوتا۔ اس روایتی نقطۂ نظر میں جذبات صرف وہی ہیں جن سے غزلیں بھری پڑی ہیں انھی احساسات، مخصوص و محدود احساسات کو شعریت کا حامل سمجھا جاتا ہے جو حسن و عشق سے وابستہ ہوتے ہیں جو بے ثباتی دنیا موت یا زیادہ سے زیادہ وطن کی محبت، آزادی کی لگن سے سروکار رکھتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہجویہ نظم جذبات کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ہجو گو شاعر ناانصافی، بے رحمی، ظلم اور اسی قسم کے انسانی نقائص کے مشاہدہ سے متاثر ہوتا ہے اور اسی مشاہدہ سے متاثر ہو کر اس کا جذبۂ نفرت، غضب، حقارت جوش میں آتا ہے۔ انھی جذبات کا اظہار وہ اپنی نظم میں کرتا ہے۔ اگر جذبۂ عشق ایک پُرزور طاقت ہے تو جذبۂ نفرت بھی ایک طاقتور زور ہے۔ اگر کوئی حسین فطری منظر ہمارے ذوقِ حسن کو بھڑکاتا ہے تو کوئی کریہہ انسانی منظر ہمارے احساس غضب کو برانگیختہ کرتا ہے اگر معشوق کے جسمانی حسن کی تعریف میں ہم رطب اللسان ہو سکتے ہیں تو کسی شخص کے اخلاقی قبح کا حقارت آمیز انکشاف بھی کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہجویہ نظم میں بھی جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور پیمانۂ شعر میں ہر قسم کے جذبات سما سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں جس طرح غزل کے اشعار یا کسی رومانی نظم میں شدت جذبات کا وجود ہو سکتا ہے اسی طرح ہجویہ نظم میں بھی جذبات کی شدت ہو سکتی ہے اور اگر کسی شعر یا نظم میں بلند پایہ شاعری ہو سکتی ہے تو پھر ہجویہ نظم میں بھی بلند پایہ شاعری کا وجود ممکن ہے۔

اردو میں ہجویہ شاعری کو زیادہ فروغ نہ ہوا۔ ریختی اور ہزلیات سے یہاں بحث نہیں۔ خالص ہجو کی طرف بہت کم شعراء نے توجہ کی اور ان میں صرف دو چار ہی کم و بیش کامیاب ہوئے۔ سوداؔ کے معاصرین میں مکینؔ، ضاحکؔ وغیرہ نے اس میدان میں تگ و دو کی لیکن آگے نہ بڑھ سکے۔ انشاؔ مصحفیؔ کی نوک جھوک سے دنیا واقف ہے لیکن ان کی ہجویں محض ذاتی بغض و عناد کی ترجمان ہیں اور اس قسم کی ہجووں میں بھی ان کا رتبہ بلند نہیں۔ اودھ پنچ کے سلسلے میں شہبازؔ، ظریفؔ وغیرہ نے اس صنف میں بھی طبع آزمائی کی مگر کوئی زندہ کارنامہ نہ پیش کر سکے۔ موجودہ زمانے میں بعض ترقی پسند شعراء نے اور ان کے ہم مسلک شعراء نے طنز و ظرافت سے کام لیا۔ لیکن ان کی طنز و ظرافت محض سطحی ثابت ہوئی۔ اردو میں صرف چار شعراء ایسے ہیں جن کی ہجویہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ یعنی سوداؔ، اکبرؔ، اقبالؔ اور جوشؔ۔

رشید احمد صاحب کہتے ہیں۔

> بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث

برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اس معیار پر سودا کی ہجویں تمام و کمال پوری نہیں اترتیں"۔

یہ صحیح نہیں۔ ہجوگو شاعر اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر و بیشتر کسی ذاتی جذبۂ عناد، بغض و تعصب سے متاثر ہو کر آمادہ ہجوگوئی ہوتا ہے اس لئے عموماً ہجووں میں ذاتی عنصر کا وجود ناگزیر ہے۔ اساسی شرط یہ ہے کہ شاعر اپنے جذبہ کو عالمگیری عطا کر سکے یعنی وہ اپنی شخصیت کو علیحدہ کر کے اپنے جذبۂ نفرت و غضب کو عام انسانی نقائص کے خلاف برانگیختہ کر سکے۔ مثلاً زید، عمرو، بکر یعنی کسی فرد یا سماج نے شاعر کے ساتھ ناانصافی برتی۔ اس ناانصافی کی وجہ سے اس کے دل میں غم و غصہ نے ہیجان برپا کیا کامیاب ہجوگو شاعر اپنے جذبات کے ہیجان کو قابو میں لاتا ہے اور مخصوص واقعہ سے قطع نظر کر کے ناانصافی، عالمگیر ناانصافی کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے "ذہن و فکر کی بے لوث برہمی" کے نمونے کم ملتے ہیں۔ شاعر انسان ہے اور اس کے جذبات ذاتی ہوتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ اپنے ذاتی جذبات کو عالمگیر بنا سکتا ہے لیکن جب تک وہ فرشتہ یا خدا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک وہ "ذہن و فکر کی بے لوث برہمی" کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ہجوگو انسان ہے اور اس کی برہمی بے لوث نہیں بالوث ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس برہمی کا سبب بظاہر نظر نہ آئے اور اس کے تحتِ شعور کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہو اس لئے بہترین طنز کی اساسی شرط یہ نہیں کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک ہو۔ بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ ذاتی جذبہ محض ذاتی نہ رہے بلکہ عالمگیر ہو جائے۔ اگر سودا کی ہجویں ناقص ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے احساسات کو قابو میں نہیں لاتے، ان سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے اور انہیں شعلۂ تخیل کی مدد سے ذاتی آلائشوں سے پاک نہیں کرتے۔ سودا میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک بلند پایہ ہجوگو کے لئے ضروری ہیں۔ وہ زندہ دل اور شگفتہ طبیعت واقع ہوتے تھے۔ بقول آزاد ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنسا سکتے تھے لیکن اس زندہ دلی کے باوجود جب برہم ہوتے تو پھر ان کی برہمی کی انتہا نہ ہوتی۔ ان کی برہمی سے ان کے معاصرین آشنا تھے اور اس سے خائف رہتے تھے کیونکہ ان کے ترکش میں طنز کے ہزاروں تیر تھے جن کی چوٹ بے پناہ تھی۔ لوگ ان سے خائف رہتے تھے لیکن وہ کسی سے ہراساں نہ ہوتے۔ ان کا تخیل تیز رو اور بلند پرواز تھا وہ ایک لمحہ میں بوقلموں تصویریں مرتب کر سکتے تھے۔ ایک سے ایک رنگین و مضحکہ خیز "قصیدہ در ہجو اسپ المسمّٰی بہ تضحیک روزگار" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ناطاقتی کا ان کے کہاں تک کروں بیاں   فاقوں کا اسکے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا   ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر   دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار
ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے   میخیں گر اس کی تھان کی ہوویں نہ استوار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلادے اس کا سن   پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے   شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار
مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں   جز دستِ غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

دیکھا! سودا کو کیسی سوجھتی ہے اور جو سوجھتی ہے خوب سوجھتی ہے لیکن وہ اپنے اشہبِ تخیل کی جولانی کو روکتے نہیں اسی

وجہ سے ان کی ہجویں رطب و یابس سے بھری پڑی ہیں اور اعتدال، تناسب کی کمی نظر آتی ہے۔ اگر ان کی سوجھ میں بوجھ کا کچھ زیادہ دخل ہوتا تو یہ ہجویں زیادہ بلند پایہ ہو جاتیں۔ ہجویہ نظموں میں جزئیات کے حسن، ان کی بوقلمونی اور موزونیت سے حسنِ نظم میں افزائش ہوتی ہے۔ لیکن اگر جزئیات کی ایسی فراوانی ہو کہ نظم کا حسنِ صورت مستور یا ناقص ہو جائے تو یہی جزئیات عیب شمار کی جاتی ہیں یہی عیب سودا کی نظموں کا اہم ترین عیب ہے۔ ان نظموں میں جزئیات کی ایسی فراوانی ہے کہ گویا اشجار کی زیادتی سے جنگل نظر نہیں آتا۔ اردو شعرا اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہر نظم کی ایک صورت ہوتی ہے جو الفاظ، نقوش، خیالات سے الگ اور بلند ہوتی ہے اور کسی نظم کی کامیابی کے لئے اس حسنِ صورت کا وجود لازمی ہے۔ سودا اس حسنِ صورت سے واقف نہ تھے۔ ان کے تخیل کی سبک روی اور بلند پروازی فراوانی جزئیات کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ان کی نظموں کو ضرورت سے زیادہ طویل اور ڈھیلی بنا دیتی ہے۔ اگر اختصار سے کام لیا جاتا تو ان کے حسن میں اضافہ ممکن تھا۔ اس فراوانی کے ساتھ سودا ضرورت سے زیادہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ مبالغہ مشرقی شاعری کا بڑا عیب ہے لیکن مبالغہ بجائے خود کوئی بری شے نہیں۔ یہ شاعری اور دوسرے فنون کے لئے ضروری بھی ہے اور حسین بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ ایک مغربی نقاد کہتا ہے کہ مبالغہ آرٹ کی جان ہے۔ یہ سب صحیح لیکن مبالغہ جب حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر اہم ترین عیب بن جاتا ہے مثلاً اس گھوڑے کی ہجو میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں ؎

کہتا تھا کوئی ہے بُز کوہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہے گا ولایت کا یہ حمار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار
اس مخمصہ میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک روز
فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے پھر دوچار
دھوبی کمہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم
اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے واں گذار
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار
بدیشی اس کی دیکھ کے کر خرس کا خیال
لڑکے بھی واں تھے جمع تماشے کو بے شمار

پہلے دو شعر تک مضائقہ نہ تھا۔ یہاں جائز حد تک اس گھوڑے کی ہجو کی گئی ہے لیکن بقیہ اشعار میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ ہے۔ پھر ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ پہلے شعر میں کہنے والے واقعی گھوڑے کو "بز کوہی" یا ولایت کا حمار نہیں سمجھتے۔ دوسرے شعر میں بھی کہنے والے نے محض ظرافت، اچھی ظرافت سے کام لیا ہے لیکن بعد کے شعروں میں اس گھوڑے کو واقعی گدھا تصور کیا جاتا ہے اور پھر اسے خرس بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ مبالغہ ذوقِ لطیف کے لئے بے لطفی کا سبب ہوتا ہے۔ پھر یہاں تکرار بھی ضرورت سے زیادہ ہے۔ گھوڑے کو گدھے سے تشبیہ دی جا چکی ہے پھر بار بار اسی تشبیہ کی تکرار مذاقِ صحیح پر گراں گزرتی ہے۔ تکرار بھی سودا کا ایک عام نقص ہے۔ وہ ایک ہی بات کو بار بار مختلف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں جس سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔

گھوڑے کی ہجو دلچسپ ضرور ہے لیکن اپنی دلچسپی کے باوجود بھی یہ بلند پایہ ہجویہ شاعری کی مثال نہیں، یہاں موضوع اہم نہیں، جذبات کی شدت بھی نہیں اور نہ مختلف عناصر کی شدت کے ساتھ آمیزش ہوتی ہے۔ غرض یہاں ایک بھی ایسا عنصر نہیں جو بلند پایہ شاعری کے لئے ضروری ہے۔ یہی کمی دوسری نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ دوسری ہجوؤں میں فدوی، ضاحک، حکیم غوث، شیدی فولاد خاں، کوتوال، دولت مند بخیل وغیرہ کو طنز کا شکار بنایا گیا ہے۔ "قصیدہ شہر آشوب" اور "مخمس شہر آشوب"

میں سنجیدگی و متانت کے ساتھ زیادہ اہم امور کی طرف توجہ کی گئی ہے لیکن ان نظموں کو پیش نظر رکھ کر بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ سودا کا میدان تنگ ہے وہ جبلّی انسانی نقائص، سماج کی ناانصافیوں، مختلف طبقوں اور پیشوں، کل انسانیت کو حلقۂ ہجو میں داخل نہیں کرتے۔ سودا میں سنجیدگی و متانت موجود تھی۔ اگر وہ سنجیدگی و متانت کو اپنی سب نظموں میں برقرار رکھتے، اگر وہ سنجیدگی و متانت کے ساتھ اہم انسانی اور سماجی نقائص کا انکشاف روا رکھتے تو ان کی اہمیت زیادہ سے زیادہ ہو جاتی۔ بہرکیف سودا نے اچھی ہجویں لکھی ہیں۔ شیدی فولاد خاں کوتوال اس طرح اپنی لاچاری کا اظہار کرتا ہے ؎

خلق جب دیکھ کر کے یہ بیداد   کرتے ہیں کوتوال سے فریاد
بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار   گرم ہے چوٹٹوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول   میری پگڑی کا میرے سر پہ مول
یارو کچھ چل سکے ہے میرا زور   دیکھو تو تک کہاں کہاں ہے چور
مٹ سکے مجھ غریب سے یہ خلل   ہے امیروں کے گھر میں چور محل
دیکھئے گر بتاں کو بھی بخدا   ہاتھ میں ہے انہوں کے دزد حنا
کس کو ماروں میں کس کو دوں گالی   چوری کرنے سے کون ہے خالی

یہ طنز کی عمدہ مثال ہے اور یہاں طنز و ظرافت کے دوش بدوش ہے ؎

دیکھئے گر بتاں کو بھی بخدا
ہاتھ میں ہے انہوں کے دزد حنا

سودا میں ظرافت کا مادہ طنز پر غالب ہے۔ غالباً اسی ظرافت کی ہمہ گیری کی وجہ سے ان نظموں میں شدتِ جذبات کی کمی ہے۔ "مخمس شہر آشوب" کے علاوہ شاید ہی کہیں پر اثر اور شدید جذبات کی مثالیں مل سکیں۔ سودا ایسے شگفتہ طبیعت واقع ہوئے ہیں کہ وہ غضب، نفرت، حقارت اور اسی قسم کے تیز و تند جذبات سے آشنا نہ تھے۔ وہ خفے ہوتے تھے لیکن ہجو لکھ کر اپنے دل کا بخار نکال لیتے تھے یعنی غصہ انہیں ہجو گوئی پر آمادہ کرتا لیکن جہاں انہوں نے قلم اٹھایا، جہاں ان کا تخیل مائل پرواز ہوا تو پھر غصہ فرد ہو جاتا اور اس کے بدلے ان کے دماغ میں نئے نئے مضامین، انوکھے خیالات، دلچسپ، رنگین، جاذب نظر تصویروں کی آمد سے انہیں ایک قسم کی مسرت ہوتی اور ان کی نظم غضب کے بدلے اس مسرت کا اظہار ہوتی۔ وہ مسرت جو ایک صنّاع کو اپنے کارنامہ کی تخلیق میں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے قاری بھی کبھی غضب ناک اور برہم نہیں ہوتا بلکہ قوتِ ایجاد اور اس کے حسین و دلکش نتائج کو دیکھ کر مسرور ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ مثل روز روشن ہے کہ سودا کی ہجو یہ شاعری کے نقائص و حدود کے باوجود اردو میں اس وقت تک سودا سے بہتر کوئی دوسرا ہجو گو شاعر نہیں پیدا ہوا۔

تعجب ہے کہ شعراء مابعد پر سودا کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ سودا کے بعد اکبر کا نام آتا ہے لیکن اکبر نے سودا سے استفادہ نہیں کیا اور اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی۔ وسعت اور تنوع مضامین کے لحاظ سے اکبر کو سودا پر فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اس فضیلت کا ذمہ دار اکبر کا عہد ہے اس عہد کی تصویر عبدالماجد صاحب نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:۔

> اکبر جب دنیا سے روشناس ہوتے ہیں تو ان کے ملک و قوم کی یہ حالت ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کو ختم ہوئے چند سال گزر چکے ہیں۔ ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلط کے شکنجہ میں پورے طور پر کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامتِ اعمال کے نتائج بھگت رہی ہے، اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر مدت ہوئی رخصت ہو چکے .... نفاق، خود غرضی، غداری، نفس پروری اور عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ داد خواہی کے لئے انگریزی عدالتیں ہیں۔ تعلیم کے لئے انگریزی مدرسے ہیں۔ سفر کے لئے انگریزی سواریاں ہیں، علاج کے لئے انگریزی شفاخانے ہیں.... عزت و حکومت کے لئے انگریزی عہدے ہیں۔ حصول معاش کے لئے انگریزی پیشے ہیں، زینت و آرائش کے لئے انگریزی مصنوعات اور انگریزی بازار ہیں غرض جس طرف بھی رخ پھرتا، حدِ نظر تک ایک غیر محدود نامتناہی پرچم انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا..
>
> اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا۔ علم و فضل کا معیارِ کمال یہ قرار پایا کہ انگریزی زبان آجائے۔ تلفظ انگریزوں کا سا ہو جائے اور انگریزی علوم سے واقفیت ہو جائے تہذیب و شائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے، لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں خاندان مشترکہ کے وجود کو ذلیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزہ سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ شرافت و عزت کا منتہائے خیال یہ قائم ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہدے حاصل کئے جائیں..... عقل و دانش کا مفہوم قرار پایا کہ انگریزی مصنف کے قول پر بے چون و چرا ایمان لے آیا جائے اور اپنے علوم و فنون، اپنے شعائر و رسوم، اپنے عقائد و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنم دلربا کے قدموں پہ نثار کر دیا جائے۔ یہ فضا تھی جس میں اکبر نے آنکھیں کھولیں۔“

یعنی وہ زمانہ تھا جب دو مختلف تمدنوں میں زبردست تصادم ہوا تھا اور اس تصادم کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی تمدن کے شیرازے بکھرنے لگے تھے اور انگریزی تمدن اپنی دلفریبی کا سکہ لوگوں پر جما رہا تھا، اپنے محاسن فراموش ہو چلے تھے اور حسنِ غیر میں نگاہیں محو تھیں۔ اکبر پرانے تمدن، پرانے نظام کے پرستار تھے اور وہ نئے تمدن، نئے نظام کے نقائص کا انکشاف کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کی طنز کے سامنے ایک نامحدود میدان نظر آیا۔ کیوں کہ انگریزی تمدن کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر محیط تھا۔ سودا کے سامنے یہ نامحدود نہیں تھا۔ ان کے زمانے میں اسلامی تمدن کے شیرازے بکھرنے لگے تھے۔ لیکن انگریزی تمدن نے اپنا جادو شروع نہیں کیا تھا۔ سودا زیادہ سے زیادہ مٹنے والی تہذیب، لٹی ہوئی شان و شوکت، گزری ہوئی عظمت کو حسرت بھری نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ ہر طرف زمانے میں انتشار کی صورت نمایاں تھی۔ یہ پراگندگی دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور یہ پراگندگی طبیعت میں بھی موجود تھی۔ سودا اسی پراگندگی کا اظہار اپنے ”مخمس شہر آشوب“ میں کرتے ہیں۔ وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ ان کے زمانے میں سماج کی وہ

طنز یہ تنقید ممکن ہی نہ تھی جو اکبر کا مخصوص حصہ ہے۔ اکبر کا قدم پرانی تہذیب پر جما ہوا تھا اور وہ اس محفوظ و ثبت مقام سے نئی تہذیب کی بڑھتی ہوئی فوج کا مقابلہ کرتے ہیں اور تن تنہا اس یلغار کو روکنا چاہتے ہیں۔ اسی مقصد میں اپنی فطری طنز و ظرافت سے مدد لیتے ہیں۔ ان کی تیز اور باریک بین نگاہیں دشمن کی کمزوریوں کو دیکھ لیتی ہیں اور وہ ان کمزوریوں کی اپنی طنز و ظرافت سے قطع و برید کرتے ہیں۔

مضامین کی وسعت اور تنوع مسلم ہے۔ لیکن اکبر سودا کے مرتبہ تک نہیں پہنچتے کیونکہ ان کا آرٹ سودا کے آرٹ سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ سودا اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کے لئے نظم کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں ضرورت سے زیادہ طولانی اور تفصیلی ہیں پھر بھی وہ نظمیں ہیں۔ اکبر نہایت مختصر قطعے، رباعیوں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ جس قسم کی ہجویں اکبر لکھتے ہیں۔ ان کے لئے یہ مختصر سانچے زیادہ موزوں ہیں۔ اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی جس قسم کے سانچے اکبر کی نظموں میں ملتے ہیں وہ سانچوں کی حیثیت سے نسبتاً کم مرتبہ ہیں۔ ان سانچوں میں وسعت پیچیدگی ممکن نہ تھی۔ ان کی تنگ دامانی ان کا اصل نقص ہے اکبر کا آرٹ مختصر تصویریں یا نقشے بنانے کا ہے اور یہ مختصر تصویریں حسین بھی ہیں اور موثر بھی اور اپنے مقصد میں کامیاب، ملاحظہ ہو ؎

وہ نقطۂ وضع کے کشتہ ہیں نہیں قید کچھ اور　　　بغیس کو گون پہنا دیجئے عاشق ہو جائیں
اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے　　　صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلۂ من　　　کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے
سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولس　　　ہے زبان گرم قلب ٹھنڈا ہے
تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی　　　چاہی تھی شئے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر　　　پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

یہ ہے اکبر کا آرٹ۔ مختصر پیمانہ میں وہ ایسی ہجویں لکھتے ہیں جو تیر بہدف ہو جاتی ہیں وہ ایسے ایسے شعر تراشتے ہیں جو نشتر کی طرح دلوں میں چبھتے ہیں۔ وہ ان شعروں کے تراشنے میں کاوش سے مصرف لیتے ہیں اور جانفشانی کے ساتھ ان کی جِلا، تیزی، کاٹ کو حدِ کمال تک پہنچا دیتے ہیں۔ اکثر یہ اشعار یا مختصر قطعے دماغ میں ہیجان برپا کرتے ہیں اور ایک وسیع منظر سامنے لا کھڑا کرتے ہیں اور قاری اس منظر کے پھیلتے ہوئے دامن میں گم ہو جاتا ہے۔

تھے معزز شخص لیکن ان کے لائف کیا کہوں　　　گفتنی درجِ گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی
بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا۔　　　پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن موت نہ آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

یہ مثالیں بلاتخصیص پیش کی گئی ہیں۔ ان شعروں میں محض ایک مختصر خیال کا اظہار نہیں ہے ہر شعر گویا ایک تنگ رستہ ہے جس سے گزر کر ہم کسی وسیع میدان میں قدم رکھتے ہیں جو بات ان شعروں میں کہی گئی ہے وہ بجائے خود زیادہ اہم نہیں اصل اہمیت ان باتوں کی ہے جو کہنے میں نہیں آئی ہیں، جنہیں قاری اپنے ذہنِ رسا کی مدد سے سمجھ سکتا ہے۔ یہ آرٹ سودا کی نظموں میں نہیں ملتا، سودا سب باتیں تفصیل سے کہہ ڈالتے ہیں۔ اکبر کچھ کہتے ہیں اور باقی خیالات کی طرف اشارہ

کرتے ہیں لیکن اس کچھ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں اور کہیں بھی خیالات مبہم اور غیر متعین نظر نہیں آتے۔ بہرکیف سودا کی نظموں میں یہ آرٹ نہیں ملتا اور نہ سودا کو اس آرٹ کی ضرورت تھی۔ جن سانچوں کا استعمال سودا کرتے تھے وہ تنگ داماں نہ تھے ان میں ہر قسم کی وسعت پیچیدگی، تخیل کی جولانی کی گنجائش تھی، سودا کے تخیل کو وسعت کی ضرورت تھی۔ تنگی میں اس کا دم غالباً گھٹنے لگتا۔ اکبر کا تخیل تنگی میں خوش ہے اسے کسی قسم کی پریشانی محسوس نہیں ہوتی۔ مطلب یہ نہیں کہ سودا کی تصویریں ہمیشہ مفصل اور وسیع پیمانے پر ہوتی ہیں۔ مختصر اور مؤثر تصویریں یہاں بھی ملتی ہیں۔ یہاں بھی دو مصرعوں اور اکثر ایک مصرع میں ایک مرقع پیش کر دیا جاتا ہے، ایسا مرقع جو زندہ چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔

ضعیفی نے کی اس کی فربہی گُم — گیا ہاتھی نکل اور رہ گئی دُم
کھانا آوے تو اس طرح لوٹے — جیسے کوئی کسی کا گھر لوٹے
بسکہ مطبخ میں سردی رہتی ہے — ناک باورچیوں کی بہتی ہے
وہ جو سودا بکے ہے لایعنی — آپ کرتا ہے دزدیِ معنی

اصل یہ ہے کہ سودا مفصل یا مختصر اور ہمیشہ زندہ مرقعے پیش کرتے ہیں، اکبر کسی ظرافت آمیز خیال یا کسی تیز طنز کا بیان کرتے ہیں۔ سودا میں ڈراما نگاری کی قوت ہے اس لئے جو تصویریں وہ مرتب کرتے ہیں وہ جیتی جاگتی ہماری آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ اکبر محض انوکھے خیال، ہنسنے اور ہنسا دینے والے نکتے، تیز و تند طعن و طنز سے ہمارے دماغ کو محظوظ کرتے ہیں اور اسے متحرک کرتے ہیں۔ یعنی اکبر میں نکتہ سنجی (   ) ہے۔ یہ مادہ سودا میں بھی موجود ہے لیکن اس حد تک نہیں البتہ ظرافت میں سودا اکبر سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔

اکبر اگر مفصل نظمیں کامیابی کے ساتھ لکھ سکتے تو ان کی ہجویں شاعرانہ نقطہ نظر سے زیادہ بلند پایہ ہو جاتیں۔ اگر وہ اپنے خیالات کا تسلسل کے ساتھ اظہار کرتے، اگر وہ مختلف نقوش کو مجتمع کر کے ایک نقش کامل تیار کرتے، اگر ان کی نظموں میں خیالات کی باریکی پیچیدگی کے ساتھ ساتھ ہوتی، اگر وہ مختلف جذبات، شدید جذبات پر قابو رکھتے تو ریزہ خیالی کا الزام جو ان نظموں پر عائد ہوتا ہے وہ عائد نہ ہوتا۔ بہرکیف اکبر کے ادبی ماحول کا لحاظ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ لائق ستائش ہے۔ سیاسی اسباب کی وجہ سے جو قابل ہجو صورتیں پیدا ہو گئی تھیں وہ چن چن کر طنز کے خنجر سے قطع کرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں ہر چیز کو دیکھ لیتی ہیں۔ معمولی باتوں کو بھی وہ نہیں چھوڑتے۔ ان کی ہجو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، جہاں وہ مغربیت کا اثر دیکھتے ہیں جہاں انہیں مادیت کا گمراہ کن اثر نظر آتا ہے تو وہ فوراً آمادہ پیکار ہو جاتے ہیں۔ "بے تمیزی، کورانہ تقلید، بدذاتی اور تنگ نظری" انہی چیزوں کے وہ مخالف تھے اور انہی سے وہ جنگ آزما تھے۔ ان کے عہد کا مرقع ان کی ہجووں کو جمع کر کے مرتب کیا جا سکتا ہے اور یہ ان ہجووں کی تاریخی اہمیت ہے اور اسی مرقع کے ساتھ ساتھ اس عہد پر بے مثل انفرادی تنقید بھی ملتی ہے۔

اکبر کے رنگ نے قبول عام کی سند حاصل کی انہیں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو شاید سودا کی نظموں کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ رشید احمد صاحب لکھتے ہیں۔

"اکبر اپنے رنگ میں منفرد رہے، ان کے رنگ میں بعض لوگوں
نے لکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔"

جن لوگوں نے اس رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ان میں سے ایک اقبال بھی ہیں "بانگ درا" کے اخیر میں جو ظریفانہ اشعار ہیں ان میں صاف اکبرؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں   مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے   واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں
لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی   ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدنظر   وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین   پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ
شیخ صاحب بھی تو پردہ کے کوئی حامی نہیں   مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف   پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

صاف ظاہر ہے کہ ان شعروں میں اقبالؔ نے اکبرؔ کا تتبع کیا ہے۔ سطحی نظر غالباً ان میں اور اکبرؔ کے شعروں میں تمیز بھی نہیں کر سکتی۔ خیالات، طرزِ بیان، لب و لہجہ، اختصار غرض سبھی خصوصیات وہی ہیں جو اکبرؔ کی ہجوؤں میں ملتی ہیں لیکن دوسرے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رنگ اقبالؔ کے لئے فطری نہ تھا اور وہ طبیعت پر زور دے کر اس قسم کے اشعار موزوں کرتے ہیں۔ اقبالؔ میں وہ شوخی، زندہ دلی، شگفتہ مزاجی نہ تھی جو روزِ ازل سوداؔ اور اکبرؔ کو ودیعت کی تھی۔ ان کا دل کنول کی طرح کھلا ہوا نہیں تھا۔ وہ سنجیدہ و متین واقع ہوئے تھے اس لئے جب وہ ہنسنے ہنسانے پر اتر آتے ہیں تو ان کی ہنسی مصنوعی معلوم ہوتی ہے اور ان کی ظرافت میں آورد کی جھلک ہوتی ہے ؎

وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
مہذب ہے تو اے عاشق! قدم باہر نہ دھر حد سے
نہ جرأت ہے نہ خنجر ہے تو قصدِ خودکشی کیسا
یہ مانا دردِ ناکامی گیا تیرا گزر حد سے
کہا میں نے کہ اے جانِ جہاں کچھ نقد دلوا دو
کرایے پر منگا لوں گا کوئی افغان سرحد سے

یہاں وہ سبکی، وہ تیزی نہیں جو اکبرؔ کے شعروں میں ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش طبعی پر آمادہ ہے غالباً اقبال نے خود محسوس کیا کہ اس رنگ میں وہ نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے اس لئے انہوں نے اس راہ کو جلد ترک کر دیا لیکن ان کی دوسری نظموں میں جو قصداً متانت و سنجیدگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ان میں وہ اکثر قصداً یا بلاقصد طنز سے مصرف لیتے ہیں۔ ان نظموں میں وہ اکبرؔ یا کسی دوسرے شاعر کی تقلید نہیں کرتے بلکہ انہوں نے اپنا ایک علیحدہ رنگ

قائم کر لیا ہے "جمعیت اقوام" "ایک بحری قزاق اور سکندر" "موسولینی" "اجتہاد" "جہاد" "پنجابی مسلمان" یہ چند مثالیں ہیں جو "ضرب کلیم" میں ملتی ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر ہم ہنستے نہیں زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں اگر تبسم کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں طنز خالص طنز ہے اور یہ طنز اقبال کی سنجیدگی و متانت کی کامیاب ترجمان ہے۔ "نفسیاتی غلامی" ملاحظہ ہو ؎

شاعر بھی ہیں پیدا علما بھی حکما بھی　　خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک　　ہر ایک ہے گو شرح معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو　　باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پر رضامند　　تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

ظاہر ہے کہ یہ طرز زیادہ رنگین اور متنوع نہیں لیکن یہاں کسی کی تقلید نہیں۔ یہ رنگ انفرادی ہے اور اپنی انفرادیت کی وجہ سے ہماری توجہ کا مستحق ہے

موجودہ زمانہ میں اکثر شعرا سیاست، مذہب اور مذہبی پیشوا، مروجہ اخلاق کے خلاف اپنی آواز بلند کر رہے ہیں یہ سب براہ راست یا بالواسطہ، شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال سے متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن جوشؔ کے علاوہ کوئی ذکر کا مستحق نہیں۔ جوشؔ میں ایک حد تک طنز و ظرافت کا مادہ موجود ہے "مولوی" "خانقاہ" "شیخ" میں یہ مذہب کی بعض صورتوں کی ہجو کرتے ہیں۔ اسی طرح اکثر سیاست کے میدان میں بھی جا نکلتے ہیں لیکن جوشؔ کا مخصوص عیب یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو (اور یہ خیالات نئے، انفرادی نہیں) بہت اہم سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ ان سے اپنی شخصیت کو علیحدہ نہیں کر سکتے یعنی ان کے خیالات ذاتی رہتے ہیں۔ عالمگیری اختیار نہیں کرتے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

الاماں! خانقاہ کی دنیا　　معصیت کی گناہ کی دنیا
دوڑتے ہیں یہاں بطر کے سمند　　یاں توکل ہے حرص کا پابند
یاں قناعت سے عارفانِ خدا　　کام لیتے ہیں سکہ سازی کا
ہر ادا میں ہے تاجرانہ کمال　　ہر بنِ مو ہے ایک دستِ سوال
کون بہتر ہے ایزد باری　　ان کا تقویٰ کہ میری میخواری

یہ خانقاہ کی دنیا کی ہجو نہیں، اپنی عذر داری ہے۔ قاری شاید وقتی طور پر متاثر ہوتا ہے لیکن ایسے اشعار کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ جوشؔ مسلسل اشعار یا نظمیں لکھتے ہیں وہ اکبرؔ کی طرح مختصر قطعوں یا دو تین شعروں پر اکتفا نہیں کرتے۔ ان کی نظموں میں تکرار و مبالغہ کی وہ زیادتی نہیں جو سوداؔ کا مخصوص عیب ہے۔ یہ سب سہی لیکن جوشؔ کی ہجویہ نظموں میں اس دلچسپی کی کمی ہے جو سوداؔ اور اکبرؔ کی نظموں کی خصوصیت ہے اور دلچسپی کی کمی یا فقدان، آرٹ میں سب سے زیادہ اہم عیب شمار کیا جاتا ہے۔

اس مختصر سی تنقید سے ظاہر ہو گیا کہ اردو میں صرف اکبرؔ اور سوداؔ ہجویہ شاعری کے میدان میں مستقل عزم کے ساتھ گامزن ہوئے اور اس میدان میں آگے بڑھے لیکن یہ دونوں بھی ایسے کارنامے نہیں پیش کر سکے جن کا مغرب کے اعلیٰ ہجویہ کارناموں کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے۔ اس میدان میں سوداؔ اور اکبرؔ کی کاوشوں کے باوجود بھی لامحدود گنجائشیں باقی ہیں اور اگر اردو شعرا اس

طرف توجہ کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن محض توجہ کافی نہیں، ہجو ایک فن ہے ایک اہم فن ہے ہجو یہ نظم ایک صنفِ شاعری، ایک دلچسپ اور اہم صنف شاعری ہے اور اس صنف میں بھی بلند پایہ شاعری ممکن ہے۔ اگر شعراء اس فن کے امکانات و مقاصد کو سمجھیں اسے فن کی حیثیت سے برتیں اور جو خصوصیتیں ایک ہجو گو شاعر کے لئے ضروری ہیں انہیں بہم پہنچائیں تو ترقی ممکن ہے ورنہ نہیں۔ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس سے اس صنفِ شاعری کی ترقی کی امیدیں وابستہ ہوں

(۳)

اردو نثر میں طنز و ظرافت کی وہ کمی نہیں جو نظم میں ملتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ نسبتاً نثر میں طنز و ظرافت کی افراط ہے اور اس افراط میں بیسویں صدی کے مصنفین کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسے حضرات کی کافی تعداد ہو گئی ہے جو طنزیہ اور ظریفانہ مضامین صرف لکھتے ہی نہیں بلکہ لکھنے پر مُصر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ جس قدر ممکن ہو اس کمی کے الزام سے اردو کے دامن کو پاک کر دیا جائے۔ ان کے قلم سے مضامین کا سیلاب جاری ہے وہ اس کا لحاظ نہیں کرتے کہ یہ مضامین معیاری ہیں یا نہیں۔ وہ کیفیت کو کمیت پر قربان کر دینے کے لئے تیار ہیں۔ بہرکیف ان مصنفین اور انشاپردازوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے گروپ میں وہ انشا پرداز ہیں جن کا نصب العین خالص ظرافت ہے اور جو ہنسنے ہنسانے کے علاوہ کوئی دوسرا اندرونی مدعا نہیں رکھتے اور اگر رکھتے بھی ہیں تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرا گروپ پر مقصد ہے جو نقائصِ انسانی، سماجی، تمدنی، اخلاقی و سیاسی غرض ہر قسم کے نقائص کو مٹانا چاہتا ہے یا کم از کم ان نقائص کو دیکھ کر برافروختہ ہو جاتا ہے۔ اس گروپ کے انشا پرداز کا جذبۂ غضب جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبۂ غضب کی اپنی ہجوؤں میں ترجمانی کرتا ہے۔ اس قسم کے انشا پرداز خالص طنز کے عوض ظرافت اور طنز، زیادہ تر طنز سے مصرف لیتے ہیں ہنسنا ہنسانا ان کا نصب العین نہیں ہوتا لیکن اکثر وہ اس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں لیکن ان کا اصل مقصد کسی نقص کو رفع کرنا یا اپنے جذبہ نفرت، غضب و حقارت کی ترجمانی ہے۔ تیسرا گروپ وہ ہے جس کی ظرافت میں فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے یہاں مقصد ظرافت نہیں بلکہ اپنے فلسفۂ زندگی کی یا ان مشاہدوں کی جن پر اس فلسفہ کی بنیاد ہے ظرافت آمیز نقاشی ہے

(۱) پہلے گروپ میں سب سے پہلا نام غالبؔ کا ہے۔ غالبؔ کی طرزِ تحریر کی خصوصیت کے بارے میں حالیؔ لکھتے ہیں:

> "وہ چیز جس نے ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخیِ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں بعض لوگوں نے خط و کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے مگر ان کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ سے وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر

> کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولیٹیکل، سوشل اور دلچسپ مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں۔ بائیوگرافی اور ناول میں متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں۔ باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔"

میں تو یہ کہوں گا کہ مرزا کی تحریر صرف خط و کتابت کے دائرے ہی میں اپنا نظیر نہیں رکھتی بلکہ اس وقت تک بھی کوئی اردو انشا پرداز بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے غالب کی تحریر کی مثال نہیں پیش کر سکا۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولیٹیکل، سوشل اور دلچسپ مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیئے ہیں — بائیوگرافی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ غالب کی نثر ہر قسم کے موضوعات کے لئے موزوں و مناسب نہیں۔ اس کا دائرہ کسی حد تک محدود ہے۔ اور یہ امر بھی مسلم ہے کہ اکثر غالب اپنے خطوط میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کرتے ہیں لیکن ان سب باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ ابھی تک اردو میں خالص ظرافت کے نمونے، ایسے نمونے جو ادبی معیار پر بھی پورے اتریں، نظر آتے ہیں وہ غالب کے معیار سے بہتر کہاں، اس معیار کی گرد کو بھی نہیں پاتے۔ خصوصاً موجودہ زمانے میں اس طرف توجہ کی گئی ہے اور متعدد مصنفین اس میدان میں اترے اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی غالب کی بلند مرتبت شخصیت کا حامل نہیں۔ کسی کا تخیل بھی غالب کے تخیل کی باریکی، تیزی، زور، بلند پروازی کو نہیں پہنچتا۔ ان کی ذہنیت میں وہ گہرائی اور پختگی نہیں جو غالب کی ذہنیت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کہیں غالب کی شوخی، رنگینی، بے ساختگی، بوقلمونی، قوت ایجاد کی مثال بھی نہیں ملتی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کسی کی انشا ادبی معیار کے لحاظ سے غالب کی انشا کو نہیں پہنچتی۔

غالب کی زندگی میں ان کی وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگرچہ وہ عسرت و تنگدستی میں زندگی بسر نہ کرتے تھے لیکن دنیا کی دولت و حشمت سے انہیں اس قدر میسر نہ تھا جتنا وہ چاہتے تھے۔ پھر بھی ان کی طبیعت میں غضب کا ابھار تھا جو کبھی انہیں نچلے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ ان کی طبیعت کا ابھار ان کے ہر ہر لفظ، ہر ہر جملے سے ٹپکتا ہے۔ یہی چیز ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ رنج و افسردگی کے بیان میں بھی وہی ابھار ہے۔ اصل یہ ہے کہ ظرافت ان کی فطرت ثانی تھی۔ جہاں قلم اٹھایا اور ظرافت کے پھول جھڑنے لگے۔

> "میاں کس حال میں ہو، کس خیال میں ہو۔ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے یہاں ان کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے خوشدامن صاحبہ بلائیں لیتی ہیں، سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانند دیوار چپ جی چاہتا ہے چیخنے کو، مگر ناچار چپ وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ جان نہ پہچان ورنہ ہمسایہ میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی امام ضامن علیہ السلام کی نیاز کا روپیہ بازو پر باندھا، ۵ روپے خرچ راہ دیئے مگر ایسا جانتا

> ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں بازو سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ اور جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔"

یہاں صرف ظرافت ہی موجود نہیں بلکہ گویا غالب نے ایک زندہ سین پیش کیا ہے۔ ڈرامہ نگاری کی قوت غالب میں موجود تھی۔ وہ محض کسی شے، کسی واقعہ، کسی سین کا بیان ہی نہیں کرتے بلکہ اسے نظر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ پوری تصویر صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ شوخی سے تو خطوط بھرے پڑے ہیں۔

> "دھوپ بہت تیز ہے، روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں، کبھی پانی پی لیا کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

اس شوخی کے ساتھ متانت اور سنجیدگی بھی موجود ہے لیکن اس میں بھی اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے مثلاً جب یوسف مرزا کو ان کے باپ اور ان کے بیٹے کی تعزیت میں خط لکھتے ہیں تو اس میں لہجہ سنجیدہ و متین ہو جاتا ہے اور الفاظ میں ایک خاص قسم کا اثر آ جاتا ہے۔ شوخی و بذلہ سنجی سے وہ قطع نظر کرتے ہیں۔ تکلفات سے یک قلم کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور سیدھے سادے مؤثر پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان مثالوں اور ان جیسی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ہنسنے ہنسانے پر قادر تھے۔ وہ رونے رلانے کی بھی قدرت رکھتے تھے لیکن اس طرف انہوں نے زیادہ توجہ نہ کی۔ غالباً ان کی شوخ طبیعت اور ان کا فلسفہ "مصری کی مکھی بنو، شہید کی مکھی نہ بنو" دونوں مانع آئے ورنہ اس قسم کی عبارت میں بھی بے مثل ہوتے۔

> "ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے، ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور دراز درپیش ہے، زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر اور اگر بازپرس ہوئی تو دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎
>
> اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
> مر کے بھی چین نہ آیا کدھر جائیں گے"

اگر اردو انشا پرداز یہ چاہتے ہیں کہ وہ میدانِ ظرافت میں آگے بڑھیں، اگر ان کی خواہش ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہنستی بولتی تصویریں مرتب کر سکیں، اگر ان کی تمنا ہے کہ وہ ظرافت کے ایسے نمونے پیش کریں جنہیں فنا نہ ہو تو پھر وہ اپنی راتیں اور اپنے دن غالب کے مطالعہ میں صرف کریں۔

غالب کے خطوط کے بعد "اودھ پنچ کی زعفران زار نظم و نثر" سامنے آتی ہے۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے وہ مختلف مذاق بھی رکھتے تھے ـــــ اودھ پنچ کے مضامین کے متعلق چکبست نے یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔

> "قوموں کے مذاقِ سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ

> پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف اور پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو زبان کے عاشق کو غالبؔ کے خطوط پر نظر ڈالنا چاہیے۔ . . . . اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔ . . ان کا ہنسنا غالبؔ کی زیرِ لب مسکراہٹ سے الگ ہے یہ خود بھی نہایت ہی بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔“

کسی کو اتفاق نہ ہو لیکن مجھے چکبستؔ سے کامل اتفاق ہے کہ ”اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے ہیں۔“ بلکہ میں تو کہوں گا کہ بحیثیت مجموعی اودھ پنچ کی ظرافت کو ادبی ظرافت نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ”بذلہ سنجی و تمسخر“ اور ظرافت کے ادبی مفہوم میں آسمان زمین کا فرق ہے جو طنز اور ظرافت اودھ پنچ کے مضمون میں ملتی ہے وہ کچی، خام، ناقص اور طفلانہ ہے۔ ان مضامین کی یہ خامی نہیں کہ ان میں غالبؔ کی زیرِ لب مسکراہٹ نہیں ملتی۔ اس میں بھی مبالغہ نہیں کہ اودھ پنچ کے ظریف خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ زیرِ لب مسکراہٹ اور بے تکلف قہقہہ دونوں میں ادبی شان نمایاں ہو سکتی ہے۔ اودھ پنچ نے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہا تھا۔ یہ کام ایک حد تک ضروری بھی تھا اور مستحسن بھی لیکن پنچ نے جو خدمتیں انجام دیں وہ وقتی تھیں۔ ان کی اہمیت تاریخی ہے ادبی نہیں۔ اودھ پنچ کی ظرافت میں ادبی شان کی نمایاں کمی ہے جو ظرافت یہاں ملتی ہے وہ ادبی نہیں بازاری ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

> وہ مارا۔ کیوں جی۔ تم لاکھ شور و غل مچایا کیے ہم نے اپنی تہذیب کا لگا لگا ہی دیا۔ سڑے ہوئے کھل میں لگا لگانا کیسا ہم سے کہیے تو بڑے بڑے بانس لگا دیں لیکن یہ اتنی لمبی چوڑی باتیں ہی کاہے پر ہیں ذرا ہم بھی تو سنیں آپ نے ابھی تک سنا ہی نہیں اجی بی زہرہ کا نکاح ہو گیا، مشتری کے بھی کوئی خریدار پیدا ہوئے ہیں۔ اب تو سب کی سب رنڈیاں تھرتھرا کے بیٹھے کو ہیں۔ خیریت سے ذرا نئی گڑھیاں منہ دھو رکھیے۔ خدانخواستہ نہ اور رنڈیوں کو مراق نہ خفقان نہ آنوجی کی ہی طبیعت ایسی۔ رنڈیاں گھر نہ پڑیں تو کیا کریں۔“

اودھ پنچ کے پہلے دور کے لکھنے والوں میں سجاد حسینؔ، سرشارؔ، ظریفؔ، ہجرؔ، آزادؔ، شہبازؔ، برقؔ، شوقؔ، اکبرؔ کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے اور اس کے دوسرے دور میں سب سے ممتاز نام سیّد محفوظ علی صاحب کا شمار کیا جاتا ہے ایسی خالص ظرافت کے سلسلے میں سجاد حسینؔ، سرشارؔ اور محفوظ علی صاحب کا ذکر کافی سمجھتا ہوں۔ سجاد حسین اور سرشارؔ دونوں نے اردو میں غالباً پہلی مرتبہ ایک ظریف کردار پیش کیا ہے۔ حاجی بغلولؔ اور خوجیؔ کے کیریکٹر اردو ادب میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہی حقیقت کہ اردو ادب ان سے بہتر کیریکٹر نہ پیش کر سکا اردو ادب کی ایک سنگین تنقید ہے۔ رشید احمد صاحب فرماتے ہیں۔

> ”حاجی بغلول ایک طور پر ڈکنس کے ”پک وک ابراڈ“ کا نامکمل اور ایک حیثیت سے ناقص

> چربہ ہے لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حاجی بغلول اردو طنزیات اور ظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اب تک اس کا جواب اردو میں کہیں نظر نہیں آتا۔

اگر کوئی شے کسی خاص ادب میں اپنا جواب نہ رکھتی ہو تو اس سے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ حاجی بغلول اور پک وک میں وہی فرق ہے جو ایک مدھم شمع اور آفتاب میں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حاجی بغلول کا کیرکٹر اردو طنزیات اور ظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے لیکن جہاں کسی دوسرے ادب سے مقابلہ کیا پھر اس کیرکٹر کی تہی مائیگی ظاہر ہو جاتی ہے۔ حاجی بغلول صرف "ایک طور پر" اور "ایک حیثیت سے" ہی پک وک کا مکمل اور ناقص چربہ نہیں۔ حاجی بغلول سراسر نامکمل اور ناقص ہے۔ اس کی اہمیت یہی ہے کہ اس سے ایک نئی راہ کھلتی ہے۔ خوجی کا کردار حاجی بغلول سے بہتر ہے۔ یہاں کسی کا نامکمل اور ناقص چربہ نہیں۔ یہ ایک تخلیقی کارنامہ ہے، کافی رنگین اور متنوع، خوجی خود ظریف ہیں اور اس ظرافت کا سبب ہیں جو دوسروں میں ہے۔ وہ خود بھی ہنستے ہیں اور لوگوں کو ہنساتے بھی ہیں اور لوگ ان پر ہنستے بھی ہیں۔ وہ ایک منفرد ہستی رکھتے ہیں اور ان کی شخصیت مختلف عناصر سے بنی ہے۔ خوجی کا کردار کسی ایک خصوصیت یا کسی خاص طرز گفتار پر مبنی نہیں اور ان کی شخصیت ان کے گفتار و کردار سے ٹپکتی پڑتی ہے۔ ان کے کردار پر دوسروں کے الفاظ اور اعمال سے مزید روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شخصیت دوسروں کی شخصیتوں سے متصادم ہوتی ہے اور اس تصادم کی وجہ سے ان کی ہستی پر نت نئی روشنی پڑتی ہے۔ خوجی کے کمالات کی فہرست مرتب کرنا ممکن نہیں فرماتے ہیں:۔

> "سنو میاں! خواجہ بدیع ہفت زبان ہے، وہ کون سی زبان ہے جس سے وہ واقف نہیں فرمائیے۔ عربی، فارسی، ترکی اور فرانسیسی سب میں عبور، انگریزی زبان کا بادشاہ!"

پھر فرماتے ہیں:۔

> "حضرات سنئے آپ خوب جانتے ہیں کہ عالم آدمی مستغنی ہوتا ہے اور میری استغنا سے بھی آپ خوب واقف ہیں۔ مجھے دنیا میں کسی سے دب کے چلنا شاق گزرتا ہے اور وجہ کیا کہ ہم کسی سے دب نکلیں۔ جب طمع ہمارے مزاج میں چھو نہیں گئی۔ لالچ سے منزلوں بھاگتے ہیں۔ حرص کے قریب نہیں جاتے۔ پھر ہمارے نزدیک بادشاہ اور وزیر اور امیر و غریب اور مفلس سب یکساں۔"

خوجی نے دنیا دیکھی ہے۔ ان کے ساتھ مختلف و متنوع قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ساری دنیا نے ان کی قدر کی ہے:۔

> "مصر میں وہ اعزاز ہوا کہ سبحان اللہ، استنبول اور قسطنطنیہ میں تو وہ قدر افزائی ہوئی کہ زمانہ واقف ہے۔"

ہم خوجی کے اور محاسن کی قدر کریں یا نہ کریں لیکن ان کی قوت ایجاد کی ضرور قدر کرتے ہیں۔ ان کی قوتِ ایجاد بلا کی ہے بات کی بات میں وہ ایک ایپک مرتب کر سکتے ہیں۔ "صف شکن علی شاہ" کی داستان ملاحظہ ہو:۔

> حضور بات یہ ہوئی کہ غلام لب چشمہ سار ایک پیالی میں آہستہ آہستہ افیون گھول

> رہا تھا کہ بس درخت کی طرف نظر کرتا ہوں نور کا عالم! یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے، یا خدا یہ کیا اسرار ہے۔ غور کر کے دیکھا تو روشنی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ چنار کا درخت مگر دم کے دم میں ہمارے حضور صف شکن پھر سے آن کر ہاتھ پر بیٹھ گئے...... ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چھوٹا سا دریا تھا۔ اس طرف ہم اس طرف غنیم، لب دریا مورچہ بندی ہو گئی اور گولیاں چلنے لگیں۔ دفعتاً بس خداوند میں کیا دیکھتا ہوں کہ صف شکن موجود آتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک کنکری لے کر کچھ پڑھ کر اس زور سے پھینکی کہ ایک توپ پھٹ اور ہزار ٹکڑے ہو گئی..... میں مزے مزے افیون گھول رہا تھا اور افسر اور سوار اور پیادے سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے کہ پہاڑ سے نالیوں کی آواز آئی۔ ہیں! یا الٰہی یہ نالیاں کس نے بجائیں، سب کے سب پھر غور سے دیکھنے لگے۔ پیالی لبوں تک لے ہی گیا تھا کہ اوپر کو روسیوں نے باڑھ ماری کوئی چار سو بندوقیں ایک ہی دفعہ سر ہوئیں اور آدھے آدمی مجروح اور مقتول ہوئے مگر واہ رے میں خدا گواہ ہے، پیالی ہاتھ سے نہ چھوٹی اب سنئے کہ فوراً صف شکن علی شاہ موجود اور میرے ہاتھ پر بیٹھ کر چونچ افیون سے تر کی اور زور سے چونچ کھولی تو وہ قطرے پہاڑ تک کی خبر لائے اور پہاڑ جو پھٹا تو ارارا دھوں اور لطف یہ کہ ادھر کا ایک آدمی ضائع نہ ہوا۔ بس میں نے صف شکن کا منہ چوم لیا۔ بٹیر کیا جانے وہ کون چیز نایاب شئے ہے۔"

خوجی کے کیریکٹر میں تین کیریکٹر پنہاں ہیں۔ خوجی جیسا وہ اپنے کو سمجھتے ہیں، خوجی جیسا انہیں ناول کے دوسرے کردار سمجھتے ہیں۔ خوجی جیسے وہ پڑھنے والوں کو نظر آتا ہے۔ اس سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ پڑھنے والا اپنے زاویۂ نظر کے ساتھ ساتھ اور دونوں زاویوں سے بھی واقف ہے۔ ان سب خوبیوں کے باوجود بھی خوجی کا کیریکٹر ناقص ہے اور یہ نقص وہی ہے جو فسانۂ آزاد کا عام نقص ہے یعنی تکلف اور اس تکلف کا لازمی نتیجہ ضرورت سے زیادہ طوالت اور خانہ پری، بقول عبدالباری آسی صاحب

> "نگاہِ خوردبین طوالتِ کلام کی وجہ سے ہر داستان کو لندھور بن سعدان کی داستان خیال کرنے لگتی ہے۔"

بہر حال خوجی اردو میں ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔

سجاد حسین اور سرشار نے زندہ کردار کی تخلیق کرنے کی کوشش، کم و بیش کامیاب کوشش کی تھی۔ سید محفوظ علی صاحب تمثیلیہ کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں۔ تمثیلیہ ایک مشکل فن ہے اور اس میں کامیابی نہایت دشوار ہے۔ اس میں کامیابی کے لیے طاقتور تخیل، زبردست شخصیت اور حساس دل اور زندہ یقین کی ضرورت ہے۔ سید محفوظ علی میں یہ اوصاف موجود نہیں۔ "شیخ سماء اللہ صاحب کی صاحبزادیاں" تمثیلیہ کی صنعت میں کوئی بلند پایہ جگہ پانے کے لائق نہیں۔ یہ ایک حد تک دلچسپ ضرور ہے لیکن اس کا حسن سطحی ہے۔ خیالات معمولی ہیں۔ اس میں نہ خطیبانہ ہیجان ہے اور نہ کوئی زندہ شعلہ زن حقیقت کا انکشاف۔

> "آسیہ (آنسو بھر کر) ہاں بہن سچ کہا، خدا کی شان، کبھی ہم اس پردیس میں تمیز دلے سمجھے

> جاتے تھے۔ سینا پرونا ہم جانتے تھے، کھانا پکانا ہم جانتے تھے، آج پھوہڑ ہم، بدتمیز ہم،
> گندے ہم، مگر اس کی وجہ جانتی ہوں، آیا پیسہ آئی مت، گیا پیسہ گئی مت، گانٹھ میں دام تو سب کریں سلام۔"

جن کی نگاہوں کے سامنے تمثیلیہ کی اعلیٰ مثالیں موجود ہیں وہ اس قسم کی مثال سے مرعوب و متاثر نہیں ہو سکتے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ آرٹ نہایت دشوار ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس آرٹ کے جاننے اور برتنے والے اردو میں موجود نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ محفوظ علی صاحب نے ''بیچارہ رنگ'' کو ترک کر کے اسپیکٹر سے قریب ہونے کی کامیاب اور مستحسن کوشش کی۔ خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں:۔

> "نثر میں سب سے بہتر ظرافت لکھنے والے مولوی محفوظ علی صاحب بی۔ اے ساکن بدایوں ہیں۔ ان سے زیادہ نیچرل اور بے ساختہ چلبلی اور از سر تا پا مرصع ظرافت کوئی نہیں لکھتا یا میرے علم میں نہیں ہے۔"

یہ تنقید نہیں تعریف ہے اور اس تعریف میں صحت صرف اس قدر ہے کہ محفوظ علی صاحب کا لب و لہجہ اودھ پنچ کے مقابلہ میں زیادہ متین و سنجیدہ ہے۔ وہ تمسخر سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے قلم سے پھبتیاں نہیں نکلتیں۔ وہ نہایت بے تکلفی سے قہقہے نہیں لگاتے اور نہ دوسروں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے سنجیدہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کے خیالات میں گہرائی نہیں اور ان کی تنقیدی قیمت نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی سنجیدگی، سبکی، لطافت، باریکی کی منافی ہے اور اکثر تو یہ ناقابل برداشت بے رنگی کا سبب ہو جاتی ہے۔

> "میرے تجربہ میں صاحب دین ایک مختلف المزاج والکیفیت چیز ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب دین کا مزاج کسی دوسرے صاحب دین کے مزاج کے ساتھ تو ہمیشہ گرم تر رہتا ہے مگر غیر صاحب دین کے ساتھ سرد خشک اور غصہ اور ریل کے سفر کی حالت میں گرم خشک ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے صاحب دین کے لئے چاہے وہ فہرست چندہ لے کر آئے یا دعوت چائے، ایک صاحب دین ہمیشہ سریع الفہم ہے مگر غیر صاحب دین کے لیے چاہے وہ خفیف درخواست ہی لے کر آئے وہ نہایت بطی الفہم۔"

محفوظ علی صاحب کے بارے میں خواجہ حسن نظامی کی رائے تسلیم کرنے کے قابل نہ تھی لیکن انہوں نے اپنی ظرافت پر نہایت جامع تنقید کی ہے:۔

> "میری طبیعت کی افتاد شوخی و ظرافت کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ میں زیادہ تر غم و درد کے مضامین میں اپنے دل کو مائل پاتا ہوں ..... جس قدر جی کا بہاؤ دکھ کی جانب ہے سکھ کی جانب نہیں مگر جناب اکبر کی ہم نشینی اور کچھ اس احساس کے سبب کہ نثر اردو میں مفید ظرافت کا رواج بڑھے مجھ کو بھی شوق ہوا کہ اردو کے اس میدان میں طبع آزمائی کروں..... میری ظرافت ..... درحقیقت ظرافت نہیں ہے۔ میں نے خود

> اقرار کیا ہے کہ یہ اردو ہے اور لوگوں میں زندہ دلی اور لطیف نکتہ چینی کا شوق پیدا کرنے کو یہ طومار تیار کیا ہے ..... اکثر مضامین میں جناب اکبر کا پیرایہ میرے پیش نظر ہے۔ وہ نظم کے دو جملوں میں جو بات کہتے ہیں، میں نے اس کو ایک بڑے مضمون نثر میں ادا کیا ہے۔ بعض مضامین کی شوخی کھلی ہوئی، بعض کی عبارت اوپر کی سطح سے سنجیدہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر اثر دل پر ظرافت کا ہوتا ہے۔ دانستہ بھی ایسا کیا ہے کہ بعض شوخ مضامین کو رکاکت میں گر جانے کے اندیشے سے متانت کی چادر اڑھا دی ہے ..... ہنسی مذاق میرا کام نہ تھا مگر میں نے محض زبان اردو کی خاطر اس میں دخل دیا ہے ..... گو میں جانتا ہوں کہ لطافت ظرافت جس کا نام ہے وہ مضامین میں نہیں ہے تاہم نہ ہونے کے مقابلے میں کچھ ہونا بہتر تھا۔"

خواجہ صاحب کی ظرافت فطری نہیں اکتسابی ہے۔ وہ اپنے کو لیے دیے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیشہ قدم سنبھل سنبھل کر رکھتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی از خود رفتہ نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے ذرا تصنع اور آورد کا شبہ ہوتا ہے "مقتول کا رقص"۔

> "کل میدانِ جنگ میں ایک مقتول تڑپتا تھا۔ میں نے اس کے سر کو زانو پر رکھا اور اس کے رقاص جسم کی بہار دیکھی۔ ملک الموت نے کہا اس کو میری گود میں دے دو۔ میں نے کہا ٹھہرو! اس کے رقص کی سیر تو کر لوں۔ فرشتہ بگڑا اور بولا کوئی اپنی جان سے جاتا ہے آپ کو اس میں مزا آتا ہے۔ میں نے کہا بھائی ہر قوم کا ایک رقص اور اس میں ایک لطف ہے۔ صوفی باطنی تلوار سے مجروح ہو کر ناچتا ہے اور زخمی ظاہری تیغ سے، دونوں میں ایک ادا ہے۔ مرنے والے نے کہا ناچنے کا لفظ صوفی کی توہین ہے۔ میں بولا سب مہذب ناچتے ہیں۔ بادشاہ اور بیگم تک اس لفظ پر عمل کرتے ہیں پھر صوفی کو رقص میں کیا عار ہے۔ تہذیب مادی ہو یا روحانی دونوں کا ایک ہی شعار ہے ....."

یہ ہے خواجہ صاحب کا رنگ۔ خواجہ صاحب کی اصل اہمیت ان کی انشا ہے۔ وہ نہایت ہی آسان، سادہ، پُرلطف طرز میں لکھتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ رعایتِ لفظی کے دام میں نہیں جا پھنستے اور ہمیشہ سنجیدگی و متانت سے کام لیتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اور ان کی پاکیزہ اردو سے اگر نوجوان انشاء پرداز استفادہ کریں تو بہت کچھ ترقی کر سکتے ہیں اور اپنی انشا کو بہت سے نقائص سے پاک کر سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی پاکیزہ اُردو کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ایسی مثال جس میں ظرافت مطلق نہیں

> "دیوانی اس پریم کی ہزاروں رنگتیں ہیں۔ کہیں پروانہ چراغ پر آ کر جل جاتا ہے، کہیں بلبل پھولوں کو گلے سے لگاتا ہے، لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے کہ دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی طرف دوڑتا ہے۔ تنکا کہربا پر فریفتہ ہے، دیدار پاتا ہے تو لپک کر سینہ سے چمٹ جاتا ہے۔ مگر چکوے چکوی کی محبت یہی ہے کہ وہ جدائی کی بہار دیکھیں وہ آپس میں مل

> نہیں سکتے۔ ساری عمر ترستے ہیں اسی واسطے تو کہا ہے کہ چکوا چکوی کو نہ ستاؤ وہ خود محبت کے ستائے ہوئے جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں۔"

مزاح نگار کی حیثیت سے اس وقت پطرس، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی مرحوم کافی شہرت رکھتے ہیں۔ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی اپنی شہرت کے باوجود بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل یہ ہے کہ دونوں کی ذہنیت ترقی کے مدارج طے کرنے کے دوران میں ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی ہے اور یہ ذہنیت وہی ہے جسے "انڈر گریجویٹ" ذہنیت کہتے ہیں۔ دونوں استعداد بہم پہنچانے سے پہلے مصنف بن بیٹھے۔ ان کے کارناموں کو اگر کسی طالب علم کا کارنامہ شمار کیا جائے تو لائقِ تحسین ہے۔ اس سے زیادہ وقعت دینا تنقید اور مذاقِ صحیح پر دانستہ ظلم کرنا ہے۔ ان کی خامی کا الزام ایک حد تک پڑھنے والوں پر بھی عائد ہوتا ہے۔ ان کے مضامین اس قدر مشہور ہوئے، ان کی اس قدر مانگ ہوئی کہ انہوں نے سمجھا کہ تصنیف کی دشواریوں پر انہوں نے کامل اختیار حاصل کر لیا ہے اس لئے مزید کاوش کی ضرورت نہیں۔ دونوں کو شروع سے خرمن جمع کرنے کی فکر دامن گیر ہوئی حالانکہ ان کی کھیتی میں خودرو گھاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ انہیں لازم تھا کہ جو کچھ وہ لکھتے اسے محض مشق سمجھتے۔ لکھتے اور رکھ کر پھاڑ دیتے اور آہستہ آہستہ مطالعہ، مشاہدہ، غور و فکر میں وسعت، باریکی اور گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ دونوں کو سوجھتی ضرور ہے لیکن جو کچھ سوجھتی ہے وہ محض سطحی قسم کی چیز ہے۔ بذلہ سنجی اور تمسخر" لطیف ظرافت کا بدل نہیں ہو سکتے اس کے ساتھ ساتھ ان میں ترقی کی گنجائش نہیں ان کا رنگ اپنی جگہ پر پختہ ہو گیا ہے دونوں کے مضامین سے ایک ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

> "ہندوستان کی جہالت پر تو خیر رونا آتا ہے لیکن یورپ اور امریکہ کی تہذیب ملاحظہ فرمائیے کہ وہاں ہر معزز آدمی کی شناخت صرف یہ ہے کہ اس کے سر پر گود میں آگے پیچھے، اِدھر یا اُدھر ہانپتا ہوا زبان نکالے دم ہلاتا ہوا کتا ضرور ہو اور اگر کسی مغربی آدمی کے ساتھ کتا نہ ہو تو اس کے متعلق یہ بھی شبہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا وہ آدمی بھی ہے یا نہیں اور اگر آدمی ہے تو یونہی سا ہے۔ مغربی خواتین کا یہ حال ہے کہ بغیر کتے کے ان کو لطفِ زندگی ہی حاصل نہیں ہوتا جب تک ان کے نرم و معطر آغوش میں ایک پلّا نہ دبا ہو وہ اپنے عدم وجود کو یکساں سمجھتی ہیں اور پلّا دبا ہوا ہے تو اس سے ایسی محبت کرتی ہیں کہ انسان اس پر رشک کرے، اسے اس طرح چومتی چاٹتی اور دبوچتی ہیں کہ ان کے عشاق کتا بن کر نہ پیدا ہونے پر فطرت سے شاکی ہو جاتے ہیں یا کتا بن جانے کے لئے دست بدعا ہوتے ہیں..... قدرِ سگ انگریز داند یا بداند اس کی میم۔"

> "چودھری صاحب نے اب وہاں دہائی دینا شروع کر دی اور میں پڑے پڑے ان کی کوششوں کی داد دے رہا تھا وہ چلا رہے تھے ابے نالائق شیخ برمنک..... اشدۃ المن الرقص

> ......ارے اخرج من الگرداب' ارے موذی ناؤ نکال" چکرا کر وہ پھر میرے اوپر گرے میں نے آنکھ کھول کر دیکھا ساری دنیا گھوم رہی تھی۔ چودھری صاحب نے پڑے پڑے دھاڑ کر کہا۔" ایہا الشیخ..... ابے الو..... ابن الالو والخنزیر.... قسم خدا کی..... واللہ... ارے بھائی شیخ ارے اشدۃ المن الرفقس.... ارے مرے..... لیے روک.... روک ..... ارے نکال...... یا اللہ..... بے ایہا الشیخ من الموذی اخرج من الماو گرداب ..... نالائق..... بدمعاش..... واللہ بھائی شیخ.... مگر توبہ کیجئے بھلا ان باتوں سے کہیں ناؤ رکنے والی تھی۔"

ان مثالوں سے دونوں کی شخصیت اور ذہنیت نمایاں ہے اور دونوں کی ترقی بھی کچھ رک سی گئی ہے۔ شوکت تھانوی کے سارے کارنامے پر ان کے اس مصرع سے روشنی پڑتی ہے ؎

قدرِ سگ انگریز داند یا بداند اسس کی میم

یا اسس دوسرے مصرع سے ؎

تو مشق ناز کر سارا اندھیرا میری گردن پر

جو شخص ایسے مصرعے موزوں کر کے سمجھے کہ اس نے ظرافت کا ایک شاہکار پیش کر دیا ہے اسے ظرافت کے معنی سے کوئی شناسائی نہیں ہو سکتی۔ شوکت تھانوی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا نچوڑ ان مصرعوں میں ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں وہی "انڈر گریجویٹ" ذہنیت ہے۔ جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہی انڈر گریجویٹ ذہنیت اس دوسری مثال میں نظر آتی ہے۔ الشذری کسی طالب علم کا شاہکار ہو سکتا ہے۔ پورے افسانے، ساری جزئیات سے مصنف کی کمزوری اور خامی ظاہر ہوتی ہے جب میں اپنے طالب علموں کو کبھی کہتا ہوں کہ کوئی دلچسپ مقالہ لکھو اور اس میں جس قدر ممکن ہو طنز و ظرافت سے مصرف ہو تو وہ اس قسم کی چیزیں پیش کرتے ہیں۔

میں پطرس کو شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی دونوں پر ترجیح دیتا ہوں اور ترجیح دینے کی وجہ یہی ہے کہ پطرس کی ذہنیت نسبتاً زیادہ پختہ ہے۔ اس میں وہ سطحیت نہیں۔ پطرس غلط اردو لکھتے ہیں، ان کی ظرافت اکتسابی ہو لیکن ان نقائص کے باوجود محض اپنی شخصیت کی گہرائی کی وجہ سے شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان کی ظرافت کی ایک اچھی مثال یہ ہے۔

> "علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے، دودھ دیتی ہے بکری کو لیجئے، دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام سات بجے سے بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی

> بات ہے کہ رات گئے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا تو ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا لیکن ایسے موقع پر دھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔‘‘

یہ ایک مشاعرہ کا بیان دلچسپ بیان تھا۔ اب ایک دوسرا بیان بھی ملاحظہ ہو۔

> ’’جلسہ شروع ہوا۔ ایک نے مصرع اٹھایا، سینکڑوں نے نعرہ لگایا اور ہزاروں نے آسمان سر پر اٹھایا مجمع کی یہ حالت ہوئی جیسے کسی کے بگڑے ہوئے منہ زور ریلے لگام ریڈیو سیٹ پر ماسکو سے روسی قوالی سننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خدا خدا کر کے ایک صاحب کی باری آئی جن کا لہجہ نکیرین کا اور جن کی شاعری عذاب قبر سے مشابہ تھی۔ پہلے تو پڑھنے سے اس لجاجت سے معذوری ظاہر کی جیسے پھانسی کے تختہ پر جانے سے گریز کر رہے ہیں لیکن جب اصرار خاطر خواہ اور بے پناہ ہوا تو معلوم نہیں کدھر سے ایک رجسٹر نکالا جس پر معلوم ہوتا تھا کہ غدر کے بعد سے اب تک میونسپلٹی کے تمام اندراجات فوتی و پیدائش موجود ہیں۔ پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ مجمع سے ہنگامہ بلند ہوا۔ اتنے میں کسی منچلے نے بجلی کا سلسلہ بند کر دیا، دوسرے نے شامیانے کی طنابیں کاٹ دیں جناب صدر سیکرٹری مشاعرہ مصرعہ طرح سب کے سب شامیانے کے نیچے گل حکمت ہو گئے۔‘‘

جو فرق ان دونوں مثالوں میں نظر آتا ہے۔ وہی فرق پطرس اور رشید احمد صاحب میں موجود ہے۔ پطرس میں وہ بے ساختگی وہ آمد، وہ جوشش نہیں جو رشید احمد میں موجود ہے۔ پطرس کی انشا بھی نسبتاً پھیکی، بے جا الکتابی معلوم ہوتی ہے۔ رشید احمد صاحب کی یہ ایک ممتاز خصوصیت ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک ادبی شان ہوتی ہے جو شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی اور پطرس کی تحریروں میں نظر نہیں آتی۔ مزاح نگار ایک ادیب ہے۔ اس کا کام صرف ہنسنا ہنسانا نہیں۔ وہ محض مشاہدہ اور قوتِ ایجاد سے کام لے کر صرف ایسے واقعے، ایسے کردار کی تخلیق نہیں کرتا جس سے بے اختیار ہنسی آ جائے۔ وہ اس واقعہ یا کردار کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتا ہے اس لئے اسے الفاظ کی جستجو اور انتخاب میں کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی واقعہ یا کردار کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو اگر اسے حسین اور موزوں الفاظ کے ذریعہ پیش نہ کیا جائے تو دنیائے ادب میں اس کی وقعت نہیں ہو سکتی۔ عموماً اردو مزاح نگار اس حقیقت کو فراموش کرتے ہیں، انہیں سوجھتی ہے اور خوب سوجھتی ہے۔ لیکن

جب تک ان کی سوجھ میں بوجھ اور خصوصاً ادبی حسن کی جلا نہ ہو تو پھر وہ کسی مصرف کی نہیں ۔ رشید صاحب کی سوجھ میں ہمیشہ بوجھ کا عنصر بھی غالب رہتا ہے اور اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ مزاح نگاری کو بھی ادب کی ایک صنف سمجھتے ہیں ۔ اسی لئے اپنی تحریروں میں ادبی محاسن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

میں نے کہا تھا کہ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کی ذہنیت خام ہے ۔ رشید احمد صاحب کی شخصیت اور ذہنیت دونوں اس الزام سے پاک ہیں وہ محض مصنف بننے کی تمنا نہیں رکھتے ۔ ان کی طبیعت میں سنجیدگی و متانت ہے ۔ وہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور ان کی ظرافت میں خیالات کی گہرائی ہوتی ہے وہ محض اپنی ظرافت سے ہمیں محظوظ نہیں کرتے بلکہ ہمیں دعوت فکر بھی دیتے ہیں ۔ قہقہہ کے بعد طبیعت اس سنجیدہ معنی کی طرف رجوع کرتی ہے جو عموماً ان کی تحریروں میں موجود رہتا ہے ۔ یعنی ان کی ظرافت محض سطحی نہیں ، اس میں کچھ اور بھی ہے ۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کے خیالات سے اتفاق کریں ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع پر کافی غور و فکر کے بعد قلم اٹھاتے ہیں اور وہ چند واضح متعین خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں ۔

> ” آیئے لگے ہاتھوں میں آپ کو چوری کے صحیفۂ اخلاق کا مطالعہ کرا دوں ۔ گو زمانہ ایسا آگیا ہے کہ دوسرے معاملات کی مانند چوری کے صحیفۂ اخلاق اور چور میں بہت بڑا تفاوت پیدا ہو گیا ہے ۔ شاعروں کی مانند چوری کی بھی بہت سی اقسام ہیں لیکن ذرا توقف فرمائیے ۔ یہ ریڈیو ہے ممکن ہے ہماری آپ کی برادری میں بعض ایسے تنگ نظر اور بے وقوف چور بھی ہوں جو میری اس حرکت پر مجھ سے ناراض ہو جائیں کہ میں نے ان کو شاعروں سے کیوں تشبیہ دی لیکن ان کے اطمینان کے لئے میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ میری نیت چوروں کی دل آزاری نہیں ہے ۔ شاعروں کی ہمت افزائی ہے اس لیے کہ بغیر چوری کے شاعری ناممکن ہے ۔ چوری کے فروغ سے شاعری کا فروغ ہوتا ہے جیسے بیروزگاری کا فروغ بیداری ہے ۔ آپ تو جانتے ہوں گے کسی ملک و قوم کی بیداری کا معیار وہاں کی بیروزگاری ہے غیر متمدن اقوام میں بے روزگاری نہیں پائی جاتی ۔ “

رشید احمد صاحب کا مخصوص عیب یہ ہے کہ وہ اکثر موضوع سے بہک جاتے ہیں ” آپ معاف فرمائیں میں یقیناً موضوع گفتگو سے دور جا پڑا ہوں “ اس قسم کے جملے اکثر لکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی کمزوری کا احساس ہے اگر یہ بہکنا ارادی ہو اور اسے جائز حدود کے اندر رکھا جائے تو یہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے ۔ لیکن رشید احمد صاحب ضرورت سے زیادہ بہک جاتے ہیں اس لئے اکثر پڑھنے والے کی طبیعت میں الجھن سی پیدا ہونے لگتی ہے ۔ اس کے علاوہ وہ بھی بسیار نویسی کے دام میں جا پھنسے ہیں جو الفاظ انہوں نے عظیم بیگ چغتائی کے متعلق لکھے ہیں وہ ان پر بھی چسپاں ہوتے ہیں ۔

> ” امید ہے کہ رسالوں کے مختلف اور بے شمار اڈیٹر صاحبان بھی ان پر رحم فرمائیں گے کیونکہ مرزا صاحب کی مروت ان کو بسیار نویسی پر مجبور کرتی ہے اور بسیار نویسی کا دوسرا نام کم سے کم صحیفۂ ظرافت میں لغویت بھی ہے ۔ “

بسیار نویسی کا لازمی نتیجہ ہے غور و فکر کی کمی۔ نیاز فتحپوری نے ٹھیک کہا ہے :-

> "لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا دماغ تھک گیا ہے اور وہ غور و تامل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاہتے ہیں۔ نہ کسی کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں تاہم کوئی نہ کوئی سنجیدہ نتیجہ ان کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا ہے۔"

موجودہ مزاح نگاروں میں رشید احمد صاحب سب سے زیادہ فطری صلاحیت رکھتے ہیں۔ کاش وہ مختصر تحریروں کے علاوہ بسیط، پیچیدہ، زیادہ اہم ظریفانہ کارناموں کی طرف بھی توجہ کرتے۔

(۲) دوسرے گروپ میں وہ ظرافت نگار آتے ہیں جن کا مقصد اصلاح ہے جو بعض چیزوں کے خلاف جہاد کرتے ہیں یا جو کسی خاص مشاہدہ سے متاثر ہو کر اپنے جذبۂ غضب کا اظہار کرتے ہیں۔ اس گروپ میں پنچ کے لکھنے والوں میں نواب سید محمد آزاد کا نام داخل ہے انہوں نے نثر میں وہی کام کرنا چاہا تھا جسے اکبر نے نظم میں اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ وہ بھی مغربیت کے خلاف تھے اور اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے تھے لیکن انہیں اردو نثر میں اتنی ممتاز کامیابی نصیب نہیں ہوئی جتنی اکبر کو نظم میں میسر ہوئی۔ آزاد میں نہ وہ زورِ تخیل ہے، نہ وہ قوتِ ایجاد جو اکبر کا مخصوص حصہ ہے۔ ان میں وہ شوخی اور شگفتگی بھی نہیں اور ان کی طنز کے تیر اس قدر کارگر بھی نہیں ہوتے۔ ان کی طنز کا نمونہ یہ ہے :-

> "یہاں ہوٹلوں اور مکاناتِ عام میں اکثر نوکروں کی جگہ خوبصورت، طرحدار، تربیت یافتہ، چست، کم سن عورتیں ہیں اور یہی لوگ ہر قسم کے کام دن کو اور رات کو دیتی اور کرتی رہتی ہیں اور اس خوش اخلاقی اور مروت سے پیش آتی ہیں کہ آدمی ان پر جان دینے لگتا ہے۔ حضور کے سرِ مبارک کی قسم میری تو یہ کیفیت ہے کہ بے اختیار ان کو مارے محبت اور اخلاق کے گلے سے لگا لینے کو جی چاہتا ہے۔"

آزاد میں وہ تنوع نہیں جو اکبر میں نظر آتا ہے۔ ان کی طنز زندگی کے ہر رُخ پر حاوی نہیں۔ اس طنز کی کاٹ گہری نہیں۔ اکبر کے مقابلہ میں آزاد کی طنزیں سطحی معلوم ہوتی ہیں۔ جوش و ہیجان، نفرت و غضب کے محرکات بھی موجود نہیں۔ طرز سیدھا سادا اور دھیما ہے :-

> "میں تو یہاں پڑھنے آیا ہوں مگر کیا خاک کتابیں دیکھوں۔ کوئی آن، کوئی وقت کوئی لحظہ بھی تو آئینۂ دل کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگی کی واٹر سلک کی گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے مجھے تمہارا گرنٹ کا پاجامہ کس نفرت سے یاد آتا ہے۔ جب کسی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ ناچتے کودتے دیکھتا ہوں تمہاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے۔ جب کسی معزز

> لیڈی کو بیف کے ٹکڑے پر ہاتھ صاف کرتے دیکھتا ہوں تو تمہاری چپاتیوں کو حنائی انگلیوں سے کھٹکنا یاد آتا ہے اور کیا جی گھبراتا ہے۔"

آزاد کے زمانے کا لحاظ کر کے اور یہ بھی مدنظر رکھ کر کہ ان کے سامنے کوئی اچھا نمونہ اردو میں موجود نہ تھا۔ ان کی کوششیں لائق تحسین ہیں لیکن ان کی اہمیت تاریخی ہے اور ان سے ادب و انشا، لب و لہجہ کے متعلق موجودہ زمانے کے نوجوان مزاح نگار بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

آزاد کے بعد موجودہ طنزیین میں تین نام سامنے آتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں، ملا رموزی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ ان میں وہ شے موجود ہے جو دوسرے رہروانِ راہ طنزیات میں مطلق نہیں۔ اردو انشا پرداز کسی مسئلہ یا واقعہ یا خیال کو ظریفانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں وہ اس مسئلہ یا واقعہ یا خیال کو طنز کے طور پر بھی پیش کر سکتے ہیں لیکن عموماً یہ مسئلہ، واقعہ یا خیال ان کے دلوں میں زبردست ہیجان نہیں پیدا کرتا۔ اس سے ان کے دماغ میں ایک محشر بپا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے زیادہ حصہ اردو طنزیات کا سطحی، سرد و بے جان معلوم ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے طبیعت حساس پائی ہے وہ صرف حس ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے احساسات شدید ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات ابلنے لگتے ہیں، ان کے خیالات میں بلا کا طوفان برپا ہوتا ہے۔ ان جذبات و خیالات اور ان کی شدت سے وہ خود بھی متاثر ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

> "جو تاریکی چھٹی صدی عیسوی میں جہالت نے پھیلائی تھی جبکہ اسلام کا ظہور ہوا تھا۔ ویسی ہی تاریکی آج تہذیب و تمدن کے نام سے پھیل رہی ہے جبکہ اسلام اپنی غربت ادنیٰ میں مبتلا ہے۔ اگر اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی تاریکی بت پرستی تھی تو اس کی جگہ آج ہر طرف نفس پرستی چھا گئی ہے۔ پہلے انسان پتھر کے بتوں کو پوجتا تھا اب خود اپنے تئیں پوجتا ہے۔ خدا کی پرستش اس وقت بھی نہ تھی اور اس کے پوجنے والے آج بھی نہیں؛ دنیا کی وہ کون سی پرانی بیماری ہے جو آج پھر عود نہیں کر آئی؟ جبکہ وہ بیماری تھی تو کیا اس کی حالت ویسے ہی نہ تھی جیسی کہ آج ہے۔ پہلے وہ پتھر کی چٹان پر بیماری کی کروٹیں بدلتی ہوگی۔ اب چاندی اور سونے کے پلنگ پر لیٹ کر کراہتی ہے لیکن بیمار کے بستر کے بدل جانے سے بیماری کی حالت نہیں بدل سکتی۔"

دیکھا اس قسم کی شاندار، پرزور زندہ تحریر کے سامنے جملہ طنزیہ تحریریں بے رنگ و بے اثر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں ہر ہر لفظ خلوص سے پر ہے، جو کچھ کہا گیا ہے وہ پہلے دل میں محسوس کیا گیا ہے۔ ہجو گو بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوری، بدتمیزی، بے رحمی، ناانصافی کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس مشاہدہ سے اس کا دل بیتاب ہو جاتا ہے وہ شدتِ احساس سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ ان چیزوں کو کچل ڈالے، بدی کے اس پھولتے پھلتے درخت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ وہ الفاظ کے ذریعہ اپنے جذبات و خیالات کے اٹھتے ہوئے طوفان کو ایک زبردست طوفان بنا دیتا ہے ایسا طوفان جو اپنی فوق الفطری طاقت سے ساری گندگیوں کو صاف کر دیتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں یہی فرق فطری رو ہے

اور اس زور کی وجہ سے ان کی انشا محض انشا یعنی لفظوں کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی۔ یہ ایک کھنچی ہوئی تلوار، ایک بڑھتا ہوا سیلاب، ایک اٹھتا ہوا طوفان اور ایک دنیا کو ہلا دینے والا بھونچال ہے، یہ ایسا عصائے موسوی ہے جو افعی بن کر ہر شئے کو نگل جاتا ہے ملاحظہ ہو۔

> "لیکن خون بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں، آگ برسانے کے ایسے جہنمی آلے اور موت وہلاکت پھیلانے کی ایسی شدید ابلیسیت تو کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی، زمین کی پشت پر ہمیشہ درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدھوں نے پھنکاریں ماریں مگر نہ تو ایسی درندگی ابھی تک کسی میں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کی فوجوں کو حاصل ہے اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدھا پیدا ہوا جیسا کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے نگلنے اور چیرنے پھاڑنے کے لئے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں۔ پھر اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہے اس ہاتھی کو دیکھو جو مشرقی یورپ کے بھٹ سے چنگھاڑتا ہوا اٹھتا ہے اور اس خوفناک چیتے کو دیکھو جو لا مارک اور روسو کی سرزمین میں خون اور گوشت کے لئے پلا ہے۔ یہ کیسے عجیب ہیں! یہ کیسے خوفناک آلات سے مسلح ہیں؟ ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارض کا ایسا ہولناک بھونچال جو کبھی نہیں آیا، ایسا طوفان جو کبھی نہیں اٹھا، ایسی آتش فشانی جو کبھی نہیں ہوئی اور خداوند کا ایسا غضب جو اب تک کبھی زمین پر نہ ہوا۔"

اگر اردو ادب اس قسم کی طنز کی زیادہ مثالیں پیش کر سکتا تو پھر وہ طنزیات کے میدان میں دوسرے ادبوں کے مقابلہ میں اس قدر پیچھے نہ رہتا۔ اس قسم کی مثالیں ابو الکلام آزاد صاحب کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ یہ تحریر زندہ ہے اور اس کا ہر ہر لفظ زندگی کا حامل ہے اور ہر لفظ بولتا چالتا متحرک نظر آتا ہے۔ یہ طرز تحریر مولانا ابو الکلام کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ ان کی شخصیت کا نتیجہ ہے۔ یہ اپنے طور پر بالکل منفرد ہے۔ مولانا ابو الکلام کی عبارت سلیس یا محدود نہیں ہوتی۔ ان کی روش عام روشوں سے یک قلم علیحدہ ہے اور یہ ایک حد تک اجنبی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شان ہے، رعب و دبدبہ ہے۔ زور ہے اور کہیں کہیں ثقالت بھی ہے اس میں وہ سبکی، باریکی، سلاست، روانی نہیں جو دوسرے انشا پردازوں کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ مولانا ابو الکلام نے عام طرز سے علیحدہ ہو کر شاہراہ اردو سے دور ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی ہے۔ ہر شخص کا یہ کام نہیں لیکن ان کی شخصیت کو اس نئی راہ کی ضرورت تھی اور اگر وہ عام روش اختیار کرتے تو شاید اپنی انفرادیت کو کھو بیٹھتے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو ان کا مخصوص رنگ ہے۔ وہ ہر کام ہر موقع کے لئے موزوں بھی نہیں۔ اس قسم کی انشا کا دائرہ محدود ہے۔ یہ خاص خاص موضوعات کے لئے مناسب ہے اور اس کا بے موقع و بے محل استعمال مضحک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے اسے موقع و محل سے استعمال کیا ہے اور جس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ان کے لئے یہ نہایت موزوں و کامیاب ہے۔

جو خطیبانہ ہیجان اور جوش مولانا ابو الکلام آزاد کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے وہ مولانا ظفر علی خان کی تحریروں میں موجود نہیں۔ مولانا ابو الکلام کی آواز بلند آہنگ ہے۔ مولانا ظفر علی خان کی دھیمی ہے۔ مولانا ابو الکلام میں بے پناہ جوش ہے مولانا ظفر علی خان

ہیں خلوص کے باوجود وہ بے پناہ جذبات کی شدت نہیں۔ مولانا ابوالکلام کی انشا ایک زندہ متحرک قوت ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی انشا نسبتاً سرد و ساکت نظر آتی ہے لیکن صرف نسبتاً ہی ورنہ ان کی تحریر میں بھی زور ہے، ایک ایسی قوت ہے جو اسے عام سطح سے بلند کرتی ہے۔

> "آج دنیا کا نظامِ حکومت جن اخلاقی قوتوں کی بنیاد پر قائم ہے وہ غرق آہن جہاز ہیں، اژدر دم توپیں ہیں، فلک پرواز طیارے ہیں، قطار اندر قطار عسکریوں کی جگر گداز سنگینیں ہیں، صف اندر صف پولس کی جمعیت فرسا لاٹھیاں ہیں جن سے جابرانہ قوانین کی ہیبت زیر دستوں کے قلوب میں بٹھائی جاتی ہے۔ ملوکیت کا یہ عفریت جس نے عسکریت کی گود میں پرورش پائی ہے۔ آج ربع مسکون پر چھایا ہوا ہے اور ناتوانوں کے جسم کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ مغرب اس خونخوار دیو کا زاد بوم تھا۔ کاش یہ اپنے وطن میں رہتا مگر اس نے ایشیا کو بھی اپنا گھر بنا لیا اور اس وقت مشرقِ اقصیٰ اس کی جہنمی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔"

اس مثال میں ظفر علی خاں کی انشا اپنے بلند ترین مقام پر ہے لیکن یہ بلند ترین مقام بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی انشا کے معمولی مقام سے بہت نیچے واقع ہوا ہے۔ دونوں خلوص کے حامل ہیں، دونوں سیاسی طنز کی راہ پر گامزن ہیں لیکن جو پائداری ابوالکلام آزاد کی تحریر کا حصہ ہے وہ ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، نسبتاً ظفر علی خاں کی تحریریں ہنگامی سی چیز معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دلچسپ ہیں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتی ہیں لیکن بقائے دوام غالباً حاصل نہیں۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ ہندوستان کی سیاسی کشمکشوں نے موجودہ ادب پر اثر ڈالا ہے اور برابر ڈال رہی ہیں، ان کشمکشوں کا اثر آئینہ ادب میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوا ہے ایک طرف تو ہمارے ترقی پسند شعراء اور ادیب ہیں جو اپنے ترقی پسند خیالات سے دنیا کو بلند آہنگ آواز میں مطلع کر رہے ہیں۔ اسی کا ایک نتیجہ وہ ہجویں یا ہجویہ تحریریں ہیں جن کی مثالیں ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، قاضی عبدالغفار وغیرہ کے ہاں ملتی ہیں۔ عموماً جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ نئے نہیں، جن چیزوں کو طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے وہ وقتی چیزیں ہیں اور موجودہ سیاسی دور کے گزر جانے کے بعد ان کی محض تاریخی اہمیت باقی رہے گی اس لئے عموماً یہ نظمیں اور ہجویں بھی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں اور آئندہ دور کا مؤرخ ان کی مدد سے اس زمانے کی تصویر مرتب کرنے میں کامیاب ہوگا، عموماً وقتی، جلد گزر جانے والے موضوعات پر لکھنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ تصنیف کی اہمیت محض تاریخی باقی رہ جاتی ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض مصنف اپنی کبھی نہ مٹنے والی انشا کی مدد سے ان وقتی دلچسپی رکھنے والے موضوعات کو بقائے جاودانی عطا کرتے ہیں لیکن ایسے مصنف بہت کم ہوتے ہیں اور ابوالکلام آزاد اس قسم کے ایک انشا پرداز ہیں۔ ظفر علی خاں اس گروہ میں داخل نہیں

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کا دائرہ محدود ہے، ملا رموزی کا موضوع محض سیاسیات ہی نہیں اس لیے ملا رموزی میں تنوع مضامین زیادہ ہے مجھے ملا رموزی کی گلابی اردو سے بحث نہیں، "گلابی اردو" غالباً اپنے نیاپن کی وجہ سے مشہور ہو گئی، لیکن اس کی ادب میں کوئی جگہ نہیں۔ اس قسم کی چیز وقتی طور پر اور کم خوراک میں اچھی لگتی ہے لیکن زیادہ مقدار میں ناقابل برداشت ہو جاتی ہے

"گلابی اردو" بالکل قابلِ اعتنا نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ "نکات" کی کیا اہمیت ہے۔ ملا رموزی اپنے نکات کے مقصد پر یوں روشنی ڈالتے ہیں۔

> "بہر نکات یا نکات کے عنوان سے جو کچھ لکھا جائے گا اس کا پہلا مقصد تو یہ ہوگا کہ رسالہ "بیدار" کے پڑھنے والوں میں جو حضرات ہنسی، مذاق، تفنن، خوش دلی کی نعمت سے ابداً محروم رہتے ہیں یا...... جن کے دماغوں سے تفریح و ظرافت کی تازگی ضائع ہو چکی ہے... انہیں گدگدایا جائے اور بتلا دیا جائے کہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ روحانی بنے رہنا ہی متانت نہیں بلکہ کسی وقت مسکرا دینا، کھلکھلانا یا قہقہہ لگانا بھی طبی اصول سے مفید صحت ہے۔
>
> دوسرا مقصد اس عنوان سے یہ ہوگا کہ آپ کو ہنسی ہنسی میں سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و قومیت کے باریک نکتے سمجھا دیئے جائیں گے جن کا تعلق آپ کی روزمرہ زندگی سے ہے لہٰذا ایسے حالات میں بعض نکتے ایسے بھی ملیں گے جن کے اندر مذاق اور دل لگی کے علاوہ انتہا کی متانت و سنجیدگی اختیار کی جائے کیونکہ بعض مواقع پر نری ظرافت بھی خطاب و بیان کی تاثیر و اہمیت کو کم کر دیتی ہے مگر ایسے سنجیدہ نکات پر آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ نکات کا لکھنے والا ملا رموزی بھی کسی مہاجن کی باسی کڑھی بن گیا ہے جس میں کوئی چٹپٹا اُبال بھی نہیں آتا بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ ہماری ظرافت کی ایک ایک سطر میں بھی کام کی باتوں کو تلاش کرتے رہیے وہ ملیں گی اور بکثرت ملیں گی ان شاء اللہ۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملا رموزی نے ظریف طبیعت پائی ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نکات میں سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و قومیت کے نکتوں سے بحث کی گئی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ملا رموزی کی ظرافت اور ان کے متین نکات کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی رائے یہ ہے:۔

> "ملا رموزی کی ہمیشہ باقی رہنے والی تحریروں میں بہت کم ایسی ملیں گی جن میں ظرافت صرف ظرافت کی خاطر کا اصول مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ ان کی کسی تحریر کا مقصد ہمارے مذموم رواجات کی برائیوں کا استیصال ہے۔ کسی کے ذریعہ ہماری حالت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں وہ اڈیسن کی طرح ہمارے معاشرتی عیوب بے نقاب کرتے ہیں جو باتیں مصلحین کی زبان پر بھی نہیں آتیں وہ ان کی زبان قلم سے بے تامل نکل پڑتی اور ان کی ادراکی وسعت کا تو جواب نہیں کہ جس مقام تک ہمارے واعظین اور لیڈروں کا گزر بھی نہیں یہ وہاں بے روک داخل ہو جاتے ہیں۔
>
> غرض ابھی ایک وسیع اور شاندار مستقبل ہمارے سامنے ہے جس کا راستہ

> ملا رموزی نے کھول دیا ہے یقیناً آئندہ ملا رموزی کی ظرافت نگاری اخبارات و رسائل سے نکل کر مستقل ادبیات میں جگہ حاصل کرے گی اور قوم کے پژمردہ دلوں کے لئے مسرت پائدار ثابت ہوگی اور ملک کے تاریک گوشوں کے لئے بھی روشنی کا کام دے گی۔"

مجھے اس رائے سے مطلق اتفاق نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ملا رموزی کی ظرافت میں "ظرافت صرف ظرافت کی خاطر" کا اصول مدِ نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ ان کے پیشِ نظر ہمیشہ کوئی مقصد ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی ظرافت وسیع مضامین پر حاوی ہے لیکن مجھے اس بیان سے قطعی و کلی اختلاف ہے کہ "ملا رموزی کی ظرافت نگاری اخبارات و رسائل سے نکل کر مستقل ادبیات میں جگہ پیدا کر لے گی۔" ہر زبان اور ہر زمانہ میں مختلف قسم کے ادیب ہوتے ہیں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو صحیح معنوں میں ادیب نہیں کہے جا سکتے وہ لکھ تو لیتے ہیں اور ان کی لکھی ہوئی چیزیں کافی مشہور اور ہر دلعزیز بھی ہوتی ہیں لیکن ہر ذی فہم جانتا ہے کہ یہ چیزیں ادب کا جزو نہیں اور نہ ہو سکتی ہیں اور وہ مصنفین بھی اپنی حقیقت اور اپنے مقام سے باخبر ہوتے ہیں۔ دوسرے ادیب وہ ہیں، جنہیں ادیب بننے کی خواہش ہے لیکن جو ادیب ہونے کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے کارنامے پیدا ہونے سے پہلے ہی مردہ ہوتے ہیں۔ کچھ ادیب ایسے بھی ہوتے ہیں (اور زیادہ تعداد ایسوں کی ہی ہوتی ہے) جو اپنے زمانے میں ادیب کہلاتے ہیں اور جنہیں دوسرے بھی ادیب شمار کرتے ہیں لیکن جن کی ادبی عمر صرف ان کے دور تک رہتی ہے اور اس دور کے گزر جانے کے بعد وہ فراموشی کی خلیج میں ڈال دیے جاتے ہیں، ملا رموزی اسی قسم کے ادیبوں میں داخل ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی اہمیت کو خود ان کا عہد مانے یا نہ مانے لیکن وہ بقائے دوام کی نعمت ازل سے ساتھ لاتے ہیں۔ ایسے ادیب کم ہوتے ہیں اور ملا رموزی ایسے ادیبوں میں نہیں۔ ان کی تحریریں بس ایسی ہیں کہ موجودہ زمانے میں لوگ پڑھیں گے کسی حد تک محظوظ ہوں گے لیکن اس زمانے کے گذر جانے کے بعد اسی قسم کے دوسرے مصنفین پیدا ہو جائیں گے اور ان کی طرف دنیا متوجہ نہ ہوگی۔ شاید ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوگی۔ عبد الغفار صاحب نے ملا رموزی کا اڈیسن سے مقابلہ کیا ہے لیکن ملا رموزی کا صحیح مقابلہ ان موجودہ انگریزی مقالہ نگاروں سے ہے جو آج کل تو مشہور و معروف ہیں لیکن جن کی ادبی عمر غالباً ان کی طبعی عمر کے برابر یا اس سے کم ہے، وجہ یہ ہے کہ ملا رموزی کی نہ وہ ذہنیت ہے وہ انشا جس میں پائداری کا عنصر ہوتا ہے اور جو بقائے دوام کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں چند مخصوص عیوب بھی ہیں جن کی طرف رشید احمد صاحب نے اشارہ کیا ہے:۔

> "وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ سب باتیں لکھنے کی نہیں ہوتیں یا ان الفاظ اور لہجہ میں نہیں لکھنا چاہیے جن میں ملا صاحب لکھنے کے عادی ہیں۔ ملا صاحب کی تحریروں میں ایک چیز اکثر کھٹکتی ہے اور اس چیز کا احساس سوا ملا صاحب کے ہر ایک کو ہے یعنی وہ دوسروں کی پگڑی اور اپنا نام اچھالنے کی زیادہ فکر میں رہتے ہیں اور وہ چیز ہے جس کے سبب سے ان کی بہترین ظرافت بدترین طنز اور بہترین طنز بدترین ظرافت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جو چیز پیشہ بنا لی جائے گی وہ ہمیشہ

> ہیچ نظر آئے گی اور جو چیز بطور مشغلہ تفریح برسرکار رہے گی وہ ہمیشہ مقبول و محبوب ہوگی۔ ملا رموزی صاحب نے ظرافت اپنا پیشہ سا بنا لیا ہے۔"

ملا رموزی انتخاب، انتخاب موضوعات اور انتخاب الفاظ سے کام نہیں لیتے۔ انہیں موقع و محل، تناسب، موزونیت کا لحاظ نہیں رہتا اور انہوں نے ظرافت اپنا پیشہ بنا لیا ہے یعنی ان میں وہ علیحدگی جو ایک کامیاب ادیب کے لئے ضروری ہے موجود نہیں۔ ان سب باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ ملا رموزی میں صناعی، ایسی صناعی جو پائدار ہو اس کی کمی ہے:۔

> "خدا جانے یہ کنگ پرائمر پڑھے ہوئے ہندوستانی اپنے قومی لباس چھوڑ کر کوٹ پتلون کس جذبہ کے ماتحت استعمال فرما رہے ہیں اور تو کچھ نہیں لباس کی اس یگانگت سے ہمیں تکلیف یہ ہوتی ہے کہ ہم ہر پتلون پوش کو مسلمان سمجھ کر السلام علیکم کہہ گزرتے ہیں اور وہ آہستہ سے معاف کیجئے میں ہندو ہوں، کہہ کر شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ بس اس اسٹیشن پر ایسے ہی ہندو بھائی ہمارے ڈبے میں عین اس وقت گھس پڑے جب ہم صبح کے ناشتے کے لئے ڈھائی آنے پاؤ والی پوریاں لوگوں کی نظریں بچا کر لینے کے لئے پلیٹ فارم پر گھوم رہے تھے۔ انہوں نے ڈبہ خالی پا کر ایک سیٹ پر نیا انگریزی وضع کا بستر بچھایا اور مع کوٹ پتلون اس پر لیٹ گئے اور ایک کتاب کھول کر سینے پر تان لی۔ پھر ایک پتلون کی جیب میں لیٹے لیٹے اس طرح ہاتھ ڈال لیا گویا سر اسٹن چمبرلین وزیر خارجہ وکٹوریہ اسٹیشن لندن سے جمعیتہ الاقوام کی شرکت کے لئے اپنے خانے کے اسپیشل میں جا رہے ہیں، کبھی کبھی پتلون کی جیب سے ہاتھ نکال کر سر سہلا لیتے تھے گویا کسی بڑے ہی زبردست سیاسی معاہدے کو ملاحظہ سے حل فرما رہے ہیں۔"

تصویر کافی صاف کھینچی ہے اور بس۔ اس میں کوئی صاف بات نہیں کوئی انفرادیت نہیں کوئی پائداری نہیں۔

(۳) تیسرے گروپ میں وہ انشا پرداز ہیں جن کی ظرافت میں فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے جو اپنے فلسفۂ زندگی کو ظرافت اور طنز کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت ہوتی ہے جو دوسروں میں نہیں ملتی۔ ان کی مختلف ہجویں منتشر نہیں ہوتیں وہ گویا ایک سلسلہ میں منسلک ہوتی ہیں اور سب مل کر مصنف کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ایسی ہجووں میں ایک قسم کا تسلسل نظر آتا ہے جس کی وجہ سے اس کے حسن میں ایک حد تک اضافہ ہوتا ہے۔ کم از کم انتشار و پراگندگی میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس گروہ میں سلطان حیدر جوش اور سجاد علی انصاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ سلطان حیدر جوش مغربی خصوصاً انگریزی مصنفین سے متاثر ہوئے ہیں اور ان مصنفین کی تقلید کرنا چاہتے ہیں اور ایک حد تک اس تقلید میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ فلسفہ کی آمیزش کی وجہ سے ان کی ظرافت میں گہرائی آ جاتی ہے۔ یہ رنگ سلطان حیدر جوش کی تخلیق ہے اور غالباً انہی پر ختم ہو گیا ہے۔

> "معلوم نہیں نیچر کو اپنی ترقی کرنے والی مخلوق کے ساتھ کہاں کا بیر ہے کہ جس قدر مشکلات سے پیچھا چھڑاتی ہے اسی قدر وہ زیادہ مشکلات حائل کرتی جاتی ہے۔ جب انسان نے پیدل

> چلنے سے قدم آگے بڑھا کر زین سواری شروع کی تو نیچر نے محض ٹھوکر لگ جانے سے آگے بڑھ کر گھوڑے پر سے گر کر مرجانا پیدا کر دیا۔ پھر انسان نے گاڑی بنائی تو اس کا الٹ جانا اور زیادہ مہلک چیز وجود میں آئی، جب ریل نے دنیا کے وجود میں قدم رکھا تو ریل سے کٹ جانے کا سخت مہلک حادثہ بھی ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ مختصر یہ کہ انسان جس قدر اپنے آرام و آسائش حاصل کرنے کے زور میں آگے بڑھتا جاتا ہے، نیچر اسی قدر تکلیف اور مشکلات حائل کرتی جاتی ہے۔ یہی حالت سوسائٹی کی ہوئی وہ جس قدر آگے بڑھتی گئی پابندی اور دھوکہ سے گلو خلاصی حاصل نہ کر سکی مگر اس کی ترقی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی ابھی وہ سوشلزم کی اس حد تک نہیں پہنچی تھی جہاں تک پہنچنا مقصد تھا! ۔۔۔۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ دنیا اس حد تک پہنچ بھی گئی تو اس کو فی الواقع آگے بڑھنا کہیں گے یا پیچھے ہٹنا۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ ترقی کرے گی یا پھر اسی پہلے وحشی انسان کے بین بین ہو جائے گی اور کچھ عجیب نہیں کہ اس مرتبہ پھر وہ انسان سے بندر کے قالب میں پہنچ جائے کیونکہ بندر کو انسان سے بدرجہا بے فکری، مساوات اور مسرت حقیقی حاصل ہے۔“

یہ ہے سلطان حیدر جوشؔ کا رنگ اور اس رنگ میں گہرائی اور پختگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی تحریر میں بے ساختگی اور برجستگی کی کمی ہے لیکن کہہ سکتے ہیں کہ بے ساختگی اور برجستگی اس قسم کی فلسفیانہ ظرافت کے لئے موزوں بھی نہیں۔ جو بات ان کی تحریروں کو ممتاز بناتی ہے وہ غور و فکر کا وجود، خیالات و تجربات کی گہرائی اور سنجیدہ اور متین لب و لہجہ ہے۔ سلطان حیدر جوشؔ ایک مخصوص شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی انفرادیت ان کے الفاظ سے عیاں ہے وہ نوجوان مزاح نگاروں کی طرح غیر ذمہ دارانہ طور پر محض ہنسنے ہنسانے کے رومات کی تلاش نہیں کرتے اور انہیں تلاش کر کے قارئین سامنے پیش نہیں کرتے۔ وہ سستی شہرت کے طلب گار نہیں اس لئے وہ عام فہم اور عام پسند قسم کی چیزوں سے احتراز کرتے ہیں اور سطحی رنگینی، سطحی رعنائی خیال کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا ہے اس لئے ان کے مضامین کبھی شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، ملا رموزی کے مضامین کی طرح عام پسند نہیں ہو سکتے لیکن ان کے مضامین شاید اس وقت پڑھے جائیں گے، جب شوکت تھانوی وغیرہ کے نام سے بھی لوگ واقف نہ رہیں گے۔ ان کے مضامین کا حلقہ اثر لازمی طور پر محدود ہے۔ یہ مضامین ان ہی لوگوں کو متاثر و محظوظ کر سکتے ہیں جنہیں خود غور و فکر کی عادت ہے، جو خیالات کی کشمکش سے بچنا نہیں چاہتے ہیں۔ جو ادب کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ ان سب اوصاف کے باوجود سلطان حیدر جوشؔ کے مضامین میں چند مخصوص عیوب بھی ہیں۔ ان کی ظرافت فطری نہیں اکتسابی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے تخیل میں غیر معمولی باریکی، بلند پروازی اور فراوانی نہیں ہے۔ ان کی انشا غیر معمولی دلچسپیوں کی حامل نہیں ہے۔

> ”آہ دنیا، ترقی یافتہ دنیا، تمام تمول، تمام قابلیت، تمام سائنس، تمام قوت ایجاد و اختراع صرف اس بات پر صرف کر رہی ہے کہ گھنٹوں کے بجائے منٹوں میں گروہ کے گروہ نیست و نابود ہو جائیں! خوبصورت اور رعنا اور نوجوان عین عالم شباب میں اسی پرانی خیالی عزت کے پیچھے

> اپنی بیش بہا جانوں کو قربان کر رہے ہیں اور سونے کے بڑے بڑے انبار روپے کی گولیوں اور چیزوں کے لئے لٹائے جا رہے ہیں۔ صدیوں پرانی صناعی کی قابل قدر یادگاریں اور اس کے ساتھ ہی نیچر کی خانہ ساز بھولی بھالی صورتیں اسی طوفانِ بے تمیزی کی رو میں بہی چلی جاتی ہیں۔"

اس میں ایک زور ہے' ایک روانی ہے' ایک اثر ہے لیکن یہ زور یہ روانی یہ اثر فطری نہیں بلکہ سلطان حیدر جوشؔ کے قصد و ارادہ کا نتیجہ ہے' اسی وجہ سے اس میں سبکی اور لطافت نہیں بلکہ ایک قسم کی گرانی محسوس ہوتی ہے لیکن پھر بھی یہ یک قلم مصنوعی نہیں یہ غور و فکر کا مادہ سجاد علی انصاری میں بھی موجود تھا' نوجوانی کا تقاضا تھا اس لئے ان کے الفاظ میں نرمی کے عوض تیزی تھی۔ ان کی طنز میں کاٹ بھی زیادہ تھی لیکن وہ سلطان حیدر جوشؔ کی طرح پختہ کار انسان نہ تھے اس لئے ان کے خیالات میں وہ گہرائی وہ تسلسل وہ جامعیت نہیں۔ انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس اس قدر بھی نہیں۔ بظاہر سجاد علی انصاری کو ذمہ داری کا زیادہ احساس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ذمہ داری اسی قسم کی زیادتی کی حامل ہے جو عموماً ان نوجوانوں میں نظر آتی ہے جو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہتے ہیں اور اس احساس میں غلو سے مصرف لیتے ہیں۔ اس قسم کا غلو ان میں نظر آتا ہے لیکن اس غلو اور صحیح ذمہ داری کے صحیح احساس میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ بہرکیف نسبتاً سجاد علی انصاری میں ذمہ داری کا مادہ دوسرے نوجوان انشا پردازوں سے زیادہ ہے:۔

> "فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے' ایک حقیقت جب مٹتی ہے دوسری حقیقت ہو جاتی ہے۔ خدا نے ابتدا میں صرف فرشتوں کو پیدا کیا تھا۔ اس وقت تخلیق شیطنت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ خود ملکوتیت میں عناصر شیطنت مضمر ہیں۔ سلسلۂ ارتقا سے شیطان خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ معلم الملکوت کی فطرت میں ملکوتیت کے وہ تمام عناصر مکمل ہو چکے تھے جو تخلیق شیطنت کے لئے لازمی تھے۔ فطرتاً اس کے لئے یہ محال تھا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی ملکوتیت پر قانع رہے وہ شیطنت پر مجبور ہو گیا۔ اس کے سامنے ایک نئی حقیقت کی وسعتیں پیدا ہو گئی تھیں وہ کسی طرح فرشتہ نہیں رہ سکتا تھا۔"

یہ ہے سجاد انصاری کا رنگ۔ اس میں فلسفیانہ رنگ نمایاں ہے۔ وہی رنگ جو سلطان حیدر جوشؔ میں بھی موجود ہے لیکن یہاں وہ پختگی نہیں' وہ گہرائی نہیں' متانت و سنجیدگی بہرحال موجود ہے۔

اس قسم کی طنز اور عام پسند طنز میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ یہ کامیاب ہو یا نہ ہو لیکن یہ کچھ دوسری چیز ہے۔ اس سے بالکل مختلف جس کی مانگ اخبارات و رسائل کے آڈیٹر کیا کرتے ہیں۔

فلسفیانہ ظرافت میں بہت کچھ گنجائش باقی ہے۔ سلطان حیدر جوشؔ صاحب نے اس کی ابتدا کی ہے۔ سجاد انصاری میں اس کی کچھ مثالیں ملتی ہیں لیکن اس رنگ کی ابھی ابتدا ہے اور اس کی وسعتیں منتظر ہیں کسی ایسے رہرو کی جو اس راہ میں جرأت کے ساتھ قدم آگے بڑھائے۔

(۴)

طنز و ظرافت کے میدان میں رہرو تو بہت ہیں لیکن شاید پانچ نام ایسے ہیں جو بقا کے ذمہ دار ہیں۔ سوداؔ' اکبرؔ' غالبؔ' سرشارؔ

ابوالکلام آزاد۔

ابھی اردو میں ادبی طنز و ظرافت کے لیے لامحدود گنجائشیں ہیں، نظم اور نثر دونوں میں۔ اگر اردو انشا پرداز اس فن کی اہمیت کو سمجھیں، اس کی خصوصیتوں سے شناسائی بہم پہنچائیں تو بہت کچھ ترقی ممکن ہے۔ ("معاصر" جلد ۳ نمبر ۴، ۵، ۶ فروری مارچ اپریل ۱۹۴۲ء)

(نوٹ: "اردو ادب میں طنز اور ظرافت" سے متعلق پروفیسر سید محمد محسن نے کچھ شبہات ظاہر کئے تھے "معاصر" جلد ۴ نمبر ۱۔ ذیل کی سطروں میں انہی شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی)

محسن صاحب نے صحیح کہا ہے کہ تنقید میں جن الفاظ کا استعمال ہو وہ صاف اور متعین مفہوم رکھتے ہوں۔ میں نے اپنی مختلف تحریروں میں اس مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً معاصر جلد ا نمبر ۵ صفحہ ۳ پر یہ جملے ملیں گے۔

> "اصل یہ ہے کہ عموماً انسان کا دماغ ذرا کاہل ہوتا ہے، نہ وہ صاف طور پر سوچتا ہے اور نہ اپنے خیالات کو صاف، غیر مبہم پیرایہ میں بیان کرتا ہے، غور و فکر ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس کے لئے محنت و مشق کی ضرورت ہے اور ہر شخص میں اس دماغی محنت و مشق کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ تعلیم ناقص ہوتی ہے اور اس کی صلاحیت سے صحیح مصرف لینا نہیں سکھاتی۔ عام بول چال روزمرہ کے تعلقات میں انسان کو اس نقص کا احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ کم و بیش کامیابی کے ساتھ اپنا کام چلاتا ہے لیکن سائنس میں اسے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو بے کم و کاست بیان کرے اور انہیں دوسروں تک پہنچا سکے اس لئے سائنس میں الفاظ علامات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر علامت ایک مخصوص چیز کا اظہار ہوتی ہے اور اس طرح خیالات صفائی کے ساتھ معین و غیر مبہم پیرایہ میں الفاظ کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ تنقید میں بھی اظہارِ خیال کے لئے صاف و معین الفاظ کی ضرورت ہے، ایسے الفاظ کا استعمال لازمی ہے جن کے مفہوم مقرر شدہ ہیں یا جن کے مفہوم اور الفاظ (جو ان کے آگے پیچھے مستعمل ہوں) کے مفہوم کی وجہ سے صاف و مقرر ہو جائیں۔"

ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق محسن صاحب کی رائے میری رائے سے مختلف نہیں۔

دوسری بات جو محسن صاحب نے کہی ہے وہ ہنسی کے سبب سے متعلق ہے۔ محسن صاحب نفسیات کے ماہر ہیں اس لئے انہیں ہنسی اور دوسری چیزوں کے اسباب سے خاص دلچسپی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے ہنسی کے سبب سے (جس مفہوم میں محسن صاحب اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں) بحث نہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

> "فطرت نے انسان کو ہنسی کا مادہ عطا کیا ہے اور ہنسی مختلف وجوہ کی بنا پر آتی ہے یہاں ہنسی کی ماہیت اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے کا موقع نہیں۔"

اس لئے ان کی تحریر کا یہ دلچسپ اور اہم حصہ، جہاں تک اس کا میرے مقالے سے تعلق ہے، غیر متعلق ہے۔ میں نے کہا ہے

ہنسی عموماً عدم تکمیل، بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے اور محسن صاحب بھی اس سے اتفاق ظاہر کرتے ہیں۔

"اس میں شک نہیں کہ ہنسی یا احساسِ ظرافت کے لئے کسی ناموزونیت اور بے ڈھنگے پن
کا مشاہدہ ضروری ہے۔"

میرے اس جملے اور دوسرے جملے میں کوئی تضاد نہیں۔

"ہنسی بھی ایک انسانی خصوصیت اور زندگی کی ناتمامی کا نتیجہ ہے۔"

یعنی اگر زندگی ناتمام نہ ہوتی تو پھر کسی ناموزوں، بے ڈھنگی شے کا مشاہدہ ممکن نہ ہوتا۔ یہی بات میں نے ایک دوسری جگہ واضح کر دی ہے

"جس دنیا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ تکمیل سے خالی ہے۔ انسان اور انسانی فطرت میں بھی یہی
ناتمامی ہے اس لئے ہنسی کے مواقع کی کمی نہیں۔"

ان جملوں سے صاف ظاہر ہے کہ مجھے ہنسی کے فوری اور خارجی سبب سے بحث نہیں ہے۔ میں نے ہنسی کے حقیقی سبب پر کچھ لکھنے سے قصداً احتراز کیا ہے اور جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے محسن صاحب بھی متفق ہیں۔ پھر میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ ہمیں دنیا اور زندگی کی ناتمامی اور ناموزونیت کی وجہ سے ہنسی کے مواقع ملتے ہیں اور ہم ہنستے ہیں تو کسی ناموزوں واقعہ کے مشاہدہ سے مجھے امید ہے کہ میرے اس بیان سے محسن صاحب کے وہ شبہات جن کا تعلق اس خاص نکتہ سے ہے رفع ہو جائیں گے۔

اب میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے کیوں ہنسی کے سبب پر بحث کرنے سے احتراز کیا۔ بات یہ ہے کہ تنقید ایک مستقل فن ہے۔ یہ فن دوسرے علوم و فنون سے مصرف لیتا ہے لیکن کوئی دوسرا فن "فنِ تنقید" کا بدل نہیں ہو سکتا۔ نقاد مختلف علوم و فنون سے واقف ہوتا ہے لیکن اسے اس واقفیت سے ناجائز مصرف لینا نہیں چاہیے یعنی اسے اپنی تنقید کو تاریخ، معاشیات، نفسیات وغیرہ میں تبدیل نہیں کرنا چاہیے خصوصاً اسے ایسے تاریخی، معاشیاتی، سیاسی، نفسیاتی مسئلوں سے اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے جو تنقید سے سروکار نہ رکھتے ہوں اور جن پر تاریخ، معاشرت، نفسیات کے ماہرین متفق نہ ہوں۔ ہنسی کا سبب بھی اس قسم کا ایک مسئلہ ہے اس سبب کی تلاش ہمیں تنقید کی سرحد سے باہر لے جاتی ہے اور نفسیات کی قلمرو میں پہنچا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ مسئلہ آسان نہیں اور اس پر روشنی ڈالنے کیلئے ایک مفصل مقالے کی ضرورت ہے جس کی گنجائش میرے مضمون "اردو ادب میں طنز و ظرافت" میں نہ تھی۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ نفسیات ابھی نیا اور نوخیز سائنس ہے اور اپنی حیرت انگیز ترقیوں کے باوجود بھی یہ انسانی دماغ کی اتھاہ گہرائیوں سے مطلق واقف نہیں۔ انسانی دماغ بھی کائنات کی طرح وسیع ہے۔ اس کی پیچیدگی، اس کے تاریک رستے اور گوشے اس باریک اور دشوار قوانین سے مکمل واقفیت میسر نہیں

بہرکیف محسن صاحب کہتے ہیں کہ "ہنسی عموماً طمانیت و تسکین کا صوری اظہار ہے"۔ وہ پھر فرماتے ہیں کہ "ہنسی حقیقت میں اپنی موزونیت اپنی عدم کمتری اپنے مکمل ہونے کے احساس کی آئینہ دار ہے"۔ لیکن یہ تعریف بھی ہنسی کی تمام صورتوں پر حاوی نہیں مثلاً اس ہنسی کو لیجئے جسے عرفِ عام میں "کھسیانی ہنسی" کہتے ہیں۔ اس قسم کی ہنسی اپنی موزونیت کی آئینہ دار نہیں۔ یہ اپنی ناموزونیت کی پردہ دار ہے۔ پھر ہنسی کا ایک سبب اعصاب کی کمزوری ہوتی ہے جو لوگ NERVOUS ہوتے ہیں وہ بات بات پر بلاوجہ ہنستے یا مسکراتے ہیں اور یہ ہنسی ان کی موزونیت طمانیت یا تسکین کا صوری اظہار نہیں۔ اس قسم کی مختلف مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

میں نے ظرافت، طنز، ہجو کو تین انگریزی لفظوں کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے جو ترتیب وار یہ ہیں۔ SATIRE, IRUNY, HUMOUR.

ہجو اور ہجو گو شاعر کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی محسن کو کچھ اختلاف ہے۔ ہجو گو شاعر انسان بھی ہے اور شاعر بھی ایک طرف تو وہ ایک

برہم انسان ہے اور اس کی ہجووں کی ابتدا، ذاتی عناد اور تعصب سے ہوتی ہے لیکن وہ شاعر یعنی صنّاع بھی ہے اور شاعر یا صنّاع کی حیثیت سے وہ اپنے ذاتی جذبات سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور اپنے جذبہ کو عالمگیری UNIVERSALITY عطا کرتا ہے، یہ علیحدگی (DETACHMENT) ہر صناع کے لیے ضروری ہے ورنہ وہ کامیاب صناع شمار نہیں کیا جا سکتا۔ محسن صاحب نے شاید اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا ہے وہ پھر کہتے ہیں کہ میں نے ہجو کو طنز کا مترادف قرار دیا ہے' یہ صحیح نہیں، رشید احمد صاحب نے طنز کو ہجو کے مفہوم میں استعمال کیا ہے اسی لئے میں نے ان کی تعریف کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔ پھر میرے ان دو جملوں میں کوئی تضاد نہیں۔

"ہجو گو شاعر ایک برہم انسان ہے اور اس کی برہمی بے لوث نہیں بالوث ہوتی ہے۔"

اور۔۔ "ہجو گو ایک بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوریوں خامیوں اور فریب کاریوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے۔"

میں نے ابھی کہا ہے کہ ہجو گو شاعر اپنے ذاتی جذبات سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور انہیں عالمگیری عطا کرتا ہے۔ ہجو اگر وہ محض ذاتی عناد اور تعصب کا اظہار ہے تو زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی اور اس کا اثر دیرپا اور عالمگیر نہیں ہوتا۔ انسانی کمزوریوں، خامیوں اور فریب کاریوں کی جو مذمت ہوتی ہے وہ بلند اخلاق کے نقطۂ نظر سے ہوتی ہے۔ اگر یہ بلند اخلاقی نقطۂ نظر موجود نہ ہو تو پھر مذمت کی اہمیت باقی نہیں رہتی اور اس کا کوئی اثر بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہجو گو شاعر ایک بلند اخلاقی مقام سے ان خامیوں کا انکشاف کرتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محسن صاحب نے ہجو میں صناعت کے وجود کو فراموش کر دیا ہے اور ان خصوصیتوں سے سروکار نہیں رکھا جو ہجو گو کو صناع بناتی ہیں۔

محسن صاحب نے ہجو اور طنز کا فرق بھی ظاہر کیا ہے اور اس سلسلہ میں مجھ سے اتفاق ظاہر کیا ہے۔

"مجھے پروفیسر موصوف سے اتفاق ہے کہ طنز گو ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے' وہ ہمدردی' ترحم' انصاف' فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ' بغض و حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے۔"

میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق ہجو گو سے ہے' ملاحظہ ہو۔

"بہرکیف ہجو گو سارے جذبات پر تصرف رکھتا ہے' وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے' وہ ہمدردی' ترحم' انصاف' فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ' بغض' حقارت کے جذبات کو بھڑکاتا ہے' ظرافت نگار کے مقابلہ میں اس کی جذباتی دنیا زیادہ وسیع و کشادہ ہے۔"

میں نے ظرافت اور ہجو' ظرافت نگار اور ہجو گو میں تفرقہ کیا ہے۔ میں نے ہجو کو برابر SATIRE کے مفہوم میں استعمال کیا ہے ہجو گو ظرافت اور طنز دونوں سے مصرف لیتا ہے۔ خالص ظرافت نگار اور ہجو گو میں البتہ فرق ممکن ہے اور اس فرق کو میں نے صاف طور پر ظاہر کیا ہے۔ طنز ایک آلہ ہے جسے ہجو گو استعمال کرتا ہے اس لیے طنز اور ہجو میں تفرقہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محسن صاحب طنز کو SATIRE کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں اور ہجو کو کسی مخصوص و محدود معنی میں' اسی وجہ سے وہ ہجو کو "ایک قدیم اور غیر مہذب صنفِ شاعری" قرار دیتے ہیں اور طنز نگار کو مکمل ادیب سمجھتے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے ظرافت' طنز اور ہجو کو ترتیب وار HUMOUR، IRONY، SATIRE کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔ اگر محسن صاحب یہ بات پیشِ نظر رکھیں تو ان کے کئی شبہات رفع ہو جائیں گے۔

اُردو شاعری میں طنز

شوکت سبزواری

طنز اور ظرافت اکثر ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں شاید اس لیئے عام طور سے ان دونوں میں فرق نہیں کیا جاتا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی مضمون طنز پر مکمل اور جامع نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ظرافت کا ذکر نہ ہو۔ طنز ظرافت سے بالکل الگ چیز ہے یہ اور بات ہے کہ اس کا ظرافت سے تعلق ہے اور یہ تعلق بہت شدید اور گہرا ہے لیکن طنز کا مفہوم کچھ اور ہے۔ ظرافت کم سے کم اس کی حقیقت میں داخل نہیں۔ طنز ایک طرح کی تنقید ہے۔ ایک قسم کا عمل جراحی ہے۔ تنقید کئی طرح کی ہوتی ہے۔ طنز شدید، تیز اور بیدردانہ قسم کی تنقید ہے۔ اسی لیئے میں نے اسے ایک قسم کا عمل جرّاحی کہا۔ تنقید میں ایک چیز کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو سامنے ہوتے ہیں اور ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ جہاں بُرے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے وہاں اچھے پہلوؤں کو بھی اُجاگر کرے۔ تنقید ہمدردانہ ہوتی ہے توازن اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ طنز میں چیز کے بُرے پہلو نمایاں کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ اس میں تنقید کا اعتدال قائم رکھنا اس لیئے دشوار ہوتا ہے کہ یا تو چیز کے اچھے پہلو خود بخود نظرانداز ہو جاتے ہیں یا بُرے پہلو اس قدر چمکا کر پیش کیئے جاتے ہیں کہ اچھے پہلو ماند پڑ جاتے ہیں اور ایک عام قاری کی نظر ان تک نہیں پہنچتی۔ طنز کا یہ رُخ ہے جو بے دردی لیئے ہوئے ہے۔ طنز میں شدت اور تیزی ضروری سی ہے اس کے نشتر کسی قدر نوکیلے ہوتے ہیں۔ طنز میں جتنی شدت ہوتی ہے اتنا ہی وہ کامیاب اور بھرپور سمجھا جاتا ہے لیکن طنز کی شدت، تیزی، بیدردی اور تلخی ایک اچھے اور بڑے مقصد کے لیئے ہوتی ہے۔ طنز کی ادب میں اہمیت اس کی مقصدیت کی وجہ سے ہے اور یہی مقصدیت ہے جس کی وجہ سے طنز کی تلخی گوارا کر لی جاتی ہے۔ بقول غالبؔ لب کی شیرینی کا کرشمہ ہے کہ اس کی گالیاں کھا کے ہم بے مزا نہیں ہوتے لب کی یہ شیرینی طنز کا مقصد ہے۔ اس لحاظ سے طنز عام ادبی تنقید سے بلند ہے۔ تنقید کا مقصد ہے کسی ادب پارے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اور ادب میں اس کی حیثیت کی تعین، طنز کا مقصد ہے اصلاح۔ تنقید استحسان اور طنز تحسین۔

طنز کی کئی شکلیں ہیں جن میں وہ رونما ہوتا ہے۔ طنز میں تلخی اور شدت ہے اس لیئے ادب میں اس کے لیئے خاص خاص اسالیب بیان اختیار کیئے گئے ہیں۔ طنز کی کڑوی کسیلی گولیاں ان اسالیب کے لطف و چاشنی کی مدد سے حلق سے اتاری جاتی ہیں۔ مزاح ان میں سب سے اچھا اور پرلطف پیرایۂ بیان ہے جو طنز کی روح کے لیئے مناسب ہے اور اس کے مزاج کے لیئے سازگار رہی ہے۔ انشاپردازوں نے طنز کے نشتروں کو ان کی ظاہری تیزی اور زہرناکی کا اثر ہلکا کرنے کے لیئے ہی مزاح کے رنگ میں پیش کیا۔ مزاح طنز کے عملِ جراحی کے لیئے غشی آور دوا کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ مزاح کے زیرِ اثر قاری پر ایک نیم شگفتگی کی حالت میں خاموشی کے ساتھ طنز کا نشتر اپنا کام کر جاتا ہے

مزاح کے کئی درجے ہیں۔ ان میں سے تین ایسے ہیں جن کا اردو ادب سے تعلق ہے۔ استہزا و تمسخر، شوخی و ظرافت، بذلہ سنجی و شگفتگی۔ اردو میں طنز و مزاح ان تینوں روپوں میں جلوہ گر ہوا ہے۔ اردو میں طنز کی ایک اور شکل بھی ہے جو مشرقی ادب میں تو ملتی ہے لیکن مغرب کے جدید ادب میں کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ اصطلاح میں اسے تعریض کہتے ہیں۔ یہ طنز کی وہ قسم ہے جس میں مزاح کو دخل نہیں۔ یہ سنجیدہ طنز ہے اور چونکہ خوش مزاجی کے لباس سے عاری ہے اس لئے اس میں کسی قدر پیچ و خم رکھا جاتا ہے۔ پہلی قسم کا طنز براہِ راست تھا یہ بالواسطہ یعنی کج ہے۔ اردو میں لپیٹ کر کچھ کہنا اور اشاروں اشاروں میں چوٹ کر جانا تعریض ہے۔ غالب کا یہ شعر تعریض کی ایک اچھی مثال ہے ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اس میں ذوق پر چوٹ ہے۔ ایما اور اشارہ بھی طنز ہی کی قسمیں ہیں۔

اس میں تعریض طنز کی اچھی، مہذب اور کامیاب قسم ہے۔ میریڈتھ کا قول ہے کہ کامیاب ظرافت وہ ہے جو ہنسائے لیکن ساتھ ہی فکر کو بیدار بھی کرے۔ تعریض میں یہ صفت موجود ہے۔ اس میں طنز براہِ راست نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ قاری کے دل کی گہرائی تک اتر جاتا ہے۔ دوسروں پر وار کرنا آسان ہے لیکن اپنی ذات کو اپنے طنز کا نشانہ بنانا مشکل ہے۔ تعریض میں طنز کا رُخ طنز نگار کی طرف ہوتا ہے لیکن اس کی چبھن مخاطب اپنے پہلو میں محسوس کرتا ہے۔ یہ طنز مہذب اور شائستہ تو ہے ہی موثر اور بھرپور بھی ہے۔ اس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔

طنز ظرافت کی روح ہے۔ کہیں ظرافت ہوتی ہے لیکن طنز نہیں ہوتا۔ یہ مسخرگی اور کھلنڈرا پن ہے۔ ادب میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ بقول میریڈتھ یہ ملک اور قوم کے غیر متمدن ہونے کی علامت ہے۔ اردو میں نری ظرافت بھی ہے اور طنز آمیز ظرافت بھی۔ اگرچہ ظرافت طنز کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ اردو شاعری کا آغاز جس زمانے میں ہوا برصغیر تاریخ کے ایک نازک دور سے گزر رہا تھا۔ یہ قوم کی سیاسی پستی اور تمدنی زوال و انحطاط کا عہد تھا۔ سچی ظرافت اس میں کیسے پنپتی۔ لیکن اس کے باوجود شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز ہی سے اردو میں خوش طبعی کی ایک دبی دبی سی لہر ملتی ہے۔ اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز دہلی میں ولی دکنی کے اثر سے ہوا لیکن ابھی تھوڑا ہی زمانہ گزرنے پایا تھا کہ وہ اس اثر سے آزاد ہوگئی۔ میر تقی میر کا زمانہ اردو شاعری کا سنہرا زمانہ تھا۔ اسی میں وہ دکن کے اثر سے آزاد ہوئی اور اپنے گوناگوں فطری امکانات کا احساس اس میں پیدا ہوا۔ اس سے پہلے دہلی کی شاعری صنفِ غزل میں محدود تھی۔ میر کے زمانے میں ان حدوں کو توڑ کر اس نے شعر کے دوسرے اصناف میں قدم رکھا۔ صحیح معنی میں شاعری کی زبان میر کے زمانے میں کھلی۔ غزل میں کتنی وسعت اور گہرائی ہے، یہ میر اور اس کے ہم عصر غزل گو شعراء کے کلام سے معلوم ہوا۔ میر اس دور کے بڑے شاعر تھے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ میر کے میدان سے ہٹ کر سودا، سوز اور درد نے غزل میں جو روش اختیار کی اس سے غزل کی توانائی، وسعت اور فضا کی پہنائی کا پتہ چلتا ہے۔ میر نے دردِ دل جمع کر کے دیوان ترتیب دیا۔ لیکن سودا فطرت سے شگفتہ دل اور باغ و بہار طبیعت لے کر آئے تھے۔ غزل میں بھی انھوں نے چمن کھلائے۔

(۲)

سودا اردو کے پہلے طنز نگار شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں تمسخر زیادہ اور طنز کم ہے۔ سودا کی طنزیہ شاعری کا تمام تر سرمایہ ان کا ہجویہ کلام ہے۔ ویسے ہجو بھی طنز ہی ہے لیکن ہجو اور طنز میں ایک بنیادی فرق ہے۔ طنز صلاح و اصلاح ہے اور ہجو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا۔ سودا

کے ہجویات اسی رنگ میں ہیں۔ ان میں استہزا، تمسخر، مضحکہ، پھکڑپن، گالی گلوچ سبھی کچھ ہے۔ ان میں سودا نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔ ان کا مقصد اصلاح نہیں اس لئے ان کو طنز نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں کسی کو رسوا کرنے کا جذبہ کارفرما ہے لیکن سودا کی ہجویات دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں کسی فرد واحد مثلاً فاخر، مکین یا میر ضاحک کی خبر لی گئی ہے یہ تمسخر کی حد میں آتی ہے۔ چند ایسی بھی ہیں جن میں شکایت روزگار ہے یا جن میں پورے معاشرے یا اس کے کسی طبقے کو ہدفِ مطاعن بنایا گیا ہے ان میں طنز ہے اور بڑا گہرا اور شوخ قسم کا، اور شاید سودا کو اسی کلام کی وجہ سے اردو کے طنز نگار شعراء میں شمار کیا گیا ہے۔

لیکن سودا فطرتاً ہنسوڑ تھے۔ ان کے یہاں ہنسنے کی اہمیت زیادہ ہے۔ ان کے فن کی روح ٹھٹھول ہے۔ طنز کے لئے جذبے کی جس شدت اور نظر کی جس وسعت کی ضرورت ہے وہ اس سے محروم ہیں۔ سودا کے قصیدوں کی طرح ان کی ہجویات بھی مانگے کی ہیں ان میں جدت یا تازگی نہیں۔ سودا مضمون پیدا کرنا خوب جانتے تھے۔ ان کی ہجویات بے بات کی بات سہی لیکن ان میں فکر و شعور پیدا کرنے والی کیفیت نہیں۔ مریل گھوڑے اور مریل ہاتھی کی انہوں نے جو ہجو لکھی ہے اس میں فن کی بلندی، نادر تشبیہیں ہیں، نازک خیالی ہے، الفاظ کی دروبست ہے لیکن طنز کی شدت اور ظرافت کی شگفتگی سے یہ خالی ہے۔ میرے خیال میں ندرتِ خیال کی شاید ہی اس سے بہتر کوئی مثال پیش کی جا سکے ؎

ہوئی ہے ناتوانی اس کے درپے　　کہ وہ ڈیل اب دھوبن کی سی گرہ ہے
سمجھنا فیل اسے دیوانہ پن ہے　　کسی مدت کا یہ بابِ کہن ہے
اٹھے ہے خاک کا یا راکھ کا ڈھیر　　کہیں ہیں اس کو ہاتھی یہ ہے اندھیر

نہیں ہاتھی صعوبت کی ہے یہ رات

یا پھر

لیکن اس کے باوجود یہ فن کی جادوگری معلوم ہوتی ہے جو کرتب دکھانے سے آگے نہیں بڑھی۔ گھوڑے کے متعلق کہتے ہیں ؎

پہیے اسے لگا دو کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھو پون کے دو اختیار

بالکل یہی بات راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کے بارے میں کہی گئی ہے ؎

جو بیٹھے یہ تو اٹھنا اس سے ہے دور
لگیں جب تک نہ اس کو راج و مزدور

سودا کی غزلوں میں شگفتگی کی جو ایک لہر ہے اس میں کہیں کہیں طنز کی آمیزش بھی ہے یہ نازک اور لطیف قسم کا طنز ہے میں سو کے ان اشعار کو اس کی ہجویات کے مقابلے میں زیادہ طنزیانی سمجھتا ہوں ان میں فکر کی روشنی اور بصیرت ہے جو طنز کی جان ہے لیکن ا اشعار کا موضوع خاص ہے اس لئے ان کا طنز محدود ہے ان میں زندگی کی سی بے پایانی ہے اور نہ کائنات کی سی وسعت۔ چند شعر سنئے

سجدہ کیا صنم کو میں دل کے کنشت میں　　کہہ اس خدا سے شیخ! جو ہے سنگ و خشت میں

جن نے سجدہ کیا نہ آدم کو　　شیخ کا پوجنا ہے بایاں پاؤں

سنگ سے بیت الحرم کی شیخ اٹھائی ہے بنا   آئینہ دل کا مجھے اس گھر میں بٹھلانا نہیں

کیا شکر کیا شکایت اپنی ہے شکل یکساں   دونوں سے آپ ہی کو مقصود جانتے ہیں

(۳)

اردو کا دوسرا طنز نگار شاعر نظیر اکبر آبادی ہے جس کا نام ہمارے تذکرہ نگاروں نے شعراء کی فہرست ہی سے خارج کر دیا تھا نظیر غزل کے شاعر نہیں۔ غزل کے لئے دل کا خون کرنا پڑتا ہے۔ ہماری غزل کی روایت کا خالق میر ہے۔ میر جیسی غزل وہی کہہ سکتا ہے جس کی ہڈیوں تک کو تپِ عشق نے گھلا دیا ہو۔ نظیر بقول نیاز فتح پوری "چٹکلہ باز" تھے۔ دل کی لگن سے زیادہ دل لگی ان کا شیوہ تھا۔ نظیر اردو کے شاید تنہا عوامی شاعر ہیں جو مقامی بھی ہیں۔ انہیں ہنس ہنس کر وار کرنا خوب آتا ہے۔ نظیر کے یہاں طنز و ظرافت کا بڑا اچھا امتزاج ہے اچھا اس لئے کہ اس میں تیز تبسم کا طنز اور ہلکی پھلکی ظرافت صرف کی گئی ہے۔ اس کا مزاج بڑا ہی خوشگوار ہے۔ شگفتگی میں تلخی کی ایسی آمیزش جو مذاقِ صحیح کو ناگوار نہ ہو، بڑے سلیقے کا کام ہے۔ نظیر میں یہ سلیقہ ہے اور اس کو ایک ماہر فنکار کی طرح اس نے برتا ہے۔ "آدمی نامہ" نظیر کی مشہور نظم ہے۔ یہ تقابلی طنز کی بہترین مثال ہے اردو تو کیا شاید دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی مشکل ہی سے اس کے ہم پایہ کوئی نظم پیش کی جا سکے۔ سودا کے طنز کی دنیا جتنی تنگ اور محدود تھی نظیر کی اتنی ہی وسیع اور نا محدود ہے۔

نظیر کے یہاں زندگی کی اہمیت ہے اس کا اجتماعی شعور بہت تیز تھا سماج کا کوئی پہلو ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ ان کی نظر تفصیلی ہے وہ ایک ہوشیار نشتر زن کی طرح فساد کو دیکھ کر نشتر استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی نظر میں حکیمانہ گہرائی ہے وہ فساد کی اصلی وجہ نہیں جانتے۔ انہیں زندگی اور اس کی رنگینیاں پیاری ہیں وہ اس کا رس نچوڑنا چاہتے ہیں، شاید اسی لئے فساد پر ان کی نظر پڑ جاتی ہے۔ زندگی کی رنگا رنگی کو انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا اور ان کی شاعری کا وہ پہلو ہے جو سب سے الگ ہے ان کے فکر و فن کی ہم آہنگی کا راز یہ ہے کہ وہ زبان پر بلا کی قدرت رکھتے ہیں اور ان کی نظر میں غضب کی وسعت ہے۔ نظیر کا کمال ہے کہ اس نے زندگی کے تنوع اور گوناگوں رنگوں کے تقابل سے مزاح اور طنز پیدا کیا۔ دوسرے شعراء نے رنگ کو شوخ اور گہرا بنا کر اثر پیدا کرنا چاہا نظیر نے مختلف رنگوں کے پس منظر سے یہ کام لیا۔ لیکن طنز کی شدت اور تیزی ان کے یہاں نہیں اور شاید اس لئے نہیں کہ وہ نفرت کرنا نہیں جانتے وہ ننگا کر سکتے ہیں، تشہیر کر سکتے ہیں لیکن سر بازار جوتے مارنا اور ذلیل کرنا کسی طرح انہیں گوارہ نہیں۔

یہ کام سودا کے بعد اردو شعراء میں انشا نے کیا اور سودا سے بڑھ چڑھ کر کیا۔ سودا اور انشا میں کئی اعتبار سے مناسبت ہے دونوں کا مزاج ایک جیسا تھا۔ دونوں خوش باش، لاابالی اور ہنسوڑ قسم کے انسان تھے۔ دونوں نڈر اور بے باک ہیں لیکن سید انشا مقابلتاً زیادہ بیباک ہیں اور زبان پر انہیں قدرت بھی زیادہ ہے۔ نظر میں گہرائی اور جذبے میں گرمی انشا سے زیادہ سودا میں ہے۔ انشا کا فن بھانڈوں کا فن ہے اور جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے سودا ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ مصحفی کی پگڑی اچھالنے میں انشا نے کون سی کسر اٹھا رکھی ہے۔ جلوس نکالے اور سوانگ رچائے لیکن اس کے باوجود ان کو رسوا نہ کر سکے۔ انشا کی ہجو میں فن کی بلندی، پاکی اور صفائی نہیں غم و غصہ اور زہرناکی ہے، بھٹیاریوں کے کوسنے ہیں۔ ٹھینگے دکھانا اور انگلیاں نچانا ہے۔ انشا کی ہجویات کا طنز سے دور کا تعلق بھی

نہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کو اچھے ظرافت نگاروں میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ میاں منابؔ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ سید انشاؔ کے فضل و کمال کو ان کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔ انشاؔ کی شاعری پر لکھنؤ کی عام فضا اس طرح نہیں چھائی جس طرح ان کی خوش طبعی پر لکھنؤ کا دربار چھایا ہوا ہے۔ انشاؔ کی ظرافت مسخرہ پن ہے او۔ ان کی ہجو شہدہ پن۔ وہ فقط کپڑے اتارنے جانتے ہیں۔ سوداؔ اور انشاؔ میں قریب قریب اتنا ہی فرق ہے جتنا ننگا کرنے اور کپڑے اتارنے میں ہے۔

انشاؔ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کے بگاڑنے میں ماحول کو بڑا دخل ہے اور جہاں کہیں انہوں نے گرد و پیش سے آزاد ہو کر ذاتی اُپج سے کام لیا ہے وہاں ان کی بے پایاں صلاحیتیں صاف اُبھر آئی ہیں۔ انشاؔ ایک طرف علم و فضل رکھتے تھے، ادب اور زبان کے سنجیدہ مسئلوں سے انہیں دلچسپی تھی، دوسری طرف انہیں شاعری کا چسکہ تھا جو اس زمانے میں بیکاروں کا مشغلہ سمجھی جاتی تھی انشاؔ نے اپنی طبیعت کو ماحول کے مطابق ڈھالنے میں اپنے علمی ذوق اور طبعی میلان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی دامن نہیں چھوڑا اور آج یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں کس حد تک وہ توازن قائم رکھ سکے۔ انشاؔ کی غزلوں میں مجھے یہ توازن نظر آتا ہے۔ یہ انشاؔ کے ذوقِ علمی اور شگفتہ طبعی کا بہترین آئینہ ہیں۔ ان کی فضا رنگین، شگفتہ اور تبسم خیز ہے۔ ان کی لَے نرم، خوشگوار اور ترنم ریز ہے۔ میں انشاؔ کی غزلوں کی اس رنگینی اور شگفتگی کو ان کا اصلی فن سمجھتا ہوں۔ اس میں وہ سوداؔ سے آگے ہیں۔ آگے تو وہ ہجویات میں بھی ہیں لیکن ان میں انہوں نے اعتدال نہیں برتا۔ فن کی حدود کا خیال نہیں رکھا اور جس طرح مدح میں وہ بھٹئی تک پہنچ گئے۔ ان کی حدیں بھانڈوں اور نقالوں سے جا ملیں۔ انشاؔ آج اپنی غزلیات اور ان کے لب و لہجے کی نرمی، فضا کی رنگینی اور لَے کے دھیمے پن کی وجہ سے زندہ ہیں۔

ان کے یہاں چٹکیاں اور گدگدیاں بھی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

گالی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی   یہ سب سہی، پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کے کہنے سے مانا بُرا ہو کچھ   میری طرف کو دیکھیے میں نازنیں سہی

چند مدت کو فراقِ صنم و دیر تو ہے   چلئے پھر کعبہ بھی ہو آئیں ذرا سیر تو ہے

چھیڑنے کا تو مزا تب ہے کہو اور سنو   بات میں تم تو خفا ہو گئے، لو اور سنو

گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں ہم کوچے میں اُس کے   کیا کیجئے دروازہ اِدھر بند اُدھر بند

ابھی کہتا ہوں دیوانے کی کنڈی کھول دو چپکے   نہیں تو میرا سر ہے آج او صاحب کی چوکھٹ ہے

(۴)

اردو کا پہلا بڑا طنز نگار غالب ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر غالب نہ ہوتا تو بعض لوگوں کا یہ کہنا صحیح سمجھا جاتا کہ اردو شاعری طنز۔ نشتروں سے خالی ہے۔ غالبؔ کی طنز کا ہجو سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو سے اپنی زبان آلودہ نہیں کی۔ اس لحاظ

وہ سوداؔ اور انشاؔ کے سلسلے میں نہیں آتے۔ غالبؔ کے طنز و ظرافت کی بنیاد نظر و خبر اور بصیرت و بصر پر ہے۔ غالب کے یہاں سلیقہ بڑی چیز ہے اور یہی ان کے فن کی جان ہے۔ ان کے فن کا یہ سلیقہ ان کے فکر کی روشنی سے ہے۔ اسے اگر ہم انہی کے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ "بصد رنگِ گلستان" ہے۔

غالبؔ کے طنز کی کئی خصوصیات ہیں۔ ایک تو بقول رشید احمد صدیقی وہ براہِ راست نہیں، اشاروں اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ جس پر وہ وار کرتے ہیں اسے اول تو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ان کے طنز کا نشانہ تھا اور اگر ہوتا ہے تو اس وقت جب طنز اپنا اثر کر چکتا ہے۔ طنز کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے۔ غالبؔ کے لفظوں میں یہ ایک ادا ہے ؏

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

غالبؔ کے طنز میں شوخی کا رنگ ہے اور اس لحاظ سے وہ سوداؔ اور نظیرؔ کے طنز سے مختلف ہے لیکن اس کے یہاں طنز و شوخی میں کچھ عجیب انداز کی ہم آہنگی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس ہم آہنگی میں بھی طنز غالب ہے اس لحاظ سے غالبؔ طنز نگار زیادہ اور ظریف کم ہیں حالیؔ نے غالبؔ کے شاید شگفتہ اور رنگین و بہار انداز تحریر یا ان مکاتیب کی وجہ سے جو زعفران زار ادب ہیں، ان کی ظرافت کو اہمیت دی اور ان کو "حیوانِ ظریف" کہا لیکن مجھے غالبؔ کے کلام میں طنز نمایاں نظر آتا ہے اس لئے میں انہیں "ظریف" سے زیادہ "طنّاز" یعنی طنز نگار سمجھتا ہوں۔

غالبؔ کا عقیدہ طنز کے بارے میں یہ ہے کہ وہ جتنا خم دار ہو اچھا ہے۔ ویسے تو رسم پرستی سے انہیں ہمیشہ نفرت رہی اور پامال راہوں پر چلنا انہوں نے کبھی پسند نہیں کیا لیکن ان کا طنز بالکل ان کی اپنی چیز ہے اور اس میں انفرادیت بہت زیادہ نمایاں ہے وہ بڑا ہی خوشگوار اور موثر ہے اور شاید اس لئے موثر ہے کہ خوشگوار ہے وہ بڑا ہی سادہ اور پرکار ہے۔ سادگی فن کی ہے اور پرکاری فکر کی۔ تضاد کاری ہی میں غالبؔ کی انفرادیت کا راز ہے۔ غالبؔ کے طنز میں جھلاہٹ، زہرناکی اور تلخی نام کو نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے لب و لہجے کی تلخی سے اس کو تلخ نہیں بنایا ویسے ہر صحیح اور سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں انگریزی ادب و انشا کے اثر سے اس طنز کو کامیاب سمجھا جاتا ہے جو خون کی پھوار بھی ہو اور تلوار کی دھار بھی۔ سوئفٹ انگریزی کا مشہور طنز نگار ہے جس کے طنز میں تیزی اور گرمی دونوں اعتدال سے زیادہ ہیں، تیزی دہشت اور بربریت کا رنگ لئے ہوئے ہے اور گرمی ہیجان اور غضب تک پہنچ گئی ہے لیکن طنز کی تیزی جب حد سے گزر جاتی ہے تو اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر و نشتر ہلاکت بار ہو سکتے ہیں لیکن اصلاح کار ان سے ممکن نہیں غالبؔ کا طنز شوخ و شنگ ہوتے ہوئے بھی دھیما ہے اس میں چابک دست نشتر زن کے ہاتھ کی صفائی، نرمی اور گداز ہے۔ غالبؔ نے طنز کے لئے تعریض کا پیرایۂ بیان اختیار کیا۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ طنز میں تلخی اور ناگواری آنے نہ پائے اور تاثیر ایسے ہی مخاطب کو یہ احساس نہ ہو کہ اس پر عملِ جراحی کیا گیا ہے۔ غالبؔ کے طنز یہ انداز کی کامیابی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ آج ہمارے بعض نکتہ رس نقاد بھی اس چھپے ہوئے طنز کا پتہ نہ چلا سکے اور ذیل کے شعروں کا رُخ انہیں غالبؔ کی طرف نظر آیا ؎

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت بھی دیکھا چاہیے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے۔

ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ   دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی   ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

غالب کا طنز نرم ہی نہیں ہموار بھی ہے اور اس کی ہمواری یہ ہے کہ اکبر کی طرح لفظوں کی الٹ پھیر یا بقول آل احمد سرور محاورات کی قوسِ قزح کی سی رنگینی سے یہ پیدا نہیں ہوا بلکہ روح کی طرح شعر کی نس نس میں ساری ہے۔ غالب کا فن شوخی کا فن ہے پھبتی اور چٹکلہ بازی کا فن نہیں اس خصوصیت میں اکبر الہ آبادی سے بھی ممتاز ہیں اور نظیر اکبر آبادی سے بھی۔ اکبر پھبتی اچھی کہتے ہیں اور نظیر کے ہاں چٹکلے خوب ہوتے ہیں۔ غالب شوخ نگار ہے اور اس کی شوخی کی جان طنز ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر   کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا   جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

اس شعر میں کتنا پاکیزہ، گہرا اور مؤثر طنز ہے اور اس کو جس سادہ و پرکار انداز میں ادا کیا گیا ہے اس کا لطف محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

مومن خاں نے بھی یہی بات کہی ہے لیکن غالب کے شعر سے اسے کیا نسبت ؎

کہاں وہ امنِ اسیری کہاں وہ عیشِ قفس
کہ بیمِ برقِ بلا روز آشیاں کے لئے

غالب کا طنز ایمائی ہے اور اس میں زور، اثر، تازگی، لطف جو کچھ بھی ہے ایما کی وجہ سے ہے۔ ایما اور شوخی غالب کے طنز کی دو بڑی خصوصیات ہیں۔ ایک میں دقت اور گہرائی ہے۔ دوسرے میں رنگینی اور گہرائی۔ غالب کے موضوعات میں اتنا تنوع نہیں جتنا اکبر کے موضوعات میں ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ غالب کا طنز تنگنائے غزل میں صرف ہوا جو پہلے سے جذباتِ محبت اور اس کی سرشارانہ کیفیت کے لئے مخصوص ہو چکی تھی۔ ادھر اس کے فن میں جو ایک طرح کی نازکی اور رعنائی ہے اس کا تقاضا تھا کہ اس میں اجتماعی زندگی کی ہنگامہ آرائیاں راہ نہ پائیں اور اس کو زندگی کے بڑے اور ابدی مسئلوں کے لئے وقف رکھا جائے۔ غالب کے طنز کی ابدیت فن و فکر اور ہیئت موضوع دونوں کی وجہ سے ہے۔ انسان، خدا، مذہب، عبادت، جنت اور اس کی نعمتیں، فکر و خیال کی پابندی جیسے اہم مسئلے غالب کے طنز کا موضوع ہیں جن پر اس بڑے فنکار نے اپنا زورِ بیان صرف کیا۔ انسان خدا کا شاہکار ہے خدا کے شاہکار کی ارزانی غالب نہ

دیکھ سکے اور پکار اٹھے ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اس شعر کا لب و لہجہ ہی طنزیہ نہیں بلکہ اس کا ہر لفظ طنز کی تیزی اور تلخی لئے ہوئے ہے "گستاخیٔ فرشتہ" اور "جناب" کیسے برمحل اور بامعنی الفاظ ہیں۔ ان کی داد کچھ اہلِ ذوق ہی دے سکتے ہیں۔ چند شعر سناتا چلوں ؎

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہو پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہو

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پہ

خلد میں کہئے تو دوزخ بھی ملائیں یارب سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

یہ اشعار یونہی روا روی میں محض یادداشت سے نقل کر دیئے گئے۔ غالبؔ کے مختصر سے دیوان میں ایسے نشتر اور بھی ہیں جن کی چبھن ہمیں پہلی ہی نظر میں محسوس ہو جاتی ہے۔

(۵)

اس اجمالی جائزے میں جن اردو شعراء کا ذکر ہوا وہ محض ظریف اور طنز نگار نہ تھے، اس کے سوا بھی بہت کچھ تھے بلکہ بہت کچھ زیادہ تھے اور ان میں سے قریب قریب ہر شاعر کی عزت شہرت اور ادب میں اس کا مقام طنز و ظرافت کا شرمندۂ احسان نہیں دوسری خصوصیات کا رہینِ منت ہے۔ یہ خصوصیات ان کی بقائے دوام اور شہرتِ عام کا سبب نہیں۔ غالبؔ کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا اس کے پورے آٹھ سال بعد ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے اودھ پنچ نکلا جس کا مقصد اردو میں ظرافت کو فروغ دینا تھا۔ پنچ کے مضمون نگاروں میں بڑے بڑے

سحرکار اہلِ قلم شامل تھے۔ اکبر الہ آبادی کے سوا سب نے نثر میں ظرافت کے پھول کھلائے۔ اکبر نے طنز و ظرافت کو فن کی حیثیت سے شعر میں برتا اور اس کے لئے قطعہ کا فارم اختیار کیا۔ اکبر کی شاعری میں ظرافت کا ایک خاص مقام ہے۔ اردو میں اکبر کی اہمیت ظرافت کی وجہ سے ہے۔ اکبر پہلے ظریف ہیں، اس کے بعد ان کے طنز کا نمبر آتا ہے۔ یہ میں اوپر کہیں لکھ آیا ہوں کہ طنز کی روح اس کا مقصد ہے اکبر کے یہاں مقصد کی نوبت بڑھی ہوئی ہے۔ مقصد طنز کو بلند اور معیاری بنانے کا ضامن ہے لیکن اکبر کے یہاں وہ اتنا بڑھا کہ اس نے طنز کے جادو کو بے اثر بنا دیا۔ اکبر کا طنز اس لحاظ سے سیدھا اور براہِ راست ہے وہ طنز میں ایما، اشارے اور تعریض کے قائل نہیں۔ وہ سامنے سے وار کرتے ہیں۔ اکبر کے فن میں ایک طرح کی چمک اور ان کی ظرافت میں ایک قسم کی عریانی ہے۔ فن میں چمک زبان و بیان پر قدرت سے آئی۔ اردو کے قادر الکلام شاعروں تو اور بھی ہیں لیکن نظیر اور اکبر کے درجے کو کوئی نہیں پہنچتا۔ نظیر کی قدرت مشاہدے کی وسعت لئے ہوئے ہے۔ جزئیات نگاری سے نظیر کی قدرت لور مشاہدے کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ اکبر کی قدرت رعنائی اور گیرائی میں ہے جس کا اظہار ندرتِ بیان اور لطفِ زبان سے ہوا ہے۔ ظرافت میں عریانی میرے خیال میں اکبر کے جنسی میلانات کی غمازی نہیں بلکہ اس زمانے کی سوسائٹی کو بے نقاب کرتی ہے اس زمانے میں عام سیاسی پستی کا اثر اخلاق پر بھی پڑا تھا اور شعر، شباب، شاہد، شراب کے گرد زندگی گردش کرنے لگی تھی۔

اکبر کی ظرافت فقرہ بازی کا رنگ لئے ہوئے ہے اور غالب کے برعکس یہ فقرہ بازی، رعایتِ لفظی اور صنعت گری کی پیداوار ہے اکبر لکھنؤ اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نغمہ سنجی کا آغاز لکھنؤ کے بگڑے ہوئے مذاقِ شاعری کے زیرِ اثر ہوا۔ سرسید کی تحریک کی مخالفت میں جب انہوں نے پرانی روش ترک کر کے طنز و ظرافت کی راہ اختیار کی تو وہ پوری طرح لکھنؤ کے اثر سے اپنے کو پاک نہ کر سکے لفظوں کا کھیل اس کے بعد بھی ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ اکبر کے اشعار کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے ان کا سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت کا تعلق تمامتر الفاظ کی نشست اور دروبست سے ہے۔ اکبر کی ظرافت میں زبان و بیان کی چاشنی اور محاورے کا چٹخارا ہے جس سے صرف اہلِ زبان ہی حظ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں شگفتگی، بانکپن، رعنائی ہے لیکن گہرائی، گرمی اور تیزی نہیں۔ یہ ہنساتے ہنساتے لوٹن کبوتر بنا سکتا ہے لیکن سوچنے پر آمادہ کرنے اور خوابیدہ شعور کو بیدار کرنے کے جوہر سے خالی ہے اور اس کی وجہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں کہ اس میں اس عہد کے عام مذاق کا خیال زیادہ رکھا گیا ہے اور پڑھنے والے کو یہ محسوس کرایا گیا ہے کہ اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے اس قسم کا مذاق مجلسوں کو گرما سکتا ہے لیکن اچھے اور بلند طنز کی پہچان یہ ہے کہ وہ دلوں کو گرمائے اور خون کے دوران کو تیز کرے۔

اس لحاظ سے اکبر پوری طرح "اودھ پنچ" حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا کام ہی لوگوں کی پگڑیاں اچھالتا اور ان کی بھدی اور بدنما تصویریں بنانا تھا۔ اکبر اس حلقے سے نہ نکل سکے اور وہ اس میں پھنس کر رہ گئے۔ ان کا طنز ظرافت سے نہ ابھرا اور ان کی ظرافت سستی قسم کی فقرہ بازی سے آگے نہ بڑھی اس لئے اس میں ابدیت کا رنگ نہ آ سکا لیکن اس کے باوجود اردو ادب میں اکبر کے طنز و ظرافت کا ایک درجہ ہے اس نے اردو ادب کی فضا کو رنگینی اور خوشگواری دی اور زندگی سے اس کا رشتہ مضبوط کیا۔ غالب سے پہلے طنز و ظرافت کی حدیں ابتذال اور تمسخر سے ملی ہوئی تھیں۔ غالب نے اس کو فن کی لطافت اور حسن سے آشنا کیا لیکن تنگنائے غزل میں محصور ہونے کی وجہ سے غالب اجتماعی اور سیاسی مسائل کو اپنے طنز کا موضوع و محل نہ بنا سکے۔ اکبر نے اس کام کو انجام دیا اس لئے اکبر اس سلسلے کی آخری

گرمی ہیں۔ جس طنز کا آغاز سودا سے ہوا اکبر تک پہنچتے پہنچتے وہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔

گرمی، تیزی اور تلخی اچھے طنز کے تین عنصر ہیں۔ مقصد اس کی روح ہے۔ اکبر کے یہاں گرمی اور تیزی نہیں لیکن تلخی ہے اور یہ تلخی غالب سے زیادہ ہے۔ غالب کے یہاں تیکھا پن ہے۔ اکبر کے طنز کی تلخی کہیں کہیں زہرناکی کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اکبر کا وہی طنز موثر اور کامیاب ہے جو ہلکا اور لطیف ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا مقصدیت کے غلبہ نے اس کو بھی بے اثر بنا دیا ہے۔ اکبر بڑے فن کار ہیں اور جہاں تک مہارتِ فن کا تعلق ہے وہ مغرب کے بڑے سے بڑے فن کار کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ شعر کا لہو جذبہ ہے اکبر کا جذبہ شدید قسم کا ہے۔ فن کا حسن سلیقہ شعاری ہے۔ اکبر سلیقہ بھی بہت اچھا رکھتے ہیں۔ اس کا آب و رنگ لطف زبان و بیان سے وابستہ ہے۔ اکبر کو اس میں بھی دستگاہ حاصل ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود میں نہیں سمجھتا کہ اکبر کے فن کی عظمت کیسے گھٹائی جا سکتی ہے اکبر نے بقول آل احمد سرور تاریخی حقائق اور فطری طاقتوں کا مذاق اڑا کر اپنی جرات کا ثبوت دیا۔ میں اسی جراتِ رندانہ پر عظمتِ فن کی بنیاد رکھتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ اکبر کا طنز ظرافت سے نہیں ابھرا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اکبر نے جن چیزوں کا مذاق اڑایا ان سب کو دیکھا لیکن ان میں دبا ہوا طنز بہت کم لوگوں کو نظر آیا۔ اکبر کے طنز کا نشانہ نہ تاریخی حقائق ہیں نہ فطری طاقتیں بلکہ قوم کا وہ کردار ہے جس نے اس کو "نقل انگریز" پر ابھارا، وہ بے بصری ہے جس کی وجہ سے وہ مغربی تہذیب کی شمع پر پروانہ کی طرح ٹوٹ کر گری وہ قصورِ نظر ہے جس نے اپنی ہر چیز کو حقیر و صغیر بنا کر دکھایا۔ چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

مال وہ ہے بنے جو یورپ میں   بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر   اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

اے خدا کر دے مجھ کو صاحب لوگ   دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ
میرا قالب ہو قالب مغربی   بھول جاؤں زبان بھی اپنی
سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں   سب یہ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

گریجویٹ ہیں، کھاتے ہیں اور تنتے ہیں
بناتے اپنے کو ہیں دوسروں میں بنتے ہیں

پبلک میں ذرا ہاتھ ملا لیجئے مجھ سے
صاحب مرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

اسی نقطہ کو سامنے رکھ کر ہی میں نے عرض کیا تھا کہ پہلے اکبر ظریف ہیں، اس کے بعد ان کے طنز کا نمبر آتا ہے، ورنہ حقیقت میں وہ طنز نگار ہیں اور میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ ظرافت سے زیادہ طنز کی ان کے یہاں اہمیت ہے۔ اکبر نے اپنی ظرافت کی طنزیاتی روح کی طرف

اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

باطل پہ نہ جاؤ حق کو سن لو
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لو

لیکن یہ روح اتنی دبی دبی اور گھٹی گھٹی ہے کہ اس کی تڑپ، گرمی اور حرکت ہر شخص کو محسوس نہیں ہوتی۔ اقبال نے میرے خیال میں سب سے پہلے اس روح کی حرارت محسوس کی اور اول اول خود انہوں نے اس پر ظرافت کا ہلکا سا پردہ ڈالنا چاہا لیکن اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور یہ روح تڑپ کر اس پردے سے باہر نکل آئی۔

غالبؔ کے بعد اکبرؔ آئے لیکن اکبرؔ کے بعد اقبالؔ کا ظہور ہوا، شاید اس لئے اردو میں طنز اکبرؔ کے فن سے آگے نہ بڑھا۔ طنز کی روح نے اقبالؔ کے یہاں حکمت، متانت اور روشن بصیرت کا روپ اختیار کر کے اچھی اور معیاری ظرافت کا گلا گھونٹ دیا۔

ہجو گوئی کی تاریخ

قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی

اکثر صاحبان فن میں چشمک ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض میں تو منافست ہوتی ہے اور بعض میں نفسانیت ہوتی ہے قسم اول کا معاملہ تو اشاروں کنایوں اور دور کی نوک جھوک پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے خفیف معاملات ہوتے ہیں کہ ان کو اکثر مورخ اور تذکرہ نویس بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ قسم دوم کا معاملہ طوالت پکڑ جاتا ہے۔ اول نوک جھوک ہوتی ہے۔ پھر ہجو ملیح، پھر ہجو قبیح، پھر سب و شتم تک نوبت پہنچ جاتی ہے ؎

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم، تم سے تو ہونے لگی

بعض دفعہ ہاتھا پائی بھی ہو جاتی ہے بلکہ خون خرابے بھی ہوئے ہیں۔

ہجو گلستانِ سخن کا ایک خار دار جھاڑ ہے۔ گل کی قدر افزائی میں خار کو بڑا دخل ہے۔ اس کے علاوہ ایک مکمل زبان کو ہر قسم کے الفاظ و محاورات اور صحت کے ساتھ ان کے استعمال کی ضرورت ہے۔ اگر ہجو وغیرہ نہ ہو تو زبان فحش، نجس اور غلیظ الفاظ کی تصحیح سے محروم ہو جائے۔ نوک جھوک، چھیڑ چھاڑ، مدح و ذم سے شاعر کی طبیعت میں جولانی بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا سوداؔ نے ایک شاعر سے جو ان کا شاگرد ہونے آیا تھا کہا کہ ہجو لکھا کیجئے۔ اس نے کہا کہ کس کی ہجو لکھوں۔ مرزا نے کہا کہ آپ میری ہجو لکھیے، میں آپ کی لکھوں گا۔ ہجو میں بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک اصلی دوسرے فرضی۔ اصلی یہ کہ واقعی طور پر کسی سے مخالفت ہو جائے اس کی ذم لکھی جائے۔ فرضی یہ کہ طبع آزمائی کے لئے کسی فرضی شخص یا ایسی شے کی ہجو کی جائے جو جواب نہ دے سکے، جو جوش و خروش قسم اول میں ہوتا ہے وہ قسم دوم میں نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض اساتذہ نے مکھی مچھر وغیرہ کی ہجویں لکھی ہیں اور روکھی پھیکی ہیں۔

ہجو سے کسی زبان کی شاعری خالی نہیں۔ عربی میں بھی ہجویں ہیں۔ آج کل ملک میں انگریزی کا بڑا رواج ہے اس لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ انگریزی میں اول ہجو کا معیار پست تھا۔ ڈرائڈن نے نظم میں سوفسٹ نے نثر میں اس کا معیار بلند کیا۔ فارسی کے بڑے بڑے اساتذہ نے ہجویں لکھی ہیں اور اس پر فخر و ناز کیا ہے۔ خاقانی ابوالعلا گنجوی کا شاگرد تھا۔ ہجو گوئی میں بڑا مشتاق تھا اور وہ اس کمال پر نازاں تھا استاد پر بھی ہاتھ صاف کر گیا۔ کہا ہے ؎

بینی سگِ گنجہ را دریں کو
ہم زرد و فغا و ہم سیہ رو

میرے نزدیک اردو میں ہجو گوئی کے موجد امیر خسرو ہیں اور انہوں نے اس کی بنیاد ہجو ملیح یعنی ایسی ہجو پر رکھی ہے کہ جس سے بیک نظر مدح کا مفہوم ہو لیکن اس میں ذم کا بھی پہلو ہو۔ دلی میں ایک چھو ساقن مشہور تھی۔ اس کا گھر شہر کے بھنگڑوں کا مرکز تھا چھو بھنگ بنانے میں مشہور تھی۔ شہر کے دور دور محلوں سے بھنگڑ اس کے ہاں آتے تھے اس لئے تقریباً ہر وقت اس کے یہاں بھنگ گھٹتی رہتی تھی۔ اس کی شان میں خسرو فرماتے ہیں ؎

اوروں کی چوپہری باجے چھو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے رکھے جس میں ناہیں تو سل
اوروں کے جہاں سینگ سمائیں چھو کے یہاں موسل

چونکہ دلی میں ہجو کا سنگِ بنیاد دلی کے اردو شاعری کے موجد اور ایک بزرگ نے رکھا۔ شاید اسی وجہ سے شاعری کی یہ قسم اہل دہلی کو بہت مرغوب ہے۔ بڑے بڑے اساتذہ کا دامن ان کانٹوں میں اس طرح الجھا ہوا ہے کہ اس کا جدا کرنا ناممکن ہے دلی کے مقد بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ تک نے اپنے ہم عصر شاعر آبروؔ پر ایک نہایت مخش چوٹ کر دی تھی اور آبروؔ نے بھی اس کا جواب دے ڈالا تھا۔

اساتذہ دہلی کو اس قدر دلچسپی ہجو سے تھی کہ اگر کوئی ہاتھ نہ لگا تو مچھر اور مکھی وغیرہ ہی کی ہجو لکھ ڈالی۔ امراء کو ہجو سننے کا ایسا شو تھا کہ جب مصحفیؔ اور انشاءؔ کی چلی جس میں نہایت فحش الفاظ استعمال کئے گئے تھے تو شہزادہ سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم ثانی فریقین سے ہج منگا منگا کر سنتے تھے اور انہیں انعام دیتے تھے۔ بعض دفعہ اپنی درباری عظمت کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔

ایک دفعہ ضاحکؔ اور سوداؔ اور سکندرؔ حاضرِ دربار تھے۔ شہزادے نے سوداؔ سے کہا کچھ سنائیے۔ سوداؔ نے عرض کیا۔ م نے تو آج کل کچھ لکھا نہیں۔ سکندرؔ کی طرف اشارہ کیا کہ انہوں نے کچھ کہا ہے۔ شہزادہ نے کہا سناؤ۔ سوداؔ نے سکندر کے نام سے ضاحکؔ کی جو ہجو لکھی تھی، پڑھی۔ ابھی دو تین ہی شعر پڑھے تھے کہ ضاحکؔ اٹھ کر سکندرؔ سے دست و گریباں ہو گئے۔ نہ شاعروں دربار کا کچھ خیال کیا نہ شہزادے نے اپنی شان کا خیال کیا۔ بس شاعروں کی ہاتھا پائی دیکھ دیکھ کر مزا لیتے رہے۔

جب اساتذہ دہلی اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے تو یہاں آ کر وہی اودھم مچایا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ خواجہ میر در کے شاگرد محشرؔ اور جراتؔ کے شاگرد مہلتؔ میں نوک جھونک ہوتے ہوتے تلوار چل گئی۔ محشرؔ مارا گیا، مہلت فرار ہو گیا۔ کئی برس کے بعد مہلتؔ پھر پہنچا تو محشرؔ کے رشتہ داروں نے اس کو مار ڈالا۔ غرض اہل دہلی میں نوک جھونک اور ہجو کے ۸۴ معرکے ہوئے۔ ان م چھ معرکے وہ ہیں جو استاد شاگردوں میں ہوئے۔ ان میں بعض معرکے ایسے بھی ہوئے ہیں۔ جن میں مورخین کو اختلاف ہے اور بعض ان کو فرضی قرار دیا ہے لیکن ایسے صرف دو تین ہی ہیں۔ چونکہ ہجو کی بنیاد نوک جھونک سے قائم ہوتی ہے اس لئے میں ان کا یہاں ایک ہی جگہ ذکر کرتا ہوں۔ میں اس امر کا افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ باوجود جدوجہد کے میں اس دلچسپ مضمون کو کما حقہ مکمل نہ کر سکا ضرورت ہے اور امید ہے کہ تاریخ ادب اردو کے شائقین و مصنفین میں سے کوئی اہل قلم اس کی تکمیل کی کوشش کریں گے

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

ہجو کی ایجاد کے متعلق تو لکھا جا چکا ہے۔ امیر خسرو کے بعد جب بارھویں صدی ہجری میں دلی میں شاعری کا چرچا بڑھا تو جعفر زٹلی نے ہجو گوئی کو ذریعہ معاش بنایا۔ یہ جس امیر کے پاس جانے کا قصد کرتا تو چند شعر اس کی مدح میں لکھتا اور چند ہجو کے۔ اگر اس نے اس کو کچھ دے دلا دیا تو مدح سنا کر چلا آیا ورنہ ہجو کو مشتہر کر دیا۔ اس نے بادشاہ اور شہزادوں کو بھی نہ چھوڑا۔ سلطان اورنگ زیب مرحوم کے بعد جب ان کے بیٹوں میں جنگ ہوئی تو اس نے جنگ نامہ لکھا۔ چند مہذب اشعار یہ ہیں ؎

نخستیں فلاں نرکہ برکھنڈ کرد　　　ہمہ کاروبار پدر لنڈ کرد
جہاں ہوئے ایسا کلیجن کپوت　　　لگے خلق کے منہ کو کالک بھبوت

دوئم شاہ اعظم ہمہ کند در　　　ہر سوئے انداخت کار پدر

چہارم پسر ڈومنی کا جنا ....

فرخ سیر بادشاہ جب تخت نشین ہوا تو اس نے اس کا سکہ لکھا

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر

بادشاہ پشہ..........

فرخ سیر نے اس کو قتل کر دیا۔ جعفر ایک دن سیٹھ مہا سنگھ کے پاس گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کو کیا دینا چاہیے۔ جب ذرا دیر ہوئی تو جعفر نے کہا ؎

نظر مت کرو پانچ اور سات پر

مبادا کہ زور آپڑے ..... پر

جعفر نے اپنی بیوی کی بھی ہجو لکھی ہے ؎

کھائے بہت اور کچھ نہ کرے　　　سارے گھر سے لڑتی پھرے
کام کرے تو ایسا کرے　　　چولہے کی ہانڈی کھڈی دھرے

جعفر کا ایک شاگرد سے بگاڑ ہو گیا۔ شاگرد نے مشاعرے میں غزل پڑھی۔ اس کا مطلع یہ تھا ؎

استاد کو میدان میں کل ہم نے پچھاڑا
چھاتی پہ چڑھے کود کے داڑھی کو اکھاڑا

ولی دکنی نے ناصر علی دہلوی کے متعلق لکھا ؎

اچھل کر جا پڑے جوں مصرعہ برق
اگر مصرعہ لکھوں ناصر علی کون

ناصر علی نے جواب دیا ؎

یہ اعجاز سخن گر اڑ چلے وہ
ولی ہرگز نہیں ہے گا علی کون

احسن دہلوی نے آبرو پر چوٹ کی، غالباً آبرو نے جواب نہیں دیا ؎

غزل اس طرح سے کہنی بھی احسن تجھ سوں بن آوے
جواب اب آبرو کب کہہ سکے مضمون بہتر ہوں

حاتم نے ناجی کے متعلق کہا ؎

سخن میں فخر اپنا بن کئے رہتا نہیں ناجی
اسے سمجھائے حاتم کس طرح اشعار کہہ کہہ کر

حاتم نے نعیم پر چوٹ کی ؎

جس دن سے کوئی یار کا حاتم مقیم ہے
بدتر اسے خزاں سے بہار نعیم ہے

نعیم کے جواب دیا ؎

طلب سنو جو سلیماں کی کچھ تو خاتم ہے
لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہے

میر اور سودا میں چلی ؎

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ   ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف (سودا)
طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں   یونہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے (میر)
نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے   وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا جانے (سودا)

سودا کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ میر نے اس کی ہجو میں کہا ؎

دلی میں لے کے کتیاں کئی اس نے پالیاں
ہمسایوں کی جنھوں نے کٹی کھائیں گالیاں

میر صاحب پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ ان کے نانا نانبائی تھے۔ اس لئے سودا نے کہا ؎

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر   کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر
پیری کے اب تو سارے مصالح میں مجتمع   بیٹا تو گندنا بنے اور آپ کوتھ میر

سودا اور ضاحک میں ایسی چلی کہ توبہ توبہ، ضاحک کا کلام نہیں ملتا۔ سودا نے جو لکھا ہے وہ کلیات سودا میں موجود ہے۔ سودا کی ہجویں فحش بھی ہیں۔ ہم مہذب نمونے لکھنا چاہتے ہیں۔

کیجیو میری ہجو تو اسے بھڑوے نٹ
تو سہی وردن بانس سے تجھ کو الٹ

فدوی اور سودا میں ہجو بازی ہوئی۔ سودا نے کہا

شاعر ہوا ہے فدوی کیا شاعروں کو ملّا   مادہ وہ زن تخلص یاروں کا مسخرا
کوئی بااسم اوس کے گھر کا پتہ نہ پاوے   اتو جو کہہ کے پوچھو بتلادے سب محلّا

فدوی نے جواب دیا ؎

کچھ کٹ گئی ہے پیٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا
دم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لنڈورا
بھڑوا ہے مسخرہ ہے
سودا اسے ہوا ہے

بقا کی میر و مرزا دونوں سے چلی تھی۔ بقا نے کہا ؎

مرزا و میر دونوں باہم تھے نیم ملّا   فن سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا اور ہجوؤں کی ریسماں میں   دونوں کو باندھ ہم نے اب کر دیا ہے پورا

قائم نے بھی میر کی ہجو کی تھی اور وہی سودا والا مضمون لیا تھا ؎

روٹی کے لئے کہلائے تم میر جی میر   کہیے تو بجا ہے آپ کو میر خمیر
پھر میر ہوئے یہ اس طرح کے لیلے   ساگوں میں ہے کوتھمیر راگوں میں ہمیر

نواب ظہور اللہ خاں نوا اور جرأت میں چلی۔ جرأت نے کہا

ظہورِ حشر نہ کیوں ہو کہ کل چنڈی گنجی
حضورِ بلبلِ بستاں کرے نوا سنجی

نوا نے کہا ؎

رات کو کہنے لگے جورو کے منہ پر ہاتھ پھیر
قدرتِ حق سے لگی ہے ہاتھ اندھے کے بٹیر

عظیم تلمیذ سودا نے ایک غزل کہی جو بحرِ رجز میں تھی۔ اتفاقاً دو ایک شعر بحرِ رمل میں ہو گئے۔ ان کا احساس نہ ہوا۔ اس پر انشا نے ایک مخمس کہا ؎

گر تو مشاعرے میں صبا آجکل چلے   کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے   پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے
موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق   تبدیلِ بحر سے ہوئے بحرِ خوشی میں غرق
روشن ہے مثلِ مہر یہ از غرب تا بہ شرق   شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

اس مشاعرے میں جنگ و جدل کی نوبت پہنچ جاتی مگر چند صلح جو اشخاص نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ انشاؔ نے ایک یہ چال چلی کہ شاہ عالم ثانی سے چغلی لگائی کہ فلاں فلاں شعرا آپ کی غزل کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بادشاہ ناراض ہو گئے اور غزل بھیجنا بند کر دی۔ اس پر محبؔ نے یہ قطعہ کہا ؎

مجلس میں جس کے چاہیے جھگڑا شعرا کا   ایسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا   اکبر تئیں یا شاہِ جہانگیر کے آگے

لکھنؤ میں شہزادہ سلیمان شکوہ ابن شاہِ عالم کے دربار میں مصحفیؔ نے غزل پڑھی، مقطع یہ تھا ؎

تھا مصحفیؔ بہ مائل گریہ کہ پسِ مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

جب مصحفیؔ چلے گئے تو شہزادے کے ایما سے انشاؔ نے اس غزل کے اشعار کو مسخ کرنا شروع کر دیا اور تمسخر آمیز الفاظ و مضامین شامل کر دیئے۔ مقطع کو اس طرح مسخ کیا ؎

تھا مصحفیؔ کانا جو چھپانے کو پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

پس اس پر جو دونوں میں چلی ہے تو بقول آزاد وہ خاکہ اڑا کہ کبھی تہذیب نے آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ ایسے اشعار یہاں رکھنے کے قابل بھی نہیں ہیں اور ان کی نوک جھونک کی داستان بھی اس قدر طویل ہے کہ اس کے بیان کے لئے ایک رسالہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال کچھ مہذب اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ مصحفیؔ نے ایک غزل میں انشاؔ کی طرف اشارہ کیا ؎

مدت سے ہوں میں سرخوشِ صہبائے شاعری   ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری
اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے   سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

مشاعرے میں ایک طرح ہوئی۔ اس پر مصحفیؔ و انشاؔ نے غزلیں لکھیں۔ مصحفیؔ کا مطلع تھا ؎

سر مشک ہے تیرا تو ہے کافور کی گردن
نے مہ نے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اس غزل پر انشاؔ نے کچھ اعتراضات کیے لیکن اہلِ نظر کا اتفاق ہے کہ انشاؔ کے اعتراضات لچر اور فضول تھے۔ انشاؔ نے اپنی غزل میں مصحفیؔ کے بڑھاپے کا مذاق اڑایا ؎

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے   سر خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن
حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشاؔ   تو توڑ دے جھٹ بلعم باعور کی گردن

انشاؔ کی غزل میں انگور، حور، منصور، نور، سقنقور، منظور، لنگور، عصفور، مغفور، مخمور، مجبور، چوڑ، کافور، دیجور، مغرور، فغفور، بلعم باعور یہ قافیے تھے۔ مصحفیؔ کی غزل میں کافور، حور، ماہی، عصفور، مخمور، معذور، زنبور، مجبور قافیے تھے۔ مصحفیؔ نے انشاؔ کی غزل پر کئی اعتراض کئے جن کا کوئی صحیح جواب نہیں ہو سکتا۔ مصحفیؔ نے اسی زمین میں سوال و جواب کیے۔ انشاؔ اس کو نہ سنبھال سکے اور دوسری زمین

اختیار کی ؎

پھی ہوئی ورزش سے تری ڈنڈ پہ مچھلی
ہے نامِ خدا جیسے سقنقور کی گردن (انشا)

اعتراضِ مصحفی ؎

میں لفظ سقنقور مجرد نہیں دیکھا   ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن

بے شک سقنقور مجرد باندھنا صحیح نہیں ہے

توڑوں گا خمِ بادہ انگور کی گردن
رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن (انشا)

اعتراضِ مصحفی

گردن کی صراحی کے لئے وضع ہے ناداں   بیجا ہے خمِ بادۂ انگور کی گردن

اے دیو سفید سحری کاش تو توڑے
اک مکے سے جور شبِ دیجور کی گردن (انشا)

اعتراضِ مصحفی ؎

جو گردنیں میں باندھی ہیں لا تجھ کو دکھا دوں   تو مجھ کو دکھا دے شبِ دیجور کی گردن

کیوں ساقیِ خورشید کیا نشے میں ہوں
سب یوں ہی چڑھا جاؤں مے نور کی گردن (انشا)

اعتراضِ مصحفی

ہے آدمِ خاکی کی بنا خاک کا پتلا   گر مور کا سر ہو دے تو ہو نور کی گردن

انشا کے آخری شعر کے متعلق اتنا ہی عرض کروں گا کہ گردن کا چڑھا جانا یعنی لجا جانا لغو اور غلط ہے۔ سید انشا نے مصحفی کی غزل پر جو اعتراض کیے ہیں ان کو ایک قطعہ میں نظم کیا ہے۔

مصحفی

دل کیونکہ پری حور کا پر اس پہ پھسلے   صانع نے بنائی تری بلور کی گردن

اعتراضِ انشا

بلور گو درست ہو لیکن ضرور کیا   خواہی نخواہی اس کو عربی میں کھپائیے

مصحفی

سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن
نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اعتراض انشاؔ

کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر   پگھلا ہوا شرارۂ غزل کو بنائیے
ایسے نجس کثیف قوافی سے نظم میں   دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمائیے

کافور کو نجس و کثیف کہنا کس قدر لغو ہے حالانکہ خود بھی اس شعر میں باندھا ہے ؎

محفل میں تری شمع بنی موم کی مریم
پگھلی پڑتی ہے اسکی وہ کافور کی گردن   (انشا)

جواب مصحفیؔ

یہ لفظ مشدد بھی درست آیا ہے تجھ سے   خم ہوتی ہے کوئی مرے بلّور کی گردن
ٹوٹے ہوئے پنجے کی طرح میرے قلم سے   جاتی ہے لچک شاعر مغرور کی گردن

انشاؔ

ماہی کا دخل کیا ہے سقنقور میں بھلا   سانڈھے کی طرح آپ نہ گردن ہلائیے
بخرے میں آپ ہی کے یہ آئی ہے شاعری   بس منہ ہی منہ میں اٹکی ایسے مت شرمائیے
استاد گرچہ ٹھہرے ہیں صاحب یونہی سہی   لیکن ڈھکی ہی اکٹھی اسے بس چھپائیے

انشاؔ نے دلی میں عظیمؔ کے مقابلے میں ایک جلوس مرتب و مسلح کر کے نکالا تھا جس میں ایک ہاتھی پر ایک شخص ہاتھ میں ایک گڑیا اور ایک گڈا لئے ہوئے بیٹھا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے پر مارتا اور یہ شعر پڑھتا تھا ؎

رنگ نیا لایا ہے چرخ کہن
لڑتے ہوئے آتے ہیں مصحفی و مصحفن

مصحفیؔ کے ساتھ بے گناہ مصحفن کی بھی اسی طرح گت بنائی جس طرح سوداؔ نے ضاحک کی بیوی کی بنائی تھی لکھا تھا ؎

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر بجایا
گاگا کے رات ساری ہمسایوں کو جگایا

انشاؔ کے جلوس کے جواب میں مصحفیؔ کے شاگردوں گرمؔ و منتظرؔ نے جلوس نکالنا چاہا لیکن چونکہ شہزادہ سلیمان شکوہ انشاؔ کے طرفدار تھے ان کے ایما سے کوتوال نے اس جلوس کو روک دیا۔ انشاؔ نے جب مشاعرہ میں مصحفیؔ پر یہ چوٹ کی ؎

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن

تو سر مشاعرہ مصحفیؔ کے شاگرد منتظرؔ نے جواب دیا ؎

لنگور کا وہ قافیہ ایسا تھا کہ جیسے
باندھے دم لنگور میں لنگور کی گردن

یہ چوٹ اس وضع پر تھی کہ سید انشا گلے میں ایک دوپٹہ ڈالے رہتے تھے جس کا ایک سرا آگے اور ایک سرا پیچھے رہتا تھا۔ سید انشا کا بارے کا ہتھیار یہ تھا کہ ایک تو وہ لوگوں کو اپنے شرفِ سیادت سے مرعوب کرتے تھے کہ سید کو بُرا کہنا عاقبت کو خراب کرنا ہے دوسرے وہ مسخرگی کی وجہ سے حکام کے منہ چڑھے رہتے تھے اس اثر سے لوگوں کو دہلتے۔ یہی چال انہوں نے دہلی میں چلی۔ اب لکھنؤ میں بھی یہی کیا کہ اول شہزادے سے کہا کہ مصحفی نے ہجو میں آپ کی طرف اشارہ کیا ہے اس پر مصحفی نے شہزادے کے حضور میں قطعہ پیش کیا اور کہا؎

یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشا کا
کہ رزم و بزم میں ہے پایہ تخت کا وہ شیر
سو سنتم مجھے ناداں نے ہجو شہ سے کیا
قباحت اس کی جو سمجھے شہ اسکو دے تعزیر

اور اسی داؤں سے گرم و منتظر کو دبانا چاہا اس پر منتظر نے کہا؎

مت خوفِ سلاطین سے تو مجھ کو ڈرابے
وہ تو ہے کہ جس کو کوئی ڈانٹے کوئی دابے
دہشت کی تو مرے تئیں تو باتیں نہ سنائے
کی ہجو اگر میں نے تو کیا قہر کیا ہے
نے دین مرا اس سے نہ دنیا گئی بھڑوے

میر سجاد سے بھی انشا کی چلی۔ سجاد نے جو کچھ کہا وہ مجھے دستیاب نہیں ہو سکا۔ سجاد معمار کے بیٹے تھے۔ انشا نے اس پر طنز کیا؎

وہ جو معمار کا اکڑ کے تنا   میں نے پتھر بھی ڈھوئے پر نہ بنا
تب تو بنا تھا یہ میرے دل میں ٹھنا   راج اٹھائے یہ جس بنا کی بنا
منہدم آخرش کرے ہے خدا

کوئی شاعر بیکس تھا اس نے سید انشا کے متعلق کہا؎

ظاہر میں تو ایسے ہیں کہ ماشاء اللہ
سب کہے ہیں ایک ہوں سگباں شاہ اللہ
باطن میں جو دیکھا انہیں اتنے میں یہ پوچ
لا حول و لا قوۃ الا باللہ

میر اور مصحفی میں بھی چلی تھی۔ کچھ زیادہ تحقیق نہیں ہو سکا۔ مصحفی نے کہا تھا؎

آئیں تو کریں مجھ سے فن شعر میں پنجہ
سودا نہیں بیٹھے تو ہیں سودا کی جگہ میر

نواب آصف الدولہ نے اپنی غزل میں یہ مقطع کہا ؎

بتوں کی گلی میں شب و روز آصفؔ
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

اس پر شمس النساء بیگم شرم تلمیذ مصحفی نے کہا ؎

کہا ہے جو تم نے یہ اپنی غزل میں   تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
وہی دیکھتا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ   نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

معروف دہلوی نے رنگین کی ہجو لکھی مجھے اس کے اشعار دستیاب نہیں ہوئے نہ اس معروفؔ کے حالات معلوم ہو سکے ں اتنا پتہ چل سکا کہ یہ نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ دہلوی نہیں ہیں اور کوئی شاعر ہے۔ رنگین نے کہا ؎

معروفؔ تو سن بات یہ اس حقیر کی   کیوں تو نے زبان ہجو میں اس کی تر کی
سو سن کے زری ایک کہے گا رنگین   زرگر کی جو سو تو ایک آہن گر کی
معروفؔ کی رنگینؔ نے سنی تقریر   تقریر کی موجب نہیں اس کی تحریر
لوگوں سے کہا اس نے کہ ہے جمع کیا   دیوان گدڑی ہے اسکا ہے وہ فقیر

لکھنؤ والوں میں بھی معرکے ہوئے مگر بہت کم۔ آزاد نے بھی اس معاملہ میں اہل لکھنؤ کو سراہا ہے۔ لکھنؤ کے مجھے صرف سات معرکوں کا پتہ چلا ہے" ان میں نہ سانگ اور جلوس ہوئے نہ گالی گلوچ ہوئی نہ لٹھ بندی ہوئی، بس مہذب چوٹیں ہوئیں۔ ناسخ اور آتش چلی" ناسخؔ نے ایک غزل میں یہ شعر فخریہ لکھا، اس میں اپنے نام امام بخش کی رعایت رکھی ؎

جو خاص ہیں وہ شریک گروہِ عام نہیں
شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

آتشؔ نے اسی وقت کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفہ میں بازی غلام نہیں

ناسخؔ ایک شخص کے پروردہ مشہور ہیں۔ مصرعہ ثانی میں اس طرف اشارہ ہے مگر اسی وقت ناسخؔ کے ایک شاگرد نے جواب دیا رغوب دیا ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندہ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

آتشؔ نے ناسخؔ کی غزلوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں تو ناسخؔ نے کہا ؎

ایک جاہل لکھ رہا ہے میرے دیواں کا جواب
بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

آتش نے جواب دیا ؎

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیواں کا جواب
جس نے دیوان اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

آتش نے ایک مشاعرے میں مشہور غزل پڑھی اس میں جا بجا ناسخ کے تجرد، تمول اور پردہ ہونے پر چوٹیں کی ہیں ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا   کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا ؟
ہوتا ہے سن کے زرد جو نامرد مدعی   رستم کی داستان ہے ہمارا فسانہ کیا
زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف   قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

ناسخ نے چند فارسی اشعار کا ترجمہ کیا تو آتش نے کہا ؎

مضمون کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں
مٹی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی

ناسخ سیاہ فام تھے آتش نے کہا ؎

روسیہ دشمن کا منہ پاپوش سے کیجے فگار
جیسے سیٹ کی پر زخم ہو شمشیر کا

ناسخ نے جواب دیا ؎

میں حُسنِ ظاہری سے گرچہ مثلِ ماہ نہیں
ہزار شکر کہ باطن میرا سیاہ نہیں

اسی سلسلہ میں ناسخ کے شاگرد گویاؔ نے آتش پر چوٹ کی ہے ؎

یقین گل ہو جو دیکھے گیسوئے دل پر چراغ
آگے کالے کے بھلا روشن رہے کیونکر چراغ

آتش نے جواب دیا ؎

فروغِ حسن پہ کب زورِ زلف چلتا ہے
یہ وہ چراغ ہے کالے کے آگے جلتا ہے

آتش کے شاگرد پنڈت نسیم کشمیری کے ایک شاگرد نے کہا ؎

واللہ کہ آتشِ فروغِ ناسخ
ٹھنڈی کر دی نسیم کشمیری نے

لکھنو میں ایک شاعر میر محبوب علی تھے، سلیسؔ تخلص کرتے تھے اور اپنے آپ کو میر انیسؔ کا مدمقابل کہتے تھے انیسؔ نے ان کے متعلق کہا ؎

نواسنجیوں نے تری اے انیسؔ   ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

سلیسؔ نے اس شعر کی تضمین کی اور انیسؔ کے خاندان پر الٹ دیا ؎

نہ مونسؔ کی باتیں تھیں ایسی نفیسؔ   نہ تھی انسؔ کی نظم ایسی سلیسؔ
یہ سچ ہے بقولِ انیسؔ اے سلیسؔ   نواسنجیوں نے تری اے انیسؔ
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

مونسؔ اور انسؔ، انیسؔ کے بھائی تھے۔ نفیسؔ ان کے بیٹے تھے۔ انیسؔ نے ایک سلام کہا اس میں یہ اشعار تھے

سدا ہے فکرِ ترقی مآل بینوں کو   ہم آسمان سے لائے ان زمینوں کو
یہ مہرباں ہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے   چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

یہ قافیہ ایسا مقبول ہوا کہ واجد علی شاہ نے بھی اس کو باندھا ؎

جہادِ نفس عبادت میں ہے مجھے منظور
وضو کے وقت الٹتا ہوں آستینوں کو

اسی زمانے میں مرزا دبیرؔ کے فرزند اوجؔ نے سلام لکھا اور آستینوں کے قافیہ پر بہت زور دیا ؎

الٹ گیا درِ خیبر سے پہلے قلعہ چرخ   خدا کے ہاتھ نے الٹا جو آستینوں کو
یہ دستبردِ خزاں کا بہار میں ڈر ہے   کہ غنچے تھامے ہیں ہاتھوں میں آستینوں کو

اس پر انیسؔ کی طرف سے جواب ہوا ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کا پھر انبار   خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل   اٹھا چکے ہیں زمیندار جو زمینوں کو
مزا یہ طرفہ ہے مضمون تو دستیاب نہیں   مقابلہ پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

اس پر دبیرؔ کے شاگرد مشیرؔ نے کہا ؎

جلی کٹی مرے استاد سے کرے جو کوئی   تو پھونک دوں گا مہ خرمن میں خوشہ چینوں کو
ہزار بار سراپا کے منہ پر چڑھتے ہیں   مشیرؔ کیا کہوں ان احمق الذہنوں کو
اساتذہ کی ہیں غزلیں سلام بھی اکثر   نیا سمجھتے ہیں یہ لوگ ان زمینوں کو

اور نظرؔ برادرِ دبیرؔ نے کہا ؎

طعنہ زن ہوتے ہیں جو کہ دبیرؔ پہ نظرؔ
کیا نہیں جانتے وہ اہلِ زبان اور بھی ہیں

رشکؔ شاگردِ ناسخؔ نے یہ غزل کہی ؎

یار کو ہم سے کوئی لگاؤ نہیں
وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں

اس پر کسی شاعر نے کہا ؎

دور سے چھیڑے دکھاؤتس   رشک بیٹھا ہے بن بلاؤنس

شاہ نصیر نے مولوی قدرت اللہ قاسم تلمیذ درد پر چوٹ کی ؎

پھر پڑھا ہم نے جو مضمون بیاض گردان
سن اسے ہو گیا چپ قاسم انوار شتاب

قاسم نے کہا ؎

واسطے انسان کے انسانیت اول ہے شرط   میر ہو یا میرزا ہو خان ہو یا نواب ہو
آدمی تو کیا خدا کو بھی نہ ہم سجدہ کریں   گر نہ خم تعظیم کو پہلے سر محراب ہو

صمصام الدولہ حافظ عبدالرحمٰن خان احسان کو بادشاہ کے حضور میں بڑا دخل تھا۔ شاہ نصیر کسی معاملہ میں ان سے کھٹک گئے اور یہ شعر کہا ؎

اے خال رخ یار تجھے ٹھیک بناتا
جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

نصیر اور ان کے شاگرد ذوق میں بگاڑ ہو گیا۔ تین مشاعروں تک ایک دوسرے کی ضد پر ایسی طرحیں ہوئیں جن کا قافیہ خس لس اور ردیف تیلیاں تھیں۔ شاہ نصیر ہر مرتبہ ساٹھ ستر شعر کا دو غزلہ پڑھتے تھے اور ان کا ہر شاگرد انیس بیس شعر کی غزل پڑھتا تھا دوسرے مشاعرے میں ذوق نے جو غزل پڑھی ان میں یہ شعر تھا۔

چق ترے دالان کی نازک بہت ہے نازنیں
کیا لگائی اس میں ہیں پلٹے مگس کی تیلیاں

تیسرے مشاعرے میں گمنام داس عاصی شاگرد نصیر نے کہا ؎

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے   قافیے میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہر خدا   یار کی چلمن میں ہوں پلٹے مگس کی تیلیاں
شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں بے دریغ   باندھے گر ہو سکے تار نفس کی تیلیاں

اس کے بعد نصیر کے بیٹے شاہ وحید الدین نے کہا ؎

گرچہ قندیل سخن کو پا لیا تو کیا ہوا
ڈھا پنج میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس مشاعرے میں باہم کچھ گفتگو بھی ہوئی اس پر مشاعرہ بند کر دیا گیا کہ مبادا سوال و جواب ہو کر کچھ بے لطفی ہو جائے۔

غالب نے دو ایک مشاعروں میں غزل نہ پڑھی تو ذوق نے کہا ؎

رکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں   کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

غالب نے جواب دیا ۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی رواں اور

غالب کا دیوان طبع ہو کر آیا تو عبداللہ خاں اوج نے کہا ۔

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آساں نہیں صاحب دیوان ہونا

مرزا غالب کے دو شعروں پر ایک شاعر نے اس طرح تضمین کی کہ ہر بند میں ان پر چوٹ کی ہے ۔

دی ہے اسے توفیق سے توفیق خدا نے   جاتا ہے ہر اک کوچے میں یہ شعر سنانے
گھر پر بھی بلا لیتا ہے دعوت کے بہانے   ایسا بھی کوئی ہے کہ جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

یہ شخص وہ ہے کوئی اس کو پیتا بھی جانا   تو میر نہ ہستی کے ہرگز فریب میں آتا
تھا کل تلک تو رقیبوں کی جھڑکیاں کھاتا   ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

جعفر دہلوی نے مرزا غالب کے متعلق کہا ۔

سب اسے جانتے ہیں وہ ہے اکالی مذہب

کوئی لالچ اسے دے گا تو نہ ڈھل جائیگا

مرزا غالب نے منشی سعادت علی خاں مصنف کی ہجو لکھی ۔

اے منشی خیرہ سر سخن ساز نہ ہو   عصفور ہے تو مقابل باز نہ ہو
آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ   لاٹھی وہ لگے جس میں کہ آواز نہ ہو

غالب سے بادشاہ ناراض ہو گیا۔ غالب نے معذرت میں ایک قطعہ لکھا، اس میں کئی شعروں میں در پردہ ذوق پر چوٹ کی ۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

یعنی میں ایسے خاندان سے نہیں ہوں جس کا ذریعہ اعزاز صرف شاعری ہو) یہ ذوق کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک غریب آدمی شیخ محمد رمضان کے فرزند تھے۔ آزاد نے شیخ رمضان کے ہاتھ میں تلوار دیکھی، مرزا فرحت اللہ بیگ کو استرا نظر آیا۔ خیر مجھے اس سے غرض نہیں، وہ شمشیر نواز جنگ کے پسر ہوں یا مقراض الدولہ کے فرزند ہوں، میں تو یہ جانتا ہوں کہ ہزاروں کی اصلاح بنا گئے۔

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

اس میں ذوقؔ کے سیاہ فام ہونے پر چوٹ ہے۔ مومنؔ شاعر بھی تھے، حکیم بھی تھے، منجم بھی تھے لیکن انہوں نے کبھی ان فنون کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ ایک مرتبہ راجہ اجیت سنگھ نے ان کو ایک ہتھنی ہدیہ دی، اس پر ذوقؔ نے کہا ؎

جہنموں میں وہ مومن مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

حکیم آغا جان عیشؔ مشہور شاعر تھے، ظفرؔ بادشاہ کے درباری تھے انہوں نے ایک سادہ لوح ملا کو جو تکبندی کر سکتا تھا ہدہدؔ تخلص کر کے بادشاہ کے حضور پیش کر دیا۔ بادشاہ نے کچھ آذوقہ مقرر کر دیا اور منقار جنگ خطاب دیا۔ ہدہدؔ تک بندی کر لاتا حکیم جی اصلاح کر دیتے۔ دوسرے درباریوں نے ہدہدؔ کے مقابلے پر باز لاکر چھوڑ دیا۔ ہدہدؔ اور باز میں خوب چونچیں ہوئیں۔ افسوس مجھے باز کا کوئی شعر نہیں ملا۔ ہدہدؔ کی گل افشانیاں کچھ دستیاب ہوئی ہیں ؎

گر اب کے بازؔ میدان میں آئے سامنے میرے
تو دم میں پر نہ چھوڑوں گا یہی میرا ارادہ ہے
ارے روئے ادب اب تک نہیں تجھ کو خبر اس کی
کہ ہدہدؔ سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

کچھ دنوں کے بعد باز تو اڑ گیا یار لوگوں نے ایک کوا لا کر پالی میں چھوڑ دیا۔ ہدہدؔ نے اس کے بھی خوب چونچیں ماریں۔ کوا کچھ کائیں کائیں غائیں غائیں کر کے اڑ گیا۔ ایسا غائب ہوا کہ کچھ نشان تک نہ چھوڑا۔ ہدہدؔ نے کہا ؎

جون آیا ہے بدل اب کے عدو کوّے کی
اس کی ہے باتوں سے ظاہر وہی خو کوّے کی
پہلے جانا تھا یہی سب نے کہ کوّا ہوگا
پر جو معلوم کیا یہ ہے بہو کوّے کی

مرزا داغؔ دہلوی سانولے رنگ کے آدمی تھے، رام پور میں داروغہ اصطبل مقرر ہوئے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

شہر دہلی سے آیا ہے اک مسکین
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

حالیؔ پہ ایک دہلوی نے اعتراض کیا تم اہلِ زبان نہیں ہو، پانی پتی ہو۔ حالیؔ نے کہا ؎

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
اور آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

حالیؔ کی ہجو میں ایک شاعر نے کہا ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے   میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

اور ؎

دلّی دلّی کیسی دلّی   پانی پت کی بھیگی بلّی

حالؔی نے سب کا جواب خاموشی سے دیا۔ خود فرمایا ہے ؎

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کیا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

حسرؔت موہانی نے مظہر الحق کی ہجو لکھی ؎

گو بظاہر شیر ہوں باطن میں لومڑے دل کے ہیں
مظہر الحق نام ہے ہیرو مگر باطل کے ہیں

مجھے اور بھی چند ہجویں یاد ہیں مگر ان کے مصنف اور حالات کے متعلق مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ایک ہجو سُنی ہے کہتے ہیں کہ کسی نے یہ ہجو مرزا سوداؔ کی لکھی تھی مگر کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزری اور اس میں جو دو نام آئے ہیں ان کا بھی کچھ مرزا سوداؔ سے تعلق نہیں، معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کوئی گمنام شاعر ہو اور اس نے سوداؔ تخلص کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سودا نہ ہو کوئی دوسرا لفظ ہو ؎

جب چھوڑ شاعری کو سودا بنا گویا
فیروز خاں کا سالا اور رمان خاں کا بھیّا
کیا خوب ہی الاپا کہتا تھا وہ ایسا
سر کو ہلا ہلا کر کہتی تھی اس کی میّا
تھا تھرے تھرے تھا تھیا تھیا تھیا

ایک وکیل تھے ان کی دو خورد سال لڑکیاں تھیں وہ ان کو بھی مشاعرے میں لاتے تھے۔ کسی شاعر سے چل گئی تھی اس نے ان کی ہجو میں کہا ؎

تھکے وکیل کی وجہ معاش کیا ہوگی
نہ فکر کیجیے گھبرائیے نہ منشی جی
یہ دونوں ٹیکہ بڑھاپے کی بچیاں ہونگی
ابھی کھایا ہے خرچہ ملے گی پھر خرچی

ایک شاعر نے کسی کی ہجو کہی تھی اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

امتحاں ہم نے کیا اس نے لکھا ہے سو بار
سین سے صبر شمر صاد سے ثے سے اسرار

بدایوں میں ایک شاعر نے کسی کی ہجو لکھی تھی ؎

اوڑھنی اوڑھو لنڈ چپکے سے گھر میں بیٹھو   ٹن ٹنی سی کوئی بازار سے ڈھولک لے لو

بدایوں میں ایک شخص تھے۔ سید نام ضیاؔ تخلص تھا۔ کسی نے کہا ؎

اندھیرا ہوا نام اندھیری کا ضیا ہے
ناداں ہے کم سن ہے بدایوں کا للّا ہے

للّا، یہ بدایونی لغت ہے۔ بدایوں میں اکثر اپنے چھوٹوں کو اس لقب سے یاد کرتے ہیں۔ گویا ایک پیار کا چھوٹا نام ہے لوگ اس کے اور معنی اور رعایت بھی بیان کرتے ہیں۔

اور بھی ہجویں اور واقعات ہیں سب کے لئے اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ اس میں بھی بعض واقعات تصحیح و تفصیل طلب ہیں۔ ہجویں تو اکثر شاعروں نے لکھی ہیں لیکن مرزا سوداؔ سب کے امام ہیں۔ ان کے بعد بالترتیب قائم چاند پوری، مصحفیؔ، انشاؔ اور میرؔ ہیں۔

پیروڈی اُردو ادب میں

ظفر احمد صدیقی

آپ کے حلقۂ تعارف میں ایسے بہت سے اصحاب ہوں گے جو عام نظروں کو بالکل معقول اور ہموار معلوم ہوتے ہوں لیکن کوئی نظرباز ان کے لہجہ کی خفیف سی اجنبیت یا ان کے انداز کا معمولی سا بے تکا پن پا لیتا ہے اور اس کی مبالغہ آمیز نقل آپ کے سامنے پیش کرتا ہے تو آپ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال پیروڈی کا ہے۔

پیروڈی وہ صنفِ ظرافت ہے جس میں کسی کے طرزِ نگارش کی تقلید کر کے اس کے اسٹائل یا خیالات کا مذاق اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اردو میں یہ صنفِ ظرافت نسبتاً کمیاب ہے۔ تنقید میں بھی اس کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا کوئی ایک لفظ ہمیں ایسا نہیں ملتا جو اس کے مفہوم کو پورا پورا ادا کر سکے۔ مضحک نقالی، ہجویہ تقلید یا خاکہ اڑانا جیسے الفاظ سے اس کی طرف کچھ اشارہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ الفاظ اوّل تو پیروڈی کے تمام تر مفہوم پر حاوی نہیں دوسرے ان کے مطالب اور رجحانات ذہنوں میں متعین نہیں، اس لیے زیرِ نظر مضمون میں، ہم انگریزی لفظ پیروڈی کے استعمال ہی کو ترجیح دیں گے۔

پیروڈی کسی ادبی تحریر یا اسٹائل کی تقلید ہوتی ہے لیکن ہر تقلید کو پیروڈی نہ کہیں گے۔ اگر کسی طرزِ نگارش کو قابلِ تعریف سمجھ کر اس کی پیروی کی جائے تو وہ پیروڈی نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی ادبی نمونہ کو اچھا سمجھ کر اس کی تقلید کی کوشش کی جائے مگر نقل میں اصل کے محاسن پیدا نہ ہو سکیں اور نتیجہ مضحک ہو جائے تب بھی اس پر پیروڈی کا اطلاق نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر ابنِ حزیںؔ سیالکوٹی کی اقبال کے تتبع میں بعض نظمیں یا بعض اُردو شعراء کی غالبؔ اور داغؔ وغیرہ کے رنگ کو اپنانے کی کوششیں اس دعوے کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

پیروڈی کا اطلاق صحیح طور پر اس ادبی تقلید پر ہوگا جس میں مصنف کسی طرزِ نگارش یا طرزِ فکر کی کمزوریوں کو یا ان پہلوؤں کو جن کو وہ کمزوریاں سمجھتا ہے نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے پیروڈی تنقید کی ایک لطیف قسم ہے مگر بعض اعتبارات سے عام تنقید سے زیادہ موثر اور کارگر بعض ادبی کمزوریاں اتنی باریک ہوتی ہیں کہ عام نظریں ان پر نہیں پڑتیں یا بار بار کے مشاہدے سے ان کی عادی ہو جاتی ہیں۔ پیروڈی کے آئینہ میں یہی کمزوریاں اتنی بڑی ہو کر نظر آتی ہیں کہ ان سے کسی کا نگاہ چرانا ممکن نہیں ہوتا۔ پیروڈی کرنے والا ان کو اس پس منظر سے نکال کر جہاں نظریں ان کی عادی ہو چکی ہیں ایسے سلسلے میں پیش کرتا ہے جہاں ان کا بے تکا پن محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ ظرافت کی چاشنی تنقید کے پھیکے یا کڑوے گھونٹوں کو گوارا بنا دیتی ہے۔

اب یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیروڈی میں ظرافت کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ کیوں ہم اس پر ہنسنے پر مجبور ہوتے ہیں نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں ہنسی کے متعلق بعض فلسفیانہ یا نفسیاتی نظریوں کا مختصراً ذکر کر دیں۔

ہربرٹ اسپنسر کا خیال ہے کہ ہنسی زائد قوت کے چھلک جانے کا نام ہے۔ (OUTR OW OF SURPLUS ENERGY)

یہی وجہ ہے کہ تندرست و توانا آدمی اکثر بات بے بات ہنسنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

بعض فلسفیوں کے نزدیک ہنسی سماجی اصلاح کا ایک ذریعہ ہے۔ جن لوگوں کو ہم وضع قطع یا چال ڈھال وغیرہ میں روشِ عام

سے ہٹا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان پر ہنس کر ان کو سماجی معیار کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میکڈوگل کا نظریہ ہے کہ ہنسی چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کے خلاف ایک فطری مدافعت ہے۔ انسان اپنی سوشل فطرت اور جبلی ہمدردی کی وجہ سے مجبور ہے کہ دوسروں کی مصیبت اور غم سے متاثر ہو۔ اب اگر وہ ہر شخص کی معمولی پریشانی اور سراسیمگی (جیسے کیچڑ میں پھسل جانے یا کرسی سے گر پڑنے) کا اثر لینے لگے تو زندگی دشوار ہو جائے۔ اس لیے نیچر ہنسی میں اس اثر کو اڑا دیتی ہے۔

اسی سے ملتا جلتا خیال لارڈ بائرن نے اپنی ایک نظم میں پیش کیا ہے۔

“AND iF I LAUGH AT ANY MORAL THING, iTS THAT I MAY NOT WEEP.”

(یعنی میں اگر کسی فانی چیز پر ہنستا ہوں تو یہ اس لیے ہے کہ کہیں میں رو نہ دوں)

نٹشے کہتا ہے کہ ”صرف انسان ہی کیوں ہنستا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہی اتنے شدید مصائب جھیلتا ہے کہ اس کو ہنسی کو ایجاد کرنا پڑا۔“

برگساں ہنسی کو زندگی کی تخلیقی قوت کا میکانکی مظاہر کے خلاف ردِ عمل قرار دیتا ہے۔ کسی شخص کے تکیہ کلام پر یا موقع بے موقع ایک ہی جملہ دہرانے پر ہمیں اس لیے ہنسی آتی ہے کہ ہم اس سے اس میکانکی طرزِ عمل کے بجائے تخلیقی عمل کی توقع رکھتے ہیں۔

تھامس ہابز کے نزدیک ہنسی کا راز دوسروں کی کمتری کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کے تصور پر ایک فوری احساسِ عظمت میں پوشیدہ ہے۔

اسٹیفن لی کاک اپنی تصنیف ”ظرافت اور انسانیت“ میں اسی نظریہ کی تائید کرتا ہے اور ہنسی کی اصل وحشی انسان کی اپنے دشمن کو گرا ہوا دیکھ کر فتح و مسرت کی چیخ ہا۔ ہا کو قرار دیتا ہے۔

ہنسی کا ایک عام فہم نظریہ یہ بھی ہے کہ ہمیں عدم ہم آہنگی (MALADYUS TWENT) یا تضاد (INCOUGRUITY) پر ہنسی آتی ہے۔ رندوں کے مجمع میں کوئی مقطع بزرگ آن پھنسیں یا کسی بہت لمبے آدمی کے ساتھ کوئی پست قد جا رہا ہو تو ہمیں ہنسی آ جائے گی۔

ان تمام نظریوں میں کچھ نہ کچھ صداقت نظر آتی ہے لیکن کسی ایک کو ہنسی کے ہر مظاہرے کی تشریح کے لیے سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے حسن و قبح سے بحث کی جائے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان سے پیروڈی کی حقیقت پر کیا روشنی پڑتی ہے۔ زائد قوت کے چھلک جانے کا نظریہ بعض صورتوں میں خواہ صداقت رکھتا ہو لیکن اس سے اس بات کی تشریح نہیں ہوتی کہ ہمیں پیروڈی ہی پر کیوں ہنسی آتی ہے۔

میکڈوگل کا نظریہ بھی کہ ہنسی چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کے خلاف فطرت کی مدافعت ہے۔ پیروڈی کی تشریح میں کچھ زیادہ مددگار نہیں ثابت ہوتا۔ کھینچ تان ہی سے اس کی تاویل کرنی پڑتی ہے۔

باقی نظریے کافی حد تک پیروڈی پر چسپاں ہو جاتے ہیں اور مختلف زاویوں سے اس کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

پیروڈی اصلاح کا ایک کامیاب حربہ ہے اس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ مسلمہ ادبی قدروں سے انحراف کرنے والے بے راہ رو ادیبوں کو راہ پر لانے کے لیے اکثر پیروڈی کو استعمال کیا جاتا ہے یا کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ہمیشہ ایک اعلے اصلاحی مقصد ہی پیروڈی کا محرک ہوتا ہے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ کبھی کبھی دوسروں کی تذلیل اور کمتری ہمارے جذبہ خود پسندی کو تسکین دیتی ہے اور پیروڈی میں ہمارے

لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہنسی کی اکثر صورتوں میں یہ جذبہ شعوری یا غیر شعوری طور پہ کام کرتا ہو لیکن ہر پیروڈی کا محرک اس کو قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کسی شاعر کے سامنے اس کے اشعار ہی کی پیروڈی پیش کیجیے۔ اگر وہ اپنے اوپر ہنس سکنے کی عالی ظرفی رکھتا ہے تو وہ ضرور اس سے لطف اندوز ہوگا۔ حالانکہ اس میں دوسرے کی تذلیل یا خود پسندی کی تسکین کا کوئی سوال نہ ہوگا۔

عدم ہم آہنگی یا تضاد کا نظریہ اگرچہ کسی گہری حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا لیکن ایک عام اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ یہ کہ ہنسی کی کوئی صورت بھی ہو اس کے موضوع میں عدم ہم آہنگی اور تضاد کا ہونا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مضحک (LUDLICAROUS) کا اطلاق ہی اس چیز پہ ہوگا جس میں کچھ بے تکا پن یا بہ الفاظِ دیگر غیر ہم آہنگی پائی جائے۔ پیروڈی بھی جو ایک مضحک ادبی تقلید ہے ان ہی خصوصیات سے متصف ہوتی ہے۔ پیروڈی کرنے والے کا آرٹ ہی یہ ہے کہ وہ اس تضاد اور عدم ہم آہنگی کو جو اصل مصنف کے یہاں بہت باریک اور مبہم سی ہوتی ہے نقل کے ذریعہ سے نمایاں کر دیتا ہے۔ کبھی یہ اثر بہت پُرشکوہ الفاظ اور غیر اہم معانی کے امتزاج سے پایا جاتا ہے جیسے (MOCK HEROIC POETRY) مضحک رزمیہ شاعری میں کبھی کسی نظریہ یا فلسفہ کا تضاد اس کو زیادہ مہمل اور بے ربط بنا کر دکھایا جاتا ہے جیسے چیسٹرٹن یا برنرڈ شا کے بعض ناولوں میں۔

برگساں کا ہنسی کے متعلق نظریہ اس کے "تخلیقی ارتقاء" کے فلسفہ سے ماخوذ ہے۔ اس فلسفہ کی باریکیوں میں پڑے بغیر اس کے ہنسی کے نظریہ کی تائید میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پیروڈی پر سب سے زیادہ یہی چسپاں ہوتا ہے۔ زندگی کی قوت اپنا تخلیقی کارنامے انسان تک پہنچنے کے بعد اپنے اظہار کی نت نئی شکلیں ڈھونڈتی ہے۔ ؎

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

نقل میں اس تخلیقی رجحان کے خلاف ایک میکانکی مظاہرہ ملتا ہے اس لیے ہنسی اس میکانکی مظاہرے کے خلاف زندگی کا ردِ عمل ہے۔ اس لحاظ سے ہر نقل فی نفسہٖ ہمارے لیے ہنسی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ایک بہروپیا جب ہو بہو کسی کی شکل بنا کر ہمارے سامنے آتا ہے تو چاہے اس شکل میں کچھ بے تکا پن نہ ہو ہم ہنسی پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص جو مختلف لہجوں کا مکمل چربہ اُتار لیتا ہے ہمیں ہنسا دیتا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے (AS YOU LIKE IT) میں ہیروئن اور اس کے بھائی کا ہم شکل ہونا سامانِ ظرافت فراہم کرتا ہے اسی طرح کوئی شخص اپنی تحریر میں اپنی انفرادیت اور قوتِ تخلیق کا اظہار کرنے کی بجائے کسی دوسرے کے اسٹائل کی نقل پیش کرتا ہے تو اس پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ نقل میں اصل سے جتنی مشابہت ہوگی اتنی ہی وہ ہمارے لیے مضحک ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ معمولی مشابہتیں تو حقیقی زندگی میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن کسی نقل میں تقریباً سو فیصدی مشابہت عموماً اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ زندگی کا تخلیقی عمل نہیں ہو سکتا بلکہ ایک میکانکی مظاہرہ ہے۔ اس اصول میں ایک استثنا بھی پایا جاتا ہے۔ اکثر اوقات نقل کا مبالغہ آمیز ہونا بھی اس کو ہماری نظر میں مضحک بنا دیتا ہے حالانکہ اس مبالغہ سے اصل سے اس کی مشابہت کم ہو جاتی ہے لیکن غور کیجیے تو یہ استثناء ہمارے نظریے کی تردید نہیں کرتا۔ مبالغہ آمیز نقل اس لیے قابلِ مضحک ہوتی ہے کہ وہ اس بات کو واضح کر دیتی ہے کہ یہ "جامہ" نقل کرنے والے پہ راس نہیں آ رہا ہے اور یہ اسٹائل اس کی شخصیت کا فطری تخلیقی اظہار نہیں۔

پیروڈی کی مختلف شکلوں پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پیروڈی کے محرکات عموماً تین قسم کے مقاصد ہو سکتے ہیں۔

۱۔ اصلاحی اور تعمیری
۲۔ تفریحی
۳۔ تخریبی

ان ہی عنوانات کے ماتحت پیروڈی کی تمام اقسام آجاتی ہیں لیکن یہ سمجھنا غلط فہمی پر مبنی ہوگا کہ ان اقسام کے درمیان کوئی قطعی حدِ فاصل بھی ہے۔ اکثر ایک ہی پیروڈی تفریحی اور اصلاحی یا تفریحی اور تخریبی مقاصد کی جامع ہوتی ہے۔ کبھی اصلاحی مقصد کے ساتھ صحیح بصیرت اور توازن نہ ہونے کی وجہ سے تخریبی پہلو آجاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آئندہ صفحات پیش کریں گے۔

پیروڈی کے لیے ایک زرخیز میدان وہ روایات اور قدریں فراہم کرتی ہیں جو ماحول کے بدل جانے سے اپنی افادیت کھو چکی ہیں یہ روائتیں سماجی ہوں یا ادبی پیروڈی ان کا مذاق اڑا کر ان کے ختم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مثال کے طور پر مغربی ادب کو دورِ نتے دی ساوورا کی تصنیف ڈان کوگزوٹ لامینشا (DON QUINOTE DELA MANCHA) کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کو سرشار نے "خدائی فوجدار" کی شکل میں اردو کا جامہ پہنایا تھا۔ اس ناول میں کسی ایک ادیب کا نہیں بلکہ ہیروازم اور بہادری (CHIVALRY) کی ان روایات کا خاکہ اڑایا گیا ہے جن سے سولھویں سترھویں صدی کے ناول بھرے ہوئے تھے۔ اردو میں اس قسم کی مستقل تصانیف تو نہیں ملتیں لیکن شفیق الرحمٰن کے مضامین میں کہیں کہیں یہ رنگ جھلک جاتا ہے مثلاً چہار درویش جس میں میر امّن دہلوی کی باغ و بہار کا کچھ ماحول لے کر عہدِ جدید کے چار نوجوان طالب علموں کو چار دوستوں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ شفیق الرحمٰن کا مقصد اس پیروڈی میں زیادہ تر تفریحی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی پیروڈی کی ایک قسم ہمیں ملّا رموزی کی نثر میں ملتی ہے۔ مولویانہ اُردو جس کے نمونے ہمیں عربی کتابوں کے ابتدائی ترجموں میں ملتے ہیں اپنے زمانے میں کتنی ہی افادیت کیوں نہ رکھتی ہو لیکن زبان کے ارتقاء اور صفائی میں ایک ایسا دور آنا ضروری تھا جب اس کی اجنبیت مذاقِ سلیم پر بار گزرنے لگے۔ معلوم نہیں ملّا رموزی نے اس طرزِ بیان کی اصلاح کے لیے اس کو تحریروں میں اپنایا یا اس کی ظرافت آمیز اجنبیت کی وجہ سے اس کو محض ایک ذریعۂ تفریح کے طور پر استعمال کیا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے ملّا رموزی کی نثر مولویانہ اردو کی پیروڈی پیش کرتی ہے۔ البتہ اس میں ذہانت کا فقدان اور سستی ظرافت کی بہتات نظر آتی ہے۔ اگر ایک آدھ مضمون ہی اس رنگ میں لکھ کر چھوڑ دیا ہوتا تب بھی غنیمت تھا لیکن ملّا صاحب نے ستم یہ کیا کہ اس کو اپنے مستقل رنگ کی حیثیت سے اختیار کر لیا جیسے کوئی شخص کسی کا منہ چڑانے کے لیے ہمیشہ کے لیے اپنے خدوخال کو مسخ کر لے۔

بعض اوقات تجدد کے ضرورت سے زیادہ تیز دھارے کو روکنے یا نئی تحریکوں کی بے راہ روی کو اعتدال پر لانے کے لیے پیروڈی ایک مؤثر ذریعہ کا کام دیتی ہیں۔ اودھ پنچ کے دور میں پنجابی اردو کی ناہمواری اور ادبِ لطیف کی بے اعتدالیوں کے خلاف اچھے اچھے مضامین نکلے جو پیروڈی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

ابھی قریبی زمانہ میں فرقت کاکوروی کی تصنیف مداوا ایک نہایت کامیاب کوشش ہے۔ اس تصنیف میں مصنّف نے مشہور ترقی پسند شاعروں کے کلام کے نمونے دے کر ان ہی کے رنگ میں اپنا کلام پیش کیا ہے۔ صاحبِ مداوا کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے

ہر شاعر کی انفرادیت اور خصوصی طرز کو اپنی گرفت میں لے کر اس کے رنگ کو اتنا تیز کر کے پیش کیا ہے کہ مہملیت کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ (REPUCTIVE AD ABSURDUM.) لیکن مداوا کی کمزوری یہ بھی ہے کہ اس کا موضوع کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اس پر پیروڈی کے وار اوچھے ہی پڑتے ہیں۔ ترقی پسند شاعری خود مسلمہ قدروں سے بغاوت کرنے میں کبھی پیروڈی کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب اگر اس کی پیروڈی کی جائے تو اس پر سنجیدگی سے نئی شاعری کا دھوکہ ہونا کوئی تعجب انگیز بات نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادیب جنہوں نے ترقی پسند شاعری کی پیروڈی سے ابتدا کی آخر میں اپنی ترقی پسند شاعری کی صلاحیتوں پر ایمان لا کر سنجیدگی سے اسی رنگ میں کہنے لگے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض بڑے ادیب اور شاعر اپنے زمانہ سے بہت آگے ہوتے ہیں۔ وہ مروّجہ قدروں کے خلاف نئی اور بہتر قدریں ادب میں پیش کرتے ہیں مگر اپنے زمانہ سے آگے نہ دیکھ سکنے والے مصنّف ان ادیبوں اور شاعروں کی روح تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے ان کو اپنی پیروڈی کا نشانہ بناتے ہیں۔ غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ جیسے عظیم المرتبت شاعر اپنے اپنے زمانوں میں اسی مذاقِ عام کی کج رَوی کا شکار رہے ہیں۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تمام ادیب یا مصنّف جن کی تصانیف آج پیروڈی کو دعوت دیتی ہیں کل غالبؔ اور اقبالؔ کی جیسی شہرت اور ہر دلعزیزی کے متوقع ہو جائیں۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ بعض اوقات پیروڈی کے تیر بے محل بھی صرف کیے جا سکتے ہیں

بعض اوقات کسی نمایاں اخلاقی یا اصلاحی مقصد کا حامل ہونے کی بجائے پیروڈی ایک اور اہم غرض کو پورا کرتی ہے یعنی زندگی کو توازن بخشنا۔ جب ہم جذباتیت کی رَو میں بہتے ہوتے ہیں اپنے رجحانات اور میلانات کے یک طرفہ پن میں کھو جاتے ہیں، اپنے خیالات اور جذبات کی شدّت پسندی میں اپنے نقطۂ نظر کے علاوہ کسی اور نقطۂ نگاہ کا تصوّر بھی نہیں کرتے۔ ایسے میں پیروڈی ہمارے جذبات کی تقدیس پر ضرب لگاتی ہے۔ ہمارے معتقدات کے اصنام کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ ہماری اہمیّتوں کے مقابلہ میں نہایت ہی غیر اہم چیزیں پیش کر کے ہمارے نقطۂ نظر کی شدّت پسندی کا مذاق اڑاتی ہے۔

فارسی میں اس قسم کی پیروڈی کی کافی مثالیں ملتی ہیں۔ شاہنامۂ فردوسی کی پیروڈی ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے۔ ؎

من آں رستمم وقت روئیں تنم   بتاشہ بگرز گراں بشکنم
بپوشم اگر جوشنِ جنگ را   ہزیمت دہم پشۂ لنگ را

(جعفر زٹلی)

عبیدِ زاکانی کا "موش و گربہ نامہ" بھی اسی قسم کی پیروڈی ہے۔

جعفرِ زٹلی کی اردو شاعری میں بھی اس قسم کی پیروڈی کی جھلک ملتی ہے لیکن اس کی اخلاقی اور ذہنی سطح بہت پست ہے۔

میرا گمان ہے کہ اردو شاعری کی بعض بدنام اصناف کی ابتداء غالباً پیروڈی سے ہوئی ہوگی مثلاً "ریختی" یا "چرکینیات"، بہت ممکن ہے۔ ان شاعروں نے ابتدا پیروڈی سے کی ہو لیکن بعد کو اپنی فطرت کی کج رَوی کا خود شکار ہو گئے ہوں۔

زندگی کو توازن بخشنے اور مذاقِ عام کو اعتدال پہ لانے کے ساتھ ساتھ پیروڈی خود اپنے ہدف کے لیے بعض اوقات بڑے مصلح کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنی شدّت آمیز تنقید سے ادیبوں کو خود نگری پر مائل کر کے ایک معتدل سطح پہ لے آتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ غالبؔ کو طرزِ بیدلؔ سے ہٹانے میں ان کے ناقد دوستوں سے زیادہ ان کے حاسد مذاق اڑانے والوں کا ہاتھ نہ ہوگا۔

"آبِ حیات" میں آزاد کی روایت ہے "حکیم صاحب" (حکیم آغا جان صاحب عیشؔ) کے اشارہ پر ہُدہُد بلبلانِ سخن کو ٹھونگیں بھی مارتا تھا۔ چنانچہ بعض غزلیں سرِ مشاعرہ پڑھتا تھا جن کے الفاظ نہایت شستہ اور رنگین لیکن شعر بالکل بے معنی اور کہہ دیتا تھا کہ یہ غالبؔ کے انداز میں غزل لکھی ہے۔ ایک مطلع یاد ہے ؎

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں
ناخنِ قوسِ قزح شبۂ مضراب نہیں

غالبؔ کی پیروڈی کے سلسلہ کا سراغ ہمیں غالبؔ کے زمانہ کے بعد بھی ملتا ہے۔ بدایوں کے ایک ظریف شاعر علی حاتم صاحب آزادؔ نے عرصہ ہوا کسی مشاعرہ میں ایک غزل پڑھی تھی جس کے دو شعر یہ ہیں۔ ؎

کٹ گئی گر شبِ یلدا بطفیلِ فرقت　　تجھ کو اے مرغِ سحر وقتِ سحر دیکھیں گے
ہم بھی آزادؔ کسی روز بقولِ غالبؔ　　شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر دیکھیں گے

اسی طرح حضرت رضیؔ بدایونی نے ایک مشاعرہ میں غزل پڑھی تھی جس کا مقطع تھا ؎

شاہدِ نازکی طبع ہیں اشعارِ رضیؔ
بارِ احسانِ معانی بھی گوارا نہ ہوا

ان غزلوں میں پیروڈی کا رُخ غالبؔ کی سمت نہیں بلکہ اہالیانِ مشاعرہ کی فہم کا احتساب مقصود ہے۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آتا ہے۔ فتح پور کے ایک مشاعرہ میں ملک کے ایک مشہور ایڈیٹر اور ادیب کو صدارت کے فرائض انجام دینا تھے۔ یہ حضرت اپنی رنگین مگر اَدق نثر کے لیے مشہور تھے۔ ایک پُرگو شاعر کو ظرافت سُوجھی تو انہوں نے شہر کے تمام خوش آواز لڑکوں کو ایک ایک مہمل غزل لکھ کر دے دی۔ ایک مشاعرہ شروع ہوا۔ ایک دو غزلوں تک صاحبِ صدر نے تحمل سے کام لیا لیکن جب اس مہملیت کا سیلاب حد سے بڑھا تو اُن کو باعزت پسپائی سے کام لینا پڑا۔

پیروڈی کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا تعلق کسی ادیب کے اسٹائل یا ظاہری پہلو ہی سے ہو، پیروڈی کے ذریعہ سے کسی فلسفہ، طرزِ فکر یا نظام کے معنوی نقائص کو بھی بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔ شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" پطرسؔ کے "کتے" اس معنوی پیروڈی کا نمونہ ہیں اس قسم کو نباہنے کے لیے گہری نظر اور کافی ذوقِ ظرافت (SENSE OF HUMOUR) کی ضرورت ہے اس لیے یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اسٹائل کی پیروڈی چونکہ آسان ہے اس لیے اس کی مثالیں ہمیں کافی تعداد میں مل جاتی ہیں۔ نثر کے اسٹائل کی پیروڈی کے کامیاب نمونے ہمیں سب سے پہلے انشاؔ کی "دریائے لطافت" میں ملتے ہیں۔ اس قابلِ قدر تصنیف میں مصنّف نے دہلی کے مختلف محلّوں اور فرقوں کی بولی کے نمونے دیئے ہیں۔ اگرچہ ایک سنجیدہ علمی تصنیف کے سلسلہ میں یہ نمونے دیئے گئے ہیں لیکن انشاؔ کی ظریفانہ طبیعت نے جگہ جگہ پیروڈی کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔

انشاء اللہ خاں کے بعد ملّا رموزی کی گلابی اُردو، عبدالغنی دہلوی کی دہلی کے کرخنداروں کی زبان اور آغا حیدر کی پسِ پردہ والی نسوانی اُردو قابلِ ذکر ہیں لیکن ان کوششوں میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ پیروڈی کا رُخ کس کی سمت ہے۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسٹائل جس کی نقل کی کوشش کی گئی ہے محض اپنی اجنبیت کی وجہ سے ایک سستی ظرافت کے طور پہ استعمال کیا گیا ہے۔

محمد حسین آزادؔ کے مقدمہ آبِ حیات میں البتہ اُردو و انشاء پردازوں کی نثر کے خاکے ایک واضح تنقیدی مقصد کی خاطر پیش کیے گئے ہیں لیکن ان میں ظرافت کا عنصر اس قدر کم ہے کہ ان پر صحیح معنی میں پیروڈی کا اطلاق ہونا مشکل ہے۔

معنوی اور ظاہری پیروڈی کا دلچسپ امتزاج ظریف لکھنوی کی بعض طویل نظموں میں نظر آتا ہے۔ مثلاً میونسپل الکشن اور مشاعرہ۔ ان نظموں میں ایک طرف الکشن اور مشاعرے کے اداروں کی نہایت ظریفانہ مصوری کی گئی ہے، دوسری طرف ضمنی طور پر بعض اشخاص کے مخصوص طرزِ گفتگو کی پیروڈی، مثلاً میونسپل الکشن کے امیدوار ایک مجتہد صاحب کی خدمت میں ووٹ کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ اب مجتہدانہ اُردو کی آب و تاب ملاحظہ ہو ؎

ووٹ دے دوں گا عوض میں آپ کو خمسین کے　　اتنے ہی ملتے ہیں مجھ کو وعظ کے تلقین کے
حضرتِ والا تو خود پابند ہیں آئین کے　　اس سے کم لینا مرادف ہے مری توہین کے
ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ تقلیل فرما دیجئے
ہے یہ کارِ خیر بس تعجیل فرما دیجئے

شاعری میں لہجوں اور بولیوں کی پیروڈی کے سلسلہ میں بھی اولیت کا سہرا انشاؔ ہی کے سر ہے۔ یہ ہمہ رنگ شاعر اپنی قادر الکلامی اور ظرافت میں کبھی جاہل ہندی عورتوں کی بولی بولتا نظر آتا ہے ؎

بھر بھر چھاجوں برست نور
رو بلیّاں دسمن دور

کبھی کشمیری اردو کا یوں خاکہ اڑاتا ہے ؎

کشمیری معلّم کو جو اک طفل نے ناگہ　　انگور کے دانے
لا کر دیے اور ان سے کہا کھائیے میرا　　ہے قسم ولایت
لہجے میں تکشمیر کے مقطع ہو نہ بولے　　شاگرد سے اپنے
چل سامنے سے میرے تیا کر نہیں لے جا　　ین میں نہیں لذّت

ملی جُلی (تفریحی اور مقصدی) پیروڈی کی دلچسپ مثال الٰہ آباد کے ایک ریختی گو شاعر مرحوم کی ایک نظم سوداؔ کے قصیدے کی تشبیب میں نظر آتی ہے۔ اس میں ایک طرف سوداؔ کے پُرشکوہ انداز کی پیروڈی ہے۔ دوسری طرف بعض پرانے رنگ کے معلّموں کا خاکہ۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

شیدؔا　　بیٹھی کیا تکتی ہے منہ کھول کتاب آگے چل　　وہی سوداؔ کا قصیدہ جو پڑھایا تھا کل
سوداؔ　　اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل　　تیغ اردی نے کیا باغِ جہاں متاصل
شیدؔا　　یعنی بامن کا نہیں ہند میں اب کوئی عمل　　ملک اپنا ہے اُرد کھائیو یہ گنگا جل
سوداؔ　　سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک　　دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزّ و جلّ
شیدؔا　　شکر کے سجدے میں سر پھل ہے ترا توڑا لی　　دیکھ کر باغ کو یوں اپنے کرم پر مت جل

سودا   بخشی ہے گلِ نورستہ کی رنگ آمیزی   پوششِ چھیٹِ قلمکار بہ ہر دشت و جبل
شیدا   راستہ میں وہ کھلا گل وہ دکھا رنگیں   چھینٹ کے کپڑے پہاڑوں کو بنا دیں جنگل
چھیٹ کو کیسے یہ مرزا نے اضافت دے دی   زیرِ کاتب کے قلم سے نہ گیا ہو یہ نکل

فارسی اور اُردو میں پیروڈی کا ایک کامیاب طریقہ رائج ہے۔ وہ یہ کہ کسی شاعر کے کسی مشہور شعر کو لے کر جزوی تصرف اور کبھی ایک مصرعے کی تبدیلی سے مضحکہ خیز رنگ دے دینا۔ مثلاً خاقانی کا شعر ہے ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی
کہ سلطانیست درویشی و درویشی ست سلطانی

اس پر ابو اسحٰق اطعمہ یوں تصرف کرتا ہے ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی
کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

اردو شعرا میں اکبر الہ آبادی کے یہاں کہیں کہیں یہ طرز ملتا ہے مثلاً ؎

پہن لے سایہ مری جان اتار کر پشواز   زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

یا حافظ کے شعر کو اس طرح پیروڈی کے سانچے میں ڈھالا ہے ؎

الا یا ایہا الطفلک بخور احت بہ نا دل ہا   کہ علم آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکل ہا

اکبر کے ان اشعار میں ایک مشہور شعر یا مقولہ کو اس کے سنجیدہ محل سے ہٹا کر بے محل چسپاں کیا گیا ہے اس لیے پیروڈی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ ان مثالوں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اکثر پیروڈی پہلو دار بھی ہو سکتی ہے یعنی نقل کسی کی کی جائے اور نشانہ کسی کو بنایا جائے یا بیک وقت کئی طرف پیروڈی کا اشارہ ہو۔ اسی قسم کی ایک دلچسپ پیروڈی علی گڑھ کے ایک نوجوان شاعر حبیب احمد صدیقی نے اپنی ایک غزل میں پیش کی تھی۔ غزل یونین کے ایک طرحی مشاعرہ کے لیے لکھی گئی تھی۔ غالب کی زمین میں تھی اور غالب کے مصرعوں ہی میں پیوند لگا کر تیار کی گئی تھی۔ چند اشعار یاد داشت سے پیش کیے جاتے ہیں۔ تقابل کے لیے غالب کے اشعار بھی جن کی تحریف کی گئی ہے نقل کر دئیے ہیں ؎

غالب   بے کاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل   جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حبیب   اس مس سے شیک ہینڈ کی ہے دل کو آرزو   جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
غالب   چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی   کیا فائدہ حبیب کو رسوا کرے کوئی
حبیب   پیسہ ہی جب نہ پاس ہو رکھنے کے واسطے   کیا فائدہ جیب کو رسوا کرے کوئی
غالب   لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل   تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
حبیب   غازہ لگا کے اس رخِ بے نور پہ حبیب   تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ان اشعار میں شاعر کا مقصد غالب کی شخصیت کو گرانا نہیں بلکہ پیروڈی کے تفریحی امکانات کو پیش کرنا ہے لیکن کبھی کبھی اسی عمل سے

کسی شاعر کے خلاف زہرناکی کا مظاہرہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اودھ پنچ کے کسی شاعر نے اصغر مرحوم کی ایک غزل کی پیروڈی کی تھی جس میں محض تفریح ہی مقصد نہیں بلکہ جذبۂ عناد بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ ؎

اصغر　　رکھو نہ کسی کا بھی خیال جلوہ گہ ناز میں　　بلکہ خدا کو بھول جا سجدۂ بے نیاز میں
نامعلوم　　رکھ نہ کسی کا بھی خیال سلسلۂ دراز میں　　بلکہ پدر کو بھول جا شجرۂ خانہ ساز میں
اصغر　　دونوں نے خاک جھونک دی دیدۂ امتیاز میں
نامعلوم　　زلف وہاں کٹی ہوئی مونچھ یہاں منڈی ہوئی　　دونوں نے دھول جھونک دی دیدۂ امتیاز میں
اصغر　　اس سے زیادہ اور کیا شوخیِ نقشِ پا کہوں　　برق سی اک چمک گئی آج سرِ نیاز میں
نامعلوم　　ٹیپ جو اس نے جھاڑ دی اک وفورِ ناز میں　　برق سی اک چمک گئی آج سرِ نیاز میں

بعض اوقات تضمین کے ذریعے سے کسی شاعر کے سنجیدہ اشعار کو پیروڈی کا رنگ دے دیا جاتا ہے۔ اس کا محرک بھی کبھی محض تفریح کا جذبہ اور کبھی تعصب اور عناد ہوتا ہے۔ بوم میرٹھی کی اکثر تضمینیں اگرچہ پست اور رکیک ہوتی ہیں لیکن ان میں شخصی عناد کی تنگ نظری نہیں ہوتی۔ مثلاً فارسی کے مشہور شعر کی تضمین جنھوں نے بوم کی زبان سے سنی ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے ؎

بر مزارِ ما غریباں نے چراغ نے گلے　　نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

تعصب اور تنگ نظری پر مبنی پیروڈی کی مثال ہمیں پھر اودھ پنچ ہی کے کارناموں سے پیش کرنا پڑے گی۔ اقبال کا مشہور شعر ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس کو یوں پیروڈی کا ہدف بنایا گیا ہے ؎

کبھی بندوق میں عشق اور کبھی بارود میں عشق

مبتلا روزِ ازل سے ہے اچھل کود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تذکرۂ سطورِ بالا سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ پیروڈی فطری طور پر ہمارے لیے غیر معمولی دلچسپی اور جاذبیت رکھتی ہے۔ یہی دلچسپی اور جاذبیت پیروڈی کرنے والے پر بڑی ادبی اور اخلاقی ذمہ داریاں عائد کرتی ہے۔ چونکہ ہر نقل ایک حد تک مضحک اور دلچسپ ہو سکتی ہے اس لیے پیروڈی کا حربہ ادب کے صحت مند عناصر کے خلاف بھی عمل میں لایا جا سکتا ہے اور غیر صحت مند عناصر کے خلاف بھی۔ اس کا صحیح فیصلہ تو وقت ہی کر سکتا ہے کہ کسی پیروڈی کا استعمال بجا تھا یا بے جا، لیکن پیروڈی کرنے والے کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ انتہائی احتیاط سے اس راہ میں قدم رکھے تاکہ ادبی ترقیوں کی راہ میں روڑا نہ ثابت ہو۔ بہرحال اگر کسی ادیب یا صاحبِ طرز میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے تو وہ باقی رہے گا اور اس کی پیروڈی گمنامی کے آغوش میں دفن ہو جائے گی لیکن اگر ادیب یا شاعر ہی میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تو اس کی شہرت کا آفتاب رفتہ رفتہ غروب ہو جائے گا اور اس کے ساتھ پیروڈی بھی اپنا مقصد پورا کر چکنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔

اس بحث سے یہ ظاہر ہے کہ پیروڈی کسی دیرپا یا مستقل ادبی قدروں کی حامل نہیں ہو سکتی۔ کچھ زمانہ گزرنے پر اس کو اپنی قدر و قیمت کھو دینا ضروری ہے۔ یا تو وہ اپنے حریف کے مقابلہ میں کام آ جاتی ہے یا حریف کو ختم کر کے خود بھی ختم ہو جاتی ہے۔

فارسی ادب میں طنز و مزاح

پروفیسر محمد علم الدین سالک

ایرانی فطرتاً ظریف ہوتا ہے۔ وہ مزاح کو پسند کرتا اور زندگی ہنسی خوشی گزار دیتا ہے۔ ایرانیوں کی زبان اور تہذیب بہت پرانی ہے۔ ان کی روایات بھی زبان کی طرح صدیوں سے چلی آتی ہیں اور کیا مجال کہ ان میں کسی قسم کا تغیّر و تبدل ہو جائے۔ ہر ایرانی تجدّد پسندی کے باوجود اپنی روایات پر قائم ہے اور اسی کو اپنی قومی زندگی کی اساس سمجھتا ہے۔

روایات کا تسلسل اور پابندی ہی ایسی چیزیں ہیں جنھوں نے ایران کی آزادی کو برقرار رکھا ہے۔ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ایرانی وقتی طور پر محکوم ہو گئے مگر ان کا جذبۂ آزادی پھر ابھرا اور انھوں نے حاکموں کو اپنا محکوم بنا لیا۔ وہ بھی ان کے رنگ میں رنگے گئے اور ایرانی رسم و رواج کی پابندی کرنے لگے۔ آج وہ بھی اپنے آپ کو ایرانی کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

اوپر لکھا گیا ہے کہ ایرانی طبعاً ظرافت کو پسند کرتے ہیں اس لیے ان کے ادب میں یہ عنصر خاصا پایا جاتا ہے۔ ظرافت جب مزاح کے درجہ سے گر جاتی ہے تو ہجو یا ہزل کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور بعض اوقات تو اس سے بھی گزر کر محض فحاشی بن کر رہ جاتی ہے۔

فارسی شاعری کا آغاز رودکی سے ہوا۔ وہ اپنے زمانے کا نابغہ تھا مگر افسوس کہ اس کا بیشتر سرمایۂ کلام ضائع ہو چکا ہے۔ اس لیے اس کے کلام سے مزاح، ظرافت یا ہجو کے نمونے تلاش کرنے مشکل ہیں۔

رودکی کے بعد دوسرا نامور شاعر دقیقی ہے۔ اس کے کلام کا فقط وہی حصہ محفوظ ہے جو شاہنامہ کا جزو بن چکا ہے۔ باقی کلام کہیں کہیں تذکروں میں پایا جاتا ہے وہ بھی چند اشعار سے زیادہ نہیں۔ اس لیے دقیقی کی ہجویات کا سراغ لگانا بھی ناممکن ہے۔

یہ دونوں شاعر دورۂ سامانی سے تعلق رکھتے ہیں جس کے زوال پر دورۂ غزنویہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں فارسی شاعری نے نئی کروٹ لی اور عنصری، فرخی، عسجدی، منوچہری اور اسدی طوسی کے علاوہ فدائے سخن فردوسی جیسے نغز گو شاعر اور قادر الکلام استاد پیدا ہوئے۔ یہ ایسے اساتذۂ فن ہیں کہ آج تک ہر مبصر اور ہر شاعر ان کی استادی کا لوہا مانتا ہے اور ان کے کلام کو نہایت مستند سمجھتا ہے۔ اس دور میں ابھی تک شعراء میں رشک و رقابت کے جذبات کچھ ایسے نمایاں نہ ہوئے تھے کہ اس کی وجہ سے ہجویات کو فروغ حاصل ہوتا۔ البتہ ایک ہجو فردوسی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے مگر جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کی کوئی ہجو نہیں کہی۔ یہ نام نہاد ہجو دراصل ان لوگوں کا کارنامہ ہے جو سلطان محمود غزنوی کو سیاسی وجوہ کی بناء پر بدنام کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے شاہنامہ کے مختلف مقامات سے اشعار جمع کر کے ایک ہجو مرتب کر لی جس کے اشعار کی تعداد زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔

شاہنامہ ایک بہت بڑی کتاب ہے اور رزمیہ شاعری کا شاہکار۔ اس میں نفرت و محبت کے جذبات جا بجا ملتے ہیں۔ کئی ایسے مقامات آئے کہ فردوسی نے ایرانی قوم کی بڑائی بیان کرتے ہوئے دوسری قوموں کی تحقیر کی۔ مثلاً قادسیہ کی جنگ میں ایرانیوں کو شکستِ فاش

ہوئی۔ فردوسی نے جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا وہاں اہلِ عرب کی ہجو بھی کی، وہ کہتا ہے ؎

ز شیر شتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجائے رسیداست کار
کہ تخت کیاں را کند آرزو　　تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

یہ جذبات ایک سچے محبِّ وطن ایرانی ہی کے ہو سکتے ہیں اور فردوسی نے ان کا اظہار بلا کم و کاست کر دیا ہے۔

دورۂ غزنویہ کی ایک اور ممتاز شخصیت شیخ الرئیس ابوعلی سینا ہیں۔ وہ فلسفہ اور طبّ میں بے مثال و بے نظیر اور مذہبی لحا سے آزاد خیال تھے۔ اس واسطے علماء کا طبقہ انھیں پسند نہیں کرتا تھا۔ شیخ نے اس جماعت کے طعن و تشنیع سے تنگ آ کر اپنی رباعیات میں جن کی تعداد بہت ہی کم ہے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ وہ ایک رباعی میں طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

با ایں دو سہ ناداں کہ چناں می دانند　　از جہل کہ دانائے جہاں ایشانند
خر باش کہ ایں جماعت از فرطِ خری　　ہر کو نہ خراست کافرش می خوانند

دورۂ غزنویہ کے بعد دورۂ سلجوق آتا ہے۔ یہ فارسی ادب کا دورِ زرّیں ہے۔ اس میں ہر صنفِ سخن کو فروغ حاصل ہوا۔ زبا میں وسعت اور بیان میں شیرینی بھی پیدا ہوئی۔ شاعری نے سادگی کی بجائے رنگینی اختیار کی۔ اور شعراء نے جولانیٔ طبع کے لیے نئے میدا تلاش کیے۔ اس دور میں، ہجو، شوخی اور ظرافت وغیرہ کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہزل اور اس سے بڑھ کر فحش نگاری بھی خوب پنپی۔ انوری، خاقانی، سوزنی خاص طور پر اس کے لیے مشہور ہیں۔ ویسے تو کسی شاعر کا دامن بھی اس سے پاک نہیں۔

مولانا شبلی کے خیال میں "انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو کی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر مگر مولانا کا یہ بیان بہت حد تک مبالغہ آمیز ہے۔ انوری کی کلیات چھپ چکی ہے۔ اس کی ورق گردانی سے مولانا کے اس بیان کی تائید نہ ہوتی۔ اس کے ہاں کہیں کہیں ظرافت، طنز اور ہجو ملتی ہے۔ بعض ہجویں بڑی کثیف ہیں لیکن مضامین اچھوتے ہیں۔ چند ایک میں لطا بھی پائی جاتی ہے مثلاً جن ایّام میں انوری سرخس میں مقیم تھا وہاں کا ایک عہدہ دار بوعلی آبی تھا۔ انوری کی اس سے کسی بات پر ان بن بوعلی کی ناک جسمانی تناسب سے کسی قدر بڑی تھی۔ اور تمام چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ انوری نے اس ناک کو ہجو کا نشانہ بنایا اور یہ رباعی کہی ؎

با بوعلی آبی ار بہم بنشینی　　شخصے بینی شش جہتش ز د بینی
گر دیدہ بدیدن رخش چار کنی　　چنداں کہ از د بینی بینی . بینی

اس زمانہ میں شعراء کی بے حد قدر و منزلت تھی لیکن درباری رقابتوں کی وجہ سے اکثر شعراء کو تلخ زندگی بسر کرنی پڑتی تھی اور ا تلخی کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شاعر بعض حالتوں میں بے حد ذلیل ہوتا تھا۔ اس بنا پر انوری شاعری کو خاکروبی کے پیشے سے بھی زیادہ ذلیل اور کثیف سمجھتا تھا۔ اس کے دیوان میں ایک خیالی واقعہ ملتا ہے جس میں اس نے نہایت لطیف پیرایہ میں اس فنِ لطیف کی اصل حقیقت کو کیا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

بایکے مردکِ کنّاس ہمی گفتم دوش　　تو چہ دانی کہ زغبن تو دلم چوں خستہ است

صنعت و پیشۂ ما ہر دو ہمی دانی چیست   آں چرا تیز رود، ویں ز چہ رو آہستہ است
گفت از غیب خود داز ہنر ما مشناس   زیں کہ ما را ز چنار آتش و از نے جستہ است
کار فرمائے دہد رونق کارِ من و تو   داند آں کس کہ دمے با من و تو بنشستہ است
کار فرمائے مرا پایۂ من معلوم ست   لاجرم کارِ من از بند تقاضا رستہ است
کہ چناں ظن برواد کابچہ تو ترتیب کنی   کردۂ دائم و پرداختۂ پیوستہ است
یا چناں داند کایں عمرِ عزیز علماء   ہمچو روز و شب جہاں متاعِ رستہ است
او چہ داند کہ دراں شیوہ چہ خوں باید خورد   کہ ترا از سرِ بیدا ددراں پے خستہ است

انوری ہم ز تو برتست کہ برشاخِ درخت
عقل داند کہ ستمہائے تبر از دستہ است

یعنی ایک دن میری ملاقات حلال خور سے ہوئی۔ میں نے کہا بھائی! میرا اور تیرا پیشہ جیسا کچھ ہے اس سے سب واقف ہیں مگر عجیب بات ہے کہ تم اپنے پیشے میں کامیاب ہو اور میں ناکام۔ حلال خور نے جواب دیا کہ تمھاری ناکامی کی وجہ یہ نہیں کہ میں تم سے زیادہ باکمال ہوں بلکہ یہ ہے کہ قدردانوں میں فرق ہے۔ میرے آقا کو ہنر کی قدر ہے اس لیے میرے کام کو فروغ حاصل ہے۔ اس کے خلاف تمھارا آقا تمھارے کام کی قدر و منزلت نہیں جانتا۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ تمھارا کام بڑا معمولی ہے۔ روزِ ازل سے جیسا چلا آتا ہے ویسا ہی چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی خیال ہے کہ عالم لوگوں کے کارنامے بازاری جنس ہیں جو بڑی فراوانی سے بازار میں موجود ہیں۔ اس علم کے بعد وہ تمہاری قدر کیوں کرے اور اسے تمہاری محنت کا احساس کیوں ہو؟

سرخس میں ایک دفعہ بارش نہ ہوئی۔ انوری نے اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر ابوعلی آبی کی ہجو میں یہ رباعی کہی ؎

سرخس از رنج بے آبی و آبی   دریغا روے دارد در خرابی
زبے آبی خلاصی یافت امسال   خداوندا خلاصش دہ ز آبی

یعنی سرخس آبی اور بے آبی (خشک سالی) کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔ اس سال اسے خشک سالی سے تو نجات مل گئی ہے مگر خداوندا! اسے آبی (ابوعلی آبی) سے بھی نجات دے۔

انوری کے زمانے میں خواجہ ابوالفتح بخل میں مشہور تھا۔ انوری نے اس کے بارے میں یہ شعر کہے ؎

خواجہ بوالفتح از کمالِ حرص و بخل   سیم حاصل می کند بے فائدہ
وز پئے نانے ہمی گوید زنش   رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَائِدَہ

اسی طرح ایک بدخوان قاری کی ہجو میں لکھتا ہے ؎

دوش در خواب من پیمبر را   دیدمش کو ز امت آزردہ است
گفتمش اے بزرگ چیت بودہ است   طبع پاک تو از چہ پژمردہ است

گفت زیں مقریک ہمی بوشم   رونق دین ایزدی بردہ است
آنچہ ایں زن بہ مردمی خواند   جبریل آں بہ من نیاوردہ است

انوری نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے قاضی طوس سدید الدین بیہقی اور عمر الدین عم زاد اور کافی ہروی کو ہجو کا نشانہ بنایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

چار کس یابی کہ در ہجو من اند   گر بہ جوئی از ثریا تا ثریٰ
قاضی طوس و سدید بیہقی   تا جک عم زاد و کافی ہری

بہر حال انوری نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت لطیف ہے۔ اس میں شدت اور زہرناکی بہت کم ہے۔

اسی زمانے میں حکیم کوشکی ایک نہایت مشہور ہزال ہوا ہے۔ اس نے سلطان سنجر کے درباریوں کے خلاف کئی نظمیں لکھیں۔ جن میں اکثر فحش ہیں۔ ان میں سے سب سے بے ضرر مندرجہ ذیل ہے ؎

ایا شمشیر زن ترکان پُر دل   بہ نسبت از نی و تاتار و کاشاں
یکایک در خراساں پروریدہ   بہ ناز و نعمت و دولت تن آساں
شمارا پادشاہِ ہفت کشور   رسانیدہ بمیری از نخاساں
بروز کودکی خفتہ کہ و مہ   ہسے در پیش دکان رواساں
بہر شہرے ز نام غز شنودن   شدہ چوں دیو از آہن ہراساں
فلک کفران نعمت ہائے سنجر   طلب کرد از شما ناحق شناساں
زہے در ماندگانِ بے حمیت   زہے خر بندگانِ ناسپاساں
کسے خود زاد و بوم و ملک و اقطاع   چنیں بیروں دہد از دست آساں
مسلّم ہیں کہ چوں بیروں کشیدند   بشمشیر از . . . زن تاں خراساں

قاضی حمید الدین ابوبکر اپنے زمانے کے فاضل، بلخ کے قاضی القضاۃ اور انوری کے ممدوح تھے انھوں نے ایک نہایت لطیف ہجو سلطان سنجر کے سپاہیوں کی لکھی ہے جو غزوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان کے آگے مارے مارے پھرتے تھے۔ ؎

حکیم کوشکی را بخواب دیدم دوش   زباں کشادہ بمدح مبارزاں سپاہ
ز راہِ طعنہ و طنز و تماخرہ می گفت   خہے گزاردہ ہر یک حقوق نعمت شاہ
فسوس زیر رکاب شما کیت و کمند   دریغ بر بود فرقِ شما قبا و کلاہ
زپیش کافر کفران نعمت آورد   گریختند چو از پیش تو بہ خیل گناہ
نہ دیدہ گرد سپاہ سیاہ پوش ہنوز   کہ گشت صبح سپید شما چو شام سیاہ

زبس تعجب کفار جملہ می گفتند   زہے جماعتِ عز لا الٰہ الا اللہ

عمر خیام پہلا شاعر ہے جس نے ریاکاری کی مذمت کی اور رباعیات کے ذریعے شوخی اور ظرافت کو روشناس کرایا۔ مثلاً وہ خود نما شیوخ کی پردہ دری کرتا ہوا کہتا ہے ؎

اے خواجہ یکے کار رواکن ما را   دم در کشو در کار خدا کن ما را
ما راست رویم و تو کج بینی   او چارۂ دیدہ کن رہا کن ما را

ایک اور رباعی میں وہ کہتا ہے ؎

آباد خرابات ز مے خوردنِ ماست   خون دو ہزار توبہ در گردنِ ماست
گر من بدنکنم رحمت چہ کند   آرائشِ رحمت زگناہ کردنِ ماست

مائیم طلب گار مے کہنہ و نو   وانگہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت   مے پیش بیار و ہر کجا خواہی برو

یعنی ایک شخص اس خوف سے دبا ہوا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا اور ہم کہاں جائیں گے۔ وہ عمر خیام سے اس بارے میں سوال کرتا ہے۔ خیام کہتا ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شراب ہمارے لیے لے آؤ اور تم جہاں چاہو چلے جاؤ۔

عمر خیام چاہتا ہے کہ انسان کا ظاہر اور باطن یکساں ہو۔ وہ اسے ظریفانہ انداز میں یوں کہتا ہے ؎

زاہد بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی   ہر لحظہ بدام دیگرے پابستی
گفتا شیخا ہر آنچہ گوئی ہستم   اما تو چناں کہ می نمائی ہستی

یعنی ایک نے فاحشہ عورت سے کہا کہ تو ہر گھڑی ایک نئے آشنا سے تعلق جوڑتی ہے۔ اس نے کہا اے شیخ تو جو کچھ کہتا ہے میں وہی ہوں لیکن کیا جو کچھ تو اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے کیا تو وہی ہے ؟

عربی میں ایک مقولہ ہے کہ الحق مُرٌ۔ یعنی سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ عمر خیام اس سے کتنا ظریفانہ مضمون شراب کے بارے میں پیدا کرتا ہے ؎

وقتے کہ طلوع صبح ازرق باشد   باید بگفت جام مروق باشد
گویند کہ حق تلخ بود در ہمہ حال   باید کہ بایں دلیل مے حق باشد

ایک اور مقام پر وہ ریاکاری کی مذمت یوں کرتا ہے ؎

گر مے نخوری طعنہ مزن مستاں را   گر دست دہم توبہ کنم یزداں را
تو فخر بایں کنی کہ من مے نخورم   صد کار کنی کہ مے غلام است آں را

اسی مضمون کو ایک انوکھے انداز میں یوں بیان کرتا ہے ؎

درمسجد اگرچہ با نیاز آمدہ ام   واللہ کہ نہ از بہر نماز آمدہ ام
روزے ایں جا سجادۂ کم کردم   آں کہنہ شدہ است باز باز آمدہ ام

خاقانی فارسی زبان کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ہے وہ حسان العجم کہلاتا ہے۔ ہر شاعر اس کا نام ادب اور احترام سے لیتا ہے وہ شاعری میں ابوالعلاء گنجوی کا شاگرد ہے جس نے اس کی قابلیت سے متاثر ہو کر اپنی لڑکی کی شادی بھی اس سے کر دی تھی۔ بعد میں حالات نے پلٹا کھایا اور استاد شاگرد میں چل گئی۔ یہ معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ دونوں نے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا شروع کیا۔ تحفۃ العراقین میں خاقانی نے اپنے حج کے حالات لکھے ہیں لیکن وہاں بھی وہ اپنے استاد پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آتا۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

بینی سگ گنجہ را دریں کوی   ہم زرد قفا و ہم سیاہ روی

رشید الدین وطواط، خاقانی کا ہم عصر اور دوست تھا۔ دونوں میں بڑی محبت تھی۔ خاقانی نے اس کی مدح میں ایک زبردست قصیدہ لکھا جس میں اس نے کہا ؎

اگر بکوہ رسید سے رواتیے سخن است   زہے رشید جواب آیدے بجائے صدا

لیکن آخر میں اس سے بھی اَن بن ہوگئی اور خاقانی نے اس کی بھی ہجو لکھی۔ مگر خاقانی سے کسی کو کیا گلہ ہو سکتا ہے؟ اس کی افتادِ طبیعت ہی ایسی تھی۔ وہ خود اپنی مدح میں کہتا ہے ؎

شبہت حوا نویسم تہمت ہاجر نہم   چادر مریم ربایم پردۂ زہرہ درم

ایک تذکرہ میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ خاقانی کسی امیر کی محفل میں پہنچا۔ امیر نے اس کے شایانِ شان تکریم و تحریم نہ کی۔ بیٹھنے کو بھی کوئی موزوں جگہ نہ دی۔ یہ بات خاقانی کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے مندرجہ ذیل قطعہ لکھا اسی محفل میں پڑھا اور چلا آیا ؎

گر فروتر نشست خاقانی   نہ ورا ننگ نہ تما ادب است
قل ہو اللہ کہ وصفِ خالقِ ماست   زیرِ تبت یدا ابی لہب است

اسی عہد میں حکیم سوزنی بہت بڑا ہزال اور ہجو گو ہوا ہے۔ اس نے عمر کا بیشتر حصہ ہجو گوئی میں بسر کیا اور نہایت کثیف اور فحش ہجویں کہیں۔ آخری عمر میں وہ اس سے تائب ہوا اور کئی قصیدے لکھے۔ جن میں وہ اپنے گناہوں پر پشیمانی کا اظہار کرتا اور آئندہ بلہ رہنے کی دعا کرتا ہے۔ ایک قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

چوں بر سوائے دل تن من گشت پادشاہ   آمد بہ پیش سینہ ام از سفہ سپاہ
لشکر گہ سفاہت من عرض دادہ بود   من ایستادہ ہمچو عارض بعرض گاہ
دیو سیہ گلیم بر آں بود تا کند   ہمچوں گلیم خویش لباس دلم سیاہ
بنمود خیل خیل گنہ پیش چشم من   تا در کدام خیل کنم بیشتر نگاہ

سوزنی کے بعد کمالؔ اصفہانی کا زمانہ آتا ہے۔ وہ ہجو کو شاعر کے لیے لازمی قرار دیتا ہے اس کا ایک قطعہ ہے ؎

ہجا گفتن ہرچہ پسندیدہ نبود　　مبادا کسے کالت آں ندارد
ہر آں شاعرے کہ نہ باشد ہجا گو　　چو شیرے کہ چنگال و دنداں ندارد
خداوندا مساک راہست دردے　　کہ الا ہجا ہیچ درماں ندارد !
چہ نفریں بود بولہب زا یزد　　مرا ہجو گفتن پشیماں ندارد
اگر ہجو گوئی تو در گردن من　　کہ ہرگز زیانے بہ ایماں ندارد

اس کی کلیات میں ہجو کی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں۔ ایک بخیل کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

اے تما جمع گشتہ در رہ آز　　ہمتِ کوتہ و امید دراز
ہمہ دنداں ز حرص ہمچوں سیر　　ہمہ مغزِ تو پوست ہچو پیاز
دست تو چوں دہان گرسنگاں　　ہرچہ در دی نہی نیابی باز
ہچوں گلوی فرو بری ہمہ چیز　　وز تو ناید بروں مگر آواز

اسی طرح ایک مزدقانی کی داڑھی کی ہجو میں ایک طویل نظم لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

آں ریشِ فلاں مزدقانی　　ریشست عظیم پاستانی

ایک مثنوی لبنان کے رئیس کی ہجو میں ہے۔ اس کے بعض بعض شعر نہایت لطیف ہیں۔ ابتدا کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

تا زبانم بکام جنبان است　　در ہجائے رئیسِ لبنان است
چہ رئیس آں خسیس پُر تلبیس　　مایۂ ظلم و سایۂ ابلیس
آنکہ نامش ز شرم پیدا نیست　　در بدی و دو ویش ہمتا نیست
آں کہ او مستولے دز دانست　　سرو سرخیل زن بمزدانست
طبع او لوم و شکل نامعلوم　　صحبتش شوم و سیرتش مذموم

کمالؔ اصفہانی نے اپنے زمانے کی ایک مشہور شخصیت ضیاء الدین کی ہجو میں ایک زبردست نظم لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

تیزے کہ مغز چرخ ز بانگش فغاں کند　　تیزے کہ روزگار بدو امتحاں کند

ایک بخیل کی ہجو کتنے لطیف پیرایہ میں کہتا ہے ؎

خواجہ در ماہتاب ناں می خورد　　در سرائے کہ ہیچ خلق نبود
سایۂ خویش راکسے پنداشت　　کاسہ از پیش خویشتن بر بود

یعنی خواجہ چاندنی میں ایسے مقام پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے جہاں کوئی نہ ہو۔ وہ اپنے سایہ کو بھی غیر سمجھتا ہے اور اس ڈر سے کہ کوئی ہے کھانے کا برتن چھپا لیتا ہے۔

کمالؔ اصفہانی کا بڑھاپا بڑی تلخی میں گزرا۔ اس عہد کے حاکموں نے بڑی بڑی سختیاں کیں۔ شہاب الدین جس کی مدح میں اس کے کئی قصیدے ملتے ہیں۔ اس سے ناراض ہوا اور اس پر کچھ جرمانہ کر دیا۔ ضیاء الدین جو اس کا افسر ماتحت تھا اس جرمانے کی وصولی میں جبر و تشدد پر اتر آیا۔ کمال الدین نے اس رویہ کے خلاف احتجاج کیا اور کئی قصیدے لکھے۔ مگر حکومت کے رویّے میں فرق نہ آیا۔ وصولی میں زیادہ سختی ہونے لگی۔ اس کے گھر پر سپاہی متعین کر دیئے گئے۔ کمالؔ نے ایک قصیدے میں درخواست کی کہ اس نا روا پابندی کو اٹھایا جائے جب اس کا بھی اثر نہ ہوا تو اس نے ایک نہایت شاندار ہجو ضیاء الدین کی لکھی جس میں اسے چوہا قرار دے کر عجیب و غریب مضمون پیدا کیے۔ ابتدائی اشعار چھوڑ کر ہم صرف اس کا وہ حصّہ نقل کرتے ہیں جس میں موش کی ہجو ہے۔ ؎

آمدم با حدیث موش کہ او   کرد خبث درون خود اظہار
خود بنیہ ازم از بغل گربہ   کنم از ماجرائے موش اظہار
گربۂ روزہ دار بود آں موش   ہم فریبندہ ہم سبک طرّار
موش چوں منقلب شود تو مست   شومیٔ او اثر کند نا چار
ظلمم آں بد کہ شیر مرداں را   بشکنم پنجۂ خرد در پیکار
در خیالم نہ بد کہ خیرہ مرا   قصد موشی چنیں کند انکار
ہر کجا موش اژدہا گردد   عندلیباں شوند بوتیمار
خود گرفتم کہ فارۃ المسک است   کہ زغمازیش نیاید عار
ہم بباید شگافتن شکمش   تا بروں اوفتد ازو اسرار
بخدائیکہ او ز عطسۂ خوک   موش را کند در جہاں دیدار
واجب القتل کرد موشاں را   در بود شاں درون کعبہ قرار
برسولے کہ فتویٰ شرعش   موش را کرد ہم بطویلہ مار
کانچہ گفتند مفسداں بغرض   در ضمیر رہی نہ کرد گزار
بشنو از بندۂ نکتۂ شیریں   کہ خلندہ است در دلم چو خار
گرچہ دنداں موش بس تیز است   تیز تر زاں زبان من صد بار
تو بحق نائب سلیمانی   حق ہر یک بجائے خود بگزار
کارِ موشاں بر آسماں بردی   جانبِ بلبلاں فسرو گلزار

کمال کو مدد معاش کے طور پر سرکار سے غلّہ ملا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اسے گلا سڑا غلہ ملا۔ اس نے طیش میں آ کر یہ قطعہ لکھا ؎

غلّہ کامسال خواجہ داد مرا   گر بہ جملہ بود اکثر خاک
خاکِ مردم خور دندانستم   کہ خورد مردم اے برادر خاک

کردم اندیشہ تا چرا فرمود   خواجہ با گندم برابر خاک
آدمی را چو خاک سیر کند   گرد وجہ غذائے من بر خاک

اس کے کلیات میں شہاب الدین کے نوجیوں کی بھی کئی ہجویں ملتی ہیں، ہم طوالت کے خوف سے انہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔

کمالؔ کے بعد خاکِ ایران نے عبیدؔ زاکانی سے بڑھ کر ہزّال پیدا نہیں کیا۔ وہ علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتا تھا اور شعر بھی خوب کہتا تھا۔ ایک معمولی واقعہ سے اس کی طبیعت میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ اس نے علوم و فنون کو ترک کرکے ہجو اور ہزل گوئی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ کہتا ہے ؎

اے خواجہ مکن تا توانی طالب علم   کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگو پیشہ کن و مطربی آموز   تا دادِ خود از مہتر و کہتر بستانی

کہا جاتا ہے کہ جب عبیدؔ کو مجلسِ شاہی میں باریابی کی امید نہ رہی تو اس نے یہ رباعی کہی ؎

در علم و ہنر مشو چو من صاحبِ فن   تا نزد عزیزاں نشوی خوار چو من
خواہی کہ شوی پسند اربابِ زمن   کنگ آور و کنگری کن و کنگر زن

کنگ، مرد قوی جثہ کو کہتے ہیں۔ کنگرہ ایسا بھک منگا ہوتا ہے جو گھر کے باہر کھڑا ہو کر ناقابلِ برداشت شور مچاتا ہے۔ صاحبِ خانہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس کو کچھ بھیک دے دیتا ہے۔ کنگر ہندوستانی ساز کا نام ہے۔

عبیدؔ زاکانی نے اپنے زمانے کے معاشرے کے خلاف طنز بھی کی ہے۔ اس کی اکثر تصنیفات میں بڑی لطیف اور بسا اوقات بڑی واضح طنزیں پائی جاتی ہیں۔ اخلاق الاشراف، ریش نامہ، تعریفات اور قصہ موش و گربہ کوئی بھی اس سے خالی نہیں، رسالہ موش و گربہ ریاکار زاہدوں پہ ایک بڑی کامیاب طنز ہے۔ یہ نظم ایک سو چوہتر اشعار پر مشتمل ہے۔ شروع میں ایک پُرغرور، تیز نگاہ اور شیر شکار بلی کا نقشہ ہے جس کی آنکھیں کہربا کی سی پلکیں نہایت تیز، پاؤں بچھو جیسے، پیشانی عقاب کی سی، پیٹ طبل جیسا، سینہ قاقم ایسا، دانت تیز اور ابرو کمان کی مانند ہیں ؎

از قضائے فلک یکے گربہ   بود چوں اژدہا بکرمانا
گربہ دور بین و شیر شکار   کہربا چشم و تیز مژگانا
پائے کژدم عقاب پیشانی   بُود پُر مکر و پُر زدستانا
تنگمش طبل و سینہ اش قاقم   ابروش قوس و تیز دندانا

بلی بھوک سے بیتاب ہوتی ہے اور ایک میکدہ کا رُخ کرتی ہے۔ ایک خم کی آڑ میں گھات لگا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اتنے میں ایک چوہا نکلتا ہے۔ پھدکتا کودتا ایک خم کے دہانے پر جا بیٹھتا ہے۔ وہاں شراب پیتا ہے اور بدمست ہو کر چھنکارنے لگتا ہے کہ کہیں ہے بلی؟ میں اس کا سر کاٹوں اور میدان میں گھسیٹ کر لے جاؤں۔ احسان کے روز جب میں داد و دہش پہ آؤں گا تو سو بلیوں کا سر تقسیم کروں گا اگر بلی میدان میں میرے مقابلے کو آئے تو وہ میرے نزدیک گویا ایک کتیا ہے ؎

گفت گربہ تا سرش بکنم   سرِ او را برم بمیدانا !
سرِ صد گربہ را بہ بخشم من   گاہِ بخشش برو زِ احسانا
گربہ در پیشِ من چو سگ باشد   گر شود روبرو بمیدانا

اسے کیا خبر تھی کہ اس کا حریف خُم کے آڑ میں اس کی ڈینگیں سُن رہا ہے یکایک بلّی جھپٹی، اسے پنجوں میں دبوچ لیا اور کہا ہاں اب کہاں جائے گا۔ چوہا اب ہوش میں آیا، بہت گڑگڑایا، کہا میں مست تھا اور مستی میں پتہ نہیں کیا کیا کچھ بک گیا۔ میں تو تیرا غلام ہوں مگر بلّی پر اس کی ان التجاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اسے مار کر کھا گئی۔ فارغ ہو کر وہ مسجد کی طرف روانہ ہوئی تاکہ اس گناہ سے توبہ کرے۔ وہ رو رو کر کہنے لگی ؎

بار الٰہا کہ توبہ کردم من   ندرم موش را بدندانا

گربہ می کرد توبہ در مسجد   یا کریم و قدیم و سبحانا
توبہ بخشی گناہم اے غفار   از گناہ گشتہ ام پشیمانا
درِ مکر و فریب باز نمود   تا بجدّ کہ گشت گریانا

ایک چوہا مسجد کے منبر کے پیچھے بیٹھا اس کی گریہ زاری سُن رہا تھا۔ وہ بلّی کی توبہ سُن کر دوسرے چوہوں کو یہ مژدہ سنانے کے لیے بھاگا ؎

مژدگانی کہ گربہ عابد شد   زاہد و مومن مسلمانا

چوہے بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بلّی کے پاس شربت، شیرینی، پھل، شراب، کباب کے تحفے بھیجے جائیں۔ یہ تحفے سات چوہے لے کر بلّی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بلّی نے انہیں اپنے پاس بلایا اور موقع پا کر پانچ چوہوں کو پکڑ لیا۔ باقی ماندہ چوہے بھاگ نکلے اور یہ بُری خبر چوہوں کو سنائی۔ ایک ہفتہ ماتم کرنے کے بعد تین لاکھ تینتیس ہزار چوہے اپنے بادشاہ کی سرکردگی میں بلّیوں سے لڑنے کے لیے نکلے۔ خونریز جنگ ہوئی، بلّیاں شکست کھا گئیں۔ سرغنہ بلّی گرفتار ہو کر چوہوں کے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئی۔ اسے پھانسی کا حکم دیا گیا۔ مگر بلّی نے اپنے آپ کو چھڑا کر چوہوں کے بادشاہ کو مار دیا اور کچھ چوہوں کو زخمی کر دیا۔ باقی چوہے اِدھر اُدھر نکل گئے۔ عبید اس قصے کو اس شعر پر ختم کرتا ہے ؎

ہست ایں قصہ عجیب و غریب   یادگارِ عبید زاکانا

عبید زاکانی کی دوسری کامیاب تصنیف تحریفات ہے جس میں اس نے اس زمانے کے معاشرہ کے مطابق لوگوں کے اخلاق کا تجزیہ کیا ہے۔ اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ظریف ہی نہ تھا بلکہ اسے اپنے زمانے کے انسانوں کی اخلاقی کمزوریوں کا بھی پورا پورا علم تھا۔ اس میں سے چند نمونے درج ذیل ہیں:۔

فصل اوّل (متعلق دنیا و مافیہا)

الدنیا   آنجا کہ ہیچ آفریدہ در وے نیاساید   ایسی جگہ جہاں کسی مخلوق کو اطمینان و سکون حاصل نہ ہو۔

فصل دوم (ترک اور ان کے دوست)

الیاجوج والماجوج   قوم ترکاں کہ بولایتے متوجہ شوند   یاجوج و ماجوج ان ترک قبائل کو کہتے ہیں جو کسی ملک پر دھاوا کرنے جا رہے ہوں۔

فصل سوم (قاضی اور اس کی صفات)

القاضی	آنکہ ہمہ او را نفریں کنند	جسے تمام لوگ برا کہیں

فصل چہارم (شیوخ اور ان کے مریدین)

الشیخ	ابلیس	معلم الملکوت

فصل پنجم (شرفاء اور ان کی عادات کے متعلق)

اللاف والوقاحت	مایۂ ایشاں	بے باکی و شیخی شرفا کی تجارت کا سرمایہ ہے

فصل ششم (پیشہ ور اور صناع)

البازاری	آنکہ از خدا نہ ترسد	دکاندار وہ ہے جسے خوفِ خدا نہ ہو

فصل ہفتم (شراب اور اس کے لوازم کے بارے میں)

الشراب	مایۂ آشوب	بے چینی اور اضطراب کا سرچشمہ

فصل ہشتم (بھنگ نوشی کے متعلق)

البنگ	آنچہ صوفیاں را بوجد آورد	بھنگ وہ ہے جو صوفیوں کو وجد و مسرت سے لبریز کر دے۔

فصل نہم (صاحبِ خانہ اور اس کے ملحقین)

المجرد	آنکہ بریشِ دنیا خندد	نوجوان یا کنوارا وہ ہے جو دنیا کی داڑھی پہ ہنسے

فصل دہم (مرد عورت کی حقیقی فطرت کے متعلق)

الخاتون	آنکہ معشوق بسیار دارد	خانم کی تعریف یہ ہے کہ اس کے بہت سے خواستگار ہوں۔

عبید زاکانی لاکھ پھکڑ اور مسخرا سہی مگر اس کے کلام کی بے باکی اور طبیعت کی اُپج ایک ایسی صفات ہیں جن کی بناء پر اس کی تصانیف خاص مطالعہ کی محتاج ہیں۔ اس کی تصانیف اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہیں کہ اس زمانے کے اخلاق پر وہ کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ تاتاریوں کے تسلط کے دور میں ایران کی عوامی اور خانگی زندگی پستی کے عمیق ترین گڑھوں میں گر چکی تھی۔ اس نے اس کا تجزیہ ظریفانہ انداز میں کیا ہے تاکہ اس کے ابنائے وطن اس سے عبرت اور بصیرت حاصل کریں۔

شیخ سعدی بہت بڑا مصلحِ قوم اور ملک ہے۔ وہ ان حدود کو پھاند کر اکثر مقامات پہ آفاقی رنگ اختیار کرتا ہے۔ اس کی تصانیف خاص کر گلستان اور بوستان اس قابل ہیں کہ ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔ اس میں طنز کے نشتر بھی ہیں، ظرافت کی چٹکیاں بھی اور کہیں کہیں نہایت لطیف چٹکلے اور لطیفے بھی ہیں جن کے پڑھنے سے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھل جاتی ہے مثلاً

استقلال اور پامردی کے جوہر نمایاں کرنے کے لیے وہ یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں ؎

شبے یاد دارم کہ چشمم نخفت   شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت
کہ من عاشقم گر بسوزم رواست   ترا گریہ و سوز بارے چراست
بگفت اے ہوادار مسکین من   برفت از برم یار شیرین من
تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام   من استادہ ام تا بسوزم تمام
ترا آتشِ عشق اگر پر بسوخت   مرا بیں کہ از پائے تا سر بسوخت

غیبت کی برائی بیان کرنے کے لیے سعدی یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں ؎

طریقت شناساں ثابت قدم   بہ خلوت نشستند چندے بہم
یکے زو میاں غیبت آغاز کرد   در ذکر بیچارۂ باز کرد
کسے گفتش اے یار شوریدہ رنگ   تو ہرگز غزا کردۂ در فرنگ
بگفت از پس چار دیوار خویش   ہمہ عمر ننہادہ ام پائے پیش
چنیں گفت درویش صادق نفس   ندیدم چنیں بخت برگشتہ کس
کہ کافر ز پیکارش ایمن نشست   مسلماں ز جور زبانش نہ رست

یعنی چند آدمی ایک مجلس میں بیٹھے تھے۔ ایک شخص نے کسی کی غیبت شروع کی۔ ایک نیک نفس نے پوچھا کیوں یار کبھی تم نے کافروں سے لڑائی بھی کی ہے؟ اس نے جواب دیا میں نے کبھی گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالا۔ نیک نفس نے کہا، سبحان اللہ! کافر تو آپ کے حملہ سے محفوظ رہے۔ لیکن مسلمان آپ کی تیغِ زبان سے نہ بچ سکے۔

شیخ سعدی مذہبی لوگوں کی تنگ نظری پر طنز کرتے ہوئے نہایت بلیغ انداز میں یہ نکتہ واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ ان کی طرح منتقم ہے اور نہ اس کی رحمت کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص ہے ؎

شنیدم کہ مستی ز تاب نبید   بہ مقصورۂ عابدے برد دید
بنالید بر آستانِ کرم   کہ یارب بہ فردوسِ اعلیٰ برم
مؤذن گریبان گرفتش کہ ہیں   سگ و مسجد اے فارغ از عقل و دیں
چہ شائستہ کردی کہ خواہی بہشت   نمی زیبدت ناز بر روئے زشت
بگفت ایں سخن پیر و بگریست مست   کہ مستم بدار از من اے خواجہ دست
عجب داری از لطف پروردگار   کہ باشد گنہگارے امیدوار
ترا می نگویم کہ عذرم پذیر   درِ توبہ باز است و حق دستگیر
ہمی شرم دارم ز لطفِ کریم   کہ خوانم گنہ پیش عفوش عظیم

یعنی ایک مست نشہ کے زور میں مسجد میں گھس گیا اور رو کر پکارا کہ اے خدا مجھ کو بہشت میں لے جانا۔ مؤذن نے اس کا گریبان پکڑ کر کہا کہ او پلید کتے! مسجد میں تیرا کیا کام؟ تو نے کون سا اچھا عمل کیا ہے کہ بہشت کا دعویٰ کرتا ہے؟ مست رو پڑا، اور بولا کیا آپ کو خدا کے لطفِ عمیم سے یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک گنہگار اس کی مغفرت کا امیدوار ہو۔ میں نے آپ سے تو مغفرت کی خواہش نہیں کی۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور خدا دستگیر ہے۔ مجھ کو تو شرم آتی ہے کہ میں خدا کے عفو کے مقابلہ میں اپنے گناہ کو زیادہ سمجھوں۔

شاہانِ شام میں ملک صالح ایک مشہور بادشاہ گزرا ہے۔ ایک دن وہ بھیس بدل کر شہر کی گشت کو نکلا۔ اس نے ایک مسجد میں دو درویش بیٹھے ہوئے دیکھے۔ بھوک کی تکلیف سے بیتاب تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا آخر قیامت میں کوئی تو حاکم ہو گا۔ اگر یہ بادشاہ لوگ جو دنیا میں عیش و عشرت کر رہے ہیں، غریبوں کے ساتھ بہشت جائیں گے تو میں قبر سے سر نہیں اٹھاؤں گا۔ بہشت ہمارا حصہ ہے کیونکہ ہم اس دنیا میں طرح طرح کے دُکھ جھیل رہے ہیں۔ دوسرا بولا کہ اگر ملک صالح وہاں بہشت کی دیوار کے پاس بھی آگیا تو میں جوتوں سے اس کا سر گنجا کر دوں گا۔ ملک صالح ان کی باتیں سنتا رہا۔ دوسرے دن ان درویشوں کو اپنے حضور طلب کیا۔ ان پر عنایات کی بارش برسائی، ان کی دلجوئی کی۔ ان کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہا کہ میں آج آپ لوگوں کے ساتھ دوستی کا اظہار کرتا اور تواضع سے پیش آ رہا ہوں، آپ بھی قیامت کے روز مجھ پر مہربانی کیجیے اور مجھ کو بہشت میں داخل ہونے سے نہ روکیے۔ اس روایت سے شیخ سعدی یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ دولت مندوں کو غریبوں کے حال سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے اور ساتھ ہی آپ نے یہ بھی دکھایا ہے کہ امیر اس جلن کو جو غریبوں کے دل میں مصیبت کی وجہ سے امیروں کی دولت وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے وقتی طور پر روپے پیسے کی بارش برسا کر بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حکایت کے آخری چند شعر یہ ہیں ؎

روان ہر دو کس را فرستاد و خواند   بہ ہیبت نشست و بحرمت نشاند
بر ایشاں ببارید باران جود   فروشست شاں گرد ذل از وجود
شہنشاہ ز شادی چو گل بر شگفت   بخندید و در روئے درویش گفت
من آں کس نیم کز غرور حشم   ز بیچارگاں روئے درہم کشم
من امروز کردم در صلح باز   تو فردا مکن در بر ویم فراز

سعدی اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے غیبت کرنے والوں پر نہایت لطیف طنز کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب مجھے نماز روزہ کے مسائل سکھایا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے فرمایا کہ روزہ میں دوپہر ڈھلنے کے بعد مسواک کرنا منع ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان مسائل کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ گاؤں کا رئیس جو بہت بوڑھا ہو گیا ہے وہ اس مسئلہ سے ناواقف ہے۔ رئیس نے جب یہ سُنا تو مولوی صاحب کو کہلا بھیجا ؎

نہ مسواک در روزہ گفتی خطا است   بنی آدم مردہ خوردن رواست

یعنی تم نے یہ تو بتا دیا کہ روزے میں مسواک کرنا منع ہے لیکن مردہ گوشت کھانا (غیبت کرنا) کیسے جائز ہو گیا۔)

غرض سعدی کے ہاں طنز اور ظرافت کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ گلستان اور بوستان سے اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔

سعدی کے بعد سلمان خواجو، ناصر بخاری اور اس زمانے کے دیگر شعراء میں ہجو اور ہزل پائی جاتی ہے لیکن ان سب میں کوئی خاص بات نہیں، نہ اس وقت ان کے دیوان موجود ہیں۔ اس لیے ہم انہیں نظر انداز کرتے ہوئے حافظ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حافظ شیرازی کو جو مقام فارسی شاعری میں حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایران اور فارسی زبان اب تک ان کے پایہ کا شاعر پیدا نہیں کر سکی۔ ان کی شاعری سحر حلال ہے، ان کا میدان غزل ہے۔ غزلوں ہی میں انہوں نے دنیا بھر کی باتیں کہہ دی ہیں۔ ان کے ایک معاصر خواجہ عماد فقیہہ تھے۔ انہوں نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ جب وہ نماز پڑھتے تو بلی بھی نماز کے انداز میں ساتھ ساتھ جھکتی تھی اور سر اٹھاتی۔ حافظ نے اس زمانے میں ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ تھا ؎

صوفی بجلوہ آمد و آغاز ناز کرد
بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اس غزل میں عماد فقیہہ کی ریاکاری پہ طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز
غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

علماء سوء اور واعظین کی پردہ دری بھی حافظ کا خاص موضوع ہے جس کی ابتدا خیام نے کی۔ سعدی نے کچھ اور فروغ دیا۔ مگر حافظ نے اسے شرابِ دو آتشہ کر دیا اور بڑی دلیری، بے باکی اور آزادی سے اس ریاکار گروہ پر چوٹیں کیں مثلاً ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند   چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانش مند محفل باز پرس   توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کم تر می کنند
گوئیا باور نمی دارند روزِ داوری   کیں ہمہ قلب و دغا در کار داور می کنند

غلامِ ہمت دُرد کشان یک رنگم   نہ آں گروہ کہ ارزق لباس دل سیہ اند

مے خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب   بہتر ز طاعت کہ بروئے ریا کنند

ترسم کہ صرفۂ نبرد روزِ باز خواست   نانِ حلال شیخ ز آبِ حرام ما

مے خور کہ شیخ و حافظ و قاضی و محتسب   چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

صوفیاں جملہ حریف اند نظر باز ولے   زاں ہمہ حافظِ سودا زدہ بدنام افتاد

زاہدِ شہر چوں مہرِ ملک و شحنہ گزید   من ہم از مہرِ نگار بگزینم چہ شود

یعنی زاہد نے اگر حکومت پرستی اختیار کرلی ہے تو ہم کسی معشوق سے دل لگائیں تو قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ گویا شاہد پرستی حکومت پرستی سے بہتر ہے۔

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے   دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را ۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد   وائے گر در پس امروز بود فردائے

جنگ ہفتاد و دو ملت، ہمہ را عذر بنہ   چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

واعظِ شہر کہ مردم ملکش می خوانند   قولِ ما نیز ہمی است کہ او آدم نیست

یعنی شہر کے واعظ کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں، ہمارا فیصلہ بھی یہی ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے (پھر وہ کیا ہے؟ فرشتہ یا شیطان ؟ یہ آپ خود فیصلہ کریں)

کسی اور شاعر کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو)

آدم از خاک و سید از نور است   آدمیت ز سیداں دور است

گر ز مسجد بخرابات شدیم عیب مگیر   مجلسِ وعظ دراز است و زماں خواہد شد

اسی مضمون کو اردو زبان کے مشہور شاعر قائم چاندپوری نے یوں ادا کیا ہے ؎

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم   یہ ہے میخانہ ابھی ابھی پی کے چلے آتے ہیں

محتسب خم شکست و بندہ سرش   سن بالسن والجروح قصاص

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت   ناخلف باشم اگر من بجوئے نفروشم

حافظؔ کے بعد فارسی شاعری میں ایک سکون سا پیدا ہو گیا۔ ان کے بعد آنے والے شاعر انہی کی تقلید کرتے رہے مگر حافظؔ جیسی بات پیدا نہ ہوئی۔ البتہ دو شاعروں نے ہزل، ہجو اور ظرافت کے میدانوں میں خوب جولانیاں دکھائیں۔ انہوں نے تحریف کو جسے پیروڈی کہتے ہیں اپنایا اور جو کچھ کہنا تھا اسی رنگ میں کہا۔

تحریف کی ابتداء عبیدؔ زاکانی سے ہوئی۔ اس نے اپنے زمانے کے اخلاقِ فاسدہ پر فقرے کسے اور بات سے بات پیدا کی۔ عبیدؔ زاکانی کے بعد نویں صدی ہجری کے آغاز میں ابو اسحاق اطعمہؔ شیرازی پیدا ہوا۔ اس کی شاعری کا موضوع کھانا پینا ہے۔ طعام ہی کی رعایت سے اس لیے اپنا تخلص اطعمہؔ اختیار کیا۔ اس نے اپنی تحریفات میں نہایت اچھوتے انداز میں پہلے شعراء اور صوفیہ پر چوٹیں کی ہیں۔ اس کا کلام اکثر اور بیشتر ہمہ اوست کے فلسفہ کے خلاف ایک طرح کی بغاوت ہے۔ رضا قلی ہدایت لکھتا ہے کہ وہ شاہ نعمت اللہ ولی کا مرید تھا مگر اس کے باوجود اس نے ان کے کلام کی بھی تحریف کی۔ شاہ نعمت اللہ کا مشہور قطعہ ہے ؎

گوہرِ بحرِ بیکراں مائیم   گاہ موجیم گاہ دریائیم
ما بہ دیں آمدیم در دنیا   کہ خدا را بہ خلق بنمائیم

اطعمہؔ نے اس کی تحریف یوں کی ؎

رشتۂ لاکِ معرفت مائیم   گہ خمیدیم و گاہ بنحرائیم
ما ازاں آمدیم در مطبخ   کہ بہ ماہیچہ قلیہ بنمائیم

جب پیرِ طریقت نے اس سے پوچھا کہ کیا تو رشتۂ لاکِ معرفت ہے تو اس نے جواب دیا "جب میں اس قابل نہیں کہ اللہ کی باتیں کروں تو پھر میں نعمت اللہ (رزق) کی باتیں کیوں نہ کروں؟"

بہر حال حالات کچھ ہوں خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ اطعمہؔ میں روحانیت کی بلندئ فکر نہ تھی یا وہ صوفیہ پر چوٹیں کرنی چاہتا ہو۔ اس کے کلام میں ظرافت اور طنز کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اس نے چھبیس کے قریب شعراء کے کلام کی پیروڈی کی ہے اور ایسے ایسے کھانوں کا ذکر کیا ہے جن سے ہمارا تو کیا موجودہ دور کے ایرانیوں کا کام و دہن بھی نا آشنا ہے۔ ہم اس کے چند نمونے یہاں پیش کرتے ہیں۔ تفصیل کے لیے رسالہ اُردو بابت جولائی ۱۹۴۲ء میں محمد داؤد رہبر کا مضمون "فارسی اور اردو میں پیروڈی کا تصور" ملاحظہ فرمائیں۔

فردوسیؔ رزمیہ نگاری کا بادشاہ ہے۔ اطعمہؔ نے فردوسیؔ کے اسلوب کی تحریف کرتے ہوئے ایک "جنگ نامۂ مزعفر و بغرا" لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

بہ نامِ رواں بخشِ روزی رساں   کہ رزقِ آفرین ست پیش از رواں
مرتب کن قوت قبل از وجود   پیاپے دہ لقمہ از خوانِ جود
خورانندۂ مرغ و ماہی و نان   رسانندۂ دست با در دہان
چنانش بہ روزی دہی اہتمام   بود از سرِ لطف و انعامِ عام
کہ چوں طفل آمد ز مادر پدر   عسل در دہاں دیدہ و روغن بہ سر

اس کے بعد مزعفر کے میدانِ جنگ میں جانے کا قصّہ ہے ؎

درآمد مزعفر بہ میداں دلیر   بہ شہدی چو شیرہ بہ رنگی چو سیر
زخوفِ گزند و زبیم ضرر   زناں کردہ بریاں بہ پیش سپر
دراں جمع مدحِ خود آغاز کرد   سر سفرۂ فضل را باز کرد
بہ گفتا منم سفرۂ آرا احید   کہ با داز رخم زخم کاچی بعید
اگر مرغم از بیضہ آید بدر   رواں برکند چشم بغراز سر
اگر از ہری لشکر آرد نخود   دگر از خراساں بہ خواہد مدد
چنانش فرستیم بہ بیستاں   کہ گریند بر وی ہمہ دوستاں

حافظ کے کلام کی بھی اس نے پیروڈی کی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

حافظ	اطعمہ
اگر آں ترکِ شیرازی بہ دست آرد دلِ ما را	بہ پشیم چوں خراسانی گر آری صحن بغرا را
بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را	بہ بوسئے قلیہ اش بخشم سمرقند و بخارا را
زعشقِ ناتمام ما جمالِ یار مستغنی است	چہ آرائی بہ مشک و زعفراں رخسار پالودہ
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را	بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
فغاں کیں لولیانِ شوخ شیریں کار شہر آشوب	جمالِ برۂ بریاں و حسنِ دنبۂ کشکک
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را	چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت	مخلفی سنبوسۂ پر قیمہ در منقار داشت
واندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت	درمیان جوشش روغن نالہائے زار داشت
در نمی گیرد نیاز و عجز با حسنِ دوست	من ز مرغ و حلقہ چی گفتار دارم در دہن
خرم آں کز نازنیناں بخت برخوردار داشت	خرم آں کز نازنیناں بخت برخوردار داشت

دلِ من بہ دورِ رویت زچمن فراغ دارد	دل من بہ دورِ بورک زعدس فراغ دارد
کہ چو سرو پائے بند است و چو لالہ داغ دارد	کہ بہ دنبہ پائے بند است و ز سرکہ داغ دارد

سعدی کے مشہور بہاریہ قصیدہ کی پیروڈی ملاحظہ ہو ؎

سعدی	اطعمہ
خیری و خطمی و نیلوفر و بستاں امروز	گوشت باید کہ مہترا شدہ باشد در دے
نقش ہائے کہ در او خیرہ بہ ماند ابصار	زخم ہائے کہ در و خیرہ بہ ماند ابصار
آں کہ باشد کہ نہ بندد کمرِ طاعت او	کافراز جوشش زنّاج بہ بیند در جوش
جائے آن ست کہ کافر بہ گشاید زنّار	جائے آن ست کہ در دم بہ گشاید زنّار
باد گیسوئے درختانِ چمن شانہ کند	ایں چنیں مرغ مسمّن چو تو ازہم بہ دری
بوئے نسرین و قرنفل بہ دمد در اقطار	بوئے نسرین و قرنفل بہ رود در اقطار
ارغواں ریختہ بر درگہ خضرائے چمن	اندراں لحظہ کہ نا کردہ بسر سفرہ نہند
ہم چناں ست کہ بر تختۂ دیبا دینار	بہ اناں ست کہ بر تختۂ دیبا دینار

خیّام کی رباعی کی تحریف کتنی شگفتہ ہے ؎

خیّام	اطعمہ
اے در رہ بندگیت یکساں کہ و مہ	اے بر سرِ سفرہ ات صلائے کہ و مہ
در ہر دو جہاں خدمت درگاہ تو بہ	در خوانِ تو گشتہ مرغ و ماہی فربہ
نکبت تو ستانی و سعادت تو دہی	کاچی تو ستانی و مزعفر بہ دہی
یارب تو بہ فضلِ خویش بستاں و بدہ	یارب تو بہ فضلِ خویش بستاں و بدہ

اطعمہ کے بعد البسہ کا نمبر آتا ہے۔ اس کا نام نظام الدین محمود قاری یزدی ہے۔ اس نے لباس اور پوشاک کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس میں اطعمہ جیسی جدت طرازی اور شوخی بالکل نہیں۔ اس کے اکثر اشعار پھیکے، بے جان اور بے مزا ہیں۔ ذیل میں اس کے کچھ اشعار درج ہیں ؎

سعدی	البسہ
ارغواں ریختہ بر درگہ خضرائے چمن	کلّہ ہائے کہ براں بالشِ زردوز افتاد
ہم چناں ست کہ بر تختۂ دیبا دینار	ہم چناں ست کہ بر تختۂ دیبا دینار
بادِ گیسوئے درختاں چمن شانہ کند	گر سربستہ والا بہ کشاید خاتون
بوئے نسرین و قرنفل بہ دمد در اقطار	بوئے نسرین و قرنفل بہ رود در اقطار
آنکہ باشد کہ نہ بندد کمرِ طاعت او	کافرہر دامکِ شلوار زر افشاں بندد
جائے آں ست کہ کافر بہ گشاید زنّار	جائے آں ست کہ در دم بہ گشاید زنّار

حافظ	البسہ
رونقِ عہدِ شباب است دگر بستاں را	رونقِ حسنِ بہاری ست دگر کتاں را
می رسد مژدۂ گل بلبلِ خوش الحاں را	گرم بازارِ زِ شمسی شدہ تابستاں را
اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا	ز تبریزہ ار گلیمی نازک آری دربرم مارا
بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را	بہ نقشِ آدہ اش بخشم سمرقند و بخارا را
حدیث از مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو	ز سرِ بقچۂ الباس اہلِ بخل کمتر پرس
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمّارا	کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمّارا

گر من آلودہ دامنم چہ عجب	قاری آں دم کہ رختِ نو پوشید
ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست	ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست

بر سرِ تربتِ ما چوں گزری ہمت خواہ	بر سرِ قبرِ قدک صوفِ مربع فگنید !
کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود	کہ زیارت گاہِ حاجات من آں خواہد بود

اطعمہ کی تقلید میں البسہ نے بھی "جنگ نامۂ صوف و کم خا" لکھا ہے۔ اس کے یہ شعر دیکھیے ؎

بنام خطاپوشِ امروزگار   کہ ستارِ عیب ست بر جرم کار
فگندہ قبا کحلیِ آسماں   ز فضلش بہ خلعتِ زر فشاں

بہ کوہ از کرم رختِ خارا دہد   پر از موجِ جسدی بہ دریا دہد
یکے را کند صوف و اطلس لباس   یکے را دہد پوستک با پلاس
گر آں ست تشریفِ احسانِ اوست   ور انیست بدرخت و عریان اوست

پس آں گہ مقرر شد از داوری   بر افراد ایں خامۂ لشکری
کہ از جنسِ موئینہ و آستر   بود زیرِ شاں اسپہا سر بسر
ازیں رخت ہائے کہ ملدابزیر   بُدزدی شوند ایں زماں بارگیر
نہ گیرند ایں جملہ با خویشتن   دو توئی و یکتائی و پیرہن
تکلتو چنیں گفت با جُل بہ را
کہ آمد کنوں نوبت پائے گاہ

اسی دور میں خواجہ عصمت بخاری نے گھوڑے کی ظریفانہ تصویر کھینچ کر کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں جدّت اور لطافت کے عناصر موجود ہیں۔ نظم بڑی جاندار ہے ؎

روزے بہ بارگاہِ سلیمانِ روزگار   رفتم کہ قبلہ بہ ازاں آستاں نبود
کردم ادا بمدح وثنایش قصیدۂ   کاں نوع دُر بہ مخزنِ آخر زماں نبود
اسپے کرم نمود کہ از جنس وحش و طیر   چوں او ضعیف جانورے درمیاں نبود
اسپے کہ چوں کمان شکستہ وجود او   سرتا قدم بغیر پے و استخواں نبود
از بسکہ گشتہ بود ز غمخوارگی چو روح   ہیچ احتیاج قالب او را بجاں نبود
لب ہا کشادمش کہ بدنداں نظر کنم   چیزے جز آب حسرتش اندر دہاں نبود
گفتم دریں زمانہ بدور کہ آمدے   گفت آں زماں کہ آدم و عالم نشاں نبود
ناگاہش از وزیدن بادی میاں شکست   بیچارہ را تحمل بارِ گراں ، نبود
چوں عاقبت براہِ عدم رفت عقل گفت   مارا ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

دورۂ صفویہ میں ہجو کی خوب گرم بازاری رہی۔ اس دور کے بہت کم شاعر ایسے ہوں گے جن کا دامن اس خارزار میں نہ الجھا ہو۔ مگر ان کی ہجویات اکثر فحش کی سرحدیں پھاند جاتی ہیں۔ حکیم شفائی نہایت فاضل اور متین شخصیت تھے مگر وہ بھی اس حمام میں ننگے نظر آتے ہیں۔ البتہ ہندوستان میں آلِ بابر کی سرپرستی میں جو ادب پیدا ہوا اس میں فحاشی بہت کم ہے۔ عرفی نے گھوڑے اور شال کی ہجو لکھی ہے مگر کیا مجال کہ اس میں کوئی فحش بات ہو۔ وہ ایک مرتبہ بیمار ہوا، کچھ مخلص اور غیر مخلص دوست اس کی بیمار پرسی کے لیے آئے۔ منافقین جس انداز سے اس کی عیادت کرتے تھے اس سے عرفی کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے ایک قطعہ میں یہ سارا واقعہ بیان کرتے ہوئے ان کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ تصویر نہایت عمدہ اور کثافت سے پاک ہے مگر اس وقت کلام سامنے نہیں۔

شیدا فتح آبادی نے ہجو گوئی اور طنز نگاری کو اپنا پیشہ قرار دیا۔ اس نے قدسی کے ایک قصیدہ پر اعتراضات کیے۔ انھیں نظم میں بیان کیا اور کہیں کہیں پھبتیاں بھی کسیں مگر یہ پھبتیاں بھی ایسی ہیں کہ ان پر اخلاق کے نقطۂ نظر سے حرف گیری نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ؎

اے سخن سنج ہنرمند باندیشہ بسنج   نقد ہر حرف بہ میزان خرد بے کم و کاست
نالہ در سینہ ہوائیست کہ بے قصد رود   چونکہ از سینہ ہوا گیر شد از جنس ہواست
عالم از دے نشود تنگ ولیکن ز ملال   خلق عالم گر از و تنگ نشینند بجاست
خود گر فہم کہ جہاں تنگ شد از نالۂ تو   کہ ز تنگئ نظر از چشم نیارد برخاست
نیست ترتیب دو مصراع بہم ربط پذیر   کہ سیاق سخن از ہر دو باندیشہ جداست
تنگئ عالم از نالہ نہ کیفیت اوست   کہ جہاں تنگ ز اندوہ شدہ بر دلہاست

تنگیٔ جا ز کجا تنگیٔ اندوہ کجا   بیشتر از تنِ جاں تفرقۂ ہم پیداست

یہ اعتراضات قدسی کے اس شعر پر ہیں ؎

عالم از نالۂ من بے تو چناں تنگ فضاست
کہ سپند از سرِ آتش نتواند برخاست

طالب آملی کی ہجو میں شیدا کہتا ہے ؎

شب و روز مخدوما طالبا   پئے جیفۂ دنیوی در تگ است
مگر قولِ پیغمبرش یاد نیست   کہ دنیاست مردار طالب سگ است

اس دور میں نعمت خان عالی بہت بڑا ہزال پیدا ہوا۔ وہ ہجویات و طنزیات میں بڑا بلند مقام رکھتا ہے۔ وقائع نعمت خان عالی اس کا شاہکار ہے۔ اس کی کلیات میں ہجو، طنز اور تحریفات کے بڑے نادر نمونے مل سکتے ہیں۔ نعمت خان عالی پر ایک علیحدہ مضمون میں انصاف ہو سکتا ہے۔ اس کی شخصیت عجیب و غریب اضداد کا مجموعہ تھی۔

نعمت خان عالی ہی کے زمانے میں جعفر زٹلی اور میر اثل پیدا ہوئے۔ جعفر زٹل کی کلیات تحریف اور ہجو سے بھری پڑی ہے۔ وہ لفظوں کے ہیر پھیر سے اپنے کلام میں ظرافت پیدا کرتا ہے اور بسا اوقات ہندی الفاظ فارسی کلام میں استعمال کر کے شعر کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔ جیسے ؎

کشتیٔ جعفر زٹلی در بھنور افتادہ است
ڈبکو ڈبکو می کند از یک توجہ پار کن

یا اس کا یہ رجز ؎

من آں رستمِ وقت روئیں تنم   کہ دہ پاپڑ از مشت خود بشکنم
کنم روزن اندر چپاتی بہ تیر   برآرم دمار از سر موز تیر
کشم گردنِ پشہ را در کمند   مگس چند را من در آرم بہ بند
بپوشم اگر جوشنِ جنگ را   ہزیمت دہم پسوے لنگ را
بہ صد حملہ بال مگس بر کنم   قطار دو صد مور برہم زنم
اگر بر زنم پنجہ در دال بھات   فتد ہیبت و خوف من در جہات
دریں دورِ ثانی رستم منم   بتاسا بہ گرزِ گراں بشکنم
بہ ہنگامِ خشم و تردد تلاش   کنم غرق انگشت در دال ماش

من آں شہسوارم کہ روزِ نبرد   برآرم بہ یکمشت از پنبہ گرد
چناں بشکنم رشتۂ خام را   کہ سازم مجل رستم و سام را
من آنم کہ گر اسپ جولاں کنم
چہل ماڈ موش و دیاں کنم

طنز و ظرافت کے سلسلے میں قاآنی شیرازی کا ذکر نہ کرنا سخت ناانصافی ہوگی۔ وہ دورِ قاچار کا ایک نامور عالم اور ایک قادر الکلام شاعر ہے۔ اس کے کلام میں جو سلاست، روانی اور موسیقی ہے وہ بہت کم شعراء کو نصیب ہوئی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑا واقعہ اس انداز اور بے تکلفی سے لکھتا ہے جیسے دو بے تکلف دوست بیٹھے نجی باتیں کر رہے ہیں۔ "پریشان" اس نے گلستان کے جواب میں لکھی۔ اس کے مطالعہ سے اس وقت کے بگڑے ہوئے معاشرے کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ اس میں طنز و ظرافت کے بہترین نمونے ملتے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ اس کا بیشتر حصہ فحش ہے اور اس قابل نہیں کہ اسے یہاں نقل کیا جائے۔

قاآنی نے قصاید میں جا بجا منظر کشی کی ہے۔ کہیں بہار و خزاں کے نقشے ہیں، کہیں ایرانی حمام کا ذکر ہے اور کہیں واعظوں پر چوٹیں ہیں۔ کہیں عشق و عاشقی کی بزم آرائی ہے اور کہیں دیگر واقعات بیان کئے ہیں۔ ان سب میں بے تکلفی کے ساتھ ساتھ ظرافت کے ہلکے ہلکے چھینٹے بھی ہیں۔ اس کی ایک بڑی مشہور نظم ہے جس میں اس نے ایک ہکلے بوڑھے اور ہکلے لڑکے کی باہمی پرلطف گفتگو کا چربہ اتارا ہے۔ یہ نظم قاآنی کی قادر الکلامی کا بہترین نمونہ ہے۔ اسے پڑھتے پڑھتے انسان خود ہکلانے لگتا ہے۔ وہ نظم یہ ہے ؎

پیرکے لال سحر گاہ بطفلے الکن   می شنیدم کہ بدیں نوع ہمی راند سخن
کے ز زلفت صصصبحم شاشاشام تاریک   وے ز چہرت شاشاشامم صصصبحم روشن
تتریاکیم و بے ششہد للبت   صصصبر و تاتاتابم ررر رفت از تتتن
طفل گفتا ممن راتتو تقلید مکن   گگگم شو ز برم اے ککلکمتر از زن
ممیخواہی ممشتی بکلکلت بزنم   کہ بیفتد ممغزت ممیان ددہن
پیر گفتا وو واللہ کہ معلوم است ایں   کہ کہ زادم من بیچارہ ز مادر الکن
ہہہفتاد و ہہشتاد و سہ سال است فزوں   گگگنگ و لالالالم بخلاق زمن
طفل گفتا خخدا را صصصد بار ششکر   کہ برستم بجہاں از مل لال و محن
ممن ہم گگگم ممثل تو تو تو
تو تو تو ہم گگگنگی ممثل ممن

ایران میں ہجو نگاری کا نیا انداز دورِ جدید میں پیدا ہوا۔ جدید شعراء نے سیاسیات اور وطنیات کو موضوع بنا کر بڑی بلند پایہ نظمیں لکھی ہیں۔ کہیں کہیں وہ انہی موضوعات پر ظریفانہ انداز میں معاشرے کی کمزوریوں کو زیرِ بحث لے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں سید

اشرف الدین نسیم شمال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ وہ جدید فارسی میں وہی مقام رکھتے ہیں جو اُردو زبان میں حضرت اکبر الٰہ آبادی کو حاصل ہے۔ ان کے کلام میں ایک نظم "خطاب بہ فرنگیاں" ہے۔ اس میں وہ مسلمانوں کے خیالی پلاؤ پکانے کی عادت پر طنز کرتے اور فرنگیوں کی عملی زندگی سے سبق لینے کی تلقین کرتے ہیں ؎

اے فرنگی ما مسلمانیم جنّت مالِ ماست
در قیامت حور و غلماں ناز و نعمت مالِ ماست

اے فرنگی اتفاق و علم و صنعت مالِ تو   عدل و قانون و مساوات و عدالت مالِ تو
نقلِ عالمگیری و جنگ و جلادت مالِ تو   حرص و بخل و کینہ و بغض و عداوت مالِ ماست
خوابِ راحت، عیش و عشرت، ناز و نعمت مالِ ماست

اے فرنگی از شما باد آں عماراتِ قشنگ   افتتاحِ کارخانہ اختراعاتِ قشنگ
با ادب تحریر کردن آں عباراتِ قشنگ   جہل بیجا، شور و غوغا، فحش و تہمت مالِ ماست
خوابِ راحت، عیش و عشرت، ناز و نعمت مالِ ماست

گر زنی بے سیم از دریا بساحل تلگراف   گر کُنی خلق غراما فون و سیما توگراف
در نمائی بہر خود از اطلس و مخمل لحاف   سندس و استبرق اندر باغِ جنّت مالِ ماست
خوابِ راحت، عیش و عشرت، ناز و نعمت مالِ ماست

اے فرنگی کشتیٔ جنگیٔ دریائی ز تو   راہ آہن علم طے الارض صحرائی ز تو
در ہوا باز در زبلین عرش پیمائی ز تو   در زمیں بیماری و جہل و فلاکت مالِ ماست
استراحت، خوابِ راحت، عیش و عشرت مالِ ماست

اختراعاتِ جدید و علم و صنعت زانِ تو   از زمیں بر آسماں رفتن ز ہمت زانِ تو
مکتب و تشویق بر اطفالِ ملت زانِ تو   غوطہ خوردن اندریں دریائے ذلت مالِ ماست
خوابِ راحت، استراحت، جہل و غفلت مالِ ماست

شیخ عبدالقادر از ما شافعی از ما بود   مالک از ما حنبل از ما یافعی از ما بود
بو حنیفہ بو ہریرہ رافعی از ما بود   اختلاف اعتقادات جماعت مالِ ماست
خوابِ راحت، استراحت، ناز و نعمت مالِ ماست

شیخی از ما بابی از ما پطر و ناپلیون ز تو   دہری از ما صوفی از ما مکتب و قانون ز تو
خرقہ و عمامہ از ما کشتیٔ و بالون ز تو   گم شدہ اے احمق مجاز از تو حقیقت مالِ ماست
حور و غلماں باغِ رضواں عیش و عشرت مالِ ماست

آں شنیدستم حسین کرد با جنگ نبرد   شد رواں از اصفہاں ہندوستاں را فتح کرد

درفرنگستان کجا دارد چنیں شیراں مرد   رستم و گودرزِ یل باآں شجاعت مالِ ماست
خوابِ راحت، استراحت، نازونعمت مالِ ماست
گرچہ در ظاہر مسلمانیم باطن کافریم   منکرِ حق، خصمِ دیں، غافل ز روزِ محشریم
مالِ موقوفات را چوں شیرِ مادر می خوریم   با دریاں گفتگوئے رمزِ خلوت مالِ ماست
باغِ رضواں، حور و غلماں، نازونعمت مالِ ماست

فکاہیات میں میرزا غلام رضا خاں روحانی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نے تحریف کے علاوہ بعض نہایت عمدہ ظریفانہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً وہ اہلِ ایران کی کاہلی کے بارے میں کہتا ہے ؎

اروپائی اگر از صفحۂ خاک   رود با آسماں پیما با فلاک
ازو گم نیست ایرانی کہ دائم   کند سیرِ فلک با چرس و تریاک
زحالِ کشورِ ایراں چہ گویم   چہ می پرسی ازیں وضعِ اسفناک
ستم کش را بود خونابہ در دل   ستمگر را بود در شیشہ کیناک
زند مفلس لبہ از دستِ منعم   کند زارع فغاں از ظلمِ ملاک
نشانی از درفشِ کاویاں نیست   کہ گیرد دادِ مظلوماں ز ضحاک
اثاثی در سرائے کشورِ جم   نماند از غارتِ دزدانِ چالاک
ندانم از جبینِ شیخ و زاہد   چہ وقت ایں داغِ رسوائی شود پاک
سخن از فضل و دانش چند گوئی   بقومے بے خبر از عقل و ادراک
لب از گفتارِ روحانی فرو بند
دہانت را بزن مہر و بکن لاک

اہلِ ایران میں افیون خوری کی عادت عام تھی۔ روحانی نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے ظریفانہ انداز میں کہا ؎

مردیم از خماری ہمشیرگاں خدارا   از یک دو بست شیرہ سازید نشہ مارا
دہ روزہ مہرِ گردوں افسانہ است افسوں   مرفین بجائے افیوں تزریق ساز یارا
آسائشِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است   با شیرہ مروت با الکلی مدارا
قلیان چرس بکش آنگہ سکندری خور   تا بر تو عرضہ دارد احوالِ ملکِ دارا
من مست بودم از مے کردم بدامنت قے   اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا
از دودِ وحدتِ ما گر جرعۂ بنوشند   در وجد و حالت آرد زندانِ باصفا را
چوں لبت گندہ بستی فوری بزن دو دستی   کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

مارا قضا کشانید پائے چراغ شیرہ	گر تو نمی پسندی تغیر دہ قضا را
اے منعمی کرداری درخانہ چرس وافیون	روزے تفقدی کن درویش بے نوا را
افیونیان برنا بخشندگان عمراند	ساقی بشارتے دہ پیرانِ پارسا را
چون شد بشیرہ معتاد لاغر شود چو مولے	دلبر کہ در کفِ او موم است سنگِ خارا
دوشینہ با حسن لات رفتیم در خرابات	باشد کہ باز بینیم دیدارِ آشنا را
رندی بہ آہ و زاری میخواند در خماری	ہات الصبوح وحیوا یا ایہا السکارا
در موقعِ خماری کیفیت نگاری	اشہے لنا واحلیٰ من قبلۃ العذارا
رندی بہ بارگندم پنہاں نمود تریاک	دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا
آن بار را مفتش بوبرد و کرد توقیف	چون بہر کشف قاچاق می گشت بار ہا را

تریاک و شیرۂ مفت صد بار ہست خوشتر
از ہستیٔ دو عالم تریاکیٔ گدا را

اہلِ ایران کی گھریلو زندگی کا ایک خوش رنگ منظر اس طرح پیش کرتے ہیں: ؎

شبِ عید است و گرفتار زن خویشتنم	داد از دست زنم
او ست جفتِ من و من جفتِ ملال و محنم	داد از دست زنم
ہم کرب ثرائزہ زمن خواہد و ہم ترسہ دوال[1]	مد[2] و فندم[3] اسالی
خود نہ شلوار بپایم نہ قبائے بہ تنم	داد از دست زنم
گیوہ ام پارہ شدہ وین زن بدتر از دیو	کفش خواہد از گیو
من نہ حاجی فرخ آقا و نہ حاجی حسنم	داد از دست زنم
پائے من ماندہ چو خر در گلِ و دل گشتہ بریش	او بفکر خویش
گویدم عطر کشی خر کہ بزلفم بزنم	داد از دست زنم
مشہدی باقر ہیزم شکن امروز زنش	رختِ نو کردہ تنش
من نہ کمتر ز زنِ باقر ہیزم شکنم	داد از دست زنم
گفت بہر سر طلسم تو کلہ گیس بخر	مد پاریس بخر
گفتمش از ہمہ کس لات تر امروز منم	داد از دست زنم
گفت اگر پول نداری ز چہ ہستی زندہ	من شدم شرمندہ
گفتمش زندہ از آنم کہ نباشد کفنم	داد از دست زنم

۱؎ انواع و اقسام پارچہ جات ۲؎ وضع و اسلوب ۳؎ شکل و ترتیب

منکہ از دست زنم حوصلہ ام تنگ شدہ   کلّہ ام سنگ شدہ
میکنم پارہ ز دستش بخشۂ پیرہنم   داد از دست زنم
گفتہ بودم کہ نگیرم زن تا گردم پیر   پدرم گفت بگیر
گفتم این لقمہ بزرگ است برائے دہنم   داد از دست زنم
خواست جوراب فرنگی کہ برائش بخرم   بتود سیم و زرم
وطنی گر بخرم دور کند از وطنم   داد از دست زنم
سر جوراب کرم معرکہ برپا کردیم   جنگ و دعوا کردیم
موئے من کند و تف افگند بریش بنہم   داد از دست زنم
گشت از خانۂ ما شیون و فریاد بلند   داد و بیداد بلند
مشت زد بر دہنم آخ دہنم واخ دہنم   داد از دست زنم

ملک الشعرا، مرزا محمد تقی بہارؔ مشہدی جدید ایران کے زبردست انقلابی شاعر ہیں۔ آپ کا دیوان ۲۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں قصاید، غزلیات، مثنویات، رباعیات و قطعات سب موجود ہیں۔ آپ نے ایک نظم "گل" (کیچڑ) کے بیان میں لکھی ہے۔ اس نظم کے ذریعے انہوں نے بلدیہ کی توجہ شہر کی صفائی کی طرف دلائی ہے۔ نظم کا انداز پُر لطف ہے اور ہر شعر بلدیہ کے لیے تیر و نشتر ہے

افتاد ایم سخت بدام بلائے گل   یارب چو مباد کسے مبتلائے گل !!
گل مشکلے شدہ است بہر معبر و طریق   گام روندگان شدہ مشکل کشائے گل
ہر گہ کہ ابر خیمہ زند در فضائے شہر   بہ بام ہر سرائے برآید لوائے گل
گل دل نمی کند خراسان و اہل او   اے جان اہل شہر فدائے وفائے گل
گر صد ہزار کفش بدرد بپائے خلق   ہرگز نمی رسند بہ کشف عطائے گل
با خضر اگر روند بہ ظلمات کوچہ خلق   اسکندری خورند درین چشم ہائے گل
اول قدم کہ بوسہ زند گل بہ پائے ما   رفتیم بہ زمین و ببوسیم پائے گل
گلہا تقبیل و درہم و کوچہ خراب و تنگ   آہ از جفائے کوچہ و داد از جفائے گل
گل ہر چہ را بہ پنجہ درآورد ول نکرد   صد آفریں بہ پنجۂ معجز نمائے گل
از گل ز بس کہ خاطر و دلہا افسردہ است   گل نیز بعد ازیں نہ دمد از فضائے گل
بر روزگار خویش کنم گریہ بامداد   چوں بنگرم بخندۂ دنداں نمائے گل
از پشت تا بہ شانہ و از پیش تا بہ ریش   ہستند خلق یکسرہ غرق غطائے گل
امروز در قلمرو طوس از بلند و پست   آنجایگہ کجاست کہ خالی ست جائے گل

آید اگر جہاز زرہ پوش ز انگلینڈ   حیراں شود ز لجۂ بے منتہائے گل
گرلای وگل تمام نگردد ازیں بلد   اہلِ بلد تمام بمانند لائے گل
شرم آیدم ز گفتنِ بسیار ورنہ باز
چندیں ہزار مسئلہ باشد ورائے گل

جدید شعراء میں اور بھی کئی ایسے ہیں جنھوں تے اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر اس وقت ان کا کلام سامنے نہیں۔ اس لیے مجبوراً ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ورنہ ان میں بعض بڑے کام کی چیزیں ہیں جن میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی۔

جدید فارسی شاعری میں ایک بات خاص طور پہ قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے کا ایرانی اس قدر وطن پرست بن چکا ہے کہ وہ ایران ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور ایرانی عصبیت کا شکار ہو کر ایران کے قدیم مشاہیر کی عظمت کے ترانے گاتا ہے۔ قدیم ایران کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ رشتے جوڑتا ہے۔ کہیں وہ خاکِ ایران کے عنوان پر نظم لکھتا ہے اور آوستہ اور ایرانی آتش کدوں کے مٹ جانے پہ آنسو بہاتا ہے اور بسا اوقات اعتدال کی حد سے تجاوز کر کے عربوں کی ہجو پر اتر آتا ہے۔ مثلاً فرخ خراسانی ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

یارب عرب مباد و دیارِ عرب مباد
ایں مرض شوم و مردم دور از ادب مباد
ایں قوم دوں و دزد گدا راز کردگار
جز لعنت و عذاب و بلا و غضب مباد
تنہا ہمیں عراق نہ ہر جا عرب کدہ
نجد و حجاز و تونس و مصر و حلب مباد

یہ ایران کی ظریفانہ شاعری کا مجمل سا خاکہ ہے جو بڑی عجلت میں تیار کیا گیا ہے۔ جن شاعروں کا یہاں اجمالاً ذکر کیا گیا ہے وہ اس قابل ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ مقالہ لکھا جائے۔ پھر کہیں جا کر فارسی زبان کے طنز و مزاح کی عظمت کا پتہ چل سکتا ہے۔

(انگریزی)

بروبڈنگ نیگ کا سفر

مصنفہ:- جوناتھن سوئفٹ

مترجمہ:- شاہد احمد دہلوی

دوسرا باب

کسان کی لڑکی کا بیان۔ مصنف کو منڈی والے شہر لے جایا جاتا ہے اور پھر راجدھانی میں۔ اس کے سفر کے حالات۔

میری مالک کی ایک لڑکی ۹ سال کی تھی۔ یہ بچّی اپنی عمر سے زیادہ مستعد تھی۔ سوزن کاری میں بڑی چابکدست اور اپنے بچّے کو کپڑے پہنانے میں نہایت ہوشیار۔ میرے رات کو سونے کے لیے ماں بیٹی نے بچے کا ایک پالنا جوڑ جاڑ کر ٹھیک کر دیا۔ ایک الماری کے چھوٹے خانے میں اس پالنے کو رکھ دیا۔ اور چوہوں کے ڈر سے اس خانے کو ایک چھینکے پر رکھ دیا۔ جتنے عرصے میں اِن لوگوں کے ہاں رہا یہی میرا بستر تھا اور جیسے جیسے میں ان کی زبان سیکھتا گیا اور اپنی ضروریات انھیں بتاتا گیا میرا بستر زیادہ آرام دہ ہوتا گیا۔ یہ کم عمر لڑکی اس قدر تیز دست تھی کہ مجھے وہ ایک دفعہ کپڑے اتارتے دیکھ کر خود ہی مجھے کپڑے پہنانے اور اتارنے لگی، حالانکہ میں نے اس کام کی اسے زحمت نہیں دی تھی اور خود ہی اپنے کپڑے پہنتا اور اتارتا تھا۔ اس نے مجھے سات قمیصیں بنا کر دیں اور سوتی کپڑے کی چند اور چیزیں بھی۔ یہ کپڑا دہ باریک سے باریک دیکھ کر لائی تھی مگر دراصل یہ ٹاٹ سے بھی زیادہ موٹا تھا۔ اور میرے یہ کپڑے ایک ساں اپنے ہاتھوں سے دھوئے جاتی تھی۔ ساتھ کے ساتھ وہ میری استانی بھی تھی۔ اور مجھے اپنی زبان سکھایا کرتی۔ جب میں کسی چیز کی طرف اشارہ کرتا تو اس کا نام اپنی زبان میں مجھے بتاتی۔ یوں تھوڑے ہی دنوں میں مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی نام لے کر مانگنے لگا۔ یہ لڑکی بڑی اچھی طبیعت کی تھی اور چالیس فٹ سے زیادہ اس کا قد نہیں تھا جو عمر کے لحاظ سے کم تھا۔ اس نے میرا نام گرل ڈریگ رکھا۔ گھر بھر میں میرا یہی نام پڑ گیا۔ اور پھر ساری مملکت میں بھی یہی مشہور ہو گیا۔ اس لفظ کے معنی وہی ہیں جو لاطینی میں نانن کیولس کے، اطالوی میں ہومن سی لیطینو کے اور انگریزی میں انسانچہ کے۔ اس ملک میں میری حفاظت بیشتر اسی لڑکی نے کی۔ جب تک میں وہاں رہا ہم دونوں کبھی جدا نہیں ہوئے۔ میں اسے اپنی گلم ڈل کلیچ یا چھوٹی دوا کہا کرتا تھا۔ اگر میں اس کی توجہ اور محبت کا تذکرہ اعزاز کے ساتھ نہ کروں تو میں ایک بڑی احسان ناشناسی کا خطاوار ہوں گا، کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا کہ اس کا صلہ اسے دے سکتا جس کی وہ مستحق تھی۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے بجائے میں نادانستہ طور پر اس کی بدنامی کا افسوس ناک ذریعہ بنا۔

اب پاس پڑوس میں چرچہ ہونے لگا کہ میرے آقا کو کھیت میں سے ایک عجیب جانور ملا ہے۔ قد و قامت میں اسپلاک نک کے برابر۔ لیکن سارے اعضاء انسانوں جیسے اور تمام کاموں میں انسانوں ہی کی نقل کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اپنی زبان

بھی بولتا ہے۔ ہمارے بھی کئی لفظ سیکھ گیا ہے۔ دو پاؤں پر چلتا ہے۔ مسکین ہے اور ہل گیا ہے۔ بلانے سے آجاتا ہے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ ہاتھ پاؤں بڑے سڈول اور خوشنما۔ رنگ کسی نجیب کی سہ سالہ لڑکی سے زیادہ اجلا۔ ایک کاشتکار جو قریب ہی رہتا تھا اور میرے آقا کا خاص دوست تھا۔ اس کہانی کی تصدیق کرنے بالقصد آیا۔ مجھے فوراً لا کر ایک میز پر رکھ دیا گیا۔ میں حسب الحکم چلتا پھرتا رہا۔ اپنا نیمچہ سونت کر دکھایا اور اسے پھر نیام کیا۔ اپنے آقا کے مہمان کی خدمت میں آداب بجالایا۔ اسی کی زبان میں مزاج پرسی کی، اسے خوش آمدید کہا بالکل اسی طرح جس طرح میری چھوٹی دُدا نے مجھے بتایا تھا۔ یہ شخص بڈھا تھا اور اسے دھندلا نظر آتا تھا۔ مجھے اچھی طرح دیکھنے کے لیے اس نے اپنی عینک لگائی۔ اس پر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ اور خوب ہنسا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے کسی کمرے کی دو کھڑکیوں میں سے پورا چاند جھانک رہا ہو۔ ہمارے گھر کے لوگوں نے میری ہنسی کی وجہ کو تاڑ لیا اور لگے میرے ساتھ ہنسنے۔ اس پر کم عقلی سے وہ بڈھا خفا ہو گیا اور اس کا منہ بگڑ گیا۔ وہ بڑا خسیس آدمی تھا اور اس مضحکہ کا سزاوار تھا۔ اس وجہ سے بھی کہ اس نے میری بدنصیبی دیکھیے، میرے آقا کو مشورہ دیا کہ برابر والے شہر میں جب بازار لگے تو وہاں میری نمائش کرے۔ گھوڑے پر وہاں جانے میں آدھ گھنٹہ لگتا تھا کوئی دو سو میل کا فاصلہ ہوگا ہمارے گھر سے۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے آقا اور اس کے دوست میں سرگوشیاں ہوتے چلی جا رہی ہیں اور کبھی کبھی میری طرف اشارہ بھی کیا جا رہا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا، اور میرے اندیشوں نے مجھے سمجھایا کہ میں نے ان کے چند الفاظ سُن لیے ہیں اور سمجھ لیے ہیں۔ لیکن اگلے دن صبح کو میری چھوٹی دُدا گلم دل کلیچ نے سارا ماجرا مجھ سے بیان کیا۔ اس نے اپنی چالاکی سے پوری بات اپنی ماں سے پوچھ لی تھی۔ بچاری لڑکی نے مجھے اپنے سینے پر لٹا لیا اور مارے شرم اور رنج کے رونے لگی۔ اسے ڈر تھا کہ بیہودہ اور جاہل لوگوں سے مجھے دکھ پہنچے گا۔ وہ شاید مٹھی میں مجھے بھینچ کر میرا دم ہی نہ نکال دیں۔ یا ان کے ہاتھوں میں پڑ جانے کے بعد میرا کوئی ہاتھ پاؤں ہی نہ ٹوٹ جائے۔ اس نے خوب جانچ لیا تھا کہ میں فطرۃً کس قدر شرمیلا ہوں۔ اپنی عزت کا مجھے کتنا پاس ہے۔ اور جب گھٹیا سے گھٹیا لوگوں کے سامنے پیسے کمانے کی غرض سے مجھے تماشہ بنایا جائے گا تو میں کس قدر پیچ و تاب کھاؤں گا۔ اس نے کہا ” ابّی اور امّی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ گرل طورگ تمہارا ہوگا لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے مجھ سے وہی چال چلی جو پچھلے سال چلی تھی کہ بھیڑ کا بچہ مجھے دینے کا وعدہ کیا مگر جب وہ خوب موٹا تازہ ہوگیا تو اسے قصائی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔“ سچّی بات یہ ہے کہ میں اپنے متعلق اتنا پریشان نہیں تھا جتنی چھوٹی دُدا میرے لیے پریشان تھی۔ مجھے ہمیشہ پکی امید رہی کہ ایک نہ ایک دن مجھے دوبارہ آزادی مل جائے گی۔ رہی یہ ذلت کہ مجھے ایک عجوبہ بنا کر جگہ جگہ میری نمائش کی جائے تو میں اس ملک میں بالکل اجنبی تھا اور اگر میں کبھی انگلستان واپس پہنچ سکا تو میری اس بدنصیبی کو میری کوتاہی قرار دے کر مجھے متہم نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اگر میرے بدلے برطانیہ عظمیٰ کا بادشاہ خود بھی ہوتا تو ان حالات میں اسے بھی اسی اذیت سے گزرنا پڑتا۔

میرے آقا نے اپنے دوست کے مشورے کے مطابق مجھے ایک بکس میں رکھا اور بازار لگنے والے دن برابر والے شہر کو لے چلا۔ اپنے پیچھے کاٹھی پر اپنی بیٹی میری چھوٹی دُدا کو بٹھا لیا۔ بکس چاروں طرف سے بند تھا، میرے اندر جانے اور باہر نکلنے کے لیے اس میں ایک دروازہ تھا اور برمے کے چند سوراخ ہوا کے لیے تھے۔ لڑکی نے اتنی احتیاط برتی کہ اس میں اپنے

بچے کا نہالچہ بچھا دیا تاکہ میں اس پر پڑا رہوں۔ یہ سفر اگرچہ صرف آدھ گھنٹے کا تھا۔ لیکن میری چول چول ہل گئی، کیونکہ گھوڑا ایک قدم میں کوئی چالیس فٹ نکال جاتا، اور ڈولی چلنے میں اتنا اونچا اچھلتا کہ اس کا زیر و بم اس جہاز کی طرح ہوتا جو بڑے طوفان میں پھنس گیا ہو۔ مگر جھکولے اس سے کہیں زیادہ لگ رہے تھے۔ یہ سفر لندن سے سینٹ ایلباکنز کے فاصلہ سے کچھ زیادہ تھا۔ راستہ میں میرا آقا ایک سرائے میں اتر گیا۔ اس میں وہ اکثر آتا رہتا تھا۔ سرائے والے سے کچھ دیر مشورہ کرنے کے بعد اور کچھ ضروری تیاری سے فارغ ہو کر اس نے ایک گرلتر دیا۔ منادی کو اجرت پہ اپنے ساتھ لیا تاکہ شہر میں منادی کرتا چلے کہ ایک عجیب و غریب مخلوق سبز شاہین کی سرائے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کا قد و قامت اسپلاک تک جتنا ہے (اس ملک کا ایک خوش وضع جانور جس کا طول تقریباً چھ فٹ ہوتا ہے) اور اس کے سارے اعضاء انسانوں جیسے ہیں۔ کئی لفظ بول سکتا ہے اور ایک سو تفریحی کرتب دکھاتا ہے۔

سرائے کے سب سے بڑے کمرے میں مجھے ایک میز پر رکھ دیا گیا جس کا رقبہ کوئی تین سو مربع فٹ ہوگا۔ میز کے قریب ایک نیچے اسٹول پر میری چھوٹی ددا کھڑی ہو گئی تاکہ میری حفاظت کرے اور بتاتی جائے کہ میں کیا کروں۔ بھیڑ بھڑکے سے بچنے کے لیے میرے آقا نے صرف تیس تیس آدمیوں کو ایک وقت میں اندر آ کر مجھے دیکھنے دیا۔ لڑکی کے حکم کے مطابق میں میز پر چلتا رہا۔ اس نے مجھ سے ایسے سوال پوچھے جنھیں وہ جانتی تھی کہ میں ان کی زبان میں سمجھ لوں گا اور میں پوری آواز سے ان کے جواب دیتا رہا۔ بار بار میں تماشائیوں کی طرف دیکھتا اور آداب بجا لاتا۔ ان کا خیر مقدم کرتا اور جو تقریریں مجھے سکھائی گئی تھیں ان کے سامنے کرتا۔ میں نے شراب سے بھرا ہوا ایک انگشتانہ اٹھایا جو گلم ڈل کلیچ نے مجھے پیالہ دیا تھا اور تماشائیوں کا جام صحت نوش کیا۔ میں نے اپنا نیمچہ کھینچ لیا اور انگلستان کے تلوار بازوں کی طرح ہاتھ دکھانے لگا۔ چھوٹی ددا نے مجھے تنکے کا ایک ٹکڑا دیا اور میں نے اس سے نیزے کے کمالات دکھائے۔ میں نے جوانی میں انہیں سیکھا تھا۔ اس دن بارہ ٹکڑیوں کو میرا تماشہ دکھایا گیا اور اتنی ہی بار مجھے مجبوراً یہی ڈھکوسلے دکھانے پڑے جن سے تنگ آ کر اور تھک کر میں نیم جان ہو گیا کیونکہ جنہوں نے مجھے دیکھا انھوں نے ایسے عجیب و غریب بیان دیئے کہ اندر آنے کے لیے لوگ دروازے توڑے ڈال رہے تھے۔ میرے آقا نے اپنے بھلے کے لیے سوائے چھوٹی ددا کے کسی اور کو مجھے چھونے نہیں دیا اور میز کے چاروں طرف بنچیں اتنے فاصلے سے لگائیں کہ مجھ تک کسی کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ لیکن ایک شریر سکول کے لڑکے نے ایک ہیزل کی ڈلی میرے سر کو تاک کر ماری مگر میں بال بال بچ گیا ورنہ وہ اس قدر زور سے آئی تھی کہ بلاشبہ میرا مغز پھاڑ دیتی، کیونکہ وہ چھوٹے میٹھے گھیئے کے برابر تھی۔ مگر مجھے بڑی طمانیت ہوئی — یہ دیکھ کر اس شیطان کی خوب ٹھنکائی ہوئی اور اسے باہر نکال دیا گیا۔

میرے آقا نے منادی کرا دی کہ اب میری نمائش اگلے بازار کے دن ہوگی۔ اس وقفے میں اس نے میرے لیے ایک زیادہ آرام دہ بکس تیار کیا۔ اس کی ضرورت کا احساس اس نے خود بھی کر لیا تھا۔ کیونکہ پہلے سفر میں میں اس قدر تھک گیا تھا اور مسلسل آٹھ گھنٹے تماشائیوں کو خوش کرنے میں میرا جسم اتنا چور ہو گیا تھا کہ مجھ سے نہ تو اپنے پیروں پر کھڑا ہوا جاتا تھا اور نہ ایک لفظ میرے منہ سے نکلتا تھا۔ تین دن میں کہیں جا کر میں ساؤنٹا ہوا۔ مگر گھر پہ بھی مجھے آرام نہ مل سکا کیونکہ سو سو میل کے قریب بسنے والے شرفا نے میری شہرت سن کر مجھے دیکھنے میرے آقا کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ تیس آدمیوں سے کم نہیں ہوں گے جو

اپنے بیوی بچے لے کر پہنچ لیئے کیونکہ ملک بہت آباد ہے، جب میرا آقا اپنے گھر پر میری نمائش کرتا تو دیکھنے والا چاہے ایک ہی خاندان ہو پورے کمرے کی قیمت اس سے وصول کر لیتا۔ لہٰذا کچھ عرصہ تک مجھے ہفتہ میں ایک دن بھی آرام نہیں ملا۔ سوائے چہارشنبہ کے، جو ان کا یوم سبت ہوتا ہے، حالانکہ شہر بھی مجھے نہیں لے جایا گیا۔

میرے آقا نے یہ دیکھ کر کہ میں کس قدر نفع بخش ثابت ہو رہا ہوں طے کیا کہ مجھے مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں لے جائے۔ لہٰذا لمبے سفر کے لیے ضروری سامان مہیا کر لینے اور اپنے گھر کے معاملات طے کر لینے کے بعد اس نے اپنی بیوی سے رخصت لی اور ۱۷ اگست ۱۷۰۳ء کو میرے یہاں آنے کے دو مہینے بعد ہم دارالحکومت کے لیے روانہ ہو گئے جو مملکت کے وسط میں واقع ہے اور ہمارے گھر سے کوئی تین ہزار میل کے فاصلے پر۔ میرے آقا نے اپنی بیٹی گلم ڈل کلیچ کو اپنے پیچھے سوار کر لیا۔ اس نے میرا بکس اپنی گود میں رکھ لیا اور بکس کو اپنی کمر سے باندھ لیا۔ لڑکی نے اس بکس میں چاروں طرف نرم سے نرم کپڑے کی تہہ لگا دی تھی اور نیچے روئی کا گدا رکھ دیا تھا اور اوپر اپنے بچے کا بستر لگا دیا تھا۔ میرے لیے کپڑے اور ضروریات کی دوسری چیزیں ساتھ لے لی تھیں اور جہاں تک ممکن تھا میری آسائش کا انتظام کر لیا تھا۔ ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں تھا، بس گھر کا ایک چھوکرا تھا جو ہمارے پیچھے پیچھے گھوڑے پر سامان لادے چلتا تھا۔

میرے آقا کا ارادہ مجھے ان تمام شہروں میں دکھانے کا تھا جو راستہ میں آتے تھے، مگر شاہراہ چھوڑ کر سو پچاس میل اندر دیہات کے رئیس کے ہاں پہنچ جاتا، بشرطیکہ اسے وہاں سے رقم ملنے کی توقع ہوتی۔ ہم آسانی سے سوا سو ڈیڑھ سو میل روزانہ طے کر لیتے تھے۔ گلم ڈل کلیچ مجھے تکلیف سے بچانے کے خیال سے شکوہ کرنے لگتی کہ گھوڑے کی دلکی نے مجھے تھکا دیا۔ میری خواہش پر مجھے اکثر میرے بکس میں سے ہوا کھلانے کے لیے نکالتی اور مجھے ملک کی سیر کراتی۔ لیکن میرے کمر تسموں کو مضبوطی سے تھامے رہتی۔ ہم نے پانچ یا چھ دریا عبور کیے جو نیل اور گنگا سے کہیں گہرے اور چوڑے تھے۔ اور شاید ہی کوئی ندی اتنی چھوٹی ہمیں نظر آئی ہو جتنی لندن کے پل کے قریب ٹیمز دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے سفر میں دس ہفتے گزر گئے اور بڑے دیہاتیوں اور رئیسوں کے علاوہ اٹھارہ بڑے شہروں میں میری نمائش کی گئی۔

اکتوبر کے چھبیسویں دن ہم دارالحکومت میں پہنچے جسے وہ اپنی زبان میں لوربرل گرد یا فخرِ کائنات کہتے ہیں۔ میرے آقا نے خاص بازار میں رہنے کی جگہ لی۔ یہاں سے شاہی محل زیادہ دور نہیں تھا۔ حسبِ معمول اشتہار جاری کیے جن میں میرا پورا حلیہ درج کیا۔ تین چار سو فٹ چوڑا اتنا سا کمرہ کرایہ پر لیا۔ میری اداکاری کے لیے ساٹھ فٹ قطر کی اس میں ایک میز لگائی اور اس کے کنارے سے تین فٹ اندر کی طرف تین ہی فٹ اونچا کٹہرا لگایا تاکہ میں میز پر سے گرنے نہ پاؤں۔ روزانہ دس مرتبہ میری نمائش کی جاتی۔ لوگ حیرت سے دیکھتے اور خوش ہو کر جاتے۔ میں اب ان کی زبان اچھی خاصی بولنے لگا تھا اور جو کچھ مجھ سے کہا جاتا اس کا ایک ایک لفظ سمجھ لیتا۔ اس کے علاوہ میں نے ان کے حروفِ تہجی سیکھ لیے تھے اور فقرے لکھنے لگا تھا۔ کیونکہ گلم ڈل کلیچ مجھے گھر پہ بھی پڑھاتی رہتی تھی اور دورانِ سفر فرصت کے اوقات میں بھی۔ اس کی جیب میں ایک چھوٹی سی کتاب رہتی تھی۔ ہمارے ہاں کے سال سن کے نقشوں کے مجموعے برابر کم عمر لڑکیوں کے لیے یہ ایک عام کتابچہ تھا جس میں ان کے مذہب کا مختصر بیان درج تھا۔ اس میں سے اس نے مجھے حروف سکھائے اور الفاظ کے معنی بتاتی رہتی۔

للّی پٹ کا سفر

مصنفہ :- جوناتھن سوئفٹ

مترجمہ :- شاھد احمد دہلوی

چھٹا باب

للّی پٹ کے باشندوں کے متعلق، ان کی تعلیم، قوانین اور
رسم و رواج - بچّوں کا طریقۂ تعلیم - اس ملک میں مصنّف کا
طرزِ زندگی - اس کا معزز خاتون کو الزامات سے بری ثابت کرنا۔

میرا ارادہ اگرچہ یہ ہے کہ اس مملکت کا حال ایک علیحدہ کتاب میں لکھوں۔ تاہم پڑھنے والوں کے اشتیاق کی تسکین کے لیے میں فی الحال چند عام باتیں لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہاں کے باشندوں کا قد چونکہ عموماً چھ انچ سے کم ہی ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں کے جانور، پودے، درخت بھی قد و قامت میں عین اسی مناسبت سے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اونچے سے اونچے گھوڑے اور بیل چار اور پانچ انچ کے درمیان ہوتے ہیں۔ بھیڑ کم و بیش ڈیڑھ انچ کی۔ ان کی قازیں تقریباً گھریلو چڑیا کے برابر اور اسی تناسب سے گھٹتے گھٹتے جب چھوٹے جانوروں پر نوبت پہنچتی تو وہ اتنے چھوٹے دکھائی دیتے کہ ان میں سے اکثر تو مجھے دکھائی بھی نہ دیتے۔ لیکن قدرت نے للّی پٹ والوں کی آنکھوں کو تمام چیزیں مناسب شکل و صورت میں دیکھنے کی صلاحیت دے رکھی تھی۔ وہ بہت صحیح دیکھتے ہیں مگر بہت دور تک نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی قریب کی چیزوں کی باریک بینی کا یہ ثبوت دیکھ کر مجھے بڑا لطف آیا۔ ایک باورچی ایک چنڈول کے پر نوچ رہا تھا اور چنڈول اتنا بڑا بھی نہیں تھا جتنی ہماری مکھی۔ اور ایک کم عمر لڑکی کو دیکھا کہ سوئی میں دھاگہ پرو رہی ہے۔ مگر مجھے نہ تو سوئی سوجھی اور نہ دھاگہ۔ ان کے اونچے سے اونچے درخت کوئی سات فٹ کے ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ان درختوں سے ہے جو شاندار شاہی باغ میں ہیں۔ جن کی چوٹیوں تک میرا مٹھی بندھا ہاتھ پہنچتا تھا۔ ترکاریاں بھی اسی تناسب سے ہیں لیکن انھیں اب میں پڑھنے والے کے تصور پر چھوڑتا ہوں۔ جملہ علوم ان میں صدیوں سے پھیل رہے ہیں اور بڑھ رہے ہیں۔ لیکن اس وقت میں ان کی تفصیل بیان نہیں کروں گا۔ مگر ان کا لکھنے کا انداز بڑا عجیب و غریب ہے کہ نہ تو بائیں سے دائیں کو ہے جیسا کہ یورپ والوں میں ہے۔ نہ دائیں سے بائیں کو، جیسا کہ عرب والوں میں ہے؛ نہ اوپر سے نیچے کو چینیوں کی طرح، نہ نیچے سے اوپر کو، کاسکاجیوں کی طرح۔ بلکہ آڑا۔ کاغذ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک، انگلستان کی خواتین کی طرح۔

یہ لوگ اپنے مُردوں کو سر کے بل دفن کرتے ہیں، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب گیارہ ہزار چاند پورے ہو جائیں گے تو سارے مُردے دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ اس عرصہ میں دنیا (جو ان کے نزدیک چپٹی ہے) الٹ جائے گی اور یوں دوبارہ اٹھائے جانے پر وہ اپنے آپ کو اپنے پیروں پر کھڑا پائیں گے۔ ان میں جو پڑھے لکھے ہیں۔ اس عقیدے کو مُہمل قرار دیتے ہیں لیکن دفن کرنے کا یہ دستور اب بھی جاری ہے کیونکہ جہلا اسی روایت پر قائم ہیں۔

اس مملکت میں چند قوانین اور رسوم بڑی عجیب ہیں۔ اور اگر میرے پیارے ملک کے دستور اور رواج کے یہ اس قدر خلاف نہ ہوتے تو ان کے جواز کے حق میں کچھ کہنے کو میرا جی چاہتا۔ کاش ان پر اسی عمدگی سے عمل بھی کیا جاتا۔ ایک جس کا ذکر میں پہلے کروں گا مخبروں کے متعلق ہے۔ ریاست کے خلاف تمام جرائم کی سزا نہایت سخت دی جاتی ہے۔ لیکن مقدمہ میں اگر ملزم اپنی بے گناہی ثابت کر دے تو الزام لگانے والے کو ذلت کے ساتھ موت کے گھاٹ آتار دیا جاتا ہے اور اس کے سامان یا زمینوں سے بے گناہ شخص کی چارگنی تلافی کی جاتی ہے۔ اس کے وقت کے ضائع ہونے کی، اس کے خطرے میں پڑ جانے کی، اُس کی قید و بند کی سختیوں کی اور ان کل اخراجات کی جو اسے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے انگیز کرنے پڑے۔ اگر زرِ تلافی کم رہ جائے تو اس کا بیشتر حصہ حکومت ادا کرتی ہے۔ شہنشاہ اسے کوئی نشان عامّہ بھی از راہِ نوازش عطا کرتا ہے اور سارے شہر میں اس کی بے گناہی کا اعلان کیا جاتا ہے۔

یہ لوگ بے ایمانی کو چوری سے بڑا جرم سمجھتے ہیں، اور شاذ ایسا ہوتا ہے کہ بے ایمان کی سزا موت نہ ہو۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ادنیٰ فہم کا آدمی بھی احتیاط اور ہوشیاری سے اپنا مال و اسباب چوروں سے بچا سکتا ہے لیکن دیانتدار شخص بے ایمانی کی مکاری سے نہیں بچ سکتا۔ اور چونکہ یہ ضروری ہے کہ خرید و فروخت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے اور اعتبار پر لین دین ہوتا رہے۔ اگر بے ایمانی کو روا رکھا گیا یا فریب دہی سے چشم پوشی کی گئی یا اس کی سزا کا کوئی قانون نہیں بنایا گیا تو ایماندار ہمیشہ مارا جائے گا اور بے ایمان مزے اڑائے گا۔ مجھے یاد ہے جب میں نے بادشاہ سے ایک مجرم کو بچانا چاہا، جس لے اپنے آقا کی رقم اڑا لی تھی۔ یہ رقم ایک گاہک نے دی تھی۔ جسے لے کر ملازم بھاگ گیا تو اس کا جرم ہلکا کرنے کے لیے میں نے کہا "یہ تو محض اعتبار کھونے کی بات ہے تو شہنشاہ نے اسے میری ایک نہایت وحشیانہ حرکت تصور فرمایا کہ اتنے بڑے جرم کا بچاؤ کر کے میں نے جرم کی شدّت کو بڑھا دیا اور سچ بھی یہ ہے کہ میرے پاس اب کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس عام عذر کے کہ مختلف قوموں کے مختلف دستور ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اعتراف ہے کہ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔

اگرچہ ہم جزا اور سزا کو عموماً وہ دو چولیں کہتے ہیں جن پہ پوری حکومت چلتی ہے لیکن اس اصول کو میں نے عملی صورت اختیار کرتے کسی قوم میں نہیں دیکھا، سوائے للی پٹ کی قوم کے، جو کوئی بھی اس امر کا کافی ثبوت مہیا کر سکتا ہے کہ اس نے تہتّر چاند اپنے ملک کے قوانین کی پابندی کرنے میں پورے کر لیے تو اسے اس کی زندگی کے معیار اور حالات کے مطابق چند مراعات حاصل ہو جاتی ہیں اور اسے ایک مناسب رقم اس سرمایہ میں سے بھی دی جاتی ہے جو اس مد کے لیے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ ساتھ کے ساتھ اسے "اسنل پال" یعنی دستوری کا خطاب بھی مل جاتا ہے جو اس کے نام کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ لیکن یہ خطاب وراثت میں اس کی اولاد

کو نہیں ملتا اور ان لوگوں نے میرے یہ بتانے پر اسے حکمتِ عملی کا ایک بہت بڑا سقم قرار دیا کہ ہمارے قوانین میں صرف سزائیں شامل ہیں۔ جزاؤں کا کوئی مذکور نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی عدالتوں میں انصاف کا جو بُت ہوتا ہے اس کی چھ آنکھیں ہوتی ہیں۔ دو سامنے، دو پیچھے اور ایک ایک اِدھر اُدھر۔ ادھر سے خبرداری کا اظہار مقصود ہے۔ اس بت کے دائیں ہاتھ میں سونے کا ایک منہ کھلا توڑا ہوتا ہے اور بائیں ہاتھ میں نیام کی ہوئی تلوار۔ اس سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انصاف کی دیوی سزا سے زیادہ جزا کی طرف مائل ہے۔

کل ملازمتوں کے لیے جو لوگ انتخاب کیے جاتے ہیں ان کی قابلیت سے زیادہ ان کے حسنِ اخلاق کو دیکھا جاتا ہے کیونکہ حکومت تو انسانوں کے لیے بہرحال ضروری ہے اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کی فہم کسی نہ کسی ملازمت کے لیے موزوں ہوتی ہے عوام کے معاملات کو قدرت نے ایسا سربستہ راز بنانے کی کوشش کبھی نہیں کی جسے صرف چند اعلیٰ قابلیت کے افراد ہی سمجھ سکیں۔ ایسے افراد جو سارے زمانے میں تین سے زیادہ پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صداقت، انصاف، رواداری اور اسی طرح کے حسنات ہر شخص کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ ان حسنات پہ اگر عمل کیا جائے اور تجربہ اور نیک نیتی بھی اس کے ساتھ ہو تو ہر شخص اپنے ملک کی خدمت کے لیے موزوں ہو سکتا ہے، سوائے اس خدمت کے جس کے لیے تربیتِ خصوصی درکار ہو۔ لیکن یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اخلاقِ حسنہ کے فقدان کی تلافی اعلیٰ ذہنی ودیعتوں سے اس درجہ بعید ہے کہ ملازمتیں ایسے خطرناک لوگوں کے سپرد نہیں کی جا سکتیں جو محض ذہنی قابلیتوں سے متصف ہوتے ہیں اور کم از کم وہ غلطیاں جو نیک فطرت لوگوں سے لاعلمی میں سرزد ہو جائیں۔ عوام کی بہبودی کے لیے اس قدر مہلک نتائج پیدا نہیں کریں گی جتنی اس شخص کی حرکات پیدا کریں گی جس کے رجحانات اسے برائیوں پہ مائل کریں، اور وہ ان برائیوں کو پروان چڑھانے اور ان کا تحفظ کرنے کی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتا ہو۔

اسی طرح ربّانی قوت کے تسلیم نہ کرنے والے کو بھی ملازمت کا اہل نہیں سمجھا جاتا کیونکہ بادشاہ قوتِ ربانی کے نائب ہونے کا حلف اٹھاتے ہیں۔ اس لیے للی پٹ والے سمجھتے ہیں اس سے بڑھ کر بے معنی بات اور کیا ہوگی کہ کوئی بادشاہ ایسے لوگوں کو ملازمتیں سونپے جو سرے سے اس حاکم ہی کو نہ مانتے ہوں جس کے احکام کی تعمیل خود بادشاہ کرتا ہو۔

جو دستور میں نے بیان کیے ہیں اور آگے چل کر جن کا ذکر کروں گا ان سے میری مراد اصلی قوانین ہیں۔ وہ رسوا کن خرابیاں نہیں ہیں جن میں یہ لوگ انسانی پست فطرت کی وجہ سے مبتلا ہو گئے ہیں۔ کیونکہ رسوں پہ ناچ دکھا کر یا بانسوں پہ کود کر یا ان کے نیچے سے نکلنے کے کرتب دکھا کر اونچی ملازمتیں حاصل کر لینا یا شاہی نوازشوں کے تمغے اور نمایاں حیثیت حاصل کر لینا ایسی خرابیاں ہیں جنھیں موجودہ شہنشاہ کے دادا نے پہلی بار داخل ہونے دیا۔ اور فرقہ بندی اور دھڑا بندی نے انھیں موجودہ بلندی پہ پہنچا دیا۔

احسان فراموش کو ان لوگوں میں واجب القتل سمجھا جاتا ہے جیسا کہ ہم نے پڑھا ہے بعض اور ملکوں میں بھی سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے محسن کا بدلہ برائی سے دیتا ہے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ضرور دشمنی کرے گا۔ کیونکہ ان کی طرف سے تو کوئی احسان کی زیر باری بھی اس پہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایسا شخص اس لائق نہیں ہوتا کہ زندہ رہے۔

والدین اور بچوں کے فرائض کا تصور ہم سے بہت مختلف ہے۔ چونکہ نر اور مادہ کے میل کی بنیاد قدرت کے نسل کشی کے عظیم قانون پہ ہے۔ لہٰذا للی پٹ والے اسے ضروری سمجھتے ہیں کہ مرد اور عورت بھی دوسرے حیوانوں کی طرح نفسانی خواہش کی تسکین کے

پیدا کیا ہوں اور اسی قدرتی اصول کے تحت انہیں اپنے بچوں کی مامتا ہوتی ہے۔ اسی باعث وہ اسے قطعی گوارہ نہیں کرتے کہ کوئی بچہ اپنے باپ کا اس لیے احسان مند ہو کہ وہ اس کی پیدائش کا ذمہ دار ہے یا اپنی ماں کا اس لیے احسان ملنے کہ وہ اسے دنیا میں لائی۔ کیونکہ انسانی زندگی کے مصائب کے پیشِ نظر یہ فعل نہ تو بجائے خود مستحسن ہے اور نہ والدین ہی کا یہ منشاء تھا۔ وہ تو اپنی محبت کی پینگوں میں کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ ان اور ایسی ہی دلیلوں سے انہوں نے رائے قائم کی ہے کہ جب کوئی اور انتظام ہو ہی نہ سکتا ہو تو والدین کو ان کے بچوں کی تعلیم پر مامور کیا جائے۔ اسی وجہ سے ان کے ہر شہر میں عوامی بچہ خانے کھلے ہوئے ہیں جہاں تمام والدین کو ماسوائے کسانوں اور مزدوروں کے، اپنے بچوں اور بچیوں کو بیس چاند کے ہوتے ہی پالے جانے اور تعلیم پانے کے لیے جبراً بھیج دینا پڑتا ہے۔ کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ اس عمر میں ان میں تربیت پذیری کی چند مبادیات سونما ہو جاتی ہیں۔ یہ مدرسے مختلف نوعیتوں کے ہیں جو دونوں صنفوں اور مختلف اوصاف کے مطابق ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں ایسے استاد ہوتے ہیں جو بچوں کو ایسی زندگی کی تربیت دینے میں مہارت رکھتے ہیں جو اُن کے والدین کے معیارِ زندگی کے شایاں ہو اور خود بچوں کی اپنی صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق بھی۔ میں پہلے مردانہ بچہ گھروں کا ذکر کروں گا اور اس کے بعد زنانہ بچہ گھروں کا۔

اونچے گھرانوں کے بچوں کے بچہ گھروں میں سنجیدہ اور عالم استاد اور ان کے کئی کئی معاون ہوتے ہیں۔ بچوں کے لباس اور کھانے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ دیانتداری، انصاف، ہمت، حیاء، حلم، مذہب اور حب الوطنی کے اصولوں کے مطابق ان کی تربیت ہوتی ہے۔ بچے کسی نہ کسی کام میں ہمیشہ مصروف رکھے جاتے ہیں۔ سوائے کھانے اور سونے کے اوقات کے جو بہت مختصر ہوتے ہیں۔ اور دو گھنٹے تفریح کے جن میں انہیں جسمانی ورزشیں کرائی جاتی ہیں۔ چار سال کی عمر تک انھیں مرد کپڑے پہناتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چاہے کتنے ہی عالی نسب کیوں نہ ہوں انہیں خود اپنے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ خادمائیں جن کی عمر ہمارے پچاس سال کی نسبت سے ہوتی ہے۔ صرف نہایت ادنیٰ درجے کے کام انجام دیتی ہیں۔ بچوں کو نوکروں سے باتیں کرنے کی اجازت قطعاً نہیں دی جاتی۔ تفریح کرنے کے لیے اپنے چھوٹے بڑے گروہ بنا کر جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ہمیشہ ایک استاد یا نائب استاد ہوتا ہے۔ اس احتیاط کی وجہ سے وہ بے وقوفی اور بدی کے ان ابتدائی بُرے اثرات سے بچ جاتے ہیں جن کے شکار ہمارے بچے ہوتے ہیں۔ ان کے والدین کو سال میں صرف دو دفعہ ان سے ملنے دیا جاتا ہے۔ یہ ملاقات ایک گھنٹے سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ آنے اور جانے پر انھیں اپنے بچوں کو پیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے لیکن ان مواقع پر جو استاد ہمیشہ موجود رہتا ہے انھیں کانا پھوسی کرنے نہیں دیتا، نہ لاڈ پیار کی باتیں کرنے دیتا ہے، اور نہ کھلونے، مٹھائیاں وغیرہ بطور تحفہ دینے دیتا ہے۔

بچے کی تعلیم اور تفریح کے اخراجات والدین ادا کرتے ہیں۔ اگر وقت پر ادا نہ کیے جائیں تو شہنشاہ کے افسر وصول کر کے دیتے ہیں۔

معمولی حیثیت کے لوگوں مثلاً تاجروں، دکانداروں اور دستکاروں کے بچہ گھروں کا انتظام بھی نسبتاً اسی ڈھنگ سے کیا جاتا ہے۔ وہ بچے جو مختلف کاروباروں کے لیے تیار کیے جاتے ہیں گیارہ سال کی عمر میں کار آموزی کے لیے بھیج دیئے جاتے ہیں مگر اونچے خاندانوں کے بچے پندرہ سال کی عمر تک تربیت پاتے رہتے ہیں۔ ہمارے حساب سے انھیں اکیس سال کے سمجھنا چاہئے۔ لیکن کڑی پابندیاں آخری تین سال میں رفتہ رفتہ کم کر دی جاتی ہیں۔

لڑکیوں کے بچہ خانوں میں اونچے گھرانوں کی بچیوں کی تعلیم بچوں ہی کی طرح ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ انھیں خادمائیں کپڑے پہناتی ہیں، لیکن ہمیشہ استاد یا نائب استاد کی موجودگی میں۔ یہاں تک کہ خود کپڑے پہننے سیکھ لیتی ہیں۔ یہ عموماً پانچ سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خادمائیں بچیوں کو خوفناک یا بے وقوفیوں کی کہانیاں سنا کر ان کا دل بہلایا کرتی ہیں، یا وہ حماقتیں کرتی ہیں جو ہمارے ہاں کی ملازمائیں کرتی ہیں تو سارے شہر میں انھیں گھما کر تین دفعہ کوڑے مارے جاتے ہیں۔ ایک سال قید رکھا جاتا ہے اور شہر بدر کر کے عمر بھر کے لیے ملک کے کسی ویران ترین حصے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں کی نوعمر لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح بزدل اور بیوقوف ہونے پر شرمندہ ہوتی ہیں اور جسمانی آرائش کے تمام ساز و سامان کی نفاست اور ستھرے پن کے خلاف سمجھ کر حقارت سے دیکھتی ہیں۔ بربنائے اختلافِ صنف میں نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی بھی فرق نہیں دیکھا۔ سوائے اس کے کہ لڑکیوں کی ورزشیں اتنی سخت نہیں ہوتیں جتنی لڑکوں کی، اور کچھ اصول و ضوابط گھریلو زندگی کے بارے میں انھیں بتلائے جاتے ہیں اور ان کی تعلیم کا پھیلاؤ لڑکوں کی نسبت کم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اونچے درجے کے لوگوں میں بیوی کو ہمیشہ ایک معقول اور خوشگوار ساتھی ہونا چاہیئے۔ اس وجہ سے کہ وہ سدا جوان نہیں رہ سکتی۔ جب لڑکیاں بارہ سال کی ہو جاتی ہیں تو یہ ان کے ہاں شادی کر دینے کی عمر سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے ان کے والدین یا سرپرست آکر انھیں گھر لے جاتے ہیں اور استادوں کے بہت شکر گزار ہوتے ہیں۔ اس موقع پر شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ لڑکیاں اور ان کی ہمجولیاں رو نہ پڑتی ہوں۔

ادنیٰ درجے کی بچیوں کے بچہ گھروں میں بچیوں کو ان تمام کاموں کی تربیت دی جاتی ہے جو ان کی صنف کے مناسب حال ہوں اور ان کے متعلقہ طبقوں کے مطابق جنھیں کارآموز بنانا ہوتا ہے انھیں ۹ سال کی عمر میں رخصت کر دیا جاتا ہے باقی کو تیرہ سال کی عمر تک رکھا جاتا ہے۔

غریب گھرانوں والے جن کے بچے ان بچہ گھروں میں داخل ہوتے ہیں مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے سالانہ وظیفوں کے علاوہ، جو کم سے کم ہوتے ہیں، اپنی ذاتی ماہوار آمدنی کا کچھ حصہ اپنے بچے کے اخراجات کے لیے بچہ گھر کے منتظم کو پہنچاتے رہیں۔ لہٰذا تمام والدین کے اخراجات قانونی طور پر محدود کر دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ للی پٹ کے باشندے سمجھتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر اور کیا نامنصفی ہوگی کہ لوگ اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لیے بچے تو پیدا کر دیں مگر ان کی پرورش کا بوجھ عوام پر ڈال دیں۔ رہے عالی نسب لوگ، تو یہ اپنے ہر بچے کے لیے حسب حیثیت ایک مناسب رقم بطور ضمانت جمع کرا دیتے ہیں۔ ان جمع شدہ رقوم کا نہایت اچھا انتظام رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ بالکل صحیح انصاف برتا جاتا ہے۔

کسان اور مزدور اپنے بچوں کو اپنے گھروں پر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا کام صرف زمین کو جوتنا اور بونا ہے۔ اس لیے ان کی تعلیم عوام کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن ان میں جو بڈھے اور بیمار ہوتے ہیں انھیں ہسپتالوں سے امداد ملتی ہے۔ کیونکہ بھیک مانگنا ایک ایسا پیشہ ہے جسے اس مملکت میں کوئی نہیں جانتا۔

یہاں شاید پڑھنے والوں کو خیال آئے گا اور یہ جاننے کا اشتیاق ہوگا کہ میرے گھریلو حالات کیا تھے اور میں نے جو اس ملک میں نو مہینے اور تیرہ دن قیام کیا تو میرا طرزِ زندگی کیا تھا؟ میرا دماغ چونکہ مشینوں کی طرف راغب ہے اور کچھ ضرورت کا بھی اقتضا تھا اس لیے میں نے اپنے لیے ایک میز اور کرسی شاہی باغ کے بڑے بڑے درختوں سے خاصی آرام دہ بنا لی تھی۔ میرے سینے

قمیص اور میرے بستر اور میز کے لیے اوقچہ اور میز پوش بنانے کے لیے دو سو درزنیں لگائی گئیں۔ کپڑا مضبوط اور موٹے سے موٹا مہیا کیا گیا، لیکن اسے بھی تہ در تہ رکھ کر جوڑنا پڑا، کیونکہ موٹے سے موٹا کپڑا بھی ململ سے باریک تھا۔ ان کا سوتی کپڑا عموماً تین انچ عرض کا ہوتا ہے اور تھان تین فٹ کا۔ میں زمین پر لیٹ گیا تو درزنوں نے میرا ناپ لیا۔ ایک میری گردن پہ کھڑی ہو گئی، اور دوسری میری ٹانگ کے بیچ میں۔ دونوں نے ایک مضبوط ڈوری سرے سے پکڑ کر تان لی اور تیسری درزن نے ایک انچ لمبے رول سے ڈوری کی لمبائی ناپنی شروع کر دی۔ اس کے بعد انہوں نے میرے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے کو ناپا۔ بس اور کچھ نہیں۔ کیونکہ ایک حساب کے قاعدے سے کہ انگوٹھے کے دو پھیر برابر ہوتے ہیں کلائی کے ایک پھیر کے۔ انہوں نے میرے گلے اور کمر کا حساب لگا لیا اور میری پرانی قمیص کی مدد سے جس کو میں نے نمونے کے لیے ان کے سامنے زمین پر پھیلا دیا تھا۔ انہوں نے میری قمیص بالکل ٹھیک سی دی۔ اسی طرح میرے کپڑے بنانے کے لیے تین سو درزی لگائے گئے۔ مگر انہوں نے میرا ناپ لینے کی ایک اور ترکیب نکالی۔ میں جُھک کر کھڑا ہو گیا اور انہوں نے زمین سے میری گردن تک ایک سیڑھی لگا دی۔ ان میں سے ایک اس سیڑھی پہ چڑھ گیا، اور میرے کالر سے زمین تک اس نے ساہول ڈالی۔ اس سے میرے کوٹ کی صحیح لمبائی معلوم ہو گئی۔ لیکن اپنی کمر اور بازوؤں کا ناپ لے کر میں نے خود دے دیا۔ جب میرے کپڑے سل کر تیار ہوئے (میرے ہی گھر میں سیئے گئے۔ کیونکہ ان کے بڑے سے بڑے گھر میں بھی یہ نہ سماتے) تو ایسے دکھائی دیئے جیسے انگلستان کی خواتین نے ہزار جامہ تیار کیا ہو۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے کپڑے سب ایک ہی رنگ کے تھے۔

میرا کھانا تیار کرنے کے لیے تین سو باورچی تھے جو میرے گھر کے نزدیک آرام دہ جھونپڑیوں میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ سب مل کر میرے کھانے کے لیے دو طرح کے کھانے تیار کرتے۔ میں بیس خدمتگاروں کو اپنی مٹھی میں اٹھا میز پر چھوڑ دیتا۔ کوئی سو خدمتگار نیچے فرش پر کھڑے رہتے۔ بعض کے ہاتھوں میں گوشت کی قابیں ہوتیں اور بعض شراب کے پیپے لیے ہوتے۔ اور بعض دوسری شرابوں کی صراحیاں کندھوں پر لٹکائے ہوتے۔ ان سب چیزوں کو میز پر کے خدمت گار میری خواہش کے مطابق بڑی ہوشیاری سے ڈوریوں کے ذریعے اوپر اس طرح کھینچ لیتے جیسے ہم یورپ میں کنوئیں سے بالٹی کھینچتے ہیں۔ ان کی ایک گوشت کی قاب میرا خاصہ ایک نوالہ بن جاتی اور شراب کا ایک پیپا ایک گھونٹ۔ ان کا بکری کا گوشت ہمارے ہاں کے گوشت کا مقابلہ نہیں کرتا۔ لیکن ان کا گائے کا گوشت اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔ ایک ران تو میرے سامنے اتنی بڑی آئی کہ مجھے اس کے تین نوالے کرنے پڑے۔ مگر ایسا کم ہوتا ہے۔ میرے ملازم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میں اسے ہڈی سمیت چبا گیا، جیسے ہمارے ملک میں چنڈول کی ٹانگ کھا جاتے ہیں۔ ان کی قازیں اور فیل مرغ میرا ایک ایک نوالہ بنتے اور مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے پرندوں سے کہیں زیادہ لذیذ ہوتے ہیں۔ ان کی چھوٹی مرغیاں تو بیس یا تیس میں اپنی چھری کے سرے پہ اٹھا لیتا تھا۔

ایک دن بادشاہ سلامت نے میری زندگی کے متعلق باتیں سُن کر خواہش ظاہر کی کہ خود بنفسِ نفیس اور ملکہ سلامت اور انہی کے خاندان کے شہزادے اور شہزادیاں میرے ساتھ شریک طعام ہونے کی (انہوں نے ازراہِ کرم فرمایا) مسرت حاصل کرنی چاہتے ہیں ۔ حسبِ ارادہ وہ آئے اور میں نے ان سب کو اپنی میز پر شاہی کرسیاں لگا کر بٹھا دیا۔ سب ذرا اونچے میرے بالکل سامنے تھے اور ادھر اُدھر ان کے محافظ کھڑے تھے۔ ریاستی خزانے کا داروغۂ اعلیٰ فلم نیپ اپنا سفید عصا لیے حسبِ دستور حاضر تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے کئی بار مجھے تیوری چڑھا کر دیکھا۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی بلکہ معمول سے کچھ زیادہ ہی کھایا، کچھ اپنے ملک کی لاج رکھنے کے لیے اور

اہلِ دربار کی تحسین حاصل کرنے کے لیے بھی۔ مجھے خانگی وجوہ کی بناء پر یقین ہوتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی تشریف آوری سے فلم نیپ کو اپنے آقا سے میری برائی کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ داروغہ سدا سے میرا مخفی دشمن تھا مگر ظاہراً اپنی روکھی طبیعت سے کہیں بڑھ چڑھ کر مجھ سے محبّت کا اظہار کرتا۔ اس نے شہنشاہ سے عرض معروض کی کہ خزانے کی حالت اچھی نہیں ہے، مجبوراً بھاری سود پر روپیہ لینا پڑ رہا ہے۔ خزانۂ عامرہ کی ہنڈیاں نو فیصدی نقصان پر چل رہی ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ مجھ پر اب تک ساڑھے دس لاکھ اسپرگ (ان کا سب سے بڑا سونے کا سکّہ، سنہری بنکی کے برابر) خرچ ہو چکے ہیں۔ اور بادشاہ کو مشورہ دیا کہ جلد از جلد موقع ملتے ہی مجھے جواب دے دیا جائے۔

یہاں مجھے ایک نہایت اعلیٰ درجے کی خاتون کی نیک نامی کا بول بالا کرنا ہے جو بے گناہ میری وجہ سے بدنام ہوئی۔ بعض بدگو لوگوں نے داروغۂ خزانہ کے کان بھرے کہ ان کی بیگم دیوانہ وار مجھ پر فریفتہ ہو گئی ہیں۔ داروغہ اس بات پر اپنی بیوی سے جلنے لگا اور یہ افواہ کچھ عرصہ تک دربار میں گشت کرتی رہی کہ بیگم ایک دفعہ چھُپ کر میرے گھر بھی آئی ہے۔ میں نہایت سنجیدگی سے اعلان کرتا ہوں کہ یہ صریح جھوٹ ہے جس کی اس سے زیادہ کوئی بنیاد نہیں کہ معزز بیگم مجھ سے معصومانہ تپاک اور دوستی سے پیش آتی تھیں۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ وہ اکثر میرے گھر آتی تھیں، مگر کھلے بندوں، چھُپ چھپا کر نہیں۔ اور ہمیشہ ان کے ساتھ دو تین اور خواتین ہوتی تھیں۔ ان میں عموماً ان کی بہن اور کم عمر بیٹی شامل ہوتی تھی اور کوئی مخصوص دوست۔ یہی طریقہ اور بھی کئی درباری خواتین کا تھا۔ اس پر بھی میں اپنے ملازموں سے گواہی دلوا سکتا ہوں کہ کسی وقت بھی کوئی ایسی سواری انھوں نے میرے دروازے پر آتی نہیں دیکھی جسے پہلے انہوں نے معلوم نہ کر لیا ہو۔ ایسے موقعوں پر جب کوئی ملازم مجھے کسی کی آمد کی اطلاع دیتا تو میرا یہ دستور تھا کہ فوراً دروازے پر جاتا اور آداب بجا لانے کے بعد گاڑی اور دونوں گھوڑوں کو نہایت احتیاط سے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا (کیونکہ اگر چھ گھوڑے ہوتے تو گھڑسوار کوچوان ان میں سے چار کھول لیتا) اور انھیں میز پر رکھ دیتا جس کے کنارے پر میں نے ایک کھسکنے والا کٹہرا پانچ انچ اونچا لگا دیا تھا تاکہ کوئی سانحہ نہ ہونے پائے۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ ایک ہی وقت میں میری میز پر چار چار گاڑیاں اور گھوڑے جمع ہو جاتے اور خوب رول چول رہتی۔ میں اپنی کرسی میں جھک کر اپنا چہرہ ان کی طرف بڑھا دیتا۔ جب میں ایک ٹولی سے باتیں کرنے لگتا تو کوچوان باقی گاڑیوں کو میز پر آہستگی سے چلاتے رہتے۔ میں نے اکثر دوپہریں ان سے باتیں کر کے بڑی خوش دلی سے گزاری ہیں لیکن میں داروغۂ خزانہ کو جھٹلاتا ہوں اور اس کے دو گوئندوں (میں ان کے نام بتاتا ہوں، وہ اپنی سی کر لیں) کلسٹرل اور ڈرنلو کو بھی۔ وہ ثابت کریں کہ کبھی بھی کوئی شخص بھیس بدل کر میرے پاس آیا، سوائے ناظم رلڈرلیسال کے، جسے جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، بادشاہ سلامت نے بحکمِ خاص بھیجا تھا۔ میری بات چھوڑیئے۔ اگر اس سے ایک معزز خاتون کی عزت خطرے میں نہ پڑتی تو میں اس بات کو اتنا طول نہ دیتا۔ حالانکہ مجھے بھی اس وقت ایک نارداک ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ یہ مرتبہ داروغۂ خزانہ کو بھی حاصل نہیں ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف ایک کلم گلم ہے۔ یہ خطاب ایک درجہ نیچا ہے جیسا کہ انگلستان میں مارکوئس ڈیوک سے ایک درجہ نیچا ہوتا ہے۔ یہ البتہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ملازمت کے لحاظ سے وہ مجھ سے اونچا تھا۔ ان غلط اطلاعات نے جن کا مجھے ایک ناقابلِ بیان اتفاق سے بعد میں علم ہوا۔ داروغۂ خزانہ فلم ناپ کو اتنا ورغلایا کہ بیوی کی طرف سے اس کا منہ کچھ عرصے تک چڑھا رہا۔ اور میری طرف سے اور بھی زیادہ۔ کیونکہ بعد میں جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس کی بیوی نے اسے دھوکا نہیں دیا تو اس نے اپنی بیوی سے دل صاف کر لیا لیکن میں اس کی نظروں سے گر گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ شہنشاہ بھی میری طرف سے بدظن ہوتا جا رہا ہے کیونکہ داروغہ اس کے بہت منہ چڑھا ہوا تھا اور شہنشاہ کو چلاتا رہتا تھا۔

(فرانسیسی)

کینڈائڈ

مصنفہ :۔ **والٹیئر**

مترجمہ :۔ **شاھد احمد دہلوی**

کینڈائڈ کے دل کی گہرائیوں میں کیونی گوندی سے شادی رچانے کی کچھ ایسی زیادہ خواہش بھی نہیں تھی۔ لیکن نواب نے انتہائی گستاخی کا جو مظاہرہ کیا تھا اس پر اس نے فیصلہ کر لیا کہ شادی کر ہی لے، اور کیونی گوندی نے اتنے خلوص سے اس پر زور دیا تھا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اس نے پینگلوس، مارٹن اور معتمد کاکیمبو سے مشورہ کیا۔ پینگلوس نے اعلیٰ درجے کی یادداشت مرتب کی جس میں اس نے ثابت کیا کہ نواب کو اپنی بہن پر کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اور حکومت کے تمام قوانین کے مطابق وہ چاہے تو کینڈائڈ سے اپنے ہاتھ سے شادی کر لے۔ مارٹن کہتا تھا کہ نواب کو سمندر میں پھینک دینا چاہیئے۔ کاکیمبو کی رائے یہ تھی کہ سب سے اچھا یہ ہے کہ اسے لیونٹ کپتان کے پاس واپس بھیج دیا جائے۔ اور اسے کشتی کھینے والے غلاموں میں شامل کر دیا جائے۔ یہ مشورہ ٹھیک سمجھا گیا۔ بڑھیا نے اسے منظور کر لیا، اور اس کا کوئی ذکر اس کی بہن سے نہیں کیا گیا۔ تھوڑی سی دولت حاصل کرنے کے لیے اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا، اور یوں ایک جرمن نواب کے غرور کو نیچا دکھانے کی مسرت انھیں حاصل ہوئی۔

یہ تصور کرنا بالکل فطری امر ہے کہ اتنی ساری مصیبتیں جھیلنے کے بعد جب کینڈائڈ کی شادی اپنی محبوبہ سے ہو گئی، فلسفی پینگلوس، فلسفی مارٹن، شائستہ مزاج کاکیمبو اور بڑھیا کے ساتھ اس کا رہنا سہنا تھا اور خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ قدیم انکاز کے ملک سے اتنے سارے ہیرے لے آیا تھا، تو دنیا بھر میں اس سے اچھی زندگی اور کوئی شخص بسر نہیں کر رہا ہو گا۔ مگر اسے یہودیوں نے ایسا دھوکا دیا تھا کہ سوائے ایک چھوٹے سے کھلیان کے اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا اور اس کی بیوی دن بدن زیادہ بدشکل ہو کر چڑچڑی اور بارِ خاطر ہوتی جا رہی تھی۔ بڑھیا بہت کمزور اور کیونی گوندی سے بھی زیادہ بدمزاج ہو گئی تھی۔ کاکیمبو جو باغبانی کرتا قسطنطنیہ جا کر باغ کے پھل بیچا کرتا، محنت کرتے کرتے نڈھال ہو گیا اور قسمت کو کوسنے لگا تھا۔ پینگلوس اس غم میں گھلا جا رہا تھا کہ جرمنی کی کسی یونیورسٹی میں سرِ دانش گاہ کیوں نہ چمکا۔ رہا مارٹن، سو اسے یقین تھا کہ سارے جہان میں یکساں خرابی پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے وہ صبر سے ساری باتیں گوارہ کیے جاتا تھا۔ کینڈائڈ، مارٹن، پینگلوس کبھی کبھی مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات پہ بحث مباحثہ کرتے۔ اپنے کھلیان گھر کی کھڑکیوں میں سے آفندیوں، پاشاؤں اور قاضیوں سے بھری کشتیاں گزرتے دیکھتے جنھیں جلاوطن کر کے لمنوس، متی لین اور ارضِ روم بھیجا جاتا۔ وہ دیکھتے کہ دوسرے قاضی، دوسرے پاشا، ان جلاوطن کیے جانے والوں کی آسامیوں پر آ جاتے، صرف اس لیے کہ جب ان کی باری آئے تو انہیں بھی جلاوطن کر دیا جائے۔ وہ لوگوں کے کٹے ہوئے سر دیکھتے

جوابِ عالی میں پیش کیے جانے کے لیے نفاست سے جڑے جاتے۔ اس نوع کے مناظران کے مباحثوں میں اضافہ کرتے اور جب وہ مباحثہ نہ کرتے ہوتے تو ان کی بے شغلی اس قدر عذابِ جان ہوتی کہ بڑھیا ان سے اکثر کہہ بیٹھتی ”میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ان میں سب سے بُرا کیا ہے۔ حبشی سمندری ڈاکوؤں سے سو بار زنا بالجبر کرانا، بلغاریوں کی قطاروں میں سے کوڑے کھاتے ہوئے بھاگنا، کوڑے کھا کر پھانسی پانا، اپنے بدن کے پُڑے اڑوانا، غلاموں کے ساتھ کشتیوں میں جوتا جانا، مختصر یہ کہ جو جو عذاب ہم نے جھیلے ہیں وہ، یا یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا؟“ کینڈائڈ کہتا ”یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔“

بحث مباحثہ میں نئے نئے تصورات کی راہیں کھل گئیں، اور آخر میں مارٹن نے نتیجہ نکالا کہ انسان اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ یا تو خلجان کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا پھرے یا نفرت کی غنودگی میں ڈوبا رہے۔ کینڈائڈ نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا اور حیص بیص میں پڑ گیا۔ پنیگلوس نے اقرار کیا کہ ”میں تو ہمیشہ شدید تکلیفوں میں مبتلا رہا۔ لیکن ایک بار یہ طے کر لینے کے بعد سارے کام حیرت انگیز طور پر ٹھیک چلتے رہتے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے مفروضہ پر قائم رہا۔ اگرچہ یہ مفروضہ اس کے حقیقی احساسات کے قطعی خلاف تھا۔

ان کے پڑوس میں ایک بہت مشہور درویش رہتا تھا۔ جو ترکی میں سب سے بڑا فلسفی سمجھا جاتا تھا۔ یہ سب اس سے دریافت کرنے گئے۔ پنیگلوس کو نمائندہ چنا گیا اور اس نے درویش سے کہا ”آقا! ہم یہ خواہش لے کر حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہمیں بتائیں انسان جیسا عجیب و غریب حیوان کیوں پیدا گیا تھا۔؟“

درویش نے کہا ”تمھیں اس سے کیا؟ یہ معلوم کرنا کیا تمھارا کام ہے؟“ کینڈائڈ نے کہا ”لیکن میرے محترم باپ دنیا میں بے انتہا بدی ہے۔“ درویش بولا ”یہ کس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیکی ہے یا بدی؟ جب اعلیٰ حضرت ایک جہاز مصر روانہ فرماتے ہیں تو کیا انھیں اس کی پریشانی ہوتی ہے کہ جہاز میں جو چوہیاں ہیں وہ آرام سے ہیں یا نہیں؟“ پنیگلوس نے پوچھا ”اچھا تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ انسان کیا کرے؟“ درویش نے کہا ”اپنی زبان کو لگام دو۔“ پنیگلوس بولا ”میں نے اپنے آپ سے اس مسرت کے حاصل کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ آپ سے علّت و معلول اچھی سے اچھی دنیا، بدی کے آغاز، روح کی کیفیت، پہلے سے قائم شدہ ہم آہنگی ——— یہ باتیں سُن کر درویش نے دروازہ بند کر دیا اور یہ کھڑے منہ دیکھتے رہ گئے۔

اس گفت و شنید کے دوران خبر آئی کہ دو وزیروں اور ایک مفتی کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس کے بہت سے دوستوں کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اس آفت کا شور کئی گھنٹے بجتا رہا۔ پنیگلوس، کینڈائڈ اور مارٹن جب اپنے کھلیان کی طرف واپس چلے تو راستہ میں انھوں نے ایک اچھی صورت شکل کے بڑے میاں کو اپنے دروازے میں سنتروں کے درختوں کے ایک جھنڈ تلے ہوا کھاتے دیکھا۔ پنیگلوس، جسے اتنی ہی پرچول رہتی تھی جتنی فلسفہ کو، ان بڑے میاں سے اس مفتی کا نام پوچھنے لگا جس کا ابھی گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ بھلے آدمی نے کہا ”مجھے اس واقعہ کا کوئی علم نہیں ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ عمر بھر میں مجھے ایک بھی مفتی یا ایک بھی وزیر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ آپ جو کہانی سنا رہے ہیں میں نے کبھی نہیں سنی، اور سمجھتا ہوں کہ عام طور سے جو لوگ ریاست کے معاملات میں سرگرداں رہتے ہیں۔ بعض اوقات بڑی عبرت ناک موت سے ہمکنار ہوتے ہیں، اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس کے سزاوار نہیں تھے۔ لیکن میں اپنے سر کو یہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں دیتا کہ قسطنطنیہ میں کیا ہو رہا ہے۔ میں جو

پھل اپنے ہاتھوں سے اس باغ میں کاشت کرتا ہوں انھیں وہاں بھیجنے پر قناعت کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے اجنبیوں کو اپنے گھر میں لاکر گھر والوں سے متعارف کرایا۔ اس کی دو بیٹیوں اور دو بیٹوں نے کئی قسم کے شربتوں سے ان کی تواضع کی، جو انہوں نے خود بنائے تھے۔ ان کے علاوہ انھیں مُربّے کھلائے، ترنج، سنترے، لیموں، کیلے اور پستے کھلائے اور موچا کی کافی پلائی جس میں بٹے دیا اور انگلستان کی بڑی کافی کی آمیزش نہیں تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اس اچھے مسلمان کی دونوں بیٹیوں نے کینڈائڈ، پینگلوس اور مارٹن کی ڈاڑھیوں میں عطر لگایا۔

کینڈائڈ نے ترک سے کہا "آپ کی ضرور بہت بڑی اور زرخیز املاک ہوگی۔" ترک نے کہا "میرے پاس صرف بیس ایکڑ زمین ہے۔ اس میں مَیں اور میرے بچے کاشت کرتے ہیں۔ محنت ہمیں تین سب سے بڑی خرابیوں سے بچائے رکھتی ہے: بے لطفی، بدی، احتیاج۔"

جب کینڈائڈ اپنے کھلیان کو واپس چلا تو اس نے ترک کی گفتگو پر غور کیا۔ پینگلوس اور مارٹن سے بولا "اس اچھے بوڑھے آدمی کی حالت ان چھ بادشاہوں پر فوقیت رکھتی ہے جن کے ساتھ کھانے کی عزت ہمیں حاصل ہوئی ہے۔" پینگلوس نے کہا "فلسفیوں کی رائے میں بادشاہت کی شان و شوکت بڑی پُرخطر ہوتی ہے۔ کیونکہ مختصراً کہتا ہوں موابائیوں کے بادشاہ ایگلون کو ایہود نے قتل کیا۔ ابسلوم کو سر کے بالوں سے لٹکایا گیا، اور تین تیر اس کے جسم میں سے پار کیے گئے۔ جیروبوام کے بیٹے بادشاہ ناداب کو باشا نے مار ڈالا۔ بادشاہ اِلہ کو زمری نے، اعازیہ کو جیہو نے، تھالیا کو جیہوئی عادہ نے، جیکونیاس اور زیدی کیاس، شاہانِ جواشم قید و بند میں ڈالے گئے۔ کروسس، استیاگیز، دارا، سائراکیوز کے دایونی سیئس، فائی رس، پرسیوس، ہنی بال، جغرطہ، ایریودستوس، سیزر، پامپی، نیرو، اوتھو، وتیلیوس، دومی شیئن، رچرڈ دوئم، ایڈورڈ دوئم، ہنری ششم، رچرڈ سوئم، میری اسٹوارٹ، انگلستان کا چارلس اوّل، فرانس کے تینوں ہنریوں اور شہنشاہ ہنری چہارم، ان سب کا جو انجام ہوا تم جانتے ہی ہو۔ اور یہ بھی تم جانتے ہو ———" "ہاں میں جانتا ہوں۔" کینڈائڈ نے بات کاٹ کر کہا "کہ ہمیں اپنے باغ کی سیوا کرنی چاہیے۔" پینگلوس بولا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ کیونکہ انسان کو جب باغِ عدن میں رکھا گیا تھا تو اس لیے رکھا گیا تھا کہ باغ کی کاشت کرے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اس لیے پیدا نہیں کیے گئے کہ بیکار رہیں۔" مارٹن نے کہا "بحث مباحثے کیے بغیر ہمیں کام کرنا چاہیے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کا۔"

اس چھوٹے سے معاشرہ کے تمام افراد اس مستحسن ارادے پر اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کاربند ہوگئے۔ ان کے مختصر سے قطعۂ اراضی میں بہت سی فصل ہوئی۔ کیونی گوندی بڑی گھریلو عورت تھی، لیکن وہ نہایت عمدہ کھانے پکانے لگی، پے کیوٹیا نے سوزن کاری شروع کر دی، اور بڑھیا نے کپڑے لتّے کی نگرانی اپنے ذمّہ لے لی۔ اس گروہ میں اب کوئی بیکار نہیں تھا۔ جیروف فلی بھی نہیں۔ وہ بڑا اچھا بڑھئی بن گیا، اور نہایت دیانتدار انسان بھی۔

رہا پینگلوس، اسے بظاہر اس کا پوشیدہ احساس تھا کہ اپنے نظریہ کی تکمیل کے لیے اسے مسلسل محنت کرنی چاہیے اور اس کی ساری خوش تدبیری اسی میں صرف ہونی چاہیے۔ وہ اپنی دھن میں لگا رہا۔ اس کی فکری اور تکلمی صلاحیتیں اس انہماک

سے ایک لمحہ کے لیے بھی علیحدہ نہیں کی جا سکتی تھیں۔ جب بھی موقع ملتا وہ کینڈائڈ سے کہتا "اس احسن ترین دنیا میں تمام واقعات بطریقِ احسن مربوط ہیں۔ اگر سلسلۂ عظیم کی ایک کڑی بھی چھوٹ جائے تو کل کائنات کی ہم آہنگی برباد ہو جائے گی۔ اگر تم اس حسین محل سے مس کیونی گونڈی کی محبت میں بے رحم لاتیں کھا کر نہ نکلتے۔ اگر عدالتی تحقیقات میں تمہیں سزائے قید نہ ہوتی، اگر تم امریکہ کا بڑا حصہ پیدل طے نہ کرتے، اگر تم نواب کو اپنی تلوار بھونک کر نہ مار دیتے، اگر تمھاری وہ تمام بھیڑیں جو تم اس عمدہ ملک ایلڈوریڈو سے لائے تھے گم نہ ہو جاتیں، اور وہ کل دولت جو ان پر لدی تھی ضائع نہ ہو جاتی تو آج تم یہاں بیٹھے ترنج کا مربہ اور پستے نہ کھاتے ہوتے۔"

کینڈائڈ نے کہا "خوب بات کہی تم نے، اور ہو سکتا ہے کہ سچی بھی ہو۔ مگر ہمیں اپنے باغ کی سیوا کرنی چاہیئے۔"

(فرانسیسی)

لغاتِ فلسفہ

مصنّف :- والٹیئر

مترجمہ :- شاہد احمد دہلوی

مساوات

ایک کتّے کا دوسرے کتّے پر کیا واجب ہے اور ایک گھوڑے کو دوسرے گھوڑے کا کیا دینا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ کوئی جانور اپنے جیسے جانور کا محتاج نہیں ہوتا۔ لیکن انسان جس نے خدا سے وہ شے پائی ہے جسے شعور کہتے ہیں۔ اس کی کیفیت کیا ہے؟ یہ کہ دنیا میں ہر جگہ غلام ہے۔

اگر دنیا درحقیقت ویسی ہی ہوتی جیسی کہ فرض کیا جاتا ہے ہونی چاہیئے —— اگر انسانوں کو اس میں ہر جگہ آسانی اور یقین کے ساتھ روزی مل جایا کرتی اور مزاج کے موافق موسم میسّر آجاتا تو ظاہر ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو محکوم بنانا ناممکن ہوتا۔ اگر دنیا خوش ذائقہ پھلوں سے لدجائے، اگر وہ ہوا جس پہ ہماری زندگی کا دارومدار ہے ہم تک امراض اور قبل از وقت موت نہ پہنچائے، اگر انسان کو ہرنی اور ہرن کی طرح کی مسکن کی ضرورت نہ ہو تو اس صورت میں چنگیز خانوں اور تیمور لنگوں کے پاس سوائے ان کے اپنے بچوں کے اور کوئی خدام نہ موں گے۔ اور یہ بچے بڑے سعادت مند ہوں گے اور بڑھاپے میں بڑی محبت سے ان کی خدمت کریں گے۔

قدرت کی اس کیفیت میں جس سے بے خانماں چرپائے، پرندے اور حشرات الارض لطف اندوز ہوتے ہیں، انسان بھی اسی قدر خوش وخرّم رہتے جتنے کہ یہ جانور۔ ایک کا دوسرے پر غلبہ محض ایک خیالی خوف ہوتا—— ایک ایسی مہمل بات جس کا کسی کو بھی خیال نہ آتا، کیونکہ جب خدمت ہی درکار نہ ہو تو خدمت گاروں کی تلاش کیوں ہو؟

اگر کسی اعصابی بازو اور جابر مزاج فرد کے دل میں سما جائے کہ اپنے کم طاقت پڑوسی کو زیر کرلے تو اس کی کامیابی ناممکن ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وا لکا پر ظالم اپنی تیاری مکمل کرلے۔ مظلوم ڈینیوب پہ جا پہنچے گا۔

اگر احتیاجیں ساتھ نہ لگی ہوتیں تو کل انسان ضرور برابر ہوتے۔ یہ فلاکت ہی ہے جو نوعِ انسانی سے وابستہ ہے جو ایک انسان کو محکومی میں دے دیتی ہے۔ اصل شکایت عدم مساوات کی نہیں بلکہ محتاجی کی ہے۔ اگر کوئی شخص اعلیٰ حضرت کہلاتا ہے تو کیا؟ اور اگر کوئی اور تقدس مآب کہلاتا ہے تو کیا؟ اگر میرے لیے یہ ناگوار ہے کہ میں کسی کا ملازم ہوں۔

ایک بڑے خاندان نے اچھی زمین کاشت کی ہے، پڑوس میں رہنے والے دو چھوٹے خاندان بنجر زمینوں پر گزر کرتے ہیں لہٰذا ان دو غریب خاندانوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ امیر خاندان کی ملازمت کریں یا اسے تباہ کر دیں۔ یہ کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔ مفلس خاندانوں میں سے ایک خاندان امیر خاندان کے پاس جاتا ہے اور روٹی کے عوض اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ دوسرا خاندان جاکر اس پر حملہ کر دیتا ہے اور مغلوب ہو جاتا ہے۔ خدمت گزار خاندان آغاز ہے خدمت گاروں اور مزدوروں کا جو مغلوب ہو گیا آغاز ہے غلاموں کا۔

ہماری غمناک دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ معاشرہ میں زندگی بسر کرنے والے انسانوں کو دو طبقوں میں تقسیم ہونے سے روکا جائے۔ ایک امیر جو حکم دے اور دوسرا غریب جو حکم مانے۔ اور یہ دونوں اور کئی طبقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جن کے اپنے اپنے فرق کے درجے ہوتے ہیں۔

کل غریب ناخوش نہیں ہوتے۔ بیشتر تعداد اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے اور مسلسل محنت انھیں اپنی کیفیت پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں دیتی۔ اور جب وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں تو لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ جیسے روم میں عوامی پارٹی اور مجلسِ عمائدین اور جرمنی، انگلستان اور فرانس کے دیہاتیوں میں یہ ساری لڑائیاں دیر سویر ختم ہو گئیں اور انجامِ کار عوام غلامی میں پڑ گئے، کیونکہ بڑوں کے پاس دولت ہے اور دولت کا سکہ ہر جگہ چلتا ہے۔ یہ کیفیت میں نے ریاست کی بیان کی ہے۔ کیونکہ قوموں کے درمیان صورت حال دوسری ہوتی ہے۔ وہ قوم جو لوہے کا سب سے صحیح استعمال کرتی ہے اُس قوم کو ہمیشہ دبائے گی جس کے پاس سونا زیادہ اور ہمت کم ہو۔

ہر شخص قوت، دولت اور عیش کا رجحان لے کر پیدا ہوتا ہے اور آرام طلبی کی زبردست خواہش بھی۔ نتیجتہً ہر شخص آرزومند ہوتا ہے کہ دوسروں کی دولت اور بیویوں اور بیٹیوں پر قابض ہو جائے، ان کا آقا بن جائے تاکہ انہیں جس طرح بھی چاہے اپنا غلام بنائے رکھے اور کوئی کام نہ کرے۔ یا کم از کم کوئی ایسا کام نہ کرے جو ہر لحاظ سے دل آویز نہ ہو۔ آپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایسی لطیف طبیعتیں ہوں وہاں یہ ناممکن ہے کہ انسانوں میں مساوات ہو بالکل اسی طرح جیسے دو واعظ یا مذہب کے استاد کر رقابت سے باز رہ ہی نہیں سکتے۔

نسلِ انسانی جیسی کچھ بھی ہو اس کی تشکیل ہوئی ہے قائم نہیں رہ سکتی۔ جب تک اس میں بے شمار افراد ایسے نہ ہوں، جن کے پاس کوئی ملکیت نہ ہو۔ کیونکہ جو شخص آرام کی زندگی گزار رہا ہو اسے کیا پڑی ہے کہ اپنی زمین چھوڑ کر آپ کی زمین کاشت کرنے آ جائے؟ اور اگر آپ کو جوتی چاہیئے تو کوئی وکیل تھوڑی آپ کو بنا دے گا۔ لہٰذا مساوات ایک ہی وقت میں سب سے فطری چیز بھی ہے اور سب سے موہوم بھی۔

اگر اختیار میں ہو تو لوگ ہر چیز کو اس کی انتہا کو پہنچا دیتے ہیں۔ اسی طرح مساوات کو بھی حد کو پہنچا دیا ہے۔ بہت سے ملکوں میں یہ اصول رکھا گیا ہے کہ کسی باشندے کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ اپنے جنم بھوم کو ترک کر دے۔ ایسے دستور کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ " یہ ملک اس درجہ تباہ حال ہے اور یہاں کی حکومت اس قدر ناکارہ ہے کہ اسے ترک کرنے کی ہم ہر شخص

کو ممانعت کرتے ہیں، اس خوف سے کہ کہیں سبھی اسے چھوڑ کر نہ نکل جائیں'' بہتر صورت حال پیدا کرو۔ اپنی رعایا میں خواہش پیدا کرو کہ تمہارے ساتھ رہے اور غیر ملکیوں میں شوق پیدا ہو کہ آئیں اور تمہارے ملک میں بس جائیں۔

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ دوسروں سے اپنی برابری کے متعلق ذاتی رائے رکھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ لاٹ پادری کا باورچی یہ طے کرلے کہ اپنے آقا کو کھانا پکانے کا حکم دے۔ باورچی یہ البتہ کہہ سکتا ہے کہ ''میں ایک انسان ہوں، اپنے آقا کی طرح۔ میں بھی اس کی طرح روتا ہوا پیدا ہوا تھا، اور اسی کی طرح کرب میں مروں گا، اور میرے مرنے کی رسوم بھی اسی جیسی ہوں گی۔ ہم دونوں ایک ہی طرح کے حیوانی فرائض ادا کرتے ہیں۔ اگر ترک روم پر قابض ہو جائیں اور اس وقت میں لاٹ پادری بن جاؤں اور لاٹ پادری باورچی بن جائے تو میں اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لوں گا'' یہ بات بڑی معقول اور صحیح ہے۔ لیکن جب تک ترکِ اعظم روم پر قبضہ پائے اس وقت تک تو باورچی کو اپنا فرض ادا کرنا پڑے گا۔ ورنہ پورا انسانی معاشرہ الٹ جائے گا۔

رہا وہ شخص جو نہ تو لاٹ پادری کا باورچی ہے اور نہ ریاست میں اسے کوئی عہدہ ہی حاصل ہے ـــــ وہ شخص جس کے کوئی تعلقات نہیں ہیں اور جو اس بات سے متنفر رہتا ہے کہ سب اس سے سرپرستانہ یا حقارت سے ملتے ہیں، جسے صاف دکھائی دیتا ہے کہ بہت سے اونچے درجے کے اور خطاب یافتہ لوگ علم، ذہانت یا خوبی میں مجھ پر فوقیت نہیں رکھتے۔ اور جو بار بار ان کی ڈیوڑھیوں پر حاضری دینے سے اکتا چکا ہے ـــــــ ایسے آدمی کو کیا کرنا چاہیئے؟ اسے دور رہنا چاہیئے۔

آزادی

ا : توپوں کی ایک باڑ ہمارے کانوں پر چھوڑی جاتی ہے، کیا آپ کو اس کی آزادی حاصل ہے کہ جی چاہے تو اسے سنیں اور جی نہ چاہے تو نہ سُنیں؟

ب : یقیناً میں اپنے آپ کو اس کے سننے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

ا : کیا آپ اس پر رضامند ہیں کہ یہ توپیں آپ کا سر اڑا دیں۔ اور آپ کی بیوی اور بیٹی کے بھی جو آپ کے ساتھ چہل قدمی کر رہی ہوں؟

ب : کیا خوب سوال ہے؟ جی نہیں، کم از کم جب تک میں اپنے صحیح ہوش و حواس میں ہوں۔ ایسی کوئی بات پسند نہیں کروں گا۔ یہ ناممکن ہے۔

ا : بہت خوب! آپ ان توپوں کی آواز ضرور سنیں گے، اور آپ یہ خواہش بھی ضرور نہیں کرتے کہ توپوں کے چھوٹنے سے آپ مر جائیں اور آپ کی بیوی اور بچی بھی مر جائے۔ آپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ آپ ان کی آواز نہ سُنیں، اور نہ یہ اختیار ہے کہ جیتے رہیں۔

ب : ظاہر ہے۔

ا : میں فرض کرتا ہوں کہ توپوں کی زد سے آپ تیس قدم آگے نکل گئے ہیں۔ آپ کو یہ چند قدم میرے ساتھ چلنے

کا اختیار حاصل تھا۔

ب: یہ بھی بالکل ظاہر ہے۔

ا: اور اگر آپ مفلوج ہوتے توپوں کی زد سے آپ نہیں بچ سکتے تھے۔ آپ کو ان کا شور ضرور سننا پڑتا۔ توپ کا گولہ آپ کو زخمی بھی کر دیتا۔ اور آپ مر بھی ضرور جاتے۔

ب: اس سے زیادہ اور کیا سچ ہو سکتا ہے۔

ا: اچھا تو آپ کی آزادی پھر کس چیز سے عبارت ہے۔ اگر اس قوت سے نہیں جو آپ کے جسم نے حاصل کی ہے۔ اس کام کے کرنے کی جسے قطعی ضرورت کے تحت آپ کے ارادہ لے چاہا ؟

ب: آپ مجھے الجھن میں ڈال رہے ہیں تو آزادی سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جو کچھ میں چاہوں اسے کرنے کی قوت کا نام ہے ؟

ا: سوچیے۔ اور دیکھیے کہ کیا آزادی کو کسی اور طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے ؟

ب: اس لحاظ سے میرا شکاری کتا بھی اتنا ہی آزاد ہے جتنا میں۔ جب وہ خرگوش کو دیکھتا ہے تو ضرور اس کے پیچھے دوڑنے کا ارادہ کرتا ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی ٹانگوں میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ للذا کتے پر مجھے کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ آپ نے مجھے گھٹا کر جانوروں کی سطح پر پہنچا دیا۔

ا: یہ گھٹیا باطل دلیلیں ہیں اور وہ گھٹیا سوفسطائی تھے جنھوں نے آپ کو پڑھایا۔ آپ اپنے کتے کی طرح آزاد ہونے پر رضامند نہیں ہیں۔ کیا آپ تقریباً اسی جیسے رجحانات کے ساتھ کھاتے، سوتے اور پیدا نہیں کرتے ؟ کیا آپ ناک کے علاوہ کسی اور طرح بھی سونگھ سکتے ہیں ؟ اپنے کتے سے مختلف آزادی کے مالک آپ کیوں بننا چاہتے ہیں ؟

ب: مگر مجھ میں ایک روح ہے جو عقل آرائی کرتی ہے اور میرا کتّا بالکل حجّت نہیں کرتا۔ اس کے دماغ میں سیدھے سادے خیالات آتے ہیں اور میرے ذہن میں ہزاروں مابعد الطبیعیاتی تصورات بھرے رہتے ہیں۔

ا: ہاں، تو آپ اس سے ہزار گنا آزاد ہیں۔ آپ میں اس سے ہزار گنی فکری قوّت ہے لیکن اس کے باوجود آپ کسی اور لحاظ سے اپنے کتے سے زیادہ آزاد نہیں ہیں۔

ب: کیا! میں کیا اپنے ارادے میں آزاد ہوں ؟

ا: اس کا آپ کیا مطلب سمجھ رہے ہیں ؟

ب: وہی سمجھ رہا ہوں جو ساری دنیا سمجھتی ہے۔ کیا یہ روزانہ نہیں کہا جا رہا کہ ارادہ آزاد ہوتا ہے ؟

ا: کہاوت تو دلیل نہیں ہوتی۔ آپ کھل کر بیان کیجیے۔

ب: میں سمجھتا ہوں کہ میں جیسا ہوں ارادہ کرنے میں آزاد ہوں۔

و : اجازت ہو تو عرض کروں کہ یہ مہمل بات ہے۔ آپ نہیں دیکھتے یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ میں اسادہ کروں گا کہ اسادہ کروں! نتیجۃً آپ صرف ان تصورات کا اسادہ کر سکتے ہیں جو آپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ آپ شادی کریں گے؟ ہاں یا نہیں؟

ب : فرض کیجیے میں جواب دیتا ہوں "نہ یہ نہ وہ"۔

و : اس صورت میں آپ کا جواب اس شخص جیسا ہو گا جس نے کہا تھا "بعض کو یہ یقین ہے کہ لاٹ پادری مازرین مر گیا، بعض کو یہ یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔ میں نہ اس پہ یقین کرتا ہوں اور نہ اُس پہ۔

ب : اچھا تو میں شادی کروں گا۔

و : ہاں! یہ ایک جواب ہوا۔ کیوں کریں گے آپ شادی؟

ب : یوں کہ میں ایک جوان، حسین، دلکش، اعلیٰ تعلیم یافتہ مالدار لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوں، وہ گاتی بہت اچھا ہے۔ اس کے والدین بڑے دیانتدار ہیں۔ اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے اور اس کے گھر والے میرے آنے جانے سے خوش ہوتے ہیں۔

و : ہاں اس میں دلیل ہے۔ آپ نے دیکھا کہ بغیر کسی محرک کے آپ ارادہ نہیں کر سکتے۔ میں آپ سے اعلانیہ کہتا ہوں کہ آپ شادی کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ قوت حاصل ہے کہ آپ معاہدے پہ دستخط کر دیں۔

ب : کیسے! میں بغیر کسی محرک کے ارادہ نہیں کر سکتا؟ تو پھر اس دوسری کہاوت کا کیا ہو گا —— میرا ارادہ میرا سبب ہے —— میں ارادہ پورا کر کے رہوں گا کیونکہ میں نے اس کا ارادہ کر لیا ہے۔

و : میرے پیارے دوست، مہمل ہے یہ۔ پھر تو آپ کے پاس ایک نتیجہ ہو گا بغیر سبب کے۔

ب : کیا جب میں طاق و جفت کھیلتا ہوں تو کیا طاق کے بدلے جفت چننے میں میرے لیے کوئی سبب ہوتا ہے؟

و : بے شک۔

ب : اچھا تو مہربانی سے یہ بتائیے کیا سبب ہوتا ہے؟

و : یہ کہ طاق کا نہیں جفت کا تصور آپ کے ذہن میں پیش ہوتا ہے۔ یہ بڑی غیر معمولی بات ہو گی۔ اگر بعض صورتوں میں تو ہم اس لیے ارادہ کریں کہ ایک محرک موجود ہو اور بعض میں ہم ارادہ کریں بغیر محرک کے۔ جب آپ شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ ظاہر ہے کہ اس کے نمایاں سبب کا ادراک کرتے ہیں۔ آپ اس کا ادراک طاق و جفت کے کھیل میں نہیں کرتے، مگر سبب اس کا کوئی نہ کوئی ضرور رہتا ہے۔

ب : لہٰذا ایک بار پھر میں آزاد نہیں رہا۔

و : آپ کا ارادہ آزاد نہیں ہے لیکن آپ کے عمل آزاد ہیں۔ جب آپ کو عمل کی قوت حاصل ہو تو آپ آزاد ہیں۔

کر عمل کریں۔

ب : لیکن میں نے جتنی کتابیں پڑھی ہیں بے اعتنائی کی آزادی پر ——— ۔

ل : سب مہمل ہیں۔ بے اعتنائی کی آزادی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک لفظ بے معنی ہے جسے کسی ایسے ہی مہمل انسان نے تراشا ہے۔

محبّت

یہ فطرت کی بساط پر تصوّر کی گل کاری ہے۔ اگر آپ محبت کا کوئی تصور قائم کرنا چاہتے ہیں تو اپنے پائیں باغ میں چڑیوں کو دیکھیے، اپنی قمریوں کو دیکھیے، اس سانڈ کو دیکھیے جو بچھیا پر چھوڑا جاتا ہے۔ اس قوی اور پُر جوش گھوڑے کو دیکھیے جسے آپ کے دو سائیس گھوڑی کی جانب لے جا رہے ہیں جو خاموشی سے اس کی منتظر ہے اور اس کے قریب آنے سے خوشی کا اظہار کر رہی ہے۔ گھوڑے کی آنکھوں کی چمک دیکھیے، اس کے ہنہنانے کی توانائی اور بلندی دیکھیے، اس کے جست و خیز دیکھیے، کنوتیاں کھڑی ہوئیں، تشنج آمیز سانسوں سے منہ کھلا ہوا، پھیلے ہوئے نتھنے، سانسوں میں آگ کی لپٹ، ہوا میں اڑتے ہوئے ایال کے بال، اور تندی و تیزی جس سے وہ اس شے کی طرف جھپٹتا ہے جسے قدرت نے اس کے لیے مقدّر کیا ہے۔ مگر اس کی سرخوشی پر آپ حسد نہ فرمائیں بلکہ نوعِ انسانی کی برتری پر غور کریں۔ حیوانِ محض پر جو نوازشیں قدرت نے فرمائی ہیں — قوت حُسن، سبک پن اور سرعت، ان سب کی کافی تلافی محبت میں کر دی گئی ہے۔

لیکن اس درجے کے جانور بھی پائے جاتے ہیں جو جنسی تعلقات سے قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں۔ مچھلیاں اس لذت سے محروم ہیں۔ پانی کی کیچڑ میں مادہ اپنے لاکھوں انڈے چھوڑ جاتی ہے اور جو نر ان پر سے گزرتا ہے جاں بخش اصول پر کاربند ہوتا ہے۔ انڈے دینے والی مادہ سے کبھی نہیں ملتا۔ بلکہ شاید اسے پہچان بھی نہیں سکتا۔

جفتی کرنے والے جانوروں میں بڑی تعداد ان کی ہے جو صرف ایک حس کی لذّت کا ادراک کرتے ہیں، اور جب بھوک مٹ جاتی ہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی جانور بغل گیر ہونا نہیں جانتا۔ اس کا سارا جسم حسّاس ہوتا ہے۔ اس کے لب بالخصوص ایک ایسی لذّت محسوس کرتے ہیں جو کبھی کم نہیں ہوتی۔ اور یہ صرف اس کی نوع کا حصہ ہے۔ پھر یہ کہ ہر موسم میں اپنے آپ کو محبّت کے افعال کے حوالے کر سکتا ہے۔ حیوانِ محض کے لیے صرف ایک محدود زمانہ ہوتا ہے۔ اگر ان اعلیٰ درجے کی فوقیتوں پر غور کریں تو آپ روچسٹر کے رئیس کا یہ قول مان لیں گے کہ محبّت دہریوں کی قوم کو خدا کی عبادت کرنے پر دھکیل سکتی ہے۔

انسانوں کو چونکہ یہ حکم ودیعت کیا گیا ہے کہ جو کچھ بھی قدرت نے انہیں بخشا ہے اس کی تکمیل کر لیں۔ اس لیے انھوں نے عطیۂ محبت کو بھی مکمل کر لیا۔ ستھرا پن، جسم کی دیکھ بھال اور صحت کا خیال رکھنے سے جسم زیادہ حسّاس ہو جاتا ہے لہٰذا اس کی تسکین کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے خوشگوار اور بے بہا جذبات بعد میں محبت کے جذبے

میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان دھاتوں کی طرح جو سونے میں مل جاتی ہیں۔ دوستی اور تکریم اس کی امداد کو بڑھتی ہیں۔ جسم اور روح دونوں کے جوہر کھلتے ہیں اور نئے تقویت بخش رشتے قائم ہونے لگتے ہیں۔

ان سب پر مستزاد ذاتی محبت ان تمام بندھنوں کو کھینچ کر قریب تر کر دیتی ہے۔ مرد اپنے انتخاب پر ناز کرنے لگتے ہیں اور وہ بے شمار فریبِ نظر جو چاروں طرف سے امڈے چلے آتے ہیں اُس تعمیر کے نقش و نگار بن جاتے ہیں جس کا سنگِ بنیاد قدرت نے اس قدر مضبوط رکھا تھا۔

یہ ہیں وہ فوقیتیں جو انسان کو جانوروں کے مختلف قبیلوں پر حاصل ہیں۔ لیکن اگر انسان ان لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے جن سے حیوان نا آشنا ہوتے ہیں تو اس کے برعکس وہ بے اندازہ الجھنیں اور نفرت انگیز باتیں ہیں جن کا شکار انسان ہوتا ہے مگر حیوان ان سے آزاد رہتا ہے۔ ان میں سب سے خوف ناک وہ ہے جس سے فطرت نے محبت کی۔ لذتوں اور زندگی کے سرچشموں کو مسموم کر دیا اور ایک بھیانک بیماری کی صورت میں تین چوتھائی دنیا پر مسلط کر دیا۔ اس بیماری کا شکار صرف انسان ہے۔ دوسری بیماریوں کی طرح یہ بیماری افراط کا نتیجہ نہیں ہے۔ عیاشی اسے دنیا میں لانے کا سبب نہیں ہے۔ فرینی اور لیسی، فلورا اور میسالینا پر اس بیماری کا حملہ کبھی نہیں ہوا۔ یہ ان جزیروں سے اٹھی جہاں نوعِ انسانی معصومیت میں زندگی بسر کر رہی تھی اور پرانی دنیا میں چاروں طرف پھیل گئی۔

اگر کوئی صورت ایسی ہو سکے جس کی رُو سے قدرت پر خود اپنی تخلیق کو ذلیل کرنے، اپنے ہی منصوبے کو ناکام بنانے اور اپنے ہی نظریوں کی مخالفت کرنے کا الزام لگایا جا سکتا ہے تو ایسی نفرت انگیز عذاب کو پیش کیا جا سکتا ہے، تو کیا پھر بھی اسی کو اچھی سے اچھی دنیا کہا جائے گا ؟ کیا ! اگر سیزر اور انطونی اور اکیتوی اس کو یہ بیماری کبھی نہیں ہوئی تو کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ فرانسس اوّل کو اس بیماری سے مرنے سے بچا لیا جاتا ؟ کہا جاتا ہے کہ نہیں۔ یہی مشیتِ ایزدی تھی اور خدا کے ہر کام میں بھلائی ہوتی ہے۔ میں اس پر یقین لانا چاہتا ہوں۔ مگر یہ مشکل نظر آتا ہے۔

اِنسان

(کیا انسان بد پیدا ہوا ہے؟)

کیا یہ عملاً دیکھا نہیں گیا کہ انسان بدکیش پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ زائیدۂ ابلیس ہے۔ اگر اس کی فطرت ہوتی تو وہ چلنے کے قابل ہوتے ہی بڑے بڑے جرائم اور وحشیانہ مظالم کرنے لگتا۔ پہلی دفعہ چھری ہاتھ میں آتے ہی اپنے ناخوش کرنے والے کو زخمی کر دیتا۔ ضرور وہ ان بھیڑیوں اور لومڑیوں کے پلّوں سے مشابہ ہوتا جو جلد از جلد کاٹنے لگتے ہیں۔

اس کے برعکس دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک شیرخوارگی کے زمانے میں اس کی فطرت بھیڑ کے بچّے جیسی ہوتی ہے تو پھر یہ کیا بات ہے کہ وہ اکثر بھیڑیا اور لومڑی بن جاتا ہے ؟ کیا حقیقت یہ نہیں ہے کہ انسان نیک یا بد تو پیدا نہیں ہوتا لیکن تعلیم، مثال، جو حکومت اس پر مسلط ہوتی ہے ـــــــ مختصر یہ کہ ہر قسم کے مواقع ـــــــ اسے نیک یا بد

بنا دیتے ہیں ؟

شاید انسانی فطرت کچھ اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ انسان ہمیشہ جھوٹے خیالات میں نہیں پلتا اور نہ سدا سچے میلانات اسے اپنا گہوارہ بنائے رہتے ہیں۔ نہ تو ہمیشہ خوش مزاج ہوتا ہے اور نہ ہمیشہ بے رحم۔

اس حقیقت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ نیکی کی ترازو میں عورتوں کا پلہ مردوں سے بھاری رہتا ہے۔ ہم سیکڑوں بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن پاتے ہیں اور ان کے مقابلے میں صرف ایک کلائٹی منسٹرا ہمیں دکھائی دیتی ہے۔

ایسے پیشے ہیں جو روح کو ضرور بے رحم بنا دیتے ہیں۔ مثلاً فوجی کا پیشہ، قصائی، منصف اور داروغۂ مجلس۔ اور وہ تمام کام جن کی بنیاد دوسروں کو تکلیف پہنچانے پر ہوتی ہے۔

جس کسی نے بھی شراب خانہ کے تہ خانے کی کیفیت دیکھی ہے، جس کسی نے بھی وکیلوں کو آپس میں بے تکلف باتیں کرتے دیکھا ہے اور انھیں اپنے موکلوں کی بدنصیبیوں پہ خود ستائی کرتے سنا ہے۔ اس کی رائے انسانی فطرت کے بارے میں بہت خراب ہی ہوگی۔

وہ عورتیں جو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں مسلسل لگی رہتی ہیں، ہر جگہ مردوں سے کم بے رحم ہوتی ہیں۔

طبیعیات اخلاقیات میں شامل ہو کر انھیں بڑے جرائم سے باز رکھتی ہے۔ ان کے خون میں اتنی گرمی نہیں ہوتی۔ تیز شرابیں خونخواری کو اکساتی ہیں، عورتیں ان کی نسبتاً کم عادی ہوتی ہیں۔ ایک ظاہر ظہور ثبوت اس کا وہ ہزاروں انصاف کے شکار ہیں جنھیں پھانسی دی گئی۔ ان میں مشکل سے ہزاروں میں چار عورتیں ہیں۔ غالباً کہیں اور بھی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایشیا میں عورتوں کی وہ مثالیں بھی ایسی نہیں ملتیں جنھیں برسرِ عام سزا دی گئی ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے طور طریق اور عادتوں نے مردوں کو بہت بد بنا دیا۔

اگر یہ حقیقت عام اور بغیر استثنیٰ کے ہوتی تو مردوں کی نوع مکڑیوں، بھیڑیوں اور خونخوار جنگلی بلیوں سے زیادہ نفرت انگیز ثابت ہوتی — مگر خوش قسمتی سے وہ پیشے جو دل کو سخت کر دیتے ہیں اور قابلِ نفرت جذبات سے بھر دیتے ہیں بہت ہی کم ہیں۔ یہ دیکھیے کہ دو کروڑ کی قوم میں زیادہ سے زیادہ دو لاکھ فوجی ہیں۔ گویا دو سو افراد میں ایک فوجی۔

دوسرے پیشے جو اخلاق کے لیے خطرناک ہیں تعداد میں کم ہیں۔ مزدور، دستکار اور فن کار اس قدر اپنے کام میں منہمک رہتے ہیں کہ جرائم کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں کمینے لوگ ہمیشہ پائے جائیں گے، اور کتابوں میں ان کی تعداد ہمیشہ بڑھا کر لکھی جائے گی۔ مگر در اصل ان کی تعداد جتنی زیادہ بتائی جاتی ہے اتنی ہی کم ہوتی ہے۔

اگر نوعِ انسانی ابلیس کی مملکت میں ہوتی تو دنیا میں کوئی انسان باقی نہ رہتا۔ ہمیں اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہیئے۔ ہم نے اچھی فطرت کے لوگ بیکنگ سے لارڈ شل تک ہمیشہ دیکھے ہیں اور دیکھتے رہیں گے اور سند یافتہ واعظ اور فارغ التحصیل حضرات چاہے جو کچھ کہیں سارے ٹائیٹس، ٹراجن، انتنیوس اور پیٹر بیلی، بڑے دیانت دار لوگ ہو گزرے ہیں۔

شادی

میری ملاقات ایک عقل آراء سے ہوئی۔ اس نے کہا" اپنے لوگوں کو آمادہ کرو کہ جلد از جلد شادی کر لیا کریں۔ پہلے سال ان کے ٹیکس چھوڑ دو۔ اور ان کے حصّے کی رقم ان لوگوں سے وصول کرو جو انہی کی عمر میں تجرّد کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔"

" تمہارے ہاں جتنے زیادہ شادی شدہ لوگ ہوں گے اتنے ہی کم جرائم ہوں گے۔ اپنے ہاں کے جرائم کے گوشواروں کے خوف انگیز خانوں پہ نظر ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ ایک باپ کے مقابلے میں سو مجرّد نوجوانوں کو سزائے موت ملی۔"

" شادی لوگوں کو زیادہ صالح اور زیادہ دانش مند بنا دیتی ہے۔ بچّوں کا باپ اپنے بچّوں کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرتا جس سے اسے شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ اپنے ورثہ میں شرمناکی کو چھوڑ جانے سے ڈرتا ہے۔"

" اپنے فوجیوں کو شادیاں کرنے دو، پھر وہ فوج سے فرار نہیں ہوں گے۔ جب وہ اپنے خاندان سے وابستہ ہوں گے تو اپنے ملک سے بھی وابستہ ہوں گے۔ غیر شادی شدہ فوجی عموماً آوارہ گرد ہوتا ہے اور بس۔ جس کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ شاہِ نیلپیز کی ملازمت کرے یا شاہِ مراقش کی۔"

" رومی جنگجو شادی شدہ ہوتے تھے۔ وہ اپنے بیوی بچّوں کے لیے لڑتے تھے، اور دوسری قوموں کے بیوی بچّوں کو اپنا غلام بناتے تھے۔"

ایک بڈھے اطالوی مدبّر نے، جو السنۂ شرقیہ کا عالم بھی تھا اور یہ بات ہمارے مدبّروں میں شاذ ہی ہوتی ہے، مجھ سے میری جوانی میں کہا" یاد رکھو، یہودیوں میں صرف ایک ہی اچھا دستور تھا ـــــ کنوارپنے سے نفرت۔ اگر وہ چھوٹی قوم شادی کو انسانی فرائض میں اولیت نہ دیتی ـــــ اگر ان میں راہبات کے لیے خانقاہیں ہوتیں ـــــ تو وہ یقیناً برباد ہو جاتے۔

(فارسی)

تعریفات

عبید زاکانی

فصلِ اوّل (متعلق دنیا و مافیہا)

الدنیا	آنجا کہ ہیچ آفریدہ در وے نیاساید	ایسی جگہ جہاں کسی مخلوق کو اطمینان و سکون حاصل نہ ہو ۔
العاقل	آنکہ بدنیا و اہلِ او نپردازد	عقلمند وہ ہے جو نہ دنیا سے علاقہ رکھے نہ اس میں رہنے والوں سے ۔
الکامل	آنکہ از غم و شادی منفعل نشود	مکمل انسان وہ ہے جو نہ رنج سے متاثر ہو نہ خوشی سے
الفکر	آنچہ مردم را بیفائدہ بیمار کند	خیال اسے کہتے ہیں جو انسان کو خواہ مخواہ بلا ضرورت پریشان کرے۔
الدانشمند	آنکہ عقلِ معاش ندارد	دانش مند (تعلیم یافتہ) وہ ہے جسے حصولِ معاش کا شعور و احساس نہ ہو نہ وہ اپنی روزی کما سکے۔
الجاہل	دولت یار	جاہل وہ ہے جو قسمت کا دھنی ہو۔

فصلِ دوم (ترک اور ان کے دوست)

الیاجوج والماجوج	قومِ ترکاں کہ بولایتے متوجہ شوند	یاجوج ماجوج ان ترکی قبائل کو کہتے ہیں جو کسی ملک پہ دھاوا کرنے جا رہے ہوں۔
الزبانیہ	پیشرو ایشاں	جہنم کے نقیب (ترکوں کے لیڈر)
القحط	نتیجۂ ایشاں	ان لوگوں کی آمدنی سے جو نتیجہ برآمد ہو وہی قحط ہے۔
العسس	آنکہ شب راہ زند و روز از بازاریاں اُجرت خواہد	کانسٹیبل وہ ہے جو رات کو لوٹ مار کرے اور دن کو دکانوں سے رشوت اور تاوان وصول کرے۔

فصلِ سوم (قاضی اور اس کے صفات)

القاضی	آنکہ ہمہ او را نفرین کنند	جسے تمام لوگ بُرا کہیں

الوکیل	آنکہ حق باطل گرداند	وکیل وہ ہے جو بے اصل اور بے بنیاد باتوں کو سچ کر دکھائے۔
الرشوۃ	کارساز بیچارگاں	رشوت اس چیز کا نام ہے جو غریبوں اور مظلوموں کی دستگیری کرے۔
السعید	آنکہ ہرگز روئے قاضی نہ بیند	خوش قسمت وہ ہے جس کو قاضی یا جج کا دیدار کبھی نصیب نہ ہو۔
الخطیب	خر	ایک بے مغز اور نادان آدمی۔
الشاعر	طامع خودپسند	ایک حریص اور البیلا انسان

فصلِ چہارم (شیوخ اور ان کے مریدین)

الشیخ	ابلیس	معلم الملکوت
الشیاطین	اتباعِ او	اس کے متبعین
الصوفی	مفت خور	جو دوسروں کی کمائی کھائے اور خود نہ کمائے
الحاجی	آنکہ دروغ بکعبہ خورد	جو کعبہ کی جھوٹی قسم کھائے

فصلِ پنجم (شرفاء اور ان کی عادات کے متعلق)

اللاف والوقاحۃ	مایۂ ایشاں	بے باکی و شیخی شرفاء کی تجارت کا سرمایہ ہے۔
الہیچ	وجود شاں	ہیچ و پوچ شرفاء کا وجود ہے۔
الجوف	تواضع شاں	ان کی آداب و تہذیب بالکل بے مغز اور بے اصل ہے۔
الگزاف والسفہ	سخن شاں	شرفاء کی گفتگو کا دوسرا نام غرور و حماقت ہے۔
اللوم والحرص والبخل والحسد	اخلاق شاں	حسد، بغض، غرور، نکتہ چینی ان کی خصوصیات ہیں۔
الابلہ	آنکہ بر ایشاں امید خیر دارد	بے وقوف وہ ہے جو ان شرفاء سے بھلائی یا جلب منفعت کی امید رکھے

فصلِ ششم (پیشہ ور اور صناع)

البازاری	آنکہ از خدا نہ ترسد	دکاندار وہ ہے جسے خوفِ خدا نہ ہو۔
العطار	آنکہ ہمہ را بیمار خواہد	عطار وہ ہے جو ہر شخص کو بیمار بنانے کا متمنی ہو۔
الطبیب (ڈاکٹر)	جلاد	جلاد و قاتل
الکذاب (جھوٹا)	المنجم	نجومی
الکشتی گیر (پہلوان)	تنبل	کاہل، بے وقوف، سادہ لوح، آوارہ

الدلال	حرامی باز	بازار کا مستند چور
الصدیک	آنچہ از مزروعات بہ مالک نرسد	جو چیز زمیندار کو فصل سے نہیں ملتی وہ ایک فیصدی ہے۔
الشکایۃ	آنچہ بہ مالک برسد	جو مالک کے کانوں تک پہنچتی ہے وہ شکایت ہے۔

فصل ہفتم (شراب اور اس کے لوازم کے بارے میں)

الشراب	مایۂ آشوب	بے چینی اور اضطراب کا سرچشمہ
النرد والشاہد والشمع والنقل	آلاتِ آں	چوسر، گنجفہ، حسن پرستی، قندیل و قابلیت سب شراب نوشی کے ذرائع ہیں۔
الچنگ والعود والمزمر	سازِ آں	بربط و طنبور و چنگ و رباب وغیرہ اس کا گانا بجانا ہے۔
الچمن والبستان	موضع آں	باغ و چمن شراب پینے کی مناسب جگہ ہے۔
الشوربا والکباب	اغذیۂ آں	کباب و گزک شرابیوں کی غذا ہے
ہادم اللذات	رمضان	خوشی و لطف کو تباہ کرنے والا رمضان ۔
لیلۃ القدر	شبِ عید	جشن کی رات

فصل ہشتم (بھنگ نوشی کے متعلق)

البنگ	آنچہ صوفیاں را بوجد آورد	بھنگ وہ ہے جو صوفیوں کو وجد و مسرت سے لبریز کردے۔
المرمع والکریم والطرفین	آنکہ بنگ و شراب باہم خورد	زندہ دل وہ ہے جو شراب اور بھنگ دونوں پیے ۔
المحروم	آنکہ ازایں دو ہیچ یک نخورد	مردہ دل وہ ہے جو دونوں کو منہ نہ لگائے ۔

فصل نہم (صاحبِ خانہ اور اس کے ملحقین)

المجرّد	آنکہ بر ریشِ دنیا خندد	نوجوان یا کنوارا وہ ہے جو دنیا کی داڑھی پر ہنسے
الشقی	کدخدا	بدقسمت وہ ہے جو صاحبِ خانہ ہو۔
ذوالقرنین	آنکہ دو زن دارد	جس کی دو بیویاں ہوں وہ ذوالقرنین ہے
الشقی الاشقیاء	آنکہ بیشتر دارد	سب سے زیادہ بدقسمت وہ ہے جس کی دو سے زیادہ بیویاں ہوں۔
الباطل	عمرِ کدخدائی	لایعنی اور بے کار صاحبِ خانہ کی زندگی ۔
الضائع التلف	روزگارِ او، مالِ او	ضائع ہونے والی چیز وقت اور صاحبِ خانہ کی دولت
الپریشان	خاطرِ او	پریشان کرنے والا صاحبِ خانہ کا دماغ

التلخ	عیشِ او	تلخ چیز صاحبِ خانہ کی عیاشی
الماتم سرا	خانۂ او	اس کے دولت کدہ کا نام ماتم سرا ہے۔
العدو خانگی	فرزند	گھر میں دشمن اس کا خلف الرشید
البداختر	آنکہ بدختر گرفتار باشد	بدنصیب وہ جو لڑکی کی طرف سے رنج اٹھائے۔
الخصم	برادر	حریف۔ صاحبِ خانہ کا بھائی۔
الخویشاند	دشمنِ جان	رشتہ دار۔ اس کا جانی دشمن
الفرح بعد الشدہ	لفظ سہ طلاق	افسوس کے بعد خوشی طلاق ثلاثہ سے حاصل ہوتی۔

فصل دہم (مرد عورت کی حقیقی فطرت کے متعلق)

الخاتون	آنکہ معشوق بسیار دارد	خانم کی تعریف یہ ہے کہ اس کے بہت سے خواستگار ہوں۔
الکدبانو	آنکہ بسیار ندارد	بیگم کی صفت یہ ہے کہ اس کے چاہنے والے کم ہوں۔
المستور	آنکہ بیک عاشق قانع نہ باشد	پاکباز۔ جو ایک عاشق پہ قناعت نہ کرے۔

(روسی) ترجمہ:- مظفر علی سید

کُتّا اور بیَل

ایوان کریلوف

کُتّا اور بیل

ایک کتا اور ایک بیل — جو ایک ہی کسان کی خدمت میں تھے — ایک دن اپنی اپنی خوبیوں پہ بحث کرنے لگے۔

اصحاب کہف کے ساتھی نے کہا "کیا کہنے ہماری قوم کے! انصاف کی بات تو یہ ہے کہ تمھیں زمین سے بے دخل کر دینا چاہیے۔ ہل چلانا، گاڑی جوتنا — بھلا یہ بھی کوئی کام ہے؟ اور مجھے پتہ نہیں کہ اُن کے سوا تم میں کون سا گُن ہے؟ خیر میرا تمھارا تو مقابلہ ہی کیا ہے! مجھے تو آٹھ پہر میں گھڑی بھر آرام نہیں ملتا۔ دن کو ڈھور ڈنگر کی رکھوالی کرتا ہوں اور رات کو مکان پہ پہرہ دیتا ہوں"۔

"بالکل ٹھیک! سو فیصدی ٹھیک"۔ بیل نے کہا "آپ جو کچھ فرماتے ہیں، سراسر درست ہے، بس اتنا یاد رکھیے کہ اگر میں ہل نہ جوتوں اور گاڑی نہ چلاؤں تو آپ کاہے کی رکھوالی کریں گے اور کس چیز پر پہرہ دیں گے۔"؟

گدھا اور بُلبُل

ایک گدھے کی ملاقات، ایک دن ایک بُلبُل سے ہو گئی۔ اس نے کہا:-

عزیزِ من! سننے میں آیا ہے کہ تم گیت گانے میں بڑی مہارت رکھتی ہو۔ میری خواہش ہے کہ تمھیں گاتے ہوئے سنوں، اور فیصلہ کروں کہ آیا تم واقعی اتنی ہی باکمال ہو یا محض عوام النّاس کا مبالغہ ہے"۔

اس پہ بلبل نے اپنے فن کا مظاہرہ شروع کیا۔ اس نے ہزار طریقوں سے لہجہ بدل بدل کر سیٹیاں بجائیں، سسکیاں بھریں، اپنے تُلے سر لگائے اور ایک گیت سے دوسرے گیت پہ آئی۔ کبھی اس نے اپنی آواز کو ایسے مدھم کیا کہ دور سے بجتی ہوئی بانسری کی نرم تانوں کا اثر پیدا ہوا۔ کبھی اس نے جنگل میں ننھے منے سروں کی بوچھاڑ کر دی۔ صبح کی ہر دلعزیز مغنیہ کے سامنے ہر چیز ہمہ تن گوش تھی۔ ہوائیں چلتے چلتے تھم گئیں۔ پنچھیوں کی منڈلی بھی دم سادھ کر بیٹھ گئی۔ حتیٰ کہ چرندے بھی گھاس پر لیٹ گئے۔ چرواہا بھی گیت کے مزے لے رہا تھا اور سانس تک کی آواز بلند نہ ہونے دیتا تھا۔ بس سنتے سنتے کبھی کبھار چرواہی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا تھا۔

آخر کار مغنیہ خاموش ہو گئی۔ گدھے نے سر کو جھکاتے ہوئے اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کیا:-

”گا رہا ہے! سچ پوچھو تو تمھارا گانا کچھ ایسا بیزار کن بھی نہیں، افسوس کہ تم نے ہمارے مُرغے کو نہیں سنا! اگر تم اس سے دو چار دن سبق لے لو، تو بہت عمدہ گانے لگو۔“

یہ فیصلہ سُن کر غریب بلبل کے پروں میں حرکت ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اُسترے

ایک مرتبہ سفر کے دوران میں میری ایک صاحب سے ملاقات ہوئی اور ہم نے سرائے کے ایک ہی کمرے میں رات بسر کی۔ اگلی صبح میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں! میرے ہم سفر کو شاید کوئی شکایت ہو گئی۔ پچھلی رات ہم دونوں خوش خوش بستروں پر دراز ہوئے تھے کسی فکر یا پریشانی کے بغیر۔ مگر اب میرے دوست کا رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ وہ کراہتا ہے، آہیں بھرتا ہے اور شکایت کے کلمے زبان پر لاتا ہے۔

”کیا بات ہے یار، ہیں؟“ میں اس سے پوچھتا ہوں ”تم کہیں بیمار تو نہیں ہو؟“

”نہیں بھئی، بالکل نہیں۔“ اس نے کہا ”بس ذرا شیو بنا رہا ہوں!“

”ہائیں! کیا اتنی سی بات تھی!“ میں حیرانی سے کہتا ہوں اور فوراً اٹھ کر اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ عجیب و غریب آدمی آئینے میں منہ چڑا رہا ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں اور ایسے کرب کے عالم میں ہے گویا اس کی کھال کھینچی جا رہی ہو۔

جب میں نے اس کے عذاب کی وجہ معلوم کر لی تو اس سے کہا ”خیر یہ تو ہونا ہی تھا ــــ تم تو اپنے آپ کو گھائل کرنے پہ تُلے ہو۔ ذرا اپنے سامان کی طرف دیکھو! یہ اُسترے ہیں یا لکڑی چھیلنے کے رندے؟ ان سے بھلا کون شیو بنا سکتا ہے! بس یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو چھیل کے رکھ دو۔“

”میں مانتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا ”کہ میرے استرے کُند ہیں۔ یہ تو صاف نظر آتا ہے۔ مگر میں اتنا احمق بھی تو نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ تیز دھار کا استرا میں اس لیے استعمال نہیں کرتا کہ کہیں گلا نہ کٹ جائے۔“

”دوست، یقین مانو کہ کُند استرے سے تم اپنا گلا اس سے بھی پہلے کاٹ کے رکھ دو گے۔ تیز استرے کے ساتھ تم دُگنی حفاظت سے شیو بنا سکتے ہو۔ بس اتنی بات ہے کہ اسے برتنے کا ڈھنگ تمہیں آتا ہو۔“

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں (خواہ وہ اس بات کو شرم کے مارے تسلیم نہ کریں) جو چالاک آدمیوں سے ڈرتے ہیں اور اپنے آس پاس احمقوں کا جمگھٹا لیے بیٹھے رہتے ہیں۔

عینک اور بندر

بڑھاپے میں ایک بندر کی نظر کمزور ہو گئی۔ اس نے انسانوں کی زبان سے سنا تھا کہ یہ کوئی اتنی بڑی بدقسمتی کی بات نہیں بس اتنا ہے کہ عینک لگا لینی چاہیئے۔ چنانچہ اس نے کہیں سے درجن بھر عینکیں حاصل کیں۔ کبھی سر پر رکھا، کبھی دُم پر باندھنے کی

کوشش کی۔ کبھی سونگھا۔ کبھی چاٹا۔ پھر بھی کسی عینک نے اس کی بینائی میں کوئی اضافہ نہ کیا۔

"واہیات!" اس نے کہا "احمق ہیں وہ، جو آدمیوں کی بکواس سنتے رہتے ہیں۔ اب یہی عینک کے بارے میں انھوں نے بالکل زٹل ہانک دی ہے۔ ان کا تو ذرا بھی فائدہ نہیں!"

اس کے بعد بندر نے غصے اور بے زاری کی حالت میں عینکوں کو ایک پتھر پہ اس زور سے مارا کہ سب کی سب ریزہ ریزہ ہو گئیں۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ آدمی بھی کبھی کبھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کوئی چیز کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو، ناواقف آدمی جو اس کی قدر نہیں جانتا، ہمیشہ اس کی برائی کرتا ہے۔ اور اگر تھوڑا بہت اختیار بھی رکھتا ہو تو اس کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔

اود بلاؤ

عدالت میں اود بلاؤ کے خلاف ایک استغاثہ دائر ہوا۔ بدیں معنی کہ اس نے جوہڑ کو اپنی غلاظت پسندی کے باعث رہنے کے قابل بنا دیا ہے۔ شہادت کے طور پر چھکڑے بھر ثبوت مہیا کیے گئے اور جیسا کہ مناسب تھا، ملزم کو ایک بڑے ٹب میں بٹھا کر کمرہ عدالت میں لایا گیا۔ جج صاحبان ذرا سے فاصلے پر، چرنت میں مصروف تھے۔ ان کے اسمائے گرامی اب بھی قدیم دستاویزوں میں محفوظ ہیں۔ دو عدد گدھے، چند ایک بڈھے گھوڑے اور دو یا تین بکرے۔ آخر میں ایک عدد لومڑ کو ـــــ اسیسر کے طور پر ان میں شامل کر لیا گیا تاکہ کسی لائق ہستی کے زیر معائنہ سب کارروائی ہو ـــــ

اب صورت حال یہ تھی کہ افواہوں کے مطابق اود بلاؤ، لومڑ کی ضیافت کے لیے مچھلیاں فراہم کیا کرتا تھا۔ خیر کچھ بھی ہو، عدالت میں جانبداری کا شائبہ نہ تھا۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ اس معاملے میں اود بلاؤ کی بدمعاشی عدالت سے مخفی نہ رہ سکتی، اور اس افواہ کے جھوٹ سچ سے کوئی فرق نہ پڑ سکتا۔ آخر فیصلہ تجویز کیا گیا جس میں اود بلاؤ کو سنگین ترین سزا دی گئی تھی۔ یعنی دوسروں کو عبرت دلانے کے لیے اس کو درخت میں پھندا ڈال کر پھانسی دے دی جائے۔

"محترم جج صاحبان" لومڑ نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ "پھانسی تو بڑی معمولی سی سزا ہے۔ میرے خیال میں تو ملزم کو ایسی کڑی سزا ملنی چاہیئے کہ رہتی دنیا تک یادگار رہے۔ اس غرض سے کہ آئندہ کے لیے بدمعاش ہمیشہ قانون سے خائف رہیں اور سزا کی دہشت سے لرز اٹھیں۔ میری ناقص رائے میں اود بلاؤ کو دریا برد کر دینا چاہیئے۔"

"کیا کہنے! کیا کہنے"! جج صاحبان نے اسے داد دی اور ایک آواز ہو کر اس کی تجویز قبول کر لی۔

چنانچہ اود بلاؤ کو ـــــ سزا کے طور پر ـــــ دریا برد کر دیا گیا۔

ماہر تعمیرات

ایک شیر کو پنچھی پکھیروؤں سے بڑا پیار تھا۔ مگر یہ دیکھ کر اسے افسوس ہوتا تھا کہ وہ بڑھتے پھولتے نہیں۔ ان کا طرز حیات

ایسا ہے کہ وہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد رہتے ہیں، کچھ چوری ہو جاتے ہیں اور کچھ اپنی مرضی سے ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔ اس ناخوشگواری اور نقصان کی تلافی کے لیے شیر نے چاہا کہ ایک بڑا سا محفوظ آنگن ان کے لیے بنوائے جو ایسی مہارت سے تیار ہو کر چور کے لیے کوئی راستہ نہ رہ جائے اور اس کے اندر جملہ ضروریات اور کافی جگہ ان کے کھیل کود کے لیے ہو۔

چنانچہ شیر کو معلوم ہوا کہ لومڑ تعمیرات کے کام میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کے ذمے یہ فرض ڈالا گیا۔ عمارت شروع ہوئی اور بڑی کامیابی سے تکمیل پذیر بھی ہوئی۔ کیونکہ لومڑ نے اس کام پر اپنی تمام ذہانت اور بے پناہ محنت صرف کی تھی۔ اس وسیع و عریض آنگن کو دیکھنے بھالنے پر محسوس کیا گیا کہ یہ حدِ توصیف سے باہر ہے۔ پکھیروؤں کو جس شے کی ضرورت ہو سکتی ہے وہاں موجود تھی۔ دانا دنکا اور پانی ڈالنے کے لیے بڑے بڑے پیالے بنے تھے۔ بیٹھنے کے لیے ہر جگہ اڈے لگائے گئے تھے۔ گرمی سردی سے بچنے کے لیے پناہ گاہیں تعمیر کی گئی تھیں اور کڑک مرغیوں کے لیے الگ تھلگ جگہیں بھی تیار تھیں۔ لومڑ کی مہارت دیکھ کر اس کی عزت و تکریم کی گئی۔ اسے فیاضانہ انعام سے نوازا گیا اور حکم جاری کیا گیا کہ تمام پکھیرو اپنی نئی قیام گاہ میں — اٹھ جائیں۔

مگر اس نقل مکانی سے کچھ فائدہ؟ پکھیروؤں کی آبادی بڑھی؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عمارت وسیع و عریض اور مضبوط تھی۔ دیواریں بلند اور دبیز تھیں۔ مگر پکھیرو روز بروز کم تر ہوتے جا رہے تھے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس خرابی کا باعث کیا ہے۔ آخر شیر نے پہرہ لگانے کا حکم دیا اور بھلا کون پکڑا جاتا ہے؟ وہی بدمعاش لومڑ! اس نے عمارت کو اس ڈھنگ سے بنایا تھا کہ کوئی دوسرا اس میں داخل ہو کر چوری نہ کر سکے۔ اور بڑی احتیاط سے ایک چھوٹا سا سوراخ چھوڑ دیا تھا جس کے راستے وہ خود داخل ہو سکے۔

زمیندار صاحب اور کمیرا

ایک شام کا ذکر ہے کہ ایک زمیندار صاحب اور ایک کمیرا جنگل کے راستے گاؤں کو جا رہے تھے۔ گھاس کاٹنے کا موسم تھا اور شام بھی گہری ہو رہی تھی۔ یکایک انھوں نے ایک ریچھ کو دیکھا کہ ان کے بالکل پاس آ چکا ہے۔ زمیندار صاحب کو چیخنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ ریچھ ان پر چڑھ دوڑا۔ ذرا سی دیر میں وہ زمین پر تھے۔ ریچھ نے جب ان کو الٹا پلٹا تو ان کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ اس کے بعد ریچھ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی اچھی سی جگہ ملے جہاں آرام سے بیٹھ کر کھانا شروع کرے۔

زمیندار صاحب نے ریچھ کے نیچے سے اپنے ملازم کو پکارنا شروع کیا" میرے دوست، میرے بھائی، مجھے چھوڑ کر نہ جانا" کمیرے نے رستم کی سی دلاوری سے کام لے کر ریچھ کے سر پہ کلہاڑے کی ضرب لگائی۔ ریچھ کی کھوپڑی دو ٹکڑے ہو گئی اور بھیجا انتڑیوں تک چلا گیا۔ ریچھ درد سے دھاڑنے لگا اور آخر کار اس کی جان نکل گئی۔ جب خطرہ دور ہوا تو زمیندار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کمیرے کو بری طرح کوسنے لگے۔ وہ غریب حیران پریشان ان کی طرف دیکھنے لگا۔

" حضور معاف کر دیجیے۔ مگر میں نے قصور کیا کیا ہے۔؟"

" نامعقول! تو نے کیا کیا ہے؟ تم اتراتے کس بات پہ ہو؟ تم نے اندھوں کی طرح ایسی کڈھب چوٹ لگائی ہے کہ ریچھ کی کھال بالکل ضائع کر دی!"

بھیڑیں اور بھیڑیے

ایک مرتبہ بھیڑوں کا سکھ چین بھیڑیوں کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ خرابی یہاں تک جا پہنچی کہ جنگل کے حاکموں نے فیصلہ کیا کہ مظلوموں کو کس طرح ظالموں کے پنجے سے چھڑایا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک مجلسِ شوریٰ بلائی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے ارکان بھی زیادہ تر بھیڑیے ہی تھے۔ مگر سب بھیڑیے بھی تو ایک سے نہیں ہوتے۔ ایسے بھیڑیے بھی ہوئے ہیں (ان کی مثال ہمیشہ یاد رہے گی) جو ایک گلّے کے پاس سے چپ چاپ گزر جاتے ہیں ——— خصوصاً جب وہ پوری طرح سیر ہوں۔ پھر شوریٰ میں بھیڑیوں کو نشستیں کیوں نہ ملیں؟ بھیڑیوں کو بچانا ضروری سہی مگر بھیڑیوں کی نمائندگی سلب کرنا بھی تو غیر ضروری ہے!

خیر ایک جنگل میں مجلس بیٹھی، انھوں نے خوب سوچا، بحثیں اور تقریریں کیں اور آخر کار ایک فرمان تیار کیا جو لفظ بہ لفظ نقل کیا جاتا ہے:۔

”جب بھی کوئی بھیڑیا کسی گلّے کو تنگ کرے یا کسی بھیڑ کو پریشان کرنا شروع کرے تو بھیڑ کو بلا لحاظِ مرتبہ اجازت ہوگی کہ بھیڑیے کو گدّی سے پکڑ کر قریب ترین جھنڈ میں لے جائے اور عدالت کے سامنے پیش کر دے۔“

اس قانون میں ہر وہ چیز موجود ہے جس کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ اس کی رُو سے بھیڑیوں کو سزا سے خوفزدہ ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ پھر بہر صورت خواہ کوئی بھیڑ مدعی ہو یا مدعا علیہ، بھیڑیا ہی بلا خوف و خطر بھیڑ کو جنگل میں لے کے جائے گا۔

کتوں کی دوستی

باورچی خانے کی کھڑکی تلے بارلس اور پولکن دھوپ کھا رہے تھے۔ بہتر تو یہ تھا کہ وہ صحن کے سامنے والے پھاٹک پہرہ دے رہے ہوتے۔ مگر وہ پیٹ بھر کھا چکے تھے۔ اور پھر کہیں شریف کتے بھی دن کے وقت بھونکتے ہیں۔؟ چنانچہ وہ آپس میں ہر طرح کی گفتگو اور بحث مباحثہ کرنے لگے۔ اپنی کتوں کی سی ملازمت کے بارے میں خیر و شر کے مسئلے پر اور آخر میں دوستی کا موضوع بھی چھڑا۔

پولکن نے کہا ”اس سے بڑی نعمت کیا ہوگی کہ دو دوست ایک دوسرے کی صحبت میں دن گزاریں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ ایک دوسرے کے بغیر نہ کھائیں نہ سوئیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوچیں کہ وہ لمحہ کب آئے گا جب وہ ایک دوسرے کو خوش کر سکیں گے، اور اپنے دوست کی خوش نصیبی پر اپنی مسرت کو قربان کر دیں گے۔ کیوں نہ ہم تم آپس میں ایسی دوستی کا عہد کریں؟ میرا دعویٰ ہے کہ زندگی کا طویل وقفہ چٹکیوں میں گزر جائے گا۔

”بالکل ٹھیک ہے ایسے ہی رہے!“ بارلس نے جواب دیا۔ ”یار پولکن، میں نے برسوں غور کیا ہے کہ ہم ایک ہی صحن کے کتے ہو کر آپس میں لڑے بھڑے بغیر کیوں نہیں بسر کر سکتے؟ آخر کیا وجہ ہے؟ ہمیں خدا نے ایسا مالک بخشا ہے جو نہ تو ہمیں تنگ جگہ میں بند کرتا ہے اور نہ غذا میں کنجوسی برتتا ہے۔ پھر بھی یہ کتنی شرم کی بات ہے۔ زمانے کے آغاز سے لے کر اب تک کتوں کی

دوستی ضرب المثل ہے اور آدمیوں کی دوستی بھی تو ہم سے کسی طرح بہتر نہیں کہی جا سکتی!"

"آؤ! ہم اپنے دور کے لیے ایک مثال قائم کریں۔" پولکن نے کہا۔

"لاؤ، پنجہ ملاؤ۔"

"یہ رہا۔"

فوراً ہی نئے نویلے دوستوں نے آپس میں بغل گیری اور چوما چاٹی شروع کر دی۔ جوش و خروش کی شدت میں ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک دوسرے کو کس سے تشبیہ دیں۔

"میرے راجہ بھوج!"

"میرے گنگو تیلی۔"

"سب جھگڑے، سب رشک، سب حسد، سب بُغض ——— آج ختم ہوئے!"

بدقسمتی سے اسی مرحلے پر باورچی نے کھڑکی میں سے ایک ہڈی پھینکی۔ ہمارے نئے نویلے دوست پورے غیظ و غضب سے اس پر پل پڑے۔

پھر بھلا ان کے معاہدۂ امن کا کیا بنا؟ راجہ بھوج اور گنگو تیلی نے ایک دوسرے کو گلے سے پکڑ لیا اور ان کے بال ہوا میں اڑنے لگے۔ حتیٰ کہ پانی کے ڈریڑے بھی ان کو جدا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔

دنیا ایسے دوستوں سے بھری پڑی ہے۔

باریک بیں

"السلام علیکم۔ کہو بھئی، کدھر سے آنا ہوا؟"

"ذرا چڑیا گھر تک گیا تھا۔ تین گھنٹے وہیں بسر کر کے آ رہا ہوں۔ میں نے وہاں کی ہر چیز دیکھی، ہر شے کا بغور مطالعہ کیا۔ میرے تحیر کا وہاں اتنا سامان تھا کہ سب کو بیان کرنے کی نہ مجھ میں طاقت ہے نہ مہارت۔ قسم بخدا، چڑیا گھر کیا ہے۔ عجائبات کا محل ہے۔ فطرت کی قوتِ ایجاد کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ کیسے کیسے پرندے اور چرندے وہاں جمع ہیں! کیسی کیسی مکھیاں، تتلیاں، پتنگے اور جھینگر وہاں قید کر رکھے ہیں!! اور ننھے ننھے کیڑے مکوڑے، بعض تو ان میں سے، سوئی کے ناکے سے بھی گزر سکتے ہیں"!

"مگر یار تم نے ہاتھی بھی دیکھا؟ بھلا کتنا بڑا ہوتا ہے؟ ضرور جب تم اس کے سامنے کھڑے ہوگے تو تمھیں محسوس ہوا ہوگا جیسے پہاڑ کے سامنے کھڑے ہو!"

"تم وثوق سے کہتے ہو کہ ہاتھی نام کا جانور بھی وہاں ہے؟"

"ہاں، بالکل!"

"دیکھو بھئی بات یہ ہے کہ میں نے غور سے نہیں دیکھا، کیا خبر وہاں ہو بھی یا نہیں!"

پتنگ اور تیتلی

جب اِک پتنگ نے بڑھ بڑھ کے بادلوں کو چھُوا
تو نیچے وادی میں اِک تیتری کو دی یہ صدا
"یقین مانو تمھیں دیکھنا بھی مشکل ہے
نہ جانے چیونٹی ہے، ذرّہ ہے کوئی یا تِل ہے
ہوائے شوق کر مجھ کو اڑائے جاتی ہے
حسد کی آگ میں تم کو جلائے جاتی ہے"
"حسد کی آگ میں؟ اتنا غرور! رہ تو سہی
تمہارے بس میں ہے کیا؟ کھل کے منہ سے کہہ تو سہی
تم آسمان کا تارا بنی ہوئی ہو تو کیا؟
تمہارا جسم زمین تک ہے ڈور میں جکڑا
یہ زندگی تو مسرت سے دور ہے، پیاری
نہیں بلندی پہ ناحق غرور ہے پیاری
میں تم سے پست سہی، آپ اُڑ تو سکتی ہوں
جدھر بھی چاہوں اسی وقت مڑ تو سکتی ہوں
مجھے پسند نہیں زندگی کو روگ لگاؤں
کسی کے لطف کی خاطر غلام بن جاؤں

(چینی)

آزادیٔ تقریر

مصنف:- لن یوتانگ

مترجمہ:- شاہد احمد دہلوی

چند سال ہوئے مجھ سے کہا گیا تھا کہ چینی لیگ برائے حقوقِ عوام میں آزادیٔ تقریر پر ایک خطبہ دوں۔ یہ ایک اہم موضوع ہے اور میں پوری آزادی کے ساتھ اس پر تقریر کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ جب یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص آزادی سے اظہارِ خیال کرنے والا ہے تو سب خائف ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی آزادیٔ تقریر کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اپنے پڑوسیوں کے متعلق کسی کے کیا خیالات ہیں، پڑوسیوں کو یہ بتانے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ معاشرہ صرف اسی بنیاد پر قائم رہ سکتا ہے کہ اس میں کسی حد تک خوبصورت جھوٹ شامل ہو اور کوئی فرد اپنے خیالات کا سچا اظہار نہ کرتا ہو۔

یہ ساری خرابی تقریر کے وجود سے پیدا ہوتی ہے۔ بامعنی زبان صرف انسانوں کی ہوتی ہے۔ کیونکہ جانوروں کی آوازیں صرف جبلّی ضروریات کا اعلان ہوتی ہیں، مثلاً تکلیف، بھوک، خوف اور طمانیت کی آوازیں۔ کتے کی آوازیں طرح طرح کی ہوتی ہیں۔ مگر سب فوری جذباتی ضروریات کو ظاہر کرتی ہیں۔ جب شیر کسی آدمی کو نگل جاتا ہے تو اطمینان سے ہونکتا ہے، لیکن ہمارے قبلِ جنگ کے ایک جنرل کی طرح ایک اخبار نویس کو قتل کرتے ہوئے یہ نہیں کہتا کہ "دیکھو جی! میرا اخلاقی طیش مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں تمہیں نگل جاؤں۔ کیونکہ تم جمہوریۂ چین کے خطرے میں ڈال رہے ہو۔" صرف نسلِ انسانی ہی ایسی حقیقی انسانی زبان کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ ہے فرق انسان اور حیوان میں

میں اسی وجہ سے جنرل ہوچینن کی رائے سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔ جنھوں نے ایک دفعہ جدید نصابِ تعلیم کو یہ کہہ کر غلط ٹھہرایا تھا کہ ان میں ریچھ سے یہ یہ باتیں کہلوائی ہیں، اور خرگوش سے یہ یہ کہلوایا گیا ہے۔ یوں جانوروں کو ان باتوں سے متہم کیا گیا ہے۔ جو وہ کہہ ہی نہیں سکتے اور حیوانوں کو اتنا ہی کج اندیش بنانے کی کوشش کی ہے جتنا کہ انسان ہے۔ حکایاتِ لقمان تمام تر دنیائے حیوانی کی صریح اہانت کرتی ہیں۔ اور اگر حیوان انھیں پڑھ سکتے تو ان کا ایک لفظ بھی ان کی سمجھ میں نہ آتا۔ انگوروں کے خوشے تک جب لومڑی کی رسائی نہیں ہوتی تو بس وہ چلی جاتی ہے۔ وہ اتنی بدمذاق نہیں ہوتی کہ انگور کھٹے ہیں" کہے۔ انسان کے علاوہ کوئی انسان اتنی گھٹیا بات نہیں کہہ سکتا۔ افیون کاشت نہ کرنے والوں سے ٹیکس وصول کر کے اگر کوئی لومڑی چینی کاشتکاروں کو افیون کے پودے لگانے پر مجبور کرے تو وہ اسے "کاہلی دور کرنے کا ٹیکس" نہیں کہے گی۔ اور اگر کہے گی تو وہ دیانتدار لومڑی نہیں ہوگی ......

لہٰذا انسان اور حیوان میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ انسان باتیں کرتا ہے اور جانور آوازیں نکالتا ہے۔ برنارڈ شا نے سچ کہا

ہے کہ صرف ایک قسم کی آزادی حاصل کرنے کے لائق ہے۔ اور وہ ہے چوٹ کھانے پر مظلوموں کو آواز نکالنے کی آزادی، اور ان حالات کو دور کرنے کی آزادی جن سے انھیں تکلیف پہنچ رہی ہو۔ چین میں جس قسم کی آزادی کی ہمیں ضرورت ہے وہ آزادیٔ تقریر نہیں ہے بلکہ قطعی یہی آزادی ہے کہ جب کسی کو تکلیف پہنچے تو وہ آواز نکال سکے۔ باتیں ہم سب کافی کر لیتے ہیں لیکن ہم میں بہت کم ایسے ہیں جو چوٹ کھانے پر آواز نکال سکیں۔ ہماری زبان اس درجہ شائستہ ہے کہ ہماری حیاتی ضروریات کا اظہار شاذ ہی کر سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان اور حیوان میں ایک فرق یہ بھی ہے۔ رات کو جب بلی چیخنا شروع کرتی ہے تو اسے پوری پوری آزادی حاصل ہوتی ہے اور اس کی آواز ہمیشہ پُر معنی ہوتی ہے۔ یہ بات چینی کاشت کار کو حاصل نہیں ہے۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے گھر جا کر بکتا جھکتا ہے اور ڈرتا ہے کہ اس کے بکنے جھکنے کو کہیں کوئی سن نہ لے۔

آزادیٔ تقریر کا تصور غیر ملکی ہے، کیونکہ چین میں کبھی بھی اس کا وجود نہیں رہا۔ اپنی عظیم عقلِ سلیم سے ہم نے بولنے کی نہیں خاموشی کی ہمیشہ تعریف کی ہے۔ ہمارے ہاں کی ایک کہاوت ہے کہ ”تمام بیماریاں منہ کے ذریعے اندر آتی ہیں۔ اسی طرح جیسے ساری خرابیاں منہ کے ذریعے باہر آتی ہیں“۔ چینی افسروں نے ہمیشہ بڑی احتیاط برتی ہے کہ ”لوگوں کے منہوں پر زیادہ اور دریاؤں پر کم پشتے باندھے ہیں۔“ اور عوام کے منہ ہمیشہ پشتہ بستہ ہوتے ہیں۔ صرف ایک کہاوت ایسی تلاش کرنے میں مجھے کامیابی ہوئی ہے جس میں ایک طرح کی آزادیٔ تقریر کی کچھ حمایت کی گئی ہے وہ یہ ہے :-

انھیں ہنسنے دو اور دھمکانے دو جو ہنسنا چاہتے ہیں اور دھمکانا چاہتے ہیں۔ میں ایک اچھا افسر ہوں، میں ایک اچھا افسر ہوں۔

مگر اس کا مطلب وہی نہیں ہے جو آزادیٔ تقریر کا۔ کیونکہ یہ آزادی صرف اس حد تک ہے جس حد تک لوگوں کی ہنسی اور نفرت تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ جب تکلیف دہ ہو جائے تو ”اچھا افسر“ انھیں گولی سے اڑا سکتا ہے۔

لہٰذا ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ تقریر کلیتاً ایک باعثِ تکلیف امر ہے اور افسروں کی نگاہ میں آزادیٔ تقریر اس سے بھی بڑا باعثِ تکلیف امر۔ افسر خاموش لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جو تکلیف پہنچنے پر نہ تو بولتے ہیں نہ آواز نکالتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ادارۂ تحفظِ عوام کا کوئی سراغ رساں میرے سامعین میں شریک ہے تو وہ سوچ رہا ہوگا کہ میں ایک بہت بڑی لعنت ہوں، اور سارے سامعین جو اس قدر خاموش بیٹھے ہیں ”گلدانوں کی طرح منہ بند کیے“ مجھ سے کہیں بہتر شہری ہیں۔ یہ عینِ فطرت ہے۔

ہمیں یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ لوگوں کے لیے آزادیٔ تقریر کا جو مطالبہ ہم کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افسروں کے لیے کوئی آزادیٔ عمل نہ رہے۔ افسر بھی اپنی آزادی سے اس قدر محبت کرتے ہیں جتنی ہم اپنی آزادی سے۔ جب ہم اخباروں کے لیے آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو دراصل ہمارا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اخباروں کا منہ بند کرنے کا جو اختیار افسروں کو حاصل ہے وہ ان سے چھین لیا جائے۔ جب ہم فرد کی آزادی کا مطالبہ ایک دستوری حق قرار دے کر کرتے ہیں تو لوگوں کے سر اڑا دینے کی آزادی جو افسروں کو حاصل ہے سلب کر لینا چاہتے ہیں۔ ان دونوں آزادیوں میں پرلے سرے کی ضد ہے۔ اس کا کوئی

علاج نہیں ہے۔

اگر میں افسر ہوتا تو میں بھی یہی چاہتا کہ کسی دن اگر میری طبیعت مکدر ہو تو جب اور جتنے چاہوں لوگوں کے سر اڑانے کی آزادی مجھے حاصل ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میرے شہر چانگ چاؤ کے جنرل چانگ لی کو اس قسم کی آزادی حاصل تھی اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جب ان کی طبیعت مرجھا رہی ہوتی اور اسے اکسانے کی انھیں کوئی صورت نظر نہ آتی تو تکدر کو دُور کرنے کے لیے ایک پرچی پر صرف دو سطریں لکھ دیتے اور ان کا دردِ سر دور کرنے کے لیے ان کے سامنے کئی قیدیوں کے سر اتار دیئے جاتے۔ میں اس حقیقت کا اظہار بے خوف و خطر کر رہا ہوں۔ کیونکہ جنرل چانگ پی کا انتقال ہو چکا ہے۔

لہٰذا جب چینی لیگ برائے حقوقِ عوام نے افسروں کی آزادیوں میں کمی اور عوام کے حقوق کا تحفظ کرنے کا مطالبہ کیا تو فوجیوں اور افسروں کی آنکھوں میں لیگ کھٹکنے لگی۔ فوجی چاہتے تھے کہ لوگوں کو سزائے موت خفیہ عدالتوں میں دی جائے۔ لیکن لیگ نے کھلی عدالتوں میں مقدمے چلانے کا مطالبہ کیا۔ افسر یہ چاہتے تھے کہ اپنے مخالفوں کو چپکے سے پکڑ کر روئے زمین سے انھیں غائب کر دیں۔ مگر لیگ تار پہ تار بھیجتی، اور مطالبہ کرتی کہ غائب ہونے والوں کا اتہ پتہ بتایا جائے۔ جیسے جیسے لیگ اپنے پروگرام میں کامیاب ہوتی گئی اسی نسبت سے بُری سے بڑی لعنت بنتی گئی۔

تاریخ چین میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ منگ خاندان کے اختتام پر جب تنگ لن علماء حکومت پر نڈر ہو کر آزادانہ اعتراضات کرنے لگے تو انھیں شوئی ہوئی رومانی کہانی کے ۱۰۸ ڈاکوؤں سے تشبیہہ دی گئی۔ عوام میں ان کا نام لینا ممنوع قرار دیا گیا۔ فوجوں کے ہاتھوں وہ مارے گئے۔ ان کے بدلے ایک گروہ اٹھا جس کا سرغنہ سوئی چنگ ہیئو تھا۔ یہ وہ گروہ تھا جس کے بارے میں ہمعصر کہا کرتے تھے کہ اس میں ”پانچ شیر، پانچ چیتے، پانچ کتے، دس بیٹے، چالیس پوتے شامل ہیں۔ مگر ہوا یہ کہ تنگ لن علماء قید کیے گئے۔ انھیں عذاب دیئے گئے اور ان کے سر اڑا دیئے گئے اور شیروں اور چیتوں اور کتوں نے بازی جیت لی۔

موجودہ کیفیت کے متعلق یہ توقع رکھنا کہ اگلے زمانے سے مختلف ہوگی۔ احمقانہ بات ہوگی۔ عوام کے حقِ تقریر کا مطالبہ جو بھی کرے پہلے فوجوں کی دشمنی کا بندوبست کر لے۔ چینی لیگ برائے حقوقِ عوام اور منگ خاندان کے تنگ لن علماء میں فرق یہ ہے کہ لیگ اصولِ آزادی تقریر کے لیے ”ایک دستوری اصول“ کی بنیاد پہ لڑ رہی تھی۔ جب تنگ لن علماء نے مشہور بدمعاش خوجے اور باغی وائی چنگ ہسین کو ملزم ٹھہرایا تو اس بدنام و رسوا خوجے کو صرف یہ کرنا پڑا کہ شہنشاہ کے حضور آنسو بہائے اور علماء کو دربار سے نکلوا دے۔ بنیادی اعتبار سے صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ کسی نئے اصول کے لیے صرف اصولی طور پر لڑنے ہی سے صورت حال میں تبدیلی ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔

(عربی)

مُلّاجی اور اُن کا خلیفہ

مصنف :- ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجم :- شیخ محمد احمد پانی پتی

جدید عربی ادب کے معماروں میں مصر کے مشہور نابینا عالم اور مصر کے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا نام سرِفہرست ہے۔ ان کی تحریریں فلسفیانہ رنگ لیے ہوتی ہیں اور معاشرہ کی بوقلمونیوں پر ان کا قلم طنز کے گہرے نشتر لگاتا ہے۔ انھوں نے "الایّام" کے نام سے دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے مشہور سلسلہ مضامین "یادِ ایام عشرت فانی" کی طرز پر اپنے بچپن اور زمانۂ تعلیم کے حالات بڑے پُرلطف طریقے سے بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب بظاہر ایک شخص کے ذاتی حالات پر مشتمل چند واقعات کا مجموعہ ہے۔ لیکن دراصل اس میں اس معاشرہ کی پوری کیفیت بیان کر دی گئی ہے جس سے ڈاکٹر صاحب کو گزرنا پڑا۔ اساتذہ کے اطوار اور علماء و مشائخ کے مشاغل کا حال انہوں نے جس طرح مزے لے لے کر بیان کیا ہے اس سے دو باتیں عیاں ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ بلادِ عربیہ کا معاشرہ ہمارے معاشرے سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ دوم یہ کہ عربی کی جدید مزاح نگاری ہمارے ہاں کی مزاح نگاری کے بہت حد تک مماثل ہے۔

"یہ دکھانے کے لیے کہ عربی کے مزاحیہ ادب کے رجحانات کیا ہیں۔ ذیل میں اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے مکتب کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ گو یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ لیکن کتاب میں ہر جگہ انہوں نے اپنے لیے "میں" یا "ہم" کی بجائے "بچہ" یا "ہمارا دوست" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لہٰذا ترجمہ میں بھی انہی الفاظ کو برقرار رکھا گیا ہے۔

مکتب کا خلیفہ بھی مُلّاجی کی طرح عجیب و غریب خصلتوں کا مالک تھا۔ ناٹے قد اور توے کی طرح سیاہ رنگ کے اس آدمی کا بخت بھی اس کے چہرے کی طرح سیاہ تھا۔ جہاں جاتا نحوست اس کی پیشوائی کے لیے پہلے سے موجود ہوتی۔ جس کام میں

ہاتھ ڈالا ناکامی بڑھ بڑھ کر قدم چومتی۔ اس کے باپ نے کئی کاریگروں کے پاس بٹھایا کہ کوئی ہنر سیکھ کر اپنی گزر اوقات کا ذریعہ پیدا کرے۔ مگر خیر سے دماغ ہی ایسا نہ پایا تھا کہ صنعت و حرفت کی پیچیدگیوں کو سمجھ سکتا۔ اس کے بعد سے اس کے باپ نے کئی کارخانوں میں نوکر کرایا کہ اور کچھ نہ سہی چوکیداری کر کے اپنا پیٹ پالے۔ مگر نحوست نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اس کے دوسرے بھائی بھی تھے جو خوب کماتے تھے۔ مگر یہ پوستیوں کی طرح سارا دن گھر میں بیٹھا مفت کی روٹیاں توڑا کرتا تھا۔ ایک دن کہیں اس نے مکتب کے مُلّاجی کو اپنا دکھڑا جا سنایا۔ مُلّاجی کو مکتب کے لیے ایک نائب کی ضرورت تھی اور انھوں نے اسی کو غنیمت جانا اور اس سے کہنے لگے:

”تم ہمارے ہاں آجاؤ۔ میں لڑکوں کو قرآن کریم پڑھاتا اور حفظ کراتا ہوں۔ تم انھیں عربی لکھنا پڑھنا سکھا دیا کرو۔ ان کا سبق سُن لیا کرو اور ان کی نگرانی کیا کرو کہ کہیں وہ میری غیر حاضری میں کھیل کود میں تو وقت ضائع نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ صبح سویرے بچوں کے آنے سے قبل مکتب کی صفائی کر دیا کرو۔ اور عصر کے بعد مکتب کو بند کر کے تالا لگا دیا کرو۔ میں اس کے معاوضہ میں تمھیں آمدنی کا چھوٹا حصہ دے دیا کروں گا۔“

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ خلیفہ کو پہلے ہی روزگار کی تلاش تھی اس نے مُلّاجی کی پیش کش فوراً قبول کر لی اور قول و قرار کے بعد مُلّاجی کی نیابت کے طور پر کام شروع کر دیا۔

دونوں ساتھ ساتھ کام تو کر رہے تھے لیکن ”من ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو“ والا حال تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو نفرت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن چونکہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر گزارہ ہونا مشکل تھا۔ اس لیے مجبوراً چاپلوسی اور خوشامد سے کام لیتے تھے۔

خلیفہ کو مُلّاجی سے اس لیے نفرت تھی کہ وہ انھیں اوّل درجے کا مکّار، فریبی اور بھوکا خیال کرتا تھا۔ مُلّاجی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مکتب کی کل آمدنی کا چوتھا حصہ خلیفہ کو بطور تنخواہ دیا کریں گے۔ لیکن آمدنی کا بہت سا حصہ خلیفہ کو بتائے بغیر خود ہی ہضم کر جایا کرتے تھے۔ بچوں کے والدین اکثر مُلّاجی کے لیے عمدہ کھانے تیار کر کے بھیجا کرتے تھے۔ مُلّاجی انھیں اکیلے ہی اکیلے چٹ کر جاتے اور غریب خلیفہ کو ان کی ہوا بھی نہ لگنے دیتے تھے۔

ادھر مُلّاجی کا یہ حال تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ خلیفہ کو کچا ہی چبا ڈالتے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب دوپہر کو دونوں کھانا کھانے بیٹھتے تو خلیفہ مُلّاجی کے اندھے پن سے فائدہ اٹھا کر روٹیاں چرا لیتا اور انھیں کسی دوسرے وقت مزے سے کھاتا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی مزے دار یا نفیس چیز دسترخوان پر ہوتی تو اس کا بھی بہت سا حصہ خود ہی ہتھیا لیتا۔ مُلّاجی نے اسے رکھا تو اس لیے تھا کہ وہ بچوں کی نگرانی کرے اور کھیل کود میں نہ پڑنے دے۔ لیکن اس نے خود مکتب میں پڑھنے والے بعض بڑی عمر کے لڑکوں سے یارانہ گانٹھ رکھا تھا اور انھیں پڑھائی میں مشغول رکھنے کی بجائے ان کے ساتھ گپیں مارتا رہتا تھا۔

مُلّاجی کی بے ایمانی اور ان کے نائب کی حرام خوری کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے تعاون کے محتاج تھے۔ اگر خلیفہ مکتب چھوڑ کر چلا جاتا تو گلیوں میں جوتیاں چٹخانے کے سوا اس کے لئے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اور اگر مُلّاجی خلیفہ کو جواب دے دیتے تو مکتب کی دیکھ بھال اور اس کا انتظام کون کرتا؟ کیونکہ یہ کام اکیلے مُلّاجی کے بس کا نہ تھا۔

ہمارے دوست نے جب قرآن کریم حفظ کر لیا تو ملّاجی نے اسے خلیفہ کے سپرد کر دیا اور اسے ہدایت کر دی کہ وہ روزانہ چھ پارے خلیفہ کو سنایا کرے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں بچے نے خلیفہ کو سبق سنانا شروع کر دیا۔ لیکن یہ سلسلہ تین روز سے زیادہ نہ چل سکا۔ بچہ کو پہلے ہی روز سناتے سناتے جمائیاں آنے لگیں۔ خلیفہ دو روز تک سُن کر اکتا گیا۔ تیسرے روز دونوں کا بھید ایک دوسرے پر ظاہر ہو گیا۔ آخر چوتھے روز یہ قرار پایا کہ بچہ خلیفہ کے سامنے دوزانو ہو کر خود ہی چھ پارے آہستہ آہستہ پڑھ لیا کرے۔ اور اگر کہیں بھول جائے تو خلیفہ سے پوچھ لیا کرے۔ چنانچہ اب بچے کا روزانہ کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ صبح آکر خلیفہ کو سلام کرتا اور اس کے سامنے دوزانو ہو کر ہونٹوں کو اس طرح حرکت دینے لگتا جیسے قرآن کریم پڑھ رہا ہو۔ خلیفہ کو دکھانے کے لیے کبھی کبھی اس سے کوئی لفظ بھی پوچھ لیتا ملّاجی ظہر کی نماز سے پہلے مکتب میں آیا کرتے تھے۔ آتے ہی وہ بچے کو بلاتے اور پوچھتے :۔

”تم نے آج کا سبق پڑھ لیا ؟“

بچہ جواب دیتا ”جی ہاں“۔

”کہاں سے کہاں تک پڑھا ہے ؟“ ملّاجی دوبارہ استفسار کرتے۔

بچہ بتا دیتا کہ فلاں سورۃ سے فلاں سورۃ تک پڑھا ہے اور ملّاجی مطمئن ہو کر دوسرے لڑکوں کو پڑھانے میں مشغول ہو جاتے۔

مکتب میں رہ کر اور ملّاجی کے عادات و خصائل دیکھ کر خلیفہ نے بھی ہاتھ پیر نکالنے شروع کر دیے تھے۔ پہلے تو اس نے بچے کا سبق سننے کے جھنجھٹ سے نجات حاصل کی۔ لیکن اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اس نے لڑکے کی حالت کا اندازہ لگا کر اس سے رشوت وصول کرنے کی ٹھانی۔ وہ وقتاً فوقتاً اسے اس قسم کی دھمکیاں دینے لگا کہ میں ملّاجی سے تمہاری شکایت کروں گا اور کہوں گا کہ تمہیں فلاں سورت یاد نہیں رہی۔ اور قرآن کریم کا فلاں حصّہ تم بالکل بھول گئے ہو۔ ادھر حال یہ تھا کہ نگرانی ختم ہونے کی وجہ سے لڑکے کو ایک سورۃ تو کیا پورا قرآن کریم ہی بھول گیا تھا اور اس کا کوئی حصّہ بھی اسے پوری طرح یاد نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر کسی دن ملّاجی نے اس کا امتحان لے لیا تو پھر اس کی خیر نہ ہو گی۔ اس ڈر کے باعث وہ ہر طرح خلیفہ کی خوشامد میں لگا رہتا تھا اور اس کا منہ بند رکھنے کے لیے اسے مختلف قسم کی سوغاتیں لا کر دیا کرتا تھا۔ کبھی روٹی لا دی، کبھی کھجوریں لا دیں، کبھی اپنے جیب خرچ کے پیسے اس کے حوالے کر دیئے۔ گرمیوں کے موسم میں شربت بنانے کے لیے مصری کی ڈلیاں لا دیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات تو اسے دوپہر کا کھانا بھی اس ڈر سے خلیفہ کے حوالے کرنا پڑتا تھا کہ کہیں وہ ملّاجی سے اس کی شکایت نہ جڑ دے۔ لیکن جو چیز مقدر میں ہو، وہ تو بہرحال ہو کر ہی رہتی ہے۔

جمعرات کا دن تھا۔ ہمارے دوست نے حسبِ معمول خلیفہ کے سامنے بیٹھ کر سبق ”یاد“ کیا اور ملّاجی کو بھی یہ اطمینان دلا کر کہ اس نے آج کا سبق دہرا لیا ہے۔ کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ چھٹی ہونے پر سیدھا اپنے گھر جانے کی بجائے وہ دو ملّوں کے ساتھ عصر کی نماز پڑھنے جامع مسجد میں چلا گیا۔ وہ اکثر جامع مسجد چلا جاتا اور وہاں منارہ پر چڑھ کر دور دور کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی جوتیاں مسجد کے ایک کونے میں رکھ کر منارہ پر چڑھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد نیچے اترا اور نماز پڑھی۔ نماز پڑھنے

کے بعد جب جوتیاں دیکھیں تو غائب۔ مسجد کا کونا کونا چھان مارا مگر کہیں ہوتیں تو ملتیں۔ مجبوراً ننگے پیر گھر واپس آنا پڑا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی باپ نے پوچھا:۔

"جوتیاں کہاں ہیں؟"

اس نے اس خیال سے کہ اگر سچ بولوں گا تو پٹوں گا، کہہ دیا:۔

"مکتب میں بھول آیا۔"

خیر بات آئی گئی ہوئی اور بچہ اپنے بہن بھائیوں کے پاس جا کر کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے اس کے باپ نے آواز دی۔ وہ کھیل کود چھوڑ کر باپ کے پاس پہنچا تو باپ نے پوچھا:۔

"آج تم نے مکتب میں کیا پڑھا؟"

لڑکے نے جواب دیا "آج میں نے آخری چھ پارے پڑھ کر قرآن کریم کا ایک دور ختم کر لیا۔"

باپ نے پوچھا "اس کا یہ مطلب ہے کہ اب تمہیں قرآن کریم پوری طرح حفظ ہو گیا ہے"؟

لڑکے نے جواب دیا "جی ہاں"

باپ نے کہا:۔

"سورہ سبا سناؤ"

مگر وہاں ایک سورۃ سبا کیا، لڑکا پورا قرآن کریم ہی بھول چکا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکا۔ باپ نے کہا:۔

"اگر سورۃ سبا یاد نہیں تو سورۃ فاطر پڑھو۔"

وہاں بھی یہی حال تھا۔

باپ نے کہا:۔

"تم تو کہتے تھے مجھے سارا قرآن ازبر یاد ہے۔ اچھا سورۃ یٰسین ہی سناؤ۔"

لڑکے نے چند آیات تو سنائیں مگر آگے چل کر پھر زبان رُک گئی۔

باپ نے کہا:۔

"اچھا اب تو تم جاؤ۔ اس وقت تمہیں تو کچھ نہیں کہتا۔ فی الحال تمہارے مُلّا جی سے نبٹ لوں گا۔"

چنانچہ لڑکا سر جھکائے باپ کے کمرے سے نکل کر اپنے حجرے میں آ کر مغموم و ملال ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

مغرب کی نماز کے بعد اس کے باپ نے اسے پھر آواز دی۔ وہ اس کے کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ مُلّا جی بھی تشریف فرما ہیں۔ بجائے اس کے کہ باپ کچھ پوچھتا، ملّا جی نے بچہ سے پوچھا:۔

"بتاؤ کیا آج تم نے مجھے قرآن کریم کے چھ پارے نہیں سنائے تھے؟"

لڑکا ملّا جی کی صریح دروغ گوئی پر حیران و ششدر رہ گیا مگر کیا کرتا۔ باپ کے سامنے ملّا جی کو کس طرح جھٹلاتا۔ کہنا ہی پڑا۔

"جی ہاں سُنائے تھے۔"

ملّاجی نے پوچھا "کیا تم نے مجھے کل سورۂ سباء نہیں سنائی تھی؟"

لڑکے کو اس کا اقرار بھی کرنا پڑا۔

"تو پھر آج تمہیں کیا ہوا کہ تم اپنے والد کو یہ سورۃ نہ سنا سکے؟"

لڑکا چُپ۔

"اچھا اب میرے سامنے سورۃ سباء سناؤ۔"

مگر لڑکے کو یاد ہوتی تو باپ ہی کو کیوں نہ سناتا۔ خاموش کھڑا رہا۔

باپ نے کہا "اگر سورہ سباء یاد نہیں تو سورۃ سجدہ ہی سناؤ۔"

لڑکا وہ بھی نہ سنا سکا۔

یہ دیکھ کر باپ کا پارہ یکدم چڑھ گیا اور وہ ملّاجی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"یہ سب کچھ تمہارا قصور ہے۔ میں اسے تمہارے پاس اس لیے بھجواتا تھا کہ تم ہر طرح اس کی نگرانی کرو گے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ یہ مکتب میں جا کر پڑھنے لکھنے کی بجائے کھیلتا کودتا پھرتا ہے۔ اگر تم اس کی صحیح نگرانی کرتے تو اس کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ آج یہ ننگے پاؤں گھر واپس آیا اور میرے پوچھنے پر کہا کہ میں اپنی جوتیاں مکتب میں بھول آیا ہوں۔ جب تم ایسی معمولی باتوں کی بھی نگرانی نہیں کر سکتے تو پڑھائی کی نگرانی کیا خاک کرتے ہو گے؟"

ملّاجی یہ سُن کر بولے:۔

میں خدائے پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اسے کبھی اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیا اور ہر طرح اس کی نگرانی کی۔ آج میں چھٹی ہونے سے ذرا پہلے مکتب سے اٹھ کر چلا آیا تھا ورنہ مجال تھی کہ آپ کا لڑکا ننگے پیر چلا آتا؟ پڑھائی کی طرف سے بھی میں نے کبھی غفلت نہیں برتی۔ میں روزانہ اس سے سبق سنتا ہوں اور جب تک یہ سبق یاد نہیں کر لیتا چھٹی نہیں دیتا۔"

باپ نے یہ سُن کر جواب دیا:۔

"مجھے تو تمہاری ایک بات کا بھی یقین نہیں۔"

ملّاجی کہنے لگے۔

"اگر میں نے آپ سے آج تک ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولا ہو تو میری بیوی پر تین طلاق۔ میں آپ سے سچ سچ کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کے لڑکے سے چھ پارے روزانہ سنتا ہوں۔"

باپ نے کہا "اگر سنتے ہوتے تو یہ نوبت نہ آتی۔"

ملّاجی نے کہا:۔

"استغفر اللہ! آپ کا یہ خیال ہے کہ آپ کے ہاں سے مجھے ماہ بماہ تنخواہ ملتی ہے وہ مجھے اپنی بیوی سے زیادہ

عزیز ہے۔ حالانکہ میں ابھی سے کہہ چکا ہوں کہ اگر میں نے ایک بار بھی آپ سے جھوٹ بولا ہو تو میری بیوی پر تین طلاق۔"

باپ نے جواب دیا:-

"ملا جی ان باتوں کو چھوڑو۔ لڑکا کل سے تمہارے مکتب میں پڑھنے نہیں جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ملا جی نے بھی بصد حسرت و یاس اپنے گھر کی راہ لی۔ صرف لڑکا اپنی جگہ پر بیٹھا رہ گیا۔ دنیا بھر کے خیالات اس کے ذہن سے نکل چکے تھے۔ اگر کوئی خیال رہ گیا تھا تو صرف یہ کہ ملا جی نے کتنی آسانی سے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔

باپ نے لڑکے کے لیے ایک اور حافظ صاحب کا انتظام کیا جو روزانہ گھر پر آ کر از سر نو لڑکے کو قرآن کریم حفظ کراتے تھے۔ عصر کے وقت ملا جی کے مکتب سے اس کے سابق ہم سبق آجاتے اور وہ ان کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاتا۔ چونکہ اسے پکا یقین تھا کہ اس کے والد اسے کبھی مکتب میں نہیں بھیجیں گے۔ اس لیے ملا جی اور ان کے خلیفہ کے بارے میں اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی، اور وہ ان کے مکر و فریب، حرص و طمع اور دروغ گوئی کی داستانیں بڑے مزے لے لے کر اپنے دوستوں کو سناتا تھا اور اس کے دوست بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔

لیکن عیش اور مسرت کا یہ زمانہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ ملا جی زیادہ دیر تک صبر نہ کر سکے۔ کیونکہ ہمارے دوست کے مکتب سے اٹھ جانے کی وجہ سے ان کی آمدنی میں بہت فرق آ گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے بعض آدمیوں کے توسط سے لڑکے کے والد سے التجائیں کرنی شروع کیں کہ وہ اپنے لڑکے کو دوبارہ مکتب میں بھیجنا شروع کر دیں۔ بالآخر والد کا دل بھی نرم پڑ گیا اور انہوں نے لڑکے کو دوبارہ ملا جی کے سپرد کر دیا۔ اگر معاملہ اسی حد تک رہتا تب بھی کوئی بات نہ تھی لیکن ہوا یہ کہ اس کے ہمجولیوں نے جو شام کو آ کر اس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے وہ تمام باتیں ملا جی اور خلیفہ کے سامنے دہرانی شروع کر دیں جو ہمارے دوست نے ان کی شان میں کہی تھیں۔ شرمندگی کے مارے اس کا برا حال ہوتا مگر کیا کر سکتا تھا۔

ان تمام واقعات سے ہمارے دوست کو اندازہ ہو گیا کہ بزرگوں کی باتوں اور قسموں پر اعتبار کرنا انتہائی نادانی اور حماقت ہے۔ اس کے والد نے قسم کھائی تھی کہ ان کا لڑکا آئندہ ہرگز مکتب میں پڑھنے نہ جائے گا۔ لیکن چند ہی دنوں میں ان کی قسم ٹوٹ گئی اور لڑکا دوبارہ ملا جی کی جھڑکیاں اور گالیاں کھانے کے لیے مکتب میں آ گیا۔ تقدس مآب ملا جی نے فرمایا تھا کہ اگر انہوں نے زندگی میں ایک بار بھی جھوٹ بولا ہو تو ان کی بیوی پر تین طلاق۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں صریح جھوٹ ہے۔ اور تو اور اس کے ہمجولی جن کی اس کے دانت کاٹی روٹی تھی اور جو ہر روز اس کے پاس آ کر ملا جی اور خلیفہ کو گالیاں سنایا کرتے تھے اب انہی ملا جی اور خلیفہ سے اس کی چغلیاں کھایا کرتے اور اسے پٹتے دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔ اسے اپنے بہن بھائیوں سے ہمدردی کی کچھ امید تھی لیکن اسے چڑانے میں وہ بھی دوسروں سے کم نہ تھے۔ ان حالات میں ہمارے دوست کے لیے صبر اور خاموشی کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

(اطالوی)

سنہرا گدھا

مصنّف: لیوسیئس اپولیس

مترجم: شاہد احمد دہلوی

پجاری ہجڑوں کے ساتھ

صبح ہوتے ہوتے ہم نے بہت سارا راستہ طے کر لیا اور جب سورج نکلا تو ہم ایک سنسان مقام پر پہنچے۔ یہاں دیر تک خوب صلاح مشورہ کرتے رہے اور آخر میں فیصلہ یہ ہوا کہ مجھ پر رحم بالکل نہ کیا جائے۔ انہوں نے دیوی کی مورتی میری پیٹھ پر سے اتار کر زمین پر رکھ دی، پھر میری کاٹھی اتار دی، مجھے ایک درخت سے باندھا اور گول ہڈیوں کے درّے سے مجھے اتنا سوڑا کہ میں دم توڑنے لگا۔ ان میں ایک یہ چاہتا تھا کہ تبر سے میرے بکلّ اڑا دے کیونکہ میں نے اس کے تقدّس کو رسوا کیا تھا۔ مجھ سے یوں انتقام لینا چاہتا تھا۔ مگر دوسرے پجاریوں نے اسے باز رکھّا، اس وجہ سے نہیں کہ مجھ پہ ترس آ رہا تھا بلکہ اس اندیشے سے کہ اگر مجھے مار ڈالا گیا تو پھر دیوی کی مورتی کس پر لادی جائے گی؟ لہٰذا انہوں نے پھر مجھے لادا اور اپنی تلواروں کے پھلوں سے مار مار کر ہنکالتے رہے یہاں تک کہ ہم اگلے بڑے شہر میں جا پہنچے۔ وہاں کے ایک بڑے شہری نے، جو بڑا مذہبی خیال کا آدمی تھا، ہمارے جھانجھ، تاشوں اور نرسنگھے کی فریجی غمناک موسیقی کا شور سنا۔ وہ ہمارا استقبال کرنے کے لیے باہر نکل آیا اور اس نے دیوی کی اقامت کے لیے بڑی عقیدت سے اپنا مسکن پیش کیا۔ دیوی کے ساتھ ہم سب گھر میں داخل ہوئے۔ دیوی کو خوش کرنے کے لیے ہر ممکن احترام کا مظاہرہ کیا گیا اور اچھی سے اچھّی بھینٹ چڑھائی گئی مگر یہی وہ جگہ تھی جہاں میں مرتے مرتے بچا۔

ہوا یہ کہ ہمارے میزبان کے ایک دیہاتی کرایہ دار نے ایک بارہ سنگھا شکار کیا۔ اس کی ایک موٹی تازی ران تحفۃً ہمارے میزبان کو بھیجی، ہیپیس شن رکابدار نے مطبخ کے دروازے میں بے پروائی سے اسے اتنا نیچا لٹکا دیا کہ ایک کتا گھومتا پھرتا آیا اور ران کھینچ کر لے بھاگا۔ جب ہیپیس شن نے دیکھا کہ ران غائب ہو گئی تو اس نے بری طرح رونا شروع کر دیا، کیونکہ سارا الزام اسی پر آتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کرے۔ اور جب آقا کھانا طلب کرے گا تو کیا گزرے گی؟ مارے خوف کے اس کی یہ حالت ہو گئی کہ اس نے اپنے چھوٹے بچے کو اپنے پاس بلایا، اُسے خوب پیار کیا اور بڑی دل ریشی سے اُسے رخصت کیا۔ اُس کے بعد ایک رسّی لی اور پھانسی لگا کر خودکشی کرنے چل پڑا۔ اس کی بیوی کو اس سے بہت محبّت تھی، اُسے اس بھیانک ارادے کی اطلاع اتفاق سے فوراً مل گئی۔ اس نے رکابدار کے ہاتھ سے رسّی چھین لی اور بولی "میرے پیارے ہیپیس شن، کیا تم بالکل اندھے ہو گئے؟ اس واقعہ نے اس قدر الٹا دیا کہ وہ دروازہ بھی تمہیں نہیں سوجھتا جو غیب سے تمہارے بچ نکلنے کے لیے کھل گیا ہے؟ اس خوفناک واقعہ کے علم کے بعد اگر تم میں کچھ بھی عقل باقی رہ گئی ہے تو میری بات مانو۔ پجاریوں کا گدھا تم نے دیکھا ہے نا، جسے آج گھر میں لایا گیا ہے؟ اسے کسی ویرانے میں لے جا کر حلال کر ڈالو۔ پھر اس کی ایک ران کاٹ کر ویسی ہی بنا لو جیسی جاتی رہی ہے۔ اسے پکا پکا کر خوب گلا لو، مزیدار مسالے ڈال کر اس کی بو مار دو، اور اسے شکار کا گوشت کہہ کر آقا کی میز پر لگا دو۔"

بدمعاش رکابدار مجھے مار کر اپنی جان بچانے کی تدبیر سن کر مارے خوشی کے کھل گیا۔ اپنی جورو کو اس نے دنیا بھر میں سب سے قابل عورت قرار دیا اور لگا اپنی چھریاں تیز کرنے۔

وقت نکلا جا رہا تھا۔ میں بیکار کھڑا نہیں رہ سکتا تھا، جان بچانے کی ترکیب مجھے کوئی سوچنی تھی۔ مجھے اس چھری سے بچنا تھا جو میرے حلقوم سے آ لگی تھی۔ میں نے فوراً اپنی رسّی تڑائی اور سرپٹ بھاگا، اور بھاگنے میں دولتیاں جھاڑنا نہیں بھولا۔ میں پہلے برآمدے میں اڑا چلا گیا اور لحظہ بھر بھی توقف کیے بغیر کمرۂ طعام میں گھس گیا جہاں صاحب خانہ بچاروں کے ساتھ قربانی کا گوشت کھا رہا تھا۔ میں نے ان کے بہت سے برتن گرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور چند میزوں کے بھی پرخچے اڑا دیئے۔ میرے یوں بدتمیزی سے گھس آنے اور نقصان کرنے پر وہ بہت برہم ہوا۔ ایک غلام سے بولا۔ ”اس اُچھل کود کرنے والے بیہودہ جانور کو لے جا اور ایسی جگہ بند کر کہ اس کے شترِ غمزوں سے میرے مہمانوں کے آرام میں خلل نہ پڑے“ اپنی چالاکی کی بدولت چھری سے گلو خلاصی پانے پر میں خوش تھا کہ چلو اب مجھے میرے اصطبل میں حفاظت سے بند کر دیا جائے گا۔

لیکن اگر بدنصیبی شامل حال ہو تو کوئی کتنا ہی دانش مند کیوں نہ ہو ہرگز پنپ نہیں سکتا۔ جو کچھ اس کی قسمت میں پہلے سے لکھ دیا گیا ہے، سے نہ تو بدلا جا سکتا ہے اور نہ ٹالا جا سکتا ہے۔ میری جس چال نے مجھے فوری موت سے بچایا تھا۔ اسی نے مجھے ایک اور مہلک خطرے میں ڈال دیا۔ چنانچہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گھر کا ایک اور غلام بدحواس ہو کر بھاگا ہوا کمرہ طعام میں یہ خبر لے کر پہنچا کہ گلی میں کھلنے والے پچھلے دروازے سے ایک پاگل کتا ابھی ابھی گھر میں گھسا ہے۔ پہلے تو اُس نے پالتو شکاری کتوں کو بھنبھوڑا، پھر اصطبل میں گھس کر گھوڑوں کو کاٹنے لگا اور آخر میں غلاموں پر بھی جھپٹا۔ اس نے داروغۂ اصطبل مرطولس ہیپیس نش رکابدار ہیپالیوس خادم کو کاٹ کھایا۔ طبیب اپولینیوس، دکٹی ان خدّام خانہ کو بھی کاٹا جنہوں نے اُسے گھر سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ جن جانوروں کو اُس نے کاٹا ہے اُن میں سے بعض میں باؤلے پن کی علامات بھی دکھائی دینے لگی ہیں۔

یہ خبر سُن کر سب گھبرا گئے اور میرے دہشت ناک طرزِ عمل سے انہیں گمان ہوا کہ مجھ میں بھی زہر سرایت کر گیا ہے۔ جس کے ہاتھ جو ہتھیار لگا لے کر میرے مالکوں نے دیوانہ وار چیخنا شروع کر دیا۔ ”ارے مار ڈالو اسے، دوسروں کی سلامتی کے لیے اسے مار ڈالو“ حالانکہ در حقیقت میں نہیں، وہ پاگل تھے۔ غلاموں نے کسی کے ہاتھ میں نیزہ، کسی کے بھالا اور کسی کے تبر تھما دیا تھا۔ اگر میں خطرے کی بو پا کر اپنے اصطبل سے بگٹٹ بھاگ کر اپنے آقاؤں کے آراستہ کمرۂ خواب میں نہ گھس جاتا تو وہ ضرور میری تکا بوٹی کر ڈالتے۔ مجھے پکڑنے کے لیے کمرۂ خواب میں داخل ہوتے انہیں ڈر لگا، اس لیے انہوں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا اور رات بھر کے لیے ایک پہرہ دار وہاں کھڑا کر دیا۔ انہیں یقین تھا کہ جب صبح ہوگی تو مجھ سے انہیں لڑنا نہیں پڑے گا، کیونکہ باؤلے کتّے کے زہر سے مر چکا ہوں گا۔ ہاں تو اب میں یہاں بند تھا، اکیلا اور آزاد کہ جو جی میں آئے کروں۔ قسمت کے ا[illegible] لیز کا میں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ میں ایک بستر پر دراز ہو گیا اور انسانوں کی طرح خوب جی بھر کر سویا، کیونکہ میں ایک مدت سے اس نعمت سے محروم تھا۔

جب میں جاگا تو دن خوب چڑھ چکا تھا۔ نیند کی راحت حاصل کرنے کے بعد میں تازہ دم ہو کر اچھل پڑا۔ باہر میرے مالک

میرے متعلق بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا "مگر میرے پیارے، وہ بیچارہ جانور اس وقت تک پاگل کیسے رہ سکتا ہے! مجھے یقین ہے کہ اب تک زہر خارج ہو چکا ہوگا اور جانور پھر بالکل ٹھیک ہو گیا ہوگا۔

"ہاں جانِ من، اب میں تم سے اختلافِ رائے نہیں کر سکتا۔"

انہوں نے طے کیا کہ دروازے کی ایک درز میں سے مجھے دیکھیں، اور انہوں نے دیکھا کہ میں بظاہر پہلے کی طرح بھلا چنگا آرام سے کھڑا ہوا ہوں۔ انہوں نے ہمت کر کے ارادہ کیا کہ دروازہ کھول کر مجھے زیادہ قریب سے دیکھیں۔ ان میں سے ایک نے جسے شاید غیب سے مجھے نجات دلانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میں پاگل ہوں یا نہیں، ایک سیدھی سی تجویز پیش کی: میرے آگے تازہ پانی کا بھرا ہوا تسلہ رکھا جائے۔ اگر میں حسبِ معمول بے جھجک پانی پی جاؤں تو یہ اس بات کا پکا ثبوت ہوگا کہ میری صحت بالکل ٹھیک ہے لیکن اگر میں ڈر کر پیچھے ہٹ جاؤں تو اس کا مطلب یہ ہوگا مجھ پر ابھی باؤلا پن سوار ہے۔ اس نے کہا کہ تمام مستند طبی کتابوں میں جانچنے کی یہی ترکیب بتائی گئی ہے اور اس نے خود عملاً بھی یہی مشاہدہ کیا تھا۔

سب نے یہ بات مان لی اور قریب کے فوارے سے ایک بڑا سا تسلہ شفاف پانی کا بھر کر میرے آگے لا رکھا۔ مگر میں اب بھی اپنے ہتھیاروں کو مضبوطی سے گرفت میں لیے رہا۔ مجھے بڑے زور کی پیاس لگ رہی تھی۔ سیدھا تسلے کی طرف گیا اور اپنی تھوتھنی پانی میں ڈال کر اس کا ایک ایک قطرہ پی گیا۔ ایسا کرنا کئی لحاظ سے میرے حق میں اچھا ثابت ہوا۔ پھر میں چپکا کھڑا ہو گیا۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی وہ مجھے تھپکی دیتے رہے، میرے کانوں کو سہلاتے رہے، میری رسّی پکڑ کر مجھے چلایا پھرایا اور میرے ساتھ جو جی چاہا کیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ یہ سب ایک غلط فہمی تھی، اور میں ایک شریف جانور ہوں اور میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔

دوسرے دن دونوں بڑے اندیشوں کے باوجود، مجھ پر دیوی اور دیوی کا ساز و سامان لادا گیا۔ اور جھانجھوں اور تاشوں کے شور کے ساتھ حسبِ معمول خیرات جمع کرنے کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ ہم چند جھونپڑیوں اور فوجی اڈوں میں سے گزر کر ایک گاؤں میں پہنچے جس کے باشندوں نے بتایا کہ یہ بستی ایک مشہور قدیم شہر کے کھنڈروں پر بسائی گئی ہے جو پہلی سرائے ہمیں ملی ہم وہیں ٹھہر گئے۔ یہاں ہم نے ایک دیہاتی کی مزیدار کہانی سنی۔ اس بیچارے کو اس کی بیوی نے بڑی بری طرح دھوکہ دیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی یہ کہانی سنیں۔

ہاں تو:

اس شخص کی گزران لوہار کے چھوٹے موٹے کام سے ہوتی تھی۔ اس کی بیوی کی بھی کوئی ملکیت نہیں تھی لیکن اس کی جنسی بھوک بہت مشہور تھی۔ ایک دن صبح سویرے لوہار جب اپنے کام پر سدھارا تو اس کی بیوی کا ایک منچلا عاشق فوراً ہی گھر میں آ دھمکا اور بستر ہی میں اس سے جا چمٹا۔ لوہار کو کسی قسم کا شبہ تو تھا ہی نہیں۔ اتفاق سے اتنے جلدی لوٹ آیا کہ یہ دونوں اپنی کڑی مہم سر ہی کر رہے تھے دروازہ اندر سے مقفّل پا کر خوش ہوا اور سر ہلا کر بولا "میری بیوی کس قدر پارسا ہے کہ کسی کے اکیلے گھر میں گھس آنے کے اندیشے سے اُس نے اس درجہ احتیاط برتی ہے!" اس کے بعد اپنے دستور کے مطابق اُس نے کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر سیٹی بجائی تاکہ بیوی کو اس کی آمد کی خبر ہو جائے۔ عورت بڑی ہوشیار تھی، اپنے عاشق کی آغوشِ شوق سے نکل کر جھٹ اُسے کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے بڑے سے ٹب میں چھپا دیا۔ ٹب میلا اور گلا ہوا تھا، لیکن تھا بالکل خالی۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور لتاڑنا شروع کر دیا "ارے موئے

احدی، ٹہل ٹہلا کر چلا آیا۔ بغلوں میں ہاتھ دیئے، اور جب جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں! آخر کب کام شروع کرے گا اور کب روٹی کما کر لائے گا؟ ارے میرا کیا حشر ہوگا؟ صبح سے شام تک چرخہ کاتتی ہوں، میری انگلیوں کی پڈیاں تک گھس جاتی ہیں تب کہیں اتنا پیدا ہوتا ہے کہ دیئے میں تیل پڑ جائے۔ اور اس کمبخت بل میں رہنا پڑتا ہے۔ کاش میں اپنی سہیلی ڈیفنی ہوتی! وہ دن بھر کھاتی پیتی رہتی ہے اور جی چاہے جتنے عاشقوں سے دل بہلاتی رہتی ہے۔"

لوہار کو یہ باتیں سن کر صدمہ ہوا۔ بولا "ارے، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے کہ ٹھیکہ دار کو آج اپنے مقدمے کی پیشی پر جانا پڑ گیا اور اس نے ہمیں کل پر ٹال دیا؟ یہ بات بھی نہیں ہے کہ میں نے آج کے کھانے کا فکر نہیں کیا۔ وہ بیکار پرانا ٹب دیکھتی ہو نا جو بہت سی جگہ گھیرے ہوئے ہے؟ میں نے ابھی ایک شخص سے اس کا پانچ درہم میں سودا کر لیا ہے۔ بس وہ آکر ابھی رقم دے جائے گا اور ٹب اٹھا کر لے جائے گا۔ آؤ ذرا ہاتھ تو لگواؤ، اس ٹب کو گاہک کے لیے باہر پہنچا دیں۔"

عورت ذرا نہ گھبرائی اور اسے ایک ترکیب سوجھی کہ اگر لوہار کو ذرا بھی شبہ ہو تو دور ہو جائے۔ ایک زور کا ٹھٹھا لگا کر بولی "مجھے بھی کیا عجیب شوہر ملا ہے، کیا کہنا! اور سودا کرنے میں تو جواب نہیں ہے ان کا۔ گھر سے باہر جاتے ہیں اور جناب ہمارا ٹب پانچ درہم میں بیچ آتے ہیں۔ میں بیچاری عورت ہوں، لیکن گھر سے باہر قدم تک نہ نکالا اور ٹب کو سات درہم میں بیچ بھی چکی۔"

لوہار کی باچھیں کھل گئیں، بولا "بھلا وہ کون تھا جو تمہیں اتنی قیمت دے گیا۔"

بیوی بولی "ارے احمق، چپ! وہ ابھی ٹب اندر ہی ہے۔ دیکھ رہا ہے غور سے کہ مضبوط بھی ہے یا نہیں۔"

عاشق نے اس کے اشارے کو فوراً پا لیا۔ اس نے سر ابھار کر کہا "دیکھو بی بی جی، تمہارا ٹب بہت پرانا ہے اور بیسیوں جگہ سے چٹخا ہوا معلوم ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر لوہار کی طرف پلٹ کر بولا "جناب، میں آپ کو نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں، مگر آپ مجھے ایک موم بتی لا دیں تو بہت ممنون ہوں گا۔ مجھے اسے اندر سے کھرچ کر دیکھنا ہے کہ یہ چیز میرے کام کی ہے یا نہیں۔ میرے پاس فالتو روپیہ نہیں ہے کہ پھینکتا پھروں۔ روپیہ آج کل درختوں پر تو نہیں اگتا ہے نا؟"

چنانچہ سادہ لوح لوہار نے بلا تاخیر ایک موم بتی جلائی اور بولا "نہیں نہیں دوست، تم اس زحمت میں مت پڑو۔ تم ذرا ادھر آ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں اس ٹب کو خوب صاف کیے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی صدری اتاری، موم بتی لی۔ ٹب کو اٹھا کر اوندھایا، اور اس کے اندر گھس کر صفائی کے کام میں لگ گیا۔

بیقرار عاشق نے فوراً لوہار کی بیوی کو اٹھا کر اوندھے ٹب پر اس کے شوہر کے سر کے اوپر ڈال لیا اور شوہر کا کام انجام دینے لگا۔ اس موقع سے وہ بہت لطف اندوز ہوئی۔ ٹب کے کنارے سے اپنا سر لٹکا کر جگہ جگہ اپنی انگلی رکھتی اور ہدایتیں دیتی جاتی "یہاں، پیارے یہاں!...... اور اب یہاں ......" یہاں تک کہ دونوں کاموں سے اس نے بہ اطمینان فراغت پالی۔ لوہار کو اس کے سات درہم مل گئے، لیکن اسے ٹب اپنی کمر پر لاد کر عاشق کے گھر پہنچانا پڑا۔

(ہسپانوی)

ڈان کوئکزوٹ

مصنّف : سروینٹیز

مترجم : شاہد احمد دہلوی

حصّہ دوم۔ باب (۱۷) جس میں پیش کیا گیا ہے وہ نقطۂ آخریں و بلند ترین جس پر
ڈان کوئکزوٹ کی ہمّتِ ناشنیدہ کبھی پہنچی یا کبھی پہنچ سکتی
تھی۔ نیز شیروں کی مہم کا انجامِ خوش۔

کسی تازہ مہم کے پیش آنے کا کوئی احتمال تو تھا ہی نہیں۔ لہذا سانچو، جیسا کہ تاریخ احتیاط سے بتاتی ہے۔ بھیڑوں کے گلہ بانوں سے بڑے اطمینان کے ساتھ دہی خرید رہا تھا۔ آقا نے جو اسے اچانک جلدی بلا بھیجا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ دہی کیا کرے اور نہ یہ سمجھ میں آیا کہ اسے لے کیسے جائے۔ لہذا اسے ضائع ہونے سے بچانے کے لیے اس نے دہی اپنی خود میں ڈال لیا، اور اس عمدہ ترکیب سے مطمئن ہو کر اپنے آقا سے احکام پانے کے لیے جلدی جلدی چل پڑا۔ سورما نے کہا، "سانچو، مجھے میری خود دو۔ کیونکہ یا تو ہوں کا مجھے کوئی علم نہیں ہے یا وہ مجھے جو سامنے دکھائی دے رہا ہے کوئی ایسا مقابلہ ہے جس کے لیے مجھے ہتھیاروں سے کام لینا ہوگا۔ وہ تماشائی جو سواری کا سبز کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ یہ بات سن کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ صرف ایک گاڑی ان کی طرف چلی آ رہی تھی جس میں دو تین چھوٹی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اس نے سوچا کہ غالباً اس گاڑی میں بادشاہ کا کچھ خزانہ جا رہا تھا۔ اس نے اپنا قیاس ڈان کوئکزوٹ پر ظاہر کیا مگر اُس نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ اُس کے تصور پر کارنامے چھائے ہوئے تھے، صرف اتنا جواب دیا "جسے پہلے معلوم ہو جائے وہ پہلے ہتھیار سج لے۔ پوری تیاری آدھی فتح ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں، تجربہ سے، میرے دو طرح کے دشمن ہیں، دکھائی دینے والے اور نہ دکھائی دینے والے۔ اور میں نہیں جانتا کب، کس طرف سے، کس وقت اور کس شکل میں وہ مجھ پر حملہ کر دیں۔" اس سے پہلے کہ سانچو دہی پھینک دیتا۔ سورما نے اس کے ہاتھ سے خود لے کر بغیر دیکھے بھالے جلدی سے اپنے سر پر رکھ لی۔ دہی پر جو دباؤ پڑا تو اس کا پانی سورما کے چہرے اور داڑھی پر بہ بہ کر آنے لگا۔ وہ بہت گھبرایا۔ بولا "اُس کا کیا مطلب ہے سانچو؟ میرا خیال ہے کہ میری کھوپڑی ملائم ہو رہی ہے، یا میرا بھیجا پگھل رہا ہے، یا میری چوٹی کا پسینہ ایڑی میں آ رہا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو یہ نتیجہ خوف کا نہیں ہے، گو مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ یہ مہم بڑی خوفناک ہوگی۔ کچھ دینا مجھے اسے پونچھنے کے لیے۔ پسینے کی دھاریں تو مجھے اندھا کیے دے رہی ہیں۔" سانچو نے کچھ نہیں کہا، ایک کپڑا اس کی طرف بڑھا دیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آقا پر بھید نہیں کھلا۔ ڈان کوئکزوٹ نے اپنا چہرہ صاف کیا اور خود کو اتار کر دیکھا کہ ایسی کیا چیز ہے جو اس قدر ٹھنڈی سر کو لگ رہی ہے۔ سفید سفید ڈلے سے دیکھ کر اس نے انہیں اپنی ناک سے لگا کر سونگھا، اور حیران ہو کر بولا "میری روح میں سمائی ہوئی خاتون کی قسم! یہ بد تمیز کمینے نوکر، یہ تو دہی ہے جو تو نے اس میں ڈال رکھا ہے۔" سانچو نے بڑی طمانیت اور چالاکی سے جواب دیا "جناب عالی، اگر یہ دہی ہے تو مجھے دیجیے، میں اسے کھاؤں ـــــ نہیں، اب مجھے خیال آیا، میرے بدلے شیطان اسے کھائے گا کیونکہ اسی نے خود میں ڈالا ہوگا۔ کبھی ہو سکتا ہے یہ کہ

میں عالی جناب کی خود کو آلودہ کروں؟ یا خدا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے پیچھے بھی جادوگر لگے ہیں جو مجھے اس لیے تنگ کر رہے ہیں کہ میں حضور کا پروردہ اور ساتھی ہوں۔ انہوں نے یہ گندگی اس لیے ڈالی ہے کہ آپ کو مجھ پر غصہ دلائیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اب کہ ان کا تیر نشانے پر نہیں بیٹھا۔ مجھے اپنے آقا کی صحیح قوت فیصلہ پر بھروسا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ میرے پاس نہ تو دہی ہے، نہ ملائی، اور نہ ہی ایسی کوئی اور چیز۔ اور اگر ایسی کوئی چیز ہوتی تو میں اسے فوراً اپنے پیٹ میں ڈال لیتا نہ کہ جناب والا کی خود میں۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا۔ "ہاں! اس میں کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے۔" وہ شخص جو سارا ماجرا دیکھ رہا تھا یہ سن کر حیران ہوا، اور جو کچھ آگے چل کر ہوا۔ اس سے اسے بھی حیرانی ہوئی، ڈان کوئکزوٹ نے سر، منہ، داڑھی اور خود کو صاف کرنے کے بعد خود پھر پہن لی، اور اپنی رکابوں میں پاؤں خوب جما کر تلوار خوب کھسکائی اور نیزہ تول کر نعرہ لگایا "ہاں اب میں تیار ہوں شیطان تک سے مقابلہ کرنے کے لیے۔"

تھوڑی دیر میں جھنڈیاں لگی گاڑی ان کے قریب آ پہنچی۔ اسے گاڑی بان ایک خچر پر بیٹھا چلا رہا تھا، اور گاڑی کے اگلے حصے میں ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ڈان کوئکزوٹ عین ان کے سامنے جا کر ڈٹ گیا اور بولا "کہاں جا رہے ہو تم، اے بھائیو! یہ کیسی گاڑی ہے؟ اور یہ جھنڈیاں کیسی لگی ہیں؟" گاڑی بان بولا "یہ گاڑی میری ہے، اور اس میں دو خوفناک شیر ہیں جنہیں اوران کے جنرل نے بادشاہ سلامت کے لئے بطور تحفہ بھیجا ہے۔ جھنڈیاں ہمارے آقا بادشاہ سلامت کی ہیں اور یہ بتلانے کے لیے لگائی گئی ہیں کہ گاڑی میں جو کچھ ہے ان کا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے تحکم سے پوچھا "کیا شیر بڑے ہیں؟" گاڑی کے اگلے رخ جو شخص بیٹھا ہوا تھا بولا "افریقہ سے ہسپانیہ تک ان سے بڑے شیر کبھی نہیں آتے۔ میں ان کا محافظ ہوں۔ میرے پاس عمر بھر بہت سے شیر رہے مگر اتنے بڑے کبھی نہیں رہے۔ ان میں ایک نر ہے اور ایک مادہ۔ نر پہلے پنجرے میں ہے اور پرے میں مادہ ہے۔ آج صبح انہیں کھانا نہیں ملا، اس وقت بہت بھوکے ہیں۔ اس لیے جناب راستہ چھوڑ دیجیے کیونکہ ہمیں جلدی وہاں پہنچنا ہے۔ جہاں انہیں کھانا دینا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے حقارت آمیز مسکراہٹ سے کہا "ہائیں! شیر اور میرے آگے چوں کرے! ارے میرے آگے یہ ذرا ذرا سے جانور کیا حقیقت رکھتے ہیں؟ اور دن کو، وہ بھی اِس وقت! اس متبرک سورج کی قسم! وہ جنہوں نے انہیں یہاں بھیجا ہے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں شیروں سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ نیچے اتر آؤ، دیانتدار دوستو! اور تم چونکہ ان کے محافظ ہو اس لیے تم ان کے پنجرے کھول دو اور صحرا کے وحشی درندوں کو باہر نکال دو۔ باوجود ان جادوگروں کے جنہوں نے انہیں یہاں بھیجا ہے میں اسی کھیت میں انہیں بتا دوں گا کہ ڈان کوئکزوٹ ساکن منچا کون ہے۔" تماشائی نے اپنے دل میں کہا۔ "ہمارے اچھے سورما نے اب ہمیں اپنا نمونہ تو دکھا ہی دیا۔ یقیناً دہی نے اس کی کھوپڑی پلپلی کر دی ہے۔ اور اس کا بھیجا نرم پڑ گیا ہے۔" سانچو نے تماشائی کے قریب آ کر کہا "جناب! خدا کے لیے شیروں سے الجھنے سے میرے آقا کو باز رکھیے۔ اگر یہ الجھ گئے تو شیر ہم سب کے ٹکڑے اڑا دیں گے۔" تماشائی نے پوچھا "کیا تمہارا آقا اس قدر پاگل ہے کہ سچ مچ اس قدر خوفناک جانوروں پر حملہ کر دے گا؟" سانچو نے کہا "پاگل نہیں ہیں، نڈر ہیں۔" تماشائی نے کہا "میں انہیں روک دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ ڈان کوئکزوٹ کی طرف بڑھا جو محافظ سے اصرار کر رہا تھا کہ پنجروں کے دروازے کھول دے۔ تماشائی نے کہا "جناب سورماؤں کو ان خطرناک کاموں میں دخل دینا چاہیے جن میں کامیابی کی کچھ امید دکھائی دیتی ہو۔ ایسے کاموں میں نہیں پڑنا چاہیے جن میں صریح ناکامی دکھائی دیتی ہو کیونکہ وہ شجاعت جو تہوّر سے نزدیک ہو جاتی ہے۔ اس میں ہمّت سے زیادہ دیوانگی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ، جناب سورما صاحب، یہ شیر آپ پر حملہ کرنے نہیں آئے ہیں۔ یہ تو بادشاہ سلامت کو تحفتہً بھیجے جا رہے ہیں۔ لہٰذا ان کو روکنا یا ان کی راہ کھوٹی کرنی

مناسب نہیں ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "پیارے جناب، آپ یہاں سے تشریف لے جائیے اور اپنے فریب دے کر لگا لانے والے بٹیر اور پھانس لانے والے جانوروں کی خبر گیری کیجیے۔ جو جس کام میں لگا ہوا ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ یہ میرا معاملہ ہے اور میں دیکھوں گا کہ یہ عالی نسب شیر میرے مقابلہ پر آتے ہیں یا نہیں۔" پھر محافظ کی طرف پلٹ کر کہا "میں خدا کی قسم کھاتا ہوں، معزز عوام الناس صاحب، اگر آپ نے پنجروں کے دروازے فوراً نہیں کھولے تو میں آپ کو اس نیزے سے اس گاڑی میں جڑ دوں گا۔" گاڑی بان نے دیکھا کہ مسلح پاگل ٹالے نہیں ٹلتا تو بولا "اچھے جناب، مجھ پر ترس کھا کر اجازت دیجیے کہ شیروں کے کھلنے سے پہلے اپنے خچر لے کر خطرے سے باہر نکل جاؤں۔ میرے جانور اگر مارے گئے تو میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاؤں گا، کیونکہ اس گاڑی اور خچروں کے علاوہ میری کمائی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے بگڑ کر کہا "ارے ڈرپوک بدبخت، کھول لے اپنے خچر اور جو تیرے جی میں آئے کر۔ مگر تو جلد دیکھ لے گا کہ تو نے یہ زحمت ناحق کی۔"

گاڑی بان نے اتر کر جلدی جلدی اپنے خچروں کو کھولا۔ اس کے بعد محافظ نے بہ آواز بلند کہا "جتنے لوگ یہاں موجود ہیں۔ سب گواہ رہیں کہ میں اپنی مرضی کے خلاف اور زبردستی کیے جانے پر شیروں کے پنجرے کھول کر شیروں کو چھوڑ رہا ہوں۔ یہ صاحب جو کچھ کر رہے ہیں میں اس کے خلاف احتجاج کرتا ہوں، اور اعلان کرتا ہوں کہ ان جانوروں سے جو بھی نقصان ہوگا اس کے ذمہ دار یہ صاحب ہوں گے، اور میری تنخواہ اور دیگر واجبات کے بھی۔ صاحبان، براہ مہربانی میرے دروازہ کھولنے سے پہلے آپ سب اپنی اپنی حفاظت کا انتظام کر لیں۔ رہا میں، تو مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ جانور مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" تماشائی نے ایک بار پھر ڈان کوئکزوٹ کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اسے آگاہ کیا کہ اس حرکت سے وہ خدا کا قہر اپنے اوپر نازل کرا رہا ہے۔ ڈان کوئکزوٹ نے کہا "میں جانتا ہوں میں کیا کر رہا ہوں۔" تماشائی نے استدعا کی "آپ اچھی طرح غور فرما لیں، یقیناً آپ کو دھوکا ہو رہا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "نہیں جناب! اگر آپ اس واقعہ کو دیکھنا نہیں چاہتے جسے آپ سمجھتے ہیں کہ المناک ثابت ہوگا تو اپنی بھنکتی گھوڑی کو ایڑ دیجیے اور اپنی جان سلامت لے جائیے۔" سانچو نے بھی آنکھوں میں آنسو بھر کے اس سخت مرحلہ سے باز رہنے کی درخواست کی جس کے مقابلے میں ساری زندگی کے تمام مرحلے حلوے مانڈے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ بھی کہا کہ "جناب والا، غور فرمائیے کہ اس میں کوئی افسوں نہیں ہے اور نہ کوئی سحر ہے، کیونکہ میں نے پنجرے کی درزوں میں سے سچ مچ کے شیر کا پنجہ دیکھا ہے اور اس کے پنجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شیر پہاڑ سے بھی بڑا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "تیرے خوف تو اسے تجھے آدھی دنیا سے بھی بڑا دکھائیں گے۔ چلا جا سانچو، اور مجھے تنہا چھوڑ دے۔ اگر میں مارا جاؤں تو اس پرانے معاہدے کو یاد رکھیو جو مجھ میں اور تجھ میں ہوا تھا۔ ڈلسینیا کے پاس واپس چلا جائیو ——— بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔" اس کے بعد کچھ ایسی باتیں بھی کہیں جن سے اس کے ارادے کا استحکام ظاہر ہوتا تھا اور یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اب ساری دلیلیں بے اثر ثابت ہوں گی۔ تماشائی چاہتا تھا کہ اسے زبردستی روک لے مگر مقابلے کے لیے نہ تو اس کے پاس ہتھیار تھے اور نہ زرہ۔ اور ایسے جھلاتے ہوئے پاگل سے الجھنا دانش مندی کے خلاف تھا جو محافظ کو اب شدت سے دھمکیاں دے رہا تھا۔ لہٰذا تماشائی نے اپنی گھوڑی کو ایڑ دکھائی۔ سانچو نے اپنے ابلق اور محافظ نے اپنے خچروں کو ٹٹکاری دی، اور شیروں کے کھلنے سے پہلے جتنی دور نکل سکتے تھے، نکل گئے۔ سانچو اپنے آقا کی موت پر واویلا کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شیروں کے پنجے اس کی دھجیاں اڑا دیں گے۔ وہ اپنی بدنصیبی اور اس منحوس گھڑی کو کوسنے لگا جب اس نے آقا کی ملازمت دوبارہ قبول کی۔ لیکن اپنے آنسوؤں اور واویلا کے باوجود اپنے ابلق کو آگے بڑھاتا رہا تاکہ گاڑی سے دور تر ہوتا جائے۔ محافظ نے جب دیکھا کہ پناہ لینے والے دور نکل گئے تو اپنی دلیلیں اور گذارشیں پھر دہرانے لگا، مگر

بے نتیجہ۔ ڈان کوئکزوٹ نے ان سب کا یہ جواب دیا کہ میں نے تمام باتیں سُن لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو مزید زحمت نہ دو۔ میرا حکم مانو اور دروازہ فوراً کھول دو۔"

محافظ جب پہلے پنجرے کا دروازہ کھولنے لگا تو ڈان کوئکزوٹ نے دل میں سوچا کہ گھوڑے پر سوار رہ کر مقابلہ ٹھیک رہے گا یا نہیں بالآخر یہ طے کیا کہ اتر کر ہی مناسب ہوگا، کیونکہ ہوسکتا ہے روزی نَنٹ شیروں کو دیکھ کر ڈر جائے۔ یہ سوچ کر وہ گھوڑے پر سے کود پڑا اور اپنی ڈھال سنبھال کر تلوار سونت لی۔ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور حیرت ناک دلیری اور بے خوفی سے شیر کے پنجرے کے آگے جا کھڑا ہوا۔ پہلے بڑے خضوع و خشوع سے اپنے تئیں اللہ کو سونپا اور اس کے بعد اپنی محبوبہ ڈلسینیا سے امداد چاہی۔

یہاں تک پہنچ کر اس سچی تاریخ کا مصنّف توصیف سے یوں پھٹ پڑتا ہے: "اُسے نہایت عالی ہمت، زبردست، اور ناقابل اظہار شجیع ڈان کوئکزوٹ ساکن منیا! اے سورماؤں کے آئینے، اگلے بہادروں کے نمونے! تو جدید اور دوسرا ڈان مینوئل ساکن لی آن ہے ——— ہسپانوی سورماؤں کی سطوت و شان۔ وہ الفاظ کہاں سے لائے جو اس عظیم معرکہ کو بیان کرسکیں؟ آنے والی نسلوں کیلئے اسے کیسے قابل یقین بناؤں؟ وہ کون سی مدح و ستائش ہے، جو کتنی ہی مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو، جو پہلے ہی تیرے حصّے میں نہ آچکی ہو؟ تو جو تن تنہا، قدم جمائے بے خوف دلیرانہ یوں کھڑا ہے کہ ہاتھ میں صرف ایک تلوار ہے اور وہ بھی کچھ بہت تیز نہیں ہے، اور صرف ایک ڈھال اپنے بچاؤ کے لیے رکھتا ہے، جو نہ تو چوڑی ہے اور نہ چمکدار، تو یوں کھڑا منتظر ہے۔ ان دو خوفناک ترین شیروں کے حملہ کرنے کا جن سے زیادہ خوفناک شیر کبھی بھی سرائے لیبیا میں نہیں گونجے۔ تیرے اپنے بے مثل کارنامے ہی منیچا کے بہادر کی ستائش کریں گے۔ اتنے بلند موضوع کو بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں"؛ یہاں پہنچ کر مصنّف اپنی توصیف ختم کرتا ہے اور تاریخ کا سلسلہ پھر شروع کرتا ہے۔

محافظ نے دیکھا کہ ڈان کوئکزوٹ اپنی ضد پر اڑا کھڑا ہے اور اگر میں شیر کو نہیں کھولتا تو اس پُر غضب اور نڈر سورما کی ناراضگی سے نہیں بچ سکتا، لہٰذا پہلے پنجرے کا دروازہ پورا کھول دیا۔ درندہ لیٹا ہوا تھا اور غیر معمولی قد و قامت اور بھیانک شکل کا دکھائی دے رہا تھا۔ پہلا کام اس جانور نے یہ کیا کہ پنجرے کا ایک چکّر کاٹا اور ایک پنجہ آگے بڑھا کر انگڑائی لی۔ پھر منہ پھاڑ کر بڑے آرام سے جمائی لی، اور اس کے بعد کوئی ہاتھ بھر کی زبان باہر نکالی اور چاٹ چاٹ کر اپنا منہ دھویا۔ اس سے فارغ ہو کر پنجرے میں سے اپنا سر باہر نکالا اور دہکتے انگاروں جیسی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ منظر ایسا تھا کہ خود بے باکی بھی خوف زدہ ہو جاتی۔ ڈان کوئکزوٹ یکسوئی سے اسے دیکھتا رہا اور بے چین ہوتا رہا کہ کب وہ پنجرے سے چھلانگ لگائے اور کب اس سے گتھ کر شیر کے چیتھڑے بکھیر دے۔ اس کی دیوانگی نے اسے بے باکی کی اس نوبت کو پہنچا دیا تھا۔ لیکن اس شیر میں شرافت زیادہ اور غرور کم تھا۔ اس نے بے باکی اور تہوّر کے مظاہرے کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر پلٹ گیا اور اپنے کولہے ڈان کوئکزوٹ کی طرف کر کے اطمینان اور خاموشی سے پھر پنجرے میں لیٹ گیا۔ یہ دیکھ کر ڈان کوئکزوٹ نے محافظ کو حکم دیا کہ اس کے دو ایک ہاتھ لگائے۔ اور اسے غصّہ دلا کر باہر نکالے۔ محافظ نے کہا "یہ میں نہیں کرسکتا کیونکہ اگر میں نے اسے غصّہ دلایا تو سب سے پہلے مجھی کو چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ جناب گھڑ سوار صاحب، جو کچھ گزر چکا ہے آپ اسی سے مطمئن ہو جائیے۔ اس سے زیادہ ہمّت کا مظاہرہ اور کیا ہوگا؟ قسمت کو دوبارہ مت للکاریئے۔ شیر کے لیے دروازہ کھلا ہوا ہے اور وہ باہر نکلنے کے لیے آزاد ہے۔ مگر چونکہ وہ اب باہر نہیں نکلا لہٰذا آج کسی اور وقت بھی باہر نہیں نکلے گا۔ حضور کی ہمّت کی عظمت تو قائم ہو ہی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بہادر اپنے دشمن کو للکارنے کے بعد مجبور نہیں

ہوتا کہ کچھ اور بھی کرے۔ آپ نے اس کے میدان میں آنے کا انتظار بھی کیا۔ اگر دشمن مقابلے کے لیے آگے نہیں بڑھتا تو ذلت اس کے سر پڑتی ہے اور مقابلے کی دعوت دینے والا فتح کے تاج کا مستحق ہو جاتا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "سچ کہا تم نے۔ دروازہ بند کر دو۔ اور جو کچھ تم نے مجھے کرتے دیکھا ہے اس کی ایک اچھی سے اچھی سند مجھے دو۔ یہ بات سب کو معلوم ہونی چاہیئے کہ تم نے شیر کے لیے دروازہ کھول دیا تھا، یہ بھی کہا کہ میں اس کا منتظر رہا کہ وہ باہر نکلے، مگر وہ نہیں نکلا۔ میں نے پھر انتظار کیا، وہ پھر بھی نہیں نکلا، اور دوبارہ لیٹ گیا۔ اب مجھ پر کوئی اور ذمہ داری نہیں ہے ——— طلسمات، غارت ہو جاؤ! یوں غیب سے سچائی، انصاف اور حقیقی شجاعت کی حمایت ہوتی ہے۔ میں تجھ سے کہہ چکا ہوں، دروازہ بند کر دے، میں پناہ لینے والوں اور بھگوڑوں کو واپس آنے کا اشارہ دیتا ہوں تاکہ تیرے منہ سے اس معرکہ کی تفصیل سُن لیں۔"

محافظ نے دروازہ بند کر دیا، اور ڈان کوئکزوٹ نے اُس سوتی کپڑے کو جس سے اپنے چہرے کا دہی صاف کیا تھا، اپنے نیزے کی نوک پر رکھا اور دُور جاتے ہوئے لوگوں کو واپس آنے کا اشارہ کیا اور آوازیں دیں۔ سب سے آگے سبز کوٹ والا تماشائی تھا اور سب ابھی چلے ہی جا رہے تھے۔ لیکن قدم قدم پر مڑ کر اِدھر دیکھتے جاتے تھے کہ سانچو نے سفید کپڑے کے اشارے کو دیکھ لیا اور چلایا "اُرے میرے پھانسی لگ جائے جو میرے آقا نے وحشی درندوں کو ہلاک نہ کر دیا ہو۔ دیکھو وہ ہمیں بلا رہے ہیں۔" سب نے رک کر دیکھا تو دیکھا کہ ڈان کوئکزوٹ ہے جو واپس آنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ ان کا خوف کسی قدر کم ہوا اور وہ آہستہ آہستہ واپس چلے، یہاں تک کہ ڈان کوئکزوٹ کے الفاظ انہیں صاف سنائی دینے لگے۔ جب وہ گاڑی کے قریب دوبارہ آ گئے تو ڈان کوئکزوٹ نے گاڑی بان سے کہا "دوست اب اپنے خچر پھر جوت لو اور اللہ کا نام لے کر آگے روانہ ہو جاؤ۔ اور ہاں سانچو، اسے اور محافظ کو دو سکے دے دو تاکہ ان کی تاخیر کی تلافی ہو جائے۔" سانچو بولا۔ "ابھی ادا کرتا ہوں، نہایت خوشی کے ساتھ۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ شیروں کا کیا حشر ہوا؟ مر گئے یا زندہ ہیں؟" محافظ نے بڑی تفصیل کے ساتھ مناسب وقفے دے کر مقابلے کی روداد بیان کی، اور ڈان کوئکزوٹ کی شجاعت کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا، اور بتایا کہ "انہیں دیکھتے ہی شیر مارے خوف کے دبک گیا اور پنجرے سے باہر نہیں نکلا، حالانکہ میں نے بہت دیر تک دروازہ کھلا رکھا۔ میں نے سورما سے کہا کہ شیر کو چھیڑنا اور زبردستی باہر نکالنا خدا کو ناپسند ہو گا۔ اس پر اپنی خلافِ مرضی سورما نے مجھے اجازت دی کہ دروازہ دوبارہ بند کر دوں۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "کہو تم کیا کہتے ہو اس کے بارے میں؟ بھلا سچی ہمت کے آگے کوئی سحر ٹھہر سکتا ہے؟ یہ ہو سکتا ہے کہ جادوگیرے مجھے میری خوش بختی سے محروم کر دیں، مگر حوصلہ اور عزمِ صمیم مجھ سے نہیں چھین سکتے۔" سانچو نے سنہری سکے دے دیئے۔ گاڑی بان نے اپنے خچر جوتے۔ محافظ نے انعام پانے پر ڈان کوئکزوٹ کا شکریہ ادا کیا، اور وعدہ کیا کہ میں دربار میں پہنچ کر اس بہادرانہ معرکے کا ذکر بادشاہ سلامت سے خود کروں گا۔ ڈان کوئکزوٹ نے کہا "اگر اتفاق سے بادشاہ سلامت دریافت فرمائیں کہ یہ معرکہ کس نے سر کیا تو کہنا "شیروں کے سورما" نے۔ کیونکہ میں نے طے کیا ہے کہ اب تک "مغموم شکل کا سورما" کی جو عرفیت میں نے تیار کر رکھی تھی۔ اُسے میں آج سے بدل دوں، تبدیل کر دوں، اور اس میں ترمیم کر دوں اور اس باب میں، میں نے اگلے سورماؤں کے قدیم دستور کی پیروی کی ہے کہ وہ جب چاہتے تھے اپنا نام بدل دیتے تھے۔

گاڑی اب آگے روانہ ہو گئی، اور ڈان کوئکزوٹ، سانچو اور ڈان ڈائگو میرانڈا (سبز کوٹ والے تماشائی کا یہی نام تھا) بھی چل پڑے۔ یہ صاحب بہت دیر سے، ایک لفظ بھی نہیں بولے تھے کیونکہ ڈان کوئکزوٹ کے مخصوص طرزِ عمل اور اندازِ گفتگو پر غور کرنے میں غلطاں و پیچاں تھے

اور سمجھ رہے تھے کہ یہ شخص ایک بھولا دیوانہ ہے، اس کی دیوانگی میں بھلائی بھی شامل ہے۔ ہمارے سُورما کی تاریخ کا پہلا حصہ دیکھنے کا اتفاق اُسے کبھی نہیں ہوا تھا، ورنہ اب جو کچھ اس نے دیکھا اُس پر اتنا متعجب نہ ہوتا۔ لیکن اسے گفتگو میں اس درجہ ذہین اور معقول اور عمل میں اس قدر سادہ لوح، وحشی اور خودسر دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کیا سمجھے۔ اس نے دل میں سوچا "بھلا اس سے زیادہ حماقت اور کیا ہوگی کہ دہی سے بھری ہوئی خود سر پر دھر لی اور سمجھتا یہ رہا کہ جادوگروں نے کھوپڑی پلپلی کر دی ہے؟ یا اس سادہ لوحی کا کوئی جواب ہو سکتا ہے کہ شیروں سے لڑنے پر تل گیا"

ڈان کوکزوٹ نے اس کے خیالات میں یہ کہہ کر مداخلت کی کہ یقیناً جناب آپ مجھے بڑا منچلا اور پاگل سمجھ رہے ہوں گے۔ اور آپ کا ایسا خیال کرنا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ کیونکہ میرے عمل سے ظاہر بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تاہم میں اس قدر بے شعور نہیں ہوں۔ جتنا کہ آپ کو دکھائی دیتا ہوں۔ جب کوئی اسپ سوار چمکتی ہوئی زرہ پہنے کسی دلچسپ مقابلے میں خواتین کے سامنے اپنا گھوڑا کداتا پھرتا ہے تو بڑا شاندار منظر ہوتا ہے۔ اور منظر بھی بڑا شاندار ہوتا ہے جب وسیع احاطے میں کوئی بہادر شہسوار اپنے شہزادے کی نظروں کے سامنے ایک بپھرے ہوئے بیل کو اپنے تیر سے جوڑ کر رکھ دیتا ہے، اور ان سب سورماؤں کا منظر بھی بڑا شاندار ہوتا ہے جو فوجی یا دوسری مشقوں میں اپنی ہنرمندیوں سے تماشائیوں کے دلوں کو لبھاتے اور ان میں ولولہ پیدا کرتے ہیں، اور اپنے شہزادے کے دربار کا اعزاز بڑھاتے ہیں۔ لیکن ان سب پر اس سورما کو فوقیت حاصل ہے جو صحراؤں اور ویرانوں میں، الجھے ہوئے راستوں اور جنگلوں میں، اور پہاڑوں میں پُرخطر معرکوں کی تلاش میں گھومتا ہے۔ ان میں بے خوف و خطر کود پڑتا ہے ـــــ محض پُرشکوہ اور غیر فانی شہرت حاصل کرنے کے لیے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی گشتی سورما کا کسی صحرا سے کسی بیوہ کو نجات دلانا شہر کی کسی حسینہ کو کسی درباری سورما کے داد دینے سے کہیں شریفانہ منظر ہوتا ہے۔ سورماؤں کے طرح طرح کے فرائض ہوتے ہیں۔ درباری سورما کا کام یہ ہے کہ خواتین کی خدمت کرے، شہزادے کے دربار کو بیش قیمت لباسوں سے مزیّن کرے، اپنے ہمہ نعمت دستر خوان پر غریب گھڑسواروں کو کھلائے پلائے۔ نیزہ بازی کا انتظام بانکوں کے لیے کرے، مقابلوں کا اہتمام کرے، اور اپنی عظمت، دریا دلی اور سطوت کا مظاہرہ کرے۔ اور ان سب پر مستزاد اپنے اچھے مسیحی ہونے کا ثبوت دے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اپنے فرائض کی ادائیگی پر پورا اترے گا لیکن گشتی سورما کا کام یہ ہے کہ دنیا کے بعید ترین گوشوں کی چھان بین کرے، پیچیدہ سے پیچیدہ بھول بھلیّوں میں داخل ہو، ہر قدم پر ناممکنات سے ٹکرائے، بے برگ و گیاہ صحراؤں میں گرمیوں کے سورج کی دہکتی کرنوں کو انگیز کرے، اور جاڑے کی برفیلی ہوا اور کہر کی شدّت کو گوارہ کرے شیر اسے خوف نہ دلا سکیں، عفریت اسے خائف نہ کر سکیں، اور نہ اژدہے اسے ڈرا سکیں، کیونکہ انہیں ڈھونڈ نکالنا۔ ان پر حملہ آور ہونا اور ان سب کو شکست دینا اس کا مخصوص فرض ہے۔ لہٰذا جناب، چونکہ گشتی سورماؤں میں سے ایک ہونا میرے لیے مقدّر ہو چکا ہے۔ اس لیے میرے فرائض میں جو کچھ آتا ہے میں اس کی ادائیگی سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ بالکل یہی صورت شیروں کے معاملے میں مجھے پیش آئی۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ بڑی اندیشہ ناک بے باکی ہے۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ استقلال ایک ایسی خوبی ہے جو بزدلی اور بے باکی کے انتہائی سروں کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ لیکن یہ بہتر ہے کہ بہادر بزدلی کے سرے پر پہنچنے کے بدلے بے باکی کے سرے پر پہنچ جائے۔ کیونکہ جس طرح کنجوس کے مقابلے میں کسی بے باک کا سچا بہادر بن جانا بہت آسان ہوتا ہے۔ یقین کیجیے جناب ڈان ڈیگو صاحب، ہر قسم کے دشوار مرحلوں میں بہتر یہی ہے کہ آدمی بے باک کہلایا جائے۔

ڈان ڈائیگو نے جواب میں کہا "جناب ڈان کوئکزوٹ صاحب، آپ نے جو کچھ کہا اور کیا اس میں صحیح شعور کارفرما ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر گشتی سورمائی کے اصول و ضوابط کبھی محو ہو جائیں تو حضور والا کے سینے میں جائیں گے، کیونکہ یہی ان کی حقیقی کھتی اور کھاتہ ہے۔ لیکن چونکہ دیر ہو رہی ہے ہمیں ذرا قدم بڑھا کر چلنا چاہیے۔ یوں ہم سب جلدی غریب خانہ پہنچ جائیں گے۔ آپ نے ابھی اتنی محنت کی ہے، جسم کی نہ سہی ذہن کی تو ضرور تھی۔ میرے گھر میں تھوڑی دیر آرام کر لیجیے۔ سورما نے کہا "میں آپ کی پیش کش شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔" اس کے بعد ذرا رفتار بڑھا کر کوئی دو بجے دوپہر کو سب ڈان ڈائیگو کے گھر پہنچے، اور ڈان کوئکزوٹ نے صاحب خانہ کو "شہسواری کے سبز کوٹ والا سورما" موسوم کیا۔

حکایاتِ مُلّا نصرالدّین ہدیٰ

آدھی رات کے وقت دو نقاب پوش ڈاکو ملّا نصرالدین کے گھر میں داخل ہوئے۔ آہٹ پانے پر ملّا سب کچھ تاڑ گیا اور اپنی جان بچانے کے لیے جلدی سے ایک الماری میں چھپ گیا۔ ڈاکو کمرے میں پہنچے تو سیدھے الماری کی طرف لپکے۔ پٹ کھولا تو ملّا نصرالدین کو سامنے پایا۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم ایک بوڑھے آدمی کو نہیں مار سکتے؟ باہر آجاؤ، چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ملّا نے جواب دیا۔ "میں جان بچانے کے لیے نہیں چھپا ہوں۔ دراصل میں منہ دکھانے کے قابل نہیں۔ زہے نصیب کہ آپ ایسے شرفا نے یہاں آنے کی زحمت گوارا فرمائی لیکن گھر میں سوائے ویرانی کے اور کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے منہ چھپائے کھڑا ہوں۔"

سات سو برس پہلے کا یہ واقعہ ترکی میں کئی موقعوں پر بیان کیا ہے۔ اور اِس دور میں اس کے لیے ایک خاص موقعہ وہ ہے جب اسمبلی کا کوئی امیدوار ووٹ کی خاطر کسی گھر میں قدم رکھتا ہے یا کسی جماعت کا کوئی رکن چندہ لینے کے لیے کسی دروازے پر دستک دیتا ہے۔ ترکی کے ہر شعبہ زندگی میں ملّا نصرالدین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علمی، ادبی، فنی، تہذیبی، معاشرتی، تجارتی اور سیاسی مسائل جب اُلجھ کر اُن چینے والی حد تک لاینحل سے نظر آتے ہیں تو اُس وقت ملّا نصرالدین کی ایک شگفتہ مسکراہٹ ساری الجھن کو دور کر دیتی ہے۔ ملّا نصرالدین کی پرانی باتیں آج بھی اپنی تر و تازگی سے نئی شگفتگی پیدا کرتی ہیں۔

ملّا نصرالدین کوئی خیالی کردار نہیں، البتہ کئی من گھڑت واقعات اس کی ذات سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں۔ ویسے اُس کی زندگی میں ایسے واقعات ضرور گزرے ہیں جو اپنے انوکھے پن کی وجہ سے بڑی دلچسپی کا باعث ہیں۔ انہی واقعات نے ملّا کو بڑی شہرت بخشی اور ترکی کی ہر محفل میں اس کا ذکر ہونے لگا۔ ملّا ترکی کے ایک گاؤں ہورتو میں ۱۲۰۸ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ عبداللہ اُسی گاؤں میں مسجد کا امام تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے نصرالدین کو اس زمانے کے لحاظ سے اچھی تعلیم دلوائی۔ نصرالدین جوان ہو کر عالموں میں شمار ہونے لگا۔ اور اس حیثیت سے ملّا کا خطاب ملا۔

نصرالدین اپنے وقت کا واحد ملّا تھا جو زاہدِ خشک اور تنگ نظر نہیں تھا۔ وہ ہر وقت ہنستا مسکراتا اور ہنسی ہنسی میں بڑی اہم اور سنجیدہ باتیں سمجھا دیا کرتا۔ اس کی مزاح و طنز سے بھرپور باتیں دل پر اثر کرتیں اور سننے والے ہنستے ہنستے زندگی کی کوئی بڑی حقیقت پر غور کرنے لگتے۔ ملّا نصرالدین نے پند و نصائح سے ہمیشہ گریز کیا۔ اُس کا یہ نظریہ تھا کہ اِس روتی بسورتی دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی سمجھ کے مطابق بات سمجھائی جائے اور بات سمجھانے کے لیے ہنسی مذاق کو اپنا شعار بنایا جائے۔ ملّا نصرالدین نے اپنے اس نظریئے کو اس حد تک عملی جامہ پہنایا کہ وہ خود جان بوجھ کر بے وقوف بنتا رہا۔ لوگ اس کی بے وقوفی پر ہنستے اور دوسرے لفظوں میں کسی اچھی بات کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی عقلمندی کا ثبوت دیتے۔

ملا نصیر الدین کی زندگی کے پورے واقعات تو کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے گاؤں کا قاضی بھی تھا۔ وہ شاعر اور فلسفی تھا۔ صاف ستھرا، خوش پوش اور ہنس مکھ انسان تھا کہ بڑی سے بڑی بات ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز سے مؤثر پیرائے میں کہی جا سکتی ہے۔ اُس کی یہ بات اُسی کے ایک واقعے سے یوں ظاہر ہوتی ہے کہ ایک بار وہ گاؤں سے باہر سڑک پر مزے مزے سے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں رسی کا ایک رسا تھام رکھا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے گدھا چل رہا تھا۔ چلتے چلتے گدھے کی پیٹھ پر لدی ہوئی بوری میں سے مٹی کا ایک پیالہ گر کر زمین پر ٹوٹ گیا۔ لیکن ملا نصیر الدین بغیر رکے اور بغیر پیچھے دیکھے اپنی راہ چلتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایک راہ گیر نے یہ خیال کر کے کہ شاید ملا کو پیالے کے ٹوٹنے کی خبر نہیں، ٹوٹے ہوئے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔ ملا نے جواب دیا "مجھے معلوم ہے لیکن جب پیالہ ٹوٹ گیا تو ٹوٹ گیا"

ایسے موقع پر دراصل سوائے ہنس کے کوئی اور چارہ ہی نہ تھا کہ بجائے اس نقصان پر رونے دھونے کے وہ اپنی رفتار جاری رکھتا۔ ملا کا یہ جواب مزاح و طنز کے پردے میں رُک گئے والے شخص کی سمجھ پر ایک کڑی تنقید ہے۔ یہ جواب دوسرے شخص کے لیے یہ معنی رکھتا ہے کہ "تم کتنے بیوقوف ہو۔ پیالہ ٹوٹ تو ٹوٹ گیا۔ اس کو جوڑا تو جا نہیں سکتا تو ٹھہر کر افسوس کرنے اور وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟"

ملا نصیر الدین اپنی حاضر جوابی، خوش باشی اور زندہ دلی کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے۔ یوں تو وہ جسمانی طور پر ۷۶ برس تک حیات رہا اور اب وہ سوری حصار دیز میں ابدی نیند سو رہا ہے اور اس کی آخری قیام گاہ ——— مزار کی پیشانی پر سے محروم ہو گیا اور وہ ناقول رہنے لگا۔ ملا بڑا خوش تھا لیکن ایک صبح اس نے دیکھا کہ گدھا زمین پر مردہ پڑا ہے۔ گدھے کو مرا ہوا دیکھ کر ملا نے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے کہ گدھا آخر گدھا نکلا اور اُس وقت مرا ہے جب وہ فاقے رہنے کا عادی ہو چکا ہے۔"

ایک دن ملا نصیر الدین نہانے کے لیے گرم حمام میں پہنچا۔ معمولی سے کپڑوں میں ملبوس ملا کو حمام والوں نے معزز نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اسے پھٹا پرانا اور میلا کچیلا تولیہ اور کپڑے دھونے والے صابن کا ننھا سا ٹکڑا دے کر اس غسل خانے میں بٹھا دیا جہاں نہانے دھونے کا معقول انتظام نہ تھا۔ ملا نہا دھو کر باہر نکلا تو اس نے حمام کے دونوں آدمیوں کو ایک ایک اشرفی انعام کے طور پر دی۔ وہ دونوں دم بخود ہو کر رہ گئے اور دل ہی دل میں افسوس کرنے لگے کہ ہم نے اس انسان کو پہچاننے میں بڑی غلطی کی۔ دوسری بار ملا جو آیا تو انہوں نے مل کر ملا کی بڑی خدمت کی۔ ایک نے نیا تولیہ، خوشبودار صابن اُس غسل خانے میں رکھا جو خاص لوگوں کے استعمال میں آتا تھا۔ دوسرے نے ملا کے بدن کی مالش کی اور جب ملا نہا دھو کر باہر نکلا تو اس نے دونوں کی ہتھیلی پر تانبے کا ایک ایک پیسہ رکھ دیا۔ اس پر وہ بہت حیران ہوئے۔ ملا سے کہا "جب ہم نے کوئی خدمت نہ کی تو ہمیں ایک ایک اشرفی ملی۔ اور آج ہماری خدمت کا یہ عوض ...." ملا نے جواب دیا "اس دن تم نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی، اُس کا معاوضہ تمہیں آج ملا اور آج تم نے بڑی خدمت کی تو اس کا معاوضہ تمہیں اس دن پیشگی دے دیا گیا تھا"

ملا نصیر الدین سے کسی نے پوچھا "عورت کوئی راز اپنے سینے میں محفوظ رکھ سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں؟"

ایک نے پوچھا "کون سا راز؟"

ملا نے جواب دیا "فقط ایک راز۔ اپنی عمر کا!"

اس پر ایک اور نے پوچھا۔ "ملّا تمہاری عمر کیا ہوگی؟"

اس نے جواب دیا۔ "چالیس برس کا ہوں۔"

ایک اور نے کہا۔ "لیکن ملا پچھلے برس بھی تم نے یہی الفاظ کہے تھے۔"

"ہاں کہے تھے۔ میں اپنے الفاظ سے پھرنے والا نہیں ہوں اور آج بھی انہی الفاظ پر کاربند ہوں۔"

ایک پبلک جلسے میں ایک لیڈر جب تقریر کرنے کے لئے سٹیج پر آیا تو وہ جمِ غفیر دیکھ کر ایسا سٹپٹایا کہ اُس کی زبان گنگ ہوگئی اور تقریر دل ہی دل میں ہوتی رہی۔ اس پر اُس کے بہت سے عقیدت مندوں نے زندہ باد کے نعرے لگائے تاکہ اس عرصے میں وہ سنبھل جائے لیکن وہ نہ سنبھل سکا۔ آخر ایک آواز آئی۔ "آپ کچھ تو کہئے۔"

اس نے کہا۔ "کیا کہوں، میں تو کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔"

مُلّا اٹھ کر سٹیج کے پاس آیا اور اُس سے کہا۔ "کیا یہ بھی نہیں سوچ سکتے کہ سٹیج سے فوراً نیچے اتر آؤ۔"

ایک کسان اپنے گھوڑے کی لمبی دم تراش رہا تھا کہ پاس سے ملّا نصرالدین گزرا۔ کسان نے مُلّا سے پوچھا۔ "دیکھو، کتنی دم ٹھیک رہے گی؟"

ملّا نے جواب دیا۔ "میرے بھائی اگر گھوڑے کی دم چھوٹی کر دو یا بڑی وہ بعض لوگوں کے لیے بہت چھوٹی اور بعض لوگوں کے لئے بہت لمبی رہے گی۔"

ایک کسان احمد نامی ملّا کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ اس نے ایک ننھا سا چوزہ ملّا کو تحفتہً دیا۔ ملّا نے اُس کی بڑی خاطر تواضع کی۔ اُس کے رخصت ہونے کے چند روز بعد ایک اور شخص آیا اور اس نے ملّا سے کہا کہ "میں احمد کا دوست ہوں۔" ملّا نے اس کی بھی تواضع کی۔ تیسرے دن ایک اور شخص آیا، اُس نے کہا۔ "میں احمد کا دوست ہوں۔" ملّا نے پھر وضع داری کا ثبوت دیا۔ اس کے جانے کے ایک ہفتہ بعد ایک اور شخص آیا اس نے کہا "میں احمد کا دوست ہوں۔" ـــــ ملّا نے اسے اپنے دیوان خانے میں بٹھایا۔ اتفاق سے وہ کھانے کا وقت تھا۔ دستر خوان بچھایا گیا تو مہمان کے سامنے ملّا نے ایک بڑے کٹورے میں لال گرم پانی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ احمد کے دیئے ہوئے چوزے کے شوربے کے شوربے کا شوربہ ہے۔"

ایک دن ملّا نصرالدین نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "کنوئیں سے پانی کا گھڑا بھر لاؤ اور دیکھنا کہیں گھڑا نہ ٹوٹ جائے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے بیٹے کے گال پر زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا تم نے اپنے بیٹے کو کیوں مارا۔ اس غریب نے گھڑا کہاں توڑا تھا۔

مُلّا نے جواب دیا۔ "گھڑا ٹوٹنے کے بعد اگر میں اُسے سزا دیتا تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔"

مُلّا نصرالدین کا ایک پڑوسی بڑا لالچی اور بے ایمان تھا۔ ایک شام مُلّا نے اُس سے فرائی پین (تلنے کا برتن) مانگا۔ پڑوسی نے اُسے فرائی پین دے دیا۔ مُلّا کو دراصل فرائی پین کی ضرورت نہ تھی، وہ اپنے پڑوسی کو ایک سبق دینا چاہتا تھا۔ پندرہ دن بعد جب اُس نے اپنے پڑوسی کو اس کا فرائی پین واپس دیا تو اس کے ساتھ ایک ننھا سا فرائی پین بھی دیا۔ پڑوسی نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

ملّا نے جواب دیا: ”تمہارے فرائی پین نے بچہ دیا ہے۔“

پڑوسی بہت خوش ہوا اور ننھا فرائی پین بھی لے لیا۔

تیسرے دن ملا نے پھر اس سے فرائی پین مانگا اور اپنے پاس ایک ماہ تک رکھا اور جب پندرہ دن اور گزر گئے تو پڑوسی خود ملّا کے پاس آیا اور اُس سے اپنا فرائی پین مانگا۔ ملّا نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ تمہارا فرائی پین مر چکا ہے۔“

پڑوسی سیخ پا ہوگیا اور گرج کر بولا: ”کبھی فرائی پین بھی مر سکتا ہے، کیا بکتے ہو؟“

ملّا نے کہا: ”جب فرائی پین بچہ دے سکتا ہے تو مر بھی سکتا ہے۔“

(بنگالی)

ایک رات

از : پرشورام

ترجمہ : یونس احمر

شہر میں بچوں کے اغوا کرنے کی وارداتیں پھر سننے میں آرہی ہیں۔ شام کے وقت لوچن بابو کے بیٹھک خانہ میں اس موضوع پر گفتگو چھڑ گئی۔ ان کا بھانجا اُدے ہاتھ ہلا ہلا کر اونچی آواز میں کہہ رہا ہے —— آج کی خبر سنی ہے آپ لوگوں نے ؟ صرف آج پچاس بچوں کو اغوا کیا گیا ہے۔ کل اسی قسم کی پچیتر وارداتیں ہو چکی ہیں۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ جو بچے اغوا کئے گئے ہیں۔ ان کا ٹھور ٹھکانہ کسی کو نہیں معلوم۔ لوگ غصّے میں دیوانہ وار ادھر اُدھر دوڑ رہے ہیں، موٹر گاڑیاں سرپٹ بھاگی جا رہی ہیں اور سپاہی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہے۔ وہ خاموش ہے

لوچن بابو نے پوچھا۔ اخبار والے نے کیا لکھا ہے ؟"

لوچن بابو کے سالا نگن نے جواب دیا۔ "دھوم کیتو نے بڑا ہی زوردار اداریہ لکھا ہے —— وہ لکھتا ہے —— ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس افسوسناک واقعہ کی ذمہ داری کس پر ہے۔ ان پڑھ عوام کا خیال ہے کہ بالی برج کی بنیاد کو پختہ کرنے کے لیے دس ہزار بچوں کو بھینٹ چڑھایا جائے گا اور پڑھے لکھے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بچے دنیا ترک کر کے بن باس لے رہے ہیں۔ آپ ہی بتایئے کس پر یقین کیا جائے ؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام لیڈران متحد ہو جائیں۔ ہم حکومت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اور کس ملک میں اتنی کثرت سے بچّوں کو اغوا کیا گیا ہے ؟"

لوچن بابو کے چھوٹے لڑکے گھنٹو نے کہا "کیا بچوں کو ان کے باپ ہی لے بھاگتے ہیں —— ؟"

وکیل بتو د بابو نے کہا "باپ بھی ایسے ہی ہوں گے۔ تم فکر نہ کرو ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔"

بوڑھے کیدار چہاٹے اس وقت چپ چاپ تمباکو نوشی میں مصروف تھے۔ نگن نے اُن سے کہا "کیدار چہاٹے ذرا ہوشیاری سے راستہ چلئے گا۔"

لوچن داس : یہ خوب ہشیار ہیں۔ انہیں بھلا کون پکڑ سکتا ہے۔"

اُدے : غالباً صرف بچوں ہی کا اغوا کیا جا رہا ہے ؟"

کیدار چہاٹے نے گُڑگُڑی کو رکھتے ہوئے کہا۔ "اُرے بھئی اُدے تم نے کیا لکھا پڑھا ہے۔ ہنھ ! بتاؤ نوجوان اور جوان میں کیا فرق ہے ؟

اُدے : جوان وہ ہے جس کے جسم میں طاقت ہوتی ہے اور نوجوان یعنی جسے ینگ کہتے ہیں۔ ذرا ٹھہریئے لغت دیکھ کر بتاتا ہوں۔

کیدار : لغت میں نہیں ملے گا تمہیں۔ آج کل لفظوں کے معنے بدل گئے ہیں۔ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس کی داڑھی اور مونچھیں دونوں ہوں وہ تو ہوا جوان جیسے روبی ٹھاکر، پی سی رائے اور جس کی نہ داڑھی ہو اور نہ مونچھیں، وہ ہوا نوجوان جیسے بنکم چٹرجی، سرت چٹرجی اور میں یعنی کیدار چٹرجی۔"

اُدے : اور میں ؟

کیدار : تم ان دونوں کے بیچوں بیچ ہو۔ تم ہی پکڑے جاؤ گے۔

اُدے نے ذرا پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں داڑھی رکھتا مگر بیوی نے ——"

نگن : خبردار اُدے۔ بیوی کا نام لیا تو کان مل دوں گا۔

اسی اثنا میں نوکر لوچن داس کے ہاتھ میں ٹیلیگرام دے کر چلا گیا۔ ٹیلیگرام پڑھنے کے بعد اُس نے کہا ——

"کیدار مہاشے یہ تار آپ کا ہے؟"

کیدار: "مجھے تار کس نے کیا؟ ذرا سناؤ تو پڑھ کر۔"

لوچن داس: کارتک یسنگ۔

اُدے: ایں، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

لوچن داس: جھمل پور سے چرن گھوش نے تار دیا ہے۔ لکھا ہے کہ کارتک لاپتہ ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج کرا دیجیے۔ اور چرن بابو پانچ بجے کی ٹرین سے خود آ رہے ہیں۔ مگر اس وقت تو چھ بج چکے ہیں۔ اب آ ہی چلے۔ ان کی زبانی سارا ماجرا سن کر ہی پولیس میں رپورٹ درج کرائے گا۔ مگر کارتک ہے کون؟

کیدار : چرن کا بڑا لڑکا۔ یہیں ہاسٹل میں رہتا ہے اور ہر ہفتے گاؤں چلا جاتا ہے۔ ان دنوں تو کالج بھی بند ہے۔

نگن : مگر سوال یہ ہے کہ کارتک کو اغوا کون کر سکتا ہے۔ بکواس ہے بالکل جھوٹ۔

کیدار : تم جانتے ہو اُسے؟

نگن : اچھی طرح۔ میرے منجھلے سالے باٹلو کا ساتھی ہے۔ بڑا ہی بہادر ہے وہ تو خوب ہوشیار بھی۔ جب دس سال کا تھا تو کہا کرتا تھا کہ لڑکیاں بھی کیا انسان ہیں —— سر پر بالوں کا گچھا، اِدھر اُدھر سے بندھا ہوا۔ اور جب چودہ سال کا ہوا تو اُس نے باٹلو کو خط میں لکھا —— عورت کی محبت؟ سب بکواس ہے۔ بھائی باٹلو اس دنیا میں رہنے کا کسی کو حق نہیں۔ صرف میں اور تم رہیں گے۔ لیکن دو سال کے بعد ہی اُس کے شجرِ جوانی کی شاخوں پر سے پنچھی اُڑ گیا اور کارتک نے اپنی بیاض میں لکھا —— عورت تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے، کٹھن اور دشوار۔

لوچن داس: یہ باتیں کچھ اچھی نہیں لگیں سن کر۔ چرن بابو نے اس کی شادی کیوں نہ کر دی۔

کیدار : کتنی بار کہا چرن سے مگر بے سود۔ جب بھی میں بیاہ کا ذکر چھیڑتا وہ کہتے —— تعلیم مکمل کرنے دو۔ پھر کمانے دو۔ پھر دیکھا جائے گا۔ البتہ اس کے لیے لڑکی ڈھونڈی جا چکی تھی اور وہ تھی ان ہی کے دوست راکھال سنگھ کی لڑکی۔ تیرہ چودہ سال پہلے ہی دونوں دوستوں میں وعدے وعید ہو گئے تھے۔ اس کے بعد راکھال بابو فوت ہو گئے اور پھر اُن کی بیوی بھی چل بسیں۔ لڑکی کی ساری ذمہ داری اس کے ماموں کے کندھے پر آ گئی۔ سنا ہے وہ کہیں کے جج تھے، ابھی حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔ نگن راکھال سنگھ کی لڑکی —— ہنھ، کارتک کبھی شادی نہیں کر سکتا اُس کے ساتھ۔ سنا ہے لڑکی بالکل وحشی ہے۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ چرن گوش آ پہنچے۔ ایک ہاتھ میں چھتری، دوسرے ہاتھ میں بیگ۔ داڑھی کے بال کچھ پکے ہوئے اور کچھ کچے۔ بُری طرح

ہانپ رہے تھے۔ بولے۔ "شریر، بدمعاش کہیں کا!"

کیدار: پتہ چلا اس کا؟

چرن: پتہ کیا خاک چلے گا۔ جھوٹا، نالائق۔

لوچن داس: چرن بابو ذرا دم لیجئے۔

کیدار: غصہ بعد میں اتارنا پہلے واقعہ تو بیان کرو۔

چرن: واقعہ کیا خاک بیان کروں گا ـــــ اپنا سر۔ گڈ فرائی ڈے کی وجہ سے کالج میں تعطیل ہے۔ وہ کئی دنوں تک میرے ساتھ رہا۔ کل سویرے یکایک اس نے کہا کہ فلسفہ کی دو ایک کتابیں باٹلو کے پاس ہیں۔ کلکتہ جاکر لے آؤں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے جاؤ لیکن دوپہر کی گاڑی سے لوٹ آنا۔ شام ہوگئی مگر نہ لوٹا۔ رات بھی صبح میں بدل گئی۔ اس کی ماں نے سینہ کوبی شروع کر دی کیونکہ پرسوں ہی ترسٹھ لڑکوں کا اغوا ہو چکا ہے۔ کلکتہ پہنچ کر میں سب سے پہلے باٹلو کے گھر گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی شانٹلو نے کہا کہ باٹلو اور کارتک اپنے کئی دوستوں کے ہمراہ ٹاؤن ہال میں تقریر سننے گئے ہیں۔ لیکن باٹلو کی بہن بولی۔ بالکل جھوٹ۔ دونوں اینگلو مغلائی ہوٹل گئے ہیں، وہاں سے پھر سینما جائیں گے۔ اب بتاؤ اسے کہاں ڈھونڈا جائے۔

بنود: جب پتہ چل گیا پھر حیران پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تفریح کرنے دیجئے۔ چلا جائے گا اپنے گھر۔

وہ تو یہاں آیا ہے تفریح کرنے اور ہمارا برا حال ہو گیا ہے۔ میں زبردستی کان پکڑ کر اسے لے جاؤں گا یہاں سے۔ چلو کیدار۔

کیدار: کہاں؟ کدھر؟

نگن: اینگلو مغلائی ہوٹل۔ ٹیکسی میں بیٹھ جائیے۔ بس دس منٹ میں دھرم تلہ پہنچ جائیں گے۔

اور چرن گھوش اور کیدار مہاشے روانہ ہو گئے۔

اینگلو مغلائی ہوٹل تھا تو چھوٹا سا مگر خوب مشہور تھا۔ یہاں ہر وقت جوانوں بوڑھوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ اس وقت بھی ہنگامہ برپا ہے۔ دروازے کے پاس ہی مینیجر کی سیٹ ہے۔ کبھی وہ بیٹھ کر اور کبھی کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھتا ہے اور آواز لگاتا جاتا ہے ـــ تین نمبر ایک پلیٹ قورمہ، چھ نمبر دو پیالی چائے، چار کٹلیٹ فوراً اور پانچ نمبر ہیم اور انڈے وغیرہ وغیرہ۔

چرن گھوش اور کیدار مہاشے اندر داخل ہوئے۔ کیدار نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ دیکھو ذرا ہولے ہولے۔ لونڈا یہیں بیٹھا کس اطمینان سے پلیٹ صاف کر رہا ہے۔"

چرن گھوش نے ناک سے آواز نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ ہوٹل شریفوں کے لیے نہیں ہے۔ بدمعاش اور غنڈے جمع ہو گئے ہیں یہاں اور گندے غلیظ کھانوں پر جھپٹ رہے ہیں۔"

کیدار: خاموش، خاموش۔ ان کا کیا قصور کھانے دو انہیں۔

مینیجر: ارے آپ لوگ اب تک کھڑے ہیں۔ دیکھئے دو نمبر میں جگہ خالی ہو گئی۔ جائیے بیٹھ جائیے وہاں۔

کیدار مہاشے نے ہونٹوں میں انگلی دیتے ہوئے کہا۔ "خاموش، خاموش۔"

منیجر نے فوراً جواب دیا۔ "بھئی شرمانے کی تو کوئی وجہ نہیں۔ یہاں تو بڑے بڑے افسران، جج، مجسٹریٹ سب ہی آتے ہیں۔ آپ پردہ کھینچ کر بیٹھ جائیے۔ اچھا بتائیے کیا کھائیں گے؟

کیدار: تو کیا پردہ کے پیچھے ہی بیٹھنا پڑتا ہے؟

منیجر: (ہنستے ہوئے) کٹلیٹ کھائیں گے؟ یا بکرے کے گوشت کا اسٹو۔ چکھ کر دیکھئے۔ مزہ نہ آئے تو میرا ذمہ۔

کیدار: گوشت کھانے کا زمانہ اب کہاں؟

منیجر: تو پھر انڈے!

چرن: نہیں کچھ نہیں چاہیئے۔ بلاؤ اس نامعقول کو۔

منیجر: جناب یہاں نامعقول قسم کے لوگ نہیں آیا کرتے۔ سب شریف اور مہذب لوگ موجود ہیں یہاں۔

کیدار: ارے بھائی چرن ایسی باتیں نہ کرو۔ بچپن کی باتیں بھول گئے اپنی؟ تم بھی درخت کی شاخوں پر چڑھ کر کیا کباب کھایا کرتے تھے۔ نیچے کو کھا لینے دو پھر مرمت کرنا اس کی اچھی طرح۔ فی الحال خاموش رہو اچھا ہے۔

کارتک اور اس کے تین دوست اطمینان سے بیٹھے کھا پی کر خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔

گوپال: میں تو اپنی زندگی آئیڈیل بنانا چاہتا ہوں ورنہ مونوٹونس بن کر رہ جائے گی۔

گھنن: مجھے تم سے اتفاق نہیں کیونکہ آئیڈیل انسان کو آئیڈیل کا غلام بنا دیتا ہے۔ میں ورائٹی یعنی رنگا رنگ کا قائل ہوں۔

(COMMITMENT) قطعی نہیں۔ لوتھر پو نے کیا خوب کہا ہے ——

ٹوپک اینڈ چوز، پلے فاسٹ اینڈ لوز۔ ہاں باٹلو تمہارا بھی کوئی آئیڈیل ہے؟

چرن گھوش نے آہستہ آہستہ کہا۔ "کیدار بھائی میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان کا موضوع گفتگو کیا ہے؟"

کیدار: بھئی تم چپ بھی رہو۔

کارتک نے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ "میں آئیڈیل ٹائیڈیل پر یقین نہیں رکھتا۔ مجھے تو ایسی لڑکی چاہیئے جو بالری بنرجی جیسی حسین، مسز چوبے کی طرح ہمت ور، رینو کا دیوی جیسی ادیبہ، منجھلی بھابی کی نند کی مانند ہنس مکھ اور پُرمذاق، لوٹی رائے کی طرح مغنیہ اور نیلما جیسی رقاصہ"

کیدار نے کہا۔ شاباش۔ ایسا تیز طرار لڑکا تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ چرن چاہئے بس اگلے مہینے میں اس کی شادی کر دو۔ ورنہ ہاتھ سے گیا۔

چرن گھوش کو تاؤ آگیا۔ اس نے کہا۔ "ابے اسٹوپڈ بندر کہیں کا یہاں بیٹھا کیا کھا رہا ہے اور یہ سارے لونڈے"

گھنن: جناب دیکھئے ذرا زبان سنبھال کر۔

چرن: اس اسٹوپڈ سے میں نے کہا تھا کہ فوراً گھر لوٹ آنا مگر اس نے بات نہ مانی۔ میرے دل میں نہ جانے کیسے کیسے اندیشے پیدا ہوئے —— کہیں موٹر کے نیچے تو نہیں آگیا، پولیس نے ہتھکڑی تو نہیں پہنا دی یا کسی نے اغوا تو نہیں کر لیا —— آجکل ویسے ہی اغوا کرنے

کی واردتیں سننے میں آرہی ہیں۔ ماں اس کی چھاتی پیٹ رہی ہے ——— اور اسے دیکھو کتنے اطمینان سے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہے۔ نالائق، بندر، اسٹوپڈ۔ یونیورسٹی میں یہی تعلیم دی جاتی ہے کیا؟ تمہارے اسناد ایسے ہوٹل میں اڈہ جمانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری پارٹی کا سردار یہ باٹلو ہے اور یہ گوپال اور گھنن ——— بے حیا بے شرم۔

کارتک تو اپنے باپ کی جلی کٹی برداشت کر گیا۔ مگر اس کے دوست آپے سے باہر ہو گئے اور ہوٹل کے مینجر نے آستین چڑھالی۔

باٹلو بڑا ہی ہشیار، سمجھدار اور شیریں سخن ہے۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے چرن بابو، آپ کارتک کو جو جی میں آئے کہہ سکتے ہیں لیکن، ہمارے خلاف آپ کو کچھ کہنے کا حق نہیں“!

مینجر: میں آپ کو پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔

چرن مہاشے کو اشتعال آگیا۔ ”دم ہے تو حوالے کر کے دیکھو“۔

مینجر: مہاشے جی یہ ہے اینگلو مغلائی کیف۔

باٹلو یہ غلط تلفظ برداشت نہ کر سکا اور ٹوکتے ہوئے کہا ”کیف نہیں کیفے“۔

مینجر: ایک ہی بات ہے۔ مہاشے جی اس ہوٹل میں مہذب قسم کے لوگ آتے ہیں۔ یہ ہے ایک رسپکٹ ایبل ریسٹورنٹ“۔

باٹلو: ریستوراں۔

مینجر: ٹھیک ہے۔ آپ نہیں جانتے مہاشے جی یہ ہے پڑھے لکھے لوگوں کا اینڈیزوورز۔

باٹلو: اندیور۔

بار بار باٹلو کی اس مداخلت سے مینجر کو تاؤ آگیا۔ بولا۔ ”ابھی تم بچے ہو، صحیح تلفظ کیا ہے۔ تمہیں بعد میں معلوم ہوگا۔ دھوپ میں یہ بال سفید نہیں ہوئے ہیں“۔

باٹلو نے بھی چیخ کر کہا۔ ”دیکھو ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔ ہم تمہارے ہوٹل کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔ کتے کا گوشت اور سانپ کی چربی کھلا کھلا کر تم شریفوں کو لوٹ رہے ہو۔

سامنے ایک معمر شریف صورت اور کم سخن شخص بیٹھا ہوا ٹماٹر کھا رہا ہے۔ اس سے پہلے وہ دو پلیٹ قورمہ صاف کر چکا تھا۔ باٹلو کی یہ بات سن کر وہ چونک پڑا اور بولا۔ ”حیرت ہے۔ اسی لیے تو میں اب یہ چیزیں نہیں کھاتا۔ صرف ٹماٹر پر اکتفا کرتا ہوں“۔

ہوٹل کے دوسرے لوگ بھی کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی نے کہا۔ ”کتے کا گوشت“ کسی نے کہا۔ ”اسی لیے تو ویٹامین کی کمی ہے۔“

مینجر نے سبھوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیے جھوٹ اور لغو باتوں پر کان نہ دھریئے۔ کیا ہمیں خدا کا ڈر نہیں ہے“۔

کیدار مہاشے نے پہلے تو چاروں طرف دیکھا پھر کہا۔ ”بھائیو اگر آپ بور محسوس نہ کریں تو ویٹامین کے بارے میں دو چار باتیں سن لیجئے“۔

چند نوجوانوں نے سبھوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہاں ضرور سنائیے“۔

”کیدار مہاشے نے کہنا شروع کیا۔ دیکھیے جناب اصل غذا ویٹامین ہے۔ یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں یعنی سبھوں کو ویٹامین کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر آپ ویٹامین چاہتے ہیں تو کٹھل کھانا شروع کر دیجئے۔ ٹماٹر سے دلچسپی رکھنے والے بابو نے تعجب سے پوچھا۔

"کیا کہا کٹھل؟"

کیدار: جی جناب کٹھل۔ شاعروں نے اس پھل کی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔ بنگال میں کٹھل ہی پھلوں کا راجہ ہے۔

شریف آدمی: کٹھل بھی کوئی پھل ہے۔ ہنہ!

کیدار: جی جناب۔ کھا کر دیکھئے۔ وزن دو من تک ہوتا ہے۔ وٹامین سے بھرپور۔

شریف آدمی: کس کلاس کا وٹامین مہاشے۔ اے، بی، سی یا ڈی؟

کیدار: اے، بی، سی، ڈی، بی، ایل، سلائی فاکس میٹ، غرض آپ جو کہیں۔

شریف آدمی: نان سنس۔

کیدار: یقین نہیں آیا آپ کو۔ تو پھر کچے ٹماٹر کھا کر جہنم میں جائیے۔ ہم رخصت ہوتے۔ نمسکار۔ چلو بھئی چرن۔

مینجر: جناب اور دہی کی قیمت تو چکاتے جائیے۔

کیدار: ایسی معلوماتی تقریر سننے کے بعد بھی پیسے مانگ رہے ہو۔ اچھا لو یہ چونّی۔

کیدار مہاشے نے چرن گھوش کو ایک طرف کھینچ کر آہستہ سے کہا۔ کارتک کو کڑوی کسیلی تو سنا چکے اب دو چار میٹھی باتیں کہہ کر اس کا دل بہلا دو۔ جاؤ اُسے بلا لاؤ اِدھر"

چرن گھوش نے کارتک کے قریب جا کر کہا۔ "سنو اگھن مہینے میں تمہارا بیاہ کر رہا ہوں وکھال سنگھ کی لڑکی سے۔ بچپن ہی سے اُس کے ساتھ تمہاری نسبت لگی ہوئی ہے۔ یاد ہے نا؟"

کارتک: میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔

چرن گھوش آپے سے باہر ہو گئے۔ بولے۔ "دیکھتا ہوں شادی سے تو کیسے انکار کرتا ہے۔ اسٹوپڈ"

کیدار: ارے اسے تمہیں تو جیسے عقل ہی نہیں۔ ہوٹل میں بھی کوئی شادی بیاہ کی بات کرتا ہے۔ دیکھو اب دیر نہ کرو۔ نو بجے کی ٹرین مل جائے گی۔ کارتک کو آج یہیں رہنے دو۔

چرن گھوش غصے میں باہر نکل گئے۔ کارتک اور اس کے تین دوستوں کے ساتھ کیدار مہاشے بھی ہوٹل سے باہر آئے۔

گھنن: ہم اپنی اس بے عزتی کو کسی حال میں برداشت نہیں کر سکتے۔ کارتک تم اپنے باپ کے خلاف مقدمہ درج کر دو۔ ہم شہادت دیں گے۔

میں تمہارے اس خیال سے متفق نہیں۔ باپ کے خلاف ایسا نازیبا قدم نہیں اٹھانا چاہیئے۔ البتہ اخباروں میں یہ خبر چھاپ دی جائے۔

گھنن: نہیں بہتر یہ ہے کہ ہم رینوکا دیوی کے پاس چلیں۔ ان کے سامنے لڑکوں کے لیے آشرم کھولنے کی تجویز رکھیں۔

باٹلو: لڑکیاں پھر ہماری مخالفت کریں گی۔ کارتک تمہارا کیا خیال ہے؟

کارتک: باٹلو ہائیڈرو سائنک ایسڈ کی کیا قیمت ہے۔

باٹلو: بہت زیادہ اس کے مقابلے میں مٹی کا تیل بہت سستا ہے۔ دس روپیہ میں کام بن جائے گا۔

کارتک: مگر اس سے بہت تکلیف ہوگی۔

باٹلو: کیا ہوا جب مرنا ہی ٹھہرا۔

کیدار مہاشے نے کارتک کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ بیٹے کارتک دل چھوٹا نہ کرو۔ بڈھا باپ ہے۔ اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ باپ کی عزت خدا کی عزت ہے میاں۔

گھنن: نہیں کارتک ہم رینو کا دیوی کے گھر چلیں۔ آشرم کھولنے کے لیے ان کا پیغام حاصل کرلیں۔

کیدار: رات زیادہ ہوگئی ہے۔ انہیں تکلیف ہوگی۔ کل دیکھا جائے گا۔

گھنن: ابھی تو ساڑھے آٹھ ہی بجے ہیں۔

کیدار: اچھا تو چلو۔

گھنن: مگر آپ ہمارے ساتھ کیوں جائیں گے۔

باٹلو: کوئی حرج نہیں۔ ہمارے ساتھ ایک بزرگ کا ہونا ضروری ہے۔

رینوکا دیوی کا ڈرائنگ روم چھوٹا سا ہے۔ بیچ میں ایک میز ہے، اس کے چاروں طرف کئی کرسیاں ہیں اور ایک بینچ بھی۔ ابھی یہ لوگ پہنچے ہی تھے کہ ایک نیپالی ملازمہ پر نظر پڑگئی۔ باٹلو نے کہا ـــــ کیدار مہاشے آپ ہمارے بزرگ ہیں لیجیے اپنا کارڈ بھجوا دیجیے۔

کیدار: میرے پاس کارڈ وارڈ کہاں۔ اسے بھئی سنو۔ جاؤ رینوکا دیوی کو اطلاع کردو کہ کیدار بابو اور چار نوجوان تشریف لائے ہیں۔

گھنن: نوجوان نہیں جوان۔

کیدار: اچھا بھئی اچھا۔ جوان ہی سہی۔

ملازمہ نے پوچھا۔ "میم صاحب کے ساتھ؟"

کیدار: ہاں ہاں رینوکا دیوی کے ساتھ۔

ملازمہ چلی گئی تو باٹلو نے کہا۔ "دیکھئے کیدار مہاشے۔ آپ ہمارے وفد کے لیڈر ہیں۔ گھبرائیے نہیں۔"

کیدار: میاں کیوں گھبرانے لگا۔

اتنے میں رینوکا دیوی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں ـــــ بھاری بھرکم عورت، پاؤڈر سے لپا ہوا چہرہ۔

انہوں نے آتے ہی پوچھا۔ "مجھے فوراً کمیٹی کی میٹنگ میں جانا ہے۔ ذرا جلدی اپنا مقصد بتا دیجیے نوازش ہوگی۔"

باٹلو: کیدار مہاشے بتا دیجیے۔

کیدار مہاشے نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے رینوکا دیوی جی اس لڑکے کا نام کارتک۔ شریف صورت اور نیک باپ کا نام ہے۔ چرن گھوش۔ ان کے مزاج میں تلخی اور چڑچڑاپن ہے۔ انہوں نے کارتک کو اسٹوپڈ اور بندر کہا ہے اور اسی لیے یہ لڑکے ....۔"

گھنن نے اپنا نوٹ بک نکالا اور دیکھتے ہوئے کہا۔ "تین بار بندر کہا ہے انہوں نے۔"

کیدار: ٹھیک۔ ہاں تین بار کہا ہے۔ اب تو وہ زمانہ نہیں رہا۔ رینوکا دیوی جی جب ہمارے باپ دادا گالیاں دیتے تھے اور ہم سر جھکا کر سُن

لیتے تھے۔ اُس زمانے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ جب اسی کلکتے میں گھوڑے ٹرام گاڑیاں کھینچتے تھے۔ لڑکے داڑھیاں رکھتے تھے، لڑکیاں چھپ چھپ کر گانے گاتی تھیں۔ یہ باتیں اب پرانی ہوگئیں۔ باپ نے لڑکے کو اگر بندر کہہ دیا تو کیا بُرا کیا۔ بندر بھی تو خدا کی مخلوق ہے۔

رینوکا دیوی نے کیدار مہاشے سے پوچھا، ”نوجوانوں میں سینگ لگا کر آپ کیوں شامل ہوگئے؟“

کیدار مہاشے نے ذرا سوچ کر جواب دیا، ”آپ نہیں جانتیں۔ میں بھی تو جوانوں کا جوان ہوں۔“

یہ سن کر رینوکا دیوی خوش نہیں ہوئیں۔ کیدار مہاشے نے ذرا وضاحت کرتے ہوئے کہا، ”میری مثال گجراتی ناریل سے دی جا سکتی ہے ـــــ باہر سے پکا ہوا اور اندر سے کچا۔

گھنن یہ سن کر مشتعل ہوگیا۔ اس نے کہا، ”کیدار مہاشے فضول باتیں نہ کیا کیجیے۔ میں بتاتا ہوں۔ دیکھیے رینوکا دیوی جی پبلک ہوٹل میں ہماری بے عزتی کی گئی۔ ہماری خطا کچھ بھی نہیں۔ ہم اس ذلت و رسوائی کو اور برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم اس مقصد کے لیے بے قصور لڑکوں کا ایک آشرم بنانا چاہتے ہیں۔ آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو آشرم کی بنیاد پڑ جائے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں ایک پیغام لکھ کر دے دیں۔“

رینوکا دیوی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہیں پھر انہوں نے آواز دی، ”شوشین، شوشین۔“

اس آواز کو سن کر ٹھگنے قد کا آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ رینوکا دیوی کے سوامی ہیں ـــــ کمزور، لاغر، آنکھوں میں عینک، ہنس مکھ۔

رینوکا دیوی نے لڑکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”یہ لڑکے میرا پیغام لینا چاہتے ہیں۔“

شوشین بابو کاغذ قلم لے آئے اور رینوکا دیوی نے اپنا پیغام لکھوایا۔

کیدار مہاشے پیغام پڑھ کر اچھل پڑے اور بولے، ”واہ بہت خوب۔ بہت خوب۔“

کیدار: ہم نے آپ کا قیمتی وقت برباد کیا معاف کیجیے گا۔

رینوکا دیوی: نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ اچھا تو میں میٹنگ میں چلی۔ نمسکار۔

رینوکا دیوی رخصت ہوگئیں تو کیدار مہاشے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ شوشین بابو نے کہا، ”آپ جلدی میں تو نہیں ہیں تھوڑی دیر اور بیٹھیے۔“

کیدار: تو کیا آپ بھی کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔

شوشین بابو نے دروازے سے جھانک کر دیکھا پھر کہا، ”پیغام! ہنھ۔ مہاشے میں کچھ نہیں جانتا۔ صرف کام جانتا ہوں۔ ہاں بتایئے تو آپ کنائی گھوشال کو جانتے ہیں۔ سینٹ ہاؤس کی چھت پر چھتیس گھنٹے تک وہ ایک پاؤں پر کھڑے رہے ہیں۔ وہ ہیں میرے چچازاد بھائی۔“

کیدار: اچھا!

شوشین: جی! بلائی بنرجی کو جانتے ہیں؟ اس لونڈے نے تنہا تین گوروں کی پٹائی کی ہے۔ وہ ہے میرا ماموں زاد بھائی!

کیدار: اچھا! آپ تو بڑے جیوٹ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اچھا ہم چلے نمسکار۔

شوشین نے منہ بناتے ہوئے کہا، ”پانچ روپے ہوں تو۔“ بالٹو نے اس کی طرف ایک اٹھنّی پھینک دی اور سب رخصت ہوگئے۔

باہر آکر کیدار مہاشے نے کہا۔ تو ہم قلعہ فتح کر آئے۔ اب جلد سے جلد روپے جمع کر کے رینوکا دیوی کے حوالے کرنا چاہیئے۔ اچھا اب میں چلا۔ کارتک آج تم باٹلو کے ساتھ رہو گے؟ کل ملاقات ہوگی پھر۔"

کیدار مہاشے کے چلے جانے کے بعد گھنن نے کہا۔ "دس ہزار روپے! فی الحال تو پچاس نوجوانوں کے قیام کا بندوبست کرنا ہے۔ ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، سونے کے کمرے، لائبریری، ٹینس کورٹ۔ رینوکا دیوی نے کم سے کم اسٹیمیٹ دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ روپے کہاں سے آئیں گے؟

باٹلو: میرا خیال ہے کہ آج ہم خوب پیٹ بھر کر کھا لیں۔ کل سے برت رکھ کر جگہ جگہ جلسے کریں گے، تقریریں کریں گے اور چندہ کی اپیل کریں گے۔

گھنن: تمہارے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں۔

اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ کارتک چپ چاپ باٹلو کے ساتھ ہو لیا۔ جب دونوں گھر پہنچے اور باٹلو کارتک کے لیے اوپر سے چائے لے کر نیچے آیا تو کارتک کہیں جا چکا تھا۔

آدھی رات کا وقت ہے۔ گوبند بابو مزے مزے سے بے خبر سو رہے ہیں۔ یکایک ان کی آنکھوں پر روشنی پڑنے سے نیند ٹوٹ گئی اور اُن کے کانوں میں آہستہ آہستہ یہ آواز آئی "خبردار جو حرکت کی اپنی جگہ سے ورنہ گولی مار دوں گا۔ الماری کی کنجی دیجئے فوراً۔"

گوبند بابو کو یہ چور بڑا ہی ماڈرن معلوم ہوا۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا "کنجی تو بیوی کے پاس ہے اور وہ چندن نگر اپنے بھائی کے گھر گئی ہے۔"

چور: اور منی بیگ، گھڑی، انگشتری وغیرہ۔

گوبند: سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر ہی سب کچھ ہے۔ لیکن میاں چیک بک چھوڑ دینا۔ تمہارے کسی کام نہ آئے گی وہ۔ اور چور نے ٹارچ کی روشنی چاروں طرف گھما گھما کر ڈریسنگ ٹیبل کی تلاشی شروع کر دی۔ یکایک وہ ٹیبل سے ٹکرا کر گر پڑا اور اس کی زبان سے اُف نکل گئی۔

گوبند بابو نے کہا "کیا ہوا؟"

کوئی جواب نہ ملا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اُف سنائی دی۔ گوبند بابو کو فکر لاحق ہوا۔ پلنگ کے پاس ہی بجلی کا سوئچ تھا۔ انہوں نے دبا کر بجلی جلا دی۔ چور میز کے اوپر بیٹھا کراہ رہا تھا۔

گوبند بابو نے پوچھا۔ "گٹھیا کے مریض معلوم ہوتے ہو؟"

چور: نہیں۔ ماہ دو ماہ بعد ایسی تکلیف ہو جاتی ہے۔ اُف، آہ۔

گوبند: علاج کرا رہے ہو؟

چور: نہیں۔

گوبند: ظلم کر رہے ہو اپنے اوپر۔ کچھ روز تک تلسی کے پتے کے رس میں کونین ملا کر کھا کر دیکھو۔ بڑا اچھا علاج ہے یہ۔ بہتر یہ ہے کہ تھوڑے دن پوری یاد گھر میں جا کر گزار دو۔

چور: دیوگھر یا مثری گھر۔

گوبند: ہاں ٹھیک۔ بات یہ ہے کہ بڈھا ہو گیا ہوں۔ یہ بھول گیا کہ تم چور ہو۔ خیر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے خود عدالتوں سے ڈر لگتا ہے۔ چور آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو گوبند بابو نے کہا۔ بیٹھ جاؤ اس کرسی پر۔"

چور کے سر کے بال بڑے بڑے تھے، آنکھوں میں عینک تھی، جسم پر ریشمی کرتا، پاؤں میں کینوس کے جوتے، ہاتھ میں ایک پستول اور کلائی میں گھڑی۔

گوبند: پستول کہاں سے ملا؟

چور: دو آنے میں لایا ہوں خرید کر۔

گوبند: اچھا تو یہ نقلی ہے اور تم سودیسی ڈاکو ہو؟

چور: جی!

گوبند: باپ نہیں تمہارے؟

چور: ہاں حیات ہیں!

گوبند: تو انہوں نے تمہیں نکال دیا ہے گھر سے!

چور: نہیں، میں خود گھر سے فرار ہو گیا ہوں۔

گوبند: وجہ فرار ہونے کی؟

چور: ان کے ظلم و ستم سے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ آج شام کو میں چند دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ وہ سبھوں کے سامنے مغلظات بکنے لگے۔ پھر بولے کہ اگلے مہینے میں راکھال سنگھ کی لڑکی کے ساتھ تمہاری شادی کر دوں گا۔ میں نے انکار کر دیا۔

گوبند: بس اتنی سی بات پر تم نے ڈاکہ زنی کا پیشہ اختیار کر لیا؟

چور: آپ میرے دل کی حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بابا تو مجھ پر غصہ اتار کر سیالدہ اسٹیشن چلے گئے اور میرے دوست مجھے لے گئے۔ ریتو کا دیوی کے پاس۔ بگ ہمبگ۔ وہاں سے پھر باٹلو میرا ساتھی مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اور میں وہاں سے بھاگ آیا کچھ کر گزرنے کے لئے ـــــ چوری، ڈاکہ زنی، قتل۔

گوبند: راکھال سنگھ کی لڑکی شاید قبول صورت نہیں ہے؟

چور: یہ تو بابا ہی جانتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے میں نے جس لڑکی کو کبھی دیکھا تک نہیں اس کے ساتھ زندگی بھر کا سودا کیسے کر سکتا ہوں۔ سنا ہے اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ ماموں نے پرورش کی ہے اُس کی۔ اور ماموں بھی اس کے بد دماغ ہیں۔ میری ہونے والی

شریک زندگی تو اور ہی پیٹرن کی ہے ——— سنتھیسس آف پرفکشن۔

گوبند: ذرا میں بھی سنوں وہ ہے کیسی!

چور: سنیں گے آپ؟

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک نوٹ بک نکالا۔

گوبند: کیا ہے وہ؟

چور: یہ ہے میری بیاض۔ میں اپنے متفرق اشعار لکھتا ہوں اس میں۔ سنیں گے۔

گوبند: ہاں ہاں سنوں گا پہلے یہ بتاؤ لڑکی کا نام کیا ہے!

چور: اصل نام تو نہیں معلوم، ویسے لوگ اُسے شیلا کہہ کر پکارتے ہیں۔

گوبند: اور تمہارا نام؟

چور: کارتک گھوش۔

گوبند: اچھا! کارتک کے دل کی رانی تو شیلی ہی ہو سکتی ہے۔

یکایک کسی کی چاپ سنائی دی۔ گوبند نے پکارا۔

”کون شیلا؟“

ایک جادو بھری آواز لہراتی ہوئی آئی۔ ”اب تک آپ جاگ رہے ہیں؟“ اور یہ کہہ کر وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

چور گھبرا رہا تھا۔ گوبند بابو چور سے مخاطب ہوئے۔ ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے ——— ٹھیک۔ تو تم سنتھیسس آف پرفکشن دیکھ چکے۔ اب اس کی قابلیت کا بھی امتحان لے لو“

اس کے بعد گوبند بابو شیلا سے مخاطب ہوئے۔ ”موجودہ لکھنے والوں میں تمہیں سب سے زیادہ کون پسند ہے؟“

شیلا: جاپانی شاعر ہیماتسو۔ اس کے اشعار پڑھ کر تو میں دم بخود رہ جاتی ہوں۔

گوبند: اچھا شیلا اب وہ ساز بجا کر سنا دو۔

اور شیلا ساز بجانے لگی۔ چور نے آہستہ آہستہ گوبند بابو سے پوچھا۔ اس ساز کا نام غالباً سانتھو سمفونی ہے۔ کیوں؟

گوبند: اُونہہ! نہیں یہ کوئی روسی ساز ہے۔ شیلا روسی ساز کی بے حد دلدادہ ہے۔

شیلا: مجھے نیند آ رہی ہے ماموں جان۔ اور ہاں آپ نے تو تعارف ہی نہیں کرایا ان سے؟

گوبند: یہ ہیں ایک صاحب چور۔ ڈاکہ ڈالنے آئے ہیں یہاں۔

شیلا اُچھل پڑی اپنی جگہ سے اور بولی۔ ”چور“ یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں گئی اور ٹیلیفون اٹھا کر کہنے لگی

پارک ۸۷ ——— ہیلو۔ بالی گنج پولیس اسٹیشن۔“

گوبند: ”شیلا، شیلا، ٹیلی فون رکھ دو۔ ذرا!“

شیلا نے ٹیلی فون رکھ کر کہا۔ "تو چور کو آپ چھوڑ دیں گے"

چور: نہیں۔ وعدہ کرتا ہوں یہیں بیٹھا رہوں گا۔

گوبند: بیٹی شیلا جاؤ تم گرم گرم چائے اور کٹلیٹ تیار کرو اور بازو کے کمرے میں اس کے سونے کا انتظام کر دو۔ بیچارہ اتنی رات کو کہاں جائے گا۔

اور شیلا فوراً چلی گئی۔

گوبند: کیوں کارتک شیلا پسند آئی۔

کارتک: ایکس کیوزٹ۔

گوبند: تمہاری سنتھیسس آف پرفکشن سے یہ ملتی جلتی ہے؟

کارتک: یہ تو ہو بہو وہی ہے۔ لیکن بابا کیا کہیں گے۔ یہ شیلا تو ان کی شیلا سے مختلف ہے۔

گوبند: ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میری یہ شیلا جب سسرال جائے گی تو گاؤں کی گوری جیسی بہوؤں کو گھونگھٹ سے سلام کرے گی۔ اور باورچی خانہ میں گھر بھر کا کھانا تیار کرے گی۔ اگر تم اسے بڑے سے بڑے کلب میں لے جاؤ تو وہ ماڈرن ڈانس کے لیے فوراً تیار ہو جائے گی۔

کارتک: واہ!

گوبند: ڈر گئے کیا؟

کارتک: بالکل نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔

(ہندی)

ہم لکھنؤ گئے

گوپال ویاس

ترجمہ : ظفر ادیب

بہت دنوں سے آرزو تھی کہ لکھنؤ دیکھا جائے، لیلیٰ کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں جیسی لکھنؤ کی ککڑیاں ہی ہمیں لکھنؤ جانے کو نہیں للچا رہی تھیں بلکہ سفیدہ آم دوسیری نگینے اور ملکھراج کے ڈولوں جیسے خربوزے کی گول گول بنکی چکنی بٹیاں بھی ہمارے منہ میں پانی بھر رہی تھیں۔

اُن دنوں کچھ ایسی بات آ بنی تھی کہ جو ملتا لکھنؤ کی تعریف کرتا، کوئی چھتر منزل کی بات کرتا تو کوئی امام باڑہ کی۔ کوئی حضرت گنج کی چہل پہل بیان کرتا تو کوئی چوک سماس کی بہار میں۔ کسی کو وہاں کی بولی پیاری تھی تو کوئی وہاں کے کھانوں میں پڑنے والے مصالحے کی گولیوں پر نچھاور تھا۔ کوئی وہاں کی شیر زبانی کا قائل تھا تو کوئی غزل خواں کا ـــــ کوئی وہاں کے عطر پر قربان تھا تو کوئی سرمے پر۔ کوئی وہاں کی شرافت کو سراہتا تو کوئی نفاست کو ہم نے بھی سوچا لاؤ گرمیوں کی چھٹیوں میں اس بار لکھنؤ دیکھ ہی لیا جائے۔

وہاں ہمارے بچپن کے دوست بھی جا بسے تھے۔ بارہ سال سے اوپر انہیں رہتے ہوئے ہو گئے تھے، ہمارے دوست تھے۔ اس لئے شریف تو ہونے ہی، پھر ایک زمانے سے لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اس لیے ہمارا یہ خیال بے جا نہ تھا کہ لکھنؤ نے ان کی شرافت میں کچھ اضافہ ہی کیا ہوگا۔ کئی بار وہ لکھنؤ آنے کو لکھ چکے تھے۔ اس بار ہم نے پہل کی، لکھا ــ بھائی ہم اس تاریخ کو اس گاڑی سے لکھنؤ آ رہے ہیں۔

گاڑی لکھنؤ پہنچی، سٹیشن دیکھ کر طبیعت کھل اٹھی۔ گاڑی رُکی، ہمارا خیال تھا کہ سمجھدار کو اشارہ کافی ہوتا ہے، ہمارے دوست بیوی سمیت ہمیں لینے کے لیے آئے ہوں گے۔ لیکن گاڑی سے اُتر کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا، پہلے تو سچ کہیں، ہمیں بہت عجیب سا محسوس ہوا، دوست پر غصہ بھی آیا مگر سوچا شاید چھٹی نہ ملی ہو یا کسی ضروری کام سے نہ آ سکے ہوں، کوئی بات نہیں، آپس میں ظاہر داری کیا؟ معمولی سا سامان تھا۔ رکشا میں ڈالا اور دوست کے گھر کی طرف چل دیئے۔

رکشا والا شریف تھا، شہر لکھنؤ کا تھا، ہونا ہی چاہیئے، اس نے کئی سڑکیں پار کیں، کئی موڑ کاٹے اور کئی گلیاں پھاڑ ڈالیں تو پھر صرف ایک گھنٹے میں ہمیں دوست کے مکان پر پہنچا ہی دیا۔ محنت کو دیکھ کر اب ہم اسے ٹھیک مزدوری نہ دیں یہ کیسے ہو سکتا تھا، خیر، مزدوری تو اسے دے دی لیکن دوست کے مکان کا بند دروازہ کیسے کھلوایا جائے۔ یہ بڑا مسئلہ ہمارے سامنے تھا، لکھنؤ کا معاملہ تھا، ذرا شرافت سے ہی کام لینا چاہیئے۔ ہم نے اُنگلی سے دروازے کو کھٹکھٹایا لیکن کسی نے نہ سنا، ہلکی سی دستک دی۔ کوئی آہٹ نہ ہوئی۔ ذرا زور سے دروازے کی زنجیر بجائی کسی کی بھنک نہ اُمنڈی۔ لاچار ہو کر آواز لگانی پڑی۔ "اُرے بھائی بھوشن"

ایک دو تین جب ہمارے گلے سے نکل کر ساتویں بار آواز محلے میں گونج گئی تو اندر سے ایک باریک لیکن تیکھی آواز جیسے بگڑے ہوئے ہارمونیم کے ساتویں سر کو کسی نے دھونکنی دے دی "دیکھنا، موہن! یہ باہر کون چیخ رہا ہے، ان کے روز کے آنے والوں نے جینا حرام کر رکھا ہے"

ایسا محسوس ہوا کہ ہم لکھنؤ میں نہیں ہیں اور ہمیں کسی نے جیتے جی ہی گٹھڑی میں باندھ کر قطب مینار سے نیچے پھینک دیا ہے، ہو گئی

لکھنؤ کی سیر ——— سوچا لوٹ چلیں، اپنی دلّی کو ——— یہاں تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی ۔

ہمارا دل شروع سے ہی وہمی ہے، کسی ایک بات پر اگر جمے رہے ہوتے اور ایک خیال سے کام کیا ہوتا تو آج ہم نہ جانے کہاں پہنچے ہوتے، بات کے ایک پہلو کے آتے ہی دوسرا دل میں کروٹیں لینے لگتا ہے، ہم نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے دوست نے اپنی بیوی کو ہمارے آنے کی اطلاع نہ دی ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوستوں کا یوں استقبال کرنے والی عورت ہمارے دوست کی بیوی نہ ہو، گھر میں کوئی کرایہ دار بھی تو ہو سکتا ہے، ہم سانس روکے ہوئے دروازے پر کھڑے رہے، سوچا کہ پوری بات معلوم کرنا ہی ٹھیک ہے۔ قیاس بیکار ہے ۔

موہن نے دروازہ کھولا اور میٹھی سی آواز میں کہا۔ ”پتا گھر پر نہیں ہیں ۔“

ہم نے بتایا۔ ”دلّی سے آئے ہیں اور تمہارے تاؤ لگتے ہیں۔ یہ سامان اندر رکھواؤ ۔“

لڑکا با اخلاق تھا اس نے ہمیں جھک کر نمستے کی اور اٹیچی اٹھا کر اندر لے گیا، گرمیوں کا بستر ہوتا ہی کتنا ہے، ہم نے اُسے اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا اور دونوں چیزوں کو ایک کونے میں جما کر بیٹھک میں ایک آرام کرسی پر جم گئے، سوچنے لگے ——— آج کیا دیکھا جائے ؛ چڑیا گھر یا تصویر خانہ ؟

موہن بولا۔ ”تاؤ جی شربت پیو گے یا چائے ؟“ بچہ بڑا پیارا تھا، ہماری شکایت دور ہو گئی۔

”چائے تو گرمی میں ہم پیتے نہیں۔“ ہم نے کہا۔

ہم نے قمیص اتار کر ایک کھونٹی پر ٹانگ دی، پنکھا تیز کیا اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر شربت کا انتظار کرنے لگے، ہمارا خیال تھا کہ ہمارے دوست کی بیوی شربت لے کر خود ہی آئیں گی اور ہمیں جو سفر میں اور گھر میں تکلیف ہوئی ہے اس پر میٹھی لکھنؤ کی زبان میں کچھ ایسی باتیں کریں گی کہ ہماری ساری شکایت دور ہو جائے گی، لیکن یہ کیا ؟ بیٹھک میں بیٹھے بیٹھے ہمیں ایسا محسوس ہوا، کہ موہن کچھ سسکیاں بھر رہا ہے یوں ہماری عادت کسی پرائے کیا اپنے گھر میں بھی کسی کی سوئی دھاگا لینے کی نہیں ہے مگر ہمارے کان اس لمحہ کھنچ ہی تو گئے، ہم نے سنا لڑکے کو سخت سست کہا جا رہا ہے۔ ”مرے، کسے بٹھا آیا ہے، بیٹھک میں ؟ تاؤ جی ! ایسے تاؤ جی تو یہاں دن میں تیس آتے ہیں، میں بھی گئی ہوں کسی کے یہاں کبھی پانی پینے۔ کہ سب میری ہی چھاتی پر مونگ دلنے آجاتے ہیں، جا، مٹکے میں پانی پڑا ہے، لوٹے میں بھر کر دے آ، اور دیکھ، یہ پنکھا کیسے فر فر کر رہا ہے، ہلکا کر اُسے ——— “

لڑکا پانی لے کر لوٹا تو اس کا ”پانی“ اتر گیا تھا وہ تو اندر سے لوٹ آیا، مگر ہمارے لبوں پر اٹکی جان ابھی نہیں لوٹی تھی، پانی کا لوٹا تو ہم نے پکڑ لیا، مگر یہ نیم ابلا ہوا پانی گلے سے نیچے نہ اتر سکا، ہم نے سوچا ——— بس اب یہاں سے چل ہی دینا چاہیئے۔ حالانکہ بیویاں سبھی کی کم و بیش ایک سی ہی ہوتی ہیں، ہم تو اپنی کو ہی کہتے تھے مگر یہ تو اس سے بھی زوردار نکلی، ہم نے واپسی کا ارادہ کیا مگر دوست کا خیال آگیا وہ ضرور برا مانیں گے۔ پھر سوچا کہ شہر کا معاملہ ہے ۔ دوست ہمیشہ ہی ملنسار رہے ہیں، بیچاری روز پریشان رہتی ہوگی، ٹھیک بھی تو ہے، انہیں میری اور بھوشن کی لڑکپن کی دوستی کا پتہ بھی کیا ؟ ان لوگوں کی شادی کے بعد میں بھی تو پہلی بار آیا ہوں۔ دوست کے آتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا ۔

آخر دو گھنٹے کے بعد ہمارے دوست آئے، آتے ہی بغلگیر ہوئے، کچھ بھی ہو لڑکپن کی دوستی کا مزا کچھ اور ہی ہے، بولے ”آہا، تم نے تو کوئی خبر ہی نہیں دی ؟“

خط کی بات کہی تو کہنے لگے "مجھے نہیں ملا" ہم نے سوچا تب ہی تو ——— ورنہ تو خط ملے اور بھوشن گھر بیٹھے رہے، کبھی ہو سکتا ہے؟ بہت دنوں میں ملے تھے، ہم دونو ——— باتوں میں الجھے تو وقت کا پتہ ہی نہیں چلا، ہم تو جانے کب تک بیٹھے رہتے مگر وہ تو اندر سے موہن آیا اور کہنے لگا، "ماتا جی بلا رہی ہیں!"

ہمارے دوست گئے اور کچھ دیر بعد لوٹ کر آئے تو مجھے محسوس ہوا کہ کچھ کھوئے کھوئے سے ہیں، پوچھا "کیوں کیا ہوا، جی! ———" بولے "کچھ نہیں، ان کی بہن بھی یہاں لکھنؤ میں رہتی ہیں۔ طبیعت ذرا علیل ہے، ان کی ——— وہ ذرا وہاں جانا چاہتی تھیں میں سوچتا تھا ———"

"ہاں۔ ہاں، سوچنے کی اس میں کیا بات ہے؟" ہم نے کہا "انہیں ہو آنے دو، نہا دھو تو میں ریل میں ہی لیا ہوں۔ کھانا باہر کہیں کھا لیں گے؟"

ہمارے دوست فوراً مان گئے، "کبھی کبھی باہر کھانے میں بھی بڑا لطف آتا ہے، خصوصاً مہمانوں کے ساتھ ——— بولے صرف ایک وقت کے کھانے کی ہی بات ہے؟"

خیر، وہ وقت تو ہوٹل میں خوشی خوشی کٹ گیا، مگر بعد کے تین دن ہمارے جو رام رام کہہ کر کٹے، وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ نہ جانے موہن بیچارا ان دنوں کتنی بار پٹا، نہ جانے ہمارے بھوشن بھائی کتنی بار غصے میں آئے اور کھسیانے ہوئے، چھوٹی چھوٹی باتیں، کیا، کیا بتائیں؟ کبھی دیا سلائی مانگنے پر موہن کی ماں بھبھک اٹھتیں، کبھی ہاتھ پونچھنے کے لئے تولیہ نکال لینے پر ان کا کلیجہ نکل پڑتا، کبھی وہ شوہر کو ڈانٹتیں، کبھی بیٹے کو جب ان دونوں میں سے کوئی نہ ہوتا تو ان کی جھنجھلاہٹ باورچی خانے کے برتنوں پر اترتی، ہمارا حال یہ کہ ہم کبھی دال میں سے مرچ نکالتے تو کبھی ساگ سبزی میں سے کنکر ——— بستروں میں سے کبھی دری غائب ہو جاتی تو کبھی چادر، غسل خانے میں کبھی صابن ندارد ہوتا تو کبھی تیل ——— کبھی بالٹی نہ ہوتی تو کبھی لوٹا نہ ہوتا۔ لیکن واہ رے ہم! ہماری بیوی ہمیں ناحق تنک مزاج کہتی ہے، ہماری برداشت تو ان دنوں جوگیوں کو بھی مات کر گئی تھی، ہم نے وہ حالت اختیار کر لی، کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہم پر اسی طرح اثر نہیں کر رہی تھیں جیسے برسات میں مسلح بوندوں کے حملوں سے پہاڑوں کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔

کوئی ایک بات ہو تو کہیں، جس دن ہم سیر کو جاتے وہیں باہر کھاتے پیتے تو ہمارے دوست کی بیوی گھر پہ ہی رہتیں اور کسی قدر مہربان بھی رہتیں، لیکن جب ہم گھر میں ہی رہتے تو ان کا دل ایک دم گھر سے فرنٹ ہو جاتا، تو اکثر انہیں کوئی باہر کا کام آ نکلتا، تب پانی کے لئے پان، ایش ٹرے اور اگالدان کے لئے موہن اور ان کے باپ ہی نہیں ہمیں بھی ہاتھ پاؤں ہلانے پڑ جاتے تھے۔

تین دن تو ہمارے دوست ہمارے قابو میں رہے لیکن چوتھا دن آتے آتے وہ بھی حوصلہ چھوڑ بھاگے، یا تو ان کی بیوی نے انہیں بھرا ہو یا خود ہی انہیں عقل آ گئی ہو کہ صبح ہی انہوں نے بیٹھک میں ٹنگے میرے کپڑوں کو اٹھا کر میرے اٹیچی پر پھینک دیا، بولے "اس طرح یہ پھیلے ہوئے ٹھیک نہیں لگتے۔"

ہم پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا، تو میری بار بار پان کھانے کی عادت پر لیکچر پلایا گیا، ہم نے سوچا کہ یہ تو حضرت کی پرانی عادتیں ہیں لیکن جب دوپہر کھانے میں میرے ساتھ وہ صرف دو روٹیاں کھا کر ہی اٹھ گئے تو پہلی بار میرا ماتھا ٹھنکا ——— معاملہ جیسا ہم سمجھتے تھے، ویسا نہیں، بہت گمبھیر ہے، شام کو آئے تو کسی بات پر اپنی بیوی سے اِس قدر الجھ پڑے کہ مجھے شک ہوا، کہیں مار پیٹ نہ ہو جائے، میں نے اُدھر کان لگائے اور معلوم کرنا چاہا آخر بات کیا ہے؟ جو کچھ سنا اُس کا نچوڑ یہ ہے۔

"تو میں کیا کروں؟ یہ کمبخت تو ٹلتا ہی نہیں۔"

"وہ ٹلتا نہیں یا تم ٹالتے نہیں، تمہیں کیا، بھگتنا تو مجھے پڑتا ہے۔"

"تو بھاگوان! بتا میں کیا کروں؟"

"میں بتاؤں؟ پھینک دو اُس بے حس کی اٹیچی باہر! ـــ، ایسا جم گیا ہے جیسے اس کے باپ کا گھر ہو۔"

لکھنؤ کی ہماری مہمان داری اب کلائمیکس پر پہنچ گئی تھی، نہ جانے کیوں تلسی داس کی یہ چوپائی (رباعی) ہمیں یاد آئی،

"آگے چلے بُہری رگھورائی"

ہم نے اپنا سامان اٹیچی میں ٹھونسا، بستر لپیٹا، کپڑے پہنے اور ہمارے دوست اندر سے آئے تو ہم نے ان سے کہا "اچھا بھائی رخصت!"

ہمارے دوست کے دل میں کیا تھا یہ تو وہی جانتے ہوں گے، مگر ظاہراً انہوں نے یہی کہا "ارے ابھی سے"

ہم نے اپنے دل میں سوچا ـــ بس، اتنی یادگار کافی ہے، لکھنؤ کی ـــ لیکن ہم نے یہی کہا "چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں اب چلنا ہی چاہیئے۔"

ہمارے دوست نے لمبی سانس لی، جس کا ایک مطلب جدائی کا غم تھا اور دوسرا مطلب تھا۔ چلو پاپ کٹا۔ ہم نے بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا، جو مل گئی وہی ریل پکڑی، جس درجے کا ملا ٹکٹ خریدا، جہاں ملی جگہ ـــ وہاں بیٹھ گئے۔ جب گاڑی نے سیٹی بجائی اور جب سچ مچ وہ چل پڑی تو اس کے پہیوں کی دُھن کے ساتھ میرے دل میں بھی یہ کہاوت گونج اٹھی،

"جان بچی اور لاکھوں پائے"

ہندی دوہے

یہ نفس انسانی کی کمزوری ہے کہ وہ کسی حقیقت کو بھی جو اس کے لیے باعث ذلت ہو تلخ سمجھ کر گوارا نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی وہ ذاتی وقار کو قائم رکھنے کے لیے دوسروں کی آبرو ریزی یا تقلیل عزت کا آرزو مند ہے۔ انہیں دو نفسانی قوتوں کے باعث انسان میں تکبر اور عیب جوئی کی خصلتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک شخص دوسرے کو ذلیل ٹھہراتا ہے تو دوسرا پہلے کو اور زیادہ حقیر سمجھتا ہے۔ اس باہمی تنازعہ کو شاعرانہ تمثیلات میں یوں ادا کیا گیا ہے

سونا کہے سنار سے کہ اُتم میری ذات   کارے منہ کی گھونگچی تلئے ہمارے ساتھ ؟
لالن کے ہم لال ہیں اور لالوی ہمر رنگ   کریا منہ جب سے بھیو تلے منج کے سنگ !

سونا سنار سے کہتا ہے کہ میری ذات اعلیٰ ہے (اور کیا غضب ہے) کہ کالے منہ کی گھنگچی ہمارے ساتھ تولی جاتی ہے۔ اس تحقیر پر گھنچی برافروختہ ہو کر کہتی ہے کہ "لالوں کے ہم لال ہیں اور ہمارا رنگ بھی لال ہے (ہمارا) منہ تو کالا اس وقت ہوا کہ ذلیل کے ساتھ تولے گئے۔

شاہی درباروں میں، امراء و روسا کے دوست احباب میں اور سلطنت کے عہدہ داروں میں بالعموم انہی لوگوں کو اپنی قدر و منزلت کے لیے سب سے زیادہ کاوش کرنی پڑتی ہے۔ جو مقابلتہ سب سے زیادہ ایماندار، محنتی، جفاکش اور عقلمند ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جعلساز، ریاکار، فریبی اور منہ چڑھے لوگ اسی طرح اپنے حاکم کو محکوم کر لیتے ہیں۔ جس طرح منشیات نفس انسانی کو تسخیر کرتی ہیں۔ آج کل وہی لوگ زیادہ تر معتوبین میں شمار کیے جاتے ہیں جو صداقت، خلوص، سچائی اور یک چلنی سے خدمات انجام دیتے ہیں اور جو لوگ جھوٹ موٹ باتیں بناتے پھرتے ہیں خوشامد کرتے ہیں انہیں گھر بیٹھے دھن دولت عزت آبرو سب ہی میسر ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

سانچے کوئی پتیجئے، جھوٹے جگ پتیائے
گلی گلی گورس پھرے، مدیرا بیٹھ بکائے

سچے آدمی کی قدر بہت کم ہوتی ہے۔ جھوٹے آدمی (اپنی لفاظی کی بدولت) قابل اعتماد تصور کیے جاتے ہیں۔ دودھ (اس وقت فروخت ہوتا ہے جبکہ وہ گلی گلی پھرتا ہے اور شراب (شراب خانہ ہی پر بکتی ہے۔

سبئے سہائک سبل کے، کوئُ نہ نبل سہائے
پون جگاوت آگ کو، دیپھی دیت بجھائے

سب ہی طاقتوروں کے مددگار ہوتے ہیں۔ کمزور کی کوئی بھی اعانت نہیں کرتا۔ ہوا آگ بھڑکاتی ہے اور چراغ کو بجھا دیتی ہے۔

خرّاٹے کس طرح بند کیے گئے

ذیل کا مضمون اخبار رفیقِ ہند لاہور مورخہ ۱۸/ نومبر ۱۸۹۹ء جلد ۱۰ نمبر ۹ سے لیا گیا ہے۔

یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۸۴ء میں مولوی محرم علی چشتی مرحوم نے مطبع خدا داد لاہور سے جاری کیا تھا اور ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۹ء تک سات سال کے وقفہ کے علاوہ ۱۹۰۳ء تک برابر اپنی پُرزور تحریروں سے ملک میں ہنگامے برپا کرتا رہا۔ مولوی محرم علی چشتی فارسی، اُردو اور پنجابی تینوں زبانوں کے بے پناہ شاعر تھے۔ انگریزی بھی جانتے تھے۔ اپنی آخری عمر میں ہائیکورٹ پنجاب کے ایڈووکیٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن اور خان بہادر بھی ہو گئے تھے۔ وکالت میں خوب نام پیدا کیا، بہت کمایا لیکن خوب اڑایا یہاں تک کہ کوڑی کفن کے لیے نہ رکھی۔

مولوی صاحب بنیادی طور پر صوفی تھے مگر فطرتاً شوخ اور ظریف، ان کی ظرافت کا کمال اس مضمون میں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء کا تذکرہ ہے۔ مسٹر بجن کے ہمراہ (جن کو میں اردو اور فارسی پڑھایا کرتا تھا) مجھے سیر کشمیر کا اتفاق ہوا صاحب موصوف کو سیر و شکار کا خاص شوق تھا اور وہ ماہ اکتوبر کے اخیر تک کشمیر ہی میں قیام پذیر رہے۔ کیونکہ سری نگر میں بوجہ رونق افروزی لارڈ لینسڈون صاحب بہادر سابق گورنر کشورِ ہند خاص رونق تھی۔ صاحب بہادر کا ارادہ بھی کشمیر میں زیادہ قیام فرمانے کا تھا اور مجھے کسی خاص خانگی ضرورت کی وجہ سے صاحب بہادر کو وہیں چھوڑ کر سری نگر سے واپس آنا پڑا۔

بارہ مُولا سے آگے چل کر تقریباً نصف رستہ میں گڑھی کا پڑاؤ ہے۔ جہاں شب باش ہونا پڑتا ہے اور مقام گڑھی میں ایک ڈاک بنگلہ بھی ہے۔ یہ وہی ڈاک بنگلہ ہے جہاں انگریز مسافروں کے ہاتھ سے ہندوستانی مسافروں کے پٹ جانے کی خبریں اخباروں میں گشت کرتی رہی ہیں۔ یہ مقام ہندوستانی مسافروں کے لیے خالی از خطرہ نہیں۔ کیونکہ آتی جاتی دفعہ صاحبان یورپین اس ڈاک بنگلہ میں کثرت کے ساتھ اترتے ہیں اور ہندوستانی مسافر کو مجبوراً نکالنا پڑتا ہے اور جب وہ ذرا اڑا تے تو اس کا لازمی علاج بھی عمل میں آتا ہے۔

جب میں اس ڈاک بنگلہ میں پہنچا تب مجھے ایک طرف کے چھوٹے کمرہ کی طرف خانساماں نے راہ نمائی کی اور وہیں پر میں اپنا اسباب رکھ کر باہر برآمدہ میں ٹہلنے لگا۔ اتنے میں ایک نوجوان شخص کو تانگہ سے اترتے ہوئے میں نے دیکھا جس پر افغانی دستار اور کلاہ تھی۔ گلے میں کوٹ اور نیچے پاجامہ (افغانی تنبان) تھا۔ یہ شخص فصیح اُردو میں گفتگو کرتا تھا اور کسی طرح کا افغانی لہجہ اس کی آواز میں نہ پایا جاتا تھا۔ آتے ہی خانساماں سے اس کی مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی:

جوان: کوئی کمرہ خالی ہے؟

خانساماں: جی ہاں! ایک کمرہ میں یہ صاحب (میری طرف اشارہ کر کے) اُترے ہوئے ہیں۔ باقی سب کمرے خالی ہیں مگر ان میں بہت سے صاحب لوگ آنے والے ہیں۔

جوان: دیکھو جی! یہ قواعد ڈاک بنگلہ تم نے خود آویزاں کر رکھے ہیں۔ ان میں صاف لکھا ہے کہ جو مسافر پہلے آئے وہ جس کمرہ کو خالی پائے اس میں اپنا قبضہ کر لے۔ تم مجھے کمرہ میں داخل ہونے سے روک نہیں سکتے۔

خانساماں: حضور! ہم تو کسی کو نہیں روکتے۔ حضور کی بھلائی کے لیے عرض کرتے ہیں۔ پیچھے اگر دنگا فساد ہوا تو حضور جانیں۔

جوان: اچھا جی! ہم خود سمجھ لیں گے۔ تم کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

میں اس جوان شخص کی جرأت اور کہنڈے کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ کسی دھمکی میں نہیں آتا۔ حالانکہ لباس اور وضع سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ مگر ایسے استغنا سے جواب دیتا تھا کہ گویا بڑا جلیل القدر شخص ہے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک نہایت موٹا ڈنڈا (جو خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم از کم بیس سیر کا تھا اور جس سے بڑھ کر موٹا ڈنڈا میں نے تمام عمر نہیں دیکھا) موجود تھا۔ ان کی اس وحشت ناک حرکت سے میں نے خیال کیا کہ عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ غرضیکہ جوان مذکور سے چند بار خانساماں نے التجا کی کہ پچھلے پہلو کی طرف جو ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اس میں وہ اپنا اسباب رکھوائے مگر اس نے مطلق نہ مانا اور ڈٹ کر اپنا اسباب اسی بڑے کمرے میں رکھوایا جو تمام ڈاک بنگلہ میں سب سے زیادہ وسیع ہے اور دریا کی طرف کو نہایت پُرفضا موقع پر واقع ہے اور اسباب کے پاس اپنے نوکر کو بٹھا کر آپ دریا کے کنارے سیر کے لیے اتنی دور چلا گیا کہ ہماری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ جاتی دفعہ خانساماں کو حکم دے گیا کہ اپنے اسلامی برتنوں میں میرے لیے پلاؤ اور قورمہ اور بھنا ہوا مُرغ تیار رکھنا۔

اتنے میں شام ہو گئی تھی۔ ٹانگوں کی گھڑگھڑاہٹ شروع ہو گئی اور یکے بعد دیگرے چھ ٹانگے احاطہ ڈاک بنگلہ کے اندر داخل ہوئے اور ان میں سے کل دس لیڈیاں اور آٹھ یورپین جنٹلمین اترے اور بنگلہ کے احاطہ میں پہنچتے ہی ایک شور و غل سُنائی دیا۔ خانساماں کو جھڑکنا شروع کیا کہ تمام کمرے خالی کیوں نہیں رکھے گئے؟ اور دیسیوں کو ان کو کیوں اتارا گیا ہے اور "ایک دم سب کو کمروں سے نکال دو" کا نادری حکم جاری ہو گیا۔ جب خانساماں نے اس حکم کی تعمیل میں ذرا تذبذب کیا تو دو صاحب بہادر خود آگے بڑھے اور سب سے پہلے اس جوان شخص کے نوکر سے کہا کہ "جھٹ پٹ اسباب نکالو"۔ غرضیکہ ملازم دوڑا ہوا گیا اور قریباً آٹھ منٹ کے عرصہ میں واپس آ کر بیان کیا کہ اس کے مالک صاحب ابھی نمازِ شام پڑھنے میں کنارِ دریا پر مصروف ہیں اور تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ صاحب بہادروں نے دھمکایا کہ "ڈیم مالک! جلدی اسباب نکالو"۔ اس نے کہا۔ "حضور ابھی ابھی چلے آتے ہیں۔"

غرضیکہ ادھر پانچ سات منٹ کی مہلت تخلیۂ کمرہ کے لیے دے کر صاحب بہادروں کی یورش میرے کمرہ پر ہوئی اور بڑا لال سُرخ چہرہ کر کے فرمایا کہ "ول! تم جلدی اپنا اسباب نکالو"۔ میں انگریزوں کے تیوروں کے پہچاننے کا عرصہ سے عادی ہوں اس لیے یہ سمجھ کر کہ ذرا چین چپڑ کی گئی تو ابھی ڈگ سے تواضع کی جائے گی۔ دست بستہ عرض کیا کہ "بہت اچھا غریب نواز! کمترین کو جس کمرہ میں حکم ہو چلا جائے"۔ اس پر حکم صادر ہوا کہ "ول تم دیکھتا ہے کمرہ کوئی خالی نہیں۔ تم شاگرد پیشہ والی کوٹھری میں چلا جاؤ"۔ "بہت اچھا حضور!" کہہ کر میں اپنا اسباب اور بستر

بندھوانے لگا۔ میرا ملازم محمد رمضان ایسا سٹپٹایا کہ اس کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے، اسباب کے باندھنے میں بیسیوں غلطیاں کر رہا تھا۔

اتنے میں دیکھا کہ دور سے وہی جوان مسافر چلا آ رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ حضرت کے ہوش و حواس اس زبردست جماعت کو دیکھ کر رفو چکر ہو جائیں گے۔ وہ پہلی شیخی کرکری ہو جائے گی اور تمام سٹی پٹی بھول جائے گی مگر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جوان مذکور ایک ہاتھ میں وہی سوٹا (جس کو تمام دنیا کے سوٹوں کا مورثِ اعلیٰ سمجھنا چاہیئے) سنبھالے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے ایک عجیب تمکنت اور وقار کی چال سے چلے آتے ہیں اور چہرہ سے ایسا استغنا برس رہا ہے گویا کچھ پروا ہی نہیں۔ جوان مذکور جب اس جنٹلمین اور لیڈی صاحبان کے مجمع کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ جوان کا رعب اس مجمع پر چھا جانے کے آثار ان کے چہروں اور بشروں سے نمایاں تھے یا تو اس مجمع نے انگریزی میں شور و غل مچا رکھا تھا اور سب یہی کہتے تھے "ووٹی ول کِک ہم آؤٹ" (یعنی ہم اسے لاتیں مار کر کمرہ سے نکال دیں گے) یا جب جوان مذکور پاس پہنچا تو ایک کی جرأت بھی اس سے بات کرنے کی نہ ہوئی۔ جوان نے اہل مجمع میں سے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا بلکہ ایسی معمولی بے پروائی کے ساتھ مجمع مذکور کے پاس سے گذر کر سیدھا اپنے کمرہ کے رُخ کو چل دیا۔

اتنے میں اہل مجمع میں سے ایک صاحب بہادر نے (جو بعد میں معلوم ہوا کہ فوجی کرنیل تھے) پیچھے سے جوان مذکور کو آواز دی کہ "بابو! بابو!" جس پر اس نوجوان نے پیچھے مڑ کر انگریزی میں کہا کہ "میری توہین مت کیجیے۔ میں بابو نہیں ہوں" اور اتنا کہہ کر اپنے کمرہ کے اندر داخل ہو گیا۔ کل مجمع کے چہرے زرد پڑ گئے اور میں اپنے اسباب کو اٹھوا کر شاگرد پیشہ کے مکانات کی طرف جانے کو تھا کہ نوجوان مذکور کا ملازم مجھے بلا کر لے گیا اور نوجوان نے میرا حال سُن کر کہا کہ "آپ ہرگز اس طرف نہ جائیے، یہی کمرہ حاضر ہے اور یہیں قیام فرمائیے"۔ میں نے بخوشی اس درخواست کو قبول کر لیا اور چونکہ اس جوان سے کوئی سابقہ تعارف نہ تھا اور اس نے مجھ سے دریافت نہیں کیا تھا کہ میں کون ہوں، خود مزید حالات کے استفسار سے زبان کو بند رکھا اور جو حیرت مجھے اس جوان کی زبان سے ایک مختصر بامحاورہ انگریزی فقرہ بالکل انگریزی لہجہ میں سُن کر ہوئی تھی اس کو بھی مخفی رکھا۔

اتنے میں خانساماں اس جوان کا کھانا پکا کر میز پر لایا۔ جس میں نوجوان مذکور نے مجھے شامل کیا۔ اس سردی کے وقت میں سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ سفر کی تھکان، غرضیکہ اس دن کے پلاؤ اور قورمہ اور بھنے ہوئے مرغ اور انڈوں اور چائے کا ذائقہ کوئی میرے ہی دل سے پوچھے۔ انگریزوں کی صحبت میں کثرت سے رہنے کے باعث جس کم بخت چیز کے پینے کی مجھے عادت ہو گئی ہے اس سے محروم رہا مگر اور سب طرح سے دعوت تکلف کی تھی۔

ابھی ہم لوگ کھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ یورپین مجمع مذکور میں سے ایک صاحب بہادر (جو بعد میں معلوم ہوا کہ ممالک مغربی و شمالی کے ایک ضلع کے کلکٹر تھے) کمرہ میں اندر تشریف لائے۔ جوان مذکور اسی طرح کرسی پر بیٹھے ہوئے کھانے میں مصروف رہا مگر میں اپنی عادت سے مجبور ہو کر دفعتاً کھانا کھاتے کھڑا ہو گیا۔ اب جوان اور کلکٹر صاحب کی گفتگو جو انگریزی میں ہوئی قابلِ شنید تھی۔

صاحب کلکٹر: میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے کھانا کھانے میں مداخلت کی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم آٹھ یورپین ہیں جن

میں سے زیادہ تر فوجی افسر ہیں اور دس لیڈی صاحبان ہمارے ساتھ ہیں۔ ایک فوجی لیفٹیننٹ جو سخت بیمار ہو گیا ہے۔ وہ بھی ہمارا رفیقِ سفر ہے۔ پس آپ کی مہربانی ہوگی اگر ہماری خاطر آپ اس کمرہ کو خالی کر دیں۔

جوان: مجھے آپ کی تکلیف کا افسوس ہے مگر آپ مجھے کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ کمرہ خالی کر کے خود کہاں رات بسر کروں؟

صاحب کلکٹر: آپ یا تو شاگرد پیشہ والے مکان میں چلے جائیں یا برآمدہ میں گزارہ کر لیں۔

جوان: شاگرد پیشہ والے مکان میں جا کر رہنا تو میرے فیلنگ کے ویسا ہی خلاف ہے جیسا کہ آپ کے فیلنگ کے خلاف ہے۔ باقی رہی برآمدہ کی رہائش سو آپ دیکھ لیجیے کہ میرے جسم کا کونسٹیٹیوشن ایسا مضبوط نہیں اور میں ایک اہل قلم شخص ہوں۔ میرے خیال میں بہادر اور مضبوط فوجی افسر جو کوہستانی معرکوں کے غالباً تجربہ کار ہوں گے۔ رات کے اس سرد موسم کی سختی کا بہ نسبت میرے زیادہ دلیری سے مقابلہ کر سکیں گے۔

کلکٹر صاحب: تو آپ کمرہ خالی نہیں کر سکتے؟

جوان: ہاں! مجھے افسوس ہے کہ یہی ناگوار جواب اس کم بخت موقع پر دے سکتا ہوں جبکہ میں اور آپ یکساں عالم مسافرت میں ہیں۔

صاحب کلکٹر: تو پھر آپ، اس کا کوئی چارہ بتائیں۔

جوان: میرے پاس تو کوئی چارہ سوائے افسوس کے نہیں اور بجز زبانی ہمدردی کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ خصوصاً جبکہ حدِّ اعتدال سے بڑھی ہوئی ہمدردی میری صحت اور جان کو خطرہ میں ڈالتی ہے۔

صاحب کلکٹر: مجھے آپ سے ایسا روکھا پھیکا جواب سننے کی توقع نہ تھی۔ اگر آپ کے ساتھ آپ کے خاندان کی عورتیں ہوتیں تو میں خود تکلیف اٹھا لینے میں تامل نہ کرتا اور اگر آپ کا کوئی بیمار رفیق ہوتا تو میں اس کے لیے ہر قسم کی سہولت کا سامان پیدا کرتا۔

جوان: مگر لیڈی صاحبان اور بیمار لفٹیننٹ صاحب کا انتظام تو ہو سکتا ہے۔

صاحب کلکٹر: وہ کس طرح؟"

جوان: لیڈی صاحبان کی رہائش کے لیے کافی کمرے موجود ہیں۔ ایک ایک کمرہ میں دو دو لیڈیاں آرام فرما سکتی ہیں اور لفٹیننٹ صاحب کو آپ، میرے کمرہ میں آرام کرنے کے لیے بھیج سکتے ہیں۔

صاحب کلکٹر (کسی قدر چیں بہ جبیں ہو کر) بہت اچھا صاحب! میں اتنا بھی غنیمت سمجھتا ہوں کہ آپ کے مزاج میں اس قدر ہمدردی ہے کہ آپ ایک بیمار کو اپنے کمرہ میں پناہ دیتے ہیں۔ میں لفٹیننٹ کو ابھی یہاں بھیج دیتا ہوں۔

تھوڑی دیر میں لیفٹیننٹ صاحب (جو واقعی بیمار معلوم ہوتے تھے۔ ہمارے کمرہ میں داخل ہوئے اور ایک کوچ پر دراز ہو گئے اب صرف ایک کوچ باقی رہ گئی تھی۔ جس پر جوان مذکور نے مجھے لٹا دیا اور خود فرش پر ایک طرف بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ میں فرش پر لیٹنے کا عادی ہوں مگر جوان مذکور نے ایک نہ سُنی اور یہ کہہ کر کہ آپ مہمان عزیز ہیں خود فرش پر ہی گزارہ کیا۔

ہم دونوں کو لحاف اوڑھ کر لیٹتے ہوئے صرف پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ صاحب بہادر کی چارپائی سے "خرر، خرر، خرر"

کی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ صاحب بہادر کے خراٹوں کی آواز تھی جو پہلے دھیمی سُر سے شروع ہوئی مگر بعد میں ”خر رڑز، خرڑڑ، خررڑ“ کے ایسے پُر زور آوازے نکلنے شروع ہوئے کہ الامان والحفیظ! بلا مبالغہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ریلوے ورکشاپ کا انجن چل رہا ہے۔ اب میرے جوان ساتھی کی حالت قابلِ دید تھی۔ گو میں بھی خراٹوں کی آواز سے گھبراتا تھا مگر ہمارا نوجوان مسافر تو اپنے لحاف میں عجیب اضطراب اور گھبراہٹ کی حالت میں معلوم ہوتا تھا۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، کبھی سر جھکا لیتا تھا، کبھی پھر لیٹ جاتا تھا، غرضیکہ میں نے سوچا حضرت خوب پھنسے اور اچھے قابو آئے۔ اب ساری تیزی و طراری بھول گئے۔ لحاف سے سر نکال کر اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف۔ پہلے زبان حال سے باہم گفتگو ہوئی اور پھر باہم ہماری قیل و قال بھی شروع ہو گئی۔

جوان: حضرت! اس کم بخت کے خراٹوں نے تو ناک میں دم کر دیا۔

بندہ: واللہ طبیعت کا بُرا حال ہے۔ ابھی سے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج کی نیند حرام ہے۔

جوان: افوہ! خوب یاد آیا۔ میں نے آج رات نمازِ عشاء نہیں پڑھی اور جناب باری سے یہ اسی بات کی سزا تجویز ہوئی ہے کہ جس نیند کی خاطر میں نے آج رات کی نماز اور وظیفہ کو چھوڑ دیا، اس نیند سے محروم کر دیا گیا ہوں۔ لیجیے میں تو نماز اور وظیفے کے لیے اٹھتا ہوں۔

اس کے بعد جوان مذکور نے اٹھ کر ایک گوشہ کی طرف وضو کیا اور نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر بعد ازاں ذکرِ جہر لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کرنا شروع کیا۔ یہ جوان اپنی گردن کو دائیں طرف لے جا کر لا الٰہ تو کسی قدر آہستہ آواز سے کہتا تھا مگر اِلَّا اللہ اس زور و شور کے ساتھ نعرہ مار کر کہتا تھا کہ تمام کمرہ گونج اٹھتا تھا، حتیٰ کہ پہلے دو تین مرتبہ تو میں بھی تھرا اٹھا۔ اللہ اکبر! نعرہ کیا تھا۔ ایک شیر ژیاں یا رعد کی گرج تھی۔ جوان مذکور نے ابھی دس بارہ ہی نعرے لگائے ہوں گے کہ لفٹیننٹ صاحب تو تھرا کر جاگ اٹھے اور خراٹوں کی بلا سے نجات ہوئی مگر ان کی خونخوار آنکھوں اور جوشِ غضب سے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مجھے ایک اور بلائے عظیم سے سابقہ کا اندیشہ ہوا۔ لفٹیننٹ صاحب اپنی کوچ پر بیٹھ گئے اور جوان کو آوازیں دینی شروع کیں مگر وہ میرا شیر برابر پُر زور کڑک کے ساتھ قبلہ رو بالکل متوجہ الیٰ اللہ ہو کر اِلَّا اللہ اِلَّا اللہ کیے جاتا تھا جو حالت ہم دونوں پر لیفٹیننٹ صاحب کے خراٹوں سے گزری تھی۔ یعنی جس طرح جوان مذکور ان کے خراٹوں سے تنگ ہو کر کبھی لیٹ جاتا تھا، کبھی کروٹیں بدلتا تھا اور کبھی اٹھ بیٹھتا تھا۔ وہی مصیبت اب لفٹیننٹ صاحب کو پیش آئی کہ وہ بیچارے عجیب مصیبت میں گرفتار تھے اور کبھی تنگ ہو کر جوان مذکور کو پکارنا بھی شروع کر دیتے تھے۔ جس کے جواب میں سوائے اِلَّا اللہ کے پر زور نعرہ کے اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ لفٹیننٹ صاحب منہ میں بڑبڑا کر شاید کچھ بُرا بھلا کہتے تھے۔ اور مجھے ان کے پُر رعب چہرہ سے ایسا خوف معلوم ہوتا تھا کہ میں دم سادھ کر بالکل خاموش پڑا ہوا تھا اور ایسی وضع بنائی گئی تھی کہ گویا مست خوابِ راحت میں پڑا ہوں۔ کچھ عرصہ کے بعد جوان مذکور نے اپنے نعروں میں وقفہ کیا اور منہ میں آہستہ سے کچھ پڑھ کر صاحب بہادر کی طرف مخاطب ہوا۔ اس وقت یہ گفتگو انگریزی میں ہوئی۔

جوان: آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے؟

لفٹیننٹ صاحب: یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

جوان: یہ ہمارے مذہب کے مطابق ہے۔

لفٹیننٹ صاحب: آپ جواب کیوں نہیں دیتے تھے؟

جوان : ہمارے مذہب کے مطابق عبادت میں بولنا منع ہے اور اب بھی آپ کے بولنے کے باعث میری مذہبی رسم میں مداخلت ہوئی۔ اب مجھے نہ بلایئے گا۔ میں کوئی جواب نہ دے سکوں گا۔

لفٹیننٹ صاحب : (حیران اور پریشان ہوکر) یہ آپ کی عبادت کب تک جاری رہے گی ؟

کچھ بہت عرصہ نہیں صرف دو گھنٹہ اور عبادت کروں گا۔ بعد ازاں دو تین گھنٹہ سو کر پھر صبح کے وقت ایک آدھ گھنٹہ اسی طرح عبادت کروں گا۔

لفٹیننٹ صاحب : (سخت حیران و غم زدہ ہوکر) تو پھر ہم کو ساری رات آپ کی عبادت کے باعث جاگنا پڑے گا۔

جوان : نہیں میرے ساتھ آپ کے جاگنے کی ضرورت نہیں۔ آپ شوق سے آرام فرمایئے اور اب مجھے نہ بلایئے گا۔

اس کے ساتھ ہی اسی سیکنڈ اور اسی لمحہ میں جوان مذکور نے پھر دگنے زور کے ساتھ الّا اللّٰہ کے نعرے شروع کر دیئے۔ الا اللّٰہ اور الا اللہ اس زور کے ساتھ کہ سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے تو اندیشہ تھا کہ کہیں ڈاک بنگلہ ہی نہ گر پڑے۔

ابھی ہمارے جوان دوست کو پانچ دس منٹ ہی نعرے لگاتے ہوئے گزرے ہوں گے کہ لفٹیننٹ صاحب سٹپٹا کر اپنی کوچ سے اٹھے اور پہلے کچھ عرصہ منہ میں بڑبڑاتے رہنے کے بعد خانساماں اور بیرا کو آواز دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے، وہاں کون موجود تھا جو باہر سے آواز دے۔ صاحب بہادر نے خود اپنی چارپائی اور بستر کو کمرے سے اٹھایا اور باہر لے جا کر برآمدہ میں دراز ہو گئے۔

صاحب بہادر تو یوں رخصت ہوئے اور جوان برابر نعرے لگاتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد فارغ ہو کر دعا مانگی اور جا نماز کو تہ کر کے رکھ دیا۔ بعد ازاں کمرہ کے دروازے کی چٹخنیاں اندر سے لگا دیں اور خاموش اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت کی میری کیفیت کچھ نہ پوچھیے کہ مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے تھے مگر نوجوان مذکور کی حالت قابلِ دید تھی کہ نہ ماتھے پر بل تھا اور نہ لب پر تبسّم اس کی متین اور معقول اور ثقہ صورت بنائے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر مجھے اور بھی سخت ہنسی آتی تھی کہ عجیب ستم ظریف شخص ہے اور اپنے مزاج پر عجیب قابو رکھتا ہے کہ لبوں کو تبسّم سے بھی آشنا نہیں ہونے دیتا بلکہ الٹا مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ ’’آخر آپ اس قدر ہنسے کیوں چلے جاتے ہیں ؟‘‘

مجھے اس شخص کی جرأت، بہادری، حاضر جوابی اور ظریف مزاجی نے ایسا فریفتہ کر لیا تھا کہ اتنی بے تکلفی کے بعد میں نے اس کے نام و نشان کا دریافت کرنا ضروری سمجھا اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کا ایک معروف و مشہور شخص ہے۔ جس سے گو میری ظاہری ملاقات نہ تھی مگر میں غائبانہ اس کے حالات سے واقف تھا اور اس کے ملکی و قومی خیالات کو پڑھ کر بالخصوص اس وجہ سے میں اس کا سخت مخالف تھا کہ وہ ہماری قوم کے محسن اور مربّی عالی قدر شیدائے قوم حضرت سر سید احمد خان صاحب بہادر مرحوم کی بے جا مخالفتیں کرتا رہا تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ جس شخص کے ساتھ میری اس قدر غائبانہ مخالفت تھی۔ اس نے نادانستہ اور بے اختیاری کی حالت میں میرے دل پر عجیب طرح سے قبضہ کر لیا اس وقت سر سید مرحوم کے بارے میں میں نے بہت کچھ تذکرہ اس سے کیا مگر اس شخص کو میں نے اپنی رائے میں ایسا ضدّی اور اپنے عقیدہ میں ایسا متعصّب اور کٹر پایا کہ ذرہ بھر بھی اس کی رائے میں فرق نہ آیا اور گو وہ اُلٹا مجھے سر سید کا مخالف بنانا چاہتا تھا مگر اس مرحوم کی قومی خدمات کا

جو نقش بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تمام دنیا کی مخالفت اور کسی قسم کے دلائل پیش کرنے پر بھی میرے دل سے محو نہیں ہو سکتا اور مرتے دم تک محو نہیں ہو سکتا۔ (گستاخی معاف! یہ تو ابوجہل والی ضد ہے۔ (اڈیٹر)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کچھ عرصہ کی گفتگو کے بعد ہم نے آرام کیا اور خراٹوں کی بلا سے مخلصی پا کر مزے سے میٹھی نیند سوئے۔ علی الصباح ٹانگوں نے وہاں سے روانہ ہونا تھا اور ہم لوگ سویرے سے تیار ہوئے اور بقچہ بندھنا سنبھال کر باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ رات والی تمام یورپین پارٹی ڈائننگ روم (کھانے کے کمرے) میں موجود ہے اور اندر سے بلند صدائیں بات چیت کی سنائی دیتی ہیں۔ نوجوان مذکور اور بندۂ درگاہ نے کان لگا کر سُنا تو جوان مذکور کو خوب صلواتیں پڑ رہی تھیں۔ مجمع کے صاحب بہادر مع لفٹیننٹ صاحب کے جن کو رات کے وقت برآمدے کی سردی نے سخت پریشان کر رکھا تھا، ٹھٹھر رہے تھے اور جس شخص کے باعث یہ تکلیف ان کو نصیب ہوئی اس کو صلواتیں سُنانے سے وہ کیونکر باز رہ سکتے تھے؟ کوئی دانت پیستا تھا اور کوئی کچکچا کر رہ جاتا تھا۔ گفتگو پُر از غضب تھی۔ اس وقت میں نے اپنے جوان ساتھی کے بُشرہ اور قیافہ کو غور سے تاڑا تو اس کی ساری گفتگو کو سن کر نہ تو اس کے چہرہ پر جوش و غضب کے آثار نمایاں ہوئے اور نہ کوئی ڈر یا خوف یا سہم کے نشان پائے جاتے تھے۔ اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ کسی خاص حرکت کا مرتکب ہی نہیں ہوا اور بڑے مزے سے اسی وقت مجھ سے کہا کہ "آؤ چلو ہم بھی اندر چل کر چائے پئیں۔" میں پہلے تو اندر جانے سے ہچکچایا۔ کیونکہ میری طبیعت میں احتیاط بہت ہے مگر بعد میں جوان مذکور نے اس زور سے پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ گھسیٹا کہ میں اس کے ساتھ ہی کمرہ کے اندر داخل ہو گیا۔

کمرہ کے اندر ہمارے داخل ہوتے ہی سب حاضرین پر عالمِ خاموشی طاری ہو گیا۔ ایک دفعہ تو کنکھیوں سے سب نے ہماری طرف دیکھا مگر ہماری طرف سے منہ پھیر کر آپس ہی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے۔ میز کے گرد چوکیاں بچھی ہوئی تھیں۔ معمولی چوکیوں پر صاحبان بہادر بیٹھے تھے اور آرام کرسیوں پر لیڈی صاحبان تشریف فرما تھیں۔ شراب کی بوتلیں میز پر موجود تھیں اور ہر ایک کے آگے گلاس اور چائے کے پیالے بسکٹ اور ابلے ہوئے انڈے وغیرہ موجود تھے۔ شراب ناب نے ان کو کسی قدر گرما دیا تھا اور سب کے سب کچھ سرور کے عالم میں تھے۔

اب ہمارے ہیرو کی کیفیت سُنیے کہ میز کے ایک کونے کی طرف کمال بے پروائی اور استغنا سے کرسی پر ڈٹ گئے اور اپنے قریب دوسری کرسی پر مجھے بٹھا دیا اور طرفہ حرکت یہ کی کہ وہ اپنا سوٹوں کا باوا آدم بھی میز پر اپنے سامنے رکھ دیا جس کو دیکھ کر بعض لیڈی صاحبان مسکرائیں۔ جوان مذکور نے خانساماں کو حکم دیا۔ چائے کی دو پیالیاں اور چار ابلے ہوئے انڈے اور کچھ بسکٹ لائے۔ سب چیزیں اسی وقت میز پر موجود ہو گئیں اور ہم دونوں کھانے میں مشغول ہوئے۔

اس وقت تو سب طرح سے خیریت تھی اور کمرہ میں سناٹے کا عالم تھا مگر اس وقت سے ایک نیا سماں شروع ہوا۔ رات والے لفٹیننٹ صاحب کی طرف میں نے دیکھا تو ان کے چہرے سے خون ٹپکا پڑتا تھا۔ دیگر فوجی کرنیلوں اور میجروں کے چہرہ سے بھی آشفتگی کے آثار نمایاں تھے لیڈی صاحبان اس نوجوان کی حرکت کو حیرت اور استعجاب سے دیکھ رہی تھیں مگر یہ شیر اسی طرح ڈٹا ہوا بسکٹ اور چائے اڑانے میں مشغول تھا۔ کسی کیطرف دیکھتا بھی نہیں تھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا تھا کہ "کیوں حضرت! اس وقت چائے نے خوب مزا دیا ہے"

میں مارے ڈر کے سہما ہوا تھا اور مجھے یہ اندیشہ معلوم ہو رہا تھا کہ "ابھی گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔" میں جوان مذکور کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا۔ صرف آہستہ سے ہوں غوں غاں کر کے ٹال دیتا تھا۔ اتنے میں میرا اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور ایک دفعہ ہی رات والے لفٹیننٹ صاحب نے آنکھیں لال پیلی کر کے بڑے جوشِ غضب کے ساتھ جوان مذکور کی طرف مخاطب ہو کر اس کو سخت ڈانٹ بتائی۔ اسوقت

انگریزی میں دونوں کا جو کچھ مکالمہ ہوا اس کو بیان کرتا ہوں :

لفٹیننٹ صاحب: (دانت پیس کر) تم بڑے گستاخ ہو۔

جوان: (بڑے تحمل اور وقار کے ساتھ) کیوں؟ کیا مجھ سے کوئی گستاخانہ حرکت سرزد ہوئی ہے؟

لفٹیننٹ صاحب: (بگڑ کر) "تم نے یہ ڈنڈا کیوں میز پر رکھ دیا ہے"

جوان: (اسی طرح بڑے وقار سے) معاف فرمایئے گا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو اس ڈنڈے کی صورت دیکھنے سے ایسا خوف معلوم ہوتا ہے اور لیجیے حکم کی تعمیل کرتا ہوں (ڈنڈا میز سے اٹھا کر نیچے رکھ دیا)، آپ تسلی رکھیے کہ یہ ڈنڈا بغیر اشد اور قانونی ضرورت کے کبھی استعمال نہیں کیا جائے گا۔

لیفٹیننٹ صاحب: تم نے رات بھی مجھے سخت تکلیف دی اور تمام رات مجھے سردی میں مارا۔

جوان: (کمال حیرت کا چہرہ بنا کر بڑی سادگی سے) میں نے تو جناب والا (بور اور نرم) کو کوئی تکلیف نہیں دی۔ آپ نے خود ہی ہماری مصاحبت کو پسند فرمایا اور خود بخود کمرہ سے اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ میں اس وقت اپنی عبادت میں مشغول تھا اور بول نہ سکتا تھا ورنہ میں ضرور آپ کو باہر جانے سے روکتا۔

لفٹیننٹ صاحب: ڈیم تمہاری عبادت! ایسی لغویات کا فائدہ کیا ہے؟

جوان: (اسی صبر و تحمل اور سادگی سے چائے پیتے ہوئے) ہماری عبادت کا اور کچھ فائدہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اتنا فائدہ تو ضرور آپ بھی تسلیم کر لیں گے کہ اگر کوئی خراٹے مار کر اپنے ساتھیوں کو بدمزہ کرے اور ان کی نیند حرام کر دے تو ایسے شخص کے ہاتھوں سے مخلصی ضرور نصیب ہو جاتی ہے۔

جوان مذکور کے منہ سے یہ آخری فقرہ نکلا تھا کہ کمرہ میں ایک لطیف سین نظر آیا۔ ایک لیڈی صاحبہ جو آرام چوکی پر تشریف فرما تھیں ——— (اور جن کی نسبت بعد میں یہ معلوم ہوا کہ وہ انہی لفٹیننٹ صاحب کی زوجہ مکرمہ تھیں) اس فقرہ کے سنتے ہی دفعتاً آرام چوکی سے بے تحاشا کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور مارے ہنسی کے ایسی بیتاب ہوئیں کہ چائے کی پیالی جو ان کے ہاتھ میں تھی ان کے کپڑوں پر گر گئی۔ اب ستم یہ تھا کہ میم صاحبہ کی ہنسی بند ہونے میں نہیں آتی تھی۔ قہ قہ قہ قہ قہ قہ قُہ قہ قہ۔ قہو قہو قہو قہو۔ قہی قہی قہی قہی۔ غرضیکہ ان کی ہنسی کا سلسلہ بند ہونے میں نہ آتا تھا۔ کئی منٹ تک ان کی ہنسی کا یہ عالم رہا اور جب وہ ذرا وقفہ لیتی تھیں تو صرف ایک سیکنڈ کا، پھر وہی ان کے اسی قہقہے کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ لفٹیننٹ صاحب تو ان کے قہقہوں سے جھینپے جاتے تھے مگر دوسرے یورپین اور لیڈی صاحبان حیران و متعجب ہو کر میم صاحبہ کے منہ کی طرف دیکھتے تھے کہ ان کو کیا ہو گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ بڑی دیر کے بعد میم صاحبہ نے ہنسی سے دم لیا اور اس وقت اپنے شوہر جناب لفٹیننٹ صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ڈیم! معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس بیچارے جنٹلمین کو بھی اپنے خراٹوں سے تنگ کیا اور اس نے اپنی مخلصی کا حیلہ اپنی عبادت کو بنایا۔ غرضیکہ حاضرین کو میم صاحبہ نے اپنے شوہر کے خراٹے مارنے کا سارا قصہ سنایا اور فرمایا کہ "بعض اوقات میں بھی سخت تنگ ہو جایا کرتی ہوں"

حاضرین کو ہمارے جوان ہیرو کی عجیب و غریب عبادت اور اس عبادت کی وجہ سے تنگ ہو کر کمرہ چھوڑ جانے کا قصہ تو لفٹیننٹ صاحب خود سنا چکے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس متن پر میم صاحبہ کے حاشیہ نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ اب فرمائیے کون تھوڑا ہنسے۔ تمام یورپین اور لیڈی صاحبان کا مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ سب کے سب دیوار قہقہہ بن گئے اور بالاتفاق یہی کہتے تھے کہ عجب زندہ دل شخص ہے

اور عجیب ترکیب سُوجھی۔ حاضرین کے قہقہوں نے لفٹیننٹ صاحب کو اور بھی کھسیانا کر دیا۔ اس وقت تمام جنٹلمین اور لیڈیاں ہمارے نوجوان ہیرو کی طرف مخاطب تھیں مگر بلا کی خودداری اور اپنے جذبات پر قادر الاختیاری کہ اس شخص کے لبوں پر مسکراہٹ بھی نمودار نہ ہوئی اور بڑی متانت سے مختلف سوالات کا جواب دیتا جاتا تھا۔ بالخصوص صاحب کلکٹر بہادر اور لفٹیننٹ صاحب کی میم صاحبہ تو نوجوان مذکور کی گفتگو پر ایسے شیدا معلوم ہوتے تھے کہ علانیہ عش عش کر رہے تھے۔ اس موقعہ پر دیسیوں اور انگریزوں کے باہمی میل جول پر ویمپی پارٹی اور اس جوان کے مابین جو گفتگو ہوئی وہ بڑی دلچسپ اور لطیف تھی مگر اس کے لکھنے کے لیے اس طویل مضمون میں گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔

یہی گپ شپ جاری تھی کہ سواری کے تانگے آن موجود ہوئے۔ وقت روانگی آپہنچا۔ ہم سب لوگ کمرہ سے باہر نکلے اور اس وقت ہمارے ہیرو کو جس قدر اپنی قابلیت پر ناز ہوتا بجا تھا۔ کل جنٹلمین اور لیڈیاں اس کے گرد حلقہ کیے ہوئے کھڑی تھیں۔ سارا مجمع ایک زبان ہو کر اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ سب نے یہی خواہش ظاہر کی کہ کوئی موقع ملاقات کا ملے اور یکے بعد دیگرے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کرکے رخصت ہوئے۔

اب ہمارے لفٹیننٹ صاحب کی سُنیے کہ وہ سخت کھسیانا چہرہ بنائے ہوئے ایک طرف کو منہ کرکے ہمارے پاس سے گزر کر تانگے میں جا بیٹھے —— مگر بلا کی بے خوفی! ہمارے نوجوان ہیرو نے ان کا تعاقب کیا اور تانگہ کے پاس جاکر ان سے بڑے عاجزانہ انداز کے ساتھ مودٔب وضع سے سامنے کھڑے ہوکر لفٹیننٹ صاحب کو انگریزی میں کہا کہ "اگر میری کوئی حرکت آپ کی ناراضگی کا موجب ہوئی تو بڑے ادب کے ساتھ اور کمال عجز کے ساتھ معافی کا خواستگار ہوں۔ آئیے ان سب رنجشوں کو دور کرکے باہم مصافحہ کرلیں"۔ اس فقرہ پر لفٹیننٹ صاحب اور بھی جھلائے اور سخت کھسیانے ہوکر کمال غصہ کی حالت میں درشتی کے ساتھ فرمایا "میں تم سے ہاتھ نہیں ملاتا تم جنٹلمین نہیں ہو"

اتنے میں تانگہ والے نے گھوڑوں کو چابک لگایا اور دیکھتے دیکھتے تانگے وہاں سے کافور ہوگئے۔ ہم دونوں بھی اپنے تانگوں میں سوار ہوئے اور وہاں سے چل دیئے۔

جو کچھ میں نے بیان کیا ہے۔ اگر یہ کوئی ناول یا قصہ ہوتا تو ناظرین کو ہمارے ہیرو کا نام معلوم کرنے کے لیے بہت بیتابی نہ ہوتی۔ مگر چونکہ یہ میرا چشم دید قصّہ ہے اور تمام حالات راست راست بلا کم و کاست لکھے ہیں۔ اس لیے ناظرین ضرور اس جوان کا نام معلوم کرنا چاہتے ہوں گے پس اب میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ ناظرین کو زیادہ کم دیر یاسی کی حالت میں رکھوں اور بلا تامل کھول کر بتا دیتا ہوں کہ اس مضمون کے ہیرو اسی، رفیقِ ہند کے اڈیٹر ہمارے مولوی یا مسٹر محرم علی چشتی ہیں اور یہ سب انہی کی حرکات تھیں جن کا تذکرہ اس مضمون میں درج ہے۔ جس سے ناظرین قیاس فرماسکیں گے کہ جہاں ایک طرف آپ کے مزاج میں کمال درجہ کی ثقاہت ہے۔ اسی طرح دوسری طرف آپ ظرافت میں بھی اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے ہیں۔ غرضیکہ ایک عجیب طرفہ معجون شخص ہیں۔

پنجاب پنچ

مولوی فتح الدین بسمل پنجابی اخبار نویسوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے، نہایت ذکی اور ذہین تھے۔ ان کے والد مولوی جان محمد بھی لاہور میں ایک مشہور عالم گزرے ہیں۔ پنجاب کے اکثر مسلمان اور سکھ رؤسا نے ان سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

بسمل نے ۱۸۷۸ء میں "اخباروں کے قبلہ گاہ" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ جس کا ضمیمہ "پنجاب پنچ" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ یہ غالباً پنجاب کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا۔ اس کا دفتر لاہور میں دہلی دروازہ کے اندر مسجد وزیر خان سے متصل واقع تھا۔ مطبع کا نام بھی قبلۃ المطابع تھا۔ قبلہ گاہ کا ایک اشتہار ملاحظہ فرمایئے:

تشریف کو وہ لائے لائے
پھر ہند نے بھی وہ رتبے پائے پائے
کیا دھوم مچی ہے کس خوشی میں بسمل
اخباروں کے قبلہ گاہ آئے آئے

اخبار کے اغراض و مقاصد ان دھنواں دھار الفاظ میں ظاہر کئے جاتے تھے:۔

اخبار ایک سچی شہادت کا نام ہے اور ملک کی خدمت کرنا اس کا کام ہے۔ منصب میں رعایا کا سفیر ہے اور قدر و منزلت میں گورنمنٹ کا مشیر با تدبیر۔ کبھی فریادی ہو کر ادب کے ساتھ گورنمنٹ کو پکارتا ہے، اور کبھی ناصح بن کر اچھی طرح رعایا کو للکارتا ہے۔ ہمیشہ بہبود ملک کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اپنی عادل گورنمنٹ کا ہر حالت میں دم بھرتا ہے۔ جمیع کمالات سے اپنے آپ کو ایسا بناتا ہے کہ جام جم اور آئینۂ سکندری بھی شرماتا ہے۔ شائقان اخبار کو مصفّا لوح محفوظ ہے اور طالبان مسرّت کو مرقع محفوظ۔ اللہ اللہ مشتاقانِ دیدار کو کوہ طور ہے اور عباد و زہّاد کو جلوۂ نور دور بینوں کے واسطے دوربین ہے اور باریک بینوں کے واسطے خورد بین ہے۔ جب کبھی کاملوں کو اپنے علم سے آزماتا ہے، اپنے آپ کو بھی ان کا ثانی ہی پاتا ہے۔ سبحان اللہ کل کائنات کے سارے رنگ اس میں مہیا ہیں۔ کہاں تک بیان کیے جائیں کہ اس کے اوصاف کیا ہیں غرضیکہ خلاصۂ کائنات ہے اور پسندیدۂ موجودات ۔"

پنجاب پنچ میں ظریفانہ مضامین اور خبروں کے علاوہ کارٹون بھی اچھی خاصی تعداد میں شائع ہوتے تھے۔ مذاق عام طور پر سطحی، عامیانہ اور زیادہ تر ذ یات پر مشتمل ہوتا تھا۔

بسمل شاعر بھی تھے اور ظرافت سے نظم و نثر مضامین برابر لکھتے رہتے تھے۔ اس عہد کی ظرافت میں ان کو درجہ کمال حاصل تھا۔ا

کا مزاحیہ کلام انجمن پنجاب کے رسالہ گلدستۂ سخن میں بھی اکثر نقل ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے ۱۸۸۰ء میں بعارضہ تپ انتقال کیا۔ وفات کے وقت ان کے فرزند منشی دین محمد کی عمر صرف ۴ برس کی تھی۔ اس لیے اخبار کا تمام کاروبار ان کے چچا مولوی فیروز الدین نے سنبھالا جو اس وقت خود بھی اخبار مشیر ہند کے مالک تھے اور اب اپنی یادگار ایک بہت بڑا ادارہ فیروز سنز کے نام سے چھوڑ گئے ہیں۔

منشی دین محمد نے تعلیم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۳ء میں پنجاب پنچ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا مگر چونکہ اچھے اور نتیجہ خیز مزاحیہ مضامین لکھنے والے بہت کم تھے۔ اس لیے نہ صرف ظریفانہ رنگ ہی اڑا دیا بلکہ اخبار کا نام بھی بدل کر صدائے ہند رکھ دیا جو بعد میں میونسپل گزٹ ہو کر ان کی وفات تک چھپتا رہا۔

مولوی فتح الدین بسملؔ کی ایک ظریفانہ سیاسی نظم رسالہ گلدستہ سخن لاہور مارچ ۱۸۸۸ء سے لے کر یہاں پیش کی جاتی ہے یہ غالباً اس زمانے کی جنگ افغانستان کے وقت لکھی گئی تھی ؎

کابلی برسرِ پیکار ہیں لو اور سنو　　ان کے اب موت کے آثار ہیں لو اور سنو
جن کے صدقے سے پلے اور ہوئے اتنے بڑے　　ان سے بھی لڑنے کو تیار ہیں، لو اور سنو
شاہ تھیانہ تو ادرک نہ مصالح موجود　　سونٹھ کی گانٹھ پہ عطار ہیں لو اور سنو
دو قدم گو نہیں چل سکتے مگر اس پر بھی　　جنگ میں چلنے کو تیار ہیں لو اور سنو
ہم نرے مولوی تھے آج طفیلِ سرکار　　پنچ ہیں صاحبِ اخبار ہیں، لو اور سنو

جیب میں نافے پڑے رہتے ہیں بسملؔ کے مدام
آج ہم غیرتِ تاتار ہیں، لو اور سنو

ہم بھی اخبار جاری کریں گے

ابو محمد سیّد جمال الدین

"ہم بھی جاری کریں گے!"
"ارے میاں کیا جاری کرو گے؟"
"بس جناب ہم بھی جاری کریں گے۔"
"بھلا کچھ معلوم تو ہو کیا جاری کرو گے؟"
"اجی ہم جاری کریں گے۔"
"الٰہی تیری پناہ! کچھ کہو گے بھی کیا جاری کرو گے؟"

(یہ مضمون اخبار "دہلی پنچ" لاہور مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۸۳ء جلد چہارم شمارہ ۱۳ سے لیا گیا ہے۔ اس کے لکھنے والے ابو محمد سید جمال الدین ڈاکٹر شفاخانہ قصبہ کھوری ضلع ساگر ہیں)۔

اخبار دہلی پنچ لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا دفتر ہیرا منڈی میں تھا۔ یہ ہمارے عہد کے مشہور اہل علم اور ماہر تعلیم آقا بیدار بخت ایم اے، ایم او ایل کے والد مولوی فضل الدین مرحوم نے یکم جون ۱۸۸۰ء کو جاری کیا تھا۔ اس کے بارہ صفحے ہوتے تھے۔ سائز ۲۰×۲۶/۴ تھا۔ قیمت سرکار اور والیان ریاست سے ۱۲ روپے اور عام شائقین سے لعہ روپے معہ محصول ڈاک لی جاتی ہے۔

پرچہ کی روش نام سے ظاہر ہے۔ نظم و نثر کے تمام مضامین ظریفانہ ہوتے تھے۔ ایک آدھ کارٹون بھی ہوتا تھا۔ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس اخبار کا عنوانِ ترغیب یہ ہوتا تھا:

> "یہ ظریف اخبار ملک کے واسطے گلدستۂ ظرافت ہے اور آئینۂ فطرت اسی کا نام ہے۔ ایک نمکین جملہ ملک کی رائے ختم کرتا ہے اور بغلیں بجا بجا کر رعایا اور گورنمنٹ کی دوستی کا دم بھرتا ہے۔ کبھی بانتیجہ راگوں سے رعایا کو وجد دلاتا ہے اور ظریفانہ اشعار سے گورنمنٹ اور ملک دونوں کو جگاتا ہے۔ نئے روپ بھر کر ملک کے سامنے آتا ہے اور ہر ایک فقرے میں اتنے پتے کی کہہ جاتا ہے۔ حروف زوائد کا استعمال نہیں کرتا، خوشامدانہ بے نتیجہ مضامین نہیں بھرتا۔ اردو زبان کو چمکانے والا لفظ زبان قلم ہی سے محفوظ نہیں کرتا بلکہ مضمون کو تصویر کے لباس میں لاتا ہے جس میں سینکڑوں آرٹیکلوں کا مزا آتا ہے۔"

مولوی فضل الدین مرحوم ایک اور ہفتہ وار اخبار "وفادار" اخبار بھی نکالتے تھے جو نہایت سنجیدہ اور متین پرچہ تھا۔ وہ بھی دہلی پنچ پریس ہی سے شائع ہوتا تھا

"ریل گورنمنٹ یا ایسٹ انڈیا کمپنی کو مبارک ہو مگر ہم بھی جاری کریں گے۔"

"تو کیا کوئی کاغذ کا کارخانہ جاری کرو گے؟"

"یہ تو ان بڑی توند والوں کا کام ہے جن کی توند اُرد کی دال کھا کھا کر اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ دھوتی کھسکتی جاتی ہے۔ لیکن ہم بھی جاری کریں گے۔

پھر کیا کوئی نہر جاری کرو گے؟"

"یہ ان ظالم حکام کا حصہ ہے جو مظلوموں کی آنکھ سے ایک کیا ہزاروں نہریں جاری کرتے ہیں۔ لیکن ایں جانب بھی ضرور جاری کریں گے۔"

آہا۔ معلوم ہوا آپ شاید کوئی جہاز جاری کریں گے۔

آپ بھی کیا ساون کے اندھے ہیں جو خشکی میں جہاز چلواتے ہیں اور جن جہازوں کی نسبت آپ فرماتے ہیں، ہندوستان میں ان کی اب حاجت بھی نہیں رہی۔ سینکڑوں روشنی والے بے غیرتوں نے اہل یورپ کی دیکھا دیکھی دن دہاڑے ...... کے جہاز چلانے شروع کر دیئے مگر یارو ہم بھی ضرور جاری کریں گے۔"

"اے حضرت! اب جلد بتلایئے کیا جاری کرو گے؟"

اب بتلا ہی دوں۔ تو لیجیے بندۂ درگاہ ایک پھڑکتا ہوا ظریف اخبار جاری کریں گے۔ کیوں یاد ہے نا سہل سا ٹوٹکا اور ادنیٰ سا نسخہ، ٹکے کی کل جاری کر دی ہزاروں روپیہ کی اخبار فروشی کرنے لگے۔ اس میں بڑا منافع ہے اور معزز پیشہ۔"

"اخبار نہیں، بُرے کا سر جاری کرو گے۔ اخبار جاری کرنا کیا خالہ جی کا گھر ہے۔ کر چکے اخبار جاری۔"

"اجی ہٹ کے سڑو۔ ہم اخبار جاری کریں گے اور بیچ کھیت جاری کریں گے۔ تم ہی پھوٹی آنکھ سے دیکھو، آئے دن سینکڑوں کندۂ ناتراش اخبار جاری کرتے ہیں۔ پھر ہم میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں؟"

"آپ اخبار تو جاری کریں گے مگر یہ تو فرمایئے کس منشا اور غرض کے واسطے؟"

آپ بھی پورے جانگلو ہی رہے۔ ارے میاں جس واسطے تمام اخبار جاری ہوتے ہیں۔ اسی واسطے ہم بھی جاری کریں گے۔ قومی ہمدردی، ملکی بہبودی اور رفاہ عام کے کاموں میں امداد پہنچانے کے واسطے ہمارا اخبار بھی جاری ہو گا۔ کیونکہ تمام اخبارات اجراء کے وقت یہی ظاہر کرتے ہیں۔ پھر چاہے کریں اس کے برعکس۔ چنانچہ ہمارے اخبار کا اشتہار بھی آپ آنکھ بند کر کے اور کان کھول کر دیکھ لیا سوا الفاظ قومی ترقی اور ملکی بہبودی وغیرہ کے دوسرا لفظ اگر اشتہار بھر میں دیکھنے میں آ جائے تو مفت اخبار دیں۔ کوڑی قیمت نہ لیں۔"

"ان لن ترانیوں کو تو رہنے دو۔ پہلے یہ تو فرمایئے کہ قومی ترقی اور ملکی بہبودی کے واسطے کس قسم کے مضامین لکھنے چاہییں؟"

"آپ کیا میرا امتحان لیتے ہیں؟ مجھے آپ نے اڈیٹر نہیں کوئی کاٹھ کا الو تصور فرمایا ہے۔ ہم تو اپنے اخبار کا پہلا فرض یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ کے تمام کاموں پر (خواہ مفید خلائق ہوں خواہ مضر) برابر نکتہ چینی کرے اور سخت و درشت ناگوار الفاظ سے پیش آئے۔ اس لیے اخبار کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ لوگ بہادر، منہ پھٹ، نڈر و بنگ اخبار کہہ کر بڑی خوشی سے خریدتے ہیں دوسرا فرض یہ ہے کہ ریاستوں کی جھوٹی تعریفیں لکھنا، ہٹ دھرمی سے پیچ لینا، خوشامدانہ مضامین سے اخبار سیاہ کرنا جیسا کہ بعض خوشامدی اخباروں کا دستور ہے [illegible]

رعلیہ الرحمۃ کی کیسی بارش ہوتی ہے اور ریاستوں سے خلعت و انعامات کی کیونکر بوچھاڑ پڑتی ہے اور مزا یہ کہ اس میں ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔ آخر سیاہی، کاغذ، کاپی نویس وغیرہ تو ہر قسم کے اخبار میں برابر ضرورت پڑتی ہے۔ ہاں اس میں کسی قدر ایمان کا ضرور خرچ ہے سو اس کا جانا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایمان ہر قسم کی آزادی کا جانی دشمن ہے۔ اسی کی بدولت ہم سے اور بڑی بڑی نئی روشنی والوں سے ہر روز کی تو تو میں میں اور دانتا کل کل ہوا کرتی ہے۔ اگر ہم کو اس ایمان کا خیال ہوتا تو ہم بھی کب کے ستارۂ ہند بلکہ شمس الہند ہو گئے ہوتے۔“

”اے لعنت تمہارے اس اخبار جاری کرنے پر، بس یہی قومی ترقی اور ملکی ہمدردی ہے۔ اسی اخبار کے جاری کرنے کا وہ شور و غل تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ملکی و قومی ہمدردی کہیں گورنمنٹ پر بیہودہ اعتراضات جمانے اور ریاستوں کی جھوٹی تعریفیں اور بیجا طرفداری کرنے سے ہوا کرتی ہے۔“

”اگر تم بڑے لال بجھکڑ ہو تو بتلاؤ کہ کس قسم کے مضامین لکھنے سے یہ مطلب حاصل ہو سکتا ہے؟“

”میں کچھ گھر سے فاضل تو ہوں نہیں جو سارا کام چھوڑ کر مضمون نگاری کی تعمیل (تعلیم) دوں۔ البتہ قومی ترقی اور ملک کی بہبودی کے واسطے چند عنوان بتلائے دیتا ہوں۔ تم اپنی لیاقت کے مطابق اس پر مضامین لکھتے رہنا لیکن پہلے میں تم کو جتلائے دیتا ہوں کہ اخبار نویس کو گورنمنٹ کی ملائے اور تجویز پر بہت غور کر کے رائے زنی کرنا چاہیے۔ اگر گورنمنٹ کی تجویز قوم کے حق میں مفید معلوم ہو تو سچے دل سے گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور جو قوم کے حق میں مضر ہو تو نیک نیتی سے شائستہ اور عمدہ لباس میں مؤدبانہ طریق سے نکتہ چینی اور رائے زنی شوق سے کرے نا ملائم اور بیہودہ الفاظ اُجڈ اور گستاخانہ طریق سے وا ویلا نہ مچاتا پھرے۔ لیکن سب سے پہلے اپنی قوم کی اصلاح اور ترقی کے واسطے مضامین لکھنا مقدم سمجھے۔ اب اپنے جاری ہونے والے اخبار کے واسطے تھوڑے سے عنوان تو سن لو پھر ان پر مضامین لکھنا!

(۱) قومی اتفاق کی ضرورت (۲) قوم میں اتفاق اور اتحاد کیونکر بڑھ سکتا ہے (۳) ضرورت علم (۴) فوائد علم (۵) کون سے علوم حاصل کرنے چاہئیں (۶) کس طرح علم حاصل کیا جائے (۷) زراعت کی ترقی کی تدابیر (۸) تجارت کے فائدے (۹) تجارت کو نوکریوں پر کیوں ترجیح ہے (۱۰) پیشوں کو ذلیل نہ جانو (۱۱) ہر قسم کی دستکاری کو ترقی دینے کی تدابیر (۱۲) اولاد کو تندرست رکھنے کی تدابیر سیکھنا سب پر واجب ہے۔ (۱۳) بچوں کے وہ کون سے لباس ہیں جو بیماری سے روکتے ہیں اور موٹے ہوتے ہیں (۱۴) فوائد مقوی اور ملکی غذا کے بچوں کی پرورش میں (۱۵) تعلیم اولاد کی مقدم ہے (۱۶) کس طرح تعلیم دی جائے جس میں بچہ تعلیم کو مثل کھیل کے شوق سے سیکھے (۱۷) بچوں سے بہت مشقت اور محنت لینے کے نقصانات (۱۸) وہ کون کھیل ہیں۔ جن سے بچوں کے اعضا درست یا سیدھے و مضبوط ہوں (۱۹) زیور پہنا کر بچوں کو باہر نکالنے کی مذمت (۲۰) بچوں اور جوانوں کو بدصحبت زیادہ اثر کرتی ہے (۲۱) بچوں سے شیریں کلامی اور تہذیب سے برتاؤ کرنے کے فوائد (۲۲) صبح اٹھنے کے فوائد (۲۳) چھوٹی عمر میں شادی کرنے کی مذمت (۲۴) استاد اور والدین سے ادب سے پیش آنا سعادت ہے (۲۵) شادیوں اور تقریبوں میں اسراف برا ہے (۲۶) نیک صحبت کے فوائد (۲۷) لہو و لعب باج سنگ کی مذمت (۲۸) عورتوں کو بقدر ضرورت تعلیم ضروری ہے (۲۹) بیوہ کی دوسری شادی کرنا برا ہے (۳۰) رفاہ عام کے کاموں کو خاص طور پر ترجیح ہے (۳۱) حقہ، تمباکو، چرٹ سے آلات تنفس کو بہت نقصان ہوتا ہے (۳۲) مے نوشی کی خرابیاں (۳۳) مدک چانڈو کی مذمت (۳۴) برے پیشوں کی مذمت (۳۵) بھیک مانگنے کی مذمت۔ (۳۶) حاکم کی نافرمانی بری ہوتی ہے (۳۷) فحش و بھکڑ کی مذمت (۳۸) ہمسایہ سے سلوک (۳۹) دوستوں سے مروت (۴۰) جھوٹ کی مذمت۔

(۴۱) غیبت کی مذمت (۴۲) مذمتِ حسد (۴۳) مذمتِ تعصب (۴۴) ذات اور نسب پر فخر کرنا برا ہے (۴۵) غرور کی مذمت (۴۶) ظلم کی مذمت (۴۷) سود کھانا حرام ہے (۴۸) سستی اور کاہلی کی مذمت (۴۹) بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت ضروری ہے (۵۰) پست ہمتی کی برائی (۵۱) حوصلہ مندی کی تعریف (۵۲) فضول کاموں میں عمر برباد کرنے کی مذمت (۵۳) نیم حکیموں سے علاج کرانے کی مذمت (۵۴) میاں کے بیوی اور بیوی کے میاں پر کیا حقوق ہیں (۵۵) نوکروں، غلاموں، ماتحتوں پر سختی کرنا برا ہے۔"

"بس کرو، بس کرو۔ اجی سنتے بھی ہو، بس کرو۔ ہم سے ایسے پاپڑ نہیں بیلے جائیں گے۔ تم نے تو ایک طرف سے دنیا بھر کے علوم و معلومات و تجربہ کاری کی باتیں تبلانا شروع کیں۔ ایک آدمی تمام ملک کی باتیں کیونکر جان سکتا ہے۔ ان سب باتوں کے حاصل کرنے کے واسطے تو عمرِ نوحؑ بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ بس جناب ایسی اڈیٹری اور اخبار نویسی کو ہمارا دُور ہی سے سلام ہے۔ آج سے کبھی اخبار جاری کرنے کا نام بھی لیا تو جو سات چوروں کی سزا (جو کہ برابر ہیں ایک مضمون چور کے) وہ ہماری سزا۔"

"اچھا اب ہم تم کو ایک ذرا سی بات تبلائے دیتے ہیں۔ اگر اس پر عامل ہوئے تو تمہارے برابر روئے زمین پر کوئی اڈیٹر نہ ہوگا۔"

"اے سبحان اللہ! کیوں نہ ہو۔ ہو تو تم ہمارے لنگوٹیا یار۔ تم کو ہماری بہبودی کا خیال نہ ہوگا تو کس کو ہوگا۔ لے اب جلدی سے لگے ہاتھوں تبلا دو تو ابھی جاتے ہی پہلے اخبار جاری کروں پیچھے کھانا کھاؤں۔"

"اچھا نصیحت کو خوب یاد رکھو کہ جب کوئی مضمون لکھنے بیٹھا کرو تو آیت قرآنی ما اتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا کو پیشِ نظر رکھا کرو۔ کیونکہ رسول معصومؐ کا استاد خود علام الغیوب ہو اس کی پند و نصائح میں دینی و دنیاوی فوائد کس درجہ پر ہوں گے۔ کیا مجال ہے کسی بشر کی جو آپ کے مضامین پر نکتہ چینی کرے یا کوئی عاقل مخالفت کا دم مارے۔"

"اچھا تو ذرا ٹھہر جاؤ پہلے میں کسی محدّث سے احکامِ رسولؐ خدا سیکھ آؤں۔ پھر اخبار جاری کروں گا۔ جب تک دیگر اخبار نویسوں پر لازم ہے۔ ہمارے قائم مقام اسی قسم کے مضامین لکھیں اور دل کھول کر لکھیں۔ لیکن کہیں بدتمیزی یا مفسدانہ مضامین یا آپس میں جوتی پیزار کر بیٹھے (جیسا کہ آج کل مراد آباد کے اخباروں کا حال ہے) تو آکر ایک ایک اخبار نویس کی وہ دردشا کردوں گا کہ توبہ ہی بھلی ہے ع

"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

مُلکی مخبر

دُور کی بات

احمد علی خاں عاصی

یہ مضمون اخبار ملکی مخبر یعنی پولیٹیکل سپاہی سے لیا گیا ہے جو ۱۸۸۶ء میں لاہور کے مطبع دہلی پنچ سے جاری ہوا تھا۔

مولوی احمد علی خاں صاحب عاصی بریلی کے رہنے والے تھے ان کی بذلہ سنجی اور ظرافت سے اس وقت کے تقریباً تمام پنچ اخبارات مالا مال نظر آتے ہیں۔ کتاب شاہد ظرافت میں ان کے بہت سے ظریفانہ مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں ؎

ہر سمت جلوہ ہائے معانی کی سیر کر
گھونگٹ الٹ دیا ہے عروس خیال کا

میرے مکٹ دھاری بنسی والے سانورے کنھیا ملکی سپاہی! خدا تمہارے عوض ایں جانب کو برج کی پری چہرہ گوپیاں نصیب کرے۔ کیوں یار! یہ سن کر دونی کی طرح جل بھن تو ضرور ہی گئے ہو گے۔ تمہیں اپنے دلربا انداز کی قسم سچ کہنا روکھی پھیکی بھدی صورت پر ایں جانب نے بھی کیسی نکھری ہوئی شوخ بے چین طبیعت پائی ہے ؎

دیکھے جو نظر بھر کے یہ کیا منہ ہے کسی کا
آئینۂ خورشید میں پرتو ہے اسی کا

غور سے دیکھیے تو نگاہِ یار سے زیادہ تیز، برق سے بڑھ کر بے چین، بتانِ سنگدل سے کہیں شوخ واللہ کوئی ادا فہم، رمز شناس، شعلہ مزاج اک ذرا مسکرا کر چھیڑ دے پنجۂ نگاریں سے رگِ جاں میں دو چار چٹکیاں لے۔ اتنی شوخ طبعی سے دل میں گدگدی پیدا کرے، اس وقت اس عاصی کی رنگ آمیزیاں اور گل افشانیاں دیکھیے ؎

نالہ بے چھیڑے ہوئے غیر کے پیدا نہ ہوا
میں لب نے کی طرح آپ سے گویا نہ ہوا

خیر یہ تو یاروں کی چھیڑ چھاڑ، کہنے سننے کی باتیں ہیں۔ مطلب کی سنیئے۔ آج جو ایں جانب کی دلفریب طبیعت کسی مضمون میں دلِ عاشق کی طرح بے چین ہو کر ہاتھ سے نکل گئی تو ادھر ادھر۔ عالم خیال سے گذر کر عجب شان و شکوہ کے ساتھ شش جہت کے جلوے دیکھتی بھالتی

وہاں پہنچی جہاں فرشتہ خاں کی عقل کو بھی رسائی نہیں۔ اے واللہ! اس اپنی انوکھی جستجو کے قربان۔ نرالی تلاشی کے صدقے۔ ایک دم میں تمام عالم ارواح چھان مارا۔ فرشتہ پیکر بن کر خوب ملاءِ اعلیٰ کے سیر سپاٹے کیے۔ گاہ زین پر سوار ہو کر تہ کی خبر لی۔ ارمان بن کر دلِ عاشق میں راہ کی۔ سرمہ کی طرح پس کر شوخ چشموں کی آنکھوں میں گھر کیا۔ سبزہ میں شادابی، پانی میں روانی کی کیفیت دکھائی۔ پردۂ گل میں برنگ بُو نہاں ہو کر گلشن ایجاد کی بہاریں لوٹیں۔ زاہد کے ہمراہ دانۂ تسبیح کی طرح ہزاروں حرم کے چکر کاٹے، دیر میں زنّار برہمن بن کر بتوں کے گلے پڑے غرض ہر رنگ میں بھیس بدل کر دیکھا بھالا، تلاش کی، جب کہیں ہزار بات کی ایک بات ہاتھ آئی ؎

کوئی صحبت ہو مجھے چھپ کر تماشا دیکھنا
میں بھی گویا رنگ محفل تھا کہ ہر محفل میں تھا

اب آپ ہماری خوشامد کیجیے اور کچھ دے کر پوچھیے تو وہ بات بتائیں۔

کیا خوب اگر خوشامد ہی کرتے تو کسی بے حجاب ہرجائی کو گھر ہی نہ ڈال لیتے۔ یہ برسات کے موسم میں جھوم جھوم کے اودی اودی گھٹائیں آتی ہیں پیا کے مزے نہ اڑاتے۔ اور سنو یار! جہاں دینے لینے کا نام آیا اور آنکھوں سے خون اترا۔ مگر خیر عالم مجبوری، مصر کابل، سوڈان بر ماند رہے۔

(بھولے بن کر) کچھ وہاں اندیشہ تو نہیں ہے۔

ہیں! بجز جان و مال کے وہاں اندیشہ ہی کیا تھا۔ سب چین چان رعایا مطیع فرمانبردار۔ چوہے کا کھٹکا نہ بلی کا غم۔ واحسرتا! یہ کسی اخبار نویس بنیے کے لونڈے کو دم دیجیے۔ ایں جانب کی آنکھوں پر عالم بین عینک لگی ہوئی ہے۔ پولیٹکل اور سوشل حالات جہاں کہیے کہ چلیں۔

چہ خوش! اس لمبے چوڑے دعوے پر آپ دو ہی ایک پھڑکتی ہوئی باتیں ارشاد فرمائیے۔

سنیے! پہلی دور اندیشی ریاست رامپور کی نیابت ہمارے نئے نواب صاحب کی تلون مزاجی سے درمیان نواب حیدر علی خاں اور جنرل اعظم الدین خاں کے گل بازی کا رنگ دکھا رہی ہے۔ نتیجہ دونوں شخصوں کی بددلی ریاست کی خرابی۔

دوسری انجام بینی فی الحال ہماری سرکار۔ جو قرضہ لینی ہے شاید کسی وقت میں کشمیر کے مالا مال خزانے سے ادا کیا جائے جس پر آج کل انگریزی اخباروں نے تاک لگائی ہے۔

تیسری نازک خیالی ہم نہیں کہتے کہ روس کسی وقت میں ہندوستان آئے یا نہ آئے۔ دلیپ سنگھ کا معاون و مددگار بنے یا نہ بنے مگر ان دونوں خبروں کے گرم و ٹھنڈے ہو جانے سے ہماری گورنمنٹ ایک پر اثر نتیجہ ضرور نکال لینی ہے۔ وہ یہ کہ کمال رعایائے ہند کی مختلف طبیعتوں کی جانچ پڑتال ہو جاتی ہے۔

راقم

صورتِ لفظ خموشی سخن آرائی ہے
بے زبانی جو مری ہے وہی گویائی ہے

اور کہو۔

اور کیا خاک کہیں۔ واللہ دل پک گیا۔ یہ اردلی کے چپراسی کم بخت بھی کیا نااہل، بے مروت، خود غرض ہوتے ہیں کہ ہزار انہیں انعام و اکرام و خاطر تواضع کرو۔ مگر کمینے اُڑد کے آٹے کی طرح اینٹھے ہی جاتے ہیں۔ دُور سے جہاں بنگلہ پر کسی بھلے مانس کو آتے دیکھا اور روکھی پھیکی صورت بنائی طوطے کی سی آنکھیں پھیریں۔ اگر اس وقت ان سے ہاتھ ملایا کچھ دے لے دیا تو پھر کیا تھا کرسی بھی بیٹھنے کو موجود اطلاع بھی نمبر اوّل لو۔ ورنہ صاحب حاضری پر ہیں۔ غسلخانہ گئے ہیں۔ بڑا صاحب آگیا ہے۔ میم صاحبہ کی چٹھی آئی ہے۔ یہ بات وہ بات اس وقت نہیں مل سکتے۔ بس مجبور، احاطہ میں چکر لگائیے اور بنگلہ شریفہ کا طواف کرکے ٹھنڈی ٹھنڈی لہراتی ہوا کھاتے گھر چلے آیئے، کہاں گئے تھے۔ کہیں نہیں اور اگر قسمت جاگی، نصیبا پلٹا۔ صاحب کی ملاقات ہوگئی۔ تو مرے بھیا خدائی مل گئی۔ کئی ہزار فیٹ سے فرشی سلام کیا۔ معنے پا انداز کی طرح بچھ گئے۔ آگے جو کھڑے کھڑے گٹ پٹ بات چیت ہوئی۔ اسے بھی چٹنی لے لیں سنتے جایئے۔

صاحب ول۔ رئیس: حضور کے اقبال سے سب خیر صلاح ہے۔

صاحب۔ شہر میں اُلو کا کیا بھاؤ ہے؟

رئیس۔ صاحب وہ پبلس میں نے بہت صبح نہار منہ جاکر دیکھا میرے دل سے ہزار درجہ صاف ہے ذرا الصا کی نیت بو نہیں آتی۔

صاحب۔ اچھا رخصت۔

اے واللہ صدقے اس ملاقات کے اور قربان اس گفتگو کے۔ من چہ می گویم تنبورہ من چہ می سراید۔ اب جو لوٹ کر آئے تو دھنیا سے تک۔ پاجامہ سے باہر بنئے بقال۔ نوکر چاکر، ماما اصیل، تجھ مجھ میں لگے لمبیاں بھرنے۔ آج صاحب سے پچاس گھنٹہ برابر بات چیت رہی۔ صاحب نے یہ کہا۔ میں نے یہ کہا۔ اس کا ذکر آیا۔ اس کی سفارش کی۔ اس کا تنزل کرایا۔ بھلا یہ تو کہو جھوٹے پر کیا ع

ہم بھی گھر بیٹھے ہوا باندھتے ہیں

اور کہو

قسم ہے جناب امیر کی اور نہ پوچھئے ع
کوفہ کا نمونہ یہ بریلی ہے شریف

یہاں محرم میں آٹھویں تاریخ تک وہ پھڑکتے ہوتے دھوم دھامی رام لیلا کے میلے ہوئے مزے گھٹے۔ آتشبازیاں چھوٹیں جشن اُڑے کہ واہی واہ۔ نویں کو راجگدی کوتوالی کے قریب ہو کر بڑے زور شور سے نکلی۔ تعزیہ داروں کو اس بات سے ایسا الم ہوا کہ اس وقت تک سانس نہ لی۔ آج تک وہی سوز و گداز ہے۔ گھروں میں تعزیئے لئے بیٹھے ماتم کر رہے ہیں۔ یا حسین۔ اگر چالیسویں تک بھی تعزیئے نہ ٹھنڈے ہوئے تو پھر کربلا کا سامنا ہے۔

اور کہو۔

اور کیا کہیں۔ لوگ کہتے ہیں روس اور ہماری سرکار کی صلح ہوگئی۔ لڑائی جھگڑے سے جان بچی۔ مصنوعی قواعد کی پہنشا کر سمجھنے والے ہی سمجھیں گے۔ مگر ہم تو خیال کرتے ہیں کہ ہیضے کے پڑے۔ جاڑے بخار کی آڑ میں یہ بھیا روس ہی ٹھنڈی گرمیاں کر رہے۔ ہائے ہائے کیا تڑ بڑ گولی چل رہی ہے۔ حکیم اور ڈاکٹروں کے امیر کابل سے بھی ہزار درجہ زیادہ پنج چھکے ہو رہے ہیں۔ لوگ ہیں کہ آنکھ بند کئے کفن پہنے سرپٹ عدم کو چلے جا رہے ہیں۔ ہم تو عوام کے ساتھ جان دینے میں کسرِ شان سمجھتے ہیں ورنہ ہم بھی والنیٹروں میں داخل ہونے کی درخواست کرتے

مُلّا دوپیازہ

آج سے پون صدی پیشتر لاہور میں اچھے اخباروں کے ساتھ ساتھ بعض گھٹیا قسم کے ظریفانہ اخبار مُلّا دوپیازہ، جعفر زٹلی، پاٹے خاں اور رفیق ہندوستان وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے جن میں نہایت فحش مضامین چھپا کرتے تھے۔ یہ اخبار بالعموم ذاتیات اور وہ بھی مقامی معاملات سے بھرے ہوتے تھے۔ ایک طرف تو اخبار کے معاونوں میں میرزا ناظم حسین ناظم لکھنوی، حکیم غلام نبی، ڈپٹی برکت علی اور سرسید احمد خاں کے حامیوں کی اچھی خاصی ایک جماعت تھی، لیکن دوسری طرف تنہا مولوی محرم علی چشتی تھے جو تفسیر احمدی کی اشاعت اور جسٹس سید امیر علی کے ساتھ مل کر ۱۸۸۶ء میں پنجاب محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن قائم کرنے کی وجہ سے سرسید کے مذہبی عقائد اور سیاسی مسلک کے خلاف ہو گئے تھے۔ مولوی محرم علی چشتی زبردست اہل قلم تھے۔ ان کے قلم میں صف شکن طاقت تھی۔ وہ اخبار کوہ نور کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اور اپنا اخبار رفیق ہند بھی شائع کرتے تھے۔ لیکن وہ اینٹ کا جواب پتھر "مُلّا دوپیازہ" ہی کے ذریعے دیا کرتے تھے۔

مُلّا دوپیازہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ گلزار محمدی پریس سے باہتمام حکیم اللہ دین مالک و منیجر چھپتا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں جاری ہوا اور ۱۸۹۶ء تک رہا۔ اس کی طنز و ظرافت اور ہجو و ہزل کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے

(محمد عبداللہ قریشی)

نو دولت "میاں برما"

تماشا خوب ہی دیکھا تری قدرت نمائی کا
چھپر کھٹ پا گیا ہے سونے والا چارپائی کا
دوشالا اوڑھتا ہے اوڑھنے والا رضائی کا
پکاتا ہے خیالِ خام اب لونڈا قصائی کا
شہانہ ٹھاٹھ باندھا ہے چلن بھولا گدائی کا
بگڑ بیٹھا ر زالہ دم لگا بھرنے خدائی کا

(مُلّا دوپیازہ، ۲۳ راگست ۱۸۹۶ء)

میرزا ناظم حسین ناظم لکھنوی نے ایک زوردار ہجو لکھی جسے چشتی صاحب نے تضمین کر کے ان کی پگڑی انہیں کے سر باندھ دی ؎

عجب آکے منڈلی ملی ہے یہ ساری   کوئی ہے نقب زن کوئی چور بھاری
ہے نٹنی کا بچہ کوئی راسدھاری   مشیر اس کے کنجر ہیں اور ڈوم ڈھاری
میں لکھوں نہ کیوں ایسی صحبت پہ لعنت

چلے حج کو اب پیر نیچر کے نائب   بہت چوہے کھا کر ہے بلّی بھی تائب
ہوتے گر کہ گرگ کہن یہاں سے غائب   مدد تو جو مانگتے تو دیں رائے صائب
تری ایسی لنگڑی حمایت پہ لعنت

تجھے حامیوں نے کیا غرق یکسر   دکھاتا ہے تو ان کی شیخی پہ تن کر
اگر مجھ سے پوچھے تو اے نطفۂ خر   کہوں گا دل و جاں کو یک ڈل سمجھ کر
ترے حامیوں کی حمایت پہ لعنت

بھری نور سے گو کہ مجلس تو رکھے   مگر ماں بچاری کو فاقے سے مارے
وہ روتی ہوتی تجھ کو اس طرح کوسے   جو ہیں ٹوٹی اب کرسیاں گھر میں اس کے
انہوں پر بھی لعنت ہے لعنت پہ لعنت

تو نٹنی کا سب مال کھا پی کے بیٹھا   دیا قرض خواہوں کو مطلق نہ پیسا
وہ پنڈت تری جان کو اب ہے دیتا   قرض داریوں ڈگریوں کا تقاضا
جو لے کر نہ دے اس دیانت پہ لعنت

بٹھائی جو مجرے پہ اب تو نے برکت   نظر آگئی تیری ساری اصالت
اور اس پہ تو بنتا ہے سید کی عترت   تو لعنت کے قابل ہی ہے فی الحقیقت
حقیقت میں تیری حقیقت پہ لعنت

راقم

کس لئے فوج عدو پر نہ ہو افتادنی
سب مضامین میں کرتا ہوں میں ایجادنی

مُلّا دو پیازہ لاہور یکم ستمبر ۱۸۹۶ء

لاہور پنچ

دُکھڑا

سمجھے وحشی جو ہمیں اور کہے کالا ہم کو
کس طرح اس سے کہو ربط ہو پیدا ہم کو
وحشی و غیر مہذب ہو جب اپنا القاب
اُلفت و انس ہو پھر تم سے بھلا کیا ہم کو
پہلے چمڑے ہی پہ موقوف ہے تہذیب اگر
تو مہذب کبھی ممکن نہیں ہونا ہم کو
بس نہ لو اتنی مشیخت کی ذرا شرماؤ
یاد ہے خوب تمہارا ابھی زمانہ ہم کو
ڈھانکنا جسم کو پتوں سے مگر بھول گئے
نیم وحشی تمہیں زیبا نہیں کہنا ہم کو
کون سے پوتڑوں کے لال تھے کہیے تو سہی
گر ہو انصاف دعائیں دو ہمیشہ ہم کو
جن کی نعمت سے پلو ان ہی کو یوں نام دھرو
ہائے افسوس کسی سے نہیں لہنا ہم کو
ہم نے ہی تم کو سکھائے، یہ کرشمے یہ ناز
اپنے سے آپ ہے جو کچھ کہ ہے شکوا ہم کو
بنے دولت سے ہماری ارل اور مارکوئس
اور حقارت سے ہو پھر دیکھتے کیا کیا ہم کو
زر دیا، ملک دیا، جان سے بھی حاضر ہیں
پھر بھی خاطر میں نہیں لاتے تم اصلا ہم کو
ہم نے کیا کیا نہ وفا تم کو جتائی پہ حیف!
تم نے جانا نہیں اک روز بھی اپنا ہم کو
تم کرو تیز ہمارے لئے ہر روز چھری
اور ہو لطف و عنایت کی تمنّا ہم کو
ٹیکس کا خنجر و تخفیف کا دشنہ ہے ہے
سخت مشکل کہ پڑی جان بچانا ہم کو
کس کی تعلیم بھلا اور کہاں کی تہذیب؟
خاک میں تھا فقط اس ڈھب سے ملانا ہم کو
عہد و پیماں پہ نہ ہوں خوش تو کریں کیا ناچار
کچھ تو ہاں چاہیئے جینے کا سہارا ہم کو
کاش ہم پر نہ کھلے آپ کی پیماں شکنی
ورنہ دشوار ہے پھر وعدہ پہ جینا ہم کو
سیدھے سادے ہیں ہم اور راستی ہے ہم کو پسند
چال فقرہ یہ تمہارا نہیں بھاتا ہم کو
گر یہی آپ کے وعدے کی کمندیں ہیں رسا
جلد کابل بھی ہے پھنستا نظر آتا ہم کو
سوکھ کر ہو گئے کانٹا نہیں جینے کی اب آس
ٹکس اور قحط نے یاں تک ہے نچوڑا ہم کو

دیکھنا پہنچے نہ سیلاب کہیں تا انگلینڈ　　آگیا اپنے اگر حال پہ رونا ہم کو
کالے گورے کا اگر پردہ اٹھا دو رخ سے　　درد پھر تم کو ہمارا ہو، تمہارا ہم کو
ان کو نفرت ہو ہمیں انس، محال است محال
حضرت پنچ یہ قول آپ کا بھایا ہم کو

۱۸۷۷ء

جالندھر پنچ

ہندوستان کا نیلام

اجی حضرت کچھ آپ کو بھی خبر ہے ؟

کیا ہے ؟

کیا آپ سوتے ہیں ؟ امیر کابل تو ہندوستان کا نیلام کر رہے ہیں۔ جب بڑی ٹوپیوں والے نیلام میں آ گئے تو ہم کس شمار اور کس قطار میں ہیں ؟

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ خیر تو ہے ! یہ خبر آپ نے کیا سُنائی۔ کہاں کا نیلام ؟

ارے بھائی ! امیر کابل ان دنوں حلوائی کی دکان پر دادا جی کا فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ تو انگریزوں کو اپنا انداز دکھاتے ہیں اور انگریز ان کی یہ چال ڈھال دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہے۔

اجی امیر کابل تو انگریزوں کے ناز پروردہ اور وظیفہ خواروں میں سے ہیں۔ ان کا وہ کیا کر سکتے ہیں ؟ بہت کریں گے تو اپنے وظیفے سے ہاتھ اٹھائیں گے۔

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک صاحب انگریزی خواں جاکٹ پتلون پہنے، پھندنے دار ٹوپی لئے، انگریزوں کی نقل بناتے تہذیب کی چال چلتے آ نکلے۔ مائی ڈیئر۔ مائی ڈیئر کہتے ہوئے ہَو ڈُو یُو ڈُو کرنے لگے۔ اور جیب سے انہوں نے ایک پرچہ نکالا اور پڑھا کہ امیر کابل انگریزوں سے ۱۲ کروڑ روپیہ مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ روپیہ مجھ کو دو میں روس منحوس کے مقابلہ میں خرچ کروں اور ان سے لڑوں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ امیر صاحب فرماتے ہیں کہ روس ہم کو ۱۲ کروڑ طلائی سکّہ اور کچھ ملک جہلم تک دینے کو تیار ہے اب گویا سمجھنا چاہیے کہ امیر صاحب ہندوستان کا نیلام کر رہے ہیں یا اگر انگریزوں نے زیادہ بولی بولی تو ان کے ہاتھ ہندوستان چھوٹ جائے گا۔ نہیں روس کے ہاتھ چھوٹے گا۔

مگر یاد رہو ! یاد رہے ہند ممسک ہے۔ اس کا یکا یک چھوٹنا محالات سے سمجھنا چاہیئے اور فی الحال ہند کی قوت علم و تہذیب میں دو چند بلکہ سہ چند ہے۔ جب کوئی اس کے رگڑے میں آوے گا تو اس وقت آپ دیکھیں گے کیا روس کیا افغانستان الحق آگے چین لبل جائے گا۔

(سنہ ۱۸۷۷ء)

بنارس پنچ

پند نامہ

چار چیزوں کو چار چیزیں ضرور ہیں۔ کالوں کو ذلت، گوروں کو (بیجا) حکومت، روم کو نصرت، روس کو ہزیمت۔

چار چیزیں چار چیزوں کے بے رونق ہیں:۔ پاؤں بے بوٹ، سر بے ہیٹ (انگریزی لمبی ٹوپی) جسم بے کوٹ پتلون، منہ بے چرٹ

چار چیزیں ہندوستان کی تبرک ہیں:۔ گرانی، خشک سالی، تخفیف اور ٹیکس۔

چار چیزیں سبب نیک بختی ہیں:۔ چندہ دینا، چوں نہ کرنا، ہاں میں ہاں ملانا، دیوالہ نکالنا۔

چار چیزیں سبب بد بختی ہیں:۔ راست گوئی، صاف دلی، کالا رنگ، اطاعت۔

چار چیزیں محال ہیں:۔ سول سروس کا عہدہ، دیسی ریاستوں میں خوش انتظامی، انگریزوں میں میل جول، ہندوستانیوں سے بے وفائی۔

چار چیزیں آب حیات ہیں:۔ مدک، چنڈو، افیون شراب۔

چار چیزیں موجب ذلّت وخفت ہیں:۔ اولاد کو پیار نہ کر کے تعلیم میں ہلاک کرنا، بیواؤں کی شادی، اولاد کا چھٹپن میں نہ بیاہنا۔

چار چیزیں مخصوص چار چیزوں کے لئے ہیں:۔ پڑھنا نوکری کے واسطے، اتفاق ولایت کے لئے، نفاق ہند کے واسطے، ذات کی زنجیر ہندوؤں کے واسطے۔

چار چیزیں بے فائدہ ہیں:۔ اخباروں کی خریداری، کتابوں کی سیر، حال کی طرزِ تعلیم، گورنمنٹ سے التجا۔

چار چیزیں ہندوستان کے لئے مخصوص ہیں:۔ جاہلی، کاہلی، غلامی، بے پروائی۔

چار چیزیں برائے نام ہیں:۔ نئی روشنی، روسیوں کی جوانمردی، انگلینڈ کی دوستی، حکام کی خوشنودی۔

چار چیزیں بالکل بے مصرف ہیں:۔ شکر گذاری، دربار دہلی کے خطاب، لارڈ لٹن کی اسپیچ، روسی سردار۔

چار چیزیں چار جگہ کم ہیں:۔ بادلوں میں پانی، ہندوستان میں غلّہ، گورنمنٹ ہند میں رعایا کی رعایت، روس کی شجاعت۔

چار چیزوں کو زوال نہیں:۔ حکام کی خودرائی کو، ہمارے مصائب کو، رشوت کے بازار کو، پنچ اخبار کو۔

(سنہ ۱۸۷۸ء)

آگرہ پنچ

کملائی ہوئی ظرافت

شوخ بے چین

پھول مرجھائے ہوئے دید کے قابل کب ہیں
آنکھ پڑتی ہے انہیں پر جو کھلے ہوتے ہیں

دنیا کی نعمت ہو اور خواجہ آگرہ پنچ۔ ہم ہوں اور ظرافت کا لہلہاتا ہوا خوشنما باغ۔ دلفریب نہر ہو اور موتی سا آب رواں نکھری ہوئی چاندنی ہو اور کوئی ماہ پیکر، خوش گلو مطرب ہو اور یہ پھڑکتی ہوئی غزل ؎

ایسے غارتگر سے یارب دیکھئے کیسے بنے　　سینکڑوں برباد کر ڈالے ہوں جس نے گھر بنے
تیرے آگے بھی نہ چوکے جو ستمگر ظلم سے　　مجھ سے اُس سے کس طرح اے داورِ محشر بنے
اور تو کچھ بھی نہ آئے شیوہ ہائے دلبری　　چٹکیاں لے لے کے دل میں آپ بھی دلبر بنے
ناز ہوں گے کیسے کیسے خاک ہونے پر مجھے　　میری مٹی سے اگر دو چار بھی ساغر بنے

تاج گنج کے مجاور مُلّا آگرہ پنچ صاحب: قسم آپ کے مضحکہ آمیز تقدس کی۔ آج جو ایں جانب کی نظر "المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام" پر پڑی تو جی پھر پھرا یا کہ چاہیے کچھ ہو تم بھی کسی پرانی ٹانگ کی قبر کے دو چار ڈھیلے ملاجی کی نظر کر کے اس مردار کی روح کو ثواب پہنچاؤ۔ واللہ اس ذکر سے تو آپ کا بھی ہاتھ بھر کا نفس مردہ جی اٹھا ہوگا۔ خیر یہ تو دل لگی تھی۔ اب ظرافت کی تسبیح ہاتھ سے رکھ کر یاروں کا پھڑکتا ہوا "دل لگا" سُنئے:۔

بہت سے ہجڑے پنچ جن کو پولیٹیکل اور سوشل خبروں کا ویران گنج کہنا چاہیے اس مثل کے مصداق ہو رہے ہیں۔ گھر میں ڈھولک نہیں اور نام نوبت رائے۔ تو یہ لاہور بڑا شہر۔ یہ پنچ کیسے جن میں چٹ پٹے ظرافت کا تو ذکر ہی کیا خبروں کا انتخاب بھی بھوتر کے بالوں کی طرح سراسر الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم چمکار کر کہتے ہیں کہ وہ مہربانی فرما کر یا تو پنچ کے نام کو استعفا دے دیں یا اپنے ویران کالموں کو دلفریب ظرافت سے پری خانہ بنائیں۔ ؏

جو شکل نظر آئے تصویر نظر آئے

بعض پنچوں کو مضمون کا ہیڈنگ تک لکھنا نہیں آتا۔ اہل نامہ نگاروں کو بھونڈے الفاظ کے ساتھ پکار بیٹھتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ پنچ کے نامہ نگار ایک آزاد خو، نازک مزاج، بے چین طبیعت لوگ ہوتے ہیں۔ ان کو چیلے چانٹوں کا خطاب دینا گویا ان کی پیاری وقعت کو بٹہ لگانا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ آئندہ ایسے دل شکن الفاظ سے اپنے چلبلے قلم کو روکیں گے ؏

ہم نیک و بد حضور کو سمجھاتے جاتے ہیں

بعض ہمارے یار نئے شوقین نامہ نگار زندہ دل گھر سے فاضل خرچ لگا کر شہیدوں میں ملنے والے اپنے خیالات کی کند چھری سے مفت ظرافت کا گلا کاٹتے ہیں اور نتیجہ سے خالی بے سود مضامین مہذب طبیعتوں پر گراں گذرنے والے الفاظ جو نمکین ظرافت کی حد سے گزر کر پھکڑ کے بازار میں نیم چڑھے کریلے کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ نام آوری کے شوق میں بے سوچے سمجھے دھر گھسیٹتے ہیں۔ نا بھائی اپنی ظرافت سے گورنمنٹ کو ہنسا کر قوم کی اصلاح، ملک کی بہبودی کی درخواست کر دو اور نوعمر آزاد طبع دیسی بھائیوں کو دل لگی دل لگی میں بُرے کاموں کا بد نتیجہ دکھا کر اچھی باتوں کا شوق دلاؤ اور اپنے ظریفانہ دلفریب لٹریچر سے اس طرح ردو بدل کر راہ پر لاؤ ؎

جو مجھ سے گریزاں تھا کل اس کو میں گھر لائے
باتوں میں لگا لایا تقدیر اسے کہتے ہیں

بعض مہربان بڑی دم کے انسان جن کی گٹھل طبیعت کند ذہن جدّت کے پاس ایجاد کے قریب کبھی خواب میں پھٹکنے نہیں پاتی۔ یاروں کے پرانے مضامین لکھے چھپے مڈنگ لوٹ پھیر الٹ پلٹ کر اپنے نام سے اس غرض سے اخباروں میں لکھ مارتے ہیں کہ ہم بھی پانچویں سواروں میں مل کر شوخ نگاروں میں داخل ہو جائیں۔ آئندہ اپنی کم ہمتی کا صدقہ یاروں کے حال پر رحم فرمائیں اور یہ سمجھ لیں ؎

جھوٹی حنا ملے جو کوئی دے بہار کیا

راقم

شکوہ کیا جو دل نے کسی کی نگاہ کا
سینہ میں ایک شور اٹھا واہ وا کا

دکن پنچ

ہندی اور مغربی ناٹکوں کی امتیازی خصوصیات

ڈاکٹر ایچ جگناتھ پرشاد۔ ایچ۔ ایم۔ بی

(وکیل ہائی کورٹ و ایڈیٹر دکن پنچ حیدرآباد دکن)

عموماً ہندو ناٹکوں میں بھی کچھ حصہ نثر اور کچھ حصہ نظم کا ہوتا ہے۔ اور سنسکرت و پراکرت زبانیں مخلوط ہوتی ہیں۔ ہندو ناٹکوں کی زبان بھی بہت شستہ ہوتی ہے۔

خاص طور پر قابلِ ذکر بات اور امتیازی خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں زنا کاری کا جو یوروپی ناٹکوں کا ماسٹر پیس ہے شاذونادر ہی ذکر ہوتا ہے۔ بعض ناٹکوں میں حسن و عشق کی رنگینیاں ضرور ہوتی ہیں لیکن عشق کا نتیجہ لازمی طور پر پاکبازانہ ہوتا ہے۔ دوسرے کی بیوی سے تعلق پیدا کرنا اس زمانہ میں بہت بڑا پاپ اور اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے۔

یوروپی ڈراموں کی طرح ہمارے ناٹکوں میں بھی طوائف کا عنصر موجود ہے۔ لیکن ہندی طوائف میں وہ عریانی نہیں تھی جو یوروپی طوائف کا جزو لاینفک ہے۔ اس کے سوا اس وقت ہندوؤں میں طوائف وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے یونان میں ہیٹرا اور اپنی اعلیٰ تعلیم و قابلیت کے لحاظ سے ان کا رتبہ یوروپی طوائف سے بہت زیادہ تھا کیونکہ تفریحی دل بستگیوں کے علاوہ تربیتِ اطفال بھی سروار تھیں۔

ہندو ناٹکوں میں البتہ واقعات خرق عادت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور خود دیوتا اور دیویاں ان میں شریک ہوتی ہیں اور جب کسی محل وقوع پر کوئی مصیبت اور مشکل آپڑتی ہے تو دیوتا ہی ان مشکلات کو آسان کرتے ہیں۔

انشاء کے لحاظ سے بھی ہندو ناٹک کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان میں کلیات کی طرف زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات جزئیات پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اگرچہ بعض محققین کی رائے ہے کہ ہندو ناٹک یونانی سے ماخوذ ہے۔ لیکن واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔

ہندوؤں میں ایکٹروں کا درجہ اس وقت بہت اونچا سمجھا جاتا تھا اور ایکٹ بھی نہایت مہذب طریقہ پر کیا جاتا تھا۔ ناٹک کے مصنفین تو نہایت ہی بلند پایہ اور بلند خیال ہوا کرتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات بادشاہ خود ڈرامے لکھتے تھے۔ چنانچہ مٹی کے گاڑی کا جو سنسکرت ڈراموں میں ایک بہترین ڈرامہ ہے۔ اس کا مصنف شودرک مگدھ کا بادشاہ ہے۔

یوں تو ہندو ناٹکوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کی فہرست بھی مرتب کرنا مشکل امر ہے۔ ہم صرف بعض مشہور و معروف ناٹکوں پر

اکتفا کرتے ہیں۔

کالیداس کے ڈراموں میں میگھ دوت کماذ سنبھو وکرم اور رشی شکنتلا وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان سب میں شکنتلا زیادہ تر مشہور و مقبول ہے۔ اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا ہے۔ خود فرانسیسی میں کئی تراجم موجود ہیں۔ اس ناٹک نے یورپ میں عام مقبولیت حاصل کی۔ گیوٹی اور لا مارٹین جیسے قابل ڈراماٹسٹ نے اس پر عش عش کیا۔ اس ناٹک سے ہندو مصنفین کے اوصاف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس میں سادگی ہے اور دوسرے مغربی ناٹکوں کی طرح اس میں مبالغہ آمیزیاں نہیں ہیں۔ طرز بیان دلکش اور کہانی دلچسپ و دل کو لگنے والی ہے۔

اس کے بعد پراکرت ناٹکوں میں راجہ ہریشچندر نل دمن سیتہ ساوتری۔ سیتہ وتی۔ دیوایانا۔ انسویا پرہلاد۔ سارنگ دھر۔ رام داس وغیرہ وغیرہ سب ناٹک ایسے ہیں جو اخلاق عصمت وفاداری اور فرمانبرداری کے احساسات و جذبات سے سراپا لبریز ہیں۔ آج کل کے یورپی ناٹکوں کی طرح اس میں عشق اور مخرب اخلاق باتوں کا شائبہ تک نہیں ہے۔ بلکہ جو کوئی بھی انسان خواہ مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا ان ناٹکوں کے دیکھنے سے ایک گونہ اخلاقی سبق حاصل کر سکتا ہے۔ برخلاف اس کے یورپی ناٹکوں اور سینماؤں کے دیکھنے سے آج کل ہمارے ملک کے نوجوان، مردوں اور عورتوں کے عادات اور اطوار پر جیسا کچھ ناگفتہ بہ اثر پڑ رہا ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

اگرچہ ڈرامہ کے فن میں یورپ نے قابلِ قدر اضافہ کیا ہے اور حسیات و نفسیات کی دلچسپ ترجمانی کی ہے۔ لیکن حسن و محبت کو اس قدر نازیبا پیرایہ میں ظاہر کیا ہے کہ بجائے کسی مفید درس عمل کے مطالعہ کرنے والی نگاہوں اور مشاہدہ کرنے والے دماغوں کو شہوانی جذبات کے لچکدار پیغامات ملتے ہیں۔ جن کے اثرات سے نوجوانوں کا محفوظ رہنا محالات سے ہے۔ لیکن ہندی ڈراموں میں حسن و عشق کی تفسیر ضرور کی گئی ہے۔ مگر ایسے مہذب پیرایہ میں کہ حفظ نفس کے بعد حصولِ خودداری اور تحفظ کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

بعض ہندو ڈراموں میں مشکل کے وقت فوق العادات قوتوں یعنی دیوتاؤں وغیرہ کی جو بر وقت امداد دکھائی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اس کو مبالغہ خیال کریں لیکن اس کو مبالغہ خیال کرنے کے بعد بھی خدا ترسی اور ہمدردی انسانی کا سبق ضرور ملتا ہے۔

یہاں ہم نے ان چند ہندو ناٹکوں کے نام صرف بطورِ نمونہ پیش کئے ہیں اور اگر ہم اپنی ناٹکوں کی تفصیل بتلانا چاہیں تو ہر ایک ناٹک کی جزئی تفصیل بھی ایک دفتر بن جائے گی۔ اس لئے ہم بخوف طوالت صرف اجمالی تشریح پر ہی اکتفا کرتے ہوئے اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں

کچھ اودھ پنچ کے بارے میں *

پنڈت برج نرائن چکبست

ہندوستان کے جس جس گوشہ میں اُردو زبان کا نغمہ سنائی دیتا ہے۔ وہاں شاید کوئی ایسا شخص ہو کہ جس کے کان اودھ پنچ مرحوم کے ذکرِ خیر سے آشنا نہ ہوں۔ اودھ پنچ نے تیس پینتیس سال تک اپنی عالمگیر شہرت و وقار کے پردہ میں اخباروں کی دنیا میں سلطنت کی ہے اور اس کی پُرانی جلدوں کے گورِ غریباں میں اکثر ایسے اہلِ کمال دفن ہیں جن کے قلم کی دھاک دلوں میں لرزہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھی۔

جس وقت اودھ پنچ نے دنیا میں جنم لیا اس وقت اخبار نویسی کا فن ہندوستان میں تخمیناً چالیس سال کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں پہلے پہل سرکار کی جانب سے ہندوستان کی بے زبان رعایا کو اخبار نکالنے کی نعمت عطا ہوئی اور سنہ ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نے زبان اور ظرافت کے چہرہ سے نقاب اٹھائی۔ اس چالیس[۱] سال کے عرصہ میں اُردو کے بہت سے اخبار جاری ہو چکے تھے مثلاً لاہور میں اخبارِ عام اور کوہِ نور کا دور تھا، یہ اپنے وقت کے نامور اخبار تھے۔ دہلی میں اشرف الاخبار کی آواز سنائی دیتی تھی وکٹوریہ پیپر سیالکوٹ سے جاری تھا۔ کشف الاخبار بمبئی اور جریدہ روزگار مدراس میں اردو کا نقارہ بجا رہا تھا۔ کارنامہ اور اودھ اخبار لکھنؤ سے شائع ہوتے تھے۔ عرصہ ہوا کارنامہ کا کام تمام ہو گیا، اودھ اخبار ابھی تک اپنے بڑھاپے کی شرم رکھتے ہوئے ہے مگر اس کا جو رنگ اب ہے وہی رنگ جب تھا۔ ان کے علاوہ اودھ پنچ کی اشاعت کے قبل بہت سے اُردو اخبار اپنی پیدائش اور موت کی منزلیں طے کر چکے تھے مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ اخبار محض خبروں کی تجارت کرتے تھے۔ بجز لارنس گزٹ کے جو میرٹھ سے شائع ہوتا تھا اور جس کی نظر رعایا کے حقوق پر رہتی تھی۔ عام طور سے ان اخباروں کا نہ کوئی خاص پولیٹکل یا سوشل مسلک تھا۔ نہ کسی مستقل دستور العمل کے پابند تھے۔ اُردو اخبار نویسی کی تاریخ میں اودھ پنچ اور ہندوستانی پہلے دو اخبار ہیں جنہوں نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولوں پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم کیا۔ ہندوستانی کا دور اودھ پنچ کے چھ سال بعد شروع ہوا اور جس پولیٹکل رشی کے دماغ کا یہ اخبار کرشمہ تھا۔ اس نے اخبار کو بھی اپنی ذات کی طرح پولیٹکل خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اودھ پنچ گو کہ ظرافت کا پرچہ تھا مگر پولیٹکل اور سوشل

---

[۱] ان اخباروں کے اکثر حالات منشی بال مکند گپتا مرحوم کے اردو اخباروں کے تذکرے سے اخذ کئے گئے ہیں جو بھارت متر اور زمانہ میں شائع ہوا تھا۔

معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا۔ اس کا مستقل، سوشل اور پولیٹیکل مسلک تھا۔ اس صوبہ میں ہندوستانی کانگرس کا چراغ سمجھا جاتا تھا۔ مگر جن گوشوں میں اس چراغ کی روشنی کا گذر نہ تھا وہاں اودھ پنچ کی بجلی چکاچوند پیدا کرتی تھی۔ سوشل اصلاح کے معاملہ میں اودھ پنچ لکیر کا فقیر تھا۔ نئی روشنی کے نادان دوستوں کی حماقت کا پردہ فاش کرنے کے علاوہ اس کی ذات سے اس تحریک کو کوئی نفع نہیں پہنچا۔ ظرافت کے اعتبار سے یہ اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا۔ اکثر ظریفانہ اخبار مثلاً انڈین پنچ، بمبئی پنچ، بانکے پور پنچ وغیرہ اس کی تقلید میں نکلے۔ مگر وہ دنیا کی ٹھوکریں کھا کر ختم ہو گئے۔ زمانہ سے کسی کو شہرت و ناموری کی سند نہیں ملی۔ اودھ پنچ کا جادو اردو زبان پر عرصہ تک چلتا رہا اور اس طولانی زمانہ میں جو خدمات اودھ پنچ سے ظہور میں آئیں ان پر نظر ڈالنے سے اُردو نویس کے دربار میں ہم اس کا صحیح مرتبہ قائم کر سکتے ہیں۔ اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ رہتے تھے۔ جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی۔ مگر قوموں کے مذاقِ سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اُردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوں پر نظر ڈالنا چاہیے۔ اُردو نثر کے ان جواہرات میں جہاں اور بہت سی لطافت و رنگینی کے جوہر موجود ہیں وہاں ظرافت کی جھلک بھی کم دلکش نہیں ہے۔ نہ پھبتیاں ہیں نہ طعن و تشنیع کے جگر خراش فقرے ہیں، محض روزمرّہ کی باتیں ہیں مگر طبیعت کی شوخی متین الفاظ کے پردے سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کے چہرہ پر مسکراہٹ کا نور پیدا کر دیتی ہے۔ باریک اور لطیف مذاق کی رنگینی اور بیساختہ پن پر جس قدر غور کرو اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں اس طرح نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر . . . . جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے وہ روتا ہے اور دیکھنے والے اس کی بے کسی پر ہنستے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے ہیں بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا غالب کی زیرِ لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسرے کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اکثر طبیعت کی شوخی اور بے تکلفی درجۂ اعتدال سے گذر جاتی ہے اور ان کے قلم سے بے تحاشا ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جن کو دیکھ کر مذاقِ سلیم کو آنکھیں بند کر لینا پڑتی ہیں۔ ایسا ہونا معیوب ضرور ہے مگر ایک حد تک قابلِ معافی ہے۔ اودھ پنچ کے ظریف اس زمانہ کی ہوا کھائے تھے جب مذاق و بے تکلفی کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع تھا۔ اور زبان و قلم کی بہت سی بے اعتدالیاں ہماری نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ اب زمانہ کے ساتھ ظرافت کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔ اور یہی دنیا کا دستور ہے۔ ممکن ہے کہ جن باتوں کو ہم آج پھول سمجھتے ہیں وہ آئندہ نسلوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکیں۔ ظرافت کے رنگ سے قطع نظر کر کے اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے اُردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اتار کر جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے کچھ نہ تھا ایسے پھولوں سے آراستہ کیا جن میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا۔ اودھ پنچ سے پہلے رجب علی سرور کے طرزِ تحریر کی پرستش ہوتی تھی اور عام مذاق تصنع و بناوٹ کی طرف مائل تھا۔ اس زمانے میں جو اُردو اخبار جاری تھے ان کی زبان ایسی ہوتی تھی جسے ہم محض محبت سے اردو کہہ سکتے ہیں۔ آج نثر اُردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ علاوہ منشی سجاد حسین مرحوم کے اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں مرزا مچھو بیگ معروف بہ ستم ظریف، حضرت

احمد علی صاحب شوقؔ، پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ، نواب سید محمد آزادؔ، بابو جوالا پرشاد برقؔ، منشی احمد علی کسمنڈوی، حضرت اکبر حسین صاحب اکبرؔ یادگار نام ہیں۔ ان لوگوں کے نظم و نثر کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک طرزِ نو کے موجد ہی نہیں ہیں بلکہ زبان و قلم کے دھنی بھی ہیں۔ ان کی عبارت شوخی و تازگی اور خداداد بے تکلفی سے معمور ہے اور ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ نثر کے نامہ نگاروں میں طبیعت کے چلبلے پن اور شوخی کے لحاظ سے اور نیز زبان کی پختگی اور لکھنؤ کی بول چال اور محاورہ کی صفائی کے اعتبار سے ستم ظریف کا رنگ اوروں کے مقابلہ میں چوکھا ہے۔ احمد علی صاحب شوقؔ کے مضامین میں ظرافت کی شگفتہ کاری کے علاوہ زبان و محاورہ تحقیقات کا خاص لطف ہے۔ حضرت کسمنڈوی مرحوم کی عبارت خاص طور سے دلکش ہے۔ مگر فارسیت کا رنگ زیادہ ہے۔ ہجرؔ کا رنگ خاص یہ ہے کہ ان کی ظرافت بمقابلہ اوروں کے بدمذاقی اور طعن و تشنیع کے کانٹوں سے زیادہ پاک ہے۔ برقؔ کی عبارت میں ظرافت کا چٹخارہ بہت کم ہے مگر زبان نہایت صاف اور ستھری ہے۔ آزادؔ کا قلم نواب زادوں کی بے فکری عیش پسندی کا خاکہ کھینچنے میں مشاق ہے۔ منشی سجاد حسین کا طرزِ تحریر سب سے الگ ہے۔ مضمون کیا ہیں چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے ذخیرے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا مصنف سے گفتگو کر رہا ہے۔ عبارت اکثر مختلف علوم و فنون کے پیچیدہ استعاروں سے گرانبار نظر آتی ہے مگر بیان کی تازگی کی وجہ سے پڑھنے والے کا جی اچاٹ نہیں ہوتا۔ ظریفانہ نظم کے میدان میں حضرت اکبر سب سے دس قدم آگے ہیں۔ طبیعت کی خداداد شوخی اکثر زبان کی صفائی سے بازی لے جاتی ہے مگر عموماً سوشل پولیٹکل اور مذہبی مسائل کے ظرافت آمیز پہلو جس خوبی کے ساتھ حضرت اکبرؔ نے نظم کئے ہیں وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ ان کا معیارِ ظرافت بھی اوروں کے مقابلہ میں لطیف تر ہے۔

اودھ پنچ کی محفل انہی پُر مذاق اور نورانی طبیعتوں سے آراستہ تھی اور اب بھی اگر کوئی شخص اُردو زبان حاصل کرنا چاہے تو اودھ پنچ کے ٹوٹے کھنڈروں کی زیارت اس کے لئے ضروری ہے۔ اودھ پنچ کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اودھ پنچ کے ظریفوں کی گلکاری سے خالی رہتا ہو۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے طرزِ معاشرت کی پُر مذاق اور دلکش تصویروں سے اس کے صفحے اکثر رنگین نظر آتے تھے۔ محرم، چہلم، عید، شب برات، ہولی، دیوالی، بسنت کے جلسے، عیش باغ کے میلے، رقص و سرود کی محفلیں، مشاعرے، عدالت کی رو بکاریاں، مرغ بازی، بٹیر بازی کے ہنگامے، الیکشن کے معرکے ایسے مشغلے تھے جو ہمیشہ اودھ پنچ کے ظریفوں کی نظر میں رہتے تھے اور ان کی طبیعتوں کے لئے تازیانہ کا کام دیتے تھے۔ ساقی نامے، برہے، بارہ ماسے، دوہے ٹھمریاں، غزلیں، رباعیاں وغیرہ نظم کرنے میں اس کے اکثر نامہ نگار خاص ملکہ رکھتے تھے۔ منشی سجاد حسین ہر ہفتہ ایک چھوٹا سا مضمون لوکل علیہ الرحمۃ کے عنوان سے لکھتے تھے۔ جس میں اکثر موسم کی تبدیلیاں ایسے ظریفانہ رنگ میں دکھائی جاتی تھیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔

زندہ دلی کی یہ تمام تصویریں اودھ پنچ کے بوسیدہ مرقع میں موجود ہیں۔ گلدستۂ پنچ کی دو جلدوں میں ان کا پورا نقشہ اتارنا اتنا ہی مشکل ہے جیسے کہ دریا کو کوزہ میں بند کرنا مگر زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے جو کچھ ہو سکا اسے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔

روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے علاوہ اودھ پنچ میں شاعری اور صحتِ زبان کے متعلق اکثر ایسے زبردست مباحثے چھڑے جو مہینوں اور سالوں تک قائم رہے اور جن کی وجہ سے اُردو دان سوسائٹی میں عرصہ تک چہل پہل قائم رہی۔

پہلے معرکہ کا تعلق فسانۂ آزاد سے ہے۔ سرشار مرحوم ابتدا میں اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے اور اس کے گہوارہ کے گرد بیٹھنے والوں میں تھے۔ جس رنگ کا اودھ پنچ عاشق تھا اسی رنگ میں وہ بھی ڈوبے ہوئے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زمانہ کے جس انقلاب نے دنیا کو اودھ پنچ کی صورت دکھائی اسی نے سرشار کی طبیعت کو بھی پیدا کیا۔

اودھ پنچ کے ایک سال بعد فسانۂ آزاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے سرشار نے یہ سلسلہ اسی اخبار میں شروع کیا ورنہ فسانۂ آزاد کا دریا بھی اودھ پنچ ہی کے چشمہ سے جاری ہوتا کیونکہ دونوں کا مذاقِ تحریر یکساں ہے اور دونوں ایک ہی باغ کے دو پھول معلوم ہوتے ہیں مگر اودھ پنچ نے اودھ اخبار کو بنیا اخبار کا خطاب دے رکھا تھا اور اس کے حال پر اودھ پنچ کے ظریفوں کی خاص عنایت تھی۔ جب سرشار اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے تو کچھ روز تک تو ذاتی مراسم کا پردہ قائم رہا لیکن رفتہ رفتہ طرفین سے طبیعتیں بے قابو ہوتی گئیں اور آخر کار فسانۂ آزاد پر اعتراضات شائع ہونے لگے اودھ پنچ کا فسانۂ آزاد پر خاص اعتراض یہ تھا کہ جو بیگمات کی زبان اس میں لکھی گئی ہے وہ محلات کی زبان نہیں ہے بلکہ ماماؤں اور مغلانیوں کی زبان ہے اس قسم کے اعتراضات کے ڈونگرے عرصہ تک اودھ پنچ کے بادلوں سے برسائے گئے اور ظرافت کی بجلیاں چمکتی رہیں۔ ان اعتراضات کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ضرور درست ہیں مگر زیادہ تر طباعی پر مبنی ہیں۔

اودھ پنچ کا دوسرا وار مولانا حالی کو سہنا پڑا۔ مولانا موصوف کے دیوان کے مقدمہ میں شاعری کے اصلی مفہوم پر بحث کی گئی ہے جب یہ مقدمہ شائع ہوا تو اس بحث نے اودھ پنچ کی بارود کے لئے چنگاری کا کام کیا۔ اودھ پنچ کو مولانا حالی سے دو شکایتیں تھیں۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ مولانا حالی کا شاعری کا مفہوم غلط ہے جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے۔ اور فطری شاعری کی لطافت و رنگینی سے خالی ہے۔

اختلاف کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں مصنوعی اور خلافِ فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی تھیں ان کا کثیر حصہ لکھنؤ کے شعراء کے کلام سے لیا تھا جس کا لازمی منشا اودھ پنچ کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شعراء کی توہین ہو۔ ان خیالات کا دلوں میں امڈنا تھا کہ دیوان اور مقدمہ کے ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی اور یہ سلسلہ بھی مدت تک جاری رہا۔ جس عنوان سے اودھ پنچ کے شہسواروں نے پانی پت[1] کے میدان میں طرارے بھرے ہیں وہ بعض صورتوں میں قابلِ اعتراض ضرور ہے مگر نفسِ مضمون کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ اودھ پنچ کی شکایت بے بنیاد نہ تھی۔

تیسرے ہنگامہ کی رونق داغ کی شاعری سے ہے۔ اودھ پنچ نے داغ کی شاعرانہ عظمت کبھی تسلیم نہیں کی۔ اس کا ظاہری سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اودھ پنچ کے ظریفوں کے دل میں لکھنؤ اور دہلی کی قدیم رقابت کا زخم ہرا تھا اور دوسرے

---

[1] اودھ پنچ میں کلامِ حالی پر جو اعتراضات کا سلسلہ جاری تھا اس کے عنوان میں مندرجۂ ذیل شعر حالی کے وطن کی مناسبت سے لکھا جاتا تھا۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے   میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے   (مؤلف)

جانب داغ کے شاگرد اپنے استاد کی شاعری پر تمام لکھنؤ کو قربان کر چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاگردوں کی بد مذاقی کا خمیازہ غریب استاد کو اٹھانا پڑا اور اودھ پنچ کے صفحوں سے اعتراضات کی چنگاریاں عرصہ تک اڑا کیں جن کا رخ داغ کی شاعری کے علاوہ اس کے حسب نسب اور صورت و سیرت کی طرف بھی تھا۔ ان اعتراضات سے داغ کی شہرت میں فرق نہ آیا مگر تھوڑے زمانہ تک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ قائم رہا۔

اودھ پنچ کا آخری یادگار معرکہ گلزار نسیم کا مباحثہ ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ لکھنؤ کے مشہور فسانہ نویس مولانا شرر نے گلزار نسیم کی زبان اور شاعری پر اعتراض شائع کئے اور اسی کے ساتھ تاریخی حیثیت سے یہ بھی لکھا کہ یہ مثنوی اصل میں آتش کی تصنیف ہے۔ نسیم کا نام محض فرضی ہے۔ اودھ پنچ نے اپنی پرانی وضع کے مطابق ان اعتراضات کا خاکہ اڑایا اور سب سے بڑی گرفت یہ کی کہ اگر یہ مثنوی آتش کی تصنیف ہے تو اس میں زبان اور محاورے کی شرمناک غلطیاں کس طرح نظر آتی ہیں۔ مولانا شرر نے اس اشارہ کو کافی نہ سمجھا اور اس عنوان سے جواب دیا کہ فریقین کی طبیعتیں جوش پر آگئیں اور اودھ پنچ کی لگی ہوئی آگ کچھ ایسی بھڑک اٹھی کہ اس کی آنچ دور دور تک پہنچی۔ گلزار نسیم کا قصہ تو درکنار رہا مولانا شرر کی زبان دانی اور نثر نگاری پر اعتراضات شائع ہونے لگے اور عرصہ تک نظم و نثر کی پھلجھڑیاں چھوٹا کیں۔ یہ سلسلہ بھی سال بھر بعد ختم ہوا۔ اس بحث کے غیر لطیف حصّہ کے علاوہ نفس مضمون کے متعلق جو مضامین نکلے ان میں اکثر زبان و محاورہ کی تحقیقات کا خاص لطف موجود ہے۔ ان مباحث کے علاوہ اکثر دوسرے اخباروں سے بھی اودھ پنچ کی نوک جھونک ہوتی رہی۔ ان میں اودھ اخبار اور طوطیٔ ہند پر اس کی خاص توجہ رہی۔ زبان و شاعری کی اصلاح کے علاوہ اودھ پنچ کی پولیٹیکل خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اودھ پنچ ابتدا سے رعایا کا خادم اور سرکار کا آزاد مشیر تھا۔ کانگریس کے پہلے جو پولیٹیکل معرکہ آرائیاں پیش آئیں ان میں اس نے ہمیشہ رعایا کا ساتھ دیا۔ الحاق اودھ، انکم ٹیکس، البرٹ بل وغیرہ کے متعلق اکثر ایسے مضامین لکھے جن کا آج شائع کرنا موجودہ قوانین کے جکڑ بند کو دیکھتے ہوئے مصلحت اور دور اندیشی کے خلاف معلوم ہوتا ہے اس نے والیانِ ریاست کی خوشامد سے اپنا دامن پاک رکھا اور ہمیشہ ان کی غفلت و عیش پسندی کا پردہ فاش کرتا رہا۔ اودھ پنچ کی قومی محبت کے وسیع دائرہ میں ہندو مسلمان سب شامل تھے۔ ہندوؤں کے تہواروں کی آمد کی خوشی میں اودھ پنچ عید اور شب برأت کے استقبال سے کم سرگرمی نہیں ظاہر کرتا تھا۔ ہولی اور بسنت کے زمانہ میں اس کا پرچہ سرخ اور زعفرانی رنگ کے کاغذ پر شائع ہوتا تھا۔ اور رنگین مزاج نامہ نگاروں کے ساقی نامے اور ترانے وغیرہ ہفتوں تک چھپا کرتے تھے۔ اودھ پنچ ہندو مسلمانوں کے قومی اتفاق کا ہمیشہ سے معین تھا اور اگر دونوں قوموں میں کوئی نزاعی امر پیش نہ ہوتا تھا تو اسے ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس چونکہ قومی اتفاق کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی لہٰذا یہ بھی اس پولیٹیکل تحریک کا دل و جان سے مددگار تھا۔ اس صوبہ میں منشی سجاد حسین مرحوم کانگریس کے رکن تھے اور باوجود بہت سے انقلابات کے جن کے دھکے سے اکثر قدم ڈگمگا گئے منشی صاحب موصوف آخر دم تک اپنی وضع پر قائم رہے۔ ابتدا میں جب سرسید مرحوم نے اپنی زبان و قلم کے جادو سے اہلِ اسلام کا دل کانگریس کی طرف پھیر دیا تھا اس وقت سوائے اودھ پنچ کے کوئی اسلامی اخبار ایسا نہ تھا جو علی گڑھ کے پولیٹیکل پیمبر کا کلمہ نہ پڑھتا ہو۔ ۱۸۸۸ء میں جب سر آکلنڈ کالون، سرسید مرحوم اور مفت کے گنہگار راجہ شیو پرشاد کانگریس کا طبقہ الٹنے کی فکر میں تھے۔ اس وقت ہندوستانی کے مضامین اور پنڈت اجودھیا ناتھ مرحوم کی دھواں دھار تقریروں کے علاوہ اودھ پنچ کی

شمشیر برہنہ اس قومی تحریک کی تائید میں اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں جب کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا تو شہر کے چند سن رسیدہ بزرگوں نے اس کی مخالفت کا غلغلہ بلند کیا۔ اس مخالفت کی تردید میں ہندوستانی اور ایڈووکیٹ میں پند و نصائح کے دفتر کھل گئے، لیکن ان واعظانہ نمائشوں کے مقابلہ میں جو مضمون زیادہ کارگر ہوا جو اودھ پنچ میں "انڈے بچے والی چیل چلہاڑ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اکثر مزاج ایسے ہوتے ہیں، جو بحث و منطق کے کڑوے گھونٹ نہیں قبول کرتے ہیں مگر ظرافت کی چاشنی سے راہِ راست پر آ جاتے ہیں۔ اس صوبہ کے پولٹیکل بحث و تحریک میں اس خدمت کا انجام دینے والا اودھ پنچ تھا۔ مذہبی اور قومی رسم و رواج کی اصلاح کے بارے میں اودھ پنچ کا وطیرہ زمانہ شناسی کی رفتار سے الگ تھا۔ اس نے محض علی گڑھ کے پولٹیکل مسلک کی مخالفت نہیں کی بلکہ سرسید مرحوم کے نورانی دماغ سے جو مذہبی اصلاح کی شعاعیں نکلیں ان پر خاک ڈالنے کی بھی کوشش کی۔ علی گڑھ کالج کو لامذہبی کا مرکز قرار دے کر اس کے بانی کو "پیرِ نیچر" کا خطاب دیا اور "نیچریہ مذہب" کا مضحکہ اڑانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ اسی طرح پردہ کی اصلاح اور تعلیمِ نسواں وغیرہ کے متعلق جو تحریک اہلِ اسلام میں مغربی تہذیب کے اثر سے پیدا ہو گئی تھی اس کی بھی سخت مخالفت کی۔ پردہ کی رسم کی تائید میں حضرت اکبر کا ذیل کا قطعہ زبان زدِ عام ہے ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں　　اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اسے پڑھ کر اصلاح پسند لوگ اپنے دانت پیسا کریں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس سے زیادہ لطیف ظرافت کا نمونہ اودھ پنچ میں مشکل سے ملے گا۔ کاش کہ یہ خداداد جوہر اصلاح و رفاہ کی کوشش میں صرف ہوتا۔

اودھ پنچ کی ترقی و وقعت کا راز بہت کچھ اس کے ایڈیٹر کی ذات سے وابستہ ہے۔ منشی سجاد حسین کا مزاج عجب صفا کا مجموعہ تھا۔ خلقی ذہانت اور طباعی کے علاوہ زندہ دلی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں بھی کبھی کسی نے ان کے چہرہ پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی کی شکن نہ دیکھی۔ بیماری کے زمانہ میں اگر کوئی مزاج پوچھتا تھا تو کہتے تھے کہ زندگی کا عارضہ ہے اور اپنی تکلیفوں کا حال اس طرح بیان کرتے تھے کہ سننے والے کو ہنسی آ جاتی تھی۔ دوا و علاج سے مایوس ہو چکے تھے مگر کہتے تھے کہ یہ سلسلہ محض اس لئے جاری رکھا ہے کہ باضابطہ موت ہو۔ بلا علاج مرنے کو بے ضابطہ مرنا کہتے تھے۔ اس زندہ دلی کے ساتھ تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور رہتے تھے۔ دنیا کے ناہموار دکاداک پہلوان کی نگاہوں میں خود بخود کھٹکنے لگتے تھے اور ان کی یہ مذاق طبیعت کہ بلا لحاظ قوم و ملت بیتاب کر دیتے تھے۔ غیر کا ذکر نہیں ان کے دلی دوستوں اور عزیزوں کو اکثر ان کی بذلہ سنجی کا مزا چکھنا پڑا ہے۔ دوستوں کی محبت اور قدر شناسی کی بدولت انہیں ابتدا ہی میں اتنے ذہین اور طباع نامہ نگار مل گئے جو ایک وقت میں شاید کسی دوسرے اخبار کو کم نصیب ہوتے ہوں گے۔ یہ لوگ محض اودھ پنچ کے نامہ نگار نہ تھے بلکہ اس کے جاں نثاروں میں تھے۔ اسے اپنا اخبار سمجھتے تھے اور کسی دوسرے اخبار میں لکھنا کسرِ شان سمجھتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد یہ رنگ قائم نہ رہا۔ بقول شاعر ؎

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ!
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

دس بارہ سال بعد اودھ پنچ کے شباب کی دوپہر ڈھلنا شروع ہوئی اور اس کے نامہ نگاروں کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا۔ ستم ظریف اور

ہجرؔ نے مرنے سے پہلے ہی لکھنا کم کر دیا تھا۔ جوانی کی بے فکری دوسرے نامہ نگاروں کا ساتھ عرصہ تک نہ دے سکی اور رفتہ رفتہ اودھ پنچ کے صفحے قدیم طرز کے پرانے مضامین سے خالی نظر آنے لگے۔ جو کچھ رہی سہی آب و تاب باقی تھی منشی سجاد حسین کی علالت نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس میں کلام نہیں کہ اس مٹی ہوئی حالت میں بھی اودھ پنچ کا نام بکتا تھا اور جب کبھی کوئی مضمون اس کے ایڈیٹر کے قلم سے نکل جاتا تھا تو اس کی دھوم ہو جاتی تھی۔ علاوہ اس کے کبھی کبھی منشی احمد علی شوقؔ، نواب سید محمد آزادؔ اور حضرت اکبرؔ کے نظم و نثر کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے مگر اودھ پنچ کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ منشی سجاد حسین کی حمیت و غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ جب تک ان کے دم میں دم ہے وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے بند ہوتا دیکھیں مگر واقف کار جانتے ہیں کہ آخر دس بارہ سال میں اودھ پنچ میں سوائے خسارہ کے کوئی نفع کی مد نہ تھی۔ منشی صاحب موصوف نے ایک خط منشی بالمکند گپتا مرحوم کو لکھا تھا جو زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اودھ پنچ کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں :-

"مکرمی! تسلیم

خط پہنچا۔ بہت بجا ہے۔ اودھ پنچ مردہ ہاتھوں سے اس لئے نکلتا ہے کہ کوئی اٹھانے والا نہیں۔ دو ایک سطروں کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہوں نہ منہ سے بول سکتا ہوں۔ کچھ لوگ ہمت کر کے نکال دیتے ہیں۔ دس سال سے فالج میں گرفتار لب گور ہوں۔ جب کسی طرف سے اطمینان نہیں تو کیا انتظام ہو سکے۔ اخبار صرف اس لئے نکالتا ہوں کہ جیتے جی مر نہیں سکتا ورنہ اس عارضہ کے ہاتھوں ع

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اودھ پنچ زندہ اخباروں میں نہیں کہ اس کا ذکر ہو۔ ہاں گذشتہ زمانہ میں کچھ تھا۔"

مگر یہ حالت کب تک قائم رہتی۔ آخر کار مرنے سے دو سال پیشتر شکستہ دل ایڈیٹر کو اودھ پنچ کا جنازہ اپنے مردہ ہاتھوں سے اٹھانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ضعیف جسم میں خون کے دس بیس قطرے ضرور تھے مگر گرہ میں ایک پیسہ نہ تھا۔ اودھ پنچ چلتا تو کس طرح چلتا۔ گو کہ باوضع ایڈیٹر کی باوجود لب گور ہونے کے یہ تمنا ضرور تھی کہ ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

خیر اودھ پنچ کا جاری رہنا تو درکنار، یہ وہ نازک زمانہ تھا کہ اگر اودھ کا ایک عالی ظرف رئیس جس کی فیاضی ضرب المثل ہے دستگیری نہ کرتا اور دو ایک پرانے دوستوں کی محبت شریکِ حال نہ ہوتی تو شاید اودھ پنچ کا ایڈیٹر نان شبینہ کا محتاج رہ کر دنیا سے سدھارتا۔ غرضیکہ چھتیس سال تک زبان اور قوم کی خدمت کر کے اودھ پنچ نے دنیا کو خیر باد کہا۔ اس وقت اردو زبان میں بہت سے قابلِ قدر اخبار موجود ہیں مگر اودھ پنچ کی جگہ خالی ہے اور زمانہ کا رنگ کہہ رہا ہے کہ عرصہ تک یہ جگہ خالی رہے گی۔ مگر اردو زبان کی تاریخ میں یہ زندہ دلی کا افسانہ ایک یادگار افسانہ ہے اور اس کی یاد قدر دانوں کے دلوں سے آسانی سے فراموش نہیں ہو سکتی۔ آج اودھ پنچ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں مگر اس کے تذکرے سے سخن سنجوں کی محفل خالی نہیں ؎

پھر گئے آنکھوں میں مشتاقِ گذشتہ نشہ میں
دورِ جام مے میں اکثر ذکرِ خیرِ جم ہوا

اودھ پنچ

اکبر الہ آبادی

اے گوہرِ مخزنِ ظرافت   وے جوہرِ معدنِ لطافت
سرمایۂ انبساطِ خاطر   تسکینِ دل و نشاطِ خاطر
دیباچۂ دفترِ فصاحت   عنوانِ صحیفۂ بلاغت
خلّاقِ معانیٔ طرب خیز   کشّافِ رموزِ عشرت انگیز
ہادیٔ ادیب و دانش آموز   گوہر افشاں و گوہر اندوز
زینت دہِ شاہدِ تکلّم   آئینۂ خندہ و تبسّم
سرچشمۂ قول و وعظ و گفتار   گنجینۂ وعظ و پند و اسرار
اے فخر دہِ زبانِ اُردو   وے اوج دہِ نشانِ اُردو
رنگینی میں غیرتِ گلستاں   شوخی میں حریفِ برقِ تاباں
کیا خوب ہے نسخۂ اودھ پنچ   محبوب ہے نسخۂ اودھ پنچ
دن رات یہی ہیں اب تو چرچے   پرچاتے ہیں دل کو اس کے پرچے
ہے خلقِ خدا قتیل اس کی   حاسد کا حسد دلیل اس کی
معقول مزاح ہے تو یہ ہے   شرعاً جو مباح ہے تو یہ ہے
ہر چند کہ رجز بیشتر ہے   گو فقرۂ طعن نیشتر ہے
لیکن وہ قند میں گھلا ہے   یہ آبِ حیات میں بجھا ہے
وہ شربتِ حفظِ عقل و ایماں   یہ مژدہ دلوں کو ہے رگِ جاں
بگڑے ہوئے بن گئے ہنسی میں   حکمت ہے تو ایسی دل لگی میں
ہر کس کہ بدید گفت خوب است   باللہ مفرح القلوب است
رندوں کی زباں ہیں پند دلخواہ   سبحان اللہ واہ وا واہ

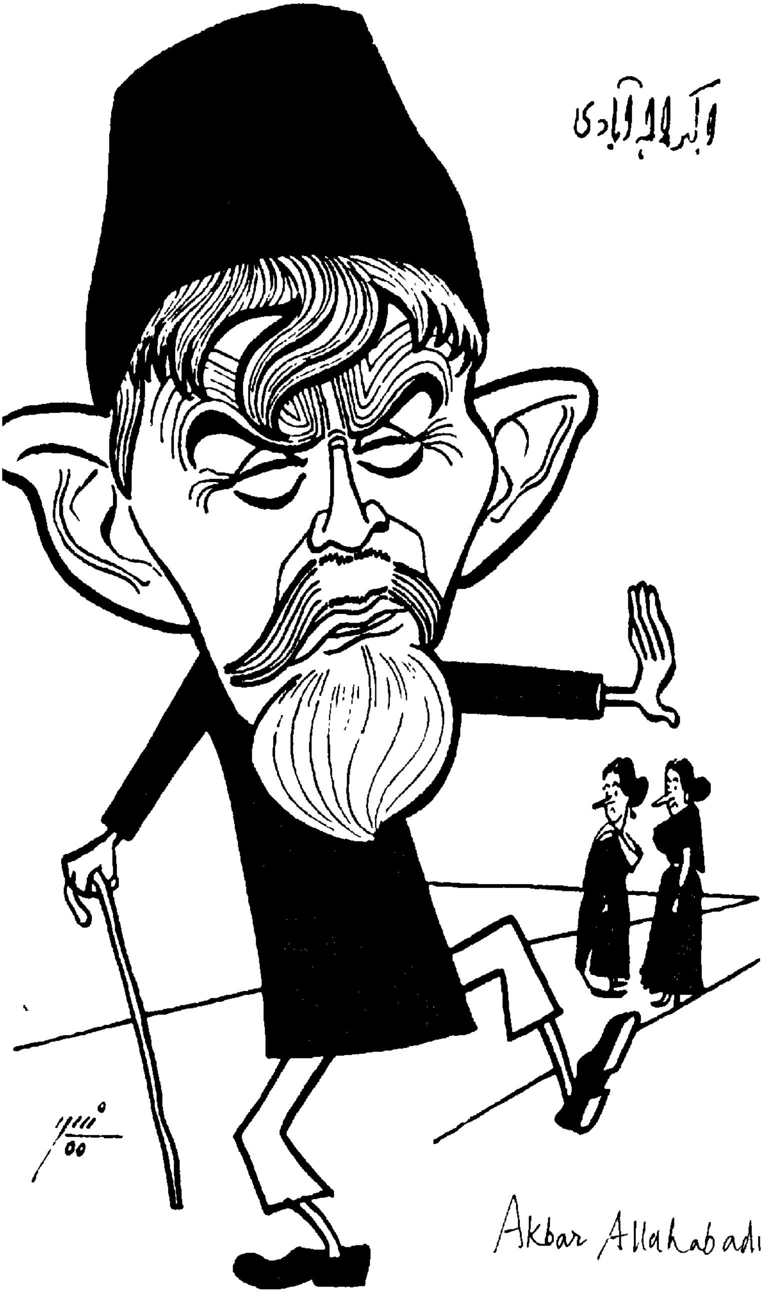

اکبر الہ آبادی

Akbar Allahabadi

ہر چند کہ طرزِ پنچ لندن   بے شبہ ہے دلپسند و پُرفن
لیکن وہ نقشِ اوّلیں ہے   نسبت اس سے اسے نہیں ہے
ماشاء اللہ یہ نقشِ ثانی   بہتر ہے بصورت و معانی
وہ پیرِ معمر و کہن سال   یہ خیر سے نونہال اقبال
وہ اک گلِ صد بہار دیدہ   یہ غنچۂ تازہ نو دمیدہ
مولودِ سعید مریم طبع   عیسیٰ دم و گوہرِ یم طبع
لطفِ شامِ اودھ ہے اس سے   روشن نامِ اودھ ہے اس سے
اک نور ہے مہرِ لکھنؤ کا   اختر ہے سپہرِ لکھنؤ کا
وہ سرد برنگِ آتشِ گل   یہ گرم بسانِ آہِ بلبل !
بحثِ مضموں میں وہ اگر پیچ   یہ حلِ نکات میں ہے سر پیچ
واں بازوئے تاز سست بنیاد   یہاں خامۂ نیزۂ چمن زاد
کیسا خامہ زبانِ معنی   کیا ذکر زباں کہ جانِ معنی
اٹھنے میں نگاہِ چشمِ جادو   چلنے میں حریفِ تیغِ ابرو
مفتاحِ خزینۂ تصوّر   نقاشِ نگینۂ تصوّر
کہنا اسے شمع کب روا ہے   اوصاف میں شمع سے سوا ہے
وہ چہرہ نمائے بزمِ صورت   یہ پردہ برافگنِ حقیقت
ہر چند کہ سرمہ در گلو ہے   تاہم سرگرمِ گفتگو ہے
رعنا و لطیف و شوخ و بیباک   سرگرم و حریف و چست و چالاک
مشاطۂ شاہدِ معانی   بانیِ بنائے خوش بیانی
پیچیدگیوں میں حرف زن ہے   شانہ کشِ گیسوئے سخن ہے
آزادی کا فخر اسے اگر ہے   یہاں فخر اس سے زیادہ تر ہے
یعنی کہ وہ مطلق العناں ہے   بے قید ہر ایک سو رواں ہے
واں طبع کو زورِ لاتخف ہے   دقّت تو جو ہے وہ اس طرف ہے
زنجیرِ خرد کی پائے بندی   باقاعدہ شرعِ دردمندی
تارِ نظرِ حسودِ بدکیش   ہر گام پہ مثلِ دام درپیش
کوتہ نظران پست فطرت   سرگرمِ شرارت و عداوت
وہاں شاخِ شجر پہ ہے ترانہ   یہاں دیدۂ دام آشیانہ

کیونکر نہ ہو ادعائے اعجاز   کھولے ہیں قفس میں بال پرواز
کی سیرِ دو عالم اک نفس میں   پھر دیکھیے تو اسی قفس میں
دریا قطرے میں موجزن ہے   غنچے میں بہار صد چمن ہے
ہے نوکِ سناں پہ نقش پرواز   رقصاں دمِ تیغ پر بہ صد ناز
شعلوں کے ہجوم میں سمندر   امواج میں ماہئ قوی پر
کیا کثرتِ خار سے خطر ہے   یاں دوشِ نسیم پر سفر ہے
پابندی کا کب ہے یہاں تاسف   یوسف زنداں میں بھی ہے یوسف
جلوہ ہے وہی وہی تجلّی   شوکت ہے وہی وہی تعلّی
پابند جو یوسفِ سخن ہے   پھیلی ہوئی بوئے پیرہن ہے
ہر رنگ میں ہے بہارِ معنی   ہر لفظ ہے پردہ دارِ معنی
ہر نقطہ ہے نکتۂ بصیرت   ہر حرف ہے کاشفِ حقیقت
صرصر کے جور سے بری ہے   یہ شاخ خزاں میں بھی ہری ہے
آپ اپنے فروغ کا سبب ہے   محتاج برنگ ماہ کب ہے
وہ مہرِ فلک سے منفعل ہے   یہاں روشنیٔ دماغ و دل ہے
دریوزہ گری پہ اس کی اوقات   یہاں قطب صفت ثبات دن رات
جن سے آسیب کا تھا کھٹکا   ان دیووں نے خوب سر کو پٹکا
غالب تھا اثر میں اسم اس کا   ٹوٹا نہ کبھی طلسم اس کا
ہوتے نہ جو زنگ سے وہ بیچین   حساد بھی صاد کرتے بالعین
سنیے اک اور نکتۂ خوب   آزادیٔ گفتگو ہے معیوب
لاتا ہوں دلیل شاعرانہ   دیکھو قدرت کا کارخانہ
منہ کے اندر زباں جڑی ہے   دانتوں کے حصار میں پڑی ہے
بتیس جوان سخت طینت   استادہ ہیں مائلِ اذیّت
ہیں مثلِ سفید دیو بیباک   ظالم جابر حریص سفّاک
حد سے جو بڑھے زبانِ گفتار   دوڑیں اسے کاٹنے یہ خونخوار
پہلو میں جوان کے ہمنشیں ہو   وہ نوکِ خلال سے حزیں ہو
کتنا ہی ہو وہ ملائم و تر   دانا پستا ہے ان میں آ کر
لوہے کے چنے کہاں سے لائیں   سختی کا انہیں مزا چکھائیں

اس قید میں جبکہ یہ زباں ہے   آزادیٔ گفتگو کہاں ہے
باریک ہے گو یہ نکتہ اے دل   لازم ہے سمجھ لیں اس سے عاقل
مرضی تھی خدائے جسم و جاں کی   محدود ہوں شوخیاں زباں کی
دل میں جو آئے بک نہ جاؤ   ہشیار چلو بہک نہ جاؤ
دریائے خیال موجزن ہے   وقف یزداں و اہرمن ہے
ہے شارعِ عام حق و باطل   ناظر اس کی ہے فکرِ عاقل
گذرے جو خیال بد بلا کد   بازوئے خرد سے بس کرو رد
باطل پہ نہ جاؤ حق کو سُن لو   کانٹوں کو ہٹا کے پھُول چُن لو
خاموش بس اے زبانِ خامہ   منظورِ نظر ہے ختمِ نامہ
ہر چند یہ عالمِ سخن ہے   یہاں فیضِ ازل ضیا فگن ہے
ہر گوشے میں وسعتِ فلک ہے   ہر ذرّے میں مہر کی چمک ہے
ہر گام پہ ہیں چمن ہزاروں   اک اک میں گلِ سخن ہزاروں
ہر برگِ گلِ سخن میں سو رنگ   ہر رنگ میں لاکھ لاکھ نیرنگ
نیرنگ ایسے کہ عقل حیراں   حیرت ایسی کہ نورِ عرفاں!
ہر سمت ہزار میکدے ہیں   ہر ایک میں لاکھ خُم بھرے ہیں!
ہر خُم میں شرابِ ارغوانی   یعنی رنگینیٔ معانی !
یک قطرہ سے طبع ہو جو ممتاز   سینہ بن جائے مخزنِ راز
وہ راز کہ دل ہو محوِ مستی   مائل ہو سوئے سخن پرستی !
ہو طول جو سلسلہ سخن کا   ہمسر ہو زلفِ پرشکن کا
پر طولِ بیاں سے فائدہ کیا   اس صرفِ زباں سے فائدہ کیا
بس بس اب روک لے زباں کو   کافی ہے اشارہ نکتہ داں کو
ہو کر آمادہ جان و دل سے   ہو محوِ دعا زبان و دل سے
جب تک ہے رباعی عناصر   رنگینیٔ نقش لوحِ خاطر
جب تک کہ یہ نظم بیتِ ہستی   موزوں ہے برائے خود پرستی
جب تک ہے مسدّس جوانب   برہانِ مشارق و مغارب
جب تک کہ ہے روح کا لطیفہ   انفاس کا ہر نفس وظیفہ
یہ پرچہ دلفریب و زیبا   ہو مونسِ جانِ ناشکیبا

ہر رنگ میں انتخاب نکلے   ہر جائے میں لا جواب نکلے
ہو سوزِ دلِ یگانہ و غیر   بن جائے چراغِ کعبہ و دیر
جب تک کہ اثر ہے کاف و نوں کا   مفتون ہو ہر ایک اس فسوں کا
پروانہ اسے چراغ سمجھے   بلبل دیکھے تو باغ سمجھے
خورشید کا نور میں ظرف ہو   ذرّوں کی کشش اسی طرف ہو
اے حافظ و خالقِ اودھ پنچ   خوشدل رہیں عاشقِ اودھ پنچ
اپنی اپنی مراد پائیں   دیکھیں جب دل کو شاد پائیں
ہر مشتریؔ بلند فطرت   پائے دورِ قمر میں رفعت
محتاج ہو سیم کا نہ زر کا   مورد ہو بلندئ نظر کا
احباب جو اس کے ہیں معاون   عالی منشان نیک باطن
ظرّاف و مصنفِ لطائف   طبّاع و مصوّرِ کوائف
سر سبز ہوں گلشنِ جہاں میں   خرّم پھریں باغ و بوستاں میں
رنگین طبعی سے گل کھلائیں   چشمِ بدبیں کو خون رلائیں
پیدا ہوں وہ گوہرِ مضامیں   دریا کے ہو لب پہ شورِ تحسیں
بے ساختہ بول اٹھیں سخن ور
اللہ ری طبع و فکرِ اکبر

(اودھ پنچ ۱۴ مئی ۱۸۷۸ء)

اودھ پنچ کا ایک شمارہ

(جنوری سنہ ۱۸۷۸ء)

یہ پرچہ سنہ ۱۸۷۷ء میں نکلا تھا۔ صفحہ ۲۶۵ سے لے کر صفحہ ۲۸۰ تک اس کا ایک پورا شمارہ (ٹائٹل سمیت) حرف بہ حرف پیش کیا جا رہا ہے۔ اقتباسات سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ معلوم کر سکیں کہ پرچہ بحیثیت مجموعی کیسا تھا۔ اسی لئے ایک پورا شمارہ من و عن پیش کیا جا رہا ہے۔

پرچے کا سائز ۱۲" × ۹½"، سطریں ۳۵، کالم تین اور صفحے آٹھ ہوتے تھے۔

مضامین سالِ نو مرسلہ مضمون نگاران

یکے ہمی رود و دیگرے ہمی آید

اے لو صاحب میاں ۱۸۷۷ء بھی سوتے جمعہ نفروا الی اللہ ہوئے۔ سال بھر خوب کڑے کئے، رتیں گانٹھیں، گلے کاٹے، بارہ مہینے کے اندر لاکھوں شعبدے، سینکڑوں کرشمے دکھلائے، گاؤں کے گاؤں صاف کر دیئے، شہر کے شہر تباہ کر دیئے۔ کبھی بوند بوند بھر پانی کو ترسایا، کہیں قحط کی آگ نے آ کسی کا نزلہ جھاڑا، کسی کو قرضدار کیا، کسی کو غرقی بندھوا دی، کسی کو خطاب دلوایا، کسی کی تسلک منظر کرائی، کسی کو ٹکی کا نواب بنایا۔ کبھی دلّی کو رونق دی کبھی آگرہ کو۔ روم و روس میں جُدا چلوا دی، سرحد پہ الگ ہش فش کرا دی اور پھر نیکنام کے نیکنام بلکہ سب سے کھرے رہے اٹھارہ سو چھہتر بھائیوں میں سب سے نمبر اوّل۔ جتنے سنہ گئے ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ نہ نام لیوا، نہ پانی دیوا۔ نہ آل نہ اولاد، ناشاد و نامراد۔ یہ تو سلامتی سے بیسیوں یادگار بھی ایسے چھوڑ گئے کہ باید و شاید۔ خطاب قیصرِ ہند، الحاق اودھ، جنگِ روم و روس، غرض کیا کیا خوب آدمی تھے خدا مغفرت کرے۔ اب ان کے بھائی صاحب سنہ اٹھارہ سو اٹھہتر جی کی آمد آمد ہے۔ ان کا وزن بھی دیکھنا ہے۔ کس پہلو پر جاتے ہیں۔ ہم لوگوں سے کیونکر برتا ؤ رہتا ہے۔

ح۔ ن

زباں گھس گئی اپنی دن گنتے گنتے بڑی راہ دکھلائی حضرت سلامت
بھلے کو حضور اب بھی تشریف لائے مبارک مبارک سلامت سلامت

السلام علیک یا سنۃ الثمانیہ وسبعین! مرحبا لکم یا ایہا الحمق الذین۔ خیر مقدم ؎

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

ول مسٹر ۱۸۷۸ء ویلکم۔ خوش آمدی، صفا آوردی ؎

اٹکھیلیوں سے چل کے نہ غمزے دکھائیے مرشد کہا تھا آپ نے تشریف لائیے

آہاہاہاہاہا۔ آیئے آیئے، قدم رنجہ فرمایئے۔ بڑی راہ دکھلائی، بعد مدت سواری آئی۔ آنکھیں ڈھونڈتی تھیں۔ بانسوں میں کنوئیں و کوؤں میں بانس ڈال دیئے۔ بارے بڑی مشکلوں سے خدا خدا کرکے جب اللہ پیر منائے تب جمال باکمال نظر آیا اور قدم مبارک دیکھنے میں آئے۔ پناہ تیری، ہر لحظہ چشم براہ اور ہر ساعت دروازے پر نگاہ تھی۔ دن گنتے تھے، گھڑیاں شمار کرتے تھے۔ سینکڑوں جگہ فالیں کھلوائیں، ہزاروں گردنامے لکھوائے، درگاہ میں چوکی بھری، امام باڑوں میں چہل منبری کی، مسجدوں میں چراغ جلائے، گرجوں میں گھنٹے بجائے۔ مندروں شوالوں میں ناک گھسنی کی۔ سر کی ٹیک کر گرے، بھتیاں بھوانی میں لے کرما کرتے پھرے۔ اب اللہ میاں کے گلگلے، رحم مولا مشکل کشا کا، کھڑا دونا حضرت عباس کی حاضری پہ دیدار کے کونڈے، سید احمد کبیر کی گائے، شیخ سدّو کا بکرا، پیر ہٹیلے کا مرغا، شاہ عبدالحق کا توشہ، بی ٹرت پھرت کی پوڑیا، کشتی کی صحنک، بی آسا کا کاسہ، سرمد کا ملیدا، دریاؤ پری کا طبق، خواجہ خضر کا بیڑا، ازیں قبیل اور بھی وغیرہ وغیرہ منتیں مرادیں مانیں کہ خدا سے یہ گھڑی دکھلائی۔ منہ مانگی مراد پائی۔ لیجیے تاشے مرفے تڑتڑ دھم دھم دھم دھم۔ تڑتڑ دھم دھم دھم دھم، نوبت خانے جھنگڑ جھنگڑ، ڈینگ ڈینگ ادھر نرسہی قرنا، دھوتو دھوتو، ساتھوں ساتھ انگریزی باجے والے، ہل ہل بنیا کو جاتے رہی۔ نندیا تماری ری ری ری ری رم تماری ری ری ری رم۔

مضامین سالِ نو مرسلہ مضمون نگاران

یکے ہمی رود و دیگرے ہمی آید

اے لو صاحب میاں ۱۸۷۷ء بھی سوتے جمعہ لقروالی اللہ ہوئے، رسال بھر خوب کوڑے کیے، ترقیں گانٹھیں گلے کاٹے، بارہ مہینے کے اندر اندر لاکھوں شعبدے، سینکڑوں کرشمے دکھلائے، گاؤں کے گاؤں صاف کر دیے، شہر کے شہر تباہ کر دیے۔ کبھی بوند بوند بھر پانی کو ترسایا، کہیں قحط کی دہائی کئے، کسی کا نزلہ جھاڑا، کسی کو ترصندار کیا، کسی کو عزتی بندھوادی، کسی کو خطاب دلوایا، کسی کی تنخواہ مقرر کرائی، کسی کو مٹی کا لقا بنایا۔ کبھی دلی کو رونق دی، کبھی آگرہ کو۔ روم و روس میں جا اچلوادی، سرحد پر الگ ٹنٹش فش کرا دی اور پھر نیلام کے نیلام ملک سب کے کھڑے رہے۔

اٹھارہ سو چھہتر بھائیوں میں سب سے نمبر اول جتنے سن گئے ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ، نہ نام لیوا، نہ پانی دیوا۔ نہ آل نہ اولاد، نا شاد و نامراد۔ یہ تو سلامتی سے بیسیوں یادگار بھی ایسے چھوڑ گئے کہ باید و شاید۔ خطاب قیصر ہند، الحاق اودھ، جنگ روم و روس، غرضکہ کیا خوب آدمی تھے خدا مغفرت کرے۔ اب ان کے بھائی صاحب سنہ اٹھارہ سو اٹھتر جی کی آمد آمد ہے۔ ان کا ذہن بھی دیکھا ہے کس پہلو پر جانتے ہیں۔ ہم لوگوں سے کیونکر برتاؤ رہتا ہے۔ ج۔ ن

زباں گھس گئی اپنی دن گنتے گنتے بڑی راہ دکھلائی حضرت سلامت
بھلے کو حضور اب بھی تشریف لائے مبارک مبارک سلامت سلامت

السلام علیک یا سنۃ الثمانیہ والسبعین! مرحبا لکم یا ایہا الاحمق الذین۔ خیر مقدم ~

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

دل مطر شدہ دیل کم۔ خوش آمدی، صفا آوردی ~

انکھیوں سے چل کے نظریں دکھائیے مرشد کہا تھا آئیے تشریف لائیے

آہاہاہاہاہا۔ آئیے آئیے، قدم رنجہ فرمائیے۔ بڑی راہ دکھلائی، بعد مدت سواری آئی۔ آنکھیں ڈھونڈتی تھیں۔ بانسوں میں کنوئیں اور کوڈوں میں بانس ڈال دیے۔ بارے بڑی مشکلوں سے خدا خدا کر کے حبیب اللہ پیر منائے تب جمال باکمال نظر آیا اور قدم مبارک دیکھنے میں آئے۔ پناہ تیری، ہر لحظہ چشم براہ اور ہر ساعت دروازے پر نگاہ تھی۔ دن گنتے تھے، گھڑیاں شمار کرتے تھے۔ سینکڑوں جگہ فالیں کھلوائیں، ہزاروں گنڈے لکھوائے، درگاہ میں چوکی بھری، امام باڑوں میں چہل منبری کی، مسجدوں میں چراغ جلائے، گرجوں میں گھنٹے بجائے۔ مندروں شوالوں میں ناک گھسنی کی۔ سری ٹیک کو گرے، بھتیاں بھوانی جی لے کر ماکرتے پھرے۔ اب اللہ میاں کے گلگلے، رحم مولا مشکل کشا کا، کھڑا دونا حضرت عباس کی حاضری، پردیدار کے کونڈے، سید احمد کبیر کی گائے، شیخ سدو کا بکرا، پیر ہتیلے کا مرغا، شاہ عبدالحق کا توشہ، بی ترت پھرت کی پڑیا۔ کشتی کی صحنک، بی آسا کا کاسہ، سرمد کا لیدا، دریا پیر کا طبق، خواجہ خضر کا بیڑا، ازیں قبیل اور بھی وغیرہ وغیرہ منتیں مرادیں مانیں کہ خدا نے یہ گھڑی دکھلائی، منہ مانگی مراد پائی۔ بجے تاشے مرفے۔ تڑ تڑ تڑ جھیم جھیم۔ تڑ تڑ تڑ جھیم جھیم، نوبت خانے جھنگڑ جھنگڑ، ڈینگ ڈینگ، ادھر نرسی قرنا، دھوتو دھوتو، ساتھوں ساتھ انگریزی باجے والے، ہل پل پنیا کو جائے ری۔ ندیا تناری ری ری ری رم تنا دی ری ری ری ری رم

رنڈیاں منڈیاں، بھانڈ بھگتیے، کلاونت، قوال ایک سال مل کر بڑے اونچے سُروں میں مبارکباد ؎

دھوم سے آیا نیا سال مبارک باشد — خوش ہیں سب ہند کے کنگال مبارک باشد
رہ گئے ڈھانچ فقط سوکھ کے انجر پنجر — ہڈیوں پہ ہے فقط کھال مبارک باشد
سن سنتر کی بدولت ہوئی جنتا گنجی — جھڑ گئے سر سے سبھی بال مبارک باشد
پانی سب مانگتی تھی خلق ٹڈی کی طرح — مینہ برستے ہی اوڑا کال مبارک باشد
کچھ تعجب نہیں سر پیٹیں دھڑا دھڑ بنیے — اپنا سر نوچیں گے بقال مبارک باشد
آٹے دال کو کوئی ترائے تو بجا جائے — خوب جوتوں میں بٹے دال مبارک باشد
سال بھر رنج اٹھائے ہیں الٰہی توبہ — اب تو غارت ہوا چنڈال مبارک باشد
پیٹ سینہ و رملا جا ہے طمانچے مارے — منہ بھر نکل کیا لال مبارک باشد

خیر یہ بات ددمات۔ گذشتہ را صلوات، آیئے: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ تسلیم۔ تسلیم۔ تسلیم۔ کہیے مزاج مبارک، مزاج شریف، مزاج مقدس۔ بہت مزاج اچھا۔ الحمد للہ۔ آپ کی عنایت، نوازش، مہربانی۔ دعا کرتا ہوں۔ سب طرح خیریت ہے۔ اپنے مزاج کی کیفیت بیان فرمایئے۔ شکر ہے لاکھ لاکھ شکر ہے۔ لیکن مجبوری درجہ کو۔ جو دم ہے غنیمت ہے۔ آپ کا سر بجائے قدموں کے جھوٹ کہوں تو کسی اور کی آنکھیں پھوٹیں آپ کو زندہ دیکھ لیا۔ چار آنکھیں ہو گئیں۔ اس کی امید بھی کسی حلال خور کو ہو گی، دن کو تارے نظر آتے تھے۔ اے ہے پھر خیال آگیا۔ تعوذ تعوذ سات قرآن درمیان۔ نادِ علیاً مظہر العجائب۔ الخ۔ ہاتھ لایئے۔ دیکھیے تصور سے کلیجے میں پنکھے لگ گئے۔ دل ہے یا گھنٹہ گھڑی۔ لے لو خود بخود بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ نیا سال آخر ہے کیا، کچھ فرمایئے۔ توبہ ذکر کس کا ہے اور آپ اس قدر ڈرے ہوئے کیوں ہیں۔ ان کا نام تو لیجیے، وہ ایسے کون حضرت ہیں۔ ارے رے رے۔ خدا بچاوے۔ اس نادے کا نام کون لے۔ سات سمندر پار اس کا منہ اُدھر ہی رہے۔ لی خمسۃ اطفی بہا —— الخ —— پھر وہی بندہ نواز نام تو لیجیے۔ نہیں نہیں صاحب معاف کیجیے۔ میں تو ہزار برس تک نام نہ لوں گا چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ اچھا اشارے کنائے میں کسی نہ کسی طرح کہیے تو سہی۔ اچھا سمجھ جایئے۔ ز ع ض غ۔ اب اور آفت میں جان پڑی۔ بقول شخصے ؎

شامت کی ماران سے کیا غیر کا گلہ — اندازِ گفتگو نہیں تیور بدل گئے

آنکھ اٹھا کے جو دیکھا تو ایک ایک ہونٹ سوا پانچ پانچ سیر کا۔ نہایت رنجیدہ چیں بر جبیں۔ آئیں خیر باشد۔ آپ ناخوش ہوئے جی نہیں میں کیوں خفا ہونے لگا لیکن خوشی کا بھی کوئی مقام نہیں۔ یہ جن کا نام آپ لیتے ہیں اور اس قدر تعریفیں کیں وہ حضرت میرے بڑے بھائی صاحب ہیں اور آپ کا کیا بگاڑا جو اس قدر آپ آزردہ ہیں۔ قبلہ بندہ خدانخواستہ میرا کیا بگاڑا۔ ہاں تمام دنیا کی حیثیت بگاڑ دی۔ تقصیر معاف بُرا نہ مانیے گا آپ کے بھائی صاحب بڑے قصائی تھے بلکہ چنگیز خاں کہیے تو بجا ہے۔ خدا بچائے اک سرے سے جھاڑو پھیر کر صفایا بول دیا۔ قیامت برپا کی۔ ایک بات ہو تو کہوں روم روس کی لڑائی۔ ہندوستان پر مہنگی کی چڑھائی۔ پھر ایک جگہ نہیں، عالمگیر۔ ملک آئین میں ٹکس کی آفت۔ عرب اور عجم پر المان کی مصیبت۔ انگلستان بنیوں کے مارے ناک میں دم۔ ہر بار دلّی یا کانپور والی دروسا کرنے کو جی چاہتا تھا۔ چلتے جب دم ہلی رنگتی تھی اور بالکل جانہار تھے تو ہزاروں بچے معصوم ریگان جنت بتلا کی معرفت چٹ کر گئے اور سانس ڈکار بھی نہ لی اور

اگر کوئی ضدی یا چالاک لوٹ پوٹ کے بیچ بھی گیا تو صورت بگاڑ دی۔ منہ کیا بھڑ کا چھتا ہو گیا بس یہی نا؟ اب آپ کہہ چکے۔ اللہ اللہ یہ آپ کے نزدیک کچھ بات ہی نہ ہوتی۔ کیا چپکے سے بس کہہ دیا اور کیا طوفانِ نوح آ جاتا تو آپ جانتے یا حضرت اسرافیل کا صور پھنکتا تو خوش ہوتے یہ نہیں جہاں اس قدر برائیاں تھیں کوئی اچھی بات بھی تھی۔ اچھی بات کی ایک ہی کہی۔ کوئی آپ ہی بیان کیجیے۔ میں نے تو نہیں دیکھا مگر کانوں سُنا ہے۔ یہ دربار قیصری کی خوشی کیا کم تھی۔ میرے ذہنِ ناقص میں جتنی باتیں ہوئیں وہ ہی دوستی کے آگے کچھ نہیں۔ واہ واہ وہ بھی کچھ ان کا احسان نہیں اوّل تو وہ سنہ ۱۸۷۶ء کے دم سے شروع ہوا تھا۔ دوسرے ایک دن تھوڑا سا برائے نام ہنس لئے پھر سال بھر برابر رونا پیٹنا رہا۔ ہاں یہ شکر کا مقام ہے کہ خدا نے جان بچائی۔ خیر اب ان باتوں سے کیا۔ میں اور زیادہ تو کہہ نہیں سکتا لیکن اگر منظور خدا ہے تو یہ ناچیز آپ کو ایسا راضی کرے کہ نہایت خوش ہو جیے اور بہت دنوں کو یاد کیجیے۔ اللہ رے۔ بات چیت تو بے ڈھب ہے۔ ابھی سے آپ فرماتے ہیں کہ ایسا راضی کروں گا کہ بھول جائیے گفتگو دوغلی ہے۔ لیکن خیر خدائے ما بزرگ است۔ چناں نماند و چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند۔

ستم ظریف!

گلدستہ

بہار آئی ہے پھولے چمن، شجر ہیں نہال   ہرے ہیں سبزے سے جنگل، گلوں سے گلشن لال
چمن کو پھول مبارک ہوں، پھول کو خوشبو   اودھ کو پنچ، اودھ پنچ کو یہ دوسرا سال
مزا عجب ہے کچھ اس پرچے میں کہ صورتِ طفل   جوان و پیر کے منہ سے ٹپک رہی ہے رال
ہرت کعب نرالی ہے سج، نرالی دھج   خدا گواہ نیا سکّہ ہے نئی ٹکسال
یہ بول چال جدا ہے یہ چال ڈھال جدا   جدا سخن کی روش ہے جدا یہ طرزِ مقال
ہیں لوگ جھومتے یوں قیل و قال پر اس کے   کہ جس طرح کسی صوفی کو آتے بزم میں حال
معاندین نے ٹپکا بہت سر اس کے لئے   مگر تراش خراش اس کی پائیں یہ کیا مجال
کہاں یہ فوقِ سما اور کہاں وہ تحتِ ثریٰ   کجا براقِ نبیؐ اور کجا خرِ دجال؟
ہے ابتدا ہی میں اس کے بس انتہا کا مزا   خدا کی شان مہِ نو میں حسنِ بدرِ کمال!
ہوا شروع زمانے میں جس برس اس کا   عجب سعید تھا الحق وہ سالِ فرخ حال
اودھ کے چیف کمشنر کا بڑھ گیا عہدہ   کہ لفٹیننٹ گورنر ہوئے ہیں وہ امسال
ہوئی ترقی فرماں روائے انگلستان   خطابِ قیصری پایا بدولتِ اقبال
جو ہندیوں کو ہوئی اس خطاب کی شادی   زبانِ ناطقہ اس کے بیان میں ہے لال
ہزاروں راہ میں کھوئے کروڑہا نذر دیئے   امید یہ تھی فزوں ہوگا اپنا جاہ و جلال
مگر زبانی ہی تھا جمع و خرچ جتنے کئے   گرہ کے ہاتھ سے مال آپ ہو گئے پامال
کسی امیر کو تو توپ کی سلامی ملی   دیا کسی کو فقط اک خطاب ہی پر ٹال

پلٹ کے واں سے بہت خاک پھانکتے آئے   یہ سمجھے تب کہ نہ اچھا ہوا کچھ اس کا مآل!
غرض جو آنکھ کھلی پنچ شاخہ ہاتھ میں تھا   برات ڈھونڈتے پھرتے سب یہ تھا احوال
یہ وقت تھا تقاضا کہ سالِ قیصر یہ   ہو اہلِ ہند کے خاطر سرور و عیش کا سال
مگر غضب ہوا لینے کے پڑ گئے دینے   ہزاروں آفتیں تھیں اس جلوس کے دُنبال

اسی کے بیچ سے باہم یہ کچھ فساد ہوا   کہ روم روس کے ٹھنتی ہے جوتیوں میں دال
تمام ہند میں برپا ہوئی اک آفت سی   اودھ میں قلتِ باراں تو میڈراس میں کال
خطاب دیتے ہی ملحق کیا اودھ کو اُدھر   ذرا نہ سوچے کیا پہلے چومے کاٹا گال!
سُنا ہے اس کی ہوئی ہے اپیل لندن میں   بقول شخصے مگر یاں گھڑی میں ہے گھڑیال!
خدایا فضل و کرم اپنا کیجیو ہم پر   عجیب ضیق میں ہے جان پھنس گئی فی الحال!
الٰہی دور جہاں سے ہو حکمتِ عملی   یہ وہ بلا ہے کہ جو کھینچتی ہے بال کی کھال
جہاں میں اپنے اودھ پنچ کو سلامت رکھ   اس آفتاب پہ آئے نہ تا بہ حشر زوال
زمانے میں رہیں اس کے عدو ہمیشہ تنگ   جہاں میں اس کے معاون رہیں سدا خوشحال

ت-ن-ہجر

سالِ نو، اودھ پنچ

بادۂ احمر لا دے ساقی   اب تو پھول پلا دے ساقی
پھول نہ ہو تو ٹھرّا لا دے   خم کو اٹھا کر منہ سے لگا دے
ہو جو نہ ٹھرّا تاڑی دے دے   سیندھی لا کے پہاڑی دیدے
سیندھی میں بھی ہو جو بہانا   لانا لانا بھنگ ہی لانا
سبزی پی کر خوب بنے گی   دیکھنا کیسی گاڑھی چھنے گی
سبز قدموں سے کام پڑا ہے   ہند میں اک کہرام پڑا ہے
اس میں بھی ہو جو غرّہ دینا   دینا دینا طرّہ دینا
چھینٹے دے کر ہم کو نہ دم دے   چٹ پٹ بھر کر ایک چلم دے
کابل سے ہم گرزک منگائیں   جا کے بخارا دھوئیں اڑائیں
کش کوئی دینا تُنک کا دینا   لانا بھبھنٹا مُدک کا دینا
فکر نہ کر تو اِس کی اُس کی   افیون کی اک دے دے چُسکی
دیکھ تو ہم نے کیا کیا مانا   پھر بھی ہم سے آنکھیں چرانا

نخرا ہے تیرا ساقن ٹیڑھا   ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا
نشا جما دے دام نہ مانگ   پاس نہیں ہے بھونی بھانگ
چار جو پائے آٹھ اڑائے   خالی ہاتھوں گھر کو آئے
جام پہ جام پلائے جا   دام کا ذکر نہ لائے جا

مانگے تو کہہ دیں صاف نہیں ہم   مسرف ہیں صراف نہیں ہم
من میں دھیرج دھرنا ساقی   پنچ کے دام بھی ہیں کچھ باقی
جس دم پاتے دے دے دام   کھری مجوری چوکھا کام
بانوں کا تیری خرچ بڑا ہے   رندوں سے اب پالا پڑا ہے
کیا کیا سوانگ تماشے لائے   کیا کیا باغ سبز دکھائے
روم و روس لڑایا ہم نے   ریچھ کا ناچ نچایا ہم نے
دیکھے سب نے قلم کے جوبن   بجلی چمکی اتر، دکھن
حال نظام کا سارا چھاپا   کابل پر بھی مارا چھاپا
شام اودھ کا رنگ جمایا   توڑ بتایا جوڑ بتایا
سچ کہو ہم جو نہ دل بہلاتے   اب تک ہوش ہیں کس کو پاتے
جان ہی لیتی فاقہ مستی   پانی کے بدلے خاک برستی!
چھاپتے پرچہ اڑتی خاک   فاقہ سے منہ پر رہتی ناک
کلوں سے کہتے جانچ تو لوں   چل بے چرخے چرخ چوں
پنچ سے ملک کو پاٹا ہم نے   سال مزے میں کاٹا ہم نے
ناؤ لگی دو بلّے پار   مارا غوطہ بلّے پار
ہاں مئے رنگیں ساقی لانا   سال بھرے کی باقی لانا
تشنہ لبی سے رند ہے ترسے   اوبلے مٹکا ہتھیا برسے
سرخ شراب اور اودی گھٹائیں   گرم پیالہ ٹھنڈی ہوائیں
گڑگڑ بادل پڑپڑ بوندیں   خاک پہ برسیں جھڑ جھڑ بوندیں
نکلے صدا ہر خاکے سے   "برسو رام جھڑاکے سے
برسیں گے برسائیں گے   بنیے مونڈ ٹھٹائیں گے"
جھوم کے آئے ابر بہاری   باغ پہ برسے باری باری
پھول کھلیں جب بلبل چہکے   دل بھی اچھلیں رہ رہ کے

کیسا نکھرا سارا گلشن   نہر بھری ہے گردن گردن !
غنچے چٹکیں لے کے بلائیں   مانگیں زباں سے برگ دعائیں
جب تک گلشن ہرا بھرا ہے   عارضِ گل سب بھرا بھرا ہے
دل ہو شگفتہ چین ہو ہر جا   خوش رہیں یارب راجا پرجا

قیصرِ ہند جئیں جم جم !
راج میں ان کے براجیں ہم

اللہ اللہ۔ آج منگل کا دن حضرت پنچ کا دوسرا جلوس ہے یا اجڑے اودھ کو جنگل میں منگل۔ یہ جنوری کی پہلی حضرت قیصرِ ہند کی خاص الخاص نظر کردہ تاریخ ہے یا کتابِ روزگار کا ٹائٹل پیج۔ یہ حسنِ اتفاق ہے یا حضرت پنچ کا اقبال، زمانے کے لاکھوں ورق کے دفتر اُلٹ جایئے ایسے فرمائشی لطیفے کہیں ہاتھ لگتے ہیں۔ بارے آج ہزاروں ٹونوں ٹوٹکوں کے بعد میاں سنہ ۷۷ صاحب اصل خیر (نہیں نہیں شر) سے سدھارے۔ اب سنہ ۷۸ کی نئی کھیپ، نیا مال، نیا وزن، روم روس کی ہشت پشت، انگلینڈ کا سوٹھ کا ناس، جرمن کی روباہ بازی، سرویہ رومانیہ کی کورنکی، فرانس کے بگڑے نیل کا ماٹ، خران کابل کی گیدڑ بھبکی اقوام سرحد کی گوشمالی سر انگریزی لوہا، الحاقِ اودھ کی میٹھی چھُری، لیسنس ٹکس کی پچڑ، سندھ اوس پار کے نئے گھن والی لوکل گورنمنٹ، ریاست نظام کی شکر رنجی، نئی روشنی والوں کی قومی ہمدردی نئے جلسوں کی گلخپ، جدید اخباروں کی اُپج دیکھنا ہے ؎

دیکھیے پاتے ہیں کیا فیض بُتوں سے عشّاق
اک برہمن سے سُنا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

پر سال روم و روس کی جنگ شائقینِ اخبارات کو لاکھ اپنی طرف کھینچے گئی مگر مسٹر اودھ پنچ کے برمحل لطیفوں، غضب کی شوخ بیانیوں خوشامدیوں کی لے دے، امرِ حق کے اظہار میں آزادبیانی، گورنمنٹ کی واجبی نکتہ چینی نے اس پر بھی سینکڑوں کو اپنا مطیع کر ہی لیا۔

ہمارے جنڈو یار شہر کے بے فکرے نواب جن کو اخبار کے نام سے بخار آتا تھا انہی کا دم بھرنے لگے۔

مسٹر اودھ پنچ بعض غبی لوگوں پر بھی آئینہ کر دیں گے کہ دیکھو شوخ بیانی یوں پھکڑ فحش سے خالی ہو سکتی ہے استعاروں تشبیہوں کا لطف تصویر کھینچ دینے سے اس طرح دوبالا ہو جاتا ہے۔ رائے بریلی سے مقام پر دو ہی چھقروں میں رشوت کا یوں استیصال ہو جاتا ہے۔ مُسرف نوجوان لوگ یوں رنڈی کی مستی سے دست بردار ہو جاتے ہیں، گو ہٹ دھرم سحر بیانی کا لوہا تو اب بھی مان گئے ہیں مگر صاف صاف اعتراف میں جو شرما شرمی ذرا جی ہچکچاتا ہے تو خیر اس سال وہ بھی لو۔

مسٹر اودھ پنچ اپنے سچے یکرنگ عالی دماغ نامہ نگاروں کے تہِ دل سے مشکور ہیں جنہوں نے اعلیٰ درجے کے مضامین کے پُل باندھ دیے۔ نہیں تو پورا اخبار (اور پھر پنچ سا) لکھنا ایک متنفس سے کیونکر ممکن تھا۔ خصوصاً ہمارے عنایت فرما۔ ن لکھنوی کی لفاظی، ت۔ ن تجر کی جادو طرازی، اُپج اور سلاست، ا۔ ح الہ آبادی کے مہذب مزاج اور عالی دماغی، پنجاب پنچ کی ذکاوت و خوش طبعی، بنارس پنچ کی مضمون آفرینی، دکن پنچ کی ظرافت، ن ج۔ ن کی چلبلی تقریریں، بلا کی نوک جھوک ہمارے لوکل ستم ظریف مضمون نگار صاحب کی وقوع گوئی، غضب کی سحر بیانی، آتش زبانی، نتھو صاحب بہادر کی لطیفہ بازی، لاہور پنچ کے سماں باندھ دینے والے فقرے، دہلی پنچ کی بولیاں ٹھولیاں پنچ کا سکہ بٹھا دینے میں یادگار رہیں۔

عذر:۔ لاکھ جلدی کی مگر لوہا کی کھڑاک سے اخبار نکلنے میں ایک دن کی دیر ہو گئی۔ ہمارے ناظرین ازراہِ عنایت معاف فرمائیں۔

کرسمس

کرسمس ڈے کی دھوم دھام، گرجا کا اہتمام، میوہ جات کی گرانی، ڈالیوں کی ارزانی، کیک بسکٹ کی تیاری، بنگلے کوٹھیوں کی گلکاری، انگریزی بانسری کا بجنا، تنبورہ کا گرجنا۔ لباس و زیور کی آرائش، تکلفات کی افزائش قابلِ دید ہے۔ انگریزوں کا بڑا دن نئی روشنی والوں کی انگریزی عید ہے۔ صاحب لوگوں کے تکلفات جو کچھ ہوں زیب اور بجا ہیں مگر نئے بگڑے نیو کرسچین کا حال کچھ نہ پوچھیے۔ بیرا ول بیرا! اِدھر آؤ۔ کل بڑا دن ہے۔ چائے کا کیتلی بہت پرانا ہو گیا ہے۔ کلعی گر سے لولوسی جوس کر کے پیندے میں جوڑ لگا دے۔ ویل ڈیکھو! وہ کالا بوٹ ہمارا لے جاؤ۔ بہت سک گیا ہے۔ چمار سے بولو پیوند لگا دے، اوس کا ایڑی بالکل گر گیا ہے درست کر دے۔ وہ کالا کوٹ الپاکہ والا جو مسٹر بجلر کے مرنے کے بعد ہم نیلام میں لیا تھا اور وہ لال ٹوپی جو سر کے میل سے کالا ہو گیا ہے جیسے مسٹر سیڈ میڈ نے جوتا پونچھ کر پھینک دیا تھا اور ہم نے دھلوا کر رکھ چھوڑا تھا نکال رکھو اور رات کو کسی بنگلے سے دو نرنگی چرا لاؤ اور وہاں نجا سکو تو مدھو سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بنگلی سے ہمارا سلام کہو اور لے آؤ۔ ہمارا کھانے کا میز جس پر مکھیاں لپٹا رہتا ہے کوئی چیتھڑا لے کر پونچھ پانچھ دو۔ کل ہمارا دوست لوگ سب جمع ہوگا۔

بیرا بھی وہ چھیل چکنیا کیل کانٹے سے درست ہے کہ ماشاءاللہ۔ پچاس برس کا سن، دبلا پتلا، بدن میں فقط ہڈی چمڑا، سر کے ذری ذری بال، بھونی سری کی قطع، آنکھوں میں کیچڑ، داڑھی کے بال کچھ زرد کچھ کالے، پھیلا ہوا منہ جیسے چھوٹی مہتاب، میلی عرقی لگائے ایک مرزئی میں چیتھڑوں کے سوا روئی کا ذکر نہیں۔ ہلدی مصالحہ کے جا بجا دھبے۔ ایک میلا لٹہ صافی کا ٹکڑا تولیہ کے عوض کندھے پر پڑا، پھٹا جوتا پہنے بازار کو لمبا ہوا۔ وہی بیرا، وہی خدمت گار، وہی بورچی، وہی مشلچی، بڑبڑاتا چلا جاتا ہے اور چپکے چپکے کہتا جاتا ہے میاں کے نہ میز نہ کرسی ایک ٹوٹی میز اور سڑے گلے چار مونڈھے، دو رکابیاں، دو کالے کوٹ پتلون نیلام سے خرید لیے۔ ٹکہ پاس نہیں انگریز بننے پر گس کرتے ہیں۔

غرضکہ ہر شخص بہ خیالِ خویش خبطے دارد۔ یہ حضرات بھی عجیب طرح بسر کر رہے ہیں۔ بقول شخصے کہ ؎

گئے دونوں جہان سے وائے ستم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

ستم ظریف

الف بائے پینچ

ا انگلینڈ کے سن رے بھائی   روس نے کی ٹرکی پہ چڑھائی
کابل ہندوستان بھڑاوا   ڈانڈا لئے جوا کی دھاوا

بابا بابا ہندمان جانت ہے سب کوئے
جھوٹھ، مکر، برتے جو کوؤ ہر کوئی واکا ہوئے

ب بتیا اک بات سناؤں   یوں قلات پشور بچاؤں
مانت ناہیں شیر علی   حکمت عمل کچھ نہ چلی

صوبہ ہندوستان کا ہے کابل قندھار
جو کوئی پہنچائے وہاں تک واکے میں بل ہار

ت ترکی سے لائے سفیر   وا کی بھی نا سنس امیر
سب سے کہت ہے کرو جہاد   کل سرحد پر مچا فساد
جو تلوار توپ پر آن پڑت ہر آن
کابل لڑکے دیکھ چکے ہیں وہ سارے افغان

ث ثابت ہوا ہے ایسا   جان بچائے دے کر پیسا
دشمن کو پھر دوست بنائے   زور گھٹانے کو لڑوائے
جو چاہو سو ہم سے اد پر لڑو روس سے جائے
فوج ہماری کمک کرے گی یہ کو دکھائے

ج جو صاحب جو جھے رن میں   رن کا ہے کو کھیے بن میں
ادن کا بدلہ کیسے ملے ہے   جو سنے ہے وہ کا دل ہلے ہے
بگڑا باگھو نہ مانیے چمکاری مت دیو
چھوڑو ایسی کڈھب جگہ گھر کا رستہ لیو

ح حرکت جو فوج نے کینی   پگ پاچھے ہو جیسے ہینی !
کس کے سر پہ تھوپی جائے   بنا لڑے کیسے ہٹ آئے
دھمکی دینے آئے تھے سو دھمکن لاگی توپ
گورے ٹوپی مار بھیں اور پگڑی گھٹا ٹوپ

خ خوف اور بڑا یہ بھائی   جن کے برستے رار مچائی
وہ سب دم او نہیں کا بھریں   ایسا ہوئے نہ واند کریں
پکا پھوڑا یہ چھیڑیے تو چھیڑا نا ہیں جائے
یہ دھڑکا موہے دن رین ہیا نہ پھوٹے آئے

د دیا جو کچھ سب کھویا   دانا والا کیا بس بویا
دیا خزانہ کر تنخواہ   دیا میگزین برائے سپاہ
جیسا کیا سو آگے آیا اب کا ہے پچھتاؤ
جو من کا کپٹے بھیا وا کا کو سمجھاؤ

ذ ذلّت یہ کیسی ہو گی   جوگی جو ہو جٹے کا بھوگی
بھیک نہ مانگے مانگے حصّہ   میل کیے ہو جھگڑا قصّہ

جن کے کارن بھرا کیے کیا انہیں سے میل
دیکھ سکھی ان تلن مان تنک نہ نکسا میل

ر رخصت ہو آئے سفیر   لگے بڑھانے فوج امیر
اب بن لڑے نہیں چھٹکارا   کیسی کریے لٹن بچارا
اپنی سی سب گر دیکھی کرم لکھے کی ہوئے
کپٹی سے منہا کرے گر شے اپنی کھوئے

ز زار کے آئے سفیر   اوس سے پتیائے ہیں امیر
دیکھیں دے وہ کیسا بُتا   کیسے کھائے حرصی کُتا
خیوا اور بخارا دیکھو کیسا جو کچھ برتاؤ
پھر کابل قندھار میں جو مانگو سو پاؤ

س سچ اک بات بتاؤں   تجھ کو صاف جو دل سے پاؤں
چھوڑ قلات اپنا گھر لیو   ڈوبل نیا اس گن کھیو
نا تم سے کچھ چھیڑ ہو نا ہر کچھ بگاڑ
بسے بسائے گھر کا کو دا ایسے دیت اُجاڑ

ش شرارت جو کرو کری   تمری حد مان پاؤں دھری
وہ کا جب تو موڑ بڑانا   چاہت ہے وہ ڈھول لگانا
ایسے کی جس چاہیے ویسی نکتا ہوئے
پاؤں کلھاڑی مار کے گھر میں بیٹھا روئے

ص صبر سے نکلے کام   جلدی کر کیوں ہو بدنام
پہلے اون سے ساتھی توڑو   جو کچھ کہیں نہ منہ کو موڑو
اون کے سب کر اپنا کر وا اپنی پھر جیت
مانو گر ہمرا کہا ہر اک سے راکھو پیت

راقم: شاعر

بے تکے آنکھ مُند پٹے ددن کی لینے لگے
طفلِ مکتب بے الف پڑھ کے سبق دینے لگے

دوسرا سبق

یا استاد! ہمیں میدان، ہمیں چوگان ہمیں گوے (۱) شامت ہے پٹھے کی شامت ہے اے مرحبا (شابش پٹھے شابش مرحبا) پڑھنا پڑھانا چولہے بھاڑ میں جائے۔ ہماری بات چیت ہی سیکھو تو بن جاؤ لال سر باللہ (بسم اللہ)

(ش) کون سا علم سیکھے؟

(ا) علم مجلس!

(ش) علم مجلس کے معنی مع مطلب فرمائیے۔

(ا) ہاں یہ بات کہی دیکھو ایک ہی سبق میں دو آنکھوں کی چار ہو گئیں یعنی مسئلے بگھارنے لگے۔ سنو علم مجلس کے اصطلاحی معنی کتابِ خوشامد کی چوتھے باب ملو بتو کی دوسری فصل لاجالوجی میں یوں لکھے ہیں کہ ـــ جیسا دیس ویسا بھیس۔

(ش) ہم یہ بھی نہ سمجھے۔

(ا) ہر رنگ میں پانی۔

(ش) آگ لگے تمہاری باتوں میں خلاصہ مطلب کیا ہوا؟

(ا) ہاں جس صحبت میں جائے ہاں میں ہاں ملائے۔ حق ہو یا ناحق۔ بات کی تائید ضرور کرے ہاتھ جوڑتا رہے۔ سب کی چلمیں بھرے چاہے کوئی چار کھونٹی بھی سنائے اور نہ مانے۔ بھلائی اپنی چاہے تو بے عزتی کو مقدم جانے کیونکہ (عزت چہ کُتّی است کہ پیش مرداں باید) پھر نفع سے مطلب نقصان کا ہے کا اگر اس نصیحت پر عمل کیا تو دیکھنا پیٹ پھول کے مٹکا ہو جائے گا۔ یاد کرو گے اور ایمانداری تو کہیں پھٹکنے نہ پائے۔ ایسا بغل میں دبائیے جیسے بندریا اپنے بچے کو چھاتی سے لگاتی ہے۔ پھر موقع محل دیکھے تو جھوٹا حلف بھی اٹھا لے کچھ ثواب عذاب نہیں مقتضائے وقت کہا جائے گا یا دروغِ مصلحت آمیز بہ ...... الخ بن جائے گا۔

(ش) کیوں مرشد جھوٹ اچھا کہ سچ؟

(ا) جھوٹ اچھا جھوٹ۔ خدا سچ نہ بلوائے اور اس جانب کا شیوہ تو قدیم الایام سے (یعنی پشت ہا پشت) یہی چلا آتا ہے اور خوب ہی پھلا (بلکہ پھولا ہے) دیکھو دو تین باتیں یاد رکھو ایک تو مثل مشہور ہے جھوٹے کے آگے سچا رو مرے۔ دوسرے سچی بات سعد اللہ کہیں سب کے من سے اترے رہیں۔ بھائی اللہ بچائے سچ بول کے گردن کون کٹوائے۔

(ش) بھلا حضرت تو آپ آزمودہ کار ہیں کچھ اس کے فائدے اور بھی بیان فرمائیے۔

(ا) بچشم سر آنکھوں سے، گلے گلے پانی اور گھٹنوں گھٹنوں دلدل میں ایک ادنیٰ سا فائدہ یہ کیا کم ہے کہ اب ہم سچ بھی بولیں تو کوئی یقین نہیں لاتا۔ باقی اور بھی ازیں قبیل وغیرہ وغیرہ۔ واہ تو آپ بھی بعضے بے اٹکل اخبار نویس ٹھہرے۔

(ش) اب ایک بہت بڑی بات ہم پوچھتے ہیں۔ حاکم محکوم میں کیا فرق ہے؟

(ا) پنش بس یہی بات تھی۔ یہ کیا بڑی بات ہے۔ سنو ایسا فرق ہے جیسے زمین و آسمان یا لکھنؤ سے لندن یا نینی تال سے دکن حیدر آباد۔

(ش) ذرا ٹھہریے اور خدا حکومت دے تو کرے۔

(ا) اس کا جواب زار روس سے پوچھ کے دوں گا ہاں زبردستی وہیں دھونکڑی خود رائی بے پروائی، سخن پروری، جنگ زرگری ناپرسانی غفلت، ہزار طرح کی سیاست (یعنی جز و ریاست مارے اور رونے نہ دے۔ سر بازار جسے پائے کھلی ڈال کے لوٹ لے) اور یہی مثل وردِ زبان رہے۔ کس کا سر اپنے آگو دے ماروں۔ یہ وہ زمانہ جس کا گلا گھونٹو وہی آنکھیں نکالتا ہے۔ زبردست کی راد سر پہ

(ش) بھلا محکوم کی کیا تعریف ہے؟

(ا) جیسے کتے مار کتے کے گلے میں رسی باندھ کے کھینچا لئے جاتا ہے یہ صفت پیدا کرے۔ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست کا مضمون۔ لاکھ طرح کی سختی ہو چوں نہ کرے۔ گو بات چاہے کیسی بُری ہو یا بیجا بہت انسب بہت مناسب، بہت بجا۔ ہر تکلیف پر شکر ہے، ہر مصیبت پر احسان ہے تیرا، کچھ مصلحت ہوگی جس کل بٹھائے بیٹھے۔ جو ناچ نچائے ناچے چار باتیں سُن کے غم کھائے۔ خطا بے خطا تقصیر ہوئی قصوروار ہوں، غرض کر حق ناحق، بدنامی کا ٹوکرا اپنے ہی سر دھرے لیکن یہ سب چاپلوسی دھوکے بازی زمانہ سازی سے ہو۔ دل میں گھر کر کے پانچوں مال اپنے کرے۔ وقت پر صاف الگ اور خیانت، بد دیانتی، کاہلی، مجہولی، کام چوری حرام خوری، کام بگاڑ دینے کی فکر، پاسِ نمک، رتی سے ماشہ تک ندارد لیکن بن پڑنا شرط ہے۔ باقی اور مطالب آئندہ تم آپ سمجھ جاؤ گے۔ تھوڑا پڑھ لو۔

(ش) خفا نہ ہو جیے بُرا نہ مانیے تو ایک بات کہوں۔

(ا) ہم تو بُرے کے باپ کو نہیں مانتے۔ شوق سے تم ہزار باتیں کہو۔

(ش) میں چاہتا ہوں چھوٹے چھوٹے جملے مختصر طور پر تڑاق پڑاق بیان کر دوں۔

(ا) واہ جملہ چو حرفی اور دو حرفی سے تو کم نہ ہوگا۔ مجھ سے کہو تو اشاروں میں سمجھا دوں۔

(ش) ہاں اوستاد! یہ بات۔ بھلا سال کون سا اچھا؟

(ا) سن صفر جس میں وہ ایکٹ جاری ہوا۔

(ش) اور مہینہ کون مبارک ہے؟

(ا) لوند کا مہینہ!

(ش) اچھا دن کون متبرک ہے؟

(ا) ہفت شنبہ!

(ش) ہائیں۔ یہ کوئی دن نہیں۔

(ا) اہو ہو ہو ہو بھائی جسے بڑا دن کہتے ہیں۔

(ش) قوم کون کھری؟

(ا) چودھری (بنیوں کا) جس کا کہیں تھل بیڑا نہیں۔

(ش) دنیا حاصل ہونے کی ترکیب؟

(ا) دین سے کنارہ کشی۔

(ش) سچ بیوپار کون سا ہے؟

(ا) لوگ تو کہتے ہیں چوری۔ ہمارے نزدیک بھاگتے بھوت کی لنگوٹی۔ رشوت بھی غنیمت ہے۔

(ش) روشنی کون اچھی؟

(ا) ظاہر ہے یہی نئی روشنی۔ پرانی چیزیں کبھی بیکار ہے۔

(ش) سفر کرے تو کدھر جائے؟

(ا) سیدھا لندن کی طرف۔

(ش) فصل کون سی اچھی؟

(ا) خشک سالی میں چیچک دبا۔

(ش) نعوذ قرآن درمیان کیا بے دھڑک نام لیا ہے۔ خدا نہ کرے۔

(ا) آخر بچے ہونا۔ بات کی تہ کو نہ پہنچے۔ تیرھویں صدی، اخیر زمانہ، دجال کی آمد آمد (نائب کو خروج کر چکے) الخفیف کی بکار سب باتوں پر طرہ، بی گرانی صاحب نے وہ لم ڈوراپیچ لڑایا ہے اور شاید وہ ہرم پڑ گئی کہ کٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ اس میں جہاں تک کمی ہو مصلحت سے خالی نہیں اور سنا نہیں کہ خس کم جہاں پاک۔

(ش) بھلا آدمی کہاں بنتا ہے؟

(ا) کمیٹی میں۔

(ش) کمیٹی چہ معنی دارد؟

(ا) جہاں چار آدمی لائق کیا نالائق جمع ہو کے زمین و آسمان کے قلابے ملائیں۔

(ش) پھر وہاں آدمی کیونکر بنایا جاتا ہے؟

(ا) اس میں کچھ محذوفات ہیں ایک نہ ایک طرح سے ضرور بنایا جاتا ہے۔ پھر کبھی کہہ دیں گے۔

(ش) اور دعا کہاں قبول ہوتی ہے؟

(ا) یہ نہ پوچھو زبان کا اثر غائب غلہ ہوا۔ دعا کا قبول ہونا ممکن نہیں۔ ہمارے نزدیک کہیں نہیں قبول ہوتی۔

(ش) اچھا دنیا میں لاحاصل کون کام ہے؟

(ا) یہی اخبار نویسی اور عمدہ مضمون نگاری بس نمی پہ سد کر بھیا کون ہو۔

(ش) واہ استاد! واللہ تمہاری باتیں کیا ہیں پیچ میل مٹھائی ہے۔ ایسی خوش ذائقہ کہ دیکھی نہ سنی۔ میرا جی لگتا ہے دو چار فقرے اور

(ا) بس بس معاف کیجیے۔ میرا تو جی نہیں لگتا۔ اب کتاب بغل میں دباؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔ طبیعت لگی تو پھر کبھی۔

تار برقیاں

۲۳ر دسمبر۔ لندن۔ بوجہ سرد ہوا اور برف کے جنوب بلگیریا کی جنگی کارروائیاں بند ہیں۔ افواج سرویا نے پیننگ گلبو کو فتح کر لیا۔ دوسری افواج سرویا روسیوں کے ساتھ مل گئیں اور ددن کی جانب بڑھتی جاتی ہیں۔ روسیوں نے مقام ادلٹی کو فتح کر لیا اور اپنی افواج ارزدن احمر میں جمع کر رہے ہیں۔ آرمینیا میں سردی کی شدت ہے۔

۲۴ر دسمبر۔ لندن۔ سلیمان پاشا نے قلعہ جات ذوار بعۃ الاضلاع میں فوج داخل کی ہے اور باقیماندہ فوج کو وہ اڈریانوپل میں جمع کر رہے ہیں۔

یقین ہے کہ گورنمنٹ سلطان نے اخیر وقت تک جنگ کرنے کا ارادہ ٹھان لیا ہے۔

شہنشاہ روس مع شہزادہ گرونلش کاف سینٹ پیٹرس برگ میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ روسی امن روم کا محاصرہ کر رہے ہیں۔

انگلستان ان عہدناموں کو جواب ہیں امن میں رکھے گا۔ اور یورپ کے ملکوں کو مساوی رکھے گا اور روس کو نہ بڑھنے دیگا اور اس کارروائی میں اس کو فرانس اور اٹلی سے اعانت ملے گا۔

۲۵ر دسمبر، لندن۔ شہنشاہ روس نے کہا ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اور مجھ کو امید ہے کہ جو کام روس نے اپنے ذمہ لیا ہے اس کو جنگِ حال میں پورا کرے گا۔

وزیر اعظم ٹرکی نے ایک وکیل سے ملاقات کی جو کہ مسلمانان ہندوستان کی جانب سے وہاں گیا ہے۔

سرویانے بانزی پر ناکامی سے حملہ کیا۔ ان کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ فوج نیشن نے ارادہ کیا تھا کہ بلند مقامات کمپنی پر قبضہ کرے لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔

فوج کشی جوا کی

۲۴ر دسمبر، شیر گھاسہ۔ فوج کل دوسری پہاڑی پر دشتونی گھاٹی ہوتی ہوئی روانہ ہوگی۔ یہ دو کالم ہو کر روانہ ہوگی۔ اوّل برگیڈ تو زیر کمان کرنیل بچانن ہوگا۔ اور دوسرا زیر کمان کرنیل ڈورنڈ۔ دو سو پچاس آدمی رفل برگیڈ اور ایک حصہ بائیسویں ہندوستانی پلٹن کو حکم دیا گیا ہے کہ فوراً یہاں آدیں تار برقی کا تار غنیم نے کاٹ دیا ہے۔ جوا کی پشتونی میں جمع ہو رہے ہیں۔ رات کو لشکر پر گولیاں غنیم چلاتا ہے۔

۲۶ر دسمبر، شیر گھاسہ۔ ایک فوج سے کل گرد آوری ہوئی تھی۔ کچھ مخالفت نہیں ظاہر کی گئی۔ ایک جوا کی مارا گیا۔ فوج لوری میں کل خیمہ زن ہوگی۔ اور پشتونی پر جمعہ کو قابض ہوگی۔ یہ حملہ بشراکت فوج جنرل کنبر صاحب کے کیا جائے گا۔ یہ فوج ہمارے شریک پشتونی میں ہوگی۔ موسم خراب معلوم ہوتا ہے۔

۲۶ر دسمبر، شیر گھاسہ۔ انتیس ہندوستانی پلٹن خوشحال گڑھ سے اور نصف بائری کوہاٹ سے آج مقام نرکی باغ کو جاوے گی۔

۲۶ر دسمبر، کلکتہ۔ کوئی انکم ٹیکس جاری نہ ہوگا مگر آمدنی کی ترقی اس طور پر کی گئی ہے کہ درجہ دار لیسنس تجارت اور پیشہ پر لگایا جاوے اور مالگذاری کسی قدر ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب میں بڑھائی جائے گی۔

فوج کشی ناگا

۲۶ر دسمبر، جورہاٹ۔ جب سے موزما کو لے لیا ہے اس وقت سے ناگوں نے نہایت ستا رکھا ہے۔ دو ڈاکیوں کو روک کر لوٹ لیا۔ دو کانسٹبلوں کو مار ڈالا۔ وہ چاہتے ہیں آمد و رفت روک دیں اور جو فوج بھیجی گئی تھی تھوڑی قرار دی جاتی ہے اور مواضع بھی مخالفت ظاہر کرتے ہیں۔ ایک سو آدمی تینتالیس پلٹن سے طلب ہوئے ہیں جو دبرو گڈھ میں ہے۔ چیف کمشنر آسام مقام گورہاٹ میں داخل ہوئے۔ امید ہے کہ یہ ناگا کے پہاڑوں کو جاویں گے۔ جب وہاں امن ہو جائے گا۔ مقام ادکھا میں سب تندرست ہیں۔

۲۶؍ دسمبر جورہات۔ انکامی ناگا موزما کے جن گاؤں کو جلا دیا تھا ان کے جُدا جُدا گروہ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے سڑک بند کردی ہے۔ اور پُل کو توڑ ڈالا ہے اور آمدورفت درمیان فوج اور سماگٹن کے رُکی ہے۔

کانسٹبل کو جو ڈاک لیے جاتا تھا مار ڈالا، دوسرے کو زخمی کیا۔ ایک اور گروہ ان ناگوں کا درمیان سماگٹن اور میدان کے ظاہر ہوا ہے۔ انہوں نے ایک اور کانسٹبل کو برچھی سے مار ڈالا اور ڈاک والے کو زخمی کیا اور انہوں نے لوریا تھر کو دھمکی دی جو ایک اسامی موضع میدان میں اور ۷ میل گولہ گھاٹ سے ہے اور یہ بھی بیان ہے کہ سماگٹن کو دھمکی دی ہے

اخیر ڈاک جو سماگٹن سے آئی وہ زیر نگار دہیں کانسٹبلوں کے آئی تھی۔ کمک پولیس کے لوگوں کی گولہ گھاٹ میں داخل ہوئی اور ایک حصہ نمبر ۴۳ پلٹن کا ڈبروگڈھ سے آنے والا ہے

فوج کشی جوائی

ایک تار برقی جو کوہاٹ سے مورخہ ۲۲ دسمبر کی آئی اس میں لکھا ہے کہ جوائیکیوں کے پاس سے ۲۲، اور ۲۳؍ ماہ حال کو قاصد آئے اور جو درخواست ان کی سابق میں تھی اسی کو ظاہر کیا یعنی رئیسوں کو اجازت ملے کہ وہ جاکر اپنے جرگوں کے لوگوں کو لشکر میں لادیں حکام سے کہا گیا کہ یہ بات غیر ممکن ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ اور قاصد نہ آوے جب تک کہ جرگے کے لوگ اس کے ساتھ نہ ہوں۔ شیرگھا سے مورخہ ۲۳؍ ماہ حال کو کسی قدر گولیاں ۲۲ ماہ حال کو جوائکیوں نے اس پکٹ پر چلائیں جو پہاڑی پر تھا۔

مطبع شام اودھ واقع لکھنؤ محلہ گولہ گنج میں محمد سجاد حسین کے اہتمام سے چھپا

اودھ پنچ کے شاعر

بسنت نامہ دھوم دھامی

ستم ظریف

آئی ہے دھوم دھام سے اب کی مگر بسنت   یرقان کے مرض میں ہوئی جلوہ گر بسنت
فاقوں کے مارے چھائی ہے چہروں پہ مُردنی   کہنے کو زرد رُو ہیں منائی مگر بسنت
سیدھی ہے بات ڈھاک کے بس تین پات ہیں   کھاتی پھری ہے ٹھوکریں کیا در بدر بسنت
بھیروں ہی ناچتا ہے یہاں کس کا راگ رنگ   دیکھی سُنی نہ تھی کبھی ایسی لچر بسنت
مطلق نہ کانوں کان کسی کو ہوئی خبر   کس سمت کو چل گئی آئی کدھر بسنت
حسرت سے بالیوں کی طرف دیکھتی ہے خلق   کنگال دانہ زد ہے کچھ اب کی مگر بسنت
اللہ بامراد دکھائے گیہوں کی شکل   آباد تیرے دم سے ہو اُجڑا نگر بسنت
کہتے ہیں سب کہ آئی گیہوں کاٹنے کی فصل   شاباش کیا سنائی ہے اچھی خبر بسنت
ہلدی کی اک گرہ نہیں پلّے وہ رنگ ہے   نفرت ہے پھیکے چوچلے ہم سے نہ کر بسنت

اے پنچ کیا ہتھیلی پہ سرسوں جمائی ہے؟
اس فصل میں بھی تم نے منائی مگر بسنت

رُباعیاں

تربھون ناتھ ہجر

حضرت اودھ پنچ صاحب! یوں کہنے کو تو رباعیاتِ عمر خیام زبان زدِ خاص و عام ہیں مگر جناب ہماری رباعیوں میں افیون کے قوام ہیں۔ واللہ وہ چاشنی ہے کہ تار نہ ٹوٹے۔ ے اس بحث اس سے کیا حاصل اُس قوام کا ہمیں بھی مزا تو چکھائیے۔ بہت بہتر ہے

چانڈو کا جو کوئی لطف ہم سے پوچھے   نہک ہاتھ میں لے لگائے بمبو منہ سے
ہو مدِ نظر جو آبِ کوثر کا مزا   ہر چھینٹے کے بعد اک گنڈیری چوسے

قندِ مکرّر

میٹھی میٹھی گزک نہ ہم سے چھوٹے   دقیانوسی شک نہ ہم سے چھوٹے
گھر بار چھٹے بلا سے لیکن اے ہجر   افیون، چانڈو، مدک نہ ہم سے چھوٹے
(اودھ پنچ، ۱۸، دسمبر ۱۸۷۷ء)

غزل

تربھون ناتھ ہجر

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے   سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن   آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
اک مہینے سے چپکے بیٹھے ہیں   واہ کیا واقعہ نگاری ہے
کیا لکھیں دل نہ جب شگفتہ ہو   آفتِ جاں امیدواری ہے
کوئی بیٹھے نہ آ کے دفتر میں   نادری حکم اب یہ جاری ہے
کیا کریں اب بچارے ایڈیٹس   رات دن شغلِ آہ و زاری ہے
مارے تخفیف اور ٹکس کے پنچ   رو چکے سب، ہماری باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر   محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے   روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر   زلف کی پھر سدا شہواری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز   گرم بازارِ فوجداری ہے
شجرِ کہنہ ہو گئے سرسبز   کیا ہی گوہر کی آبداری ہے
مفت کا مال کرتی ہے تحصیل   بس یہی اک وفا شعاری ہے
ہر گرانی سے ناک میں دم ہے   اب نہ وہ اشرفی نہ ساری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے
دیکھیے فیصلہ یہ کب تک ہو   حضرتِ دل کی روبکاری ہے
اک نہ اک دن یہ ہوگا پردہ فاش   اس کا خمیازہ شرمساری ہے
نہوڑے نہوڑے یہ اونٹ کی چوری
واہ کیا خوب پردہ داری ہے
(اودھ پنچ ۱۹؍ مارچ ۱۸۷۸ء)

غزل

ابو الکمال سیّد محمد علی امجد امیٹھوی

آج کل ہے کچھ سنیچر پاؤں میں   مفت کا رہنا ہے چکر پاؤں میں
سینکڑوں خارِ مغیلاں ٹوٹ کر   رہ گئے مثلِ نشتر پاؤں میں
رشتۂ تہذیب کو تو آج کل   باندھے پھرتے ہیں پھندر پاؤں میں
بدگمانی تو ہے جب باندھے پھریں   جورووں کو اپنی شوہر پاؤں میں
عشق میں اک آسماں رفتار کے   آ گیا ہے سر کا چکر پاؤں میں
ہجر میں ان کے ستم یہ اور ہے
کاٹتے ہیں شب کو تھر پاؤں میں

الانسان ضاحک

یہ مرحوم اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جب کسی انگریز حاکم اعلیٰ نے ہندوستانیوں پر جھوٹ کا الزام لگایا اور اکبر الٰہ آبادی نے اس سے متاثر ہو کر یہ رباعی کہی ؎

بے ڈھب ہے جھوٹ سچ کی چھڑی بحث ہند میں
سچ کہتے ہیں جو جھوٹ ہوں کہتے تو روسیاہ
کیسے ہی ہم ہوں آپ تو ہیں ہم پہ حکمراں
جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ

تو الانسان ضاحک نے یہ نظم لکھی ؎

جھوٹا ہمیں بتاتے ہیں سالانہ بزم میں   کیونکر کہیں کہ جھوٹ کا الزام جھوٹ ہے
وہ صبح کو بتائیں اگر شام راست ہے   اور ہم بتائیں شام کو گر شام جھوٹ ہے
وہ کہہ رہے ہیں ہند میں تکلیف کچھ نہیں   ہم کہہ رہے ہیں ہند میں آرام جھوٹ ہے
آتی تھی سوتے سوتے نظر شکل ہند کی   پوچھا جو میں نے نام کہا نام جھوٹ ہے
انعام پاتے ہیں جو ہمارے گریجویٹ   انعام اسے نہ سمجھو سب انعام جھوٹ ہے
مفلس ہوں گرچہ صدمۂ آلام ہیں سیر   افلاس جھوٹ صدمۂ آلام جھوٹ ہے
تصویر میں ہے ان کی اگر آم رس بھرا   یاں شاخ میں لگا بھی ہو گر آم جھوٹ ہے
بندہ خدا وہاں ہے یہاں بندۂ خدا   دینِ مسیح راست ہے اسلام جھوٹ ہے

ناول ڈرامے بیچ ہیں کہ یورپ میں ہیں چھپے
مطبوع ہند قصۂ گلفام جھوٹ ہے
کہتے ہیں وہ جو آئی کو اسشار عین صدق
کہتے ہیں ہم جو آنکھ کو بادام جھوٹ ہے
گردش کا اپنی گردشِ ایام ہے سبب
گر وہ کہیں کہ گردشِ ایام جھوٹ ہے
ادبار جبکہ آگیے سب عیب آگئے
آغاز جھوٹ نیز سرانجام جھوٹ ہے

اسی طرح جس وقت فصیح الملک نواب مرزا داؔغ کا انتقال ہوا تو الانسان ضاحک کی بجلی شوخ طبیعت نہ رہ سکی اور جناب نے یہ قطعہ ارشاد فرمایا ؎

یادش بخیر آتے اجل نے مٹا دیا
گویا کہ داؔغ صفحۂ ہستی پہ داغ تھے

تھے باعث نشاط کبھی مورثِ صُداع
بلبل تھے ناچ گھر کے کلب گھر میں زاغ تھے

گھبراتے تھے ولایتی چکر کی سیر سے
مخمورِ حسن کیفیت جام بارغ تھے

مجلس میں ان کی پورٹ نہ وہسکی نہ شاہپین
سیندھی کے مونتیا کی فقط کچھ ایاغ تھے

شائستہ لیڈیوں کا نہ مطلق تھا واں نشاں
ہاں تھے تو مولیوں کے پتے تھے سراغ تھے

باتوں میں جو چلے تھے طبیعت میں شوخیاں
روشن خیال تھے نہ وہ عالی دماغ تھے

کس نے کہا کہ تھے وہ نئی روشنی کے لیمپ
وہ تو الہ دین کے طلسمی چراغ تھے

غزل

پیٹنٹ

ڈیر پنچ! اُردو شاعری پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ شاعر لکیر کے فقیر ہیں، جدّت کا مادہ نہیں اعتراض کسی قدر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ہم صرف ایک شق پر بحث کریں گے۔ شاعروں نے صرف چند اعضائے انسانی لیے ہیں جن کا فراق اور وصال میں دکھڑا رو دیا جاتا ہے ہم کہتے ہیں کیا خدا نے کوئی عضو بیکار بنایا ہے یا کوئی عضو ایسا بنایا ہے جو اس عشق کو محسوس نہ کرے جو سر سے پیر تک مخلوط ہوتا ہے

پھر کیا وجہ ہے کہ صرف دل و جگر، آنکھ، سینہ، پہلو کا لگاتار سلسلہ ہے اور باقی اعضا جو شاید مادۂ عشق قبول کرنے اور متاثر ہونے میں ان سے زیادہ قابلیت رکھتے ہوں چھوڑ دیے جائیں۔ ہماری رائے میں سب کو درجہ بدرجہ اور رتبہ بہ رتبہ یاد کرنا چاہیے۔ اس عمل درآمد کے بعد نیچرل شاعری کے سکول والوں سے بھی صلح ہو جائے گی۔ بہرصورت ایک نئی غزل اس نئی طرز میں نذر ہے۔ یہ مشتے نمونہ از خروارے سمجھنا چاہیے۔ راستہ ہم نے بتا دیا ہے اب شاعرانِ رنگیں بیان طبع آزمائیاں کریں اور اس طرزِ جدید کو آسمان پر اڑا لے جائیں۔ حق ایجاد بنام موجد پیٹنٹ ہے۔ تتبع اور تقلید کی اجازت عام ہے۔

معدہ میں آگ عشق کی بدستور جلتی ہے
پھیپھڑوں کی دھونکنی مرے سینہ میں چلتی ہے
گردوں نے دردِ عشق میں آفت مچائی ہے
تلی غمِ فراق میں ہاتھوں میں ملتی ہے
چھینک آئی ہم نے شکر خدا کا ادا کیا
اس راستے سے ناک کی حسرت نکلتی ہے
کروٹ بدل رہے ہیں شبِ ہجرِ یار میں
آنتوں میں زور و شور سے بندوق چلتی ہے
تارے گنا کیا ہوں پڑا چت شبِ فراق
آنتی دبی کہ ریڑھ کی ہڈی اچھلتی ہے
دانتوں کا دسترس نہ ہوا گوشِ یار تک
سچ ہے کہ بدنصیب کی کب دال گلتی ہے
شیر و شکر تھیں عشق میں یہ بھی بلا ہوئیں
لو آج پسلیوں میں بھی تلوار چلتی ہے
تصویرِ یار ہم نے لگائی دماغ میں
کچھ کچھ شبِ فراق طبیعت بہلتی ہے

برسات آئی پھر وہی گڑبڑ مزاج ہے
پھر پیٹ میں فساد ہے پھر ناف ٹلتی ہے

رنگ میں بھنگ

اصغر

(سید اصغر علی نام تھا۔ شاہ پور ضلع فتح پور کے رہنے والے تھے۔ بذلہ سنج شاعر تھے۔ اودھ پنچ سابق میں لکھا کرتے تھے۔ کلام میں شوخی اور ظرافت کا لطیف امتزاج ہوتا تھا)

یہ محرّم ہیں ہولی کا تہوار

ہنسی صورت ہے اور دل بیمار
گر پڑے تھک کے پردہ ہائے چشم
جب نہ آیا ستم شعار عیار
لگ گئی آنکھ موت آ پہنچی
ہو گئی حسِ مشترک بیمار
ڈمرع قالب سے سیر کو نکلی
عالمِ خواب کی دکھائی بہار

نظر آیا بہت بڑا میدان
عرصۂ حشر جس کا باج گزار

کوہِ آتش فشاں زمیں بالکل
دھوپ سے تیز مہر آتشباز

ایک بڈھا ضعیف ریشائیل
نظر آیا بہ صورتِ خونخوار

پیٹ میں آنت تھی نہ منہ میں دانت
جھریاں جسم میں پڑی تھیں ہزار

ضعفِ پیری سے جھک گئی تھی کمر
سر بھی جنباں تھا صورتِ منجوار

پائے ماندن نہ جائے رفتن تھی
تھی عجب مخمصے میں جانِ نزار

کچھ ہراس اور کچھ بڑھی ہمت
بڑھ کے دو اک قدم ہوا دوچار

پڑھ گیا چند آیتِ قرآن
کر کے دم، دم میں لایا جسم زار

دل میں آیا خیال ڈر کیا ہے
تم بھی تو آدمی ہو ہمت دار

حضرتِ خضر سبز پوش ہیں یہ
یا ہیں درویشِ کامل و دیندار

پھر یہ آیا خیال ڈر کے ساتھ
ہو نہ انساں یہ کوئی آدم خوار

ایک ہی لقمہ میں نگل جائے
مجھ کو حلوا سمجھ کے لذت دار

بھیجا لاحول کہہ کے بسم اللہ
دل میں ڈھارس بندھی چلا ناچار

پہنچا اک دم میں اس فقیر کے پاس
دیکھی آنکھوں سے اس کی حالتِ زار

میں نے پوچھا کہ کون ہو کیا ہو
اپنا مجھ کو بتاؤ نام و دیار
کس کے تیرِ نگاہ کے گھائل ہو
کس کی چشمِ سیہ کے ہو بیمار

بولا وہ مردِ نیک خوش اسلوب
حال کیا پوچھتے ہو تم اے یار
تیغِ ابرو کا میں نہیں گھائل
نہ کسی حور وش کا عاشقِ زار
انقلابِ فلک کا مارا ہوں!
دل پہ اٹھی ہے درد کی دیوار
لوگ سب سو رہے ہیں غفلت سے
ان کے افعال پہ ہوں زار و نزار

فرطِ غم سے جو کھل گئیں آنکھیں
مٹ گیا سب طلسم کا گھربار
وہی کنجِ قفس وہی فریاد
بسترِ غم ہے اور اصغرؔ زار

اودھ پنچ کے لطیفے

ایک بنئے پر بے ایمانی، دغابازی کی بدولت صاحب مجسٹریٹ کے حکم سے بید پڑے۔ یار دوستوں نے لالہ جی سے ہمدردی کے کلمات تاسف کہنا شروع کئے تو لالہ صاحب نے فرمایا "جی نہیں کوئی رنج کی بات نہیں۔ میں ایسی پیٹھ پیچھے کی باتوں پر خیال بھی نہیں کرتا۔

س :۔ ذرا بتانا کہ سورج پچھم میں کیوں ڈوبتا ہے اور پورب سے کیوں نکلتا ہے ؟

ج :۔ یہ تو جس بے وقوف سے پوچھو گے بتا دے گا۔

س :۔ اسی لئے تو میں آپ سے پوچھتا ہوں۔

ایک شخص نے کسی سے پوچھا کہ تم نے اتنی کم عمر عورت سے کیوں شادی کی ؟ اس نے جواب دیا سنا نہیں عذاب جس قدر چھوٹا گلے بندھے اسی قدر اچھا۔

ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ عورتوں کے پیٹ بھی کوئی بات ہضم کر سکتے ہیں ؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں صرف ایک بات یعنی اپنی عمر۔

ایک شریف نے کسی حکیم سے پوچھا کہ ناس (مغز روشن) سے دماغ کو کچھ نقصان تو نہیں پہنچتا۔ حکیم نے جواب دیا ہرگز نہیں کیونکہ جن کے کچھ بھی دماغ ہے وہ ناس سونگھتے ہی نہیں۔

متبرک مبارکی

مبارک وہ کالے جو ستائے جاتے ہیں۔ کیونکہ آسمان کی راحت انہیں کے واسطے ہے۔ مبارک وہ جو سول سروس کے لئے رنجیدہ ہیں۔ کیونکہ سرکار سے زبانی تسلی دی جائے گی۔ مبارک وہ جو قحط کے بھوکے پیاسے ہیں۔ کیونکہ پادریوں کی بدولت مسیحی مذہب

مشرف ہوں گے، مبارک وہ جو سنگ دل ہیں کیونکہ بعض خوشامدی اخبار رحم دل کہیں گے۔ مبارک وہ جو راست بازی کے لئے دھمکائے جاتے ہیں، کیونکہ ان کے سچائی کے درخت کی جڑ مضبوط ہو جائے گی۔ (۱۱ر ستمبر ۱۸۷۷ء)

ایک ولایت سے تازہ وارد انگریز کے سامنے ایک گائے کی چوری کا مقدمہ پیش ہوا۔ صاحب بہادر کا اجلاس سہ منزلے کوٹھے پر تھا۔ صاحب بہادر گائے کا نام سن کر گھبرائے اور کہا "گائے عدالت میں حاضر کیا جائے۔" اہل محلہ اور فریقین نے عذر کیا کہ گائے کوٹھے پر نہیں آ سکتی۔ آپ نیچے چل کر ملاحظہ فرما لیں۔ جب صاحب نیچے گئے اور گائے کو دیکھا تو فرمایا "او کالا لوگ ہم کو بہت کھراب (خراب) کرتا ہے۔ گائے گائے پکارتا ہے۔ یہ نہیں صاف کہتا کہ بیل کا میم ہے۔

حضرت لقمان نے باوجود عمر دراز کے کوئی مکان نہیں بنایا۔ ایک جھونپڑی میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔ ملک الموت نے پوچھا کہ باوجود اس بڑی زندگی کے آپ نے مکان کیوں نہیں بنایا؟ آپ نے جواب دیا کہ جس کی تاک میں آپ ایسے رہیں اس کو مکان بنانے کی سوجھتی ہے۔ (ا۔ح۔ ۲۵ر ستمبر ۱۸۷۰ء)

حضرت اودھ پنچ صاحب! یہ سال عیسوی اگرچہ 'ست' ست تر کہلاتا ہے مگر میں اس کو 'ست' ست خشک کہتا ہوں کیوں کہ تری کا تو کہیں نام نہیں۔ بحر ہستی میں سامان تباہی ہے خوشۂ درخت بے آبی سے صورتِ ریگِ ماہی ہے۔ جوار کا درخت دامن کو سمیٹے زاہدِ خشک کی طرح کھڑا ہے۔ سبزہ سموم جانستان سے مسموم ہو کر نزاع میں پڑا ہے۔ دانۂ گندم کی موجودگی نے دادا جان کو جنت سے نکالا تھا۔ اب اس کی عدم موجودگی ان کی اولاد کو پھر وہاں پہنچا رہی ہے۔ (۱۶ر اکتوبر ۱۸۷۷ء)

ایک صاحب نے اپنے شائستہ و تعلیم یافتہ لڑکے کی تعریف میں فرمایا کہ "حضت ماشاء اللہ یہ کرنسی نوٹ ہے۔ جہاں لے جاؤ روپیہ لایا۔" ایک صاحب خوشامدی بیٹھے تھے بول اٹھے کہ "بجا ہے پیر و مرشد اگر کوئی لڑکی ہوتی تو چشم بد دور وہ بھی بل آف ایکسچینج ہوتی۔" (ا۔ح۔ ۸ر جنوری ۱۸۷۸ء)

ذرا بتلانا تو سہی کہ انگریزی حجام زیر بار کیوں ہے اور ہندوستانی حجام فارغ البال کیوں ہے؟ وہ بقول خود باربر اور یہ بال بر!

(۵ر جون ۱۸۷۷ء)

زبان نہ جاننے کی خرابی

ایک ہندوستانی نے تنگی میں آکر ایک موقع پر جہاں خانساماں نہ ملتا تھا کہہ دیا کہ میں خانساماں گری جانتا ہوں۔ ایک صاحب بہادر نے اس کو نوکر رکھ لیا۔ اور اول روز فرمایا کہ انڈے کا بیل کر لاؤ۔ یہ بیچارہ کیا جانے کہ بیل انگریزی میں اُبالنے کو کہتے ہیں۔ اس نے جانا صاحب بہادر فرماتے ہیں اس کا بیل بنا لاؤ۔ اب یہ حیران ہوا کبھی صاحب بہادر کے چہرے کو دیکھتا کہ کچھ پی تو نہیں گئے۔ اور کبھی اپنی طرف

دیکھتا کہ میری سماعت میں تو فرق نہیں آگیا۔ بڑی دیر تک کھڑا ہوا سوچتا اور صاحب بہادر کو تکتا رہا۔ آخر کار ناچار ہو کر کہہ دیا کہ "صاحب! میں حضرت عیسیٰ نہیں ہوں جو انڈے کا بیل بنا دوں کسی اور کو بلا لیجئے۔ خانساماں گری تو میں جانتا ہوں۔ مگر معجزہ کرنی اور جانتا ہوگا۔

بارہ بجے تھے چوکیدار حلوائی کی بھٹی میں سو رہا تھا۔ گلی کا کتا اپنی قسمت کو رو رہا تھا کہ ایک خوش وضع رنگین طبع شاعرہ نے اپنے شوہر سے میٹھی میٹھی باتیں اور دلربائی کی گھاتیں شروع کیں۔

میاں ہم نے ایک غزل کہی ہے مگر سر پٹک مارا مطلع نہیں موزوں ہوتا۔ لیجئے ہاتھوں ایک مطلع نہیں کہہ دیتے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

بہتے ہیں سدا آنکھوں سے یہاں خون کے دریا　　یہ کام تو ہرگز یم قلزم سے نہ ہوگا

اتفاق سے چور چپکے چپکے بیٹھا ٹاٹی سے سُن رہا تھا اور طرّہ یہ کہ چور بھی شاعر اور حاضر جواب۔ فوراً ایک شاعر کے یہاں چوری کی سوچتے دیر نہ ہوئی تھی کہ مطلع ہاتھ باندھے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اب قیامت کا سامنا ہے۔ بولیں تو مشکیں کسی جائیں۔ چپ رہیں تو ذہن کند ہو جاتے۔ آخر نہ رہا گیا۔ ایک دفعہ یہ آوازہ بلند بول ہی تو اٹھے کہ ؎

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا　　جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

(رتن ناتھ سرشار۔ اودھ پنچ، ۵ر مارچ ۱۸۷۸ء)

ایک مولوی صاحب کو خانہ ساز تمباکو میں شیرہ ڈالنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ بنیئے کے پاس گئے اور کہنے لگے "اے شیراع ہے شیراع؟" عین اپنے مخرج سے کچھ اتنے غلیظ اور قبض کے ساتھ خارج ہوا کہ بنیا گھبرا گیا اور کہنے لگا "صاحب! اتنا گاڑھا شیرا تو نہیں ہے جس کا نام اتنی مشکل سے نکلے۔

ایک شخص نے اپنے لڑکے سے پوچھا کہ تم مکتب میں کون سی کتاب پڑھتے ہو؟ لڑکے نے جواب دیا۔ قرآن، پوچھا کون سی سورت؟ کہا لا اقسم بھذا البلد (یہ سورت کی ابتدائی آیت ہے) باپ نے کہا آگے پڑھو۔ صاحبزادے کو اور کچھ یاد نہ تھا فرمانے لگے ووالدی بلا ولد (اور میرا باپ جو کہ لاولد ہے) والد محترم جھلائے اور کہنے لگے۔ اپنی جان کی قسم ہے جس کے گھر میں تیرا سا بچہ پیدا ہوا اُسے "لاولد" ہی کہنا چاہیے

پروفیسر۔ کیوں بھئی بیرا! صاحب خانہ تشریف رکھتے ہیں؟

بیرا : حضور وہ تو نہیں ہیں۔

پروفیسر : اور یہ کھڑکی سے جھلک کس کی دکھائی دی؟

بیرا : وہ نہیں ہیں ان کا سایہ ہے۔

پروفیسر : اُنوہ! میری عقل روز بروز کیسی ہوتی جا رہی ہے۔ سائے کو آدمی سمجھنے لگا۔

جج : تو تم نے اپنے شوہر کے سر پر کرسی دے ماری اور وہ ٹوٹ گئی ؟
ملزمہ : مگر میرا ارادہ نہ تھا۔
جج : یعنی تمہاری نیت حملہ کرنے کی نہ تھی ؟
ملزمہ : میری نیت کرسی توڑنے کی نہ تھی۔

ایک صاحب کو جنہیں شادی کی تلاش تھی اتفاق سے ایک بی صاحبہ مل گئیں۔ انہوں نے جھٹ پیام دے دیا۔ اب آپس میں شرائط کی بحث چھڑی۔

بی بی : سنئے صاحب! میں اپنے میکے والوں کے سامنے برابر ہوں گی، آپ کو حق منع کرنے کا نہ ہوگا۔
میاں : منظور!
بی بی : دیکھئے مجھے جوتی بھر افیون کھانے کی عادت ہے۔
میاں : کچھ مضائقہ نہیں۔
بی بی : سینا پرونا بالکل نہیں جانتی۔
میاں : آپ ہی ننگی پھریئے گا۔
بی بی : کھانا پکانے کی عادت نہیں۔ نگوڑا چولہے میں کون سر دے۔
میاں : خیر تو فاقہ کرنے میں ایذا آپ ہی کو ہوگی۔
بی بی : بھئی میرا مجاز (مزاج) بھی ذری جل کو کڑا ہے۔
میاں : بی دولتی اپنے تیہے میں آپ ہی کھولتی۔
بی بی : کسی کسی وقت جو خفقان ہوتا ہے تو سیر سپاٹے کو چلی جاتی ہوں۔
میاں : خدا کا ملک وسیع ہے۔ آپ کی ٹانگ لنگڑی نہیں۔
بی بی : شعر کہنے کی بھی لت ہے۔ رات کو اکثر مشاعرے میں شرکت کرتی ہوں۔
میاں : عیب نہیں شعر گوئی تو ہنر ہے۔
بی بی : ہاں سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ جھوٹ بھی بولتی ہوں۔
میاں : تو میرا اسلام۔ یہ مصیبت برداشت کرنے کے قابل نہیں۔

کسی بخیل سے بہادر کی تعریف پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ بہادر وہ ہے جو غیر کے منہ سے نوالہ چبانے کی آواز سُنے اور نہ مرے۔

صاحب کا کتا مر گیا۔ خانساماں رونے لگا۔

صاحب : ول خانساماں تم ہمرا کتا کو بہت پیار کرتا تھا؟

خانساماں : حضور بس کچھ نہ پوچھیے۔ آنجہانی مسٹر ٹریہ ہمیشہ چھوٹی رکابیاں پیالے زبان سے چاٹ کے صاف کر دیتے تھے۔ میں دھونے دھلانے کی مصیبت سے بچ جاتا تھا ہائے اللہ! اب کون برتن صاف کرے گا

اسکندریہ کے ایک باغ میں علی ابراہیم عطار صاحب کسی درخت کے نیچے پڑ کے سو رہے۔ بیچارے تھکے ہوئے تھے۔ نیند کم بخت موت کی بہن ہے، ہوش نہ رہا۔ اتنے میں ایک چور آیا۔ اس نے ہونٹوں کی دراڑ سے طلائی دانتوں کی جھلک جو دیکھی تو منہ میں پانی بھر آیا۔ آہستہ سے ہونٹ ہٹا کے بتیسی غائب کر دی۔ بہ چل دہ چل۔ لاحول ولا قوۃ۔ عطار صاحب کو جب ہوش آیا تو ٹھنڈی ناک کی پھنگی سے گلے ملنے بڑھی سیپی موتیوں سے خالی۔ غصہ آیا اور پوپلے مسوڑھے چوریہ پیٹتے گھر آئے۔

ایک بنیا عقل کا اندھا آنکھوں سے چوکس کچھ ڈنڈی ترازو کے پھیر میں ایسا آیا کہ کسی کنوئیں میں دہر دھمکا۔ اتفاق سے کوئی افیونی صاحب بھی پینک میں اونچ نیچ نہ دیکھ سکے۔ اڑڑا دھڑیم۔ غڑاپ سے اسی کنوئیں کے اندر۔ بنیا گھبرایا کہ ارے تو کون۔ انہوں نے کہا ابے تو کون۔ اس نے کہا میں بنیا۔ آپ نے کہا تو لا بھئی ذری سا گڑ تو دے دے۔ (۳۰/ اپریل ۱۸۷۸ء)

ایک ..... اور بگڑے دل سپاہی سے چخ چل گئی۔ وہ جب تک چبوترے سے اینٹ اکھاڑے میاں سپاہی نے اڑنگے پر اٹھا کے مارا تو چاروں شانے چت اور جھٹ چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ اب حضرت جو کھسیانے ہوئے تو کیا کہتے ہیں اچھا اس وقت تو نہیں آنے دو ابکی ہولی تو سہی تمہاری نقل بنوا کے گدھے پر سوار کر دوں۔"

میاں سپاہی: "بھئی ہولی پر کیا موقوف۔ اسی وقت ہماری ران کے نیچے گدھا موجود ہے" (۲۶/ مارچ ۱۸۷۸ء)

مولوی صاحب شاگرد کو ڈانٹ رہے تھے کہ تجھے کل انشاءاللہ پڑھایا تھا کہ ہر بات میں اسے یاد رکھا کر۔ پھر بھول گیا۔ مت تیرے استاد کی ایسی تیسی۔

ایک کچہری کے منشی بھی سن رہے تھے سمجھے کہ انشاءاللہ شاید کوئی بہت سی عمدہ انشاء ہے۔ ہمیں بھی انشاء میں مہارت کم ہے۔ جھٹ مطبع نولکشور اور کانپور میں درخواستیں روانہ کر دیں کہ ایک جلد انشاءاللہ کی جلد بھیجیے

لالہ جی کی ڈاڑھی میں سفید بال سر نکالنے لگے۔ ایک پرانے رفیق مدت کے بعد جو ملے تو کہا "بھائی تمہارے تو سفید بال ہو چلے۔ حضرت فرماتے ہیں "جی مضائقہ نہیں۔ دل تو ویسا ہی سیاہ ہے"

کسی شاعر کا طوطا مر گیا۔ اس نے تاریخ وفات کہی ؎

میاں مٹھو جو ذاکرِ حق تھے　　رات دن ذکرِ حق رٹا کرتے
گربۂ موت نے جو آ دابا　　کچھ نہ بولے سوائے ٹیں ٹیں"

ٹ ی = ٹیں بار = سنہ ۱۲۳۰ھ
۴۰۰ ۱۰

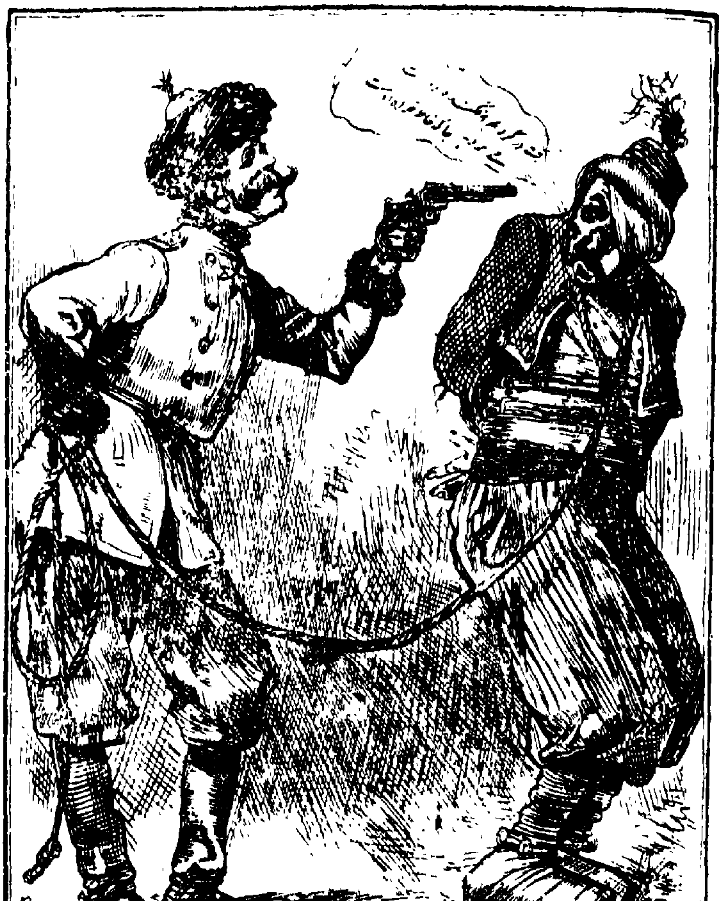

صلحنامہ

روس ”سنا کانفرنس مین کہدینا کہ مین سب طرح راضی ہون - اور بہت خوش ہون نہین تو بچھتاؤ گے
اور تم ہوگے“ ”منقول از فن“

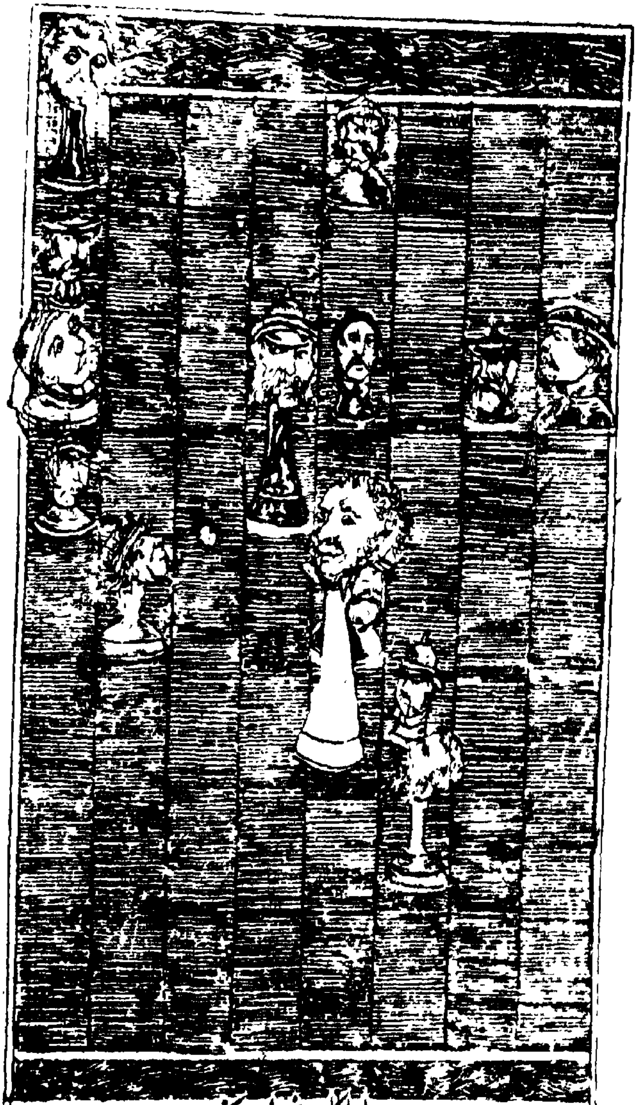

پولیٹکل شطرنج

(شرح کیفیت تو الگ صفحہ پر دی گئی ہے یہاں صرف اسقدر بتا دینا کافی ہے کہ سیاہ بازی روس کی اور سفید بازی انگلنڈ کی ہے۔ اور چال روس کی ہے)

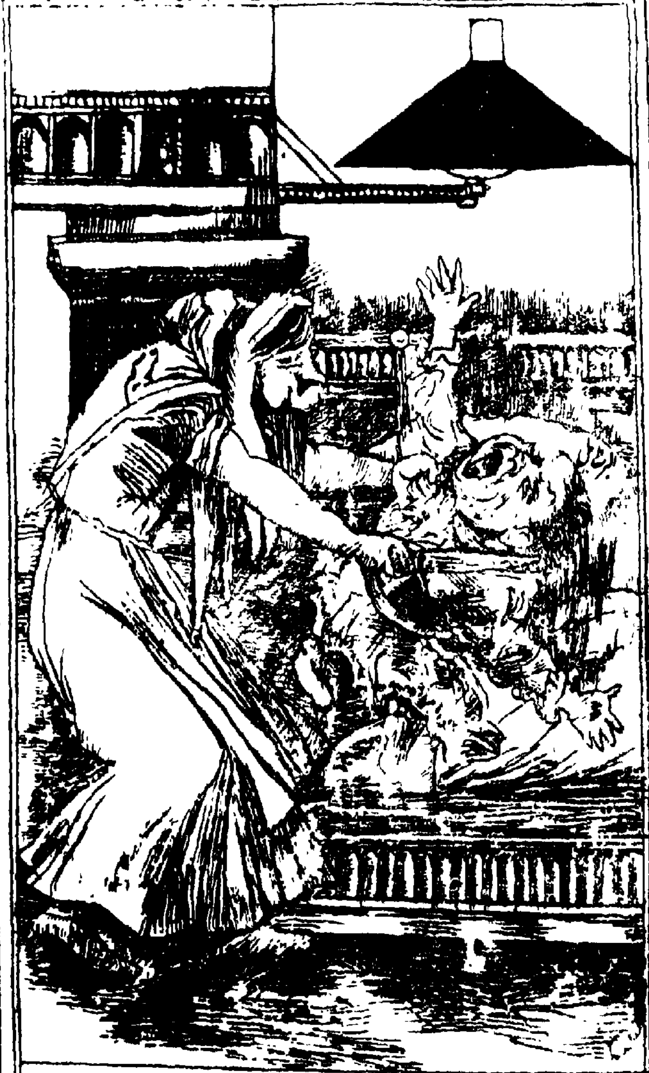

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے حسرت ان غنچون پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ساہ قرضہ واس

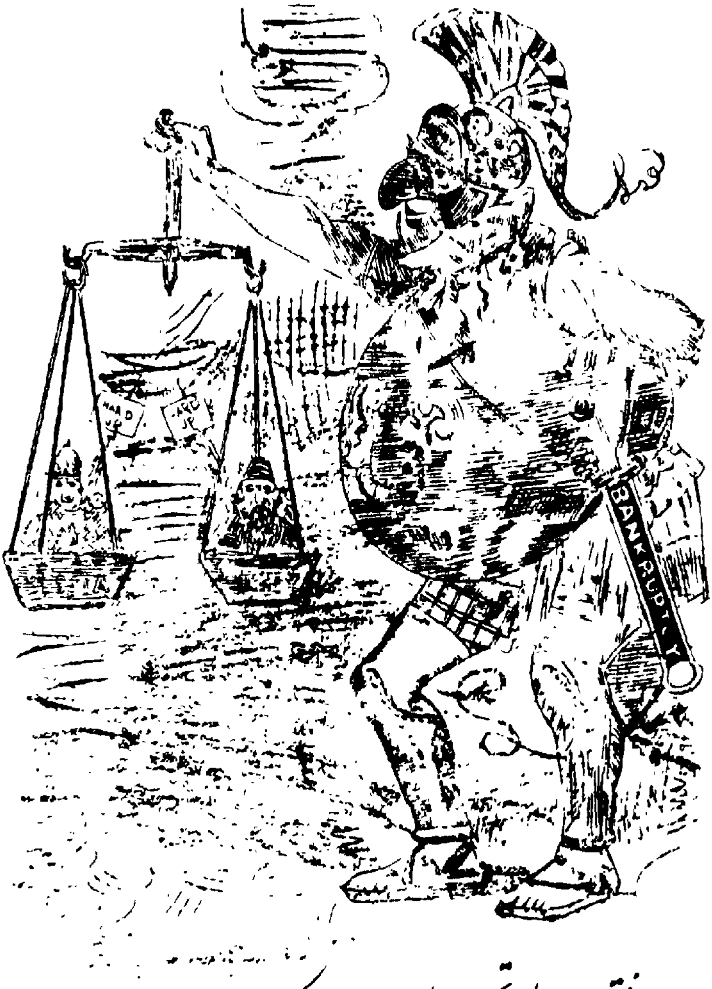
BANKRUPTCY

فتح ہے لمبی تھیلی والے کی !

انڈے بچّے والی چیل چلہٹا

منشی سجّاد حسین

بھلا یہ کیونکر ممکن ہے بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکنے چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی اینٹی صاحبہ جیپ شاہ کی بالکی نمونہ ہی بنی منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی توبہ کیجئے۔ بولیں اور بیچ کھیت بولیں، اس طرح بولیں جیسے ادہر کے کھیت میں پھندیت ہٹیر۔ ملک گلا پھاڑ کے غل مچا کے' سارا شہر سر پہ اٹھا کے جس میں یہاں سے لندن تک تو خبر ہو جائے کہ لکھنؤ میں بھی کچھ اینٹی بھائی ہیں چنانچہ یوں تو عرصے سے سٹر پٹر جلسے کرتے تھے اور بعض حضرات اپنے نزدیک حق ادا کرتے تھے یا مستحق بننے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر جب دیکھا کانگریس کا اجلاس سر پہ آ پہنچا ادھر لفٹیننٹ گورنر بہادر بھی شہر میں تشریف فرما ہیں ادھر حضور وائسرائے بھی دربار فرمانے والے ہیں۔ چھتری سرکس بھی تماشے کر رہا ہے۔ الفریڈ کمپنی بھی تماشے کرنے آئی ہے۔ ان حضرات کو مثل عارضہ متعدی پریچ بچی، بیچینی بڑھی، مادہ ہیجان میں آ ہی گیا اور ایک بار آنکھ بند کر کے تج کچا کے "عظیم الشان" اینٹی کانگریس" کا اشتہار دے ہی دیا کس کی رہی اور کس کی رہ جائے گی۔ وقت گذرتا جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔ خلاصہ اشتہار ملاحظہ ہو:-

> "منجانب مسلمانان شہر لکھنؤ بتاریخ ۳ نومبر ۱۸۹۹ء بمقام بلند باغ کانگریس کا جلسہ سالانہ لکھنؤ میں ہونے والا ہے اس میں کچھ تجویزیں قرار دی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ وہ کل باشندگان شہر کے ہیں ... حالانکہ اس شہر کے قریب قریب کل باشندے چہ ہندو چہ مسلمان ابتدا ہی سے کانگریس کی مخالفت کرتے ہیں لہذا تدارک ہم پر لازم ہے جس کے لئے ایک بڑا جلسہ منجانب مسلمانانِ لکھنؤ بتاریخ مذکورہ نو بجے اتوار کے دن مکان انجمن رفاہِ عام قرار دیا گیا ہے۔ لہذا استدعا ہے کہ وقت مقررہ پر تمام حضرات اہلِ اسلام اس جلسے میں مع اعزہ و اقربا و احباب و متعلقین کے شرکت فرمائیں اور گورنمنٹ کے خیر خواہ بنیں"

یوں تو اشتہار کی کئی باتیں ایسی ہیں جن میں اکثر .... گفتگو ہے مگر ایک بات اس نیاز مند طرفین کو یہ پوچھنا ہے کہ متعلقین کو جو تکلیف دی گئی ہے اس کا انتظام کیا فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ اپنے اینٹی بھائیوں سے کچھ بعید نہ سمجھئے کہ کنجڑوں کی طرح مع متعلقین جلسے میں آ موجود ہوں۔ کیا معنی کہ جب اعزہ و اقربا و احباب کے علاوہ متعلقین کو بھی یاد آپ نے فرمایا ہے اور یہ بھی غالباً المشتہر حسینی

خان بہادر نظیر حسن خاں صاحب کلیم، نواب آغن صاحب، مرزا عباس علی خاں صاحب سکریٹری، حکیم محمد رضا خاں بہادر، شیخ علی عباس صاحب وکیل جانتے ہوں گے کہ متعلقین بی گھر سی یعنی گھر کے لوگوں، یعنی لڑکوں کی والدۂ یعنی اسے جی یعنی بیگم خانم صاحبہ یعنی جورو جی یعنی زوجۂ معظمہ اطال اللہ پانیچہا و آنچل و دوپٹہ ہا، علیٰ رؤس شوہرین الی یوم الوفات بل بعد الممات کو کہتے ہیں تو ان ذات شریف کے اٹھ کھڑے ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی جس طرح تھیٹر، سرکس، گھوڑ دوڑ کے جلسوں میں اکثر اتفاق ہوتا ہے اس طرح یہاں بھی آ دھمکیں گی اور یہ بھی دور نہ سمجھیے کہ جب سارا گھر لیوں شریک ہوگا تو اس دن ضرورت کا سامان بھی ہمراہ ہوگا۔ خواصیں، پیش خدمتیں، شیر خوار بچہ جن کے ابھی ٹیکہ لگا ہوگا اور دانہ ابھرنے یا دانت نکلنے کی وجہ سے چڑچڑا ہوگا۔ پھر اس کا گہوارہ، پالنا، جھنجھنا، چسنی، انا، چھوچھو، مع برادر رضاعی۔ اس کے علاوہ بکری کا بچہ، چند خرگوش اور چینی چوہے، طوطے کا پنجرہ جو ریز کم کرتا ہے اور خاص اس مصلحت سے آئے گا کہ بولنے والے کی بولیاں یاد کرے، باورچی خانے کا بگلا، انا کے صاحبزادے، لطفہ ناتحقیق کا پالا ہوا لینڈی کتے کا پلا، چھوٹی صاحبزادی کا گلہری کا بچہ، بائی گربہ خانم مسماۃ بسی، کبوتروں کی کابک، مرغی کا ٹاپہ، بٹیروں کے تھیلے، بیگم صاحبہ کا پاندان یعنی سب کچھ دان، آفتابہ، آئینہ، اگالدان، طشت، تسلہ، لوٹا، ڈھولک، پایان مسہرے، بچھونے، گاؤ تکیے، بچے کے پوتڑے سہاپچے، لحاف، توشک، سلامتی سے سب کچھ ہوا چاہیں، بس معلوم ہونا چاہیے اس کا کیا سامان کیا گیا ہے اور ہاں بڑی بات تو رہی جاتی ہے یعنی ان سب کا کرایہ کون دے گا بی صاحبہ خدانخواستہ کیوں دینے لگیں۔ کیا وجہ کہ یہ نہایت بدشگونی ہوگی، دوسرے اگر یہ جرمانہ دینا پڑا تو متعلقین کیا معنی متعلقین کے متعلقین یعنی شوہران اور برخوردار بھی گھر سے باہر نہ نکلنے پائیں گے۔ پھر اگر مع اعزہ و اقربا و احباب و متعلقین کے بلانا چاہتے ہیں تو پہلے جلسے کی جانب سے سواریوں کا بندوبست ہونا چاہیے تو پھر اللہ نے چاہا تو تل دھرنے کی جگہ نہ ملے گی۔ اینٹی بھائی بقول اہلِ دکن اپنا اپنا کشلا لئے موجود ہوں گے۔ طاعون والے جلسہ میں تو دکانیں بند تھیں۔ اس دفعہ چولہے تک گھروں میں نہ گرم ہوں تب کی سند مگر جائے استاد خالی۔ ایک بات مشتہر صاحبان بھول گئے یعنی متعلقین کو تو طلب کیا مگر رنڈلیں، خانگیوں کا کہیں ٹھکانہ نہ کیا جو ایک کیا معنی ساری دنیا کے متعلقین ہونے کا پیشہ اٹھائے ہوتے ہیں۔ اور معاملہ فہمی کا یہ حال ہے کہ بی جدن، بی چودھرائن وغیرہ وغیرہ کا تجربہ ذاتی تو غالباً اینٹی بازوں کو کیا بڑے بڑوں تک کو ہوگا بس ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لینا یعنی جب بلوائیں اور ضرور بلوائیں۔ اس کے کیا معنی کہ جہاں بگھیاں پالکیاں ڈولیاں بہل وہاں جو پہلے نہ ہوں۔ واللہ اینٹی دینٹی، تو چار دن کی بات ہے سابقہ تو انہی سے پڑتا ہے۔ اگر اس تقریب میں انہیں نہ پوچھا تو بہتوں سے برادری ترک ہو جائے گی اور شادی بیاہ ہو یا ناچ گانوں کے جلسوں میں کوئی رنڈی منڈی ایک نہ آئے گی اور سفر والیوں کو جو شکایت ہوگی وہ نمک پر جراحت سمجھ لیں۔ ان کی لنترانی گورنمنٹ بھی اندرونی قوت رکھتی ہے ان کا سکہ دلوں پر چلتا ہے۔ ان کے طبلے کی گمک، مانگ متی، توپ، سارنگی، ہنری مارٹنی، مجیرے، مگزم گن سے زیادہ زور رکھتے ہیں اور بی صاحبہ تو پوری ڈائنا میٹ، نارپیڈو ہی ہیں۔ ان کے توڑ کا کیا پوچھنا بلکہ سچ پوچھو تو یہ لوگ ماٹر گن ہیں جن سے اکثر خاندانوں کے خاندان اڑ گئے۔ پس ان کی زد سے ضرور بچنا چاہیے۔

ساتھ میں لے کے اپنے یاروں کو
بینڈ کی بھی جیل مداروں کو

کھلے خط و سربستہ مضامین

منشی سیّد محمد سجّاد حسین مرحوم (ایڈیٹر اودھ پنچ)

(۱)

بنام مسٹر گلیڈ اسٹن

مولوی گلیڈ اسٹن صاحب طولعمرہٗ !

دعائے خیر نصیب شما باد۔ ایسے زمانے میں جبکہ چاروں طرف سے ہوائے شر و فساد ٬ ہر ملک سے سموم بغض و عناد کے جھونکے آرہے ہیں تمہارے حق میں اس سے بڑھ کر مناسب دنیا میں شاید ہی کوئی اور دعا ہوگی ۔

تم غالباً واقف ہوگئے اور اگر نہیں تو اب کان پھٹ پھٹا کر سُن لو کہ یہ تمہارا بوڑھا، خرانٹ ٬ تجربہ کار ٬ زمانہ دیدہ ٬ فلسفی ٬ حکیم ، مورخ ، پولیٹیشن اور خدا جانے کیا کیا دوست ٬ ایسا تاریک خیال اور نامنصف نہیں کہ محض ضد ، ہٹ دھرمی ، استبداد سے کسی معاملے میں ایک طرفہ رائے قائم کرے اور اس کے دوسرے پہلو کی طرف سے عمداً اور ارادۃً اپنی دوراندیش اور باریک بین آنکھیں بالکل بند کرلے ۔ آج کل ہزاروں دوست ہیں تو لاکھوں تمہارے دشمن ۔ دس اچھا کہتے ہیں تو بیس بُرا بھی ۔ مگر یہ سب ہوا کے رُخ اپنا جہازِ رائے چلاتے ٬ انصاف کا انجن ہرگز کام میں نہیں لاتے ۔ لیکن یہ تمہارا اور اپنی ملکہ معظمہ کا سچا ٬ بے میل ٬ پکا ، سولہ آنے ڈبل دوست ٬ خیر خواہ ٬ جاں نثار ٬ اودھ پنچ ان عیوب سے ایسا دور ہے جیسا دین ایمان یا ہندوستان کی نمک حرامی سے ۔ یہ مصلحتِ وقت ٬ دسترس انجام کار سب باتوں پر غور کرتا اور تمہاری ذمہ داریوں ٬ فرائضِ منصبی ٬ مشکلاتِ عہدہ کو خوب جانتا بوجھتا ہے بیشک تم کو چند آدمیوں نے بنایا ہے مگر واضح رہے دو صورتوں میں بنایا جاتا ہے ۔

اوّل جب واقعی اس میں صفت بنائے جانے کی پائی جاتی ہو اور کھلّی باز اپنے ڈھب کا اسے پاتے ہوں ۔

دوسرے اگرچہ وہ فی الحقیقت اس قابل نہ ہو مگر اتفاقاً کچھ حرکات سکنات یا معاملات کی ظاہری صورت ایسی ہو جائے کہ لوگوں کو غلط فہمی واقع ہو ۔

بہر نوع دل لگی بازوں ٬ دور سے تماشا دیکھنے والوں کا الو کہیں نہیں گیا ۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے اور میں تمہارے

احوال ماسبق و حال پر منصفانہ غور کرتا ہوں کہہ سکتا ہوں کہ تم بیچارے درحقیقت ایسے ہرگز نہیں جیسا تم کو آج کل لوگ خیال کرتے ہیں۔

مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ تم بن گئے اور خوب بن گئے۔ بخت و اتفاق کو کوئی ڈزریلی روک سکتا ہے نہ گلیڈ اسٹن۔ مگر اب تو بدنامی کا ٹوکرا تمہارے ہی سر ہے اور سچ بھی یہ ہے کہ اس کے مستحق بھی تم ہی ہو۔ میں نے تمہاری فارن پالیسی کبھی لائق ستائش نہیں پائی۔ رفاہ و فلاح، آرائش و زیبائش ظاہری ٹیپ ٹاپ، اوپری لیپا پوت کے واسطے تمہاری ذات مخصوص ہے مگر اس کے لوازم اور مصالحوں کی فراہمی اور ترکیب سے تم ایسے محروم جیسے ہندوستانی حکومت سے۔ تم پولیٹیکل دسترخوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار رہو۔ پکا پکایا کھانا، تیار ہانڈی تم خوبی سے چن سکتے ہو مگر ہانڈی پکانے اور چیز تیار کرنے کے نام سے خاک دھول بکائن کے پھول۔ تم نہیں جانتے کہ طرح طرح کے کھانوں کے واسطے کون کون سا مصالحہ کیونکر پیسا اور ترکیب دیا جاتا ہے۔ کبابوں میں کس چیز سے گھلاوٹ آتی ہے، پلاؤ کو دم کیسے دیتے ہیں، فارن پالیسی کا مزعفر اور متنجن کیونکر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے۔ کہتے ہیں جو کوئی چھچھوندر مار ڈالتا ہے اس کے ہاتھ سے لذت جاتی رہتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہوا ہو مگر اب یہ ضرورت بے شک معلوم ہوتی ہے کہ پہلے اچھا باورچی اور رکابدار سب تیار کرے۔ پھر دسترخوان لگانے اور خاصہ چننے کو تم بلا لئے جاؤ۔ تم ہرگز اس لائق نہیں کہ دونوں کام تمہارے سپرد ہوں۔ یہ خدمت کچھ کنسرویٹو ہی خوب جانتے ہیں لیکن سردست کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ اس دفعہ کی الٹ پھیر میں تمہارا تو وہی حال ہوا ہے

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

کھانا تیار نہ سامان درست مگر دعوت (جنگ) کی وہ دھوم دھام کہ عالم گونج رہا ہے۔ (ناخواندہ) مہمان ہیں کہ چلے آتے ہیں بلکہ ایک آدھ تو آستین ہاتھ دھوئے قرار واقعی ہتھے مارنے پر مستعد ہیں۔ نظرِ غور سے دیکھا جائے تو تمہارا قصور نہیں۔ جن لوگوں نے اس دفعہ تم کو بلایا اور وہ نہ سمجھے کہ کھانا تو اس دفعہ رکابداروں نے ہنوز تیار نہیں کیا۔ ہم ان کو باورچی خانے سے کیوں نکالے دیتے ہیں۔ اب عین وقت پر کون ہتھیلی پر سرسوں جمانے آتا ہے۔

اشارۂ کنایہ برطرف صاف یہ ہے کہ آجکل تمہارے واسطے بڑے بڑے افکار آموجود ہوئے گو خزانہ و فوج و قوم ہر طرف سے اطمینان ہے مگر سمجھو تو شیطان مانتا نہیں پریشان تو ضرور کرتا ہے۔ خیر اس کی نوبت خدا نہ لائے۔ فی الحال اہل الرائیوں نے تم کو اور بھی بوکھلا رکھا ہے جو ہے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی اٹھاتا ہے مگر صلاح کی صلاحیت ایک میں نہیں۔ سب اپنے دل کی آرزو پیش کرتے ہیں اور تم جانو صلاح و آرزو میں بہت بڑا فرق ہے اس لحاظ سے میں اپنے دست و قلم کو تکلیف دیتا اور تمہاری دماغ خراشی کرتا ہوں۔ تم جانتے ہو فارن معاملات آجکل کیسے پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ مصر اور وسط ایشیا کے معاملات تو سمجھو۔ دو بڑے ستون ہیں جو جمعہ مسجد کی طرح دو رہی

سے سر بلند کیئے کھڑے ہیں۔ باقی ٹرکی کا تذبذب، فوج کی حفاظت میں امیر کی تحاشی، برہما میں کشیدگی، مغربی افریقہ میں جرمن کی بیہودگی، یہ سب امور اگرچہ فرداً فرداً خفیف ہیں مگر بہ ہیئتِ مجموعی اطمینانِ خاطر کے دشمنِ جانی ہیں۔ بُرا نہ لگے تو میں صاف کہوں کہ اکثر یہ دقتیں تمہاری قوم کے غلط قیاسات اور تعرضات سے پیدا ہیں۔ تم نے جو کچھ کسی قوم یا معاملے کی نسبت رائے قائم کی وہ اکثر غلط نکلی۔ چنانچہ مصر کا معاملہ لیجیے۔ تم بغاوت کو قومی نہیں شخصی سمجھے مگر دیکھا۔ ایک عربی گیا، مہدی سودانی (یا سوڈانی) آیا۔ اس کو زیر کرو دیکھو کل ہی عثمان دغنا موجود ہے۔ عثمان کو بھگاؤ یا گرفتار کرو۔ دوسرے کوئی اُن کے بھائی بند لاٹے بوغا پیدا۔ پھر آج تک خیال کرو کتنی فوجیں آئیں کتنی شکستیں دیں۔ باغیوں کو کیسے کیسے کنوئیں جھنکائے لیکن بارہ برس بعد کتے کی دُم وہی ٹیڑھی۔ جب دیکھا مصر کا توام وہی بگڑا ہوا۔ کوئی بادشاہ ہو، صاحبِ تخت و تاج ہو، اس کو زیر کیا، تخت و تاج لے لیا، دارالسلطنت پر قبضہ کیا۔ یہاں سب ایک سرے سے لنگوٹی بند، خانہ بدوش۔ اِدھر سے بھاگے اُدھر ہوئے، اُدھر سے آئے اِدھر ہو رہے۔ بھلا ایسوں سے اُلجھنا اپنی بات کھونا نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر کسی حصّہ ملک کو ان کے حوالے کر بھی دیا تب بھی مطلب حاصل نہ ہوگا۔ کیا وجہ کہ مہدی ملک مانگتا ہے نہ سلطنت اس کو تو تجدیدِ اسلام کا خبط ہے۔ ادھر اطمینان ہوا کہ مکّے اور ٹرکی پر ٹپکا۔

وسط ایشیا میں تمہاری کارروائی چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ اچھا یا بُرا کیا کہا جاوے۔ باقی اس کاہلی سے جو نتائج پیدا ہوئے وہ بلاشبہ ہم کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ اس کی وہی مثل "کچھ نہ کرنا بھی بُرائی کرنا ہے" جہاں تک تمہارا بس رہا ہاتھ پاؤں نہ ہلائے مگر اب تو روس منحوس کے سر جا کر شیطان چڑھا۔ اب تو وہ خواہ مخواہ افغانیوں کو پہنچاتا ہے۔

چونکہ یہ مضمون طویل ہے اور میں سمجھتا ہوں تم کو بھی آج کل کام کی کثرت ہے میں اس خط کو ناتمام چھوڑتا ہوں اس بحث کو دوسرے خط میں لکھ کر ان سب کے علاج بتاؤں گا۔ تم گھبرانا نہیں۔ دیکھو اوسان نہ جانے پائیں۔ گرینول ایسے وقت میں کام کا آدمی ہے۔ ڈفرن کی مستعدی قابلِ صاد۔ زیادہ عمرت دراز باد۔

(۲)

بنام مسٹر گلیڈ اسٹن

مولوی گلیڈ اسٹن صاحب طول عمرہٗ!

دعائے ہمت و جرأت۔ میں اپنے پہلے خط میں وعدہ کر چکا تھا کہ دوسرے ہفتے اپنے خیالاتِ روشن سے تم کو مستفیض کروں گا۔ تم سمجھو کہ پولیٹیکل معاملات پر منحصر نہیں۔ عموماً ہر کام میں ایفائے وعدہ و راستی تقریر و تحریر فی زمانا جوہرِ انسانی تصوّر کی جاتی ہے لہٰذا زیادہ زحمت کش انتظار نہیں رکھتا اور مخاطب کرتا ہوں:

میں نے اپنا سلسلۂ سخن اوس دفعہ وسط ایشیا تک پہنچ کر چھوڑا تھا۔ یہ وہ مقام ہے کہ جس نے بہتوں کے جی چھڑا دیئے ہیں۔ اس سے تم اپنی طرف کوئی اشارہ نہ سمجھنا۔ میرا دستور ہے کہ ہر کس و ناکس سے پتے کی دل لگی نہیں کرتا کیونکہ اس سے

انسان اپنے ہی دل میں خجل ہو جاتا ہے اور مجھے سردست شخصی، قومی، ملکی سب مصلحتوں سے تم کو بددل کرنا منظور نہیں۔ کیا وجہ ایک تو تم یونہی صورتاً سیرتاً بچھیا کے باوا تھے۔ اس پر آج کل کی جگر گھنیوں نے اور بھی کولہو کا بیل بنا دیا ہے۔ شکستہ خاطر تو ہو ہی رہے ہو۔ اگر ووٹ آو کریڈٹ کی ٹھہرائی تو یقینی قوم سے ہنسی خوشی رخصت ہو۔ ہوارڈن کیسل میں تیشے سے بخاری کرنا شروع کر دو گے۔ دل لگی بازوں کا کیا بگڑے گا۔ یہاں کارِ سلطنت میں خلل کا اندیشہ ہے اور سب سے بڑھ کر تو یہ سمجھ لو کہ آج تم نے استعفا داخل کیا اور کل روسی ہرات پر قابض وہ لوگ بڑے قابو پرست اور بے باک موقع شناس ہیں تم وقت گذر جانے کے بعد گدی کی طرف چوٹی ڈھونڈھتے ہو وہ دو قدم آگے سے اس پیشانی والے چار بال اس پھرتی اور چالاکی اور استواری سے پکڑتے ہیں جیسے ہمارے مسٹر ٹیپو کاڈو ریا اپنی نازک بدن زوجہ محبوبہ کے جھونٹے، جب وہ شخص ازراہِ غمزہ و عشوہ کسی دن اس کے واسطے کھانا نہیں پکاتی۔

اچھا اب مصر سے چلو۔ واقعی اگر تم میں کچھ انصاف و شرم و کانشنس ہے تو تمہارا دل ہی جانتا ہو گا کہ اس ذرا سی پھنسی نے کیسا دل باندھا ہے اور زمانہ تہذیب میں کیا کیا سفاکیاں کرائی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ پھنسی اپنی جسامت کی وجہ سے تو بہت خفیف سی ہوتی ہے مگر موضع اور موقع کی بدولت بڑے بڑے کاربنکل اور پھوڑوں سے گوئے سبقت لے جاتی ہے مصر بجائے خود کچھ نہ سہی اس کی سوزائش یا خود یعنی سلطان کچھ تو اپنے ہاتھوں اور کچھ خود غرض دغا باز دوستوں کی بدولت چنداں قابلِ خوف و خطر نہیں مگر یہ بھی معلوم رہے کہ تمہاری یورپین طاقتیں سب مصر کے معاملات میں حصہ بخرہ لگانے کو موجود ہیں۔ وہاں یورپ کی ناک پر بیٹھ کر تم چاہو کہ کوئی ایشیائی سی کارروائی بے غل و غش کر جاؤ یہ محال ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہم کو اپنے زمانہ طفولیت کا واقعہ یاد ہے کہ ایک دفعہ ہمارے دوستوں میں کنکوا لڑتا تھا تم جانو جہاں کنکوا لڑتا ہے۔ کٹے کنکوے چھٹانے یونہی ہاتھ کی صفائی دکھانے کو بازاری لونڈے لاڑی بھی ارد گرد اپنی دمڑچی اور ڈھیلچی لنکیاں بڑھائے رہا کرتے ہیں۔ ایک صاحب اس بلا کے جلد باز اور عجلت پسند تھے کہ جب تک دوسری طرف چھپ کے آپ انہیں ککلیوں سے الجھ جائیں۔ اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے۔ اچھے اچھے سدھ کنکوے اور نفیس مانجھا سب اسی میں صرف ہو گیا ہے اور جب اُدھر کا سر پہ تڑا تڑا یا تو حضرت ہاتھ لگانے کی جگہ ہاتھ ملنے لگے، پس مصر کی روداد بہت کچھ اس سے مشابہ ہے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ یہ ساری گل افشانیاں تمہاری ہی جودتِ طبع کا نتیجہ نہیں۔ یہ قضیہ بھی گذشتہ وزارت نے ترکہ چھوڑا ہے اور تم بیچارے کے سر پڑا لیکن یہ بھی تو سمجھو کہ آخر قوم نے ایسی ہی الٹی خرابیوں کی درستی کے واسطے تو تم کو قلمدانِ وزارت دلوایا اور تم نے قبول کیا۔

علاوہ اس کے بہت سی بے عنوانیاں تو خاص تمہارے ہی صدقے میں واقع ہوئیں۔ بھلا جنرل گارڈن کو بھیج کر تم خاموش ہو رہے۔ پھر اس بیچارے کی خبر بھی نہ لی۔ آخر مروا ڈالا، اس سے تمہاری کتنی بدنامی ہوئی۔ اب یہی دیکھ کر تو سر پیٹر لمسڈن وسطِ ایشیا میں جھلا رہے ہیں۔ دیکھو جتنا تمہارا فرقہ کشت و خوں سے محترز تھا اسی قدر اب باعث ہوا ہے۔

خیر یہ تو داستانِ پارینہ ہے۔ اب مطلب کی یہ بات ہے کہ کرنا کیا چاہیئے۔ خداوند کریم تم کو عقل اور ناصحانِ مشفق

کی بات پر توجہ دے تو سب کچھ درست ہو جائے۔

اس امر کا تصفیہ کہ آیا مقصدِ مہم مصر حاصل ہوا کہ نہیں تو میرے نزدیک کوئی نہیں کر سکتا۔ ابھی جب کوئی مقصد ہو تب تو دیکھا جائے۔ وہاں سرے سے متزلزل اور مبہم کارروائی تھی۔ مقاصد بھی اسی طرح پورے ہوتے رہے بس اب انتظار ہی کس بات کا کرنا لازم آتا ہے۔ اب تم اپنی فوج ٹھکانے ٹھکانے پہنچاؤ۔ ٹرکی کو اوّل تو اس لائق نہ رکھا۔ دوسرے اگر کسی حکمتِ عملی سے چاہو گے کہ اس کی فوج وہاں بھجوا دو کہ وہ بھی حیران پریشان ہوتی پھرے تو یہ سمجھ لو کہ تم وہی غلطی پھر کرو گے جو اس فتنۂ عظیم کی بنا ہے۔

شاید تم اپنی بطی الہضمی سے اس بلیغ چٹکلے کو فوراً نہ سمجھو گے مگر مجھے سرِ دست صراحت منظور نہیں۔ مناسب ہوا تو پھر کبھی بتا دوں گا۔

اب رہی کوئی اور یورپین طاقت خانہ مخود مطلبی خراب "اب تو برابر والوں کے ساتھ یہ حال ہے ؎

اسی خاطر تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

ہاں ایک اٹلی ہے، سو میرے نزدیک چہ خفتہ چہ بیدار۔ عقلاء کے نزدیک کچھ نہ سہی مگر حال میں فرانس نے تم کو زک فاش دی۔ فرانسیسی اخبار بند کروا کر مصر سے معذرت کرانا آدابِ شہنشاہی کے خلاف تھا مگر تم سے ہم کو اوّل روز وزارت سے ایسی ہی امیدیں تھیں۔ وزارتِ سابق میں تم امریکہ والوں سے کھا بدے۔ جنیوا میں چند چلتے پُرزے جمع ہوئے اور تمہاری سلطنت کو الباما کا تاوان دینا پڑا۔ وزارت حال پر آتے سے کچھ روز پہلے تم نے سلطنت آسٹریا کو سخت سست کہا تھا منسٹری نصیب ہوتے پہ تمہاری پہلی حرکت کا تاوان دینا پڑا۔

سالی کہ نکوست از بہارش پیداست

پس تم نے تو بادپاشا سے معذرت کرائی تو کون سی نئی بات کی جس نے اپنی ٹوپی اتار لی اس کو اور کا کیا خیال۔

لیکن حال کی پیچیدگیوں کو دیکھتے تم نے کمال حلم اور بردباری کی۔ اس پہ میرا صاد ہے۔ میں اس کارروائی کا مخالف نہیں۔ واقعی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ کاش خدا تمہاری ایسی ہی موقع شناس عقل رکھے۔ جس دُھن اور ڈھرے پر ہو اسی پہ قائم رہو۔

---

(۳)

بنام مسٹر گلیڈ اسٹن

مولوی گلیڈ اسٹن طول عمرہٗ !

آج کل زمانہ ایسی جلد جلد کروٹیں بدل رہا ہے اور تم بھی اس کے ساتھ وہ قلابازیاں کھا رہے ہو کہ معلوم نہیں اس تحریر کے پہنچتے پہنچتے چمنِ دہر میں کون کون جدید گل کھلیں اور کون انوکھے شگوفے سر بلند کریں۔ اسی جہت سے میری دو دو باتیں تم چٹ پٹ اور سُن لو اور اپنا راستہ پکڑو۔ باقی اتفاقات کا چکر تو کسی کے روکے رُک نہیں سکتا۔ جو جس کام کے واسطے بنا ہے جب مہلت موقع پائے گا۔ اپنی علت غائی پوری کرے گا۔

تم سمجھو۔ مہدی، عثمان دیغما، زار روس اور اس کے ارکانِ سلطنت، ارنیل جنرل، علی خانوف، کروف، بے وقوف جن کی بے ایمانی بہ ذوف، آخر عالم اسباب میں جھگڑے فساد، قتل و غارت ہی کے واسطے آئے ہیں کہ میری آپ کی طرح علوم فنون، حکمت، فلسفہ، تہذیب، ترقی کے واسطے جان کھپانے، کوشش کرنے، یہ مانا کہ تم نے درگزر کر کے معاملہ مختصر کیا مگر حرامزادے کی رسی دراز، سرِدست یہ سلسلہ ختم ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ پس جوبات کرو زمانے کے موافق۔ میں نے پہلے خط میں سب تفصیل لکھ دی ہے کہ اگر تم مصر کے جھگڑے کو یوں چھوڑ جاؤ گے تو بڑی خطا کی۔ جن کا بھروسا تھا میں نے ان کی قلعی بھی کھول دی۔ پس اب سوا اس کے کوئی صورت ہی نہیں باقی کہ مصر میں، اگریسو پالیسی یعنی فتاحی کی حکمتِ عملی بالکل ترک کی جائے۔ مہدی و عثمان دیغما وغیرہ کی عداوت سینۂ بے کینہ سے آزاد ہو۔ اب جس قدر قبض و تصرف میں ہے اس پر ایک دفعہ آیۃ الکرسی پڑھ کر پھونک دی جاوے اور اسی طرح اس کی محافظت کی جاوے جیسے مرغی اپنی ساری جھوں پیٹ کے نیچے چھپائے رہتی ہے۔ اگر حملہ کرو تو دفاعی، مقابلہ کرو تو حفاظتی۔ ساری فوج بلا لینا اور ملک کو اس سے تتر بتر کر کے چھوڑ دینا یہ کس خدا نے بتایا اور کس ایمان نے سکھایا ہے۔ اب لازم ہے سب افواج در مقام مناسب محفوظ پہ جمع رکھو کہ مصر والوں کے کام بھی لا سکو اور سرحد ہندوستان کے جھگڑے میں بھی بلا سکو۔

اب رہا روس کا جھگڑا، اس کی کیفیت یہ ہے کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی کے ساتھ حسنِ عقیدت ہوا کرتا ہے کسی کو اپنے کسی دوست سے ایسی امید ہوتی ہے کہ سراسر خلاف ترصد حرکات دیکھتا جاتا ہے مگر عقیدت نہیں جاتی۔ کوئی بزرگوار اپنی زوجۂ مقدس کی جانب سے وہ حسنِ ظن (زن نہیں) رکھتے ہیں کہ آیت حدیث غلط ؎

حکمِ جورو جی بہ از حکمِ خداست
آنچہ جورو جی بفرماید رواست

کسی کو کسی حکیم طبیب ڈاکٹر پر وہ اعتقاد ہوتا ہے کہ صریح حضرت قلم کا تیغ دستاں کر رہے ہے۔ خدا گنج کی نوآبادی کو ہر روز ہزاروں کا چالان بھیج رہے ہیں مگر یہاں مسیحائے دوراں حضرت ہی ہیں۔ کسی کو کسی وکیل صاحب پر اطمینان ہے۔ کہ معاملہ فہمی سے اس قدر دور جیسے اعمیٰ بینائی سے مگر یہاں سارے عالم کا قانون انہی کی نوکِ زبان پہ ہے۔ بعض کو کسی شاعر پر عقیدہ ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا مہمل گوئی پر ملامت کناں ہے مگر آپ کو وہی کلام مرغوب و مطبوع۔ پس اسی طرح سمجھ لو تم کو بھی روس کے ساتھ حسنِ عقیدت ہے۔ تمہارا دل و دماغ اتنا وسیع ہی نہیں کہ روس کی چالاکیوں اور فریب کے دفتر کا ایک حرف بھی اس میں سما سکے۔ تم بیچارے اس کے فتنہ و فساد کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ تم میں فرلودیت کا وہ جوش ہے کہ تم جان نہیں سکتے۔ آن سلطنت، صولت و شوکتِ شہنشاہی، شکوہ و شانِ قیصری کیا ہے۔ پھر اس کی کمی بیشی کا اندازہ تم کو کیا خاک پتھر مل سکتا ہے۔

الغرض اس حسنِ عقیدت نے تم کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ علاوہ اس کے دو حماقتیں تمہاری قوم سے ایسی ہوئی ہیں کہ مدت تک ان کا اثرِ بد تم کو سہنا پڑے گا۔ اوّل تو مختلف تعصباتِ مذہبی، قابو پرستی، تنگ نظری کی بدولت تمہاری دونوں

پارٹیوں نے سلطنت ٹرکی کو ایسا ضعیف اور نحیف کر دیا کہ روس کے ساتھ کلہ بکلہ لڑنے والا کوئی نہیں رہا۔ یونان کی بادشاہت نئے سرے سے قائم ہو گئی۔ کرسنڈلم میں اسلامی سلطنت خلل انداز تھی وہ قوت میں کم ہوئی۔ مگر یہ بھی سمجھ لو تم نے ایک دوست کے ساتھ گھاٹے کے وقت پر کنائی کاٹی، سلطنت و شاہی کے خلاف کیا۔ یہ تمہاری کوتاہ فہمی ہے کہ دنیا کی بادشاہت کو مذہبی سلطنت سمجھتے ہو۔ اگر مذہب کو بادشاہت میں ایسا دخل ہوتا تو سارے پیغمبر اور اولیا رشی اور منی بادشاہت ہی کرتے۔ تم نے ایک طرف مذہبی تعصبات پر قہقہہ اڑایا، اور دوسری طرف مذہبی عناد و عداوت کو ہادی بنایا۔ حال کی جنگ روم و روس میں اگرچہ کنزرویٹو پارٹی برسرِ حکومت تھی اور جو امر فروگذاشت ہوا اس کا عذاب ثواب اس کی گردن پر۔ مگر انصافاً کہو کہ تم اس پالیسی میں کیسے شریکِ غالب رہے۔ جھوٹ یا سچ جو کچھ وہ کہنے والے تھے تم نے ہفتہ ہفتہ بھر میں دو دو لمبے چوڑے رسالے شائع کر کے ان کو باز رکھا۔ بلگیریا کے مظالم رنگنے کو تو آپ کا قلم خونیں رقم رواں دواں تھا مگر اب فسانۂ بادہ سوا فغان سرحد پہ کٹ گیا۔ آپ کی کمیشن کی توہین ہوئی۔ اس کے ساتھ کے لوگ بے رحمی فصل سے کھیت رہے۔ جاڑے پالے کے مارے ٹھنڈے ٹھنڈے ملکِ عدم کا راستہ ناپنے لگے۔ مصر اور سوڈان اور خرطوم میں انسانوں کی قربانی کرا ڈالی۔ اس پہ جودتِ طبع صرف نہیں ہوتی ؎

بس گرسنہ خفت و کس ندانست کہ کیست
بس جان بہ لب آمد کہ برو کس نہ گریست

المختصر روس کو غلبہ نصیب ہوا۔ پھر اس کا نتیجہ کھلا ہی رکھا ہے کہ وسط ایشیا میں کارروائی کرنے کو اب سلطان کو اپنی طرف ملاؤ تو کیا اور جُدا رکھو تو کیا۔ اب تو روس ذرا ذرا سی بات پر ان کو دھمکا کر اپنی طرف سازش پر مجبور کر سکتا ہے۔ بہت رعایت کی نیوٹرل رہنے دیا۔ اس حماقت کا خمیازہ تمہاری حیات میں کیا بعد ممات تک انگلستان کو بھگتنا پڑے گا۔ تمہاری قوم جس قدر ٹرکی سے متاثرت کرتی جائے گی اسی قدر سزور لالیعنی اور تیحنر فضول کے ثمرے اٹھائے گی۔

دوسری خطا یہ ہوئی کہ جب معلوم تھا کہ افغانستان پہ ہم قبضہ نہیں رکھ سکتے۔ اس میں آمدنی نہ منافع۔ قوم پرورش پا سکتی ہے نہ تجارت چل سکتی ہے تو پھر شیر علی خان سے لڑنا اور کابل قندھار فتح کرنا سراسر فضول تھا۔ اس میں اتنی بات ہوئی کہ تم شریک نہ تھے۔ لیکن اوّل منزل پہنچانے کی خدمت تمہارے ہی سر پڑی۔ اس میں تم نے اپنی حماقت صرف کی یعنی ساری کارروائی کالعدم کر دی حالانکہ قندھار پہ قبضہ رکھنا لازم تھا۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا اب روس نے قدم بڑھایا اور تمہارے کمیشن کی سخت توہین کی۔ میں اس جگہ اس سے بحث نہ کروں گا کہ تم سے اس بارے میں کیا عقلمندیاں ہوئیں مگر اس قدر ضرور کہوں گا کہ جو چال تم چلے وہ بُری چلے۔ اگر کوئی اچھی سوچے بھی تو انجام بخوش اسلوبی نہ ہو سکا۔ کمیشن سرحدی کی تجویز ایسی معقول تھی کہ باید و شاید مگر وہی دم کی کسر رہ گئی جس کا اعادہ فضول ہے۔ اب بعد قبضۂ پنجدیہ و مردچک و چاپی بصرہ جو مالش کا معاملہ ٹھہرا ہے۔ اس کی نسبت بھی کچھ نہ کہوں گا۔

جو ہونا تھا ہو گیا۔ تم نے میرے اشارات پر عمل نہ کیا۔ تمہاری قوم اور تمہارا خدا اپنے سمجھ لے گا۔ اب واقعی انگریزی عظمت وحشیوں کی نظر میں کم کرادی۔ سر پیٹر لمسڈن سا افسر کمیشن روس کے چالاک اور چلتے پرزے کمروف علی خانوف کے مقابلے میں دوسرا خدا نے پیدا ہی نہیں کیا۔ اب ؎

قرن ہا باید کہ تا یک لمسڈن از لطفِ طبع
صاحبِ غیرت شود یا زیرک و ڈپلومٹ

سر (معنی صاحب نہیں بلکہ یہی سر جو آج کل مصر کے مخروطی میناروں اور وسط ایشیا کے لق و دق میدانوں میں ہم آپ ٹکرا رہے ہیں اور پیٹر (بمعنی پیٹنے والا از علامت فاعل) لمس معنی چھونا، ڈن یا دن آواز توپ و بندوق۔ پس مطلب یہ کہ ایسا سر پیٹنے والا کہ لمس کرنے سے دن سے چھوٹ جاتا ہے۔ آدمی کاہے کو چاندی کی بارود ہے۔ خشکی کا تارپیڈو ہے۔ مگر افسوس تمہاری کاہلی سے روس نے اس کو محض آتشبازی بنایا۔ کمیشن سمیت بے چارہ چھنک کر رہ گیا اور اب اگر چھوٹا بھی تو کمیشن سے مستعفی ہو کر، بم کے گولے کی طرح سیدھا اپنے گھر کی طرف راہی ہوا۔ اب اس مسگھڑ بھلائی کو تہ کر رکھیے اور سارے کمیشن کو بلا لیجیے۔ لندن ہو یا ڈنمارک بطور خود کارروائی کیجیے۔ اس کے بعد جب تصفیۂ زمین بر سر زمین فیصل کرنے کی نوبت آئے تو اپنا کمیشن سینٹ پیٹرس برگ سے بہ معیت کمیشن روس بھیجیے کیونکہ پولٹیکل معاملات ایک طرف یوں بھی دو شخص جب کسی جگہ اس طرح ملنے کا بندوبست کرتے ہیں کہ ایک طرف سے ایک دوسری طرف سے دوسرا چل کر مقام پر پہنچے تو دقت سے خالی نہیں ہوتا۔

اب رہی شاہ ڈنمارک کی ثالثی۔ یہ سچ ہے کہ ثالث صاحب کی ایک بیٹی زار روس کو ایک پرنس آف ویلس کو بیاہی ہیں۔ دونوں سلطنتوں سے قرابتِ قریبہ ہے مگر تم اس قدر ضرور سمجھ لو کہ گو وہ بادشاہ اعزاز میں قدیم ہے۔ مگر بادشاہت اور ملک گیری سے بالخلقت محروم ہے (ایسے بادشاہ کے واسطے تمہارا سا وزیر بہت مناسب تھا۔ اس نے اپنا ہی ملک جہیزوں وغیرہ میں دے دلا کر مختصر کر رکھا ہے۔ وہ ملک گیری اور ملک دہی کی لذت سے بالکل ناواقف اس کے علاوہ میں پوچھتا ہوں اس کی نظروں میں روس اور انگلستان بوجہ قرابت کیوں برابر ہونے لگے۔ ہاں تم کسی جدید منطق سے ثابت کر دو کہ جس طرح شہنشاہ روس کو ایک بیٹی بیاہی ہے۔ اسی طرح ہماری قیصرِ ہند ملکہ معظمہ کو دوسری تو البتہ میں بھی برابر سمجھوں ورنہ بادشاہوں میں ایسی باتوں کو مانیں تو زارِ روس ہی کیوں انگریزوں کو ستائیں۔

تمہاری کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روس جس حصۂ ملک پر قابض ہو گیا ہے وہ بہ رضامندی امیرِ کابل اسی کے سر رہے گا۔ آئندہ کا وعدہ لے لیا جائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ تم فضولیات میں مبتلا ہو کر مقصدِ اصلی کو اس طرح سنٹ سے نکل جانے دیتے ہو جیسے چوہے دان سے چوہا یا ہاتھ سے زندہ مچھلی۔ امیر تو وہ ویران حصۂ ملک جو بہ قبضۂ روس آیا۔ ۲۰ مارچ کو بیع کر چکے اور تم سے دام بھی راولپنڈی میں وصول کر چکے ان کو پروا ہی کیا۔ تم نے جس مصلحت سے افغانستان کو وظیفے دیئے، تحفے نذر کیئے اس کا خیال تو تم کو لازم ہے۔ اگر روس کو بڑھنے دیتے

ہو تو خیر، جلال آباد، قطع، پشاور، ڈیرہ جات پر فوج جا کر منتظرِ روس بیٹھو۔ پھر امیر کی اعانت کی ضرورت نہ وظیفوں کی حاجت اور اگر ہمسائگی روس نہیں چاہتے تو ایک چپہ زمین نہ لیتے دو یا ہرات (جس پر وہ کوئی دن میں آیا ہی چاہتا ہے) روس کے سر مڑھو اور قندھار پر خود قبضہ کرو۔ جی چاہے دام دونوں کے اپنے خزانے سے دینا۔ روس بیچارہ مفلس ہے ــــــ سمجھ لینا ڈچس اڈنبرا کے مہر میں رقم مجرا ہوئی۔

اگرچہ جانتا ہوں تم میری باتوں کو کم سمجھتے ہو مگر اتنا پھر بتاؤں گا کہ یہ سامان تیاری افواج جاری رکھو اس کی بدولت پارلیمنٹ روپیہ دے گی، روس دبے گا، افاغنہ تالیاں اور بغلیں نہ بجائیں گے، وحشی اقوام عبرت کی نظر سے دیکھیں گے

چونکہ یہ اخیر خط تھا کسی قدر طویل ہو گیا ہے۔ اب مجھے اور شاگردوں کو تعلیم دینا ہے۔ تم کو چندے کوئی خط نہ لکھوں گا۔

مکرر آنکہ ان اہم معاملات کے علاوہ اور جو چھوٹے چھوٹے خرخشے ہیں وہ بھی اس درستی کے ساتھ خود درست ہو جائیں گے۔

(۴)

بنام ملکۂ وکٹوریہ (قیصرِ ہند)

ملکۂ سکندر حشم دامت ظلہا!

اگرچہ تمہارے ملک و حشم کے آئین و قوانین ملکداری رفتہ رفتہ ایسے ڈھرے پہ آ گئے ہیں کہ حاکمِ وقت کو انتظام مہام میں خود سری و خود رائی کے منہ زور رہوار پر سواری کی نوبت نہیں آتی اور محض زمانہ کی ہوا، قوم کی نبض دیکھ کر اپنی رفتار مطابق کر لینا ہوتی ہے۔ سلطنت ایک ٹرین ہے جس کا انجن پارلیمنٹ۔ چند چلتے پرزوں کی قوت اور کام سے واقف ہو کر مباحثِ ملکی کی سردی گرمی سے رایوں کی سلنڈر کی رفتار پر نظر رکھنا اور ٹرین چلانا صرف کاریست کہ فراستِ حاکم میخواہد اور باقی دنیا کے سارے بکھیڑے، جھنجھٹ پارلیمنٹ کے سر اور وزرا کے حوالے۔ مگر پھر بھی بندہ بشر، گہوارۂ عالم کے نشیب و فراز زمانے کی سردی گرمی دماغ پر تو کچھ نہ کچھ اثر ضرور پیدا کرتی ہے۔ چونکہ میرے علم و یقین میں تم بھی انسان اشرف البنیان ہو لہٰذا تم کو بھی ایسے خرخشوں سے معرا و مبرا نہیں پاتا اور ضرورت دیکھتا ہوں کہ بعد تعلیم و تلقین گلیڈ اسٹن چند کلمات تمہارے گوشِ حق نیوش تک پہنچا دوں۔

آج کل معاملات کا قوام بہت کچھ بگڑا معلوم ہوتا ہے۔ اگر فعالہ اولوالعزمی کی چاشنی اندازۂ اعتدال سے بڑھ کر حلاوت ملکداری میں زیادہ ترشی دکھلائے تو چنداں ناگوار نہیں گزرتا۔ کیا وجہ کہ وہ تو ایک باطنی بنگ ہے جو کاسۂ دماغ میں گھٹ گھٹ کر اثر پیدا کرتی اور موجیں دکھاتی ہے مگر صلح اور امن کی حالت منفعلہ کا شربت بزوری معتدل ادنی اسی کمی بیشی میں بگڑ جاتا اور خدا جانے کیسی الٹی پلٹی تاثیرات پیدا کرتا ہے جب کوئی فعل درجہ ملازمی سے گزر کر متعدی ہو جاتا ہے۔ تو ایک شخص کی ذات تک محدود نہیں رہتا۔ ممکن ہے کہ بہت سے امور کا وقوع ایک کو ناپسند ہو مگر ضرور نہیں کہ دوسرا

بھی اسی قدر کراہت کرے۔ پس انسان لا محالہ چار و ناچار طوعاً و کرہاً بہت سے افعال اسی وجہ سے کرتا ہے۔ تم بھی اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو۔ سب سے اہم اور ضروری کام عموماً حاکموں اور خصوصاً تمہارے واسطے زمانے اور قوم کی رفتار پر نظر رکھنا ہے۔

زمانے کا چلن آج کل پر کیا منحصر ہے ہمیشہ آگے کی جانب رہا ہے۔ چُستی اور سُستی عارضی امور ہیں مگر میل اور رجحان اسی جانب رہے۔

قدم وقت بیشتر باشد

گاہے ماہے وقفہ یا مکث زیادہ تیزی اور سرعت کے ساتھ رواں ہونے کو ہوا کرتا ہے۔ جیسے آندھی آنے سے پہلے ہوا میں سکون کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح جب عالم اسباب میں تولید واقعات کمی پر ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ مادر گیتی اس دفعہ بڑے بڑے گھن گرج جھول نکالنے والی ہے۔ عقلمند اور انجام بین ہر وقت چوکنا اور ہر کام کے واسطے مستعد رہا کرتے ہیں۔ تم بھی ایسی ہی ہو مگر اتنی کسر ہے کہ تمہاری قوم کثرتِ کامیابی اور فرطِ سامان سے اس قدر مغرور اور متکبر ہو گئی ہے کہ اب بلا خوض و فکر اور داہنے بائیں دیکھے دوسروں کے مقابلے میں اپنی ہر چیز کو اعلیٰ اور افضل سمجھتی ہے۔ اس سے علاوہ دیگر نتائج کے یہ نقصان ہوتا ہے کہ وقت پر چند ایسے امور ناپسندیدہ و نامطبوع سے سامنا ہو جاتا ہے۔ کہ جن سے طبیعت میل کھاتی ہے نہ گوارا کر سکتی ہے۔

عالی ہمتی اور بلند خیالی اور کارہائے سترگ کرنے کے واسطے خفیف سی لاپروائی اور بلند نظری وہی خدمت انجام دیتی ہے جو راہگیر کو لاٹھی یا چھڑی۔

مگر کون کہہ سکتا ہے کہ بہرام گھاٹ کے پورے لیٹے کی لاٹھی موجبِ زحمت نہ ہوگی۔

ترقی ہو یا تنزل در اصل دونوں ایک اور ایک ہی دو ہیں۔ صرف نام کا فرق ہے۔ گیند کو دیکھو اور بتاؤ اس میں سے کس مقام کو اونچا اور کس کو نیچا کہہ سکتے ہو۔ اسی طرح زمانے کو چکر یا دائرہ یا چرخ جو چاہو کہو، دنیا کے ساتھ رواں دواں ہے۔ یہ محض ہماری فہم ہے کہ مختلف نام پیدا کرتی ہے۔

حیات و ممات، صحت و عارضہ، ترقی و تنزل چولی دامن کا ساتھ رکھتے ہیں۔ تمہاری قوم تہذیب اور ترقی کے درجے کو طے کر چکی اب اس کو سنبھلنا چاہیئے اور بہت پھونک پھونک قدم رکھنا لازم ہے۔ سارا یورپ اپنے واسطے ایک طوفانِ عظیم بنا رہا ہے۔ تمہارا ملک اس سے قبل کسی قدر فصل اور مغائرت کے باعث بہت سی آفات میں شریکِ یورپ نہ ہو سکا۔ اب عنایتِ خدا سے تمہاری وہ سلطنت ہے جس پر آفتاب غروب ہی نہیں ہوتا۔ اب ہر جگہ کی سرد و گرم ہوا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پیدا کرے گی۔ اگر تمہاری قوم عقیل ہے تو اس کو لازم ہے کہ

اگر خواہی سلامت بر کنار است

پر عمل کرکے پھونک پھونک قدم رکھے۔

لبرل فرقہ باعتبار پولٹیکل مباحث بے شک، مجھے پسند ہے مگر اعتدال کی دم ضروری۔ افعال لازمی اس کے بہت اچھے ہوتے ہیں مستعدی میں بوجہ تکبر و غرورِ قومی اور لاپروائی کسبی و دیگر اسباب خفیف و عظیم معاملہ دگرگوں ہو جاتا ہے۔

ایک اور امر جو تمہاری توجہ خاص کا محتاج ہے یہ ہے کہ یورپ کے ساتھوں ساتھ تمہارے انگلستان میں مذہب کے خیالی باغ و بوستان کے ہرے بھرے سبز و شاداب تناور درخت سموم علم نظری و ظاہری کے جھونکوں سے جڑ سے اکھڑ اکھڑ کر گر رہے ہیں۔ صرف تھوڑے سے لنڈ منڈ تنے اپنی سخت جانی سے بچ رہے سو وہ بھی امروز و فردا میں کوچ کرتے نظر آتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی قوم ظاہری، صوری و معنوی طور سے خود سر و آزاد ہو کر بادشاہی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ جس نے حاکم حقیقی کی اطاعت کا بوجھ سر سے پھینک دیا وہ حاکم مجازی کو پہلے سلام کر چکا۔ مذہب اب صرف ظاہری مراسم اور آرائش و زیبائش کے واسطے رہ گیا ہے اس کے اصلی تصدیق و تسکین سے مدت ہوئی کہ ناآشنائی ہو چکی ہے۔ اگر کچھ ہے تو تقدس کی جگہ وضعداری خلقی اور نیچرل رفتارِ زمانہ کسی کے روکے نہیں رک سکتی۔ آگ، پانی اور ہوا کسی کی تدبیر سے اپنی قوت ترک نہیں کر سکتے مگر ان کی قوتوں سے کام مفید لینا آج کل کے حکما اور عقلا کا کام ہے۔

المختصر اسی طرح اور بھی چند امور ہیں جن کو دوسرے خط میں لکھوں گا۔ اب تم جاؤ زارِ روس کو خط بھیجو۔ میں بھی کائنات کی سیر کو جاتا ہوں۔

(۵)

بنام ملکۂ وکٹوریہ (قیصرِ ہند)

ملکۂ سکندر حشم دامت ظلہا!

میں نے اپنے پہلے خط میں دوسرے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی جہت سے اگرچہ مجھے ساری دنیا کے بکھیڑوں اور تم کو اپنی پارلیمنٹ کے جھگڑوں، وزرا کے استعفوں سے مہلت کم ہے مگر ایفائے وعدہ کرتا ہوں۔

سب سے پہلے پیش پا افتادہ مضمون وزارت کا ہے۔ جو کچھ ہوا اور تم نے اور گلیڈ اسٹن نے کیا وہ تو ہو چکا۔ اس کا ذکر نہیں، کیا وجہ کہ میری عادت ہے معاملاتِ گذشتہ کو بجز مورخانہ تجربہ کے اور کسی لائق نہیں سمجھتا۔ تم نے سالسبری کو وزارت دی۔ اچھا کیا نہ بُرا۔ آخر تم بیچاری کرتیں بھی کیا۔ کنسرویٹو فرقہ اب ایسا بے سر اور بے تکا ہو رہا ہے کہ کوئی ٹھکانہ نہیں۔ بس یہی اندھوں میں کانے راجا تھے۔ اب نظرِ تعمق سے ملاحظہ کیجئے تو ایسے فرقے کا کمزور ہوتا جانا جو قدیم باتوں کا (جن میں شخصی سلطنت بھی شامل ہے) حامی ہو بادشاہوں کی ذات کے واسطے فالِ نیک نہیں۔

بگوئی

لارڈ رنڈالف چرچل جو بدقسمتی ہندوستان سے وزیرِ ہند ہوئے ہیں بجائے خود تیز آدمی ہیں مگر کم سنی اور درشت اور بدزبانی مانع ترقی ہے۔

معاملاتِ ہندوستان تمہاری خاص توجہ کے محتاج ہیں اور میری رائے میں تم بھی اس کی۔ آج تک تمہارے ملک اور پارلیمنٹ میں جس قدر توجہ ہوئی ہے وہ بالکل ناکافی ہے اور لاپروائی سے مملو۔ یہ سمجھ لو کہ آزادگی اور شوریدگئ قوم کی دست

سے اعزازِ قیصری محفوظ رکھنے کا صندوقچہ ہندوستان ہی ہے۔ اگر تنکا ہوا کا رُخ بتاتا ہے تو ایک شہزادے کی تنخواہ کے بارے میں قوم کی خست بہت کچھ سمجھاتی ہے۔ یہ اسی ہندوستان کے جگرے ہیں جو بادشاہوں کا تقدس تک چاہتا ہے۔

بھلا کچھ تو ہے کہ ہر اولوالعزم کو جہاں زمانے نے کسی قدر بھی وسعت دی اس نے اسی طرف کو رُخ کیا۔ ظاہر میں اگرچہ میں یہاں کا باشندہ نہیں مگر دراصل میں ساری دنیا کا بسنے والا ہوں۔ ازل سے اس ملک کی خوبیاں مجھ پر اس طرح روشن ہیں جیسے بادشاہوں میں آج کل زار روس۔ سکندر نے میرے ہی مشورے پر کاربند ہو کر ادھر کا قصد کیا تھا۔ مگر افسوس اس کی فوج نے وہی ارادے ایک دوسرے عنوان سے برتے جس کے جام سے تمہاری قوم آج کل بدمست ہے" اور آخر اس کا نتیجہ جو ہوا اس سے میرا یا سکندر ہی کا دل آگاہ ہے اور تھا۔ جب تک ہندوستان انگلستان کا ضمیمہ دُم چھلا بنا رہے گا پارلیمنٹ انگلستان میں اس کا گیند دھڑکا ہوگا، وہاں کا ادنیٰ سے ادنیٰ گورا ہندوستان میں دیوتا بن کر جہاز سے اُترے گا تب تک ہندوستان ہندوستان نہ ہوگا۔ لاکھ روپیہ کی بات تم کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر شے کی خوبی ذاتی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک اس کی ذات میں فرق نہ آئے۔ آم تب تک ہی آم ہے جب تک املی نہیں بنایا گیا ہے۔ پس اسی طرح ہندوستان اسی وقت تک ہندوستان ہے جب تک ہندوستان کی ذات میں خلل نہیں آیا۔

تہذیب اور ترقی صدق اور راستی کے جانی دشمن ہیں مگر کیسے جیسے مارِ آستین۔ حکما کہتے ہیں کہ نیکی کو کسی طمع سے عمل میں لانا نیکی نہیں اور اسی کو ایشیائی شاعر یوں کہہ گیا ہے ؎

کب حق پرست زاہدِ جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ . . . ست ہے

اصلی نیکی وہ ہے جو از خود بلا ارادہ سرزد ہو۔ پس مہذب دوستی ہرگز طمع اور نمائش کی آلائش سے پاک نہیں ہوتی۔ تم مہذبوں کے جو لمبے چوڑے عہد نامے، اقرار نامے، اسٹامپ، رجسٹری سے اپنے وعدے کو آراستہ و پیراستہ کرتے ہو بعینہٖ اس ہندوستانی سبزہ رنگ، ملیح، دلربا معشوق کی طرح ہو جو انگریزی صابون سے عارض باصفا کو دھو کر آنکھوں کے پپوٹے سیاہ کر ڈالتی ہے۔

پس نتیجہ سخن یہ ہے کہ آج کل کسی کی دوستی اور عہد پر اعتماد نہ کرو عہد نامے چاک کرنے اور اقرار توڑنے اور دوستی دشمنی کرنے کے واسطے ہوتی ہے۔ انگریزی مثل ٹرسٹ ان گاڈ اینڈ کیپ یور پوڈر ڈرائی (خدا پر بھروسا کرو اور بارود خشک رکھو) پر عمل کرو اور دیکھو جنگ گاہ عالم میں کیا تماشہ ہوتا ہے۔

جس انسان میں اخلاط متضادہ جمع ہیں ممکن نہیں کہ ایک کم اور دوسرا زیادہ نہ ہو۔ یہی حال سلاطین کے جبروت و سطوت کا ہے۔ گلیڈاسٹن اور آرام طلب قوم نے خونِ صالح اور طاقتِ اصلی بہت کچھ فضول فصدوں اور مسہلوں میں نکال ڈالی ہے۔

مثل مشہور ہے آپ کاج مہا کاج۔ تمہاری قوم بڑی خود غرض اور خود مطلب ہے۔ تم سے تو چاہتی ہے کہ خدمت لے مگر تمہاری خدمت پر چون و چرا کرتی ہے۔ پس ایک نصیحت آخری تم کو کرتا ہوں اگر اس پر عمل کیا

تمہارا ہی فائدہ ہوگا ورنہ گلیڈ اسٹن کی طرح اس کان سے سُن اس کان سے اڑا دیا تو تم جانو تمہارا کام جانے۔ اپنے تاج کے نہایت درخشاں اور تاباں جواہر کو پہلے اس ترکیب سے جُدا کرو کہ نہ تو اس فرنگی کی طرح اس کو صدمہ پہنچاؤ جس نے اورنگ زیب سے دوستی کے واسطے لیا اور کانٹ چھانٹ کر ستیاناس کیا اور نہ اپنے تاج کو بدنما بناؤ اس کے بعد ایک جُداگانہ تاج بنوا اور اس میں وہ جواہر لگا کر کسی اپنی اولاد کے سر رکھو۔ ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

الکنایۃ ابلغ من التصریح

(۶)

بنام مہاراجہ کشمیر

مہاراجہ صاحب!

آج کل طویلۂ عالم میں وہ لیتا ہج، عرصۂ کائنات میں وہ ہم ہجم ہے کہ ہر متنفس محتاج پند و اندرز نظر آتا ہے مگر تم جانو میری نگاہِ بلند تو ازل سے آج تک کبھی نیچی پڑی ہی نہیں اور خاص کر جب محل اور موقع دیکھا ہے۔ اپنے مذہب میں آئی پر چُوکنا حماقت اور گناہ دونوں خیال کیا ہے۔ اس واسطے آج تمہی سے لگّا لگاتا ہوں۔ تمہاری اہلیت اور معقولیت جو تم میں حد سے زیادہ ہے شاید بھڑک مٹا کر اس بوڑھے خرانٹ کی دو باتیں سُننے دے۔

یہ تم اچھی طرح سمجھ لو کہ ایسے باپوں کا مرنا جو اولاد کو دولت، ثروت، ریاست، سلطنت چھوڑ جانے والے ہوں دنیا میں چنداں رنج و تاسف نہیں پیدا کرتا۔ بعض جگہ تو اِدھر مرنے والے باپ کی نعش پڑی ہوتی تھی اور اُدھر صاحبزادۂ بلند اقبال جشنِ تخت نشینی مناتے ہوتے تھے۔ ایک جلد باز جلے تن نے بوڑھے باپ کو اسی بات پر مار ڈالا کہ تم تو مروگے نہیں، ہم بوڑھے ہوئے جاتے ہیں۔ لطفِ ریاست کب اٹھائیں گے۔ پس اب نہ تو میری صلاح ہے اور نہ غالباً تمہارا دل باپ کا غم منانے کو چاہتا ہوگا۔ مضیٰ ما مضیٰ۔ اب ریاست کا جھگڑا، ملکداری کا بکھیڑا تمہارے لیے کیا کم ہے۔

تم نے جو کچھ گدی پر بیٹھتے ہی رفاہ و فلاح کے احکام جاری کیے اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدت کے سوچے ہوئے ہیں بلکہ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آج کل کی مصلحت کے موافق بیہودہ دستور اور لایعنی تکلیف دہ مراسم کی قدر اسی قدر تمہارے ذہن میں ہے جتنی ہونا چاہیئے۔ بات تو اچھی ہے بشرطیکہ تمہارے دماغ سے نکلی ہے۔

تمہارا ملک دستکاری، نفاست، میوہ جات، لطافت، موسم، خوبیِ آب و ہوا میں ضرب المثل ہے مگر ساتھ ہی اس کے بدانتظامی و بدحالی میں شہرۂ آفاق ہیں۔ تمہارے خوشامدیوں نے اگر انگریزی یا اور ہندوستانی عملداری کی نذریں پیش کر کے نیچی آنکھ اوپر اٹھوا دی، عرقِ خجالت رومالِ خوشامد سے پونچھ دیا تو اس سے نہ شال بافوں نے گاڑھی کمائی کا پورا جوڑ

پایا نہ مفلوک اور کنگال مسلمان خوش ہوئے۔

آج کل کی تہذیب کی کنجی یہ مثل ہے:

"ہاتھ پاؤں بچائے اور موذی کو ٹھلائے"

جب تک اس پر عمل ہے مزے سے ڈل میں عیش مناؤ گل مرغ میں جشن اڑاؤ۔ کس نے پیر سدکر بھیجا کون ہو۔ سرحد کا جھگڑا کچھ تمہی کو بیم و رجا میں نہیں رکھتا، سارے ہندوستان اور انگلستان اور افغانستان میں بکر کودیتا پھرتا ہے۔ ہندوؤں میں سانڈ چھوڑ دیتے ہیں وہ جانتے ہو کس قدر ظلم کرتا پھرتا ہے۔ بازار میں جدھر رُخ کیا، دکاندار کی جان اگاڑی پچھاڑی تڑاکر نو دو گیارہ ہو گئی۔ پس اسی طرح سمجھ لو علتہ العلل نے روس کو بھی سانڈ دیا ہے، اس کے علاوہ نوش میں گزندِ نیش، گلستان شادی میں خارِ غم، شیرینیٔ الفت میں چاشنیٔ شکایت، بہارِ حیات میں خزانِ موت، رنگ میں بھنگ، کلیل میں غلیل نہ ہو تو لطف کیا آئے۔ قدر و منزلت کیا معلوم ہو۔ قدرِ عافیت کسے داند کہ بہ مصیبتے گرفتار آید۔ صاحب توبۃ النصوح کا قول ہے اگر مرنا نہ ہوتا تو لوگ درختوں سے گر کر، کنوؤں میں پھاند کر جان دیتے۔ سرکس میں محض تماشائیوں کی توجہ میں تحریک پیدا کرنے کے واسطے سہواً و عمداً گھوڑوں پر سے گر پڑتے اور دوڑتے ہی میں اچک جاتے ہیں یہ سب کیا ہے۔ بندھی ٹکی وضعداری، سلامت روی کی چالوں میں چہل بہل پیدا کرنا ہے تاکہ دلچسپی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ روس ادھر سے آئے گا نہ آئے گا مگر تم یہ سمجھ لو ٹپکے کا ڈر شیر کا پتا پانی کرتا ہے۔ علاوہ اس کے ناؤ میں خاک اڑانے یا پانی گندے کا بہانہ تو بآسانی مل سکتا ہے۔

آج کل ریذیڈنٹ کا تقرر بہتوں کو چکر میں ڈالے ہے، ہماری جو حالت نہ ہو وہ کم ہے۔ برمحل کارروائی کرنے والے تو گھات کے منتظر ہی رہتے ہیں۔ والیانِ ملک کچھ آئے دن تو مرتے ہی نہیں۔ غالباً لوہا گرم ہے پیٹا جائے مگر تم کو میں ایک گُر بتائے دیتا ہوں۔ تم سب کہنا مگر اوسان نہ کھونا۔ قیامِ ریذیڈنٹ منظور کرنا مگر سمجھ کے۔

جو حماقت عقل سے نادانی جان بوجھ کر ہو وہ حماقت و نادانی نہیں ؎

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بین و کار آساں کن

اب میں تم سے رخصت ہوتا اور تم کو انگریزوں کے سپرد کرتا ہوں۔ چند نکتے میں نے بتا دیے ہیں اور باقی مفصل مشورے تمہارے ابا جان کو اودھ پنچ نے سالہا سال دیے ہیں۔ اگر ان پر غور اور عمل کرو گے لطف اٹھاؤ گے ورنہ ما بخیر شما بسلامت ع

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(۷)

بنام حضور نظام دکن

ڈیر!

یہ تو مجھے معلوم ہے آپ نے اوروں کے نام خط دیکھ کر کس قدر رشک کھایا ہوگا۔ مگر تم جانو یہ پرانا خرانٹ ناصح بہت کچھ دنیا دیکھے ہوئے، ضرورتوں اور حاجتوں کو خوب پہچانتا ہے۔ جیسی مصلحتِ وقت دیکھتا ہے کارروائی کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تم کو میرے نصائح کی سخت حاجت اور بے انتہا ضرورت ہے اور آج سے نہیں جب سے تمہارے وزیر با تدبیر سر سالار جنگ اس جہان سے سدھارے اور بقول، بازاری عوام کے کہ

گل گئے گلشن گئے جگ میں دھتورے رہ گئے

کا معاملہ ہوا یا جب سے تختِ ریاست نصیب ہوا۔ مگر تم جانتے ہو عذر معذرت اور سگھڑ بھلائی کا میدان سلامتی سے اس قدر وسیع ہے کہ عمداً پہلوتہی کیجیے۔ نادانستہ غفلت کی، لیجیے کچھ نہ کچھ پیش ہی ہو سکتی ہے اس لیے اگر میں یہ صحیح اور واقعی بات کہوں کہ مجھے پہلے تمہاری طبیعت اور لیاقت اور عقل کا حال دریافت ہونا مقدم تھا تو کچھ بے جا نہ ہوگی۔ چنانچہ اتنے عرصے کی نگرانی سے یہ مقصد پورا ہو گیا۔

انسانی خوبیوں اور بدیوں کے اعتبار سے اگر میں تم کو بشریت اور انسانیت کا معدن کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا بلکہ بعض اوقات اپنی طبعِ وسیع و خلقت گنجائش طلب سے تمہاری انسانیت حیوانیت تک بھی پہنچ جاتی ہے لیکن میں اس کو بھی بشریت قرار دیتا اور تم کو مستوجبِ الزام نہیں سمجھتا۔ کیا وجہ کہ التزام، سامان، لوگوں کی ہمت، نیت صحبت کے اثر سے تم کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب ہر طرح کوشش کی جائے کہ فعالہ کی جگہ صرف انفعالیہ ہی ترقی پکڑے۔ اب بجز اس کے اور چارۂ کار نہیں کہ مہامِ ریاست، حالاتِ رعایا، کارگزاری اہل کاران، مداخل و مصارف خزانہ بغیر عینک کے دیکھو اور پھر جس بات پر دل کا استخارہ واجب آئے اس پر عمل کرو۔ تم انتخابِ دیوان میں ہر انسانی خوبی کو کام میں لائے۔ قدردانیِ ریاست، مصلحتِ وقت، عزت افزائی سب کچھ کر گزرے اور واقعی نمک حلال، وفادار، خیر خواہ، عقیل، عالی دماغ دیوان کے حقوق کو خوب ادا کیا مگر ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

لاپروائی، استغنا، گستاخی جو بعض اوقات سوءِ ادبی کی حد تک پہنچ جاتی ہے سب خاک میں ملائے دیتی ہے۔ تم تو اپنی سی کر گزرے۔ آگے جو جیسا کرے گا۔ ویسا پائے گا۔ مثل مشہور ہے سکھائے پوت (یعنی بیٹے) دربار

نہیں جاتے قصہ یوں ہے کہ ایک سلطنت میں نہایت لائق ہوشیار وزیر تھا۔ بادشاہ بھی اس کو مانتے اور بہت معزز جانتے تھے۔ وزیر انجام بیں نے اپنی اولاد کی آئندہ بہبود اور وزارت موروثی کرنے کے واسطے مناسب سمجھا کہ میرا لڑکا حین حیات اگر دربارِ شاہی میں حاضر ہو کر کاروبار سیکھا کرے تو غالب ہے بعد میرے میرے آقا اور لڑکے دونوں کو دقت نہ پڑے۔ وزارت بھی بلا تکلف خاندان میں قائم رہے مگر سلامتی سے صاحبزادے پورے صاحبزادے ہی تھے۔ باپ تو ریاست کے وزیر تھے، صاحبزادے احمقوں کے بادشاہ نکلے تاہم وزیر پُر تدبیر نے طبیعتِ انسانی کی تربیت پذیری پر اطمینان کر کے خیال کیا کہ کچھ نہ کچھ میرے جیتے جی سیکھ جائیں گے۔ آگے کام چل نکلے گا۔ چنانچہ ایک روز کسل مندی مزاج کا حیلہ کر کے خود تو دربار نہ گئے۔ مگر صاحبزادے کو بھیج دیا۔ اور چلتے وقت امورِ ذیل بطور ہدایت نامہ پڑھا دیے!

اول۔ پہلے بادشاہ اور پھر ولی عہد کو نہایت ادب اور محبت سے سلام کرنا۔ کیونکہ وہ ہمارے بڑے خواجہ اور یہ چھوٹے خواجہ ہیں۔

دوسرے۔ چونکہ تم وزیر کے بیٹے ہو۔ کسی ایسے ویسے مقام پر نہ بیٹھ جانا۔ جب بادشاہ اشارہ کریں کسی اونچی جگہ پر بیٹھنا۔

تیسرے۔ اگر کوئی بات بادشاہ پوچھیں تو نہایت نرم اور میٹھی باتیں کرنا۔

اب سنیئے حضرت داخل دربار ہو کر کیونکر نعائے آبائی و تعلیمات پدری کو صرف کرتے ہیں کہ پہلے جاتے کے ساتھ ہی بآوازِ بلند پکارے۔ ''بڑے کھوجنیا تُمکا (تجھے) سلام اور چھوٹے کھوجنیا تو ہوگا (تجھے بھی) سلام۔ بیٹھنے کا اشارہ پاکر آپ لگے بلند مقام ڈھونڈھنے۔ آخر ایک گوشے میں سامانِ روشنی کے واسطے ڈیوٹ کی قطع کی چیز رکھی ہوئی تھی آپ اُچک کر اس پر بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے محض اپنے لائق وزیر کی قدر افزائی کے خیال سے مزاج پوچھا جواب ملا ''روئی، ریشم، سمور، قاقم۔''

دریافت کیا، کیا مشغلہ رہتا ہے، ارشاد ہوا۔ ''یہی لڈو، پیڑا، برفی۔''

اب تو بادشاہ سے نہ رہا گیا، حکم دیا اس مردود مجنون کو نکال دو دربار سے۔ گھر پر پہنچ کر والد بزرگوار نے پوچھا کہو کیسی گزری تو آپ فرماتے ہیں۔ ''اجی بھئی جائیے ابا۔ آپ نے کس دیوانے کے پاس مجھے بھیجا تھا۔ جو جو آپ نے سکھایا سب کمال احتیاط سے عمل کیا۔ مگر بادشاہ ہیں کہ کسی طرح خوش ہی نہیں ہوتے۔ پہلے تو ہم نے دونوں کو سلام کیا۔ آپ نے خواجہ کہا تھا ہم نے مارے محبت کے 'کھوجنیا' کہا۔ بیٹھنے کو کوئی اونچی جگہ تھی نہیں۔ ایک چوکی بچھی تھی۔ اس پر بادشاہ خود بیٹھے تھے، زیادہ گنجائش نہ تھی۔ آخر کار بعد تلاش ایک کونے میں ڈیوٹ سب سے بلند رکھی تھی میں اس پر اُچک گیا۔ مزاج پوچھا، میں نے کہا روئی، ریشم، سمور، قاقم سے بڑھ کر کون چیز نرم ہوگی۔ وہی میں نے بتایا۔ مشغلہ پوچھا لڈو، پیڑا، برفی کہا۔ اس پہ بادشاہ بہت خفا ہوئے۔ آپ ہی فرمایئے اس سے میٹھی کون شے ہو سکتی ہے۔''

وزیر نے سرپیٹ لیا اور کہا "واقعی سکھائے پوت دربار نہیں جاتے۔" نتیجہ سخن یہ ہے تم نے بھی سلام لیا اور باوجود مخالفت بٹھایا۔ مزاج پوچھا مستقل دریافت کیا۔ بعد حد ہو چکی آگے جو جیسا نکلے ویسا سمجھو۔

اولاد میں اکثر جسمانی و نفسانی تاثیرات آبائی ہوتی ہیں مگر کبھی کبھی نہیں بھی ہوتیں۔ ملکداری اور ریاست کے امور سترگ کی انجام دہی کے واسطے جا بجا بادشاہ تک بدل جاتے ہیں، وزیروں کو کون پوچھتا ہے۔

اس موقع پر پہنچ کر یہ بھی گوش گذار کرنا ضرور ہے کہ جو کچھ کرنا اپنے بھروسے پر کرنا۔ قدیم فریق پیرانہ سالی اور بڑھاپے کے مارے سست تدبیر ہو رہا ہے۔ سوچتا بہت ہے کر کچھ نہیں سکتا۔ ڈاک کے گھوڑے، کری تلواریں سردیائے پڑاتے کام نہیں دے سکتے۔

دنیا میں ریاست کے انتظام کے واسطے نوکر چاکر ہوتے ہیں مگر تھوڑے عرصے سے ریاست نوکری چاکری کے واسطے ہو گئی ہے۔ دو چار چلتے پرزوں کی بدولت انہی کے پھیر بدل سے مہلت نہیں ملتی۔ احکام کی خوبی و بدی ریاست کی بہبود و فلاح پر کیوں کر نظر ہو سکتی ہے۔ انقلاب میں نفع ذاتی و صفاتی حاصل کرنے والے آئے دن ریاست کا تختۂ انتظامی الٹ کرتے ہیں، ان کو دوزخ جنت سے کام نہیں۔ اپنے حلوے مانڈے سے مطلب ہے۔

گھوڑ دوڑ، تفریح امراء و رؤسا کے واسطے مردانہ کھیل ہے مگر وہی "بوقت فرصت"۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے بعض لوگ عہدوں کی سوداگری کرتے ہیں اور غالباً یہی وجہ اور بھی بار بار انتظام بدلنے کی ہو گی۔ خیر سرِ دست اور کچھ نہیں۔ اس تجارت پر محصول جنگی تو تم بھی قائم کر دو۔

اور بھی چند مضامین دوسرے قابلِ تحریر ہیں۔ ان شاء اللہ دوسرے خط میں لکھے جائیں گے۔

(۸)

م نظام دکن

ڈیر!

میں اپنے پہلے خط میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ تم کو اپنے ہی دل سے استخارہ کرنا چاہیئے۔ اس سے یہ نہ خیال کرو کہ کوئی شخص مشورے کے لائق تمہاری قلمرو میں باقی نہیں رہا۔ نہیں، ہیں اور متعدد ہیں مگر ان کو پہچاننا اور ان کی مناسبتِ طبیعت کے لحاظ سے رائے لینا اور اس رائے کو میزانِ عقل میں تولنا تمہارا کام ہے۔ دیکھو تمہارے وزیر مرحوم نے کیسے کیسے متضاد صفات کے حضرات مختلف اقطاع ہندوستان سے جمع کیے تھے مگر ہر ایک سے کام وہی لیتا تھا جس میں اس کو لیاقت ہوتی تھی۔ یہ سمجھ لو جس قدر تیز جست، چالاک گھوڑا ہو گا، اسی قدر سوار کو اور بھی ہوشیار بیٹھنا ہو گا۔

میں تم کو ایک نسخہ فقیروں کا بتاتا ہوں۔ گو بہ آسانی اور مفت میسر آنے کی وجہ سے تم قدر نہ کرو مگر سمجھ لو کہ

کشود کار، سرانجام مہمات، حصول مقصد کے واسطے منتر ہے تو یہی اور خزانہ ترقی کے لئے کلید ہے تو یہی یعنی جب غور کر لیا کہ یہ امر ہماری ذات و صفات کے واسطے مفید ہے اور اس کو تکمیل تک پہنچانا ضروری، تو پھر ہر وقت، ہر لمحہ، ہر جگہ اس کا خیال رکھنا فرض ہے اسی کا نام دُھن ہے۔ جب تک اس میں پکے نہ ہوگے ہرگز ہرگز مقصود حاصل نہ ہوگا۔ تمہارے وزیر کو بہبود و ترقی ملک کی بہت سی دُھنیں تھیں۔ جن میں وہ سوتے جاگتے ہر ساعت مستغرق رہتے تھے۔ تم جانو دنیا میں بجز ایک کے نقصان کے دوسرے کا فائدہ نہیں ہوتا۔ پس وہ فکریں ہی اسی طرح کی تھیں کہ جہاں تم کو اور تمہارے ملک کو فائدہ پہنچاتیں وہاں دوسروں کا نقصان بھی کرتیں۔ پس اب ان حضرات نے موقع اور گھات پا کر ایسے ایسے رخنے اور جھگڑے بکھیڑے شروع کر دیے کہ تم کو ریاست ملنے پر دُھن نہ بندھنے پائے۔ گو تم کم سن تھے مگر نہ ایسے کہ اپنے وزیر کی تدابیر و مساعی واپسی برار کی خبر نہ سُنتے ہو۔ اس کو مرتے مرتے یہی دھن رہی۔ اب انصاف کرو۔ اس کے بعد پھر بھی کبھی اس کا چرچا ہوا۔ ملک وہی، والیٔ ملک وہی، برار وہی، سرکار وہی مگر افسوس انگریزی مثل "کوشش کرو، کوشش کرو اور پھر کوشش کرو" پر عمل کرنے والا نہیں۔ ممکن ہے تمہارے دل پر ایسا اثر ڈالا گیا ہو کہ واپسی برار کا جُملہ سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہوں یا طبیعت وحشت کی لیتی ہو۔ مگر سمجھ لو اگر تم کچھ کھو گے۔ تو ایسے ہی مہمات سر کرنے سے ورنہ کٹھ پتلیوں کا ناچ تو عالم میں ہوا ہی کرتا ہے۔

ایک اور بات اخیر میں کہتا ہوں کہ غور کا مقام ہے خدا کو عوام اور بعض خواص خدا کیوں مانتے ہیں۔ صرف یہی وجہ ہے کہ اپنی ذات کسی قدر مختار اور کسی قدر مجبور پاتے ہیں اور اس سے نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ جب ہمارے اختیارات محدود ہیں تو ضرور ہے کوئی ذات ایسی ہو جو بہمہ وجوہ مکمل اختیارات رکھتی ہو۔ پس وہی ذات خدا ہے۔ غرض یہ کہ جو کچھ ہیں یہی لوگ حضرتِ اختیار صاحب ہیں۔ جو لوگ اسکی قدر کرتے ہیں وہ حتی الوسع اپنے ہی اختیارات وسیع رکھا کرتے ہیں۔ تمہاری طبیعت نے بھی دانستہ یا نادانستہ تم کو اسی وادی پر پہنچایا ہے۔ اب تم کو لازم ہے اپنے ہی اختیارات کا میدان گھوڑ دوڑ کے چکر سے زیادہ وسیع بنائے رکھو اور کسی دوسرے کو عام اس سے کہ وزیر ہو یا وزیر کا بھائی، عزیز ہو یا قریب، کسی کو نہ دو۔ میری صلاح تو یہاں تک ہے۔ اگر ملک غارت بھی کرو تو اپنے اختیار سے اور خزانہ لٹا دو تو اپنے اختیار سے۔ کسی پیادے کو نوکر رکھو اپنے اختیار سے غرض یہ کہ جو کچھ جا بیجا کرو اپنے اختیار سے۔

ایک بات اور چلتے چلاتے سُن لو کہ مالی انتظام تو خیر جیسا ہے ویسا ہے مگر اہلِ سیف کی جانب بھی تم کو توجہ چاہیئے۔ پرانے اور قدیم طریقے نے تمہارے خزانے کو سپاہیوں کی جیب میں ڈالا نہ تمہارے صندوقوں میں رکھا بلکہ اکثر جمعداروں کے پیٹ کی لپیٹ میں الجھایا۔ اس کا انتظام بہ لطائف الحیل نہایت سہولت سے کرنا چاہیئے۔ کیا وجہ کہ ؎

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

اور بھی چند امور باقی ہیں۔ اگر فرصت ہوئی تو تیسرے خط میں گوش گذار کیے جائیں گے۔

(۹)

بنام نظام دکن

حضرتا !

میں نے جو آپ کے نام خطوں کی بھرمار شروع کر دی ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ کچھ دنوں یاد کیجیے جس قدر کم توجہی کی شکایت تھی غالباً وہ رفع ہو گئی ہوگی اور کچھ کچھ آنکھیں کھل ہوں گی کہ اب تک میں نے کیا کیا اور کیا کرنے کو باقی ہے۔ لیکن مشکلات و معاملاتِ موجودہ کا جمِ غفیر ایسا مضطرب الحال بنائے ہے کہ آپ کو مشکل سے آگے پیچھے نظر پھیرنے دیتا ہے۔ خیر یہ تو امور اتفاقی ہیں۔ چارہ ہی کیا ہے۔ اگر اتنا ہی خیال ہے جتنا میرے خیال میں ہے وہی بہت ہے ؎

عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است

آدمی کی تلاش عالمگیر اور سعادت علی خاں کو عمر بھر رہی اور ہمیشہ پہیلیاں بجھایا کئے کہ وہ کیا ہے کہ بہت ہے اور پھر نہیں یعنی انسان۔ مگر خدا کی عنایت سے کوئی نہ ملا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس وقت کوئی بھی انسان نہ تھا بلکہ بات یہ تھی کہ ان کی طبیعت اور مزاج کے موافق کوئی نہ مل سکا۔ اس پہ کوئی کام ان کا رُک رہا نہ انتظام ملتوی۔ ایک نے سلطنت کی شاخیں، انتظام کی سختیاں دُھر تک پہنچا دیں۔ دوسرے نے ایک جدید ریاست کی بنا ایسی قائم کی کہ سلطنت کی حالت نصیب ہوئی۔ پس اسی طرح کام چلانے کے واسطے تم بھی رُکے نہ رہو۔ کسی نہ کسی طرح چھکڑا چلا جائے۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔

سعادت علی خان کوئی نائب نہ مقرر کرتا تھا۔ اگر لوگ پوچھتے یہی جواب دیتا کہ وہ ریاست ہی ایسی کیا ہے جس کے واسطے نائب کی حاجت ہو۔ میں دیکھتا ہوں تمہارے ہاں معاملہ بالعکس ہے، ریاست اور اس کی آمدنی سے شاید محض اس وجہ سے ترقی نہیں کی جاتی کہ وہ نیابت ہی کیا ہے جس کے واسطے ریاست بڑھائی جائے۔ خیر اس میں اور دیگر امور میں کلیہ یاد رکھو کہ وزارت ریاست کے واسطے ہے نہ ریاست وزارت کے لیے۔

عاشق و معشوق کے خطوط کیسی احتیاط سے کیوں نہ بند ہوں ضرور تاڑ لیے جاتے ہیں، وہ ان کا وزن، وہ چاروں طرف سے نئی نویلی دلہن کی طرح سمٹا سمٹایا، ٹھسا ٹھس بند ہونا، وہ گوند کی چار چار تہیں، وہ سیکڑوں تختے کاغذ اور لمبے چوڑے مضامین، ارمانوں، آرزوؤں، حسرتوں کے جمِ غفیر سے چست اور تنگ لفافے کے گوشے، سطح معشوق نوخیز کے سینہ و بازو کی طرح ابھرے اور بھرے بھرے، وہ اعلیٰ درجے کا کاغذ، وہ انتہا کی خوشخطی۔ وہ خوشبوؤں میں بسا ہونا، وہ بند کرنے کی جگہ پر اکثر پان کی ہلکی سرخی، وہ اسم بر خاتمہ، وہ دوسروں پر طلاق، یہ سب

محبت، الفت، شکوہ و شکایت، راز بہ باتے، لب اور پان خوردہ کی شیرینی ظاہر کرتے ہیں، مشاق اور نظرباز تو

خط کا مضمون تاڑ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

پس ہندوستانی رئیسوں کے ساتھ گورنمنٹ انگریزی کی مراسلہ بازی، وہ رزیڈنٹ کا آنا جانا، وہ مراسلہ لانا، وہ تخلیے میں ہی سرگوشیاں، وہ اخفا میں اہتمام جو کچھ ظاہر کرتا ہے اس بوڑھے خرانٹ پہ آئینہ ہے۔ ہاں دُسر ملا کر اچھا تو ہے۔ تمہاری خاطر کس کو منظور نہیں خصوصاً جب تم ناراض بھی نہ کرو۔ امورِ ناگوار زبان تک نہ لاؤ۔ مشرق کے جانے والے کو سمجھ لینا چاہیئے اگر برابر چلا ہی جائے گا تو ایک دن مغرب میں آ نکلے گا۔

”اگر در خانہ کس ست یک حرف بس ست“

تمہارے مدار المہام کے چھوٹے بھائی گھوڑ دوڑ میں (جو تمہارا خاص مشغلہ ہے) اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور خود بازی جیتے۔ ان کو اور تم کو مبارک۔ اگر حیدرآباد کی مدار المہامی میں صرف شہسواری درکار ہوتی تو پھر کیا تھا، ترقی و تنزل مدارج کے واسطے حاکم کی توجہ یا کم توجہی کے ساتھ امورِ اتفاقی لازمی ہیں۔ پس یہ بھی انہی امورِ اتفاقی سے ہے۔

مجھ کو تو تم جانو ہندوستانی نہ دکنی، پارسی نہ مدراسی، انگریزی نہ ارمنی۔ میں تو باشندۂ دنیا ہوں۔ میری نظرِ وسیع میں سب یکساں، پس میری صلاح و مشورت میں کسی کی جنبہ داری کو دخل نہیں ہو سکتا۔ فی الحال ہندوستانیوں دکنیوں کا بڑھاؤ اُتار ریاست کو ہنڈولا بنائے ہے۔ تم کو لازم ہے سب میں اپنا مطلب مقدم رکھو۔ نہ وہ افراط کہ ادھر سے کوئی بھی بال کترا فرہو دے۔ جھاڑن کا کوٹ پتلون پہن، کھڑے گھاٹ، نچری بن، سید صاحب پیالہ پی چھٹی کے جادر گھاٹ جا اترا اور آنکھ بند کر تمہارے یہاں سے تنخواہ، عہدہ، جگہ، کام سب بگٹٹ چلا آتا ہے بلکہ اسٹیشن پہ ریل سے قدم نیچے رکھا نہیں کہ تنخواہ بیش قرار نے نذر دکھائی۔ عہدے نے سلامی اتاری اور ترقی کی چوکڑی پہ یہ جا وہ جا۔

اور نہ یہ مناسب و مصلحت ہے کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ ہندوستانی نکالے جائیں۔ ایک آغا صاحب ولایت سے ہندوستان تشریف لائے۔ ایک دوست نے پھلیندے کھلائے۔ ہندوستان کا یہ میوہ آپ کو بہت لذیذ معلوم ہوا۔ پوچھا کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اَم کو آنجا لے چلے تو برا مہربانی ہو۔ دوست صاحب کے ایک پھلیندے کے درخت کے نیچے جا کر دکھا دیا کہ لو یہاں ٹوٹے ہوئے سیاہ سیاہ یہ بہت سے پڑے ہوئے ہیں جتنے کھائے جائیں کھاؤ۔ آغا صاحب لگے ذوق شوق سے کھانے، اتفاق سے پھلیندوں کے ساتھ میں کئی بھونرے بھی مرے پڑے تھے۔ آپ ایک آدھ وہ بھی چکھ گئے۔ وہ جب دانت کے نیچے پہنچا تو کرکراہٹ معلوم ہوئی۔ آغا صاحب فرماتے کیا ہیں ”تم چاہے چُرکرے چاہے مُرکرے کالا کالا ہم ایک نہیں چھوڑے گا۔“ بس کچھ ضرور نہیں ہندوستانی ہندوستانی ایک نہ چھوڑے۔ ہاں افراط تفریط ہر شخص کے نزدیک معیوب ہے۔

خیر یہ تو ہو چکا۔ ایک ضروری اور اہم ضروری بات لکھ کر میں یہ خط ختم کرتا اور کسی دوسری طرف رُخ کرتا ہوں۔

سُنو مثل مشہور ہے، جان ہے تو جہان ہے، اگر اپنی طبیعت درست مزاج صحیح ہے تو ریاست، سلطنت، عیش عشرت، شراب کباب، سیر تماشے سب کا لطف ہے۔ بھلا معشوقانِ پری تمثال و مہ وشانِ خوش خصال، نائے و نوش، مستی کا جوش و خروش کیا مزا دے گا جب ہم پڑے پڑے مسہری پر بالسم کپیبا اور مرکیوری کے مرکبات کے محتاج نیم کا ٹیرا بلا رہے ہیں۔ تاجِ پُرزر، لباسِ مکلف کیا اس چہرے پر بھلا معلوم ہوگا جس کو فسادِ خون نے تہتیج سے اس طرح بگاڑا جیسے گلفام اور بے نظیر کو اندرسبھا اور مثنوی میرحسن کے مصوروں نے۔ ان امور کا اثر اعصاب پر اور اعصاب کا اثر دماغ اور جسمِ لطیف (حواسِ خمسہ و ارادہ وغیرہ) کے افعال پر جو کچھ پڑتا ہے طب و حکمت گواہ ہیں۔ واجد علی شاہ باوجود حلیم و شحیم ہونے کے انتزاعِ سلطنت کی خبر سُن کر رونے لگے۔ اس کی وجہ علی نقی خان اور لارڈ ڈلہوزی سے پوچھو۔

شاید تم فسادِ خون میں شہزادہ بسمارک کی مثال پیش کرو۔ مگر اتنا بھی سمجھ لو کہ یورپین طرزِ تعلیم و خیالات، وسعتِ معلومات اور کندی جذباتِ انسانی وہاں کیسی ہے۔ اس پر بھی دیکھ لو فسادِ خون کو افسادِ عالم اسباب میں کس قدر دخل ہے۔ جو بات اس کے دماغ سے نکلتی ہے دنیا میں فتنہ و ہنگامہ پیدا کرتی ہے۔

اب میں تم کو رخصت کرتا اور سید بلگرامی کو سونپتا ہوں۔

نشہ کی ترنگ

پنڈت تربھون ناتھ ہجر

مہنگا کرہ آٹا سستی کرافیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے جناب اودھ پنچ صاحب! واللہ کل مکتب میں کیا جی خوش ہوا ہے۔ قسم ہے جناب امیر علیہ السلام کی یہی بار بار دل چاہتا تھا کہ اللہ رکھے منے مرزا کو ایک دم چھاتی سے جدا نہ کروں۔ بخدا کسی نے سچ کہا ہے تخم تاثیر صحبت کا اثر۔ باپت پوت پراپت گھوڑا کچھ نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ پھر آخر اچھے مرزا ہی کے تو صاحبزادے ہیں، ماشاء اللہ سے وہ بلا کی طبیعت پائی ہے کہ حضت کیا عرض کروں۔ مجھے رہ رہ کے یہی خیال آتا ہے کہ یہ دن سن. نام خدا ابھی جوانی ہتو نہ مسیں بھی اچھی طرح نہیں بھیگی ہیں اور یہ فکر آسماں پیما خدا چشم زخم زمانہ سے بچائے، وہ پیاری طبیعت پائی ہے کہ سبحان اللہ بحمدہٖ باوجود صدہا نوکروں کے اچھے مرزا اپنے ہاتھ سے چلم بھر کر دیتے ہیں اور پھر میں اس چلم کی کیا تعریف کروں جس میں تلے اوپر چار توے اور پھر مزا یہ کہ چاروں کی کیفیت نرالی، ایک جلا دوسرا موجود، ہر کش شربت کا گھونٹ دھوئیں کی یہ لطافت کہ ہوالاوّل وہوالآخر۔ ہائے لال لال سچے کولوں کو اس ترکیب سے جماتے ہیں کہ تحریر اقلیدس کی جس شکل سے چاہیے بھڑا لیجیے اگر سرِ مو فرق ہو تو ہاتھ قلم کر ڈالیے۔ ایک حقہ ہی نہیں چانڈو کا قوام وہ بڑھیا تیار کرتے ہیں کہ بس اور کیا کہوں ہاتھ چوم لے، اور بھئی ان کی ہی محنت کوئی کر تو لے، جناب سیّد الشہدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ افیون کو بانات کے ٹکڑے میں کم سے کم دو سو مرتبہ تو مقطّر کرتے ہیں اس کی رنگت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہو بہو خون کبوتر بُو باس صلّے وجلّے، واللہ ہے ایک مرتبہ نگاہ بھر کے دیکھ لیجیے دو دن تک چسکی کی حاجت نہ ہو اور پھر میں آپ سے کہوں وہ ان کی بتاشے کی پٹے ڈال دینا ستم ہی برپا کر دیتی ہے۔ کیا مجال کہ کہیں چھینٹا رُکے تو۔ ایک دم میں طبیعت باغ باغ ہو جائے۔ خیر یہ تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، موزونیٔ طبع تو ان کے حصے میں پڑی ہے، اِدھر آپ نے شعر پڑھا اور اُدھر جواب لیجیے۔ اور تو اور شیخ سعدی کے کلام کی تضمین کر ڈالی اور پھر کیسے کیسے مصرعے چسپاں کیے ہیں کہ جن کا جواب نہیں۔ اعجاز کہیے تو بجا ہے۔ حضت آپ پسند کریں یا نہ کریں ہماری امت والوں نے تو یہ دل میں ٹھان لیا ہے کہ اب کریما کے عوض یہی اشعار بچوں کو پڑھایا کریں گے جس سے

دنیا و عقبیٰ دونوں ہاتھ لگیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ؎

مرے ساقی چانڈو کا چھینٹا پلا   کہ ہستم اسیرِ کمند ہوا
مزا کر کرا ہو گیا دے چرس   ندارم غیر از تو فریاد رس
خوش از چانڈو بازی گر کار نیست   وزیں گرم تر ہیچ بازار نیست
مدک چوں مس قلب را کیمیاست   کہ افیوں ہمہ دردہا را دواست
اگر چانڈو بازی تو کرا اقتیار   شود خلق دنیا ترا دوست دار
یہ افیونیوں کی کمر خم نہیں   نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں
کمر خم ہوئی رہ گیا مغز و پوست   تواضع ز گردن فرازاں نکوست
مدک کش لگائے اگر دم سنبھل   زند سوزاد شعلہ در آب و گل
ادھر لاؤ حقہ لگاؤ نہ دم   کہ ناگہ شود سر بسر کالعدم
جو افیوں پیے ہے وہی آدمی   نہ زیبد ز مردم بجز مردمی

میاں ہجر پینک میں آٹھوں پہر
بہ غفلت مبر عمر در دے بسر

دو دو چونچیں

تربھون ناتھ ہجر

افیونیوں کے وکیل

؎ مردماں کو چھینٹہ چانڈو کشند
اولش اللہ و آخر ہو کشند

ذات شریف ۔ بھئی واللہ ہمیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ام السکرات بی افیون لوگوں کو اولیاء اللہ بنا دیتی ہے، چٹکی بجاتے ہی کمال کو پہنچا دیتی ہے۔ اے لو، یہ مسئلہ آج حل ہوا ع

یار درخانہ و من گرد جہاں می گردم !

روزہ، نماز، عبادت، ریاضت یہ سب مذہبی ڈھکوسلے نکلے۔ لاحول ولا قوۃ۔ مفت میں اتنی عمر رائیگاں ہوئی۔ لیکن ہاں، یہ تو فرمایئے کچھ ولی بننے میں کسر تو نہیں رہ جاتی؟"

وکیل ۔ آپ بھی پھر کہیں گے کہ میں کچھ ہوں۔ جان بوجھ کے ننھے بنے جاتے ہو۔ اماں تیرہ صدی میں بھی اولیاء بننا کیا کچھ کرامات ہے؟ ٹکے کے الائچی دانے لو، ٹونگو۔ ٹونگتے میر آغا کے چانڈو خانے پہنچو، جو سا ببلو پسند آئے منہ میں لگاؤ، لیٹ کر یا اکڑو بیٹھ کر اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو، کرتے ہوئے چھینٹے اڑاؤ۔ پھر آئینہ لے کر اپنی صورت کا معائنہ کرو، دیکھو تو آناً فاناً میں کیسی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے۔ حلم و بردباری بشرہ سے کس طرح چمکنے لگتی ہے۔ نفس کشی کے واسطے تو یہ اکسیر اعظم ہے۔

ذات شریف ۔ یہ تو آپ نے سب سچ کہا، مگر اس میں پینک کی بیخ بڈھب لگی ہے، جب دیکھئے تب غین۔

وکیل ۔ افسوس ؎ آگہ نہ تپ دروں را نشتر چہ زنی رگ جنوں را

آپ بھی نرے عقل کے دشمن ہی نکلے۔ مرد خدا جسے تم پینک سمجھتے ہو، وہ فی الحقیقت پینک نہیں، مراقبہ ہے، گو بظاہر آنکھیں بند ہوتی ہیں مگر وہ دل کی آنکھوں سے مشاہدۂ نور الٰہی کرتے ہیں۔ اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو اچھا ما مقیما اٹھا کر دیکھ لو، دیکھو تو اس میں کیا لکھا ہے۔

کہ بچشمان دل مبین جز دوست
ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست !

ذات شریف۔ حضرت! آپ کا فرمانا برحق ہے، مگر یہ تو فرمائیے، کہ ایک کتاب والا کہتا ہے ؎

کاہش و افزائش ایں نشہ بایک دیگر ست   میخور و افیوں ترا چنداں کہ افیوں میخوری!

آخر اس کا کیا جواب ہے؟

وکیل۔ کاہشِ تن تو عین جوہرِ عاشقی ہے۔ امیاں فراق میں گھُل گھُل کے پوست و استخوان رہ جائے تو اپنے حساب قلعہ فتح کر لیا۔

ذات شریف۔ یہ تو کچھ پہیلی سی آپ نے کہی۔ واللہ ہے مطلق سمجھ میں نہیں آئی۔

وکیل۔ ہائے کیسی پھُوہڑ عقل ہے ارے میاں جہاں سوکھ کے کانٹا ہوئے، سمجھیے کہ طلبی کا پروانہ آیا ہی چاہتا ہے۔ اب دیکھیں وصل کیونکر حاصل نہیں ہوتا؟

ذات شریف۔ ہاں ہاں پھر یہ کہیئے۔

وکیل۔ اب آپ کو بھی لازم ہے کہ بہت نہیں صبح و شام دو چھینٹے بسم اللہ کر کے پی لیا کیجیے، پھر دیکھئے کیسے عقل کے جوہر کھلتے ہیں۔ لو دُور کیوں جاؤ، ان چینیوں کو دیکھو کیسے آفت کے پرکالے ہیں کہ ریل ان کے ہاں سے نکلی، تار بجلی ان کے ہاں سے نکلی، دخانی کشتی ان کے ہاں سے نکلی۔ سب سلطنتیں روم و روس کی لڑائی دیکھ کے کانپ رہی ہیں اور فغفور کو دیکھیے، قطب از جا نمی جنبد۔ بے غل و غش بیٹھا ہوا مزے اڑا رہا ہے۔ نے غم خویش نے غم کالا۔

ذات شریف۔ ذہن و ذکا کے علاوہ قوتِ اختراعی بھی آ جاتی ہے۔ ماشاء اللہ معلومات میں بھی دست گاہ کامل بہم پہنچ جاتی ہے خیر یہ تو قابلیت اور علمیت کی قلعی کھلی۔ اب یہ فرمائیے کہ استعمال افیون سے اور کون سے فائدے متصور ہیں۔

وکیل۔ تمہیں اس بکواس سے کیا حاصل۔ صرف دو تین دن ذرا ذائقہ لے لو، پھر چاہے چھوڑ دینا، اور اس کا ذائقہ کچھ ایسا تو ہے نہیں کہ چوہرن کیسی پانی ہو کہ میں بیان کر جاؤں، وہ خود اپنے جوہر دکھا دے گی کسی کے کہنے کی کیا حاجت ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔

ذات شریف۔ حضرت دمڑی کی ہانڈی بھی لی جاتی ہے تو ٹھونک بجا کر لی جاتی ہے، یہ تو پھر دلی ہونا ہے۔ ہر پہلو دیکھ بھال کے ولایت اختیار کریں گے۔ بھلا کچھ تعریف تو سنیں۔

وکیل۔ لے تم بھی کیا یاد کرو گے، قواعد افیون کے ست کا لب لباب بتائے دیتے ہیں۔

(۱) بڑے بڑے مرتاض اور عابد یادِ الٰہی میں شب بیداری کرتے کرتے اونگھ جاتے ہیں، مگر ہمارے جتھے کے لوگ رات کو سونا حرام سمجھتے ہیں۔ جب دیکھیے مراقبہ میں غرق، دریائے محبت میں غوطے لے رہے ہیں۔ اوہو ہو ہو!

(۲) جس کو دیکھیے خندہ رو ہنستا بھی ہے ہنساتا بھی ہے۔ باور نہ آئے تو زعفرانی رنگت شاہد ہے۔

(۳) حلم و بردباری، سلیم الطبعی، عجز و انکساری تو گویا خدا ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتا ہے۔ نفس کش اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ اناث سے سر کی جوئیں دکھلاتے، مگر ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

(۴) سب سے افضل یہ صفت ہے کہ تعزیراتِ ہند کی کوئی دفعہ ان پر فضلِ الٰہی سے عائد نہیں ہو سکتی۔ ہاتھا پائی جانتے

ہی نہیں سخت کلامی سیکھی ہی نہیں، بے ادبی اور گستاخی کے پاس نہیں پھٹکتے۔ بنوٹ کا نام نہیں جانتے۔ آپ جھک کر تسلیم کیجئے گا، وہ قدرتی خمیدہ کمر ہیں۔ آپ ہی ملاحظہ کیجئے کہ کیا زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کم خوراک اتنے بڑے کہ کیسا ہی قحط پڑے ان کو کچھ ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ چھٹانک آدھ پاؤ رات دن میں کھا لیا، نہیں تو کچھ اس کی بھی پروا نہیں۔

(۵) داستان گو ایسے جید کہ چھ مہینے گذر گئے اور امیر حمزہ نے ملکہ مہرنگار کی خواب گاہ کا ابھی پردہ ہی اٹھایا ہے۔

(۶) اور سب کچھ جانے دیجئے خیر خواہ سرکار کتنے بڑے ہیں کہ سولہ روپے سیر اور بیس روپے سیر چھنا چھن چھنا چھن دیئے جاتے ہیں۔ کبھی دریغ نہیں کرتے۔ ان سے بڑھ کے مالگذار سرکار کا کوئی ہو تو لے۔

(۷) شیریں گفتار، شیرینی کے عاشق زار۔ گھوڑے پر بھی سوار ہوں گے تو میٹھی پوئی پسند۔ بھئی اب جی گھبرا گیا۔ لو جماہیاں آنے لگیں۔ سارا نشہ مٹی ہو گیا۔ اچھا پھر کبھی بیان کر دیں گے۔ مصرعہ

تا کجا شرح کنم طاقت گویائی نیست

ذات شریف۔ آخ تھو (کھکھار کے اور گلا صاف کر کے) ختم ہوئی بس رام کہانی۔ اس برتے پہ تتا پانی۔ بے چلو ہٹو ہوا کھاؤ۔ ہم اور تمہارے چھینٹوں میں آئیں۔ قدرت خدا کی۔ افیون وفیون تو نہیں، ہاں

رباعی

در مذہب من اگر شوی بادہ پرست
بہ زانکہ بری بجانب افیوں دست!
نے مرد نہ زن، نہ مردہ و نے زندہ
نے خفتہ، نہ بیدار نہ ہشیار نہ مست!

وکیل۔ (نہایت پیچ و تاب کھا کر) مصرعہ

ہم تو مرشد تھے، تم ولی نکلے!

واللہ ہے، منہ سے تو بھولے بھالے معلوم ہوتے تھے، مگر اب معلوم ہوا کہ آپ بھی بڑے ذات شریف ہیں۔

ذات شریف۔ مصرعہ ـــــ لا ہاتھ ادھر دے کہ بہت دور کی سوجھی۔

(اودھ پنچ۔ ۴ ستمبر ۱۸۷۷ء)

ہوگیا زندگی سے جی بیزار

وقنا ربنا عذاب النار

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

توبہ سوبہ تلا بلا دوہائی تہائی چوتھائی۔ داد بیداد فریاد الغیاث وغیرہ وغیرہ۔ باینہمہ کان پکڑ کر اوٹھا بیٹھی بعد ملاحظہ نظر ثانی پھر توبہ کر بندے اس گندے روزگار سے۔ کیا کہیے اور کیا نہ کہیے۔ آج تک معہ مبالغہ پونے پانچ کروڑ برس ہوئے اس عذاب النار کا مطلب سمجھ کے بیچا بیچ میں نہیں آتا۔ بعضے عذاب النار کے یہی معنی بھاڑ چولھے کی آگ کہتے ہیں۔ بہتیرے ملّا قل آعوذیے، نا دوزخ جو ہمارے معزز مولانائے مغربی کے بقول یونہی سا ایک دو ہڑپن کا ڈراوے دھمکاوے کا آلہ ہے۔ مان بیٹھے ہیں۔ اکثر پیٹو مر بھکے پیٹ کی آگ یعنی بھوک پیاس کا عذاب سمجھے ہوئے ہیں، بعضے سپاہی پیشہ لڑنے مرنے، مورچہ میدان داری کے آدمی بندوق کی نلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ غرضکہ اپنے اپنے خیالی پلاؤ کون ایسا ہے جو نہیں پکاتا۔ خاص مطلب سچّی بات وہی ہے جو ایک برگزیدہ، سن رسیدہ، گرم و سرد چشیدہ پہنچے ہوئے اللہ والے بزرگ نے مرتے وقت چپکے سے کہی تھی کہ بھیّا نار سے مراد عورت، یہی عذاب وہ ہے کہ جس سے پناہ مانگنی چاہیے بلکہ پناہ بھی مانگے نہیں ملتی۔ غرض یہ کہ چھٹکارا ہی نہیں۔ بھاگے سے بھی جان نہیں بچ سکتی۔ اب ضرور ہوا کہ میں تھوڑا تھوڑا سا ذکر بھی کر دوں، پورا مرقع اتارنے میں تو کم سے کم کوئی سوا لاکھ جزو کی کتاب ہو۔ ہاں دو ایک جملے پتے نشان کے طور پہ وہ بھی لب لباب کہہ دوں گا۔ ہاں لے اب پڑھیے کیا۔ (وقنا ربنا عذاب النار) اے حضرت پہلی قسم بڑھیا معاملہ جندہ جورو عاشق معشوق کا درجہ، بیوی شمع پہ جیسے پروانہ، میاں جیسے چاند کے گرد چکورا، انتہا کے پینگ بڑھے ہوئے اخلاق میل جول ساری دنیاداری کی باتیں، ات گت ساتھ دنیا دی سب کام بند، میاں بے مصرف محض، گھر میں حوالات کا مزا، مجال کیا دالان کے باہر قدم نکالیں۔ دوست آشنا حق ملاقاتی سب کو استعفا۔ نوکری چاکری کا تو ذکر ہی کیا بلا تشبیہ کفر کے کلمے سے بھی زیادہ بیوپار تجارت گھر کی چار دیواری میں تو ممکن نہیں۔ بے دست غیب یا کیمیا بنانے کے کام کیونکر چلے، کھائیں کس کے گھر سے، اوقات بسری کیونکر ہو، لاکھ امیر سہی بیٹھے بیٹھے تو کنوئیں خالی ہو جاتے ہیں۔ خرچوں پر خرچوں کو آئے تو کہاں سے آئے۔ گھر سے باہر جانا، سفر کرنا بغیر سارا ٹبّر لادے کل اٹالہ ساتھ لیے ممکن نہیں۔ پھر کچے بچے چینگا پوٹی ماما، اصیل دائی کھلائی آئے گئے ملا کے تین چار کوڑی آدمی اور ایک دوسرے سے ایسا متعلق جیسے چہرے سے ناک، مصارف دن دونی رات چوگنی ماشاء اللہ ہو نیسنے ولے کی آنکھوں میں خاک روز بروز ترقی پر روزمرہ میں بھاڑ کی کیفیت جو پایا جہاں سے جو کچھ ملا جھونک دیا آخر تا بہ کجا مجبوری کو ہاتھ

پاؤں ہلانا چاہا۔ گھر سے باہر قدم نکالنا تھا کہ آفت آگئی۔ بس ہو چکا خوب دیکھا اب وہ ہماری بات کہاں صورت سے نفرت ہے۔ رسیاں تڑاتے ہیں۔ اے صاحب وہ نہیں کہتے کہ چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ، کون کس کا ہوا ہے ایک سی بات ذرا مشکل ہے۔ اب کی یہی کیفیت یہی لگاوٹ تھی۔ اے مشکل کشا کی قسم وہ آنکھ ہی نہیں۔ گھڑی بھر کو گھر میں آتے ہیں تو رسیاں تڑاتے ہیں کنڈے تولا کرتے ہیں۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کیونکر باہر اُٹھ جاؤں، کب نظر بچے کہ ہوا ہوں۔ توبہ ہے ہم سے تو نگوڑی کبوتری اچھی۔ جب دیکھو کبوتر اس کے گرد پھرتا ہے۔ چونچ سے کھینچا جاتا ہے، جوبن دیکھتا ہے، اور تو اور اپنے پیٹ کا دانہ اس کے منہ میں اُگل آپ بے چارہ بھوکا رہتا ہے۔ پھر یہ ایک پیار اخلاص ہی نہیں بچے پالے تنکے چونچ چونچ میں اٹھا لا کے دربے میں گھر بنائے۔ انڈے سیا کرے، بچوں کو پھرائے، کبوتری ذرا باہر نکلی اور غوں غوں اپنی زبان میں بلاتا ہے۔ زبان تو ہے نہیں کہ کہے مطلب یہ کہ تو کیوں تکلیف کرتی ہے یہیں چین سے بیٹھی رہ اور مزا یہ کہ وہ قطامہ اُدھر رُخ نہیں کرتی، بھاگتی ہے، دس دفعہ کی خوشامد درآمد میں ایک دفعہ شامد یہ بھی چونچ سے چونچ ملا دیتی ہے اور بڑی بڑائی اِدھر کی اُدھر اتراتی اتراتی دم لٹکائے تیرتی پھرتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کتان مرتبہ میں نے خود کہا کہ کیوں صاحب تم نے تو اب سب کہیں کا آنا جانا اٹھنا بیٹھنا چھوڑ ہی دیا۔ دن رات گھر میں کھونٹے سے لگے بیٹھے رہتے ہو، گھڑی بھر کو ٹانگیں سیدھی کر لیا کرو۔ اسی وجہ سے کھانا ہضم نہیں ہوتا، ٹل ٹلی چلا کرتی ہے تو حضور فرماتے تھے کہ صاحب سُنو باہر تم جا نہیں سکتیں اب تمہارے دیکھے بغیر چین کیونکر آئے۔ میں کہتا ہوں کہ گھڑی بھر میں تو میرا دل اُلٹ جلئے، نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جائے، کچھ بن پڑتا ہے۔ چلیئے صاحب وہی ہم ہیں کہ ٹپے مکھیاں مار رہے ہیں پورے نو بجے میاں سدھارے تھے یقین ہے بارہ بجنے کو آئے ہوں گے۔ اس بندۂ خدا نے پھر کروٹ ہی نہیں لی یہ بھی نہیں معلوم کہ مرتی ہے یا جیتی ہے اس پر کیا بنی اس نے کچھ کھایا پیا یا ہمارے انتظار میں یونہی بھوکی پیاسی کنڈا ہوتی ہے۔ لگے آگ۔ سچ کہتے ہیں مردوے اور طوطے کی ایک ذات ہے۔ بیوی بے دید بے مروّت آج کے سوا لعنت اللہ ہے جو ان کا رستہ دیکھے اور بھوکوں مرے۔ میں تو اپنے پیارے دیدوں کی قسم کل سے نو بجتے بجتے سویرے سے کھا پی مگن ہو کے بیٹھوں گی۔ پھر یہ بھی میری ناحق کی بات ہے مان نہ مان میں تیرا مہمان انہیں اس کی پرواہی کیا ہے وہ نہیں معلوم کہاں کہاں کون کون سی نعمتیں کھا کے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوں گے۔ مگر آج نہو ذوف ہے۔ ایسی باتوں پر یہ جب ہی تک ہے کہ دوسرا خیال نہ کرے جان کے انجان ہمارا بے سمجھے کیا آنکھوں سے دیکھے اور ٹال دے نہیں تو ذرا سے میں آدمی کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا ہے دن کو تارے نظر آتے ہیں۔

صورت اگر ضد ہی پر آجائے تو مردوے کو ناک چنے چبوا دے اور میرے ہاتھ میں وہ چٹیا دبی ہے کہ ابھی کہو تو کل ہی سے تگنی کا ناچ نچوا دوں، کچھ بنائے نہ بنے آنکھوں سے دیکھیں اور کرم کرم جلا کریں۔ ایک ادنیٰ سی بات کل سوار ہو کے باجی اماں کے بہانے سے چھوٹی پھوپھی کے یہاں جاؤں اور پندرہ دن کا غوطہ مار دوں، سواری پر سواری جائے اور خالی پھر آئے یوں ہی اکیلے پڑے مکھیاں مارا کریں۔ پھر آپ سے آپ دوئی تو یہ چٹکارا ہے میری باتوں پر اے لو وہی سیدھی سمجھ کے ننھی بھولی باتیں کرنے لگی یہ نہیں جانتی کہ گھر والے کا ایک گھر گھرے کے سو گھر۔ وہ تو خود اللہ خیر مناتے ہوں گے

کہ کہیں یہ دفع دفعان ہو تو کھل کھیلوں، رات رات بھر غائب رہوں۔ نوج آگ لگے ایسے خاوند کو جورو کو، کلیجہ میں پیپ پڑ گئی آئے دن کی موئی سوختی اس گھرداری کو لوکا سات چھپڑوں کا پھونس نگوڑی جان جلنے ہی کی ہو گئی۔ سب سے بڑی مصیبت جھوٹ ہو یا سچ الفت محبت کا نام ہی سہی اب بدگمانی بھی لازم و ملزوم بلکہ ضروریات شعر میں سے کہنا چاہیئے۔ لیکن نہ اتنی بے تکی نفرت خیز کہ جس سے جی متلائے دل بُرا ہونے آنے لگے، یہاں سیکھا سیکھی پڑوسن کی کہیں کسی دوست آشنا کے یہاں گئے لڑائی کا سرا نکلا حق ناحق کی تن بھن قسما قسمی ہو رہی ہے۔ قرآن کتاب تسبیح کنٹھا ایک ہے شامت کی مار کسی دوست نے بلوایا یا کہیں سے کوئی ملازم خدمت گار رقعہ لے کر آیا چلیے غضب ہوا تیوریاں بدل گئیں باچھیں پھڑکنے لگیں الٰہی شکر الٰہی شکر چلو اچھا ہوا یہ کوئی نئی ملاقاتی بڑے گہرے دوست پیدا ہوئے۔ ان کا حکم اتنی دیر بھی گھروالے میں بیٹھنے کا نہیں۔ پھر تازی تازی دوستی ہے نا ملاقات کے معنی بھی یہی ہیں جب تک ملاقاتی دوسرے کی ٹانگوں میں ٹانگیں ڈالے ایک جگہ نہ بیٹھا رہے وہ ملاقات ہی کیا۔ ہم نے تو یہی دیکھا سُنا کہ جہاں کسی سے رسم و راہ دوستی آشنائی ہوئی وہاں فوراً گھربار تج دیا، جورو بچوں کو استعفا دے انہی کے دروازے پر دھونی رما بیٹھے، لکیر کے فقیر ہو گئے۔ اگلے وقت کی وہ مثل سنی تھی کہ شادی مبارک نوکری ندارد، یہاں الٹی گنگا بہی ہے۔ دوستی مبارک گھرداری ندارد بلکہ جورو جاتا بال بچے سب برخاست ماما اور چھوٹی انا ذرا جا کے ان آدمی صاحب سے اتنا تو پوچھا کہ بھائی کہاں بلایا ہے کیا کام ہے کچھ خیریت تو ہے بھلا اگر تھوڑی سی دیر ہو جائے تو کچھ قباحت تو نہیں۔ خط چاہے کیسا ہی ضروری بلکہ دوسرے کسی شخص کا فقط یہاں کے پتے سے آیا ہے پھر کچھ ہی کیوں نہ ہو بغیر کھولے اور پڑھ لیے چین کہاں سب سے بڑھ کے شامت کی مار اگر کہیں میرے پیارے دوست (تہذیبِ حال کا فقرہ) یا جانِ من فدایت باد کسی بے اٹکل خانماں خراب نے لکھ دیا اور بملاحظۂ اقدس بیوی صاحبہ معظمہ آیا تو زمین آسمان کے قلابے مل گئے۔ بہت بڑی بڑی موٹی جلدوں کے قرآن سات سات تلے اوپر رکھ کے اٹھتے ہیں کہ یہ خط کسی عورت کا ہے ہائیں نام تو دیکھو۔ نام کو کیا دیکھیں اول تو بنا کے احمد محمود لکھ دیا دوسرے کیا مردانے نام رنڈیوں کے نہیں ہوتے ہیں، صاحب علی جان امیر صاحب وزیر صاحب پیارے صاحب حیدر صاحب ایک ہو تو کہا جائے۔ باقی جب قلم ہاتھ میں ہے تو گوہر خان یا خورشید کا صاحب خورشید حسن نہیں ہوتا بلکہ اس قوم کے تو یہی پیارے پیارے ننھے منے نام ہوتے ہیں۔ اب لڑائی کیلئے جانا ہے آٹھ آٹھ دن تک ہنڈیا چولہا اوندھا پڑا ہے بہ ہزار دقت بڑی منت خوشامد سے جب سعی سفارش ہوئی تو اس خانہ جنگی سے نجات ملی غرض کہ نئے دن کی تو تو مَیں مَیں۔ پھر ہانڈی کا سا اُبال ایک مورچہ ہو چکا تھا کہ دوسرا قلعہ دغنے لگا۔ آج کیا ہے دامن میں پیک کا دھبہ کیوں لگا ہے۔ کل یہ گلوریاں کہاں چبائی گئیں کہ ہونٹوں پہ لکھوٹا جم گیا۔ جیتی جان عطر کیونکر نہ لگائے ہوں۔ اب تو گلاب کیوڑے کے حوض میں غوطے لگتے ہیں۔ بالوں میں کنگھی نہ کرے اور نہائے نہیں تو جوئیں بہنے لگیں۔ کپڑے گرمی میں دوسرے دن نہ اتارو تو پسینے کی بُو سے ناک نہ دی جائے پناہ بذات خدا اب سینے مقدار اس لائے یہ نکھار یہ چکن پٹ بغیر کہیں لگن لگے تو ہوئی نہیں۔ ماشاءاللہ جب دیکھو جیسے چوتھی چالے کی دلہن، پٹیاں بنتی ہیں، گلوری سے منہ کبھی خالی نہیں، آئینہ تو سامنے سے سرکتا ہی نہیں، بغلیں سونگھو کے تازے پھولوں کی خوشبو آتی ہے اور ابٹنا کہاں مل گیا مائیوں بھی بیٹھے تھے، یہ تو اب جوہر کھلتے جاتے ہیں جناب امیر کی قسم میں اگر قرآن کا جامہ پہن کے آؤ تو نہ مانوں، کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ نیند کسی دن شام سے آتی تھی کبھی دو دو بجے تک آنکھ نہیں لگتی

ٹھنڈی سانس اکثر اوقات بلا ضرورت بھی نکل جاتی ہے۔ شعر کا پڑھنا اور اس کے مضامین کا مختلف ہونا کچھ اختیاری بات نہیں اور نہ کچھ ایسی قباحت ہے۔ بھوک یہ کچھ ضرور نہیں کہ ایک سی ہے اور ایک ہی وقت اشتہا ہوا کرے۔ سوتے میں آدمی بدخواب بھی ہوتا ہے، بڑاتا بھی ہے۔ مشکوک مزاج کو اکثر مہری یہ نالی کی چھینٹ سے بھی بغیر نہائے چارہ نہیں، نماز بڑے بڑے نمازیوں کی ایک کیا دو دو چار چار وقت کی قضا ہو جاتی ہے۔ آنکھیں محرور مزاجوں کی تو ہمیشہ اور یوں عموماً گرمیوں کی فصل میں یا کسی گرم غذا کے کھانے سے سرخ بھی ہو جاتی ہیں۔ رنج ملال انسان کو ہوا ہی کرتا ہے ایک سی طبیعت ہمیشہ رہتی نہیں، کبھی گدگدی میں آدمی رو دیتا ہے۔ کبھی جھُریاں کھاتا ہے اور ٹھٹھے لگاتا ہے، سوتے میں کروٹ کا اِدھر سے اُدھر ہو جانا کوئی ایسے گناہ کی بات نہیں پھر سوا ہوا برابر مثل مشہور ہے مگر توبہ توبہ العظمت للّٰہ جتنے سامان عرض کیئے گئے یہ جملہ دفعات مندرجہ بالا ایک ایک کو تخم فساد کہنا چاہیئے اس میں سے جو پھُنسی ہے وہ ایسا دل باندھتی ہے جس کی حد نہیں۔ وہ الجھنیں ہوتی ہیں کہ مہینوں کلیجے پر نشتر پڑا کرتے ہیں۔ محرم کی مجلسیں بلا قید کل فرقے سب قوموں میں ہوا کیا ہیں۔ پھر ایک شہر کی سکونت اور کچھ نہ سہی تو خالی علیک سلیک صاحب سلامت ہی ہے بغیر شریک ہوئے بنتی نہیں۔ جو انفوں پر سب سے زیادہ محبت کا اطلاق دفعہ حصہ کیونکر نہ آئے۔ اب اِدھر آدمی نے پکارا کہ ماما جی حصہ لے جاؤ۔ بی بی آبادی کے یہاں کی حاضری یا بی مشتری کے گھر کی قفلی ہے، اور قیامت قائم ہوئی۔ سچ مچ ٹیڑھی کھیر ہو گئی۔ مجال کیا ٹاٹ کا پردہ نہ اٹھنے پائے، مزدوری دستوری چہ معنی وارد بلا تشبیہ تبرک کی دردشا ہونے لگی۔ سب سے بڑی اہم لڑائی پوری قلعہ بندی کوئی لونڈی باندی ماما اصیل پیش خدمت مغلانی اماری کہاری ایک آدھ کنے سے درست ستون سے اتری ہوئی نہ ہوئی اور گھر کا مالک سمجھ کے کام کاج بھی ہبک دبک کے کیا پھر کیا پوچھنا ہے میرے بھائی کھڑے کھڑے شہر بدر تو نہیں گھر بدر کر دی گئی۔ اب کام کی تکلیف ہے تو پیزار کی نوک سے۔ ہزاروں لاکھوں قسموں پہ تسکین نہیں، دشمنی روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ غصہ میں اگر کبھی کوئی امر خلاف مزاج زبان پہ آ گیا تو تو نیزے پانی بلند، پھانسی دلوا دینا اور قتل کرا دینا باقی رہ جاتا ہے۔ غرضکہ زندگی تلخ، یہ پہلا دن نہایت چاہ پیار الفت محبت والا تھا۔ اب اختلافِ مزاج کا ذکر ہی کیا بقول شخصے ؎

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو　　اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

البرٹ بل

منشی جوالا پرشاد برق

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان
طوق زریں ہمہ در گردن خرمے بینم

لو سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ ایک چھلاوہ تھا جو چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یکایک بلائے آسمانی پھٹ پڑی۔ ایک اینٹ کی خاطر مسجد ڈھائی۔ پیارا بل ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گیا اس کی پیدائش پر کیا کیا ناز تھے۔ اس کے والدین نے اسے کیسے کیسے لاڈ سے پالا۔ بچپن میں کیسی کیسی داشت کی۔ رات کو رات دن کو دن نہ سمجھا مگر دشمنوں کی نظر کھا گئی۔ سوتیلی ماں کے پالے پڑا۔ ماں باپ ہاتھ مل کر رہ گئے۔ ہماری امیدوں کا خون ہو گیا۔

فوجِ اندوہ والم ٹوٹ پڑی دھوکے سے
آرزوئیں ہوئیں سب قتل پڑا رن کیسا

کلیجہ دھک سے ہوا کیسی کچھ دل پر چوٹ لگی۔ رپن کا زمانہ۔ ہم تو خوشیاں مناتے بغلیں بجاتے مست پڑے ہوئے تھے آخر کو پالا ہمارے ہی ہاتھ رہے گا۔ مگر یکایک پردۂ غفلت جو آنکھوں سے اٹھا تو بھور ہو گیا۔ ان اینگلو انڈین سے خدا سمجھے عین موسمِ بہار میں ہمارا آشیانہ نوچ کھسوٹ کے پھینک دیا۔ "کم بخت کنکارڈوٹ" نے منحوس شکل دکھائی۔ سخن سازوں نے ملکۂ معظمہ کے پروکلیمیشن کے الفاظ میں نئے نئے معنی پہنائے پیارے رپن کو مجبور کیا۔ وہ بھی بُرے پھنسے۔ کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑا۔ ممبران کونسل کے نقارخانے میں طوطی کی آواز کسی نے نہ سنی۔ آخرش وہ بھی انہی کے ساتھ سر ہلانے لگے۔

جا کر قفس میں عاشقِ صیاد ہو گیا بلبل کا حال قابلِ فریاد ہو گیا
انصاف اُلٹے استرے سے مونڈا گیا بغاوت نے نقارہ فتح کا دھم دھڑم بجا دیا

یہ سچ ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے پیارے رپن کو ہم کیا کریں
جیش بالائی تو نازم چہ بصلح و چہ بجنگ کہ بہر حال باندازۂ ناز آمدہ

اختیار ملا مگر برائے نام جوری کی یخ بلا کی طرح پیچھے لگی مگر ہمت نہ ہارنا چاہیے۔ پارلیمنٹ میں واویلا ضرور ہو۔ ہندیو دشمنوں سے سبق لو کچھ کھو کے اب تو سیکھو۔ دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہے جس کی لاٹھی اسکی بھینس

اگر ہم بھی گورنمنٹ ہوس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے۔ فتنہ انگیزی پر کمر باندھتے، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی رہتا۔ مگر شر ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم تو سچے خیر خواہ سرکار ہیں۔ مگر ہائے سال بھر کی محنت کھاری کنویں میں ڈوب گئی۔ کیا کیا خیالی قلعے بنائے تھے مگر "اکنالدٹ" کے ایک ہی گولے نے ان کا صفایا کر دیا۔ جن پر ہمیں بھروسا تھا، جو ہماری خیر خواہی کا دم بھرتے تھے وہی دغا دے گئے۔ وقت پر نکل کھڑے ہوئے۔ کاندھا ڈال دیا۔ گویا ہم بیچوں بیچ سمندر میں ایک ٹاپو پر اترے تھے۔ کھانا پکایا، دسترخوان بچھایا۔ جیسے ہی کھانے کو ہاتھ بڑھایا کہ دفعتاً جزیرہ ہلنے لگا اور دم کے دم میں سب غڑاپ سے سمندر میں۔ افوہ دھوکہ ہوا تھا۔ وہ جزیرہ نہ تھا وہیل مچھلی کی پشت تھی۔ خیر۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

بہار

جوالا پرشاد برق

اٹھلاتی لجاتی مسکراتی   کس ناز سے ہے بہار آئی
کم سن - الھڑ - حسین - البیلی   چوتھی کی دولھن نئی نویلی
بوٹا سا وہ قد بہار کے دن   اوٹھتی کوپل اوبھار کے دن
گہنا پھولوں کا زیب تن کر   دھانی جوڑا نیا پہن کر
گھونگھٹ اِک ناز سے نکالے   سہرا پھولوں کا منہ پہ ڈالے
ہریالی بنی وطن میں آئی   اِک سبز پری وطن میں آئی
اوتری گلشن میں جب سواری   سورج نے آرتی اوتاری
گل نے زرِ گل کیا نچھاور   صدقے ہوئی عندلیب اوڑ کر
شبنم بھر لائی کورے کورے   شربت سے گلاب کے سکورے
خورشید نے آئینہ دکھایا   کرنوں نے مورچھل ھلایا
نہریں ہر پھر کے لائیں پانی   سبزے نے بچھایا فرش دھانی
خوشیاں اشجار نے منائیں   میووں کی ڈالیاں لگائیں
غنچوں نے چٹک کے لی بلائیں   بلبل نے چہک کی دیں دعائیں
مرغانِ چمن نے گیت گائے   ہر رنگ کے زمزمے سنائے
چڑیوں نے گا کے دل لبھایا   موروں نے ناچ کر رجھایا
بدلی پھولوں نے اپنی وردی   اودی - زنگاری - لاجوردی
بھونروں نے یہ گونج کر صدا دی   کوئل نے یہ پھیر دی منادی
معشوقۂ گلعذار آئی   آئی آئی بہار آئی
سن گن جو ہیں فصل گل کی پائی   سردی گھبرائی سٹ پٹائی

گردش سے دنوں کے بے خطر تھی   مطلق نہ بسنت کی خبر تھی
معزولی کی اپنی پاتے ہی چھاؤں   اوتر کو کٹک چلی دبے پاؤں
رنگ اوڑ گیا پہلے جو جما تھا   گھر مٹ گیا جو بنا ہوا تھا
بیچاری کی کوکھ اوجڑ گئی ہے   پالے پر اوس پڑ گئی ہے
مکھڑے پر گھٹا ہے غم کی چھائی   چہرے پہ ہے چھوٹتی ہوائی
پھوٹی قسمت پہ روتی ہے برف   ہستی گھل گھل کے کھوتی ہے برف
رنگت ارض و سما کی بدلی   صورت سیرت ہوا کی بدلی
اطراف جہاں میں مچ گئی عید   پہونچا خطِ استوا پہ خورشید
چرخِ چارم پہ ہے نمایاں   فیاض زماں - مسیح دوراں
چلتی ہے ہوا اوسی کے دم سے   ہے نشو و نما اوسی کے دم سے
نیچر کو شعاعیں پالتی ہیں   ہر چیز میں جان ڈالتی ہیں
کرنوں نے گرمی جڑوں میں گھس کر   پیدا کئے یہ نمو کے جوہر
شاخوں میں جڑوں سے چڑھ کے پہونچیں   دوڑیں پتوں میں بڑھ کے پہونچیں
سجنے لگیں باغ و بوستاں کو   رنگنے لگیں تختۂ جہاں کو
فیروزی - صندلی - گلابی   خاکی - عنابی - سرخ - آبی
لاکھی - نارنجی - ارغوانی   طوسی - خشخاشی - آسمانی
کافوری - کاکریزی - لاہی   بادامی - سیاہ - زرد - کاہی
عباسی - پیازی - زعفرانی   ماشی - زنگاری - سبز دھانی
ہر اک کا جدا ہے رنگ و روغن   پر سبزے پہ ہے بلا کا جوبن
سایہ بھی ہے اوسمیں روشنی بھی   گرمی سے ملی جلی ہے سردی
سبزے کا اوبھار کیوں نہ بھائے   ہر فصل بہار کیوں نہ بھائے
او آنکھوں کو نور دینے والے   او دل کو سرور دینے والے
کہساروں پہ تو ہی ڈہ ڈھایا   گلزاروں میں تو ہی لہلہایا
ساری خلقت ہری ہے تجھ سے   ہر چیز ہری بھری ہے تجھ سے
اللہ رے تمولی کارسازی   بخشی گلشن کو روح تازی
بادِ سحری چلی جو سن سن   ابھرا ہر شاخِ گل کا جوبن
سینوں میں ہوئی اُمنگ پیدا   ننھی کلیاں ہوئیں ہویدا
چھیڑا جو صبا نے کسمسائیں   کچھ کچھ دبے ہونٹوں مسکرائیں

پھر گل پہ نسیم نے کھلایا بڑھ کر پہلو میں گُد گُدایا
سب مارے ہنسی کے کھلکھلائیں پھولے نہ وہ جامے میں سمائیں
باچھیں گئیں کھِل خوشی کے مارے دم پھول گیا ہنسی کے مارے
خوشبو درجِ دہن سے نکلی اترائی ہوئی چمن سے نکلی
کچھ ایسی دماغ میں سمائی شاخِ گل کو ہوا بتائی
اٹھلاتی ہوئی چلی ادا سے چُہلیں کرتی ہوئی ہوا سے
گھوڑے پہ سوار تھی ہوا کے جھونکے گئے بن اڑن کھٹولے
ہر موجِ نسیم تھی معنبر خوشبو سے جہان ہوا معطّر
پیارا پیارا سماں جو دیکھا خلقت کو شادماں جو دیکھا
گھر سے اپنے کسان نکلے بوڑھے بالے جوان نکلے
تاروں کی چھاؤں۔ منہ اندھیرے کھیتوں میں پہونچ گئے سویرے
گوڑی جوتی زمیں کمائی نیچے کی زمین اُوپر آئی۔
بو جوت کے بیڑیاں لگائیں کچھ لوگوں نے چرخیاں لگائیں
پُر سے پانی کسی نے کھینچا بعضوں ڈھیکلی سے سینچا
برہا کوئی سنبھالتا ہے نالی کوئی نکالتا ہے
مل مل کے دہاتنیں ہیں گاتی کھرپی سے ہے کھیت میں نراتی
کھیتی پہ نثار ہونے والے وہ جوتنے والے بونے والے
فارغ ہوئے آج جوت بو کر پلٹے گھر ہاتھ پاؤں دھو کر
پانی کھیتوں میں بھر چکے وہ جو کچھ کرنا تھا کر چکے وہ
اس کام سے گو ہوئے وہ آزاد اب فکر ہے فصل ہو نہ برباد
آفت سے اوسے خدا بچائے امید پہ پانی پھر نہ جائے
بےچین ہیں سخت ہے تردد ہر دم کمبخت ہے تردد
دھڑکا ہے بڑا پڑے نہ افتاد کھٹکا ہے ہوا کرے نہ برباد
دل میں ہیں یہ وسوسے سمائے گروی گیہوں میں لگ نہ جائے
پتھر نہ پڑیں کہ کھیت ہوں گرد پالا نہ پڑے کہ پیڑ ہوں زرد
پچھوا سے نہ ساری فصل کھو جائے گیہوں پتلا نہ گر کے ہو جائے
پیڑوں پہ ٹڈیاں نہ چھا جائیں ہرہے گودو نہ کھیت کھا جائیں
چوہوں کے کاٹنے کا ڈر ہے دیمک کے چاٹنے کا ڈر ہے

کھیتوں میں بیج سڑ نہ جائے   کھیتی پہ اوس پڑ نہ جائے
دل ٹوٹ گیا پھٹے جو بادل   جی چھوٹ گیا ہٹے جو بادل
پالا جو پڑا تو دل ہوا سرد   سرسوں نہ جمی تو منہ ہوا زرد
خورشید حمل سے ہو ہویدا   نیچر میں کر امتزاج پیدا
برہم نہ مزاج آب و گل ہو   حدّت کرنوں کی معتدل ہو
بادل برسا دے ابرِ نیساں   دانے موتی سے روے دہقان
شبنم بدہ جا تو ڈالیوں میں   موتی سے پرو دے بالیوں میں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آؤ   اُودی اُودی گھٹائیں چھاؤ
گھبرا نہ کسان ہے خدا ساتھ   اللہ کے ہیں بڑے بڑے ہاتھ
دنیا کا رفیق تو ہے دہقان   عالم کا شفیق تو ہے دہقان
مفلس۔ قلاش۔ بھوکے محتاج   زردار۔ امیر۔ صاحبِ تاج
سب کا تو نے ہے پیٹ پالا   تیرا ہو جہان میں بول بالا
تیری فیاضیاں ہیں مشہور   کیونکر نہ ہو تجھ پہ ہند مغرور
یا رب برسا دے ابرِ رحمت   لگ جائے ٹھکانے اس کی محنت
نیّت میں ہو پھل جنابِ باری   محنت ہو سو پھل جنابِ باری
ٹھنڈے جھونکے چلیں خدایا   شاخیں پھولیں پھلیں خدایا
ہاں جوشِ نمو بڑھے الٰہی   یہ بیل منڈھے چڑھے الٰہی
پودے جو نہال ہوں تو بن جائے   دہقان خوشحال ہوں تو بن جائے
اے ابرِ کنوں بہ ہوشش در آ   اے رحمتِ حق بہ جوشش در آ
گاڑھی ہے کسان کی کمائی   باشد کہ بود کرم نمائی
دکھلایا دعا نے یہ نتیجا   آہوں سے فلک کا دل پسیجا
نکلا تیزی سے مہرِ انور   حدّت سے بھڑک اٹھا سمندر
کرنوں کی ادھر بڑھی شرارت   پانی کی ادھر بڑھی حرارت
قلزم کی بدن میں لگ گئی آگ   منہ پہ غصّے سے آگیا جھاگ
اک جوش میں آیا بحرِ زخّار   دل بادلوں کے چڑھے دھواں دھار
چھایا بڑھ کر فلک پہ مارا   چھاتا دل کا بخار سارا
خورشید کو بادلوں نے گھیرا   عالم میں چھا گیا اندھیرا
کرنوں سے ہوا لطیف ہو کر   چلنے لگی بن کے بادِ صرصر

بادل اڑتے ہوا سے بھاگے
باتیں کرتے ہوا سے بھاگے
میدانوں میں بڑھ کے آ گئے وہ
کہساروں پہ چڑھ کے چھا گئے وہ
ٹکرائے پہاڑ سے کہیں پر
جھلا کے برس پڑے وہیں پر
اونچی نیچی پہاڑیوں پر
دھاریں گرتی ہیں ٹکرا کر
چشمے کہیں زور کر رہے ہیں
نالے کہیں شور کر رہے ہیں
نہریں اٹھلاتی جا رہی ہیں
لہریں موجیں اڑا رہی ہیں
سبزے سے ہرا ہے دامنِ کوہ
پھولوں سے بھرا ہے دامنِ کوہ
تختہ ہے چمن کا یا پہاڑی
گملا پھولوں کا یا کہ جھاڑی
سبزے کا پہاڑ پر یہ انداز
جیسے چہرے پہ سبزہ آغاز
گھاٹی پھولوں سے رشکِ گلزار
دانتی پہ درخت سلسلہ وار
معشوقہ سبز رنگ ہے گھاس
ہر پھول میں ہے دلھن کی بوباس
بیلیں ہیں پڑی ہوئی شجر پر
بندھن واری بندھی ہے در پر
چرتے ہیں ہرن پرے جمائے
پھرتے ہیں کنوتیاں اوٹھائے
مستی میں کلیلیں کر رہے ہیں
میداں میں طرارے بھر رہے ہیں
کھوہوں میں چھپے ہوئے ہیں زہاد
دنیا بھولی ہوئی خدا یاد
چپ بیٹھے ہیں دھونیاں رمائے
اللہ سے اپنے لو لگائے
جل پیتے ہیں کھا کے جنگلی پھل
جنگل میں منا رہے ہیں منگل
پھل پھول پہ کرتے ہیں قناعت
تنہائی میں کرتے ہیں عبادت
صانع کی دیکھتے ہیں صنعت
اللہ کی دیکھتے ہیں قدرت
ہر شے سے عیاں ہے نور اوس کا
ہر رنگ میں ہے ظہور اوس کا
افلاک و زمیں نجوم و حیواں
دھات اور نبات۔ جن و انساں
جھیلیں۔ دریا۔ پہاڑ۔ چشمے
اوس کی قدرت کے ہیں کرشمے
مرغانِ چمن سروں میں گاؤ
توحید کے زمزمے سناؤ
نہرو پھر پھر کے ہو عبادت
جھرنو گر گر کے ہو عبادت
سر سجدے کو خم کرو ثمر تو
جھک جاؤ شاخِ بارور تو
مرغانِ چمن چہک اوٹھو تم
گلہائے چمن مہک اوٹھو تم
بلبل کی تنیاں پہ قال آئے
پتی پتی کو حال آئے
قدرت کے ہتھکنڈے ہیں نرالے
دیکھیں آنکھوں سے آنکھوں والے

تازہ کیا جسم و جاں کو اوس نے
سرسبز کیا جہان کو اوس نے
ہے رشکِ جناں ہر ایک گلشن
ہر پیڑ پہ ہے بلا کا جوبن
رُک رُک کے نسیم چل رہی ہے
سبزے پہ ہوا مچل رہی ہے
گیہوں کے کھیت دھانی دھانی
تختے سرسوں کے زعفرانی
ایسی کھیتوں میں کچھ تو اودی
کچھ سرمئی اور کچھ کبودی
ٹیسو سے ہے لال لال جنگل
منہ پر ہے ملے گلال جنگل
آتے ہی بسنت مدہ پہ آئیں
شاخیں آموں کی بور لائیں
کوئل کوکی تو آئے بادل
سر پہ گلشن کے چھائے بادل
اوپر چھائی ہوئی گھٹا ہے
نیچے پریوں کا جمگھٹا ہے
شکلیں نکھری ہوئی ہیں سب کی
زلفیں بکھری ہوئی ہیں سب کی
سحر انکھڑیوں میں زباں میں جادو
نظروں میں فسوں بیاں میں جادو
مستانی ادا ۔ نشیلی آنکھیں
تیکی چتون ۔ رسیلی آنکھیں
بانکی وہ چھب وہ ترچھی چتون
شوخی ۔ طرّاری ۔ چلبلا پن
جو ہے وہی کھیلتی ہے ہنس کر
اک ایک ڈھکیلتی ہے ہنس کر
انداز سے آ رہی ہے کوئی
منہ پھیر کے جا رہی ہے کوئی
ہنستی پھرتی ہے کوئی تنتی
جوڑا پہنے ہوئے بسنتی
کوئی کرتی ہے چھیڑ خانی
دکھلا کے کسی کو کچھ نشانی
کوئی پڑی آہ کر رہی ہے !
کوئی کھڑی واہ کر رہی ہے
کلیاں چن چن کے توڑتی ہیں
آپس میں شگوفے چھوڑتی ہیں
کھل کھیلی ہیں راگ لا رہی ہیں
مل مل کے بسنت گا رہی ہیں
دنیا تو بہار سے ہے مسرور
ہے برق کا سوزِ دل بدستور
واں دشت و چمن ہرے ہوئے ہیں
یاں داغ کہن ہرے ہوئے ہیں

گل بے رُخِ یار خوش نباشد
بے بادہ بہار خوش نباشد

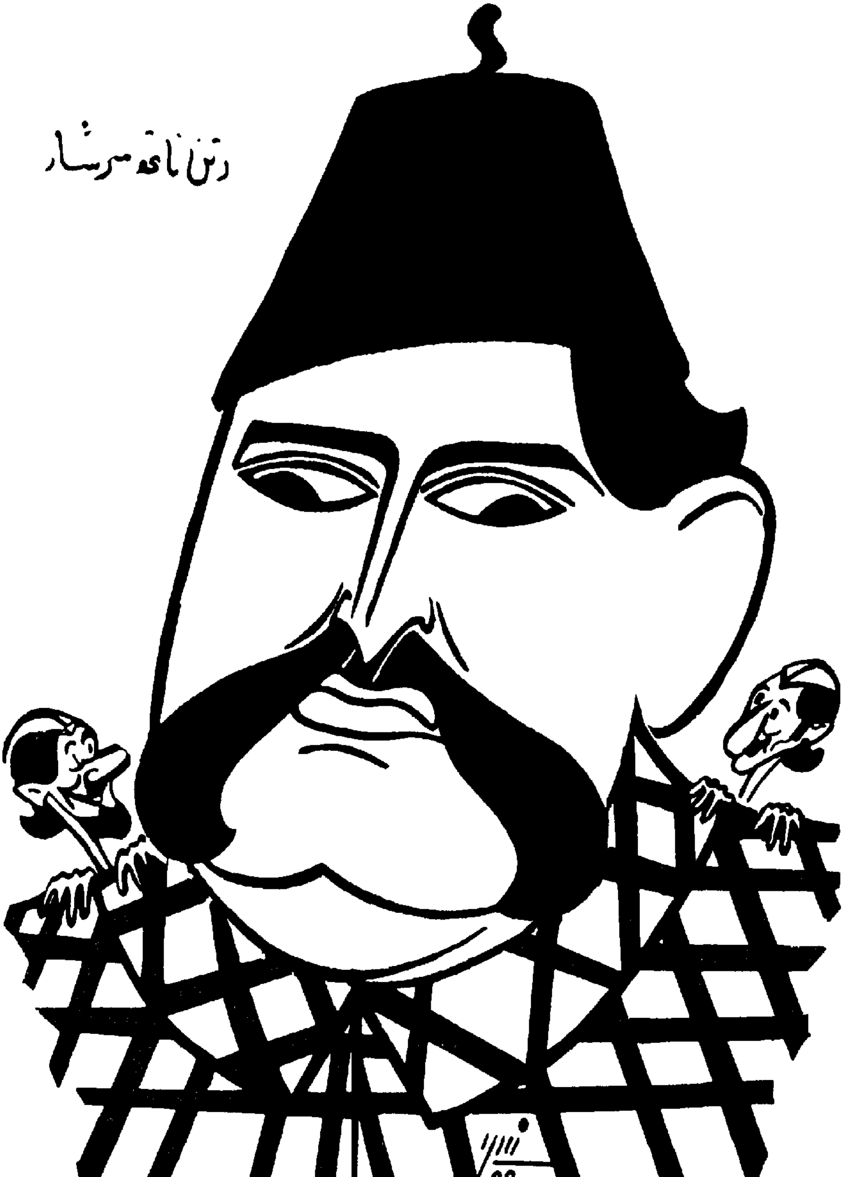
رتن ناتھ سرشار

RATAN NATH SARSHAR

کیا یہی ہے لن ترانی آپ کی
دیکھ لی بس خوش بیانی آپ کی

پنڈت رتن ناتھ سرشار

ہم :۔ اودھ پنچ ہیں؟ ذرا ادھر تو آؤ۔ تمہیں واللہ ایک بات سنتے جاؤ۔ خدا کی قسم وہ لطیفہ سناؤں کہ ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر ہو جایئے۔

اودھ پنچ :۔ تو بھئی ہم بے سُنے ہی کھلکھلا کے ہنسے دیتے ہیں (ہا ہا ہا۔ خ خ خ خ خخ)

ہم :۔ یار اس کی سند نہیں۔ آخر عجلت کیا ہے۔

اودھ پنچ :۔ واہ وا۔ عجلت کیا ہے! اور سنئے صاحب۔ زار روس کا حال سُننا ہے۔ پرنس بسمارک کی ملاقات کرنا ہے۔ ڈزریلی صاحب کی خبر لانی ہے۔ رومیوں کی خیر منانی ہے۔ کیا آپ کی طرح لونڈے پڑھانے ہیں۔

ہم :۔ واللہ۔ کیا کہی ہے۔ لانا ہاتھ۔ کیوں سچ کہنا کس چکمے سے ہاتھ لیا ہے۔ کیا سر دست سوجھی ہے۔ ورنہ تم ہاتھ نہ لگتے۔

اودھ پنچ :۔ اے لاحول۔ ہاتھ دے کے ہم نے یہ پھل پایا اچھا کہو کیا کہتے ہو؟

ہم :۔ ایک ضلع میں ایک بیدم کے ولایتی کا بیٹھے بیٹھے شوق چرایا کہ اردو پڑھیں۔ سوچے کہ ہرشل نے علم ہیئات میں اپنی تحقیق دقیق کا سکّہ بٹھا دیا۔ نیوٹن نے ریاضی میں کوس لمن الملک بجایا۔ کلمبس نے دنیائے عتیق کا پتہ لگایا۔ آؤ ہم اردو کے پڑھنے میں ایسی بات ایجاد کریں کہ شیطان سے زیادہ مشہور ہو جائیں۔ سوچتے سوچتے آخر ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔ بہت دور کی سوجھی۔ سوچے کہ الف بے تے انہ بیٹھے بیٹھے کون رٹے۔ یہ پرانا فیشن ہے۔ آؤ پہلے گالیاں سیکھیں۔ اس سے دو فائدے بہ یک کرشمہ دو کار۔ ایک تو گالیاں سیکھ جائیں گے زبان دان کہلائیں گے۔ دوسرے ہم ولایتی آدمی ہندیوں پر بڑھ بڑھ کے منہ لگائیں گے۔ اونہیں کی زبان میں اونکو صلواتیں سنائیں گے۔

اودھ پنچ :۔ بارک اللہ۔ ولایتی اور ہندی کی ایک ہی ہوئی۔

ہم :۔ خیر صاحب۔ یہ سوچ کر حضرت نے ایک مولوی بڈھے کو بلایا۔ اور اپنا مافی الضمیر کہہ سُنایا۔ وہ بے چارے ہکلائے۔ بغلیں جھانکنے لگے۔ صاحب گالیاں سکھانا ہمارا کام نہیں۔ فرخ آباد جایئے۔ پیر بھجڑی کی بیعت کیجئے۔ یا بھٹیاریوں سے قارورہ کرایئے۔ ہمیں آزاد فرمایئے۔ ایسی نوکری سے ہم درگزرے۔ صاحب بہادر بہت بگڑے۔ سیدھے سے ٹیڑھے اور بیٹھے سے اوندھے ہو

گئے، (عقل کے اوندھے) طیش کھا کر فرمایا کہ دل میں افسوس آتا ہے۔ ہم گالیاں نہیں جانتا اور دائنہ (ورنہ) سب کے پہلے ہم تم کو گالی دیتا۔ آخون جی (گنجے کو خدا ناخن نہیں دیتا) کہتے ہوئے۔ اس بے دم کے یہاں سے ٹوک دم بھاگے۔ صاحب بہادر اس ٹوپی کو زرہ مغز سمجھا اور کسی ہیکڑ الدولہ مخش الملک سے بیس پچیس گالیاں لکھوا لائے ایک دن کا تذکرہ سنئے منزل دور تو ہو بیٹھے۔ صاحب بہادر ایک مرتبہ موضع حماقت پور پرگنہ خر آباد میں تشریف لے گئے۔ رات کو دس بجے جب اپنے کام سے فراغت پائی تو یادِ الٰہی کے عوض گالیاں یاد آئیں۔ فوراً با آوازِ بلند گالیاں یاد کرنے لگے۔ خانساماں خیمے سے دور تھا۔ سائیس سے پوچھا۔ کاہے ہو گھور یو مرگا سارا آج بیوکت (بے وقت) کاہے ہلّا مچائے ہے۔ ادھر سے گھبرا کر کہا (بھائی مار بھائی مار) لو مرگا نا ہیں۔ صاحب کچھ پڑھت ہیں) خانساماں فوراً خیمے کے پاس گیا۔ اہا ہا ہا۔ یہ صاحب کو ہو کیا گیا۔ ابھی تو اچھے بھلے چنگے تھے۔ گرمی چڑھ گئی یا پاگل ہو گئے۔

چق اٹھا کر اندر گیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ صاحب لہرا لہرا کر گا رہے ہیں۔ مگر بے وقت کی شہنائی۔ نئے دُھن میں سر دُھن رہے ہیں۔

سؤر کا بچہ ۔ مرغی والا
حرام زادہ ۔ کتوں کا سالا

اے سبحان اللہ۔ کیا موزونیِ طبع ہے۔ یہاں بھی قافیے کا قافیہ تنگ کیا۔

خانساماں :۔ صاحب یہ آپ ہی آپ کس کو گالیاں دے رہے ہیں۔

صاحب :۔ ول بھاگ جاؤ۔ آج ہمارا پہلا سبک ہے۔

بجا ہے پیر و مرشد۔ دوسرا سبق اس دن ہوگا جب حضور کی چپت گاہ سے پٹے پر قینچ کے جائیں گے۔ فصد کھولی جائے گی۔ تو گویا سب کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ اور فاضل حضور تب ہی ہوں گے جب پاگل خانے میں زنجیر کھڑکھڑائیں گے۔ آپ کا علم دنیا سے نرالا ہے کہ بسم اللہ ہی سے لوہے کے چنے چبواتا ہے۔

ہ۔ قہ قہ قہ قہ۔ جبھی تو قہ قہ قہ اچھی ہے

بحمد اللہ کہ یہ ولایتی صاحب کسی ضلع کے مجسٹریٹ یا جج نہیں۔ ورنہ عدل و انصاف پر خوب گالیوں کا چھرّا چلتا ہے۔ ہم کہتے آم وہ کھٹے ابی۔ سرکار نے یہ اچھی قید کر دی کہ حکام یورپین جب تک اردو کا امتحان نہ دے لیں ترقی نہ پا سکیں۔

اودھ پنچ ۱۴ر اگست ۱۸۷۷ء

سرشار

طالبِ نظارہ ام پردہ برافگن زرخ
پیشِ صفِ راستاں شعبدہ بازی مکن

ایک پُرفزا اور نزہت افزا باغ میں ایک رندِ شاہد باز چھٹے رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ اِدھر گلرخانِ سیم بدن خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے۔ اور احباب بزلہ سنج مرنجاں مرنج بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہچہا رہے تھے کہ دفعتاً مجمع احباب سے ایک خوش ادا اور خوش گلو نے بڑی سُریلی اور رسیلی آواز سے تان لگانی شروع کی کہ

تنی جھانکی جھونکی لاگیو مورے بارے بلم

اوہو ہو ہو۔ میاں شوری کی روح اس وقت وجد کر رہی ہوگی۔ واہ اوستاد کیا کہنے ہیں۔ ہاں ذرا اونچے سروں میں۔ واللہ کیا گلے بازی ہے۔ یہ گلا ہے یا سورداس کا چکارہ۔ اس کے بعد حضرت کھلے بند کا دلرُبا مضمون آویزۂ گوشِ سامعین ہوا۔ ہم بھی نظر سے اوجھل بیٹھے تھے جیسے بُو در گل یا سرور در مُل یا نسیمِ نوبہار۔ یا شمیم طرۂ مُشکبار۔ ہم نے اس دلکش مضمون کو اپنے مذاق کے موافق پا کر غلغلۂ واہ وا بلند کیا۔ واہ بھئی کھلے بند تم تو چھپے رستم نکلے۔ ہمیں خط کے ذریعے سے اپنے نام تیں بتا دیئے۔ لیکن حضرت ڈبل بیرنگ نہ بھیجئے گا کہ اس مہنگی میں آٹا گیلا ہو جائے۔

ہندوستان کی شادی جیسے گوڑیا گڈے کا بیاہ۔ اے سُبحان اللہ۔ دولہن جلندھر میں دولہا پشاور میں اور بھونری پھر گئی۔ مرد مکارم نگر میں، عورت انوپ شہر میں اور نکاح ہو گیا۔ ع

خانہ ملاح در چین است دکشتی در فرنگ

دولہن بیچاری کی کیا طاقت کہ زبان تو ہلا سکے۔ راضی برضا۔ ماں باپ نے جس کے ساتھ چاہا بیاہ دیا۔ جس کنوئیں میں چاہا دھکیل دیا۔

لکھنؤ میں ایک با وضع خوش باش شریف عالی خاندان، معالی دودمان خواجہ صاحب کی دختر پری پیکر جب نام خدا سیانی ہوئی تو بڑے اونچے اونچے گھروں سے پیغام آنے لگے۔ آخر ایک رئیس نجیب الطرفین، شریف الجانبین کے صاحبزادے سے نسبت قرار پائی۔ خواجہ صاحب کی دختر رشکِ قمر، چندے آفتاب چندے مہتاب ؎

اگر دیدے رُخِ آں حور پیکر خلیلِ بت شکن میگشت آزر

نوعمر نوخیز ہمجولیاں چہل کرنے لگیں۔ اے بہن مبارک۔ اللہ کرے کہیں جلد دروازے پر شہنائی بجے، شبھ گھڑی سے سُسرال جاؤ۔ ہم نے بھی اڑتی سی خبر پائی ہے۔

وہ مسکرا دیں۔

تو لجاتی کیوں ہو۔ اللہ سب کو یہ دن نصیب کرے۔ ہم تو آج حضرت عباس کی حاضری کریں گے۔ بس! خاتونِ جنّت کی قسم تمہارے

میاں تو صورت دیکھنے کے لائق ہیں۔ ابھی نامِ خدا مَسیں بھیگتی ہیں۔ اللہ نے یہ جوڑا اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔

دولہن بیچاری شرمائی جاتی تھی کسی کو ہنسی ہنسی میں گھُرکنا کسی کو جھڑکنا۔ ہٹو بھی۔ اللہ سوں ہمیں یہ دل لگی نہیں بھاتی مگر دل ہی دل میں کھِلی جاتی تھیں۔ غرض کہ خدا خدا کرکے کہیں شادی ہوئی۔ جب چاندنی نے سہرے میں کھیت کیا تو مشاطگانِ چابک دست نے اس مہ لقا کو سولہ سنگار کرکے بہ اُدانِ حمید کمرے میں بھیجا۔ شوہر نے ؎

برقع زعارض برفگن یک صبحدم تا جاوداں
گردد فرامش صبح را خورشیدِ تاباں در بغل

کہتے ہوئے نقابِ زریں جو اٹھایا تو نور کا بکہ نظر آیا۔ نگاہ پھسلی جاتی تھی۔ دولہن نے جو دزدیدہ نگاہ حضرت پر نظر ڈالی تو اللہ ہی اللہ۔ اودھر دولہن کا وہ نورِ عالم افروز ادھر میاں کالے بھجنگا منگل کے روزے۔ اودھر طبیعت بشاش۔ ادھر سینہ پاش پاش۔ اودھر چہرۂ گلنار، ادھر آنکھیں اشک بار، اودھر سینہ باغ باغ، ادھر کلیجے پہ داغ۔ اودھر عرشِ بریں پر دماغ، ادھر خونابۂ دل در ایاغ، اودھر ترانہ خوشی وظیفہ زبان، ادھر آہ و فغاں۔ طوطی را با زاغ ہم قفس کردند۔

ہے ہے چاند کو گہن لگ گیا۔ شاخِ صندلی پر مارِ سیہ کا قبضہ ہوا۔ ہائے اگر ایجاب و قبول کا نسخہ جاری ہوتا تو کس مزے سے دولہا دولہن میں گذرتی۔ اور طرہ یہ کہ بیوی پڑھی لکھی، تربیت یافتہ، خوش فکر، نکتہ سنج میاں مدک باز، بدقطع، بدوضع، لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل۔ الف اللہ، بے برکت، تے توبڑا، خے خیر صلاح۔

یا حضرت! ذرا غور تو کیجئے۔ یہ شادی ہے یا رنج و الم کی خانہ آبادی۔ دولہا دولہن کی رضامندی مقدم ہے۔ یہ نہیں کہ والدین نے چاہا جس کے کھونٹے باندھ دیا۔ معدۂ رنج و الم کی افزائش۔ تمام عمر کی کاہش۔ بات بات میں تکرار۔ آئے دن جوتی پیزار۔ ایسی شادی پر خدا کی سنوار۔

جی ہاں یہ تو ہم نے بھی سُنا ہے کہ یورپ میں کبھی کبھی بڑا کڑا امتحان لیا جاتا ہے۔ بھیا یہ تو اس حال میں کہو جب ہم ان کی سی بے تکلفی پر اصرار کریں اور اچھا اگر اس جھانکی جھونکی میں کبھی ننگ و ناموس کا خیال نہیں رہتا تو خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کیجئے۔ اس قدر آزادی اور مطلق العنانی کیوں دیجئے۔ چلیے فراغت ہوئی۔ ہمارا مطلب حاصل! اور یہ تو بات ہی نرالی ہے کہ گندہ بروزہ اگرچہ گندہ لیکن ایجاد بندہ۔

اودھ پنچ، ۱۲۔ مارچ ۱۸۷۸ء

جنگی پتنگ کا میدان

کہو۔ آکا اودھ پنچ! کبھی جنگی پتنگ بھی لڑائے ہیں؟

یہ جنگی پتنگ کیسے؟ گول، دوپنا، ڈیڑھ گنا، خربوزیا، شطرنجیا، جھنڈی دار، طوقیا، مانگ دار، بھیڑیا، بگلا، دوپرا سُنے تھے۔ یہ جنگی پتنگ کہاں ایجاد ہوئے؟

اے میاں! والے سرویلنے بیٹھے بٹھلائے یہ گُل کھلایا کہ سلطان روم سے جنگی کنکوؤں کا میدان بد دیا۔ اس ٹکلمی کا تو کیا پتا تھا کہ

روم سی سلطنت رفیعہ سے ٹکر لڑتا۔ مگر روسیوں کی شہ جو پائی تو جنگ پر چڑھ گیا۔ مدد مانگ کر بل کرنے لگا۔ ترکی فوج نے دم کے دم میں اس کی ترکی تمام کردی۔ ایسا پٹایا کہ پیتا توڑ، میدان چھوڑ، رشتۂ شجاعت توڑ، اجنبیت سے ناتا جوڑ، نوک دم بھاگا۔ وہ کامل لنگر کا لڑانے والا پتنگ کی لڑائی کیا جانے۔ روس نے جو دیکھا کہ پالا روم کے ہاتھ ہے تو جھگوڑے کا ہاتھ بٹالیا۔ فوراً پینچ چلا۔ عیسائی سلطنتوں کے آزاد کرانے کے حیلۂ شرعی سے جھٹ میدان بدلیا اور میدان کارزار میں دوڑ پڑا۔ اوچکا اور منہ کے بل گرا۔ گرا اور پھر سنبھلا اور پھر بڑھا اور پھر گھٹا۔ گھٹا اور پھر ڈٹا۔ ڈٹا اور پھر پٹا۔ پٹا اور پھر ڈٹا۔ اب تو ایسا جم گیا کہ خدا ہی ہٹائے تو ہٹے۔ طرفین سے خوب خوب جوڑیں چھپکیں۔ بڑے بڑے جغادری پتنگ باز جمع ہیں۔ رومی گھسیٹ میں خوب مشاق ہیں۔ اپنے گھر ہی سے چھپکا ہیئے پر سے اس زناٹے سے کھینچ گئے کہ طرفشانی کا پتنگ کھٹ سے الگ وہ کاٹا۔ اور جو کہیں کنّے تنّہ گئے تو خالی ڈور ہاتھ میں۔ کنکھا ہوا ہو گیا۔ ارے کہہ کے رہ گئے۔ روسی لمڈورا اڑانے میں طاق ہیں۔ چپ و راست سے فوج کو بڑھاتے جاتے ہیں اور غنیم کے میدان میں جا کر پیچ لڑاتے ہیں۔ دونوں نے خوب خوب پیچ کاٹے۔ مگر روسیوں نے آجکل چٹائے بہت۔ تھوڑے دنوں سے کچھ ایسی ہوا بندھی ہے کہ ترکوں کی جیت کا چراغ گل ہو گیا۔ مگر ؎

بیدل نیم ہنوز بہ بینم چہ می شود

یونان نے چاہا تھا کہ روس کی طرف ہو رہے مگر انگلستان نے للکارا کہ کیوں بچار بھلا۔ پٹا ہے۔ پٹا۔ جرمنی اور آسٹریا بھی روس کی شراکت کر کے تیلی ڈور سے روم کے چھکے چھڑانے پر آمادہ تھے۔ لیکن پیچے کے خیال سے چپ ہو رہے۔ بحری میدان میں بھی خوب ماہی جال چھپکے۔ کبھی انہوں نے غوطہ دیا۔ کبھی انہوں نے دیکھیں پالا کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

(اودھ پنچ - ۲۰ نومبر ۱۸۷۷ء)

لکھیم پور کھیری

لکھیم پور کھیری کے شمال کی جانب کے مشرق کے مغرب کے دائیں کونے کے بائیں طرف ایک بڑا لق و دق جنگل ہے کھیری۔ ایک صاحب کو کہ عرصۂ دراز سے محکمۂ آبکاری کے غم میں پڑے تھے۔ شوق چرایا کہ شکار کھیلیں۔ جھپ جنگل ہی ہو رہے۔ جھٹپٹے وقت کسی ٹکائی کا بھائی پائینچے چڑھائے۔ جوتیاں ہاتھ میں دبائے۔ نکے دار ٹوپی سر پہ جمائے۔ مجیرا لٹکائے سامنے سے آ رہا تھا۔ صاحب بہادر نے پوچھا ول تم کون؟ حضور میر شکارا ہو ہو تو ول تم ہمارے ساتھ چلے ہم کو شکار کھلاؤ۔ خداوند یہاں جنگل میں کیا شکار کھیلیے گا۔ ول اسی جھاڑی میں۔ واہ حضور اس میں تو کانٹے چبھیں گے۔ میاں امانت کے معشوق کو ڈھونڈیئے جو بیریوں میں چھپ رہے تھے۔ تڑکا ہونے دیجئے۔ گجردم ایک سے ایک قبول صورت ——— لیجئے۔ مگر اس وقت شکار کیا۔ اب شام ہونے کو آئی ہے۔ مجھے تین کوس اودھر چلنا ہے۔ سلام۔ ول سلام نہیں نہیں۔ تم بولا کہ یہاں سے تین کوس چلتا ہے۔ ہم چلنا مانگتا ہے۔ ہاتھی لاؤ۔ تب تو چپراسی نے بڑھ کر کہا کہ حضور یہ سارا میر شکار پتریا کا بھائی ہے۔ صاحب مسکرا دیئے۔ اتنے میں ر۔ن لکھنوی جو جنگل جنگل خبروں کا شکار کرتے پھرتے ہیں۔ عین وقت پہ پہنچ گئے۔ نوٹ بک کے جال میں پنسل کے لاسے سے اس خبر کو ایسا پھانسا کہ جکڑ گئی۔ نذر ہے۔

رتن ناتھ لکھنوی - اودھ پنچ - ۶ نومبر ۱۸۷۷ء

کوئی کہتا ہے دیوانہ کوئی کہتا ہے سودائی
خوشامد سب کیے کرتے ہیں جس سے جیسی بن آئی

اکبر الہ آبادی

ہٹو۔ بچو۔ سنبھل بیٹھو۔ جگہ دو۔ ہم آتے ہیں۔ ہم آتے ہیں۔

ہاں۔ ہاں۔ یا اللہ! اے حضت آپ ہیں کون؟

ایں! ہم ہیں کون؟ ہم ہیں۔ ہم!

توبہ! ارے میاں خدا کے لئے کچھ کہو گے بھی آخر ہو کون؟ بتا ہی دیں۔ ہم ہیں خیال ولد دماغ ولد نیچر ولد قل ہو اللہ احد اللہ الصمد . . . . الی آخرہ۔

واہ وا۔ واہ وا۔ یہ تو آپ نے اپنے نام کے ساتھ اپنا نسب نامہ بھی پڑھ سنایا۔ یہ تو فرمایئے یہاں نہ کوئی کمیٹی نہ سوسائٹی نہ لکچر نہ آرٹیکل۔ نہ چندہ نہ لاٹری۔ آپ زور شور سے جو تشریف لائے ہیں اس کا کیا باعث؟

آہاہا ہا۔ اس کا باعث کچھ نہ پوچھیے ؎

چمنستان کی گئی نشو و نما پھرتی ہے!
رت بدلتی ہے کوئی دن میں ہوا پھرتی ہے

ادھر اودی اودی بدلیاں، نیلم پری بنی ہوئی بحر ہند سے آ رہی ہیں ادھر ہری ہری پتیاں معشوق سبز پوش کی طرح اپنا جوبن دکھا رہی ہیں۔ آپ جانیے۔ ہم ایک جوہر مجرد۔ کلیل میں آ گئے۔ کیٹی چھوڑ محفل رنداں میں آ نکلے۔

جناب یہ سب سہی۔ مگر کچھ بات اور بھی ہے ورنہ ؎

ایک سے ایک ہے تماشا رنگ
دیدنی ہے جہان رنگا رنگ

ہزار رنگ بدلے کبھی آپ نہاں خانۂ دماغ سے نہ نکلے۔ اب کیا تھا کہ آپ نے اس دھوم دھام سے پر پرواز کھولے ہیں؟

سچ بتا دوں؟

مناسب تو یہی ہے!

بھئی سچ تو یہ ہے اللہ سیکرٹری آف اسٹیٹ کو بغیر کہے اول درجہ کا صدر اعلیٰ کر دے ولایتی معنی صدر اعلیٰ کے مراد ہیں۔

وہ نہیں کہ بگڑا گویا مرثیہ خوان اور بگڑا وکیل صدر اعلیٰ، ایکٹ پابندی اخبارات کی ترمیم کی کس عمدگی سے رائے دی ہے کہ جی پھڑک گیا۔ سچ پوچھیئے تو ہم کو جلا دیا۔ میرے حق میں تو مسیحائی کی۔ سقف دماغ میں سوکھے مکڑی کی طرح ہزار جال پھیلاتا تھا مگر ایک مخمس مضمون ہاتھ نہ آتی تھی۔ اب تو وہ خمس مخمس میں پھنساؤں کہ ہزار قحط پڑے میرے راتب میں خلل نہ پڑے۔ اس وقت طبیعت ایسی حاضر ہے کہ جو مضمون فرمایئے بے تکلف موزوں کر دوں۔

اگر یہ ہے تو اپنی سرکار ابد قرار کی شان میں ایک رباعی دعائیہ کہنا ضرور ہے۔

بہت خوب۔ اے حضرت! یہ تو خود ہمارا فرض ہے۔ نخزانہ مضمون ہاتھ آیا ہے تو ادائے ٹکس واجبات سے ہے

اچھا سنیئے۔

پہلا وزن

قیصرِ ہند کو اللہ سلامت رکھے   دشمنوں کو ہدفِ تیر سلامت رکھے
حاسدوں کو غم و حسرت کی نشانی کر دے   ہیچ کو عشرت و راحت کی علامت رکھے

آمین۔ آمین۔ آمین۔

اے سبحان اللہ! خوب ارشاد کیا ہے۔ مجرد کے واسطے علامت کس قدر موزوں ہے۔

آداب جھاڑتا ہوں۔ بندگیاں اوچھالتا ہوں۔

کیا خوب آداب نہ ہوا دولتیاں ہوئیں۔

جی یہ توسنِ طبع کی رعایت ہے

اچھا یہ بندگیوں کا اوچھالنا چہ معنی دارد۔ بندگیاں نہ ہوئیں۔ میخوار کی پگڑی ہوئی۔

جی یہ بادہ مضمون کی مناسبت ہے۔

کلیل میں تو آپ ہی ہیں۔ بھلا جواب دینے میں کب رکئے گا۔ خیر اب زمانہ سابق کی کچھ برائی اور اس عہد کی کچھ تعریف فرمایئے سچ بات کہنے میں کیا عذر ہے۔ وہ بھی لیجیے۔

دوسرا وزن

ہوتے تھے آگے ہند میں مجنون بادشاہ   کرتے تھے بے خطا بھی بہت خون بادشاہ
اے ہیچ میرا عہد عجب عہد امن ہے   یعنی ہے اس زمانے میں قانون بادشاہ

سچے پر ـــــ!

ہاں ہاں۔ بس آگے نہ بڑھیئے گا۔ صرف شعر کہلا لیجیے۔

یوں ہے تو خیر۔

خیر کیسی؟ خونِ جگر کھا کر نظم کروں۔ آپ ایک خیر میں خاتمہ بالخیر کیے دیتے ہیں۔ اے حضرت! تعریف کیجیے۔

اچھی زبردستی کی تعریف ہے۔ اچھا صاحب۔ واہ وا۔ ماشاءاللہ۔

تسلیم جاری کرتا ہوں۔

یہ کیا ؟

قانون کی رعایت۔

اسی رعایت نے آپ کو مجنوں بنا کر دو قافیوں کا زبردستی خون کرایا۔

اچھا افواج ہند کو سرکار نے یورپ بھیج کر جو عزت افزائی کی ہے اس کی نسبت بھی کچھ ارشاد ہو۔

یہ تو آپ نے میرے دل کی کہی۔ اچھا سنیئے۔

تیسرا وزن

انگلش کی مدد سے مالٹا تک   ہندی لشکر جو بڑھ گئے ہیں
کہتے ہیں یہ ہنس کے ہند والے   کالے گوروں پہ چڑھ گئے ہیں

بہت خوب سبحان اللہ۔

آداب فیر کرتا ہوں (رعایت ظاہر ہے)

خیر یہ تو سب کچھ ہوا۔ اب شہر کلکتہ کی تعریف میں بھی کچھ ارشاد ہو جائے۔

ضرور ضرور۔ وہ تو ہمارا دارالسلطنت ہی ہے۔ اللہ آباد رکھے۔ اچھا سنیئے۔

چوتھا وزن

نائب سلطان عالم کی وہاں درگاہ ہے   حاکمان دادگر کا خیمہ و خرگاہ ہے !
تاجروں کا کیوں نہ ہو اطراف یورپ سے ورود   جانتے ہیں سب کہ کلکتہ بھی بندرگاہ ہے

اے سبحان اللہ۔

تسلیم کو داتا ہوں۔

یہ کیا ؟

بندرگاہ کی رعایت۔ اے حضت! اب فرمائش نہ کیجئے گا۔ دیوالہ نکلا چاہتا ہے۔ اس وقت رخصت ہوتا ہوں۔ آپ بھی کچھ لیجئے گا۔ کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہے۔ چلتے چلاتے ایک وزن اور عرض کئے دیتا ہوں۔

پانچواں وزن

سَرسَر سَرسَر سٹاک
سُرسُر سُرسُر پھٹاک

میاں خیال صاحب اس قدر جھک مارے رفو چکر ہو گئے وہ گئے پھر وہی سکوت۔ وہی سناٹا سے

شمع کے گل ہوتے ہی پروانے راہی ہو گئے
دفعتاً گیا تھا میانِ انجمن کیا ہو گیا

اودھ پنچ ۶ اگست ۱۸۷۸ء

مسٹر اودھ پنچ صاحب۔ آپ کو عالم بالا کی پولیٹیکل باتیں بتا دوں، وہاں کے انتظامات کی خبر سنا دوں تب تو آپ اپنے کارسپانڈنٹ کی بلند پروازی کے قائل ہوں گے یا نہیں لیجئے مجھ سے سنئے۔ عرش بریں پر ایک کمیٹی ہوئی حضرت جبریل نے طوفان سنہ آئندہ کا بجٹ پیش کیا۔ بہت دیر تک بحث رہی۔ بالآخر سال بھر کے لئے حضرت میکائیل تخفیف میں در آئے۔ حقیقت میں ایسے فرشتے کا مامور بہ خدمت ہونا جس کے ایک بال کو سات سمندر نہ تر کر سکیں۔ خالی از مصارف کثیرہ نہ تھا خصوصاً ایسے وقت میں کہ کوہ ہندوکش سے لے کر جبلِ اسود تک رسد کی ضرورت ہے۔ بعدہ سنہ گزشتہ کے عالم ارواح کی آمدنی کا بجٹ پیش ہوا۔ حضرت عزرائیل کی کارروائی ایک سستی کے ساتھ پائی گئی۔ لہٰذا علاوہ قحط اور وبا اور امراض معمول کے فرشتہ جنگ روم روس ان کی مدد کے لئے مقرر کیا گیا۔ کہیں آپ یہ فقرہ نہ تیز کریں کہ عالم بالا کی مخبری میں شہاب ثاقب سے کیونکر بچے۔ جناب یہ بات دوربین لگانے والوں سے پوچھیے۔ میں نے مراقبہ میں یہ حالات دریافت کئے ہیں۔ آپ کے کارسپانڈنٹ کے خیال کو ہر محکمہ میں حاضری کی اجازت ہے۔

اودھ پنچ ۴ ستمبر ۱۸۷۷ء

سُسرال کی گالی کا بُرا مانے سو بھڑوا

ولزلی صاحب فوجی سفیر متعینہ لشکر روس جب پوخارسٹ میں گرینڈ ڈیوک نکلس کی ملاقات کو گئے تو نکلس نے وہ بے اعتنائی برتی کہ ان کی ساری شیخی حکمتِ عملی کے بدر رو میں جم کر رہ گئی۔ نہایت انقباض کے ساتھ نکلس صاحب منہ پھیر کر بولے بھی تو یہ کہ "کم بخت جاسوس جو دوستوں کا بھیس بدل کر آتے ہیں اور بھی بدتر ہیں۔" اس توہین کی شکایت جلسہ وزرائے انگلستان تک پہنچی۔

گمان کیا بلکہ یقین تھا کہ کوئی سخت تہدید منجانب انگلستان عمل میں آئے گی۔ لیکن سارے جھگڑے کا تصفیہ مفصلہ ذیل تحریروں سے ہو گیا۔ وہ اصل تحریریں ہم کو نہیں ملیں مگر فرانس والوں کے قیاس کے مطابق اون مراسلات کا منشا یہ ہے۔ لارڈ ڈربی بنام ڈیوک نکلس۔ "کیوں بھائی جان! ذلیل کرتے ہو۔ ہم نے کبھی کان دم ہلائی۔ یہ اہانت کے کوٹ چہ معنی دارد۔"

ڈیوک نکلس۔ "لڑکی بیاہ کے کیا ہم اب اِس چھیڑ چھاڑ سے بھی گئے؟"

مخاطبہ لارڈ ڈربی یا ولنڈلی صاحب۔ "سسرال کی گالی کا بُرا مانے سو بھڑوا۔"

اودھ پنچ ۲۵ ستمبر ۱۸۷۷ء

ایک نادان خوش اعتقاد کسان کی دُعا

اے میرے اچھے خدا میں اعتقاد رکھتا ہوں کہ تیرا کوئی ساجھی نہیں مجھ پر کرم کر۔ پڑھے ہوئے ملا کہتے ہیں کہ تو قوی ہے قدیر ہے۔ محیط ہے میں ان پیچیدہ باتوں کو کچھ نہیں سمجھ سکتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ تو لاٹ صاحب سے بھی بڑا ہے۔ عام لوگ کہتے ہیں کہ تو ہر ذرہ عالم کا منتظم ہے۔ میں اپنے چھوٹے سے اور کمزور خیال کو اتنے چکر دے سکتا ہوں کہ ہر ذرہ پر نظر دوڑا کر تیری قدرت کی کارروائیوں کا مشاہدہ کروں مگر یہ جانتا ہوں کہ حاکم بندوبست نے بغیر تیری مرضی کے مجھ پر جمع نہیں بڑھائی۔ اے میرے داتا مجھ پر رحم کر جب تو ہر ذرہ کا منتظم ہے تو میرے کھیتوں میں بہت سا غلہ کیوں نہیں پیدا ہوتا کہ اس کو بیچ کر جو باقی بچے اس سے بال بچوں کو پالوں۔ اے اللہ تو ہر جگہ ہے مگر شاید اس موضع میں تو نے گزر نہیں کیا اور اگر گزر گیا تو میری اجڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر مجھ کو اپنا بندہ نہ سمجھا اور اگر بندہ سمجھا تو گنہگار پایا۔ اس وجہ سے مجھ پر جمع بڑھوا دی۔ اے اللہ میرا گناہ معاف کر دہ گناہ کچھ بہت بڑا نہیں ہے۔ میں نے نیل والے صاحب کی ایک بھینس چرائی تھی مگر اس کے لیے دو مہینے کی قید بھی بھگت لی۔ اس نے میرے کھیت کا نقصان کیا تھا میں نے اس کو باندھ رکھا تھا اس کے سوا اور کوئی گناہ بھی نہیں کیا نہ کسی کی زمین دبائی نہ مال چھین لیا یا خدا اب مجھ پر اپنا فضل کر اور میری اس دعا کو بدلی کے لفافہ میں لپیٹ کر تیز رو بجلی کے ہاتھ صاحب لوگوں کے پاس بھیج دے اور حکم دے دے کہ مہنگی بھر غریب کسانوں پر مالگذاری کے واسطے ذرا سختی نہ کریں۔

ل ۔ ح ۔ الہ آباد

خمارستان کا ڈنر[1]

(نواب) سیّد محمد آزاد

رُوداد

حاضرینِ نکبت قرین

مسٹر پینک الدولہ ——— چیئرمین
چُسکی الملک ——— گورنر صوبہ تریاک آباد
مرزا خمار بیگ ——— راقم فوچو گزٹ
میر مھرو خان ——— منڈا لین یانگ کانگ
سیّد یانبو جنگ ——— کمانڈر انچیف افواج فغفوریہ
دھواں دھار خان ——— انسپکٹر جنرل چانڈو خانہ جات

مسٹر پینک الدولہ :- حضرات! میں اپنے پلّے درجے کی خوش نصیبی اور افتخار کا باعث اس کو سمجھتا ہوں کہ آج میرے نصیب یہ عزت بخش خدمت ہوئی کہ میں آپ صاحبوں سے اپنے اس شاہنشاہ آفتاب نسب، عادل، انصاف گستر، پر قوت، ذی شوکت اور پر ہیبت کے جام صحت و تندرستی کے پینے کی استدعا کرتا ہوں کہ جس کے عہدِ انصاف مہد میں ہم لوگ کالی ناگن کو بے تکلف نگل جاتے ہیں۔ اور وہ بدذات اور فتنہ گر ہم لوگوں کو ڈسنے اور آزار پہنچانے کی ہمت نہیں کر سکتی ہے۔ ہمارے ہاتھ میں اس وقت اس عالی قدر بادشاہ کا جامِ صحت ہے کہ جس کی رعیت سے بڑھ کر کسی کی رعیت منکسر المزاج، نرم طبیعت اور تہذیب یافتہ نہیں ہے اور جس کی نیک نیتی اور پاک باطنی کی برکت سے افیون کی ایسی مفید نفس کش اور مفرح چیز ہم لوگوں کے استعمال میں ہے کہ جس نے ساری دنیا کے لوگوں سے زیادہ آرام اور تسکین اور راحت اور بے خلش طور سے زندگی بسر کرنے کا سامان ہم لوگوں کے واسطے مہیا کر دیا ہے۔ اور جس کی بدولت انگریزیوں نے ہم لوگوں کی جیب کا لاکھوں روپیہ پایا ہے (چیرس)، یہ اسی متبرک چیز کی برکت ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے آج تک بجز اس کی یاقوتی رنگت کے خون کی رنگت تک کبھی خواب میں نہیں دیکھی ہے اور یہ اسی کی کرامت ہے کہ صدہا سال سے ہمارے کان

---

[1] پورا عنوان ہے "خمارستان کے تہذیب یافتہ مدکیوں کی تجارت کے جلسے کا سالانہ ڈنر"

بجز سامعہ نواز آواز بانبو کے توپ و بندوق کی وحشت انگیز اور ہیبت ناک اور عاقبت سوز آواز سے آشنا نہیں (چیرس) یہ اسی بیپی کا جلوہ ہے جس کا تصور ۱۲ بجے دن تک ہم لوگوں کو آنکھ نہیں کھولنے دیتا ہے اور یہ اسی حور کا عشوہ ہے کہ جس نے ہم کو ساری دنیا کی شیطانی اور نفسانی لذتوں، ہوسوں اور خواہشوں سے بے نیاز کر دیا ہے یہ رحم دلی کا مادہ ہماری قوم میں اسی کا خاص عطیہ ہے کہ ترکوں کے بہادرانہ طور سے لڑنے مرنے کا تذکرہ سن کر دو دو دن تک ہم لوگوں کے ہوش پریشان رہتے ہیں اور یہ اسی کی بخشی ہوئی بہادری کی نعمت ہے کہ ہمارے ہموطن پٹاخے کی آواز پر دست بقبضہ ہو جاتے ہیں۔ (چیرس)

ہم لوگوں کا عمدہ بیچ ٹوور مسٹر نم ہوم کا ایجادی بانبو ہے کہ جس کا دھنواں خطہ کے خطہ کو جلا دے اور اقلیم پھر کو خاک میں ملا دے ہمارے ملک کا چھینٹا حیثم دُوربین کے لیے لیٹر ڈیلیوز کا گولا ہے اور کون آج تک اس کی چوٹ کھا کر سنبھلا ہے (چیرس)

ہم لوگوں کا خیالی جنگی جہاز ایسا ہے کہ جو ہمارے چین کے سمندر سے ایک منٹ میں بحر اسود کی موجوں پر برق کی طرح چمکنے لگتا ہے اور ہماری پینک کی گاڑی ایسی ہے کہ جو ایک لمحہ میں ہزاروں سمندروں اور لاکھوں پہاڑوں کو طے کرتی ہے۔

اب ہمارے ملک میں بھی افیون کی کاشتکاری سرکاری طور سے جاری ہو گئی ہے کیونکہ ہمارا سارا ملک اس کا محتاج ہے اور اب وہ زمان مسرت نشان قریب ہے کہ ہم لوگوں کا کروڑوں روپیہ ہمارے ہی ملک میں رہے گا اور ہم لوگ مالوا اور بہار کے بار عظیم سے دائمی طور سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ (چیرس)

عام تجارت کی بھی ایسی ترقی ہمارے ملک میں فضل الٰہی اور توجہ سلطانی سے ہے کہ جس کا ذکر ناگفتہ بہ ہے۔ تہذیب و علم بھی ان دنوں اوج پر ہے کہ یورپ والے بھی جس کا رشک کرتے ہیں۔ اور ایسے کامل پروفیسر لوگ ہماری یونیورسٹی میں ہیں کہ جو برسوں مراقبہ میں رہے ہیں اور ستارہ اور اوج کا حال دریافت فرماتے ہیں۔ خلاصۂ کلام ہر قسم کی ترقیوں سے ہمارا ملک چین اور ملک مفتوحہ فغفوریہ مالا مال ہے اور ہر طبقہ اور فرقہ اور ہر درجہ کی رعایا مرفہ الحال ہے۔

اب ہم جام صحتِ سلطانی کو نوشِ جان کرتے ہیں۔ (چیرس) بینڈ بجنے لگا ؎

کھو دیا حسن ملک نے ستم ایجادوں کا
اُڑ گیا رنگ دھواں بن کے پریزادوں کا

مرزا خمار بیگ :- راقم توجچہ گزٹ، ہز ایکسیلنسی، جنٹلمین اینڈ لیڈیز، ہماری قسمت میں آج ایسا مشکل سبق پڑا ہے کہ جس کے ہم حاشا اپنے کو قابل تصور نہیں کرتے ہیں اور کبھی ہم کو اس کی امید نہیں کہ ہم اپنی آج کی اس عظیم خدمت کو پوری طرح سے اور نیک طور سے انجام دے کر سُرخرو اس سے نکل جائیں گے۔ ہماری دلی مسرت اور بڑی عزت کی یہ بات ہے کہ ہمارے سپرد اس جلیل القدر مہمان کا ٹوسٹ ہوا ہے جو آج اتنے بڑے صوبے کا گورنر ہے اور جس کی قلم کی نوک پر ہم لوگوں کے اقبال و ادبار کا دار و مدار ہے۔ ہم کو فقط اس کی مسرت نہیں ہے کہ میرے سپرد ایسے عالی جاہ اور بے مثل عہدہ دار کا ٹوسٹ ہوا ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ قلبی شادمانی بھی ضم ہے کہ میں اپنی خوش قسمتی سے گورنر ممدوح کا ذاتی دوست بھی ہوں اور اکثر ہم نے لڑکپن میں اپنی ولایت کی چراگاہوں میں ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سور کے خوشنما اور خوش رفتار

اور نیک اطوار بچوں کو چرایا تھا جبکہ ہم اور وہ سمندر گمنامی میں ڈوبے ہوئے تھے اس وقت اس ایوان رفیع الشان کے دیکھنے اور عام لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش ہونے کا تصور تک ہم کو نہیں تھا۔ ہمارے معزز دوست کی ذاتی صفتوں کا بیان کرنا یہاں تحصیل حاصل ہے کیونکہ آپ لوگ بھی ان کے ذاتی دوست ہیں اور ان کے خلق وسیع، سلیم الطبعی، تحمل مہمان نوازی، ہمدردی، نیک نفسی کا مزا چکھے ہوئے ہیں اس لئے مصروف رہے کہ میں ان کی قدرت انتظامی، ملکی اور اس کے عمدہ نتیجوں کی طرف رجوع کروں اور مشتے نمونہ از خروارے آپ لوگوں کو سناؤں، جو صفائی اور رونق کہ سررشتہ آبکاری کی ان کے زمانہ حکومت میں ہوئی ہے، ایسا آج تک کبھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ اور صرف شراب افیون کی تجارت کو ترقی دینے سے اس قلیل عرصہ میں تہذیب اور علم ایسا شائع ہوا ہے کہ ہر کوچہ و بازار میں شراب خانے اور مدک خانے کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے دیکھنے سے نیک نیت آدمی کی آنکھوں کو بڑا آرام ملتا ہے۔ ٹیکس کی تلخ گولی کو مصلحت ملکی اور خزانہ خالی کے خیال سے حکمت عملی کی مصری میں ملا کر اس چالاکی سے انہوں نے نیٹو لوگوں کو کھلا دیا ہے کہ جس طرح لڑکوں کو دوائے تلخ شہد ملا کر کھلا دیتے ہیں۔

کب بیکن اور کنٹش میں اس لطف کے ساتھ ٹیکس جاری ہوا تھا۔ اس دوا کا ایسا اثر لوگوں پر ہوا ہے کہ ہزاروں آدمی روزانہ خون تھوک کر اس خارستان کو گلستان بنا رہے ہیں۔ یہ انہیں کا گرامی کونسل اور قانون خانہ ہے کہ جس نے ہم لوگوں کو اس جنگلی ملک میں ایسا محافظ صحت اور سرپرست اطوار اخلاقی قانون عطا کیا ہے اور یہ ہماری فوج کے ولایتی بچے ہیں کہ جن کے طفیل میں خمارستان کے اکثر شہروں اور کیمپوں کے نوجوان ڈاکٹروں کی تائید سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ گو اس سے بظاہر چین کے دوا کے تاجروں کا نقصان معلوم ہوتا ہے مگر غور کرنے سے وہ نقصان خفیف اس عام فائدۂ عظیم کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔

یہی ہمارے عالی مرتبہ دوست کے اعلیٰ درجہ کی سرگرمی اور عرق ریزی پر دال ہے کہ ضلع خرابہ کے کوہی لوگوں کی زبان بھی اس سے آشنا ہوئی اور انہوں نے بھی مغربی تہذیب کا مزا چکھا۔ چیف کمشنر خرابہ کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے رم کو ان کوہستانی ملکوں میں مروج کیا گیا ہے۔ تب سے سیکڑے میں بیس آدمی آگے سے زیادہ قحط کی سختی اور خوف کو کم کرنے کے لئے دارالبقا میں نشیمن کرتے جاتے ہیں۔

اس کا کامل یقین ہے کہ میرے جلیل القدر دوست بعد انقضائے ایام خدمت گورنری اس ملک مفتوحہ کی کہ جب کہ سرسبزی اور کامیابی کا ہار گلے میں ڈال کر اپنے وطن کو تشریف لے جائیں گے تو وہاں بھی اپنے ملک کے لئے پارلیمنٹ بیکن میں بڑا بڑا کام کریں گے اور ہوم گورنمنٹ کی تحویل میں جتنے اعلیٰ درجے کے تمغے اور خطاب ہیں، یہ سب لے لیں گے۔

حاضرین نے بڑے تپاک سے گورنر کا ٹوسٹ پیا اور بینڈ بجنے لگا ؎

تو کار زمیں را نکو ساختی　　کہ بر آسماں نیز پرداختی

(اودھ پنچ، ۱۹ فروری ۱۸۷۸ء)

لفظ ؛ ہندوستانی بی بی

نواب سیّد محمد آزاد

اپنے شوہر کی عاشق، شیدا اور فدائی۔ اپنے بچوں کی انّا کھلائی اور دائی عفت کی دیوتا محبت کی تصویر مروت کی اوتار انسانی زندگی کی تازگی کے لیے جاں نواز اور فرحت آثار ہوائے بہار گھر کی رونق گھر کی زینت گھر کا بھرم عزیزوں اور جملہ متوسلین کے لئے ہمیشہ رواں ہمیشہ شاداب اور ہمیشہ لبریز چشمۂ کرم، عصمت کے سراپا، عزت و حمیت گلستان کی ہزار داستان بلبل، سچی قناعت، اسلامیانہ صبر اور درویشانہ توکل کے صاف اور خوش رنگ بادۂ گل رنگ کے مینا کی قلقل، خالص اور بے لوث دینداری کا محفوظ گنجینہ، عصمت عفت اور مروت کا قومی دفینہ، بالخلقت دوسروں کی وقف خدمت و چارہ سازی، بالطبع عزیزوں کے لئے سرگرم جاں نوازی، وہ غنچہ کہ ہوائے محبت خالص کے چلنے پر جس کی شگفتگی کا دارومدار ہے، وہ سرسبز اور بارآور شجر جو اپنے سایۂ عنایت و محبت کے جاگزینوں پر بغیر کسی قسم کی خصوصیت اور قید کے ہر فصل میں ایک رنگ سے رحمت بار ہے۔ وہ سپاہی معرکۂ زندگی میں صبر و قناعت جس کی آبدار تلوار ہے۔ وہ منتظم جز رسی پیش بینی اور داشتہ آید بکار کے اصول پر جس کا ہر کاروبار ہے۔ زندگی کے طوفان بلانشان اور مصیبت سامان میں مردوں کی طوفانی طبیعت کے لئے لنگر کا کام دینے والی، ان کی ہر واقعی اور مصنوعی مصیبت اور رنج میں اظہارِ خواہش، ہمدردی و چارہ جوئی میں لب تر ہونے کے قبل پاک محبت اور صاف ہمدردی کا درد فرسا اور غم تراش لبریز جام دینے والی، اپنے گھر کے چراغوں پر رات بھر اپنی صحت سے بے پروایانہ قطع نظر کر کے پروانہ وار نثار ہونے والی، رونے، ضدی لڑکوں کی پُراثر اور پُرشور و شر آواز کی فطرتی جگوتی کے بجنے پر رات بھر میں دس دس بار بیدار ہونے والی، وہ انسان، اولاد کی تمنا جس کی سب سے بڑی حاجت ہے، بے اولادی جس کے لئے سخت آفت اور قیامت ہے وہ صحت بادِ نسیم عنبر شمیم جس کے چلنے سے متعصب دشمنوں کی تنگ خیالی کا تیرہ و تار زندان ہر ہندوستانی کے لئے روضۂ رضوان ہے

وہ مسیح الزمان جس کے شفا خانۂ محبت و ہمدردی کی معجون کا محتاج ہر پیر و جوان ہے وہ قومی یاقوتی کان جس میں ہزاروں لعلِ بے بہا نہاں رہتے ہیں وہ عمانِ رحمت نشان جس سے اخلاقی خوبی اور نسوانی نیکی کے سینکڑوں چشمے ہر مکان میں پنہاں بہتے ہیں۔ شوہروں کی جمعیت خاطر اور طمانیت کے اوراق کا خوبصورت اور مضبوط شیرازہ ۔ ان کے چہرۂ خوشحالی کا خوش رنگ خوشبو دار حسن افزا غازہ۔ وہ نیک کار بندہ شوہر کی اطاعت جس کی بہت بڑی عبادت ۔ وہ نیک سرشت انسان رحمدلی اور ہمدردی انسانی جس کی جبلی عادت، شوہر کی فرمانبرداری جس کے خیال میں پرستش میں شامل جس کے نزدیک دیوتاؤں اور شوہروں میں صرف ایک ہلکا سا امتیازی پردہ حائل۔ ایک عالم کی مصیبت پر رونے کو فطرتی طور سے جس کا دل ہر وقت تیار ہے ۔ وہ متوالی جو متوالے شوہر تک پر صدقے قربان اور نثار ہے۔ ہزاروں شام غربت میں صبح اُمید کی جلوہ ریزی' وفا شعار شوہروں کے لئے ہر طرح کی پُر لذت اور بد اطواروں کے لئے ایک قسم کی ہلکی پرہیزی۔ ہر گھر کی باعثِ زینت و آبادی، سلطنت خانہ داری میں انسداد آوارگی کی منادی بغیر محسوس، دل پسند اور پُراثر دردمندانہ اور فرمان پذیرانہ اداؤں سے اکثر شریف النفس میاں کو در پردہ اپنا غلام بناتی ہے۔ دلجوئی اور مزاج شناسی کے دروازے سے ان کی شمع قبول تک پہنچ کر اپنے ہر مطلب کا پیام سناتی ہے ۔ بدنفس اور بدعقل ساس نندوں کے بے تمیزانہ اور ظالمانہ نکتہ چینیوں سے جس کا دل چور ہے۔ اپنے میکے والوں کی خاطر بات جس کو ہر حال میں بدل منظور ہے محل بے محل حمل کے حمل کرنے پر غرور انگیز مسرت کی ادا دکھانے والی باوجود صحیح المزاج ہونے کے جلدی سے صاحبِ اولاد ہونے کے پُرجنون تمنا میں بیسیوں جاہلوں کی مضر اور صحت سوز دوائیں بے دھڑک کھانے والی، یہاں کی بدمزاجیوں کے کاکل پر پیچ و خم کے سلجھانے کا خوبصورت شانہ، روانِ خانہ، جانِ خانہ، اہلِ خانہ وہ قیدی نواز جیالہ جس کے الفت کا محبوس ہتکڑی اور بیڑی کی قید و بند سے ہمیشہ آزاد ہے۔ وہ مجنون پرور لیلیٰ جس کے پاگل خانہ کا دیوانہ آزاد سے بیزار اور اپنے پُرفساد و نفسانی خواہشوں سے ہمیشہ مصروفِ جہاد ہے' وہ باغیرت جس کو اپنے شوہر کے گھر سے مر کر نکلنے پر ناز و نازنین ہر مصنوعی ناز نخرے سے بری مجسّم نیاز ہے ۔ اپنے عزیزوں کی پیاری' اپنے ماں باپ کی دلاری' دنیا کو میاں کے حق جنت الفردوس بنانے والی بہشتی ناری لڑکپن کی تماشا جوانی کی محبوبہ اور بڑھاپے کی انّا ہے۔ انسانی زندگی سند آسائش کا فطری مرقع ہے۔ سوت کے خیال سے موت سے زیادہ ڈرنے والی خواب میں اس کے تصور سے خیالی طور سے لڑنے جھگڑنے والی۔ وہ عجیب الخلقت عورت شملہ اور نینی تال کی صحت بار آب و ہوا جس کو بہت ضرر کرتی ہے۔ ایک پرانے بے مروّت اور غلط جیل خانے میں جو آسائش اور بڑی نازش سے ستّر اور اسّی برس کی عمر تک ہشاش بشاش زندگی بسر کرتی ہے۔ سن تمیز میں بھی قید خانے اور گھر کی جس کو مطلق تمیز نہیں بجز اس کے اپنے عزیزوں کے غیر مرد اگر عزیز مصر بھی ہو تو اس کو عزیز نہیں۔ باہر کے نوکروں سے کچھ نہ کچھ عناد کا رکھنا جس کا قدیم شعار ہے۔ ہم پہلے ہر رنگ اور ہر طرح سے جس کا دل اپنی دائی ماں کا بدل طرفدار ہے۔ مرد احباب کے ساتھ بے تکلف پہاڑوں اور جزیروں کی روح پرور ہوا کھانے کا ذکر سن کر جس کے ہوش اُڑتے ہیں، محل سرا سے باہر نکلتے نکلتے بے جا اور غیر ضروری شرم سے جس کے پاؤں زمین میں دو دو گز گڑھتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس میں جانے کا نام سن کر فرطِ اضطراب سے مرغِ بسمل کی طرح پھڑکتی ہے۔ غیر مرد کی جادو چشمی کے تصور سے نوگرفتار جنگلی دیار گھوڑی کی طرح بہت خوفناک انداز سے بھڑکتی ہے ۔ رسائی اور حکومت کے جنگل کے مرغوں کو فرطِ نادانی سے اخلاقی فرخندہ فرجام دام کا دانہ بن کر جس کو پھنسانا نہیں آتا۔ اپنی دلربا اداؤں، طبعی قوتوں اور خداداد صفتوں کے حُسن استعمال سے

جس کو بیگانہ کو خویش اور دشمن کو دوست بنانا نہیں آتا۔ باوجود قومی اخلاقی علالت اور مشہور بے سرو سامانی، علاج کے بھی سو بیماروں کے حق میں بہت آسانی سے بھی ایک انار بننے پر سخت انکار۔ شوہر کے ولی ولایتی ہم سفر دست سے ڈرائنگ روم میں کھڑے کھڑے ذرا سا ہاتھ ہلانے کی بات سننے پر میکے جانے کے لئے قیامت خیز تکرار اور بے انتہا اصرار۔ وہ جاندار تکیہ جس پر آج بڑے بڑے لوگوں کی آسائش، امارت اور سخاوت کا تکیہ ہے وہ زندہ سلائی کی کل جس کے ذریعہ سے ہزاروں چاک در چاک گریبان افلاس میں مضبوط بخیہ ہے۔ وہ وحشی غیر محرم مرد کی سریلی نے وار اور دلکش آواز بھی جس پر چابک کی طرح پڑتی ہے، وہ نازک اندام موم کی گڑیا، غیر مرد کی نگاہ محبت وعنایت بھی جس کے بدن میں مثل کانٹے کے گڑتی ہے۔ وہ چراغ محبت و شرافت جس کی نورانی حیا سے بعض بد نصیب روشن خیال حکیموں نے اپنی آسائش اور عافیت کے کاشانے کو دائمی طور پر پر نور ہونے دینا محض بے سود جانا، وہ آب دار اور آبرو دار شرافت وعفت کہ جس کو مغربی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے سرتاج نے اپنے سلک ازدواج میں بہ ہزار تمنا وخواہش پرونا اپنے اور اپنے افسردہ حال اور شتر بے مہار نوجوان قوم کے حق میں ہر طرح سے محمود جانا۔

عشق کیا شئے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہیئے

احمد علی شوق

آخر یہ شوق ہے کون جانور۔ چرند ہے یا پرند۔ رہتا کس دیس میں ہے، کھاتا کیا ہے، پیتا کیا ہے۔ بس یہ ننھی سی رائی کے دانے کے برابر بات، جس کے واسطے کامل کی تلاش۔ کشف نہیں، کرامات نہیں، مراقبہ نہیں، سماع نہیں، حال کا قال نہیں، مسئلہ تجدد امثال نہیں ؎

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی پوچھے ہم سے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

اللہ اللہ آپ ہیں اودھ پنچ کے نامہ نگار۔ چشمِ بد دور آپ سے بڑھ کے اس معمّے کا حل کرنے والا کون۔ علماء، زاہد خشک صوفی جاہل، پنڈت برائے نام، شعراء بے اعتبار، ایک آپ کی ذات ہے باقی اللہ اللہ خیر سلّا۔ بندہ پرور سنیئے اگلے زمانے والے بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے سیدھے سادے آدمی تھے، جو جی میں آیا کہہ گزرے جو سنا مان لیا، نہ حجت نہ دلیل۔ یہ عقل جو اس زمانے والوں کو اللہ نے دی ہے پہلے اس کی چھاؤں بھی نہ تھی۔ نہ یہ طریقۂ تعلیم، نہ یہ تہذیب، نہ یہ اپج، نہ یہ ایجادیں، نہ یہ رفتار، نہ گفتار، نہ یہ لباس، نہ قیاس، اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا اسی عشق کے معاملے میں دیکھ لیجیے متقدمین نے کیسی منہ کی کھائی، ہزار عقل کے گھوڑے بگ ٹٹ دوڑائے لیکن منزلِ مقصود کو نہ پہنچے۔ صرف دو قسمیں قائم کیں، ایک مجازی دوسری حقیقی، بھلا عشقِ بازاری، عشق خانگی، عشق ازدواجی ان کا بھی کہیں ذکر ہے؟ خاک نہیں۔ اب آپ ہی انصاف فرمایئے، لمبی چوڑی عقل والے ان کی تحقیق پر کیوں نہ حرف رکھیں۔ مجازی اور حقیقی کی تفصیل میری دانست میں فضول ہے۔ ان سے تمام پرانی کتابیں بھری پڑی ہیں، رہیں نو ایجاد قسمیں ان کا سمجھانا کونسی بڑی بات ہے، چٹکی بجاتے سمجھائے دیتا ہوں۔ عشق ایک قسم کا ولولہ ہے جو ایّامِ شباب میں ظاہر ہوتا ہے اور جو ایک جنس کو رجوع کرتا ہے طرف دوسری کے۔ بازاری میں یائے نسبتی تصوّر فرمایئے۔ چونکہ عشق بازار سے تعلق ہے اس لحاظ سے عشقِ بازاری نام رکھا گیا۔ اس کی دو قسمیں ہیں :۔

قسمِ اوّل

تھوڑا سا دن باقی رہا اور لپ جھپ نہا دھو کنگھی سے بال سنوار، ٹیڑھی ٹوپی، بنارسی رومال، رنگین گھٹنا پہن، گلوری دبا

پو قدمے چوک میں جا نکلے۔ کبھی اس کمرے پہ نگاہ کبھی اس مونڈھے پہ، باچھیں کھلی ہوئیں، مونچھیں تین پائے، اس کمرے سے لگاوٹ اس کمرے سے نگاہ بازیاں۔ کوئی ہنس دی اور یہ ریشہ خطمی ہو گئے، کسی نے جھوٹوں اشارہ کیا اور یہ دائیں بائیں دیکھ کھٹ سے زینے پہ۔ آیئے نواب صاحب! حضور کیا کہنا، حضور ایسے، حضور ویسے۔ وہ بٹیر لڑائے کہ بڑے بڑے استادوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ وہ کنکوا لڑایا کہ لوگ بتی بول گئے۔ طبلہ بجانے میں ماشاءاللہ ہاتھ ایسا تیار جیسے ریل کا انجن، گھڑی کا پُرزہ۔

ادھر حضرت نے گلوری کھائی اُدھر غیرت آئی، بھئی رنڈی کے پان یوں مفت کیا کھائیں لٹو دار پگڑی والے کو اشارہ کیا اس نے جیب سے نکالے اور نائکہ جی کے حوالے کیے۔ پھر بھڑووں نے دیکھا اچھی سونے کی چڑیا پھنسی، ساز ملاجے کا رنگ جمایا۔ غرض چیتھڑے چھڑانا مشکل، دو چار جو گرہ میں تھے وہیں چڑھا دیے۔ ہاتھ جھلاتے رخصت ہوئے۔ یار دوستوں میں لن ترانیاں اڑانے لگے۔ بڑے مرزا آج تو بی . . . . . . نے وہ خاطر داریاں کیں کہ واللہ ہے بندۂ بے تد بنالیا۔ بھئی کیا خلیق لوگ ہیں۔ جب ادھر سے ہو نکلے بے دو چار گلوریاں کھلائے چھٹکارا محال ہو گیا۔

قسم دوم (عشقِ بازاری)

اس کے واسطے صرف چار ٹکے پیسوں کی ضرورت ہے۔ مٹھی میں دبا بازار کی سیڑھیاں بھریں، ہانپتے کانپتے جا پہنچے، چڑیلیں نظر پڑیں، آنکھیں ملائیں، باتیں چکنائیں۔ دو چار جوتیاں، دس بیس گالیاں کھائیں، ٹکے حوالے کیے۔

یہ تو عشقِ بازاری ہوا، اب عشقِ خانگی کا ماجرا سنیئے۔ یہ بھی دو قسموں پر منقسم ہے۔ اوّل بلانا دوسرے خود جانا۔

قسمِ اوّل (عشقِ خانگی)

یہ بڑے آدمیوں کے حصے میں ہے۔ ایں بڑے آدمی کیا۔ یہی دراز قد فربہ، نہیں نہیں بھیّا روپے والے کو بڑا آدمی کہتے ہیں۔

اب قسم اوّل کی تعریف سنیئے، دس بیس روپے کے خرچ میں اونچی سے اونچی . . . . . . کیوں نہ ہو، گھر گھر گھر گھر دروازے پہ موجود۔ پری نے جلوہ دکھایا، حور نے حجابِ فاصل اٹھایا، چودھویں کا چاند نکل آیا۔ تکلّف برطرف ؎

اُنچل رُخ سے جو ہٹ گیا ہے
پردہ غیرت کا پھٹ گیا ہے

یہ بات، وہ بات، لٹیا پسند، خاصدان پسند، گھڑی پسند، اگالدان پسند آناً فاناً گھر کا تعلیقہ کر لیا۔ فرمائشیں مزید برآں لیکن یہ چاندنی چار ہی دن کی ہے۔ اِدھر میاں کا دیوالہ نکلا اُدھر ؎

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

پہ عمل کیا گیا۔

قسم دوم (عشقِ خانگی)

دو روپے کمر میں باندھ چل کھڑے ہوئے۔ یہ گھر دیکھا وہ گھر دیکھا آخر ایک مکان میں سبزے کی روش جم گئی —— حضرت خوش غلاف ہو پلنگ پر دراز ہوئے۔ خانم صاحب کو پیاس کی شدت، دوسرے مکان کا دروازہ کھلا ہوا۔ پانی پینے کو اٹھیں اور غڑاپ سے اسی دروازے میں۔ میاں ہیں کہ امیدوار بودہ بدانند یا الٰہی زمین کھا گئی یا آسمان۔ اتنے میں دو تین مسٹنڈے ڈنڈے باز آدھمکے۔ ارے ہے قیامت نازل ہوئی اوسان خطا ہو گئے۔ پیٹ میں سانس سمانی مشکل پڑ گئی۔ دو چار ڈگ جما کانٹا سا نکال باہر کیا۔ جی ہی جی میں پچھتائے اپنا سا منہ لیے ٹپے گاتے چلے آتے ہیں۔ ہٹ تیرے کی۔

یہ عشقِ خانگی ہوا رہا عشقِ ازدواجی، اس کے مزے کچھ نہ پوچھیے جو ہیں سو ہیں۔ یہ عشق خود ہی مہذب ہے اسکی حقیقت سنیئے۔ ایک مہذب مرد کا ایک مہذب عورت کو عقد کے لئے دیکھنا بھالنا۔ اب اگر یونہی بن دیکھے بھالے عقد کر لیا اور دونوں میں میزان نہ پٹی۔ شادی عذابِ جان، جورو اجیرن۔ زندہ درگور ہوئے۔ اس سے عقلاء نے عقد سے پہلے کچھ دنوں امتحان لازمی ٹھہرایا پھر ہے چاہا کیا، چاہا کھٹ سے الگ ہو رہے۔ تم اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ اسے عشقِ ازدواجی کہتے ہیں اور اس پر اپنا بھی صاد ہے۔

نمایش گاہ

احمد علی شوق

ابرِ نیساں کو قلم نے پانی پانی کر دیا   موتیوں سے دامنِ کاغذ لبالب بھر دیا
واہ ری رنگیں بیانی تو نے کیا باندھی ہوا   نوعروسانِ سخن کو پھولوں کا زیور دیا
اے اودھ پنچ آپ نے بہرِ رگِ جانِ عدو   حرف لکھنے ہی بس اس کے ہاتھ میں نشتر دیا
بنیا اخبار اور بازارِ سخن کی بانگی   اسکو کیا سوجھی کہ اس نے اوکھلی میں سر دیا
ہم کو دیکھو کھینچ کر نقشۂ نمائش گاہ کا   تحفۂ اربابِ بینش کہہ کے آگے دھر دیا

لطافت کی کان ظرافت کی جان مسٹر اودھ پنچ صاحب! بالفعل زمانہ کیا کیا کروٹیں بدل رہا ہے۔ کیسی کیسی قلابازیاں کھا رہا ہے جو بات ہے وہ الوٹانسی ہے۔ ان نئے نئے ڈھکوسلوں سے جی اکتا گیا۔ ستم ظریفوں کی میٹھی میٹھی چھریاں کام کر گئیں۔ چین کا کوسوں پتا نہیں۔ آرام کنوؤں میں بانس ڈالے نہیں ملتا۔ سال کا سال مر مر کے بسر کیا۔ دنیا بہ امید قائم پر عمل کئے ہوئے۔ آس لگائے۔ زندگی کے دن بھرتے رہے۔ ہوا دھر کے پتھروں کی مارا مار نے اور بھی دل سرد کر دیا۔ فصلِ انبہ کا بیج گن گن کر مارا گیا۔ آندھی کا منہ کالا ہو کہ آئے دن اس پر خاک اڑایا کرتی ہے ؎

ہر سمت سے ہے ہجومِ ظلمات   جو دن ہے وہ پہلی گور کی رات

ایک تو یونہی حال پتلا ہو رہا ہے۔ اس پر طرہ سنئے کبھی کالی گھٹا چھائی ہے، گھن گرج بادل گرجتے ہیں۔ جھما جھم مینہ برستا ہے۔ کبھی سرد ہوا جیتے جی ٹھنڈا کئے دیتی ہے۔ بدن یخ ہوا جاتا ہے۔ کبھی لون جھلسائے دیتی ہے۔ آفتاب آنکھیں نکال نکال کر گرمیاں دکھاتا ہے۔ دھوپ کے مارے کھوپڑی چٹخی جاتی ہے۔ سر کا پسینا تلووں کو آتا ہے۔ یا تو گلی گلی وہ چہچہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یا ایسا سناٹا ہے جیسے اس دیس میں آدمی ہی نہیں بستے۔ مکانوں کی وہ گت کہ اینٹ سے اینٹ بج رہی ہے۔ جس کو دیکھئے بدن میں سکت نہیں۔ ضعف کے مارے آنکھیں یوں بند جیسے بخیلوں کے دروازے۔ ہندی بھائی، بھولے بھالے دربارِ الٰہی سے بے ہنری کا تمغا پا چکے ہیں۔ اگر کسی نے اینڈی بینڈی اوٹ پٹانگ چار لکیریں کھینچ لیں۔ لیجئے بھیا بڑے دستکار ہیں۔ باچھیں کھل گئیں۔ اپنے حسابوں مانی بہزاد پر چھاپہ مارا۔ مگر سچ یہ ہے جہاں روکھ نہیں وہاں رنڈ روکھ۔ خوشامدی للو پتو کے آدمی۔ خراب کن ہنر ہے، انہیں کیا بس میں جنگلی ڈال جھالوانک کھڑیں۔ کسی کا گھر جب ناپٹ کو موجود ان خورندوں کی دل سوزی جھوٹے کولوں کو آگ ہے۔ ٹھہرنے کا نام نہیں جانتے۔ کڑی پڑی آڑے آنے والا کوئی نہیں ؎

کس را نہ بینم روزِ غم جز سایہ در پہلوئے خود   آنہم چو بینم سوئے او گرداند از من روئے خود

ارے ماں یہ تو سب ہوا۔ کوئی ڈھونڈورا یا کچھ پکار رہا ہے (کان لگا کر) ہاں بھئی (کھڑکی سے سر نکال کر) کیوں بھئی یہ ڈھنڈورا کاہے کا ہے ؟

حضور نمائش گاہ کا !

واہ وا۔ گھر بیٹھے خضر ملے۔ یہاں تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، مٹرگشت کا عارضہ بھئی ہزار کام چھوڑ اس جلسے میں ضرور جائیں گے۔ (چاہے چانڈو کا وقت قضا ہو جائے) دن تاریخ پوچھ پاچھ چار دن آگے سے کمر کس بیٹھے۔ گھڑی گھڑی پہاڑ ہو گئی۔ سوتے جاگتے اسی کا دھیان بندھا ہوا۔ اٹھتے بیٹھتے اسی کی لو لگی ہے۔

بارے خدا خدا کر کے وہ دن آیا، اے لیجئے سویرے ہی سے نکھر، کنگھی سرمے سے لیس ہو، جامدانی کا انگرکھا ڈانٹ، کریپ کی دو پلڑی نکردار ٹوپی ٹیڑھی رکھ، ٹاٹ باقی جوتا پہن، کڑی کمان کا سا تیر نمائش گاہ کے پھاٹک پر پہنچے۔ ابھی قدم ڈگنے نہیں پایا تھا کہ پہرے والوں نے ڈانٹ بتائی۔ الٰہی خیر بھو چکے ہو رہے۔ زمین نے قدم پکڑے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہر چند آج کل کے خوشامدیوں سے کچھ بڑھ چڑھ کر خوشامد کی۔ وہ سب کے سب فرعون بے سامان ہوا کے گھوڑوں پہ سوار کس کی سنتے ہیں۔ لاچاری درجے مخالفت کا سبب پوچھا

میاں تم تو بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے معلوم ہوتے ہو۔ ذرا ہوش سنبھالو۔ عقل کے ناخن لو۔ پہلے آدمی بن آؤ پھر اس پھاٹک کے اندر قدم دھرنا۔

بھائی جان آدمی کیسے بنتے ہیں ؟

ماشاء اللہ! اتنے دنوں دلی میں رہے۔ بھاڑ جھونکا کئے۔ اجی ٹوپی ایسی۔ کوٹ ایسا۔ پاجامہ ایسا۔ بوٹ ایسا۔

قہر درویش برجان درویش۔ سوائے بغلیں جھانکنے کے کچھ نہ بن پڑا۔ گم صم الٹے پاؤں گھر کا راستہ لیا۔ جی میں آیا۔ اونہہ مارو الگ کرو۔ کس کی نمائش گاہ۔ اپنی ایسی تیسی میں جائے، کپڑے وپڑے کہاں خریدتے پھرو گے۔ اتنا بچے گا۔ بٹیر کھائیں گے۔ مرغوں کے کام آئے گا۔ چانڈو کے دم اڑیں گے۔ چرایا ہوا شوق بھلا کب مانتا ہے۔ ایک پل چین نہ آیا۔ بے کل ہو گئے۔ ننگے سر، نہار منہ، بگٹٹ۔ مسٹر جونس کی کوٹھی میں پہنچے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ منہ مانگے داموں جو کچھ لینا دینا تھا وہ لے دے، آدمیت کا جامہ پہن۔ تڑاق پڑاق کندے جوڑ۔ پھر اسی پھاٹک پر۔ اب کے منہ میں دانت ہیں جو ڈانٹے۔ کھٹ پٹ کھٹ پٹ آگے بڑھے۔ گردن نیچی کئے اپنی راہ چلے گئے۔ اس دفعہ چپراسی اپراسی سب کے سب ہمارے کوٹ پتلون بوٹ کی چمک دمک دیکھ کر دم بخود ہو گئے۔ غرضکہ یہ چل وہ چل بھرے جلسے میں غٹ پٹ۔ وہاں تو الٹی گنگا بہتی دیکھتے جی بجھ گیا۔ وضو ٹھنڈے ہو گئے۔ ہم اس دھن میں آئے تھے کہ بندا دین کا ناچ، حیدری کی گلے بازیاں ہوں گی۔ سو اس راگ مالے کی تن تنن بھی نہیں۔ خیر ایک حماقت شدنی تھی۔ ہو گئی۔ اس میں پچھتاوا کاہے کا۔ جو تقدیر سے اتر گیا تھا۔ اس کو بھاڑ میں جھونک چکے اب آگے کو کان ہو گئے بہتا پانی بہہ جائے۔ ٹھہرا پانی رہ جائے۔ جیتے جی تو کوڑی کوڑی دانت سے پکڑیں گے۔

گزشتہ را صلوٰۃ کہہ کر جی کو سمجھایا بجھایا۔ ادھر آئے اور ادھر گئے۔ یہ چیز دیکھی وہ چیز دیکھی، اے لیجئے اب تو آنکھیں کھل گئیں۔ جس دکان پہ جا پڑے آئینہ بن کر رہ گئے۔ چین کی دستکاریاں، انوکھے کرامت کے مال۔ یورپ کے نفیس نفیس تجارتی اسباب۔ خصوصاً انگلستان کے صنائع ندیدہ نہ شنیدہ۔ واللہ ہے ہمارا اپنا بازار اس کی گرد کو نہ پہنچے۔ ساری خدائی کا تماشا کھڑے کھڑے ان آنکھوں سے دیکھا

لیکن دیکھنا ہی دیکھنا ہاتھ لگا۔ ٹکا پاس نہیں جو کسی دکاندار سے بات کریں۔ چانڈو، مدک میں توڑے کے توڑے پھونکنا یاد کر کے کلیجے میں آگ لگی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپک پڑے۔ چھاتی پر سانپ لوٹ گیا۔ ؎

سودن دست شدہ قسمتِ مایا قسمت

اب یہ وسوسوں میں سمایا کہ یونہی خالی ہاتھ کیا منہ لے کر گھر میں جائیں گے۔ بیگم صاحبہ مارے طعنوں کے اودھیڑ دیں گی۔ یار آشنا جن سے دانت کاٹی روٹی ہے۔ مصاحب جو ہماری ناک کے بال ہیں بے نقط ادھیان سنائیں گے۔ ہرچند وہاں جو شے تھی وہ چیونٹی ہی کی تھی۔ لیکن ہمارے کس مصرف کی، بے ضرورت چیزیں نظر میں نہیں سماتیں۔ اپنی کار آمد چیز ڈھونڈتے ڈھونڈتے پانوں ہاری مان گئے۔ قوتِ رفتار بول گئی۔ آخر ایک گوشے میں دلی کے سادہ کاری زنانے چھلے اور لکھنؤ کی بنی ہوئی بیٹروں کی چند کابکیں بہت خوبصورت نظر پڑیں۔ واہ رے ہم قسمت کے دھنی کیا کہنا۔ وہ دکاندار اپنے ہی دیس کے جان پہچان نکلے۔ اب کیا پوچھتے ہو۔ پانچوں گھی میں۔ کلیجہ ہاتھوں بڑھ گیا۔ علیک سلیک کے بعد دکانداروں پر دم دھاگے کا جال ڈالا۔ چھلے کابک دو دن کے وعدے پر قرض لے کر مونچھوں پر تاؤ دیتے گھر میں آئے۔ بارے خدا نے سرخرو کیا بات کی بات رہ گئی۔ نہیں تو کلنک کا ٹیکہ ہمارے ماتھے پر بدا تھا۔

اودھ پنچ ۔ ۱۱ر جون ۱۸۷۸ء

یہ تماشا دیکھئے

حضرت اودھ پنچ صاحب۔ یہ جلمونہی شبرات ایسی مہنگی میں اور جلے کو جلانے آئی۔ کیا کہیں کس کا سر اپنے آگے دے ماریں۔ آتشبازی دانش بازی تو خاک نہیں۔ جی سنبھلنے کو۔ گردشِ تقدیر کا چکر۔ دورانِ سر کی چرخی۔ داغِ جگر کی مہتاب، آہ آتش فشاں کی ہوائی۔ ٹپ ٹپ ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کی پھلجھڑی۔ ہچکیوں کے پٹاخے موجود ہیں۔ رہا حلوا۔ سو یہاں فاقوں نے یوں ہی حلوا نکال رکھا ہے۔ اوس پر ستم ظریفوں کی میٹھی میٹھی چھریوں نے اور بھی زندگی تلخ کر دی۔ حلوا کس کا۔ چولھے بھاڑ میں جائے مگر یار ایک ٹیڑھی کھیر ہے جو ہمارے ہی جی پر ندم خر گندم تک ہوتا تو بلا سے اپنا جی مارتے، لہو کے گھونٹ پی کے بیٹھ رہتے۔ آخر مُردوں کی رُوحیں جو حلوے کی چاٹ میں منہ کھولے بیٹھے ہوں گے۔ یونہی منہ دیکھ کر رہ جائیں گے۔ اس کی کیا تدبیر کی جائے۔ ہم بتائیں۔ سردست حلوائی کی دکان دادا جی کا فاتحہ۔ یہی مثل پوری کرو۔ آگے کو جب کچھ انٹی چڑھے گا۔ دیکھا جائے گا۔ بھئی واہ۔ ہم بھی کیا مرد آدمی ہیں۔ کہاں تو شبراتی سنانے آئے تھے۔ کہاں یہ دکھڑا نکالا۔ لے سنیئے شبراتی ؎

شبرات آئی پٹاخے ہوں پڑا پڑ رات بھر　　لوکیوں کی سر ہو چھوٹیں دھڑا دھڑ رات بھر
کچھ نہیں افلاس میں ملتا تو دن ناغہ نہ جائے　　سر منڈا کر پیٹئے اس کو تڑا تڑ رات بھر

اودھ پنچ ۔ ۱۲ر اگست ۱۸۷۸ء

تہذیب قیس

عبدالغفور شہباز

لیلیٰ کے کہنے سننے سے آخر کو قیس نے ‏ لکھوایا نام نجد کے انگلش سکول میں
اے بی کے بعد پڑھنے لگا ایسی ریڈریں ‏ تعلیم خوش معاشی ہے جن کے اصول میں
پنٹا میٹر میں دیکھتا تھا انبساط کو ‏ پاتا تھا انقباض فعولن فعول میں
ازبر تھے یو کلڈ کے تھیورم پرابلم ‏ اقلیم حافظہ تھی گرامر کے رول میں
تھا تکیۂ کلام کی صورت زبان پر ‏ کیا جانے کیا مزا تھا بھراڈیم فول میں
القصہ انٹرنس ہوا پھر ہوا ایف اے ‏ بی اے ایم اے کے پاس بھی آئے حصول میں
ہمت بڑھی کہ کیجیے بیرسٹری بھی پاس ‏ رہ کر عرب میں وحشیوں کے ہوں شمول میں
لندن گیا تو اوک میں پانی لگا مزا ‏ حاصل تھا وہ جو نجد کے بن کی ببول میں
آئی نظر جو اوک کی کرسی پہ ایک مس ‏ کھٹمل کی طرح عشق گھسا دل کی چول میں
بال اس کے سر پہ صاف شعاعیں تھیں مہر کی ‏ ریشم کو جو شمار کریں جنس اول میں
پھل سیب نے لگائے تھے قامت کی شاخ میں ‏ رنگت بھری تھی روزنِ عارض کے پھول میں
دیکھا جو یہ بجا نہ رہے قیس کے حواس ‏ لگتی نہیں ہے دیر بلا کے نزول میں
مجنوں کو دھن کہ جلد پیوں وسکی وصال ‏ میری پڑی ہی تذبذب ردّ و قبول میں
میری کے کورٹ شپ کا بڑھا تازہ ذوق و شوق ‏ لیلیٰ کا عشق کہنہ خاک دھول میں

شہباز ہے کلام کا اکبر کے یہ جواب
لیکن بڑا ہے فرق فروع و اصول میں

قانونِ قسمت

ہم نے پوچھا یہ اپنی قسمت سے   دور کیوں ہم سے گنجِ مطلب ہیں
کالی رنگت ہے کیا مخل اس میں   کالی رنگت سے گزریں شب ہیں
سب ہی کو ہے سدا چمکتا چاند   شب ہی کو جگمگاتے کوکب ہیں
کالی رنگت سے گیسوِ جاناں   لیلۃ القدر سے مخاطب ہیں
کالی رنگت سے گیسوئے خمدار   تیغ و خنجر ہیں جفت عقرب ہیں
کالی رنگت سے پتلیاں دونو   چشم کے آسمان پہ کوکب ہیں
رنگ کے زیب سے مسی کاجل   راحت چشم و زینت لب ہیں
کس طرح دیں جگہ نہ آنکھوں میں   فائدے کحل کے مجرب ہیں
زیب دیتا ہے تن پہ کالا سوٹ   متفق اس پہ کل مہذب ہیں
حجرِ اسود کے مذہبی بوسے   بوسۂ لعل سے بھی اعذب ہیں
پاک کعبے کے کالے کالے غلاف   سرمۂ چشم دین و مذہب ہیں
گوری رنگت ہے گر سبب اس کا   ہم میں بھی کالے کم نہیں سب ہیں
رنگ ابیض سدا نہیں مطبوع   ورنہ کیوں داڑھیاں مخضب ہیں
ڈرتے ہیں داغِ برص سے یوں لوگ   جیسے مبروص کے معذب ہیں
شکل سے سنکھیا شکر کی ایک   جتنے ابیض ہیں کب سب اعذب ہیں
فرض کرلیں سفید کو گر دِن   دن بھی خالی کسوف سے کب ہیں
پتلیاں گر سپید ہو جائیں   ہر قدم پر قدم مذبذب ہیں
رشتہ مندوں میں خوں اگر ہو سفید   لاکھ اقرب ہوں پھر بھی عقرب ہیں
رنگ نقرہ بُرا ہے گھوڑوں میں   اس پہ شاہد صفات مرکب ہیں
اجلے سے ہے سہاگنیں بیزار   کیونکہ رنگیں سہاگنیں سب ہیں
سچ بتا ان پہ کیوں تو ریجھی ہے   ہم سے غمزے ترے یہ کیوں اب ہیں
بولی قسمت فضول سب تقریر   ایسی باتیں نظر میں یاں کب ہیں
کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف   دل کے آنے کے اور ہی ڈھب ہیں

معذرت انگریزی

ایک مرغے نے یہ مرغی سے کہا   لوٹتی ہے خاک پر کیوں بے تمیز
ہنس کے مرغی نے دیا اس کو جواب   جسم پر ملتی ہوں پوڈر اے عزیز
بولا مرغا ہے یہ پوڈر کیا بلا   بولی مرغی ہے یہ اک فیشن کی چیز
پوچھا مرغے نے کہ ہے فیشن یہ کیا   بولی مرغی بچۂ کمفرٹ و ایز
ڈانٹا مرغے نے کہ انگریزی نہ بول   بولی مرغی تیرے سر میں ہے ڈزیز
مرغا جھنجھلایا کہ پھر پھر پھر وہی   مرغی بولی چپ بھی رہ اے بدتمیز
وہ زباں جو ہے زبانوں کی کوئین   بولی وہ ہے جس کی ہر بولی کنیز
چھوٹ سکتی ہے چھڑائے سے کہیں   جب تلک ہے کوٹ پتلون اور کمیز
حبذا شہباز کا حسنِ کلام   مرحبا باغ فصاحت کی بریز

پادری ولیم نے احمد سے کہا   لو پڑھو انجیل سے سیکھو تمیز
بولا احمد اس کی اب حاجت نہیں   پڑھ چکا ہوں میں تو صاحب مسٹریز

حضرت رمضان کا فوٹو

دو ہفتے سے گھر میں مرے وارد رمضاں ہیں   جھلتے یہ کچھ ایسے ہیں کہ سب ان سے بجاں ہیں
ہے شام مہینوں ہی میں جا کر کہیں آتی   سنتے کہیں برسوں ہی میں مغرب کی اذاں ہیں
مسجد میں ہیں ترتیل و قرأت کے وہ جھگڑے   آمین کی جا مقتدی کہتے الاماں ہیں
ہوتی ہی نہیں ختم کسی طرح سے رکعت   مغرب پہ تراویح کے بادوں کے گماں ہیں
مغرب ہی چلی جاتی ہے مغرب سے عشا تک   سن لیتے کبھی اس میں ہی مرغوں کی اذاں ہیں.

مسجد سے جو آئے تو پھرے گھر سے خدا کے
الفاظ ہیں جو شکر کے سب ورد زباں ہیں

ایڈیٹر چاند کے نام

سیّد ممتاز حسین

[محترم و معظم جناب منشی کنہیالال صاحب !]

تسلیم۔ اودھ پنچ کا بار تنہا اپنی گردن پر لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کام چور ہوگیا۔ پھر بھی دو چار ورق کا مضمون لکھنا پہاڑی کے پتھر ڈھونے کے برابر نہ تھا جو تعمیل حکم سے گردن تابی کرتا اور بہانہ ڈھونڈتا مگر دو قسم کی بیماریوں نے یکبارگی حملہ کردیا۔ ایک ملیریا بخار جس نے تمام ڈیل پر کرم فرمایا دوسرے اسفل جسم کے بعض دو ہر یا ثمر نما "تولید مثل" پر آمادہ ہوگئے۔ آپ جانئے مردوں کو تولید کی زحمت یا عُسر ولادت کی ایذا سے کب واسطہ پڑتا ہے؟ پھر تولید بھی کس کی۔ اوندھے پھوڑے کی تین چار ہفتے اس مخصوص اور موذی بیماری نے ضائع کئے۔ خدا خدا کرکے اب تفرّق اتصال ہوا ہے۔ اس حالت میں چاند کیلئے مضمون بہت مشکل ہے۔ عذر لنگ نہیں عذر صحیح قبول فرمائیے۔

مجھے جب اسکا علم ہوا کہ آپ نے میرا نام اہل قلم کی فہرست میں لکھ لیا تو بہت تعجب ہوا۔ آج تک سینکڑوں مضمون قدیم اور جدید نظم و نثر لکھنے والوں کے متعلق ماہواری رسالوں اور اخباری کاغذوں پر شائع ہوئے ان میں کہیں میرا ذکر یا میرا نام نہیں۔ اور رہے بھی تو اعتراضات کی ہتھکڑیوں بیڑیوں میں مقیّد ہے خدمت اُردوئے معلّیٰ کا خلعت دوسروں کے جسم کی زینت نظر آتا ہے۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ ایک تو میں ادیب نہیں۔ دوسرے بیمار۔ تیسرے متروک الدنیا۔ چوتھے اتنی ہمّت نہیں رکھتا کہ ناقدری کا خلعت جو برادری نے عنایت کیا ہے اسے نامنظور کردوں اور زبردستی کہوں کہ میرا شمار کاملین روزگار میں ہونا چاہیئے۔ پانچویں سب سے بڑا عذر یہ کہ ڈرپوک ہوں یعنی مرد میدان مقابلہ و مسابقت نہیں۔ پھر بھلا کیا سمجھ کے مضمون نگاری کی بانگی دکھاؤں۔ جناب میرا دور ہی سے سلام ہے میں ان لوگوں کا حشر کتب تاریخ میں دیکھ چکا ہوں جن کو جہل مرکب کی بیماری نے بشکل کابوس کی طرح دبوچا اور اپنے پرائے کے سامنے بے جانی بوجھی بات میں دخل دے کے ذلیل ہوئے :۔

(۱) اسحٰق بن ابراہیم موصلی کے سامنے ابو عبیدہ نے قدما کے بعض شعر پڑھے۔ اسحٰق نے پوچھا "کیوں جی اس کلام میں کوئی حسن یا مزہ بھی ہے؟" عبیدہ نے جواب دیا "نہیں"۔ اسحٰق نے ناک بھوں چڑھا کے کہا "تو پھر کیوں گدھے کی طرح بوجھ اٹھائے پھرتے ہو۔"

ممکن ہے کہ میری بے مزہ عبارت دیکھ کے آپ سے یہی سوال ہو کہ جناب منشی صاحب آخر اس شخص کے ٹوٹے پھوٹے جملوں اور بے ربط عبارت میں کیا لال لگے ہیں جو آپ نے خواہ مخواہ اچھا بھلا کاغذ ردی بنا ڈالا؟ اے حضرت اس سے تو بہتر تھا کہ ملّا فلاں، جناب فلاں، مسٹر فلاں۔ پروفیسر فلاں

سے مضمون لکھنے کی درخواست کی ہوتی جو پیدائشی ادیب و ظریف ہیں اور جن کے رشحات قلم کے زیر بار احسان آج ہندوستان بھر کے میگزین ہیں۔

(۲) بنی تمیم (قبیلہ) کا ایک شخص ابونواس فرزدق مشہور شاعر عرب کے پاس آیا اور کہا۔ "میں نے ایک شعر کہا ہے سُن لیجئے۔" فرزدق نے شعر سنا اور چند لمحے کے بعد کہا۔ "سنو بھائی شعر کو ایک $\frac{9}{10}$ سالہ اونٹ فرض کرو جس کے اجزا کی تقسیم یوں ہوئی کہ امرؤالقیس کے حصے میں تو سر آیا۔ عمر بن کلثوم نے کوہان پایا عبید بن الابرص نے ران پر قناعت کی۔ اعشیٰ کو سرین ملی زہیر نے پٹھے ہتھیائے طرفہ کے ہاتھ سینہ لگا نابغتان (نابغہ جعدی و نابغہ ذبیانی) پہلو اور پسلیاں لے بھاگے۔ میں سب کے آخر میں پہنچا۔ توائم (پنڈلیاں اور ٹانگیں) اور پیٹ کا مالک میں بنا۔ اوجھڑی بچی تھی اس نے پکا کے کھائی مگر نہ پچی تو زمین دیکھی اور دکھائی۔ میاں تمہاری شاعری وہی جنازے کے پیٹ سے نکلا ہوا فضلہ ہے۔

جناب ایڈیٹر صاحب! مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں کوئی مستقل مضمون لکھوں تو وہ اگلوں کے پیٹ کا فضلہ سمجھا جائے گا. ابھی تک لوگوں نے بجائے خود یہ طے کیا ہے کہ پرانے اودھ پنچ کے ماخوذات جدید اودھ پنچ کے حیات کا سبب ہیں. اجی وہ وقت ہی اور تھا۔ وہ زمانہ ہی اور تھا۔ وہ لوگ ہی اور تھے۔

(۳) ایک شاعر صاحب نے اپنے برادر مکرم سے فرمایا کہ میں شاعر ہو گیا ہوں سنا آپ نے؟ انہوں نے ارشاد کیا بھائی یہ کوچہ پُر خطر ہے۔ خیر، مگر سناؤ تو سہی۔ شاعر صاحب مستعد ہوئے۔ ابھی یہی ایک شعر پڑھا تھا ؎

ھل تعرف الدّار بالقفنینا ابکینا فاحزنینا

کیا تم اس گھر کو جانتے ہو جو قفنینا میں ہے اور اس نے مجھے رولایا اور رنجیدہ کیا، نون کی نامعقول تکرار سے جھلا کے بھائی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "اے مردود اگر تو نے دوسرا شعر پڑھا تو خدا کی قسم تجھے کنوئیں میں دھکیل دوں گا۔"

ایڈیٹر صاحب۔ مجھ بے بضاعت فرومایہ کا مضمون دیکھ کے مبادا چاند کے خریداروں میں سے کوئی کنوئیں میں دھکیلنے پر آمادہ ہو جائے۔

(۴) ابن صباح کی کنیز جس کا نام برھان تھا۔ ابن صباح کے مہمان بُنان کے سامنے گانے بیٹھی ؎

اِنّ نَفْسِیْ رسول نفسی الیھا
ولَنفسی جعلت نفسی رسولاً

(میرا نفس خود میرے نفس کا معشوقہ کی طرف پیامبر ہے اپنے نفس کے لئے میں نے اپنے نفس کو پیامبر بنایا ہے) بنان نے برہان کے منہ پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔ "چپ اب تو سارے گھر میں فس فس پھس پھس کی آواز گونجنے لگی۔"

منشی صاحب! میں ڈرتا ہوں کہ چاند میں میرا سڑا اوپسا مضمون دیکھ کے لوگ چاند کے منہ پر ہاتھ نہ رکھیں۔

(۵) ایک شاعر صاحب شعر پڑھ رہے تھے دوسرے نے تعریف کی "واہ صاحب! کیا شکر ہے جس میں مٹھاس نہیں۔"

حضرت بیمار ہوں۔ بیماری میں ٹھٹھول کیسے سوجھتی ہے۔ کڑوی دوائیں پیتے پیتے زبان تلخ ہو گئی۔ سوکھے ٹھٹھے۔ یا زہرخند

اور بن مٹھاس کی شکر ایک ہی ہیں۔ تاریخ میں بُرے اور بے معنے مضمون کے نتائج صدہا درج ہیں۔ مگر سب سے بڑا یہ واقعہ ہے۔ کہ محمد بن حسن الحصنی کے صاحبزادے کو شاعری کا شوق ہوا۔ مگر وہ صرف شاعری کی تہمت اپنے سر لینا چاہتے تھے۔ محاسن شعر یا معنویت کی پروا انہیں نہ تھی۔ ایک دن باپ سے کہنے لگے "ابا۔ ابا۔ میں نے شاعری شروع کر دی۔ باپ نے جواب دیا کہ سناؤ صاحبزادے اس پر مچلے کہ اگر شعر آپ کو پسند آیا تو ایک لونڈی یا ایک غلام انعام میں لوں گا۔ باوا نے ہامی بھری کہ ایک نہیں دونوں دوں گا۔ اب تو صاحبزادے دل کھول کے پرکٹی اڑانے لگے۔ حصنی کو غصہ آگیا اور کہنے لگا" خدا کی قسم ایسے اشعار کا صلہ نہ لونڈی ہے نہ غلام۔ مگر سردست میں تیری ماں کو تین طلاقیں دیتا ہوں۔ جس نے ایسا یاوہ گو لڑکا جنا۔"

بہرکیف جناب ایڈیٹر صاحب میں عذر خواہ ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے نظم و نثر میں بچھیڑوں کے ساتھ کلول کرنے پر مجبور نہ فرمائیں گے۔ میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ مجھے کوئی دعویٰ یا سلیقہ انشا پردازی میں نہیں۔ میں نے تو "چندیں شکل برائے اکل" کے طور پہ یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ زیادہ نیاز۔

نیاز مند
ممتاز
(ایڈیٹر اودھ پنچ)

منطق آرا بیگم بنام مسٹر چرچل

حکیم ممتاز حسین عثمانی

"قیمتی بوسے" کتاب صدائے نذیر تاب"

بیٹا چرچل! تم واقعی بہت چڑچڑے بدمزاج جلد باز جھلّے اکل کھرے۔ روکھے سوکھے۔ پھیکے بدمزہ۔ ناک چڑھے بھڑ بھڑیئے۔ لالچی خود غرض تن پرور۔ چھوہڑ۔ بددماغ۔ پیٹ کے ہلکے۔ خود پسند۔ یاوہ گو ہو۔ ہا بیٹا بری بات! تمہیں بڑے بڑے پولیٹیکل دماغوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو یہ عادتیں تم نے نہ چھوڑیں تو اللہ جانتا ہے پولیٹیکل میدان میں تمہیں کبھی "فرلق" کا مرتبہ حاصل نہ ہوگا۔

صاف صاف دل کی بات کہہ دینا اگلے زمانے میں تعریف کے قابل تھا۔ اب تو جتنی کمینڈ کی بات کہی جائے اتنی ہی تعریف ہوتی ہے دوسرے یہ کہ صاف صاف کہنے میں بھی تہذیب کا آنچل ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیئے بھلا بتاؤ تو سہی تم نے کیا سمجھ کے بڑے میاں (گاندھی) کو "نیم برہنہ باغی فقیر" کے الفاظ سے یاد کیا۔

مردوں کے واسطے "نیم برہنہ" یعنی آدھے ڈیل سے ننگا ہونا کوئی عیب نہیں۔ یورپ میں تو آج کل تہذیب نے اتنی ترقی کی ہے کہ عورتیں بھی جامے سے باہر پڑی پھرتی ہیں۔ چیتھڑا اک ڈیل پر نظر نہیں آتا جتنی چھپانے کی چیزیں ہیں سب اللہ رکھے ہوا اور دھوپ کھاتی ہیں بڑے بڑے میدان انہیں ننگے دھڑنگوں کے واسطے خاص کر دیئے گئے ہیں جن میں اکیلی عورتیں ہی نہیں ساتھ میں مرد بھی ننگے اُچکتے پھرتے ہیں۔ اور قانون انہیں روک نہیں سکتا۔ گاندھی غریب تو پھر بھی لنگوٹی باندھے رہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ابھی وہ آدھے دھڑ سے مہذب ہیں۔ اسی وجہ سے تم انہیں کہہ جاتے ہو۔

رہا یہ کہ وہ باغی ہیں تو یہ بھی غلط ہے۔ نمک بنانا بغاوت نہیں۔ شراب کی بکری موقوف کروانا بغاوت نہیں۔ چرخا کاتنا بغاوت نہیں۔ کھدر کی چادر اوڑھنا بغاوت نہیں۔ بھلا کس کتاب میں بغاوت کے یہ معنی لکھے ہیں۔ دو باتوں کا جواب ہوا۔ تیسری بات کا جواب سنو کہ یورپ والوں کا ایمان ہے روپیہ۔ روپیہ پاس ہو تو پاجی پن میں ہنر ہے۔ دس شریفوں کا ایک شریف۔ ہزار شریفوں کے سر اس کے سامنے جھک جاتے ہیں ؎

مرا بندہ بدہ کفش بر سر بزن

قحبہ بھی اگر زردار ہے تو نادار شریف عفیف بہو بیٹی اس کی کنیز بننے کو موجود۔ برخلاف اس کے ایشیا والوں کے نزدیک روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ بقول بدنصیبین کے دانت پہ چھلیں نہ ہو مگر آدمیت ہو۔ مفلس نادار ہو مگر ہڈی اور نسل کا شریف ہو۔ کنگال قلاش ہو مگر حیادار ہو۔ ایشیا میں آج بھی لنگوٹی باندھنے والے فقیروں کے آگے بڑے بڑے ہفت ہزاری سر ٹیک کرتے ہیں۔ ایک بوریئے پر آسن جمانے والے فقیر کے سامنے لاکھوں ہفت ہزاری ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں وہ خود کسی کے دروازے پر نہیں جاتا مگر اس کی منڈھی پر شاہ و شہریار تک حاضری دیتے ہیں شاعروں نے اسی کی مدح کی ہے ؎

سمجھنے والے کیا قدر زر و گوہر سمجھتے ہیں
اسے مٹی سمجھتے ہیں اسے پتھر سمجھتے ہیں

دیوالیہ ہونے پر فخر کیا جاتا ہے ؎

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریے پر بیٹھے ہیں قالین کو ٹھوکر مار کے

عورتیں مثل کہتی ہیں۔ "پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان ؎

زندگی ترک سوال مدعا است
آبرو چوں جمع شد آب بقاست

آن پر جان قربان کرنے والے ہزاروں بندگانِ خدا اب بھی موجود ہیں جو فاقہ کرتے کرتے مر گئے مگر ہاتھ کسی کے آگے نہ پھیلایا۔ میں نے تمہاری تقریر اخباری کالموں میں دیکھی۔ ارے مردودِ خدا سے ڈر کہیں تو ہلِ کھولن طعن تشنیع (تشنیع) سے باز آیا ہوتا۔ تو نے سو تنباڑاہ کو مات کر دیا۔ ابھی نہ گورنمنٹ نے کچھ دیا نہ ہندوستان والوں نے کچھ پایا مگر واویلاہ وامصیبتاہ کا شور مچ گیا ——— انگلستان کے حقوق کا تحفظ" ایک معمّٰی ہے اور اسی چیستان کے حل کرنے میں نصف خزانۂ ہند ہر سال صرف ہوتا رہے گا۔ خبر نہیں کہ ایسی حالت میں تمہیں اپنے قومی حرمان کا خیال ہی کیوں پیدا ہوا۔ اس وقت جو معاملہ درپیش ہے اس کی توضیح اس حکایت سے ہوتی ہے۔

دود کباب

یکے روستا از پدر کردہ قہر   سیاحت کناں از دہ آمد بشہر
زبس آں پسر چیز نادیدہ دید   بدنداں سرِ انگشت حیرت گزید
چو سرگشتہ از رنج رہ خستہ بود   بہ بازار رفت و زمانے غنود
درینجا زیک سوکہ دودِ کباب   پدیدار شد و روستا یا شتاب
برآورد زانبان خود قرص نان   بہ دودش بیالود و میخورد و ازاں
زماں بخورد دادہ چوں می جوید   ہمہ سرِ انگشت خود می کمید
کبابیؔ دوں البلش دید چوں   سراسیمہ از دکہ آمد بروں
گریبانِ وے سخت بگرفت و گفت   کہ دودِ کباب اے پسر نیست مفت
ربودی متاعم۔ نہ دادہ ثمن   بگو پس چہ شد قیمت دودِ من
کلام کبابی بہ حیرتش فزود   بگفتا متاع کہ بردم چہ بود؟
نمی خوردم ازمن ندودِ شما   نباشد مگر دود جز دودِ ہوا؟
نمود ند القصہ آغازِ جنگ   زپیکار شاں رہگزر گشت تنگ

دو جاہل۔ آرام بابائے دہر   نمودند بایک دگر گفتگو
سر کار شاں بہ تنازع کشید   دراں بین بہلول آنجا رسید
بہ رغبت نمودند او را حکم   بدہقاں بگفتا کہ منما ستم
بدہ قیمت دودش آنگہ برو   کہ نتواں خوری مال مردم بزور
زدے پول بگرفت وجنباں شمرد   کہ دل از کبابی صدایش بہ برد
بہ دہقانی آں پولہا رو نمود   بگفت ایں "صدا" قیمت دود بود
چہ خطے کہ بردی ز آواز پول   کند جائے دود کبابش قبول
مشامت معطر ز دود کباب   شدہ پس شدی زایں قضا کامیاب
بہ بردی اگر دود ایں پول ہم   شمرد۔ کز شمردن نگہ دید کم
چو دود کبابی است گفتار من   کہ در نزد جاہل نہ دارد ثمن

بدیں رسم سلطانیہ از قدیم
کہ تہنہ قیمت بگفت حکیم

لوگ فارسی زبان سے کم واقف ہیں لہٰذا خلاصہ ترجمہ اس کا لکھے دیتی ہوں کہ ایک صاحبزادے اماں باوا سے روٹھ کے گھر سے نکل گئے۔ کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ دیہات سے شہر میں جو پہنچے تو ہر چیز نئی معلوم ہوئی۔ جو چیز دیکھی بھونچکے رہ گئے کہ آہا یہ کیا ہے آوارہ پھرتے پھرتے ایک کبابی کی دکان تک پہنچے۔ بھنے ہوئے گوشت کی چرائہند مسلمان کو بہت بھاتی ہے۔ مرزا قتیل جب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے کہا کرتے تھے۔ "ایں بوئے کباب روزے مرا مسلمان خواہد کرد۔" صاحبزادے کے پاس دام تھے مگر کنجوس تھے کباب کا دھواں غنیمت سمجھ کے وہیں بیٹھ گئے اور روٹی نکالی۔ ایک نوالہ توڑا سیخ کباب پر جھکے ناک سے دھواں سڑکا اور نوالہ منہ میں رکھ لیا۔ القصہ دھوئیں سے لگا لگا کے روٹی ختم کی۔ کبابی نے جو دھوئیں کی پونجی مفت لٹتے دیکھی بہت جھلایا دود غضب کا رخ دماغ سے پار ہوا۔ لپک کے گنوار نے لونڈے کی پگڑی اتار لی اور کہا۔ "سیدھی طرح دھوئیں کے دام ڈھیلے کر دو اسی میں خیر ہے ورنہ کوفتہ بنا کے رکھ دوں گا۔ صاحبزادے منت کرنے لگے کہ بھائی تمہارا کیا نقصان ہوا آخر یہ دھواں ہوا میں مل کے اڑ ہی تو جاتا۔ کسی بندۂ خدا کا بھلا ہو گیا تو کیا برائی ہوئی۔ مگر لالچی کبابی کے ہتھے ایک بے وقوف چڑھا ہوا تھا وہ کیوں چھوڑتا۔ اتفاقاً ادھر سے حضرت بہلول دانا جنہیں پاگل مورخ دیوانہ کہتے ہیں چلے آتے تھے۔ دونوں نے بہلول کو پنچ مقرر کیا۔ طرفین کی روداد سن کے بہلول نے دہقان بچے سے کہا۔ "جب تم نے دھوئیں کے تصرف کیا ہے تو قیمت ادا کر دو۔" پنچ مقرر کرنے کے بعد حیل حجت کا محل نہ تھا۔ ناچار ہمیانی کا منہ کھولنا پڑا۔ بہلول نے روپیہ اپنے ہاتھ میں لیے اور کبابی کے کان تک لے جا کے کھنکھنانا شروع کیا۔ کھن کھن کھنانانا۔ کبابی اس جھنکار یا کھنکار سے پھولوں نہ سمایا کہ واہ "اللہ دے اور بندہ لے۔" ہاں صاحب روپیہ کی صدا ایسی ہوتی ہے لوگ بنک گھر میں جا کے سنا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مفلس فقیر کا ذکر ہے کہ وہ پہلی مرتبہ بنک میں بھیک مانگنے گیا۔ بہت سے پنشن لینے والے انگریز اعلیٰ درجہ کی وردیاں پہنے نوٹ اور نقدے کے جو وہاں سے نکلے تو اس نے چپراسی سے پوچھا۔ "کیوں جی یہ لوگ کہیں کے بادشاہ ہیں

دیکھو تو کیسی عمدہ پوشاکیں ہیں اور کتنا روپیہ ان کے پاس ہے۔" چپراسی نے جواب دیا تم بھی نرے بے وقوف ہو۔ اجی یہ سلطانی غلام (نوکر) ہیں تنخواہیں لینے آئے ہیں۔

مفلس فقیر نے آسمان کی طرف سر اُٹھایا اور کہنے لگا۔ دیکھ رے میرے مالک غلاموں کی پرورش یوں کرتے ہیں۔ اگر تجھے بندہ پروری کی گھات معلوم نہیں تو بادشاہوں سے سیکھ لے۔"

جب کانوں میں روپیہ کی گھنٹی خوب بج چکی تو بہلول نے دہقان بچے کو اس کے روپے پلٹا دیئے۔ "لو صاحبزادے اپنا مال۔ تم نے اس کے دھویں سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے تمہارے مال کی کھنکار سے دل خوش کیا۔ جیسا مال ویسی قیمت۔ ماحضر نشما بسلامت۔ نہ کباب کے دھویں سے اس کے کبابوں کو نقصان پہنچا نہ جھنکار کی آواز نے تمہارے مال میں کمی کی۔ کہو میاں کبابی۔ "دود کباب" کے دام پائے؟

میاں چہ چل! گول میز کانفرنس ہیں۔ "دودِ کباب کی قیمت" ہی کا معاملہ درپیش تھا۔ ہندوستانی دہقان زادے ملکی اُدھم سے حکام کے مقاصد کے لیے مضر ہے۔ ناخوش ہو کے لندن گئے اور وہاں کبابی کی دکان سے دھواں اٹھتے دیکھا مرکھکوں کی طرح پتلیوں کی جیبوں سے سوکھے ٹکڑے نکالے اور پیٹ بھر کے چلے آئے قیمت اس دود کباب کی کانگریس والوں سے مانگی جاتی ہے۔ کانگریس کا پولیٹیکل بہلول "زور است کہ از صدائے زر کامل العیار قیمتش مید۔" بالفعل شعر خوانی اور بیت بازی ہو رہی ہے۔

چکر گھنی کے ہندوستانی شریک سے
من بلا گردانِ ایں پالات بشم[1]   من فدائے حلقۂ چشمات[2] بشم
گر کسے می مردوی روز از برات   من بقربان ہمیں حالات بشم
بلکہ با ایں حسن روز افزونِ تو   می توانم مخلص فردات بشم
چوں بہر عضوِ تو یک خاصیت است   من فدائے جملۂ اعضات بشم

کانگریسی اہل ملک سے
صد ہزار "اما" است دریک دور تو   معتقد من کدام "اما" ت بشم
اگر مگر لیکن ۱۲
شاہ[3] پیش بازی شاہانہ ات   مات شد من چوں بخواہم مات بشم
از برائے دیدن بابا مگر   چند باید نوکر بابات بشم

تشدد پسند ہندوستانی سے
بسکہ یا الوات دیدم دلبراں   مصلحت گوید کہ من ہم لات[4] بشم

حکومت ہند اور اس کی پالیسی کہتی ہے سے
عاشقی را بیں کہ بعد از ایں ہمہ   تازہ می خواہم کہ خاطر خوات بشم

مصلحت کے غار میں بیٹھنے والی نگاہیں کہتی ہیں کہ اس بیت بازی اور غزل خوانی کا نتیجہ اور اس حکایت کا نتیجہ یکساں ہوگا:۔

کہتے ہیں کہ ایک میاں نے شادی کی۔ جورو ذری کاہل تھی جھاڑو بہار و اسے کھلتی تھی میاں نے اپنی ماں سے کہا "اماں تم جھاڑو دو دیں تمہارے ہاتھ سے یہ کہہ کر ستھرائی لے لوں گا کہ ہائیں میرے ہوتے تم زحمت اٹھاتی ہو۔ لاؤ میں جھاڑو دے دوں۔ شاید اس بہانے سے جورو بیگم اپنی فروگزاشت پر متنبہ ہو اور وہ چیت جائیں۔" اماں نے جھاڑو ہاتھ میں لی۔ صاحبزادے نے مشورے پر عمل کیا۔ دلہن بیگم تھیں چالاک انہوں نے فوراً فیصلہ چکا دیا۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ ایک روز اماں جھاڑو دیں ایک روز تم دو بس۔"

---

[1] مخفف بشوم ۱۲ [2] چشمانت کا مخفف ۱۲ [3] کانگریسی شطرنج کا میر خطاب بہ مسٹر راموزے [4] تصرف ہے "ط" "ت" سے بدل گئی مگر یہاں "لات" "مفرس" "لمہ" "یا لات" کا سمجھنا چاہیے ۱۲۔

فتنہ و عطرِ فتنہ

عقیل احمد جعفری

بے خزاں دیدۂ بہار بیا   صفحۂ از ''ریاض'' باز کشا

وہ لوگ جنہوں نے ریاضؔ کو صرف سُنا ہے دیکھا نہیں ہے ریاضؔ کی شخصیت کی جاذبیت کا راز ان کی خضر صورتی میں مضمر سمجھتے ہوں گے۔ انہوں نے کاش ریاضؔ کی وہ تصویر ہی دیکھی ہوتی جو خود ریاضؔ نے اپنے ایک شعر میں یوں کھینچی ہے ؎

"بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں!"

نو ساخت، نو طرز، نو ایجاد، سنہرے بٹن کی نظر افروز اچکن جس پہ لفظ ''ریاضؔ'' سلمے کے کام سے نمایاں طور پہ کڑھا ہوا، بڑی اور کھڑی مونچھیں کبھی بل کھائی ہوئی کبھی تنی ہوئی ایک فٹ کئی انچ جس کی توصیف میں خود کہا ہے ؎

چوٹیاں جتنی تھیں چھوٹی ہو گئیں
میری مونچھیں ان کی چوٹی ہو گئیں

یہ ہے ریاضؔ کی وہ تصویر جس پہ ایک زمانے میں ایک زمانے کی نگاہیں پڑ رہی تھیں ؎

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاضؔ پر
کس نوک کا جوان ہے کس آن بان کا

فتنہ آہ چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار جو مذاق کی شگفتگی، شستگی اور پختگی اور تخیل کی جدّت، ندرت اور نزاکت کی گویا کھینچی ہوئی روح تھا۔ ہلکے رنگ سے رنگے ہوئے اور کٹے ہوئے ورق گویا ورقِ گل، پاکیزہ خفی خط، حسین سیاسی کارٹون، دلچسپ اسکیچ، منتخب اشعار اور چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے ادبی سیاسی ظریفانہ مضامین ـــــ یہ تھا فتنہ ـــــ یہ تھا فتنہ کہ ''پیام یار'' جو

دل سے زبان پر آ گیا، جو دماغ نے قلم کے سپرد کر دیا۔ کوئی "فتنہ" کو فتنہ کہے یا قیامت مگر میں تو اسے ریاض کی رنگین زندگی کا ایک خوشنما ورق سمجھتا ہوں اور بس ؎

"فتنہ" کو پوچھتا ہے کوئی اس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا؟

وہ فصلِ گل کے سے فصلی مضامین ہر فصل و موسم کے اعتبار سے جدید اور لذیذ، وہ ہلکی ہلکی مذہبی چوٹیں، وہ رندانہ سرمستانہ کیفیتیں، وہ نثرِ شاعرانہ، وہ نظمِ ناقدانہ، وہ عنوان کی جدّت، وہ خبروں کی لطافت اور وہ زبان کی نزاکت کہ ع

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

وہ نازک خیالیاں اور لفظوں کے اُلٹ پھیر سے شاہدِ معنی کی گرفتاریاں۔

اور سُنیے "فتنہ" میں خبریں بھی ہوا کرتی تھیں مگر صرف وہ خبریں جن میں کوئی نہ کوئی ظرافت کا پہلو پیدا ہو سکتا تھا۔

حسرت موہانی اسی "فتنہ" کی نسبت "اردوئے معلیٰ" میں تحریر فرماتے ہیں:

"گورکھپور کا "فتنہ" مارچ سنہ ۸۳ء میں جاری ہوا۔ حضرت ریاضؔ کی شوخ مزاجی اور برق طبعی نے "فتنہ" نام تجویز کیا اور "کلِّ قصیرٍ فتنۃ" کی سُرخی حسبِ حال اس کا عنوان قرار پائی۔ وقت کی خوشحالی سے حکیم برہمؔ، شادؔ، شوخ نگارؔ، فطرتؔ، سحر نگارؔ وغیرہم اچھے اچھے لکھنے والے اسکے معاون تھے۔"

حضرت ریاضؔ کا یہ دعویٰ تھا کہ اس وضع اور اس رنگ ڈھنگ کا روئے زمین پر کوئی اور پرچہ موجود نہیں ہے۔ اگرچہ بعد میں ایک یورپین افسر سے جو "فتنہ" کا عاشق تھا یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک زمانے میں ایک پرچہ اسی تقطیع کا فرانس میں بھی موجود تھا مگر رنگ کے لحاظ سے "فتنہ" پھر بھی لاثانی ٹھہرا۔

ابتدا میں صرف فتنہ ہی شائع ہوتا تھا جس میں زیادہ تر نثر کے شوخ اور چلبلے مضامین ہوا کرتے تھے مگر کئی سال کے بعد اس کے ساتھ ایک حصہ نظم کا بھی نکلنے لگا جس میں اردو زبان کے تمام گلدستوں سے چوٹی کے اشعار چھانٹ کر درج کیے جاتے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے اس کا نام "عطرِ فتنہ" بہت صحیح تجویز کیا گیا اور حضرتِ ریاضؔ کا شعر ؎

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی نظرِ انتخاب کی

زیبِ عنوانِ "عطرِ فتنہ" ہونے کی وجہ سے تمام دنیائے ادب میں ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا۔ "فتنہ" کی ابتدائی جلدوں میں ایسے ایسے لطیف مضامین نکلے ہیں جن کو پڑھ کر طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے۔ ۸۷ء کا ذکر ہے کہ مدیر "صلائے عام" دہلی نے ایک خط میں ادیٹر "فتنہ" کو لکھا تھا کہ "اگر ولایت میں ایسے لکھنے والے ہوں جیسے "فتنہ" میں ہوتے ہیں تو ایک نہ ایک دن وہ سیکرٹری آف اسٹیٹ ہو کے رہیں۔"

"فتنہ" کے متعلق "سید الاحرار" کی وقیع رائے معلوم کرنے کے بعد اب آیئے "فتنہ" کی تعریف خود "فتنہ" کی زبان سے سُنیں:

"فتنہ" عالم کے اس بوٹے سے قد اور پھُندنے سے ڈیل پر کہیں فتنہ قامتوں کی نظر نہ لگ جائے۔

> ایک تو ماشاءاللہ حسنِ خداداد نوک کا جوان، اس پر خوش نما لباس، گلے میں طلائی جدول کا جڑاؤ کنٹھا، سنہرے لفظوں کا نازک نازک زیور، بین السطور چھوٹے چھوٹے پھولوں کے ہار اللہ رے نکھار، اللہ ری بہار، ہزار چمن صدقے کروں جب بھی جی نہ بھرے۔"

اس "چند تصویرِ بتاں" اور "چند حسینوں کے خطوط" والے مرقع کی کوئی کوئی تصویر کیا آپ دیکھنا پسند نہ کریں گے؟ "قہر نگار"، "شوخ نگار" اور "میاں رمضانی" ——— وہ میاں رمضانی جن کا ایک مضمون دیکھ کر میر ناصر علی چیخ اٹھے تھے:

> "اُردو اخبار دیکھنے کا اگر کوئی نتیجہ نہیں تو بھی "فتنہ" میں کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل آتی ہے کہ مدت کی محنت ٹھکانے لگ جاتی ہے۔
>
> تارک الصوم سے مخاطب ہو کر جو باتیں میاں رمضانی نے کی ہیں اُردو لٹریچر کے عمدہ سے عمدہ نمونوں میں سمجھیے۔ مجھے فرصت ہوئی تو ایسے پاکیزہ خیالات کے جمع کرنے میں بہت محنت کروں گا جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ملک کے اہلِ کمال اُردو میں کیا کیا لیاقتیں دکھا سکتے ہیں ——— قصور ہے تو زمانے کا کہ اس کے داد دینے والے بھی نہیں ملتے۔"

وغیرہ کے اچھوتے اور البیلے مضامین کے ساتھ ایک اور مضمون نگار کا نام بھی "فتنہ" کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ حضرت ریاضؔ کا اصلی کمال یہ تو ہے ہی کہ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انشا پردازی میں ایک طرزِ خاص کے بانی تھے لیکن ان کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے صرف ایک نیا طرز ہی نظم و نثر میں نہیں نکالا بلکہ اس کو ایک "اسکول" کی حیثیت دے کے چند اپنے رنگ کے لکھنے والے بھی پیدا کر دیے۔

ریاض الاخبار

اے عندلیب رنگ ہمارا اڑائیو
تقلید میں بھی تا رہے ایجاد کا مزا

"ریاض الاخبار نے اپنے طرز میں جو اعلیٰ درجے کی نمود حاصل کی ہے وہ اس لائق ہے کہ زمانے کو اس پہ ناز ہو۔ شاہد پرستانِ سخن سے اس کی قدر پوچھیے اور جو عروسِ مذاق کے نکھار پہ مٹے ہوئے ہیں ان کے دل ٹٹولیے۔ شوخیوں نے ہر چند ابھی تیز چٹکیاں نہیں لی ہیں پھر بھی ہلکے ہلکے نیلے سائے نظر آتے ہیں چٹکیوں نے ابھی چبھتا ہوا اثر نہیں ڈالا ہے پھر بھی کس مزے سے گدگدی اٹھ رہی ہے ـــــ سامان وہ فراہم ہوئے کہ طاؤسِ مینا کے رقص کے عوض اس کے ورق بھلے معلوم ہوتے ہیں ـــــ جنہیں شعر و ادب سے لگاؤ تھا وہ اس کی پرستش کرنے لگے جنہیں پولیٹکل مضامین کی چاہت تھی وہ اس پر مر مٹے۔ ناول کی شہرت کا وہ شور ہوا کہ ہنگامۂ محشر سمٹ کر سینے میں آ رہا۔

اس پرچے کی خواہش ہے کہ اپنی حالت کو اپنے حوصلے کے موافق سنبھالے۔ وہ بات پیدا کرے کہ ملک کو اس کے وجود سے فخر حاصل ہو۔"

ریاض الاخبار سنہ ۸۳ء

حسنِ سرِ رہ گزر

۱۔ زرّیں کالم ریاض الاخبار نے نادہند خریدارانِ اخبار کے خلاف بطورِ پروٹسٹ ایک یہ جدّت کی تھی کہ ایسے حضرات کے نام مدّت انتظار گزر جانے کے بعد سیاہ جدول میں بڑے بڑے حرفوں سے شائع کرتا تھا۔ اس کے برعکس خوش معاملہ مربیوں اور معطیوں کو "زرّیں کالم" میں جگہ دیتا تھا ـــــ عنوانِ بالا کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

دنیا میں وہ حضرات بھی ہیں جن کے نام خاص کالم کے نذر کئے جاتے ہیں اور کچھ التفات نہیں ہوتا ساتھ ہی بعض ایسے بھی ہیں جو اشخاص مندرجۂ خاص کالم کی تیغ تغافل کے زخموں پہ مرہم رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نام جس کالم میں درج ہوں اس کو زرّیں کالم سے تعبیر کرنا مناسب ہے ؎

کام آتی ہے حسینوں کے کمائی میری
جو مجھے دیں مرے اللہ خزانے پائیں

جو لوگ اخباری دنیا سے باعتبار دیسی مذاق کے واقف ہیں وہ زرّیں کالم کی جدّت کو بہت ہی نگاہِ قدر سے دیکھیں گے۔ ہم نے آئندہ کے لئے پسند کیا ہے کہ خاص کالم کی ترمیم سیاہ کالم سے کر دیں اور وہ سیاہ کالم زرّیں کالم کے دوش بدوش رہے کہ...... قدرے تا صلہ دارد کا مضمونِ صادق آئے۔

۲۔ ذیل کی خبر ہرگز قابلِ اعتبار نہیں

اخبار ''شحنۂ ہند'' میں ایک ''سنسنی خیز'' خبر شائع ہوئی۔ سیاس الاخبار تعلقات کی بنا پر اس خبر کو اپنے اخبار میں شائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا لیکن خبر اتنی دلچسپ تھی کہ بے شائع کئے بھی نہ بنتا تھا۔ آخر اس دلچسپ اور معنی خیز، مندرجہ بالا سُرخی کے ذیل میں وہ خبر شائع کر ہی دی:۔

''نواب بہاول پور راولپنڈی کے افغانی دربار میں حسبِ دستور گز بھر کا اونچا عمامہ اور مرصع سرپیچ باندھ کر تشریف لائے۔ لاکھوں روپے کے سونے کے زیور اور جواہر لدے ہوئے، انگریز افسر نواب صاحب کو جب امیر کے ڈیرے میں لے گیا تو نواب کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ امیر نے کہا السلام علیکم۔ جواب ندارد۔

امیر نے پوچھا۔ ''حالتِ انتظامِ مملکتِ شما چیست''ــــ جواب میں خاموش۔

امیر نے فرمایا۔ '' نواب چہ گونہ وچہ حال داری و ترا چہ شد'' ــــ وہی سکوت

الغرض امیر جھلا گئے اور بہ آوازِ بلند کہا:

''ایں بے چارہ را راہ گذارید کہ با طفلاں یا زناں بازی و ملاعبت نماید یا گوئے و چوگاں مشغول شود۔''

نواب صاحب بہ زبانِ حال شکریہ ادا کرتے ہوئے خیمے سے نکل آئے ؎

اگر نقوشِ مصوّر ہمہ ازیں جنس اند
مخواہ دیدۂ بینا خنک ترِ اعمیٰ''

۳۔ تازہ ایجاد

اسپین میں اور اس کی وجہ سے کیوبا میں بلکہ یورپ کے کل کیتھولک گرجا گھروں میں عبادت کے ساتھ بیہودگیوں کے بھی مرقع

ملتے ہیں۔ اسپین کی عورتوں میں ایک خاص کمال یہ ہے کہ وہ اپنی پنکھیوں کے ذریعے سے عام جلسوں میں اپنے دوستوں سے باتیں کر لیتی ہیں۔ — ایک صاحب حال ہی میں کیوبا گئے تھے وہ بیان کرتے ہیں — میں گرجا گیا میرے ہمراہ میرے ایک دوست بھی تھے انہوں نے مجھ کو کچھ حال پنکھیا کے ذریعے سے اظہارِ مدعا کی ترکیب کا سمجھایا۔

• وہ کہتے ہیں ہم بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک نوجوان خوش پوشاک، خوبصورت لیڈی گرجا میں آئی۔ پہلے تو اس نے کچھ عبادت کی اس کے بعد چاروں طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے کسی کو تلاش کرتی ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی پنکھیا کو پورا کھولا۔ میرے دوست نے یہ بتایا اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس نے اپنے مطلوب کو دیکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے پنکھیا کو آدھا بند کر دیا، اس کے یہ معنے ہوئے کہ آؤ مجھ سے ملو۔ پھر اس نے بند پنکھیا کے بالائی نصف حصے پر چار انگلیاں رکھیں۔ مطلب یہ کہ ساڑھے چار بجے۔ پھر یکایک اس نے پنکھیا گرا دی، اس کے معنی مجھ کو یہ بتائے گئے کہ میں اس وقت تنہا ہوں گی۔

ریاض الاخبار :- پھولوں کے رنگ سے معنی تعبیر کرنا مدت سے ہے، افسانوں میں بھی اس کا ذکر ہے، حرم سرا میں بھی۔

جہاں تک پھولوں کے رنگ سے تعبیر کرنے کا تعلق ہے۔ یہ ایجاد عربوں کی جدت طرازیوں کی یادگار معلوم ہوتی ہے اور جہاں سے بیہودگیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اسپینیوں کی بد مذاقی ہے۔

بیل کی سرگزشت

ریاض خیرآبادی

بیل بن کر کس مصیبت میں پھنسے ہم ناتواں،
سرگزشت اپنی بیاں کس سے کریں ہم جان ہار

دُودھ میں ماں کے ہوئے ہر قوم کے بھائی شریک
بھائی بن کر بھی نہ یہ سمجھے کہ ہیں ہم شیر خوار

رکھ کے بھوکا ہم کو اپنا پیٹ سب بھرتے رہے
کہہ کے ماتا دھو کے دیتے تھے اسے بھی بار بار

اس کو آتی تھی محبت منہ ہمارا دیکھ کر
چاٹتی تھی پیار سے کس طرح وہ الفت شعار

دودھ اُترے ماں کا دو منہ ہم نے مارے اس لیے
ورنہ یہ منہ تھا ہمارا دودھ کرتے زہر مار

ہم بندھے رہتے تھے تھن کے پاس ماں کے پاؤں سے
منہ کے بدلے ہاں کھلی رہتی تھی چشمِ انتظار

دُور تھا منہ سے ہمارے تھن بھی ظرفِ شیر بھی
اور ظرفِ شیر سے باہر نہ جاتی کوئی دھار

ساتھ ماں کے جب چلے منہ پر چڑھی جاتی ضرور
اب ترس آتا ہے کس کو لاکھ ہم ہوں بے قرار

آنکھ پر سب کے چڑھے جب کچھ نکالے ہاتھ پاؤں
سینگ بھی آنے نہ پائے ہو گئے نظروں میں خار

نوجوانی رنگ بھی لائی تو کس آفت کا رنگ
کیا کہیں اپنی خزاں ہم کیا کہیں اپنی بہار

ایک آفت جو تنے کو ہل میں ہم جوتے گئے   ہر طرف ہل چل گئے کیا ہو گئے وہ سبزہ زار
کھینچنا وہ ہل جو چلنے ہوں زمیں کو پھاڑ کر   گو زمیں پتھر سے بھی ہو سخت ایسے نوک دار
ایک حالت پہ گند جانے لگے دو دو پہر   ماں کے تھن کا دودھ آیا ہونٹ پر اُف رے نستار
آگیا بھاری جُوا گاڑی کا گردن پر کبھی   ہم نے گو میدان جیتے پھر سمجھے اپنی ہار
ہم نے کیسے کیسے چھکڑے کھینچے دلدل میں پھنسے   بوجھ ہم نے یوں اٹھایا جس طرح عصیاں کا بار
کھانے پینے کا نہ کوئی وقت تھا آرام تھا   ٹھوکریں کھا کھا کے گرنا اور چلنا بار بار
موسم گرما میں دن کی دھوپ کیسی سخت و تیز   موسم سرما میں شب کی اوس کیسی ناگوار
ہم اگر تھک کر کبھی بیٹھے تو منہ چلتا رہا   تھا ہماری زندگانی پر جگالی کا مدار
خون سوکھے دیکھ کر کھانے کو ایسی خشک گھاس   جس کو پی کر خون پانی ہو وہ آبِ ناگوار
جیتے جی گویا بھرا جاتا تھا بھوسا کھال میں   سوکھے ڈنٹھل بھوک کی شدت میں کرنا زہر مار
پگھلے چربی جس سے کولھو میں کھلی اس تیل کی   وہ بھی قسمت سے مہینے میں کبھی دو چار بار
دانہ بن جائیں تو بن جائیں بدن کی پھنسیاں   اس کا بدلہ بھی بھگتنا ہم کو تا روزِ شمار
آندھی آئے پانی برسے ہم کو چلنا رات دن   ساتھ دے تو اس طرح دے گردشِ لیل و نہار
ہائے وہ سوجے ہوئے پھوٹے ہوئے کاندھے کا زخم   بوجھ بھاری سخت منزل اونچی نیچی رہگزار
بے سکت، پا لنگ، لاغر ناتواں زار و نحیف   بھوکے پیاسے زخم خوردہ سینہ ریش و دلفگار
رفتہ رفتہ دے دیا طاقت نے بھی بالکل جواب   بیٹھ کر اٹھنا ہوا مشکل ہمیں انجام کار
جان بچنے کے ذریعے جس قدر تھے سب مٹے   رحم کے قابل نہیں اب بھی ہمارا حالِ زار
باندھ کر سچ ہے کھلائے کون بوڑھے بیل کو   کون پالے ہم کو اس حالت میں لے پروردگار
وقت نازک عمر آخر جان دو بھر حال غیر   سر پہ اب قصاب پہنچے لے کے چھریاں اور کٹار

بات کتنے کر دیئے ہر عضو کے ٹکڑے جدا   قیمہ قیمہ کر دیا بے دریوں سے جسم زار
ریشے ریشے پہ ہمارے دانت تھا ہر ایک کا   آدمی کیا چیل کوّے ٹوٹے ہم پہ بے شمار
حصے بخرے ہو گئے کچھ بٹ گیا کچھ لٹ گیا   گوشت اپنا تکے بوٹی ہو گیا انجام کار
کھال باقی رہ گئی تھی اس کے نقارے منڈھے   شامتِ اعمال سے پڑتی ہے اب اس پر بھی مار
ایک ناکردہ گنہ کا حال یہ ہے اے ریاضؔ   وہ بھی اک بے عقل بے بس بے زباں بے اختیار

دیکھئے ہوتا ہے کیا ہم سے گنہ گاروں کا حشر
دیکھئے پاتے ہیں کیا پاداش ہم سے زشت کار

چٹکیاں اور گدگدیاں

ریاض خیرآبادی

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاضؔ
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

ہماری اس آرزو میں ہمارے سید احمد خاں بہادر بھی شریک ہیں شاید اوپر کے دل سے۔ اخبار والوں نے کعبہ پہنچا دینے کا کوئی دقیقہ ہی نہیں رکھا تھا ع

وہ تو کہتے بچ گئے فصلِ بہار آنیکو تھی

کسی نہ کسی طرح جھوٹ سچ بول کر بیچارے سید نے اپنا دامن چھڑایا۔

ہمارے بُرے بھلے سید کو لوگ یہیں پڑا رہنے دیں تو بہتر ہے اور اس بُرے وقت میں بہتیرے کام اس سے نکلتے رہتے ہیں ہمیں تو معتقدین سید سے سید ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ ہزار چھیڑ چھاڑ پر اس سے نہ ہو سکا کہ عزم حج کی خبر مشتہر ہونے پر اپنی زبان سے تردید کر سکتے۔ کہا تو یہی کہا عزم مصمم ہے جب خدا لیجائے ـــــ مگر معتقدین کے تو آگ ہی لگ گئی۔ ایک نئے بگڑے ہوئے میاں رمضانی ہیں۔ کئی فاقوں میں آپ نے ایک مضمون چست کیا مگر واہی واطواف بیت اللہ کے نام پہ آپ اس طرح جامہ سے باہر ہوئے گویا شیطان نے انگلی دکھادی۔ ان کو جب حج کی ضرورت ہوگی تو علیگڑھ سوجھیگا ؎

کسی کا دل پاک ہے سنگِ اسود
بڑھو کہہ کے لبیک یا سید احمد

ہمارے نزدیک اخبار والوں نے غلطی کی جو یہ لکھا۔ الفاظ میں تغیر و تبدل ہوتا تو اچھے رہتے انہیں لکھنا چاہیئے تھا کہ سید صاحب خدا کے گھر جانے والے ہیں۔ اس صورت میں کوئی تردید نہ کرتا۔

دیر سے کعبہ کو ڈرتے ہوئے ہم جاتے ہیں
دیکھ لیتا ہے جو کوئی وہیں تھم جاتے ہیں

سید صاحب کے ایک عقیدت مند کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب حج کو نہ جائیں گے۔ ان عقیدت مند کا نام محمد رمضان ہے

جو سیکرٹریٹ گورنمنٹ پنجاب میں ہیں۔

ان کو اور سید صاحب کو یوں سمجھئے کہ ایک ہی خاک کے چند ذرے ہیں جو سمٹ کر دو قالبوں میں کم و بیش جا بسے ہیں۔

عقیدت مند صاحب پہلے اڈیٹر رفاہ مرسے بھڑتے ہیں اور وہ تیرہ خیال جو دردِ دل کی طرح دماغ میں گھٹے ہوئے تھے کچھ ظاہر کئے ہیں سیّد صاحب کے عزم حج کے متعلق آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

"وہ اس قابل نہیں جو مکہ معظمہ کے مصائب اٹھا سکیں۔ انہیں دس پانچ قدم چلنا مشکل ہے۔ چہ جائیکہ بیت اللہ۔ اونٹ کی سواری اور بیت اللہ کے گرد ننگ دھڑنگ برہنہ سر طواف کرنا بہت دشوار ہے۔"

اونٹ کی سواری گویا گدھے کی سواری سے گری ہوئی ہے۔ سچ ہے ماں کے پیٹ سے جو کوٹ پتلون پہنے نکلے ہوں ان کو ننگ دھڑنگ ہونا یا تہمد باندھنا کیوں نہ دشوار ہو۔

صاحب کشف الاخبار نے براہِ راست سید صاحب سے دریافت کیا تھا۔ جواب ملا:

اس فریضہ اعلیٰ کے ادا کرنے کا مثل اور مسلمانوں کے میرا بھی مصمم ارادہ ہے لیکن بعد عید الفطر غلط۔ اخباروں کی نیک فال کا شکر گزار ہوں۔

مبارک بود فال مہ رخ زدن
نہ مہ رخ زدن بلکہ شہ رخ زدن

ہماری خاک تھی کیا فتنہ انگیز
بنے سات آسماں دو گز زمیں کے

ہمارے سر سید کو عاقبت کی فکر ہو یا نہ ہو اپنے گور گڑھے کی بھی فکر ہے؟ اگر نہیں ہے تو ہم ان کو مرد آخر بیں نہ تسلیم کریں گے اور اگر ہے تو ہمیں بتائیں انہوں نے اب تک کیا کیا۔

ہم ان کے خیر اندیش ہیں۔ چاہتے ہیں جس طرح مدرسۃ العلوم کی بابت ان کی محنت ٹھکانے لگی مٹی بھی ٹھکانے لگے۔ بے وقوف ایسے الفاظ کو فال بد سمجھیں۔ ہم ایسوں کا جواب دینا نہیں چاہتے۔ گور گڑھے کی فکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدانخواستہ سر سید کوچ کا قصد کریں یا ہماری طرف سے تقاضہ سمجھیں خدا ان کی عمر میں اس قدر برکت عطا فرمائے جتنی اپنے فرشتۂ خاص کی عمر میں برکت عطا فرما چکا ہے۔

یہ ہماری محض خیر اندیشی ہے کہ جو بات ان کو نہیں سوجھتی وہ ہم سمجھائے دیتے ہیں۔ ہم نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے کہ صرف اپنی مٹی برباد ہونے ہی کی فکر نہیں کرتے بلکہ مرنے سے پہلے اپنے دائمی رہنے کی جگہ پسند کرتے ہیں۔ کبھی باغ میں۔ کبھی کسی بزرگ کے پائیں مزار کبھی گھر ہی میں۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے جانشین نامزد کرتے ہیں۔ یہ تو سر سید بھی کر چکے۔ باقی ہے تو وہی بات جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں

یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ علیگڑھ کی سرزمین نے ان کے لئے بے طرح کشش دکھائی ہے ورنہ لندن جا کر ان کا واپس آنا یعنی جیتے جی اس نے ان کو بزور کھینچا۔ خدا ناخواستہ مرنے پر واگذاشت کی کیوں ٹھہرائے گی مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ علیگڑھ میں کس جگہ کی زمین —— یہ کچھ ہم لوگ تو ہیں نہیں جن کے لئے کہنا پڑے۔

ہم بیکسوں کی لاش کو ملتی نہیں جگہ
حسرت پکارتی ہے کہ مٹی کہاں کی ہے

ان کی مبارک لاش کے لئے تو ہر طرف سے زمین دوڑے گی خصوصاً جب پہلے سے تصفیہ نہ ہوا ہوگا۔ مرنے پر اس کش مکش کو اٹھا رکھنا عقل انجام بین کے خلاف ہے۔ یہ بات سمجھا تو ہم نے دی اب سوچ کر اس کا تصفیہ کرنا سرسید کا کام ہے جن کو ابھی تک اس کی خبر نہیں ؎

کعبہ کی ہے ہوس کبھی کوئے بتاں کی ہے
مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے

قرین قیاس تو یہی ہے گو ان کی کوٹھی نے اپنی کشش ان کے لئے اچھی طرح ثابت کی ہے اور جہاں انسان شب کو رہتا ہے وہیں نیند بھی خوب آتی ہے مگر یقیناً وہ اسے پسند نہ کریں گے۔ یہ حضرت والہ و شیدائے مدرسۃ العلوم ہیں جب پسند کریں گے تو مدرسۃ العلوم کی زمین کو۔

اس سے ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مقبرہ کے لئے بہت کچھ عمارت متعلقہ مقبرہ کی ضرورت نہ پڑے گی۔ کسی کمرہ میں اگر زمین دوز قبر پسند کر لی تو مقبرہ کی چار دیواری اور گنبد کا بھی جھگڑا گیا۔ اور اگر علیحدہ جگہ لی تو مقبرہ کی عمارت سے مدرسۃ العلوم کی نمود اور بھی بڑھ جائے گی۔

خیر وہ بیرونی زمین کو پسند کریں یا اندرونی زمین کو چھوٹے سے احاطہ میں بیرونی سرونما کچھ مٹی کا نشان نظر آئے یا زمین دوز قبر پر سبزہ لہرائے یہ ہوگا جب ہی کہ جب پہلے سے تجویز ہوا اور یہ تجویز بھی کسی قانون کی دفعہ سے متعلق کر دی جائے تاکہ اسی اکھاڑے کے پکیتی پہلوان مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو وقت پر اڑنگا لگانے کا موقع نہ ملے۔

اس وقت باغ کی ہوا موافق ہے۔ کثرت رائے سے جو کچھ کرنا ہو کر لیا جائے وہ جانشین کے اکھاڑ دینے کو تو چھوڑئے نہیں بعد کو گڑے مردے اکھاڑنے کے لئے بھی دریغ نہ کریں گے مانیں کب تاب آئے گی کہ مرنے کے بعد سرسید مدرسۃ العلوم کی زمیں پہ دائمی قبضہ کریں۔ لائف سکرٹری ہونے کے لئے تو موت نے وقت محدود کر دیا تھا اس کے لئے تو باعتقاد سرسید قیامت بھی نہیں۔

ریشِ مومن

لکھنؤ میں کسی تقریب سرکاری کے ذریعہ سے کچھ والیانِ ملک بھی آئے تھے۔ داروغہ عباس علی مرحوم انجنیئر و یکتائے فن فوٹوگرافر کے دولت خانہ پر جس کا اب نشان تک نہیں ہے چند مقتدر نوابین و رؤسائے شہر تشریف فرما تھے۔ منشی نولکشور آنجہانی بھی موجود تھے اور میں بھی — کہ ایک رئیس با اختیار معہ مختصر اسٹاف کے مرغِ زریں بنے آتے نظر آئے۔ اطلاع کے ساتھ ہی سب حضرات تعظیماً استقبال کے لیے بہ عجلت بڑھے۔ دیکھا کہ ریش دونوں جانب پائے پر چڑھی ہوئی۔ شکل مشین۔ چہرہ غضب ناک۔ نہ سلام میں خود سبقت کی نہ سلام کا جواب دیا۔ زبان پر لکھنؤ کا نام اور صدہا صلواتیں لعنت و پھٹکار کی بار بار تکرار۔ اس طرح مقام نشست تک تشریف لائے اور باوصف تلخ گوئی اعزاز کے ساتھ بٹھائے گئے۔ مگر گفتار و کردار و لہجہ میں فرق نہ آیا۔ مزاج پرسی کی جرأت کون کر سکتا تھا۔ وہ البتہ سخنہائے درشت ارزانِ فرمائے جاتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب زبان تالو سے لگی تو ایک سن رسیدہ گرم و دیدہ نواب صاحب نے بہ ادب عرض کیا کہ لکھنؤ سے برافروختگی کا سبب معلوم ہو تو ہم بھی ہمنوا ہونے کی جرأت کریں۔ فرمایا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اسلامی شہر مگر جسے دیکھئے داڑھی صاف۔ مسلمان و غیر مسلمان میں امتیاز نہیں۔ نہ مصافحہ و معانقہ نہ سلام علیک کا۔ ساتھ ہی پھر لعنت کی تکرار — سلسلہ ٹوٹنے پر مُسن نواب صاحب نے عرض کیا برافروختگی کا سبب تو معلوم ہو گیا مگر حضور نے اس کی علت دریافت نہ فرمائی۔ بہ ادب عرض کرتا ہوں سنئے۔ غدر سے پہلے میں بھی اور سب مسلمانانِ لکھنؤ بھی ریش کے ساتھ رکھ دکھاؤ میں آپ ہی کے مقلد تھے۔ ایک روز میں خط بنوا رہا تھا۔ آئینے پر نظر تھی۔ اطلاع پہ اطلاع مسجدوں اور امام باڑوں کے منہدم کئے جانے کی آ رہی تھی۔ دفعتاً معلوم ہوا کہ نواب آصف الدولہ کا مشہور امام باڑہ اور اس کی وسیع اور حسین مسجد گھوڑوں کا اصطبل بنا دی گئی۔ نہ روک تھام کی قوت تھی نہ انتقام کی۔ میں نے مشتعل ہو کر خاص تراش سے کہا کہ ریش رکھ کر مسلمان صورت رہوں اور یہ خبر سنوں، تو اُسے صاف کر دے ؎

وضع رندانہ رہے ریش رہے صاف ریاضؔ
خوف کی چیز ہے اس وقت مسلماں ہونا

فتنہ اور عطرِ فتنہ کے مضمون نگار

(۱)

ہم کوئے بتاں میں تھے ماہِ رمضاں آیا
صد شکر کہ مستی میں سمجھے نہ کہاں آیا

ہم وہ طریقے بتائیں گے کہ روزہ تو ہو مگر معلوم نہ ہو۔

سُنیے! راتیں ہیں تو گرمیوں کی بس اک ذرا ہوا سنک رہی ہو پھر کیا کہنا۔ کھلے ہوئے صحن میں اُجلا فرش اور اس سے لطیف چھٹکی ہوئی چاندنی، جھکا ہوا آسمان اور ابھی اُبھرا ہوا چاند، پھیکے پھیکے ابر کے ٹکڑوں کی دوڑ دھوپ کسی شمار قطار میں نہیں۔

فرش ہو، فرش پر گاؤ تکیے اِدھر اُدھر دس پانچ کرسیاں، دو ایک کوچ، چھوٹا سا چمن زار اور اس میں ہرے بھرے شجرِ گل بس اتنے کہ ہوا کی ہلکی سنک بھی بوئے گل کو لے اُڑے۔

یہ بھی تکلف میں داخل ہو تو ہرا ابھرا سبزہ وہ بھی نہ ہو تو ہری بھری دوب، اس کے نمو کے لیے تو وضو کا پانی بھی بہت ہے۔ نہ کہ جب توجہ ہو تو رست پھیل کر جگہ لے سکتی ہے۔

یہ سامان بھی نہ ہو تو جھاڑ دار درختوں کی ہلتی جلتی شاخیں اپنے نازک ہاتھوں سے ہوا کی موجوں کو پینگ دے رہی ہوں اتنے میں بھی روزہ وصول ہے۔

دس پانچ احباب ہوں، کوئی فرش پر تکیے کے سہارے کوئی کوچ پر کوئی کرسی پر، لوٹے سے تدوالوں کی طرح صراحیوں کی قطار ہو ان پہ کاغذی آبخورے اور یہ سب اس سوندھی مٹی کے جس سے ہم پاپ ساوضع رندوں کا خمیر ہوا ہے۔ ہوا پانی کو ہم سے زیادہ سرد کر رہی ہو۔ ہار پھول، عطر، پان، پیچوان، مشک، کل بقول امیرؔ ؎

ساقیا پھول سے کیا کام کلی پیتے ہیں

دو گھونٹ پانی پی کر گلوری منہ میں دبائے دو چار کش کھینچ کر ابرِ بہار بن جانے والے دھوئیں کو آسمان کی طرف لہرا دیا۔ رنگِ صحبت ہے۔ کہ جما ہوا ہے، پھر اس طرح کہ گنبدِ مسجد سے نکل کر تراویح خواں بھی اسی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں۔ مختلف ذکر اذکار ہنسی قہقہے، بے تکلف صحبت، کسی نے زانو بدلا، کسی نے کروٹ۔ ہوا کی سنک خوابِ نوشیں لائی بھی تو ؎

مردمِ دیدہ یہ چلّائے کہ باہر باہر

کسی دوست نے زانو تھپک دیا کہ نیند کافور۔

ماہِ مبارک کی راتیں وہ پاک صحبت نہ چوڑیوں کی کھنکار نہ چھڑوں کی جھنکار، نہ چھم چھم، نہ چھن چھن، خدا کی یاد نہیں تو خدا کو بھولے بھی نہیں تھی منی رات باتوں میں کٹی یا آنکھوں میں، تہجد و فجر سجدے میں جھکے تو بھی شبِ قدر نہ جھکے تو بھی شبِ قدر۔ نور کی راتیں نور کے

گلے، چار چھ گھڑی رات ہی سے "سحر" کی ٹھیرادی، کچھ دیر یہ مشغلہ رہا، اس سے فراغت پائی کہ تلاوت و نمازِ فجر کی طرف جھکے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے آٹھ نو بجے دن تک اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر جو سونے کی ٹھہرائی تو پھر کون کروٹ لیتا ہے۔ آبِ وضو کے چھینٹوں سے ظہر کے وقت آنکھ کھلی بھی تو چند منٹ کے لیے، نفل کے سجدوں کے ساتھ پھر رخصت ہوئے۔ پانچ پہر کے جاگے ہوئے۔ کیسی دھوپ کیسی گرمی، کیسی بھوک، کیسی پیاس۔ نیند تو سولی پر آتی ہے۔ غرض کہ خوب سوئے اور جی بھر کے سوئے، اُٹھے تو دو چار گھڑی دن رہے۔ نہائے دھوئے، وضو کیا، نماز پڑھی، گل گشت کی، چمن زاروں میں ٹھہرادی۔ ادھر کا دن ہی کتنا، اللہ اکبر کے ساتھ افطار اور افطار کے ساتھ ادائے فرض ——— پھر وہی رنگِ صحبت، کھانے پینے کا لطف، حقے پان کے مزے ؎

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا

یونہی ٹھنڈی ٹھنڈی راتوں کو خوابِ غفلت میں ضائع کرنا ہمارے مشرب میں گناہ ہے نہ کہ رمضان المبارک میں۔ جن کو ٹھنڈی رات کی قدر نہیں وہی دن کو بدنام کنندۂ صوم ہیں۔ روزے ہیں اور دھوپ، گرمی، بھوک، پیاس کی شکایت کے دفتر کھلے ہوئے ہیں۔ اے توبہ! یہ بھی کوئی روزے ہیں، دن رات محوِ عبادت نہ رہے لیکن اس شکایت سے تو بچیے۔ راقم ؎

مفتی یہ کہے لاکھ کہ روزہ نہیں جاتا
میں بھول کے بھی پی نہیں سکتا رمضان میں

"رمضانی" از بجنور

۲۔ ہمارا خواب اور جلسۂ کانگرس

سونی سنسان کوٹھی ہے، پھولوں کی بھینی بھینی بُو کسی کافر کی چوٹی کی یاد دلا رہی ہے۔ شمع کی سنہری لَو پر پتنگوں کا جھرمٹ ہے کلیجے میں ٹیس زیادہ ہے، دل میں پھڑک ہے، آنکھوں میں ببول کا جنگل اُگا ہے، دروازے پر ٹکٹکی بندھی ہے۔ ہارمونیم چھیڑ رہا ہوں، کسی کی یاد میں لب پر یہ ترانہ ہے ؎

تم وہ ہو کہ سو بار اگر حشر بپا ہو   وعدہ نہ وفا ہو نہ وفا ہو نہ وفا ہو
ہم بند کیے آنکھ تصور میں پڑے ہیں   ایسے میں جو چھم سے کوئی آجائے تو کیا ہو
ہے شام میں بھی صبحِ شبِ وصل کا عالم   قرباں ان آنکھوں کے جن آنکھوں میں حیا ہو
کیا جام دیا ہے مجھے کیا جام دیا ہے   ساقی کا بھلا ہو مرے ساقی کا بھلا ہو
گزری ہوئی ہم یاد دلاتے ہوں کسی کو   منہ پھیرے ہوئے کوئی ہمیں کوس رہا ہو
کیا چیز ہیں یارب یہ حسینانِ جہاں بھی   ان پہ جو کوئی جان دے عمر اس کی سوا ہو
لاکھوں ہی جوانوں میں ریاضؔ ایک جواں ہے
کم بخت حسینو! اسے چاہو اسے چاہو

مسہری، گجرے اور پھولوں سے لدی ہے، ابھی تک کسی کے چھم چھم، چھن چھن کی آواز کانوں میں نہیں آئی، طبیعت زیادہ گھبرائی کے لیٹ رہا، نیند کا جھونکا زلفِ محبوب کی لپٹ بن کر آیا اور پلک جھپک گئی۔

رخسارِ گل گوں، مے دو آتشہ، لبِ سُرخ بادہ یاقوت، بتیسی موتیوں کی لڑی، آنکھیں چڑھی ہوئی نشۂ جوانی میں چور، گدرایا ہوا جوبن، پائنچے ہاتھ پر ڈالے، اٹکھیلیوں کے ساتھ کوئی آتا نظر آیا۔ سُننے والوں کے لئے ؎

ناگاہ ز در در آمدِ جاناں ندیدہ

کیا کہوں، کس طرح کرسی پہ لا بٹھایا اور سارمونیم چھیڑ کر خوب ہی لبھایا۔ ابھی ؎

لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا

ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک خادمہ کولھا پھڑکاتی آ پہنچی۔ چلیے بیگم صاحب چلیے! سب ہمجولیاں آگئی ہیں اب جلسے کا وقت ہے۔ وہ آفتابِ محشر میرا ہاتھ پکڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دو قدم پر ایک عمدہ کمرہ آراستہ دیکھا۔ کرسیوں پر تھوڑی تھوڑی عمر کی حسین گل پوش لیڈیاں بیٹھی ہیں۔ اس جانب کو بھی سب نے ہاتھوں ہاتھ کرسی پر جگہ دی۔ سب کے چہروں سے تعلیم کا اثر پیدا تھا۔ نستعلیق چال ڈھال، پاکیزہ خیالات، ایک مہذب اور متین لیڈی جو سب سے عمر میں اُتری ہوئی تھی پائنچے چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی "میری پیاری بہنو! میں چاہتی ہوں کہ آج کانگرس کی مخالفت میں کچھ دیر باتیں ہوں۔" دو ایک کافر وشوں نے تائید کی، کہا "ضرور ضرور، اخباروں میں اس کال موہنی کی بہت پکار ہے۔" تائید کے ساتھ کارروائی شروع ہوئی۔

دھانی دوپٹے والی بیگم:۔ میری آنکھ کی روشنی، کلیجے کا سُکھ، دل کی مُراد، سب بہنو! میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ بنگالی کوّے موئے کیا کرتے والے ہیں۔ ہماری جیتی ماں ملکہ (وکٹوریہ) کے آگے ہم کو خوار کرنے والے ہیں۔ وہ باتیں چاہتے ہیں کہ گدھوں کو مُن کر تب آئے لو چھو ہمارے لیے یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہم جنس کی سلطنت ہے ـــــ (قہقہہ)

اطلسی پاجامے والی بیگم:۔ میرا خیال بھی آپ ہی سے ملتا جلتا ہے اگر انگریز ہندوستانیوں کو ہتھیار دے دیں تو دن رات لہو لہان ہونے کی نوبت پہنچے۔ یہ نگوڑے مردوے ایسے کلیجے کے ہوتے ہیں کہ خون خرابا کرتے دیر نہیں لگتی۔ ہماری غریب بہنوں پر روز (اللہ بچائے) تلوار اٹھایا کریں گے۔ پھر لڑکوں کے گھر میں ایسے جو کھم کا رہنا کیا۔ دو بار چڑیا سی جان پھُرّ سے نکل جائے نا بابا نا!

بڑی موباف والی بیگم:۔ میری پیاری بہنو! اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ کالے کوّے امتحانِ مقابلہ جھینک جھنکا کر پاس بھی کر لیں تو ہمارے بیٹر اور مرغ لڑانے والے مردوے کیونکر ان سے بازی لے جائیں گے۔ اس وقت بنگالنیں کولھا پھڑکا پھڑکا کر ہم کو نام رکھیں گی اور ہم سر نہ اٹھا سکیں گے اس لیے میں کبھی نہ کہوں گی کہ امتحانِ مقابلہ ہوا کرے۔ اس میں چاہے کیسا ہی ہندوستانیوں کا نقصان ہو۔ ہماری آنکھوں پر ایسے پردے پڑے ہیں کہ یہ ذلت سہیں۔ اللہ فائدہ بھی کتنا بگلا مارے پکھا ہاتھ، چار پاس ہوگئے۔ بڑے بڑے عہدے پاگئے تو جھاڑو پھرے ملک کو کیا سرسبزی ہوئی۔ یہ ملک میں کیا مُن برسا دیں گے، ان کے شگون کے لیے سارا ملک کیوں اپنی ناک کٹواتے بیٹھے۔ اتنی سی بات کے لیے ہم اپنی ولایتی بہنوں سے دشمنی ٹھانیں۔

ہماری پیزار کی نوک کو کیا پڑی ہے۔

افشاں جبیں بیگم:۔ تاروں بھری رات ہے، گود بھری ہوں صاف جی سے کہتی ہوں کہ ٹکس دنیا گول ہے کیونکہ سوات ہو جاتا ہے اس روپے سے جو پتنگ میں اُڑے جیسے چوک کی کسبیاں لے جائیں نگوڑی گھر کا ستیاناس کر دیں، وہ اچھا یا سرکار کا بھلا ہو وہ اچھا۔ خدا کی مار ان مردوں پر جو ہماری سرکار کو روپے دیتے جلیں۔

بسنتی پوشاک والی بیگم:۔ سُنو میری چہیتی بہنو! اس میں شک نہیں کہ یہ بنگالی سرکار سے ہم کو زرد رُو کرانے والے ہیں جو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں، ان کی آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے۔ اب رات زیادہ گئی، آئندہ تاریخ بڑے جلسے کے لیے مقرر ہو۔ یہ سُنتے ہی میں نے چاہا کہ دو ایک سے کچھ باتیں کروں کہ ایک نے سینے کا دھکا دیا۔ آنکھ کھل گئی۔

راقم: رات کا خواب الٰہی توبہ
(حکیم برہم مرحوم)

۲۔ مرزا مُفلس“

اُٹھے، ٹہلے، چلے، پھرے، داڑھی میں خضاب کیا، بالوں میں تیل ڈال کنگھی کی۔ کپڑے بدلے، تسبیح زمرّد ہاتھ میں لی یا اللہ یا خدا کی حرکات صوتِ لب سے جاری مگر دل و زبان دونوں ناواقف، عطر ملا ”چار باغ“، رومال کندھے پر ڈالا، زیتون کی چھڑی بطور تبرک ہاتھ میں لی۔ پہلے پہنچے حکیم برہم کے دواخانے میں۔ شیشی اور پڑیا جیب میں رکھ کر خیالِ خوشی میں مسرور پہنچے کہاں سرائے پختہ میں اور منگوائی وہاں ہرمز جی کمپنی کے یہاں سے ولایتی، اس کے بعد عاقبت بہ خیر!

نظم

اب ہند میں کیا رہا ہے بھائی — فریاد ہے ہندوؤ دہائی
”مصری“ اس باغ کے تھے اک گُل — شاگرد تھے ہند کے جزو کُل

اک پھول اسی چراغ کے تھے — اک لوند اسی ایاغ کے تھے

سقراط سے لے کے تا بہ لقمان — طفلِ مکتب تھے اہلِ یونان

آگے اس کے زمیں سے تا بہ مہ — سب کرتے تھے زانوئے ادب تہ

کنتیائی کے بھی خدا تھے ہندی — اس کشتی کے ناخدا تھے ہندی

رامائن میں دکھائے وہ ڈھنگ — ہومر کا بھی جم سکا نہ کچھ رنگ!

رنگت ملٹن کی بھی ہے پھیکی — سبحان اللہ ـــ والمکی

کالی داس آہ خدائے بینش — سرمایۂ نازِ آفرینش

مشہورِ جہاں کتاب اس کی — مقبولِ زماں کتاب اس کی

بھنڈے بیکن کے بھی گرہ لے تھے   یونانی جیب میں پڑے تھے
تشریح کے بادشاہ تھے ہندی   تشخیص کے بھی خدا تھے ہندی
دعویٰ جس کو ہو جان مل کا   دیکھے وہ فلسفہ "کپل" کا
وہ علم وہ نفس اب ڈبویا
جو کچھ سیکھا تھا سب وہ کھویا

اس نظم پر "فتنہ" کا نوٹ بھی قابلِ دید ہے:۔

" نظم کیا ہے ایک تصویر ہے "دلی جذبات" کی۔ ہمارے دوست کو گران فضول باتوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی مگر کبھی کبھی حبِ وطن کے جوش کا بھی "جوار بھاٹا" آجاتا ہے۔ اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرشار ہندوستان کی قدیم تاریخ کے بھی ماہر ہیں اور تمام دنیا کے ابتدائی حالات بھی ان پر آئینہ ہیں۔

" پدرم سلطان بود" کی مثالیں بھی اس نظم سے ملتی ہیں افسوس ہے "سپوت" کچھ نہ کر سکے۔ اس کا مرثیہ جہاں تک پڑھا جائے کم ہے۔"

۴۔ ایک نئے انداز کی غزل

باغِ عالم کی روش پر جلوہ گر ہیں گُل کے گُل   جان کر خونِ لبِ طرے پی رہے ہیں مل کے مُل
رشک کے قلزم میں کیا شے ہے صراطِ مستقیم   نالۂ شب گیر عاشق توڑ دیں گے پل کے پُل
سخت مشکل جان بچنی ہے بُتِ سفاک سے   قتل پر عشاق کے چتون گئی قاتل کی تُل
باغ ہے صحنِ چمن ہے، شیشہ و ساقی و جام   جی میں آتا ہے پئیں اے جان تجھ سے مل کے مُل
دشمنوں کی بات پر ہرگز نہ جا تو اے نثار
رستم و سہراب کے مرقد سے سُن عاجل کے جُل

بے نام مضمون نگار

۱۔ چانڈو خانے کی گپ

ایک افیونی :۔ بڑا آیا تھا وہاں سے' ہمارے پٹھے سے لڑنے ۔ کیا مارا ہے۔

دوسرا :۔ یہ روسیہ بڑا حرام زادہ ہے۔ اسکو پانی پت کے میدان میں بھی کوئی بیس تیس برس ہوئے وگلے والی پلٹن نے خوب پٹیا تھا۔

تیسرا :۔ اخاہ یہ وہی ذات شریف ہے جو بڑے بڑے جہاز دے کر کابل قندھار پر آئے تھے اور ہمارے لاٹ صاحب نے سب جہاز چھین لیے تھے۔

چوتھا :۔ مگر آج ہم نے میلے میں پنیر (پانیر) کا بچہ دیکھا تھا اس میں لکھا تھا کہ روسیہ کے بہت سے جہاز آرتھر پورتو (آرتھر پورٹ) پر پڑے ہوئے ہیں۔

پانچواں :۔ پانیر کا بچہ کیا وہی ارے میاں وہی ''صلح کل'' گورکھپور والا۔

پہلا :۔ اچھا تو کیا وہاں کوئی بڑا بھاری دریا ہے؟

دوسرا :۔ آرتھر پور وہی نا جس پر نواب شجاع الدولہ نے ایک بڑی بھاری مسجد بنائی تھی۔

راقم ''افیونی!''

۲۔ ایسے بھی ہوتے ہیں

قرض دار ہیں لیکن چہرے پر شکن نہیں۔ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ کتنوں کی جمع مارے بیٹھے ہیں مگر خرچ سب اُجلے ہیں۔ نقد آمدنی خربوزے، آم، گوشت، شراب اور آرائشی چیزوں کے لئے وقف ہے۔ دھوبی بھنگی وغیرہ کی تنخواہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ بزاز بنئے کا حساب الگ ہے۔ اخبار بھی آتا ہے کئی سال کی قیمت باقی ہے آئندہ طاعون کے منتظر ہیں۔ لیتا مرے کہ دیتا۔

۳۔ الف، لام

عربی لٹریچر میں الف لام کی بڑی وقعت تھی مگر ہندوستان میں اسکی درگت ہوئی۔ جب تک مولوی شبلی کا تعرف رہا قاعدے کی پابندی رہی۔ پنجاب میں اصلاح دی گئی۔ اب میں نے نیا قاعدہ ایجاد کیا ہے۔ میرے قاعدے کے موافق الف، لام آخر میں آیا کرے گا۔ مثلاً چند الفاظ پیش کرتا ہوں :۔ بھوپال، بنگال، گڑھوال، نینی تال، جنجال، بھونچال، بال، وبال، ابال، لال، گلال، قال، حال حلال

ننھیال، ددھیال، سُسرال، سال، دلّال، خسرجال۔

راقم : یکے از ال موڑہ

۴۔ بیکاری کے مشغلے

چھتری کھولی اور پھر بند کر کے رکھ دی۔ کتابیں اِدھر سے اُدھر کر دیں، کاغذ پنسل لیا، دو چار شعر لکھ ڈالے۔ قیچ پیدٹ آرتھر پر طباعیاں کرنے لگے۔ کسی راہرو پر ایک آدھ پھبتی چُست کر دی، میز اٹھوا کر کمرے سے برآمدے میں رکھوا دی، پھول کے گملوں کی ترتیب بدل دی، سرا میں گشت کر آئے۔ کسی دوست سے ملنے چلے گئے۔ اگلا پچھلا حساب دیکھ ڈالا۔ کسی اخبار کا نمونہ طلب کر لیا، زبان اردو پہ بحث کرنے لگے، پتلون رفو کرنے کو بھیج دیا، آدمی سے بازار کا نرخ دریافت کرا منگایا، شاہدانِ بازاری میں فرق و امتیاز کرنے لگے، آئینے کر مونچھ کے سفید بال چننے لگے، دو پیگ اڑا کر تر دماغ ہو گئے، دوسروں کے جھگڑے میں میر فیصل بن گئے۔ لیٹے، اٹھے بیٹھے، اور پھر سو گئے۔

۵۔ دیوتاؤں کا استھان

کہا جاتا تھا لہاسہ میں طلسم نظر آتا ہے۔ مکان نور کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ استرکاری اور پلاستر موتیوں کے چونے سے کیا گیا ہے۔ یاقوت، نیلم، پکھراج، ہیرے، لعل، زمرد، فیروزے دیواروں پہ جڑے ہیں عجیب پچی کاری ہے۔ جنت کا مکان اگر دنیا میں دیکھنا ہو تو لہاسہ میں جا کر لامائے اعظم کا محل دیکھ لو۔ محل کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ دودھ اور شہد کی وہ افراط ہے کہ کتّے اکتّے بھی نہیں پوچھتے مگر جب کرنل ینگ ہسبینڈ اور جنرل مکڈانلڈ پہنچے تو کھانا بھی نصیب نہیں ہوا۔ بڑی خوشامد درآمد کی منتوں نے ایک نہیں سُنی۔ آخر جنرل مکڈانلڈ کا فوجی فرمان دریا جوش میں آیا تو ایک مہنت صاحب کچھ پیسا دے کر حاضر ہوئے جو غیر کافی سمجھا گیا۔ دیوتاؤں کے شہر میں کھانا پانی نہ ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ دیوتاؤں کو کھانے پانی سے کیا واسطہ، سنا ہے سرکار وہاں کی کوئی چیز نہ چھوئے گی نہ کسی چیز پر دوامی قبضہ کرے گی، جیسی گئی تھی ویسی ہی واپس آئے گی۔ فوج کی ورزش مقصود تھی وہ ہو گئی اور لارڈ کرزن فاتحِ تبت بن گئے۔

راقم : سونے کا ورق

۶۔ رشتے داریوں کا ایک حرف

مہربانی کر کے کوئی صاحب اس کا جواب دے سکتے ہوں تو حل کریں کہ مندرجہ ذیل رشتے داریوں میں حروفِ ابجد کا حرف بَ پہلے کیوں آتا ہے مثلاً باپ، بابا، بھائی، بیٹا، بھانجا، بھتیجا، بہن، بہنوئی، بہو، بھاوج، بیوی ——— اور چچا، چچی، خالہ، خالو، ماموں، ممانی، پھوپھا، پھوپھی اس سے کیوں علیحدہ رکھے گئے؟

راقم :۔ واہ بے

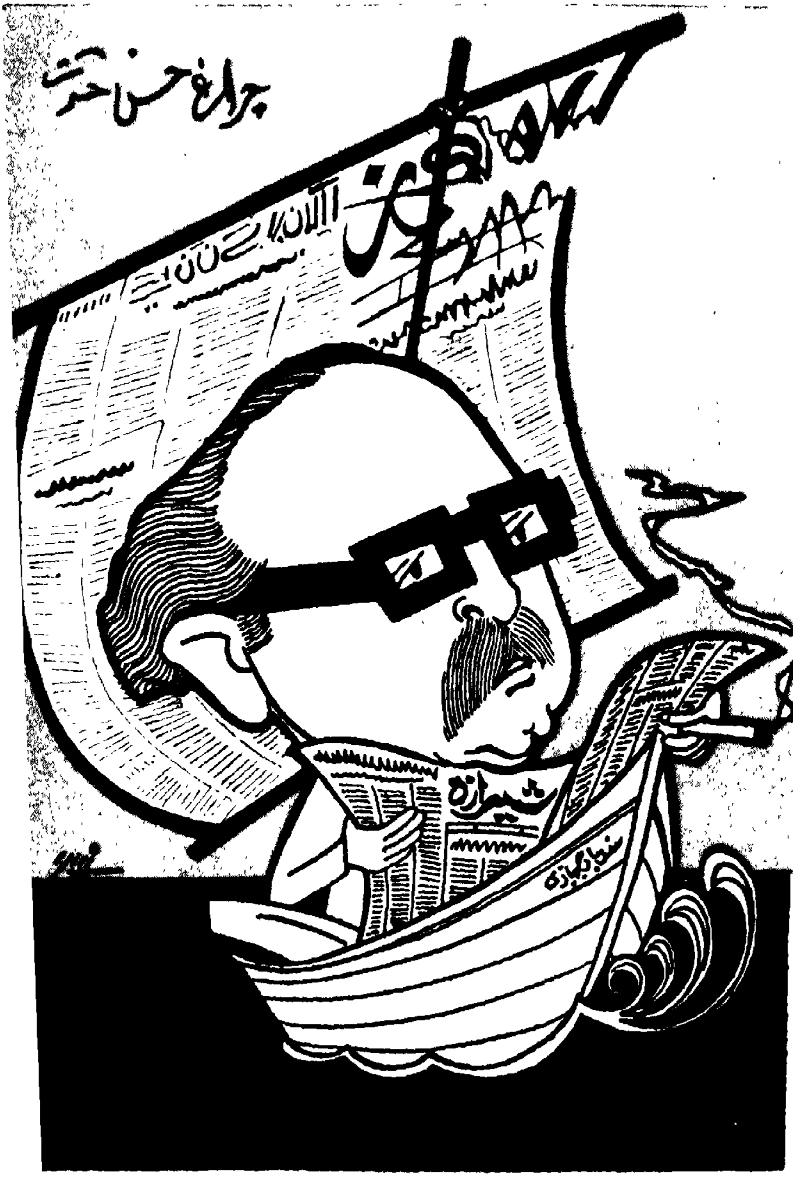
چراغ حسن حسرت
شیرازہ
سندباد جہازی

شیرازہ

شیرازہ

یوں تو زندہ دلانِ لاہور نے وقتاً فوقتاً کئی ظریفانہ اخبار نکالے مگر شیرازہ خاص اہتمام سے نکلا اور اچھے حلقوں میں بہت مقبول ہوا لوگ اب تک اسے یاد کرتے ہیں۔ یہ ایک ادبی اور فکاہی ہفت روزہ اخبار تھا جو مولانا چراغ حسن حسرت نے سندباد جہازی کے فرضی نام سے دسمبر ۱۹۲۶ء میں لاہور سے جاری کیا تھا حسرت ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، اخبار نویس بھی تھے اور مزاح نگار بھی۔ وہ صحیح زبان لکھنے پر خاص قدرت رکھتے تھے۔ ان کا انداز تحریر بیحد شگفتہ رنگین اور دل نشین ہوتا تھا۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز کلکتہ سے ہوا جہاں عصرِ جدید، نئی دنیا، جمہور، استقلال اور پیغام میں ادارت کے فرائض انجام دیئے اور کوچہ گرد اور کولمبس کے فرضی ناموں سے فکاہی کالم لکھے جن کی شہرت انہیں لاہور کھینچ لائی۔ جہاں وہ پہلے زمیندار پھر انصاف، اس کے بعد پھول اور تہذیب نسواں پھر احرار، زمیندار، احسان، شہباز، نیشنل کانگرس، فوجی اخبار، امروز اور نوائے وقت وغیرہ روزناموں کے اداروں سے منسلک رہے اور مزاح نویسی میں خوب نام پیدا کیا۔

شیرازہ بہت بلند پایہ فکاہی پرچہ تھا۔ اس میں مولانا عبدالمجید خاں سالک مدیر انقلاب لاہور کے حوادث و افکار اور سندباد جہازی کے اشارات خاص کشش کا باعث ہوتے تھے۔ اس نے اپنے گرد اور بھی بہت سے اچھے لکھنے والے جمع کیے جن میں حفیظ ہوشیارپوری، محمود نظامی، خضر تمیمی، میراجی، عطاء اللہ سجاد، محمد فاضل، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، احمد ندیم قاسمی، باری علیگ، حاجی لق لق، ضمیر جعفری، عاشق محمد غوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چراغ حسن حسرت کی کتاب مطائبات (جغرافیہ پنجاب جدید) کا سلسلہ بھی پہلے پہل اسی میں شروع ہوا جس میں انہوں نے اپنے زمانے میں پنجاب کی بعض مشہور سیاسی شخصیتوں اور تحریکوں کا مضحکہ اڑایا ہے۔ سیاسی شخصیتوں کی بظاہر سنجیدہ اور اہم زندگیوں کے بعض چھپے ہوئے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کرکے دکھانے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔

اس سلسلے میں ان کے سات مضامین جو شیرازہ میں چھپے تھے مردم دیدہ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ کیلے کا چھلکا، دو ڈاکٹر اور اقبال نامہ بھی اسی پرچے کی یادگاریں ہیں۔

جدید جغرافیہ پنجاب (تیسرا باب)

پہاڑ ۔ دریا ۔ نہریں وغیرہ

سند باد جہازی

پنجاب کی قدرتی تقسیم کے تذکرہ میں ہم مختصر طور پر پنجاب کے بڑے بڑے کوہستانی سلسلوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا کوہستانی سلسلہ جسے سدِ سکندری کہتے ہیں اتحادی سطح مرتفع میں پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں جہاں آج کل سدِ سکندری واقع ہے وہاں زمانہ قبل از تاریخ میں ہر طرف بنجر میدان اور ریگستان پھیلے ہوئے تھے جن میں سینکڑوں میلوں تک روئیدگی کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ پھر زمین کے اندرونی طبقات میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ پہاڑوں کے ایک عظیم الشان سلسلہ نے اس کی جگہ لے لی۔ ماہرین علم طبقات الارض کا خیال ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ کوہستانی سلسلہ پھر غائب ہو جائے گا اور جہاں آج یہ پہاڑ کھڑے ہیں وہاں کف دست میدان کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن بعض اتحادی محقق اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سدِ سکندری سنگ خارا کی چٹانوں کا مستحکم پہاڑ ہے جسے زمین کے اندرونی تغیرات لاکھوں برس تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ سدِ سکندری کی سب سے اونچی چوٹی سکندر مونٹ ہے جو اس سلسلۂ کوہ کے مغربی سرے پر واقع ہے۔ اس پر ہمیشہ سپید برف جمی رہتی ہے جو دور دور سے نظر آتی ہے اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ اس کے آس پاس اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں ہیں۔ جن کے برفانی عمامے دور سے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پنجاب کے کسان کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے ان چوٹیوں کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان میں یہ خیال عام ہے کہ اگر خدانخواستہ ان پہاڑوں پر برف نہ رہے تو پنجاب کے دیہات خشک سالی کی وجہ سے ویران ہو جائیں۔

ہر مذہب و ملت کے لوگ سکندر مونٹ پر اپنا حق جتلاتے ہیں۔ چنانچہ ساہوکار کہتے ہیں کہ کیلاش پربت کی طرح یہ پہاڑ بھی مقدس ہے کیونکہ یہاں مدت تک شری ساور کرنے کٹیا ڈال رکھی تھی۔ اور شری گاندھی جی مہاراج بھی اسے اشیرواد دے چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب ملیچھوں نے اسے بھرشٹ کر دیا ہے۔

منوہر پربت

یہ چوٹی اتحادی سطح مرتفع کے حصہ میں ہندو سبھا کی ترائی کے پاس واقع ہے۔ یہ بالکل چٹیل پہاڑ ہے اور اس کے صرف بعض حصوں میں تھوڑی تھوڑی زیر درختی پائی جاتی ہے۔ اسے لاکھی پربت بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اس کے دامن میں اگلے وقتوں کے خزانے دفن ہیں بلنیے ساہوکار کہتے ہیں کہ بوہنی کے وقت منوہر پربت کا نام لیا جائے تو بنج بیوپار میں بڑا نفع ہوتا ہے۔

کوہِ خضر

کسی وقت جب آسمان صاف ہو سکندر مونٹ پر نظر ڈالو تمہیں اس سے کسی قدر لیدیپ کی طرف ہٹ کے ایک اور چوٹی نظر آئے گی جس کے برفانی عمامے کے ساتھ ساتھ سیاہی سی دکھائی دیتی ہے۔ اس برفانی چوٹی کو کوہِ خضر کہتے ہیں اور اس کے پاس جو سیاہی نظر آتی ہے وہ اصل میں جنگلات ہیں۔ اگرچہ اونچائی میں یہ سکندر مونٹ سے چھوٹی ہے مگر اس کا راستہ بہت دشوار گذار ہے اور بڑے بڑے کوہ پیما اس کا بھید نہیں پا سکے۔

مجیٹھ پہاڑ

سدِ سکندری کی یہ اونچی چوٹی اکالی جنگلات کے سر پہ کھڑی سنتری کی طرح پہرہ دے رہی ہے۔ سندربن کا مشہور جنگل اس چوٹی پر واقع ہے۔ اس پر برف بھی پڑتی ہے مگر زیادہ دیر نہیں رہتی۔ اس کی ڈھلوانوں پر کھیتی باڑی بھی خوب ہوتی ہے۔

میاں کا ٹیلا

یہ چوٹی بہت نیچی ہے۔ اس لیے اس تک پہنچنا آسان ہے چنانچہ کالجوں اور اسکولوں کے کھلنڈرے کئی مرتبہ اس تک پہنچ چکے ہیں۔ پھر بھی ہر انسان کا کام نہیں کہ اس پہ قدم رکھ سکے۔ کیونکہ جو لوگ یہاں تک پہنچتے ہیں وہ لوٹتے وقت راستہ بھول جاتے ہیں۔ اس پر برف کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آتا۔ ہر طرف خشک گھاٹیاں اور خوفناک چٹانیں بڑے غرور سے سر اٹھائے کھڑی ہیں جنہیں دیکھ کر انسان کو آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ پھر بھی جن لوگوں کو معلومات بڑھانے اور اپنے علم میں اضافہ کرنے کا شوق ہے وہ جی کڑا کر کے یہاں جا ہی پہنچتے ہیں۔

کوہِ چھوٹو رام

یہ پہاڑ اگرچہ سدِ سکندری سے بہت دور مشرق کی طرف ہٹ کے واقع ہے اور بظاہر اتحادی سلسلۂ کوہ سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے تاہم جغرافیہ کے عالموں کا خیال ہے کہ کوہِ چھوٹو رام اصل میں سدِ سکندری کی ہی شاخ ہے کیونکہ نباتی اور معدنی پیداوار کے لحاظ سے یہ اتحادی سلسلۂ کوہ سے بہت ملتا جلتا ہے سکتے ہیں اس چوٹی پہ کھڑے ہو کر ایک کے دو نظر آتے ہیں۔

اتحادی سلسلۂ کوہ کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے بڑے پہاڑ ہیں۔ ذیل میں مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کوہِ شہاب الدین

سدِ سکندری کی مشرق کی جانب یہ عظیم الشان پہاڑ کھڑا ہے۔ اس میں گندھک کی کانیں کثرت سے ہیں اس لیے اس کی رنگت سیاہی مائل ہے۔ اس کے بعض حصوں میں تھوڑی سی زیر درختی بھی پائی جاتی ہے لیکن اکثر حصے بالکل لنڈ منڈ نظر آتے ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ اس پہاڑ سے کبھی لاوے کا سیلاب بہ نکلے گا جو اتحادی سطح مرتفع کو جلا کر بھسم کر دے گا۔ لیکن نئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی اندرونی حرارت ختم ہو چکی ہے اور اب اتحادی سطح مرتفع کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔

کوہِ محمد وٹ

[illegible] کہ اس پہاڑ میں سونے کی کانیں ہیں۔

چنانچہ جو برساتی نالے اس ست بہ نکلے ہیں ان کے ریت میں سونے کے ذرات پائے جاتے ہیں۔ اس پہاڑ کی پیداوار سے اتحادی سطح مرتفع اور وادیٔ لیگ دونوں کے باشندے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

منظفر کوہ

یہ بھی مشہور برفانی پہاڑ ہے جس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی زمانے میں سدِ سکندری سے ملا ہوا تھا۔ لیکن بعض کوہستانی ندیوں نے سدِ سکندری کو آہستہ آہستہ کاٹ کر منظفر کوہ سے الگ کر دیا۔ اگرچہ یہ پہاڑ اتحادی سطح مرتفع میں ہی واقع ہے لیکن اس میں اور سدِ سکندری میں کئی دریا اور وادیاں حائل ہیں اور یہ سدِ سکندری سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے۔

اشتراکی جوالا مکھی

آتش فشاں پہاڑوں کا مشہور سلسلہ ہے۔ کبھی اس سے برابر کئی کئی مہینے تک آگ کے شعلے بلند ہوتے رہتے ہیں اور کبھی مدت تک افسردگی سی چھائی رہتی ہے۔

کانگریسی سلسلۂ کوہ

اس کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ ست پڑا اور بھار گو پربت۔ ان دونوں کا ذکر ہم اس کتاب کے پہلے باب میں کر چکے ہیں۔

درّے

درّہ دولتانہ

سدِ سکندری کا مشہور درّہ ہے۔ جھیل دولتانہ جس کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے اسی درّہ میں واقع ہے۔ بہت کشادہ درّہ ہے۔ اس لیے اسے اتحادی سطح مرتفع اور دوسرے علاقوں کے درمیان آمد و رفت اور رسل و رسائل کا بہت بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس درّہ سے ہر موسم میں بکثرت قافلے اخباروں کے انبار اور سینما کے فلم گذرتے نظر آتے ہیں۔ سدِ سکندری اور کوہِ شہاب الدین کے درمیان بھی یہی درّہ واسطہ بنا ہوا ہے۔ پرانے زمانے کے اکثر محققوں کا خیال تھا کہ درّہ دولتانہ دراصل کوہِ شہاب الدین میں واقع ہے لیکن جدید تحقیق سے اس بات کی تردید ہو گئی ہے۔ مسلم لیگ کی وادی اس درّے کے قریب سے شروع ہوتی ہے۔

درّہ میر

یہ بھی سدِ سکندری کا مقبولِ عام درّہ ہے۔ بہت سا مالِ تجارت جو دساور کو جاتا ہے اسی درّہ کے راستہ سے گذرتا ہے پنجاب کی ریاستوں کے جو کارواں جاتے ہیں ان کا راستہ بھی یہی ہے۔

درّۂ جہان یا درّۂ شاہنواز

سدِ سکندری کا مشہور درّہ ہے جو میاں کے ٹیلے میں درّہ میر کے عین بالمقابل واقع ہے۔

درّہ غضنفر

ایک تنگ درّہ ہے جس کے دونوں طرف پُرہیبت اور سنگلاخ چٹانیں پھیلتی چلی گئی ہیں۔ یہ درّہ بہت پُرپیچ ہے اور دُور سے وادیٔ لیگ کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قریب جاؤ تو وادیٔ لیگ سے بہت دور سدِ سکندری کی چٹانوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔

اُچّل ڈنڈی

یہ درّہ میٹھ پہاڑ میں واقع ہے۔ اکالی جنگلات اور سندربن کی بہت سی پیداوار اسی درّہ کے راستے باہر بھیجی جاتی ہے۔ یہ درّہ اونچے اور گنجان درختوں سے گھرا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے درّے ہیں جن کا حال بڑی بڑی کتابوں میں لکھا ہے۔ بھارگو پربت اور سنت پڑا میں بھی بہت سے چھوٹے بڑے درّے ہیں جن میں زیادہ آمدورفت تو نہیں ہوتی البتہ وہ تجارتی مقاصد کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

جھیلیں

جھیل دولتانہ

یہ میٹھے پانی کی بہت بڑی جھیل ہے۔ یہ کوہِ شہاب الدین اور سدِ سکندری کے درمیان واقع ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اب آہستہ آہستہ اس کا پانی کھارا ہوتا جاتا ہے۔ بظاہر اس کی سطح بالکل ساکن نظر آتی ہے اور اس کے نیلگوں پانی پر مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندے تیرتے پھرتے ہیں لیکن یہ جھیل بہت گہری ہے اور جھیل ولر کی طرح اس میں کشتی رانی بہت خطرناک ہے چنانچہ ہر سال اس میں بہت سی کشتیاں اور ڈونگے غرق ہو جاتے ہیں۔

دریا

دریائے ظفر علی خان

پنجاب کا سب سے بڑا دریا ہے جو ہمیشہ اپنا راستہ بدلتا رہتا ہے۔ کسی زمانے میں اس دریا کی ہولناک موجیں ایک طرف سدِ سکندری سے جا ٹکراتی تھیں اور دوسری طرف قادیان کے ٹیلوں تک جا پہنچتی تھیں اور جب اس میں طغیانی آتی تھی تو اتحادی سطح مرتفع کے باشندے الاماں والحفیظ پکارتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں جا چھپتے تھے۔ لیکن اب اتحادی انجنیئروں نے اس کے دونوں کناروں پر مضبوط بند باندھ دیا ہے اور اس پر واہ کے سیمنٹ سے ایک عظیم الشان پل تعمیر کیا ہے جسے عہدِ جدید کی انجنیئری کا عظیم الشان کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ پہلے اس سے آبپاشی بالکل نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اب اس سے اتحادی سطح مرتفع کی اراضی کو سیراب کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ اس میں اکثر مقامات پر خطرناک چٹانیں ہیں۔ کئی جگہ آبشار بھی ہیں اس لئے اس میں زیادہ دور تک

جہاز رانی نہیں ہو سکتی۔

کسی کو یقین نہیں کہ دریائے ظفر علی خان ہمیشہ اس حالت میں رہے گا۔ کیا عجب اس میں پھر کبھی بڑے زور کی طغیانی آئے اور اس کی موجیں بند اور پل کو بہا کر لے جائیں۔ ابھی چند سال ہوئے اس دریا میں بڑا زبردست سیلاب آیا تھا جس نے احراری کاہستان کو زیر آب کر دیا تھا۔ دریائے ظفر علی خان پہلے سدِ سکندری سے ٹکراتا، وادیٔ لیگ سے پہلو بچاتا، بحیرۂ کانگریس میں ڈیلٹا بنا کے گرتا تھا اب اتحادی سطح مرتفع اور وادیٔ لیگ کو سیراب کرتا ہوا خلیج لیگ میں جا گرتا ہے۔

دریائے ظفر علی خان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے دریا اور ندی نالے آ ملتے ہیں جن میں دریائے اختر علی خان بہت مشہور ہے یہ دریا اصل میں دریائے ظفر علی خان کی ہی ایک شاخ ہے جو کرم آباد سے کچھ دور آگے بڑھ کر دریائے ظفر علی خان سے الگ ہو جاتا ہے اور میدانی علاقے میں بڑے زور سے بہتا ہوا سکندر مونٹ کے مقام پر پھر دریائے ظفر علی خان سے آ ملتا ہے۔ یہ دریا اپنے ساتھ بہت سی مٹی بہا لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکندر مونٹ سے آگے بڑھ کر دریائے ظفر علی خان کا پانی بہت گدلا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ندی نالے مٹی بہا کے لاتے ہیں اور دریائے ظفر علی خان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ اگر یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو دریائے ظفر علی خان ایک دن ایک وسیع دلدل[1] بن کے رہ جائے گا۔ ان دونوں دریاؤں کے درمیان جو علاقہ ہے اسے دوآبہ زمیندار کہتے ہیں

دریائے سالک و دریائے مہر

یہ دونوں دریا پہلے دریائے ظفر علی خان کے معاون تھے۔ لیکن ۱۹۲۷ء میں ایک زلزلہ آیا تھا جس نے ان کی گذرگاہ تبدیل کر دی دریائے سالک کا پاٹ زیادہ ہے اور دریائے مہر اگرچہ عرض میں اس سے کم ہے لیکن زیادہ گہرا ہے۔ اس کے علاوہ لمبائی میں بھی اس سے زیادہ ہے۔ ان دونوں دریاؤں میں نہ کہیں چٹانیں ہیں نہ آبشار، دونوں خاموشی سے اپنے مقررہ راستہ پر بہتے چلے جاتے ہیں اور ذرا بھر اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ دریائے سالک[2] میں سارا سارا سال کشتیاں چلتی رہتی ہیں اور لوگ غوطے لگاتے اور موتی نکال لاتے ہیں۔ لیکن اکثر غوطہ خوروں اور شناوروں کو دریائے مہر کی طرف رُخ کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ یہ دونوں دریا بہتے ہوئے سکندر مونٹ کے قریب آپس میں مل جاتے ہیں اور یہ دریائے انقلاب کہلاتے ہیں۔ ان کے درمیان جو سرسبز اور زرخیز علاقہ ہے اسے دوآبہ مہر سالک یا دوآبہ مہر سالک کہتے ہیں۔ اکثر لوگ اس دوآبہ کو دوآبۂ انقلاب بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں دریا اتحادی سطح مرتفع کے شمالی حصہ سے نکلتے ہیں اور خلیج لیگ کے قریب جا گرتے ہیں۔

دریائے نورا

چشمہ لوب نور سے جو کشمیری بازار سے شمال کی جانب واقع ہے، نکلتا ہے۔ میاں کے ٹیلے کے پاس سے گزرتا ہوا مٹی کے ساتھ ساتھ پکی ردوٹی، نور نامہ کلاں، قصہ شاہ بہرام اور بہت سی چھوٹی بڑی درسی کتابیں بہا لاتا ہے۔ کہتے ہیں سکندریہ کا کتب خانہ اسی دریا میں غرق ہوا تھا۔ یہ دریا کچھ ایسا گہرا تو نہیں تھا لیکن کتابوں کی گھلی ہوئی سیاہی کے باعث اس کا پانی بہت تاریک نظر آتا ہے۔ اور اکثر لوگ غلطی سے اسے بہت گہرا سمجھ لیتے ہیں۔ پہلے اس میں جہاز چلا کرتے تھے لیکن اب صرف اسکولوں کے طالب علم اور مدرس کبھی کبھی کتابوں کی تلاش میں اس کے تاریک سینہ پر کشتیاں اور ڈونگے دوڑاتے نظر آ جاتے ہیں۔ اس دریا میں مچھلیاں نہیں ہوتیں۔ صرف کتابیں ملتی ہیں اس لیے بے چارے

---

[1] بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔

[2] (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

مدّیں اسے اللہ کا بہت بڑا انعام اور احسان سمجھتے ہیں اور اس کے طاس کو احسان کہتے ہیں۔ بہت چھوٹا دریا ہے۔ جتنا لمبا ہے اتنا ہی چوڑا ہے پہلے خلیج بیگ میں گرتا تھا، اب اس خلیج سے کچھ دور شمال کی جانب صحرائے کالا ہاری کے ریت میں غائب ہو جاتا ہے۔ علمائے جغرافیہ ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکے کہ اسے دریا کہنا چاہیئے یا جھیل۔

دریائے کرشنا

ہندو سبھا کی ترائی سے عین شمال کی طرف آریہ سماج کی گھاٹیاں ہیں جن سے دریائے کرشنا نکلتا ہے۔ یہ دریا کچھ دور تک بھاگو پربت اور ست پڑا کے درمیان میں سے ہو کر پتھروں سے سر ٹکراتا شور مچاتا گذرتا ہے۔ یہاں اس کا پاٹ بہت کم اور گہرائی بہت زیادہ ہے۔ اس کوہستانی علاقے سے نکل کر جب یہ میدانی علاقے میں پہنچتا ہے تو اس کا پاٹ زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ پنجاب کا بہت بڑا دریا ہے اور ان پانچ دریاؤں میں سے ہے جن کی وجہ سے اس صوبے کو پنجاب کہا جاتا ہے۔ یہ ہندو سبھا کی ترائی کے ساتھ ساتھ کانگریس کے کوہستانی علاقوں کو بھی سیراب کرتا ہے لیکن اس کے بالائی حصّہ میں چٹانیں کثرت سے ہیں اس لئے یہاں جہاز رانی نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس کا زیریں حصّہ جہاز رانی کے لئے بہت موزوں ہے۔ دریائے کرشنا کا طاس بہت زرخیز ہے اس کے بالائی حصّہ کو پرکاش اور زیریں حصّہ کو پرتاب کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ دریا بہت مقدس ہے چنانچہ دور دور سے لوگ اس میں اشنان کرنے آتے ہیں اور اس کا پانی بوتلوں میں بند کر کے لے جاتے ہیں۔ اس میں بہت چھوٹے چھوٹے دریا اور ندیاں آملتی ہیں۔

ویر ندر ندی اس دریا کی ایک مشہور شاخ کا نام ہے۔ یہ ندی بہت سبک خرام ہے اور سُرخ و سپید سنگریزوں پر اونچے سُروں پر بھنی گیت گاتی چلی جاتی ہے۔ اس کا پانی بہت شیریں اور مصفّیٰ ہے اور اس کے کنارے کافی دور تک سبزہ زار پھیلتا چلا گیا ہے۔ پہلے اکثر شوقین لوگ صبح و شام ویر ندر ندی کے کنارے آکر اس سبزہ زار اور آبِ رواں کا لطف اٹھاتے، چھینٹے اڑاتے اور ڈبکیاں لگاتے تھے۔ لیکن اب اس کے کنارے خاردار جنگلے بنوا دیئے گئے ہیں اور خاص خاص لوگوں کے سوا کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔ دریائے کرشنا جنوب کی طرف بہ کر خلیج مہا سبھا میں گرتا ہے۔

دریائے خورد سند

یہ دریا آریہ سماج کی گھاٹیوں سے نکل کر کچھ دور دریائے کرشنا کے متوازی بہتا ہے۔ کانگریسی سلسلہ کوہ کے قریب پہنچ کر یہ بھاگو پربت اور ست پڑا۔ دونوں سے پہلو بچاتا ہوا دریائے پرمانند کے متوازی بہنے لگتا ہے۔ ہندو سبھا کی ترائی کو زرخیز بنانے میں اس دریا کا بڑا حصّہ ہے۔ سول نافرمانی کے موسم میں جب اونچے پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے اور کوہستانی ندی نالے بہ نکلتے ہیں تو اس دریا میں طغیانی آجاتی ہے اور اس کی موجیں کانگریسی کوہستان کی بلندیوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اس کا پاٹ اچھا خاصا ہے لیکن زیادہ گہرا نہیں

لہ (حاشیہ متعلق صفحۂ گذشتہ) فردوسی نے محمود غزنوی کے متعلق کہا تھا ؎

خجستہ درگہِ محمود زابلی دریاست　　چہ گونہ دریا کہ آں را کرانہ پیدا نیست
چہ غوطہ ہا زدم و اندرون ندیدم دُر　　گناہِ قسمتِ ما بُد، گناہِ دریا نیست

ہندوؤں کے نزدیک اس دریا کو بھی تقدس حاصل ہے۔ اس دریا کے طاس کے بھی دو حصے ہیں۔ بالائی حصّے کو آریہ گزٹ اور زیریں حصّہ کو ملاپ کہتے ہیں۔ اس میں ہمیشہ جہاز رانی ہوتی رہتی ہے۔ یہ دریا جنوب کی طرف بہتا ہوا خلیج مہاسبھا میں جا گرتا ہے۔

دریائے پرمانند

آریہ سماج کی گھاٹیوں سے نکل کر اکالی جنگلات کے پاس سے بہتا ہوا مغرب کی طرف ہو لیتا ہے اور دریائے خورسند کے متوازی بہنے لگتا ہے۔ ہندو سبھا کی ترائی میں یہ دریا کچھ اس زور سے بہتا ہے کہ آس پاس کی زمین کو زیرِ آب کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس عمل کی وجہ سے اس علاقے میں جابجا وسیع دلدلیں پیدا ہو گئی ہیں جہاں مچھر بڑی کثرت سے پرورش پاتے اور ہندو فیور پھیلاتے ہیں۔ یہ بہت ہی خطرناک قسم کا بخار ہے جس نے پنجاب میں تباہی پھیلا رکھی ہے۔

دریائے پرمانند کے دونوں کناروں پر بہت دور تک چٹیل پہاڑیوں اور وحشت ناک بیابانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ان پہاڑیوں پر جو تھوڑی بہت زراعت ہوتی ہے حقوق کی برسات میں مینہ کا پانی اسے بہا لے جاتا ہے۔ اس عمل کو آب بری یا پن کٹ (EROSION) کہتے ہیں۔ پنجاب کی زرخیزی کو پن کٹ نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ نارنگ سرا اور نریندر ناگ جو مشہور گرم چشمے ہیں۔ اسی دریا کے کنارے واقع ہیں۔

کہتے ہیں زمانۂ قبل تاریخ میں دریائے پرمانند کانگرسی سلسلہ کوہ میں سے بہتا ہوا کالے پانی میں جا گرتا تھا۔ پھر کچھ ایسے انقلابات ہوئے کہ یہ ہندو سبھا کی ترائی میں سے بہتا ہوا خلیج سرکار کے ”گورے پانی“ میں جا گرنے لگا۔ اس دریا کے طاس کو ہندو کہتے ہیں۔

دریائے حبیب

اس دریا کا منبع ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ جغرافیہ والوں کا خیال ہے کہ سدِّ سکندری اور کانگرسی سلسلہ کوہ کے بعض نامعلوم حصوں کی تحقیق کرنے کے لیے جو مہمیں بھیجی جا رہی ہیں انہیں اگر اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تو دریائے حبیب کا منبع بھی معلوم ہو جائے گا۔ کسی زمانے میں یہ دریا مسلم لیگ کی وادی کو سیراب کرتا تھا لیکن اب اس نے اپنا راستہ بدل لیا ہے اور احراری کاہستان اور کانگرسی سلسلہ کوہ کے درمیان بہتا ہے۔ بڑا تیز دریا ہے۔ خصوصاً جب یہ سکندر مونٹ کی مہیب[1] چٹانوں سے ٹکراتا اور آبشار بناتا ہوا بہتا ہے تو بہت خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اس میں جگہ جگہ گرداب پڑتے ہیں۔ اس کی موجیں کف آلود نظر آتی ہیں۔ میدانی علاقے میں بھی پہنچ کر اس کی تیزی میں فرق نہیں آتا اور یہ اپنے زور میں کنارے کے علاقے سے بہت سی مٹی بہا لیتا ہے۔ اس کے دہانے کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ بحیرۂ کانگرس میں یا اس کے قریب کے کسی سمندر میں گرتا ہے لیکن ابھی تک یہ بات تحقیق طلب ہے۔

---

[1] سلیمان ساوجی نے دجلہ کی روانی دیکھ کر کہا تھا۔

دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ ایست
پائے در زنجیر کف برلب مگر دیوانہ ایست

یہ شعر دریائے حبیب پر بھی صادق آتا ہے۔

دریائے ویرا

روایت ہے کہ یہ دریا شری سوامی گنیش دت جی مہاراج کی جٹا سے نکلتا ہے اور بھارت ورش کے سناتن دھرمی نرناری کو لابھ پہنچاتا ہے اس لیے پرانے خیال کے ہندو اس دریا کو بہت مقدس سمجھتے ہیں۔ کسی زمانے میں ست پڑا کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ اب بھارگو پربت کے پاس سے گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ریت میں سونے چاندی کے ذرات ملتے ہیں۔ ہندوؤں کے دوسرے مقدس دریاؤں کی طرح یہ بھی غیر زراعت پیشہ دریا ہے۔ یعنی اس کے کنارے زراعت کے بجائے صرف بنج بیوپار ہوتا ہے۔

دریائے مرتضیٰ[1]

پہلے ترکی میں بہتا تھا۔ پھر افغانستان میں بہنے لگا۔ اب مستقل طور پر ہندوستان آ گیا ہے۔ اس دریا اور اس کے معاون دریاؤں نے کسی زمانے میں وہ زرخیز علاقہ بنایا تھا جسے احسان کہتے ہیں۔ اب اس دریا کا طاس شاہیانہ کہلاتا ہے۔ چڑی مار اس دریا کو مقدس سمجھتے ہیں۔ دریائے مرتضیٰ خلیج لیگ میں گرتا ہے۔

کانگرسی ندی نالے

بھارگو پربت اور ست پڑا سے بھی برسات کے موسم میں اکثر ندی نالے نکلتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی ندیوں میں نیشنل کانگرس ندی بہت مشہور ہے جو ست پڑا سے ایک زمانے میں بہ نکلی تھی۔ یہ گندے پانی کی ایک لمبی ندی تھی جس میں بہت سی نالیوں اور موریوں کا پانی بھی آ ملتا تھا۔ بہرحال یہ صرف برساتی ندی تھی اور اب خشک پڑی ہے۔

پارس ندی بھی ست پڑا سے نکلتی ہے۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی ندی ہے لیکن اس کا پانی بہت میٹھا اور صاف و شفاف رہتا ہے۔

دریائے سول

جسے دریائے ابیض اور عام لوگوں کی بولی میں گورا دریا بھی کہتے ہیں۔ شمال کے ایک نامعلوم خطّے سے نکلتا ہے اور جنوب کی طرف تیزی سے بہتا ہوا خلیج سرکار میں جا گرتا ہے۔ اس کی سطح بظاہر ہموار معلوم ہوتی ہے۔ پانی صاف و شفاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے گورا دریا کہتے ہیں۔ لیکن اس کے اندر بہت سی خوفناک چٹانیں ہیں۔ پہلے تو اس کا پانی بہت سپید معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اب اس کی رنگت کسی قدر تیرگی مائل ہوتی جاتی ہے۔ سرکار نے اس کے بالائی حصّہ سے ایک نہر نکالی ہے جسے جوئے "نوکر" یا "نہر اپر سول" کہتے ہیں۔ اس نہر کے پانی کی کثیر مقدار کو ذخائرِ آب میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ نوکر ویر یا نوکر ہیڈ بھی اصل میں اسی نہر کی فیاضی کا کرشمہ ہے جس کے پانی سے پنجاب کا بہت سا علاقہ سیراب ہوتا ہے۔ جو دریا خشک ہونے لگتے ہیں انہیں بھی اسی ذخیرۂ آب سے پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ نہر اصل میں پانی کے لیے صرف سول کی ہی مرہونِ منت نہیں بلکہ جھیل دولتانہ

---

[1] دریائے مرتضیٰ ترکی کا مشہور دریا ہے۔ اسکے کنارے ترکوں نے یونانیوں کو زبردست شکست دی تھی۔

سے جو سرکاری ندی نالے بہ نکلتے ہیں۔ ان کا پانی بھی اسی میں آملتا ہے اور سرکاری مقاصد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

دریائے سول بدیسی دُھن میں بدیسی گیت گاتا ہوا بہتا ہے اور دور سے بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ اس دریا کی بہار دیکھنا ہو تو سکندر مونٹ پر کھڑے ہو کر دیکھیے۔

دریائے کالی

ہندو مہا سبھا کی پہاڑیوں سے کچھ آگے ایک بہت بڑا چشمہ ہے جسے "کالی ناگ" کہتے ہیں۔ یہ دریا اسی چشمے سے نکلتا اور ہندو سبھا کی ترائی اور کانگریسی سلسلہ کوہستان سے مٹی اور سنگریزے بہالاتا ہے۔ یہ دریا نہ بہت تیز رفتار ہے، نہ زیادہ آہستہ خرام، نہ اتنا وسیع ہے کہ اور چھور معلوم نہ ہو، نہ اس کا پاٹ اتنا چھوٹا ہے کہ تھوڑے سے خرچ میں پُل بن سکے۔ نہ اتنا زیادہ گہرا ہے کہ تہ کا کچھ حال معلوم نہ ہو، نہ اتنا کم گہرا کہ جہاز بھی نہ چل سکیں۔ طغیانی کے زمانے میں آس پاس کے علاقہ کو اس طرح زیر آب نہیں کرتا کہ بند باندھنے کی ضرورت محسوس ہو اور جاڑے میں سمٹ کر اتنا چھوٹا بھی نہیں رہ جاتا کہ پایاب نظر آئے۔ غرض یہ دریا اپنی میانہ روی اور اعتدال کے لئے مشہور ہے۔ کانگریسی سلسلہ کوہ اور ہندو سبھا کی ترائی دونوں کے باشندے اس پیا پیا حق جتاتے ہیں مگر ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ دریا کس علاقہ کے زیادہ رقبہ کو سیراب کرتا ہے۔ اس کا گیت دیسی ہے مگر گیت کی دُھن بدیسی۔ اس کا طاس جسے "ٹریبیون" کہتے ہیں بہت زرخیز ہے۔

دریاؤں کے سلسلہ میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پنجاب کے دریاؤں سے کام لینے کے لئے ان میں جگہ جگہ بند باندھے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بند دریائے ظفر علی خان میں باندھے گئے ہیں، کیوں کہ طغیانی کے زمانہ میں یہ دریا بہت خطرناک ثابت ہوتا تھا۔ لیکن جب سے اس دریا کے بندوں میں سیمنٹ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ خطرہ نہیں رہا

سوالات

۱۔ بتاؤ کوہ شہاب الدین کی اندرونی حرارت کیوں ختم ہو چکی ہے ؟
۲۔ سکندر مونٹ اور مظفر کوہ کا مقابلہ کرو۔
۳۔ بتاؤ کوہ چھوٹو رام پہ کھڑے ہو کر ایک کے دو کیوں نظر آتے ہیں ؟
۴۔ حاتم طائی کے قصے میں اگر تم نے کوہِ ندا کا حال پڑھا ہے تو بتاؤ کہ کیا میاں کے ٹیلے کو کوہِ ندا کہنا صحیح ہے ؟
۵۔ بتاؤ دریائے ظفر علی خان آج کل کہاں سے نکلتا ہے اور کہاں گرتا ہے ؟
۶ بتاؤ وہ کون کون سے آلات ہیں جن سے دریائے مہر کی گہرائی ناپی جا سکتی ہے۔ کیا تم بانس سے اس دریا کی گہرائی معلوم کر سکتے ہو ؟
۷۔ دریائے نورا کون کون سی کتابیں بہا لاتا ہے ؟
۸۔ کیا تم نے کبھی دریہ ندر ندی دیکھی ہے ؟ اگر دیکھی ہے تو اس کے متعلق اپنے تجربات بیان کرو۔
۹۔ ہندو فیوڈ کہاں کہاں ہوتا ہے اور گورا پانی کیسے کہتے ہیں ؟

منکہ ایک ....
خاندانی معتبر نائی ہوں

عبدالمجید سالک

ججمانو! میں ایک معتبر نائی ہوں، میرے دادا بادشاہی نائی تھے۔ کنور نونہال سنگھ کی شادی، شام سنگھ اٹاری والے کے ہاں میرے ہی دادا نے کرائی تھی۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ سنا ہے کہ جب میرے دادا اٹاری سے شاد بامراد ہو کر واپس لوٹے ہیں تو مہاراج ان کی پیشوائی کے لئے قلعہ کے حضوری دروازے تک چل کر آئے تھے۔ اور دادا پر انعام و اکرام کا وہ مینہ برسایا تھا کہ کھاتے کھاتے تین پشتیں گذر گئیں اور اب بھی مولا کی مہربانی سے تیس بیگھہ زمین کا مالک ہوں۔ کھانے پینے کی کمی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے گذران اچھی ہے۔ لیکن دیکھتا ہوں کہ میرے بعد یہ خاندانی معتبری چلتی نظر نہیں آتی۔ زمانہ کا رنگ بدل گیا۔ طور طریقے بدل گئے۔ پرانے زمانے کے ججمانوں کی یاد آتی ہے تو کلیجے پر استرا چل جاتا ہے، زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی ہے۔ یار دوست سمجھاتے ہیں میاں ہوش کے ناخن لواؤ۔ تم کس چکر میں پڑ گئے۔ جس طرح زمانے نے پرانے طریقوں کو مونڈ کے صفا چٹ کر دیا۔ اسی طرح آجکل کے فیشن بھی صاف ہو جائیں گے۔ لیکن ججمانو! ذرا یہ اندھیر تو دیکھو کہ ہم لوگوں کا کوئی کام بھی ہمارے ہاتھ میں نہ رہا۔ ہمارے زمانے میں حجامت بناتے تھے تو نائی، ختنہ کرتے تھے تو نائی، زخموں پر مرہم لگاتے تھے۔ تو نائی، پچھنے اور سینگی لگاتے تھے تو نائی، شادی بیاہ میں کھانا پکاتے تھے تو نائی اور بر کے لئے کنیا اور کنیا کے لئے بر ڈھونڈتے تھے تو نائی، لیکن آجکل یہ کیا قیامت آئی کہ ہم لوگوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ اور کل کے لونڈے چھاؤنیوں میں گوروں کی داڑھیاں مونڈ مونڈ کر اپنے آپ کو نائی کہتے ہیں اور چار چار آنے بٹور لیتے ہیں۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی۔ ہم لوگوں کا یہ قاعدہ تھا کہ فتو موچی سے اللہ بخشے بڑا کاریگر تھا، خاص کر کسوت بنانے میں تو سنا ہے ولایت تک مشہور تھا۔ اس سے کسوت سلالی اور جب وہ لایا تو اللہ دین تیلی کے ہاں دے آئے۔ اس نے پندرہ پندرہ دن کڑوے تیل میں ڈبو کر رکھی۔ اس کے بعد اللہ تمہارا بھلا کرے، اسے پونچھ پانچھ کے صاف کیا۔ چار استرے دو قینچیاں، ایک نہیرنا، ایک مہندی وسمہ لگانے کی کھرپی اور ایک کٹوری۔ یہ سب چیزیں اس میں رکھیں اور سالہا سال کے لئے بے فکر ہو گئے۔ اب جو تم دیکھو تو آج کے نائی کیسے۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ ماں ٹینی باپ کلنگ۔ ولایت کے چار چار روپے کے استرے اور صابن اور پھٹکری اور وہ آٹا سا جسے پوڈر کہتے ہیں، لئے پھرتے ہیں، جیسے کوئی نسخہ تیار کریں گے اور پھر ایک حجامت میں پورا ایک گھنٹہ غارت کر دیتے ہیں۔ ہاتھ کی صفائی کا نام نشان نہیں، بزرگوں کا ذکر تو کیا کہئے مجھ روسیاہ کا ایک واقعہ سنئے۔ لالہ پھوتی مل کے پتا سرگباش ہو گئے، بیٹوں، پوتوں اور رشتہ داروں کا ہجوم ہو گیا۔ لالہ جی نے مجھے بلا کر کہا ''علیا، جو پرماتما کی اچھیا تھی، وہ پوری ہو گئی۔ ذرا جلدی سے بھدرن کر دو، اس سے فارغ ہو جاؤں تو بیسیوں کام اور پڑے ہیں۔''

بس میاں اللہ دے اور بندہ لے، میں نے کورا استرہ جو ہاتھ میں لیا تو پچیس آدمیوں کو آدھ گھنٹے میں مونڈ کے رکھ دیا۔ قدردان ججمان نے پانچ پیسے چہرہ شاہی میری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور کہا ''علیا ہم جیسے ساہوکار تو ہزاروں ہوں گے پر تجھ جیسا نائی چار کھونٹ میں نہ ملے گا۔''

اب حالت یہ ہے کہ نہ کوئی سر گھٹاتا ہے نہ پٹے رکھتا ہے نہ داڑھی کا خط بنواتا ہے۔ جسے دیکھو ماتھے پہ بالوں کا ایک منڈھا سا لئے پھرتا ہے

اور سر کے پچھلے حصے میں صفا چٹ میدان۔ بال ہیں کہ گاؤدم۔ آگے زیادہ پیچھے کم۔ پہلے خال خال لڑکے بالے ڈاڑھی منڈاتے تھے، اب جسے دیکھو جوان ہو یا بوڑھا، مونچھیں تک چٹ کرائے بیٹھا ہے جیسے ابھی باپ مرا ہے۔ نا صاحب ہم سے تو ایسی حجامتیں ہوتیں نہیں، مولا آباد رکھے اپنے مولویوں اور چودھریوں کو جو پرانی وضع نبھائے جا رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہماری بھی نبھتی جاتی ہے۔ ہم لوگ بچوں کا ختنہ کیا کرتے تھے۔ ذرا سی فلک سیر کھلا دی۔ بچہ اتنا غفیل ہو گیا۔ گھسیاٹی چڑھائی اور ایک اشارے میں ختنہ کر، چولھے کی جلی ہوئی مٹی سے خون بند کر، راکھ کی پوٹلی لپیٹ لنگوٹا بندھوا دیا اور بچہ ہے کہ کھیلتا پھر رہا ہے۔ اب یہ کام ڈاکٹروں کے سپرد ہو گیا ہے۔ انہیں کیا معلوم ختنہ کس کو کہتے ہیں۔ نہ باپ نے کیا نہ دادا نے۔ انگریزوں کے پڑھائے ہوئے، اور انگریزوں میں ختنہ کا رواج نہیں۔ جبھی تو ہم نے دیکھا ہے کہ ان سے ختنہ کرا کر بچہ مہینوں بستر پر ایڑیاں رگڑتا ہے اور ڈاکٹر ایسے دواؤں کے بے چارے کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ کنوؤں میں ڈالنے کی دوا سے دھوؤ، یہ چیز چھڑکو وہ چیز لگاؤ۔ دس روپے روئی۔ اور مرہم پٹی میں غارت ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بچے کا زخم اچھا نہیں ہوتا اور پھر ہمیں کو بلانا پڑتا ہے۔ ہم لوگ زہری سے زہری پھوڑوں کا علاج دم کے دم میں کر لیا کرتے تھے۔ زنگاری مرہم کا پھاہا چپکا دیا چلو چھٹی ہوئی۔ اب وہ جبھی اترے گا جب پھوڑا اچھا ہو جائے گا، نہ روزانہ دھونے کا کھڑاگ نہ باندھنے کا قضیہ۔ یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ اچھے اچھے عقل شناس والے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ڈاکٹروں کے جال میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ دھڑا دھڑ روپیہ بھی خرچ کرتے ہیں۔ روزانہ درد سے چیختے چلاتے بھی ہیں۔ پیسے بھی دلواتے ہیں۔ مدت تک پھوڑا بھی اچھا نہیں ہوتا، لیکن ڈاکٹر کا جادو ایسا سر پہ سوار ہے کہ اس کا دامن نہیں چھوڑتے پر نہیں چھوڑتے۔

ججمانو! یہ تو عام نائیوں کے کام تھے۔ اب بھی نائی یہی کچھ کر رہے ہیں، لیکن ہم خاندانی معتبر نائی ان ٹکے ٹکے کے نائیوں سے بہت اونچا مرتبہ رکھتے تھے۔ غریب آدمی تو شادی بیاہ میں کیا خرچ کرے گا اور مہمانوں کو کیا کھلائے گا۔ ہم کھاتے پیتے ججمانوں کے ہاں شادیوں پر کھانا پکاتے تھے۔ بس چار گھڑی پہلے کہہ دیجئے اور پانسو آدمیوں کا کھانا تیار لیجئے۔ پھر ہم خود غرض بھی نہ تھے۔ دوسرے کا گھر پھونک کر تماشہ نہ دیکھتے تھے۔ آج کل کے نمک حرام نائیوں کی طرح چاول اور گھی اور پستہ اور بادام اور گوشت چرا کر چپکے سے اپنے گھروں کو نہیں بھجوا دیتے تھے۔ بلکہ اپنے ججمانوں کی بھی کفایت اور پردہ داری کرتے تھے۔ پلاؤ پکایا اس کی بوٹیاں الگ نکال لیں، کچھ گھی بھی نچوڑ لیا۔ اور دہی، بوٹیاں اور گھی، قلیے اور ساگ میں ڈال کر دو سالن مہمانوں کے آگے رکھ دیئے۔ بس پھر کیا تھا ججمان عش عش کر گیا۔

اب پچھلے دنوں کا ایک قصہ سنیئے۔ ایک نئے فیشن کے گھر میں شادی تھی۔ میں تو اپنے ججمانوں کے سوا کسی دوسرے کے جاتا نہیں، لیکن ایک ججمان ہی نے سفارش کی، میں چلا گیا۔ بابو صاحب نے حکم دے دیا کہ نائی جو سامان اور مصالحہ مانگے اسے دے دیا جائے۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق مالک کی خیر خواہی اور بچت کے خیال سے وہی ہیر پھیر یہاں بھی کیا۔ پھر کیا ہوا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بابو صاحب غصے میں بھرے ہوئے چولہوں کے پاس آئے اور مجھے ہزار ہا بے نقط سنا ڈالیں۔ "کم بخت، خاندانی نائی بنا پھرتا ہے۔ پورا سامان لے لیا۔ پورا مسالہ لیا اور پلاؤ میں گھی نہیں، سالن میں لذت نہیں، برادری کے لوگ کیا کہیں گے کہ کس فاقوں مرے گھر میں دعوت کھانے گئے۔ کم بخت تو نے تو میری ناک کٹوا دی۔" اب میں ہوں کہ ششدر کھڑا ہوں۔ یا الٰہی نیکی برباد گنہ لازم، سامان اور مسالہ میں خود نہیں کھا گیا۔ گھر نہیں لے گیا، بچا ہوا یہیں رکھا ہے اور یہ بابو صاحب ہیں کہ شکر گزار ہونے کی جگہ الٹا میری جان کو آ رہے ہیں۔ اس دن سے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ فیشن کے گھرانوں میں جا کر جھانکوں گا بھی نہیں۔ مجھے اپنے ڈھنگ کے ججمان ہی کافی ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں دولت مندوں کے ہاں کھانا پکانے سے عاجز ہوں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خاندانی نائی ہوں اور

میرے بزرگ بادشاہوں کے نائی تھے۔ اب نہ بادشاہی رہی نہ نائی رہ گئے۔ آجکل جو لوگ شادی بیاہوں پر زیادہ خرچ کرتے ہیں، ان کی حیثیت مجھے خوب معلوم ہے۔ میرے گاؤں کے سارے ہی چودھری لالہ پکوڑی شاہ کے قرض دار ہیں۔ چودھری اپنے گھر کو آگ لگاکر تاپیں تو تاپیں، مجھ سے تو یہ نہیں ہوتا کہ قرض لیے ہوئے روپے کو بے دردی سے خرچ کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مجھ سے کفایت ہو سکتی ہے پوچھے بغیر کر دیتا ہوں۔ باقی پکانے کو پلاؤ، بریانی، متنجن، مزعفر، قورمہ، روغن جوش، ہر قسم کا سالن، مچھلی، مرغ، غرض ہر چیز پکا سکتا ہوں۔ البتہ انگریزی شوربا نہیں پکا سکتا۔ میٹھے ٹکڑے نہیں پکا سکتا۔ پڈنگ بنانی نہیں آتی۔ یہ چیزیں ہمارے دادا کے وقت میں تھیں نہ کسی نے ہمیں سکھائیں نہ خدا ایسا موقع لائے۔

ایک زمانہ تھا بڑے بڑے امیر لوگ اپنے خاندانی معتبر نائیوں کو اپنا رازدار سمجھتے تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتے سے زیادہ نازک معاملہ اور کیا ہوگا۔ لڑکے کے لئے لڑکی والوں کے ہاں پیغام لے کر جانا اور لڑکی کے لیے لڑکا تلاش کرنا، پھر لڑکے لڑکی کی شکل صورت، مزاج سبھاؤ، ماں باپ کی حیثیت اور طبیعت کے متعلق ٹھیک ٹھیک معلومات فراہم کرنا اور بہم پہنچانا، پسند کی صورت میں شادی کی شرطوں کا فیصلہ کرنا، تاریخ مقرر کرنا، غرض یہ سارے کام خاندان کے معتبر نائی کے ہاتھوں انجام پاتے تھے۔ ہزاروں کا زیور، کپڑا صندوق میں بند کر کے نائی کے حوالے کر دیا جاتا اور کیا مجال کہ ایک سوئی بھی اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ اسی لئے تو معتبر کا لفظ نائی کے ساتھ ایسا لگا ہے کہ چسپاں ہو کے رہ گیا ہے۔ آجکل کے ٹٹ پونجیے نائی بھی ہیں جن کا سارا نائی پن صابن لگا کر ڈاڑھیاں مونڈنے ہی تک محدود ہے۔ ذرا کسی ایسے نائی کے ہاتھ کسی دوست کے پاس دیا سلائی کی ایک ڈبیہ ہی بھیج کر دیکھئے۔ رستے ہی میں بیچ کر اس پیسے کا پان نہ کھا جائے تو میرا نام علیا نہیں کچھ اور رکھ دیجیے۔

صرف شادی بیاہ ہی پہ موقوف نہیں، عام پیغام رسانی بھی ہمارے سپرد ہوتی تھی۔ بڑے بڑے معزز آدمی اپنی بیٹیوں کو سسرال سے بلانا چاہتے اور گھر کا کوئی آدمی فارغ نہ ہوتا تو یہ کام بھی معتبر نائی ہی کے سپرد کیا جاتا تھا۔ اسی اعتبار کی وجہ سے ہم لوگوں کی عزت کا ڈنکا بجتا تھا۔ ہندو ہمیں راجا اور مسلمان خلیفہ کہتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک راجہ کے بیٹے اور ایک نائی کے لڑکے میں بحث ہو گئی۔ راجہ کا بیٹا کہتا تھا کہ میرا باپ بڑا ہے، نائی کا لڑکا دعویٰ کرتا تھا کہ میرے باپ کا مرتبہ تیرے باپ سے بھی اونچا ہے۔ راجہ کے بیٹے نے کہا تو نے دیکھا نہیں ساری دنیا میرے باپ کے آگے سر جھکاتی ہے۔ نائی کے بیٹے نے برجستہ جواب دیا کہ تو نے دیکھا نہیں کہ تیرا باپ جب حجامت بنواتا ہے تو میرے باپ کے آگے سر جھکا کر بیٹھتا ہے۔ لیکن زمانے کا اُلٹ پھیر دیکھو، اب یہ بات بھی جاتی رہی۔ حجامت بنوانے والا کرسی پہ بیٹھتا ہے، سامنے طباق سا آئینہ دیوار سے لگا ہے اور نائی اس کے دائیں بائیں بلائیں لیتا پھرتا ہے۔ اب تو وہ سر جھکانے کا معاملہ بھی نہ رہا۔ غرض کس کس چیز کو روؤں۔ جیجا تو ادل پکا پھوڑا ہو رہا ہے۔ تم کو اپنے حال کی طرف متوجہ دیکھا تو دو باتیں کر لیں۔ پرانی شان نہ رہی، پرانی آن نہ رہی، پرانی باتیں نہ رہیں۔ اگلے دن نہ رہے، اگلی راتیں نہ رہیں، لیکن آجکل کے زمانے کے اناڑی پن کو دیکھتا ہوں۔ آج کل کے نائیوں کی ناکارگی اور بد دیانتی کو دیکھتا ہوں تو دل فخر سے بھر جاتا ہے اور گردن اونچی کر کے کہتا ہوں کہ آخر میں ایک خاندانی معتبر نائی ہوں۔ نائی تو اور بھی ہوں گے، لیکن میرے خاندانی اور معتبر ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟

سالک صاحب سے پہلی ملاقات

باریؔ

ہمارے محلہ میں "خلافت کمیٹی" کا دفتر تھا۔ ہم اسکول جاتے ہوئے اس دفتر کے پاس سے گزرتے۔ سفید کھدر میں ملبوس چند لیڈر یہاں ہر وقت موجود رہتے۔ ہمارے خیال میں یہ لوگ دنیا کے سب سے بڑے انسان تھے۔ ہم میں سے بعض کی یہ خواہش تھی کہ خدا ہمیں لیڈر بنا دے۔ ایک دن اسکول جاتے ہوئے "خلافت کمیٹی" کے دفتر کے باہر ہجوم کو دیکھ کر ہم سب حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ایک بوڑھے رضاکار سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ "گورنمنٹ نے مولوی زمیندار کے افکار و حوادث کو گرفتار کر لیا ہے۔" وقت بہت تنگ تھا ہم تیزی سے اسکول کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں ایک سیاست زدہ ہم مکتب سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ حکومت نے مولانا سالک کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس بے چارے کا یہ کہنا تھا کہ سب اس پر ٹوٹ پڑے اور یک زبان ہو کر چلّائے "جھوٹ بول رہے ہو۔ انگریزوں نے افکار و حوادث کو گرفتار کیا ہے نہ کہ مولانا "سالک کو۔" اسکول کی عمارت قریب تھی۔ اس لیے بات ختم ہو گئی۔ واپسی پر ہماری ایک تیسرے درجہ کے لیڈر سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ "زمیندار" کے فکاہی کالم کا عنوان "افکار و حوادث" ہے اور مولانا سالک اس کالم میں انگریزوں سے مذاق کرتے تھے اس لیے حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا ہے۔

یہ تھا سالک صاحب سے پہلی مرتبہ غائبانہ تعارف!

—— زمانہ بدل گیا۔ حالات کی رفتار میں نمایاں تغیر رونما ہوا۔ پنجاب کی صحافت میں انقلاب پیدا ہوا۔ سالک صاحب نے اپنا "افکار و حوادث" جاری کر دیا۔ "افکار و حوادث" کا مطالعہ کبھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے بارہا یہ خیال پیدا ہوا کہ سالک صاحب سے ملاقات کی جائے لیکن حالات نے اتنی مہلت نہ دی کہ ہندوستان کے اس مایہ ناز ادیب سے چند باتیں کر سکوں۔

گردشِ زمانہ نے راقم الحروف کو رنگون پہنچا دیا۔ ایک سال تک "مجاہدانہ زندگی" بسر کرنے کے بعد لاہور واپس آیا۔ چند دنوں کا قصہ ہے کہ وقارؔ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ آوارہ گردی کے لیے وقار صاحب سے زیادہ موزوں رفیق لاہور میں نہیں مل سکتا۔

"چلو بھئی سالک کے ہاں چلیں۔"

"میری ان سے ملاقات نہیں۔" میں نے کہا۔

"بہت اچھا۔ ذرا سالک صاحب کو بتائیں۔" وقار نے کہا۔

ہم دونوں نے راستہ میں یہ پروگرام بنا لیا۔ "انقلاب" کے دفتر میں پہنچ کر وقار صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ کا اسمِ گرامی ماچون ابراہیم ہے۔ فسادات بہ ما میں آپ کی ساری جائیداد تباہ و برباد ہو چکی ہے۔"

سالک صاحب نے مخلصانہ انداز میں میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ایک مصیبت زدہ سوداگر کی طرح نہایت آہستگی سے سالک صاحب سے مصافحہ کیا۔

"تشریف رکھیے۔" سالک صاحب نے کہا۔

میں سالک صاحب کے بالمقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے دائیں طرف وقار صاحب تھے۔ سالک صاحب نے نہایت ہمدردانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں مظلومیت کی تصویر بنا ہوا خاموش بیٹھا تھا۔ سالک صاحب نے چاہا کہ وہ مجھ سے بات چیت کریں۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ ان کے دل میں معاً یہ خیال پیدا ہوا کہ وقار صاحب سے دریافت تو کر لیں کہ برمی سوداگر اُردو زبان جانتا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے سالک صاحب کے ان الفاظ کو اس انداز سے سُنا کہ گویا کچھ نہیں سمجھ رہا۔

"آپ اُردو سمجھتے ہیں کیا؟" سالک صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے وقار صاحب سے دریافت کیا۔

"بہت کم۔" وقار صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

سالک صاحب اور وقار صاحب نے اب پنجابی میں گفتگو شروع کی۔ شاید اس خیال سے کہ کہیں برمی سوداگر اپنی داستانِ تباہی کا تذکرہ غیروں کی زبان سے سُن کر مزید غم زدہ نہ ہو جائے۔

"وقار صاحب! آخر آپ پنجاب کیوں چلے آئے۔ یہاں ان کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ انفرادی مدد سے ان کی مشکلات حل نہیں ہو سکتیں۔ بہتر یہ ہے کہ انھیں کسی اسلامی انجمن کے سپرد کر دیا جائے۔"

"سالک صاحب! یہ بیچارے تو روٹی کو ترستے ہیں۔ اجتماعی اعانت کا سوال تو بعد میں پیدا ہوگا۔ سرِدست آپ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کیجیے۔" وقار نے جواب دیا۔

میرے لیے اب ہنسی ضبط کرنا بہت دشوار تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا:۔

"راستہ میں مولوی غلام رسول مہر ملا۔ میرے کو پانچ روپیہ دیا۔ اچھا مسلمان ہے۔ اب آپ ـــــ"

سالک صاحب کی حالت اب قابلِ رحم ہو چکی تھی۔ وہ میرے سامنے ایثار اور ہمدردی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ وہ میری تباہی سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ میں حیران رہ گیا کہ دوسروں کو ہنسانے والا سالک اپنے سینے میں ایک حساس اور درد مندانہ دل لیے ہوئے ہے۔

سالک صاحب نے کاغذ کے پُرزے پر کچھ لکھا اور دفتری کے حوالے کر دیا۔ دو منٹ تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ دفتری ایک روپیہ میز پر رکھ کر چلتا بنا۔

سالک صاحب نے وقار کی طرف روپیہ بڑھاتے ہوئے کہا "ان سے کہیے کہ یہ حقیر رقم قبول کریں۔ کل ان شاء اللہ تعالیٰ

ان کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظام ہو جائے گا۔"

وقار صاحب نے روپیہ میری طرف بڑھاتے ہوئے زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے بھی زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

سالک صاحب حیران تھے کہ آخر بات کیا ہے۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا:۔

"مجھے باری کہتے ہیں"

یہ تھی سالک صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

اس عجیب و غریب تعارف کے بعد اسلام اور اشتراکیت، یورپی سیاسیات اور کانگرسی وزارتوں پر گھنٹوں بحث ہوتی رہی۔ یہ تعارف اپنی نوعیت کے لحاظ سے خواہ کسی قدر "بیہودہ" ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ سالک صاحب سے ایک ہی ملاقات میں مخلصانہ اور محبانہ روابط قائم ہو گئے۔ چند ابتدائی ملاقاتوں میں جو وقت صرف ہونا تھا وہ بچ گیا۔ دوسرا نتیجہ جو اس ملاقات سے نکلا وہ یہ تھا کہ مولانا سالک کی انسانی ہمدردی، شرافت اور مسافر نوازی نے مجھے سالک کا گردیدہ بنا دیا۔

عاشق جالندھری

محمود نظامی

یہ سعادت بھی جالندھر کے حصّے میں آئی تھی کہ جہاں اس کی مردم خیز خاک سے فردوسیٔ اسلام پیدا ہوئے وہاں ابوالحمقاء میاں محمد صاحب عاشقؔ کی مٹی کو بھی یہیں سے خمیر حاصل ہوا۔ بہت کم لوگ ان کے کلام سے واقف ہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں جب کہ اردو ادب کے علمی اور فنی مطالعہ پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔ ان کی جلیل القدر شاعری اس امر کی مستحق تھی کہ کوئی صاحبِ نظر ان کے کلام کی صحیح حیثیت سے لوگوں کو روشناس کراتا۔ گو میرا یہ منصب نہیں کہ میں ان کے افکار و اشعار کے متعلق کوئی سیر حاصل تبصرہ کروں۔ لیکن آج کی صحبت میں آپ کی خدمت میں ان کے کلام کے چند نمونے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تعجب کسی صاحبِ ذوق کو اس میں دلچسپی کا سامان نظر آ جائے اور وہ اس عالی مرتبت جلیل القدر شاعر کے جلیل القدر ادبی کارنامے کو تعلیم یافتہ طبقہ سے روشناس کرا کے ادبِ اردو کی قرار واقعی دیرپا اور معتدبہ خدمت انجام دے سکے۔

عاشق جالندھری بستی غزاں جالندھر کے رہنے والے ہیں۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو حضرت عاشق کہاں کے ہیں
بستی غزاں میں رہتے ہیں بستی غزاں کے ہیں

ان کے نزدیک شاعری پیشہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ ان کی طبیعت کا ذوق ہے جو شعروں میں اپنے معنی اور نزاکت بیان کرتا ہے ورنہ عام زندگی میں وہ اردلی کے عہدے پر فائز ہیں۔ جس کے ساتھ ساتھ پہلوانی کا بھی شوق ہے۔ اپنی پہلوانی کے متعلق ارشاد کرتے ہیں ؎

خوش ہو کے کہتے ہیں وہ مرے داؤ پیچ پہ
معشوق ہم جو ہیں تو اسی پہلواں کے ہیں

اپنے اردلی ہونے کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اچھی کہی کہ عشق کا مگدر اٹھائیے !
بندہ تو اردلی ہے فقط، پہلواں نہیں

یہاں پہلوان ہونے سے جو انکار ہے وہ ہماری تہذیب کے مطابق بطور انکسار کیا ہے۔ ورنہ ان کی شاعری سے ان کی پہلوانی کسی طرح کم نہیں۔ آپ کی شکل و شمائل اور عادات و خصائل کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آپ میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو شعرائے اردو میں فرداً فرداً پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ آپ کا رنگ جناب داغؔ سے ملتا ہے اور اس پہ طرہ یہ کہ چیچک

رو واقع ہوئے ہیں اور اس خصوصیت میں استاد ذوقؔ سے کسی طرح کم نہیں۔ پہلوانی میں آپ اپنے زمانے کے ناسخؔ ہیں، مزاج عاشق کا پایا ہے۔ بد دماغی میں میرؔ کے ہمسر ہیں اور ملنے میں سوداؔئی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک اور خصوصیت جو غالباً شاہ آبروؔ کے سوا کسی استاد کو نصیب نہیں ہوئی، وہ آپ میں موجود ہے اور وہ یہ کہ آپ بفضلِ تعالیٰ واحد العینین ہیں اور اس رعایت سے سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف ایک جگہ اشارہ کرتے ہیں ؎

اک آنکھ ہے عروسِ عدم سے مری دو چار
اک آنکھ وقف ہے ترے دیدار کے لیے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں عشق میں کھل جاتی ہیں آنکھیں عاشق
میں تو کانا ہی رہا یار پہ شیدا ہو کر

ایک اور مقطع ہے ؎

گو کسی کام کا ہوتا نہیں بھینگا معشوق   کانے عاشق کو ملے مفت تو مہنگا کیا ہے

ایک اور مقطع سُنیے ؎

قیس و فرہاد لے عاشق کو نہ مانا مرشد   عقل کے اندھوں نے کچھ قدر نہ کی کانے کی

میرے خیال میں عاشقؔ کی شاعری کے متعلق کوئی رائے دینے سے پیشتر میں آپ کی خدمت میں ان کی ایک غزل سُنا دوں، فرماتے ہیں ؎

ذائقہ چکھ کے وہ کہنے لگا بالائی کا   کاش میں چھوکرا ہوتا کسی حلوائی کا
پیٹ پھولا ہے ہوا سے بُت ہرجائی کا   کیا کرے دائی یہاں کام نہیں دائی کا
اونٹ جب اٹھتا ہے جنگل میں جمائی لیکر   یاد آ جاتا ہے نقشہ تری انگڑائی کا
باتوں باتوں میں اڑا لے گیا اوزار تمام   آج اس شوخ نے سر مونڈ لیا نائی کا
میری بوسیدہ لنگوٹی پہ وہ کیوں ہنستے ہیں   جن کی پتلون میں پیوند ہے نکٹائی کا
دو ہی دن چلتے ہیں معشوق جو بازاری ہیں   اے خدا بھیج مجھے کوئی حسیں سائی کا

ایک اور غزل سُن لیجیے تاکہ آپ کو رائے قائم کرنے میں دِقت نہ ہو ؎

کچھ تو آزارِ محبت کی داد دو مجھ کو   خود نہیں ملتے تو بھائی سے ملا دو مجھ کو
یاں لنگوٹی بھی نہیں اور وہ بُت کہتا ہے   سوٹ انگلینڈ سے دو چار منگا دو مجھ کو
دیکھو ترساؤ نہ یوں شربتِ دیدار سے تم   گر پیالہ نہیں لوٹے سے پلا دو مجھ کو
کھٹکھٹایا مرا دروازہ جو اغیار نے رات   ڈر کے وہ بولے کہ بھوسے میں چھپا دو مجھ کو

اس کلام سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ انھوں نے ایسے الفاظ اور خیالات سے بہت فائدہ اٹھایا ہے جن کو شعراء ادنیٰ اور بازاری سمجھ کے چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ یہ امور مروجہ روش شاعری سے میل نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے عام شعراء ان کو سوقیانہ سمجھ کر ترک کرتے ہیں اور شعر میں ان کو شامل کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ عاشق نے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ و خیالات کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جن کو ظاہر بیں نگاہیں نہیں دیکھ سکیں۔ شاید آپ میں سے کوئی صاحب عاشق پہ الزام لگائیں کہ وہ معمولی قسم کے شاعر ہیں جو اپنے غیر مہذب اشعار سے بازاری لوگوں کا دل خوش کیا کرتے ہیں مگر جو چیز ان کی خامی اور نقص سمجھی جائے گی وہی میری رائے میں فی الحقیقت ان کی بڑی خصوصیت اور صفت ہے کیونکہ ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات اور جذبات اور انسانی بول چال کو خود ان ہی کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں اور روزمرہ کے معاملات کا سچا فوٹو من و عن کھینچ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا بیان ہر درجہ دلچسپ اور نیچرل رہتا ہے اور تصنّع اور بناوٹ ان کے کلام میں مطلق نہیں رہتی مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

شیخ اندھے سے جو ٹکرایا تو اندھے نے کہا
میں تو اندھا تھا ہی بھڑوے تو بھی اندھا ہو گیا

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اندھے کے اندازِ تکلم کو کس قدر نیچرل انداز میں پیش کیا ہے۔

مشرقی شاعری میں عاشق کے دل کی حیثیت فاؤنٹین پن یا گھڑی سے زائد نہیں جسے وہ جیب میں ڈالے پھرتے ہیں اور حسبِ ضرورت کبھی کسی کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں، کبھی میز پر ڈال دیتے ہیں، کبھی کہتے ہیں ؎

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

کبھی پھیری والوں کی طرح اس جنسِ بے مایہ پر گلی کوچوں میں سودا چکاتے پھرتے ہیں۔ جلال لکھنوی کہتے ہیں ؎

جلد دل کا فیصلہ کچھ ہو چکے
لے چکو سودا یہ جتنے کر چکے

خیر یہ تو خوانچہ فروش تھے جو سالم دل کے "سٹاکسٹ" تھے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دل کو کاٹ کاٹ ٹکڑوں کی صورت میں فروخت کر دیتے ہیں۔ غنیمت کہتے ہیں ع

کہ من سی پارۂ دل می فروشم

اور آپ نے خوانچہ فروش کی یہ صدا بھی سُنی ہوگی ع

من قاش فروشِ دل صد پارۂ خویشم

ایسا بھی ہوتا ہے کہ گاہک سے سودا نہیں بنتا۔ قیمت پہ تکرار شروع ہو جاتی ہے اور خوانچہ فروش اپنا مال اٹھا کر دوسری گلی میں "تازہ دل ٹکے سیر" کی صدا بلند کرتا ہے۔ ذوق کہتے ہیں ؎

مال جب اس نے بہت ردّ و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

کبھی کبھی یہ چیز جیب سے گر کھو بھی جاتی ہے، اور آتے جاتے کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ بیچارے مرزا غالب کا دل تو آئے دن ان کی جیب کے کسی پھٹے ہوئے گوشے سے ٹپک پڑتا تھا اور ان کو شکایت کرنا پڑتی تھی کہ ؎

کہتے ہیں نہ دیں گے دل گر ہم نے پڑا پایا

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مشرقی عاشق کا دل ایک ایسی چیز ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے عید بقر عید پر تحفہ کے طور پہ دیا جا سکتا ہے۔" چھابڑی میں ڈال کر گلی کوچوں میں بیچا جا سکتا ہے۔ جیب پھٹی ہوئی ہو تو گر بھی سکتا ہے اور اگر اٹھائی گیرے گھات میں ہوں تو جیب کو کتر کر اسے صاف اڑایا بھی جا سکتا ہے۔ اسی خوف سے عاشق جالندھری اپنا دل رومال کے ایک کونے میں مضبوطی سے باندھ کر رکھتے تھے۔ مگر ایک مرتبہ ایک ایسی محفل میں چلے گئے جہاں چور لے باتوں میں لگا کر ان کا دل صاف غائب کر دیا۔ اب ان کو رومال کی ضرورت ہوئی اور ہاتھ جیب میں ڈالا تو کیسہ خالی، سر پیٹ کر اپنے محبوب سے کہتے ہیں ؎

تم نہیں تو کون ہے جس نے چُرایا میرا دل
کوئی تو آخر اُچکا اس بھری محفل میں ہے

مگر وہ بزرگوار بھی گرگِ باراں دیدہ تھا، ایسے مواقع کے لیے پہلے ہی سے تیار تھے۔ چنانچہ عاشق کہتے ہیں ؎

جانتا ہے کہ یہاں کون تلاشی لے گا ؟
دل مرا یار نے نیفے میں چھپا رکھا ہے

حُسن کہیں ہو کسی شکل میں ہو انسان کا دل اس کی طرف ایک اضطراری کشش سے کھنچتا ہے۔ عاشق جالندھری کے دل میں تو حُسن و لطافت کی دنیا آباد ہے۔ جب اس کی نظریں قدرت کی چمن آرائی پر پڑتی ہیں تو اس کی آنکھوں میں حُسن کا نشہ سا چڑھ جاتا ہے اور وہ عالمِ مستی میں جھوم جھوم کر قدرت کے ان دل افروز مظاہر کی قدر کرنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہر جگہ رہتا ہوں میں حُسن کا شیدا ہو کر
کہیں آتو کہیں نتھو کہیں خیرا ہو کر

عاشق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے محبوب میں حُسن کے ظاہری لوازم اور معینہ خواص تلاش کرے۔ اس کی محبت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس میں سن و سال، حسن و رنگ کی تمام قیود عنقا ہیں کیونکہ خود لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

جمالِ شخص نہ چشم است و زلف و عارض و خال
ہزار نکتہ دریں کاروبار دلداری است

رندؔ لکھنوی کہتے ہیں ؎

نہ عارض نہ زلفِ دوتا دیکھتے ہیں   خدا جانے ہم تم میں کیا دیکھتے ہیں

اسی طرح جب انسان کا دل کسی شئے پر فریفتہ ہوتا ہے تو اس کے لیے عقل و خرد کے مجہول دائرے میں مقید رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالبؔ کا تجربہ ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عاشقؔ جالندھری بھی عشق پر زور نہیں رکھتے اور ان کا دل کائنات کے ہر اس ذرّے سے وابستہ ہو جاتا ہے جس میں ان کے لیے زرّہ بھر بھی کشش کا سامان موجود ہے۔ انھیں اگر بچّے سے محبت ہے تو بوڑھے سے عشق ہے۔ اگر بھینگے سے الفت ہے تو گنجے سے بھی پیار ہے۔ اگر وہ یہ کہتے ہیں ؎

آنا شلا کے اپنے نواسوں کو جلد تم
ایسا نہ ہو کہ بیٹھ رہوں انتظار میں

تو یہ بھی کہتے ہیں ؎

کیا نہیں ہوتے کہیں ساٹھ برس کے معشوق   آئینہ لے کے تو دیکھو ابھی بگڑا کیا ہے

ممکن ہے آخری شعر پہ آپ یہ اعتراض جڑ دیں کہ یہ خلافِ حقیقت واقعہ ہے مگر شاید آپ حافظؔ کا یہ شعر بھول چکے ہیں ؎

آں دل نہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُروش بہ یک نگاہے

عاشقؔ ایک صاحبِ دل شاعر، ایک جانباز عاشق ہے جو اپنے محبوب کا در کسی حالت میں نہیں چھوڑتا۔ فرماتے ہیں ؎

کیا خبر تھی مجھے دل دینے سے پہلے یارب
یار کا حُلیہ بگڑ جائے گا لقوا ہو کر

اس شعر میں بالکل میرؔ کا یاس و حرماں ہے۔ وہی درد و سوز ہے، وہی اثر اور تڑپ ہے۔ اگر یہی شعر میرؔ کی زبان سے نکلتا تو اس کے نشتروں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اسی جذبۂ وفا شعاری کے ماتحت اپنی ایک اور کیفیت کا ذکر کرتے ہیں ؎

وائے قسمت شامِ وعدہ اس قدر اولے پڑے
میرے گھر تک آتے آتے یار گنجا ہو گیا

عاشقؔ جالندھری کا جذبۂ عشق و وارفتگی اس قدر بسیط ہے کہ اسے اپنے محبوب ہی کی ذات میں تجلیاتِ حسن کا پرتو نظر نہیں آتا بلکہ اس کے نزدیک ہر وہ شئے جو اس کے محبوب سے متعلق ہے حسن و دلکشی کی آماجگاہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اس عشوہ گر کی بھینس کے انداز دیکھ کر
قربان اونٹ اور تصدق گدھا ہوا

عاشقؔ جالندھری کا رنگ اس قدر جدید ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں پرانی روش کو یک قلم موقوف کر دیا ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات آپ کے ذہن نشین ہو جائے گی۔ سُنیئے :-

(۱) یہ پرانی طرز کے عشق کے معاملات کے برعکس اپنے اشعار میں جدید روشنی کے عشق کا حال قلمبند کرتے ہیں ؎

گر کوئی پوچھے تو اپنا باپ ہی کہنا مجھے   بات یہ میں نے ہے ان کو خوب سمجھائی ہوئی
پہلے دشمن کو پھر ان کے باپ کو راضی کیا   جب کہیں جا کر میری ان سے شناسائی ہوئی

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

غیر سے کہنے لگے وہ دیکھ کر میری شبیہ   یہ ہمارے آنریری باپ کی تصویر ہے

(۲) ہمارے شعراء کی ایک بہت پرانی روش یہ تھی کہ وہ رقیب سے ہمیشہ خائف رہتے اور عورتوں کی طرح اس کے حق میں بددعائیں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے مگر عاشق جالندھری رقیب سے ڈرنا تو درکنار الٹا اس سے جرأت پیزار کرنے سے بھی نہیں جھجکتے۔ گو رقابت کے سلسلے میں انھیں اپنی زندگی کے بہت سے تلخ تجربات اٹھانا پڑے جیسے ؎

کیا تھی خبر رقیب ہے مجسٹریٹ بھی
ان کو بلا کے جیل میں جانا پڑا مجھے

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

سر کرائیں تو سہی آپ عدو کا ننگا   میں بھی دیکھوں مرے پاؤں میں جوتا کیسا

اور سُنیئے ؎

رقیبوں کو انھی کے گھر پہ جا کر ڈانٹ آتا ہوں   سمجھتا ہوں کہ یہ چوہے نہ نکلیں گے کبھی بل سے

(۳) غزل کی ایک مذموم روش صید و صیاد کے معاملات کا تذکرہ تھا۔ اس میں شاعر اپنے تئیں پرندہ بنا کر پنجرے میں ڈالتا تھا، پھر چڑیمار کی جان کو سو سو صلواتیں سناتا تھا۔ آخر کار ان بچوں کو یاد کرتا کرتا جاں بحق ہو جاتا تھا جنھیں گرفتاری سے قبل اس نے گھونسلے کے اندر اپنے انڈوں سے نکالا تھا۔ عاشق کہتے ہیں کہ قفس کے گوشے میں منتقل ہونے کیلیے اپنے تئیں پرندہ کیوں متصور کرتے ہو۔ کیا انسان کو پنجرے کے اندر بند نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ صیاد اور جال سے ڈرنے کی بجائے فخریہ کہتے ہیں ؎

جو ہوتے ہم کسی پنجرے کی زینت   دوبالا شان ہوتی چڑیا گھر کی

اپنے مرثیہ میں فرماتے ہیں ؎

آہ سونا پڑا ہے چڑیا گھر   اس کی رونق بڑھائے گا اب کون؟

(۴) محبوب کے لباس کے متعلق ہمارے شعراء کی جو روایات ہیں وہ آپ سے مخفی نہیں۔ اس کی کجکلاہی اور زرخوش پوشی کی کیفیت کا رونا ہر جگہ نظر آتا ہے بلکہ اس کی آرائش و تزئین کا تذکرہ بھی عام رہتا ہے۔ خواجہ آتش ؎

وہ ہیں مصروف آرائش نہ دھوکا کھائیو اے دل
ارے بجلی بھی ہوتی ہے پری زادوں کے زیور میں

اسی طرح غالب کہتے ہیں ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مگر چونکہ عاشق جالندھری کے محبوب کو اپنے باطنی اور ظاہری حسن کی وجہ سے ظاہری لباس کی ضرورت نہیں۔ اس لیے انہوں نے سرے ہی سے اس کا فیصلہ کر دیا ہے ؎

سادگی دیکھے کوئی آ کر مرے جلاد کی　　　ہے فقط تن پر لنگوٹی ہاتھ میں شمشیر ہے

(۵) پرانے زمانے میں اگر کوئی شخص کسی کو سمجھاتا بجھاتا تو دوسرا وضعداری کے خیال سے بہ خاموشی تمام اس کی تلقین کو سن لیتا۔ ہمارے شاعر بھی بیچارے ناصح کی ہر بات کو سننے کے لیے تیار ہو جاتے۔ مگر عاشق جالندھری کے نزدیک چونکہ محبت دو دلوں کا ایسا معاملہ ہے جس میں کسی تیسرے کو دخل دینے کا حق حاصل نہیں۔ اس لیے وہ غالب کے برعکس "دیدہ و دل فرشِ راہ" کرنے کی بجائے الٹا حضرت ناصح کو سرزنش کرنا پسند کرتے ہیں ؎

بے دھڑک محفلِ زنداں میں جو آیا ناصح　　　بہرِ تعظیم اٹھا بانس کا ڈنڈا کیسا !

اس پر بھی جب ناصح کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہوتا تو وہ اس کے ساتھ عملی مذاق تک سے نہیں چوکتے۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

کیا تھی اسے خبر کہ ہے لوٹے میں شوربا　　　ناصح کا حال وقتِ طہارت تو دیکھیے

(۶) یہ تو تھی غزل کے پرانے مضامین میں تبدیلی، اب معنوی تبدیلی بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں کمان و تیر، خنجر و شمشیر کا ذکر بھی اکثر آتا ہے۔ یہ ایسے تشبیہات ہیں جن سے ناز و ادا مراد ہوتی ہے اور یہ تشبیہات و استعارات ہمارے شعراء کے دماغوں پہ اس قدر مستولی تھے کہ خود غالب چلا اٹھا ؎

مطلب ہے ناز و غمزہ مگر گفتگو میں کام　　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مگر عاشق نے خنجرِ ناز اور شمشیرِ ادا کے مجہول استعارات کو بدل کر اپنے لیے نئی راہ نکالی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ادائے ناز کی گھوڑی اگر نہیں سرکش　　　نگاہِ شوق کا ٹٹو بھی بد لگام نہیں

آخر میں ان کی دو غزلوں کے چند شعر سن لیجیے ؎

آپ الجھے ہوئے ہیں کس شے پر　　　یہ لنگوٹی ہے تولیہ تو نہیں
تیرے ابا کی کیا مجھے پروا　　　تیرا ابا مرا خدا تو نہیں
خود سمجھ جائے گا ہماری بات　　　شیخ انسان ہے گدھا تو نہیں

کالکا کا ہو کہ ڈیرہ دون کا　　　ہر حسیں پیاسا ہے میرے خون کا
خود تو وہ چلتے ہوئے بھوپال کو　　　دے دیا مجھ کو ٹکٹ رنگون کا
اس قدر ہے گرمیٔ عشقِ بتاں　　　ہے دسمبر پہ بھی دھوکا جون کا
دم بدم کہتا ہوں ان سے حالِ دل　　　قافیہ ہے تنگ ٹیلیفون کا

اگر شیطان مر جائے

عطاء اللہ سجاد

میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ زمانہ مردہ پرست واقع ہوا ہے۔ جب تک کوئی شخص زندہ رہتا ہے اس کے خلاف ہزاروں زبانیں زہر اگلتی ہیں۔ وہ اپنی بدکاریوں، غداریوں اور بے ایمانیوں کے لیے انگشت نما رہتا ہے (یہ اور بات ہے کہ ان الزامات کی صداقت اور عدم صداقت کا امتحان نہ کیا جائے)، لیکن موت اس کے تمام عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کے مخالفین جب یہ سنتے ہیں کہ وہ دنیا کی فضا میں آخری سانس لے چکا ہے تو ان کا لب و لہجہ فوراً بدل جاتا ہے اور وہی شخص جو کچھ عرصہ پہلے ان کی نظر میں دنیا جہان کی برائیوں کا منبع ہوتا ہے دفعتہً حسن اخلاق اور دیانت و امانت کا دلکش پیکر بن جاتا ہے۔ اس دلچسپ تمثیل کا ایک پہلو یہ ہے کہ مرنے والا خود اس مدحت سرائی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اور شاید اس کے دشمن دل ہی دل میں کہتے ہوں" وہ ایک ایسے جہان میں پہنچ گیا ہے جہاں ہماری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے ہمیں اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے منہ سے اپنی تعریفیں سن کر غرور سے سربلند کر سکے۔"

آپ اور آپ کے دوست کسی شخص کو تمام عمر حد درجہ کا بخیل اور کنجوس مشہور کرتے رہیں گے۔ لیکن جب وہ موت سے ہم کنار ہو جائے گا تو آپ ہی میں سے کوئی شخص کہہ اٹھے گا "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" دوسرے صاحب فلسفیانہ انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہیں گے "بھائی وہ آدمی بڑا دانا تھا، شہدوں کی طرح دولت لٹاتا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ دولت کی نمائش کم ظرفوں کا کام ہے" تیسرے صاحب کہتے ہیں "لوگ کہتے ہیں" وہ دل کا بڑا سخی تھا۔ آج تک کوئی سائل دروازے سے واپس نہیں گیا" اور اس موقع پر وہ اپنی طباعی سے فائدہ اٹھا کر مرحوم کی سخاوت کے دو تین قصے ارتجالاً گھڑ دیتے ہیں اور لوگ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دنیا اپنا بہترین انسان کھو چکی ہے۔

محلے کے مولوی صاحب تمام عمر کسی آدمی کو کرسٹان، بے ایمان اور دوزخی کہتے رہیں۔ ان کی زبان ان کے خلاف سالہا سال تک تکفیر اگلتی رہے لیکن جب وہ مر جاتا ہے تو مولوی صاحب خود اسے غسل دیتے ہیں، اسے کفناتے ہیں اور اس کے بعد اپنے مقتدیوں کے سامنے مہینوں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ "واللہ کیا مسلمان تھا۔ موت کے بعد چہرے پہ جلال اور انوار کی بارش ہوتی رہی۔ مرتے وقت زبان پر کلمۂ شہادت تھا۔ مجھ سے کہنے لگے مولوی صاحب میرے کلمے کے گواہ رہیو" سیاسی لیڈر اپنے مخالفین سے ہمیشہ لفظی جنگ میں معروف رہتے ہیں۔ اسے ملک کا غدار اور ملت کا دشمن بتاتے ہیں۔ لیکن جب وہ مر جاتا ہے تو ایک عظیم الشان جلسہ جیسا انسانی سروں کا "ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر" نظر آتا ہے منعقد کیا جاتا ہے جس میں مرحوم کی ملی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ پسماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا مانگی جاتی ہے اور عوام کو بتایا جاتا ہے کہ قصرِ قومیت کا ایک بہت بڑا ستون گر پڑا۔

انھیں حقائق کے پیشِ نظر میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر شیطان آج مر جائے تو دنیا والوں کا رویّہ کیا ہو۔ شیطان ہی ایک ایسی ہستی ہے جسے خدا، اس کے فرشتوں اور کائناتِ انسانی نے ہمیشہ ملعون و مغضوب قرار دیا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کے لغات میں جس قدر ملامت کے الفاظ ہیں وہ تمام شیطان پر صرف کیے جاتے ہیں لیکن شیطان اگر آج فنا کا جام پی لے تو اس کے متعلق دنیا کا نقطۂ نظر یقیناً بدل جائے گا۔ آج جس قدر برائیاں شیطان کے سر تھوپی جا رہی ہیں تقریباً اس سے دوگنی نیکیوں کا سہرا اس کی لاش پہ باندھا جائے گا۔ دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک ایک جوش پھیل جائے گا اور بڑے بڑے اخبار نویس، شاعر، فلسفی، عالم اور سیاسی لیڈر شیطان کو خراجِ تحسین ادا کریں گے۔ عوام ایک دوسرے سے اس کی صفات بیان کریں گے "میاں جی کیسا دل گردے والا تھا۔ خدا اور اس کے سارے فرشتوں کے مقابلے میں آخر تک ڈٹا رہا۔ وہ تو عزرائیل نے موقع پا کر دبوچ لیا ورنہ یوں مر سکتا تھا۔"

"آدم کو سجدہ کرنے کی بات ہی کیا تھی۔ اتنی سی بات پہ خدا سے بگڑ گیا۔ وہ دن اور یہ دن یہ خدا کی مخالفت سے باز نہیں آیا۔"

ایک فلسفی اخبار کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے فرمائیں گے:-

> "دنیا ایک ایسی قوت سے محروم ہو گئی ہے جس نے کائنات کا توازن برقرار رکھا ہوا تھا۔ شیطان کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے آدم کو جنت کی بے عمل اور بے کیف زندگی سے نکال کر اسے حیات کی لذتوں اور رنگینیوں سے روشناس کرایا۔ اس کی موت سے زندگی پھر نیکیوں کا گہوارہ بن جائے گی۔ اگر ہم نے شیطان کی روح کو برقرار نہ رکھا تو مجھے ڈر ہے کہ دنیا ہنگاموں سے خالی ہو جائے گی اور ہم جمود اور بے حسی کے اسی جال میں گرفتار ہو جائیں گے جس سے ابتدائے آفرینش میں حضرت شیطان نے ہمیں نجات دلائی تھی۔"

ایک اخبار نویس اس کی موت پر یوں تبصرہ کریں گے:-

> "حضرت عزرائیل سے ہمیں ذاتی تعارف حاصل تھا اور ان کی موت کی خبر قارئین کو پہنچاتے وقت ہمارا دل غم سے فگار ہو رہا ہے۔ وہ دنیا کے سب سے پہلے اخبار نویس تھے اور پروپیگنڈا کا فن ان کی طباعی کا مرہونِ منت تھا۔ انھوں نے حوّا کو بہکا کر آدم اور حوّا کے خلاف جو کامیاب پروپیگنڈا کیا اس کا نتیجہ آج آپ کو اور ہمیں اس وسیع و عریض کائنات کی صورت میں نظر آ رہا ہے۔ حضرت عزرائیل کی تمام عمر ادھر ادھر پروپیگنڈا کرتے گزری۔ وہ اخبار نویسوں کے لیے منبع الہام تھے اور ان کی وفات صحافتی برادری کے لیے ایک صدمۂ جانکاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔"

بذلہ سنج شاعر اس پہ دل سوز نظمیں لکھیں گے اور تو اور علماء کے طبقے میں بھی ہلچل مچ جائے گی اور وہ کہیں گے:-

> "شیطان گمراہ کر کے ہمیں اس بات کا موقع دیتا تھا کہ ہم کفر کے فتووں کے لٹھ سے ان کی اصلاح کریں لیکن اس کی موت نے ہم سے یہ مؤثر طریقہ چھین لیا ہے۔ وہ مر چکا ہے اب دنیا میں حکومت نیکی کی ہو گی۔ افسوس کہ اب تقریریں کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی موضوع نہیں رہا۔"

سیاسی لیڈروں کو یہ خیال ستائے گا کہ شیطان کی موت سے سیاست کا بازار سرد پڑ جائے گا اور اس بات کا اثر لازمی طور پر ہماری اقتصادی حالت پر ہو گا۔ دنیا کے جنگجو ڈکٹیٹر اس بات پر افسوس کریں گے کہ اب جنگ کے لیے بہانے تراشنے کا فن انھیں کون سکھائے گا۔ وہ حسرت سے اپنے آلاتِ حرب پر نظر کریں گے اور "ہائے شیطان" پکار کر خاموش ہو جائیں گے۔ البتہ فرشتے ضرور اس واقعہ پر مسرور ہوں گے اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہیں گے "اچھا ہوا مر گیا کم بخت نے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اب جب تک خدا کوئی نیا شیطان نہیں بناتا ہم چین کریں گے۔" اور جبرائیل پکار اٹھے گا "خاموش رہو۔ وہ ہم سب کا استاد تھا۔"

درباری شاعر

محمد فاضل

پچھلے دنوں سالک صاحب نے افکار و حوادث میں اور بعض دوستوں نے شیرازہ میں ایسے شعراء کا تذکرہ کیا تھا جو اپنی شگفتہ مزاجی اور مزاح طبعی کے باعث اپنے ہاں کی علمی ادبی محفلوں کی جان ہوتے ہیں۔ اس قسم کے تذکرے ادب کے لیے بڑے مفید اور پژمردہ دماغوں کے لیے حقیقی راحت کا سبب ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست کی معرفت اسی قسم کے ایک بزرگ کے مختصر حالات مجھ تک پہنچے ہیں جو قارئین شیرازہ کی نذر ہیں۔

آپ کا نام کرم دین اور وطن مالوف چکوال ہے۔ درباری شاعر تخلص فرماتے ہیں اور بزعم خود صرف شاہانہ درباروں میں ہی اپنا کلام پڑھنا اپنی شان کے شایان سمجھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ایسے قدردان درباران کو میسر نہیں۔ اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ میرا کلام سمجھنے والے لوگ آئندہ چل کر پیدا ہوں گے۔ شاہ جارج پنجم آنجہانی کی سلور جوبلی پر قصیدے اور نظم لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور "درباری شاعر" ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔ کسی زمانے میں مدرس بھی رہے اور حکومت سے بھی شغف ہے۔ بخار اور کھانسی کی مجرّب گولیوں کے علاوہ چکوال اور چکوال کے گرد و نواح کے طلبہ کو "معجون شاعری" بھی عنایت فرماتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی روانیٔ طبع سے مجبور ہو کر اپنے اس ذکر جمیل کے صلہ میں میری ہجو ملیح بھی رقم فرما دیں۔

جہاں ایسے نادر روزگار شاعر ہوتے ہیں وہاں قدردان بھی ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کی قدر کرتے ہوئے "بزم ادب چکوال" کے قدر شناس اراکین نے آپ کو "امام دین الچکوال" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ آپ گو اس خطاب سے خوش ہیں مگر ہر نئے آدمی سے اپنا تعارف اپنے آپ کو "اقبال ثانی" کہہ کر کراتے ہیں۔

چودھری فضل حق صاحب نصیر بی اے ایل ایل بی سب جج خانیوال جب چکوال میں تھے تو ان کی علم دوستی اور شاعر نوازی کے باعث چکوال کو بھی شعر و شاعری کا زکام ہو گیا تھا۔ ان ہی کے ایماء پر ہمارے درباری شاعر نے "گلزار درباری" کے نام سے اپنا کلام طبع کرایا۔ چودھری ذکاء اللہ صاحب بسمل ایم اے اور محمد غالب صاحب اشک صحرائی نے دیباچے لکھے۔ چودھری فضل حق صاحب نے بھی تقریب کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور استاد کرم دین کا ان کے ہم مشرب دیگر شعراء سے بالعموم اور استاد امام دین گجراتی سے بالخصوص موازنہ کیا۔ "درباری شاعر" خود فخریہ فرمایا کرتے ہیں کہ میں امام دین کا استاد ہوں۔ کیونکہ اس کا کلام (اس زمانے کے کم علم لوگوں کے لیے) بے معنی ہوتا ہے اور ان کی قیود سے باہر نہیں ہوتا مگر میں ان دونوں الجھنوں سے آزاد ہوں۔ وجہ یہ کہ امام دین کے کلام کی طرح میرے

کلام کو سمجھنے والا تو اس زمانہ میں کوئی ہے نہیں باقی رہا اوزان کا سوال سو نظیر اکبر آبادی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ؎

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ س رنگی کا بلبل کے لیے دشوار ہے

افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے مجھے "گلزارِ درباری" دستیاب نہ ہو سکی۔ ورنہ ہر قسم کا نمونۂ کلام پیش کیا جاتا۔ جس قدر ان کا کلام مجھ تک پہنچا ہے وہ ذرا "جگر تھام کر" سُن لیجیے۔

شاہِ جارج پنجم آنجہانی کی سلور جوبلی پر جو "شاندار نظم" لکھی تھی اس کا مطلع ملاحظہ فرمائیے :-

اے بادِ فلک ذرا کھا کے لپک بہ منظوریٔ حق کر ذکر شاہ کی داستان کا
دہرا دے قصّہ تو ماضی حال مستقبل امر نہی مضارع کی گردان کا

یوں تو یہ نظم اپنی روایتی شان رکھتی ہے اور اپنے بحر کی طرح طویل تھی۔ افسوس! کہ میرا حافظہ اس کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ مگر ایک شعر اور سُن لیجیے جس میں شاہِ جارج کو خطاب کیا ہے اور شاہانِ سلف سے ان کا مقابلہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تیری شان ہے سب سے بالا تو ہے سب سے نرالا وہ ہیں ادنیٰ تو ہے اعلےٰ
کیا ہے مرتبہ اس جگہ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان کا

ایک دفعہ چکوال میں مشاعرہ ہوا۔ مصرعِ طرح تھا۔ ع "خود پرستی خدا پرستی ہے"۔ چکوال کے شعراء نے اپنی اپنی طبع آزمائی۔ مگر میدان بالآخر ہمارے درباری شاعر کے ہاتھ میں رہا۔ ایک لمبی غزل لکھی جس میں سے صرف تین شعر مجھے یاد ہیں ؎

آٹا مہنگا ہے کنک سستی ہے　　　خود پرستی خدا پرستی ہے
چین مجھ کو نہیں ملا ہمدم　　　ظلم کی کیا یہ بستی ہے
شاعرِ درباری کو دید کی امید نہیں　　　دیکھنے کو پر نظر ترستی ہے

جنابِ عدمؔ کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

دگرگوں اس قدر اب دل کی حالت ہوتی جاتی ہے
مری ہر سانس روداد محبت ہوتی جاتی ہے

یارانِ چکوال نے عدمؔ کی یہ غزل جھوم جھوم کر درباری شاعر صاحب کو سنائی۔ آپ بھلا کب برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے سامنے ایک کم سن شاعر کی تعریف کر کے ان کے سینے پر مونگ دلی جائے۔ فوراً ایک غزل لکھ دی۔ تین شعر حاضر ہیں ؎

محبت جس کے ساتھ چاہے دنیا میں نباہتی ہے　　　مری ہر آہ دل جوئے حسرت[1] ہوتی جاتی ہے
عشق میں اپنی ہستی کا کچھ بھی نہیں پتہ باقی　　　خدایا اس کو میں کھاتا ہوں یا یہ مجھ کو کھاتی ہے
جہاں میں سخن "شاعرِ درباری" پہ ناز کرتا ہے　　　کہ اس کی ہر سانس رودادِ محبت ہوتی جاتی ہے

---

[1] حسرت صاحب داد دیں۔

پنجابی میں "جھر جھر کرنا" قریباً چھوٹا منہ اور بڑی بات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ "جھر جھر کرنا" میں زیادہ ابتذال پایا جاتا ہے۔ ہمارے "درباری شاعر" کو ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال سوجھا کہ یہ شاعر جو "پنجتن پاک" کی تعریف میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں حقیقتاً "پنجتن پاک" کی تعریف سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ اور یوں ہی "جھر جھر" کرتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی آپ نے شاعروں کے اس "جھر جھر" کرنے کو نظم کرنا چاہا۔ چنانچہ ایک مسدس کی ابتدا کی جس میں "جھر جھر" کو نہایت خوبی سے نباہ گئے فرماتے ہیں :-

وہ بڑی شان والا قائم تخت اوپر پہ پہ پہ پہ
محمدؐ رسول اللہ سرور در در در در در در
علی حیدر کرار شکن خیبر بر بر بر بر بر بر
حسنین شریفین برتر تر تر تر تر تر تر
شاعر درباری کون تعریف ان کی کر سکتا ہے
صفت کی کرتے ہیں سب جھر جھر جھر جھر

الغرض استاد کرم دین المتخلص بہ "شاعر درباری" یا "درباری شاعر" کا دم چکوال میں غنیمت ہے۔ ایسے لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں ؟ چونکہ حسین حیات ہیں۔ اس لیے ان کی خدمت میں میرا مخلصانہ سلام پہنچے -

اُستاد بوٹے خاں گلزار کا حال

خضر تمیمی

آل انڈیا ریڈیو نے کچھ عرصے سے اردو ادب کی مستند کتابوں پر پیروڈی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ خضر تمیمی نے آبِ حیات کی پیروڈی لکھی جو ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے شائع کی جاتی ہے۔

جس وقت وہ صاحب کمال ادب کی گاڑی میں ایجاد کے گھوڑے کو جوت کر عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے سخن کے ہر موڑ سے "بچ جاؤ" "بچ جاؤ" کی آوازیں بلند کیں۔ عقدِ ثریا اس کے گھوڑے کا دانہ بنا جسے آبِ حیات میں بھگویا گیا۔ اب ایک ایسے استاد کا ذکر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ کیونکہ اس شعر کے پتلے کے گھوڑے کا بھی رونگٹا رونگٹا بیکار نہ تھا اس واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا، ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

یہ جھنڈے خاں پرچم کے بیٹے تھے جنہوں نے تیس سال تک سنٹرل ماڈل سکول کی ڈرل ماسٹری کے اکھاڑے کو اپنی جسمانی ورزشوں کے علاوہ دماغی کاوشوں سے بھی اندر کا اکھاڑا بنائے رکھا۔ ان دنوں ملحقہ ٹریننگ کالج میں نارمل اور ایس وی کی جماعتیں بھی ہوتی تھیں، جن کے طلبہ کو استاد پرچم مرحوم اصلاح بھی دیا کرتے تھے۔ ابتدا میں ان کی تنخواہ بہت کم تھی۔ اس لیے زبان کی آبیاری کے لیے وہ اپنے اشعار کو کہ فرزندان معنوی شاعر کے ہوتے ہیں، مشتاقانِ سخن میں اس طرح سے تقسیم فرماتے تھے کہ بیس تیس پرچے اپنی نیکر کی دونوں جیبوں میں بھر کر ہر شام سنٹرل ٹریننگ کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو جاتے۔ جوہرِ سخن کے پرکھنے والے جوق در جوق آتے اور خاطر خواہ انعام دے کر مختلف پرچے لے جاتے تھے۔ لطف یہ تھا کہ دو ماہ کے بعد پرچہ دینے کی بجائے آپ شاگردوں سے خود شعر کہلواتے اور انہیں سُن سُن کر خوش ہوتے۔

لطیفہ ۱۔ پرچم مرحوم سے جب اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمانے لگے کہ یہ زبان کی ترویج کا جبری طریقہ ہے کیونکہ اوّل اوّل خریدارِ سخن جب ان شاہ پاروں کو مشاعرے میں پڑھتا ہے تو وہ محسوس نہیں کرتا کہ اسے قدردانوں کے حلقے میں ایک نغز گو شاعر کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ ایک شاعر کی ہستی مسلّم ہو چکنے کے بعد اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے۔ وہ بڈھا استادِ سخن اس بات کو خوب جانتا تھا کہ اپنی شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے مبتدی کہ جبری شعر گوئی شروع کر دے گا۔ اس میں نکتہ یہ تھا کہ جن لوگوں کو شاعر نہ ہونا ہوتا تھا وہ بھی طوعاً کرہاً اس فنِ شریف کو "جزویست از پیغمبری" اختیار کر لیتے تھے۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ یہ سب انہی باکمالوں کا صدقہ ہے کہ گاؤں کے سو مدرسوں میں نوّے مدرّس شاعر ہیں اور باقی دس بھی تخلص کے سوا نہیں ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اُستاد بوٹے خاں گلزارؔ کی والدہ کے جیتے جی ان کے والد نے نکاح کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اس واقعہ سے دو ماہ بعد پیدا ہوئے تھے پرچمؔ مرحوم کو نئی دلہن سے زیادہ محبت تھی اس لیے ان کی تعلیم و تربیت میں بہت غفلت برتی گئی۔ ان کی والدہ نے چنگڑ محلہ میں ایک مکان لے رکھا تھا۔ وہ عفیفہ وہیں قناعت کی چادر اوڑھے گزران کر رہی تھی اور بوٹے خاں بھی کبھی کبھی ٹریننگ کالج کی سڑک والی دیوار پہ بیٹھ کر اپنے والد بزرگوار کے احکام اور ان کی فوری تعمیل کے منظر دور ہی سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ ان کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ بچپن میں ان کی والدہ کہیں چکی پیسنے گئی تھی۔ یہ جھولے میں پڑے رو رہے تھے کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور ان کے ہاں سے ایک روٹی لیکر چلتا بنا۔ انہوں نے اپنی توتلی زبان میں کتے کی آمد اور روٹی کی گمشدگی کی داستان کو ایسے دلآویز طریقے سے ادا کیا کہ ماں کو روٹی کھونے کا غم جاتا رہا اور انہوں نے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور اپنے خاوند کے خلاف دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے پیش گوئی کی کہ اس موئے سے یہ بچہ ہزار درجے اچھا شاعر ہوگا۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی والدہ کی دعا کا اثر تھا۔

وحیدی سلمہٗ (کہ مستند نشانی بزرگوں کی ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے خود بوٹے خاں کی والدہ سے جب اس واقعہ کی صحت کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے یاد کر کے اس کی تصدیق کی اور کہا کہ فی الحقیقت اس وقت بوٹے خاں کی عمر برس دن سے کچھ کم تھی۔ جھنڈے خاں پرچمؔ مرحوم اپنی ایک آواز کے ساتھ سینکڑوں گردنوں کا جھکنا دیکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے نکاح ثانی کر لیا۔ وحیدی صاحب لکھتے ہیں کہ نکاح ثانی سے تین ماہ پیشتر انہیں محکمہ تعلیم میں اگلا گریڈ بھی مل گیا تھا اس لیے آئندہ فراغت کے پیشِ نظر انہوں نے بیاہ کیا۔ اگرچہ باپ نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی حصہ نہ لیا تھا لیکن ان کے شاگردانِ تعلیمی کہ اکثر ان میں سے شاگردانِ معنوی بھی تھے۔ یہ شاباش ہے کہ ان میں سے بعض ننھے بوٹے خاں کو بزرگوں کی نشانی سمجھ کر گلے کا تعویذ بنائے پھرتے تھے اور جس سے جو کچھ بن پڑتا تھا اپنے استاد زادے کی خدمت سے دریغ نہ کرتا تھا۔ ان شاگردوں میں فخر کا طرّہ دستار منشی جیون بخش اجلؔ مرحوم کو ملا۔ جنہوں نے ہمت کی کمر باندھ کر ایک جمعۃ الوداع کو شاہی مسجد لاہور میں چندہ کر کے بوٹے خاں کے لیے ایک گھوڑا اور تانگہ خریدا۔ جس سے یہ دونوں ماں بیٹا فراغت سے گزران کرنے لگے۔ اس وقت استاد مرحوم کی عمر اکیس برس کی تھی۔ آپ نے چالیس سال کی عمر تک لاہور میں کوچوانی کی۔ وردی میں امتیاز اور بقائے دوام کا تمغہ لگایا۔ اور نقارۂ فخر کی اس آواز کو کوئی نہیں دبا سکتا کہ ایک مرتبہ بھی قانون شکنی کے سلسلے میں ان کا چالان نہیں ہوا۔

استاد کا معمول تھا کہ صبح چار بجے سے بارہ بجے تک اور پھر تین بجے شام سے رات کے ۹ بجے تک ٹانگہ چلاتے تھے اور باقی وقت مشقِ سخن کی نذر کرتے تھے۔ بارہ بجے سے تین بجے تک دوست احباب کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ شاگرد غزلیں اصلاح کو دیتے تھے لو کر انہیں ایک کھاردے کی تھیلی میں بھر کر پہلو میں رکھ دیتے تھے۔ وہ بھی بناتے تھے اور ملاقاتیوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کی محویت کا یہ عالم تھا کہ چنگڑ محلے والے مکان کی بیٹھک میں ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ آپ کی عفیفہ ماں ہمیشہ کمیٹی کے نلکے سے پانی بھرتی رہی اور استاد کو معلوم بھی نہ ہوا کہ ان کے گھر میں گنگا موجود ہے۔ ایک دن جب اندھیرے میں کہ اس گھر میں بجز شاعری کے نور کے اور کچھ نہ تھا۔ اجلؔ مرحوم کا پاؤں اس سے الجھا تو استاد نے کہا کہ ”کیا ہوا؟“ انہوں نے جواب دیا کہ کچھ یونہی نلکے سے پاؤں نے ٹکر لی ہے۔“ یہ فرمانے لگے ”یہاں نلکا بھی ہے؟“ انہوں نے عرض کی ”حضرت اسی لیے تو آپ کو یہاں لائے ہیں کہ ہر وقت پانی ملتا رہے۔“ ان کے پاس پھٹے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ”میں تو اس باغ کی آبیاری میں ایسا لگا ہوں کہ ان کے نلکے کی خبر ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر چپکے ہو رہے۔ کیا

موتیت ہے۔ کئی برس گزر جائیں۔ داڑھیکس برابر ادا کرتے رہیں اور یہ پتہ نہ ہو کہ گھر میں ملکا موجود ہے۔ خیر ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ انہوں نے دنیا کے نلکے کی طرف نہ دیکھا اور خدا نے ان کے کلام میں وہ روانی دی کہ آج پانی بھی اس کے آگے پانی بھرتا ہے۔

ایک دفعہ لاہور میں موٹر بسیں رائج ہوئیں۔ اسٹیشن سے ہائی کورٹ تک چھ پیسے کرایہ تھا۔ راستے میں جو اُترے اکنی دے۔ مشتاقانِ سخن نئی چیز پر ٹوٹ پڑے۔ حتّٰی کہ اکنی میں سالم ٹانگے کو کوئی نہ پوچھتا تھا۔ میرے دوستو! وہ زمانہ عجب زمانہ تھا۔ صبح سویرے گھوڑے کا یہ خرچ کہ چھ پیسے کا گڑ، اڑھائی آنے کا آٹا اور تین آنے کا دانہ۔ دوسرے تیسرے دن مصالحہ۔ دوپہر کو ڈنر کے طور پر ہرا چارہ۔ شام کو پھر چھ آنے کا دانہ گویا ایک روپیہ یومیہ اکیلے گھوڑے کا خرچ اس پر خانگی اخراجات مستزاد۔ اس دوران میں ایک دفعہ استاد مرحوم پر دو وقت فاقے سے گزر گئے۔ نبض شناس ماں نے کہ بیٹے کی طبیعت سے پوری طرح واقف تھی، زبانِ طعن سے ان کی ہمت کے سمند کو تازیانہ دیا کہ "تجھے ٹانگہ چلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا"۔ یہ سُن کر وہ خاموش سے ہو گئے۔ دوسرے دن ان کی والدہ کو اپنے میکے کالا شاہ کاکو جانا تھا۔ یہ راستہ اور بھیس بدل کر گاڑی کے اس ڈبے میں پہنچ گئے جس کے ایک گوشے میں اس کی ماں بیٹھی تھی۔ انہوں نے متانت کے ساتھ جیب سے ایک شیشی نکالی اور بلند آواز سے پکارے "صاحبان! ہمارے کارخانے کی دواؤں کی پہلی ہی خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے"۔ اس کے بعد آپ نے خوب زور شور سے متولے پڑھنے اور شعر رٹنے شروع کر دیئے۔ پھر انہوں نے ایک پڑیا نکالی جس میں وہ ایک ایک سونف پر کھانڈ لپیٹی گئی تھی۔ اس کی دو دو گولیاں آپ نے گاڑی میں مفت بانٹنا شروع کیں، جو آتا الغرض خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر ان کی بات کا یقین کر لیتا۔ یہ انہیں گولیاں چکھاتے تھے۔ پھر ان سے پیسے کماتے تھے۔ جن دوستوں سے راز کہہ رکھا تھا انہوں نے ان کی والدہ کو خبر کی۔ اس ماتا کی ماری نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو فی الحقیقت ادھنیوں، دھیلوں پیسوں اور کوڑیوں کے ڈھیر ان کی جیب میں کھنکنا رہے ہیں۔ اس تفریح طبع یا لیاقت ہرفنی کے اظہار کے ساتھ نکتہ یہ تھا کہ ماں بیٹے کو محض وبالِ دوش نہ سمجھے اور نہ کوچوانی کا پابند جانے۔ جس کوچے میں جائے گا کچھ اچھا ہی لے نکلے گا۔

نازک مزاجی۔ نقل۔ ایک دن آپ نے کسی موچی سے اپنا بوٹ جو بزرگوں کی نشانی تھی گٹھوایا۔ اس نے معمول سے زیادہ موٹے دھاگے کے ساتھ سیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پاس کوئی اور جوڑا نہ تھا۔ چنانچہ مجبوراً اسی کو پہننا پڑا۔ لیکن فوراً ہی پاؤں میں درد ہونے لگ گیا۔ فرماتے تھے کہ میں نے کبھی باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن رینالڈ کے سارے ناول اور منظوم ہیر رانجھا کے قصے کی تمام جزئیات گویا ان کی زبان پر تھیں۔ مگر مجھے اس پر تعجب نہیں۔ تانگے چلاتے وقت گھوڑے پر فی البدیہہ منظوم غصہ اتارتے تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ سواری کے ساتھ کرائے کا تصفیہ بھی نظم میں کرتے تھے۔ اس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ جس فن کو وہ لیے بیٹھے تھے۔ یہ سب اس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ وہ نوشادر کا ایک استعمال بھی جانتے تھے۔ جس سے بڑے بڑے قلعی گر ان کے مرید ہوتے تھے۔ دودھ دوہنے میں ایسی صفائی اور چستی برتتے تھے کہ اُ رجر اس پر تعجب کیا کرتے تھے۔ بعض جولاہوں کو ان کے فن میں قابلیت خداداد سے انہوں نے ایسی ایسی اصلاحیں دی ہیں جو آج تک دل پر نقش ہیں۔ نیل کی تجارت کے اسرار وہ جانتے تھے۔ حکمت کی گتھیاں وہ سلجھاتے تھے۔ خواب کی تعبیر میں انہیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ انسان کو دنیا بھر کے علوم سے واقفیت رکھنی چاہیئے۔ وہ اس دنیا کو ایک دلچسپ چیز سمجھتے تھے۔ خود فرماتے ہیں ؎

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ　　ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

آپ کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ اوائل عمر میں گھوڑے اور ٹانگے کا شغل اختیار کیا تھا۔ پھر ہمیشہ اس مضمون کو اپنے اشعار میں باندھا کیے۔ ذرا دیکھنا۔ کس قدر گرم مطلع ارشاد فرمایا ہے ؎

گھوڑے کو کداتا ہوا وہ شوخ اگر آوے   اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آوے

استاد مرحوم کی عمر تیس سال کی تھی جب آپ نے اپنی مشہور آفاق کتاب "گھوڑے کے جنسی تعلقات" تصنیف فرمائی۔ آپ نے علم نفسیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس میں گھوڑے کی دماغی عقلی اور جسمانی حرکات پر ایک ایسا محاکمہ کیا ہے جس کا جواب نہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس کے جس قدر خیالات بلند ہیں اتنے ہی زبان تعریف سے بالا ہے۔

لطیفہ:۔ ایک دفعہ عجیب اتفاق ہوا۔ لاہور میں جوبلی کے جشن پہ ایک مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا جس میں یوپی تک کے قسمت آزما شریک ہو رہے تھے۔ استاد گلزار مرحوم نے بھی شاگردوں کے اصرار پر ایک غزل لکھی۔ مطلع تھا ؎

نہ سرکس کا نہ منڈی کا نہ یہ بازار کا گھوڑا   لٹے گا آج دو دو ٹکہ میں گلزار کا گھوڑا

جیون بخش اجلؔ فرماتے تھے کہ اس کے بعد جب وہ اپنے ٹانگے پہ سوار ہو کر مشاعرے کو چلے تو موچی دروازے کے قریب گھوڑا بدکا اور ان کے ٹانگے کی کہیں ٹکر ہو گئی۔ اجلؔ مرحوم لکھتے ہیں کہ میں نے جوان ہو کر استاد سے پوچھا کہ حضرت کیا آپ کو پہلے ہی اس کا علم تھا؟ تو آہستہ سے فرمایا کہ بس بیٹھے بیٹھے سبھی کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ انہیں کرامات تھیں یا وہ غیب دان تھے۔ ایک حسنِ اتفاق تھا جو لطفِ طبع کے لیے لکھ دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک دفعہ مشاعرے میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا ؎

اے گلزار اگرچہ ہم کو آپ سے کوئی بیر نہیں   لیکن کچھ آثار بُرے ہیں عشق میں اب کے خیر نہیں

گھر پہنچے تو ان کی ضعیفہ بیوی اور ضعیفہ ماں دونوں برس پڑیں کہ ہم غریب آدمی ہیں دو ٹکے کی اوقات۔ موئے شاعروں کی طرح خاک پھانکنا کوئی تمہیں زیب دیتا ہے۔ اس پر بی اماں نے جھاڑو اور بیوی نے جوتوں سے اپنے حال میں مگن رہنے کی تاکید کی۔ اور وہ شرافت کا پتلا صبر و استقلال سے ان تمام مصائب کو جھیلتا رہا۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ اتفاق سے مرزا اطلو بوق شیرازی جو خود صاحبِ دیوان اور ان کے جلیل القدر شاگردوں میں سے تھے۔ مشاعرہ کے بعد پھر ان کے گھر پہ موجود تھے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد انہوں نے اس مطلع کو پڑھا اور پوچھا کہ حضور یہ کیا؟ جو کچھ زبان سے نکلتا ہے وہ بعد میں ہو جاتا ہے۔ اس پر آنکھیں بند کر کے فرمایا کہ بس ادھر ہی کا فیضان ہے۔

اخیر میں اُستاد نے تانگہ چلانا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے گھر کے قریب ہی چند احباب رات کے پردے میں قمار بازی کے ذریعے قسمت آزمائی کیا کرتے تھے۔ یہ بھی انہیں کے پاس رہتے۔ کسی کے جیتنے پر قصیدہ اور ہارنے پر مرثیہ لکھتے۔ ان کا مقولہ تھا کہ مرد وُہ ہے جسے معمولی ضروریات زندگی بھی میسر نہ ہوں اور وہ ان کے لیے تگ و دو میں مصروف رہے۔

ایک روز شاہ محمد غوث کے تکیہ کے باہر رات بسر کی۔ آپ ابھی سو ہی رہے تھے کہ الاؤ بجھ گیا اور صبح ہوتے ہوتے وہ اُستادِ یگانہ جس کے بعد اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام ہندوستان میں پیدا ہو۔ نمونیہ کی وجہ سے پاس والے راکھ کے ڈھیر کی طرح خاک کا ڈھیر ہو گیا افسوس اتنے شاگردوں کے ہوتے ہوئے کسی بے حیا کو اتنی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ اس کی تعریف وہ ہی کہتا ؎

یوں مریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے   اے کمال افسوس ہے تجھ پہ کمال افسوس ہے

جہاں رمضان رہتا تھا

مولانا اختر شیرانی ایڈیٹر "رومان" کی نظم "یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ پچھلے دنوں ایک صحبت میں مولانا کے تین عقیدت مند یعنی جناب خضر تمیمی، عزیزم عطاء اللہ سجاد اور راقم الحروف جمع ہو گئے اور باتوں باتوں میں اس نظم کا ذکر آگیا۔ مولوی خضر تمیمی کی جان پہچان کے لوگوں میں میاں رمضان ایک بنھد گوار تھے۔ "ریحانہ" کے تذکرہ میں انہیں بے اختیار وہ یاد آگئے اور چند منٹوں میں یہ ساجھے کی نظم لکھ ڈالی گئی۔ خدا کرے کہ اختر کی "ریحانہ" کے طفیل ہمارا "رمضان" بھی زندگی جاوید حاصل کرے۔

(سندباد جہازی)

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

وہ اس کوچے کا لمبردار تھا آزاد رہتا تھا

بہت مسرور رہتا تھا بہت دلشاد رہتا تھا

بشانِ قیس عامر صورتِ فرہاد رہتا تھا

جو اس کو یاد رکھتا تھا وہ اس کو یاد رہتا تھا

اور اس دالان میں اس کا چچا رحمان رہتا تھا

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

اسی چھپر تلے دن رات اس کی چارپائی تھی
یہی وہ چار کپڑے تھے اور اک میلی رضائی تھی
وہ اس دنیا کا مالک تھا یہی اس کی خدائی تھی
اور اس کوچہ کے پنواڑی سے اس کی آشنائی تھی
کبھی وہ اور کبھی یہ اس کے گھر مہمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

اسی کوچے میں آوارہ دھواں ہے اس کے حقے کا
فضا کا ذرہ ذرہ نوحہ خواں ہے اس کے حقے کا
مگر دھندلا سا خاکہ کہکشاں ہے اس کے حقے کا
ابھی ٹوٹا ہوا نیچہ نشاں ہے اس کے حقے کا
وہ حقہ جس کے دم سے اس کو اطمینان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

ہے سرمہ بیدلوں کی آنکھ کا اس کا غبار اب تک
اٹھائے پھر رہے ہیں بیلچے کچھ خاکسار اب تک
یہاں چلتا ہے لنگڑا کر ہوا کا راہوار اب تک
جھکا دیتے ہیں سر تیمور سے عالی وقار اب تک
یہیں کہتے ہیں پہلے اس سے ایم اے خان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

(شیرازہ ۱۶ دسمبر ۱۹۳۳ء)

ماڈرن غزل

حاجی لق لق

کیا ان کو حالِ دل سنانے سے فائدہ؟

ہوگا تو ہوگا نوٹ دکھانے سے فائدہ ؟

نوکِ مژہ جو دل میں چبھی دل پھڑک اٹھا

کچھ تو ہُوا ہے ٹیکہ کرانے سے فائدہ ؟

دل گم ہے اپنا چور کا لیکن پتہ نہیں

عاشق کو کیا پولیس کے تھانے سے فائدہ ؟

معلوم ہے دکھاتے ہیں وُہ ہم کو سبز باغ

لارنس باغ شام کو جانے سے فائدہ ؟

اب بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ میرے بزرگ ہو

کچھ بھی ہوا نہ شیو کرانے سے فائدہ ؟

جو نیچے جیب کے ہے مری جاں اسے چرا

عاشق کا فاؤنٹین چرانے سے فائدہ ؟

لق لق زمانہ ہم سے اٹھاتا ہے فائدے

ہم نے کچھ اٹھایا زمانے سے فائدہ

ماڈرن غزل

ضمیرؔ جعفری

غریب خانہ ہمیشہ سے جیل خانہ ہے　　مرا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ ہے
الٰہی خیر! دلِ زار و ناتواں کی خیر　　کہ آج ان کا ہر انداز ہٹلرانہ ہے
نہ جاں کی خیر نہ قلب و جگر سلامت ہیں　　وزارتِ رخِ دلدار کا زمانہ ہے
ترا وصال میسّر ہو نقدِ جاں کے عوض؟　　بڑی بلند تری "شرحِ آبیانہ" ہے
جمالِ دوست کی جاپان دوستی توبہ!　　مثالِ چین مگر عشق "فدویانہ" ہے
ہے مدعائے حقیقی تو دید ساقی کی　　شرابخانے پہ پکٹنگ تو اِک بہانہ ہے
تم آج کیوں یہ گورنر سے بن کے بیٹھے ہو　　کہو کہو مری جاں کس کو آزمانا ہے
دلوں کا فرش بچھا ہے جدھر نگاہ کرو　　تمھارا گھر بھی دلوں کا کباڑ خانہ ہے
نہ دیکھ آہ مجھے اے نگاہِ یار نہ دیکھ　　کہ آج تیرا ہر اقدام" جارحانہ" ہے

مجھے ضمیرؔ خدا کے کرم سے کیا نہ ملا
مزاج گرم، طبیعت بھی شاعرانہ ہے

چل راوی کے پار

عاشق محمد غوری

چل راوی کے پار
سجنیا
چل راوی کے پار
نہ میں بابو نہ میں منشی   جاگ اٹھی ہے قسمت تیری
میں ہوں نمبردار
سجنیا
چل راوی کے پار
ریشم کا لے سر پہ دوپٹہ   کھدر کا ہو تیرا کرتہ
اور اُونی شلوار
سجنیا
چل راوی کے پار
راہ میں ملا گر پھولوں والا   میں تجھ کو اس سے لے دوں گا
پیسے کے دو ہار
سجنیا
چل راوی کے پار
روکھی سوکھی روٹی کھا کر   لیٹ رہیں پیپل کے نیچے
پریم کی ہو جے کار
سجنیا
چل راوی کے پار
سو جائے گر قسمت اپنی   یعنی پائیں ہم کو کھوجی
پھر جو کرے کرتار
سجنیا
چل راوی کے پار

حصّۂ نثر

غالب

(۱) مرزا قربان علی بیگ خاں صاحب سالک کے نام

میری جان!

کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا ذکر کیا؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی ہو گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے۔ کہتا ہوں۔ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرامگاہ" و "عرش نشیمن" خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آئیے نجم الدولہ بہادر" ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں" اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے! اوغلان صاحب، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو"۔ بولے کیا، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا، یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

(۲) میر سرفراز حسین کے نام

سنو میاں سرفراز حسین! ہزار برس میں تم نے مجھ کو ایک خط لکھا وہ بھی اس طرح کہ جیسا جلال اسیر کہتا ہے ؎

بغیر درشکر آب است روبہا دارد

پڑھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے۔ مجھ کو کیا پیام ہے۔ کچھ نہیں، شاید دوسرے صفحہ میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب سرنامہ میرے نام کا، آغاز تحریر میں القاب میرا، پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا۔ یہ کیا سیر ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں؟ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم نہ کروگے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لیے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا تو میں اس کا جواب آنکھوں سے

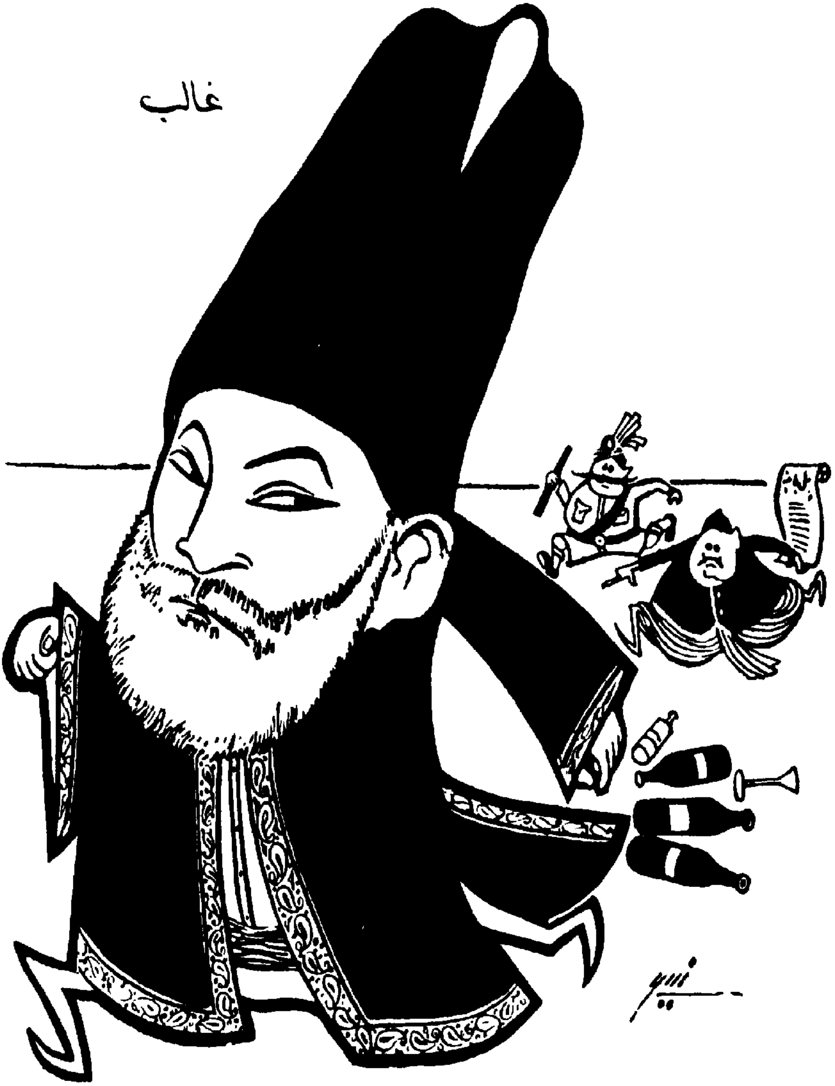
غالب

لکھوں گا اور ہاں یہاں، پھر تم نے میر اشرف علی کو کیا لکھا کہ ہم نے سنا ہے کہ چچا نے اس کا مرنا سنا ہوگا۔ اس غریب کا قول یہ ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو نہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری؟ کاش اس کے باپ کا نام لکھتے تاکہ میں جانتا کہ کون سی بھانجی مری ہے؟ اب میں کس کا نام لے کر روؤں اور کس کی فاتحہ دلاؤں؟ اس امر میں حق بجانب اس مظلوم کے ہے توضیح بقیدِ نام لکھو۔

---

(۳) منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

بھائی!

ریمیا و ہیمیا خرافات ہے۔ اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو اور افلاطون اور بوعلی یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے۔ کیمیا اور سیمیا دو علم شریف ہیں جو اشیاء کی تاثیر سے تعلق رکھے وہ کیمیا اور جو اسماء سے متعلق ہو وہ سیمیا ؎

جاں غم سیمیا نخورد گمے
دل سوئے کیمیا نیسا وردم

شعر با معنی ہوگیا۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟ زمان و زمانہ کو میں پاگل ہوں جو غلط کہوں گا؟ ہزار جگہ میں نے نظم و نثر میں زمان و زمانہ لکھا ہوگا۔

---

(۴) مرزا تفتہ

حضرت اس قصیدہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکالے ہیں لیکن افسوس کہ بے محل اللہ لے جا ہے۔ اس مدح اور اس ممدوح کا بعینہٖ وہ حال ہے کہ ایک مزبلہ پہ سیب کا یا ہی کا درخت اُگ جائے۔
خدا تم کو سلامت رکھے، دکان بے رونق کے خریدار ہو۔

---

(۵) مرزا تفتہ

لاحول ولا قوۃ! کس ملعون نے بسبب ذوقِ شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریقِ قہرِ درویش بجانِ درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے، میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

---

(۶) میر احمد حسین میکش کے نام

بھائی میکش!

آفریں، ہزار آفریں۔ تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خرمے کس مزے کے ہوں گے جن کی تاریخ ایسی ہے۔
دیکھو صاحب ع

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

تاریخ دیکھی، اس کی تاریخ کے خرمے کھائیں گے، اس کی تعریف کریں گے۔ کہیں یہ تمہارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسنِ طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے، ابھی خرمے لے کر آوے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اگر بفرضِ محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خرمے بھجواؤ گے تو ہم بھی کہیں گے تازہ نئے بہتر، بادہ سے بہتر۔ ۱۸۵۶ء۔

---

(۷) علاء الدین احمد خاں علائی کے نام

میری جان!

سُن، پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ بہ یک مژہ برہم زدن مینہ نہیں تھما۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ لیے ہیں، دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؟ تمہارے خط کا جواب ضرور، لُوٹتے جاؤ۔ مرزا امشاد علی بیگ کو تمہارا خط پڑھوا دیا۔ انہوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی معیت پر کیا موقوف ہے۔ مجھے آج سواری مل جائے کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں اونٹ ٹٹو کا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے بس!

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے ؎

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔

بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ اِدھر متھرا داس سے قرض لیا اُدھر درباری مل کو مارا۔ اِدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر اک کے پاس تمسک مُہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مُول نہ سُود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے

آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے، مول میں قسط اس کو دینی پڑے، انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ آگیا، گزارا مشکل ہوگیا، روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش۔ صبح کو تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کو شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپیہ مہینہ بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ رامپور سے وجہ مقرری اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہوگیا۔ متفرق رہا، خیر رہو، صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی، گوشت پورا آنے لگا۔

چونکہ بھائی صاحب نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی، ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا ع

اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما

دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ دریبہ کے بنیوں اور لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدتِ وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا —— مطلعِ امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی علیہ السلام۔

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب اور ان کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن بنانا ہوگا اور میں دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا۔ تاکہ مشرکین و منکرینِ نبوتِ مصطفویؐ و امامتِ مرتضویؑ اس میں جلیں۔ سنو مولوی صاحب! اگر ہٹ دھرمی نہ کروگے اور کتمانِ حق کو گناہ جانوگے تو البتہ تم کو یاد ہوگا اور کہوگے کہ ہاں یاد ہے۔ جن روزوں میں تم علاء الدین خاں کو گلستان بوستان پڑھاتے ہو اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپلچے مارے ہیں۔ نواب امین الدین خاں ان دنوں میں لوہارو ہیں، علاء الدین خاں کی والدہ نے تم کو ڈیوڑھی پر سے اٹھا دیا۔ تم باچشم پُرآب میرے پاس آئے۔ میں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف زادوں کو اور سردار زادوں کو چشم نمائی سے پڑھاتے ہیں، مارتے نہیں، تم نے بے جا کیا، آئندہ یہ حرکت نہ کرنا، تم نادم ہوئے۔ اب وہ مکتب نشین

طفل سے گزر کر پیر ہفتاد سالہ کے واعظ بنے۔ تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے۔ چوں پیر شدی حافظ …… الخ اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے۔ مجموعہ نثر جداگانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں ؎

صوفی بیا کہ آئینہ صاف است جام را   تا بنگری صفائے مئے لعل فام را
شراب ناب خور و رُخِ مہ جبیناں بیں   خلافِ مذہب آناں جمال ایناں بیں
ترسم کہ صرفہ نبرد روزِ باز خواست   نانِ حلال شیخ ز آب حرام ما
ساقی مگر وظیفۂ حافظ زیادہ داد   کآشفتہ گشت طرۂ دستار مولوی

میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں، پاخانہ ڈھ گیا، چھتیں ٹپک رہی ہیں تمھاری پھوپھی کہتی ہیں:۔ ہائے دبی، ہائے مری —— دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹہ برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو۔ اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک مرمت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

غالب

صبح یکشنبہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ء

(نوٹ) اس خط کے مضمون سے ظاہر ہے کہ حمزہ نے نواب علاؤ الدین خاں کے خط میں مرزا غالب کو لکھوایا ہوگا کہ اب بوڑھے ہو گئے ہو شراب چھوڑ دو۔ ساتھ حافظ کا یہ شعر درج کر دیا ہوگا ؎

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و سیہ مستی در عہد شباب اولیٰ

غالب نے جواب میں اسی پر طنز کی ہے۔

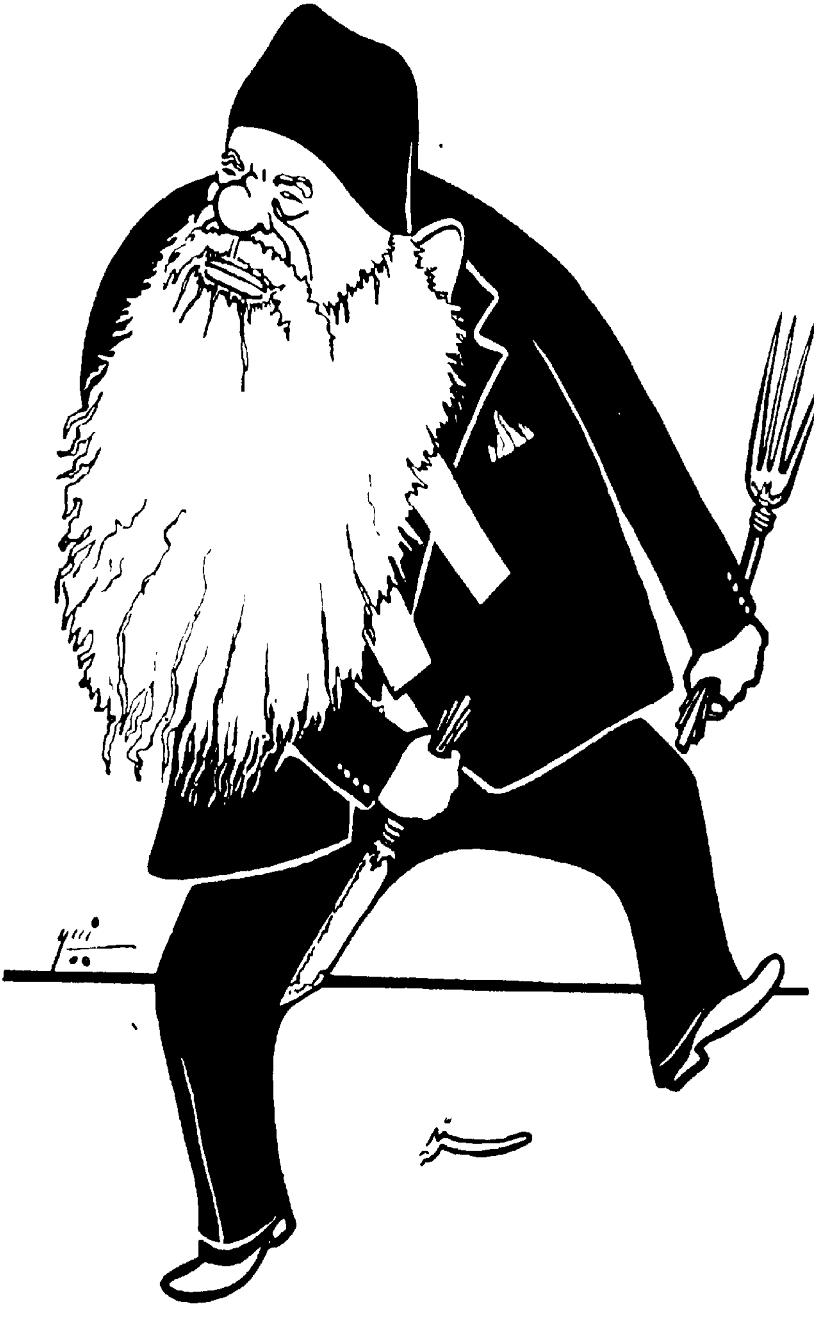

بحث و تکرار

سرسید احمد خاں

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور نحیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں، اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں، اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھبوڑا۔ جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ نحیف نحیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی اس کی مٹھی میں لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کرا کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سرہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں تو تکار تک نوبت آجاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہم وطنو! جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی

اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت رہتی ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ اور آواز وضع، الفاظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو۔ مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردید گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید مجھے دھوکہ ہوا یا میں غلط سمجھا۔ بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا۔ جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کر دو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا۔ کیونکہ جھگڑا یا بحث زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز جیسے کہ دوستی، ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جبکہ تم مجلس میں ہو۔ جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو آنے مت دو۔ کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو، اس کو جلد ختم کرو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثہ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

خط و کتابت

اگر ہم اپنی قوم کے طریقہ خط و کتابت کی درستی پر بھی کچھ لکھیں تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔ جس طرح ہماری قوم میں اور بہت سی فضول لغویات شامل ہیں اور ایسی باتیں بھی ہیں جو ہماری سمجھ میں مذہب اسلام کی عمدہ اور پُراثر باتوں کو بے اثر اور پھیکی بنا دیتی ہیں۔

جب ہم کسی خط کو پڑھتے ہیں تو اس میں ایک بہت لمبا چوڑا القاب اور آداب پاتے ہیں۔ ان دونوں میں صرف شاعرانہ الفاظ ثنا و صفت مکتوب الیہ کے ہوتے ہیں۔ جو در حقیقت مکتوب الیہ میں نہیں ہیں حالانکہ القاب میں یا تو بیگانہ وار (اگر مکتوب الیہ بیگانہ ہے) کوئی ایسا لفظ ہونا چاہیے جو خطاب کا مشعر اور مخاطب کرنے کے لیے کافی ہو۔ یا اس دلی تعلق یا ادب کو ظاہر کرتا ہو جو در حقیقت کاتب کو مکتوب الیہ سے ہو۔

آداب معلوم نہیں کیا لغو چیز ہے۔ ایشیا کے امراء اور بادشاہ ہمیشہ اس خیال میں تھے کہ جو ہم سے کمتر ہیں وہ بمنزلہ ہمارے غلاموں کے ہیں اور بدبختی سے وہ لوگ بھی اپنے تئیں ایسا ہی سمجھتے تھے۔ اور ہر قسم اور ہر موقع کی ملاقاتوں اور بات چیت میں دونوں اس خیال کو کبھی بھولتے نہ تھے۔ اس سبب سے آپس کی تحریروں میں بھی وہ رسم جاری ہوئی جو خط و کتابت کے لیے زیبا نہیں ہے۔ فضول و بے معنی وقت ضائع ہونے کے سوا آداب کے لفظوں کی رعایت دلی مطالب علی الخصوص اس زور یا جوش سے جو دل میں ہے ادا نہیں ہو سکتے۔ قوم کے دل میں جو ایک غلامانہ انفعال پڑا ہوا ہے وہ دور نہیں ہو سکتا۔ پس ہم کو امید ہے کہ ہمارے اس آرٹیکل کے پڑھنے

والے ادب میں اور خطوط میں جو آداب لکھا جاتا ہے اور نیز ادب میں اور غلامانہ القاب میں جو فرق ہے اس کو نظر انداز کریں گے۔

اس کے بعد نہایت شوق و ذوق سے اشتیاق ملاقات لکھا جاتا ہے اور خلوص عقیدت و محبت بتائی جاتی ہے جس کا ایک لفظ بھی صحیح اور واقعی نہیں ہوتا اور اگر صحیح بھی ہو تو ان کو مقدمہ مطالب بنانے سے کیا مطلب ہے۔ اس رسم نے ایسا رواج پایا ہے کہ دوست و دشمن دونوں کے خطوط کی طرز تحریر میں کچھ فرق و امتیاز نہیں رہا ہے۔ خط پڑھنے سے جو الفاظ محبت یا اشتیاق اس میں لکھے ہیں ان کا کچھ بھی اثر دل پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک معمولی تحریر سمجھی جاتی ہے جو دوست و دشمن سب کو لکھی جاتی ہے۔ خود پڑھنے والا جانتا ہے کہ میں بھی اس سے زیادہ چکنے چپڑے الفاظ لوگوں کو لکھتا ہوں جن کا کچھ بھی اثر میرے دل میں نہیں ہے۔ ان رسموں نے خط و کتابت کا جو سب سے بڑا نتیجہ ہے اور حالت و مفارقت میں محبت و اخلاص کے ازدیاد کا ذریعہ ہے اس کو بالکل خاک میں ملا دیا ہے۔

ہماری قوم کے مقدس لوگوں نے ان بنیادی تحریرات میں ایک اور مذہبی طرہ لگایا ہے۔ کوئی خط بسم اللہ الرحمن الرحیم سے خالی نہیں ہوتا۔ بہت سے بزرگ اپنے خطوط کے عنوان پر "محمدلاً" "حامداً" "مصلیاً" "مسلماً" لکھتے ہیں۔ لفافوں پر ان شاء اللہ تعالیٰ، "بعونہ تعالیٰ" "تمینہ و کمال کرمہ" تحریر فرماتے ہیں اور جن بزرگوں کا مذاق عمل اعمال کی طرف مائل ہے وہ لفافہ پر حوالہ قطمیر بھی لکھ دیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان الفاظ کی تحریر سے ہمارا خط ضرور مکتوب الیہ تک پہنچے گا۔ مگر اکثر دیکھتے ہیں کہ ان الفاظ کی کچھ بھی تاثیر نہیں ہوتی۔ ڈاک سے اکثر خط اڑا ہی لیے جاتے ہیں جو اس سے بھی ادنیٰ خیال کے لوگ ہیں وہ لفافوں پر جو بہتر بگیاں لکھ دیتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا شخص ان کے خط کو کھول کر نہ پڑھ لے۔

ہم کو نہایت افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک دل لگی بات بنا لیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت دینداری اور خدا پرستی اور نہایت ہی اتقا اور ٹھیٹ سنت پر چلنے کا کام ہے۔ حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور اس کے مقدس الفاظ و مضامین کی بے ادبی نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے اسی قسم کے برتاؤ سے اسلام کی برکت و منزلت ان کے دل میں نہیں رہی۔ بعوض اس کے کہ اسلام کی باتوں سے ان کے دل میں نیکی، خضوع اور خشوع پیدا ہو سختی اور قساوت پیدا ہوتی ہے۔

وہ بسم اللہ خط پر لکھتے ہیں۔ مگر ان سے پوچھو کہ لکھتے وقت اس پاک نام اور مقدس الفاظ کے معانی اور مطلب کا کچھ بھی خیال اور دھیان تمہارے دل میں آتا ہے جس طرح اور لفظ شوقیہ و سخت و سست قلم سے نکلے جاتے ہیں۔ اسی طرح بے خیال بسم اللہ بھی لکھ دی بلکہ میں نے غلط کہا۔ شاید اگر کسی محبوب کو خط لکھا جاتا ہو تو الفاظ شوقیہ و محبت کا کچھ اثر دل میں معلوم ہوتا ہو۔ کسی کو سخت سست لکھنے میں بھی دل میں کچھ اثر غصہ کا پیدا ہوتا ہوگا۔ مگر بسم اللہ لکھتے وقت خدا کا دھیان بھی نہیں ہوتا۔ ہم نے بڑے بڑے شخصوں کو دیکھا ہے کہ شطرنج کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور خط پر حامداً لکھ رہے ہیں۔ حے۔ الف لکھا تھا کہ بولے وہ پیادہ مرا۔ وہ پیادہ مرا پھر میم۔ دال لکھی اور کہا دہ کشت۔ اتنے میں الف لکھا اور بولے وہ مات۔ غور کرو کہ اس طرح پر مذہبی مقدس الفاظ کا برتاؤ کیا کچھ دل میں نیکی پیدا کر سکتا ہے۔

ہم نے ایسا بھی دیکھا ہے کہ خدمت گار پر خفا ہو رہے ہیں، گالیاں دے رہے ہیں اور قلم سے خط کے سرے پر بسم اللہ الرحمن الرحیم حامداً و مصلیاً لکھ رہے ہیں۔ ایک گالی پر بسم اللہ اور دوسری پر حامداً اور تیسری پر مصلیاً لکھا جا رہا ہے۔

ہم نے ایسے خط بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلیاً لکھے دیکھے ہیں جن میں تمام دنیاوی مزخرفات بھرے ہوئے ہیں۔ ان کاموں کے کرنے کے حکم اور صلاحین مندرج جو ایمانا۔ اخلاقاً شرعاً ممنوع و حرام ہیں۔ بعضے خطوں کا یہ فقرہ بھی یاد ہے کہ از دیگر حالات ہم مطلع فرمایند۔ لفظ دیگر کی تشریح ہم نہ کریں گے صرف مولوی کا یہ شعر پڑھ دیں گے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

پھر کیا ایسی سنت تحریری بجا لانے سے کچھ ایمان و اسلام کی برکت دل میں بیٹھ سکتی ہے۔

شاید یہ کہا جائے کہ یہ تو رند مشربوں کا حال ہوا۔ بزرگ و مقدس لوگوں کا لکھنا اس طرح پر نہیں ہے۔ غالباً یہ بات صحیح ہو مگر تجربہ سے، مشاہدہ سے، عقل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب مذہب کی مقدس باتوں کو دنیاوی باتوں میں ملا دیا جاتا ہے اور بطور مذہبی تقدس کے اس کو نہیں برتا جاتا تو ان کی کچھ عظمت اور ان کا کچھ اثر دل میں نہیں رہتا۔ انصاف سے کہو کہ وہ لوگ جو رات دن تسبیح ہلاتے ہوتے پھیرتے ہیں اور جہاں بیٹھتے ہیں اللہ اللہ کر رہے ہیں۔ دو باتیں کیں اور اللہ اللہ کہہ کر دانے اِدھر کے اُدھر کر دیئے۔ تین لغویات منہ سے نکالیں اور اللّٰہم صلِّ پڑھنے لگے۔ رفتہ رفتہ انگلیوں کو وہ مشق ہو گئی کہ وہ کچھ پڑھیں یا نہ پڑھیں یہ دانے اِدھر کے اُدھر کرتی چلی جاتی ہیں۔ کیا ایسے برتاؤ سے خدا کے نام کی عظمت اور برکت دل میں رہتی ہے۔ کیا اسی حالت میں خدا کا نام سنتے ہی خضوع و خشوع دل میں پیدا ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ ایسے برتاؤ سے خدا کا نام لینا اور کسی کو بدذات کہنا دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ نہ اِس کا کچھ اثر ہوتا ہے نہ اُس کا۔

ہر کام میں خدا سے مدد چاہنا اور اس کی طرف رجوع کرنا نہایت عمدہ مسئلہ ایمان و اخلاق کا ہے۔ مگر یہ ایک فعل قلبی ہے جس کے ساتھ ممکن ہے کہ زبان بھی شریک ہو۔ مگر صرف قلم سے لفافے کے سرے پر ان شاءاللہ لکھ دینا چہ معنی دارد۔ نہایت عمدہ بات ہے کہ خط کے پہنچنے میں بھی خدا پر بھروسا کرو۔ اس سے مدد چاہو۔ مگر لفافہ پر ان شاءاللہ کی چڑیا بنانے سے کیا مطلب ہے۔

میرے ایک دوست نے (جو اس قسم کے رسمیات کے نہایت پابند اور پرانے فیشن اور پرانے خیالات پر نہایت مستحکم ہیں) مجھ سے کہا کہ درحقیقت ایمان کی بات تو یہی ہے کہ جس طرح ہم خط پر مشفق، مہربان اور ایک رسم کے موافق لکھتے ہیں اسی طرح ان شاءاللہ بھی لکھ دیتے ہیں جس طرح شہر کا نام لکھا، پتہ لکھا اسی طرح ان شاءاللہ بھی لکھ دیا۔ پس اب غور کرنے کی بات ہے کہ کیا ایسی صورتوں میں اسلام کی برکتیں نصیب ہو سکتی ہیں؟ یہ اسلام کے کام ہی نہیں ہیں۔ یہ تو شغل اور رسمی باتوں کے رسمی کام ہیں۔ غیر مذہب کے لوگ جب ہمارے خطوں کے لفافے دیکھتے ہیں ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا احمق مذہب ہے جو یہ خیال بتلاتا ہے کہ ایسے لفظوں کے لکھنے سے خط تلف نہیں ہوتا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ صاحب مذہب تو احمق نہیں مگر لکھنے والے احمق ہیں۔

بعضے دوست ہم سے کہتے ہیں کہ یہ سب صحیح مگر مسلمانوں کے خطوط پر ایسے الفاظ ہونے مسلمانی کی نشانی ہے۔ مگر

نہایت ادب سے عرض کرتے ہیں کہ جناب ہم ہندوؤں کی طرح خط کے ماتھے پر قشقہ لگا کر اور گلے میں زنّار ڈال کر مسلمانی پھنسوانا نہیں چاہتے۔ اگر دل کی آنکھیں اندھی ہیں تو خط پہ بسم اللہ کا قشقہ دینے سے کچھ فائدہ نہیں۔

جناب رسولِ خدا صلعم نے اپنے فرامین پر بسم اللہ لکھی ہو۔ پھر کیا وہ نامے انہیں مضامین کے تھے اور انہیں مقاصد کے تھے۔ جن مقاصد و مطالب میں تم اپنی روزانہ خط و کتابت کرتے ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے خطوط پر بسم اللہ لکھنی سنت سمجھتا ہو تو نہایت بے ادب و گستاخ ہے اور کچھ بھی قدر و منزلت سنت کی نہیں جانتا۔ اسی بات کو تو ہم روتے ہیں کہ مسلمان مذہب کو مذہب کی طرح نہیں برتتے بلکہ اس کا کھیل بناتے ہیں۔

یہودیوں کا بھی یہی حال تھا کہ محض ظاہری باتوں کو انہوں نے یہودیت سمجھی تھی اور ان کے ہاں علماء و فقہاء جو ربّی اور قوہن کہلاتے تھے صرف ظاہری باتوں پہ چلتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے ہاں دو فرقے قائم کر رکھے تھے۔ ایک صدوقی جیسے سنیوں میں اہلحدیث اور وہابی اور شیعوں میں اخباری، دوسرا فردوسی۔ جیسے سنیوں میں فقہی اور شیعوں میں اصولی۔ یہ دونوں فرقے ذرا ذرا سی باتوں پر بحث کرتے تھے اور اسی کو کمال دینداری جانتے تھے۔ اس بات کی بڑی احتیاط کرتے تھے کہ بکرا اس قدر انگشت لمبی چھری سے تین رگڑوں میں ذبح ہو۔ مگر اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ آیا کہاں سے تھا۔ توریت کو بے طہارت چھونے اور بے لوبان جلائے کھولنے میں بہت احتیاط ہوتی تھی۔ مگر اس بات کی کہ اس میں لکھا کیا ہے کچھ پروا نہ تھی۔ مکان پر۔ مراسلوں پر۔ چھاتی پہ آیاتِ توریت کے حروف مقطعات کا نقش لگانا بہت ایمان اور اتقاء کا کام سمجھتے تھے۔ مگر جو بدی سینہ میں بھی بھری ہوتی تھی اُس کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ یہی حال بعینہٖ ہمارے زمانے کے مقدس لوگوں کا ہے۔

گول عمامہ، برج کی صورت کا عمامہ۔ عرب والوں کے عمامہ کی طرح کا عمامہ سر پہ باندھے شملہ کئی انگل کا چھوٹے اس کی تحقیق کیے اور ٹھیک گدی کے پیچھے لٹکائے۔ ریش مبارک مکنگھن پھٹکارے۔ قمیص مسنون پہنے اُس پہ صدری عربی لگائے اور اس پر عبائے کسروانی جس کو بعض کتابوں میں خسروانی منسوب الی کیخسرو کافر بادشاہ فارس لکھا ہے زیبِ تن کیے مسجد یا خانقاہ یا کسی مدرسہ اسلامی میں تشریف رکھتے ہیں۔ بعضے نہایت سادہ سیدھا دیہاتیوں کا سا لباس اپنی سادگی اور محض للہیت اور خالص بے تکلفی جتانے کو پہنے ہوئے پھرتے ہیں۔ مگر پوچھو تو سہی کہ تمہارے دل بھی کسی لباس پر تکلف یا ملبوس سادہ سے آراستہ ہیں۔ بجز اس کے کہ مسواک اتنی لمبی ہو۔ اور ڈاڑھی اتنی مٹھی۔ پئجامہ اتنا اونچا ہو اور کرتا اتنا نیچا۔ اور کچھ نہیں۔ اور اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ سب ثواب اور جو کچھ دوسرا کرے وہ سب عذاب۔ قل اتخذتم عند اللہ عھداً فلن یخلف اللہ عھدہ ام تقولون علی اللہ ما لا تعلمون۔

ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہم کو شائستہ ہونا چاہیئے۔ دنیا کے کاموں کو دنیا کی طرح اور دین کے کاموں کو دین کی طرح برتنا چاہیئے۔ دونوں کو خلط ملط کر کر بگاڑنا اور مذہبی باتوں کو دنیاوی باتوں میں گڈمڈ کر کر غیر مذہب والوں کو ہنسوانا نہیں چاہیئے۔ دنیاوی باتوں کے خطوط پر بسم اللہ نہ لکھنی درحقیقت اللہ کے نام کا ادب کرنا ہے۔ لفافے پر ان شاء اللہ کی چڑیا نہ بنانی دراصل خدا پہ بھروسا کرنا ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

ابن الوقت

ایک ڈپٹی کلکٹر انگریزوں کی مدارات کا شائق

ڈپٹی نذیر احمد

نوبل صاحب۔ بہت تعجب ہے، آپ نے یہ نوکری حاصل کرنے میں ابھی تک خود کوشش نہیں کی، اس لیے کہ میں نے عزت طلب ہندوستانیوں کو انگریزوں کی ملاقات کا مشتاق پایا اور اگر آپ نوکری کی خواہش ظاہر کریں تو میں گورنمنٹ کو سفارش کرنے کو موجود ہوں۔

ابن الوقت۔ میں آپ سے ایمان کی بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ اپنے باپ دادا کے وقت سے شاہی سرکاروں کے متوسل ہیں۔ ان سرکاروں کی ملازمت کا یہ رنگ تھا کہ چھوٹی بڑی کل خدمتیں موروثی۔ یہ کتنے اطمینان کی بات تھی کہ سارے ملازم نہ صرف اپنی بلکہ اولاد کی معاش سے بھی بے فکر تھے میں واقعات کے طور پر ان سرکاروں کے دستور اور قاعدے۔ اگرچہ یہاں کے اصول سے آپ اُن کو درست، نادرست، واجب ناواجب جو چاہیں سمجھیں۔ جرمانے، معطلی، موقوفی کا نام بھی ہمارے قلعے میں کبھی کسی نے نہیں سُنا۔ داد و دہش، انعام و اکرام کی کوئی حد نہ تھی۔ تیمور کی نسل نے کبھی روپے کو روپیہ سمجھا ہی نہیں۔ شاہی تنخواہیں، اولاد در اولاد کی اولاد پر تقسیم ہوتے ہوتے بعض کے حصے میں آنے پیسے رہ گئے تھے اور وہ بھی دو دو تین تین ڈھائی ڈھائی برس میں ملے تو ملے۔ ورنہ اکثر تنخواہیں محض برائے نام تبرک کی طرح، صرف سرکار کی داد و دہش پر نوکروں کا گزر تھا مگر وہ پیسے نوکروں کو ایسے عزیز تھے کہ مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور دہلی کی نقل مشہور ہے کہ قلعے سے ڈھائی یا تین روپے ان کی تنخواہ کے بھی تھے۔ نواب محبوب علی خاں نے تخفیف کا قلم جاری کیا تو مفتی صاحب کا نام بھی زمرہ ملازمان شاہی سے کاٹ دیا۔ مفتی صاحب کو مفتی صاحب، ایسے تین تین روپلی کی ان کے خدمت گاروں کو بھی پروا نہ تھی۔ مگر مفتی صاحب نے جب سُنا تو دہائی دیتے ہوئے حضور تک پہنچے اور آخر اپنی تنخواہ بحال کرا کر ٹلے۔ غرض قلعے کی سرکاروں کا برتاؤ نوکروں کے ساتھ ایسا تھا جیسے ماں باپ کا اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ تو صاحب میں تو ایسی سرکاروں میں رہا ہوں اور میں خود اپنے تئیں انگریزی نوکری کے قابل نہیں سمجھتا۔

میرے نسبتی بھائی ڈپٹی ہیں۔ برس دن ہوا رخصت لے کر اپنی والدہ کو حج کرانے گئے تھے۔ اب آج کل میں آنے والے ہیں۔ مزاج کے ہیں تیز، کسی حاکم سے ان کی نہیں بنتی اور برس میں دو دو بار نہیں تو بیچارے ہر برس ضرور بدلتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی آ نکلتے ہیں اور اپنے حالات بیان کیا کرتے ہیں۔ ان سے میں قیاس کرتا ہوں کہ واقع میں ایک دن بھی مجھ جیسے آدمی کا انگریزی دربار میں گزر ہونا مشکل ہے۔ میں نے اپنے بھائی صاحب سے ایک دن پوچھا تھا کہ کہیے کچھ آپ نے سرمایہ بھی جمع کیا؟ تو کہنے لگے۔ جی اللہ اللہ کرو، کیا سرمایہ۔ خدا جانے کیسے کیسے کتر بیونت کرتا ہوں کہ قرض نہ لینا پڑے۔ مجھ کو تو آئے دن کی بدلی اُدھیڑے ڈالتی ہے۔ ورنہ خدا کا فضل ہے میری تنخواہ خرچ کو کافی ہے۔ بلکہ کچھ پس انداز ہو رہتا ہے۔

میں۔ حقیقت میں آپ کو برس دن بھی کہیں جم کر رہنا نصیب نہیں ہوتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اور بھی تو ڈپٹی ہیں!

از جا نمی جنبد، برسوں سے ایک جگہ جمے بیٹھے ہیں۔

بھائی صاحب۔ خدا جانے لوگ کیا کمال کرتے ہیں۔ میں ہرچند کوشش کرتا ہوں کہ حکام کو راضی رکھوں، مگر کچھ ایسی تقدیر کی گردش ہے کہ خواہی نخواہی ناچاقی ہو ہی جاتی ہے اور بار بار کی بدلی نے مجھے اور بھی بدنام کر رکھا ہے اور لوگ میرا نام سن کر پکار اٹھتے ہیں۔ اجی! وہ لڑاکو ڈپٹی کلکٹر۔

میں — آپ نے اصل سبب اب بھی نہ بتایا کہ حکام آپ سے کیوں ناراض رہتے ہیں۔ اگر آپ کو میں سرمایہ دار دیکھتا تو شبہ کر سکتا کہ شاید آپ رشوت لیتے ہوں گے۔

بھائی صاحب۔ بات صاف صاف تو یہ ہے کہ میں رشوت نہیں لیتا اور مجھ جیسا تنگ مزاج آدمی رشوت لے بھی نہیں سکتا۔

میں۔ میں تو سنتا تھا کہ انگریز رشوت سے بہت چڑتے ہیں، اور آپ کے فرمانے سے بالکل الٹی بات معلوم ہوتی ہے۔

بھائی صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کسی مرتشی انگریز سے معاملہ نہیں پڑا۔ نہ میں نے کبھی کسی انگریز کو رشوت دی۔ انگریزوں کی بڑی رشوت کیا ہے؟ ڈالی یا دورے میں گئے تو رسد۔ یا ڈاک بٹھانے کی ضرورت ہوئی تو گھوڑا گاڑی یا شکار کو نکلے تو مانگے کے ہاتھی وغیرہ یا خاص خاص لوگوں سے شاذ و نادر تحفہ تحائف۔ سو میں ان چیزوں پر رشوت کا اطلاق نہیں کر سکتا۔ رسد میں تو اکثر نوکروں کی شرارت ہوتی ہے کہ صاحب سے بھی ایک ایک کے دو دو لیتے ہیں۔ اور بیچ میں آپ چٹ کر جاتے ہیں اور صاحب کو خبر نہیں ہونے دیتے۔ اور شاید کوئی میم والا صاحب ہوا اور میم ہوئی کفایت شعار جز رس۔ اور اس کے دھیلے انڈا اور آنے مرغی کے دام کاٹ دیئے۔ اور لکڑی گھاس مفت کہ یہ چیزیں تحصیلدار، تھانیدار اور دیہات سے ضرور بے قیمت لیتے ہیں اور کتنے ہی دام کیوں نہ دیں۔ اصلی مالکوں کو کوڑی ملنے والی نہیں تو یہاں اس کا بھی عجب نہیں۔ مگر پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ انگریزوں میں رشوت نہیں چلتی۔ مگر ان کے حصے کی بلکہ اُس سے بھی بہت زیادہ ان کے اردلی، خدمت گار، شاگرد پیشہ، پیشی کے عملے لے مرتے ہیں اور صاحب کی آنکھ، کان، زبان بلکہ ہمزاد جو کچھ کہو۔ یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص میری طرح ان ہمزادوں کو راضی نہیں رکھ سکتا تو کتنا ہی بڑا عہدیدار کیوں نہ ہو۔ اختیارات، حکومت، تنخواہ سب کچھ ہے مگر عزت نہیں۔ اور میں چاہوں تو انگریزوں کے شاگرد پیشوں کو کچھ خرچ کر کرا کے راضی کر سکتا ہوں۔ مگر مجھ کو ان کے نام کی کچھ ایسی چڑ سی آپڑی ہے کہ دوہری دوہری سواریاں رکھتا ہوں۔ خدا کے فضل سے نوکر بھی متعدد ہیں۔ مکان کا کرایہ، اخبار، کھانا، کپڑا میرا سارا خرچ میرے پندار میں اُجلا ہے۔ سال میں سیکڑوں روپے تو ہسپتال، مدرسے اور متفرق چندوں میں نکل جاتے ہوں گے۔ یہ تمام مصارف میں خوش دلی سے کرتا ہوں۔ لیکن ڈالیوں اور شاگرد پیشوں کے انعام میں مجھ سے ایک روپیہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئی اور چھوٹے بڑے صدہا انگریزوں سے میری معرفت ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔ میں انگریزوں سے ملتا ضرور ہوں مگر بہ مجبوری دفع ضرورت کے لیے کہ ایسا نہ ہو مغرور سمجھا جاؤں یا عملوں اور اردلیوں کو جو ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں چغلی کھانے کا موقع ملے۔ مجھ کو بعض ایسے کریم النفس انگریزوں سے بھی واسطہ پڑا ہے جنھوں نے صرف بہ تقاضائے انصاف کارگزاری دیکھ کر مجھ کو فائدے پہنچائے ہیں اور میں ان کا دل سے ممنون ہوں مگر انگریزوں کے عام برتاؤ سے میرا دل کچھ ایسا کھٹا ہو گیا ہے کہ جنھوں نے مجھ پر احسان کیے ہیں ان کے ساتھ بھی میں نے اس سے زیادہ راہ و رسم نہیں رکھی کہ

جب تک افسری ماتحتی کا تعلق رہا، رہا۔ جب وہ بدل گئے یا میں بدل گیا تو بھول کر بھی میں کسی کو عرضی نہیں بھیجتا۔ میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں کہ آخر زبردستی ٹھیل کر، دھکیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں تو کوٹھی پر جا کر ہمیشہ وہی بے لطفی وہی بے عزتی۔ جاڑا ہو، لوئیں چلتی ہوں۔ ہندوستانی ڈپٹی نہیں ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو۔ کلکٹر، جنٹ اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں ہیں۔ اگر یوریشین ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے (اور نہ ملے تو رہے کہاں) تو احاطے کے باہر اترنا ضرور۔ اور احاطے بھی شیطان کی آنتڑی کہ جیسے پرانے فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں۔ اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے، نوکری نذر کر آئے۔ اسی دن رپورٹ ہوئی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا۔ گویا ڈپٹی کلکٹر کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک چوکی تک پوئی نہیں تو دل کی پیشی کا بستہ لے کر بھاگ سکے۔ بس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے جھکوتیاں کرا دی ہیں تو باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹہ، آدھ گھنٹہ کھڑے دم لیا اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگی تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا۔ ہاتھ سے داڑھی مونچھ کو سنوار آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جما لیا، چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مؤدب مقطع بن کر ہاتھ باندھے، نیچی نظریں کیے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف بڑھے، خدمتگار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر ہی سے تاڑ لیا تھا۔ کوٹھی کے پاس آتے دیکھ قصداً ادھر ادھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی، باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں، کھڑے کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں، لوٹ چلیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹنے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں۔ شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کا اور اردلی لوگوں کا حال معلوم ہو گا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا اور ادھر کا رخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھ گھنٹہ (اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہو کہ دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کیے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لیے ہوئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لیے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق رکھ آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا۔ کیوں جمعدار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے؟ بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے۔ خدا جانے کب موقع آ پڑے۔ چار و ناچار اچٹتا ہوا سا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہو، اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے۔ ملاقات تو شاید ہی ہو۔ لیکن آپ بیٹھیے۔ ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں۔ یہ کہہ کر وہ پھر اندر کو جانے لگا تو آخر رہا نہ گیا اور زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں، اپنے سر پہ؟ تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، اور ایک بازو ندارد گویا بید کی تپائی لا کر ڈال دی۔ اس کے بعد سے جب جب کوئی چپراسی یا خدمتگار باہر آتا یہی معلوم ہوتا کہ ابھی صاحب غسل خانے سے نہیں نکلے۔ اب کپڑے بدل رہے ہیں۔ اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں۔ اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہو گی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں۔ پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ آنا تو پڑے ہی گا۔ دوسرے دن کیا بھروسا اتنی

محنت کیوں ضائع کی جائے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے اور صبر کرو۔ بڑی دیر کے بعد چپراسی یہ حکم لے کر نکلا کہ سررشتہ دار کو رپورٹ حوالی کے لیے بلایا ہے اب رہی سہی امید اور بھی گئی گزری ہوئی۔ تب تو اپنا سا منہ لیکر چپراسی سے کہتے ہوئے اٹھے کہ خیر میں تو اب جاتا ہوں۔ صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا۔ تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا میں دو بار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں۔ کچھ بولے نہیں۔ اب پھر کیے دیتا ہوں۔ خفا ہوں گے تو آپ میرے آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا۔ غرض بلائے گئے۔ صاحب کو دیکھا تو پائپ منہ میں لیے ٹہل رہے ہیں بس معلوم ہو گیا کہ مطلق ملاقات نہیں ہو سکتی۔ سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر ان کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں، اور کیا معلوم ہے۔ شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے سے ان کو خبر تھی۔ چپراسی نے شاید یہ بھی کہا ہو مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ ہیں۔ عین سامنے کے دروازے سے آیا۔ درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔ بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔ کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی ان کی نظر نہ پڑی ہوگی ضرور پڑی ہوگی خیر آخر آپ ہی سر اٹھایا اور ڈپٹی صاحب! حاکم بالادست ہو کر اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل کی کرسی پر جو دوسری طرف تھی، بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پہ بیٹھنا کون نہیں جانتا۔ لیکن میں تو اپنے سے زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسی پہ بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا۔ کہنے کو کرسی پہ بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر جو تڑ ٹیکے ہوں تو جیسی چاہے قسم لے لو۔ تم خدا کے بندے ہو یقین ماننا۔ بس ڈنڈے پر الگ تھلگ جیسے اڈے پہ گلدم۔ کرسی پہ بیٹھا ہی تھا کہ کمبخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ خداوند! سررشتہ دار حاضر ہیں۔ صاحب میری طرف دیکھتے جاتے ہیں اور چپراسی سے فرما رہے ہیں "اچھا آنے بولو" یعنی اچھا سررشتہ دار سے کہو۔ چلے آئیں۔ اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب دوں، اور سررشتہ دار مردود، آگے آگے آپ، پیچھے بستہ قلمدان لیے ہوئے چپراسی آ ہی گھسا۔ سررشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں "ول صاحب گرمی لوٹ"۔

میں ـــ (گردن جھکا کر) ہاں خداوند گرمی کے تو دن ہی ہیں۔ میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لو سے بھی کئی آدمی مرے۔ صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں اور دل میں یہ کہہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا ارے ظالم! تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس آیا کہ ایک بندہ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملی ہے ناظم اپنی بدذاتی سے خس کو بندھوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے اور جو واقع ہیں۔ گرمی بھر اپنے گھر ٹٹی میں رہتا ہے۔ کتنی دیر سے برآمدے میں پڑا بھن رہا ہے لاؤ سلام لے کر اس کو آزاد کر دوں۔ میں سمجھتا تھا کہ آدمیوں کا لو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی؟ کتنے آدمی مرے؟ کب مرے؟ لو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں؟ اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ کو بھی آئیں یا نہیں؟ غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب تو کچھ پی سے گئے۔ نہیں معلوم دھیان سے نہیں سُنا یا سمجھے نہیں۔ اب سررشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کاغذ پھیلا رہا ہے اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چپ۔ جب سررشتہ دار کاغذ پھیلا لگا صاحب کا منہ دیکھنے، تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں "آپ کچھ کہیگا" یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ "نہیں میں تو صرف سلام کے لیے حاضر ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے۔ جی ملنے کو چاہتا تھا" بالکل جھوٹ تھا

کس مسخرے کا جی ملنے کو چاہتا تھا اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔ ملاقات کے بامزہ اور بے مزہ ہونے کا معیار وقت ہے دیر تک ملاقات رہی۔ تو جانو کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات کیا خاک بامزہ سمجھی جائے کہ جانا اور اٹھاؤ چولھے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت سب کچھ دو ہی منٹ میں ہو ہو چکا۔ اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات کے ارادے سے گیا تھا۔ خدا گواہ ہے صرف ماتھا چھٹول وہ بھی اپنے سر کا چھدا اتارنے کے لیے۔ صاحب مجھ سے چاہتے ایک بات بھی نہ کرتے مگر سررشتہ دار اور چپراسیوں کو میرا الٹے پاؤں لوٹ آنا معلوم نہ ہوتا تو مجھ کو کچھ شکایت نہ تھی مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظروں میں ہوئی جو منصبی عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے۔ باہر نکلا تو چپراسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فرشی سلام کیا۔ الٰہی! یہ کاہے کی ایسی لمبی چوڑی تعظیم ہو رہی ہے۔ گھنٹوں میں برآمدے میں بیٹھا سوکھا کیا۔ ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہیں پڑی۔ اب یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے؟ آہا! میں اتنی جانفشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہگار ہوں۔ یہ سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لیے مجھ پر تعینات ہیں۔ ہر چند کہتا ہوں مکان پہ تنخواہ پہ دیکھا جائے گا۔ عید قریب ہے اس میں سمجھ لینا۔ بے حیا پیچھا نہیں چھوڑتے آخر میں نے ذرا ترش رو ہو کر کہا کہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ ہوتا تو دینے کا نام دینا کبھی کا دے چکا ہوتا۔ ایسی بے اعتباری ہے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلو۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوا کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بکس پر بیٹھ لے۔ اتنے میں جمعدار نے پنسل اور پرچہ کاغذ نکال میرے ہاتھ میں دیا کہ حضور ناظر کو رقعہ لکھ دیں۔ جب میں قلم اٹھاتا تھا بے ادب ہاتھ پکڑ پکڑ کر لیتے تھے۔ پہلے فرمائیے کہ آپ کیا لکھتے ہیں۔ اسی کش مکش میں بڑھتے بڑھتے میں تو آخر بگھی تک جا پہنچا۔ سائیس پٹ کھولے کھڑا ہی تھا۔ لپک کر پائدان پر پاؤں رکھ کر غڑپ بگھی کے اندر۔ سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا، اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا۔ میں نے کوچبان سے لے کر کاغذ کے پرزے میں ایک روپیہ رکھ پڑیا بنا اردلیوں کو دکھا کر پیچھے پھینک دیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا تو چپراسی نے پڑیا اٹھا لی۔ ایک روپیہ دیکھ کر یقیناً بہت ہی بگڑے ہوں گے۔ مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر نکل جا چکا تھا۔ بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک ایسا لمبا سانس لیا جیسے کوئی مزدور سر پہ سے بھاری بوجھ اتار کر۔ تمام راستہ اسی ملاقات کی ادھیڑ بن میں طے ہوا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ رشتہ دار اور چپراسیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہی۔ اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ ایسی بے حرمتی سے روٹی کمانے پر لعنت ہے۔ پھر دل کو سمجھاتا کہ عزت ایک امر اضافی ہے۔ مجھے اپنے اقران و امثال پر نظر کرنی چاہیئے۔ ان کے ساتھ بھی تو انیس بیس کے فرق سے ایسی ہی مدارات کی جاتی ہے تو جس مجلس میں سب ننگے ہیں وہاں لنگوٹی کی کیا شرم۔ اسی حیص بیص میں گھر پہنچا۔ چند آدمی منتظر ملاقات بیٹھے ہوئے تھے مگر نہ وہ ڈپٹی تھے اور نہ میں کلکٹر کہ برآمدے میں محتاج اطلاع بیٹھے ہوں۔ آئے تو میں موجود نہ تھا۔ مزے میں گاؤ تکیوں کے سہارے سے پھیل پھیل کر بیٹھے۔ گھر میں سے پان آ گئے۔ آدمیوں نے حقے بھر دیئے۔ جوں ہی مجھ کو دیکھا ایک صاحب بولے اللہ اکبر، ڈپٹی صاحب! آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی۔ کن وقتوں سے میں آپ آپ کا منتظر بیٹھا ہوں۔ دوسرے صاحب "آج بندے کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کہا آج کسی کی دال نہیں گلتی۔" تیسرے صاحب مدت سے جدید تحصیلداری قائم ہونے کی خبر تھی۔ یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آ چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اسی انتظام کے صلاح مشورے میں دیر لگی۔ لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اتارتا جاتا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا ہے خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔

سائمن کمیشن اور ہندوستان

محمد علی جوہر

بھائیو! یہ گلا تو میں نے پھانسی کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ مگر آپ مجھے شور مچا کر مجبور کرتے ہیں کہ میں اسے تقریر میں آواز بلند کرکے یوں ہی پھاڑ ڈالوں۔ میرا گلا پڑ گیا ہے۔ میں کوئی طویل تقریر اگر کرنا چاہتا بھی تو نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ اس لیے کہ مولانا حسرت موہانی خود ہی کہہ چکے ہیں کہ وہ کمیشن کے ساتھ تعاون کے خلاف ہیں۔ لیکن دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ یا اس کے ساتھ تعاون یا عدم تعاون، کوئی تیسری چیز نہیں ہو سکتی۔ اور عدم تعاون ہی کا نام مقاطعہ ہے۔ حسرت صاحب مقابلہ کرنا چاہتے ہیں لیکن مجھے تعجب ہے کہ وہ مقابلہ کرانے کے لیے سر محمد شفیع اور حسن نظامی کے پاس گئے۔ (قہقہہ) لیکن آپ حضرات حسرت صاحب سے مایوس نہ ہوں۔ یہ یقینی نہیں ہے کہ وہ بھی سر محمد شفیع یا حسن نظامی جیسے ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں کو بھی اپنا جیسا کرلیں اور ان سے انگریزوں کا مقابلہ کرا کے ایک متوازی حکومت ہندوستان میں قائم کرائیں (قہقہہ)

ایک بزرگ تھے جن کو سماع سے بہت شوق تھا۔ ایک دوسرے بزرگ کو سماع سے نفرت تھی۔ جب ایک دن وہ اپنے دوست کے یہاں پہنچے تو محفل سماع قائم تھی۔ یہ دیکھتے ہی انہوں نے اپنی نفرت کا اظہار فرمایا جس پر صاحب خانہ نے کہا کہ ذرا آنکھیں بند کیجیے۔ تھوڑی دیر بعد کہا کہ اب آنکھیں کھول لیجیے اور بتائیے کہ آپ نے کیا دیکھا؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے دیکھا رسول اللہ (صلعم) آپ کے گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس پر صاحب خانہ نے کہا کہ "رسول اللہ (صلعم) بھلا محفل سماع میں تشریف لاتے، اگر آنحضورؐ اس کو جائز نہ سمجھتے؟ اس پر دوسرے بزرگ نے فرمایا کہ کیا معلوم منع ہی کرنے کو تشریف لائے ہوں"۔ (قہقہہ) امید ہے کہ مولانا حسرت موہانی بھی لاہور اور درگاہ صابریہ پر محمد شفیع اور حسن نظامی کو اپنی حرکات سے باز آنے کے لیے ہی کہنے کو جاتے ہوں۔ (زور کا قہقہہ) ان کو ہم سے کیوں شکایت ہے کہ ہم مالوی جی اور لالہ راجپت رائے وغیرہ سے مفاہمت کرتے ہیں۔ مالوی جی نے تو اختلاف کر ہی دیا اور کانگرس میں مفاہمت کی تائید کی۔ ہمیں امید ہے کہ لالہ جی اور ہندو مہاسبھا کے لیڈر بھی اسی طرح کانگرس کے فیصلوں کا اتباع کرنے لگیں گے۔ جب حسرت صاحب سر محمد شفیع اور حسن نظامی سے مایوس نہیں تو ہم بھی لالہ جی سے مایوس نہیں۔ (قہقہہ)

تعجب ہے کہ حسرت صاحب کو تعمیری کام کا اس قدر شوق ہو گیا ہے اور تخریبی کام سے اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ اس وقت ان کے علاوہ مولانا آزاد بھی موجود ہیں۔ میں ان دونوں صاحبوں کو یاد دلاتا ہوں کہ ۱۹۱۴ء میں ایک دن یہ دونوں صاحب میرے پاس

تشریف لائے تھے اور چونکہ میں صاحبِ فراش تھا۔ میں نے اپنے زنانہ مکان میں انہیں بلالیا تھا۔ اس وقت یہ ایک تخریبی کام کے لیے مجھ سے کہہ رہے تھے۔ اور میرا تعمیری کام پر اصرار تھا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا کہ تعمیری کام کرنے والا کوئی نہ کوئی پیدا ہو ہی جائے گا۔ ہم کو اس کا انتظار نہ کرنا چاہیئے۔ اور جو خراب عمارت کھڑی ہوئی ہے اسے بلا تامل گرا ہی دینا چاہیئے اور جب تک کہ خراب عمارت گرا نہ دی جائے گی اس کی جگہ عمدہ عمارت کیسے بنائی جا سکے گی؟

حسرت صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ ترکِ تعاون کی تحریک میں ہم لوگوں نے تعمیری کام کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ہم نے گورنمنٹ کالجوں کو خالی کرانا چاہا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ودیا پیٹھ وغیرہ مختلف مقامات پر کھولے بھی، یہ ہمارا قصور نہ تھا۔ ان میں طالب علم بڑی تعداد میں اب تک شامل نہیں ہوتے ہیں یا اہلِ ملک ان کے لیے سرمایہ فراہم نہیں کرتے۔ پھر بھی بحمداللہ جامعہ ملیہ احمد آباد اور بنارس میں ودیا پیٹھ قائم ہیں۔

تخریبی کام میں سب سے زیادہ پرجوش خود حسرت صاحب ہی تھے۔ لیکن ان تک نے کانپور میں ایک اسلامی مدرسہ کو از سر نو ترتیب دی تھی۔ اور بحمداللہ وہ مدرسہ بھی قائم ہے۔

اب بھی ہم کمیشن سے مقاطعہ کی آپ کو فہمائش نہیں کرتے بلکہ ساتھ ہی ساتھ ہم نے ہندو مسلمانوں کی مفاہمت کا تعمیری کام بھی شروع کر دیا ہے اور اچھی خاصی کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ لیکن حسرت صاحب جو زیادہ تر تخریبی کام ہی کرتے رہے ہیں تعمیری کاموں سے آگاہ معلوم نہیں ہوتے۔ سارا مکان ایک ساتھ ہی ڈائنامیٹ سے اڑایا جا سکتا ہے۔ لیکن کوئی مکان ایک دن میں تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ تعمیری کام میں پہلے بنیاد رکھی جاتی ہے جو زمین کی سطح پر نظر نہیں آیا کرتی، ہم نے پہلے وہ بنیاد رکھی، پھر اس پر ردے رکھنا شروع کیے۔ پہلے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مسلمانوں نے وہ تجاویز مرتب کیں جن کی حسرت صاحب خود میرٹھ اور پشاور میں تائید کر چکے ہیں۔ اور وہی ان کے مؤید نہیں ہیں بلکہ ان کے نئے دوست سر محمد شفیع بھی ۲۰ مارچ کے جلسے میں موجود تھے اور ان کے ان پنجابی اعزہ اور احباب کے کامل اتفاق سے جو جلسہ میں موجود تھے دہلی کی تجاویز منظور ہوئی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ سر محمد شفیع کا دعویٰ تھا کہ یہ سب تجاویز انہی کی پیش کردہ ہیں اور وہ اپنے زمانۂ وزارت میں انہیں ایک یادداشت کی شکل میں تحریر فرما چکے ہیں ان تجاویز کو مرتب کرنے کے بعد ہم آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سامنے گئے اور بمبئی میں اس نے بھی قبول کیا۔ اور اس کے قبول کرنے والوں میں ہندو مہاسبھا کے لیڈر مسٹر جیکر، مسٹر کیلکر اور ایک بڑی حد تک ہندو مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر مُنجے بھی تھے اور لالہ لاجپت رائے بھی فرماتے ہیں کہ وہ یورپ جانے سے پہلے ان تجاویز سے موافقت کا اپنے دوستوں کے سامنے اظہار کر چکے تھے اور انھیں نے ہندوؤں کو بھی انہیں قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ یہ دوسرا ردا تھا۔ مذہبی تنازعات کے متعلق شملہ کانفرنس میں، افسوس ہے کہ کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ لیکن حسرت صاحب جانتے ہیں کہ ہم نے جدوجہد کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ جب ہندو مہاسبھا والوں نے ہم سے مفاہمت نہ کی تو ہم نے ان ہندوؤں کی طرف رجوع کیا جو کانگرس میں شریک تھے اور الحمد للہ کہ کلکتہ میں ہم کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ تیسرا ردا تھا جو ہم نے چڑھایا۔ اس کے بعد ہم مدراس گئے اور وہاں تمام تنازعات کا فیصلہ ہو گیا اور باوجود بہت سے اختلافات کے جن پر رات کے ڈھائی بجے تک بحث ہوتی رہی۔ کانگرس نے ہماری ہی تجویز کو تسلیم اور قبول کیا اور مالوی جی کی ترمیمیں نہ منظور ہو گئیں۔

اس بحث میں ایک مسلمان کو بھی حصّہ لینا پڑا۔ خود ہندوؤں کو ہندو مخالفین کا جواب دینا پڑا۔ یہ چوتھا ردا تھا جو ہم نے چڑھایا۔ اس کے بعد خود مالوی جی نے جو یقیناً ہندو مہا سبھا کے سب سے بڑے ممتاز اور با اثر لیڈر ہیں ہماری تائید کی۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کی جو اس کانگریس کے فیصلہ کی سارے ہندوستان سے تعمیل کرانے کی کوشش کرے گی، شامل ہو گئے۔ یہ پانچواں ردا تھا جو چڑھایا گیا۔ کیا یہ تعمیری کام نہیں ہے؟

۹ فروری کو دہلی میں کانگریس کی مجلس عاملہ وہی تعمیری کام کرنا شروع کرے گی جس پر آج حسرت صاحب اس طرح مُصر ہیں یعنی ہندوستان کا دستور اساسی بنانا شروع کیا جائے گا۔

۱۲ فروری کو اور انجمنوں کی کمیٹیاں بھی شریک کی جائیں گی اور اس کے بعد مارچ میں پورے ملک کا ایک کنونیشن دہلی میں مجتمع ہوگا جس میں ہر ملت، ہر جماعت، ہر سیاسی فرقہ کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ سب آئیں اور ہندوستان کا دستور اساسی تیار کریں۔ کیا یہ تعمیری کام نہیں ہے؟ اور کیا اس سے جلد بھی کوئی تعمیری کام ہو سکتا ہے؟

لیکن سوال یہ ہے کہ ۳ فروری کو جس دن کمیشن کے منحوس قدم ہندوستان کی سرزمین پر رکھے جائیں گے اس دن کیا کیا جائے گا؟ کیا اس سے پہلے کوئی کامل مفاہمت ممکن ہے؟ اگر اس سے پہلے ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے، لیکن اس کے ہونے تک ہم ان خیالات کے اظہار کو ملتوی نہیں کر سکتے جو کمیشن کے متعلق ہمارے دل میں موجزن ہیں۔ ہماری غیرت اور حمیّت کا بھی تقاضا ہے کہ اگر ہم کمیشن کو ہندوستان آنے سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تو کم از کم اتنا تو کر لیں جس کے کرنے کی یقیناً ہم میں طاقت ہے کہ اپنی دکانیں بند کر لیں اور اس دن صرف ان کے دکانداروں کی دکانیں کھلی رہیں اور ہر ہندوستانی کی دکان بند ہو۔

حسرت صاحب چاہتے ہیں کہ کمیشن کو ایک ڈاک خانہ بنایا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے دستور اساسی کے تیار ہونے تک جسے حسرت صاحب کمیشن کے منہ پر پھینکنے کے لیے ہم سے کہتے ہیں۔ ہم ایک پوسٹ کارڈ اس ڈاکخانے میں ڈال دیں جس میں لکھا ہو کہ ہم تمہارا خیر مقدم نہیں کر سکتے۔ یہ پوسٹ کارڈ صرف ۳ فروری کی ہڑتال ہی ہو سکتی ہے۔

کمیشن کے متعلق مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ ہم کو جیوری سے اتنی شکایت نہیں ہے جتنی جج سے ہے۔ اگر جیوری میں سب کے سب ہندوستانی ہی ہوتے۔ جب بھی اس کے سامنے ہم اپنے مقدمے کی پیروی کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اس لیے کہ جج ہندوستانی نہیں ہے بلکہ ایک غیر ملک انگلستان اور اس کا پارلیمنٹ اور اس کا کابینہ وزارت ہے۔ ہر شخص کو اپنے گھر کے انتظام کرنے کا فطرتی حق ہے۔ غیر تو غیر کوئی غیرت مند اپنے حقیقی بھائی کو اس بناء پر اپنے بیوی بچوں کا انتظام سپرد نہیں کر دیتا کہ اس کا بھائی اپنے بال بچوں کا انتظام اس سے اچھا کرتا ہے۔ اگر کوئی ایسا بے غیرت اس جلسے میں موجود ہے جو اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو بھائی کے حوالے کر دے تو بولے۔ یہی حال ملکوں کی حکومت کا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ انگلستان میں ہر محکمہ کا انتظام مساوی طور پر عمدہ نہیں۔ بعض محکموں کا انتظام جرمنی میں اچھا ہے۔ بعض کا فرانس میں اور بعض کا روس میں اور بعض کا امریکہ میں۔ لیکن کیا انگلستان کا کوئی محکمہ اس بناء پر کسی دوسرے ملک کی

حکومت کے سپرد کر دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کا انتظام انگلستان کی حکومت سے بہتر کر سکے گی؟

ابھی حکیم سید وزیر حسن صاحب کا گلا خشک ہو گیا تھا اور کتنے ہی لوگ اس وقت چلا رہے تھے کہ "ہم نہیں سنتے، ہم نہیں سنتے"، اور غصے کے مارے ان کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ کیا حکیم صاحب اس کو گوارا کر سکتے تھے کہ ان کے کسی دوست کا لعابِ دہن ان کے گلے کو تر کر دیتا؟ ہرگز نہیں۔ اپنا گلا اپنے ہی تھوک سے تر ہوتا ہے۔ کوئی دوسروں سے اپنے منہ میں نہیں تھکواتا۔ پھر ہم کس طرح غیروں کو اجازت دے سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کی حکومت کا دستورِ اساسی وہ تیار کریں اور ہم پر وہ حکومت کرتے رہیں؟

اب مجھے صرف دو لفظ اور کہنا ہیں، ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی محنت کی کمائی پر خود قابض رہے اور اس کو خود خرچ کرے۔ پھر بھی اگر وہ کمزور ہوتا ہے تو ڈاکو اس کی پونجی کو اس سے چھین سکتے ہیں۔ اور جب تک وہ کمزور رہے گا وہ اپنی پونجی پر قابض نہ ہو سکے گا۔ دنیا میں ہزاروں ڈاکے پڑتے ہیں اور خود ہمارے ہندوستان میں اس کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن کیا کبھی ڈاکوؤں نے بھی کوئی کمیشن بنا کر اس امر کی تحقیقات کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ جس ضعیف و ناتواں کی پونجی انہوں نے لوٹی ہے وہ اب اس قدر قوی ہو گیا ہے وہ اپنی پونجی ان سے دوبارہ لے سکے؟ ایک ملک والوں کا دوسرے ملک والوں پر قبضہ کر کے اس ملک والوں پر حکومت کرنا یقیناً ایک طاقت ور ڈاکو کا ایک کمزور شخص کی پونجی پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔ جب تک وہ قوی نہ ہو سکے گا اپنی پونجی اس سے دوبارہ نہیں لے سکے گا۔

ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم اس قدر قوی نہیں کہ ڈاکو سے اپنی پونجی چھڑا سکیں۔ اس کے لیے کسی کمیشن کے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر تم ہم سے پوچھتے ہو کہ پونجی ہے کس کی، اس کا حق دار کون ہے تو ہمارا صاف جواب ہے کہ وہ ہماری ہے اور صرف ہم ہی اس کے حق دار ہیں۔ اگر ہم ڈاکو کو اپنے گھر سے نہیں نکال سکتے تو کیا ضرورت ہے اس کی کہ جس کوٹھڑی میں ہم خود بیٹھے ہیں اس کا دروازہ بھی کھول دیں تاکہ ڈاکوؤں کا ایک کمیشن ہماری قوت کی آزمائش کرے اور اس کا امتحان لے۔ کم از کم اتنا ہی کیا جائے کہ اس کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا جائے اور یہی ان شاء اللہ ۳ فروری کو سارا ہندوستان کرے گا۔

حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک

> سرسید کی "بزمِ ادب" بچے کھچے پرانے لائق پرستش بزرگوں کی گویا نچوڑ تھی۔ اب
> ان اصحاب کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے جنھوں نے جما جمایا نقشہ یعنی پچھلے پہر کا خواب
> اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔
>
> ان میں سے ہر فرد اپنے دائرہ کا مالک تھا اور مستقل ہستی رکھتا تھا۔ آج
> وقار الملک اور محسن الملک کی یادگار میں چند سطریں لکھنے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔

یہ بات بھولنے کے لائق نہیں ہے کہ جہاں تک سرسید کی ادبی تبلیغ کا تعلق ہے یہ دونوں، گویا ان کے دست و باز و تھے۔ سرسید کے ساتھ محسن الملک کی نوک جھونک، ادبی راز و نیاز جس کا ایک مذاکرہ مراسلات دلچسپ میں دکھایا گیا ہے اور جس کے عالمانہ اور سخن گسترانہ شواہد مرحوم "تہذیب الاخلاق" کے سیزدہ سالہ فائل میں بکثرت ملیں گے۔ فتوحاتِ ادبیہ کا بہترین سرمایہ ہیں، جن پر مستقلاً اظہار خیال کی ضرورت ہے۔ میرے موضوع کے صفحات محدود ہیں ان کے پھیلانے کی گنجائش نہیں۔ یہاں صرف چشم سخن کے اشارہ پر قناعت کرنی ہوگی۔

بہرحال کس کس کو یاد کروں۔ محسن الملک۔ وقار الملک۔ چراغ علی۔ ذکاء اللہ۔ نذیر احمد۔ حالی و شبلی وغیرہ وغیرہ بھی سجائی محفل تھی جو دیکھتے دیکھتے درہم برہم ہوگئی۔ سرسید کی "بزمِ ادب" ایسا دلچسپ موضوع ہے کہ اگر مولوی وحید الدین سلیم نے اپنی عمر ضائع نہ کی ہوتی اور سرسید اور ان کے رفقاء کے ساتھ جو وابستگی ان کو رہی ہے اور جس کے آثار "معارف" کے نقش اول میں بافراط موجود ہیں وہ افسانہ یا تاریخ کی حیثیت سے ایک ضخیم الاوراق اور نہایت دلچسپ کتاب تیار کر سکتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کی اخلاقی فوقیت کا راز دراصل اس کی پاکیزہ سوسائٹی میں مضمر ہوتا ہے تو "سیر الصحابہ" کی طرح علی گڑھ کی یہ آخری بزمِ ادب ہمارے لیے دقت کی چیز اور نتیجہ خیز رہتی۔

خیر ان تصریحات کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹیے۔ سرسید نے ہمیشہ معاصرین ادب کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ان کی بااثر شخصیت خاموش تصرف کے ساتھ دوسروں کی قلب ماہیت کرتی رہتی تھی۔ شبلی نے "مولویت" علی گڑھ میں پہنچ کر چھوڑ دی۔ ان کے خیالات کی کایا پلٹ۔ مذاق تصنیف اور وسیع النظری، غرض یہ جو کچھ ہوئے سرسید کے دامن تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا وہ آج بھی ان کی شرافت ادبی کا پتہ دیتا ہے۔ اسی طرح حالی کی نیچرل شاعری خیالات کے لحاظ سے سرسید کے فیض صحبت کی ممنون ہے۔ ابھی یہ فیصلہ باقی ہے کہ حالی کی روش جدید نے پروفیسر

آزاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل یعنی ان کے نتائج فکر سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جن کی تاریخی حیثیت سے کم سے کم اولیت کا شرف حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ متاخرین ادب کے ساتھ سر سید کا درجہ متناسبہ صرف مربیانہ تھا۔ اس لیے ایسی باوقار ہستی سے چشمک تو خیر اس کی کسرات بھی بمشکل ہاتھ آئیں گی۔

پروفیسر آزاد اس قدر بلند خیال اور استادانہ دل و دماغ رکھتے تھے کہ ان کے ہاں بھی جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے، ”چشمک“ کا گزر نہیں۔ ایک واقعۂ دلچسپ اہلِ ذوق کی ضیافت طبع کے لیے لکھتا ہوں۔ لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے۔ نذیر احمد کا لیکچر ہونے والا تھا جو چھپا ہوا ان کے ہاتھ میں تھا۔ آزاد رسالہ کی طرف متوجہ ہوئے تو نذیر احمد نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجیے، کانفرنس میں پیش کرنا ہے۔ آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کانٹ چھانٹ شروع کر دی۔ نذیر احمد آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوش محبت سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا کہ ابھی ان کے دائرہ میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ایک ”بوڑھے بچے“ کی مشق سخن پر نظر ثانی کر سکتا ہے۔

حالی بھی آزاد کی استادی کا لوہا مانتے تھے۔ ان کی مخلصانہ عقیدت کیشی کے لیے وہ تقریظ و تنقید دیکھیے جو ”آبِ حیات“ اور ”نیرنگِ خیال“ پر حالی نے لکھی ہے اور جس میں ضمناً یہ طے کر دیا ہے کہ نیچرل شاعری دراصل آزاد کی صنعت فکر کا نقش اولین اور ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے۔ حالی لکھتے ہیں ”نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ یعنی لٹریچر کے رتبہ کا طول و عرض بڑھ گیا لیکن اس کا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا۔ یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی۔ لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کر دی۔ نیرنگ خیال میں کچھ داد دی ہے۔ کیونکہ آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم و تشخیص کی اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور خصائل انسانی کے فطری خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کیے ہیں جن سے اردو لٹریچر اب تک خالی تھا۔“

شبلی بھی آزاد کا ادب کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے۔ اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ اعلیٰ معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔“ تاہم ایک ہلکی سی چشمک لیجیے۔

”ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگ خیال میں جہانگیر کی یہ تصویر کھینچی ہے:“ اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا۔ جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا، وہ خود نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال (نور جہاں) اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ در، جو کچھ دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اس کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک فرد کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سوانگ دیکھ کر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اس لیے بدمست کبھی نہیں ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔“

”تزکِ جہانگیری“ کی ریویو میں شبلی فرماتے ہیں ”آؤ دیکھیں اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے۔ ہمارے انشا پرداز نے جہانگیر کے کبھی کبھی ہوش میں آنے کا جو کارنامہ بتایا ہے وہ اس کی کتاب تزکِ جہانگیری ہے:“ اس کے بعد شبلی نے جو کچھ لکھا ہے ناقدانہ اور سخن گسترانہ ہے۔ یعنی یہ ہزر چشمک کی ایک خوبصورت مثال ہے جو عنوان زیر بحث کے تحت میں آ سکتی ہے۔

"شعر العجم" جس زمانہ میں لکھی جا رہی تھی میں نے شبلی کو توجہ دلائی کہ آزاد کی تالیف موعود پر نگاہ رکھیے گا جو موضوع مشترک پر نکلنے والی ہے۔ وہ سمجھے میرا مطلب "سخندان فارس" سے ہے۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں: ۔

"آزاد کا سخن دان پارس حصہ دوم نکلا۔ سبحان اللہ۔ لیکن الحمد للہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

مجھے تحریر فرماتے ہیں "آزاد کی کتاب آئی" جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں۔ تاہم ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لیکچر تک اس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا۔ بارھویں میں یہ میدان میں اترا ہے لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا۔ یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔

میں نے لکھا، میری غرض سخن دان فارس سے نہیں بلکہ آزاد کے "تذکرہ شعراء" سے تھی۔ اس پر تحریر فرماتے ہیں "میں آزاد کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا لیکن آپ نے پھر ڈرا دیا۔ مجھ کو پہلے سے معلوم ہوتا تو اس مضمون پر ہاتھ نہ ڈالتا۔"

یہ جزئیات جو دکھا رہا ہوں خارج از موضوع نہیں ہیں۔ ان سے یہ پتہ چلے گا کہ شطرنج کی اصطلاح میں بساط ادب کے یہ شاطر مہرے آپس میں کس طرح گتھے ہوئے تھے۔

نذیر احمد بھی تنقیص پسند نہیں تھے۔ ان کی لے دے زیادہ تر سرسید پر رہتی تھی لیکن اس طرح کہ

"وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"

خلوص تھا کہ حرف حرف سے ٹپکا پڑتا تھا۔ طبیعت میں منقولانہ رنگ غالب تھا۔ اس لیے شروع شروع سرسید کے اجتہادات سے ان کو جھجک سی تھی جو رفتہ رفتہ گئی اور اس طرح گئی کہ سرسید کے عقیدت کیشان باصفا میں یہ کسی سے پیچھے نہیں تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ یہ فراخ دلی جس کے شواہد ان کے لٹریچر میں کثرت سے نظر آئیں گے، سرسید تک محدود نہ تھی اوروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ ایک آدھ واقعہ استشہاداً لیجیے۔

علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں کانفرنس کی مقتدر جماعت کا اجلاس ہے۔ اطراف ملک سے پڑھے لکھے اور رودار لوگ آ آ کر جمع ہوئے ہیں۔ خطیبانہ بلند آہنگی کے سلسلہ میں ایک آواز یوں گویا ہوتی ہے "میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی۔ اب تو ایسا بھول گیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں۔" ان فقروں کا نکلنا تھا کہ اس زمانہ کے مولوی شبلی جو نئے نئے علی گڑھ آئے تھے۔ ہزاروں نگاہوں کے نقطۂ شعاعی بنے ہوئے تھے۔ اور میدان کی قابلیت کا پہلا اعتراف تھا جس کا اثر بجلی کی طرح ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گیا۔

اسی طرح نذیر احمد لیکچر سے پہلے کبھی کبھی اپنی نظم سنایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر فرماتے ہیں: ۔

> "جس طرح یحییٰ پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی منادی کرتے تھے کہ میرے بعد مجھ سے ایک بہت بڑا پیغمبر آنے والا ہے، اسی طرح میری نظم گویا ندائے عام ہے کہ میرے بعد مولوی الطاف حسین حالی اپنی نظم پڑھیں گے اور میں اپنی پندار میں ان کی نظم کی رونق کا باعث ہوتا ہوں۔"

اخلاقاً ایک ہم عصر کی شاعرانہ فوقیت کے اعتراف کا یہ کتنا بلیغ اور خوب صورت پیرایہ ہے۔

اب میں نفسِ مطلب سے قریب ہوتا جاتا ہوں۔ یہاں تک صرف بیانات اضافی تھے۔ اصلی کام حالیؔ و شبلیؔ کو باہم ٹکرانا ہے لیکن ترتیباً پہلے یہ دیکھیے کہ حالیؔ نے شبلیؔ کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں "چشمک" کا کوئی عنصر موجود ہے یا نہیں ؟

معارف میں نامۂ حالیؔ و شبلیؔ کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری ہے۔ ان خطوں میں حالیؔ، شبلیؔ کو اس خلوص حسن اشتیاق سے یاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک تصنیف کا جس شوق و ذوق سے نام گناتے ہیں وہ بھی اس آرزو کے ساتھ کہ کوئی کتاب ان کی لائبریری کے آغوش میں جگہ پانے سے نہ رہ جائے۔ اخلاص کی آخری حد ہے، خط دیر میں ملتا ہے تو کہتے ہیں :۔

" اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کیا جو
پیراہن یوسف نے چشمِ یعقوب کے ساتھ کیا تھا"

جس خط کو دیکھیے درد محبت اور ایک خاص طرح کی صدق مقالی جو بڑے بوڑھوں کا حصہ ہوتی ہے۔ لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ شبلیؔ کے پاؤں کا واقعہ پیش آتا ہے تو گھبرا کر ان کے فرزند رشید یعنی حامد شبلیؔ سے خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں اور باوصف اس کے کہ آنکھ نے جواب دے دیا ہے۔ قویٰ میں باقتضائے سن عام اضمحلال ہے، پھر بھی اعظم گڑھ کے سفر کی آمادگی ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ الندوہ میں شبلیؔ کے احباب کی رباعیات دیکھ کر حالیؔ کو خیال آتا ہے کہ وہ مولانا شبلیؔ کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کریں۔ اس لیے ایک رباعی موزوں کر کے بھیجتے ہیں کہ الندوہ کے کسی آئندہ نمبر میں اسے بھی جگہ دے دیجیے گا۔

سیرۃ النعمان جب شائع ہوئی تو حالیؔ نے اس پہ ریویو لکھا۔ فرماتے ہیں " انھوں نے (یعنی شبلیؔ) نے اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے اس کے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پہ جلوہ گر ہوتی ہے اور جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے سیرۃ النعمان کو ان سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں۔"

کتاب کی ترتیب، اصول، استنباط اور طرز اجتہاد کے لحاظ سے شبلیؔ کو حالیؔ نے " فاضل ادیب" محقق اور اگر وہ منظور کریں تو منشی اور شاعر کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور دکھایا ہے کہ " جس طرح حسن تناسبِ اعضا کا نام ہے، سیرۃ النعمان میں روایتہ درایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ پہ رائے اور قیاس سے کام لیا گیا ہے اس طریقۂ استدلال سے فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور مصنف (یعنی شبلیؔ) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اٹھا دیئے ہیں۔"

شبلیؔ " دستہ گل" ہدیتہً بھیجتے ہیں تو حالیؔ جواباً لکھتے ہیں :۔

" کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا رومؔ جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظؔ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پہ مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو۔ مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔"

آپ کہیں گے کہ ان مسلسل انکشافات میں سوائے بہکی ہوئی باتوں کے مقصود اصلی یعنی چشمک کا اب بھی پتہ نہیں۔ لیکن

میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اصلی نکتہ سے قریب تر ہوتا جاتا ہوں۔ اصولاً اخلاق کے ساتھ تھوڑی سی کج ادائی بھی ہو تو زیادہ اجاگر ہوتی ہے جو آنکھیں روشنی کی عادی ہوتی ہیں ان کو تاریکی گراں گزرتی ہے اسی طرح نفسِ انسانی کا رخ روشن اس کے دوسرے رخ کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔ اس لیے میری اضافی تصریحات بے کار نہیں ہیں۔ بہرحال اظہار خلوص کی حد ہو چکی، کچھ اصل موضوع یعنی "چشمک" کی مثالیں لیجیے۔

حیات جاوید میں ایک موقع پہ حالی فرماتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی حمایت کے جوش میں سرسید کے قلم سے بعض مواقع پہ ایسے الفاظ نکل گئے ہیں کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے اور اسی بناء پر شمس العلماء مولانا شبلی نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم میں اس غلطی کا جس کو سرسید چھ سات برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے ذکر کیا ہے اور اس بناء پہ کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبان میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ سائنٹیفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے اس دعویٰ پہ کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں جو خود سرسید نے بعض مواقع پہ بیان کی تھیں پیش کی گئیں۔"

حالی کہتے ہیں کہ اگر مولانا (یعنی شبلی) کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن چونکہ انہوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے اس لیے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل منشاء ظاہر کرنا ہے۔" حالی نے ایک ایک اعتراض کی تردید کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ شبلی کے اعتراضات کا زیادہ تر حصہ خود سرسید کے خیالات سے ماخوذ ہے۔" چشمک کی یہ پہلی مثال ہے جس میں حالی کی حیثیت نسبتی اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہے۔ اور جس میں ناقدانہ اظہار خیال کے سوا در پردہ کوئی چوٹ نہیں ہے۔

یہاں تک تو آپ نے دیکھا کہ حالی کا شبلی کے ساتھ کیا رنگ تھا۔ لیکن یہ شراب اب تیز ہوا چاہتی ہے۔ اب یہ دیکھیے شبلی کے خیالات و مقالات کا جہاں تک خوش صفات حالی کا تعلق ہے کیا حال ہے۔ شبلی نے ابھی المامون نہیں لکھی ہے یا لکھی ہے۔ لیکن لکھنے سے پہلے "حیات سعدی" پیش نظر ہے، ایک عزیز کو لکھتے ہیں: ۔

"ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفتہً بھیجی ہے۔ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔ میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لیے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے لیکن یہ دیکھنا ہے کہ شبلی جب خود تصنیفات کے مالک ہوئے تو حالی کے ساتھ ان کا یہ حسن ظن کہاں تک قائم رہا۔؟"

سوانح مولانا روم میں شبلی یوں اظہار خیال کرتے ہیں "تمام اہلِ تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پہ ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا۔ تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں اور چونکہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں اس لیے مذاق حال کے موافق خواہ مخواہ بھی ان کو ترجیح دی جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرائض کے بالکل خلاف ہے۔"

اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی یہ مان لیا جائے کہ شبلی کا روئے سخن حیات سعدی یا یادگار غالب کی طرف ہے تو "چشمک"

کی یہ نہایت ہی چبھتی ہوئی مثال ہوگی جو ناظرین کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک نکتہ سنج پوچھ سکتا ہے کہ کیا یہی طریقہ نمایاں طور پر "موازنہ انیس و دبیر" میں اور ایک کافی حد تک "شعر العجم" میں اختیار نہیں کیا گیا۔؟ کلیات خسرو جس کی تہذیب و ترتیب بزم علی گڑھ آج کل کے معرکہ ادبی میں پیش پیش ہے اور جس میں تنقید کے سلسلہ میں معاصرانہ کلام کا موازنہ کیا گیا ہے کہاں تک واقعہ نگاری کے خلاف "مذاق حال" سے بے نیازی کا دعویٰ کر سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا حالی اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر تھے؟

چشمک کی دوسری مثال لیجیے:۔

تذکرہ گلشن ہند کے حاشیہ میں شبلی لکھتے ہیں:۔ "مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں اور اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے۔"

اسی طرح جیسا کہ دیباچہ گلزار نسیم کے حاشیہ ذیل میں تصریح کی گئی ہے۔ شبلی نے لائق چکبست کو لکھا تھا کہ گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بے رحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے۔"

میں اس کے متعلق خود کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ مولوی عبدالحق کے ذمہ دار قلم سے ٹپکی ہوئی سیاہی جس طرح پھیلی ہے ایک نظر دیکھنے کے لائق ہے، جس طرح ناممکن ہے کہ کسی ٹکسالی (اسٹنڈرڈ) کتاب پر ان کا مقدمہ نہ ہو یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی یا پاسداری میں یہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں۔ یعنی "چشمک" کے جراثیم ان کے مقدمات میں اس کثرت سے ملیں گے کہ یہ ان کے لٹریچر ے خصائص کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقع کے تاک میں رہتے ہیں اور اظہار خیال سے کبھی نہیں چوکتے۔ لیکن ر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں، یعنی شبلی کی تنقیص مقصود بالذات نہیں ہوتی۔

یہاں تک تو "چشمک" کی نرم مثالیں تھیں یعنی تلخ گولیاں غلاف شکر میں، اب ذرا قوی تر شواہد لیجیے۔ مناقب عمر بن عبدالعزیز ، ریویو کے سلسلہ میں شبلی فرماتے ہیں:۔

"سوانح نویسی کے فرائض میں سے جو بڑا فرض مصنف سے رہ گیا وہ تنقید ہے۔ یعنی مصنف نے اپنے ہیرو کی خوبیاں دکھائی ،۔ اس کے کسی قول و فعل پر نکتہ چینی نہیں کی۔ لیکن یہ اس زمانہ کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے۔"

اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

> "مصنفین اسلام آج کل کے فریب دہ طریقہ سے بالکل آشنا نہ تھے۔ آج کل کی سوانح نگاری کا انداز یہ ہے کہ حقیقت نگاری کے ظاہر کرنے کے لیے ہیرو پہ نکتہ چینی کی جاتی ہے لیکن اس طرح محاسن نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھائے جاتے ہیں۔ پھر نہایت کمزور اور ضعیف الفاظ میں ایک آدھ اعتراض بھی کر دیا جاتا ہے جس سے دراصل مداح کو قوت دینی مقصود ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعہ نگاری کے لحاظ سے کسی واقعہ کو چھپانا نہیں چاہا ہے اور اس لحاظ سے ممدوح کی چھوٹی سے چھوٹی برائی کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ ورنہ

ایسے محاسن اور خوبیوں کے مقابلہ میں ایک ذرا سی برائی بالکل نظر انداز کرنے کے قابل تھی۔ یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے اور اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے لیکن یہ طریقہ قدیم طریقہ سے بہت زیادہ قابلِ اعتراض بلکہ خطرناک ہے۔ قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور خداعی ہے، جو واقعہ نگاری سے براحل دور ہے۔“

یقیناً ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ تبلّی کا روئے سخن کس کی طرف ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمری سے ممدوح کا مقصود کیا ہے؟ شیش محل پہ بیٹھ کر اوروں پر پتھر پھینکنا ایک خوش ادائی سہی۔ لیکن کیا دانائی بھی ہے؟ اس کا جواب صفحات زیر تحریر میں مل جائے گا لیکن جلدی نہ کیجیے اور دیکھیے مآثرِ رحیمی کے ریویو میں ارشاد ہوتا ہے:۔

> ”اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خانخاناں کی خوبیاں ہی گنائی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں۔ حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے لیکن اس طریقہ کو ہم آج کل کے پُرفریب طریقہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کر کے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے اور کوئی عیب اور وہ بھی خفیف کر کے لکھا جاتا ہے تو اس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کے کام آئے۔ یعنی جب عیب نہیں چھپاتا ہے تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے۔ بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے۔
>
> اس طریقہ کی عمدہ مثال ہے۔“

ابھی اور دیکھیے۔ موازنہ انیس و دبیر میں اسی خیال کا اعادہ یوں کیا گیا ہے:۔

> ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں باوجود دعویٰ آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ اس کو دکھائے جائیں۔ لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں۔ جس چیز نے ان کو اظہار حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے، جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا۔ اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں ان میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں جن کو نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اور سلسلہ در سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔“

اخلاقی حیثیت سے مولانا کی نگاہ جس نکتہ پر بار بار پڑتی ہے اس کے اہم نتائج سے کون انکار کر سکتا ہے۔ آپ دیکھیں گے

ابھی تک اظہار خیال پر ایک نقاب پڑی ہوئی ہے۔ مگر یہ نقاب اس قدر ہلکی ہے کہ باریک تاروں سے چھن چھن کر ”چشمک“ کی شوخیاں آپ کے ذوق پردہ دری کو اکسائیں گی۔ لیکن ذرا ٹھہریئے۔ اس کا حسن عریانی دیکھنے کے لائق ہے۔ یعنی اس وقت تک تصریحات کی جگہ صرف اشارات و کنایات تھے۔ اب صاف صاف لیجیے شبلی کہتے ہیں :۔

> ”حیات جاوید میں مولانا (حالی) نے سید صاحب کی ایک رُخی تصویر دکھائی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بدطینتی ہے۔ لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں۔ پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ محض دعوی کرتے تھے واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے۔ بہرحال حیات جاوید کو محض مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔“

اس پر بھی تسکین نہیں ہوتی، ایک دوست کو پھر لکھتے ہیں :۔

> ”اختلاف آرا بھی کیا چیز ہے۔ حیات جاوید کو میں لائف نہیں سمجھتا بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل۔ خبروالناس فما یعشقون مذاهب۔“

یہاں یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل کا پُر فریب طریقہ سوانح نگاری ”جو شبلی کے خیال میں ایک طرح کی خیانت اور خداعی ہے“ اور جس پر بار بار بے چینی کے ساتھ زور دیا گیا ہے۔ دراصل حالی کی ایجاد ہے یا شبلی کی تصنیفات اسی دائرہ میں آجاتی ہیں۔ تاریخی تنقید کا یہ ایک نہایت نازک نکتہ ہے جس پر مولانا نے روشنی ڈالی ہوتی تو دنیائے ادب کے لیے ایک جدید انکشاف ہوتا۔

اسی طرح حالی کی یہ صنعت گری جہاں یورپ کے طرز تحریر سے ماخوذ بتائی گئی ہے ”موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں گی“ لٹریچر کی طرف سے مولانا کی اس فی الوقت دقیقہ رسی اور جوش التفات کا شکریہ! لیکن ایک نکتہ دان یہ سوال کر سکتا ہے کہ جس خطرے کا احتمال ظاہر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے مغربی زبان کی کوئی سوانح عمری ایسی دکھائی جا سکتی ہے جس میں محاسن کے ساتھ معائب ابھار کر دکھائے گئے ہوں۔ کم سے کم جتنی مستند کتابیں سیرۃ (لائف) کی حیثیت سے انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ وہ اکثروں کے دائرہ نظر میں ہوں گی لیکن افسوس ہے کہ حیات جاوید کی طرح کسی کتاب سے مولانا کی توقعات پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتیں۔ یعنی ان میں ایسے مستقل ابواب نہیں ملتے جن میں ”یکے از اقوام جرائم پیشہ“ یا ”باب الاشرار“ کے عنوان سے کسی شخص کے حفظ غیب کا غیر ضروری خاکہ اڑایا گیا ہو۔

ایک ادیب معارضہ بالمثل کی حیثیت سے پوچھ سکتا ہے کہ بہ لحاظ فن حالی کے جس اقتصاد کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے۔ خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک ابھار کر دکھائی گئی ہیں۔ اس کا جواب مجھے خوف ہے غیر امید افزا ہوگا۔ کیا یہ علم النفس کی حق تلفی نہیں ہے جو ایک نکتہ سنج مورخ کے قلم سے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ عظمت خود ملک کے سب سے بڑے مورخ کے خیال کے مطابق واقعات کو بدل نہیں سکتی۔

بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیات جاوید کے لیے حالی کی طرف سے اعتذار (اپالوجی) کی بالکل ضرورت نہیں۔ ایک

شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھی۔ اور آشنائے فن ہو کر لکھی۔ اور یہی اونچے سے اونچا معیارِ تحریر ہے۔ جو ایمان بالغیب کی حیثیت سے یورپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔

یہ غلطی ہے کہ حیاتِ جاوید کا رئیس التذکرہ فرشتہ نہیں تھا۔ انسان تھا۔ لیکن اس کے اخلاقی اوصاف اس کی اضطراری لغزشوں پر جنھیں انسانی کمزوری سمجھیے غالب تھے، یہی مابہ الامتیاز ہے جس کی بناء پر سوانح نگار بڑے سے بڑے شخص کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ سرسید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی پر شبلی کو اس قدر اصرار ہے جن کے اظہار میں حالی نے صرف بے دردی سے کام نہیں لیا۔ دراصل سرسید کی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی اخلاق کی تکمیل ناممکن ہے۔ اس قسم کی اضافی تصریحات کا بے ضرورت پھیلانا اور تنقیصی پہلو اس طرح نمایاں کرنا کہ اصلی محاسن دب جائیں، بالکل ایسا ہی ہوگا جس طرح ندوہ کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے جس پر مولانا کا سوانح نگار کبھی راضی نہ ہوگا۔ اور جیسے شبلی کی علمی نفسیت (سائیکالوجی) سے دراصل کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراطِ خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں ہے۔ شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا۔ حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے دورِ جدید میں مذہب کو معقولاتِ عصریہ سے تطبیق، دینے کی کوشش کی، اور یہ امر بلا اختلاف ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے۔ ہم کو مصر کے مذہبی لٹریچر کی اوقات معلوم ہے اس لیے مصطلح جبہ و دستار کی فضیلت سے اگر قطع نظر کر لیجیے تو سرسید اور ان کے رفقاء نے جو کچھ لکھ دیا ہے مشکل سے اس پر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے اور یہ سرسید کے اختراعی دماغ اور ان کے زبردست اجتہاد کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ عدمِ اعتراف دراصل لٹریچر کی خورش ظرفی ہوگی۔ میں یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ عقائد کو جو جذباتی چیز ہیں۔ معقولات سے بھڑانا جس پر ہمارے متکلمین کو اس قدر ناز ہے۔ دراصل کہاں تک "گول خانہ میں چوکھنٹی چیز" کا مصداق ہے۔ میرا منشا صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت لکھا گیا یا آئندہ لکھا جائے گا وہ محض سرسید کے قلم کی آوازِ بازگشت ہوگی۔ یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ حالی کے ہیرو کے ساتھ شبلی کو اس قدر "چشمک" کیوں ہے، کیا یہ جامع حیثیات شخصیت شبلی کے ناموران اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ جس طرح ایک خوب صورت عورت دوسری پرکالۂ آتش کو دیکھ نہیں سکتی۔ دراصل جذبۂ رشک اس کی تہ میں ہے۔ ملک کے ایک بہت بڑے فاضل کی رائے کے مطابق سرسید کے بعد اگر اردو میں کوئی قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ حالی ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حالی نے سرسید کی صرف کثیر الاوراق لائف نہیں لکھ دی بلکہ یہ اردو لٹریچر میں ایسا اضافہ ہے جو حالی کی ذات پر ختم ہو گیا۔ لیکن کیا شعر العجم کے مصنف کو بھی اس پر رشک کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب آگے چل کر تاریخ دے گی۔ نہ جاننا کبھی کبھی جاننے سے زیادہ باکیف ہوتا ہے۔ اس لیے سردست اس لطف کو کھونا نہیں چاہتا۔

لیکن شعر العجم کے ساتھ کے ساتھ جو ایک ذوقی چیز ہے میری بڑھی ہوئی حسنِ عقیدت اس موازنہ کو جائز نہ رکھے گی۔ اس لیے حیاتِ جاوید کے مقابلہ میں شبلی کی صرف ان تصنیفات کو رکھیے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے جنس مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آج کل کے قواعدِ رسمیہ (ایٹی کیٹ) کی نزاکتیں شائستہ سوسائٹی میں موازنۂ اوصاف کو جائز نہیں رکھتیں۔ لیکن مصنفین کے دماغوں کی رگڑ فن

تنقید کا ایک سخن گسترانہ فرض ہے، جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی، اس لیے چشمک کے وہ عقدہ ہائے سر بستہ جن میں حالی کے مقابلہ میں لائق عزت شبلی کا پہلو کچھ دبتا ہوا سا ہے، کھلے ہوئے راز کی حیثیت سے پیش کیے گئے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں اسے ختم کر دوں، ایک فقرۂ معترضہ بار طبیعت ہو رہا ہے جس سے اسی سلسلہ میں نپٹ لینا چاہتا ہوں۔ چشمک جس کے متعدد نظائر جہاں تک گنجائش تھی بہم پہنچائے گئے ہیں۔ وراثت طبعی کے اثر سے اس کا سلسلہ اور بڑھتا ہے ایک زاویۂ علمی کا نوجوان سید الطائفہ جسے آگے چل کر نظام ادبی کا ایک قوی تر عنصر ہونا ہے۔ ایک غیر متعلق تصنیف کے سلسلے میں یوں اظہار خیال کرتا ہے :۔

> " مولوی نذیر احمد بھی اس گناہ کے مجرم ہیں۔ جس قلم نے مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح ابن الوقت اور ایامی لکھنے میں زندگی بسر کی ہو وہ الفرائض، اجتہاد، ترجمہ قرآن، امہات الامۃ کے لیے سنجیدگی عبارت، متانت کلام اور ثقاہت بیان کہاں سے لائے گا مقصود یہ ہے کہ مذہبی کتابوں اور بزرگان دین کی تاریخ کے لیے سنجیدگی چاہیئے، شوخ اور ظریفانہ عبارت اور سخیف محاورات موزوں نہیں "۔

یہ مولوی نذیر احمد کون؟ وہی جن کا تصنیفی نام عوام میں "ڈپٹی نذیر احمد" ہے۔ آہا۔ آقائے اردو علامہ نذیر احمد۔ ایل ایل ڈی جو ملک میں السنۂ مشرقیہ کا سب سے بڑا ادیب تھا جس کی عربیت اس پایہ کی تھی کہ سخت سے سخت منحرف بھی اس کا لوہا مانتے تھے اور اس کے تبحر علمی سے مرعوب رہتے تھے۔ جس نے اردو سی کم مایہ زبان کو اپنے خاص طرز ادا اور زور فصاحت سے ایسا کر دیا کہ آئندہ اس پر ادب العالیہ (کلاسیکس) کا اطلاق ہو گا جس کی طبیعت میں قدرت نے عربی کا مذاق اس لیے رکھا تھا کہ وہ عرب کے صحیفۂ آسمانی کا قالب بدل سکے۔ پہلے ترجمۂ قرآن کا یہ رنگ تھا۔

"مستی لکالتیاں اور یاد کرتیاں چھپ کر"

اب وہ شستہ رفتہ اور فصیح اردو کا ایک مرقع ہے جس پر انشا پردازی ناز کر سکتی ہے۔ نذیر احمد نے مراۃ العروس کے سوا اگر کچھ نہ لکھا ہوتا جب بھی ان کے کمال انشا پردازی کے ثبوت کے لیے یہ اکیلی کتاب کافی تھی ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اس وقت ایک گراں پایہ مصنف تھے۔ جب ہمارے لائق ادب بزرگوں میں بہتیروں نے قلم ہاتھ میں نہیں لیے تھے رہی ان کی ظرافت جو انہی کا حصہ ہے اور جسے آپ کھانے میں نمک سمجھیے اور میں لٹریچر کے چہرے کا تبسم کہوں گا جو نئی تحقیقات کے مطابق صرف خوش ادائی نہیں بلکہ اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ کامل صحت کی دلیل ہے۔

صرف ایک مثال اور لیجیئے۔ نزولِ قرآن کے سلسلہ میں نذیر احمد اپنے فصیح لیکچر میں ایک جگہ کہتے ہیں :۔

" جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے وہ ایک وقت تھا عربی لٹریچر کے جوبن پہ ایک بہار آ رہی تھی۔ لوگوں میں یہ مادہ ایسا بر سرِ ترقی تھا کہ کوئی متنفس مذاق شعری سے خالی نہ تھا۔ یہ تو عربی زبان کے عروج کا زمانہ تھا۔ یوں بھی عرب کو اپنی بولی پر ناز تھا۔ انہوں نے اپنے سوا دوسروں کا نام رکھا تھا عجم یعنی گونگے یا جن کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ ایسے لوگوں سے کیسی ہی اچھی بات کی جاتی مگر وہ ہوتی حلیہ فصاحت سے عاری تو ان کے کان پر جوں بھی نہ چلتی۔ بس ضرور تھا کہ اسی داؤ سے ان کو پچھاڑا جائے جو داؤ ان کو خوب

رواں تھا۔ یعنی فصاحت، قرآن نازل ہوا تو جو اپنے اپنے وقت کے سرسیدؔ، محسن الملک، سید محمود اور حالیؔ و شبلیؔ تھے سب کے چھکے چھوٹ گئے۔"

یہی بلاغت ہے جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انشا پرداز کا ایک فقرہ ہزاروں علمی اور تاریخی اوراق پر بھاری ہوتا ہے اور یہی تصرفات ہیں جن کے لحاظ سے ایک ادیب کو بڑے سے بڑے فلسفی اور مؤرخ پر ہمیشہ ترجیح رہے گی۔

یہی بلاغت تھی جس نے کسی زمانے میں حیدر آباد دکن کے بسمارک کو نذیر احمد کا شیدائی بنا دیا تھا۔ سر سالار جنگ اوّل اسٹیٹ ڈنر پر ہیں۔ طلائی قابوں کا دور چل رہا ہے۔ چھری کانٹوں کی دھیمی موسیقیت میں دفعتہً سرکاری ڈاک آنے کی اطلاع ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو فوراً پیش کی جائے۔ ایک منٹ کے بعد جلیل القدر میزبان شام کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے۔ برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائق ادب امیرالامراء کی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑتی ہے اور چہرے پر رہ رہ کر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جیسے تبسم زیر لب کی ہلکی لہریں کہیے۔ نذیر احمد کے خرابِ ادب کا یہ وہ لقمۂ تر تھا جس سے شاہی میز بھی بے نیاز نہ رہ سکی۔ لیکن اب یہ ہمارے گلے میں پھنسنے لگا ہے جیسے ہم اگلنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بے تکی روایات سابقہ کے لحاظ سے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ ادب چاہتا ہے ان کا کمال انشا پردازی غیر شائستہ جنبشِ لب سے ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

آخر میں مجھے ایک نکتہ صاف کرنا ہے۔ یعنی حالیؔ کے ساتھ شبلیؔ کی چشمک کے جو شواہد پیش کیے گئے ہیں ان سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ شبلیؔ کو حالیؔ سے خلوص نہیں تھا۔ شبلیؔ حالیؔ کو ہمیشہ عزّت کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب تک مواد تحریری نہ ہو میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا۔ مگر حالیؔ کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ ان کی دقیقہ رس طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا۔ اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے۔"

پاؤں کے واقعہ کے بعد شبلیؔ کو حالیؔ نے دفورِ جوش میں جو رباعی لکھ کر بھیجی تھی اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ شبلیؔ "الندوہ" میں "مولانا حالیؔ کی ذرہ نوازی" کے عنوان سے یوں رقم طراز ہیں:۔

> "مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے، وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں۔ لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیاز مندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔ اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر قدماء کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔
> خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے۔"

بہرحال "چشمک" جو کچھ تھی ادبی حیثیت سے تھی۔ نجی تعلقات دونوں صاحبوں کے اتنے خوشگوار تھے جتنے باوصف اختلاف وکلائے مقدمہ کے اجلاس سے باہر ہوا کرتے ہیں۔ ان چند صفحوں میں خصائص نفسی کے مختلف رُخ ضمناً سامنے آ گئے ہیں ورنہ میری غایت محض تنشیط ادب یعنی احباب کی دماغی تفریح کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حیثیت سے اردو لٹریچر میں غالباً یہ ایک نیا مضمون ہے۔

شیخ سماءاللہ کی صاحبزادیاں

محفوظ علی بدایونی

۱۱ رمضان ۱۳۳۲ھ

اظہار تقدس مقصود ہو تو گنہگار اور اعلان تورع منظور ہو تو خطا وار۔ یہ واقعہ ہے کہ مجھے مدت العمر میں شاید ہی کبھی چھپ چھپ کر اور کنسوئیاں لے کر غیر عورتوں کی گفتگو سننے کا اتفاق ہوا ہو۔ اور اگر شاذ و نادر کبھی ہوا بھی ہو تو یقیناً پہلا موقع ہے کہ دو چھوڑ اکٹھی پانچ عورتوں اور وہ بھی اونچے درجہ کی خاتونوں کو باتیں، اور وہ بھی ذاتی اور خاندانی گلے شکوے کرتے سنا اور سننے کے بعد یہی نہیں کہ اس کان سُنا اس کان اڑا دیا بلکہ قلمبند بھی کر لیا۔ اور قلمبند بھی کر لیا تھا تو قلمدان میں بند نہ کیا بلکہ اب ڈھنڈورا پیٹنے بیٹھا ہوں۔

تمہاری اس بھری بستی میں مشکل سے کوئی سمجھ دار متنفس ایسا نکلے گا جو شیخ سماء اللہ صاحب کو جانتا بلکہ اچھی طرح پہچانتا نہ ہو اور ایسا شخص تو اس سے بھی زیادہ مشکل سے ملے گا جسے شیخ صاحب سے دوستی یا دشمنی، محبت یا عداوت کا اچھا یا برا تعلق نہ ہو۔ مگر آفریں ہے شیخ صاحب کو کہ انہیں نہ دوستوں کی دوستی کی پروا نہ دشمنوں کی دشمنی کا کھٹکا۔ وہ اپنے حال میں مست اور اپنے خیال میں محو ہیں۔ اور اپنی شان رفعت نشان کے اعتبار سے اعلیٰ، ادنیٰ، دوست، دشمن سب پر چھائے ہوئے ہیں۔ وضعدار تو سیکڑوں، ہزاروں دیکھے سنے۔ مگر وضعداری کی مد میں اس شخص نے حد کر دی کہ جو بات جس وقت پہلے دن کی تھی بھلا اس کا وقت ٹل تو جائے اور جس ترتیب اور جس سلسلے شروع کی تھی بھلا اس میں فرق پڑ تو جائے۔ سیر کا وقت پہلے دن مقرر ہو چکا ہے۔ آندھی آئے مینہ آئے، اولے پڑیں، لو چلے، اس میں تبدیلی قیامت ہی آ جائے تو آئے۔ ورنہ کیا امکان بڑھاپا آ گیا۔ مگر وہی خم و چم، وہی آن و شان قائم ہے۔ وہی البیلی چال کہ جب چلتے ہیں دوستوں کے سر پہ اور دشمنوں کے جگر پہ پاؤں دھرتے جھومتے جھامتے ہی چلتے ہیں۔

عنبرا خاتون کے ساتھ ان کی شادی کا واقعہ میری بلکہ مجھ سے زیادہ عمر والوں کی یاد سے بہت پہلے کا ہے۔ جس طرح یہ سچی بات ہے کہ شیخ صاحب ذات کے اونچے اور بہت اونچوں سے اونچے ہیں اسی طرح یہ بھی سچی بات ہے کہ بیوی ذات میں ان سے نیچی اور بہت گری ہوئی اور حد درجہ کی گری ہوئی ملی۔ لیکن اونچی ذات والی بیوی خدائی بھر میں ملنی ممکن نہ تھی۔ بیوی کی ذات اگر گری ہے ہے تو میاں ہی کی ذات سے گری ہوئی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں بیگموں اور خاتونوں کو عنبرا خاتون سے وہی نسبت ہے جو چھاچھ کو دودھ سے اور بھوسی کو گیہوں سے۔

جن پانچ عورتوں کی گفتگوئے باہمی کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ انہیں شیخ سماء اللہ صاحب کی صاحبزادیاں ہیں جو انہیں

عنبرا خاتون کے بطن سے ہیں۔ پانچوں باپ کے سایہ عاطفت اور ماں کے آغوشِ محبت میں پل بڑھ کر ماشاء اللہ مرتب ہو چکی ہیں۔ اور اب اپنے اپنے گھروں کی مالک ہیں۔

مجھے تو خود اعتراف ہے کہ اشخاص کی عمر اشیاء کی مقدار اور اجسام کے فاصلہ کا اندازہ کرنے میں مجھ سے ہمیشہ غلطی ہو جاتی ہے لیکن جو لوگ مقدار اور فاصلے اور عمریں مردوں کی عمر کا اندازہ ہمیشہ ٹھیک ٹھیک کر لیتے ہیں۔ عورت ذات کی عمر کے اندازے میں وہ تک اکثر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اس لیے میں ان خاتونوں کی عمریں بقید سال و ماہ و روز نہیں لکھ سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ قیاس و تخمین سے کچھ نہ کچھ کم زیادہ لکھ دیتا۔ لیکن کمی میں تو مضائقہ نہیں۔ (اور مضائقہ کے ساتھ ان خاتونوں کی شکرگزاری کا باعث ہوتا) اگر خدانخواستہ بندہ بشر ہے، کہیں زیادتی ہو جاتی تو قیامت ہی آجاتی۔ یعنی انہیں مجھ سے مفت کی شکایت بلکہ عداوت پیدا ہو جاتی۔ سب مرد جانتے ہیں کہ جو باتیں عورتوں کو ناگوار ہوتی ہیں کہ نہ برداشت ہو سکیں نہ معاف، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی عمر کا تخمینہ بڑھا کر کیا جائے۔ اس لیے زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے یہ امر قطعی خلاف مصلحت ہے کہ جس صنف میں آج کل اقتراعیات (سفریجٹ) جیسی بہادران دریچہ شکن پیدا ہونے لگی ہیں، اس کے پانچ افراد کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنا لوں۔ آخر میرے مکان میں بھی تو دریچے، روشن دان، چوکھٹ، کواڑ، چھپر، کھپریل، خدا کے فضل سے سبھی کچھ ہیں۔ بیٹھے بٹھائے ہلکی پھلکی جان کو فکر مول لے میری بلا۔

یہ جو پان کھائے، آنکھوں میں سرمہ، دانتوں میں مسی اور ہاتھوں میں مہندی لگائے ڈھیلا ڈھالا کرتہ پاجامہ پہنے، ہلکا دھانی دوپٹہ اوڑھے، قطب کو پیٹھ کیے بیٹھی ہیں، آسیہ بیگم ہیں جو عمر و تجربہ کے اعتبار سے، چال ڈھال کے اعتبار سے، شکل و صورت کے اعتبار سے، قد و قامت کے اعتبار سے سب میں بڑی ہیں۔ اور اسی لیے سب بہنیں انہیں بڑی آپا کہتی تھیں۔ قیافہ بتا رہا ہے کہ بچپن اور جوانی کے دو دن عیش و آرام اور مسرت و اطمینان سے گزرے ہیں۔ تیسرا پن یعنی بڑھاپا آیا تو آلام و افکار کو ساتھ لایا جنہوں نے کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مگر ضبط کہتا ہے کہ خبردار جو ایک حرف بھی زبان سے نکالا۔ چنانچہ آفرین ہے اس کو وقار کو کہ چھاتی کے کواڑ بند کیے دل میں حسرتیں اور منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی ہے۔ مجال کیا جو دل کا ترجمان زبان کو بنائے۔ آسیہ بیگم کے داہنے ہاتھ پر جو سیاہ فام خاتون آدھی ساڑھی باندھے اور آدھی اوڑھے سر کے چھلے اور اینٹھے ہوئے بالوں میں کوڑیوں اور جھوٹے موتیوں کی لڑیاں لٹکائے، گلے میں کہربا کے دانوں کی مالائیں، ہاتھوں میں عاج کی چوڑیاں اور پاؤں میں چپلیں پہنے بیٹھی ہیں اور جو سب سے زیادہ مفلوک الحال اور شکستہ بال معلوم ہوتی ہیں، افری خانم ہیں جنہیں آسیہ بیگم تو افریہ افری کہتی ہیں مگر باقی اور بہنیں سانولی آپا کہہ کر پکارتی ہیں۔ افری خانم کے داہنے ہاتھ کو جو دھاریدار سایہ پہنے، ٹوپ اوڑھے، عینک لگائے، ناک بھوں چڑھائے سب سے زیادہ متین یا مغرور مگر یقیناً سب سے زیادہ متمول، الگ تھلگ بیٹھی، بلکہ لیٹی ہیں۔ یہ امری خانم ہیں جنہیں آسیہ بیگم تو امری اور باقی بہنیں نئی باجی کہہ کر پکارتی ہیں۔ آسیہ بیگم اور افری خانم کے سامنے اور امری خانم کی طرف منہ کیے جو نیم مشرقی نیم مغربی وضع بنائے ننگے پاؤں ساڑھی باندھے چھوٹا کوٹ پہنے، کالر لگائے، ٹوپ اوڑھے بیٹھی ہیں، یہ برعکس نہند نام زنگی کافور" حسینہ بیگم ہیں۔ آسیہ بیگم اور امری خانم تو "حسینہ" کہتی ہیں باقی سب بہنیں "دریائی بہن" کہہ کر پکارتی ہیں۔ یہ چاروں بہنیں تو بیٹھی ہوئی ہیں لیکن پانچویں جو غالباً کیا یقیناً سب سے چھوٹی ہیں۔ آسیہ بیگم کے داہنے ہاتھ سے کچھ فاصلے پر مغرب کی جانب آفریہ خانم کی پیٹھ پیچھے کھڑی ہوئی ہیں۔

جو کبھی ٹہل لیتی ہیں کبھی ٹھہر جاتی ہیں۔ ان کا قد چھوٹا ہے مگر جسم گداز اور گٹھا ہوا۔ منہ میں سگریٹ، آنکھوں میں گلابی ڈورے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے جو اکثر قہقہے تک ترقی کر جاتی ہے۔ ان کی وضع قطع تو امری خانم سی ہے مگر مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ "امری خانم" تو متین و خاموش یا مغرور و مدمغ، شکن در ابرو اور سرگرہ بر جبیں، با ہمہ دلچسپ ہمہ الگ تھلگ سی بیٹھی یا لیٹی ہیں۔ بخلاف اس کے یہ تیز و طرار اور شوخ و پھلاک ہیں جنہیں ایک پہلو قرار نہیں۔ سب سے ملتی جلتی، بولتی چالتی ہیں۔ اگرچہ ضرور ہے کہ اس میل جول، بول چال، شوخی طراری میں تعلّی، تفوق اور نخوت، انانیت کا رنگ اچھا خاصا چمکتا نظر آتا ہے۔ ان کا نام شاید اس وجہ سے کہ ان کے پاس روپیہ بہت ہے یا شاید اس وجہ سے کہ ان کا رنگ نہایت سپید ہے، روپا بیگم ہے اور سب بہنیں انہیں روپا روپا کہتی ہیں۔ حسینہ البتہ کبھی کبھی "چھوٹی بھنو" کہتی ہیں۔

اتنا لکھنے پایا تھا کہ ایک صاحب تشریف لے آئے۔ خاکسار ہوا تو ان سے باتوں میں مشغول، برخوردار...... طول عمرہٗ جو ماشاءاللہ اسکول کی ابتدائی جماعت میں پڑھتا ہے، اپنی اردو کی کتاب لے کر آ بیٹھا۔ آپ جانیے چھ سات برس کی عقل کی بساط ہی کیا۔ اب جو پایا اچھا کاغذ اور اچھا قلم تو شرارت کہو یا ناسمجھی صفحے کے بیچوں بیچ میں سطور ذیل لکھ ڈالیں۔

"ایشیا سب سے بڑا براعظم ہے۔ افریقہ ایشیا سے مغرب کی طرف ہے۔ اسے تاریک براعظم کہتے ہیں۔ امریکہ ۱۴۹۲ء میں دریافت ہوا۔ اس لیے نئی دنیا کہلاتا ہے۔ اوشیانا ایشیا سے جنوب و مشرق میں واقع ہے۔ یورپ سب سے چھوٹا براعظم ہے۔"

آئندہ کے لیے تو تنبیہہ کر دی گئی۔ مگر خیال ہوا کہ پٹھان کے بچے کی طرح مضمون نگاری کے میدان میں اس کا وار خالی نہ جانا چاہیے لہٰذا بچے کی تحریر بجنسہٖ شامل مضمون رہنے دی جس کے لیے ناظرین سے معافی طلبی کے بعد پھر سلسلۂ سخن شروع کیا جاتا ہے۔

روپا : "بڑی آپا سلام۔"

آسیہ : جیتی رہو۔ ٹھنڈی سہاگن۔ دعا دینے کو تھی دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ مگر درخواست سے پہلے ہی منظوری کا اثر دیکھ رہی ہوں۔ خود نہانا تو کوئی بات نہیں۔ تم تو دودھ سے دوسروں تک کو نہلوا رہی ہو۔ ماشاءاللہ وہ کثرت ہے کہ ٹین کے ڈبوں میں بند ہو ہو کر ایرا غیرا کے گھر پہنچ رہا ہے۔ پوتوں کی یہ کیفیت (بھئی بُرا مت مانیو) میں ہونستی نہیں اور تمہاری سگی بہن ہو کر بھانجوں کو ہونسوں تو مجھ خالہ پر لُعنت ہے! اپنے گھر کا تو ذکر کیا دوسروں کے گھروں میں ایسے پھل رہے ہیں جیسے کردی تو مڑی۔"

روپا : یہ سب آپ بزرگوں کی دعا کا اثر ہے۔

آسیہ : کہو بہن برطو، فرسو، سلفو، المو، کہاں تک نام لوں، سب بچّی بچے اچھے ہیں؟

روپا : جی ہاں سب اچھے ہیں۔

آسیہ : برطو تو بیچارہ بڑا گئو ہے، فرسو بانکا چھیلا ہے۔ شام ہوئی نہیں کہ وہ خط بنوا۔ مونچھیں چڑھا، ٹیڑھی ٹوپی لگا بازار کی سیر کو نکلا۔ سلفو مثل فیل ہے۔ لمبا چوڑا، بھاری بھرکم۔ الغرض خواہ مخواہ مرد آدمی۔ مگر سنتی ہوں گھنّا ہے۔ المو کو میں نے عرصے دیکھا نہیں۔ پچھلی دفعہ جب تم لیکر آئی تھیں تب تو بڑا شریر اور چلبلا بچہ تھا مگر اٹھان ماشاءاللہ اچھی تھی۔ ہونہار اور چونچال ایسا تھا کہ دونے کو بچھاڑ دے۔

روپا : جی ہاں، اب تو بڑا ہو گیا ہے، جھگڑالو بہت ہے۔ بھائیوں کو چین نہیں لینے دیتا۔ آپ نے برطو، فرسو، سلفو کو ایسا ہلا لیا ہے کہ ہر وقت آپ ہی کے پاس بنے رہتے ہیں۔ میں بہتیرا، بلواتی پکڑواتی مگر آپ کا گھر انہیں ایسا بھایا ہے کہ ہٹنے اور ٹلنے کا نام ہی

نہیں لیتے۔

آسیہ: ملنا کیسا، آنکھوں سکھ، کلیجے ٹھنڈک، ماں اور خالہ میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ سنا نہیں کہ ماں مرے ماسی جیئے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ تمہارے یہاں کا سا عیش آرام مجھ غریب کے گھر کہاں؟

روپا: آپا، بُرا نہ مانو کہوں۔

آسیہ: شوق سے کہو، بڈھوں کے اچھا بُرا ماننے کی پروا جوان نہیں کیا کرتے۔

روپا: آپ کے گھر میں اس قدر غربت نہیں جس قدر کہ بدتمیزی، پھوہڑپن اور گھنونا پن ہے۔ کسی کو کھانے کا سلیقہ نہیں پہننے کی تمیز نہیں، انتظام کی عقل نہیں۔

آسیہ: (آہ بھر کر) ہاں بہن سچ کہا، خدا کی شان! کبھی ہم ہی آس پڑوس میں تیونالے اور تمیز والے سمجھے جاتے تھے۔ سینا پرونا ہم جانتے تھے، کھانا پکانا ہم جانتے تھے، لکھنا پڑھنا ہم جانتے تھے۔ آج پھوہڑ ہم، بدتمیز ہم، گندے ہم، گھنونے ہم۔ مگر اس کی وجہ جانتی ہو۔ آیا پیسا مت آئی، گیا پیسا مت گئی۔ گانٹھ میں دام تو سب کریں سلام۔

روپا: تو اب آپ کے دام کہاں گئے؟

امری: (آنکھ بھوں چڑھا کر) کس نے کھا لیے؟

حسینہ: (منہ بنا کر) کس نے چرا لیے؟

آسیہ: (آہ بھر کر) کہاں گئے؟ کس نے کھا لیے؟ کس نے چرا لیے؟ کیا جواب دوں؟ بیٹیو، دُکھے جی کو درد کھانے سے کیا فائدہ؟ امری: اپنی تو ہم کہتے ہیں۔ پاک رہ بیباک رہ، نہ ہمیں بڑی کی دھن سے غرض، نہ چھوٹی کی دولت سے مطلب۔ نہ اودھو کا لینا نہ مادھو کا دینا۔ اگر کبھی کبھار کچھ لیتے ہیں تو کچھ دے کر ہی لیتے ہیں۔ ویسے لینے کا ہمیں حق کیا ہے۔

آسیہ: اے امری میں کچھ کہتی ہوں۔ میں نے تو لینے کا ہمیشہ گن مانا، دینے کا کبھی احسان نہیں جتایا۔ مگر منہ پر آئی بات اب جو کھلواتی ہو تو کہتی ہوں۔ دیئے کھلونے اور لی اشرفیاں۔ دیا لوہا اور لیا سونا۔ میرے گھر سے آگ لائیں، نام دھرا بیسندر۔

حسینہ: بولو، اپنی تو ہم کہتے ہیں۔ ہم ناشکرے نہیں۔ کھا کے مکرے تو ٹک پھوٹ پھوٹ مرے، ہم تو نئی باجی اور چھوٹی بھنو کو جانتے ہیں۔ انھیں کا جھوٹن کھاتے اور انھیں کا اترن پہنتے ہیں۔ اب سے پہلے تو ہمارے گھر میں بھونی بھانگ بھی نہ تھی۔ جب سے انہوں نے خبر لی ہے چولھے پر توا اور گھڑے پر کٹورا ہے۔ ان کے بچے آئے تو گھر کا گزارا ہو گیا۔

آسیہ: ہولو۔ مجھے بحث کرنا منظور نہیں۔ اڑی اڑی بات طاق بیٹھے۔ میل کا بیل، سوئی کا بھالا، بات کا بتنگڑ بن جائے۔ اچھے جی بُرے ہو جائیں۔ اس لیے جو تم کہتی ہو سچ ہے۔

روپا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ پیچھے سے دنادن توپوں کی گھن گرج کی آواز سنائی دی۔ سب نے پیٹھ پھیر کر دیکھا تو آگ کے شعلے بلند ہیں۔ روپا یہ دیکھ کر یہ کہتی ہوئی گھر کو بھاگی ”ہے ہے جوان مرا المو بھائیوں سے لڑ پڑا۔“

آسیہ: بہن گھبرانا نہیں۔ اللہ تیرے گھر میں ٹھنڈ سیلک رکھے۔ میں چھنو مُنو کو ابھی بھیجتی ہوں اور ہاں چنو سے بھی کہتی ہوں کہ وہ اپنے نوکر چاکر لے کر جلد پہنچے۔ راقم

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف برطرف
ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

حدیث الغاشیہ

مولانا ابوالکلام آزاد

دو دن کی فریقانہ معرکہ آرائی کو اب اور کہاں تک طول دیا جاتا؟ اس کا فیصلہ یوں کیا گیا کہ بین بین طریقہ پسند کیجیے کہ خیرالامور اوسطہا کفر و اسلام دونوں کو اختیار کیجیے۔ اہرمن اور یزداں کو رام کیجیے۔ ایک ہی طرف کیوں جھکیے۔ جب دونوں کی خوشنودی حاصل ہو سکے؟ صرف کعبے ہی کے کیوں ہو رہیے۔ جب تک بت کدے سے بھی رسم و راہ ہو سکے! ایک ہاتھ میں زنارِ برہمن لیجیے اور دوسرے ہاتھ میں سُبحۂ زاہد، یعنی ایک ہاتھ ایمان سے ملائیے اور دوسرا وقتِ مصافحہ نفاق۔ یعنی ایک ہاتھ میں جامِ غلامی” اور دوسرے میں” سندانِ حریت“۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

مُذَبْذَبِیْنَ ذٰلِکَ، لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ ط (۴ ، ۱۴۳)

معشوقِ ما بشیوۂ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلاً (۴ : ۱۵)

(بعض باتوں میں راہِ ایمان اختیار کریں گے اور بعض میں راہِ کفر، وہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری راہ اختیار کریں) حقیقت یہ ہے کہ اس ”جمع اضداد“ کی راہ نہایت مشکل ہے۔ ایک ہاتھ میں جامِ باطل پرستی رکھیے اور دوسرے میں سندانِ حق پرستی اور دونوں کو باہم زور زور سے ٹکرائیے مگر شرط یہ ہے کہ باطل کے جامِ بلوریں میں بال تک نہ آئے اور سندانِ حق پرستی بھی ہاتھ سے الگ نہ ہو۔ ع

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اوروں کی خبر نہیں مگر اپنی کمزوری کا تو ہمیں صاف صاف اعتراف ہے۔ اس شعبدہ بازانہ چابکدستی کی مشق کے لیے بڑی بڑی قابلیتوں کی ضرورت ہے۔ یہ مقاماتِ عالیہ ہم تہی دستانِ کمال کو بھی حاصل نہیں ہوئے۔

”اسے میں خبر اڑی کہ (ہز آنر) کے ہاں (ڈنر) ہے۔ ہم نے کہا کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ قومی طاقت کے ہزار دن آہنی حربے ایک طرف اور ان نئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہیے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے؟ جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے ؎

چشم اگر ایں است و ابرو ایں و ناز و عشوہ ایں
الفراق اے ہوش و تقویٰ، الوداع اے عقل و دیں

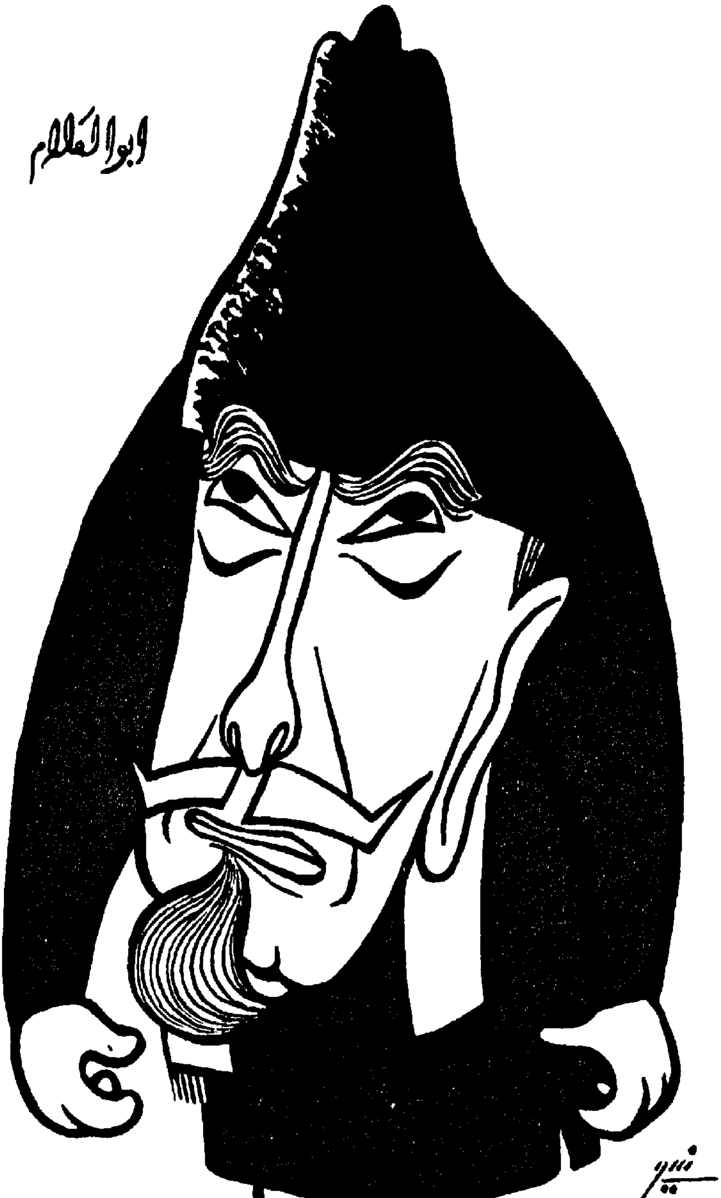
ابو العلاء

لیکن پھر ہم نے دل کو تسکین دی۔ اطبائے قدیم و جدید کا اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے۔ جلسہ رات کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے ہے اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ و بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پہ زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہو گی کہ صبح تک معدے میں فرد کش رہے اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدوں سے۔

مگر افسوس کہ دوسرے روز ہماری طبی معلومات میں ایک انقلابِ عظیم واقع ہوا (طبی کانفرنس) کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ غذا جتنی نفیس و لطیف ہوتی ہے اتنی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے۔ نیز اگر بقراط بھی کہیں ملیں تو ہم ان سے اس بارے میں لڑنے کے لیے تیار ہیں کہ شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے۔"

حریفانِ خلوت نے "صحبتِ نیم شبی" کی مجلسِ خاص کے مزے لوٹے لیکن اس بادہ گسارانہ فیاضی کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ صبح کی مجلسِ عام کو بھی سرشاری اور بے خودی سے محروم نہ رکھا جائے۔ کیونکہ بارہ دری سے نکل کر جو کچھ گزری اس کی ذمہ داری تو کوئی نہیں لے سکتا اور کیوں لے؟ لیکن اس میں شک نہیں کہ بارہ دری کے اندر تو سبھی مست تھے ؎

بے خود اس میں ہیں سب حاتم
ان دنوں کیا شراب سستی ہے

لیکن ہم کہیں کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساقی مآب دوست نے پلائی تو ضرور کوئی ایسی ہی شے جس کا رنگ سُرخی مائل اور نظروں کے لیے ولولہ انگیز تھا۔ لیکن اس میں شک ہے کہ کہیں پانی تو زیادہ نہیں ملا دیا تھا۔ کیونکہ ہم نے ۲۸ ہی کو دیکھا کہ شام ہوتے ہوتے جمائیاں آنی شروع ہو گئی تھیں اور چہرے اکثر بے حال تھے۔ بارہ دری سے نکلنے کے بعد ہی چند مدعیانِ آزادی ملے جن سے ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہنگامہ تھا لیکن وہ رزولیوشن کا مطلب بھی نہ بتلا سکے۔ جب کہا کہ بے سمجھے بوجھے آپ نے بھی تو "رقصِ مذبوحہ" میں حصہ لیا تھا تو یکایک ان کے سر میں خارش شروع ہو گئی۔ حالانکہ اب ہاتھ کی جگہ سر نہیں بلکہ پیشانی تھی۔ ؏

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر۔

وہاں تو سب دم بخود رہے لیکن ڈیپوٹیشن کی شرکت کا مسئلہ ایسا نہ تھا جو بعد کو یاد نہ آتا۔ ہم نے سنا ہے کہ بقیہ تمام دن اسی معرکہ آرائی میں صرف ہوا۔ ؏

یہ بعد از انفعال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

بزرگانِ پنجاب نے فوراً اپنا بستر لپیٹا کہ ہماری قائم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور صحبتِ نیم شبی کی کسی کو خبر نہیں دی۔ گویا اور تو تمام صوبوں کی قائم مقامی کا کامل لحاظ رکھا گیا تھا! سنا ہے کہ جناب (راجہ صاحب) اسٹیشن دوڑے ہوئے گئے کہ خدا کے لیے اور جو جی میں آئے کیجیے مگر روٹھ کر تو نہ جائیے۔ ؏

تم ہی سچے سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے

خیر یہ تو اس "شبِ وصل" کی شام تھی۔ اس کے ذکر کو کہیں جلد نپٹائیے۔ کیونکہ اصلی پُر لطف حصہ تو اس کے بعد آتا ہے جب کہ

رندانِ بادہ گسار نے "حجلۂ نیم شبی" آراستہ کیا اور موٹر کاریں بھیج بھیج کر ایک ایک شریکِ پیماں کی قسمتِ خفتہ کو مژدۂ بادہ گساری سے بیدار کیا گیا ع
وقت آں نیست کہ در حجرہ بخوابی تنہا

"ذکرِ عیش بہ از عیش" یعنی ع
ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

چشمِ تصور سے کام لیجیے کہ دسمبر کے آخری ہفتے کی سرد راتیں ہیں۔ لیلائے شب کی زلف کمر سے گذر چکی ہے۔ ایک کنجِ خلوت میں صحبتِ بادہ پرستی گرم ہے اور گرم گرم ساز نثوسا کی ع
دھری شراب ہے بیٹھے ہیں جا بجا ساقی

قبل اس کے کہ آپ کسی مدعی زاہد کو الزام دیں، آپ ہی کو منصف بناتے ہیں کہ بھلا ایسی توبہ شکن اور ولولہ انگیز صحبت میں اگر ہمارے کسی دوست کی توبہ نے لغزش کھائی اور اس جام عہد فراموش کو منہ سے لگاتے ہی بنی جو کسی کے "دستِ طلائی" نے پیش کیا تھا تو انصاف کیجیے، آخر پہلو میں دل کس کے نہیں ہے! اور یہ تو وہ مقام ہے کہ ہاروت و ماروت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے تھے۔ ع
ساقیا مرنج از من، عالمِ جوانی ہاست

خود صحبت آشنایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی تھی۔ اللہ اللہ جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی "پُراسرار صحبتیں"! آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں گذر رہے ہیں؟ رات کی تاریکی، پچھلا پہر، رندانِ شاطر و کہنہ مشق کا ہجوم اور بعض نوجوان و نوآموز مدعیانِ حریت پھر شغلِ مے پرستی کا یہ عالم! اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں؟

مست بر بسترِ من افتد و رنداں دانند
حالتِ مست کہ بر بسترِ ہشیار افتد

اب ادھر کی سُنیے۔ یہاں تو شب زندہ دارانِ بادہ گساری "صبح نمازؔ" کی اعضا شکنیوں میں کروٹیں بدل رہے تھے اور ادھر صبح آٹھ بجے ہی سے اجلاس کا ہال تماشائیانِ بزم سے بھر گیا۔ ایک دن پہلے حصولِ مقصد کے لیے جو تدابیر گوناگوں و بوقلموں اختیار کی گئی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک تدبیر خاص یہ تھی کہ جلسے کے لیے ٹکٹ مقرر کر دیا گیا اور یہاں تک ہمیں بھی اتفاق تھا۔ کیونکہ آج اسٹیج پر پردے سے جو پتلیاں نکلنے والی تھیں وہ تھیٹر کے آموختہ یاد کیے ہوئے ایکٹروں کی طرح ایک تماشے زیادہ نہ تھیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ (باصطلاحِ عوام) اس "تماشہ گھر" کے لیے ٹکٹ بھی مقرر کیا جائے لیکن اس پر طرہ یہ تھا کہ ٹکٹ کے لیے پہلے تو شرط لگائی گئی کہ صبح آٹھ بجے سے پہلے لے لیے جائیں، حالانکہ جاڑوں میں آٹھ بجے تک رات کی کمر سے فضا بھی صاف نہیں ہوتی۔ پھر ٹکٹ کے لیے تھیٹر کے صدر دروازے پر ٹکٹ گھر کی کھڑکی کا اعلان کیا گیا تھا لیکن جو لوگ وہاں پہنچتے تھے ان سے کہا جاتا تھا کہ راجہ صاحب کے ہاں، ہائے۔ راجہ صاحب کے ہاں سے صدا اٹھتی تھی کہ جہاں سے آئے ہیں اسی طرف پچھلے پاؤں پھر جائیے۔ !

یاں سے واں، واں سے یہاں حکم ہوا وصل کی شب
ہم اٹھاتے ہی، بچھاتے رہے بستر اپنا

اس سے غالباً مقصود اصلی یہ تھا کہ ان مشکلات کی وجہ سے آزاد خیال طبقے کی مجارٹی جمع نہ ہو سکے۔ یہ بھی خبر اڑی تھی کہ ایک جماعت کل کے لیے باہر سے ٹھیکے پر بلائی گئی ہے۔ ایک جماعت راوی ہے کہ پولیس کی قوت سے بھی کام لینے کا ارادہ کیا گیا تھا لیکن صبح کو پھر ان تمام انتظامات کے عمل میں لانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ رات کے قول و قرار کے بعد سب مطمئن ہو گئے تھے کہ جب خیموں میں باہم صلح کر لی ہے تو میدانِ جنگ میں لڑائی کا اب کیا خوف؟ (ناظم پاشا) جب ساتھ مل گیا تھا تو (کامل پاشا) بے فکر ہو گیا تھا کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ فوج کی اصلی قوت ان کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو لیکن اس وقت تو ضرور ہے۔

بہر حال مجلس جم چکی تو پردہ اٹھا اور اس تماشے کا ایک ہی ایکٹ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ہمارے عشوہ فرما دوست باہر نکلے اور رزولیوشن پیش کیا وہ بیٹھے تو میجر (سید حسین) بلگرامی اٹھے اور تائید کی۔ ع

یکے بدزدی دل رفت و پردہ دار یکے

اب نہ ۲۶ کے محرک تھے اور نہ موید ؎

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

۲۶ کی سہ پہر کو ہمارے دوست کا مزاج بہت گرم تھا۔ ان کی تقریر اتنی پُرجوش تھی کہ اس کی بے اعتدالی ہم کو بھی ناگوار گزری اور ان کے کان میں کہا کہ خدا را ذرا لب و لہجہ نرم کیجیے۔ علی الخصوص یہ بات ہمیں کچھ اچھی نظر نہیں آئی کہ سارا زور "جوش محمدؐ" اور "متین اللہ" کے ضلع پر وہ صرف کر رہے تھے۔ اور تقریر صرف صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پر شخصی ارادت ظاہر کرنے میں جاری تھی۔ حالانکہ بہتر تھا کہ بغیر تشخص و تعین کے وہ سب کچھ کہتے۔ ہم کو اعتراف ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اس وقت قابلِ تعریف ضبط و تحمل سے کام لیا اور اپنی تقریر میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ گو جلسہ ان کا مخالف تھا۔ مگر غصہ تو وہ شے ہے کہ موقع شناسی کی مہلت ہی کب دیتا ہے

لیکن آج کل کی تقریر اتنی ٹھنڈی تھی کہ پرسوں جن لوگوں نے ان کے جوش کے انگارہ سے اپنی انگیٹھیاں روشن کی تھیں آج ان کو آغازِ تقریر ہی سے جماہیاں آنے لگیں۔ پرسوں ہمارے دوست کے ہاتھ میں شامپین کے جام تھے۔ آج انہوں نے چاہا کہ ٹھنڈے پانی ہی کو واٹر گلاس میں بھر بھر کر تقسیم دیں۔ سوڈا بھی نہیں۔

ہم نے تقریر کا پہلا لفظ ہی چکھ کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے احباب سے کہہ دیا تھا کہ آج یا تو صرف پانی ہے یا پانی اس قدر ملا دیا ہے کہ بُو اور ذائقہ دونوں کا پتہ نہیں ؎

مرا اے می فروش آں بے خودی نیست مگر در بادہ آب کردہ باشی

سب سے پہلے ہمارے دوست نے قسمیں کھانا شروع کیں کہ مجھ پہ خدا کے لیے اعتماد کیجیے۔ لیکن وہ بھول گئے کہ زیادہ قسمیں کھانا کوئی اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی۔ گو اچھی علامت ہو۔

ع
قسم سچی سہی پھر بھی ضرورت کیا ہے کھانے کی

ہمارے دوست کو معلوم نہیں ہے کہ اعتماد حاصل کرنے کا ذریعہ قسموں اور عہد و پیمان میں نہیں ہے بلکہ کسی اور ہی چیز میں ہے۔ سچا اعتماد پیدا کرنے والوں نے کبھی خود قسمیں نہیں کھائی ہیں بلکہ اپنی استقامت اعمال کے زور سے اعتماد کی قسمیں دوسروں سے لی ہیں۔ اس نکتے کو خانخاناں) نے سمجھا تھا ؎

بکیش صدق و صفا حرف عہد بیکار است   نگاہ اہلِ محبت تمام سوگند است

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ

قبل اس کے کہ کوئی کچھ کہے خود ان ہی نے ڈیپوٹیشن کی تجویز کو سادی چیک ٹبک سے تعبیر کیا اور پھر واقسموا باللہ جہد ایمانہم کا سلسلہ شروع ہوا۔ کیا یہ اس کا ثبوت نہ تھا کہ خود ان کا ضمیر بھی اس وقت عالمِ اضطراب میں تھا۔ اس لیے خود ہی اپنے سے کھٹکتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں ؟ صاف معلوم ہوتا تھا کہ آج جو کچھ زبان سے نکل رہا ہے اس سے ہمارے دوست کو خود بھی حیا آ رہی ہے ؎

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں   تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں ؟

رزولیشن کے پاس کر دینے کی خوشی کے ہیجان نے ہوش و حواس کھو دیے تھے۔ جن نوجوانوں نے پرسوں اپنی گلابازی سرگرم تقریروں میں دکھائی تھی۔ آج ان کی گرج اس ہنگامے کے بپا کرنے میں کام آ گئی۔ چیختے چیختے گلا بیٹھ جاتا تھا مگر سینوں کے اندر آوازوں کا ایک سمندر بہ رہا تھا۔ آواز اگلتے اگلتے منہ دکھ جاتے تھے۔ مگر برق و رعد کا سیلاب تھا کہ کسی طرح بند ہی نہیں ہوتا تھا۔ ”بلغاری محاصرہ“ کی پلٹنیں اس بیکاری سے کچھ اکتا سی گئی تھیں۔ اب انہوں نے ایک گھنٹے کی خاموشی کی کسر یوں نکالی کہ کچھ دیر کے لیے بارہ دری کے اسٹیج کو ”بارسٹن سرکس“ کا تماشا گاہ فرض کر لیا اور لگے بے تکان قلابازیاں کھانے ؎

دل رنگیں شود بے ذوق زنہار   گہے طفلی شود مستانہ مے رقص

جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے، محال ہے کہ اس کی کیفیت سمجھائی جا سکے۔ چہرے جوش و ہیجان سے سرخ، گردن کی رگیں ابھری ہوئیں، شدتِ شور و ہنگامے سے پھٹے ہوئے ہاتھ میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں اور پاؤں کو اضطرابِ رقص سے قرار نہیں، منہ سے کف اُڑ رہی تھی اور چونکہ قریب قریب کھڑے تھے اس لیے آپس میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رومال نکال کر منہ پونچھتے اور پھر کف اڑاتے۔ منتظمین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کے اسٹیج سے میدانِ رقص کا کام لیا جائے گا ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوش تواجد میں گردشِ رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی اس لیے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبی تختوں کو کوٹ رہا تھا۔

یہ ایک رقص مغلوبہ کا اصلی ایکٹ تھا۔ اگر (سر ہنری اورنگ) زندہ ہوتا اور اس مجمع کو دیکھتا تو یقین ہے کہ ان پُر جوش نوجوانوں کی ایک کھیپ تو ضرور اپنے ساتھ لے جاتا۔

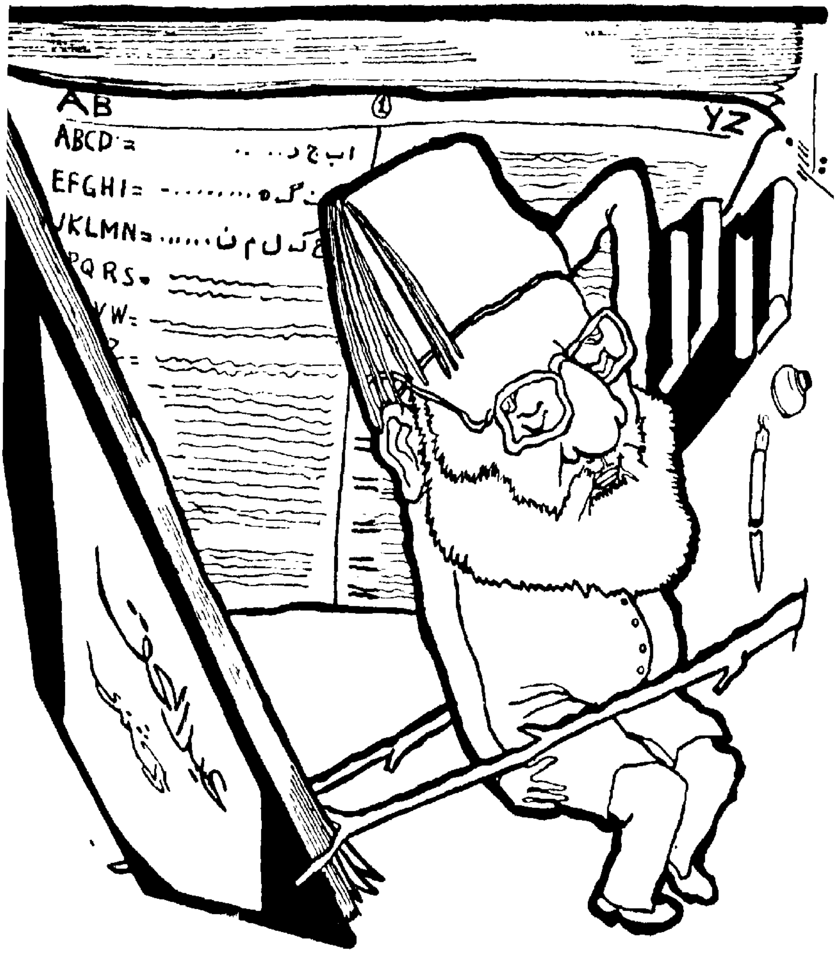
AB
YZ
ABCD =
اب ج د
EFGHI=
KLMN=
PQRS=
VW=

آسان اردو

ڈاکٹر عبدالحق

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مرزا غالب کی مشکل پسندی مشہور ہے اور جب اس کی شکایت بہت بڑھ چکی تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا۔ یہ عذر تو ایک لطیفہ ہے لیکن عام شکایت کا اثر یہ ہوا کہ وہ سچ مچ آسان کہنے لگے اور آسان بھی ایسا کہ اس کا جواب نہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اسی آسان کلام پر ہے۔ آج مجھے بھی آسان لکھنے کی التجا کرنی پڑی ہے۔ خدا کرے اس کا نتیجہ بھی حسب مراد نکلے۔

یہ واقعہ ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ اس کا ذکر میں نے اس لیے کیا تھا کہ اردو کے اس نئے دور میں پھر ویسے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ ہماری زبان پر ایک اور وقت بھی ایسا ہی آیا تھا۔ اس بدعت کا آغاز لکھنؤ میں ہوا۔ جدت پسندی کے شوق میں لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں نے ایسے مشکل اور ثقیل فارسی عربی کے لفظ اپنے کلام میں داخل کرنے شروع کر دیئے تھے کہ عام فہم تو کیا خاص فہم بھی نہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو کے بہت سے ٹھیٹ لفظ اور بول چال کے عام فہم محاورے عامیانہ قرار دے کر متروک کر دیئے گئے۔ یہ معیار شرافت و ثقاہت سمجھا جاتا تھا۔ تحریر ہی میں نہیں۔ بات چیت میں بھی یہی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی علمیت جتانے کے لیے یہ لوگ عجیب طرح کی زبان بولنے لگے تھے۔ ایک زمانہ میں یہاں کی ہائی کورٹ میں لکھنؤ کے ایک صاحب علم میر مجلس تھے۔ ایک دن میں یونہی ان سے ملنے گیا۔ مزاج پوچھا تو فرمایا "صدر پر انصاب نوازل ہے۔" آپ سمجھے کیا کہا۔ غزل جس کی زبان سبک فصیح اور عام فہم ہوتی ہے وہ بھی اس کی زد سے نہ بچی اور اس میں بھی وہاں کے شاعروں نے ایسے ثقیل اور نامانوس عربی فارسی لفظ لکھنے شروع کر دیئے جو کسی طرح ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں مثالیں پیش کر کے آپ کی سمع خراشی کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا اب بھی کچھ نہ کچھ اثر باقی ہے۔

بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک غریب آدمی حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کے مطب میں آیا۔ اس کے گھٹنے میں درد تھا۔ حکیم صاحب نے معائنہ کے بعد کہا۔

"حلقیت کا ضماد کرو۔" وہ بیچارہ ہکا بکا ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ اب کے حکیم صاحب نے ذرا ڈانٹ کر کہا حلقیت کا ضماد کرو۔ وہ خاک نہ سمجھا اور اسی طرح سہمے انھیں دیکھتا رہا۔ اس پر حکیم صاحب نے مولوی عبدالحلیم شررؔ سے جو ان کے پاس بیٹھے تھے فرمایا کہ یہ کیسا جاہل گنوار ہے کہ بات نہیں سمجھتا۔" خیر وہ تو ایک گنوار تھا، آپ معاف فرمائیں گے۔ اگر میں اس تقریر سننے والوں سے یہ پوچھوں کہ آپ میں سے کتنے ہیں جو اس کا مطلب سمجھے۔ اگر حکیم صاحب معمولی زبان میں یہ کہہ دیتے "کہ ہینگ کا لیپ کرو۔" تو کیا ان کی شان میں

جفتے پڑ جاتے۔ اور ان کی حکمت و حذاقت میں فرق آجاتا؟ مگر نہیں وہ طب کے علمی الفاظ اور اصطلاحات کو عام بول چال میں بیان کرنا اپنے فن کی توہین اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اگر عام بول چال میں یہ باتیں آگئیں تو شان کہاں رہی۔

یہی حال مولویوں کا ہے۔ وہ اپنی تقریر، وعظ یا بیان میں موٹے موٹے عربی یا فارسی کے لفظ اور جملے کے جملے مزے لے لے کر بلاتکلف کہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ سننے والوں میں بہت سے ایسے ہیں جو نہیں سمجھتے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ گو نہ سمجھتے ہوں لیکن دل میں سب قائل ہیں کہ یہ بڑا مولوی اور بہت بڑا عالم ہے۔ مرعوب کرلے کا یہ بہت اچھا گُر ہے۔

سر سید احمد خاں نے جہاں اور بہت سی بدعتوں کو توڑا جملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔ سرسید کی سادہ نویسی مشہور ہے۔ مجھے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے میں اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کرنا چاہتا ہوں جسے گھر کی ماما اور سائیس بھی سمجھ لے اور انہوں نے یہ کر دکھایا۔ سنجیدہ اور علمی مضامین بھی انھوں نے بڑی ستھری اور آسان زبان میں لکھے ہیں اور بعض وقت انہیں سادہ الفاظ اور فقروں کے صحیح استعمال میں وہ قوت اور دلکشی پیدا کر دی ہے کہ جو بڑے بڑے الفاظ اور جملوں سے ممکن نہیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی حیدر آباد میں مقیم تھے میں ایک روز ان سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں (اس زمانے میں وہ علم الکلام لکھ رہے تھے) میں نے پوچھا کہ کس فکر میں ہیں۔ فرمایا الہام و وحی کے موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے بھی اس پر لکھا ہے۔ لکھا کیا ہے مسئلہ کو پانی کر دیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کیا پیرایہ اختیار کروں۔

ہم کیوں لکھتے ہیں۔ اس لیے تاکہ ہمارے خیالات دوسروں تک پہنچیں اور لوگ ان سے مستفید ہوں، تو جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ ہماری تحریر کو پڑھیں گے اُسی نسبت سے اس کا فائدہ بھی زیادہ ہوگا اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ تحریر آسان زبان میں ہو اور ایسے پیرائے میں لکھی گئی ہو کہ لوگ اسے شوق سے پڑھ سکیں۔ اگر مشکل زبان ہو تو اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور اسے مقبولیت حاصل نہ ہوگی۔ اگر آپ دنیا کے ایسے ادیبوں کی فہرست بنائیں جنھیں قبولِ عام حاصل ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں یہ عزت اُنھیں کو ملی ہے جنھوں نے اپنے خیالات آسان اور شگفتہ زبان میں ادا کیے ہیں۔

ہم آسان اس لیے نہیں لکھتے کہ آسان لکھنا آسان ہے بہت مشکل ہے۔ اوّل تو لکھنے والے کو زبان پر پوری قدرت ہو۔ دوسرے جس خیال کو وہ ادا کرنا چاہتا ہے وہ ہمارے ذہن میں اس قدر صاف اور روشن ہو اور اس کا ہر پہلو اس قدر رچا ہوا ہو کہ جب ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحۂ کاغذ پہ موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے۔ جب خیال خود ہی ہمارے خیال میں سلجھا ہوا نہیں ہوتا تو بیان بھی مبہم اور تاریک ہوتا ہے۔ اور اس وقت مشکل الفاظ اور پیچیدہ طرز بیان کی آڑ لینی پڑتی ہے۔ اس میں لفظ کے صحیح استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر ادیب کو یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ کون سا لفظ کب اور کہاں استعمال کیا جائے۔ لفظ میں بڑی قوت ہے۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا اثر رکھتا ہے۔ بعض وقت اچھے اچھے ادیبوں کو لکھتے وقت صحیح لفظ نہ ملنے پر بڑی الجھن ہوتی ہے۔ ایک لفظ آتا ہے وہ اسے رد کر دیتا ہے۔ دوسرا آتا ہے اسے بھی ہٹا دیتا ہے۔ تیسرا آتا ہے وہ بھی پسند نہیں آتا۔ آخر اسی رد و بدل میں جب اسے صحیح لفظ مل جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے گھٹا میں سے چاند نکل آیا جو اس گُر سے واقف نہیں۔ اور صحیح لفظ کی قوت کو نہیں جانتے۔ وہ اپنا لفظ ایچ پیچ اور ہیر پھیر سے کئی کئی جملوں میں ادا کرتے ہیں۔ پھر بھی اس میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ جو صحیح لفظ صحیح مقام پر اپنی جادو بیانی سے پیدا کرتا ہے۔

ایک یہ بات بھی دماغوں میں سمائی ہوئی ہے کہ بڑے اور پُرشکوہ لفظوں میں زیادہ قوت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خاص خاص موقعوں پر ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن عام طور پر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شان و شوکت اور عظمت دکھانے کے لیے پرشکوہ اور بڑے لفظوں کی ضرورت پڑتی ہے یا کبھی کبھی رعب ڈالنے اور مشیخت جتانے کے لیے بھی۔ لیکن اثر اور دل نشینی کے لیے آسان اور چھوٹے لفظ ہی کام آتے ہیں۔ بعض اوقات آسان اور چھوٹے لفظوں میں ایٹم بم کی سی قوت ہوتی ہے۔

ایک بار مولانا حالیؔ کے پاس ایسی تحریر آئی جس میں بہت سے مشکل اور دقیق لفظ تھے اور عبارت بھی پیچیدہ تھی۔ فرمانے لگے کہ لوگ جیسے بولتے ہیں ویسے کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے کہا کہ بولنے میں زبان کے سوا آدمی چشم ابرو ہاتھ کے اشارے اور چہرے کے تیور سے بھی کام لیتا ہے۔ لکھنے میں یہ میسر نہیں۔ اس لیے دقیق الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے اس کمی کو پورا کرتا ہے لیکن اگر زبان پر قدرت ہو اور لفظ کا صحیح استعمال معلوم ہو تو وہ گفتگو سے زیادہ تحریر میں حسن پیدا کر سکتا ہے۔

مشکل پسندی کا ایک دور لکھنؤ کا تھا جس کا میں اشارتاً ذکر کر چکا ہوں۔ دوسرا دور اس وقت آیا جب مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" افقِ صحافت پر نمودار ہوا۔ اور اس کے بعد انھوں نے "البلاغ" جاری فرمایا۔ حضرت نے صحافت کا رنگ ہی بدل دیا۔ بدل کیا دیا بگاڑ دیا۔ قیمت یا چندے کے لیے "بدلِ اشتراک" ایڈیٹر کے لیے "مدیر مسئول" اور اسی قسم کی ناہموار اور غیر ضروری ترکیبیں رائج فرمائیں انتہا یہ ہے کہ اپنے اسم شریف کو بھی عربی لباس پہنا دیا۔ یعنی "احمد المکنی" بہ ابی الکلام الدہلوی"۔ لاحول ولا قوۃ یہ اردو ہے یا اردو دشمنی۔ ایسے زیادہ سے زیادہ اردو نما عربی یا عربی نما اردو کہہ سکتے ہیں۔ نقالی یا تنقید انسان کی فطرت میں ہے۔ بعض اخبار والے اور دوسرے لکھنے والے اس رنگ کو لے اڑے۔ اور عجیب و غریب واہی تباہی الفاظ اور ترکیبیں لکھنی شروع کر دیں۔ ایک ان کے مقلد اخبار کے ایڈیٹر نے اپنا ایک مقالہ اس طرح شروع کیا۔

"بعد از انقضائے دہور و مرور ایام و شہور" اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر بہت افسوس ہوتا تھا لیکن یہ بہروپیاپن زیادہ دیر تک نہ رہا۔ یہ چیز چلنے والی نہ تھی نہ چلی اور خدا کا شکر ہے نہ چلی۔

الفاظ کا جادو

عبدالماجد دریابادی

اگر آپ کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے تو کسی "سرا" میں ٹھہرنا آپ کے لیے باعثِ توہین۔ لیکن کسی "ہوٹل" میں قیام کرنا ذرا بھی باعثِ شرم نہیں۔ حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ سرا مشرقی ہے، ہندوستانی ہے، دیسی ہے اور ہوٹل مغربی ہے۔ انگریزی ہے، ولایتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ سرا کے فلاں بھٹیارے سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں لیکن فلاں ہوٹل کے منیجر سے آپ کا بڑا ربط وضبط ہے۔ اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ سرا کے بھٹیارے اور ہوٹل کے منیجر کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں! کسی مدرسہ میں آپ مدرس ہیں تو بس کچھ معمولی ہی سے، لیکن کسی کالج میں اگر آپ لیکچرار یا پروفیسر ہیں، تو معزز ہیں، صاحبِ وجاہت ہیں۔ حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے مدرس اور پروفیسر بالکل ایک چیز ہیں۔

ندوہ کے دار الاقامہ میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل خوش نہیں ہوتا۔ لیکن اسی دارالاقامہ کا نام جب آپ شبلی ہوسٹل سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ مدرسہ میں اگر آپ پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ بے قیمت ہیں۔ لیکن اگر آپ کا تعلق کسی کالج سے ہے تو آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟ اب ہر مدرسہ طبیہ” طبیہ اسکول ہے اور مدرسہ تکمیل الطب اور مدرسہ منبع الطب اب تکمیل الطب کالج اور منبع الطب کالج ہیں۔ مدرسہ طبیہ وجاہیہ کا زمانہ گیا۔ اب اس کا صحیح نام "طبیہ وجاہیہ کالج" ہے۔ طبی درسگاہوں کو چھوڑیے، خود دینی درسگاہوں کا کیا حال ہے؟ وہ دن گئے جب زبانوں پر مدرسہ چشمہ رحمت کا تذکرہ تھا۔ اب وہ "چشمہ رحمت کالج" ہے اور وہاں کے صدر مدرس "پرنسپل" صاحب ہیں۔ فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ کے سب سے بڑے استاد کو "صدر مدرس" ذرا کہہ کر تو دیکھیے، فوراً آپ کی غلطی کی تصحیح کی جائے گی کہ ان کا عہدہ اب صدر مدرسی کا نہیں پرنسپل کا ہے۔

کوئی آپ سے کہے کہ آپ گلی میں کھڑے ہو کے "گلی ڈنڈا" کا تماشہ دیکھ رہے ہیں تو آپ شرما جائیں گے، لیکن جب آپ کرکٹ یا فٹ بال یا ہاکی کا میچ کھلے میدان میں کھڑے دیکھ رہے ہوں گے، تو اس وقت نہ آپ اپنے بڑوں سے شرمائیں گے نہ چھوٹوں سے! مینڈھے لڑاتے ہوئے یا بٹیر بازی یا مرغ بازی کرتے ہوئے اگر آپ کہیں پکڑ لیے گئے تو آپ اپنے کو کسی کے سامنے اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھیں گے۔ لیکن جب آپ کے شہر میں باکسنگ (مکّے بازی) کا مقابلہ ہوگا یا ہیوی ویٹ چیمپین آجائیں گے تو ان کے کمالات کا تماشا دیکھنا روشن خیالی میں داخل! کہیں چوری چھپے رہس یا نوٹنکی دیکھنے کھڑے ہو جائیے تو خود آپ کی ثقاہت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے لگے، لیکن تھیٹر میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجیے کہ ڈرامہ جیسے فنِ شریف کی شرافت وعظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟

اپنے دیس کے کسی بھانڈ، کسی سازندہ، کسی ڈھاڑی سے اگر آپ کی شناسائی ہوگئی ہے تو اس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف اپنے ہم عمروں کے سامنے بھی کچھ جھینپ کر ہی کرتے ہیں۔ لیکن چارلی چپلن اور میری پکفرڈ کے کمالات فن اور آرٹ کی جتنی داد جی چاہے دیجیے۔ بھری محفلوں میں، بزرگوں اور استادوں کے مجمع میں اور اخبارات کے صفحات میں آپ کی نقادی ہی کی داد ملتی چلی جائے گی!

نٹوں کا پیشہ بھی بھلا کوئی عزت کا پیشہ ہے۔ اور خدانخواستہ آپ سے کسی نٹ یا نٹنی سے ملاقات کیوں ہونے لگی۔ لیکن وہی قلابازیاں کھانے والے جب سرکس والے اور سرکس والیاں بن کر آپ کے سامنے آتے ہیں تو نہ آپ ان سے ملنے میں شرماتے ہیں نہ اُن سے تعلقات بڑھانے میں!

جوئے یا جواریوں سے، ظاہر ہے ہماری شرافت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ کوئی ہمیں جواری کہہ دیکھے، اپنی جان اور اس کی جان ایک کر دیں لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیوال کی راتوں میں دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں یہی ذلت ہمارے لیے عین عزت بن جاتی ہے۔ اور بڑے بڑے شریف و معزز نہ جوئے کی بازی لگاتے شرماتے ہیں اور نہ اپنے کو ریس باز کہلاتے! نخاس میں کسی کباڑیے کی دکان پر مول تول کرنا ہماری عزت و شرافت کے لیے باعث ننگ لیکن مال روڈ پر پیک ایلن کی کوٹھی پر گشت لگانے میں نہ کوئی عار ہے نہ شرم۔ اس لیے کہ پیک ایلن صاحب کوئی کباڑیے تھوڑے ہی ہیں، آکشنر اور نیلامیے ہیں!

چوک اور امین آباد میں کسی حلوائی کی دکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خرید لیے تو جاننے والوں کی نظریں بچا بچا کر، لیکن حضرت گنج میں ڈیلیرلو کی دکان کے سامنے اپنا موٹر بلا تکلف روکیے اور کیک پیسٹری کی خریداری بہ نفسِ نفیس بے جھجک فرمائیے اس لیے کہ ڈیلیرلو حلوائی کنفکشنر ہے!”

نظیر آباد کے چوراہے پر کسی شربت والے کی دکان سے فالودہ کا گلاس خریدنا آپ کی خودداری کے منافی، لیکن حضرت گنج میں صاحب کی جگمگاتی ہوئی دکان پر بیٹھ کر آئس کریم نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق! کسی ”نانبائی“ کی دکان کا نام اگر ”ریسٹوران“ پڑ جائے تو وہی عار، فخر میں تبدیل ہو جائے!“ نائی بے چارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام، اس کے استرے اور کسوت کے آگے سر جھکانا آپ کیونکر گوارا فرما سکتے ہیں۔ لیکن وہی نائی جب تک اپنے کو (HAIR DRESSER) کہلانے لگے، اور اپنی چوراہے کی دکان پر ”ہیر کٹنگ سیلون“ کا سائن بورڈ لگا دے تو وہی ناگوار آپ کے لیے بہ طیب خاطر گوارا و پسندیدہ بن جائے۔

عدالت کا پیادہ جب تک چپراسی یا ”مذکوری“ ہے حقیر و ذلیل ہے، لیکن وہی پیادہ اگر ”بیلف“ کہہ کر پکارا جاتا ہے تو معزز ہے اور آپ کی زبان پر محض بیلف نہیں بلکہ ”بیلف صاحب“ ہے! کوئی چمار یا موچی اس قابل کب ہوتا ہے کہ آپ اسے منہ لگائیں۔ لیکن وہی رذیل اگر کسی (TANNERY) کا مالک کہلانے لگے تو معاً اس کی رذالت آپ کی نگاہ میں عزت و شرافت میں بدل جاتی ہے اور دنیا کے سب سے بڑے موچی باٹا (BATA) کی قوم سے تعلق رکھنا تو عین دلیل اعزاز! نسبتی کا ساہوکار یا مہاجن بڑے سے بڑا ہو آپ کی نظر میں محض ”بنیا“ ہے۔ لیکن وہی بنیا اگر کسی بینک کا منیجر ہو جائے یا اپنے کو بینکر کہلانے لگے تو دیکھیے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ کسی رئیس کا ”مصاحب“ آپ کی نظر میں اخلاقی حیثیت بے عملی، خوشامد، چاپلوسی اور خود فروشی کا مجسمہ ہے۔ لیکن صاحب کے ”پرائیویٹ سیکرٹری“ اور ”اے ڈی سی“ کا نام ادھر آیا اور ادھر معاً آپ کی نظروں میں وسعت و متعدی

رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی! پنچایت کا نام آیا اور آپ کے ذہن نے قصائیوں اور کنجڑوں، نائیوں اور دھوبیوں اور دوسری نیچ قوموں کا تصور شروع کر دیا لیکن ادھر پنچایت کے بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور میونسپل بورڈ کے الفاظ بولے گئے اور آپ کا ذہن ان فرنگی پنچائتوں کی بلندی پر رشک کرنے لگا۔

کوئی مولوی غریب اگر عالمگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظ ہے تو غبی ہے، کودن ہے، کندہ ناتراش ہے، محض ملاّ ہے لیکن اگر کسی ایڈووکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ یا پریوی کونسل کے نظائر ازبر ہیں، تو ان کی قابلیت، خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں۔ فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام، آج محال ہے کہ کوئی زبان پر لا سکے۔ لیکن لنڈن اور برلن، پیرس اور نیویارک سے کتنے ہی نئے نئے عجائب افسانے اور کتنے ہی ہوشربا طلسمات، ناولوں کے نام سے سراغرسانی کے افسانوں کے نام سے سنسنی خیز خبروں کے نام سے دہشت انگیز افتتاحوں کے نام سے صاعقہ اثر ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن ناموں سے ہر سال اور ہر ماہ، ہر ہفتہ اور ہر روز، ہر صبح اور ہر شام شائع کریں۔ ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی و انہماک کے ساتھ ان کے نشر و اشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا روشن خیالی کی دلیل اور تہذیب و تعلیم یافتہ کی سند! کوئی آپ کو صلاح دے کہ "لوہاری" کا پیشہ اختیار کیجیے تو آپ اُسے گالی سمجھیں لیکن میکنیکل انجینئری کے عہدہ کی طرف آپ خود لپک لپک کر بڑھ رہے ہیں۔ "جرّاح" کے لفظ سے جو تخیّل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ کس درجہ پست ہے، لیکن سرجن کے نام لینے سے اس پستی میں کتنی بلندی آجاتی ہے۔ محلّہ اور پڑوس کے "جلاہے" آپ کے خیال میں پست و ادنیٰ، لیکن کپڑا بننے والے اگر لنکاشائر کے ہیں تو کیا ان کی بابت بھی آپ کا یہی خیال ہے؟ بزاز گز ہاتھ میں لیے اور مزدور کے سر پہ گٹھڑی اٹھائے شہر میں پھیری کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی کوئی عزت و وقعت یقیناً نگاہ میں نہیں۔ لیکن وہی کپڑا بیچنے والے اگر مانچسٹر کے باشندے ہیں تو بس معززین بلند ہیں۔ بزرگوں کے سالانہ فاتحے منانا دلیل حمق و علامت وہم پرستی، لیکن فلاں ادارہ کے احاطہ میں "فاؤنڈرس ڈے" یا "یوم تاسیس" دھوم دھام سے منانا، دلیل دانش و برہان روشن خیالی۔

لکھنؤ کے چوک یا دہلی کی چاوڑی کی کسی پیشہ ور کا نام آپ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ اپنے کسی بزرگ کے سامنے نہ لیں گے، نہ کسی کا ناچ مجرا دیکھنے کھلم کھلا تشریف لے جائیں گے۔ کسی ڈرائنگ روم میں گھر کے سب مردوں اور عورتوں کے سامنے ریڈیو ہے، بے تکلف آپ فلاں بائی جی اور فلاں بیگم صاحبہ کے نغموں سے لطف اٹھائیں گے۔ اور فلم ایکٹرس جو بھی آپ کے دل میں جگہ لے گی، پوری بیباکی سے آپ اس کے چرچے ہر چھوٹے بڑے کے سامنے کریں گے۔

کوئی کہاں تک گنائے اور ناموں اور لفظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے۔ نمونہ کے لیے یہ بھی کافی ہی نہیں کافی سے زائد ہیں۔ اپنی واقفیت کی دنیا میں خود نظر دوڑائیے اور دیکھ لیجیے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، معاشرت و معاملت کے ہر گوشہ میں فرنگیت کا کتنا دماغی رعب ہم پر اور آپ پر چھایا ہے۔ حقیقت ایک ہوتی ہے۔ معنی و مفہوم متحد ہوتے ہیں۔ لیکن جو لفظ اور جو نام فرنگیت کے راستے سے "صاحب" کے رشتہ سے آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں ان میں ان کے دیسی مترادفات سے زیادہ کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ اہمیت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کر لی ہے! اگلوں نے بہت کیا تو یہی کیا تھا کہ ملک فتح کر لیے قلعے سر کر ڈالے، فوجوں کو میدان جنگ میں شکست دے دی۔ اس سے زیادہ نہ چنگیز سے کچھ بن پڑا۔ نہ ہلاکو سے، نہ دارا سے نہ سکندر

سے ایہ شرف مخصوص صرف اسی دور یا جوجی کے لیے اٹھا رہا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ فتح کر لیے جاتے ہیں اور ہاتھوں، پیروں کے علاوہ عقلوں، دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خطِ غلامی لکھا لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غریب محکوموں کے پاس، خیر و شر، حسن و قبح ہنر و عیب کا معیار لے دے کے بس یہی ایک رہ جاتا ہے کہ "صاحب" کی چشمِ التفات کدھر ہے۔ عزت بھی "صاحب" کی دی ہوئی اور دولت بھی سرکار کی مرحمت کی ہوئی۔ دین بھی وہیں کا عطیہ اور دنیا بھی وہیں کی بخشش۔ اب نہ ہندو، ہندو ہے نہ مسلمان مسلمان "سب رعائے سرکار"! اب مسلمان نہ زیدؔ ہے نہ عمرؔ، نہ بکرؔ اور ہندو نہ رام ہے نہ کرشن، نہ گوبند۔ بلکہ سب کے سب چھٹ چھٹا کر "صاحب دین"۔

اسماءِ نکرہ اور الفاظِ عمومی کو بھی چھوڑ دیئے۔ قیامت یہ ہے کہ اعلام اسماءِ معرفہ تک یورپ زدگی کی وباء سے محفوظ نہیں۔ "میاں کلو" کو آپ نے اپنے ہاں جب دیکھا اکہ بانی ہی کرتے پایا لیکن بلیک (BLACK) آپ کے شہر کے سول سرجن ہیں۔ "کلوا مہتر" آپ کے محلے ہی میں رہتا ہے لیکن پروفیسر "بلیکی" (BLACKIE) یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر ہیں! "لالہ گھاسی رام" "بے چارے" کانجی ہاؤس کی محرری سے عمر بھر آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن بریگیڈیر جنرل "ہے" (HAY) برطانوی فوج کے ایک مشہور و معروف افسر ہیں! "میاں" رمضانی اور میاں شبراتی کی ساری عمر خدمت گاری میں گزری۔ لیکن مسٹر مے (MAY) اور ڈاکٹر فرائیڈے (FRIDAY) پارلیمنٹ کے نامور ممبر ہیں! "مٹھو" کہار "طوطا" گلو کار اپنی ہی بستی ہی میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ لیکن سر جان "پارٹرج" (PARTRIDGE) آپ کے صوبے کے گورنر تھے۔ مسٹر کاک (COCK) اس وقت تک آپ کے ضلع کے کلکٹر ہیں اور سوان (SWAN) صاحب ابھی تبدیل ہو کر کمشنری پر گئے ہیں! آپ کی ماما کا لڑکا شیرا بے چارہ اب تک چپراسی کی جگہ کی امیدواری کر رہا ہے لیکن "بل" صاحب (BULL) ترقی پا کر کمشنر ہو گئے۔ مسٹر لمب (LAMB) اور مسٹر کڈ (KID) آپ ہی کے ضلع میں حاکم بندوبست اور جائنٹ مجسٹریٹ ہیں۔ "دریاؤ سنگھ" غریب کو لائن جمعداری سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا۔ سر جان لیک (LAKE) دیکھتے دیکھتے ہی آئی آر کے ایجنٹ ہو گئے۔ "لالہ" کوباری مل" کے چلائے عرائض نویسی کا کام بھی نہ چلا۔ جسٹس اسمتھ (SMITH) ہائی کورٹ کی ججی پر پہنچ گئے۔ "شیخ جھاؤ" کی زندگی نوربافی کرتے کرتے ختم ہو گئی۔" سر چارلس ووڈ (WOOD) حکومت ہند کے ہوم ممبر ہیں۔" جنگلی گھسیارہ بے چارہ عمر گھاس ہی چھیلا کیا۔ سر جان فارسٹر (FARESTER) سنا ہے کہ امریکہ میں برطانیہ کے کونسل جنرل ہو گئے۔

خدا حافظ

قاضی عبدالغفار

۱۹ تاریخ کی صبح کو ہمارا چھوٹا سا قافلہ سمندر کے ساحل پر احباب و اعزہ سے رخصت ہو رہا تھا۔ بمبئی کے اور باہر کے بہت سے احباب جمع تھے اور وہ تماشہ بھی ہو رہا تھا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ اگر ان پھولوں کو یکجا وزن کر سکوں جو میں نے اپنی عمر میں دیکھے یا استعمال کیے ہیں۔ تب بھی ان کا مجموعی وزن ان ہاروں اور گلدستوں سے یقیناً کم ہوگا جو ۱۹ کی صبح کو میرے جسم پر لاد دیے گئے تھے گلے میں ہار ڈالے جا رہے تھے اتنے کہ بلا مبالغہ دم گھٹ رہا تھا۔ ہاتھوں میں گلدستے دیئے جا رہے تھے اتنے کہ سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ مجھ پر سادہ لوح مسلمانوں کی عقیدت و محبت برس رہی تھی، اور خدا جانتا ہے کہ عقلِ سلیم مجھے ملامت کر رہی تھی۔ نفس ایک پختہ کار ڈاکو کی طرح جو کسی بڑے مہاجن کی دولت لوٹ کر خوش ہو رہا ہو۔ چاہتا تھا کہ میں اس کے تمام تر احساسِ حیوانی میں غرق ہو جاؤں۔ مجھ سے داد چاہتا تھا کہ ذرا دیکھنا بمبئی کے یہ لکھ پتی اور کروڑ پتی تجھے کس طرح جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں! دیکھ تو وہ تیرے ہاتھوں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ وہ تیری توصیف میں رطب اللسان ہیں تو ان کی نظر میں ایک ارفع و اعلیٰ انسان ہے۔ اے بے وقوف۔ آ۔ میرے ساتھ چلا چل۔ تیرے لیے دنیا میں اس سے بڑی نعمت کیا ہے کہ تجھ سے بہتر انسان بھی تیری تعریف کریں...... اس طرح ان سادہ لوح مسلمانوں کے منوں پھول ضائع ہو رہے تھے...... وہ ہار جو شب کی بے خودی میں مسل کر رہ گئے ہوں، وہ پھول جو اوّل شام کی بدمستیوں میں کچل گئے ہوں، وہ لڑیاں جو محبت سے گوندھی گئی ہوں اور بے پروائی سے توڑ ڈالی گئی ہوں۔ ان سب میں شراب کا سا نشہ ہوتا ہے، بدمستی ہوتی ہے، بے خودی ہوتی ہے، کیفِ گناہ ہوتا ہے مگر دھوکہ اور فریب نہیں ہوتا۔ آج جو پھول گلے میں پہنائے جا رہے تھے۔ ان میں حفظ نفس ہی نہیں فریب بھی تھا۔ پہننے والے کی خود فریبی اور پہنانے والے کی توہین بھی تھی۔ پجاری جب مندر میں اپنی مورتیوں پر پھول چڑھاتا ہے تو وہ پھول اس کے انکسار عبودیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ معبودیت کے طمطراق سے اس کا نفس محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن اب کہ قومی زندگی کے چشموں کا پانی گندہ ہو گیا ہے۔ موجودہ ہنگامہ میں ظاہر پرستوں نے جوشِ ملّی کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ بہت سے پھول ہوں، بہت سے ہار ہوں، اونچی آوازیں ہوں، تکبیر کے نعرے ہوں، جلوس کے ہنگامے ہوں اور تقریروں کے دریا بہیں گویا کہ قومی جدّوجہد جہاد کا فرض ادا ہو گیا۔

قومیت کا صحیح تخیل قوموں کی زندگی کا سرمایہ ہے، وہی انسان کے تمدن کو روم و یونان و نینوا و اٹلی کے عہدِ مکر و فریب اور دور کیوں جائیں، خود ہندوستان میں حکومتِ مغلیہ کے عہدِ آخر کی تاریکیوں اور گہرائیوں میں گراتا ہے۔ آج ہندوستان کی قومیت کا تخیل قرآن کی الوہیت اور وید کی روحانیت کی ایک بوسیدہ تصویر ہے، وہ اس قدر پست ہے کہ اب کسی ذرا سے قومی کام کے لیے انگلستان کا سفر بھی سزاوار

صد تحسین و آفریں قرار پاتا ہے۔ گویا کہ جہاد کا بہترین عمل یہی ہے جس کا کوئی ہندوستانی اقدام کر سکتا ہے۔ وہ پھول، وہ ہار، وہ تصیدے، ستائش گردں کا وہ اجتماع، محبت و عقیدت کی وہ نمائش، سب کچھ مل گیا۔ صرف اس لیے کہ کسی شخص نے تین ہفتہ انگلستان میں رہ کر دو چار ملاقاتیں کر لیں۔ دس بیس تحریریں لکھ دیں اور چند تقریروں میں اسلامی مسائل کے گھوڑے دوڑا دیے۔ جب تخیل کی پستی کا یہ عالم ہو اور نظر اس قدر محدود ہو کہ پی اینڈ او کمپنی کے پانی پر تیرنے والے عشرت محل میں چند روز سفر کرنا اور چند روز انگلستان و پیرس کی تہذیب و تمدن کی مینا کاریوں سے متمتع ہونا بھی ایک مجاہدہ قرار پائے تو جان لیجئے کہ اس قوم کا مرض پرانا ہے۔ اور اب علاج محض گرمیٔ سخن سے نہ ہوگا۔ کچھ آج نہیں، میرے دل میں یہ خیال اکثر آتا ہے کہ آخر یہ تماشے کب ختم ہوں گے۔ تماشہ گاہ میں ہر شب کو تاج الملوک بکاؤلی کے سرہانے پہنچ جاتا ہے، لیکن صبح کو جب تماشہ ختم ہوا تو اس تاج الملوک نے بھی رات کے روغن کو گرم پانی سے دھو ڈالا اور بکاؤلی کی نرگس شہلا کا سرمہ بھی بہ گیا۔ اس بدنصیب برِاعظم کے تماشہ گاہ میں شب و روز یہ تماشے ہو رہے ہیں۔ یہ لمبی تانیں بلند آوازیں، بہت سے خوبصورت ہار اور گلدستے، پھولوں سے لدی ہوئی گاڑیاں اور جلوس قوم کی بیداری کی روشن دلیلیں یہی ہیں! خدمت و مخدومیت کا تخیل وہ تاج الملوک ہے جس نے بکاؤلی کو محض خواب میں دیکھ لیا ہو اور ایک کاغذ کا پھول بنا کر دکھاتا پھرتا ہے کہ یہی میرا گل مراد ہے!

پندرہ دن کے اس بحری سفر کی نوعیت یوں تو وہی تھی جو ہر ایسے سفر کی ہوا کرتی ہے۔ صبح سے شام تک بکروں کا چلتا رہنا معدہ کا ہندوستانی ریلوں کے تھرڈ کلاس کی طرح لادا جانا، سمندر کی صحت بخش ہوا میں اشتہا کی شدت، راستہ میں ملنے والے جہازوں کا نظارہ کہیں کوئی جزیرہ نظر آ جائے تو اس کا تماشہ، سمندر میں کم یا زیادہ طلاطم ہو تو اپنے کمروں میں پڑا رہنا اور زندگی کا ایک گونہ بے لطف ہو جانا موسم اچھا ہو تو جہاز کے عرشے پر تفریح و ورزش، دو چار ہمسفروں کے ساتھ چہل قدمی اور گپ، جہاز کے مختصر کتب خانہ کی کتابوں کا مطالعہ۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نئی نہیں کہ تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے یا پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کرے۔ جب کسی کا پہلا بحری سفر شروع ہوتا ہے تو ہمیشہ بڑے بڑے ارادے جہاز پر ساتھ جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ تو یہ خیال ہوتا ہے کہ سفرنامہ اور روزنامچہ تو ضرور لکھا جائے گا۔ وہ ایک بڑی مفصل اور دلچسپ کتاب ہوگی جو ہندوستان واپس آ کر شائع کی جائے گی۔ اور اگر دل میں زیادہ ارمان ہیں تو اس ذریعہ سے اپنی شخصیت کا اچھا خاصہ اشتہار بھی دیا جا سکے گا۔ اور اگر مفلس ہیں تو کتاب کو فروخت کر کے خالی جیب پر بھی کچھ احسان کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ارادے تو سب کچھ ہوتے ہیں اور جہاز پر پہنچ کر پہلا خیال میرا بھی یہی تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں۔ مگر اس کی تکمیل صرف اتنی ہی ہوئی کہ کبھی کبھی ایک دو صفحے لکھے اور ان کو واپسی کے وقت تک نہ دیکھا! اب ان صفحات کو لکھنے بیٹھا تو وہ پرزے بھی یاد آتے۔ جہاز کی زندگی دلچسپیوں سے خالی نہ تھی۔ لیکن ان دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے کالا آدمی کافی اہلیت نہیں رکھتا۔ پانی پر تیرنے والا عشرت محل جس کو عہدِ جدید کی اصطلاح میں "جہاز" اور "کشتی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ "سردِ خانۂ ہمسایہ" اور "حسن رہ گزر سے" کے تمام روح پرور کرشموں سے بھرا ہوتا ہے۔

غالب مغفور نے اس "جنتِ نگاہ" اور "فردوس گوش" کو دیکھا ہوتا تو ان کی "چو گوشہ" سطح سمندر کی لہروں پر رقصاں نظر آتی ہیں۔ میں جب صبح سے شام تک جہاز کے ہر گوشے میں وہ خود آرائیاں دیکھتا تھا تو نظر چرا کر گردن جھکا لیتا تھا۔ گویا کہ خطاوار میں ہوں۔

ایک دوست تو اپنے عہدِ جاہلیت کو یاد کر کے ٹھنڈے سانس کے ساتھ یوں بھی فرماتے تھے کہ

عید ہوئی ذوق و لے شام کو

اگر نفسیات کا کوئی مبصر ان جہازوں پہ سفر کرے اور بشرطیکہ مقناطیسیت سے متاثر ہونے والے تمام جذبات کو بمبئی کے ساحل پر چھوڑ آئے تو وہ اس "بار بردار فریبِ حسن" میں اپنی بصیرت کے لیے ایک وسیع میدان پائے گا۔ اس ہاتھی کی طرح جس پر ریشم کے ہزاروں تھان اور جواہرات کی سینکڑوں بوریاں لدی ہوئی ہیں۔ ہمارا جہاز ہزار ہا میل کا سفر طے کرتا ہے اور بمبئی سے لے کر عدن و سویز و پورٹ سعید و ساحل فرانس و انگلستان تک یہ گراں مایہ امانت پہنچا دیتا ہے۔ کرشموں اور تجلیوں کا وقت ہمیشہ سے وہی ہے جب سورج کی روشنی باقی نہ رہے۔ یوں تو جہاز مغرب کے بعد بھی بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا دیا جاتا ہے مگر پھر بھی عرشہ کے بہت سے کونے تاریک رہتے ہیں جب بجلی کی روشنی میں باریک ریشم کے اندر سفید جسم جھلک چکیں اور کھلے ہوئے سینوں پر جواہرات اپنی دمک دکھا چکیں تو پھر تاریک گوشوں کا سکون کس قدر عزیز ہوتا ہے۔ شب کے دسترخوان پر جہاز کی ساری پونجی سفید کھال، باریک کپڑے، خوبصورت بال، درخشاں جواہرات ان سب کی ڈھیریاں لگی رہتی ہیں۔ ہر کرسی پہ ایک چھوٹی سی دکان ہوتی ہے اور اس دکان پر ہر قسم کی جنس بھی ہوتی ہے۔ ایک نیک بخت کو روز دیکھتا تھا کہ وہ ہر وقت اپنے کھلے ہوئے سینے کو نہایت باریک جالی کے بالشت بھر ٹکڑے سے چھپانے کی کوشش فرماتی تھیں۔ مگر وہ جالی کا ٹکڑا ہر دفعہ ان کے شانوں سے پھسل کر نیچے گرنے پر اصرار کرتا تھا۔ پس برابر بیٹھنے والے مرد کا اخلاقی فرض ہوتا تھا کہ وہ اس ٹکڑے کو اٹھا لے اور ان کے سڈول شانوں پر ڈال دے۔ ایک دوسری بیگم صاحبہ میرے سامنے ہی ایک میز پر تشریف رکھا کرتی تھیں۔ ان کی نازک پاپوش کا تکمہ بار بار کھل جانے کا عادی مجرم تھا۔ مگر جب وہ کھلتا تھا تو ہمراہیوں کا اضطراب قابلِ دید ہوتا تھا۔ ہر شخص دوڑتا تھا کہ پہلے یہ تکمہ میں لگا دوں۔

ایک مجوزۂ سمندری کے پاؤں میں موچ آ گئی۔ حادثہ اوپر کے عرشہ میں پیش آیا تھا۔ کوئی صورت نہ تھی کہ ان کو اس ہال کمرے تک پہنچایا جاتا۔ آخر چند مجاہدوں میں سے ایک نے جرأتِ مردانہ کا اقدام کیا اور گود میں اٹھا کر اس بارِ عزیز کو نیچے پہنچا دیا۔

اس جلوہ گاہ میں چند پارسی اور یہودی خواتین بھی تھیں جن کو اپنی یوریین بہنوں سے ایک قدم بھی پیچھے رہنا گوارا نہ تھا۔ دن بھر اور رات کو بھی گیارہ بارہ بجے تک ان خواتین کا پُرشور ہجوم عرشے پہ رہا کرتا تھا۔ شاید دنیا میں بمبئی کے پارسی بھائیوں سے زیادہ کسی قوم کو اس قدر چیخ چیخ کر بات کرنے والی خواتین نصیب نہیں۔ چیخنا صرف آواز ہی کا فعل نہیں ہے۔ کبھی کبھی بعض بہنوں کی وضع قطع گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی ہے۔ ان کا لباس چیختا ہے، ان کی نگاہیں چیختی ہیں، ان کے موزوں کی باریکی اور جوتوں کی نزاکت چیختی ہے۔ ان کی ساریوں کا رنگ چیختا ہے۔ جنسِ لطیف کا یہ غوغا بازاروں کے عامیانہ چیخ و پکار سے اکثر سننے والے اور دیکھنے والے کے لیے بہت زیادہ دل دوز اور دردناک ہوتا ہے۔ میرا تخیل یہ ہے کہ عورت چیخ نہیں سکتی۔ شعر چیخ نہیں سکتا، بول سکتا ہے، تصویر چیختی نہیں مسکراتی ہے یا بسورتی ہے اور اگر اس کا رنگ روغن چیخنے لگے تو پھر وہ نظر فریب نہیں۔ بعض اوقات ان پارسی بہنوں کا ادعائے شانِ نسوانیت میری نظر میں ان کو اس شعریت سے بہت دور پھینک دیتا تھا، جو عورت کا صحیح مفہوم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ نسوانیت اس قدر بلند آہنگ ہو سکتی ہے یا عورت اس طرح اپنے ڈھول اور نقارے بجا سکتی ہے۔ یورپ میں اس قسم کی خودنمائی سے نظر خوب آشنا ہوئی۔ وہ خودنمائی بے عیب اور بے لوث نہ تھی۔ تاہم اس میں یہ شعریت کو یکسر فنا کر دینے والا خروش بھی نہ تھا۔

اسی جہاز میں ایک ہندوستانی رانی صاحبہ اور ان کی نوجوان لڑکی بھی انگلستان جا رہی تھیں۔ اس ہنگامہ میں صبح سے شام تک وہ دونوں اپنی کرسیوں پر سب سے الگ بیٹھی رہتی تھیں۔ میں گو کہ اپنے وجود کو جہاز کی اس دنیا سے دور پاتا تھا۔ تاہم دن میں ہر دفعہ جب رانی صاحبہ پہ نظر پڑتی تھی تو تخیل کا

ایک عجیب ہیولیٰ پیشِ نظر ہوتا تھا۔ ایک طرف یورپین تمدن و معاشرت کے تمام مصنوعات اور نقاشیوں کو دیکھتا تھا، مہکتی ہوئی، ناظرین میری اس اصطلاح سے درگزر فرمائیں۔ نسوانیت سے اکتایا اور بعض اوقات جھنجھلایا کرتا تھا اور دوسری طرف ہندوستان کی ایک عورت اور لڑکی پر نظر جاتی تھی جو اس فریب نظر میں گھری ہوئی تھیں تاہم اس سے دور تھیں۔ بے پردہ تھیں مگر پردہ میں تھیں، بے نقاب تھیں مگر نقاب میں تھیں۔ حیا کا مفہوم اگر کچھ ہے تو اب بھی ہندوستانی عورت کے وجود روحانی میں موجود ہے۔ ازراہ تعصب نہیں کہتا۔ یورپ کے بہت سے اوصاف کا معترف ہوں مگر یہ جوہر تہذیب و تمدن ان بازاروں میں بہت کمیاب ہے۔ جب اس ہنگامہ میں رانی کو دیکھتا تھا تو اپنے دماغ میں پاکیزہ نسوانیت کی ایک عجیب تصویر پاتا تھا جس کی ایک جھلک بھی یورپ کے بصریں نفسیات نہیں دیکھتے، وہ محض فریب نظر کے مجنوں ہیں۔ ایک شب عرشہ پر ناچ ہو رہا تھا۔ رانی صاحبہ بھی ایک گوشہ میں اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی محفل کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ میں ایک طرف کھڑا سوچتا تھا کہ یورپین نسوانیت کی یہ تصویریں جن پر دنیا بھر کے فنون لطیفہ صرف ہوتے ہیں، انسان کے محسوسات عالیہ سے کیوں دور رہتی ہیں؟ یورپ کی عورت شب کے لباس میں جو اس کے لیے زیب و زینت کا منتہیٰ ہے۔ گردن سینے کے انتہائی حدود تک کھلی ہوئی، بازو بغلوں سے اوپر تک برہنہ، مرد کے اعلیٰ تخیل کو مس کرنے کی بجائے درحقیقت اس کی مادیت کو متحرک کرتی ہے اور ایک دنیا ہے کہ اس سحرکاری پر مٹی ہوئی، برخلاف اس کے ہندوستان کی عورت تعلیم و تمدن اور معاشرت میں چاہے اپنی یورپین بہن سے دو قدم آگے بڑھ جائے وہ اپنے لباس میں آداب حجاب و حیا کی پوری پابندی نہ کرتی ہو، لیکن آنکھ میں غرور نسوانیت، وہ تمکین حیا پھر بھی محفوظ رکھتی ہے جس کا وجود یورپ میں عام طور پر نظر نہیں آتا۔ تعصب نسل و مذہب سے قطع نظر میں نے تو یورپین اور ایشیا کی عورت کی تصویروں کو جب دیکھا قلب نے گواہی دی کہ آنکھ اگر روح کا آئینہ ہے تو اس ذریعہ سے کالی عورت کی اعلیٰ روحانیت صاف نظر آسکتی ہے۔ ایک موٹی میم صاحبہ کو (غالباً فرانسیسی تھیں) ہر روز دیکھتا تھا کہ وہ دن میں دو دفعہ لباس تبدیل فرما کر تشریف لاتی تھیں۔ ہر شام کو ان کے لباس میں جدت طرازیوں کا گوناگوں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ بیچاری وزن میں شوکت علی صاحب سے کم نہ ہوں گی جسم نازک پر لباس فاخرہ کا تانا اپنے میں تاب مقاومت نہ پاکر اور اس کشمکش سے تنگ آکر جو جسم کی ہر حرکت سے اس کے اندر پیدا ہوتی تھی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چیختا تھا۔ صحت جسمانی ماشاءاللہ ایسی تھی کہ ہم سے دائم المریض رشک کریں۔ اس دبیز جسم نے نسوانیت کی لطافت و نزاکت کو بالکل دبا لیا تھا تاہم وہ جب شب کے نہایت باریک کپڑے پہن کر نکلتی تھیں تو ازراہِ غایت انکسار اپنے کو پری سے کم نہ سمجھتی تھیں۔ قدم اٹھاتی تھیں تو نظر ہر طرف دوڑتی ہوتی تھی کہ کسی نے دیکھا یا نہیں۔ ہولی کر لچک نہ سکتی تھی مگر پھر بھی لچکائی جاتی تھی۔ پنجوں پہ چلنے کی کوشش کی جاتی تھی، یہ بھی ایک ادا ہے لیکن جسم نازنین کا وزن لکڑی کے فرش کو تھرا دیتا تھا۔

یہ تو حال تھا لیکن نظر فریبیوں کے زخم نصیب یہاں بھی حاضر تھے ...... یہ کیا ہے؟ نسوانیت کا کیسا ادنیٰ تخیل ہے؟ غرور نسوانیت کی کیسی بھدی تصویر ہے؟ وہ غرورِ نسوانیت جس کا سارا سرمایہ جسم کی سفید کھال، خوشبودار پوڈر اور باریک ریشم ہو۔ یقین جانیے کہ اس نسوانیت کی روح گم ہو گئی ہے۔ یہ کاغذ کی جاپانی قندیلیں ہیں جن کے اندر موم کی بتی گل ہو چکی ہے اور خالی قندیلیں ہوا میں جھول رہی ہیں۔ لیکن کم نظر روشنی کے طالب نہیں، بلکہ قندیل کا کاغذ خوب صورت چاہتے ہیں۔

فریب حسن اور خود بینی کے ان نمونوں کا ذرا کالی رانی سے مقابلہ کیجیے جو دولت میں شاید تمام یورپین بہنوں سے زیادہ ہو گی۔ ثروت و جاہ دنیا کے لحاظ سے اس کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ تعلیم و تہذیب و تمدن و معاشرت میں وہ لندن و پیرس کے بہترین نمونوں کے دوش بدوش تھی۔ تاہم چشم حقیقت بیں گواہی دیتی ہے کہ وہ سب سے مختلف، الگ، دور اور بلند تھی۔ دن کا اکثر حصہ عرشہ پر گزرتا تھا۔ بارہا ان کالی ماں بیٹیوں پر نظر جاتی تھی اور قلب پکار اٹھتا تھا کہ اگر قوموں کی کامیاب زندگی کے لیے عورتوں کی فطرت عالی اور خصائص حسنہ کی شرط لازمی ہے تو پھر میری قوم کا مستقبل ان کالی عورتوں کے ہاتھ میں محفوظ ہے۔ وہ کچھ ہی ہو جائیں مگر ان کی فطرت آلودہ نہیں۔

چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ

نیاز فتح پوری

دنیا میں سانپ اور مولوی دو چیزیں ایسی ہیں جن کی قسموں کی انتہا نہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور مؤخر الذکر کا یہ حال ہے کہ ؎

ہر کرا جامۂ مولوی بینی
در دمش صد ہزار مار انگار

مسجد کے مُلّا سے لے کر محراب و منبر کے واعظ تک نمازِ جنازہ پڑھانے والے مولوی سے لے کر اس مولانا تک جو بیضاوی و بخاری کا درس دیتا ہے ایک چیز اِلّا ماشاء اللہ سب میں مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ان کے ظاہر و باطن کا تضاد ہے۔ یعنی جس مولوی کا ظاہر جتنا زیادہ خوشنما ہے اتنا ہی زیادہ اس کا باطن مکروہ ہے۔

ایک مولوی کی ''ہیئتِ وضعی'' جس میں اس کا بیتے تکا عمامہ، الجھی ہوئی زلف دگا ہے تا گوش وگا ہے تا بنا گوش، لانبی پریشان داڑھی، زمین دوز بہ دت سیاہ، داغدار پیشانی، شیروانی نما کرتہ، نیم ساقی پاجامہ اور غیر دباغت شدہ متعفن چمڑے کا جوتا مع تسبیح و جریب و رومال اور ''ناسدانی'' کے سب کچھ شامل ہے۔ ایک ایسی پیٹنٹ وضع ہے جس کو دیکھنے کے بعد گویا ہر شخص کا فطری فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس وضع والے کو مولوی سمجھے اور بحیثیت مولوی ہونے کے اس وضع کا اختیار کرنے والا تو گویا منجانب اللہ اس پر مامور ہی ہوا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں قورمہ اور پلاؤ مہیا ہو سکتا ہے وہاں اپنا سلسلہ ارشاد ہدایت دراز کر دے۔ اس میں بھلا کسی کو اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔

مولوی کی اوّلین قسم جو ارتقاء مولویت کی سب سے پہلی کڑی تھی اور جو مکتبوں کی بوریوں پر نظر آتی تھی۔ اب تقریباً مفقود ہو چکی ہے مگر ان کے کارنامے مولویت کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے ہمیشہ اہمیت رکھیں گے۔ ''موجودہ مولوی'' اسی ''گذشتہ مولوی'' کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اور وہ شخص جو ''نفسیاتِ مولویت'' سے بحث کرنا چاہے گا اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اس قوم کے ابتداء ظہور سے آغاز کرے۔ علمی و اصولی حیثیت سے آپ اس پر غور کرنے کی اہمیت کا اندازہ یوں کر سکتے ہیں۔

مثلاً میرے محلہ میں بہت زمانہ ہوا ایک مولوی کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر محلہ کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کی ایک مولویائن تھیں اور چند در چند بچے تھے جن کو اگر برابر کھڑا کر دیا جاتا تو اچھا خاصہ زینہ بن جاتا۔ رئیس کے یہاں ان کو صرف پانچ روپیہ ماہوار

اور کھانا ملتا تھا لیکن ان کی دیگر فتوحات کی صورتیں مختلف تھیں۔ عید، بقرعید، شبرات میں عیدیاں، بقرعیدیاں وغیرہ بپاس خاطر عزیز سلمہٗ، لکھ کر انعام وصول کرنا تو خیر ایک جائز معمول تھا ہی، لیکن اس کے علاوہ اور بھی مختلف ترکیبوں سے کام لیتے تھے اور اس باب میں وہ ایک مخترع و موجد کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً ان کے موٹے لانبے کرتے میں آگے پیچھے، نیچے اوپر تقریباً ایک درجن جیبیں تھیں۔ یہ جیبیں مختلف وسعت کی تھیں اور ان کا رنگ بھی مختلف تھا۔ کوئی سرخ تھی اور کوئی زرد، کوئی سفید تھی اور کوئی سبزی مائل۔ ہر لڑکے کو خفیہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب وہ گھر سے آئے تو کوئی نہ کوئی چیز لیتا آئے۔ پھر اگر کوئی مرچ لایا تو سرخ رنگ کی جیب میں ڈال دی۔ کسی نے ہلدی کی گرہ پیش کی تو زرد رنگ کی جیب میں رکھ لی۔ کوئی آٹا لایا تو سفید جیب کی نذر ہو گیا اور سبز ترکاریاں سبز جیب میں چلی گئیں۔ ایک جیب چمڑے کی بھی تھی جس کا راز ایک دن اتفاق سے یوں کھل گیا کہ ایک مسلمان تیلی کا لڑکا کچھ تیل کٹورے میں لایا۔ اور انہوں نے آنکھ بچا کر اسی جیب میں تیل کو انڈیل لیا۔ الغرض شام کو جب وہ گھر جاتے تو مولویائن اور ملّازادوں کے لیے بقال کی اچھی خاصی دکان بن کر جاتے تھے۔

ایک معمولی شخص کے لیے بظاہر یہ واقعہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن ایک ماہر نفسیات غور کرے گا کہ ایسے معلم کے شاگردوں میں کیا ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے اور وہ آگے چل کر کس قسم کے ''افراد قومی'' بننے کی اہلیت رکھ سکتے ہیں۔

بہر حال اللہ کی یہ مخلوق تو اب مفقود ہو گئی ہے لیکن اس کی اولاد یا تلامذہ کے سلسلہ میں جو مولوی پائے جاتے ہیں ان کی تین بڑی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو عربی مدارس میں لڑکوں کو پڑھاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو وعظ و تبلیغ کے ساتھ لوگوں کو مرید بھی کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد مسلمانوں کے قائد و رہنما بن گئے ہیں۔

اوّل الذکر قسم بظاہر گوشہ نشین اور بے ضرر قسم معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی خلوت نشینی حقیقتاً ایک مستقل ہنگامہ محفل ہوتی ہے جس میں یہ ایک مغ کی حیثیت رکھتا ہے اور طلبہ مغبچوں کی، رہی بے ضرری سو اس کا حال اس سے عیاں ہے کہ اگر درسگاہ اس قسم کی ہے جس کے طلبہ مسجدوں میں رہ کر محلہ داروں کی خیرات اور سوئم کی روٹیوں پر زندگی بسر کرتے ہیں تو اخلاقی تربیت اور علو حوصلگی معلوم، اور اگر کوئی قومی مدرسہ ہے جس میں دارالاقامہ کے اصول پر طلبہ کے رہنے کا انتظام ہے تو وہاں کا نصاب وہی فرسودہ و قدیم ہے جو انسان کو آگے بڑھانے کے بجائے پیچھے دھکیل دیتا ہے اور جس کی تکمیل کے بعد وہ سوائے اذان دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔

اوّل الذکر قسم کے مولویوں میں جو افراد زیادہ ذہین ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر دوسری قسم میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وعظ و تبلیغ شروع کر کے ''مشایخانہ'' حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ طبقہ زیادہ مالدار، زیادہ خوشحال، زیادہ کامیاب و رنگین ہے۔ ایسا مولوی سب سے پہلے بنگال و برما کے جاہل قریوں میں اپنی ''مشقِ سخن'' شروع کرتا ہے اور جاہل مسلمانوں کو جھوٹی روایتیں گھڑے ہوئے کاذب افسانے مذہب و بانیٔ مذہب کے متعلق سنا کر ''اوّل اوّل علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل'' کا وعظ کہتا ہے اور جب وہ اپنی حیثیت بلحاظ ایک عالم ہونے کے یکے از انبیاء بنی اسرائیل کی طرح قائم کر لیتا ہے تو جبراً و علانیہ ''مرشد ہادی'' بن کر اپنے ارادت مندوں اور مریدوں کے رجسٹر کھول دیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح کم از کم ۷۳۰ مرید اس کو حاصل ہو جائیں تاکہ اگر ایک روپیہ سالانہ بھی ہر ایک مرید سے وصول کیا جائے (جو نہایت معمولی بات ہے) تو دو روپیہ روز کا اوسط پڑ جائے۔ یہ طبقہ نہایت

"خوش خوری" "خوش پوشاک" ہوتا ہے۔ اگر یہ کسی ایسے قریہ میں پہنچ جاتا ہے جہاں تمام ضروری چیزیں اس کے "ذوقِ شکم" کو پورا کرنے والی مل سکتی ہیں تو پھر اس کے دسترخوان کا پروگرام یہ ہوتا ہے:۔

صبح کا ناشتہ:۔ نماز کے بعد ہی کشمیری چاء، سیر بھر دودھ اوٹا ہوا، پاؤ بھر مسکہ، ایک چھٹانک پسے ہوئے بادام، آدھ پاؤ قند، دو پراٹھے، تین اُبلے ہوئے انڈے، چار کباب۔

دوپہر کا کھانا:۔ مرغ کا قورمہ، مرغ پلاؤ، بریانی، پسندے، باقرخانی، مزعفر، بالائی۔

سہ پہر کا کھانا:۔ سادہ چائے اور تازہ پھل۔

شب کا کھانا:۔ وہی جو دوپہر کو، مگر شامی کباب اور بھُنی ہوئی مچھلی کے ساتھ۔

اگر مولانا کسی ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں یہ اشیاء فراہم نہیں ہو سکتیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ صرف دال ترکاری پر بسر کرنا ہوگی تو پھر کہہ دیتے ہیں کہ آج کل جلالی عمل کا چلّہ کھینچ رکھا ہے اس لیے سوائے دودھ بالائی کے کچھ نہیں کھا سکتا۔

مولانا کی پوشاک بھی ہمیشہ دورہ ہی کے زمانہ میں تیار ہوتی ہے۔ عماموں کی تو خیر کمی نہیں کیونکہ ہر نیا مرید جب کچھ زرِ نقد اور مٹھائی لاتا ہے تو وہ ایک نیا عمامہ بھی پیش کرتا ہے (جو بعد کو گھر پہنچ کر مولویانی کے دوپٹے اور ملّا زادوں کے کرتوں کے کام آتا ہے) لیکن یوں بھی قمیص، اچکن، تہمد اور ازاربند کے لیے طرح طرح کے موتی اور ریشمی کپڑے "تحفۃً" آتے رہتے ہیں۔ اور جو مولوی زیادہ ہوشیار ہیں وہ صرف اسی غرض سے جولاہوں اور کپڑے کی تجارت کرنے والوں کو مرید بناتے ہیں۔ مولانا کے وعظ و تلقین کا جہاں تک تعلق ہے یکسر خدا کی شانِ جلالی سے وابستہ ہوتی ہے۔ خدا ایسا قہار ہے ایسا جبّار ہے اس نے جہنم اتنا وسیع بنایا ہے۔ وہ یوں اژدہوں سے ڈسواتا ہے، اس طرح آگ میں جلاتا ہے مگر ہاں وہ جس کی شفاعت رسولؐ خدا کر دیں یا کوئی پیر، گویا خدا کا قہرمانی وجعہ اپنے وقت کا چنگیز یا ہلاکو ہے اور مولانا اس کے وزیر باتدبیر، ان کی ملفوظات کا بڑا حصّہ خود اپنے ہی کرامات و خوارق عادات سے متعلق ہوتا ہے کہ فلاں مقام پر اس طرح ایک مرتے ہوئے شخص کو اچھا کر دیا۔ امسال باراں میں یوں پانی برسا دیا۔ فلاں کے دل کا حال اس طرح بتا دیا۔ جنّات کے بادشاہ کو طلب کر کے فلاں کے سر سے آسیب کو یوں دور کرا دیا، وغیرہ وغیرہ۔

اگر مولانا کو ذوقِ موسیقی بھی ہے تو شب کے اوّل حصّہ میں قوالی اور اس کے ساتھ حال قال کی چند مذبوحانہ حرکات بھی دکھائی جاتی ہیں، ورنہ شام ہوتے ہی مولانا کا جائے قیام مردوں کے لیے "ممنوع الدخل" ہو جاتا ہے اور صرف عورتوں کی ہدایت کے لیے وقف سمجھا جاتا ہے۔ پیر صاحب نرم قالین پر نرم تکیوں کے سہارے دراز ہو جاتے ہیں۔ عورتیں ڈرتی ہوئی، سہمی ہوئی آتی ہیں اور مولانا کا وہ جسم جو مقوی اور قیمتی غذا سے خوب نرم اور پُر گوشت بنا ہوا ہے دابنے لگتی ہیں۔ مولانا تھوڑی دیر اس لذت سے سرشار ہونے کے بعد دوسرے کمرہ میں چلے جاتے ہیں اور وہاں علیٰحدہ علیٰحدہ ہر ایک کو تعلیم و تلقین خصوصی کے لیے طلب فرماتے ہیں۔ پھر چونکہ وہ مقام بلند ہے جو پیر صاحب کی اصطلاح میں "قاب قوسین او ادنیٰ" سے کم نہیں، اس لیے یہاں کے راز اوّل تو بہت کم ظاہر ہوتے ہیں اور جو کبھی ہو گئے تو فوراً "کل یوم ھو فی شان" "ان اللہ جمیل و یحب الجمال" کا وعظ شروع ہو جاتا ہے اور جاہل مرید خوشی کے ساتھ اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو آلۂ تفریح بنانے کے لیے راضی ہو جاتے ہیں۔

تیسری قسم مولوی کی وہ مولانا ہے جو ملک کے اونچے اور تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنی کارگاہ قائم کرتا ہے تاکہ ملک کا سیاسی قائد و رہنما تسلیم کیا جائے۔ جہاں تک اصلاحِ ملک و قوم کا تعلق ہے ان کا کارنامہ بالکل صفحۂ سادہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جس حد تک تخریب و فساد متعلق ہے اس طبقہ کا وجود اس درجہ خطرناک ہے کہ شاید ہم افعی کہہ کر اس کی اہمیت کو پوری طرح ظاہر کر سکیں۔

یہ مولانا کھدر پوش ہوتا ہے۔ دیسی چیزوں کا عاشق، ولایتی اشیاء سے متنفر، حریت و آزادی کا علمبردار، غلامی و استبداد کا عدو، ترقی کا حامی، تنزل کا دشمن اور "یتیموں کا والی غریبوں کا ملجا" سبھی کچھ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس کے کھدر پوش سینہ کے اندر اتنا موٹا اور مکروہ قسم کا نفس ہوتا ہے کہ شاید ہی غریب فرعون کو نصیب ہوا ہو۔ اس کے تمام مقالات حریت، اس کی تمام شعلہ بیانیاں اس کی جملہ سوراج پرستیاں صرف حُبِ جاہ سے متعلق ہوتی ہیں اور اس کا مقصود ان تمام نمائشوں سے سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ریل کے اونچے اونچے درجوں میں سفر کرے، روانگی کے وقت لوگوں کا ہجوم اس کو اشٹیشن تک پہنچانے جائے، جہاں پہنچے وہاں رسمِ مشایعت کے لیے ایک جماعت موجود ہو، گلے میں ہار ڈالے جائیں، اس کی موٹر کو نوجوانانِ ہند دھکیل کر لے جائیں۔ جلوس کے ساتھ جب وہ بازاروں کی طرف سے نکلے تو ایک غرور نما انکسار کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے جھک جھک کر لوگوں کا سلام قبول کرتا جائے اور جائے قیام پر ہر طرف زائرین کی آمد و شد سے میلہ سا لگا رہے۔

یہ اپنے آپ کو سیاسیات کا ماہر، "نظامِ عالم" کا آستن حنانہ" اور گردشِ ارضی کا محور سمجھتا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو نظمِ دنیا درہم و برہم ہو جائے، اور قومیت کا بیڑا غرق۔ اس قسم کا مولانا بہت کم خطرہ میں پڑتا ہے اور اگر کبھی پڑ جاتا ہے تو صرف تجارتی اصول کی بناء پر کہ آئندہ اس کے کاروبار کی رونق اس سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ یہ سوائے اپنے کسی کی رائے کو پسند نہیں کرتا۔ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں خدا نے صرف اسی کو ذی عقل و ہوش بنایا ہے اور خلیفۃ اللہ فی الارض اسی کی ذات سے عبارت ہے۔ وہ جلسوں میں ہمیشہ دیر کر کے پہنچتا ہے تاکہ جس وقت وہ پہنچے تو سارا مجمع جو اس کا منتظر ہے گردن اٹھا اٹھا کر اس کو دیکھنے لگے۔ وہ چوکڑیوں پر سوار ہو کر جاتا ہے، اونچی جگہ مسندوں اور زرکار کرسیوں پر اپنا دامنِ عبا دراز کرتا ہے۔ وہ دورانِ جلسہ میں سرگوشیاں کرتا ہے اور کاغذ کے پرزوں پر لکھ لکھ کر لوگوں کو ہدایت فرماتا ہے۔ گویا وہ اس ساری جماعت کا قائدِ اعظم ہے۔ اس مشین کا گورنر اسپرنگ ہے جس پر پرزوں کی باضابطہ گردش ہے۔ مولانا، مولانا کی آوازوں سے اس کا سیروں خون بڑھتا ہے دست بوسی سے اس کے جذباتِ قیادت میں برقی رو دوڑ جاتی ہے اور جس وقت اسٹیج پر جا کر وہ تالیوں کی آواز سنتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ خدا عبارت ہے صرف اسی کی ذات سے۔ یہ حال ہے اس کی پبلک زندگی کا، لیکن اپنے گھر کے اندر وہ کیا ہے! اپنے متعلقین کے ساتھ اس کا کیسا برتاؤ ہے۔ لوگوں کے حقوق وہ کیونکر ادا کرتا ہے، اس کا حال اس کی غریب بیوی سے پوچھیے جو ایک کنیز سے بدتر حیثیت رکھتی ہے۔ بچوں، خادموں اور اس کے اعزہ سے دریافت کیجیے کہ یہ اپنے آپ کو "خدا کا بیٹا" کہنے والا کس طرح کا باپ، کس قسم کا آقا اور کس انداز کا انسان ہے۔ اس کا مذہب یکسر خود پرستی، اس کا دین و ایمان سراسر کبر و غرور اور اس کی ذات از سرتاپا یادگار ہے ان فراعنہ کی جن کا حال تو کتابوں میں ہم کو نظر آ جاتا ہے لیکن صورت اب تک کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس قدر تمہید کے بعد مجھ کو اصل مدعا کی طرف آنا چاہیے جو عنوان سے ظاہر ہے۔ میرے تجربات مولویوں کے متعلق

اس قدر وسیع ہیں کہ اگر چاہوں تو برسوں تک اس سلسلہ کو قائم رکھ سکتا ہوں، لیکن اس وقت میں اپنا بالکل حال کا تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں، جو ادبی حیثیت سے کم پر لطف نہیں ہے۔

۲۵ جولائی کو میں ہندوستانی اکاڈیمی کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے الہ آباد جا رہا تھا۔ پرتاب گڈھ اسٹیشن پر پہنچ کر میں جس درجہ میں داخل ہوا وہاں پہلے سے ایک ہندو خاتون کونہ میں بیٹھی ہوئی تھی جس سے ایک مرد (جو غالباً اس کا خوش نصیب شوہر ہوگا) باتیں کر رہا تھا۔

یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، بہت قبول صورت، حد درجہ مہذب اور نہایت خوش ادا اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے بالکل ایک سفید فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی کندنی چمک، اس کے خد و خال کی کشمیریت، اس کی آنکھوں کی نشیلی کیفیت، اس کے لبوں کی میگونی، اس کے جسم کی لچکیلی نزاکت، یہ سب باتیں اس کی خوش سلیقگی متانت و سنجیدگی کے ساتھ مل کر ایک ایسی فضا پیدا کر رہی تھیں کہ ہر شخص کو اس سے متاثر ہونا چاہئے اور غلط ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن ایسی صورتوں میں میرا فلسفہ صرف یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ پر غور کرتا ہوں اور صبر کر لیتا ہوں۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں مقابل کی بنچ پر بالکل اس کے سامنے اور بہت قریب ہو کر بیٹھ جاتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، صرف احترامِ نسوانی کے خیال سے کہ ممکن ہے اسے کچھ تکلیف ہو اور وہ آزادی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکے۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک مولانا مع اپنی تمام خصوصیات ظاہری کے داہنے ہاتھ میں طہارت کا لوٹا لیے ہوئے اور بائیں ہاتھ میں بستر اجام بدستے و سبوئے بدست اندر داخل ہوئے اور بیک نگاہ گاڑی کا جائزہ لے کر بلا پس و پیش اپنا محاذ انہوں نے اسی جگہ قائم کر دیا جس کو میں نے قصداً چھوڑ دیا تھا۔

مجھے پہلے ہی ان کی وضع و صورت اور اس ناشائستہ حرکت سے یقین ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی مولانا ہے۔ لیکن اتفاق سے اسی درجہ میں ایک وکیل صاحب ان کے شناسا اور مل گئے۔ اور انہوں نے مولانا کے لفظ سے خطاب کر کے مہر تو ثیق ثبت کر دی۔

مولانا کی عمر ۵۰ سے متجاوز ہوگی لیکن صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور مصنوعی دانتوں کی تاب اور داڑھی کا خضاب جو ہر چند طاؤسی ہو گیا تھا بتا رہا تھا کہ ہنوز زعمِ جوانی موجود ہے۔ تمام اعضاء صحیح و سالم تھے۔ البتہ داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا کچھ ٹیڑھا اور مفلوج سا تھا۔ غالباً عملِ جرّاحی کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ ہاتھ پر ایک بڑا نشان اس کا پایا جاتا تھا۔

مولانا کو اس قدر اپنے سے قریب دیکھ کر اس خاتون نے آنچل کی اوٹ سے نیچے ہی نیچے بہت غور سے دیکھا اور نہایت مخفی تبسم کے ساتھ اس نے شوہر کو اور شوہر نے اسے دیکھا اور دونوں پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

مولانا نے سب سے پہلے اپنی نشست کا اندازہ اس طرح قائم کیا کہ چہرہ اسی طرف رہے اور اس کے ماتھے کی سُرخ بندی جو بیر بہوٹی کی طرح دہک رہی تھی نگاہ سے اوجھل نہ ہو۔ جب وہ اپنے نشانہ و ہدف کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے چاہا کہ کسی طرح اس کے شوہر سے بے تکلفی پیدا کر کے اپنے آپ پر گلچینئ جمال کو حلال کریں لیکن بدقسمتی سے ایک صاحب جو

ان کے شناسا تھے الف لیلہ کے کم گو حجام سے کم باتونی نہ تھے اور انھوں نے جو مولانا سے گفتگو شروع کی تو پھر اس کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہوتے۔ ہر چند مولانا کی چین پیشانی کی عبوست اور کبھی کبھی اخبار لے کر اس کے مطالعہ کی کوشش کرنا صاف کہہ رہا تھا کہ وہ کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور ان کی توجہ و مراقبہ کو صدمہ پہنچ رہا ہے لیکن وکیل صاحب جو اپنی پہنائی اور قد و قامت کے لحاظ سے ابوالہول کی لحد معلوم ہوتے تھے۔ اس غریب مولانا کے آزار کو نہ سمجھ سکے اور برابر ان کی یکسوئی خیال و نگاہ میں حارج رہے۔ لیکن باوصف اس کے مولانا نے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے ہدف کو فراموش نہیں کیا اور اپنے کسی لمحۂ عزیز کو انھوں نے بیکار جانے نہیں دیا۔ وہ باتیں کرتے تھے مگر نگاہ کا سمت نہ بدلتا تھا۔ وہ وکیل صاحب کے سوالوں کا جواب دیتے تھے۔ مگر ہر جواب کے دوران میں اس "سرمایۂ جان" کو بھی ضرور دیکھ لیتے تھے۔ وہ کوشش کر کے اپنے ہاتھ کی معیوب و کج انگلیوں کو چھپاتے تھے کہ مبادا وہ خاتون اس عیب کو دیکھ لے۔ وہ آواز میں ایک خاص قسم کا لوچ پیدا کر کے گفتگو کرتے تھے۔ وہ اپنے قہقہہ میں جھنکار سی پیدا کرنے کی سعی فرماتے تھے، وہ اپنی خوش دلی، قابلیت، جاہ و ثروت، دولت و امارت کا ثبوت دینے کے لیے کبھی کبھی لطایف بھی کہتے۔ فارسی کے اشعار بھی پڑھتے، بڑے بڑے لوگوں کے نام اور ان سے اپنے تعلقات کو بھی ضمناً ظاہر کرتے جاتے تھے اور سب سے زیادہ زور اس پر دے رہے تھے کہ دنیا میں تعصب سے زیادہ بُری کوئی چیز نہیں اور بھئی میرا مسلک تو یہ ہے کہ "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" رام رام کہہ کر جس وقت مولانا نے اس عورت کو دیکھا تو وہ بھی انھیں دیکھ رہی تھی اور میں بھی ان دونوں کے دیکھنے کو دیکھ رہا تھا اور آخرکار جب تینوں نگاہیں مرکز اجتماع سے ہٹیں تو اس طرح کہ تینوں نے علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو دیکھا مگر یہ منظر پیدا کرتے ہوئے کہ مولانا اپنی جگہ مست تھے اور وہ خاتون محجوب۔ الغرض مولانا کے تمام لاعبانہ تیور اس کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ انھی لوگوں میں سے ہیں جو ؎

ایں کار را بہ شیوۂ کار آگہاں کنند

جب مجھے پوری طرح یقین ہو گیا کہ مولانا کی خوش طبعی اب کافی طور پر بڑھ گئی ہے اور انھیں وثوق کامل ہو گیا ہے کہ سارے درجہ میں صرف انھی کی ذات ایسی ہے جس پہ وہ خاتون مائل ہو سکتی ہیں، ہو سکتی کیا ہو ہی گئی ہے تو میں سنبھلا اور میں نے آگے بڑھ کر بہ ادب عرض کیا کہ "اگر جناب اجازت دیں تو چند مسائل حضور سے دریافت کروں جو اسی وقت میرے ذہن میں آئے ہیں۔"

وہ یہ سن کر دفعتہً چونک پڑے اور بولے "ہاں ہاں کہیے، ہم لوگ اسی لیے ہیں۔" اور یہ کہہ کر خاص پندار کے ساتھ اس طرف دیکھ لیا۔

میں نے عرض کیا کہ "مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ جناب صرف عالم ہی نہیں ہیں بلکہ ادیب و شاعر بھی ہیں جیسا کہ آپ کی شعر خوانی سے ظاہر ہوتا ہے اور اسی بناء پہ مجھے یہ دریافت کرنے کی جرأت ہوئی ہے کہ کیا "غناء خانۂ ہمسایہ" اور "حسنِ دیگراں" سے فائدہ اٹھانے کا مسئلہ محض شاعرانہ ادعا ہے یا واقعی کوئی شرعی حقیقت بھی اس میں پنہاں ہے؟"

یہ سن کر ان کے چہرے پہ پہلے ایک ہلکی سی سُرخی عتاب کی اور پھر زردی حجاب کی نمودار ہوئی اور پہلو بدل کر بولے کہ "آپ کو مجھ سے مذاق کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟"

میں نے کہا کہ ”بندہ نواز میں آپ سے مذاق کر سکتا ہوں؟ میں تو واقعی آپ سے سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں۔ کیونکہ بسا اوقات سفر و حضر میں ایسا ہوتا ہے کہ نگاہ مجبوراً اٹھ جاتی ہے اور میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے آخرکار کانپ اٹھتا ہوں کہ کہیں آخرت میں بازپرس نہ ہو۔“

مولانا نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے کہ ”یہ صورت تو عذاب سے ڈرنے والوں کی نہیں ہوتی، داڑھی منڈی ہوئی، مونچھ بڑھی ہوئی اور پیشانی سجدے کے نشان سے خالی۔“

میں نے کہا ”بجا ارشاد ہوا۔ میں اپنی صورت کا سب سے زیادہ شناسا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ عذاب سے ڈرنے والی صورت کیسی ہوتی ہے۔ سامنے ہی موجود ہے۔ صراحت کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں تو آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں اور آپ کو اس کا جواب عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے دینا چاہیئے، عام اس سے کہ میری داڑھی منڈی ہوئی ہے یا خضاب سے رنگی ہوئی ہے، میرے دانت اصلی ہیں یا مصنوعی، میری انگلیاں سیدھی ہیں یا ٹیڑھی، میری عمر باپ ہونے کی ہے یا شوہر بننے کی۔“

یہ سننے کے بعد مولانا کا غصہ ضبط سے باہر ہو گیا اور وہ آستین چڑھا کر بولے کہ ”تم مجھ سے مسخرہ پن کرتے ہو۔ یاد رکھو میں بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش بھی ہوں۔“

میں نے عرض کیا کہ ”میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔“

اس تنقید کی تاب وہ کیا لا سکتے تھے، بے اختیارانہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن وکیل صاحب نے اٹھ کر ان کو پکڑ لیا اور سارا درجہ مخاطب ہو کر ان کو سمجھانے لگا کہ ”جانے دیجیے آپ بزرگ ہیں، اپنی طرف خیال کیجیے۔“ اور ”چنیں و چناں“ میں نے کھڑکی کی طرف رُخ کر لیا اور جب چند منٹ کے بعد سکون ہوا تو میں پھر ان کی طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ ”مولانا اگر غصہ فرو ہو گیا ہو تو عرض کروں کہ میرے سوال کا جواب مرحمت ہو۔“

یہ سُن کر سارے درجہ والے تو خیر ہنس ہی پڑے تھے وہ خاتون بھی مسکرانے لگی اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

مولانا بولے کہ ”خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑیئے، میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا۔“

میں نے کہا کہ ”یہ بات شرعی مسئلہ ہے اور آپ کو بتانا پڑے گا۔“

وکیل صاحب خوش مزاج انسان تھے، انہوں نے کہا کہ ”مولانا کیا حرج ہے، آپ کیوں نہیں بتا دیتے؟“

مولانا بولے کہ ”آپ نہیں سمجھتے یہ مجھے بے وقوف بناتے ہیں ورنہ کیا یہ خود نہیں سمجھ سکتے کہ جو کچھ یہ پوچھ رہے ہیں محض شاعرانہ بات ہے اور شرح ......“

میں نے کہا ”نہیں مولانا واللہ ایسا نہیں ہے، مجھے اس وقت تک تو صرف گمان ہی تھا لیکن آج یقین ہو گیا کہ غسل خانۂ ہمسایہ جائز ہو یا ناجائز لیکن ”حسنِ رہگذر“ سے لطف اٹھانا قطعاً جائز ہے۔“

مولانا بولے ”یہ کیونکر آپ کو یقین ہو گیا؟“

یہ سُن کر میں ہنس پڑا اور دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

مولانا غصّہ میں اٹھے اور لوٹا لے کر منہ بناتے ہوئے بیت الخلاء چلے گئے۔ ایک اسٹیشن درمیان میں باقی تھا کہ وہ باہر آئے اور جب اپنی جگہ بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا کہ تشبّہ کسی قوم کے ساتھ ایک شخص کو اسی قوم میں داخل کر دیتا ہے۔ اس لیے اگر ہمارے ہاں کی عورتیں بھی سُرخ بندی کا استعمال کریں تو وہ ہندو ہو جائیں گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

مولانا نے فرمایا" بے شک بندی کا استعمال ہماری عورتوں کو نہ کرنا چاہیئے۔"

میں نے عرض کیا" لیکن مولانا! یہ تو آپ نے بھی دیکھا، کہ ہے بڑی پیاری چیز اور خاص کر گورے رنگ پر تو قیامت ہی ہو جاتی ہے۔"

مولانا نے کہا" حقیقت یہ ہے کہ تم ہو کوئی بڑے بدمعاش۔"

اتنے میں پریاگ اسٹیشن آگیا جہاں مجھے اترنا تھا۔ مولانا بدستور بیٹھے رہے اور میں اتر پڑا۔ لیکن نیچے پلیٹ فارم پر جا کر میں نے ان سے کہا کہ" مولانا خدا کے لیے صرف ایک بات کان میں سُن لیجیے۔" مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے کہنا مان لیا اور جب انھوں نے کھڑکی کے پاس آکر اپنے کان قریب کیے تو میں نے عرض کیا کہ" مولانا اس میں شک نہیں کہ چیز اچھی ہے کیا رائے ہے؟"

یہ سُن کر انہوں نے میری گوشمالی کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں الگ ہٹ گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔

اکاڈمی کا دفتر پریاگ اسٹیشن سے صرف دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر ہے اور اس دس منٹ کے راستے میں جس خیال نے میرے دماغ کو گھیر رکھا وہ مولانا کا واقعہ تھا بلکہ غالب کا یہ شعر تھا جسے میں گنگناتا جا رہا تھا ؎

اگر بہ دل نہ خلد آنچہ از نظر گزرد
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گزرد

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

سجاد حیدر یلدرم

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن میں دلّی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پہ پڑی جو بڑے مؤثر طریقے سے اپنی حالتِ زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفے کے بعد یہ درد سے بھری اپیچ انہیں الفاظ اور اسی پیرائے میں دوہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا کہ میں اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا اور جسم خوب موٹا تازہ تھا اور چہرہ ایک حد تک خوب صورت تھا، مگر بد معاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اس کی شکل تھی، رہی اس کی صدا تو میں ایسا قسی القلب نہیں ہوں کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ لفظ بہ لفظ لکھی جائے۔ چنانچہ وہ اپیچ یا صدا جو کچھ کہیے یہ تھی: ۔

> "اے بھائی مسلمانو! خدا کے لیے مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ میں آفت کا مارا سات بچوں کا باپ ہوں۔ اب روٹیوں کا محتاج ہوں، اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں۔ مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں، اے خدا کے بندو! میری سنو۔ میں غریب الوطن ہوں۔"

فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر ان کے قصّے کا اثر ہوا ان سے خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں میں نے اس کو اپنے سے اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے، وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں، وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ بس یہاں تک میں اس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیئے میں رات دن اسی فکر میں گزارتا ہوں اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک میں غور کرتا رہا کہ اس کی یہ قابلِ رشک حالت کس وجہ سے ہے اور آخر کار میں بظاہر اس عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں؛ میں حسرت سے کہتا ہوں "میرے اتنے دوست ہیں۔ اس کا کوئی دوست نہیں!" اگر یہ سچ ہے تو اسے مبارک باد دینی چاہیئے۔

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا اپنے مکان پر آیا۔ کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے میرا کوئی دوست نہیں۔ اسے خوش نصیب شخص! یہیں تو تو مجھ سے بڑھ گیا۔ لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہے؟ یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں کی طرح اسے دن بھر میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے؟ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں۔ مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا کہ میں تخلیے میں اپنے خیالات جمع کر سکوں اور انہیں اطمینان سے قلمبند کر سکوں یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے اُسے سوچ سکوں۔ کیا یہ فقیر دن دہاڑے اپنا روپیہ لے جا سکتا ہے؟ اور اس کا کوئی دوست راستے میں نہ ملے گا اور یہ نہ کہے گا:۔

”بھائی جان دیکھو۔ پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔ مجھے اس وقت ضرورت ہے۔ تھوڑا سا روپیہ قرض دو!“ کیا اس کے احباب وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اُسے نیند کے جھونکے آ رہے ہیں۔ مگر یار دوستوں کا مجمع ہے، جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں، اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے۔ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہو حق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اسے جانا نہیں پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا؟ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہٹا کٹا ہے اور میں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللہ کیا اس بات پر بھی شکریہ ادا نہیں کرتا؟ خدا جانے وہ اور کونسی نعمت چاہتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں! بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی ہے اور یہ ان سے بھاگتا ہے۔ مگر میں دوستوں کو بُرا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لیے میرے پاس آتے ہیں اور میرے خیر طلب ہیں۔ مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پہنچانے کا، اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفرین کی جائے۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ نہیں ثابت کر سکا کہ احباب کا ایک جم غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی باتوں میں عمر نہیں گزارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا، چاہے اس سے میرے دل پر کتنا ہی صدمہ ہو۔“

مثلاً میرے ایک دوست احمد مرزا ہیں جنہیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں۔ یہ نہایت معقول آدمی ہیں اور میری ان کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے شور مچاتے ہوئے چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ ان کا آنا بھونچال سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں ”کوئی آ رہا ہے قیامت نہیں ہے“۔ ان کے آنے کی مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ ”میاں اس وقت کام میں مشغول ہیں“ تو وہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں۔ (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) ”خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے! توبہ توبہ! اچھا بس ایک منٹ ان کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہوں گے نا؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا۔“

یہ کہتے ہوئے اوپر آتے ہیں اور دروازے کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آ کے لگا۔ (آج تک انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں۔

"آہا ہا ہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا مگر دیکھو دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا مت بند کرو۔ میں ہرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب جاتا ہوں، میں بیٹھوں گا نہیں، ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا۔ تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا، اپنے ساتھ میرے کل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر اب وہ کہاں! اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے۔ تاہم اگر وہ گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا میں انہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور ان کی دوستی بہت پرانی ہے اور وہ مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ تاہم انہیں چھوڑ دوں گا اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے۔

اور لیجیے! دوسرے دوست **محمد تحسین** ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں اور رات دن انہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں۔ جب میں کام سے فارغ ہو چکتا ہوں لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں۔ مگر تحسین آئے ہیں اور ان سے ملنا ضروری ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش کروں مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں ہاں بڑا خراب موسم ہے۔ میرے چھوٹے لڑکے کو بخار آ گیا۔ منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔" اگر پالٹکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ "بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں"۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لیے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ "طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں لگتی؟ کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری کا ہی ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں جنہیں سوائے اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریق مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمت کے (تعریف اس حالت میں جبکہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ منجملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے میں شاکر صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ان کا خیال ہے کہ اہلِ علم کی تھوڑی سی قدر کرنا امراء کے شایانِ شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے۔ یہ کہہ کے "شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہوگی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا۔ دیکھو، میری خوشی کر دو۔"

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا۔ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ ایڈیٹر ”معارف“ سے وعدہ کر چکا تھا کہ ایک خاص عرصے میں ان کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا۔ اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی ایک کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتے کی غرض سے بلایا گیا۔ جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ ”ہیں ہیں! کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی کام شروع کر دو۔ اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو۔ اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سینری کا لطف اٹھانے میں گزارا جائے۔ چلیے گاڑی تیار کراتے ہیں۔ دریا پر مچھلی کا شکار کھیلیں گے۔ پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجہ طالب علی صاحب سے ملائیں گے۔“

میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت معلوم! خیر سینکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت تو میں بچ گیا اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا۔ جس عنقا یعنی یکسوئی کی تلاش میں میں سرگرداں تھا وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

میں جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا جو میرے لکھنے پڑھنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا جس پر سیاہی کا ایک قطرہ گرانا گناہ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات مگر سیاہی دیکھتا ہوں تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب، مگر اکثر میں نب ندارد۔ جاذب کاغذ ایک مخمل جلد کی کتاب میں، مگر لکھنے کے کاغذ کا پتہ نہیں۔ اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا۔ مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں اور جو چیزیں کہ ضروریات کی تھیں وہ موجود نہیں۔ آخر کار میں نے اپنا وہی پرانا استعمالی مگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمانداری سے میری مدد کی تھی۔ میرے پراں خیالات کو تیزی کے ساتھ قفسِ کاغذ میں بند کیا تھا) نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مرغان خوش نوا کی تعریف میں شعراء اس قدر رطب اللسان ہیں، ان کی اس عنایت سے میں خوش نہیں ہوں کہ سب کے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے ان کی طرف سے کان بند کر لیے اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔

تن۔ تن تن تننا۔ چھن۔ تان۔ تن تن تن۔ میں ایسا مصروف تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ یکایک اس تن تن نے چونکا دیا۔ ہیں! یہ کیا ہے؟ افوہ! اب میں سمجھا میرے کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے۔ انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے۔ اس وقت ستار سے شوق فرما رہے ہیں۔ بہت خوب بجا رہے ہیں۔

”اس کی گلی سے آئے کیوں“؟ نکہت زلف لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے امید۔ آیا مجھ کو صبا سے ہے امید، مجھ سے صبا کو کیا غرض؟“

واہ وا! سبحان اللہ! کیا غزل چھیڑی ہے! ”اے ترک سوار نواح عرب یثرب نگری پہنچا دینا۔ کس رنگ میں ہے۔ وہ حبیب مرا مجھے وا کی کھبریا لا دینا۔“ بہت ہی خوب! کمال کرتے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ انہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے اور خاموشی طاری ہو گئی، تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔

”اے میرے خیالات! تمہیں میرا گنجینہ، میرا خزانہ ہو۔ خدا کے لیے رحم کرو۔ میرے دماغ میں پھر آؤ۔“ یہ کہہ کے میں کاغذ کی طرف

متوجہ ہوا کہ دیکھوں کہاں چھوڑا ہے۔ میں اس فقرے تک پہنچا تھا: ”ہم اس وسیع اور دقیق مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں اتنا ہی اس کی مشکلات کا مثل ....“

مثل کے آگے میں کیا لکھنے والا تھا؟.... ریگ دریا کے اندازہ نہیں کر سکتے؟“ ہرگز نہیں۔ ایسا معمولی تو نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ اور تھا۔ کوئی اعلیٰ درجے کی تشبیہ تھی اور فقرے کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنے والا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھا کیا نہ تھا۔ اب تو دماغ میں اس کا پتہ بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے کہ:-

”اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہتِ زلف لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے امید۔ مجھ سے صبا کو کیا غرض؟“

مگر میرا تو صبا کے نام نے دماغ ہی خالی کر دیا۔ اگر وہ آتی اور نکہتِ زلف بھی لاتی تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ بہرحال مجھے وہ فقرہ از سرِ نو درست کرنا چاہیئے۔ مشکلات کے بجائے کچھ اور ہونا چاہیئے۔

ہم اس وسیع مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں اتنا ہی ان بیش بہا علمی جواہر کو جو ہمارے ملک اور قوم کے علمی خزانے کے پُر کرنے کے لیے کافی ہیں اور جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟“ یہ کیا؟

’جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟‘ یہ کیا مہمل فقرہ ہوا! لاحول ولا قوۃ۔ میں بھی کیا گڑ بڑ کر رہا ہوں۔ آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے؟“ یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب نے کسی دوست سے کہے ہیں جو ابھی ان سے ملنے آیا ہے۔ میں مصروفیت میں انہیں ہی لکھ گیا۔

ہاں تو کاٹ کے فقرہ درست کرنا چاہیئے۔“ اور جن کی قدر ابھی تک ملک و قوم کو معلوم نہیں ہوتی ہے اور بظاہر.....“

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

کون ہے؟

”میں ہوں، شبن۔ سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو نیچے ذرا سی دیر کے لیے تشریف لائیے۔ کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور سرکار انہیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں۔“

بادلِ نخواستہ میں اٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ شبن صاحب نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا۔ گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کر دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے۔ فقرہ از سرِ نو پھر بنانا پڑا۔ طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ بہزار دقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا۔

”ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیقات کا شوق ہے اور جو کولمبس کی طرح۔ نئی معلومات اور نئی دنیا (گو وہ علمی دنیا ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لیے اپنے تئیں.......“

دروانسے پر پھر دستک "کیا ہے؟" اچھا۔"

دریافت کرنے کے لیے اپنے تئیں خطرے میں ڈالنے سے بھی خوف نہیں کھاتے۔ ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے اور اپنی کاوشوں اور کوششوں سے موجودہ . . . . ."

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

"ہاں"

"حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں، کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔"

"اوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں۔ میں پھر کھا لوں گا۔ اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں۔"

"اور آئندہ نسلوں کو زیر بار احسان کریں گے۔ یہی وہ نوجوان ہیں جو قوم کی کشتی کو خدا کی مدد پہ بھروسا کر کے خطرات سے بچاتے اور ساحل مراد تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ۔

دستک۔ کیا ہے؟"

"سرکار کہتے ہیں: اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اسی وقت کھائیں گے۔ مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا۔"

اچھا بھئی، لو ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر میں کھانے کے لیے جاتا ہوں۔ سب سے معذرت کرتا ہوں۔ میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں "چہرے پہ تھکن محسوس ہوتی ہے۔ کیا بہت لکھ ڈالا؟ دیکھو میں تم سے کہتا تھا نا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں؟"

سوائے اس کے کہ آمنا و صدقنا کہوں اور کیا کہہ سکتا تھا۔ اب کھانے پر اصرار ہوتا ہے جس چیز سے مجھے رغبت نہیں وہی کھلائی جاتی ہے۔ بعد کھانے کے میزبان صاحب فرماتے ہیں" سہ پہر کو تمہیں گاڑی میں چلنا ہوگا۔ میں تمہیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کر لو۔"

واپس کمرے میں آ کر تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کر لوں اور پھر لکھنا شروع کر دوں۔ مگر اب خیالات کہاں؟ مضمون اٹھا کر دیکھتا ہوں:

"زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ۔"

اس کے متعلق کیا لکھنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اس کو پہلے فقروں سے کیونکر ربط پیدا کرتا تھا۔ یوں ہی پڑے پڑے نیند آ جاتی ہے۔ تیسرے پہر اٹھتا ہوں تو دماغ نہایت صحیح پاتا ہوں۔ "زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ" بالکل حل ہو جاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینے کی طرح نظر آتا ہے۔ میں خوشی خوشی اٹھ کر میز پہ گیا اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک۔

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے، سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں فوراً نیچے جاتا ہوں تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب فرماتے ہیں یہ ہوتا ہے "آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے۔" میں سچی بات کہوں گا کہ کچھ بھی نہیں لکھا۔" تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ آخر اس قدر کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے؟

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائیے قسمیں مجھے یقین ہوا مجھ کو اعتبار آیا

مل ملا کر شام کو واپس آئے۔ کھانے کے بعد باتیں ہوتی رہیں۔ سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام اٹھا کر دیکھتا ہوں تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں۔ وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ۔ غصے اور رنج میں آکر اسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔ اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے واپس چلا آتا ہوں۔ ناشکرا اور احسان فراموش کہا جاؤں گا۔ مگر میں مجبور ہوں۔ اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دوں گا۔

میں نے ذرا تفصیل سے اُن کا حال بیان کیا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ بس ان احباب کی فہرست ختم ہو گئی جن سے میں رخصت طلب کر سکتا ہوں۔ نہیں ابھی بہت سے باقی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے۔ مگر جب آتے ہیں میں ان کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک صاحب جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں جو مجھ سے ملتے ہی کہتے ہیں "میاں عرصے سے میرا دل چاہتا ہے تمہاری دعوت کروں"۔ مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست آتے ہیں، وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔ جب میں جواب دیتا ہوں تو متوجہ ہو کر نہیں سنتے، یا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں وہ جب آتے ہیں اپنی ہی کہے جاتے ہیں میری نہیں سنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں، مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں ؏

"مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"

اب چونکہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کر دیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کر دوں۔ دروازے پہ ایک گاڑی آکے رُکی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ کون صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کی شکایت نہیں کرنے لگا کیونکہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ کسی کرم فرما نے کرم نہیں فرمایا۔ اس لیے اس کے شکریے میں اس مضمون کو اسی ناتمام حالت میں چھوڑتا ہوں اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب آتے ہی مجھ پر اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے"۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے، جو حاذق ہے یا کوئی مجرب نسخہ میرے لیے کسی سے مانگ کر لائے ہوں گے۔

"آئیے آئیے۔ مزاج عالی۔ بہت دن بعد تشریف لائے"

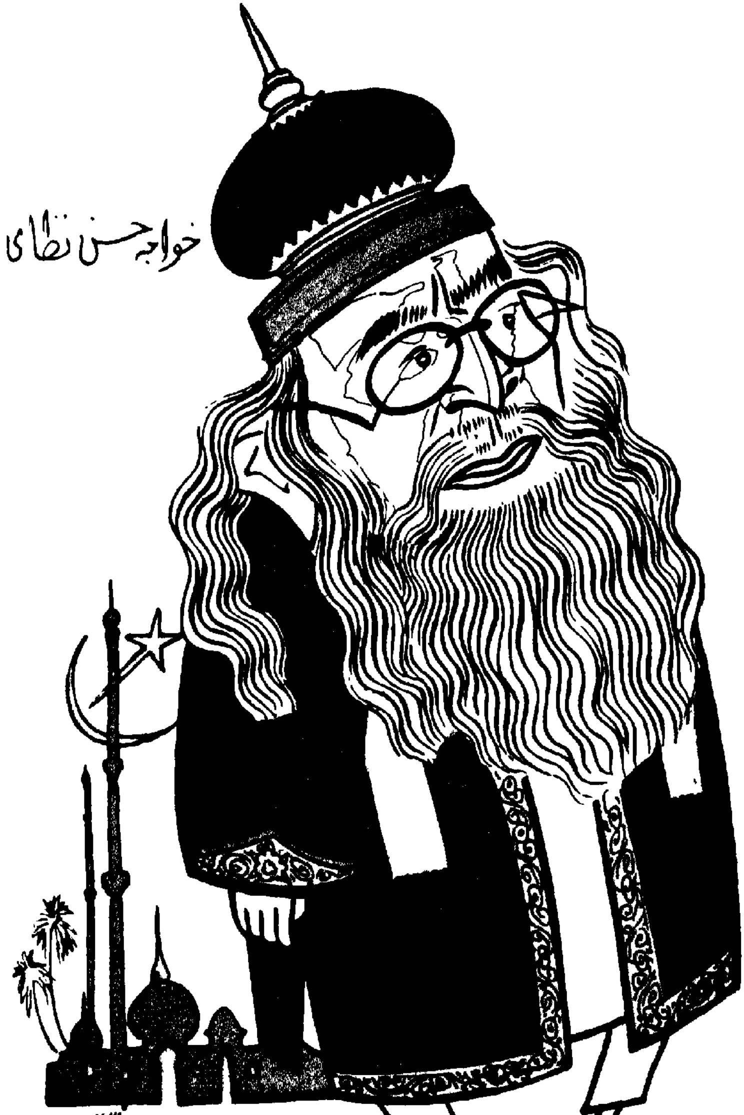
خواجہ حسن نظامی

کم اِن مائی ڈیر سنہ ۱۶ء

خواجہ حسن نظامی

(۱)

ویل کم، ہو ہو۔ مائی ڈیر سنہ ۱۶ء اندر آئیے، کیک چکھیے، کم مٹھاس کی چاء پیجیے، انگیٹھی گرم ہے ہاتھ سینکیے۔ ناک کو تو سردی نہیں لگتی۔ خنکی معلوم ہو تو اس کو بھی گرما لیجیے۔ مگر ہاں، آپ کی ناک ہے بھی یا نہیں؟ سنہ ۱۵ء کے تو نہ تھی۔ اہل جرمنی نے وعدہ خلافیاں عہد شکنیاں کر کر کے بیچارے کی ناک کاٹ لی تھی۔

بھائی، میرے گھر میں بریک فاسٹ کا تو کچھ انتظام نہیں ہے۔ تیرہ تیزی کی گھونگنیاں کھا کھا کر دن کاٹتا ہوں۔ تمھارے لیے ایک خانساماں سے کیک کا ایک ٹکڑا اور ٹھنڈی پھیکی چاء کی پیالی مانگ لایا تھا۔ چہ کند بے نوا ہمیں دارد۔ صبر کر کے اسی کو نوش کرلو۔ زیادہ حرص ہو تو میدان جنگ میں جاؤ وہاں سب کچھ ملے گا۔

ذرا سُننا، خدا نے کہا تھا میں خود زمانہ اور وقت ہوں، کیا تم بھی خدا ہو؟ کیونکہ تم بھی ٹائم اور وقت ہو، مگر خدا بدلا نہیں کرتا۔ اور تم بارہ مہینے میں بدل جاتے ہو۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تم خدا نہیں ہو پس جب تم خدا نہیں ہو تو لاؤ میرا کیک پھیر دو اور چاء کی پیالی بھی واپس دو۔

ہاں یاد آیا، میں تو مشرقی ہوں اور مشرق والے دے کر واپس نہیں لیا کرتے، اچھا خیر، کھالو، نگل لو، ٹھونس لو، تمہیں کس نے بلایا تھا؟ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ آؤ بھگت کرتا تو اپنے محرم کی کرتا جو لاڈلا ہے، ہجری سنہ کا پہلا پیغام لے کر آتا ہے۔ تم سے مجھے کیا غرض۔ تم کو پادری صاحب کے ہاں جانا چاہیئے تھا۔

لاحول ولا قوۃ۔ معاف کیجیے گا جناب، بھوک و مفلسی میں انسان کی عقل قابو میں نہیں رہتی۔ آپ ہمارے بادشاہ کی نشانی ہیں۔ ہر دفتر میں آپ ہی کا سکّہ چلتا ہے۔ ہماری قوم تو آپ سے اس قدر محبت رکھتی ہے کہ ہر شخص دیوار پر آنکھوں کے سامنے آپ ہی کو لٹکاتا ہے۔

جنوری کی قسم، میں تمہارا تابعدار ہوں، وفا شعار خادم ہوں، تمہارا کیا کہنا۔ بڑے اچھے ہو، کیسے گرم گرم کوٹ لاتے ہو۔ تمہارے آنے کی خبر سُن کر ایک مہینہ پہلے خیرات بانٹنے والے مجھ کو لحاف سِلوا دیتے ہیں اور لحاف کے اندر مجھ کو ایسا آرام ملتا ہے جیسا کچھوا کو اپنے خول میں۔

میری عادت خوشامد کرنے کی نہیں ہے، پر آج تو میں تمہاری خوشامد کروں گا اور کہو تو تمہارے بوٹ بھی صاف کرنے سے عذر نہ ہوگا۔ لیکن یہ وعدہ کرلو کہ تم سنہ ۱۵ء اور سنہ ۱۴ء کی خونریزی کو بند کرا دو گے۔

میاں مجھے اس لڑائی سے تو کچھ تکلیف نہیں، دنیا میں کچھ بھی ہوا کرے مجھے اس سے کیا غرض؟ البتہ یہ بے آرامی ہے کہ سوئیاں اور رنگ بہت مہنگا ہو گیا ہے، جانتے ہو کہ میں دمڑی دھیلے کا آدمی ہوں، سوئیاں سستی تھیں تو اپنی گدڑی میں آسانی سے پیوند لگا لیتا تھا۔ اب یہ دونوں اس قدر گراں ہیں کہ میں نہ سوئیاں خرید سکتا ہوں نہ رنگ، یونہی میلا کچیلا' چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں۔

اگر تم لڑائی بند نہ کراؤ تو یہ دونوں چیزیں ہی سستی کرا دو۔ بس میں تو فقط اتنا چاہتا ہوں۔ مجھے نہ خطاب چاہیئے نہ کونسل کی ممبری، میں تو روکھی روٹی پیٹ بھر کر اور کنویں کا پانی اور تن کا موٹا جھوٹا کپڑا چاہتا ہوں۔ کنویں کا پانی اس واسطے کہ نل کا پانی لوہے کے منہ سے آتا ہے اور لوہا آج کل توپ میں، بندوق میں، گولے میں، گولیوں میں، آدمی کا خون بہاتا ہے اور میں خون خرابے سے بہت ڈرتا ہوں۔ اندیشہ ہے کہ لوہے کے پانی کہیں مجھ میں بھی فتنہ و فساد کا اثر نہ آ جائے۔

---

(۲)

جھینگر کا جنازہ

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا، خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ، جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں جو وہ مجھ کو دکھا دکھا کر ہلایا کرتا تھا، تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا۔ اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چار چاند لگا کر چمکا دوں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیّہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں بے شریر تو یہاں کیوں آیا؟" اچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ' بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے بولا وہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی، خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقتوں سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔

جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ واہ خفا ہو گئے، بگڑ گئے، لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی کہ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشہ دیکھا تھا۔ آج غسل خانے میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بے چارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے اور وہ اس کو دیوار پر کھینچے لیے چلی جاتی ہیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا خطبے کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعہ تو ہزاروں آئیں گے۔ خدا سلامتی دے۔ نماز پڑھ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضرور ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بے چارہ غریب تھا، خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مکروہ تھا، غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا۔ کیا امریکہ کے کروڑ پتی راک فیلر کے شریکِ ماتم ہوگے؟

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا، جی دکھایا تھا۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ بوریے کے نیچے آب خورہ کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا ڈسنے والا پھن، نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی۔ نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی، شام کے وقت عبادتِ رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا یہ غافلوں کے لیے صور ہے۔ اور عاقلوں کے لیے جلوۂ طور۔

ہائے آج غریب مر گیا، جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے۔ ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا۔

ہاں تو، جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"۔ چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا۔ ویسٹ منسٹر ایبے یا...... کے بہشتی مقبرہ میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خور سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہو ؎

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر، اے فلاسفر، اے متوکل درویش، اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پہ تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پہ کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں خیر اب تو تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو جا۔ مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔

گھریلو مشاعرہ

تاجور نجیب آبادی

اجی سُن رہے ہو۔

کیوں ؟ کیا تم نے کچھ کہا تھا ؟

نہیں اب کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

تو کہنے سے پہلے ہی ہم کیوں کر سُن لیتے اور کیا سُن لیتے ؟

اچھا اب سُن لو !

سناؤ۔ کیا سنانا چاہتی ہو۔

دیکھنا آپ نے سنا ہے لاہور میں ہزاروں سینما ہیں۔ وہی تا جنھیں ہمارے ہاں بائیسکوپ کہتے ہیں۔ ہیں نا ؟

ہزاروں تو پورے صوبے میں بھی نہ ہوں گے۔

ہزاروں نہ سہی سیکڑوں میں تو کلام ہی نہیں۔

ہمیں تو اس میں بھی کلام ہے۔

پھر وہی کٹ حجتی۔ میں نے کوئی پٹ ہوؤں کی مردم شماری کی ہے ؟

سینماؤں کی مردم شماری کی بھی ایک ہی کہی۔ آدمیوں کی مردم شماری ہوتی آئی تھی۔ سینماؤں کی مردم شماری تمھیں سے سنی۔

نوج تم سے کوئی بات کرے۔

ٹھکانے کی بات تو ہم سے ہر وقت کی جا سکتی ہے۔

تو میں خدا نہ کرے بے ٹھکانے کی بات کیا کرتی ہوں۔ کوئی میرے دشمن پاگل تو نہیں۔

نہیں تم تو نہیں۔ اکثر بیویاں بے تکے ہی بات کیا کرتی ہیں۔

اور شوہر ؟

شوہر کمبختوں کو بات کرنے کی مہلت ہی کب دی جاتی ہے۔

انھیں بات کرنے کی مہلت ہی کون نہیں دیتا ؟

وہی جس کی باتوں کا آغاز و انجام ازل و ابد سے وابستہ رہتا ہے۔

یعنی بیوی۔

چور کی داڑھی میں تنکا۔

یہ محاورہ اسی دن کے لیے یاد کیا تھا؟

نہیں بلکہ اس کا استعمال ایسے ہی موقعے پر کیا جاتا ہے۔

تو ہم چور ٹھہرے اور تم ساہ ؟

تم چور نہ ہم ساہ۔ محاورات تو دراصل استعارات ہوتے ہیں۔

کل کو کوئی گالی دے کر کہہ دینا کہ گالی تو استعارہ ہوا کرتی ہے۔

تعلیم یافتہ لوگ استعاروں ہی میں گالیاں دیا کرتے ہیں۔

کسی دن میرے سر پر لٹھ رسید کر کے اسے بھی استعارہ بنا دینا۔

لٹھ بازی بھی ایک قسم کا استعارہ ہی ہے۔ مگر ذرا جلی قسم کا استعارہ ہے۔

تو ان جلی اور خفی استعاروں کی مشق کے لیے میں ہی رہ گئی ہوں؟

اپنی سہیلیوں پر ان استعاروں کی مشق تم بھی کر سکتی ہو۔

جان بار سہیلیوں نے کیا قصور کیا ہے کہ انھیں تختۂ مشق بنا دُوں۔ میں تو یہ استعارے تم پر مشق کرنا چاہتی ہوں۔

شوق سے مگر پہلے ان استعاروں کو ہم سے سیکھ لو۔ ہمارا اندازِ تعلیم تو تم جانتی ہو "ڈائرکٹ میتھڈ" کے اصول پر ہوتا ہے۔ لٹھ بازی کے جلی استعارے کی عملی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی تم اگر اس قابل رہیں کہ ہم پر اس کا تجربہ کر سکو تو ضرور کر لینا۔

تم نے اس نگوڑے استعارے کی عملی تعلیم کس سے لی تھی ؟

اپنے مرحوم استادوں سے۔

پھر تمھارا سر کیونکر سلامت رہ گیا ؟

ہمارے سر کے گنگا جمنی بالوں میں جو یہ ٹیڑھی ترچھی شاہراہیں نظر آتی ہیں اسی تعلیم کی یادگار ہیں۔

تو تمھارا مطلب یہ ہے کہ یہ شاہراہیں میرے سر میں بھی قائم کی جائیں۔

سر کی یہ شاہراہیں باغِ جنت پر ختم ہوتی ہیں۔ تم نے سنا ہوگا کہ استاد کی مار بدن کے جس حصے پر پڑ جاتی ہے اس پر آتشِ دوزخ حرام ہو جاتی ہے۔

بس معاف رکھو۔ مجھے اس رستے سے جنت پہنچنا منظور نہیں۔ تمھیں کو اس شاہراہ سے وہاں پہنچنا مبارک رہے۔

یہ تو کچھ بات نہ ہوئی۔ ہم اس شاہراہ سے جنت ضرور پہنچیں گے۔ مگر تم جنت کے راستے سے کترا کر جہنم رسید ہو گئیں تو ہمارے بغیر جنت سونی سونی نظر آئے گی۔

سونی نظر آئے یا آباد۔ میں تمھارے ساتھ جنت جانا بھی نہیں چاہتی۔

اور کہاں جانا چاہتی ہو۔

جہاں خدا لے جائے۔

خدا کو کیا غرض کہ میرے تمہارے درمیان حائل ہو؟

شاعری کا بحران کیوں ہونے لگا؟ مت پڑھا کرو بات بے بات شعر۔ مجھے یہ کلموئی شاعری سے چڑ ہو گئی ہے۔ قرآن میں جبھی تو شاعروں کو گمراہ بتایا گیا ہے۔ مولانا حالی ان مٹے شاعروں سے تنگ آکے یہی فرماتے ہیں کہ ؎

گنہگار تو بخشے جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

شاعری کا بحران متعدی ہوتا ہے دیکھو تم بھی اس میں مبتلا نظر آتی ہو۔

مجھ سے ستر پہرے دور۔ نوج میں شاعر بنوں۔ تمھیں کو یہ بیماری مبارک ہو۔

آخر تم ایک شاعر کی بیوی تو ہو۔ کہہ دو نہیں ہوں۔

ہاں ہاں میں کسی شاعر وائر کی بیوی نہیں۔ شاعر بھی کوئی آدمی ہوتا ہے۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم شاعر ہیں اور نکاح کے رجسٹر میں لکھا ہے کہ تم ہماری بیوی ہو۔ اور شاعر تمہارے خیال میں آدمی نہیں ہوا کرتا تو نتیجہ یہ نکلا کہ تم کسی آدمی کی بیوی نہیں ہو۔

میں کسی کی بھی بیوی نہیں۔ مت کہا کرو مجھے بیوی۔

تمھارا خدا بھلا کرے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ نان نفقہ، مہر و ہر یہ سب آئے گئے ہوئے۔

اب ہم ہیں اور ہماری تنخواہ۔ اپنی بھوک کھانا اور اپنی نیند سونا۔ یہی تو ہم چاہتے تھے۔

جی ——— کیوں نہیں چاہتے تھے۔ بس ایک تم۔ ایک تمھارا جاپا۔ باقی جھوٹا کل سنسار" میں اور میری تنخواہ" کیا کہنے تمھارے اور تمھاری تنخواہ کے۔ تنخواہ تمھاری کہاں سے آئی۔ میاں ۲۵ رپلی پاتے تھے۔ میرا آنا ایسا سبھتا ور ہوا کہ اب ڈیڑھ سو مل رہے ہیں۔ بس اپنے پچیس نکال کے باقی سوا سو سیدھی طرح میرے میکے بھیج دیا کرو۔ رہا میرا سوا لاکھ روپے کا مہر، اس کی جلد فکر کرو۔ رہے تمھارے بچے انھیں سنبھالو۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ باوڑا ایکسپریس کل صبح مجھے میرے گھر پہنچا دے گی۔ پھر بیٹھے شاعری بھگارتے رہنا۔

بچے ہم سنبھالیں؟ یہ کیوں؟ تمھیں ان سے کچھ واسطہ نہیں؟

کیا خدا نہ کرے میں انھیں جہیز میں لے کر آئی تھی؟

تو کیا ہم شادی کے جوڑے کے ساتھ لے کے گئے تھے؟

مجھے نہیں معلوم لے کے گئے تھے یا نہیں۔ مجھ سے مت بولو۔ جبھی تو نانی اماں کہا کرتی ہیں کہ یہ مردوے نگوڑے نہ ہوتے تو دنیا بہشت نظر آتی، انھیں ہستیوں نے اسے جہنم بنا دیا۔

اللہ بخشے ہمارے دادا میاں بھی فرمایا کرتے تھے کہ عورت آدمی کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی لیے اس کا دماغ ٹیڑھا۔ مزاج ٹیڑھا۔ فطرت ٹیڑھی، یہ خود ٹیڑھی ہے۔ اس کا ٹیڑھا پن کسی صورت نہیں جا سکتا۔ یہ جب سے دنیا میں آئی ہے جینے والوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ بس اس کے ٹیڑھے پن کا ایک ہی علاج ہے۔

کیا ہے وہ علاج؟ میں بھی تو سنوں! دیکھوں تو وہ تمھارے بہشتی بزرگ عورت کے ٹیڑھے پن کا کیا علاج بتا گئے ہیں۔

یہ پھر بتائیں گے۔ دو بج چکے ہیں۔ چوکیدار بول رہے ہیں۔ سونے بھی دو گی یا نہیں۔ اس مشاعرے کو پھر کے لیے اٹھا رکھو۔!

قرض و مقروض

سلطان حیدر جوشؔ

ضرورت کے وقت ایک حاجت مند کو نقد یا جنس جو کچھ بوعدۂ واپسی کچھ مدت کے لیے دیا جائے قرض کہا جاتا ہے! قرض کی دو قسمیں ہیں۔ داد و ستد کے نقطۂ نظر سے، اور کاروباری اصول پر جو کچھ دیا جائے قرض ہے۔ لیکن امداد کے خیال سے اور محبت کے اصول پر، جو کچھ دیا جائے مقراض ہے!

اگر آپ کسی دوست کو قرض دیتے ہیں تو دوہرا خطرہ پیدا کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ روپیہ کھو دینے کا خطرہ اور دوست کھو دینے کا خطرہ! ننانوے فی صدی دونوں ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم"۔ نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے!

اگر آپ دوست پہ تقاضہ نہ کریں جب وہ آپ کے سامنے آتے ہوئے شرمائے گا! اور اگر کریں تو گویا ہمیشہ کے لیے اسے کھو دیا۔ تقاضے کا نام آتے ہی وہ چراغ پا ہو جائے گا! ایک دوست کی امداد آپ شوق سے کریں مگر اسی قدر رقم کے ساتھ اسے ممنون بنائیں جس کے ضائع ہو جانے کا آپ کو بھی احساس نہ ہو۔ آپ دوست کی مدد کر سکتے ہیں مگر بقصد قرض نہ دیجیے۔ آپ کی زبان پر اس رقم کا نام نہ آیا کہ اس کو صدمہ ہوا۔ قرض لینے والے اکثر رقیق القلب ہوا کرتے ہیں، آپ گویا اسے قرض دے کر کشمکش میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اسے اپنی نگاہ میں ذلیل کر دیتے ہیں، اور وہ فطرتاً اس کو محسوس کرتا ہے۔ اگر آپ تقاضائے شدید کو کام میں لائیں گے تو یقین رکھیے آپ اس کی ہتک عزت کریں گے!!

ایک دوست قرض لے کر آپ کا ممنون منت ہو سکتا ہے مگر محض اس شرط پر کہ آپ اسکی واپسی کا نام بھی زبان پہ نہ لائیں! اگر آپ وہ رقم کسی طرح واپس پا لیتے ہیں تو اس کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ آپ نے کوئی احسان کیا تھا۔ وہ اس کو احسان سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ جو کوئی دوست کو قرض دے کر ادائی کی امید رکھتا ہے ایک ایسی حماقت کرتا ہے جس کو کوئی منطق فعل مناسب ثابت نہیں کر سکتی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک قرض دار دوست اگر کبھی شاذ و نادر، دوست کی رقم جو اس نے عین احتیاج میں قرض دی تھی واپس کرتا ہے تو اس بات کا متمنی ہوتا ہے کہ قرض دینے والا دوست اس ادائگی پر خاص طور سے اس کا ممنون ہو۔ فی الحقیقت دوست کو قرض دینا قرض نہیں ہے! مقراض ہے!

قرض صرف وہی ہے جو بازاری اصول پر دیا جائے! داد و ستد کی تجارت اسی وقت بار آور ہوتی ہے جب قرض ۵ ۷ سے .. فی صدی تک شرح پر دیا جائے۔ اور ضمانت میں رقم قرض سے پندرہ گنی مالیت آڑ میں رکھ لی جائے۔ اس اصول پر کاربند ہونے والے زندہ رہتے ہیں، تو ہر قسم کی عزت اور خطابات پاتے ہیں اور مرتے ہیں تو اپنے بچوں کے منہ میں سونے کا چمچہ دے جاتے ہیں۔

اس اصول کے خلاف عامل ہونے والے زندگی بھر فاقے کرتے ہیں اور مرتے وقت ان کے گور و کفن کے لیے چندے کی ضرورت ہوتی ہے۔

عام طور پر قرض لینے والے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو قرض لے کر ادا کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ اور ایک وہ جو کیسے ہی اچھے ارادے رکھتے ہوں۔ ادا نہیں کر سکتے۔ مختصر یہ کہ ایک ادا نہیں کرتے۔ اور ایک ادا نہیں کر سکتے۔ غضب یہ ہے کہ تمام قرض لینے والے رقیق القلب اور زود رنج ہوتے ہیں۔ کسی کے دل دکھنے سے قہر الٰہی کا احتمال علیحدہ رہا۔

تیسری قسم قرض لینے والوں کی ایک اور بھی بتائی جاتی ہے۔ یہ حضرات قرض لینے کو ایک نہایت معزز و آرام دہ پیشہ سمجھتے ہیں۔ معزز تو اس وجہ سے کہ بڑے بڑے مہاجن قرض دینے کے وقت "نواب صاحب" سے خطاب کرتے ہیں اور آرام دہ اس وجہ سے کہ لفضلہ نہ کسی کی سفارش کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ کسی خدمت کی ذلت گوارا کرنی پڑتی ہے۔ دلال اگر زندہ ہیں تو ہر طرح کا آرام گھر بیٹھے نصیب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگ روز رات کو "خدا دے کھانے کو بلا سے کمانے کو" ورد کے طور پر پڑھا کرتے ہیں!

قرض لینے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب انسان اپنی حاجتوں کو اپنے مال یا اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ کسی کا حاجت مند ہونا قدرت کی وجہ سے ہے۔ جس کو خدا حاجت مند بنانا، یا رکھنا چاہتا ہے اس کی امداد کرنا یعنی اس کو حاجت مند نہ رہنے دینے کی کوشش کرنا۔ ایک فعل عبث ہے اور ایک حد تک مشیئت ایزدی سے لڑنا ہے۔ گویا حاجت مند کو ہمدردی کے نقطہ نگاہ سے یا امداد کے طور پر قرض دینا سوشل گناہ ہے تو مذہبی گناہ بھی ہے۔ البتہ کاروباری اصول پر المضاعف ہو جانے والے سود کے ساتھ قرض دینا منشائے قدرت کے موافق ہے۔ کیونکہ اس طرح جس تباہی میں قدرت اسے رکھنا چاہتی ہے وہ جلد سے جلد آ جائے گی۔ اب منشائے عالم اسباب کے موافق کار بند ہونا چاہتے ہیں یا خلاف؟ غالباً حماقت کو آپ حماقت ہی سمجھتے ہوں گے۔

ایک مہاجن کے قرض دینے کا رنگ مجھے عرصہ ہوا کہ نہایت پسند آیا تھا، وہ رؤسا اور متمول حضرات کو ۵۰ فیصدی سود پر قرض دیتا تھا اور ہر مرتبہ قرض دینے کے وقت اپنے پہلے قرضے کا حساب بے باق کر لیتا تھا مثلاً اس نے ایک نواب صاحب کو دس ہزار قرض دئیے تھے۔ دوبارہ انہیں نواب صاحب کو قرض دیتے وقت اپنے گذشتہ قرضہ مع سود یعنی ۱۵ ہزار روپیہ وصول لے کر پانچ ہزار نقد اور دئیے اور بیس ہزار کا تمسک اسی شرح پر لکھوا لیا۔ دو تین دفعہ کے تبادلہ میں بیس، بچیس ہزار کی رقم نہایت خوش معاملگی کے ساتھ سوچتے سوچتے ایک لاکھ بن جاتی ہے قرض دینے کا یہ طریقہ بہترین طریقہ ہے اور تاریخ بھی ایسے قرضے کا وجود ثابت کرتی ہے۔ ٹرکی کو مدت دراز سے یورپ اسی اصول پر قرض دیتا چلا آیا ہے۔ نتیجہ اگر آپ کو معلوم نہ ہو تو کسی مصری صاحب فہم سے دریافت کر لیجئے۔ ہمیں بھی بتلانے میں کوئی حجت نہیں بشرطیکہ سنسر صاحب مدفیوضہ اجازت دیدیں۔

مختصر یہ کہ قرض اگر تقاضائے فطرت کا لحاظ رکھ کر دیا جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کاروبار کے اصول پر دیا جائے تو اس کو قرض کہا جائے گا۔ ورنہ اللہ کچھ! اور کچھ میں مقراض محبت بھی شامل ہے اور حماقت محض بھی۔

اس میں شک نہیں کہ کسی دوست سے اگر نہایت تہذیب کے ساتھ سلسلۂ ارتباط قطع کرنا ہو تو بہترین ترکیب یہ ہے کہ اس کو کچھ رقم قرض دے دی جائے۔ القرض مقراض المحبت، میں نہ اگلے زمانے والوں کو شبہ تھا اور نہ موجودہ زمانہ والوں کو ہے۔

مالدار کو قرض دینا اور ۵۰ فیصدی سود کی شرح پر ذکاوت و ذہانت ہے۔ مفلس کو قرض دینا ابلہی و حماقت ہے اور دوست کو قرض دینا مقراض محبت ہے!!

اجتہاد و تحقیق

سجّاد انصاری

جہلا کی گمراہیاں ایک طرف، ان کے کسی انداز پر تبصرہ کرنا ہی حماقت ہے۔ قابلِ غور تو اس طبقہ کی زندگی ہے جس نے ادعائے علم و فن کی بدمستیوں میں حسن و قبح کا بھی ہوش کھو دیا۔ دنیا کا خیال ہے کہ اربابِ علم کی بے راہ روی عبرت انگیز ہوتی ہے۔ میں اس سے متفق نہیں۔ اربابِ بصیرت کبھی ممنونِ عبرت نہیں ہوتے۔ ان کا مقدس ترین فرض یہ ہے کہ جس واقعہ کو عوام عبرت آموز قرار دیں، وہ اسی کو ایک بے نیاز قہقہہ میں گم کر دیا کریں۔ حاملانِ علم و فن کی گمراہیوں سے عبرت نہیں تفریح حاصل کرنا چاہیئے۔ ان کی زندگی کی ہر لغزش مضحکہ خیز ہوتی ہے لیکن اس تماشے سے صحیح معنوں میں مسرور ہونے کے لیے مخصوص دل و دماغ چاہئیں۔ بے وقوف کبھی صحیح طور پر ہنس نہیں سکتا۔ دنیا کی تضحیک صرف وہ بلند نظر انسان کر سکتا ہے جو عالی حوصلگی اور عالی ظرفی کے ساتھ دنیا کے حقائق سے بھی آشنا ہو۔ حقیقت آشنا صرف وہ نظر ہے جو ایک بے نیاز تبسم کے ساتھ کائنات کے ہر واقعے کو ٹھکرا دے۔ چشمِ گریاں اور نگاہ عبرت اندوز، دل و دماغ کی محرومیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

میرا مفہوم یہ ہے کہ میں مدعیانِ تحقیق کی لغزشوں پر اس لیے تبصرہ نہیں کر رہا ہوں کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ میں ایسا تنگ نظر نہیں کہ لوگوں کو تلقینِ عبرت کروں۔ مجھے صرف ان واقعات کی طرف اشارہ کرنا ہے جنھوں نے کائناتِ عالم کو اس حد تک مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ اگر کسی میں یہ صلاحیت نہیں کہ ان اشارات پر متبسم ہو سکے۔ اسے چاہیئے کہ مصروفِ ماتم ہو جائے۔ دنیا پر نہیں خود اپنی بدنصیبیوں پر کہ فطرت نے اسے ذوقِ تبسم سے محروم رکھا۔ میرا مخاطب وہ کج نظر اور کم فہم نہیں جو دنیا کے ہر واقعہ پر رونا چاہتا ہے۔ اگر کسی کو ماتم کرنا ہے اس کے لیے ہزاروں مشاغل ہیں، اور ہزاروں مرحلے جوانِ صالح، زاہدِ خشک، احسن پارسا فریبِ تصوف، غرض کہ اس طرح کے تماشے عبرت انگیز بھی ہیں اور لائقِ ماتم بھی۔ لیکن ایک صحیح انسان ان پر ہنستا ہے۔ البتہ حشر و نشر کے مراحل پر ان بدتوفیقوں کو ضرور ماتم کرنا چاہیئے۔ جنھوں نے اپنے ہاتھوں اپنی دنیا کو خدا کے لیے نہیں، بلکہ محض اس لیے غیر دلچسپ بنا دیا ہے کہ عقبیٰ میں تمام مسرتیں دنیاوی اذیتوں کی جزا میں مل جائیں گی۔ ان کی دنیا اور عقبیٰ دونوں عبرت خیز اور ماتم انگیز ہیں۔

یہ بے بسی اس کے لیے باعثِ شرم ہو جاتی ہے۔ اسے مجبوراً کسی نہ کسی طرف اپنے قوائے فکر کو متوجہ کرنا پڑتا ہے۔ اس غرض سے کہ دنیا پر اس کی جہالت اور بے چارگی کا راز افشا نہ ہو، وہ لا محالہ عالمِ نامعلوم کے رموز کو ذاتی طور پر ممنونِ تحقیق کرتا ہے نتائج معلوم ژولیدہ بیانی، کج فہمی، بے راہ روی، نادانیاں، حماقتیں، جہلِ مرکب، نہ منزل کا پتہ، نہ جادۂ منزل کا ہوش، دماغ کے سامنے کوئی

راستہ نہیں، دل میں کوئی آرزو نہیں، الفاظ کا نہ کوئی مقصد ہے نہ مفہوم ان تمام عقدہ ہائے لاینحل اور افکار لایعنی کا نام فلسفہ رکھا گیا ہے۔ ہیگل اور کینٹ کے ایسے معما پسند ہرزہ سرا پیدا ہو گئے۔ انسان جو کچھ سمجھنا چاہتا تھا وہ ہمیشہ کے لیے بھول گیا۔ اس کے سامنے وہ مراحل آگئے جن کو اگر اربابِ قضا و قدر بھی حل کرنا چاہیں تو کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انسان نے اپنے ادعائے تحقیق میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق وہ نکات پیدا کر دئیے جن کو در اصل مذہب و خدا سے کوئی تعلق نہیں ۔

لیکن فلسفہ نازاں ہے کہ معمائے کائنات حل ہو گیا، اور اربابِ علم و فن متکبر کہ ان کی عقدہ کشائی نے دنیا کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے۔ خدا نے ہزاروں پیامبر بھیجے۔ مگر اربابِ تحقیق نے بلا تامل ان کی تکذیب کر دی۔ انہوں نے یہ امتیاز قائم کر دیا کہ پیامبر جہلا کی تشفی کے لیے ہیں اور حاملانِ علم و اجتہاد اربابِ نظر کے لیے جہل مرکب رقص کرنے لگا۔ انسان نے اربابِ حل و عقد کو شکست دے دی اور یہی نہیں نظامِ عالم اور حیاتِ انسانی کی لطافتیں بھی ہمیشہ کے لیے برباد کر دی گئیں۔ دنیا کی دل آویزی، اس کے رموز میں مضمر ہے۔ نظامِ کائنات صرف اس لیے دلفریب ہے کہ وہ ایک طلسم ہے جس کی حقیقتیں افشا نہیں کی جا سکتیں۔ انسان حقائقِ کائنات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جس وقت کائنات کے رموز منکشف ہوں گے۔ شیرازۂ عالم بکھر جائے گا۔ قیامت اسی وقت آئے گی جب انسان پر اس کی انسانیت کا راز افشا ہو جائے گا۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے، تاہم مضطرب اور بد خود غلط انسان طلسم کائنات کو توڑنا چاہتا ہے۔ اسے اس سے بھی تشفی نہیں ہوئی کہ وہ ایک ہیولائے مقدس ہے جس کا خاکہ بہشت کی فضائے لطیف میں تیار کیا گیا تھا۔ حیاتِ انسانی کی رنگینیاں اسے مسرور نہیں کر سکتیں۔ مشرق روحانی فضا سے مانوس ہے۔ اس کا فلسفہ اگر کسی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اسی عالم تقدس کی طرف جس کی رنگینیوں کے پرتو سے یہ دنیا معمور ہے۔ ایک گروہ نے اسے حسنِ مطلق کا محض ایک پرتو قرار دیا۔ دوسرے نے اس کو اور اس کے خدا دونوں کو معناً متحد کرنا چاہا! لیکن مغرب! وہ کبھی اڑنے کا عادی نہیں۔ اس لیے اس کا فلسفہ بھی اسفل کی طرف آتا ہے ۔

ڈارون مع اپنی استخوان پرستیوں کے عرصۂ علم و فن میں نمودار ہو گیا، اور کائناتِ انسانی دفعتاً ہی ازلی رنگینیوں سے محروم ہو گئی۔ مجھے حیرت تو مغرب کی رکاکت، مذاق اور کثافتِ تخیل پر ہے۔ انہیں انبساط و مسرت اس تصور سے نہ ہوئی کہ ان کے اجسام خاکی پرورش فردوس بریں کی اس فضا نے کی ہے جس کی دلفریبیاں آج بھی انسان کو حریص و طامع بنائے ہوئے ہیں۔ دنیا باوجود اپنی تمام بہشت آفرینیوں کے اس فضا کے ایک ذرہ کی بھی وقعت نہیں رکھتی۔ مغربی دل و دماغ کو اگر تسکین ہوتی ہے تو اس نتیجہ سے کہ انسان حقیقتاً ہیولائے ارتقائی ہے۔ جس کی پرورش کنارِ فردوس میں نہیں بلکہ آغوشِ میمونی میں ہوئی تھی۔ حقیقتِ انسانی اسے مضطرب کر رہی تھی۔ حقیقتِ میمونی نے اسے مطمئن کر دیا۔ اس سے بحث نہیں کہ واقعتاً نظریۂ ارتقاء صحیح ہے یا غلط۔ تخیلات اور توہمات کبھی صحیح یا غلط نہیں ہوا کرتے ۔ ان کے لیے صرف لطافت و کثافت کا امتیاز ممکن ہے۔ اس حیثیت سے مغربی تحقیق و اجتہاد کی حقیقت تمسخر انگیز ہے۔ ان کے لیے یہ تصورِ لطیف نہ تھا کہ انسان عالم لاہوتی کا ایک کرشمہ ہے۔ وہ صرف اسی حقیقت سے مسرور و مطمئن ہیں کہ اس کی حقیقتیں میمونیت میں مضمر ہیں۔

اگر کسی حکیم نے خدا اور اس کے مظاہر کو بھی ممنون احسان کرنا چاہا، اسی تحقیق کو خضرِ راہ قرار دیا جس کے ذریعے ہر دنیاوی مسئلے پر رد و قدح کی جاتی ہے۔ ڈیکارٹ اور برکلے حقیقتِ خداوندی کی طرف متوجہ بھی ہوئے تو اسی جہل مرکب کے ساتھ۔ یقین کی جگہ پر علم طمانیت قلب محال ہو گئی۔ دماغی اطمینان معیارِ حقیقت ٹھہرا۔ یہاں بھی ہرزہ سرائیوں کا وہی انداز ہے جو دوسرے حکماء کے انکار و الحاد کے

مباحث میں قائم ہے۔ لطف و انبساط، سکون و مسرت یقین و الیمنان فنا ہو گئے۔

مغرب کی گمراہیاں لازمی تھیں۔ ان کے پیغمبر کی تعلیم و تلقین موجودہ تمدن کی وسعتوں کی کفالت نہیں کر سکتی۔ نہ ان سے ہر وعظ و پند کی مستقل ترکیب تھی جس کی رہنمائی سے وہ گمراہیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ انجیل اپنے حقائق سے معرا ہو چکی تھی۔ اقوال و افعال، نقل و حرکت کی کوئی یادگار نہ تھی۔ ان کے لیے سوائے ان کی ذاتی کاوشوں کے سکون و اطمینان کی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن مشرق اور بالخصوص عالم اسلامی . . . .

معترضہ جملے

میاں عبدالعزیز

۱۵ جولائی

وہ خدائے قدیر جس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہلتا مگر بجلی کا پنکھا چلتا ہے (لاحول ولا) کیا ایجاد کا کلمہ میرے قلم سے نکلا اصل بات یہ ہے کہ جب ساتھ والی اونچی کوٹھی کی خس کی ٹیٹوں کا وہاں کی مقطر دو آتشہ میں مُبرف سوڈے کا، صبح شام کی چہل پہل اور روزانہ "غالب شاہی" عید کا خیال آتا ہے تو جی جل جاتا ہے اور سوچتا ہوں کہ کیا میرے ہی گھر پہ اللہ میاں کا زور چلتا ہے کہ پہر دن گزر جائیں اور پتا نہ ہلے۔ بچے ہیں کہ گرمی دانوں سے بلبلا رہے ہیں۔ بیوی چولھا پھونکتے پھونکتے ڈارون کی تھیوری کا زندہ ثبوت بن گئی ہے۔ خود پسینے میں ڈوبا جاتا ہوں مگر اللہ صاحب کی کلکٹری میں غریب کی شنوائی نہیں، خیر نئے سرے سے مضمون شروع کرتا ہوں۔

وہ رازقِ ازلی جس کے ادنیٰ اشارے سے سمندر کی تہ میں پتھر کے کیڑے کو مقررہ قوت لایموت برابر ملتی ہے اور جس کی مرضی سے چیونٹیاں میری کھانڈ اور چوہے میری روٹی کا سرقہ کرتے ہیں (استغفر اللہ، پھر وہی بات۔ ذات باری اور چوروں کی اعانت۔ اصل بات یہ ہے کہ کل جو اس کوٹھی میں جا نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاء کی میز سے تین چار قد دار کیک کے ٹکڑے وہاں کے کتوں کی نظر ہوئے اور خانساماں نے مکھن لگے ہوئے ٹوسٹ مہتر کو معمولی دریادلی سے دے دے کہ حیران ہوا کہ اس جگہ چیونٹیوں اور چوہوں کی الٰہی فوج کیوں حملہ آور نہیں ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آگیا کہ فرش پکے ہیں۔ اللہ صاحب کی سفر مینا پلٹن کی انجینئری ان کے آگے عاجز ہے۔ مگر یہ عقدہ پھر بھی حل نہ ہوا کہ کوٹھی میں تو صرف مہتر کا درجہ کتوں سے ذرا کم رہا۔ مگر میرے گھر میں چوہے پہلے اور میں پیچھے! خیر اس الجھن سے کیا فائدہ! مضمون پھر شروع کرتا ہوں)

وہ حافظِ حقیقی جس کو آسمانوں کی منور کتاب ازبر ہے۔ مگر جسے بنیے کی بہی کے اندھیر کا کچھ پتہ نہیں (معاذ اللہ، پھر وہی دہریہ پن) اصل بات یہ ہے کہ یہ اونچی کوٹھی ایک مشہور بہی کا ایک ورق ہے۔ کسی زمانے میں ایک نواب صاحب نے پانسو کا رقعہ لکھا تھا، وہ کسی وجہ سے پانچ ہزار درج ہوا۔ اور پھر بڑھتے بڑھتے یہ کوٹھی اور ایک گاؤں ہضم کر گیا۔ اللہ صاحب کی بہی میں کچھ اس قسم کی ڈگریاں ہوتی ہیں۔ مگر مجھے اس سے کیا؟ میں تو ایک چشم پارسا کی فرمائش کی تعمیل میں مضمون لکھنے بیٹھا تھا۔ انھوں نے چلتے چلتے خیال ظاہر کیا کہ مسلمان خواتین کے ایک بہترین نمونہ کا نقشہ باندھا جائے۔ کہاں ایک بہترین مسلم بیوی کا حسنِ کامل کہاں یہ میرا بے ساختہ نیم پخت کفر! پھر شروع کرتا ہوں۔

وہ مسبب الاسباب جس نے اپنی حکمتِ کاملہ سے مگر مچھوں کی خاطر سمندروں کو بے شمار کمزور و ناتواں مچھلیوں سے بھر دیا ہے جس کے لازوال خزانوں میں سے ہر بلی کو کبھی نہ کبھی کبوتر اور ہر سانپ کو کہیں نہ کہیں مینڈک میسر ہو جاتا ہے، مگر جس کے ہاں میرے لیے صرف مکھیوں اور مچھروں کی پلٹنیں ہیں اور وہ بھی میرے کھانے کے لیے نہیں بلکہ مجھے کھانے کے لیے ...... (پھر وہی دریدہ دہنی!) اصل بات یہ ہے کہ جب ہر شام کو فرمانبردار ملازم اس اونچی کوٹھی کے وسیع صحن میں شب نیموں اور مسہریوں کی قطار کھڑی کرتے ہیں اور پائنتی کی طرف بجلی کے پنکھوں کی لین لگاتے ہیں تو میں حسرت سے کہتا ہوں کہ اللہ اللہ وہاں مچھر بھوکے مریں گے۔ مگر میرا خون آکر چوس لیں گے۔ مگر یہ تو روز ہی ہوتا ہے۔ مجھے جلدی سے اپنا مضمون شروع کرنا چاہیئے)

وہ احکم الحاکمین جس نے صاحب ضلع کے اوپر لاٹ اور لاٹ کے اوپر بادشاہ اور بادشاہ کے اوپر اپنے آپ کو اور اپنے اوپر ہمارے پٹواری کو حکمران مقرر کیا ہے۔ (لعنت بکار شیطان! پھر وہی بے تکا پن!) اصل بات یہ ہے کہ اونچی کوٹھی والے مجھ سے ساتھ والی دو گز زمین قیمتاً مانگتے تھے اور قیمت بھی اچھی دیتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔ جب خرید کے متعلق وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تو انھوں نے پٹواری کے ذریعہ سے حد برآری کرا کے وہ زمین اپنے احاطہ میں مفت شامل کرا دی۔ فنانشل تک مقدمہ کیا۔ اجمیر شریف سے خاک لا کر اس زمین پر بچھائی۔ داتا گنج بخش سے پانی لا کر چھڑکا۔ ختم قرآن اس موقعہ پر کرایا۔ مگر نہ فنانشل نہ ولی نہ کلام پاک غرضیکہ کوئی بھی اس پٹواری کے "کن فیکون" کے آگے دم نہ مار سکا۔ مگر یہ سب کچھ تو ہو چکا، مجھے مضمون شروع کرنا چاہیئے)۔

حمیدہ:۔ ابا! آداب، آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

میں:۔ کچھ نہیں!

حمیدہ:۔ میں دیکھوں؟

(بغیر میری اجازت کے حمیدہ پڑھنا شروع کر دیتی ہے اور جوں جوں پڑھتی جاتی ہے ناک بھوں چڑھاتی جاتی ہے)

حمیدہ:۔ (ختم کر کے) ابا آپ کا خط روز بروز بدتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں تو اس قدر آپ کہتے ہیں، خود کیوں صاف نہیں لکھتے؟ اور یہ مضمون تو کچھ اچھا نہیں۔

میں:۔ اچھا کہ بُرا، تم اب جاؤ مجھے لکھنے دو۔

حمیدہ:۔ اچھے ابا! خفا نہ ہو جیے، یہ بتائیے کہ وہ کون بیوی ہیں جنھوں نے بہترین مسلمان خاتون کا تذکرہ آپ سے طلب کیا؟

میں:۔ حمیدہ وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے کام کرنے دو۔

حمیدہ:۔ (یہ میری وہ ۱۶ سالہ نعمت ہے جس کا عشرِ عشیر بھی اس اونچی کوٹھی کو میسر نہیں اور جس کے ہوتے باوجود غربت کے یہ دنیا میرے لیے ہزاروں جنتوں سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ حمیدہ کی شرارت کے مقابلے میں جنت کی ثقاہت لاکھ دفعہ قربان ہے) بھلا آپ اور مجھ سے غصہ! بتائیے وہ بیوی کون ہیں؟

میں:۔ کیوں پوچھتی ہو؟

حمیدہ:۔ ضرور کوئی مولوی کی بیوی ہوں گی، کیونکہ آج کل ذرا ان کا زور ہے؟

میں:۔ یہ تو بڑی بودی دلیل ہے۔ کیا کوئی آزاد منش بیوی یہ خیال نہیں کر سکتی کہ معلوم تو کریں کہ مردوں کی نظر میں بہترین مسلم بیوی کے خیالات کیا ہونے چاہئیں؟

حمیدہ:۔ یہ اچھی رہی! خیالات پر کسی کا کیا بس ہے۔ سوال تو عادات کا ہے، اور میں سمجھتی ہوں کہ جس بیوی کو آزادی کی ہوا چھو بھی گئی ہے وہ یقیناً جانتی ہے کہ جو بیوی دل سے مسلم ہو وہی بہترین ہے، اس لیے وہ کبھی ایسا سوال نہ کرے گی، وہ خود سوچ لے گی کہ مختلف بہترین ہستیوں میں اتنا فرق ضرور ہوگا کہ مختلف حالات میں ان کا باطنی حسن الگ الگ صورتوں میں ظاہر ہوگا۔ اماں ہی بہترین مسلم بیوی کا اچھا خاصہ نمونہ ہیں۔ میں نے کسی پارٹی میں کسی بیوی کے چہرہ پر وہ اطمینان اور مسرت کی جھلک نہیں دیکھی جو اماں کے چہرے پر اس وقت ہوتی ہے۔ جب وہ رشیدہ کا منہ دھلواتے وقت خود کلمہ پڑھتی ہیں اور رشیدہ تتلا تتلا کر "محمد رسول اللہ" کہتی ہے۔ اس قدر بشاشت تو کسی انگریزی مس کے چہرے پر بھی دیکھنے میں نہیں آتی۔ تب بھی نہیں دیکھی جب مس بلینک ہارتے ہارتے ٹینس کا سٹ جیت گئیں۔

میں:۔ کسی ایک وقت بشاش ہونے سے انسان بہترین انسان تھوڑا ہی بن سکتا ہے۔

حمیدہ:۔ ابا آپ تو غضب کرتے ہیں۔ تو کیا انسان محلوں میں رہنے سے بہترین انسان بن جاتا ہے؟ یہ تو دل کی بات ہے۔ میرے خیال میں تو جو شخص، چاہے اس کے حالات کیسے ہی ہوں، اپنی طرف سے پوری کوشش کرے کہ وہ مفید ثابت ہو۔ (نتیجہ چاہے اس کے موافق ہو کہ مخالف) وہ بہترین انسان ہے۔

میں:۔ کہتی تو ٹھیک ہو۔

حمیدہ:۔ آپ تو ہمیشہ کہتے ہیں کہ میں بے عقل ہوں۔

میں:۔ کب؟ کب؟؟

حمیدہ:۔ نہیں کبھی نہیں۔ یونہی آپ سے اپنی تعریف سننے کو جی چاہتا تھا۔ لیجیے اب جاتی ہوں۔ ننھے کو روٹی کھلا دوں۔

حمیدہ گئی تو میں نے اس کی اور اپنی اوپدالی گفتگو قلم بند کر لی۔ جس قدر غور کرتا ہوں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بہترین زندگی کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ مفید ہونے کی پوری کوشش کی جائے۔ مگر مانے گا کون؟ حمیدہ کی فطرتی راستی کی روشنی نے کس آسانی سے اور کس صفائی سے میرے پراگندہ تخیل کی تاریکی کو دور کیا ہے۔ مگر چڑیل نے مضمون برباد کر دیا۔ میرے پیشِ نظر وہ خارجی اسباب تھے جن سے انسان ہم چشموں کی نگاہوں میں ممتاز نظر آتا ہے۔ اس گڑیا نے ایک ذرا سے جملے سے یعنی یہ کہ دل کی بات ہے، اسے مسئلۂ نفسیات کر دیا۔ پھر شروع کرتا ہوں۔

وہ نورانی موتیوں کا ہار جس کا نام زندگی ہے اور جس کے پرکھنے والے جوہری، خدا اب ایشیا میں پیدا نہیں کرتا۔ کیونکہ یہاں کے

لوگوں کو مرنے اور مرنے کے قصّوں سے نہ فرصت ہوگی نہ وہ زندگی کا خیال کریں گے (خدا کو چھوڑ کر اب ایشیا کا پیچھا میں نے کیا۔ مجھے کچھ ہو تو نہیں گیا؟ اصل بات یہ ہے کہ ایک لامتناہی تواتر سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہاں سوائے اس کے اور کچھ کام ہی نہیں کہ فلاں جگہ بچہ ہوا عقیقے کی دعوت ہے، دوسری جگہ شادی کے متعلق ولیمہ کی دعوت ہے اور تیسری جگہ مرگ کے متعلق چالیسویں کی دعوت ہے۔ پیدائش بیاہ، موت اور ساتھ ساتھ روگ سوگ کچھ ایسا تانتا بندھا ہے کہ کسی کو اور کسی کام کے لیے فرصت ہی نہیں مگر مجھے اس سے کیا؟ میں تھوڑا ہی اس سفید کالے کمبل کا جلاہا ہوں کہ خواہ مخواہ شرماؤں، پھر شروع کرتا ہوں)

وہ خاتمِ سلیمانی جس کا نام کامیابی ہے اور جو سلطان صلاح الدین کے بعد مسلمانوں سے گم ہوئی اور سمندر میں سے یورپین اقوام کے ہاتھ ایسی آئی کہ اب کبھی نہ نکلے گی۔ دہشت۔ یہ میں کیا لکھ گیا؟ میں کہاں کا ولی ہوں کہ پیشن گوئی کروں، اور جو مجھے پیشین گوئی ہی کرنی تھی تو اشتہار کے ذریعے کرتا کہ زید بکر سے پہلے مرے گا یا عمر کے ہاں لڑکا ہوگا، یا زلزلہ آئے گا یا طاعون پھیلے گا۔ جب میری کامیابی سے صورت آشنائی تک بھی نہیں تو اس کے متعلق اس قدر وثوق کس قدر لغو ہے؟ اور کیا پتہ ہے کہ کامیابی یورپ سے امریکہ ہوتے ہوئے جاپان جا نکلے اور پھر وہاں سے چین کا چکر لگاتی ہوئی واپس لوٹ جائے؟ اصل بات یہ ہے کہ کبھی بھی تو اخبار میں نہیں پڑھا کہ میرے نام دس لاکھ کی لاٹری نکلی ہے۔ جب دیکھو یہی ہوتا ہے کہ مسٹر ڈیم فول کو دس ہزار پونڈ آئے۔ مس گلاب کے پھول کو بیس ہزار پونڈ دستیاب ہوئے۔ مسٹر گرگ کو اس کے چچا دس لاکھ پونڈ چھوڑ گئے۔ بوڑھیا مس بھیڑا اپنے کتے کے لیے ہزار پونڈ چھوڑ گئیں۔ مسٹر تیتھر انداز نے دو کروڑ ہسپتال کی نذر کیے۔ کاش میں ہسپتال ہی ہوتا!!

بیگم:۔ اوہو! آپ تو مضمون نگاری کی دھن میں ہیں! دیکھوں کیا لکھا ہے؟ (بغیر اجازت پڑھنا شروع کر دیتی ہیں اور ہکلاتی جاتی ہیں)

میں:۔ کیوں کیا رائے ہے؟

بیگم:۔ یہ تو میں نہیں کہتی کہ محض لفاظی ہے، زندگی کے دو پہلوؤں کی اچھی تصویر ہے مگر حمیدہ والی تعریف جس کے آپ اس قدر مدّاح معلوم ہوتے ہیں وہ تو غلط ہے۔

میں:۔ (عالمانہ غرور کے ساتھ) ہرگز نہیں۔ ایسی صحیح تعریف تو کبھی سننے میں نہیں آئی۔ شاید کسی وقت گفتگو میں میں نے وہ فقرہ استعمال کیا ہوگا اور حمیدہ کو یاد رہ گیا۔ میری مینا کا حافظہ بہت اچھا ہے۔

بیگم:۔ آپ کا فقرہ ہو کہ حمیدہ کا۔ تعریف قطعاً غلط ہے۔ کم از کم اسلامی نقطۂ خیال سے۔

میں:۔ تو تم ذرا اسلامی تعریف بیان کر دو۔

بیگم:۔ صرف ایک جملہ ایزاد کرنے کی ضرورت ہے۔

میں:۔ وہ کیا؟

بیگم:۔ جو شخص چاہے اس کے حالات کیسے ہی ہوں اپنی طرف سے ہر حال میں خالص خدا کی خوشی کے لیے پوری کوشش کرے کہ وہ مفید ثابت ہو اور نتیجہ سے مطلقاً بے نیاز ہو وہ بہترین مسلمان ہے۔

میں :۔ خدا کی خوشی کا کیا معیار ہے ؟

بیگم :۔ سبحان اللہ ! کیا سوال ہے ؟ خدا کی خوشی وہ ہے جس میں مخلوق کی بہتری ہو۔ بیماری نہ ہو۔ مفلسی نہ ہو، خوب عیش و عشرت ہو مگر حتی الوسع سب کے لیے مساوی ہو۔ اور خدا کی خوشی کیا ہے !

میں :۔ اور نماز روزہ ؟

بیگم :۔ مجھ سے جو پوچھتے ہو تمہیں بتاؤ کہ نماز روزہ آخر کیا ہیں ؟

میں :۔ عبادت ۔

بیگم :۔ اور بچوں کو اچھی طرح پالنا۔ صاف رہنا۔ ان کی گھر والوں کی، ہمسایوں کی خدمت کر کے خوش رہنا یہ کیا ہیں۔ کیا یہ عبادت نہیں ؟

میں :۔ عبادت تو ہیں۔

بیگم :۔ پھر کیا جس کو نماز روزہ میں خوشی ہو وہ، وہ کرے۔ جس کو اور کسی قسم کی عبادت میں خوشی ہو وہ، وہ کرے۔ مجبور کرنے کا یا جو ایک خاص قسم کی عبادت نہ کرے اسے متہم کرنے کا کسی کو کیا حق ہے ؟ شرط تو صرف یہ ہے کہ نیت یہ ہو کہ مقصود خالص خدا کی خوشی ہے ؟

میں :۔ تم تو معتزلہ ہو۔

بیگم :۔ معتزلہ وعتزلہ تو میں جانتی نہیں مگر بات ٹھیک کہتی ہوں۔ اسلام رسوم کا نام تھوڑا ہی ہے ۔ صرف ایک قلبی کیفیت ہے۔ غیر مسلموں کو دنیا کے دکھ درد بے چین بناتے ہیں اور ان کے پاس کوئی کلید ایسی نہیں جس سے وہ اس زنداں سے نکل سکیں۔ زندگی ایک تازیانہ ہے جو بار بار انہیں مجروح کرتا ہے ۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ زندگی کو بجائے تازیانہ کے سواری کا گھوڑا سمجھو۔ خوب اس سے کام لو۔ اگر اتفاق یہ آ پڑا ہے کہ تمہارا گھوڑا گھوڑدوڑ والا نہیں بلکہ تانگے والا ہے تو اس سے ملول نہ ہو۔ جن کے پاس گھوڑدوڑ کے اسپ تازی ہیں ان کی طرف بہ نگاہ حسد نہ دیکھو۔ قلبی کیفیت یہ رکھو کہ ہمارے لیے سوال یہ نہیں کہ ہمیں مجروح یا بدرنگ یا پست قامت گھوڑا کیوں ملا۔ بلکہ سوال صرف یہ ہے کہ کچھ اچھے سے اچھا کام ہم اسی سے لے سکیں، وہ پوری کوشش سے لیں۔ تم مرد تو صرف نام کے مسلمان ہو۔ اصل میں زر و جاہ کے حریص ہو۔ تبھی تو یہ ساتھ والی اونچی کوٹھی ہر وقت تمہیں کھٹکتی ہے۔ میں تو روز ان کے لیے بھی دعا کرتی ہوں کہ خدا انہیں بہت دے اور وہ خوش رہیں۔

میں :۔ تو کیا تم دعا کی قائل ہو ؟

بیگم :۔ کیا جہالت کا سوال ہے !

میں :۔ کیوں ؟

بیگم :۔ دعائیں اس لیے تھوڑی مانگتی ہوں کہ اللہ کبھی میرے کہنے سے مجبور ہو جائے گا۔ صرف اس لیے مانگتی ہوں کہ

مجھے یقین ہے کہ مخلوق کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم ایک دوسرے کا بھلا چاہیں اور یہی خدا کی خوشی ہے۔ بلا سے دعا کا اثر ہو کہ نہ ہو۔ میرا اپنا دل تو زنگ آلود نہیں ہوتا۔

میں :- واللہ باللہ اگر کوئی مولوی تمہاری منطق سن لے تو ابھی ڈبل کفر کا فتویٰ تم پر عائد ہو جائے۔

خیر، مگر میں تو ان مولوی صاحب کے لیے بھی دعا ہی کروں گی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کروں گی کہ یا اللہ اب تو ٹرکی کی طرح ہندوستان میں بھی کوئی ایسی تدبیر ہو کہ مولویوں کے وعظ اسی طرح زیر لائسنس ہوں جس طرح مسکرات کی فروخت۔

بیچارے مولوی! وہ دیانت داری سے اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور قوم ہے کہ صلواتیں سناتی ہے۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تمہارے قول و فعل میں کس قدر فرق ہے۔ تم بنتی تو پردہ کی مخالف ہو۔ مگر خود کس قدر سخت پردہ کرتی ہو۔ اسلام کی قلبی کیفیت بتاتی ہو مگر بچوں کو نماز کی تاکید۔

اس میں قول و فعل کے فرق کی کیا بات ہے۔ کیا فیشن کے لیے آدمی کچھ نہیں کرتا؟ فی الحال مروجہ فیشن یہی ہے، جو میرا ہے، کم از کم میری جماعت کا۔ مگر پھر تم نے مجھے بحث میں گھسیٹا۔ اسلام میں کم از کم میرے اسلام میں بحث منع ہے۔ کیونکہ بحث ایک لغو فعل ہے۔ اور ہر مومن کو لغو سے پرہیز ہے۔ لو اب کھانے کے لیے آؤ۔ تمہارے لیے بہت اچھی سی کچوریاں تلوں گی۔

بیگم تو چل دیں مگر میں نے ان کی گفتگو بھی لکھ لی۔ سوچتا ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہت حد تک ان کی منطق بھی درست ہے تو کیا میرے گھر کی صحیح مردم شماری یہ ہے کہ دو بہترین مسلمان خاتونیں اور ایک جہالت کا پتلا مرد؟

اور کیا اکثر مسلمان گھروں کے اعداد اسی کے لگ بھگ ہیں؟ کوئی تعجب نہیں جو یہ درست نکلے۔

کاہلی

علی عباس حسینی

کہتے ہیں کہ دو کاہل ایک گولر کے درخت کے نیچے پڑے تھے۔ ادھر سے ایک سوار گزرا۔ ایک کاہل نے اسے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا کر کہا "بھیا سوار مہربانی کر کے ذرا گھوڑے سے اتر پڑو اور یہ جو گولر میرے سینے پر پڑا ہے اسے اٹھا کر میرے منہ میں ڈال دو!" دوسرے نے فریاد کی "ارے میاں سوار، اس کی باتوں میں نہ آنا یہ بڑا کاہل ہے۔ اس سے اتنا نہ ہو سکا کہ رات میرا منہ کتا چاٹتا گیا اور اسے دھتکار دیتا۔" پہلے نے کہا "اور تمہارے منہ کو کیا ہوا تھا۔ وہ آخر کیوں نہ کھلا؟" دوسرا بولا "واہ تمہارے ہوتے میں اپنا منہ کیوں دکھاتا؟" پہلا جھٹ بول اٹھا "اور تو اللہ کا یہ نیک بندہ سوار تو موجود ہی ہے میں خود گولر کیوں اٹھاؤں؟" سوار نے کہا "تم دونوں پہ خدا کی مار!" اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر وہ ہنستا آگے بڑھ گیا۔

آپ بھی شاید یہ کہانی سُن کر ہنس دیں گے۔ مگر ذرا ہنسی روک کر ایک کام کاجی کی بھی روئیداد آج سُن لیجیے۔ میرے ایک دوست ایک سیٹھ سے ملنے لکھنؤ سے بمبئی گئے۔ کسی قومی معاملے میں مشورہ بھی کرنا تھا اور ان کی جیب ہلکی کرنے کا دل میں منصوبہ بھی تھا۔ آمد کی اطلاع پہلے سے تھی۔ وکٹوریہ ٹرمینس پر موٹر موجود تھا۔ گھر جو پہنچے تو 9 بج رہے تھے۔ میزبان ناشتے کی میز پہ ملے۔ انھیں دیکھتے ہی بولے "آپ آگیا، آرام کرے۔ ہم دفتر جاتا ہے شام کو ملے گا۔" اور چاء کی پیالی جلدی جلدی سُڑک ایک دو تین۔ انھوں نے نہایا دھویا، کپڑے بدلے، ناشتہ کیا، اخبار پڑھے، لنچ کھایا، چاء پی، لیٹے بیٹھے سوئے۔ شام کے چھ بجے سے انتظار شروع ہوا سات بجے، آٹھ بجے، نو بجے، نوکر نے کھانا میز پہ لگا دیا۔ وہ بھی اکیلے ہی زہر مار کیا۔ اور دس بجے سو رہے۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی تیار ہو کر کھانے کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے میزبان صاحب بھی تشریف لائے۔ صاحب سلامت کرتے ہی جلدی جلدی اخباروں پہ نظر ڈالی۔ کوئی خبر ایسی پڑھی کہ چاء کا گھونٹ ایک نالی کی جگہ دوسری نالی میں اتر گیا۔ کھانستے کھانستے آنکھیں نکلی پڑ رہی ہیں مگر بولے تو اتنا بولے کہ "گاڑی! ٹیکسی! جلدی!" مہمان نے پیٹھ ٹھونکی، تھپ تھپائی، سہلائی، اچھو رکا تو بولے "معافی! بزنس!" اور پھر رفو چکر۔ پھر وہی پہلے دن والا پروگرام دہرایا گیا۔ مگر آج انہوں نے بھی دل میں ٹھان لی کہ چاہے ساری رات گزر جائے مگر سیٹھ سے واپسی پہ باتیں کر کے رہوں گا۔ دس بجے وہ پلٹے۔ ہاتھ پاؤں اور کپڑوں میں جگہ جگہ کالے دھبے۔ چال ڈھال میں وہ تھکن جیسے چالیس کی جگہ اسی برس کے بوڑھے ہوں۔ مہمان کی ہمت نہ پڑی کہ اس تھکے ہارے میزبان سے گفتگو کریں۔ سو رہے مگر یہ طے کر کے کہ کل اس کے کام کا پیچھا کروں گا۔ دن بھر میں کہیں نہ کہیں دو باتیں کرنے کا موقع نکل بھی آئے گا۔

چنانچہ تیسرے دن جب سیٹھ حسبِ معمول جلدی جلدی ناشتہ کرکے جیبیں ٹٹولتے اپنی وکٹوریہ میں بیٹھنے لگے تو یہ بھی سامنے والی سیٹ پر اُچک کر بیٹھ گئے۔ سیٹھ نے نظر اٹھا کر کہا "ساتھ چلیے گا، اچھا!" اور مختلف جیبوں میں سے نوٹ بکیں نکال کر ہر ایک میں کچھ لکھنے، کچھ جوڑنے گھٹانے لگے۔ گاڑی تھوڑی دیر میں ایک بلند عمارت کے سامنے رکی۔ سیٹھ نے مہمان سے کہا "آؤ" اور وہ جلدی جلدی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ عمارت تھی پانچ منزل کی اور سیٹھ کا دفتر تھا آخری منزل پر۔ کوئی لفٹ یا الیوٹیر نہیں کہ اس کے ڈبے میں اپنے کو بند کرکے بٹن دبا کر دفتر تک اڑن کھٹولے کا مزہ لیتے۔ یہاں تو اس قطب مینار کی سیڑھیاں ایک ایک کرکے خود ہی گننا پڑیں۔ میرے دوست تھے ادھر کے رئیس۔ دوسری ہی منزل تک پہنچتے پہنچتے چربی گھلنے لگی، اور پانچویں منزل تک پہنچنے پر تو ان کا دس پونڈ وزن پانی بن کر بہ گیا۔ بارے سیٹھ کے دفتر میں پہنچے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں دو کلرک دو بڑے بڑے رجسٹروں پر جھکے کچھ لکھ پڑھ رہے تھے۔ سیٹھ ان کے بیچ میں سے گزر کر ایک پہلے سے بھی مختصر کمرے میں پہنچے۔ وہاں ایک بڑی سی میز کے گرد چار کرسیاں تھیں، اور دیوار والے رُخ پر صدر میں سیٹھ کی کرسی۔ میز پر ایک درجن کے قریب ٹیلیفون رکھے تھے۔ ان میں سے دو کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میرے دوست تو ایک کرسی پر گر کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ مگر سیٹھ نے جلدی سے دونوں ریسیور اٹھائے۔ اب کبھی ایک سے باتیں کرتے ہیں کبھی دوسرے سے۔ پھر انہوں نے دونوں ریسیور رکھ کر کئی ٹیلیفون پر کئی نمبر جلدی جلدی گھما کر ملائے۔ اب ایک سے دو فقرے کہتے ہیں، ریسیور میز پر رکھ دیتے ہیں۔ دوسرے سے دو لفظ کہتے ہیں ریسیور میز پر رکھ دیتے۔ تیسرے سے کچھ باتیں کرتے ہیں ریسیور میز پر رکھ دیتے ہیں۔ پہلا اٹھا لیتے ہیں، کبھی دوسرا، کبھی تیسرا اور اس درمیان۔ سامنے رکھے ہوئے چھوٹے پیڈ سے چٹیں پھاڑتے ہیں، ان پر کچھ لکھتے جاتے ہیں اور الگ رکھتے جاتے۔ اسی درمیان میں کئی دفعہ کلرک آئے، کاغذوں پر دستخط کرا لے گئے، حساب دکھا گئے، احکام لے گئے۔ دو گھنٹے یہی کام جاری رہا۔ ٹیلیفون کی کِرکِر سنتے سنتے میرے دوست کے کان پک گئے۔ دم الجھنے لگا۔ وہ اکتا کر بھاگنے ہی والے تھے کہ دفعتہً سیٹھ اٹھے "ساتھ چلیے گا"؟ پوچھتے باہر روانہ ہوگئے۔ یہ انھیں سے باتیں کرنے تو بمبئی آئے تھے نہ چلتے تو کیا کرتے؟ پھر سیڑھی سے اترنے میں چار و ناچار پانچ سیر وزن گھٹایا، نیچے آئے، وکٹوریہ میں بیٹھے۔ چلے۔ قبل اس کے کہ یہ کچھ کہیں سیٹھ نے جیبوں میں ٹھُسی ہوئی سلپیں جلدی جلدی نکالیں اور انھیں ترتیب دینا شروع کیا۔ چند ہی منٹ میں گاڑی رکوائی اور جلدی سے اتر پڑے۔ یہ بھی اترنے لگے تو بولے "نہیں، تم بیٹھیے!" اور لپکتے ہوئے ایک کارخانے کے اندر۔ آدھ گھنٹہ بعد پلٹے۔ گاڑی چلی، کاغذات پر کچھ لکھا، کچھ جوڑا، کچھ گھٹایا۔ گاڑی رکی اتر پڑے۔ پھر ایک عمارت کے اندر جلدی ہی پلٹے۔ گاڑی پھر چلی، پھر کاغذ نکال لیے گئے۔ پھر رُکی، پھر اترے غرض یہ اترنا چڑھنا گھنٹوں جاری رہا۔ دفعتہً جیب سے گھڑی نکالی، بولے "لنچ" اور ایک ریستوران کے سامنے گاڑی روک کر اتر کر اس میں گھس گئے۔ مُرغ، کباب، پلاؤ، قورمہ، انڈے، چپاتیاں، پوریاں، پراٹھے، کھیر، شاہی ٹکڑے سب کچھ منگوا لیا۔ مہمان نے "زرمی خورم" سمجھ کر سب ٹھونسا۔ سیٹھ نے ایک توس کے ساتھ ایک انڈا کھایا۔ ایک پیالی چائے پی، لیکن اس درمیان میں بھی نوٹ بکوں، ڈائریوں اور چٹوں پر جوڑنا گھٹانا جاری رہا۔ ان سے کوئی بات نہ کی۔ ابھی شاہی ٹکڑوں کا پہلا چمچہ منہ تک پہنچا ہی تھا کہ سیٹھ ایک بارگی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ "اوہ، بڑا دیر لگایا!" ـــــ بل بھی نہ مانگا، میز پر دس دس کے دو نوٹ پھینک دیے اور چل دیے۔ ان کو بھی مجبوراً ساتھ بھاگنا پڑا۔ اب پھر وہی چڑھنا چلا، گاڑی رکتی وہ اترتے، کسی عمارت میں گھستے۔ وہاں سے لپکے

ہوئے آتے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی کاغذات دیکھنے لگتے۔ چار بجتے بجتے مہمان کی طبیعت اوبھ گئی۔ انھوں نے سیٹھ کی غیبت میں گاڑی بان سے پوچھ لیا "یہ کیا کام کرتے ہیں؟" معلوم ہوا کہ بروکر (دلال) ہیں۔ ہر طرح کے گودام میں جاتے ہیں۔ غلّہ، روئی، لکڑی، کوئلہ وہاں اگر کرسی ملی تو اس پر بیٹھے نہیں تو زمین ہی پہ بیٹھ کر سودا پٹایا، چلے آئے۔ اسی میں کپڑے بھی میلے ہوتے ہیں اور ہاتھ پاؤں بھی۔ اور چہرے پہ بھی کالک پُت آتی ہے۔ شام کے قریب دفتر کی طرف پلٹے۔ میرے دوست زینوں پر چڑھنے اترنے کے خیال ہی سے کانپ گئے۔ اس لیے جب سیٹھ دفتر کے سامنے اترنے لگے تو انھوں نے معافی مانگ کر کہا "میں گھر جاؤں گا۔" سیٹھ نے مسکرا کر پوچھا "تھک گیا!" انھوں نے سر ہلا کر ہامی بھری۔ وہ بولے "ابھی ہم دس بجے تک کام کرے گا!" انھوں نے دل میں کہا "جاؤ، مرو۔" اور جب وکٹوریہ نے گھر پر چھوڑا تو اسی طرح اپنے پر فقرہ کسا "خیر سے بدھو گھر کو آئے۔"

آپ نے دونوں کہانیاں سُن لیں۔ اب آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ ان دونوں زندگیوں میں قابل ترجیح و پسند کون ہے؟ یہ کاہلی والی زندگی یا یہ کام کاجی کل؟ اگر آپ ذرا سا بھی غور کریں گے تو میری طرح اسی نتیجہ پہ پہنچیں گے کہ کاہلی دنیا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کاہلی کو بُرا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ صفت کسی میں اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک وہ حد درجہ کا قانع نہ ہو۔ اور قناعت کے بارے میں جتنے پیغمبر گزرے ہیں، سب ہی تر زبان ہیں۔ ساگ ستو جو خدا نے اپنے کرم سے دیا کھا لیا۔ موٹا جھوٹا جو کچھ پہننے کو ملا پہن لیا۔ جھونپڑا ہوا کہ پکی حویلی، برگد کا سایہ ہوا کہ لال قلعہ، جہاں پڑ رہنے کی جگہ ملی پڑ رہے۔ نہ کسی کو سینگ مار کر اس کی ناند چھینی، نہ کسی کو جھنجھوڑ کر اس کے حصّے کی ہڈی اچکی اور نہ کسی کو مار کر اس کی لاش پر کھڑے ہو کر اپنے کو اونچا کیا۔ کسی نے ایک گال پر طمانچہ مارا۔ اس کی مشق ناز کے لیے دوسرا گال بھی بڑھا دیا۔ کسی نے ہماری آدھی روٹی بھی چھین لی۔ ہم نے کھیسے نکال کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ کسی نے دھکیل کر ہمیں گرا دیا۔ ہم شکر بجا لائے کہ سر اٹھا کر چلنے کے گناہ سے بچے۔ یہ فراخدلی، یہ عالی ظرفی، یہ بلند نظری، یہ استغنا، یہ انکسار، یہ ایثار، بغیر کاہلی کے کہاں نصیب۔؟

ذرا غور تو کیجیے ہم اس چھوٹی سی عمر میں کتنا بے کار وقت ضائع کرتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی چیخنے لگتے ہیں۔ "کہاں؟ کہاں؟" یعنی وہی غذا کے لیے بے صبری، حلق و زبان کی حرکتِ پیہم، یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ دودھ مل گیا، چلو پیٹ بھر گیا۔ دنیا کی فکروں سے بچنت ہو کر سو رہے یا انگوٹھا چوسنے لگے۔ پھر بھی ہر دو تین گھنٹے پہ پھیپھڑوں کو مضبوط کرنے کی ورزش جاری ہوتی رہتی ہے۔ ذرا بڑے ہوئے بس اب چرخی بن گئے۔ دوڑتے ہیں، گرتے ہیں، چوٹیں کھاتے ہیں، گھٹنوں سے منہ سے ڈھل ڈھل خون بہ رہا ہے مگر نچلے نہیں بیٹھا جاتا۔ یہ توڑا، وہ پھوڑا، اس کو نوچا اس کو کھسوٹا، جو چیز پائی منہ میں رکھ لی۔ منہ چلتا ہے، پیٹ چلتا ہے۔ مگر ہم ہیں کہ کسی طرح نہیں رُکتے۔ اسے لیجیے، اسی رواداری میں اسکولوں، کالجوں میں پہنچے۔ اب کیا ہے، رات دن حرکت، اچھی بُری حرکت۔ آنکھ چلتی ہے، زبان چلتی ہے، دماغ چلتا ہے، ہاتھ پاؤں چلتے ہیں، خود اچھلتے ہیں، دوسروں کو اچھالتے ہیں۔ بس ہر وقت وہ قطع کہ لوگ کہیں "ناچ کھلاڑی دِھنا دِھن! ناچ کھلاڑی دِھنا دِھن!" اس منزل کو جیسے ہی پار کیا، یاروں نے معاش کا جوا کندھے پہ رکھ دیا۔ دن رات تیلی کے بیل کی طرح کولھو پیلتے رہو!

ارے میاں یہ سب کس لیے؟ کاہے کی کاؤں کاؤں؟ کھاؤ گے تو اتنا ہی جتنا پیٹ میں سمائے گا، اور پہنو گے تو وہی جس سے

گرمی سردی سے بچ سکو؟ اتنے کے لیے خون پسینہ ایک کرنا کیا معنی؟ آرام سے ایک جگہ لیٹو۔ گولر کبھی نہ کبھی تمھارے سینے پر ٹپکے گا ہی اور کوئی نہ کوئی مردِ خدا پیدل یا سوار ایسا بھی آجائے گا کہ اسے اٹھا کر تمھارے منہ میں بھی رکھ دے۔ اور اگر وہ نہ بھی آیا تو وہ جانے جو مسبّب الاسباب ہے جس نے رزقِ بہم پہنچانے کا ٹھیکہ لیا ہے اور نہ خبر لے گا تو یہی ہوگا نا، کہ مر جائیں گے؟ تو کون سی انوکھی مصیبت آجائے گی، کون سی نئی بات ہو جائے گی۔ یہی تو ہوتا ہی ہے۔ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے! کھلونے کو اس سے کیا مطلب کہ اس سے کیونکر کھیلا گیا۔ نہ وہ یہ جانتا ہے کہ اسے بنایا کیوں اور نہ اسے یہ معلوم کہ اسے توڑا کیوں؟ ؏

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اچھا صاحب! کاہلی اب بھی بُری ہے تو ایک بات اور سُن لیجیے۔ مگر خدا لگتی کہیے گا۔ سر سید اور اقبال کی بیچ میں نہ اتر آئیے گا۔ ان کے نزدیک تو زندگی ہی رواں دواں نہیں۔ مقصد زندگی بھی روانی دوانی ہے۔ لیکن آپ انصاف سے بتائیے کہ آپ نے کسی بڑے فلسفی مفکر یا مصنف کو رواں دواں دیکھا یا سُنا ہے؟ اجی جناب! میاں سقراط اسی حرکت و عمل کے قائل تھے۔ جب دیکھیے ایتھنز کے چوک کا چکر لگا رہے ہیں اور ہر ایک سے دست و گریباں ہیں۔ نتیجہ کیا ہوا؟ صلہ کیا ملا؟ ساری عمر میں ایک کتابچہ بھی نہ لکھ سکے اور آخر جام زہر پی کر جان دینی پڑی۔ ان کے برعکس افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو کو لیجیے۔ کبھی دونوں نے مل کر پانی نہ پیا۔ ہر وقت بیٹھے سوچا کیے۔ ایک نے ایسی ”جمہوریت“ لکھی کہ نہ کانوں نے سنی، نہ آنکھوں نے دیکھی۔ دوسرے نے مختلف علوم کا وہ باغ لگایا کہ تمام عمر اس کی سیر کیجیے اور طبیعت سیر نہ ہو۔

خود اپنے رشیوں، منیوں، سنتوں، سنیاسیوں کو لے لیجیے۔ دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ، دھیان گیان میں بیٹھے رہے مگر ہمارے لیے ایسی ایسی تبرکات چھوڑ گئے کہ انسانی عقلیں ہمیشہ ان پر عش عش کریں گی۔ ہماری اپنشد، ہماری پران، ہماری برہمن ہماری شاستریں، انھی ”بے کاروں“ کی دماغی اُپج کا نتیجہ ہیں۔ ویدانت کا فلسفہ یا تصوّف کا طریقہ اسی طرح جم کر بیٹھنے اور ڈوبے رہنے اور دنیا اور اس کی ”مایا“ سے الگ ہو کر سوچنے کا نتیجہ ہیں۔

ذرا آج کل کے ہنگاموں کو بھی ملاحظہ کیجیے۔ کالے کو گورا کھائے جا رہا ہے، پیلے کو سرخ اپنے رنگ میں ڈوب دے رہا ہے۔ ایشیا کے لیے یورپ پیر تسمہ پا بنا ہے۔ یورپ کی گردن میں امریکہ کا قلادہ ہے۔ ہر وقت گرم اور ٹھنڈی لڑائیاں جاری ہیں۔ بھائی بھائی میں اختلاف ہے۔ باپ بیٹے میں مقابلہ ہے۔ آرام حرام، نیند حرام! بس ایک دوڑ ہے، مسابقہ ہے، مجاہدہ ہے مقاتلہ ہے کہ برابر چلا جا رہا ہے۔ ایٹم بم بن رہے ہیں۔ ہائیڈروجن بم تیار ہو رہے ہیں۔ زہریلے گیس انبار کیے جا رہے ہیں۔ بیماریاں پھیلانے والے، جلتا پٹرولیم چھڑکنے والے گولے بھرے جا رہے ہیں۔ نئی نئی بندوقیں، نئی نئی رائفلیں، نئی نئی مشین گنیں، نئی نئی آب دوز کشتیاں بنائی اور ڈھالی جا رہی ہیں۔ بمبار، جٹ ہوائی جہازوں کی پرواز و تاخت کی آزمائش و پیمائش کی جا رہی ہے اور یہ سب اس لیے کہ بقول نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن ”انسان کی نہیں، موت کی فتح ہو!“

آخر اس آفت، اس ہنگامہ، اس اپنے ہاتھوں اٹھائی ہوئی قیامت کا اصلی سبب کیا ہے؟ صرف یہی کہ انسان نے غلط طور پر کام کو سراہا۔ اور کاہلی کو ذلیل و خوار سمجھا۔ کاش ساری دنیا اس صفت عالیہ کی اہمیت کو سمجھتی اور اسے اپنا لیتی۔ پھر کیا ہوتا؟ ہر

ایک اپنی اپنی جگہ اطمینان سے لیٹا بیٹھا ہے۔ نہ سرمایہ داری ہے، نہ مزدوری، نہ جھگڑا نہ لڑائی، نہ مفت کی بک بک، نہ خواہ مخواہ کی جھک جھک، نہ لیکچر بازیاں، نہ دیا کھیان، نہ تقریریں، نہ اسپیچیں، نہ الکشن، نہ ووٹنگ، نہ اسمبلی نہ کونسل، نہ ممبر نہ وزیر، نہ خوش آمد نہ چاپلوسی، نہ انصاف، نہ ناانصافی، نہ موکل نہ وکیل، نہ استاد نہ طالب علم، نہ کتابیں نہ پبلشر، نہ مطبع نہ مزدور، نہ انقلاب اور نہ انقلاب زندہ باد کے نعرے۔

ہم ہوتے اور جیتے جی جنت کی راحتیں ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را باکسے کارے نباشد

اگر آپ اس پر بھی کاہلی کو بُرا کہنے پر مُصر ہیں تو آپ کو اختیار ہے۔ ہماری تو مجال نہیں کہ ہم اس کے خلاف زبان کھول سکیں۔ ہمیں تو ایک دن اس کا سامنا کرنا ہے جس نے ازل و ابد کے لامتناہی طول میں صرف ایک بار ”کن“ سوچا تھا اور جب سے اپنی خودی میں ڈوبا پڑا ہے۔ ہمیں تو اب جنتی بننے کی فکر ہے۔ ہمارے لیے تو وہ دن لد گئے جب ہم یہ کہتے تھے کہ ؎

میسّر نہیں پیر تم، کاہلی اللہ رے
نام خدا ہو جواں، کچھ تو کیا چاہیے

ہم نہیں پٹے

تمکین کاظمی

کہتے ہیں "شرع کو شرم نہیں" جب ہی تو اشرف علی صاحب قبلہ نے بہشتی زیور میں نہایت صفائی کے ساتھ ایسی باتیں لکھ دیں جن کو پڑھ کر لوگ بگڑ گئے۔ بعضوں نے اس کا نام رکھ دیا "اشرفی کوک شاستر"۔ اگر ذرا غور کیجیے تو آپ قانون کو بھی بے شرم پائیں گے۔ کیسی کیسی فحش اور بے شرمی کی چیزیں آپ کو "تعزیرات" اور "ضابطہ فوجداری" میں نظر آتی ہیں۔ "مسلمانوں پڑھو اور عبرت کرو۔"

مگر ایک نکتہ سُن لیجیے۔ شاید آپ نے غور نہیں کیا۔ وہ یہ کہ قانون پیشہ حضرات بھی بے شرم قانون پڑھ کر ذرا بے شرم ہو جاتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے کیسے۔ سنیئے جو "روحِ ظرافت" کی "ارواحِ لطیف" اور "کولتار" کے برش" "انگوٹھی کی مصیبت" کے بانی "شریر بیوی" کے شوہر "لغولیقی" کے مفوضہ وکیل" حضرت مکرمی مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے ایل ایل بی ہیں یا طالب علمی کے زمانہ میں ایسے "سعادت آثار" جوان صالح تھے کہ بس قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے اور "پردہ" کے متعلق آیاتِ قرآنیہ ڈھونڈا کرتے تھے۔ مگر جب سے انہوں نے ایل ایل بی میں قدم رکھا ذرا بے شرم ہو گئے ہیں اور ایسی ہی بے شرمی کے مضامین لکھنے لگے ہیں مگر غضب خدا کا اب تو اس بے شرمی کی انتہا کر دی کہ سب لوگوں کو دعوت دے دی کہ میاں آؤ اپنے پٹنے کی داستان سناؤ۔ بھلا کونسا شریف آدمی اپنی ایسی داستان سنائے گا جو شرم ناک ہو اور اس سے اس کی شیخی کرکری ہو جائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ دوستی بڑی بلا ہے۔ بھیا شوکت تھانوی اور بھائی امین سلونوی نے مشتے نمونہ کہہ کر دو ایک واقعات اپنے پٹنے کے لکھ دیئے اور مجھ پر آفت نازل کر دی۔ "سرپنچ کے سالنامہ کے لیے لکھو۔ اس نادری حکم کی تعمیل میں اپنی بے عزتی ہی کی داستان شروع کرتا ہوں۔

تو جناب خدا آپ کو نیکی دے۔ ہم ذرا بچپن ہی سے نہایت غریب متین اور غایت سنجیدہ واقع ہوئے ہیں۔ راستہ چلتوں کو، خونچے والوں کو، سبزی ترکاری والیوں کو سنا سنا کر ذرا عادت سی ہو گئی تھی۔ اس لیے ہم نے ہر ایک کو سنانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک دفعہ والد ماجد کو بھی دق کیا۔ اس المناک واقعہ کی تفصیل یہ ہے۔ والد مرحوم تلجاپور کے تحصیل دار تھے، وہاں "تلجا بھوانی" شہرہ آفاق مندر ہے جس کے پجاری مہراج "کاجی بابا" ہیں جنہیں گھوڑوں کا بہت شوق ہے۔ ہم نے دورے پہ جاتے ہوئے ان سے ایک گھوڑی جو نہایت کم سن اور پورے قد کی بڑی مضبوط اور تیار تھی مانگ لی اور اپنے دورے پر اسی گھوڑی کو ساتھ رکھا۔ والد مرحوم کیونکہ گھوڑے کی سواری اچھی طرح نہیں کر سکتے تھے۔ معلوم نہیں ایک دفعہ آپ کو کیا سوجھی، کیمپ برخاست کر کے چلتے وقت مجھ سے فرمایا کہ تم ٹٹو پر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہاری گھوڑی پر سوار ہوں گا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی۔ ہم نے کہا بھی کہ قبلہ گھوڑی بہت تیز ہے۔ منہ زور ہے، شریر ہے "بک" کرتی ہے۔ "الف" ہوتی ہے۔ مگر قبلہ نے سنا ہی نہیں۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ گھوڑی قبلہ کو پٹخے گی ضرور۔ اس لیے ہم نے محض اس خیال سے کہ گھوڑی

قبلہ زمین پر اطمینان اور آرام کے ساتھ پہنچ جائیں۔ ”تنگ“ کے ”بکل“ ”بکسوئے“ کھول دئیے۔ سائیس نے ایک طرف کی رکاب تھام لی اور حضرت نے گھوڑی پر سوار ہو کر باگ ٹھیک کی اور گھوڑی آہستہ سے چلی۔ چند قدم چلنے کے بعد نہایت اطمینان سے الف ہو گئی۔ اور معہ زین رکاب گھوڑی کی پیٹھ سے سرین سے ہوتے ہوئے زمین پر آ گئے۔ سائیس نے دوڑ کر سنبھالا۔ ہم بھی پہنچ کر پوچھنے لگے کہ ہوا کیا۔ مگر وہ بھی آخر ہمارے والد ہی تھے۔ جب ہم قریب پہنچے تو ایک شاندار طمانچہ رسید فرما کر بیک لفظ بیس پچیس صلواتیں سنا دیں۔ ہم نے لاکھ لاکھ کہا کہ سائیس کی غلطی تھی اس نے تنگ نہیں لگایا تھا۔ مگر وہ سمجھ چکے تھے۔

بات گزر گئی مگر اس دن سے پھر کبھی حضرت نے نہ تو ہماری گھوڑی پر سواری کرنی چاہی اور نہ کسی بڑی گھوڑی پر سوار ہوئے۔ بازی بازی ریش بابا ہم بازی اس کو کہتے ہیں۔

دوسرے شرم ناک واقعہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک بڑے میاں جو نظم جمعیت و فوج بے قاعدہ کے ملازم تھے اور ہمارے محلہ کے رہنے والے تھے۔ ہمارے سر ہو گئے۔ تمہارے نانا جو خضاب استعمال کرتے تھے۔ اس کا نسخہ لا دو۔ ہم نے نانی اماں سے نسخہ پوچھا مگر انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اماں جان بھی اس نسخہ سے واقف نہ تھیں۔ بڑے میاں سے کہا کہ ”حضرت“ وہ نسخہ کسی کو بھی معلوم نہیں مگر وہ برابر مانگتے ہی رہے۔ آخر میں تھک کر ہم ایک ترکیب سے حکیم بابا میاں سے بال اڑانے کا پوڈر مانگ لائے۔ اس میں چنبیلی کا تیل اور ذرا سی روشنائی ملا کر خضاب بنا دیا اور شیشی بڑے میاں کے حوالے کر دی کہ حضرت یہی خضاب ہے جو نانا لگایا کرتے تھے۔ اب پہلے ایک دفعہ اس خضاب کو استعمال فرمائیے۔ اگر پسند ہو تو میں اس کے اجزا لکھ دوں گا۔ بڑے میاں نے ترکیب استعمال پوچھی اور دعائیں دیتے ہوئے گھر رخصت ہو گئے۔

معلوم نہیں رات بھر انہیں نیند آئی یا نہیں۔ مگر صبح صبح خوشی خوشی اٹھ کر بالشت بھر لمبی سفید بگلے کی ڈاڑھی کو خضاب لگایا۔ اور جبڑوں کو خوب ملتے رہے۔ جب سوزش ہونے لگی تو آپ نے اسے چھوڑ دیا اور ضروریات سے فارغ ہو کر مسجد پہنچے۔ مسجد کے صحن میں حوض تھا لوگ بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ بڑے میاں نے حوض ہی پر بیٹھ کر ڈاڑھی کو خوب گھس گھس کر دھونا شروع کیا۔ دیر تک ملنے کے بعد منہ جو دھویا تو گچھے کے گچھے ہاتھ میں آ گئے۔ پہلے گال صاف ہو گئے پھر ٹھوڑی صاف ہو گئی۔ ادھر ادھر چند بال لگے رہے اور بس۔ نمازی وضو کر کے تیار ہو چکے تھے۔ مگر حضرت کی ڈاڑھی نذر خضاب ہو گئی۔ اور آپ نے کندھے سے رومال اتار کر اوڑھ لیا اور ایسے خانہ نشین ہوئے کہ چار مہینے تک قدم باہر نہیں رکھا۔ چوتھے مہینے جب ذرا بال آ گئے تو کنارے کر ہمیں ڈھونڈنا شروع کیا۔ بھلا ہم ایسے اچھے آدمی کہاں جو انہیں مل جاتے، مدت تک ڈھونڈتے پھرتے رہے۔ ایک دن اتفاق سے ہم دار الشفاء کی سڑک پر سائیکل سوار تھے۔ اس پیے بڈھے نے سڑک پر سے ایک پتھر اٹھا کر پھینک مارا۔ مگر ہمارا اقبال دیکھیے کہ پتھر ہمارے مونڈھے کو چومتا ہوا نکل گیا اور سیدھے جا کر پولیس کانسٹیبل کی پیشانی پر پڑا جو تھانے کے سامنے پہرہ دے رہا تھا۔ غریب کانسٹیبل پہلے تو پتھر کی زد میں آ کر چکرا گیا۔ پھر سنبھل کر سر سے بہتے ہوئے لہو کو ہاتھ سے پونچھتا ہوا آگے بڑھا اور بڑے میاں کو دھر لیا۔ دو دن تک بڑے میاں پولیس کی حراست میں رہے۔

تیسرے روز نجات ملی۔ اس دن کے بعد سے بڑے میاں نے ہمیں راستے میں دیکھا بھی تو منہ پھیر لیا۔

لوگوں کی ڈاڑھیاں اس طرح اڑا دینا یقیناً برا ہے۔ مگر آپ ہی کہیے کہ ایک بڈھا خواہ مخواہ سر ہو جائے کہ خضاب کا نسخہ لا دو۔ دراں حالیکہ نہ تو آپ کو نسخہ معلوم ہو اور نہ کوشش کے باوجود معلوم ہو سکے اور پھر آپ انکار کریں تو وہ جھوٹ سمجھے اور اصرار کرتا جائے تو

آپ کس طرح پیچھا چھڑائیں گے۔ اس لیے ہم نے بڈھے میاں کی ڈاڑھی اڑا دی تاکہ نہ رہے ڈاڑھی نہ لگے خضاب۔ اسی لیے تو امیرؔ نے کہا ہے ع

کاٹ کر جڑ پھینک دو نخلِ تمنا کی امیرؔ

تیسرا تکلیف دہ واقعہ یہ ہے، نقش بندیہ سلسلہ کے اندھے فقیروں کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ ایک اندھا بڈھا فقیر ہاتھ میں لمبی لکڑی اور ہاتھ میں پتلی شمع لیے آٹھ بجے رات کو ہمارے دروازے پر سوال کیا کرتا تھا۔ کتے اس کو بھونک بھونک کر ڈرایا کرتے تھے۔ ایک دن ہم نے کتے کی آواز نکالنے کی بہت مشق کی اور جب فقیر آیا تو گھر کے سامنے کھڑے ہو کر بھونکنا شروع کیا۔ مگر جناب یہ اندھے غضب کے بدمعاش ہوتے ہیں۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ کتا دو پاؤں کا ہے۔ چنانچہ نہایت تیزی کے ساتھ ایسی زور سے لکڑی رسید کی کہ ہم بلبلا اٹھے۔ اور کئی روز تک ہماری پسلی میں درد رہا۔ اندھے کی لاٹھی سے خدا بچائے۔

ایک مولوی صاحب جن کا نام لکھوں تو فوجداری ہو جائے گی، ہمارے والد کے ہم سبق رہ چکے تھے اور حیدرآباد کے مشہور عالم اور فاضل تھے۔ مگر ہم سے بہت خفا رہتے تھے۔ ہمیشہ ہمیں بُرا کہتے تھے۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں بھی نہ آئی۔ کیونکہ وہ زاہد صورت اند گراں ڈیل تھے، اس لیے ہم ان کو مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس کی شکایت والد مرحوم اور استاد مرحوم سے کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہماری کسی شرارت پر ایک بھری مجلس میں انہوں نے گالیاں دے دیں۔ ہم خاموش ہو رہے۔ مگر موقعہ کی تاک میں تھے۔ گلزار حوض سوکھے حوض کی نکڑ پہ ایک کتابوں کی دکان تھی جس کا نام یا تو حیدرآباد بک ڈپو تھا یا دکن بک ڈپو۔ بہرحال بک ڈپو نام ضرور تھا اور اس نام کی سب سے پہلی دکان حیدرآباد میں قائم ہوئی تھی جس میں "شوکیس" بھی تھے۔ اسی بک ڈپو کے چبوترے پہ کرسی ڈال کر ہمارے مولوی جی بیٹھا کرتے تھے۔ محرم کے دن تھے، تیسری چوتھی تاریخ تھی، مجمع خوب تھا۔ مولوی جی کو بک ڈپو میں بیٹھا دیکھ کر ہمارے آگ لگ گئی۔ سامنے ہی ٹکسال "صرافہ" تھا۔ اور اسی کے پاس ایک لالہ کی دکان تھی جو پوری کچوری بنایا کرتا تھا۔ ہم نے وہاں جا کر کڑھائی کے اس حصہ پر ہاتھ صاف کیا۔ جو جل جل کر سیاہ ہو گیا تھا اور جس پر خوب سی کالک لگ گئی تھی۔ جب تمام ہاتھ کالا ہو گیا۔ ہم نے دستی سے ہاتھ ڈھک کر بک ڈپو کا رخ کیا۔ اور چبوترے پر چڑھ کر مولوی جی کے پیچھے جا کر سر پر سے ہاتھ پہنچا کر ان کے کالے منہ کو خوب کالا کر دیا اور بھاگ کر مجمع میں مل گئے۔ پہلے تو مولوی جی نے ہمیں پکڑنے کی کوشش کی اور دکان سے کود کر ہمارے پیچھے بھاگنے لگے۔ مگر جب منہ کی کالک دیکھ کر لوگوں نے قہقہے لگانا شروع کیے تب کہیں بک ڈپو کے برابر کی دکان پر جا کر اس کے پاس کے آئینہ میں اپنا روسیاہ دیکھا اور پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ اس کی شکایت انہوں والد سے کی۔ مگر ہمارا مذاق اتنا "ڈیسنٹ" تھا کہ جس نے سنا اس نے داد دی، مگر اس کے پانچویں روز روسیاہ مولوی نے ہمیں نئے پل "افضل گنج" کے پل پہ گرفتار کر لیا اور چار چھ طمانچے اس زور سے رسید کیے کہ اب تک اس کا مزہ یاد ہے، گال ہی تو سوج گئے۔

ضلع عثمان آباد میں ایک عہدہ دار تھے جو آج کل ایک بڑے عہدے پر ہیں۔ ان کے پاس ایک بڈھا تھا جو ذات کا "ڈھوا" تھا اور شیروانی پہن کر اس کے اوپر سے سوٹ کوٹ "صدریہ" پہنا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ہم نے اسکول کے لڑکوں کو دکھا کر پکارا واسکوٹ بس لڑکوں نے بھی اس کا نام واسکوٹ رکھ دیا۔ اسے معلوم بھی ہو گیا کہ نام ہم ہی نے رکھا۔ ان لڑکوں کو سکھایا ہے۔ حضور بندگانِ عالی کی سالگرہ مبارک کا جلسہ تھا اور ہم سینئر طالب علم ہونے کی وجہ سے انتظام کرتے پھر رہے تھے۔ یہ مسخرا اسکول کے کمپاؤنڈ میں تھا تماشہ دیکھنے آ گیا۔ ہم کسی کام کے لیے گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور قریب ہی واسکوٹ بھی تھا۔ دو ایک لڑکوں نے واسکوٹ واسکوٹ چیخنا شروع کیا۔ بچے کم سن تھے۔ اس مسخرے نے ان کو چھوڑ دیا اور سیدھے ہمارے سر پر وار ہو کر دو چانٹے رسید کر دیئے۔ جوانی اور پھر طالب علمی کا زمانہ۔ ان دنوں ہم بفضلہٖ تعالیٰ خاصے کھلنڈرے، تیسرے چانٹے پر اسے کولھے پہ لاد کر دے پٹخا۔ اور اتنے

گھونسے رسید کیے کہ میاں واسکوٹ بلبلا اٹھے۔ خیریت گزری کہ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ ورنہ بڈھا واسکوٹ نہ جانے جیتا یا مرجاتا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ والدہ وغیرہ خالہ کے گھر مہمان گئی تھیں۔ گھر پر صرف ملازمین تھے اور ہم یار دوستوں نے ایک دفعہ سید صاحب کا بکرا پکڑ کر ذبح کر دیا اور پکا دیا۔ "بریانی" بعض لوگ ڈرتے رہے کہ کہیں خون کے تے اور پاخانے نہ شروع ہو جائیں۔ کیونکہ عام طور سے مشہور ہے کہ سید صاحب کا بکرا ذبح کر کے کھانے والا مرجاتا ہے۔ مگر ہم لوگوں میں کئی ایک سید تھے اور مکان بھی ہمارا تھا۔ اور ہم صحیح النسب سید تھے۔ اس لیے کچھ نہ ہوا۔ دو شیخ اور ایک پٹھان کھانے والوں میں شریک تھے۔ مگر نہ تو ان کی نکسیر پھوٹی نہ ہمیں چھینک آئی۔ بکرا اڑا کر جو مزا لگا تو ہم لوگوں نے باضابطہ چوریاں شروع کیں۔ ایک دفعہ ایک دوست کے مکان سے دو اصیل مرغ اڑا لائے جو ہمارے دوست کے والد نے بڑی محنت کر کے پالے تھے۔ ان کو کھایا تو بڑا مزا آیا۔ دوسرے روز کوٹلہ کے دروازے کے پاس ایک دکان والے نے کئی اصیل مرغ پال رکھے تھے، ان میں سے دو اڑا لائے اور انہیں بھی چٹنی کر دیا۔ ہماری ماما کوٹلہ میں رہتی تھی۔ معلوم نہیں اس نے کہہ دیا، یا دکاندار خود تاک میں تھا۔ تیسرے دن عین موقعہ واردات پر اس نے ہمیں گرفتار کر لیا۔ ہم نے مرغ چھوڑ کر اس سے لڑنا شروع کر دیا۔ اندھیری رات، صورت کسی کی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مگر دیر تک خاصی کشتی ہوتی رہی۔ دکاندار آدمی تھا خاصا تنومند اور جوان، دو تین گھونسے ہمیں ایسے رسید کیے کہ مزا آگیا۔ ہمارے ساتھی بڑے ہوشیار تھے وہ فوراً چلے گئے تھے، اور مسجد کے پاس کھڑے رہ کر ہمارا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے بڑی دقت سے پیچھا چھڑایا، اور فرار پر قرار کیا۔ قمیص اور واسکوٹ تو پارہ پارہ ہو گئی تھی مگر سیدھا مونڈھا بھی جھول گیا تھا اور ٹخنے پر ایسی چوٹ آئی تھی کہ کئی روز تک چلنے کے قابل نہیں رہے۔ اس دن سے ہم نے چوری کر کے کھانا چھوڑ دیا۔ اگر اس دکاندار سے نہ پٹتے تو شہر بھر کے اصیل مرغ ہضم کر جاتے۔ خیر اچھا ہی ہوا ورنہ چوری کی عادت ہو جاتی۔

کوٹلہ عالی جاہ میں ایک "الاوہ" ہے جسے "خونی الاوہ" کہتے۔ یہاں محرم میں عجیب و غریب کرتب کیے جاتے ہیں کسی شخص کا صرف سر طشت میں رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی کے گلے میں تلوار آر پار نظر آتی تھی۔ کسی کا نصف حصہ جسم نظر آتا ہے۔ یہ الاوہ محرم میں خوب معمور رہتا ہے۔ ایک روز ہم بھی تماشہ دیکھنے گئے۔ الاوے کے سامنے ایک دوست کا کوٹھا تھا۔ اس پر بیٹھ کر تماشہ دیکھ رہے تھے کہ ایک امیر کے صاحبزادے الاوہ دیکھنے کے لیے ہاتھی پر بیٹھ کر آئے اور ہمارے کوٹھے کے سامنے ہاتھی کھڑا ہو گیا۔ ہم نے مہاوت سے کہا بھی کہ میاں ذرا ہاتھی کو آگے بڑھا لو۔ مگر مہربان اور باور کیجیے جن جن ناموں کے ساتھ "بان" آتا ہے وہ بڑے بدمعاش ہوا کرتے ہیں۔ اس فیل بان نے سنا ہی نہیں۔ ہم نے بھی ایک ترکیب سوچی اور گھر میں جا کر چولھے کے پاس سے پھکنی اٹھا لایا اور پسی ہوئی مرچ لے کر پھکنی میں ادھر ادھر بھر دیا اور ایک طرف کاغذ لگایا۔ اسے لیے باہر نکلے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہاتھی کی آنکھ میں مرچ جھونک دیں۔ وہ خود بھاگ جائے گا۔ مگر جب ہم اس کے گھر کے دروازے سے نکلے تو یہاں ہاتھی لید فرما رہے تھے۔ جب وہ فراغت حاصل کر چکے تو ہمیں خیال ہوا کہ اب کون سونڈ کے قریب جا کر مرچ اچھالے۔ لاؤ یہیں جھونک دو۔ چنانچہ پھکنی کو ایک طرف منہ لگا کر پھونکا تو ساری مرچ اڑ کر معدے میں جا رہی۔ گر اوپر جو صاحب زادے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے خدمت گار نے ہمیں "مرچ افگنی" کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ شاید ان سونڈوں نے آتش بازی لی تھی۔ جو ہودے ہی میں رکھی ہوئی تھی۔ اس خدمت گار نے ایک آتش بازی کا بڑا سا انار لے کر اس زور سے پھینک مارا کہ باوجود ہمارے پینترا بدلنے کے ہماری پیٹھ پر آ لگا اور ہم دوڑ کر کوٹھے پر چڑھ گئے ابھی ہم نے کوٹھے کی سیڑھیاں بھی طے نہیں کی تھیں کہ ہاتھی صاحب نے آگے بڑھ کر ایک دکان سے سرین کو رگڑنا شروع کیا اور مہاوت

نے آنکس مار مار کر اس کا سرالگ لہولہان کر دیا۔ آخر غریب ہاتھی نے چنگھاڑتے ہوئے دوڑنا شروع کیا، اور ہمارے سر سے بلا دفع ہو گئی۔ معلوم نہیں اس ہاتھی نے کہاں پہنچ کر دم لیا۔ اور ان صاحبزادوں کا کیا حال ہوا کہ دوسرے اور تیسرے روز ہم نے "شیر دکن" "صحیفہ" "عثمان گزٹ" تینوں اخبار دیکھے مگر اس واقعہ کی تفصیل یا ان صاحبزادوں کو ضرر پہنچنے کی خبر کسی کو بھی نہ تھی۔

۴۳ء میں ہماری ایک عزیزہ معہ اپنی صاحبزادیوں اور اپنے صاحبزادوں کے گلبرگہ شریف تشریف لائی تھیں۔ جب وہ گلبرگہ سے حیدرآباد کو واپس تشریف لے جانے لگیں تو ہم انہیں پہنچانے اسٹیشن گئے۔ رات کا وقت تھا۔ زنانے ڈبے میں صرف دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمارے بھائی نے قلی سے سامان رکھوا دیا، اور پھر زنانے ڈبے میں سوار کرا کر خود دروازے کے اندر جا کر برتھ پر پاندان رکھنے لگا۔ ڈبے میں پہلے صرف دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ ایک بچاری بڑی بی تھیں جس کی سفید پوشی بیوگی کا اظہار کر رہی تھی۔ اور دوسری کوئی بڑی منہ سے دار عورت تھی۔ لڑکے کے اندر جانے پر اس غریب بیوہ نے تو ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر اس منہ سے دار نے بس ڈبہ ہی سر پہ اٹھا لیا۔ سیکڑوں صلواتیں سنانے لگی۔ لڑکا تو خیر پاندان رکھ کر اتر آیا۔ مگر اس عورت کا چیخنا بند نہ ہوا۔ میں نے ڈبے کے باہر ہی کھڑے ہو کر سمجھایا کہ "بائی وہ لڑکا تھا اس سے پردہ ہی کیا ہے۔ تمہیں گھور نے تھوڑا ہی آیا تھا۔ پاندان رکھ کر چلا گیا۔ بس اتنا سنتے ہی اس "حرافہ" نے مجھے گالیاں دینا شروع کیں۔ اور وہ گالیاں شروع کیں کہ میں نے عمر بھر میں کبھی نہیں سنی تھیں۔ خیر ہم نے صبر کیا اور گاڑی کے مارچ ہونے کے انتظار میں پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کیا۔ خالہ زاد بھائیوں کو دوسرے ڈبے میں بٹھا دیا اور ٹرین کے مارچ ہونے سے پہلے پھر اسی ڈبے کے پاس آ گئے۔ بیگم صاحبہ کھڑکی سے لگ کر بیٹھی ہوئی برابر گالیاں سنا رہی تھی۔ ٹرین کے حرکت کرتے ہی ہم اچک کر پائدان پر چڑھ گئے اور کھڑکی کو بیچ میں لے کر دونوں ہاتھ ہم نے ان محترمہ کے گلے میں حمائل کر دیئے اور نہایت اطمینان سے ان کا گال کاٹ دیا۔ اور اس شوخ نے اس زور سے چیخ ماری کہ سارا ڈبہ گونج گیا۔ کیونکہ ٹرین تیزی سے گزرنے لگی تھی اور پلیٹ فارم ختم ہو رہا تھا۔ اس لیے ہم نے اس بیہودہ کارروائی کو ختم کر کے جلدی سے کودنا چاہا مگر اس حرافہ نے ایک زوردار چپت رسید کی کہ ہماری ٹوپی سر سے اڑ گئی اور ہم بدحواسی میں کود پڑے۔ شاہ آباد اسٹیشن پہنچ کر گاڑی رکی تو ان محترمہ نے اپنے اغوا کنندہ ساتھی کو بلا کر قصہ سنایا اور انہوں نے پولیس کو متوجہ کرنا چاہا مگر پولیس نے ان کو ہدایت کی کہ وہ گلبرگہ اسٹیشن کی پولیس کو مخاطب کریں۔ چونکہ وہ حضرت خود اس حرافہ کو کہیں سے اغوا کر کے لا رہے تھے اس لیے انہوں نے بھی کچھ زیادہ جرأت نہیں کی اور بعد کو معلوم ہوا کہ اس حرافہ نے جو ذات کی ہندو تھی مگر کسی مسلمان کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی۔ واڑی اسٹیشن تک برابر ہمیں گالیاں دیں اور گھڑی گھڑی یہ کہتی تھی کہ سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں ایسا۔ گویا اس کے نزدیک سیکنڈ کلاس میں اس کا امکان تعجب انگیز تھا۔ گو ہماری یہ حرکت نہایت بیہودہ تھی۔ کیونکہ اس ڈبہ میں ہماری بیگم صاحبہ (جو عنقریب ہم سے منسوب ہونے والی تھیں) بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور دوسری اعزہ بھی۔ مگر کسی نے اس حرکت کو دیکھا نہیں۔ البتہ آواز سب نے سنی۔ گو یہ سخت بیہودگی تھی۔ مگر اس سے زیادہ لطیف اور کوئی انتقام ہی کیا ہو سکتا تھا۔ ان گالیوں کا مزا اب بھی یاد ہے اور اس لطیف انتقام کی لذت بھی۔

ان میں دو تین واقعہ آپ کو بیہودہ اور ذرا رکیک نظر آئیں گے۔ مگر مجبوری سے میں نے صرف واقعات لکھ دیئے ہیں۔ ان میں رنگ آمیزی نہیں کی، اس "سچ گوئی" کی علت میں آپ چاہیں جو کہیں۔

حال کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے مگر اس کی تفصیل مضمون کو اور طویل کر دے گی اس لیے اسے کسی دوسری فرصت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

مگر حضرات ان واقعات کو ذرا اپنی ہی حد تک محفوظ رکھنا۔ ؏ یہ راز ہیں زندگی کے اپنے تم اس کا چرچا نہ کیجیے گا

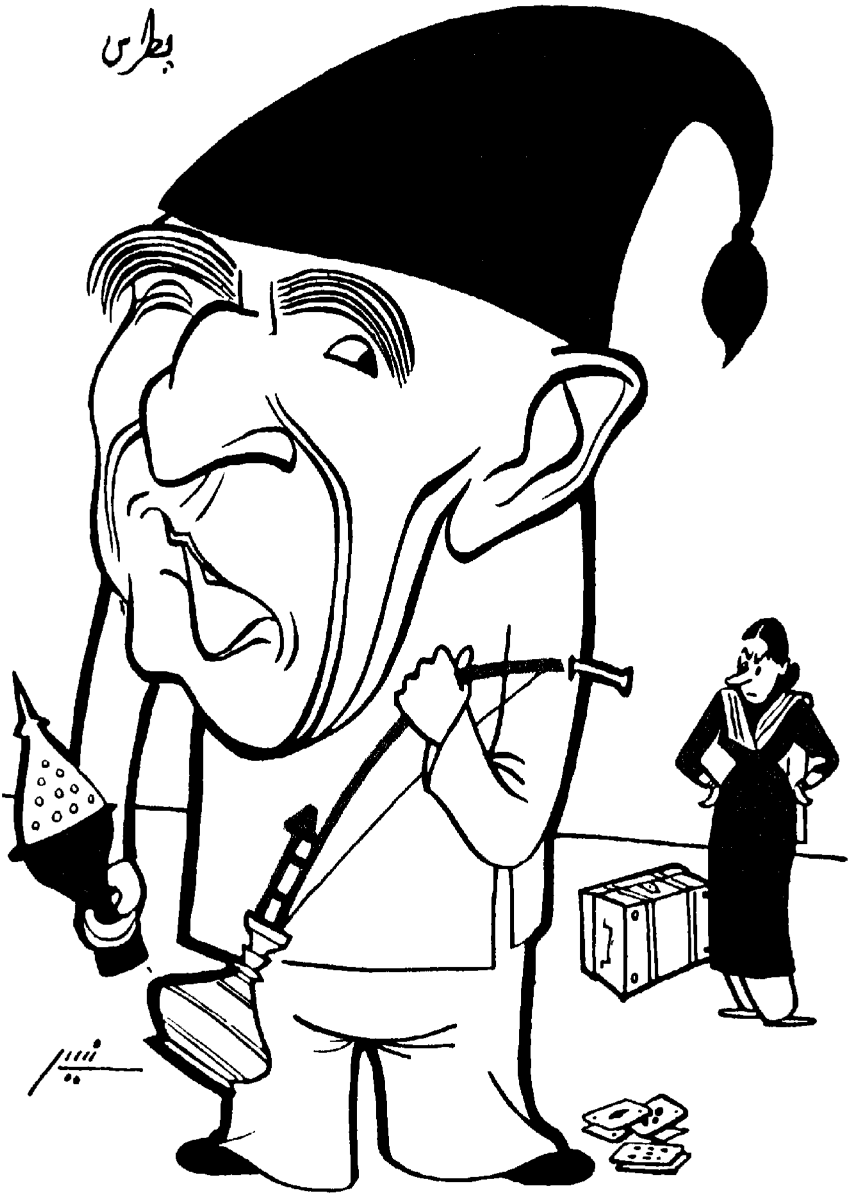
بطرس

میں ایک میاں ہوں

پطرس بخاری

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سے اس پہ کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے انھیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدا نخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیے۔ اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں۔ لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے، گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں، انہی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے ہمارے گھر میں ”موئے کبوتر باز“ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوّے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحریں، کبھی چھوٹی بحریں۔ ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کم بخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے۔ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے اندر آ جاؤ۔ ہم نے کہا نہیں آتے، تم باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لیے

دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے، کیوں بھئی خیر باشد! میں نے کہا کچھ نہیں، کہنے لگے اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا۔ اس لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا۔

"مرزا بھئی! کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عاداتِ قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے، ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پُراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری ......" اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع، ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔ لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا!

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کیے۔ یعنی اب بے شک دوست آئیں، بے شک اودھم مچائیں۔ میں بے شک کھاؤں، بے شک جب چاہوں اٹھوں، بے شک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا۔

"روشن آرا جلدی کرو۔ نہیں گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی۔ "خط ضرور لکھتے رہیے۔"

میں نے کہا "ہر روز اور تم بھی!"

"کھانا وقت پہ کھا لیا کیجیے اور وہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے، اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا دل بھی بے تاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا، تہ کر کے جیب میں ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پہ ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا، سگریٹ سلگا لیا، ٹانگیں سیٹ پہ پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی:-

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھو حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے"

"بہت اچھا"

"گیارہ بجے۔ سُن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے"

"بہت اچھا حضور!"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان، آدمی کا نام نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی، شطرنج کا کمرہ خالی، تاش کا کمرہ خالی، صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔ اس سے پوچھا:-

"کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا حضور! آپ جانتے ہیں اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سُوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا

ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا' دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟“

میں نے کہا تھیٹر!“

کہنے لگے ”بس بہت ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو میں ابھی آیا۔“

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا۔ اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پہ جمائی، جمائی پہ جمائی، حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں۔ لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا ”ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا، مردود کہیں کا۔ سارا دن میرا ضائع کر دیا۔“

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا۔ اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے، تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بیہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا ”حضور حجام آیا ہے۔“

ہم نے کہا ”یہیں بلا لاؤ۔“ یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سردئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا، گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بے تاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نامعلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداس ہوں، تم فوراً آ جاؤ۔

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس

بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لیے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی، سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمھاری خیر نہیں، اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا بہت معقول طریقے سے، قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں۔ اور ایک آدھ کام کا پتا اڑا نہیں اور ساتھ ہی قہقہے پہ قہقہے اٹھنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے، دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سب نے کہا "واہ وا کیا بات کہی ہے"! ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آجائے گی۔" دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے۔ سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے۔"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے۔" کوئی کہے "نہیں حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔" دوسرے نے کہا "نہیں صاحب ایک پاؤں پہ کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔" آخر میں بادشاہ سلامت بولے "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوکدار ٹوپی پہنائی جائے، اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ وا!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے، ہم نے کہا "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں، کل کسی اور کی باری آجائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شانِ استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقع پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقع الٹا تو روشن آرا۔

دم خشک ہو گیا۔ بدن پہ ایک لرزہ سا طاری ہو گیا، زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آجاؤ، میں بہت اداس ہوں اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آ رہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی..... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود از حد شریف واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک مَیں، مَیں ہوں مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے۔ اس لیے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پہ جایا کروں گا، نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکیے یا حجام کے اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"خط ہے؟"

"جی ہاں!"

"دے جاؤ، چلے جاؤ۔"

"ناخن تراش دو۔"

"بھاگ جاؤ۔"

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا، آپ دیکھیے تو سہی۔

بہادر شاہ
اور
پھول والوں کی سیر

فرحت اللہ بیگ

سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے ؎

"رعیت چو بیخ است سلطان درخت   درخت اے پسر باشد از بیخ سخت"

یہ جڑوں ہی کی مضبوطی تھی کہ دلّی کا سرسبز و شاداب چمن اگرچہ حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا اور فلاکت کی بجلیوں اور بادِ مخالف کے جھونکوں سے سلطنتِ مغلیہ کی شوکت و اقتدار کے بڑے بڑے ٹہنے ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ پھر بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس برائے نام بادشاہ کو تخت سے اتار کر دلی کو اپنی سلطنت میں شریک کر لے۔ مرہٹوں کا زور رہا۔ پٹھانوں کا زور رہا۔ جاٹوں کا زور رہا، انگریزوں کا زور رہا۔ مگر دلّی کا بادشاہ دلّی کا بادشاہ ہی رہا۔ اور جب تک دلّی بالکل تباہ نہ ہوئی اس وقت تک کوئی نہ کوئی تخت پر بیٹھنے والا نکلتا ہی رہا۔ دلّی کے ریذیڈنٹ نے بہت کچھ چاہا کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی کر دے۔ گورنر جنرل نے بڑی کوشش کی کہ شاہی خاندان کو قطب میں منتقل کر کے قلعہ پر قبضہ کر لے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بہت زور مارا کہ دلّی کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا جائے مگر بورڈ والے اس پر کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ دلی کا بادشاہ کیا ہے اور اس کے اثرات کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے مباحثے ہوئے۔ نوجوانوں نے بہت جوش و خروش دکھایا، مگر انگلستان کے جہاندیدہ بڈھوں کے سامنے کچھ نہ چلی۔ جب بورڈ میں مسٹر ملکر نے کھڑے ہو کر کہا:

عزیزو میں پچاس سال ہندوستان میں رہا ہوں۔ میں وہاں کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ دلّی کا قلعہ کیا ہے۔ اس کی بنیاد اگر ایک طرف کابل تک گئی ہے تو دوسری طرف راس کماری تک۔ ایک جانب آسام تک ہے تو دوسری طرف کاٹھیاواڑ تک ذرا قلعہ کو ہاتھ لگایا تو وہ زلزلہ آئے گا کہ سارا ہندوستان ہل جائے گا۔ یہ برائے نام بادشاہت جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو۔"

آخر بورڈ میں بڈھے جیتے اور نوجوان ہارے۔ دلّی کے بادشاہ کا اقتدار مزید کم ہو گیا۔ مگر جو عقیدت رعایا کو بادشاہ سے تھی اس میں ذرہ برابر فرق نہ آیا اور جو محبت بادشاہ کو رعایا سے تھی وہ جیسی کی ویسی رہی۔ رعایا کی وہ کونسی خوشی تھی جس میں بادشاہ حصہ نہ لیتے ہوں۔ اور بادشاہ کا وہ کونسا رنج تھا جس میں رعایا شریک نہ ہوتی ہو۔ بات یہ تھی کہ دونوں جانتے اور سمجھتے تھے کہ جو ہم ہیں وہ یہ ہیں اور جو یہ ہیں وہ ہم ہیں۔

شاہ عالمگیر ثانی کے قتل کے واقعہ ہی پر نظر ڈال لو۔ دیکھو کہ ہندو مرد تو مرد عورتوں کو بھی بادشاہ سے کیسی محبت تھی اور خود بادشاہ

اس محبت کی کیسی قدر کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کو فقیروں سے بڑی عقیدت تھی۔ جہاں سُن پاتے کہ کوئی فقیر آیا ہوا ہے اس کو بلاتے، نہ آتا تو خود جاتے، اس سے ملتے بہت کچھ دیتے دلاتے۔ اور فقیر نوازی کو توشۂ آخرت سمجھتے۔ غازی الدین اس زمانہ میں دلّی کا وزیر تھا۔ خدا جانے اس کو بادشاہ سے کیوں دلی نفرت تھی۔ قلعہ میں تو ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔ دھوکے سے بادشاہ کو مارنے کا جال پھیلایا۔ قلعہ میں مشہور کر دیا کہ پرانے کوٹلہ میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں۔ بڑے صاحب کرامات ہیں۔ بڑے خدا رسیدہ ہیں۔ مگر نہ کہیں خود جاتے ہیں نہ کسی کو آنے دیتے ہیں۔ ادھر بادشاہ کو ملنے کا شوق ہوا۔ ادھر لوگوں نے شاہ صاحب کی کرامتوں کے اور پُل باندھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن بادشاہ تن تنہا قلعہ سے نکل کوٹلہ پہنچے۔ ادھر ادھر کھنڈروں میں تلاش کی۔ یہاں تو پہلے ہی سے دشمن لگے ہوئے تھے۔ چار نمک حراموں نے ایک بُرج میں سے نکل کر بادشاہ کو شہید کر دیا۔ اور لاش جمنا کی ریتی میں پھینک دی۔ خدا کی قدرت دیکھو، ادھر سے ایک برہمنی رام کنور آ رہی تھی۔ اس نے جو لاش پڑی دیکھی تو ذرا ٹھٹکی۔ بھاگنے کا ارادہ کیا۔ پھر ذرا غور کیا تو کیا دیکھتی ہے کہ ہیں، یہ تو بادشاہ سلامت کی لاش ہے۔ رات بھر اس بے کس شہید کا سر زانو پہ لیے بیٹھی روتی رہی۔ صبح جمنا جی کے اشنان کو لوگ آئے۔ انہوں نے بھی لاش کو دیکھ کر پہچانا۔ تمام شہر میں کھلبلی پڑ گئی۔ اس بے کس شہید کی لاش دفن ہوئی۔ شاہ عالم ثانی بادشاہ ہوئے۔ انہوں نے رام کنور کو بلایا بہت کچھ انعام و اکرام دیا اور اس برہمن کو اپنی منہ بولی بہن بنا لیا۔ تھوڑے دنوں میں سلونوں کا تہوار آیا۔ بھائی کے لیے بہن موتیوں کی راکھی لے کر پہنچی۔ بادشاہ نے خوشی خوشی راکھی بندھوائی۔ بہن کو جوڑا دیا۔ اس کے رشتہ داروں کو خلعت دیئے گئے۔ راکھی بندھن کی رسم قلعہ کی رسموں میں شریک ہو گئی۔ جب تک قلعہ آباد رہا اس برہمنی کے خاندان اور قلعہ والوں میں بھائی چارہ رہا۔ ہر سال راکھیاں آتیں۔ بادشاہ اور شہزادیوں کے باندھی جاتیں۔ جوڑے دیئے جاتے۔ یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب بادشاہ سے قلعہ چھوٹا۔

پھول والوں کی سیر بھی اسی محبتِ باہمی کا نتیجہ تھی۔ ہوا یہ کہ اکبر شاہ ثانی اپنے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ سراج الدین ظفر بڑے بیٹے تھے مگر باپ بیٹے میں صفائی نہ تھی۔ مرزا جہانگیر کو بادشاہ بہت چاہتے تھے، اور کیوں نہ چاہتے۔ مرزا کی والدہ نواب ممتاز محل کا قلعہ میں زور تھا۔ بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم دونوں نے ریذیڈنسی میں کوشش کی کہ کسی طرح مرزا جہانگیر ولی عہد ہو جائیں۔ اس زمانہ میں دلّی کے ریذیڈنٹ سیٹن صاحب تھے۔ ایسا بادشاہ پرست انگریز ہی ہندوستان میں کوئی آیا ہو تو آیا ہو۔ اکبر شاہ کی وہ ایسی ہی عزت کرتے تھے۔ جیسی خود اپنے بادشاہ کی کرتے تھے۔ ٹوپی اتار کر مجرا گاہ سے آداب بجا لاتے۔ کرسی دی جاتی تو بادشاہ کے سامنے کبھی نہ بیٹھتے۔ گفتگو میں آدابِ شاہی ملحوظ رکھتے۔ بادشاہ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ غرض سب کچھ کرتے تھے مگر اس بات پہ راضی نہ ہوتے تھے کہ مرزا جہانگیر ولی عہد ہوں۔ بظاہر اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ سلسلۂ تخت نشینی کو درہم برہم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور دوسری یہ تھی کہ وہ مرزا جہانگیر کے عادات و اطوار سے مطمئن نہ تھے۔

مرزا جہانگیر بلا کے پینے والے اور غضب کے منہ پھٹ تھے۔ اس مخالفت سے دلوں میں بیر تو پڑ ہی گیا تھا۔ ایک دن سرِ دربار مرزا جہانگیر نے سیٹن صاحب کو "لُولُو ہے بے" کہہ دیا۔ صاحب کسی نہ کسی طرح پی گئے۔ تھوڑے دنوں بعد یہ غضب کیا کہ ان پہ گولی چلائی۔ آخر کہاں تک طرح دی جاتی۔ قید ہو کر الہ آباد گئے۔ ممتاز محل کو بڑا صدمہ ہوا۔ منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ کر آئیں گے تو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی۔ خدا کی قدرت اور سیٹن صاحب

کی شرافت دیکھیے کہ انہی کی سفارش پر صاحبِ عالم اس قید سے رہا ہوئے۔ دلّی آئے۔ بادشاہ بیگم نے منت بڑھانے کی تیاریاں کیں۔ بڑی دھوم دھام سے چادر گئی۔ شہر بھر کے تمام ہندو مسلمان شریک ہوئے۔ قطب میں کئی دن تک میلہ لگا رہا۔ پھول والوں نے جو مسہری بنائی تو اس میں خوبصورتی کے لیے ایک پھولوں کا پنکھا بھی لٹکا دیا۔ سراج الدین ظفرؔ ولی عہد سلطنت نے "پنکھا" کہہ کر گذرانا۔

نورِ الطاف و کرم کی ہے یہ سب اس کے جھلک　　کہ وہ ظاہر ہے مَلک اور ہے باطن میں مُلک
اس تماشہ کی نہ کیوں دھوم ہو افلاک تلک　　آفتابی سے خجل جس کے ہے خورشیدِ فلک
یہ بنا اس شہِ اکبر کی بدولت پنکھا!

شائق اس سیر کے سب آج ہیں بادۂ دل　　واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشمِ انجم ہو نہ اس سیر پہ کیوں کر مائل　　سیر یہ دیکھے ہے وہ بیگم والا منزل
جس کے دیوان کا رکھے ماہ سے نسبت پنکھا

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زبس ماہ تلک　　ڈوبے ہیں رنگ میں مدہوش سے آگاہ تلک
آج رنگین ہے رعیت سے لگا شاہ تلک　　زعفران زار ہے اک بام سے درگاہ تلک
دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پنکھا

بادشاہ کو یہ میلہ بہت پسند آیا۔ دلّی والوں سے پوچھا کہ اگر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلہ ہوا کرے تو کیسا؟ مسلمان درگاہ شریف پہ یہ پنکھا چڑھائیں۔ ہندو لوگ مایاجی پر چڑھائیں۔ مسلمانوں کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک ہوں۔ میلہ کا میلہ ہو اور دونوں قوموں میں میل جول بڑھے۔ بھلا نیکی اور پوچھ پوچھ۔ دلی والے راضی ہو گئے۔ لیجیے پھول کی سیر کی بنیاد پڑ گئی۔ بادشاہ سلامت خود قطب جاتے، وہاں رہتے، شہزادے میلہ میں شریک ہوتے۔ بڑھتے بڑھتے یہ میلہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اسی زمانہ میں یہ گانا چلا۔

قطب کو چلا میرا اکبر ہٹیلا　　یہ رستہ میں جنگل نہ ملتا ہے نہ ٹیلا

بہادر شاہ کے زمانہ میں تو اس کا وہ زور ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس زمانہ میں پھول والوں کی سیر کیسی ہوتی تھی تو ذرا آنکھیں بند کر لیجیے۔ میں دکھائے دیتا ہوں۔

سنہ ۱۲۶۴ھ کا ساون بھی غضب کا ساون تھا۔ یا تو برستا ہی نہ تھا، یا برسا تو ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ بُدھ بُدھ پندرہ دن ہو گئے۔ مینہ نہ آج کھلتا ہے نہ کل۔ اور پانی کا یہ حال ہے کہ دھائیں دھائیں یکساں برسے چلا جاتا ہے۔ جمنا بڑھ کر نگمبود گھاٹ تک آ گئی۔ کیلا گھاٹ میں سے پانی ہو کر شہر میں گھس آیا۔ چاندنی چوک کی نہر ابل کر کناروں سے نکل گئی۔ بیچارے چھوٹے چھوٹے مکانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے بڑی بڑی حویلیاں چیں بول گئیں۔ اڑ اڑا دھم کی آوازیں چلی آ رہی ہیں۔ اس مکان کی چھت بیٹھی اس کا پاکھا گرا۔ شاید ہی کوئی مکان ہو گا جس کی کم سے کم چھت نہ گری ہو۔ غریب غربا گھر چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ جامع مسجد کے نیچے سامان کا ڈھیر ہو گیا۔ کسی نے پلنگ بچھا اوپر سے دری ڈال چھوٹی سی کوٹھڑی بنا لی۔ کسی نے چھپر کھٹ کے گرد چادر گھیر، عورتوں کے لیے جگہ نکال لی۔ غرض ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ دو سال پہلے بھی ڈھائی ڈھوئی مینہ برسا تھا۔ مگر یہ تو کچھ اور ہی رنگ تھا۔ بنئے اپنی مصیبت میں مبتلا تھے۔ بھٹیا رے

اپنے حال میں گرفتار۔ آخر رہیں تو کہاں رہیں اور کھائیں تو کیا کھائیں۔

دلی میں بہادر شاہ برائے نام بادشاہ تھے۔ سارا انتظام کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھا۔ بھلا کمپنی کو کیا غرض پڑی تھی جو ان غریب شہر والوں کی خبر لے۔ شہر والے جانیں اور ان کا کام جانے۔ خیر بادشاہ سلامت کو خبر ہوئی۔ بیچارے کے جو کچھ اختیار میں تھا وہ کیا۔ سارے سرکاری مکان کھلوا دیئے۔ کوٹ قاسم کی مال گزاری انہی دنوں میں آئی تھی۔ وہ سب کی سب اس مصیبت ماری رعیت پر خرچ کر دی۔ مسلمانوں کو دونوں وقت کھانا پہنچایا۔ ہندوؤں کو غلہ دیا۔ سر چھپانے کو جگہ دی۔ غرض یہ مصیبت کے دن بھی کسی نہ کسی طرح گزر گئے۔ سولھویں دن ذرا پانی نے دم لیا۔ ابر پھٹا سورج کا کونا دکھائی دیا۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ دو چار دن مکانوں کی مرمت اور حالت کی درستی میں لگے۔ اس کے بعد یاروں کو میلہ کی سوجھی۔

بھلا جمنا ایسی بھرپور چلے اور دلی والے چپکے بیٹھے رہیں۔ ڈھنڈورا پٹ گیا کہ کل تیراکی کا میلہ ہے۔ صبح ہی سے قلعہ کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ آٹھ نو بجے تک تو یہ حالت ہوئی کہ شہر خالی ہو گیا۔ بیلہ[1] آباد ہو گیا۔ پنواڑیوں کاچھیوں، بساطیوں، سوداگروں، غرض ہر قسم کے سودے والوں کی دکانیں لگ گئیں۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ بادشاہ سلامت بھی نکل سمن[2] برج میں آ بیٹھے۔ شہزادوں کے لیے دیوان خاص کے صحن میں فرش ہو گیا۔ بیگمات اور شہزادیوں کے لیے موتی محل خاص محل اور اسد برج کی جالیوں کے سامنے مسندیں بچھ گئیں۔ تیراکوں کے استاد اپنے شاگردوں کو لے جمنا میں اترے اور تیراکی کے کمال دکھانے شروع کیے۔ کوئی چت تیرا تو اس طرح گویا تختہ بہا چلا آتا ہے۔ کسی نے کھڑی ماری تو ایسے ایسی کہ گھٹنے تک پانی سے نکل آیا۔ کوئی ہے کہ گٹھڑی بنا بہاؤ چلا جاتا ہے۔ کوئی شیر کے ہاتھ مارتا چڑھاؤ پر سیدھا چڑھ رہا ہے۔ ادھر تیراکی ہو رہی تھی ادھر قلعہ والوں اور شہر والوں میں کنکوے بازی شروع ہوئی۔ تکلیں لڑیں تو ایسی کہ چکراتی چکراتی مقبرہ[3] سے آگے نکل گئیں۔ پتنگ اڑے تو ایسے کہ سارا آسمان کنکووں سے چھپ گیا۔ غرض یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ دو دن پہلے اس شہر میں آفت بپا تھی۔ شام ہوتے ہوتے میلہ بچھڑنا شروع ہوا۔ رات کے نو دس بجے بیلہ پھر وہی جنگل کا جنگل ہو گیا۔ ہاں دونوں اور آبخوروں کے ڈھیر پیکوں کے نشان اور چھلکوں کے انبار یہ ضرور بتلاتے تھے کہ یہاں کوئی بڑا شہر تھا جو دم بھر میں بسا اور دم بھر میں غائب ہو گیا۔

ساون ختم ہوا۔ بھادوں لگا۔ جھڑیوں کا زمانہ گیا۔ پھوار کا زمانہ آیا۔ دلی والوں کے دلوں میں پھر گدگدی شروع ہوئی۔ قطب کا سبزہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ پھول والوں کی سیر کی سوجھی۔ شرفاء دہلی میں سے دو ہندو اور دو مسلمان لال حویلی[4] پہنچے۔ اطلاع کرائی باریابی ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لائے۔ کہا "پیر و مرشد! پھول والوں کی سیر کا زمانہ آ گیا ہے۔ جھرنا اور شمسی تالاب بھر کر کٹورہ ہو گئے۔ کوئی تاریخ مقرر فرما دی جائے۔ اگر جہاں پناہ بھی تشریف لائیں تو زہے نصیب۔" بادشاہ نے فرمایا "ہاں

---

[1] جمنا کی ریتی کے برابر جھاؤ کا جو جنگل ہے اس کو بیلہ کہتے ہیں۔

[2] قلعہ میں تسبیح خانہ سے ملا ہوا یہ ایک ہشت پہلو برج ہے۔ نام تو اس کا مثمن برج لیکن دلی والے اس کو سمن برج کہتے ہیں۔

[3] مقبرہ سے مراد ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ یہ عمارت دلی سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

[4] دہلی کے قلعہ کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہتے تھے۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان کا شعر ہے ؎

میری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں
دہائی ہے بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے

اماں[1] ٹھیک تو ہے۔ جو تمہاری خوشی ۱۵ تاریخ مقرر کردو۔ رہا ہمارا آنا۔ تو جہاں تم وہاں ہم کیوں نہ آئیں گے۔" تاریخ مقرر ہونا تھا کہ شاہی روشن چوکی کا شہنائی نواز چاندی کی نفیری ہاتھ میں لیے حاضر ہوا۔ نفیری پر شادیانہ بجایا۔ لیجیے سیر کی ۱۵ تاریخ پکی ہو گئی۔ سارے شہر میں نفیری بج گئی کہ پندرھویں کو پھول والوں کی سیر ہے۔ لوگوں نے تیاریاں شروع کیں۔ بادشاہ سلامت دربار خاص سے اٹھ کر تسبیح خانے میں گئے ہی تھے کہ تمام بیگمات اور شہزادیاں جمع ہونی شروع ہوئیں۔ ایک آئیں سلام کر کے بیٹھ جاتیں۔ دوسری آئیں بیٹھ جاتیں۔ تھوڑی دیر میں سارا قلعہ تسبیح خانہ میں جمع ہو گیا۔ لیکن سب ہیں کہ منہ سے چپ ہیں۔ مگر نگاہیں صاف کہہ رہی ہیں کہ قطب چلیے۔ بادشاہ سلامت بھی سمجھ گئے۔ فرمایا:۔

اماں میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ سیر کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ آج دس ہے۔ پندرہ کو سیر ہے۔ اچھا ہو گا کہ سب سے پہلے ہم چلے چلیں۔ بعد میں گئے تو شہر والوں کو تکلیف ہو گی۔ دو تین دن قطب کا لطف اٹھا لو اور پھر قطب دلّی والوں کے سپرد کر دو۔ لو جاؤ چلنے کی تیاری کرو۔ ان شاء اللہ کل سے سویرے سویرے روانہ ہوں گے۔ اور ہاں۔ میاں[2] دارا۔ تم ہماری سواری کا بندوبست کرو۔ کوتوال سے کہہ دو۔ قلعہ دار سے کہہ دو۔ حکیم صاحب[3] سے میں خود کہہ دوں گا۔ صبح سویرے نکل گئے تو سلطان جی ہوتے ہوئے شام تک ان شاء اللہ قطب پہنچ جائیں گے۔ یہ سب لوگ تو اتنا سننے کے لیے جمع ہی ہوئے تھے۔ ایک ایک اٹھ مجرا کر رخصت ہوا۔ سامان بندھنے لگا۔ سامان بندھتا اور داروغہ توشک کے پاس پہنچ جاتا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ بیسیوں پیٹیاں، سینکڑوں لوغیند، ہزاروں گٹھریاں، لاکھوں پوٹلیاں، غرض الم غلم منوں سامان جمع ہو گیا۔ کچھ چھکڑوں میں لادا گیا۔ کچھ اونٹوں پہ چڑھایا گیا۔ کچھ شکرموں[4] میں رکھا گیا۔ کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا عمل ہو گا کہ سامان چلنا شروع ہوا خدا خدا کر کے کہیں دو بجے۔ اس لین ڈوری کا تانتا ختم ہوا۔ اس وقت کہیں جا کر بیچارے داروغہ کو دم لینے کی فرصت ملی۔ ابھی پوری طرح دم نہ لیا تھا کاروا بیگنی نے حکم پہنچایا کہ "حضرت جہاں پناہ کا ارشاد ہوا ہے کہ توشک خانہ شاہی ابھی روانہ ہو۔ جنگلی محل میں قیام ہو گا۔ اس لیے خیموں، سراپردوں اور شامیانوں کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں شہر والے اگر یہ سامان طلب کریں تو دے دیا جائے۔ دوسرے حکم کا انتظار کیا جائے اور حکیم صاحب کے ذریعہ سے شہر کے لوگوں کو اس حکم کی اطلاع کرا دی جائے۔" حکم پہنچنا تھا کہ داروغہ صاحب پھر کمر باندھ، اپنے پیش دستوں کو لے سرکاری سامان باندھنے کی فکر میں لگ گئے۔ یہاں انتظام والے تو اپنی مصیبت میں گرفتار تھے اور وہاں قلعہ والوں کی یہ حالت تھی کہ گویا شادی رچی ہوئی ہے چوڑی والیاں بیٹھی دھانی چوڑیاں پہنا رہی ہیں۔ رنگ ریزنیں سرخ دوپٹے رنگ رہی ہیں۔ کہیں مہندی لپس رہی ہے۔ کہیں کڑاہیاں نکالی جا رہی ہیں۔ کہاں کا کھانا اور کہاں کا سونا۔ اسی گڑبڑ میں رات کے بارہ بجا دئیے۔ کوئی دو بجے ہوں گے کہ سواری کا بگل ہوا۔ قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے نوبت خانہ سے ملا ہوا جو میدان ہے اس میں سواریاں آ لگیں۔ انائیں۔ مغلانیاں۔ خواصیں[5] چھوکریاں۔ لونڈیاں۔ سرتیں[6] سوار ہونا شروع

---

[1] آخر زمانہ میں شاہان دہلی انہی معنوں "اماں" کا لفظ استعمال کرتے تھے جن معنی میں آج کل بھئی کا لفظ بولتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری اردو کا یہ خیال تھا کہ یہ لفظ شاید "اے میاں" کا مخفف ہے۔ چنانچہ اب بھی دہلی میں اے میاں کو مختصر کر کے امیاں بولا جاتا ہے۔ ان کے اس خیال کو پیش نظر رکھ کر میں نے دلّی کے شہزادوں سے اس کی مکرر تحقیق کی۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت اس لفظ کو اپنے اصلی یعنی "ماں" کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اس لفظ کا استعمال حیدر آباد دکن میں اب بھی عام طور سے ہوتا ہے۔

[2] مرزا دارا بخت ولی عہد سلطنت تھے [3] احترام الدولہ۔ عمدۃ الحکماء معتمد الملک۔ حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں ثابت جنگ بہادر وزیر اعظم تھے۔ ان ہی کی شہادت نے بیچارے بادشاہ کو رنگون دکھایا۔ [4] اونٹ گاڑی کو پہلے شکرم کہتے تھے۔ پھر یہ لفظ بند گھوڑا گاڑی کے لیے بھی بولا جانے لگا۔ [5] اس زمانہ میں بیگمات اور شہزادیوں کی مصاحبوں کو خواص کہتے تھے۔ درجہ میں یہ مغلانیوں سے بڑی ہوتی تھیں۔ [6] زرخرید لونڈیاں سرتیں کہلاتی تھیں۔ سریہ عربی میں لونڈی کو کہتے ہیں۔

ہوئیں۔ بہارکسوں۔ مجھولیوں اور بہلیوں میں وہ ٹھساٹھس ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ سانگیوں[1] اور ماچیوں[2] میں پہلے تو اثاث سامان بھرا۔ اوپر سے بھی دو دو تین تین چھوکریاں اور مامائیں دھنس گئیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح سے یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ بیل لگائے گئے اور یہ قافلہ قطب کو روانہ ہوا۔ مشعلچی مشعلیں اور تیل کی کپیاں ہاتھ میں لیے ساتھ ہوئے۔ یہ لوگ قلعہ کے باہر ہی ہوں گے کہ بیگمات اور شہزادیوں کی رتھیں، ڈولیاں نیمے[3]۔ میانے[4]۔ پالکیاں[5] چوپہلے[6]۔ جنڈ ول اور سکھپال موتی محل کے برابر آلگے۔ شہزادہ ولی عہد بہادر بھی باہر نکل آئے۔ دگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے راستے بند کیے۔ ترکنوں اور گرجنوں نے قناطیں کھینچیں جو بیگم یا شہزادی باہر آتیں ان کو بلحاظ ان کے درجہ کی سواری ملتی۔ ہر سواری کے ساتھ ایک قلماقنی اور ایک اردابیگنی مقرر ہو جاتی۔ تین سوا تین بجے ہوں گے کہ پہلی رتھ روانہ ہوئی۔ آگے آگے رتھیں، ان کے پیچھے دوسری سواریاں۔ سب کے آخر میں نواب زینت محل کا سکھپال۔ لاہوری دروازہ پر سواری پہنچی تھی کہ کپتان ڈگلس قلعدار نے اتر کر سلامی دی۔ دروازہ کے باہر سے دگلہ پلٹن کا ایک بہا آگے ہو لیا اور ایک پیچھے۔ شہزادیوں کی سواری کے ادھر ادھر قلماقنیاں مردانہ لباس پہنے کلغی دار پگڑیاں باندھے، ساتوں ہتھیار سجائے ساتھ ہوئیں۔ بیگمات کی سواریوں کو ترکنوں کی پلٹنوں نے بیچ میں لیا۔ ان کا بھی مردانہ فوجی لباس۔ گورے گورے چہرے۔ شانوں پر کاکلیں پڑی ہوئیں۔ سر پر چھوٹا سا عمامہ۔ اس میں سفید پروں کی اونچی کلغی۔ ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی برچھیاں۔ پشت پر ترکش۔ شانہ پہ کمان۔ پہلو میں تلوار۔ ڈاب میں پیش قبض۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کی فوج دلی میں گھس آئی ہے۔ نواب زینب محل کی سواری کا بڑا ٹھاٹ تھا۔ آگے آگے دو حبشنیں گھونگر والے بال۔ ان پر سرخ پگڑیاں، پگڑیوں میں سفید مقیش کے پھندلے۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ لال لال دیدے۔ سرخ گورنٹ کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ گھوڑوں پر سوار۔ ہاتھوں میں پتلی پتلی چوبیں۔ سامنے گھوڑوں کی پشت پر زر بفت سے منڈے ہوئے ڈنکے[7]۔ ایک چوب مارتی دوسری پکارتی۔ ادب سے نگاہ روبرو۔ حضرت بادشاہ بیگم سلامت" سکھپال کے دونوں طرف دو دو گرجنیں۔ ایک کے ہاتھ میں مورچھل دوسرے کے ہاتھ میں چنور۔ ہر ہر قدم پر بسم اللہ، بسم اللہ کہتی چلی آتی تھیں۔ سب سے پیچھے اردابیگنیوں کی پلٹنیں۔ مردانہ لباس پہنے ہتھیار لگائے اپنی اپنی ساتھ تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مشعلچنیں، کسی کے ہاتھ میں مشعل اور کپی۔ کسی کے ہاتھ میں دو شاخہ کسی کے ہاتھ میں پنج شاخہ سواری کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ یہ جلوس دلی دروازہ تک تو اسی سلسلہ سے گیا۔ دروازہ کے باہر نکل کر رتھیں تو ترکمان دروازہ کی طرف سے ہوتی ہوئیں قطب کی سڑک پر پڑلیں اور دوسری سواریاں دروازہ کے باہر ہی ٹھہر گئیں۔

کوئی چار بجے ہوں گے کہ بادشاہ سلامت بیدار ہوئے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر گڑ[8] کا شربت پی کر معدہ صاف کیا۔

---

[1] - [2] بھارکسوں اور بہلیوں کے سامنے بانس باندھ کر اور سوت کا جال بنا کر جو جگہ بنا لیتے ہیں۔ اس کی سانگی اور اسی طرح پیچھے گھانس وغیرہ بھرنے کو جو جھولی سی بنا لیتے ہیں اس کو ماچی کہتے ہیں۔

[3] [4] [5] [6] آدمی پالکی کو نیمہ کہتے ہیں۔ اس میں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے۔ اس سے بڑی میانہ ہے جو پہلے بھی پالکی کی وضع کے ہوتے ہیں مگر ان کی شکل بجائے مستطیل کے چوکور ہوتی ہے ــــ [7] نواب زینب محل خاندان شاہی سے نہ تھیں۔ نواب علی قلیخاں کے خاندان میں نواب شمشیر الدولہ کی لڑکی سے بادشاہ نے بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ خدا کی قدرت سے اولاد ہوئی۔ جواں بخت نام رکھا گیا۔ انہی کی ولی عہدی کے جھگڑوں نے قلعہ میں تفرقہ ڈالا۔ بیگم کی محبت میں بادشاہ ایسے گرفتار تھے کہ جو وہ چاہتیں بلا چون وچرا کرتے۔ آخر انہی مخالفتوں نے رنگون پہنچا دیا۔ یہ بیگم جب نکلتیں ڈنکہ ان کے ساتھ ہوتا۔ اسی لیے ان کو ڈنکے والی کہا جاتا تھا۔ قلعہ میں کم رہتی تھیں۔ لال کنوئیں پر نیا محل بنوا لیا تھا۔ غدر کے بعد وہ محل پٹیالہ والوں کو ملا۔ اب وہ بھی ٹھکانے لگ گیا۔ [8] بہادر شاہ مرحوم کا دستور تھا کہ صبح اٹھتے ہی گڑ کا (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خانساماں نے یاقوتی کی سربمہر پیالی پیش کی۔ مُہر توڑ کر یاقوتی نوش جان کی اور فرمایا۔ "اماں سب لوگ سدھاریے!" "عرض کی جہاں پناہ کے اقبال سے سب انتظام ہوگیا۔ میر تزک[1] حاضر ہیں۔ کیا ارشاد ہوتا ہے۔" فرمایا "اچھا بسم اللہ کرو۔" یہ حکم ہونا تھا کہ بگل ہوا۔ ولی عہد بہادر کے لیے تام جھام۔ مرزا شاہ رخ کے لیے تخت رواں۔ مرزا فخرو کے لیے بوچہ اور خود بادشاہ سلامت کے لیے ہوادار، دیوان خاص میں آگیا۔ باقی سب شہزادے اور سلاطین زادے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ادھر بادشاہ سلامت نے باہر نکل ہوادار میں قدم رکھا اور ادھر چوبدار نے آواز لگائی۔ "ادب سے تعظیم سے مجرا بجالاؤ۔" حضرت بادشاہ سلامت کو شہزادوں نے تلوار میان سے نکال سلامی دی۔ دوسرے لوگ جھک کر آداب بجالائے۔ بادشاہ سلامت کے بعد ولی عہد بہادر، مرزا شاہ رخ اور مرزا فخرو سوار ہوئے۔ ہوادار کے پیچھے ایک خواصی نے چتر شاہی کھولا۔ دوسرے نے سورج مکھی لی اور یہ جلوس آہستہ آہستہ قلعہ کے دہلی دروازہ کی طرف چلا۔ دروازہ کے باہر پہلے سے فوج کی شتل بندھی ہوئی تھی۔ سب سے آگے نشان کا ہاتھی اس پر شاہی پرچم۔ اس کے پیچھے نقارہ کے اونٹ، اونٹوں کے بعد ترک[2] سواروں کا رسالہ۔ رسالے کے بعد روشن چوکی کے تخت تختوں کے پیچھے میر تزک۔ اس کے بعد سلاطین زادوں کی سواریاں، شہزادوں کے گھوڑے۔ مرزا فخرو کا بوچہ۔ مرزا شاہ رُخ کا تخت رواں۔ مرزا دارا بخت کا تام جھام۔ ان کے پیچھے دور[3] باش اور دورباش کے پیچھے بادشاہ سلامت کا ہوادار۔ ہوادار کے پیچھے فوج کا پرا۔ آخر میں قلعہ کے نوکر چاکر۔ بہیرو بنگاہ۔ سڑک کے کنارے کنارے مشعلچیوں کی قطاریں۔ غرض قلعہ[4] کے دلی دروازہ سے جو شتل بندھی تو پرانے کوٹلہ پر جاکر ختم ہوئی۔ سواری قلعہ کے دروازہ سے نکلی ہی تھی کہ شہدوں نے غُل مچایا۔ حضرت پیر و مرشد ہمارا حق بھی مل جائے۔ خدا تعالیٰ عمر و اقبال میں ترقی کرے آمین۔ اور صدہا سال یہ سایہ دلی والوں کے سروں پر قائم رکھے۔ آمین۔ خدا شہزادے شہزادیوں کو سلامت رکھے۔ آمین۔ سیر آرہی ہے۔ کچھ ایسا ملے کہ ہم بھی جہاں پناہ کے صدقہ میں سیر کی بہار دیکھ لیں۔ بادشاہ سلامت نے اشارہ کیا۔ خواصی نے مٹھائیاں بھر بھر کر روپیے ہوادار پہ سے نچھاور کیے۔ پھر کیا تھا۔ روپوں کے ساتھ شہدے سڑک پر بچھ گئے۔ کسی نے ہاتھ پھیلائے، کسی نے جھولی پھیلائی۔ سواری چلنی مشکل ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک یہی ہنگامہ رہا۔ جب دل بھر کر روپیہ لوٹ چکے تو شہدے دعائیں دیتے رخصت ہوئے۔ اور ہوادار آگے بڑھا۔ لوگوں کو پہلے ہی سے خبر ہوگئی تھی کہ آج پچھلی رات کو سواری مبارک قطب جائے گی۔ رات کے بارہ ہی بجے سے خاص بازار سے لگا فیض بازار اور شہر کے دلی دروازہ تک خلقت کا ہجوم تھا۔ بازاروں میں آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ چھتوں اور کمروں پر ہزاروں عورتیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) شربت پی کر جوں کا توں نکال دیتے تھے۔ اس طرح کل رطوبات فاسدہ خارج ہو کر معدہ صاف ہو جاتا۔

[1] قلعہ میں میر تزک کا بڑا درجہ تھا۔ دربار اور جلوس کا انتظام اور لوگوں کو باریاب کرنے کی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ ایک یہی شخص تھے جن کو دربار میں جریب لے کر کھڑے ہونے کی اجازت تھی۔ ذرا کسی نے آدابِ شاہی میں اونچ نیچ کی اور انہوں نے کھٹ سے جریب پاؤں پہ ماری۔ یہ خدمت سعادت یار خاں رنگین کے خاندان میں مدت تک رہی۔

[2] دلی کی جو فوج انگریزی لباس اور انگریزی ہتھیاروں سے آراستہ تھی اس کو ترک سوار کہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ترکوں کا بھی یہی فوجی لباس تھا۔ [3] دورباش ایک خوبصورت رنگین شہتیر ہوتا تھا جس پہ برچھیاں لگی ہوتی تھیں یہ سواری کے آگے رہتا تھا کہ کوئی بادشاہ پر حملہ نہ کرے۔

[4] قلعہ کے دروازے میں لاہوری دروازہ اور دلی دروازہ۔ شہر پناہ کے دروازوں کے بھی یہی نام ہیں۔ لاہوری دروازہ کھاری باولی کے کنارہ پر تھا وہ زمین کے برابر کر دیا گیا۔ ہاں دلی دروازہ موجود ہے فیض بازار کے سرے پر ہے اور اسی میں سے ہو کر پرانے قلعہ کو سڑک گئی ہے۔

بیٹھی جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہر شخص اپنے بادشاہ کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ وقت کم تھا اس لیے بازاروں میں آئینہ بندی تو نہیں ہوئی تھی۔ ہاں بعض بعض مکانوں کے دروازہ۔ کمروں کے روکار اور دکانیں سجا کر روشنی کر دی تھی۔ جلوس آہستہ آہستہ ان سڑکوں پر سے گزرا۔ ایک سناٹے کا عالم تھا۔ مگر ہر شخص کے بشرہ اور آنکھوں سے جوش ٹپک رہا تھا۔ بادشاہ سلامت بھی اس جوش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک پھریری سی آئی اور آنکھوں سے خود بخود آنسو نکل کر رخساروں پر بہ آئے۔ کیا خبر تھی کہ نو برس نہ گزریں گے کہ اسی سڑک پر سے گزرنا ہوگا۔ مگر کس حالت میں کہ سڑک ویران ہوگی۔ دلی والے تباہ ہوں گے۔ گولوں کی مار سے مکانات مسمار ہوں گے۔ اور بے گناہوں کے خون سے زمین رنگین ہوگی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد اسی سڑک سے پھر شہر میں داخل ہونا ہوگا مگر کس حالت میں کہ خود قید ہوں گے۔ چاروں طرف جنگی پہرہ ہوگا۔ بیٹیوں، بھانجوں اور بھتیجوں کی لاشیں میدانوں میں بے گور و کفن پڑی ہوں گی، محل ویران ہوں گے اور محل والیاں خدا جانے کہاں ہوں گی اور کس حالت میں ہوں گی۔

غرض سواری مبارک ان سڑکوں پر سے گزر کر دلی دروازہ پہنچی۔ محافظوں نے سلامی دی اور جلوس سلطان جی[1] کی سڑک پر پڑ لیا۔ جو زنانہ سواریاں پہلے سے روانہ ہو کر یہاں ٹھہری ہوئی تھیں وہ بھی جلوس کے آخر میں شریک ہو گئیں۔ کہاروں نے یہاں سے ذرا قدم تیز کر دیئے۔ اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے سواری پرانے قلعہ پہنچ گئی۔ شیر شاہ کی مسجد کے سامنے ہوادار رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے مسجد میں نماز پڑھی۔ وظیفہ پڑھا۔ کوئی گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیام کر کے یہاں سے سواری بڑھی اور ابھی دن پوری طرح نہ نکلا تھا کہ ہمایوں کے مقبرہ پہنچ گئی۔ مقبرہ میں پردہ ہو گیا۔ سواریاں اتریں۔ باہر کے دروازہ سے بادشاہ سلامت کا ہوادار کہاریوں نے سنبھال لیا اور مقبرہ کے دروازہ پر جا لگایا۔ سامنے کے صحن میں پہلے سے فرش ہو گیا تھا۔ مسند بچھی ہوئی تھی۔ بادشاہ سلامت مسند پر جا بیٹھے۔ وظیفہ ختم کیا۔ مقبرہ کے اندر گئے۔ خاندان شاہی کے سینکڑوں لوگ اس مقبرہ کے تہ خانوں میں موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ہر ایک کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی۔ شہزادے ساتھ تھے۔ سب کو ایک ایک قبر دکھاتے، نام بتاتے ان کے کارنامے سناتے۔ اپنی اور ان کی حالت کا مقابلہ کرتے اور بے اختیار رو دیتے[2]۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر پھر ہوادار میں سوار ہوئے اور جس ترتیب سے یہ قافلہ آیا تھا اسی ترتیب سے آگے بڑھا۔ درگاہ شریف قریب ہی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ دلی والوں کو خاص اس درگاہ سے جو عقیدت ہے وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ کسی قوم اور کسی ملت کا آدمی نہیں جو اس چوکھٹ پر سر نہ جھکاتا ہو۔ اور کوئی بدنصیب ہی ہوگا جو یہاں سے نامراد جاتا ہو۔ پردہ کا انتظام پہلے سے ہو گیا تھا۔ ہوادار باؤلی پر رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے اتر کر وضو کیا۔ شہزادوں نے ہاتھ منہ دھویا۔ شہزادوں کے لیے باؤلی کے طاقوں کے سامنے اوٹ لگ گئے تھے۔ کسی نے وضو کیا۔ کسی نے غسل کیا۔ کوئی پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ بادشاہ سلامت وضو کر کے ہوادار میں آ بیٹھے۔ اردا بیگنی نے عرض کی "جہاں پناہ باؤلی میں تیرنے کے لیے خادموں کے لڑکے آئے ہیں۔ کیا حکم ہوتا ہے"؟ فرمایا "ہاں اماں ہاں بلاؤ۔ وہ حقدار ہیں۔ اپنا حق لینے آئے ہیں۔ کیوں نہ ملے گا، ضرور ملے گا"۔ حکم ہونا تھا کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کے بیس پچیس لڑکے اندر آ گئے۔ مجرا بجا لائے۔ اجازت چاہی اور گنبد پر چڑھ گئے۔ سیڑھیوں پر سے بیگمات اور شہزادوں نے باؤلی میں روپے پھینکنے شروع کیے۔ ادھر روپیہ گرا اور ادھر کوئی نہ کوئی لڑکا گنبد پر سے کودا۔ ڈبکی لگائی اور روپیہ نکال لایا۔ تھوڑی دیر تک یہی تماشہ ہوتا رہا۔ اس کے

---

[1] حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کو دلی والے سلطان جی کہتے ہیں۔ ان کا مزار مبارک دلی دروازہ سے ۳ میل پر ہمایوں کے مقبرہ کے بالکل سامنے ہے۔

[2] آخر میں بہادر شاہ مرحوم کا دل ایسا رقیق ہو گیا تھا کہ بات بات پر آنسو نکل آتے تھے۔

بعد سب کے سب درگاہ شریف میں گئے۔ پہلے حضرت امیر خسرو کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ وہاں سے حضرت سلطان جی کے مزار پہ آئے۔ بادشاہ سلامت تو اندر چلے گئے۔ عورتوں نے گنبد شریف کے دروازے پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ کسی نے زنجیر پکڑ کر دعا مانگی۔ کسی نے چوکھٹ کی مٹی لے کر منہ پر ملی۔ کسی نے گود پھیلا کر دل ہی دل میں تلاوت شروع کی۔ کسی نے مسجد کے کٹورے کا قصہ شروع کیا کہ "دیکھنا بُوا۔ یہ کٹورہ سونے کا ہے۔ بڑا بھاری ہے کئی سیر کا ہوگا۔ یہ سامنے جو تسبیح خانہ ہے اس میں بھی ایک ایسا ہی کٹورہ لٹکا ہوا تھا۔ دادا جان کے زمانہ میں ایک بڑھیا مصیبت کی ماری درگاہ شریف میں آئی اور عرض کی کہ یا حضرت سات بیٹیاں ہیں کھانے کو پیسہ پاس نہیں۔ یہ پہاڑ کیوں کر اٹھیں گے۔ آپ ہی مشکل آسان کیجیے۔ وہاں سے اٹھ جو تسبیح خانہ میں آئی تو کٹورہ گنبد سے اتر اُس کی گود میں آگیا۔ خوشی خوشی گھر آئی۔ بڑی دھوم دھام سے بیٹیوں کی شادیاں رچائیں۔ مزے سے ہنسی خوشی رہنے لگی۔ دلّی کے امیر تھے ان کو جو یہ خبر ہوئی تو انہوں نے بھی درگاہ شریف میں جا کر دعا مانگی۔ وہاں سے اس مسجد میں آئے۔ بڑی دیر تک کٹورے کو دیکھتے رہے۔ کٹورہ جہاں تھا وہیں رہا۔ جل گئے۔ مزدوروں کو بلوا پاڑ باندھی۔ جتنی پاڑ اونچی ہوتی کٹورہ اور اونچا ہوتا جاتا۔ پاڑ گنبد کی چھت تک پہنچی تو کٹورہ غائب ہو گیا۔ ادھر پاڑ کھلی اور ادھر کٹورہ اپنی جگہ پہ آموجود ہوا۔ سچ ہے لالچ بری بلا ہے۔ کٹورہ تو کیا ملتا، پاڑ باندھنے کا خرچ مفت گلے پڑا۔"

بادشاہ سلامت فاتحہ سے فارغ ہو درگاہ شریف سے باہر آئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے مزار، مرزا جہانگیر[1]۔ مرزا نیلی[2] اور جہاں آرا بیگم[3] کی قبروں پر گئے۔ فاتحہ پڑھی۔ یہاں سے پھر باؤلی پہ آئے۔ خادموں کو انعام دیئے۔ فقیروں کو خیرات تقسیم کی اور وہاں سے نکل منصور کے مقبرہ کی سیدھی سڑک پر ہو لیے۔ یہاں دو ڈھائی گھنٹہ آرام کیا۔ خاصہ تناول فرمایا۔ کوئی چار بجے یہاں سے روانہ ہوئے۔ شام ہوتے ہوتے قطب پہنچ گئے۔ جنگلی محل اور مرزا بابر[4] کی کوٹھی پہلے سے آراستہ تھی۔ جو سواریاں سیدھی قطب آئی تھیں۔ انہوں نے سب سامان قرینہ سے جما دیا تھا خاصا تیار رکھا تھا۔ دن بھر کے سب تھکے ماندے تھے۔ کھا پی، نماز پڑھ ایسے سوئے کہ جب چار بجے کی نوبت بجی اس وقت کہیں جا کر آنکھ کھلی۔

جنگلی محل اب تو واقعی جنگلی محل ہے۔ ہاں کسی زمانہ میں بڑا شاندار محل تھا۔ پہلے ہی کچھ کم بڑا نہ تھا۔ بہادر شاہ نے دیوانِ خاص، دیوان عام خاص محل اور باب ظفر بنوا کر اس کو اور بڑا کر دیا۔ دروازہ کیا ہے خود ایک چھوٹا سا محل ہے۔ سر تا پا سنگ سُرخ کا ہے۔ سدکار پر سنگِ مرمر کی پٹیاں۔ حاشیہ اور پھول دے کر اس کی رونق کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ دروازہ کی بلندی کوئی ۱۶ – ۱۷ گز ہے۔ پہلو میں ۷۷ سیڑھیوں کا چکر دار زینہ ہے۔ محراب کے عین اوپر شاہی بارہ دری ہے۔ یہیں سے بیٹھ کر بادشاہ سلامت اور بیگمات پنکھوں کا تماشہ دیکھتے تھے۔ دروازہ سے ملا ہوا درگاہ شریف کا دروازہ ہے

---

[1] مرزا جہانگیر وہی شہزادے ہیں جن کی وجہ سے پھول والوں کی سیر قائم ہوئی۔ واپس آنے کے بعد انہوں نے پھر بے اعتدالیاں کیں۔ پھر الٰہ آباد بھیج دیئے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ نواب ممتاز محل نے ان کی لاش الٰہ آباد سے دلّی منگوالی اور سلطان جی میں ایک نہایت خوبصورت سنگِ مرمر کا حجرہ بنوا دفن کر دیا

[2] مرزا نیلی شاہ عالم ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ انتقال کے بعد ان کو بھی مرزا جہانگیر کے حجرہ میں دفن کیا گیا۔

[3] جہاں آرا بیگم شاہ جہاں بادشاہ غازی کی بیٹی تھیں۔ حضرت سلطان المشائخ سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کا مزار درگاہ کے پائنتی ایک سنگِ مرمر کے حجرہ میں ہے۔ سرہانے کتبہ لگا ہوا ہے۔ کتبہ کا یہ شعر بڑا دردناک ہے۔ ؎

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا　　کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

[4] مرزا اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ ان کی ایک بڑی کوٹھی انگریزی وضع کی اب تک قطب موجود ہے۔ اس کا ایک دروازہ تو درگاہ شریف میں ہے دوسرا جنگلی محل میں۔ اور تیسرا جنگل میں جھرنے کی طرف نکلتا ہے۔

جھرنے سے پنکھے اُٹھ کر ادھر آتے۔ پہلے دن جوگ مایاجی کا پنکھا اُٹھتا۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا۔ درگاہ شریف کا پنکھا تو برابر والے دروازہ سے مزار شریف پر چلا جاتا۔ لوگ مایاجی کا پنکھا شاہی دروازہ کے سامنے کچھ دیر رکتا۔ اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کے سامنے سے ہوتا ہوا مندر چلا جاتا۔ باب ظفر کے اندر کا حصہ دیکھنے کے قابل ہے۔ بڑے پھاٹک سے لگا کر اندر محل تک سات ڈیوڑھیاں ہیں۔ پھر ہر ڈیوڑھی پر پہرہ داروں کے لیے سہ دریاں بنی ہوئی ہیں۔ پھاٹک پر تو وگلہ پلٹن کا پہرہ تھا۔ اندر کی ڈیوڑھیوں پر ترکنوں[1]، قلماقنیوں[2]، اردا بیگنیوں[3]، شدنوں اور گرجنوں کی نشست ہوتی۔ بھلا کیا مجال کہ محل میں پرندہ تو پَر مار جائے۔ پھاٹک سے گھستے ہی الٹی طرف پہلی ڈیوڑھی کے پاس سے زنانہ کو راستہ جاتا تھا۔ غرض اس محل میں اتنی گنجائش تھی کہ سارا قلعہ اس میں سما جاتا اور پھر بھی جگہ رہتی۔ اب مردانے اور زنانے سب مکانات ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گئے۔ ایک باب ظفر رہ گیا ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس محل کا یہ دروازہ ہے وہ محل کیا ہوگا۔ بادشاہ کی کہی ہوئی تاریخ دروازہ کی روکار پر کندہ ہے۔

این در عالی چو شد مکرم بنا حسب المراد
گفت دل۔ سال بنا۔ باب ظفر پائندہ باد

سنہ جلوس ۱۲۶۴ھ

زمانہ کے ہاتھوں اس دروازہ کا بھی وہی حشر ہوا جو اندر کے محلوں کا ہوا۔ وہ تو کہو محکمہ آثارِ قدیمہ نے اس کو اپنی نگرانی میں لے کر سنبھال لیا ہے۔ خیر تو صبح کی نوبت بجی ہی تھی کہ محل میں چہل پہل شروع ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدل، نماز پڑھ، ناشتہ کر سب شہزادے شہزادیاں، بادشاہ سلامت کے سلام کو آئیں۔ مطلب تھا کہ چلیے یہاں بیٹھنے تھوڑی آئے ہیں۔ جہاں پناہ بھی وظیفہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ سب کا سلام لیا۔ دعائیں دیں۔ ان سب کا مطلب سمجھ گئے۔ فرمایا "کہو۔ اماں کہاں کا ارادہ ہے۔ جھرنے کا یا قطب صاحب کی لاٹھ کا۔" سب نے عرض کی "پیر و مرشد پہلے جھرنے تشریف لے چلیے۔ ابر آیا ہوا ہے۔ اس وقت جھرنے پہ بہار ہو گی۔" فوراً اردا بیگنی کو پردہ کرانے کا حکم دیا گیا۔ وگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے ناکہ بندی کر دی۔ اردا بیگنیوں قلماقنیوں نے راستہ کا انتظام کیا۔ شدنیں اور گرجنیں بیگمات اور شاہزادیوں کے ہمراہ ہوئیں۔ ماماؤں، اصیلوں، خواصوں اور سرتیوں کا غول کا غول نکلا۔ اور سیدھا جھرنے کا رخ کیا۔ شاہزادیوں نے پہلے درگاہ شریف میں حاضری دی۔ وہاں سے مرزا

---

[1] آخر زمانہ میں ترکستان۔ حبش اور گرجستان سے عورتوں کی آمد بند ہو گئی تھی۔ پہلے سے جو خاندان دلّی میں بس گئے تھے انہیں میں سے یہ پلٹنیں بھری جاتیں۔ لباس ان سب کا مردوں کا سا ہوتا تھا۔ یہ سب مردانہ کرتب جانتی تھیں۔ ان کا کام زنانہ میں پہرہ دینا تھا۔

[2] قلماقنیاں پہرہ دینے اور حکم احکام پہنچانے پہ مقرر تھیں۔ ان کے لباس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان عورتوں کو شادی کرنا ممنوع تھا۔

[3] اردا بیگنیاں بھی محل کا انتظام کرتیں اور شاہی حکم احکام پہنچاتی تھیں۔ ان کا صرف مردانہ لباس ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ نام بھی مردوں کے سے ہوتے تھے۔ گفتگو بھی مردوں کی طرح کھری کھری زبان میں کرتی تھیں۔ تو عورتیں مگر شکل صورت وضع قطع چال ڈھال سے بالکل مرد معلوم ہوتی تھیں۔ دلّی میں ان کو ہڑ بگنیاں کہتے تھے۔ پھر یہ لفظ اردو میں ایسی لڑکیوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ جو بڑی شریر اور ڈھنگی ہوں اور جن پر سودا کا یہ شعر صادق آتا ہو ؎

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

باہر کی کوٹھی میں سے ہو جنگل میں نکل گئیں۔ پہلے جہاز[1] پہ جا کر دم لیا۔ شمسی تالاب کا لطف اٹھایا۔ میلوں تک پانی ہی پانی تھا۔ برجی[2] بیچ میں آگئی تھی۔ پانی کا یہ عالم دیکھ کے بہتوں کے جی میں آیا کہ کود پڑیں۔ پھر خیال آیا کہ بادشاہ سلامت سے اجازت لیے بغیر پانی میں اترنا ٹھیک نہیں جھکی ہو رہیں۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھہر کر سب کے سب اولیا مسجد[3] پہنچے۔ مصلّوں پہ نفلیں پڑھیں۔ اتنے میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی۔ شاہزادے ساتھ تھے۔ آگے آگے سواری چلی، پیچھے پیچھے عورتوں کا یہ غول روانہ ہوا۔ اولیا مسجد سے جھرنا دو رہی کتنا ہے۔ تھوڑی دیر میں سب کے سب وہاں پہنچ گئے۔

جس نے پہلے زمانہ کا جھرنا نہیں دیکھا اس نے دلّی میں کچھ خاک نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بہشت کا ایک کونہ کاٹ کر مہرولی[4] میں جوڑ دیا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ یہ بنا کس لیے تھا اور کیا کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے شمسی تالاب کا بند باندھ کر اس کا پانی نولکھی نالہ میں ڈالا تھا اور اس نالہ کو تغلق آباد کے نالوں سے ملا دیا تھا۔ تاکہ قلعہ میں پانی کی قلت نہ ہو۔ تغلق آباد ویران ہو گیا۔ نالہ ٹوٹ گیا۔ تالاب کا پانی جنگل میں بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر سنہ ۱۱۷۰ھ میں نواب غازی الدین[5] فیروز جنگ بہادر نے شمسی تالاب کے بند کے سامنے حوض بنوائے۔ نہریں نکالیں۔ فوارے لگائے اور اس ٹکڑے کو بہشت کا نمونہ کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہاں بارہ دریاں۔ دالان اور مکانات بن گئے۔ چار دیواری کھنچ گئی۔ درخت بڑھ کر جھرنے پر چھتر ہو گئے، اور تھوڑے دنوں میں یہ جگہ کچھ سے کچھ ہو گئی۔ بند سے سوتوں کی شکل میں پانی جھر جھر کر یہاں آتا تھا۔ اسی لیے اسی مقام کا نام جھرنا ہو گیا۔ بند سے ملا ہوا جو سہ درہ دالان ہے وہی جھرنے کی جان ہے۔ دالان کی چھت اندر سے کھوکھلی ہے۔ بند کا پانی پہلے چھت میں آتا ہے۔ چھت میں درزیں چھوڑ دی ہیں۔ درزوں میں سے پانی اس طرح گرتا ہے۔ گویا دالان میں مینہ برس رہا ہے۔ دالان کے سامنے کی جو دیوار ہے اس میں چراغ رکھنے کے لیے سیکڑوں طاق بنے ہوئے ہیں۔ چراغوں کے سامنے پانی کی چادر گرتی ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یا تو پانی میں آگ لگا دی ہے یا سونا پگھل پگھل کر برس رہا ہے۔ چھت کی منڈیر کے نیچے ۳ پرنالے ہیں، پرنالوں میں سے ہو کر پانی چھجے پہ آتا ہے۔ چھجے کے نیچے ایک بڑا حوض ہے۔ پرنالوں کا پانی چھجے پر پھیل کر اس زور سے حوض میں گرتا ہے۔ گویا دھواں دھار بارش ہو رہی ہے۔ حوض کے سامنے ۸ گز لمبی ۲ گز چوڑی اور گز بھر گہری ایک نہر ہے۔ حوض کا پانی ابل کر اس نہر میں آتا ہے۔ جہاں نہر ختم ہوئی ہے وہاں سلامی کے پتھر دے کر ایک چادر سی بنا دی ہے۔ اس سلامی کے پتھروں پر ایسی اچھی منبت کاری کی ہے کہ پانی کے بہنے سے چادر پر مچھلیاں سی تڑپتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس چادر

---

[1] شمسی تالاب کے کنارے جہاز کی شکل کی ایک بہت بڑی اور خوبصورت عمارت قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ہے۔ اس عمارت کو جہاز کہتے ہیں۔

[2] اسی تالاب کے بیچ میں ایک چھوٹا سا کھلا ہوا برج ہے اور برج کے نیچے ایک سنگِ خارا پر گھوڑے کے سم کا نشان ہے۔ اس سم کے متعلق عجیب روایتیں مشہور ہیں، عام طور پر اس کو براق کا سم کہتے ہیں۔ کنارے سے برجی اتنی دور ہے کہ وہاں تک جاتے جاتے اچھے اچھے تیراکوں کے دم ٹوٹ جاتے ہیں۔

[3] یہ ایک چھوٹی سی مسجد شمسی تالاب کے کنارے پر ہے۔ صحن میں دو مصلّے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان مصلّوں پر حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہما نماز پڑھا کرتے تھے۔

[4] مہرولی ہی کو قطب کہتے ہیں۔ یہ دلّی سے گیارہ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ بادشاہ کے زمانہ میں یہاں خاصی رونق ہو گئی تھی۔ وہ قطب کے عاشق تھے جہاں ذرا ابر آیا اور ان کی سواری قطب چلی۔ کہا کرتے تھے کہ ابر ہمارے قطب جانے کا نقیب ہے۔

[5] نواب غازی الدین فیروز جنگ شاہانِ دہلی کے وزیر آصف جاہ اول کے فرزند تھے۔ یہ وہ غازی الدین فیروز جنگ نہیں ہیں جنہوں نے عالمگیر شاہ ثانی کو کوٹلہ میں شہید کرایا تھا۔

کے نیچے شمال اور جنوب سے دو نہروں کے پانی اور آن ملے ہیں۔ آگے چل کر یہ پانی پھر تین نہروں میں بٹ جاتا ہے۔ بڑی نہر تو بارہ دری کے منڈوے[1] کے دونوں طرف سے چاردیواری کے باہر نکل جاتی ہیں۔

محمد شاہ کے زمانہ سے لگا کر بہادر شاہ تک شاید ہی کوئی دلّی کا بادشاہ ہوگا جس نے جھرنا میں کوئی عمارت نہ بنوائی ہو۔

خود محمد شاہ نے تو بڑی نہر کے اوپر بارہ دری کا منڈوا بنوایا۔ شاہ عالم ثانی نے جنوب کی طرف سہ درہ دالان نکالا۔ اکبر شاہ ثانی نے شمال کی جانب دوہرا دالان تعمیر کیا۔ بیچ میں جو جگہ رہی تھی اس میں بہادر شاہ نے سنگِ سرخ کی بارہ دری بنوا کر جھرنا کی عمارتوں کو مکمل کر دیا۔

جھرنا کے قریب ہی دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک "پھسلنا پتھر" دوسرے "امریاں" پھسلنا پتھر محمد شاہ بادشاہ کی جدّت پسند طبیعت کی یادگار ہے۔ یہ پتھر کوئی سوا چھ گز لمبا اور ۲½ گز چوڑا ہے اور جھرنا کی مشرقی دیوار سے ملا کر اس کو ذرا جھکا ہوا گاڑ دیا ہے۔ یہ پتھر اس بلا کا چکنا کہ ذرا کوئی بیٹھا اور پھسلا۔ پھول والوں کی سیر میں لوگوں کا اس پر چڑھنا اور پھسلنا ایک تماشہ ہوتا ہے۔ اس پتھر کے استعارہ سے ذوق نے یہ شعر کہا ہے[2]

میں کہاں سنگِ دریا سے ٹل جاؤں گا　　کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤں گا

بارہ دری کے منڈوے سے ملا ہوا جھرنے کا دوسرا دروازہ ہے اور اس کے باہر امریاں۔ آموں کے درخت تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ مگر یہاں کے درختوں پہ کچھ اور ہی بہار ہے۔ جھرنا کے پانی سے بارہ مہینے سرسبز رہتے ہیں اور اتنے گھنے ہو گئے ہیں کہ آسمان بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ ادھر ان کی سبزی ادھر نیچے گھانس کی سبزی۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور آسمان سبز مخمل کے بن گئے ہیں۔ جھرنے میں چادروں کا گرنا۔ فواروں کا اچھلنا، پانی کا بہنا اگر "جنت نگاہ" ہے تو امریوں میں موروں کی جھنکار، پپیہے کی پکار اور کوئل کی کوکو "فردوس گوش" ہے۔ غرض جھرنا ایک عجیب چیز تھا کہ ہر موسم میں ایک نیا لطف دکھاتا تھا اور ہر شخص کو نئی لذت بخشتا تھا۔ اس کی بھی بہار گئی۔ شمسی تالاب کٹ چھنٹ کر حوض بن گیا۔ بند اس سے دور جا گرا۔ پانی کا رسنا موقوف ہوا۔ نہریں خشک ہو گئیں۔ حوض ملبہ سے اٹ گئے۔ درخت سوکھ سوکھ کر کٹ گئے۔ پھسلنا پتھر ٹوٹ کر ٹکڑے ہو گیا۔ ہاں عمارتیں کھڑی رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں میں ان کا بھی وقت آ لگے گا۔ اس کے بعد جھرنے اور امریوں کا بس نام ہی نام رہ جائے گا۔ سچ ہے :-

ہمیشہ رہے نام اللّٰہ کا

تو ہاں بادشاہ سلامت کے جھرنے پہنچتے ہی قلماقنیوں نے شاہی ہنگورا کھڑا کر اس میں مسند بچھا دی۔ ہوادار ہنگورے کے پاس جا لگا۔ بادشاہ اُترا۔ اس میں جا بیٹھے۔ دو خواصیں مورچھل لے پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔ دونوں نے آہستہ آہستہ ہنگورے کو ہلانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد بادشاہ سلامت نے فرمایا "کہو اماں۔ کیا ارادہ ہے۔ اب تیرنا[2] ہوتا ہے یا جھولا جھولنا؟

اچھا جھرنا میں رہو کچھ امریوں میں چلو۔ یہاں کا بھی لطف اٹھاؤ۔ وہاں کا بھی مزہ دیکھ لو۔ ہم تو امریوں میں جاتے ہیں۔" یہ کہہ بادشاہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ٹہلتے ٹہلتے بارہ دری کے دروازہ سے امریوں میں آ گئے۔ یہاں پہلے سے انتظام ہو گیا تھا۔ ایک طرف بادشاہ سلامت اور

---

[1] اس بارہ دری کی چھت نہیں ہے بلکہ ٹٹیاں لگا کر پھولوں کی بیلیں چڑھا دی ہیں۔ پھول کھلنے سے ساری چھت ڈھک جاتی ہے۔

[2] قلعہ میں شاہزادے اور شاہزادیاں دونوں کو مردانہ فن سکھلائے جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ہوگا جس کو تیر، تلوار، بندوق چلانا، سوار ہونا اور تیرنا نہ آتا ہو۔ بابر بادشاہ کے زمانہ سے یہ خاندان پانی کا عاشق ہے۔ قلعہ ہی دیکھ لو۔ آدھا قلعہ حوضوں اور نہروں نے گھیر لیا ہے۔

بادشاہ بیگم کے تخت بچھ گئے تھے۔ دوسری طرف شاہزادیوں کے لیے دری، چاندنی اور قالینوں کے فرش کر کے تکیے لگا دیئے گئے تھے۔ درختوں میں بیسیوں جھولے پڑ گئے تھے۔ پہلے بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے۔ اس کے بعد سب سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ انتظار تھا کہ کب حکم ہو اور کب جھولوں پہ جائیں۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "واہ جی وا! خالی جھولا کیسا۔ کڑھائی چڑھاؤ۔ جھولتے جاؤ۔ کھاتے جاؤ"! تاج محل[1] نے عرض کی، "جہاں پناہ! ہم پہلے ہی سے یہ انتظام کر کے آئے ہیں۔ حکم کی دیر ہے۔ ابھی سب کچھ ہوئے جاتا ہے"۔ یہ کہہ لونڈیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تو حکم کی منتظر ہی کھڑی تھیں۔ ذرا سی دیر میں بیسیوں کڑھائیاں آگئیں۔ درختوں کی جڑوں میں چولہے لگ گئے۔ کسی کسی بیگم کے سامنے انگیٹھی آگئی۔ اب ہے کہ کوئی تو بیٹھا بیسن پھینٹ رہا ہے۔ کوئی گلگلوں کے آٹے میں کھانڈ دے رہا ہے۔ کوئی سہال اور اندرسے تلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ کوئی اندرسے کی گولیوں کا سامان نکال رہا ہے۔ کوئی چھاج پہ کھجوریں بنا رہا ہے۔ غرض تھوڑی دیر میں خاصہ بازار سا لگ گیا۔ جب سامان سے لیس ہوگئے تو ہر ایک نے بڑھ بڑھ کر بادشاہ سلامت سے عرض کی کہ حکم ہو تو کڑھائی میں گلگلہ پڑے۔ فرمایا، نہیں۔ اماں، ابھی نہیں۔ جھولوں پہ لوگ بیٹھ لیں۔ اس وقت پکوان شروع ہو۔ یہ کہہ نواب، زینت محل اور نواب تاج محل کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کھڑی ہوگئیں۔ تاج محل تو ایسی خوب صورت نہ تھی، ہاں زینت محل کی کچھ نہ پوچھو۔ عجب قبول صورت پائی تھی۔ شہر بھر میں ایک تھیں۔ ان کی جامہ زیبی اور حسن کی تعریف ہی سن کر بادشاہ نے ان سے شادی کی تھی۔ رنگت ایسی سرخ و سفید تھی جیسے گلاب کی پتی یا شہاب اور میدہ۔ کتابی چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک۔ ہاں بھویں بالکل نہ تھیں۔ اس کمی کو سرمہ کی بھویں بنا کر پورا کیا جاتا۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں۔ سر پہ تاروں بھرا گلنار دوپٹہ۔ جسم پہ سرخ انگیا کرتی۔ بادلے کلی کا سبز زربفت کا پیجامہ۔ موتیوں جڑی گھیتلی جوتی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا سرمہ۔ دانتوں میں مسی۔ ہونٹوں پہ لاکھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ پرستان کی پری امرائیوں میں اتر آئی ہے۔ زینت محل نے تاج محل کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھا۔ تاج محل نے زینت محل کو بُرے بُرے دیدوں سے گھورا۔ حکم سے لاچار تھیں۔ بادشاہ سلامت کے سامنے جو جھولا تھا اس کے لال سبز ریشم کے رسے اور گنگا جمنی پٹریاں تھیں۔ دونوں اٹھ اس میں جا بیٹھیں۔ زینت محل نے پاؤں جوڑے۔ تاج محل نے جھونٹے لینے شروع کیے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "واہ جی وا! ایسا سوتا جھولا ہم کو تو پسند نہیں۔ بی ٹرمنھی[2] خانم اور دلدار کو بلواؤ۔ بھلا بیگمات جھولیں۔ اور یہ دونوں جھرنا میں گھسی رہیں"۔ یہ سنتے ہی دو اربگنیاں جا دونوں کو جھرنا میں سے پکڑ لائیں۔ دونوں بے چاریاں جھرنے میں نہا رہی تھیں۔ سارے کپڑے شرابور تھے۔ پہلے تو سامنے آتے ذرا جھجکیں مگر جب بادشاہ سلامت نے خود فرمایا "آؤ۔ قطب کی بہار یہی ہے" تو اس وقت ذرا ہمت بڑھی۔ کپڑے نچوڑتی ہوئی دونوں جھولے کے اِدھر اُدھر کھڑی ہوگئیں اور شہزادیاں آواز ملانے آگئیں۔ ادھر انہوں نے ملار شروع کیا اور ادھر کڑھائی میں گلگلہ پڑا۔ ٹرمنھی خانم اور دلدار تو خیر رنڈیاں تھیں۔ تاج محل ڈومنی تھیں۔ مگر

---

[1] نواب تاج محل کا قلعہ میں بڑا زور تھا۔ تھی تو ڈومنی مگر جب سے بادشاہ نے اس کو محل میں داخل کیا تھا اس وقت سے بادشاہ اس کی مٹھی میں آگئے تھے۔ بغیر اس کے حکم کے قلعہ میں پتہ تک نہیں ہل سکتا تھا۔ آخر نواب زینت محل نے اس کا کفر توڑا۔ قلعہ سے نکالی گئی اور ایسی نکالی گئی کہ پھر قلعہ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

[2] میں نہیں جانتا کہ اس لفظ کی کیا املا ہے۔ ٹرمنھی کے معنی ٹیڑھے منہ والی کے ہے۔ لقوے سے ذرا اس کا منہ پھر گیا تھا۔ جو املا میری سمجھ میں آئی ہے میں نے لکھ دی۔ جو آپ کی سمجھ میں آئے پڑھ لیجیے۔ ٹرمنھی خانم غضب کی گانے والی تھی۔ تان رس خاں بھی اس سے ذرا کنیاتے تھے۔ آخر اسی سے لڑ کر نکل گئے۔ بادشاہ کی غزلیں حضوری میں یہ ہی گاتی تھی۔ دلدار اس کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں ڈیرہ دار رنڈیاں تھیں۔ بڑی بہن کی نواسی دودی جان اور چھوٹی بہن کی نواسی کالی جان دلّی کی مشہور طوائفیں گزری ہیں۔

شہزادیوں کی آوازیں بھی رس میں کچھ کم نہ تھیں۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ سے شاید ہی کوئی محل والی ہوگی جو گانا نہ جانتی ہو۔ تان رس خاں اسی لیے نوکر تھے۔ تاج محل اسی لیے محل میں آئیں۔ بی ٹرمٹی خانم اور دلدار کی اسی گانے سے بادشاہ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ اب جھولے کے ساتھ گانا شروع ہوا :۔

جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں   جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں
دین اندھیری۔ تال کنارے۔ مرلا جھنکارے۔ بادل کارے۔ بوندیاں پڑیں پھنیاں پھنیاں
جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں
دو سکھی جھولیں۔ دو ہی جھلائیں۔ چار مل گیاں۔ جھول جھلیاں۔ جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں

وہ نور کے گلے۔ وہ رسیلی آوازیں۔ وہ اونچی تانیں۔ وہ وقت کی راگنی۔ وہ سہانا وقت۔ پتے پتے اور ٹہنی ٹہنی سے۔ جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں کی آواز آ رہی تھی۔ مور درختوں سے اتر۔ جوش میں آ۔ سامنے ناچنے لگے۔ درختوں کے جانور چہکنے لگے۔ پپیہے کی پیہو پیہو اور کوئل کی کوکو سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ غرض ایسا سماں بندھا کہ ایک دفعہ ہی فراٹے سے مینہ کا چھینٹا آیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا” واہ۔ اماں وا۔ قطب میں مینہ سے بھاگتے ہو۔ بھادوں کا چھینٹا ہے ابھی برسا ابھی نکل گیا۔ ہاں بی۔ دلدار کوئی اور چیز ہو جائے اور ہاں تم سب ایک ہی جھولے کو کیوں گھیرے کھڑے ہو۔ دوسرے جھولوں پر جاؤ۔ گاؤ بجاؤ۔ کھاؤ پیو۔ کچھ لطف اٹھاؤ“ یہ سننا تھا کہ جھولوں کی طرف سب دوڑ پڑے۔ دو چار جھولوں پر تو بچوں نے قبضہ کر لیا جو باقی رہ گئے ان پر شہزادیاں ہو بیٹھیں۔ جب ذرا یہاں چھیڑ ہوئی تو دلدار نے دوسری چیز شروع کی۔

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ میں جوگن تیرے ساتھ
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
جوگیا بجائے۔ بین بانسری۔ جوگیا بجائے۔ بین بانسری۔ جوگن گائے ہے ملار
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگن نے چھایا ہے بدیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
جوگیا نے پہنے۔ لال لال کپڑے جوگیا نے پہنے۔ لال لال کپڑے۔ جوگن کے لمبے لمبے کیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

اب کیا پوچھتے ہو گرم گرم پکوان آ رہا ہے کھا رہے ہیں۔ جھولا جھول رہے ہیں۔ کوئی اندرسے کی گولیاں منہ میں دبائے ہے۔ کسی کے منہ میں سہال کا ٹکڑا ہے۔ کسی کے حلق میں بیسن کی پھلکی پھنس گئی ہے۔ سانس رکا جاتا ہے مگر ملار ہے کہ چل رہا ہے۔ مینہ برس کر نکل گیا تھا۔ پھر بھی پانی کی بوندیں درختوں میں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ ادھر بوند کڑاہی میں گری۔ تیل اُڑا۔ اور ادھر کسی نہ کسی کے منہ سے ”اوئی“ کی آواز نکلی۔ کسی کے ہاتھ پر چھینٹا پڑا۔ تو کسی کے منہ پر کوئی تو ”اوئی توبہ ہے“ کہہ کر رہ گئی۔ کوئی کلا سہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسروں نے پھر پکڑ یہ کہہ بٹھا لیا کہ ”واہ بوا۔ نوج کوئی ایسا نازک بن جائے۔ چھینٹا پڑتا ہی ہے۔ یوں کڑھائی چھوڑ کر کوئی نہیں اٹھ کھڑا ہوتا۔“

بچوں کے جھولے پر کچھ اور ہی مزا تھا۔ پکوان کی سب سے زیادہ کھپت یہیں تھی۔ دو جھولے تو لڑکوں کے قبضہ میں تھے ۔ باقی

پر لڑکیاں جھول رہی تھیں۔ لڑکے تو جھولے میں کھڑے ہو، وہ لمبے لمبے پینگ بڑھا رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔ ہاں لڑکیاں جھولوں میں چھوٹی چھوٹی لال سبز پٹڑیاں ڈالے، پاؤں جوڑے جھول رہی تھیں۔ وہ بے سرا ملار چل رہا تھا کہ واہ جی وا۔ کسی کی تان کدھر جاتی تھی، کسی کی کدھر۔ لڑائی بھی ہوتی جاتی تھی کہ "لو برا۔ بس اترو۔ بہت جھول چکیں اب ہماری باری ہے۔" لیکن گانے کا سلسلہ نہ ٹوٹتا تھا۔ گیت بھی بڑے مزے کا تھا۔ ذرا سنیے۔

اماں۔ آڑو جامن گھلے دھرے اماں، میں نہیں کھاتی میری ماں
اماں۔ تتا پانی بھرا دھرا اماں، میں نہیں نہاتی میری ماں
اماں۔ دہانی جوڑا سلا دھرا اماں۔ میں نہیں پہنتی میری ماں
اماں۔ بھائی بھاوج ملن کھڑے اماں۔ میں نہیں ملتی میری ماں

غرض پھوپھا، پھوپھی سے لگا ماماؤں اور ناناؤں تک سب ملنے کو کھڑے ہیں مگر لڑکی کسی سے ملنے کا نام نہیں لیتی۔ آخر تان اس پر ٹوٹی تھی کہ:۔

اماں۔ ساجن ڈولا لیے کھڑا اماں۔ میں نہیں جاتی میری ماں

یہاں تو یہ ہو رہا تھا اور وہاں جھرنا پر کچھ اور ہی بہار تھی۔ ادھر بادشاہ سلامت جھرنا سے نکل امریوں میں آ گئے اور ادھر شاہزادوں نے کواڑ بند کر، ڈھیلے پائجامے اتار، تنگ پائجامے پہن۔ دھم سے جھرنا میں غوطہ مارا۔ کوئی ڈبکیاں لگا رہا ہے۔ کوئی تیر رہا ہے۔ کوئی کمر کمر پانی میں کھڑی چھینٹے لڑا رہی ہے۔ بچے اچھل نہروں میں کھڑے اودھم مچا رہے ہیں۔ کچھ حوض کے سہ درہ دالان میں کھڑی نہا رہی ہیں۔ کچھ پھسلواں پتھر سے پھسل رہی ہیں۔ نیچے گر کر قلابازیاں کھاتی ہیں۔ کیچڑ میں لت پت ہوتی ہیں۔ حوض میں آ کر کودتی ہیں۔ نہانے والیاں غل مچاتی ہیں کہ "نکلو۔ سارا پانی گدلا کر دیا۔" غرض ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں ایسا مست تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ اتنے میں پرچہ لگا کہ حضرت جہاں پناہ ناظر کے باغ تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب کیا تھا۔ سب نے پانی میں سے نکل جھٹ پٹ کپڑے بدلے۔ بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نہروں میں سے نکالا۔ یہ ادھر ان کے کپڑے لینے گئیں اور ادھر وہ دھم سے پھر نہر میں کود گئے۔ بڑی مشکل سے بچوں کو پونچھ پانچھ کپڑے بدلوا۔ جھرنا کے زنانے کھل گئے۔ سب کے سب وہاں سے نکل امریوں میں آئے۔ تھوڑا بہت جھولا جھولا۔ پکوان کھایا اور ناظر کے باغ کا راستہ لیا۔

ناظر کا باغ جھرنا سے قریب ہی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے ناظر روز افزوں نے بنوایا تھا۔ امریوں کے سامنے ہی اس کا بڑا دروازہ ہے۔ دروازہ پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

پے تاریخ سالش گفت ہاتف خدا یارسے بود باللہ مبارک

باغ کے گرد پختہ چار دیواری ہے۔ اندر چاروں طرف سنگِ سرخ کی چار بارہ دریاں ہیں۔ بیچ میں ایک بڑی خوب صورت عالی شان بارہ دری ہے۔ بیچ کی بارہ دری کے چاروں طرف حوض ہیں۔ ان حوضوں میں کئی کئی فوارے ہیں۔ جھرنا کا پانی اس باغ میں آتا ہے۔ ان چاروں حوضوں سے چار نہریں نکالی ہیں۔ تھوڑی دور نہر گئی اور دوسرے حوض میں گر گئی۔ اس سے نکلی تیسرے حوض میں جا گری۔ اسی طرح حوضوں میں سے یہ نہریں ہوتی ہوئیں اور سامنے کی بارہ دریوں کے گرد گھوم کر باہر نکل جاتی ہیں۔ ان نہروں کی وجہ سے باغ کے چار حصے ہو گئے ہیں۔ نہروں کے دونوں کناروں پر چلنے پھرنے کے لیے پختہ روشیں ہیں۔ اس کے بعد گھاس کے تختے ہیں۔ اور ان تختوں سے ملی ہوئی پھولوں کی کیاریاں اور کیاریوں کے بعد گھنے سایہ دار درخت۔ شروع بھادوں تھا۔ آم کے درختوں پر بہار تھی۔ گدرنی کی طرح لدے ہوئے تھے۔ بھلا بغیر اجازت کے کون

ہاتھ لگا سکتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بادشاہ سلامت سے اجازت چاہی۔ اجازت ملنی تھی کہ سب کے سب درختوں پر ٹوٹ پڑے۔ آدھے کھائے آدھے پھینکے۔ گٹھلیاں چلیں، چھلکے چلے۔ تھوڑی دیر میں نئے کپڑے عجیب شان کے ہو گئے۔ بارہ دری کے حوضوں میں پھر سب جا کر نہائے کپڑے بدلے۔ خاصہ پر آ کر بیٹھے۔ مگر کیسا کھانا اور کہاں کا کھانا۔ پکوان اور آموں سے پیٹ بھر چکے تھے۔ منہ جھوٹا لیے کو بیٹھ گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں دسترخوان بڑھ گیا۔ اس کے بعد سب ہیں اور وہی آموں کے درخت۔ شام تک کئی کئی جوڑے بدل گئے۔ غرض کہ سارے کا سارا دن اسی جھرنے، امریوں اور باغ کے پھیر میں گزر گیا۔ شام کو جنگلی محل میں آ کر وہ لمبی تانی کہ صبح کی خبر لائے۔

دوسرے روز قطب صاحب کی لاٹھ۔ علائی[1] دروازے۔ امام ضامن کے مقبرے، بھیم کی چھنٹکی[2]۔ کڑوے[3] میٹھے نیم اور بارہ بادشاہوں[4] کی قبروں کا چکمہ رہا۔ تیسرے روز چہل[5] تن چہل من۔ لنگا[6] ولی کے قلعہ۔ جمالی کمالی کے مزار اور اندھیریا[7] باغ کی سیر کی۔ غرض تین دن میں سارا قطب چھان مارا۔ تھک کر چور ہو گئے۔ پھرتے پھرتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ جب کہیں جا کر عقل سے بیٹھے۔ چودھویں تاریخ بھی آ گئی تھی۔ صرف جنگلی محل اور مرزا بابر کی کوٹھی قلعہ والوں کے پاس رہی۔ باقی سارے قطب پر دلّی والوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

دلّی والے سیر کا انتظام تو پورے سال کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تاریخ مقرر ہونے کے بعد ذرا اس میں تیزی آ جاتی ہے۔ ادھر تاریخ مقرر ہوئی اور ادھر کارخنداروں (کارخانہ داروں) کے ہاں ہتی پڑی۔ حسبِ مقدور سب نے اس میں چندہ دیا۔ یہ تو قطب میں کھانے پینے کا خرچ ہو گیا۔ اب رہے دوسرے خرچ۔ تو وہ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ جی چاہے اٹھاؤ۔ جی چاہے نہ اٹھاؤ۔ تیرہ تاریخ سے دلّی خالی ہونی شروع ہوئی۔ اجمیری دروازہ سے لگا قطب تک دکانیں لگ گئیں۔ امیروں کی پالکیاں جا رہی ہیں۔ رنڈیوں کی رتھیں نکل رہی ہیں۔ ایک ایک رتھ ایسی کہ نظر لگے۔ مخمل کی برجی۔ اس پہ زردوزی کے پھول۔ اوپر سنہری کلس۔ اطلس کے پھندنے۔ کلابتون کی ڈوریاں۔ سفید براق بیٹے۔ ان پر رنگین بیل بوٹے۔ ناگوری بیل۔ ان پر زردوزی کام کی جھولیں۔ گلے میں چاندی کے گھنگرو۔ سینگوں پر سنگوٹیاں۔ ریشم کی ناتھیں۔ اندر بناؤ سنگار کیے رنڈیاں بیٹھی ہیں۔ ایک رتھ آئی نکل گئی۔ دلّی کے شرفا گھوڑوں پر سوار۔ مخمل کے کارچوبی زین پوش لیس ٹکی ہوئی لگائیں۔ گنگا جمنی گہنا پہنے ہوئے گھوڑے رنگی اور گندھی ہوئی ایالیں۔ ریشمی باگ ڈور تھامے، سائیس ان کے صاف شفاف کپڑے، چھوٹی چھوٹی سرخ پگڑیاں۔ ایک ہاتھ میں باگ ڈور دوسرے میں چوہری۔ سوار ہیں کہ شہ سواری کے انداز دکھاتے چلے جا رہے ہیں۔ غریبوں کا کچھ عجیب رنگ ہے۔ صرف ایک تہمت[8] بندھی ہے۔ نہ جسم پر

---

[1] یہ دروازہ سلطان علاء الدین کا بنوایا ہوا ہے۔ لاٹھ کے بالکل پاس ہے اور خوب صورتی میں لاجواب سمجھا جاتا ہے۔

[2] مہرولی میں شمال کی طرف کوئی میل بھر کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا پتھر پہاڑ کی چٹان پر رکھا ہوا ہے۔ بچہ بھی ہلائے تو اس طرح ہلتا ہے کہ اب نیچے جا پڑے۔

[3] چھنٹکی کے قریب ہی ایک بزرگ کے مزار پر یہ درخت ہے کہتے ہیں رائے پتھورا کی بیٹی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی تھی۔ اس کی قبر پر بھی اس نیم کا سایہ ہے۔ نیم کے درخت کا جو حصہ ان بزرگ کے مزار پر ہے، اس کے پتے میٹھے اور جو حصہ راجہ کی لڑکی کی قبر پر ہے اس کے پتے کڑوے ہیں۔

[4] یہ پٹھان بادشاہوں کی قبریں ایک کھلے چبوترے پر بنی ہوئی ہیں۔ [5] اولیا مسجد کے سامنے چالیس شہیدوں کے مزار ہیں۔ کہتے ہیں یہ کسی طرح
گنتی میں نہیں آتے بے ترتیبی کی وجہ سے بھول چوک ہو جاتی ہے۔ [6] چہل تن چہل من کے پاس ہی ایک ویران عمارت ہے سنتے ہیں رات کے وقت اس میں گانے کی آوازیں آتی ہیں۔

[7] اندھیریا باغ قطب کی جان ہے۔ شمسی تالاب کے جنوبی کنارہ پر خوبصورتی سے لگایا ہے کہ دور سے گہرے ابر کا دھوکا ہوتا ہے۔ گھنا ایسا ہے کہ دن کی دھوپ بھی مشکل سے اس کے پتوں پر چھنتی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ نے اس باغ میں دنیا کے جو مزے اٹھائے ہیں وہ کسی بادشاہ کے خواب و خیال میں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

کرتہ ہے نہ سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی۔ ہاں ایک چھوٹا سا مٹکا سر پہ اوندھائے سرپٹ اڑے جا رہے ہیں۔ اب یہ نہ پوچھو کہ اس مٹکے میں کیا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ سیر کا سارا ذخیرہ اسی مٹکے میں ہے۔ تحفہ تحفہ کپڑے ہیں۔ لیس دار کار چوبی ٹوپی ہے۔ پوال سلیم شاہی جوتی ہے۔ روپے ہیں، پیسے ہیں۔ بچھونا ہے۔ غرض سب ہی کچھ بھرا ہے۔ مٹکے میں اس لیے رکھا ہے کہ بھیگ نہ جائے۔ ترکیب اچھی نکالی ہے۔ سامان کا سامان بچا اور مٹکا قطب میں کام آیا۔

تیرھویں کی صدی سے جو یہ لین لگی تو کہیں چودھویں کی شام کو جا کر ختم ہوئی۔ ساری دلی خالی ہو گئی۔ شاید ہی کوئی گھر ہو گا جس میں مرد یا بچہ رہ گیا ہو۔ اب رہیں عورتیں تو انھوں نے دلی میں سیر منائی۔ سبزی منڈی نکل گئیں، باغوں کی سیر کی۔ جھولے ڈالے۔ کڑھائیاں چڑھائیں۔ آم کھائے۔ حوضوں میں نہائیں۔ غرض دل کے پورے ارمان نکال لیے۔ شاہی حکم تھا کہ جس سرکاری باغ میں دلی والیاں جانا چاہیں تو جانے دو۔ پردہ کرا دو۔ باہر پہرے لگا دو کہ مرد اندر نہ جا سکے۔ آگے یہ جانے اور باغ جانے۔ انھوں نے بھی دو روز میں سارے باغوں کو لنڈورا کر دیا۔ آموں کی گٹھلیوں اور چھلکوں کے ڈھیر لگا دیے۔ دن میں کئی کئی دفعہ اٹھائے جاتے اور پھر وہی پہاڑ کے پہاڑ لگ جاتے۔

میلانیوں نے پہلے تو قطب میں اپنے لیے کونے تلاش کیے۔ بھلا قطب میں ٹھہرنے کے لیے جگہ کی کیا کمی تھی۔ سرکاری ڈیرے تھے۔ شاہی مکانات تھے۔ پرانے کھنڈر تھے۔ امراء تو اپنے مکانوں میں جا ٹھہرے۔ روپے پیسے والوں نے سڑک کے دونوں طرف جو کوٹھے تھے وہ کرایہ پر لے لیے۔ غرباء کچھ تو ڈیروں اور سرکاری مکانات میں جا پڑے۔ کچھ جھرنے میں جا ٹھہرے۔ کچھ ناظر کے باغ میں اتر گئے لیکن جن کو قطب کا لطف اٹھانا تھا انھوں نے آسمان کے نیچے ڈیرہ کیا۔ مینہ برستا ہے برسنے دو۔ یہی قطب کی بہار ہے۔

مہرولی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو۔ اس سرے سے اس سرے تک سارا آئینہ بند تھا۔ دنیا بھر کے سودے والوں کی دکانیں لگ گئی تھیں۔ میوے، مٹھائیاں اور کھلونوں سے بازار پٹا پڑا تھا۔ ایک طرف حلوائیوں کے ہاں پوریاں کچوریاں۔ پیڑیاں۔ سہال اور اندرسے تلے جا رہے تھے، تو دوسری طرف کبابوں پراٹھوں۔ بریانی۔ مزعفر اور متنجن کی خوشبو سے سارا بازار پڑا مہک رہا تھا۔ گاہک ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ لیا۔ کھایا۔ پتے وہیں پھینک آگے بڑھے۔ نیواڑن کی دکان پر پہنچے۔ بی نیواڑن ہیں کہ بالوں میں تیل ڈالے۔ کنگھی کیے۔ آنکھوں میں سرمہ لگائے۔ دانتوں میں مسی ملے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھی پان بنا رہی ہیں۔ دیسی پان لال لال صافیوں میں لپٹے سامنے دھرے ہیں۔ پان بن رہے ہیں مذاق ہو رہا ہے۔ یار لوگوں نے پان لیے خود کھائے، دوسروں کو کھلائے۔ پیک تھوکی۔ آگے بڑھے۔ پھول والوں کی دکانوں سے گجرے لیے گلے میں ڈالے۔ ساقی کے پاس ٹھہرے۔ دو دم حقہ کے مارے۔ ایک دو پیسے دئیے۔ آگے قدم بڑھایا۔ ساقی کا رنگ بھی آج کچھ نیا ہے حقہ کیا ہے ایک تماشہ ہے۔ کوئی گز بھر اونچا نیچہ۔ اس پر اتنی بڑی چلم کہ ڈیڑھ پاؤ تمباکو آئے۔ نَے ہے کہ یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے نَے کو سنبھالنے کے لیے کئی کئی گھوڑیاں دے رکھی ہیں نَے پر خس چڑھا ہے۔ اوپر موتیا اور چنبیلی کی لڑیاں لپٹی ہیں۔ گھوڑیوں کے اوپر روشنی کے چھوٹے چھوٹے گلاس لگے ہیں۔ ساقی خود بھی سفید کپڑے پہنے سبز بنارسی سیلہ باندھے۔ لال ٹپکا لپیٹے کھڑے حقہ پلا رہے ہیں۔ کوٹھے والوں کو پلانا ہو تو "نَے" سیدھی کر دی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) بھی نہیں آ سکتے۔ اب اس سے زیادہ کیا لکھوں۔ خیر جو تھا سو تھا۔ اچھی گزار گئے۔ بہادر شاہ کے بیٹے۔ مرزا شاہ رخ کا مزار باغ سے بیچ میں ایک چبوترا بنا ہوا ہے۔ اب یہ باغ کسی قدر چھدرا ہو گیا ہے۔

ٹہ لفظ تو "تہ بند" ہے اس سے تہمد ہوا۔ پھر تہمت بن گیا۔ شاہ مبارک آبرو کا شعر ہے ؎

آبرو کے قتل کو حاضر ہوئے کس کے کمر　　خود کرنے کر چلے عاشق پہ تہمت باندھ کر

انھوں نے بھی دو کش کھینچ لیے۔ ادھر کسی نے مہنال پہ ہونٹ رکھے اور انھوں نے شعر پڑھنے شروع کیے

حقّہ جو ہے حضورِ معلّٰی کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریّا کے ہاتھ میں

شام ہوتے ہوتے بازار اتنا بھرا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ تھالی پھینکو تو سروں پر جائے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہی جھرنے سے نفیری کی آواز آئی۔ سمجھے پنکھا اٹھا۔ اب ہر شخص ہے کہ جھرنا کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ جا رہے ہیں کچھ واپس آ رہے ہیں۔ ریلے پر ریلا پڑ رہا ہے۔ جو ذرا دم خم والے ہیں وہ ان جھٹکوں کو سینہ اور پشت پہ سہ رہے ہیں۔ جو ذرا کمزور ہیں وہ یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں کہ "ارے بھئی جانے بھی دو۔ کون اس بلا میں پڑے۔ آگے چل کر پنکھا دیکھ لیں گے۔"

پنکھا جھرنے سے اٹھا۔ شمسی تالاب سے ہوتا ہوا مہرولی کی سڑک پر آیا۔ یہاں پہلے ہی سے مشعلیں، لالٹینیں، گلاس، ہانڈیاں فانوس اور دیوارگیریاں جل چکی تھیں۔ روشنی ایسی تھی گویا دن نکلا ہوا ہے۔ اب پنکھے کا جلوس بازار میں سے گزرنا شروع ہوا۔ آگے آگے ڈھول تاشے والے۔ روپہلی ٹھپّہ ٹکے ہوئے۔ سبز کُرتے۔ لیس لگی ہوئی گول لال ٹوپیاں۔ کسی کے گلے میں ڈھول۔ کسی کے گلے میں تاشہ ہاتھوں میں چوبیں۔ دھوں دھاں کرتا اس طرح گزرا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے۔ ان کے پیچھے دو جھنڈے زربفت کے پھریرے۔ مقیش کے پھندے۔ کلابتوں کی ڈوریاں۔ جھنڈوں کے سروں پر رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لال ٹینیں۔ ایک لالٹین کے سرے پر سنہرا ہلال۔ دوسرے پر روپہلی چکمہ۔ ان کے بعد شرف الحق کوتوال کا گھوڑا۔ اردلی میں پولیس والوں کا پرا۔ ان کے پیچھے نوبت خانے کا تخت۔ تخت کیا ہے خاصی بارہ دری ہے۔ تخت کے اوپر بانسوں کی بارہ دری کھڑی کر اوپر کھپچیوں کا گنبد بنا، کپڑا منڈھ، پنی لگا، کاغذوں کے پھولوں سے سجا، دروں میں گینڈئی پردے ڈال، ڈوریوں سے کس دیئے۔ نوبت والے اندر جا بیٹھے۔ تخت کو کہاروں نے اٹھایا اور یہ خاصہ مکان کا مکان جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ نوبت خانہ کے پیچھے دلّی کے اکھاڑے۔ ہر اکھاڑے کے ساتھ ایک ایک استاد۔ بیس بیس پچیس پچیس شاگرد بنے ہوئے تیار جسم۔ چوڑے چوڑے سینے، بھرے بھرے ڈنڈ۔ بھری ہوئی مچھلیاں۔ پتلی پتلی کمریں۔ جسم پر چُست جانگیے۔ گلے میں سونے کے چھوٹے چھوٹے تعویذ۔ کوئی بنیٹی کا چکر باندھ رہا ہے کوئی لیزم ہلا رہا ہے۔ کوئی تلوار کے ہاتھ نکال رہا ہے کہیں پھری گنکا سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ کہیں بانک اور بنوٹ کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں۔ غرض دور تک اکھاڑے ہی اکھاڑے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے نفیری والے اور ان کے ساتھ دلّی کے سقّے سفید براق کپڑے پہنے۔ لال کھاروے کی لنگیاں کمر سے لپیٹے سبز صلے سروں پہ باندھے، ہاتھوں میں منجھے منجھائے پیتل کے کٹورے لیے نفیری اور جوڑی کے ساتھ کٹوروں کی آواز ملاتے چلے آ رہے تھے۔ نفیری والوں کے بعد ڈنڈے والوں کی سنگتیں تھیں۔ ہاتھوں میں لال سبز ڈنڈے پندرہ بیس کا حلقہ۔ بیچ میں طبلہ سارنگی والے۔ تال سُر پہ ڈنڈوں کی کھٹا کھٹ عجیب مزا دے رہی تھی۔ ان کے پیچھے تخت رواں۔ تختوں پر رنڈیاں بھاری بھاری پشوازیں پہنے، کارچوبی دوپٹے اوڑھے، پاؤں میں گھنگرو باندھے چھم چھم ناچ رہی ہیں۔ ان کے بعد انگریزی باجہ اور ترک سواروں کا رسالہ۔ سرخ بانات کی وردیاں۔ ان میں سفید بانات کے کف اور کالر۔ شانوں پر فولادی جال، پاؤں میں کالی برجسیں۔ لک[1] کے چمڑے کے اونچے بوٹ، سر پہ سرخ مُنڈاسے۔ ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے لیے گھوڑوں کی کنوتیاں ملائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ سواروں کے پیچھے شاہی روشن چوکی اور رسیلا نیوں

---

[1] (PATENT LEATHER) کو دلّی میں لک کہتے ہیں۔

کا اژدھام۔ سب کے صاف ستھرے کپڑے کارچوبی ٹوپیاں۔ مداغل ٹکے ہوئے۔ نیچے چولی کے انگرکھے ایک برے پائجامے۔ سلیم شاہی جوتیاں۔ ان کے پیچھے پلٹن کی چار قطاریں۔ کم عمر[1] گورے گورے لڑکے سر پر دھانی منڈاسے۔ منڈاسوں پر چھوٹی چھوٹی کلغیاں۔ سبز اطلس[2] کے کوٹ۔ سفید اطلس کی کسی ہوئی برجیس سیاہ چمڑے کے انگریزی جوتے، ہاتھوں میں سبز پھریروں کے چھوٹے چھوٹے نیزے۔ بڑی آن بان سے قدم ملاتے چل رہے ہیں۔ ان کے پیچھے دلی کے شرفاء اور عمائد کا ہجوم۔ نیچی نیچی قبائیں اور چغے، ہندوؤں کے سروں پر چھوٹی چھوٹی گنبدی پگڑیاں مسلمانوں کے سروں پر زعفرانی عمامے اور چوگوشیہ ٹوپیاں، ہاتھوں میں رنگ برنگ کی جریبیں۔ ہشاش بشاش چہرے، گلے میں پھولوں کے گنٹھے ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں، موسم کا لطف اٹھاتے، میلہ کی رونق بڑھاتے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں، ان کے بعد شاہی شہنائی نوازوں کا گروہ نفیری کے کمال دکھاتا موسم کی چیزیں بجاتا خود بھی اپنے کمال کے مزے اٹھاتا۔ پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے سب سے آخر میں پنکھا اور پنکھے کے پیچھے پھول والوں کا غول۔

بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو۔ بانس کی کھپچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا۔ پنی چڑھا آئینے لگا۔ پھولوں سے سجا ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوشِ محبت اور یگانگت کا نشان تھا جس نے چھوٹے بڑوں، ہندو، مسلمانوں، غرباء، امراء۔ غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقہ کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعہ سے نکال مہرولی میں لے آیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہروں کا مرکز تھا اور یہ مہرولی نہ تھی بلکہ لگن تھا جس میں خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا ان کے پروانے۔

غرض خلقت کا یہ ہجوم پھوار میں بھیگتا، خس کے پنکھے جھلتا، آہستہ آہستہ مہرولی کی سڑک پر سے گزرا۔ باجہ والے اور نفیری والے ہر کمرہ کے سامنے ٹھہرتے۔ ایک آدھ چیز سناتے۔ انعام لیتے اور آگے بڑھتے۔ ہوتے ہوتے یہ جلوس شاہی دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ بادشاہ سلامت اوپر کی بارہ دری میں برآمد ہوئے۔ بیگمات کے لیے چلمنیں پڑ گئیں۔ اب ساری بھیڑ سمٹ سمٹا کر باب ظفر کے سامنے آ گئی پھاٹک کے سامنے بڑا کھلا میدان تھا۔ یہاں باجہ والوں نے اپنے کمال دکھائے۔ اکھاڑے والوں نے اپنے کرتب دکھائے۔ سقوں نے کٹوروں سے بجائے۔ ڈنڈے والوں نے اپنے ہاتھ دکھائے۔ رنڈیوں نے اپنا ناچ دکھایا۔ سب کو حسبِ مراتب انعام ملا۔ کسی کو سیلا ملا۔ کسی کو دوشالہ ملا۔ کسی کو مندیل ملی۔ کسی کو کڑے ملے۔ اتنے میں پنکھا بھی سامنے آ گیا۔ شہر کے شرفاء اور امراء مجرا بجا لائے۔ اوپر سے سارے مجمع پر گلاب پاشوں سے گلاب اور کیوڑہ چھڑکا گیا۔ عطر اور پان سے تواضع کی گئی۔ بادشاہ کے اشارہ کرتے ہی ولی عہد بہادر نیچے اتر آئے۔ لوگوں کے گلے میں پھولوں کے گنٹھے ڈال کر سب کو رخصت کیا۔ یہاں سے سلاطین زادے اور شہزادے بھی جلوس کے ساتھ ہو گئے۔ کوئی بارہ بجے ہوں گے کہ پنکھا جوگ مایا جی پہنچ گیا۔

یہ مندر قطب صاحب کی لاٹھ سے کوئی دو ڈھائی سو قدم پر ہے۔ بڑی لمبی چار دیواری ہے۔ کونوں پر برجیاں ہیں۔ احاطہ کے اندر (۲۰۔۲۲) عمارتیں اور بیچ میں دیوی کا استھان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوی کشن جی کی بہن تھیں۔ بجلی بن کر الوپ ہو گئیں اور یہاں آن پڑیں۔ راجہ یدھشٹر نے مندر بنوا دیا۔ مندر زمین کے برابر ہو گیا تھا۔ پھول والوں کی سیر شروع ہوئی تو اکبر شاہ ثانی کے ایماء سے لالہ سیدھ مل نے نیا

---

[1] شرفاء دہلی کے لڑکوں اور کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی یہ فوج بادشاہ نے بنائی تھی۔ تھے تو لڑکے مگر غدر میں مارٹے کے نیچے سب ڈھیر ہو گئے۔ ان کے قصے دلی کے بڈھے بیان کرتے تھے اور روتے تھے۔ تاریخ میں ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ خدا معلوم کیا بات ہے ہاری ہوئی فوج تھی شاید اس لیے ان کا ذکر بے ضرورت سمجھا گیا۔

[2] دہلی کا شاہی رنگ سبز تھا۔

مندر بنوایا۔ رفتہ رفتہ اور عمارتیں بھی اندر بن گئیں۔ اب یہ خاصی آباد جگہ ہو گئی ہے۔ اس مندر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر پلنگ یا چارپائی نہیں جا سکتی۔

کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑھا کر واپس ہوئے۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ بابِ ظفر کے سامنے آ کر ٹھیرا۔ بعض مصاحبوں نے کوشش کی کہ بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف میں کسی نہ کسی طرح لے چلیں۔ مگر بادشاہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوئے۔ کہا "اماں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جب میں جوگ مایا جی کے پنکھے کے ساتھ نہیں گیا تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤں۔ تمہارے بھائی کیا خیال کریں گے۔ مسلمان تھا۔ مسلمانوں کے پنکھے میں شریک ہو گیا۔ ہم کو غیر سمجھا۔ اس لیے جھروکوں سے نیچے بھی نہیں آیا۔ نا۔ اماں، نا۔ جلیبا ایک کے ساتھ کرنا دلیا دوسرے کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے تھے اب بھی جائیں گے۔ آتش بازی[1] میں ہندو۔ مسلمان سب شریک ہوتے ہیں۔ وہاں ہم بھی چلیں گے۔"

خیر درگاہ شریف[2] تو قریب ہی تھی۔ لوگ دس بجے پنکھا چڑھا کر فارغ ہو گئے۔ اور یہاں سے نکل سیدھے شمسی تالاب پہنچے۔ تھوڑی دیر میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آ گئی۔ بیگمات کے لیے جہاز پر چلمنیں پڑ گئیں اور اندر جا بیٹھیں۔ بادشاہ سلامت نے مہتابی پر جلوس کیا۔ مصاحبوں اور دہلی کے اکثر امراء و شرفاء کو اوپر بلا لیا گیا۔ سارے سیلانی تالاب کے کنارے جم گئے۔ تالاب میں سینکڑوں کشتیاں، بجرے اور نواڑے پہلے ہی سے پڑ گئے تھے۔ آدھوں میں شاہی آتش باز سوار ہو کر ایک طرف چلے گئے۔ باقی میں دہلی کے آتشباز اور شوقین بیٹھ کر دوسری طرف گئے۔ بادشاہ سلامت کا آنا تھا کہ دونوں پارٹیاں مقابلہ کو تیار ہو گئیں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ جہاز پر مہتابی چھٹی۔ مہتابی کا چھٹنا تھا کہ میدان کارزار گرم ہو گیا۔ سب سے پہلے غبارے چھوڑے

---

[1] میں نے بزرگوں کی زبانی سنا تھا کہ بادشاہ کو آتش بازی کا بڑا شوق تھا۔ آتش باز نوکر تھے۔ کوئی میلہ نہ تھا جس میں قلعہ سے آتش بازی نہ جاتی ہو۔ دہلی والوں سے مقابلے ہوتے تھے۔ ان مقابلوں کے دو بڑے میدان تھے۔ ایک شمسی تالاب۔ دوسرے سید حسن رسول نما کا حوض۔ پھول کی سیر میں تو اب آتشبازی نہیں چھٹتی۔ ہاں سید حسن رسول نما میں اب بھی خوب مقابلے ہوتے ہیں۔ ان بزرگوں کے بیان کی تائید اب ایک کتاب سے بھی ہو گئی۔ اب حال میں مسٹر اینڈریوز نے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ خاں دہلوی کی سوانح عمری لکھی ہے اور دہلی کے بڈھوں بڈھوں سے پوچھ پوچھ کر غدر سے پہلے کے حالات جمع کیے ہیں۔ اس میں بادشاہ کے اس شوق کا بھی ذکر ہے۔ اس کتاب کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ دہلی والوں میں کیا تعلقات تھے اور کس طرح یہ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ صاحب لکھتے ہیں کہ جس بڈھے سے بادشاہ کا حال پوچھا خواہ ہندو ہو یا مسلمان اس کے آنسو نکل آئے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کسی غیر کا قصہ بیان کر رہا ہے بلکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ یہ کتاب ابھی ۱۹۲۹ء میں ڈبلیو ہیفر اینڈ سنز لمیٹڈ کیمبرج نے چھاپی ہے اور ساڑھے سات روپے قیمت ہے۔

[2] یہ درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی ہے۔ آپ حضرت سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ تھے۔ سلطان شمس الدین التمش کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ کا وصال قوالی میں اس شعر پر ہوا۔ ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

دہلی کے بادشاہوں نے آپ کے مزار کے گرد سنگِ مرمر کی جالیاں، فرش اور دروازے بنوائے۔ دیواروں پر کاشانی اینٹوں کا کام کرایا اور آس پاس مسجدیں اور حجرے تعمیر کرائے۔ خود مزار شریف تو کچی مٹی کا ہے۔ ہاں آس پاس دوسروں کی قبروں کے بڑے (باقی اگلے صفحے پر

گئے اور ذرا سی دیر میں آسمان پہ ہزاروں چاند اور سورج نکل آئے۔ ان سے فراغت ہوئی تو جنگی آتش بازی[1] کا نمبر آیا۔ ہوائیاں[2]، چچکے[3]، لٹو[4] اور خدنگے[5] چلے۔ ہوائیوں کی سائیں سائیں۔ چچکوں کی غائیں غائیں۔ لٹوؤں کی دھائیں دھائیں۔ خدنگوں کی زائیں زائیں اور قلموں کی سائیں سائیں سے بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی جنگ ہو رہی ہے۔ ادھر آسمان پہ مقابلہ ہو رہا تھا ادھر پانی پہ آتشبازی کے بجرے چھوٹے بجرے کیا تھے چھوٹے چھوٹے جہاز تھے۔ توپوں کی جنگ۔ مہتابیاں اور چھچھوندریں۔ گولوں کی جگہ چکر اور خدنگے۔ مستولوں کی جگہ انار۔ آدمیوں کی جگہ مٹی کے سپاہی۔ پیٹ میں بارود۔ ناف میں چھچھوندر[6]۔ اس سرے سے اس سرے تک شتابہ کا سلسلہ۔ ادھر سے دلی والوں کے بجرے چلے ادھر سے قلعہ والوں کے بجرے آئے۔ بیچ تالاب میں پہنچ کر دھواں دھوں ہونے لگی۔ سمندروں کی لڑائی کا مزا آ گیا۔ آتشبازی کی چمک سے سارا تالاب اور کنارے روشن ہو جاتے تھے، اور پانی میں روشنی کے عکس کشتیوں کے سائے۔ آتشبازوں کے ننگے ننگے جسم۔ کناروں پر خلقت کے ہجوم۔ ان کے غل آتشبازی کے عکس سے ان کے زرد زرد چہروں اور اوپر دھوؤں کے بادلوں نے ایک عجیب خوفناک منظر پیدا کر دیا تھا۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی مہتابیوں۔ آفتابیوں۔ اناروں۔ سہروں۔ جائی جوئیوں۔ ہت پھولوں اور چرخیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ دونوں طرف کی کشتیاں سمٹ کر جہاز کے بالکل سامنے آ گئیں۔ یہاں استادوں نے اپنے ہنر کے کمال دکھائے۔ نسری چھوڑی تو ایسی کہ لوٹ کر سو سو دفعہ اٹھے اور رہ رہ کر سانس لے۔ تباشہ انار ایسے کہ کئی کئی گز اونچے جائیں اور بیچ رنگی پھول دیں اور پھر یہ مزا کہ ہتھیلی پہ چھوڑ لو۔ کیا مجال جو چر کر لگے۔ بڑے انار جو اٹھے تو جہاز سے اونچے نکل گئے۔ بس معلوم ہوتا تھا کہ سرد کے درختوں کو آگ لگا کر کشتیوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴۶) عمدہ عمدہ سنگِ مرمر کے تعویذ ہیں۔ ایک طرف سنگِ مرمر کی چھوٹی سی مسجد ہے اور اس کے پہلو میں آخری بادشاہانِ دہلی کے مزار۔ بیچ میں شاہ عالم ثانی کا مزار ہے اور اس کے ایک طرف اکبر بادشاہ ثانی کی قبر۔ ایک پہلو خالی تھا۔ اس میں بہادر شاہ نے اپنا سردابہ بنوایا تھا۔ خیال تھا کہ مرنے کے بعد باپ دادا کے پہلو میں جا پڑیں گے۔ یہ کیا معلوم تھا کہ وہاں قبر بنے گی جہاں بزرگوں کا پہلو تو کجا قبر پر دیا جلانے والا بھی نہ ہو گا۔

[1] دہلی والوں نے آتش بازی کو دو قسموں میں بانٹا ہے۔ ایک جنگی دوسرے گلکاری۔ ان دونوں کا مطلب آگے آپ خود سمجھ جائیں گے۔

[2] بڑے اڑن اناروں کو دہلی میں ہوائی کہتے ہیں۔

[3] موٹے مضبوط بانسوں کی لمبی لمبی پوریوں پر آنتیں لپیٹ اوپر سے جھلی چڑھا اور اندر خوب ٹھونس ٹھونس کے بارود بھر کر چچکہ بنایا جاتا ہے۔ اس کا چلانا واقعی بڑا کمال ہے۔ بارود کو آگ دے۔ اس کو ہلانا شروع کیا۔ جب زور پکڑ گیا تو جھلا کر اور کئی چکر دے کر اوپر چھوڑ دیا۔ اب بانس کی یہ آدھ گز لمبی پوری غائیں غائیں کرتی اس زور سے جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اگر چھوڑنے میں کہیں ہاتھ نیچا رہ گیا اور یہ پوری تماشائیوں میں گھس گئی تو سمجھ لو کہ قیامت آ گئی۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی، کسی کا منہ جھلس گیا۔ کسی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ غرض یہ آتش بازی کیا ہے ایک بلا ہے۔

[4] مٹی کے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے گولے بناتے ہیں۔ یہ اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ ایک طرف چھید کیا اور بارود بھر دی۔ چھید میں چھوٹی سی چھچھوندر لگا دی۔ چلاتے وقت چھچھوندر میں آگ لگا۔ لٹو کو اوپر پھینکا۔ اندر کی بارود نے آگ لی اور لٹو پھٹا۔ اس زور کی آواز ہوتی ہے جیسے توپ چل گئی۔

[5] خدنگ کو دہلی والے خدنگہ کہتے ہیں۔ یہ چیز ایسی عام ہے کہ کسی نوٹ کی ضرورت نہیں۔

[6] بڑی چھچھوندر کو قلم کہتے ہیں۔ اس کی بارود اتنی تیز ہوتی ہے کہ زمین پہ لوٹنا جانتی ہی نہیں۔ پانی کی چوٹ کھا کر بھی اٹھتی ہے تو پچیس تیس گز اونچی اڑ جاتی ہے۔

کھڑا کر دیا ہے اور ان میں سے رنگ برنگی پھول جھڑ رہے ہیں۔ دم اتنا کہ ختم ہونا ہی نہ جانیں۔ کمال یہ کہ کپڑے پر دھبّہ نہ دیں۔ آتش بازی کی روشنی سے تو یہ نظر آتا تھا کہ سارے کا سارا پانی سونے کا ہو گیا ہے اور اس کے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے تالاب میں آتشیں باغ لگا دیا ہے۔

غرض دو بجے کے قریب آتش بازی ختم ہوئی۔ بادشاہ سلامت کی طرف سے شال دوشالے۔ مندیلیں اور سیلے تقسیم ہوئے۔ کہیں تین بجے جاکر لوگوں کو فرصت ہوئی۔ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا پڑے۔ بادشاہ سلامت کی سواری رات ہی کو قطب سے نکل گئی۔ اور روشن چراغ[1] دہلی ہوتی ہوئی تیسرے پہر تک دہلی آگئی۔ دوسرے روز لوگوں نے صبح ہی صبح اٹھ۔ میوے مٹھائیاں پراٹھے[2]، چھلّے[3] اور کھلونے خریدے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے نکل اپنے گھروں کا راستہ لیا۔ شام تک مہرولی سنسان اور دہلی آباد ہو گئی۔

دیکھ لیا آپ نے پھول والوں کی سیر کا مزا۔ اور اب کی کیا پوچھتے ہو۔ غدر ہوا۔ دہلی تباہ ہوئی۔ بادشاہ رنگون پہنچے۔ بندھن ٹوٹ گیا۔ تیلیاں بکھر گئیں۔ بندھن اب بھی ہے مگر وہ محبت کا بندھن تھا یہ قانون کا بندھن ہے۔ ذرا کچھ بات ہوئی۔ اور چل بھیا عدالت میں۔ بات یہ ہے کہ پھول والوں کی سیر رعایا کی عقیدت اور بادشاہ کی محبت کا مظاہرہ تھی۔ بادشاہ کے بعد بھی چلی۔ مگر مرکز اور یک جہتی نہ ہونے سے زور گھٹتا گیا۔ اب پانچ چھ برس سے بالکل بند ہے۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں اور دلوں کی کدورت کا یہی حال رہا تو ہمیشہ کے لیے اس کو بند ہی سمجھو ؎

اب ہم نشیں میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

مضمون ختم ہو گیا۔ پڑھنے کے بعد ہر شخص کے دل میں خیال پیدا ہو گا کہ یہ واقعات ہیں یا کوئی من گھڑت قصہ۔ اس کے متعلق میں بعض باتوں کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اس مضمون میں جس قدر تاریخی واقعات یا مکانات کے نقشے ہیں ان کی صحت میں تو کسی کو شک ہو نہیں سکتا۔ البتہ بقیہ واقعات کے متعلق دل میں دگدا پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی یہ کیفیت ہے کہ جھرنے اور امریوں کے واقعات کا حال میں نے ان بڑھیوں سے سنا ہے جو ان جلسوں میں شریک تھیں۔ اس زمانہ کی سیر دیکھنے والے اب بھی دہلی میں موجود ہیں۔ وہ میرے ایک ایک حرف کی تائید کریں گے۔ جلوس کی تصویر خود میں نے اپنے مصوری کے استاد کے ہاں دیکھی ہے۔ میں نے صرف یہ کیا ہے کہ ان واقعات کو ملا کر رنگ بھر دیا ہے۔ اب رہی گفتگو۔ تو وہ البتہ میرے خیال کا نتیجہ ہے لیکن جو تعلقات اور محبت رعایا اور بادشاہ میں تھی، اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس گفتگو کو بھی مبالغہ آمیز نہیں کہا جا سکتا۔ مسٹر سی ایف اینڈ روز کی کتاب "ذکاء اللہ دہلوی" اٹھا کر دیکھ لو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ میں نے اس بارے میں لکھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ مسٹر اینڈ روز میرے استاد تھے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ کس طرح بڈھے بڈھوں سے مل کر انھوں نے غدر سے پہلے کے حالات دریافت کیے ہیں اور خود ان پر اس تحقیقات کا کیا اثر ہوا ہے۔

---

[1] حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پرانی دہلی میں ہے۔ قطب سے ۵ میل اور دہلی سے کوئی ۵ میل۔ آپ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ ہیں اور وہیں سے آپ کو چراغ دہلی کا خطاب ملا تھا۔ جہاں آپ کا مزار ہے۔ اس بستی کو اسی خطاب کی وجہ سے چراغ دہلی یا روشن چراغ دہلی کہنے لگے ہیں۔

[2] [3] پھول والوں کی سیر کی دو ہی سوغاتیں تھیں۔ ایک پراٹھے دوسرے چھلے۔ آتے اور گھر گھر بٹتے۔

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سنہ ۱۲۶۴ھ کا انتخاب کیوں کیا گیا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ سنہ ۱۲۶۴ھ تک بہادر شاہ کی زندگی بہت چین چان اور امن و امان سے گزری۔ اس کے سال بھر بعد ہی سے اس بچارے پہ پے درپے مصیبتیں آتی شروع ہوئیں۔ دارا بخت ولی عہد کا انتقال ہوا۔ مرزا شاہ رخ مرے مرزا فخرو چل بسے۔ خود بادشاہ کو زہر دیا گیا۔ جواں بخت کی ولی عہدی کے جھگڑے پڑے۔ قصہ مختصر یہ کہ غدر تک ان مصیبتوں نے بچارے بڈھے بادشاہ کو بٹھا دیا۔ اسی خیال سے میں نے وہ آخری سال لیا ہے جب بادشاہ ان تمام فکروں اور مصیبتوں سے آزاد تھے۔

بہرحال یہ بڈھوں کی ودلیعت تھی جو میں نے آپ تک پہنچا دی۔ اب چاہے آپ اس کو قبول کریں یا نہ کریں۔

ارہر کا کھیت

رشید احمد صدیقی

"وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے"

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض، فطری حوائج اور معاشرتی حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی۔

پارلیمنٹ اور کونسلروں کی ہیر پھیر اور جیبز جواب "رقص پروانہ" اور "پرفشانی شمع" سے زیادہ گرمئ محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں۔ وہ صدا ہائے بازگشت ہیں جو شاید سب سے پہلے کسی آلہ مکبر الصوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائڈ پارک کی خوش فعلیاں اکثر آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر ڈاکٹروں پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت دیر میں پیدا ہوا۔ لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ کی پیشرو گزر چکی ہیں۔ یہ دیہاتوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک قضائے حاجت کرتا ہے اور دوسرا ان کو آپریشن۔

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں کہر آلود ہو کر پھیلنے لگتا ہے۔ کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ کسان اور ان کے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں۔ گویا دونوں ایک ہی مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ یعنی گھر پہنچ کر کھانا ملے گا، سونے کو ملے گا اور عافیت ملے گی۔ ان کے مقابلے میں دن کی محنت ہر حیثیت سے دلآویز تھی۔ اور دوسرے دن کی مشقت خوش آیند۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے۔ کسان کی بیوی، اس کے بچے، بچیاں اور اس کا بوسیدہ جھونپڑا کسان کے لیے اتنا ہی عزیز ہوتے ہیں جتنا خود مویشی کے لیے۔ کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس لیے زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر یا مستغنی ہوتے ہیں۔ غرض کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو وہ آج کل کے روشن خیال میاں بیویوں سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ خوش قسمت نہیں تو مسرور سہی!

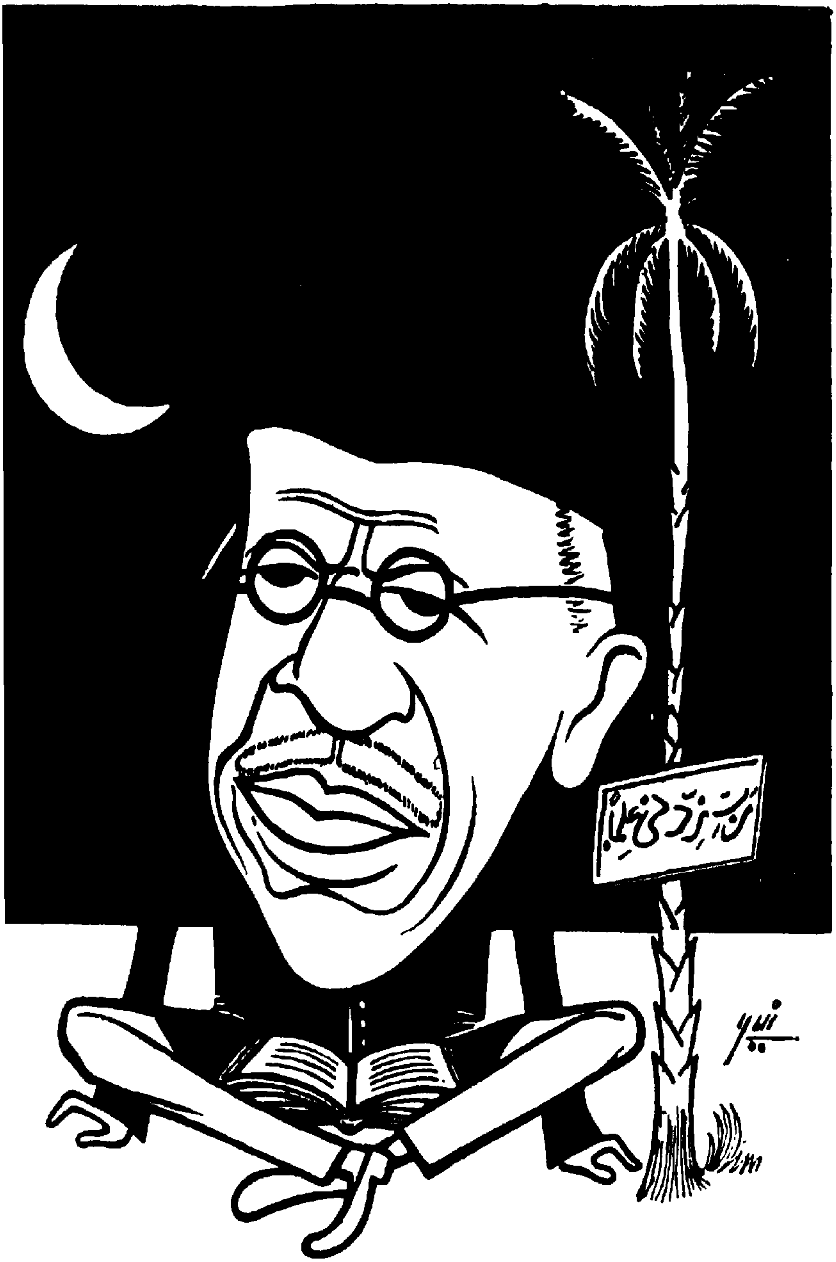

لیکن وہ دیکھیے گا۔ گاؤں کے قریب والے کنویں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے۔ ایک طرف گڑھا سا ہے جس میں کھاد پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک ببول کا کھوکھلا پرانا درخت ہے جیسے کوئی کہن سال وکٹوریہ کراس تمغہ یافتہ جس پہ ایک آدھ شب زندہ دار سبز رنگ اس طور سے بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں۔ جیسے جنگِ عظیم کے اختتام پر یورپ کے بعض فرزندانِ قسمت شاخِ زریں پر بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ عورتوں کی کچھ تعداد جمع ہوئی۔ یہاں کچھ دیر تک مزید کمک کا انتظار کیا گیا۔ ان میں جو جوان تھیں، پُر شباب لیکن بے خطر کنویں کی جگت پر تھیں۔ پاؤں لٹکائے ہوئے کچھ گنگناتی ہوئی اور بوڑھیوں کو دعوتِ تہدید و عتاب دیتی ہوئی کچھ بوڑھیاں تھیں جو جگت کے نیچے بیٹھی ہوئی کراہ رہی تھیں، گالیاں دے رہی تھیں اور کھانستی جاتی تھیں۔ اتنے میں ایک اور گروہ آ پہنچا۔ نوجوان جگت پر بیٹھنے والیوں نے اپنی ہجولیوں کا شوخی و طراری سے اور بوڑھیوں نے کوسنے، گالی اور کھانسی سے خیر مقدم کیا۔ اکہری قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے یہ مجمع کھیت کی پگڈنڈی پہ ہو لیا۔ جسموں کو تولتے ہوئے نوجوان عورتیں لڑکھڑاتیں تو ایک ہلکی سی چیخ اور بلند قہقہہ کے ساتھ سنبھل جاتیں۔ بوڑھیوں کا قدم ڈگمگاتا تو زمیندار اور کسان جس کا کھیت حاشیہ پہ ہوتا موسم، پاس کا لڑکا، لڑکی یا قہقہہ لگانے والی عورت گالیاں سنتی۔ یہ مہم چلتے چلتے ایک تاریک، ناقابلِ گزار، اندیشہ ناک اور خاردار سدّ رؤیں کے سامنے رک گئی۔ یہ دیہاتی بلجیم کے قلعے تھے۔

برسوں گزر رہے ہیں اسی دشت کی سیاحی میں
لیکن بعض ثقات جس کا شاید نام لینے سے گھبرائیں ـــــــ ارہر کا کھیت!

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لیے ہم چورن یا مار کھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا اختتام اور تعزیرات کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں حفظانِ صحت کے جراثیم ملتے ہیں۔ یہاں آنے پہ معلوم ہوگا کہ بہت سے منچلے یا مظلوم پہلے سے پہنچ چکے ہیں۔ کسی کا "آرامِ جاں" اور مونسِ قلب" بچھڑ گیا ہے۔ وہ اس کے لیے افتاں و خیزاں یہاں تک پہنچا ہے اور کسی سے وعدۂ دید، وانکے مرید کا قول و قرار ہے، وہ سراپا شوق چلا آ رہا ہے اور ـــ کسی کا گدھا کھو گیا ہے، وہ بھی بھٹکتا ہوا آ پہنچا ہے۔ یہ اس بھول بھلیوں کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کبھی گدھے والے کا ہاتھ عشاق کی گردن پہ ہوتا ہے یا خود گدھا کسی محبوبہ کے پہلو میں۔ آخر یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں ماسکوریڈ یا جشن "نقاب پوشی" کیا تھا جس پر یورپ والے ناز کرتے ہیں اور ہم روتے ہیں یا گالیاں دیتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لیے موزوں ہے۔ مہابھارت یا ارہر کا کھیت، مہابھارت تو شاید اختتام پہ ہے، سائمن کمیشن کی سفارش اور ارہر کے کھیت کا اور انتظار ہے۔

جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں، ایسا مسئلہ ہے جس پہ ناک بھوں پر زور دینے سے پہلے دل و دماغ پر زور دینا زیادہ ضروری ہے۔ ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ اکثر شفا خانے میں ورنہ جیل خانے میں۔ جیل خانہ کا راستہ تو اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گزرتا ہے اور شفا خانہ کا شہروں کی صاف شفاف سڑکوں سے جس پر سے موٹر بھی گزرتے ہیں اور مولوی بھی۔ یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے

کہ اس کے نوجوانوں نے اسرافِ شباب کے لیے شفا خانوں کو جیل خانوں پر ترجیح دی۔ زندگی کے آثار اپریشن ہال کے نشتر سے زیادہ جیل خانے کے ڈنڈے میں پائے جاتے ہیں۔ شفا خانہ سے زندگی اور جیل خانہ سے موت گھبراتی ہے۔

شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچوں کا سالن یا بے تمباکو کا پان، مانا کہ مرچ اور تمباکو مضرِ صحت ہیں۔ لیکن تندرستی کا مصرف تحفظِ تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں پیرانہ سالی کا لطف (اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں) اٹھانا ممکن ہے۔ لیکن پیرانہ سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالاتِ منتظرہ ہیں۔ ایک کا مقصود "انتظار" دشمن ایمان و آگہی" یا " رہزنِ تمکین و ہوش" ہے دوسرے کا؟

لیکن یہ ستم ظریفی ہندوستان کے مطالبہ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر ضد کرتا ہے۔ اور دوسری طرف سب کا انتقام بھی پورا پورا لیتا ہے۔

ارہر کے کھیت میں عقل سے شرمساری کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے بسولہ سے کام لیتے ہیں اور عدالت رندے سے خبر لیتی ہے۔ کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرے میں بھلے مانس شاعر کا اپنا کلام سنانا۔

دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں۔ اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے الّا عورت۔ شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک یورپ اور دولت حیّ و قائم ہیں۔ اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے الّا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے۔ اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے، پناہ لیتا ہے اور کشاکشِ حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفنن جس کے لیے اس نے چوپاٹی اور اپالو تعمیر کیا ہے۔ دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے۔ شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ دیہاتی کے یہاں محنت، دیانت اور عورت ہے۔ شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے لیکن محنت و دیانت سے نہیں بلکہ مکر و دولت سے آج چوپاٹی اور اپالو دریا بُرد ہو جائیں تو وہ جلد سے جلد کوئی اور چوپاٹی اور اپالو تعمیر کر لے گا۔ کسان کے جھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں سطحِ آب پر اپالو اور چوپاٹی کی خس و خاشاک یا گندگی نظر نہیں آ سکتی۔ بلکہ موجوں کے ساتھ ایک خفیف سی ہلکی رنگین تحریر! چوپاٹی اور اپالو کی تعمیر دولت شیطان سے ہوتی ہے۔ یہ ایک لمحہ میں تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حسن کی مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔ جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

ارہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے۔ کونسل اور اسمبلی کا صور یہیں سے پھونکا گیا تھا۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ سب یہاں معرضِ بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے، داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے۔ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے، رکمینا کے بچہ کیوں نہیں پیدا ہوتا اور سکھیا کو حمل کیسے ٹھہرا۔ ایک نے کہا میری گائے کے بچھیا ہوگی۔ دوسری بولی بھولو کی بچھیا ہو چکی ہے اب کے بچھڑا ہوگا۔ اس پر اختلافِ آرا ہوا اور ہندوستانی لیڈروں

کی طرح دونوں بھول گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے اور اب کیا ہو رہا ہے۔

اندھیرے میں گالی گلوچ موثر نہیں ہوتی۔ دونوں آگے بڑھیں، ایک کا پاؤں اور دوسری کا ہاتھ، بعوق حفظانِ صحت پر پڑا اور پڑتے ہی غصّہ کا سیلاب دوسری جانب مائل ہو گیا۔ دونوں یک لخت اس نتیجہ پہ پہنچیں کہ یہ مینا کے لڑکے مکندیا کا فعل تھا۔ دونوں نے مکندیا کو بانگ دہل کوسا، یہ گویا منیا کو اعلانِ جنگ تھا۔ منیا نے بیٹھے ہی بیٹھے للکارا۔ مکندیا گھبرا کر اپنی ماں کی تلاش میں بھاگا تو فریقین اول میں سے کسی کے اوپر جا گرا۔ دونوں چیخ پڑیں۔ منیا نے مار ڈالا۔ اب کیا تھا سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا۔ نہ خشک طہارت کا خیال رہا نہ تر نجاست کا، ایک غوغا بلند ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کھیت کے چاروں طرف سے لوگ نکلنے لگے۔ مرد، عورت، بچے، گیدڑ، کتے، بٹیریں، لومڑی، نیولا، بن ماؤ ——— گویا اسمبلی میں بم گرا۔

ایک روز ہم کو یک لخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہنچ گئے ہیں۔ بحیثیت لیکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا، پلنے والوں کے لیے اتنا ہی بصیرت افروز اور دلچسپ ہے جتنا کسی آثارِ قدیمہ دریافت کرنے والے کو ایک لاکھ برس قدیم آنجہانی گینڈے کا ڈھانچہ ملنا۔ ایسی صورت میں ہر اس گزر جانے والے کو مخاطب کرنا اور طوعاً و کرہاً اس سے اظہارِ خلوص یا برتری کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پہ سوچنے کا اہل ہے۔ اس اثناء میں ایک کتا سامنے سے گزرا اور ہم نے بیٹھے ہی بیٹھے ایسی ڈانٹ بتائی اور آمادۂ نقضِ امن ہوئے گویا اردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نے ہم کو کتوں کے استیصال کے لیے تھانہ دار بنا دیا تھا۔ اتنے میں ایک بہشتی گزرا اور ہم نے انتہائی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا۔ کیوں اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو طے مسافت میں بڑی آسانی ہو گئی ہو گی۔ اس نے نہایت انکسار اور متشکرانہ انداز میں ہامی بھری۔ ابھی یہ رسمی تکلّفات ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا سامنے آ گیا، بولا۔ میاں اس دروازے کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے۔ دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہو گیا۔ (خوانچہ کے اندر جو ابھی سر ہی پر رکھا ہوا تھا کچھ ٹٹولتے ہوئے) خدا آپ کو سلامت رکھے۔ یہ لیجیے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حکامِ یونیورسٹی نے معلمین کے لیے کس مصلحت کی بناء پہ گاؤن پہننا لازمی کر دیا ہے۔ لیکن ابھی ہمارا غصّہ اور سکوت، خوانچہ والے اور "بریلی کے تحفہ امرود" کے درمیان پورے طور پہ متوازن نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک طرف سے "حاجی بلغ العلیٰ" کچھ گنگناتے ہوئے اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا کملی اور داڑھی کے علاوہ ع عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلیٰ" اور فارسی "جریب زیتونی" ہے کچھ لوگ "سابق دیوانہ ہمدرد" اور حال "ابوالمجنون" کہتے ہیں۔ کچھ دنوں "خنثت الپنزایہ" پہ زور لگاتے رہے۔ ان دنوں "قانونِ مسعودی" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں کہ اب جنون کی کیا حالت ہے۔

ملتے ہی فرمانے لگے۔ جلدی سناؤ جلدی۔ میں نے کہا کیا۔ فرمایا کوئی اچھا سا شعر۔ میں نے کہا سنیئے ؎

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے　　یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

گردن ہلا کر "بجلوہ ریزی" کمل "و بہ پر فشانی" ریشیں اپنے سکوت کا ثبوت دیا۔ میں نے کہا کوئی موضوع بتائیے تو مضمون لکھوں، فرمایا "ارہر کا کھیت"۔

میں نے دریافت کیا کیوں جناب اس شعر کا یہ معاوضہ سخن فہمی کی داد دوں؟ کمل کو حاجی صاحب نے جناب "کراماً" کے سر سے اٹھا کر مولانا "کاتبین" پر ڈال دیا (میں نے سہولت کی خاطر ان "تسمہ پا" بزرگوں کے نام علیٰحدہ کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان کے نام و نشان، حسب نسب، وطن اور مشاغل کی بابت اپنا ذخیرۂ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں مجھے امید ہے نیاز صاحب باب الاستفسار کے جن نمبر میں اس پر اظہار خیال فرمائیں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ باب الاستفسار اور جن نمبر میں بھی کراماً کاتبین کے مانند مجھ سے کچھ خلطِ مبحث سرزد ہو رہا ہے) فرمایا نواب صاحب کہاں ملیں گے۔ میں نے کہا کون نواب مزمل اللہ خاں صاحب، کیا یہ شعر سنائیے گا؟ کہنے لگے جی نہیں وائس چانسلر صاحب نواب مسعود یار جنگ بہادر، میں نے کہا ان کو سنانا ہے تو پھر یہ سنائیے گا ؎

ترا کہ زور بیازوے تیغ زن باقیست　　　بگیر تیغ کہ آں حسرتِ کہن باقیست

فرمایا یہ کیا، میں نے کہا یہ یہ ہے ؎

من آں علم و ہنر را بپرِ کاہے نمی گیرم　　　کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ گھبرا کر کچھ بے اختیار ہو کر فرمایا۔ ارے میاں یہ سب تو ہوا، اب کیا ہو۔ اچھا تمھارے کلاس میں بیٹھ جاؤں، ذرا تمھارا لکچر سنوں گا۔ میں نے کہا، اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہوگا۔ فرمایا، "السلام علیکم !

"اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا"

(۱)　اگر مضمون اچھا ہے تو میں ذمہ دار۔
(۲)　اگر عنوان بُرا ہے تو حاجی صاحب ذمہ دار۔
(۳)　اگر کتابت وغیرہ کی غلطی ہے تو نیاز صاحب ذمہ دار۔
(۴)　اگر کل بُرا ہے تو ناظرین ذمہ دار۔

خط و کتابت و ترسیلِ زر میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔

الشذری

مرزا عظیم بیگ چغتائی

اگر ہمارے منہ سے نکل گیا کہ بھئی برار کے معاملہ میں انگریزوں نے حق و انصاف کے گلے پر چھری پھیر دی تو حضرت اس کے یہ معنی کدھر سے ہو گئے کہ ہر وقت برار کے پتھروں سے ہمارا سر پھوڑا جائے۔

(۱)

"یار یہ برار کیسے واپس ملے گا؟" یہ ایک سوال تھا جو بھائی شذری نے شاید صبح ناشتہ سے پہلے پہلے سترہ مرتبہ مجھ سے کیا۔ "دیکھو جی!" میں نے تنگ آ کر کہا۔ "تم نے جو ہماری جان زیادہ کھائی اور یہ برار کا بسا پھر ہمارے کانوں میں چلایا تو یاد رکھو مجھ سے کوئی برا نہ ہوگا۔" "آپ خود خیال کیجیے کہ برار کے جھگڑوں کو نہ تو ہم سمجھیں نہ بوجھیں۔ رہ گیا انگریزوں پر غم و غصہ کا اظہار کرنا سو وہ کر چکے اور پھر بارہا کر چکے۔ بخدا اب کان ہیں کہ کھائے جا رہے ہیں۔ کہو ہم اور ہمارے آبا و اجداد کیا اگر حضرت عیسیٰؑ بھی آ جائیں تو قوم انگریز تو ماننے سے رہی۔ اجی گرجے بند کر دے اور برار نہ دے۔ مگر مصیبت دراصل اور تھی۔ وہ یہ کہ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ اگر دنیا میں برار کی واپسی کی فکر کسی کو ہوگی تو بس دو کو۔ ایک تو خود حضرت اقدس و اعلیٰ یعنی برار کے مالک کو اور دوسرے بھائی شذری کو۔ میری دانست میں اگر کہیں بھائی شذری برار کے رہنے والے ہوتے یا نہ سہی یا کم از کم انھوں نے برار کو دیکھا ہی ہوتا تو نہ معلوم یہ کیا غضب کرتے۔ کہتے تھے نہ ہوا میں (یعنی برار کا مالک) کچھ روز تک تو نقشے بنتے رہے اور یہاں دیکھنا پڑا اور بار بار دیکھنا پڑا کہ برار کا صوبہ مل کر سلطنت آصفیہ کتنی ہو جائے گی۔ یہاں تک غنیمت تھا مگر صورت حال اب یہ پہنچی کہ علی گڑھ کے ایک بورڈنگ کے کمرہ میں بیٹھ کر برار کی واپسی کی کوشش ہونے لگی۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے صوبہ کی اتنے سے کمرہ میں بیٹھ کر جو واپسی کی کوشش کی جائے تو کون سی چیز ہے ایسی کمرے کی از قسم جمادات و حیوانات وغیرہ جو سلامت رہ جائے۔ کسے باشد! اگر اس نے بھائی شذری کے خیال کے مطابق ذرا بھی ان کی رائے سے اختلاف کیا اور یہ ظاہر کیا کہ برار واپس نہیں ملے گا یا جلد نہیں مل جائے گا تو بھائی شذری نے اس سے یہ سوچ کر جھگڑنا شروع کر دیا کہ یہ اول درجہ کا بدمعاش ہے اور ہو نہ ہو برار اسی کی جیب میں ہے اور ابھی ابھی یہیں کا یہیں اس سے دھروا لو۔ مشتے نمونہ...... ایک روز کا ذکر ہے کہ پھر برار کا قصہ درپیش تھا۔ چائے پی جا رہی تھی۔ ایک اور صاحب بھی شریک تھے اور انھوں نے نہایت ہی متانت سے چائے کی پیالی میں شکر ڈالتے ہوئے کہا: "مشکل ہے برار کا واپس ہونا۔"

تو "وہ کیسے"۔ بھائی شنذری نے کچھ بدک کر کہا "وہ کیسے۔ ذرا مجھے بھی تو بتائیے کہ آخر کیسے انگریز ہمارا (حضور نظام کا نہیں) صوبہ کا صوبہ ہضم کر لیں گے" "وہ کیسے"؟ انھوں نے کہا "ہو نہ ہو یہ قوم انگریز ہے۔ اس کے ہاضمہ کا یہ حال ہے کہ مصر اور قبرص ہضم نہیں کر گئے بلکہ پی گئے اور یہ برار کون چیز ہے"۔ تن بدن میں بھائی شنذری کے آگ ہی تو لگ گئی۔ دانت پیس کر اور منہ ٹیڑھا کر کے بولے "نہیں دیں گے، نہیں دیں گے؟ اجی ان کے تو دیں گے باپ —— آپ لیں گے آپ لیں گے؟" انھوں نے مسکرا کر کہا "جی آپ روک لیجیے گا نا...... آپ کا بس چلے تو روک ہی لیجیے گا۔"

"مذاق نہ شد حضرت! یہ مصر کا حلوا نہیں ہے یہ برار ہے۔ برار حلق میں سے نکال لیا جائے گا حلق میں سے"۔ (بھائی شنذری نے ہاتھ سے نکالنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا)

"اخاہ ——" وہ بولے" یہ کہیے یوں کہیے اب معلوم ہوا کہ حضور بھی کچھ ٹکے حیدرآباد سے معلوم ہوتا ہے پا گئے اور لگے بین پر جھومنے۔"

ان کا یہ کہنا تھا کہ بس شنذری آگ بگولہ ہو گئے۔ اول تو انھوں نے ان تمام لوگوں کو ملاحیاں سنائیں جو حیدرآباد کے وظیفہ خوار ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ حق بجانب اور مستحق ہیں، اور پھر اس کے بعد انھوں نے وہی کہا یعنی یہ کہ برار ان کی جیب میں ہے لے لو فوراً۔ نتیجہ اس کا سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ بات بڑھی اور چینی کے برتنوں کے لیے میز چھوٹی ثابت ہوئی۔ ہیں ہیں کر کے بیچ بچاؤ کیا۔

آپ کہیں گے کہ تعلیم کے علمبردار، تہذیب یافتہ کالج کے طالب علم اور یہ —— ! تو حضرت یہ زر زمین کے جھگڑے دراصل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کے چوتھے روز کا لطیفہ سُنیے۔

(۲)

چودھری صاحب کہنے لگے "یار مرزا دیکھو یہ حیدرآبادی کس قدر ملک کے غدار اور دشمن ہیں"۔ یہ کہہ کر دو تین حیدرآبادیوں کے رقعے دکھائے۔ بات دراصل یہ تھی کہ بھائی شنذری خفیہ طور پر اس کی تحریک کر رہے تھے کہ تمام کالج کے لڑکے گروہ اور انبوہ کی صورت میں واپسی برار کے معاملہ میں کالج کی تحریک کو جامہ پہنائیں، اور سخت قسم کی ایجی ٹیشن پیدا کر کے ایک چٹپٹا سا جلسہ کر کے دھر لیں۔ تمام وائسرائے وغیرہ کو تار پہ تار، تار پہ تار۔ اس تحریک سے حیدرآبادیوں نے اور دراصل ہر اس نے جس کے سر میں سر تھا دلچسپی لینے سے انکار کر دیا۔ اوروں کو تو ڈالا بھائی شنذری نے جہنم میں مگر حیدرآبادیوں سے الجھ پڑے۔

دیر تک بڑبڑاتے رہے اور تجویز یہ تھی کہ ایک ورکنگ کمیٹی بنے اور لوگ جمع ہو کر تدبیریں کریں اور دستور ہے کہ ویسے کوئی جمع نہیں ہوتا یعنی چائے، کیک بغیر۔ چنانچہ شام کے لیے بھائی شنذری اس کا انتظام کر رہے تھے اور جناب اسی وجہ سے میں بھی مجبوراً برار کی واپسی کا خوش آئند اور خوش کن تذکرہ کم از کم آج کے لیے سننے کو تیار تھا۔

حیدرآبادیوں کے خلاف جب بخار نکال چکے تو میری طرح سے مٹھائیوں اور پھلوں وغیرہ کی فہرست بنی کہ کتنی کون چیز آئے ظاہر ہے کہ برار کی واپسی کے سلسلہ میں جب یہ تیاریاں ہوں تو سچے دل سے کیوں نہ دو ایک پڑوسی بھی اس قومی خدمت میں حصہ لیں۔

غرض دو تین حضرات کے مشورہ سے کھانے پینے کی چیزیں تیار ہوئیں۔ بیرے کو بلا کر دو نوٹ دس دس روپیہ کے دئیے گئے کہ بازار سے سب چیزیں لا کر رکھ لینا جب ہم کالج سے واپس آئیں تو سب موجود ہو۔

"کوئی چیز رہ تو نہیں گئی؟" ایک آخری نظر فہرست پر ڈالتے ہوئے پرچہ بھائی شنذری نے بیرے کی طرف بڑھا دیا۔

"اصل چیز تو رہ ہی گئی" ایک صاحب نے پرچہ دیکھ کر کہا "واہ"! اور یہ کہہ کر قلم لے کر اس فہرست میں اضافہ کر دیا۔

بہار یعنی پانچ روپیہ کا برار بھی آئے گا۔

بھائی شنذری نے دیکھا اور اس مذاق پر خندہ فرمایا۔ قلم کی طرف بھائی شنذری نے ہاتھ بڑھایا اور جب انھوں نے نہ دیا تو مسکرا کر ہاتھ جھٹک کر بولے۔

"لاؤ جی قلم ادھر کاٹ دیں۔"

دوسرے صاحب بولے "واللہ کاٹ دو، کاٹ دو، ورنہ عجب نہیں یہ لے آئے۔"

اس پر اور تفریح رہی اور مذاق ہی مذاق میں پرچہ اسی طرح بیرے کو دے دیا گیا۔

"کیا فائدہ۔" بھائی شنذری نے ہنستے ہوئے کہا "ویسے ہی اول نمبر کا گدھا ہے چکرا تا پھرے گا بیرا خواہ مخواہ۔"

مگر بیرا چلا گیا۔ مذاق تو مذاق ہی ہے انیس روپے سے اوپر کا سودا تو ویسے تھا۔ یہ پانچ روپیہ کا برار موقع اور مناسبت کے لحاظ سے منگایا جا رہا تھا۔ (سچ مچ نہیں)

(۳)

"برار آ جائے قبضہ میں ....ن ...... ن ـ ن ـ ن ..... وہاں بھی می می می ہو تیری شاہی" یہ مصرعہ اللہ کے فضل سے اکثر ہمارے کمرے سے گونجتا رہتا تھا، رات کو، دوپہر کو، صبح و شام غرض وقت بے وقت یہ مصرعہ الاپا جاتا تھا۔ پھر نہانے میں تو اس کا الاپنا اس قدر لازمی تھا کہ بیان سے باہر، بدن پر تیزی سے صابن کیا بلکہ یہ کہیے کہ بھائی شنذری یہی مصرعہ مل مل کے نہایا کرتے تھے۔ اس مصرعہ نے کیا کیا نہ سر پھٹول کی تھی۔ ایک روز بھائی شنذری نے جماہی لیتے میں اس مصرعہ کو بھی شروع کر دیا۔ اول تو جماہی میں منہ پھٹا ہوا (مشکل سے کوئی جماہی اس مصرعہ کے بغیر لی جاتی تھی) پھر اس پر انگڑائی بھائی شنذری کی شیریں نہیں بلکہ نمکین آواز کا رعد آفریں ترنم، نتیجہ یہ کہ "برار آ جائے، تو صاف سنائی دیا اور اس کے بعد کا بقیہ حصہ جماہی کے تیز و تند طوفان اور حلقوم کے غوغائے بے ہنگام میں انگڑائی کی کھینچا تانی میں قلابازیاں کھاتا کچھ اس طرح ادا ہوا کہ واقعی معلوم ہو کہ کوئی کتا نہایت ہی کامیابی کے ساتھ خود تان سین سے درس لے رہا ہے۔ آپ جانیے کہ اچھے گانے والوں کے پڑوسی عموماً دشمن ہوتے ہیں۔ لہٰذا برابر والے کمرہ سے ایک پنجاب کی طرف کا موذی جس کے شاید معدہ کے بجائے بھی پھیپھڑا تھا اس زور سے گرج کر بولا:

"کتے .. ..ے ..... ہا"

کوئی اور بڑے زور سے برآمدے سے پکارا "باندھو" جماہی کے سلسلہ میں بھائی شنذری نے ایک انگڑائی بھی لی تھی۔ وہیں کے وہیں ہاتھ چھوڑ دئیے اور ایک "ہڑپ" کے ساتھ منہ بند کر کے بولے "یہ کون ــــ؟"..... مگر سناٹا ــــ تیزی سے

باہر گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بحث و مباحثہ، قہقہوں کا شور برابر والے کمرے سے کچھ اس طرح بلند ہوا کہ جیسے معلوم ہو کہ وعظ اور لڑائی اور ہنسی مذاق سب کچھ معہ چپقلش کے بیک وقت ایک ہی جگہ ہو رہا ہے۔

میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ طرفہ بحث بھائی شذری نے چھیڑ رکھی ہے۔ وہ یہ کہ تاجدارِ دکن کی سخت توہین کی گئی۔ محض اس وجہ سے کہ مصرعہ خود حضرتِ اقدس و اعلیٰ کی زورِ طبع کا نتیجہ ہے۔ ادھر سے یہ عذر تھا کہ یہ حضرتِ دکن کا کلام ہے اگر آپ خود اللہ میاں کا کلام اس طرح سے ”رُوئیں گے“ تو ہم آپ کو بغیر بندھوائے نہیں مانیں گے کیوں؟ مبادا کہ آپ کاٹ کھائیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی بحث کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ صرف ایک اور وہ یہ کہ مخالفین بضد ہو جائیں۔ اس بات پہ کہ کسی طرح بھی بھائی شذری برار واپس نہ لے سکیں گے۔ مگر کسی نے کہا اور خوب کہا کہ ؏

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

وہاں اکیلے دوکیلے پیمبری حضرت موسیٰ کو مل گئی تو کیا ہوا یہاں بھی تو اس سے کم واقعہ نہیں پیش آیا۔ یعنی یہ کہ بیرا بازار سے برار لے آیا اور وہ بھی قرض !

(۴)

میرے سپرد بھائی شذری نے ایک اور کام کیا تھا۔ وہ یہ کہ چند بااثر دوستوں کو علاوہ تحریری دعوت ناموں کے زبانی بھی دعوت دے آؤں۔ چنانچہ آخری گھنٹہ جو کالج کا ختم ہوا تو بھائی شذری تو چلے کمرے کی طرف اور میں چلا اپنے کام پر۔ وہاں سے پھرتا ہوا واپس لوٹا۔ پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں شدہ ہے اور میرا کمرہ شاید میرٹھ۔ لڑکے کالج کے بجائے اپنے کمروں پر واپس جانے کے میرے کمرے کی طرف دوڑ رہے تھے، میں بھی دوڑا۔ ایک شور و غل ہنسی مذاق میں معلوم ہوا کہ بازار سے بیرا برار لے آیا ہے۔ کمرہ کے دروازے پر پہنچا ہوں۔ بھیڑ کو چیر کر تو تصدیق ہو گئی۔ ایک پورا صوبہ کا صوبہ اور وہ بھی ایک کمرے میں آجائے تو کیا ہو !

میں کمرہ میں گھسا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کونہ میں ایک بڑے بھاری بورے میں برار رکھا ہے اور بیرے کو بھائی شذری ہاکی اسٹک سے بجا رہے ہیں۔ جوں توں کر کے بیرے کو چھڑایا۔ وہ بھاگا غریب کمرے سے نکل کر۔

مگر انصاف سے دیکھیے اس غریب کی کیا خطا۔ ایک دفعہ نہیں کوئی دس مرتبہ پٹ چکا تھا۔ اس بنا پر کہ جو چیزیں منگائی گئی تھیں ان میں سے کوئی چیز دام نہ ہونے کی وجہ سے نہ لا سکا۔ حکم تھا کہ لاؤ کہیں سے، بازار گیا ایک سے نہیں بلکہ کئی آدمیوں سے پرچہ پڑھوایا اور سب نے کہا کہ ہاں ٹھیک تو ہے پانچ روپیہ کا برادہ منگوایا ہے۔ کیونکہ آپ یقین کریں کہ پرچہ پر خط شکستہ میں لفظ برار اس طرح لکھا تھا ”برادہ“ یعنی برار کے آخری حرف ”ر“ پہ دال کا دھوکہ ہوتا تھا اور آخری ڈیش ہ یعنی ”ـــ“ پہ حرف ”ہ“ کا۔ چنانچہ جس طرح بھی اور جہاں سے بھی غریب سے بن پڑا پوسے پونے تین روپیہ کا برادہ لیتا آیا۔ اس سے زائد کہیں مل ہی نہ سکا۔ ورنہ مار بڑی بلا ہے۔ وہ پورے پانچ روپیہ کا لاتا۔

اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ کالج کے لڑکے ہی جانتے ہیں۔ جلسہ کا رنگ کیسا رہا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو اس معاملہ پر ہنسنا منع ہے اور دوسری طرف سب کا یہ حال کہ لفظ برار کے ذہن میں آتے ہی بجائے صوبہ برار کے بُرادے کا زبردست بورا نظروں کے سامنے پھر جاتا۔ نہایت ہی ناکامیاب میٹنگ رہی۔ خیال یہ تھا کہ ورکنگ کمیٹی مرتب ہو گی مگر نالائقوں نے پیٹ بھر کر عمدہ چیزیں کھانے کے بجائے یہ زیادہ پسند کیا کہ باہر جا کر پیٹ بھر کر ہنسیں، کچھ نے یہ کوشش کی کہ ہنسی سے سیر ہو کر چہرہ کو سنجیدہ بنا کر کمرے میں واپس آئے۔ مگر قدم رکھتے ہی پھر ہنسی نے غلبہ کیا اور پھر واپس، قصہ مختصر نہ تو ورکنگ کمیٹی بنی اور نہ کچھ کام ہو سکا۔ ہاں دو چار سنجیدہ اصحاب سے اور بھائی شنذری کی ٹھن گئی مگر کہیں ان حادثات سے بھائی شنذری کے ارادہ میں کمی ہونے والی تھی، ہرگز نہیں بلکہ ع

سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا

نتیجہ یہ کہ بھائی شنذری کامیابی سے نزدیک تر آ گئے۔ . . . .

سودیشی ریل

شوکت تھانوی

دن بھر کے تھکے ماندے بھی تھے اور رات کو سفر بھی در پیش تھا۔ مگر "بندے ماترم" کے نعروں پہ کان کھڑے کر لینا ہماری ہمیشہ کی عادت ہے اور ان نعروں کو بھی ضد ہے کہ ہمارا چاہے جو حال بھی ہو بیمار ہوں، کسی ضروری کام کے لیے باہر جا رہے ہوں یا اور کوئی مجبوری ہو مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے، اور اپنی طرف ہم کو کشاں کشاں کھینچ کر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ حقہ کا نیچا اور صراحیاں ایک دکان پر یہ کہہ کر رکھ دیں کہ "بھائی ابھی آتے ہیں" اور سیدھے پنڈال میں گھس گئے۔ جہاں ایک صاحب جو صورت سے لیڈر معلوم ہوتے تھے یعنی سر پہ گاڑھے کی گاندھی کیپ، داڑھی مونچھ سے فارغ البال، ایک لمبا سا کھدر کا کرتہ، ٹانگوں میں وہی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ کو اپنی پشت پہ رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بید کو حرکت دیتا ہے۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا، اس لیے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے کبھی مغرب کی طرف اور کبھی کبھی ایک دم سے پیچھے بھی مڑ جاتے تھے۔ بہرحال یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف ہیں یا سامنے، اس لیے مشکل تھا کہ ان کو خود قرار نہیں تھا۔ وہ تخت جس پر کھڑے ہوئے وہ گھوم رہے تھے مجمع کے وسط میں تھا اور تمام مجمع کا رخ تخت کی طرف۔ کبھی کسی کی طرف منہ کبھی کسی کی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا اور اسی طرح ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف کبھی دور کی آواز کی طرح اور کبھی بالکل نہیں، ہمارے کانوں میں پہنچ رہے تھے، ہاں ایک بات یہ تھی کہ ہماری طرف کے لوگ غل مچانے میں اُتر، دکھن اور پچھم کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے ہم تقریر سننے کے معاملے میں ذرا گھاٹے میں تھے۔ پھر بھی جو کچھ سُنا وہ بہت کافی تھا۔ اس لیے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں، کبھی اردو میں، کبھی نثر میں، کبھی نظم میں، کبھی ہنس کر کبھی چیخ کر کبھی ادھر مڑ کر، کبھی ادھر گھوم کر وہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم نے سُن لیے تھے:

"بھائیو! اب وہ وقت نہیں ہے کہ ریزولیوشن پاس ہوں اور رہ جائیں —— تجاویز منظور ہوں اور
شرمندۂ عمل نہ بنیں —— سرگرمیاں —— اب تیار ہو جاؤ —— ہوشیار رہو —— کہ تم کو ——
۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے —— اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے ——
(وہ دوسری طرف گھوم گئے) خوابِ غفلت سے بیداری کا وقت —— یہ ہے —— اور وہاں تم ——
برٹش گورنمنٹ —— سوراج سودیشی —— چرخہ —— کھدر ——" (چیرز کے بعد تقریر ختم)

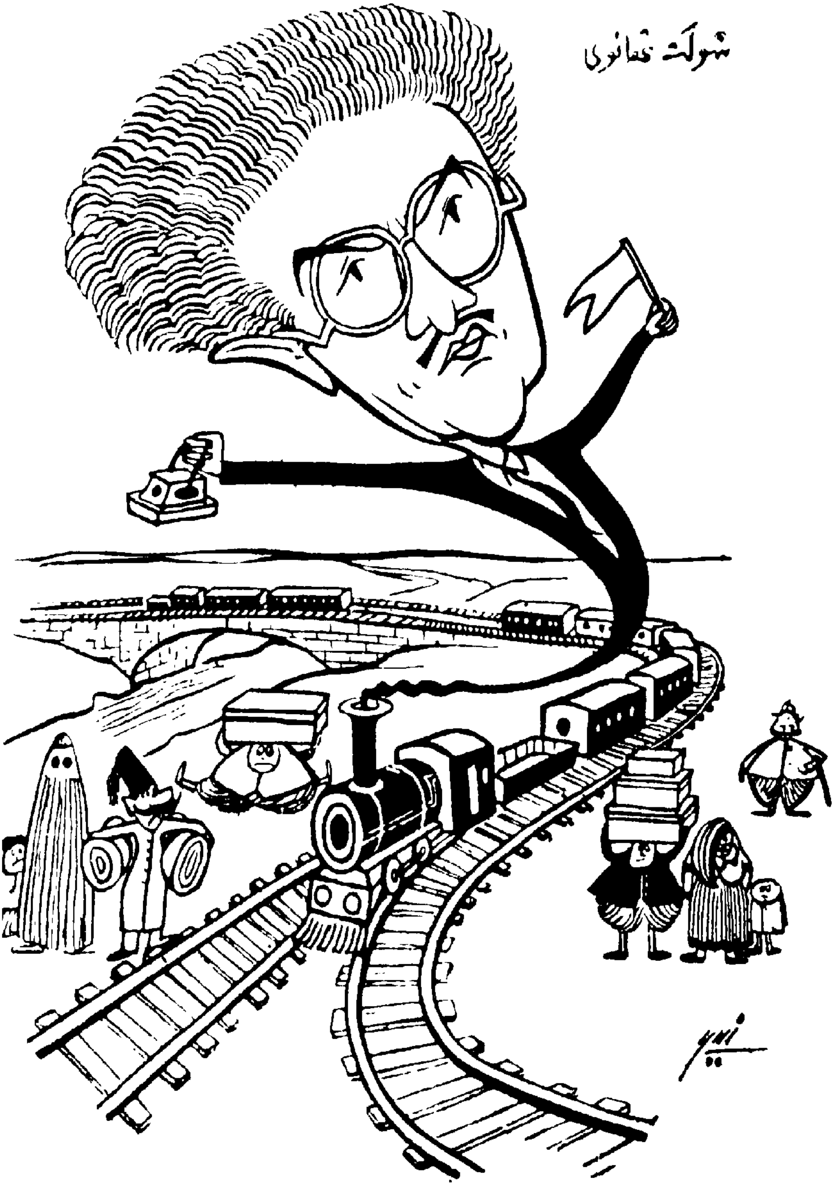

شوکت تھانوی

دو گھنٹے میں ہم نے صرف یہی سنا اور سمجھ لیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا۔ غالباً اس سے زیادہ انہوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی ہو تو ہم کیا کریں۔ ہمارے لیے یہی بہت تھا کہ ۳۱ دسمبر کو سوراج ملے گا۔ ہم اسی خیال میں غرق مجمع کو دھکیلتے خود دھکے کھاتے کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے۔ دکان پر سے حقے کا نیچا لیا۔ صراحیاں اکے پر لادیں اور گھر پہنچ گئے۔ اسباب باندھا، کھانا کھایا، حقہ بھرا، آرام کرسی پر لیٹ کر شوق فرمانے لگے۔ گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے اس لیے اطمینان بھی نصیب نہ تھا۔ مگر احتیاطاً شیروانی نہیں اتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے گا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

لیکچر کا خیال اور ۳۱ دسمبر کے بعد سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کے لیے ۳۱ دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے۔ اگر آج ۳۱ دسمبر ہوتی تو ہم اپنی ریل پر سفر کرتے۔ نہ بدیشی گارڈ ہوتا نہ فارن ڈرائیور نہ اینگلو انڈین کا علیحدہ درجہ ہوتا۔ ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے چاہے تھرڈ میں بیٹھتے چاہے فرسٹ میں، ہم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ ہم خود فرسٹ میں بیٹھتے اور انگریزوں کو تھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوئے سفر کرتے ——— ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ایکدم سے کان میں پھر وہی "بندے ماترم" کی آواز آئی اور ہم ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔ گھر سے باہر نکلے، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں، جھنڈیوں اور گیسوں سے سجا ہوا "بندے ماترم" کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ "بھائی یہ کیا ہے؟" جواب ملا کہ "کیا سو رہے تھے؟ خبر نہیں کہ سوراج مل گیا؟" ہم نے پھر بڑا سا منہ کھول کر کہا۔ "سوراج؟" جواب ملا "ہاں سوراج سوراج!" ہم نے اپنے دل میں کہا کہ "واہ بھئی وا دعا تو قبول ہوئی ہماری اور سوراج مل گیا ان لوگوں کو، ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی" پھر سوچا کہ ہم اور یہ لوگ کچھ غیر تھوڑی ہیں۔ ان کو ملا یا ہم کو ایک ہی بات ہے مگر واللہ کمال ہوا کہ سوراج مل گیا۔ دل کو کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سوراج مل گیا ہوگا۔ حالانکہ ابھی تک جلوس نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جب جلوس کی طرف نظریں جاتیں تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا۔ اور جب سوراج ملنے پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج ملنے کی خوشخبری سنائی تو شک دور ہوا اور ایک آزادانہ و خود مختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا۔ ابھی ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹہ نے ٹن ٹن کر کے دس بجا دیئے۔ یعنی ہم کو خود اسٹیشن چلے جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لیے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں اور ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہنچ کر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرتا ہے۔ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا:

"بابو جی! کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجیے۔"

بابو جی نے بجائے اس کے کہ ٹکٹ دے دیتے پہلے تو ہم کو گھورا پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے "ایک بات کہہ دیں یا مول تول ہو؟"

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پہ بابو جی نے پھر کہا۔ ” جناب سنئے تین روپے ہوئے لائیے روپے اور ٹکٹ لے لیجیے۔“

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا :

” جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنے تو کرایہ ہے۔ آپ کہتے ہیں تین روپے۔ مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہیے ہے، کانپور کا سیکنڈ کلاس۔“

بابو جی نے ذرا ترش رو ہو کر جواب دیا:

” جناب والا ! میں بہرہ نہیں ہوں۔ سُن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیئے مگر اسی کے تین روپے ہوئے کوڑی کم نہ لوں گا۔ جی چاہے لیجیے ورنہ جانے دیجیے۔“

میں :۔ ” مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنہ کرایہ تھا آج کیا ہو گیا کہ ایک دم بڑھ گیا ؟“

بابو :۔ ” کل کی بات کل کے ساتھ، آج دلیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ہے۔“

میں :۔ ” یہ کیسے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجیے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔“

بابو :۔ ” لائیے روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دے دیجیے اور ٹکٹ لے لیجیے۔“

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آ رہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا اور یہ سوچ کر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی :۔

” سنیے تو جناب، ٹھہرئیے تو جناب، دیکھیے تو جناب ' اچھا دو روپے دے دیجیے، آئیے وہی ایک روپیہ تیرہ آنے دیجئے ـــ اب وہ بھی نہ دیجیے گا ؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے، لائیے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کر سکتے، ہمارا نقصان ہو رہا ہے۔“

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا گردن ترچھی کر کے وہیں سے کہہ دیا ” ایک روپیہ دیں گے، ایک روپیہ کو دینا ہو تو دے دو۔“

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے مگر واللہ کمال کیا انہوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے ” لائیے صاحب لائیے، بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے۔“

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا لیکن وہ ٹکٹ ریل کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس پر تاریخ پڑی ہوئی تھی اور نہ اس پر کچھ چھپا ہوا تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر ”درجہ دوم کانپور“ لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی جو غالباً ان کے دستخط تھے۔ ہم نے ٹکٹ کو ادھر سے دیکھا اُدھر سے دیکھا اور دو تین مرتبہ غور سے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ بابو صاحب بھی ذرا قیافہ شناس تھے۔ ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسم ہو کر کہنے لگے :۔

” جناب والا رات کو سوراجیہ ملی ہے ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں۔ وہ دو تین دن میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ

سے کیا مطلب، آپ تو سفر کیجیے۔ اب آپ سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

بابو صاحب نے تسلی تو دے دی مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ ہے نہ کرایہ نہ فاصلہ اور فاصلہ ہوتا تو کہاں سے انہوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ سمجھ کر کہ یا تو یہ روپیہ گیا یا ہم تیرہ آنہ کے نفع میں رہے۔ اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے یا الٹا باندھ کر ٹانک دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی وہی گھڑیال۔ مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے۔ حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ اسباب کے ٹھیلے پہ پان والا اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا۔ قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچائیں۔ بمشکل تمام ایک قلی ملا۔ لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اٹھانے کو کہا اس نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا:

"اندھے ہو گئے ہو دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر؟"

ہم "معاف کیجیے گا غلطی ہو گئی" کہہ کر پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ "یا اللہ یہ کیا انقلاب ہے، پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو قلی کس صورت کا ہو گا؟ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اٹھایا اور دو مرتبہ کر کے سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ اسباب قرینہ سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہئیے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور؟ سب سے پہلے تو ہم نے انہی حضرت سے پوچھا جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے۔ لیکن انہوں نے صرف یہ جواب دیا کہ "بابو بھیا ہمکا ناہیں مالوم" یہ خالص سودیشی ریل کے سیکنڈ کلاس کے معزز پسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہو گی وہاں چلی جائے گی۔ اسی لیے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف۔" ہم نے گھبرا کر پوچھا:-

"لیکن یہ فیصلہ کب ہو گا؟" جواب ملا کہ جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے۔

ہم نے پھر پوچھا۔ "لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا۔"

جواب ملا کہ ہو جایا کرے جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟

اب ہم بالکل راضی بہ رضا ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس انتظام کو برا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دعا تھی، اچھا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا جس کی اب کوئی امید بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ غرضیکہ کبھی اپنے ڈبہ میں بیٹھ کر کبھی لوٹے میں پانی لا کر، کبھی انجن کو مشرق اور مغرب کی سمت حدِ نظر تک ڈھونڈ کر، کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹنے لگے۔ گیارہ سے بارہ، بارہ سے ایک، ایک سے دو بجے مگر نہ گھڑی کی سوئی ہٹی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی۔ صرف ہم ٹہلتے

ار ہے۔ خدا خدا کر کے ایک آدمی نے بہ آواز بلند چیخنا شروع کیا۔ "بیٹھنے والے مسافر بیٹھو گاڑی چھوٹتی ہے۔"

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈھا پھر مغرب کی طرف مگر دونوں طرف انجن غائب تھا اور ہماری بالکل سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے۔ اور ان الفاظ پر شک کرنا اس لیے کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی غیر ذمہ دار شخص نہ تھا۔ بلکہ وہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب تھے جن کو ہم قلی سمجھتے تھے۔ بہر حال بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی دو تین درجن لٹھ بند گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے۔ ان سے ہم نے لاکھ کہا "ارے سیکنڈ کلاس ہے، اماں سیکنڈ کلاس ہے۔ بھائی سیکنڈ کلاس ہے۔" مگر انھوں نے ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے "ہم ہو جانت ہے ڈیوڑھا ہے۔ ہم ٹکس لیا ہے۔" خیر صاحب ہم چپ ہو رہے اور پلیٹ فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہہ دیں مگر گارڈ وارڈ نظر نہ آیا مجبوراً انہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر سے عرض کر دیا جس کا جواب انھوں نے اپنی سودیشی شان سے صرف یہ دیا "بیٹھیے جناب سب ہندوستانی برابر ہیں، سب بھائی ہیں، سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں۔ کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔ اب سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے فرق کو بھول جائیے۔ سب کو برابر کا سمجھیے۔ جائیے تشریف رکھیے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی۔" ہم یہ کھرا جواب سن کر منہ لٹکائے ہوئے اپنے درجہ میں آ گئے، جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ کھڑے کھڑے سفر ہوگا یا غسل خانہ میں جگہ ملے گی۔ مجبوراً اپنا ٹرنک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا۔ گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن گاڑی میں لگایا جا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کانپور ہی کی طرف لگایا جا رہا ہے۔ لیکن انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے۔ وہ کانپور جائیں گے۔ انھوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آ جائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی لانے کے لیے گیا ہوا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا ایک روپیہ سے صبر کر کے ارادہ ملتوی کر دیں۔ کام اشد ضروری تھا اس لیے جانا ضروری تھا، گاڑی چھوٹتی نہ تھی۔ اس لیے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کش مکش میں جان تھی معلوم نہیں وہ کون سا وقت تھا جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی۔ اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا اس لیے کہ کفرانِ نعمت کا الزام بھی تو ہم پر لگا دیا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے "بندے ماترم" کے فلک شگاف نعروں سے اچھل پڑے۔ معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے۔ ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع میں وہ لیڈر صاحب دکھائی دیئے جنھوں نے رات کو تقریر کر کے سوراج دلوایا تھا اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سیکرٹری ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرض ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی سُن سُن کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش زیبِ پا بزرگوار لال اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لیے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب نے کُرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی۔ اور پہلے سرخ اور پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے غلطی سے سرخ جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا

گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں۔ مگر تمھارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔

ڈرائیور نے بھی ان کے بے جا غصہ کا جواب کڑک کر دیا "جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں۔ میرا کیا قصور ہے۔ دو گھنٹہ سے للو فائرمین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آ۔ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ پتہ بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا۔ دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتائیے میرا کیا قصور ہے۔"

گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چپ ہو گئے اور کوئلہ کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن میں یہ بڑی بُری بات ہے کہ وہ بغیر کوئلہ کے چل ہی نہیں سکتا۔ جس طرح گھوڑے کے لیے دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو تھوڑی دیر بھوکا بھی چل سکتا ہے۔ مگر یہ اتنا بھی کام نہیں دے سکتا۔ اب بتائیے کہ ریل بھی تھی، انجن بھی، مسافر بھی تھے، گاڑی بھی، سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی آ گئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا۔ مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹہ بعد للو فائرمین کوئلہ کی گٹھڑی لیے یہ کہتا ہوا آ پہنچا۔

"آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ نو آنہ میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔ راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔"

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا "روکو۔ روکو، گارڈ صاحب رہ گئے۔" گاڑی رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہو گی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلّا چلّا کر پوچھنا شروع کیا "ارے لائن کلیر بھی لے لیا تھا ——— لائن کلیر" ڈرائیور نے بھی چلّا کر جواب دیا "لے لیا تھا ——— لے لیا تھا ———" گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا "اچھا تو چھوڑو گاڑی میں سیٹی بجاتا ہوں" گاڑی پھر چلی۔ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس، اس لیے کہ اس سے زیادہ تیز شاید ہم خود چل لیتے۔ اور اگر ابھی شرط بدل کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک شریکِ سفر سے پوچھا "کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس" وہ پہلے ہی کچھ خفا بیٹھے تھے۔ غالباً گاڑی پر ہوں گے، غصہ ہم پر اتارا، اور جھڑک کر فرمانے لگے "میاں خدا کا شکر کرو کہ یہ گاڑی ہی ہے، تم میل ایکسپریس لیے پھر رہے ہو" ان کا جواب سن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی۔ مگر سیر سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے نئے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے جاتے تھے اور گاڑی چھک چھک چل رہی تھی۔ اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پر رکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ :۔

"جب تک میں نے سگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن میں گاڑی لانے کا حق کون سا تھا؟"

ڈرائیور : "جب آپ نے گاڑی آتے دیکھ لی تھی تو سگنل کیوں نہیں دیا؟"

اسٹیشن ماسٹر : "ایک تو گاڑی لے آیا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا۔ دوسرا ڈرائیور رکھ لوں گا جو مجھ سے گستاخی کی۔

اگر گاڑی لڑ جاتی تو تمہارا کیا جاتا، آئی گئی سب ہم پہ آتی۔"

ڈرائیور:۔" دیکھیے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی نے باتیں کیا کیجیے، نوکری کی ہے عزت نہیں بیچی ہے۔ بڑے آئے وہاں سے نکالنے والے، جیسے ہم ان ہی کے تو نوکر ہیں۔ اچھا کیا گاڑی لائے، خوب کیا گاڑی لائے۔ اب اس ضد پر تو ہزار مرتبہ لائیں گے، دیکھیں ہمارا کوئی کیا کرتا ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر:۔" دیکھیے گارڈ صاحب منع کر لیجیے اس کو، کیسی کمینہ پن کی باتیں کر رہا ہے۔ افسری ماتحتی کا کچھ خیال نہیں۔ چھاتی پہ چڑھ کر خون پی لیتا ہوں۔"

گارڈ:۔" جانے بھی دو، اماں جانے بھی دو۔ ہائیں ہائیں یہ کیا کرتے ہو، اماں تم ہی ہٹ جاؤ، بھائی تم ہی ہٹ جاؤ۔ ارے ارے چھوڑ دو بھی، ہٹو بھی، سنو تو سہی، ارے یار سنو تو۔"

اسٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو گھونسے، لاتیں، تھپڑ، جوتے رسید کرنا شروع کر دیے اور تمام مسافر یہ جھگڑا دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ بمشکل تمام گارڈ نے بیچ بچاؤ کیا اور سمجھا بجھا کر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ ابھی بے چارہ سمجھا ہی رہا تھا کہ کسی نے آ کر نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا:۔

"گارڈ صاحب، اے گارڈ صاحب! اجی وہ مال گاڑی سامنے سے آ رہی ہے اور اسی پٹڑی پہ آ رہی ہے۔ غضب ہو گیا"

گارڈ بھی یہ سنتے ہی بدحواس ہو گیا اور چیخنا شروع کر دیا:۔

" مسافرو جلدی اترو، جلدی اترو، گاڑی لڑتی ہے، گاڑی لڑتی ہے جلدی اترو۔"

سب مسافر ہڑبڑا کر اپنا اسباب کچھ لے کر کچھ چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس گاڑی سے اس بری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے منہ پہ آ پڑا۔ میں ایک دم سے چونک پڑا۔ حقہ کی نے میرے منہ پہ آ کر گری تھی۔ حقہ جل چکا تھا آرام کرسی بھی شبنم سے تر ہو گئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے کے قریب تھے۔ میں کرسی سے اٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس لیے کہ اب گاڑی تو سونے کی وجہ سے چھوٹ چکی تھی۔ اب ہو ہی کیا سکتا تھا سوائے آرام سے سونے کے۔

لندھن کا عنابی دربار

ملّا رموزی

اے میلاد کی غزلوں پہ رونے والو!

کیا نہ سنا تم نے کہ مبلغ ایک دربار بڑی شان والا منعقد ہوا۔ بیچ شہر لندھن کے خاص واسطے رسم تاج پوشی بادشاہ کے، مگر یہ کہ یہ ہے بے خبری تمھاری اے بے خبری حد سے گزری ہوئی بہ سبب اس کے کہ نہیں ہیں تعلیم پائے ہوئے بیچ ہندوستان کے مگر اوپر ایک سو کے چند۔

پس بیچ جس قوم کے ہوں لکھے پڑھے کم وہ یا بھرتی ہوں گے، بیچ فوج کے، یا ملازمت کریں گے وہ ایسے ٹھیکیداروں کی کہ بنائی ہوئی عمارتیں ان کی نہیں زندہ رہتی ہیں مگر مبلغ ایک سال، مگر یہ کہ اصل بے وقوف ہیں وہ جو بنواتے ہیں عمارتیں ایسے ٹھیکیداروں بے ہنر اور بے ایمان سے۔

پس جب سلسلہ کلام ہمارے کا پہنچا اوپر اس جگہ کے تو تشریف لائیں بیوی نمبر ۲ ہماری ساتھ مہربانی بہت کے اور فرمایا کہ اے شوہر میرے دراز کرے خدا عمر اور تندرستی آپ کی اور مسٹر لائڈ جارج شاگرد قدیم آپ کے کی، کیا ہو گیا ہے آپ کو کہ اوپر ٹھیکہ داروں اس زمانہ کے کے غصہ ہو رہے ہیں۔ آپ درآں حالیکہ جانتے ہیں آپ کہ بیچ اس زمانہ ہذا کے نہیں ہوتے۔ تعلیم یافتہ مکمل علم والے جبکہ بیچ زمانہ طالب علمی کے پڑھائے جاتے ہیں مضامین کثرت سے تا دماغ خراب ہو جائے طالب علم ہندوستانی کا، پس جو طلبہ کہ بیچ ایک وقت کے پڑھتے ہیں دس مضامین اور سولہ کتابیں تو کیا خاک باخبر اور صاحبِ کمال ہوں گے وہ بیچ ایک فن کے، پس جب یہ حال ہو نصابِ تعلیم کا تو کیونکر محنتی اور جفاکش ہوں نوجوان اس زمانہ ہذا کے، راستہ بتادے اللہ مسلمانوں کو اے راستہ اجمیر شریف کا اگر نہیں ہوتی دلچسپی ان کو معاملوں سیاسی سے اور ترک کرادے اللہ عادت حقہ نوشی کی مسلمانوں پنجاب کے سے اور محفوظ رکھے اللہ باشندوں جاپن اور ارکان جمعیۃ اقوام کو افیون اور گانجے سے تحقیق محال ہے یہ کہ پھر بادشاہوں ہیلا سلاسی حبشہ کے، کہ تحقیق ہے یہ مقولہ حکیموں ایران کے کا واسطے ایسوں کے کہ کہا ہے ع

"جو کہ شمشیر مارتا ہے سکہ ساتھ نام اس کے کے پڑھتے ہیں"

پس داد دیجیے ترجمہ اس مصرعہ کے کی مجھ کو اے شوہر میرے! پھر فرمایا کہ تحقیق جو جھگڑا کہ ساتھ شیعوں اور سُنیوں لکھنؤ شریف کے ہوا ہے غم کھائیے اوپر اس کے کہ تحقیق مسلمان رہ گئے ہیں اب بیچ دنیا کے خاص واسطے تباہی کے بہ سبب بجبری تعلیمات

مذہب اپنے کے، پس جس نے کہ دوری اختیار کی اصول مذہبی اپنے سے وہ راندا جائے گا اسے بھٹکے گا وہ بھی گمراہ ہوگا وہ طرف سے اچھی اور کامیاب زندگی کے مگر اسے عجب وہ گھڑی محبت کی بڑھانے والی کہ جب تشریف لائیں بیوی نمبر ۲ ہماری ساتھ محبت ایسی کے کہ نثار ہوں اس پر شہر کلکتہ اور دہلی، اور باتیں کیں انھوں نے اسے باتیں اوپر والی تو کہا ہم نے کہ اے بیوی نمبر ۲ ہماری تحقیق قربان ہوں اوپر وفاداری تیری کے چالیس غنانے اور قربان ہوں اوپر وفاداری ہماری کے چالیس اونٹ طرابلس کے مگر اسے عجیب وہ طرابلس کہ لڑتے تھے کبھی واسطے حفاظت اس کی کے حضرت شیخ سنوسی رحمت خدا کی اوپر ان کے مگر عجب کہ آج قابض ہے ملک اٹلی اوپر طرابلس کے بہ سبب حقہ نوشی اور باہمی عداوت مسلمانوں کی کے جو ہے بہ سبب جہالت کے، پس بیچ جس شہر کے ہوں مقدمہ باز زیادہ بھی ہوں، سڑکیں خراب اور گلیاں گندی جس شہر کی مان تو اور جان تو اے عزیزہ بیوی ہماری کہ نہیں منہ فراغت کا دیکھیں گے باشندے اس شہر کے، بھی جہاں طلاق لیتی ہوں عورتیں زیادہ طلاق دیتے ہوں مرد زیادہ اور شادیاں ہوتی ہوں بے مرضی معلوم کیے لڑکیوں کی، تو تحقیق آوارگی اور افلاس بڑھے گا بیچ ایسے شہروں کے، بھی باشندے جس ملک اور شہر کے بیٹھے رہتے ہوں اوپر دکانوں کے بیکار تو قسم ہے امرت دھارا اور سوڈا واٹر کی کہ نیلام ہوگا جلد وہ شہر بہ سبب آوارگی باشندوں اپنے کی کے، بھی اسی طرح جب بڑھ شوق لوگوں کا واسطے قوالی اور گانے کے، بھی بڑھ جائے شوق خریداری زیور کا بیچ عورتوں کے اور بوڑھے ہونے لگیں لوگ بیچ عمر ۴۰ سال کے تو مت گمان لے جا کہ راستہ کامیابی کے پائیں گے وہ کیونکہ البتہ تحقیق آیا ہے بیچ کتابوں بڑی کے یہ کہ باشندے جس ملک کے قناعت اختیار کرتے ہوں اوپر دال روٹی کے تحقیق ہیں وہ مارے ہوئے سستی اور جہالت کے، پس چاہیے راستہ بتانا ان کو طرف تعلیم کے مگر اسے عجب وہ لیڈر قوم کے کہ نہیں ہے لیاقت اندر ان کے لیڈری کی، مگر یہ گزر بسر کرتے ہیں وہ اوپر لیڈری کے، گویا کہے تو کہ ہیں وہ تاجر قوم کے اور مال تجارت ان کا ہے قوم بے وقوف۔

پس اما بعد، جب سلسلہ کلام کا اوپر اس جگہ کے پہنچا تو طبعی وطنز کیا ہم نے اوپر ان ایڈیٹروں اخباروں اردو کے، کہ جو پیشین گوئی کر رہے ہیں برسوں سے عالمگیر جنگ کی، خاص کی کئی جنگ ہسپانیہ کہ کہتے تھے وہ کہ تحقیق جنگ ہسپانیہ سے ہوگی شروع لڑائی بڑی مگر نہ ہوئی وہ موافق دلائل ہم ملا رموزی صاحب کے تو تحقیق منہ ان کا فق ہوگیا، پھر کہا ہم نے کہ دراز کرے اللہ بالوں سر تیرے کے کو اے بیوی نمبر ۲ ہماری اور توفیق زیادہ وفاداری سے دے تجھ کو واسطے ہمارے کہ تحقیق اوپر فقط وفاداری تیری کے ہو رہی ہے شاعری ہماری، اگرچہ بہت دن گزرے کہ نہ غزل کہی اوپر ہندوستان کے سر مائیکل او ڈوائر نے، بھی نہیں چھوٹتے پیچھا قادیانیوں کا مولانا ظفر علی خاں ہمیشہ ہو جیو اخبار" زمیندار" ان کا کہ تحقیق ذریعہ اس اخبار تذکرہ کیے گئے کے پہلا شوق سیاست کا بیچ مسلمانوں بے خبر کے، مرغ بازی سکھا دے اللہ مسولینی کو اور کبوتر بازی ہر ہٹلر کو بدلے شوق جنگی ان کے کے، بھی توفیق دے اللہ بجلی والوں کو تا مبلغ چار پنکھے بجلی کے دیں وہ واسطے دولت خانہ ہمارے کے بیچ اس زمانہ گرمی سخت کے، تا سکیں ہم لکھنا مضامین عمدہ کا موافق حق عمدگی ان کی کے، مگر بات کاٹی ہماری بیوی نمبر ایک ہماری نے اور کہا کہ اے شوہر میرے اور بیوی نمبر ۲ اپنی کے ہرگز گمان مت لے جاؤ اوپر مسلمانوں کے کہ قدر پہچانیں گے وہ آپ

کی اور دیں گے وہ پنکھا بجلی کا آپ کو مگر یہ کہ ساتھ قوت بازو اپنے کے لاؤ تم، تو آفریں بہت کہی ہم نے اوپر خودداری بیوی نمبر ایک اپنی کی کے اور کہا کہ تحقیق عورتیں جس گھرانے کی ہوں گی خوددار تو تحقیق محفوظ رکھے گا اللہ اس گھرانے کو فضولیوں مغربی تمدن کی سے مگر عجیب بلے وقوف وہ عورتیں کہ ہو کر کم آمدنی خرچ کرتی ہیں وہ زیادہ اوپر لباس قیمتی اپنے کے، بھی اوپر لباس قیمتی اولاد اپنی کے، بھی اوپر تفریح سینما کے، بھی اوپر کھانے لذیذ کے، بے خبر تنگدستی اور قرضداری سے، پس سُن تو کان دھر باتیں حکمت کی، اے عورت اگر ہے تو عقل کی رکھنے والی کہ جو قوم کہ جاہل رکھے گی وہ عورتوں اپنی کو اور آزادی دے گی وہ قبل تعلیم کے، اسے آزادی نامعقول، تو خانہ تلاشی لے گی ایسے گھرانوں کی پولیس بغیر وارنٹ کے، کیونکہ موافق قوم حکیم بزرجمہر کے رواج دنیا شادی مرضی طرفین کے مفید ہے اور دیسی لباس مفید ہے واسطے عورتوں ہندوستان کی کے، بھی اختیار کرنا گھریلو صنعت کا مفید ہے، بھی ادھوری تعلیم و تربیت کا ہونا ایسا ہی ہے گویا کہے تو کہ بیچ بخار سخت کے ہذیان بک رہا ہے مریض بخار کا، بھی اسی طرح نہ فائدہ دیں گے قوم کو رسالے ادبی اردو کے کہ تحقیق بجز ہفوات و اہیات کے نہیں ہوتا اصل ادب بیچ ان کے، مگر غزلیں، مہمل اور افسانے اخلاق کے جلانے والے، پس قسم ہے غزلوں رُلانے والی کی کہ حوالات میں بھیجے جائیں گے وہ شوہر تمام کہ بے پروا رہتے ہیں وہ بیویوں اپنی سے بہ سبب ناراضی اپنی کے، بھی تکالیف پہنچاتے ہیں وہ بیویوں اپنی کو، بھی اسی طرح موٹر ڈرائیور بنائے جائیں گے دن حشر کے وہ شوہر جو زیادہ رہتے ہیں بیچ گھر خسر اپنے کے، محفوظ رکھے اللہ ہر ہندوستانی کو خضاب لاجواب اور سسرال اپنی سے اور پاک کرے اللہ اسے رہائی دے اللہ بندشوں خلاف شرع سے عورتوں اس زمانہ ہذا کی کو، کیونکہ شریک ہونا مسلمانوں کا بیچ کانگریس کے بغیر بصیرت سیاسی کے برابر ہے نہ شریک ہونے ان کے کے، دور رکھے اللہ ہم کو اور بیوی نمبر ایک ہماری کو اجلاس ولڈلے جس سے ٹوکونسلوں" کے سے اور گولیاں کرنین کی کھلاتا ہے اللہ تعالیٰ خشک واعظوں اور جاہل میلاد خوانوں کو کہ تحقیق وجود ان کا بخار اور مراق ہے بیچ حق قوم مسلمانوں کی کے اور شوق دے اللہ ہندو و مسلمانوں، دنیا تمام کو اتحاد و اتفاق کا، بھی طاعون پھیلا دے اللہ بیچ لیڈروں کے تاکم ہو جائے مقدار لیڈروں کی کہ کثرت لیڈروں کی سبب ہے تباہی قوم کا۔

پس بعد اس گفتگو کے مصروف ہو گئے ہم اور بیوی نمبر ۴ ہماری بیچ تعاویذ دربارہ لندھن کے، اب کیا کیا اشارے ہمارے جھٹلاؤ گے؟

غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں

کنہیّا لال کپور

(دورِ جدید کے شعراء کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعراء تشریف فرما ہیں۔ مثلاً ن۔ م۔ راشد، میراجی، ڈاکٹر قربان حسین خالص، میاں رفیق احمد خوگر، راجہ مہدی علی خاں، پروفیسر غیظ احمد غیظ، بکرما جیت ورما، عبدالحئی نگاہ وغیرہ وغیرہ۔ یکایک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں۔ ان کی شکل و صورت بعینہٖ وہی ہے جو مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں "دیوانِ غالب" کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعراء کھڑے ہو کر آداب بجا لاتے ہیں)

غالب :- حضرات میں آپ کا نہایت شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دورِ جدید کے شعراء سے شرفِ نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر:- یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے دگرنہ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب :- رہنے بھی دیجیے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر:- تشریف رکھیے گا۔ کیسے جنت میں خوب گذرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ـــ

غالب (مسکرا کر) بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے۔ جب سے وہاں گیا ہوں ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر:- تعجب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے۔ پینے کو شراب، انتقام لینے کو پری نژاد اور اس پر یہ فکر کوسوں دور کہ ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا   آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ.......

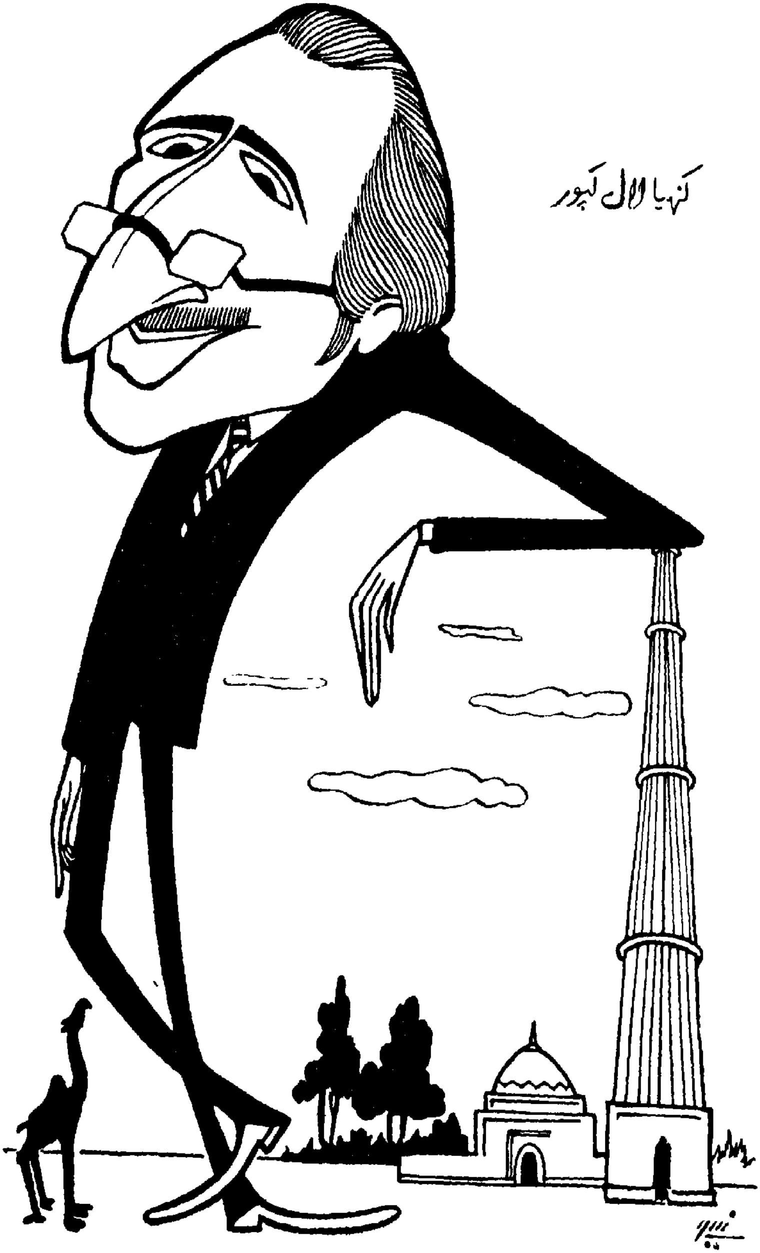

کنہیا لال کپور

تیسرا شاعر (بات کاٹ کر): سنائیے اقبال کا کیا حال ہے؟

غالب: وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا۔ وہی پرانی بحث ؏

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر: میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے اب مجلس کی کارروائی شروع کرنی چاہیئے۔

دوسرا شاعر: میں کرسئ صدارت کے لیے م۔ ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسئ صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرینِ مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔)

م۔ ن ارشد: میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیئے۔ میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب: بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنا دیں گے۔

م۔ ن ارشد: معاف کیجیے گا مرزا۔ اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی۔ شمع کی بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے۔ اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب: بہت اچھا صاحب تو غزل سنیے گا۔

باقی شعرا: ارشاد!

غالب: عرض کیا ہے ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔ مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

اجی صاحب یہ کیا حرکت ہے۔ نہ داد نہ تحسین۔ اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر: معاف کیجیے مرزا ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب: بے معنی؟

ہیراجی: دیکھیے نا مرزا آپ فرماتے ہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا اور اگر آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجیے۔

اکٹر قربان حسین خالص: میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی

پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح سے میری اِک اک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں
خط لکھیں گے کیونکہ الفت ہے ہمیں
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمھارے نام کے

غالب: یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

میرا جی: جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں۔

غالب: ہاں! ہاں! بڑے شوق سے۔

میرا جی: عرض کیا ہے ؎

جنوں ہوا ، جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق تھا
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا جنوں ہوا

غالب (ہنسی کو روکتے ہوئے) : سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م۔ ن ارشد: اب مرزا، غزل کا دوسرا شعر فرمائیے۔

غالب : میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔ کہا ہے ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ : گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب : کس طرح ؟

عبدالحی نگاہ : ؎

عشق نے، ہاں ہاں تمھارے عشق نے
عشق نے، سمجھے! تمھارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا
اتنا تمھارے عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمھارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا

غالب (طنزاً) : بہت خوب، بھئی غضب کر دیا۔

غیظ احمد غیظ : اور دوسرا مصرعہ اس طرح لکھا جا سکتا تھا ؎

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمھارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب : واللہ۔ کمال ہی تو کر دیا بھئی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں۔

م۔ ن ارشد : اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں اپنا کلام سنائیں گے۔

ڈاکٹر خالص : اجی ارشد صاحب میں کیا کہوں۔ اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگِ میل اس لیے آپ اپنا کلام پہلے پڑھیے۔

م۔ ن ارشد : توبہ! توبہ! اتنی کسرِ نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "بدلہ"۔ عرض کیا ہے ؎

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرمِ شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارضِ گلفام ترا
اور اربابِ وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شبِ عیش گذر جانے پر
بہرِ جمع درم و دام نکل جاتا ہے

ایک بڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب و سمور

(نظم سُن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ ہیر اجی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگیٹھی، بھوت اور دختر تہذیب و تمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیرِ لب مسکراتے ہیں)

غالب : ارشد صاحب معاف کیجیے آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

غیظ احمد غیظ : یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے۔ مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد مبہم اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م۔ ن ارشد : مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجیے ؎

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

اب بتائیے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب (شعر کو دہرا کر) : صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ ن ارشد : اجی چھوڑیئے اس حرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص : میری نظم کا عنوان ہے "عشق"۔ عرض کیا ہے ؎

عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا
عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوّالہ — عشق
عشق ہے پیامِ موت!

غالب : بھئی یہ کیا مذاق ہے۔ نظم پڑھیے۔ مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص (جھنجھلا کر) : تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے ؏

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

غالب : میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔ نہ ترنم۔ نہ قافیہ نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص : مرزا صاحب یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا۔ ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کیے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعتِ تخیل، تازگیٔ افکار اور ندرتِ فکر سے ہے۔

غالب : رفعتِ تخیل، کیا خوب، کیا پرواز ہے ؎

میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب : مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر : اس کی وجہ مغربی شعراء کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے۔ اس کے علاوہ دورِ جدید کی روح، انقلاب، کش مکش، تحقیق، تجسس، تعقل پرستی اور جد و جہد ہے۔ ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے اور میرے اس نکتے کو ٹھیکرے نے بھی اپنی کتاب ونیٹی فیئر میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لیے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعراء اور جدید شعراء کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعراء بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب : میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ ن ارشد : خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو، ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق، گل و بلبل، شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لیے اور بھی موضوعِ سخن ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ؎

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گذری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے

یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

راجہ عہد علی خاں: بہت خوب ؎ "یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے" ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون "ڈاک خانہ" ہے جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا، موضوع ہے۔

غالب: ڈاک خانہ؟

راجہ عہد علی خاں: مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے، سُنیے عرض کیا ہے ؎

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اُف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اُف آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو، مصر کو، لندن کو، کوہِ قاف کو
دیکھنا — آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ
یہ تو لڑکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال
خدو خال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اُف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام

جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا
یا ہمارے ہے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجواں
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا، بھئی کمال کر دیا، کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے)

م۔ن ارشد : اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ : میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیراجی : تو پھر وہی نظم سنا دیجیے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ : آپ کی مرضی، تو وہی سن لیجیے۔ عنوان ہے "لگائی" ہے

فون پھر آیا دلِ زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ

یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف دادِ طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م۔ن ارشد : حضرات میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اینٹی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رفیق احمد خوگر (سرگوشی کے انداز میں ہیراجی سے) : بکواس ہے۔

م۔ن ارشد : اب میراجی اپنا کلام پڑھیں گے۔

میراجی : میری نظم کا عنوان ہے "بینگن"۔

غالب : بینگن

میراجی : بینگن، اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن پر نظم لکھنے کا حقدار نہیں ؟

غالب : معاف کیجیے گا، نظم پڑھیے۔

میراجی : عرض کیا ہے ؎

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھا رانی آ ہی گئی تو
کرشن کنہیا ڈھونڈ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤں لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لیے بھوکا رہنا بہتر
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے داد دی جاتی ہے۔ بعض شعراء یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں بھئی جدید شاعری میراجی کا ہی حصہ ہے)

م۔ن ارشد : اب جناب بکرماجیت صاحب ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرماجیت ورما : میں نے حسبِ معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالب : (حیران ہوکر)۔ شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں۔ میرے اللہ دنیا کدھر جا رہی ہے ؟

بکرماجیت ورما : مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیئے گئے تھے۔ دورِ جدید کے شعراء نے انہیں ایک قابلِ عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب : جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں، بھانڈ، میراسی یا اس قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرماجیت ورما : پہلا گیت ہے "برہن کا سندیس" عرض کیا ہے ؎

اڑجا دیس بدیس رے کوّے اڑجا دیس بدیس
سُن کر تیری کائیں کائیں

غالب : خوب۔ سُن کر تیری کائیں کائیں

بکرماجیت ورما : عرض کیا ہے ؎ سُن کر تیری کائیں کائیں

آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں
مت جانا پردیس رے کوّے اڑجا دیس بدیس

م۔ن ارشد : بھئی کیا اچھوتا خیال ہے۔ پنڈت صاحب میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا وہ بھی مرزا کو سُنا دیجیے۔

بکرماجیت ورما : سُنیے پہلا بند ہے ؎ بول کبوتر بول

دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے
من میں میرے ہوک اٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے
بول غٹرغوں بول —— کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعراء (ایک زبان ہو کر): بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول۔

(اس اثناء میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں)

بکرماجیت ورما : اب دوسرا بند سُنیے ؎ بول کبوتر بول

کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول —— کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعراء (ایک زبان ہو کر): بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول

(اس شور و غل کی تاب نہ لا کر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

غسلیات

کرشن چندر

بہت سے بچّوں کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہانے کی رسم پتھر کے زمانے بلکہ اس سے بھی بہت پہلے زمانے کی یادگار ہے۔ جب کہ اس کرۂ ارض پر صرف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، مینڈک، گھڑیال اور مگرمچھ پیدا ہوئے اور تخلیق حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف انواع ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے۔ چنانچہ آج بھی بیسویں صدی کا بچّہ جب ٹب میں پڑے پڑے چلّا اٹھتا ہے تو یقیناً پانی کے ٹھنڈا ہونے کی شکایت نہیں کرتا بلکہ اس آبی زمانے کی وحشی رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جس کے نام سے ڈاروِن کا نام ہمیشہ کے لیے وابستہ ہے۔

اس زمانے میں بہت سی پرانی وحشیانہ رسمیں متروک ہو چکی ہیں، مگر نہانے کے متعلق ابھی کچھ عرصہ اور جہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میرے بہت سے احباب جو اس قابلِ نفریں رسم کے خلاف جہاد کرتے کرتے تنگ آ چکے ہیں اور کچھ بہت پُرامید نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک پنجاب میں پانچ دریا بہتے رہیں گے انسان بدستور ان میں نہاتے اور گھڑیال، مگرمچھ اور خوفناک بھنوروں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہاں میں ان لوگوں کا تفصیل سے ذکر کرنا نہیں چاہتا جو غسلخانوں میں نہاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پنجاب میں جہاں متوسط طبقہ کے لوگ کافی تعداد میں ہیں۔ ہر دہ ہزار افراد کے لیے صرف ایک غسلخانہ دستیاب ہو سکتا ہے اور بعض اضلاع میں تو تناسب کا یہ فرق بہت بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ محکمہ دیہات سدھار کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہوشیارپور میں ایک بھی غسلخانہ نہیں۔

لیکن میں اپنے احباب کے نکتۂ نگاہ کو درست نہیں سمجھتا، میں مستقبل کے متعلق اس قدر ناامید نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا عقیدہ محض ایک نام نہاد رسمی رجائیت کے فلسفہ پر مبنی ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں یاسیت اور تذبذب میں پھنسے ہوئے دلوں نے آج تک کچھ نہیں کیا، اور پھر میرے پاس تو پُرامید ہونے کے لیے بہت سی وجہیں ہیں۔ انھیں تفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) اس سیاسی خلفشار کے زمانہ میں لوگوں کو غسل سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ نہانا ایک انفرادی فعل ہے اور فسطائیت یا اشتراکیت ہر دو مقبول عمومی فلسفے انفرادیت کو مٹا دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔

(۲) جوں جوں "تہذیب" بڑھتی چلی جا رہی ہے انسان کو پانی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے اور نہانا تو محض اب نچلے درجوں

کی پسماندہ جماعتوں کے لیے رہ گیا ہے ورنہ شائستہ و مہذب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کنوئیں پر نہاتے نہاتے ایک پوربئے کا دوسرے پوربئے سے کہنا "ارے یار، تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔" ذرا خیال کیجیے کتنا تیم، غریب، افلاس زدہ فقرہ ہے۔ خود داری، بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری، میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی مجھے یہ بتادے کہ وہ دن کے کے بجے نہاتا ہے تو میں یہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لیے ابھی اسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر

صبح چار بجے کون نہاتا ہے؟ ——— پوربیا، بنیا، میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر!

صبح چھ بجے ——— ڈاکیہ، دفتر کا بابو، پولیس کا سپاہی۔

آٹھ بجے ——— پروفیسر، کالج کا لڑکا۔

دس بجے ——— صاحب بہادر، لیڈر۔

بارہ بجے ——— منسٹر، مجسٹریٹ، رئیس اعظم۔

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے۔ اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ پون گھنٹہ صرف کرتے تھے تو اب صرف دو منٹ پر آجائیں گے۔ اگر پہلے سارے جسم کو پانی میں بار بار ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کو تر کر کے "نہانے" سے فارغ ہو جاتے ہیں اور میں تو اس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے اور یہ فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کریں گے کہ لو بھئی آج ہم "نہائے" اور یقیناً جس طرح ایک روز ہندوستان کو سوراج حاصل ہوگا اسی طرح وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ نہانے کی رسم اس ہندوستان جنت نشان سے قطعاً مٹ جائے گی۔ صرف کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض راسخ الاعتقاد ہندو، سنیچر وار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا منہ دیکھ لیتے ہیں۔ بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتہ کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور نہایت غرور سے کہا کریں گے "آج ہم نے تو غسل کر لیا۔ کتنی مدت کے بعد آج پانی میں منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانے کو آج کل لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتہ میں ایک دن ہمارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے مگر ہمارے دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگویا کرتے تھے۔ (ایک جھرجھری لے کر) واہ، وا اس نہانے میں کیا مزہ ہوگا!

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں، بدن صاف رہتا ہے اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے۔ کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا۔ میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ رادی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض و غایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھرتا ہے تو سائنٹیفک نکتہ نگاہ سے استے بھی غلط

سمجھنا چاہیے۔ نہانے کے فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑتا ہے۔ باقی رہا رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا تو جنوبی ہندوستان کے باشندے کب کے "گورے" بن چکے ہوتے اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید ہوتا۔ مگر اس کے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے۔ ان کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ وہ اکثر ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ مبادا ہوا کا کوئی تیز و تند جھونکا انھیں اڑا کر لے جائے۔ وہ ہر صبح اٹھ کر اپنے پھونس کے جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاریگری پہ حیران ہوتے۔ جس نے ان کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کلائی پکڑے ہوئے نبض ٹٹولتا رہتا، کوئی اپنے پتلے، کاغذی جسم پہ بار بار ہاتھ پھیرتا اور سوچتا یا الٰہی اس جسدِ خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے؟

ان کی سات بیویاں تھیں۔ موٹی، بانجھ اور بدصورت بیویاں، وہ سب کی سب اس قدر کریہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچ کر دل میں کڑھتا رہتا۔ "ہو نہ ہو میرے اس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھی ہے، اگر "وہ" مجھے مل جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔"

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً متروک ہو چکی تھی۔ بھائی تو اس خیال سے نہیں نہاتے تھے کہ چونکہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں۔ اور بیویوں کو اس خیال سے نہانے نہیں دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کریں گے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال ابھارا کہ اسے ضرور نہانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے، دریا پر گئی اور نہا کر گھر لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اس نے اپنے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پہ ایک عجیب چمک تھی اور اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ جب بھائیوں نے اسے دیکھا تو بیتاب ہو گئے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ یہ میری بیوی ہے، نہیں یہ میری بیوی بنے گی۔ اسے میں لوں گا، اسے میں لوں گا۔ گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپا تک پہنچی، طمانچوں کا لگنا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جاں بحق ہو گئے اور بیویاں بیوائیں بن گئیں اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھونس کا بڑا سا جھونپڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں، "اسے میں نہ دوں گا، اسے میں نہ دوں گا، یہ میری ہے، یہ میری ہے"!

نتیجہ :۔ نہانا اخلاقی جرم ہے۔

آخر میں آپ استفسار کریں گے تو یہ سولہ آنہ درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے، اسے ملیامیٹ کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے خلاف پُرزور پروپیگنڈہ کیا جانا چاہیئے۔ مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی، ہنگامی باتیں ہیں۔ آخر آپ کا "پروگرام" کیا ہے بغیر پروگرام کے آج کل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔

لگے ہاتھوں وہ بھی سُن لیجیے ۔

(۱) جو امیر شخص نہائے اسے سماج سے باہر نکال دیا جائے ۔

(۲) دفعہ ۱۴۴ الف میں یہ الفاظ ایزاد کیے جائیں :۔

" ہر گاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ .... جو غریب شخص طلوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائے گا اسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائے گا ———

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا " بابو جی، غسلخانے میں پانی دیر سے دھرا ہے، آپ جلدی نہالیں، ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔" میں قلم چھوڑ میز کی دراز سے ایک تولیہ نکال کر یہ شعر گنگناتا ہوا غسلخانے کی طرف بھاگ گیا۔

نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

تزکِ نادری عرف سیاحت نامہ ہند

رقم زدہ:- اعلیٰحضرت جناب نادر شاہ سابق شہنشاہ سابق ابنِ شمشیر سابق مرحوم و مغفور وغیرہ وغیرہ

شفیق الرحمٰن

پیش لفظ عرف کرنا مرتب اس تزک کا ہمارا

آج جو اتفاق سے پرانی پوستین کو جھاڑا تو متعدد اشیاء کے ساتھ ہمارے خود نوشتہ اوراق کرم خوردہ بھی زمین پر گر پڑے۔ جنھیں ہم نے وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ پڑھا تو حیران رہ گئے۔ سوچا کہ سیاحتِ ہند کے بعد معترضین نے ہم پر جو طرح طرح کی افترا پردازی کی ہے کیوں نہ اس کے جواب میں یہ اوراق پیش کیے جائیں۔ اگرچہ ہم مقامی مؤرخین کی لگام بندی فرما چکے تھے تاہم غیر ملکی پریس نے واویلا مچا کر جو غلط فہمی پیدا کر دی ہے اس کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ تصویر کا یہ رخ دکھا کر کیوں نہ معترضین کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیں۔ پھر ہمیشہ سے لوگوں کو گلہ بھی رہا ہے کہ تاریخ غلط پیش کی گئی ہے۔ تبھی تاریخ کی غیر جانبدار اور مستند کتابوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ ہم ہندوستان محض حملے کی غرض سے ہرگز نہیں گئے۔ دراصل ہمیں اپنی دور افتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی۔ حملے کا خیال ہمیں راستے میں آیا۔ تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا ہم نے زبردستی ہرگز نہیں ہتھیایا۔ عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے میاں نے بصد منت و سماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوا دیں اور قتلِ عام کس مسخرے نے کرایا تھا۔ وہ تو ایک معمولی سا لاٹھی چارج تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اہلِ ہند نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لا سکے۔ سُنا ہے ہمارے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی کہاوتیں گھڑ لی ہیں۔ مثلاً شامتِ اعمالِ ما با صورتِ نادر گرفت۔ ہمارے دل کو خصوصاً اس مثل سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ یعنی اگر اس نادر سے مراد ہم ہیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص تھا۔ اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کے بعد اس قدر غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رُخ نہ کرتے اور اگر دلی میں پتہ چل جاتا تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے۔

والیے کابل سے ناچاقی

مدت سے ارادہ تھا کہ والیے کابل کی گوشمالی کریں۔ وہ لگاتار بلا کسی وجہ ہمارے خلاف زہر اُگل رہا تھا۔ جب ہم نے خط لکھ کر اس خواہ مخواہ پروپیگنڈے کی وجہ پوچھی تو اور بھی زیادہ زہر اگلنے لگا۔ چنانچہ موسم کو مناسب پا کر حملہ آور ہوئے۔ غالباً ان لوگوں کو ہماری قوت کا غلط اندازہ تھا۔ ہم نے دریائے ہلمند کو جگہ جگہ سے کاٹ کر ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔

دریائے بلند نہایت خوشنما دریا ہے۔ فرمانبردار خاں معروض ہوا کہ شاہانِ سلف کا رواج رہا ہے کہ حملہ کرتے وقت جو دریا راستہ میں آئے تیر کر عبور کرتے تھے۔ اس کے کہنے پر غلطی سے ہم نے بھی چھلانگ لگا دی اور شاہانِ سلف میں شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے۔ کنارے کی طرف آنے کی کوشش کی، ہم پوستین کو چھوڑتے تھے لیکن پوستین ہمیں نہ چھوڑتی تھی۔ بمشکل میں باہر نکالا گیا، بڑے پشیمان ہوئے، تہیہ کیا کہ جب تک تیراکی کے ماہر نہ ہو جائیں پانی میں قدم نہ رکھیں گے۔

شہباز خاں کو خطاب کا عطیہ

مقامی باغ میں چند الّو دکھائی دیئے۔ یہاں کا الّو ایرانی الّو سے بڑا اور بہتر ہوتا ہے۔ الّوؤں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہو لیا شام کو ہمارے قیام گاہ کے پاس بسیرا لیتا اور رات بھر ہاؤ ہو مچاتا۔ ہم نے فرمانبردار خاں سے پوچھا کہ یہ جوڑا کیا چاہتا ہے۔ وہ بولا گستاخی کرتا ہے اور ہمیں واپس جانے کو کہتا ہے۔ ہم بے حد خفا ہوئے اور فرمانبردار خاں کو پاپوش مبارک سے زد و کوب کر کے سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی شہباز خاں کی رائے دریافت کی۔ وہ جاں نثار معروض ہوا کہ فال نیک ہے۔ الّو جیسا منحوس پرندہ بھی ہم سے بلند طالع شہنشاہ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے، ہم اس جواب پر خوش ہوئے اور نمک حلالی کی قدر کرتے ہوئے اس کو الّو شناس کے لقب سے نوازا اور اس کے ہم جنسوں میں اس کی عزت افزائی فرمائی۔

سیاحتِ ہند کا ارادہ

کابلی افواج کے ساتھ ہماری جنگ خاصی رہی۔ یہ ان تمام خصوصیات کی حامل تھی جنھوں نے نادر شاہی جنگوں کو قلیل عرصے میں اس قدر حیرت انگیز شہرت بخشی۔ اب ماشاء اللہ نادر شاہی حکم، نادری قہر، نادر موقعے اور نادری حکومت بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ والیِ کابل اپنے کیے پر نادم تھا۔ اس نے وفاداری کا حلف اتنی مرتبہ اٹھایا کہ ہم نے تنگ آ کر منع فرما دیا۔

شہباز خاں الّو شناس ہر روز ملکِ ہندوستان کی خبریں سناتا کہ کابل سے میوہ جات کثیر مقدار میں ہند بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے تجار ہینگ، بھنگ، چرس و دیگر تفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دلچسپی لی تو الّو شناس بھی چست ہو گیا۔ اس نے ہمیں پھوپھی محترمہ کی یاد دلا دی جو غالباً ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھوپھی کا محض ذکر ہی سنا تھا نہ کبھی انہیں دیکھا تھا نہ شرفِ ملاقات بخشا تھا۔ گستاخ فرمانبردار خاں کا خیال تھا کہ ہماری کوئی پھوپھی تھیں ہی نہیں۔ خیر چونکہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہو گئی، سوچا یہ بیکار وقت کیوں نہ سیاحتِ ہند میں صرف کیا جائے۔

ہمیں بتایا گیا کہ حملہ آوروں کی سہولت کے لیے اہلِ ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں :۔

براہِ افغانستان : خیبر ایجنسی ــــ پشاور ــــ لاہور ــــ پانی پت
براہ بلوچستان : سمہ سٹہ ــــ بھٹنڈہ ــــ دلّی

ہم نے پہلا راستہ پسند فرمایا کیونکہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے :۔

کابل سے کوچ —— چار گھڑی گزرنے پہ کابل سے کوچ کیا۔ عمائدینِ شہر فصیل تک بلکہ درہ خیبر تک چھوڑنے آئے۔ جانے نہ دیتے تھے۔ ویسے کابل مفارقت کا سوچ کر روتا تھا اور ہمارے سیاحتِ ہند میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تھا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ رونا پیٹنا دکھاوے کا ہے۔ یہ لوگ بڑے کائیاں ہیں۔ ہمارے رخصت ہوتے ہی پراپیگنڈہ دوبارہ شروع کر دیں گے اور پھر ہم اہلِ ہند پہ مہمان نوازی کا زیادہ بوجھ ڈالنا قرینِ مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسے سمجھایا کہ جب ہم سیاحتِ ہند سے واپس لوٹ آئیں تب اس کا جانا زیادہ موزوں تھا۔ وہ پھر بھی روتا تھا۔ اسے ازراہِ غریب پروری ایک ریشمی رومال آنسو پونچھنے کے لیے مرحمت فرمایا اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اس منزل سے کوچ کر کے درّہ خیبر میں پہنچے۔ نہایت پُرفضا مقام ہے۔ سکندرِ یونانی، محمود غزنوی اور دوسرے نامی سیاح بھی اسی راستے سے گزرے تھے۔ ہم نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی۔ اس درّے میں پرند، چرند، درند، انسان بلکہ نباتات و جمادات تک نظر نہیں آتی۔ خداوندِ باری تعالیٰ کی کیا قدر بیان کی جائے۔

مغل فوجدار نے پشاور سے کچھ دور سے آ کر سعادتِ آستاں بوسی حاصل کی اور مشورہ دیا کہ ہمارا واپس چلا جانا بہتر ہوگا۔ کیونکہ اس موسم میں سیاحت لطف نہیں دیتی۔ اس نے دو سو مہر طلائی نذر اور ایک مرصّع گھوڑا بطور پیش کش گذرانا، ہم نے بھی ازراہِ مروت ایک دنبہ عنایت کر کے ٹالا۔ پشاور سے آگے شیر پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ طبیعت بڑی خوش ہوئی۔ بندگانِ درگاہ تو بھاگ گئے ہم وہیں کھڑے رہے۔ ہم کو کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ ایک گربہ کی مثال ہوتا ہے۔ نہایت نفاست پسند اور بورژوا قسم کا چوپایہ ہے۔ کچھ دیر ہمیں دیکھنے کے بعد اس درجہ مرعوب ہوا کہ بھاگ نکلا۔ اگلے روز ہمیں کسی نے بتایا کہ وہ شیر نہیں تھا، کچھ اور چیز تھی۔

واللہ اعلم بالصواب !

سفر کا حال

دریائے سندھ عبور کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ سید بایزید ابنِ یزید یزدانی آستاں بوسی کی سعادت کے متلاشی ہیں۔ جب بلایا تو دیکھا کہ فقط ایک آدمی تھا۔ ہم نے ازراہِ تلطف اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے بھینچا، وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے فوراً اٹھا کر باہر لے گئے، لخلخہ سنگھایا گیا، مالش کی گئی۔ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ نذریں جو پیش کرنے لایا تھا لے کر رفوچکر ہوا۔ ہم نے اہلکاروں کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اگر خود نہیں آتا تو نذریں تو بھجوا دے مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

قلعہ کا فوجدار ہماری سواری کے لیے ایک عجیب و غریب چوپایہ لایا جسے ہاتھی کہتے ہیں۔ نہایت پُرشوکت فیل جسم جانور کا۔ دو دانت ہوتے ہیں جو صرف دکھانے کے لیے ہیں۔ ناک جس کو سونڈ کہا جاتا ہے زمین کو چھوتی ہے۔ ہاتھی پر چڑھ کر آدمی دوسروں کے گھروں کے اندر سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے سواری کا قصد کیا اور باگ ہاتھ میں لینی چاہی، وہ بولا اس کی لگام نہیں ہوتی، ڈرائیور علیٰحدہ بیٹھتا ہے۔ ہم نے ایسے بے لگام جانور پہ سواری سے انکار کر دیا۔

لطیفہ

سندھ کے علاقے سے وفد آیا کہ وہاں کے عمائدین بے تاب ہیں کہ ہم ان کو سرفراز فرمائیں۔ ساتھ ہی ایک مشہور خانقاہ

کی گدّی کی پیش کش بھی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک میں عجیب دستور ہے۔ کوئی گھاگ چند ہتھکنڈے دکھا کر بھولے بھالے انسانوں کو رام کر لیتا ہے۔ یہ شخص پیر کہلاتا ہے اور معتقدین مرید کہلاتے ہیں۔ مرید اپنی آمدنی کا ایک حصہ پیر کو باقاعدگی کے ساتھ نذر کرتے ہیں۔ پیر کوئی خاص کام نہیں کرتا۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کاغذ کے پُرزوں پہ کچھ لکھ دیتا ہے جنھیں تعویذ کہتے ہیں ان تعویذوں سے بڑھوں کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے اور اولاد کے سرپرستوں کا انتقال ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ لطیفہ سن کر ہم بہت ہنسے کہ کسی نے کیا بے پر کی اُڑائی ہے۔

لیکن جب اُلّو شناس تین چار پیروں کو ہماری ملاقات کے لیے لایا تو ہمیں محسوس ہوا کہ لطیفہ دوسروں پر نہیں ہم پہ ہوا ہے۔ پیروں کی زندگی کی طرح طرح کی دلچسپیاں اور ان گنت مشغلے۔ ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنی گذشتہ زندگی پہ بڑا افسوس ہوا کہ ناحق خراب ہوتے پھرے۔ اگر پہلے سے پتہ ہوتا تو سیدھے ہند آ کر پیر بن جاتے اور مزے لوٹتے۔

ایسا سنہری موقع ملنے پر ہم نے خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور وفد کے ہمراہ چلنے کا قصد ظاہر کیا لیکن اُلّو شناس نے رائے دی کہ سندھ کے سیاسی حالات ہمیشہ کچھ ایسے ویسے ہی رہتے ہیں، چنانچہ اس تجویز کو التوا میں رکھا۔ اگر خدانخواستہ شہنشاہی کامیاب نہ رہی تو ضرور بضرور پیر بن جائیں گے اور دل کی ساری امنگیں پوری کریں گے۔ ان شاء اللہ العزیز !

اختر شماری

کل رات اختر شماری کی، دو سو پچاسی تارے گنے ہوں گے کہ نیند آ گئی، باقی بشرطِ زندگی کل گنیں گے۔

شتر غمزے

مقامی قلعہ دار کی دعوت پہ اس کے ساتھ گئے اور شتر غمزے ملاحظہ فرمائے، محظوظ ہوئے۔ کیونکہ ایران میں یہ چیز نہیں ہوتی اور اس ملک میں عام ہے۔

ایک مفید رسم

جہلم کے قریب ایک قلعہ دار نے ہم پہ دھاوا بول دیا اور پھرتی سے قلعے میں محصور ہو گیا۔ ارادہ ہوا کہ اس کو اسی طرح محصور چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں لیکن اُلّو شناس ملتمس ہوا کہ نیا ملک ہے یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ ہم نے فرمایا کہ اس طرح قدم رکھے تو دلّی پہنچنے میں دیر لگے گی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ عقب سے آ کر تنگ نہ کریں۔ اس روز ہمیں نزلہ سا تھا اور قصد لڑائی بھڑائی ہرگز نہ تھا۔ اُلّو شناس کے اصرار پر دو دن تک قیام کیا لیکن کچھ نہ ہوا۔ تنگ آ کر ہم نے پوچھا کہ کوئی ایسی تجویز نہیں ہو سکتی کہ یہ معاملہ یونہی رفع دفع ہو جائے۔ اُلّو شناس چلا گیا۔ شام کو لوٹا تو اس کے ساتھ ایک ہندی سپاہی تھا۔ اُلّو شناس کے کہنے پر ہم نے سپاہی کو پانچ سو طلائی مہریں دیں۔ ابھی ایک گھنٹہ نہ گزرا ہو گا کہ قلعے کے دروازے کھل گئے۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔

ہند میں یہ ایک نہایت مفید رسم ہے۔ جب کٹھن وقت آن پڑے یا مشکل آسان نہ ہو تو متعلقہ لوگوں کو ایک رقم یا نعم البدل پیش کیا جاتا ہے۔ تحفے کی مقدار اور پیش کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں لیکن مقصد ایک ہے —— اسے یہاں رشوت کہتے۔ کس قدر زود اثر اور کارآمد نسخہ ہے۔ اگر لاکھوں کے اٹکے ہوئے کام ہزار پانچ سو سے سنور جائیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ رشوت دینے دلانے

کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس حرکت سے کرنسی حرکت میں رہتی ہے۔ ہم واپس ایران جا کر اس رسم کو ضرور رائج کرائیں گے۔

ہمیں بتایا کہ کچھ مہریں سپاہی نے اپنے استعمال کے لیے خود رکھ لی تھیں۔ باقی کوتوال کو دیں جس نے اپنا حصّہ رکھ کر بقیہ رقم قلعہ دار کے حوالے کر دی۔ قلعہ دار نے سنتریوں کو خوش کر کے دروازے کھلوا دیئے۔ واقعی یہ ملک عجوبۂ روزگار ہے !

گوجرانوالے میں قیام

شیخ بوٹا شمر پوری ایک ایرانی النسل درویش ہیں جو بڑے فاضل ریاضت کار، مبارک نفس، متوکل اور گوشہ نشین ہیں۔ گوجرانوالے میں ان سے مل کر معرفت اور وجدان کی باتیں ہوتی رہیں۔ فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر تارک الدنیا بنا جائے۔ پھر شبہ سا ہوا کہ کہیں یہ بھی پیر نہ ہوں۔ تحقیقات کرنے پر شبہ درست نکلا۔ آپ بڑے رنگیلے پیر ہیں۔ پنجاب سے وادی کانگڑہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں کیونکہ وہ علاقہ زیادہ رنگین ہے۔ دیر تک ان سے خفیہ باتیں ہوتی رہیں جنھیں سینہ بسینہ رکھنے کا ارادہ ہے۔ یہ ملاقات کیا تھی گویا تجدیدِ عہدِ شباب تھی۔

ہمارا سنجیدہ ہو جانا

گلستان بیکانیر سے ایلچی درِ دولت پہ حاضر ہوا۔ ملتجی ہوا کہ چلیے مشتاقانِ دید راہ دیکھ رہے ہیں۔ تربوزوں کا موسم بھی ہے۔ ارادہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لیے چلے چلیں مگر اُلو شناس کو حسبِ معمول شبہ ہوا کہ یہ کوئی چال ہے۔ بیکانیر لق و دق صحرا ہے جس میں نہ پانی ہے نہ روئیدگی۔ یہ لوگ ہمیں صحرا میں چھوڑ کر بھوک پیاس سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہر چیز سرخ نظر آنے لگی۔ فوراً ایلچی کو بلوا کر الٹا لٹکوایا۔ جب بکا کہ واقعی یہ چال تھی تو کھلوا کر سیدھا گیا
اس حادثے نے ہمارا موڈ خراب کر دیا۔ سوچا کہ اہلِ ہند سے اچھے سلوک کی توقع کرنا حماقت ہے۔ کیوں نہ کسی بہانے اس ملک پر حملہ کر کے ان کی گوشمالی کریں۔ فرمانبردار خاں کو حکم دیا کہ حملے کی چند وجوہات سوچے، اس نے یہ فہرست پیش کی: ۔

۱۔ ہم عوام کے مفاد کے لیے جنگی چالوں کی ایک کتاب "رہنمائے حملہ آورانِ ہند" لکھنا چاہتے ہیں۔
۲۔ ہندی گویّے ترانوں کو "نادر نا دھیم" سے شروع کر کے ہماری توہین کرتے ہیں۔
۳۔ تاریخ میں اس سے پہلے ایران نے ہند پہ باقاعدہ حملہ نہیں کیا۔
۴۔ ہند پہ حملہ ہوئے کافی عرصہ گذر چکا ہے۔
۵۔ یوں بھی ان دنوں ہند پہ حملے کا رواج عام ہے۔

ایسی بے معنی وجوہات معروض ہونے پر ہمیں غصہ آیا۔ ایک بھی بات خدا لگتی نہ تھی۔ قصد ہوا کہ فرمانبردار خاں سے وہی پہلا سا سلوک کریں۔ دیکھا تو وہ کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ ہم نے خود ان سے بہتر وجوہات سوچنے کی دیر تک کوشش کی۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو خوش ہو کر فرمانبردار خاں کو بحال فرمایا۔

شاہدرے میں آمد آمد

شاہدرہ کے قریب ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ چال ڈھال سب لڑکوں کی سی تھی۔ نام بھی عبداللطیف

گویا مردانہ تھا۔ ہم نے پیش کاروں کو حکم دیا کہ اس کے باپ سے مل کر تحقیق کریں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللطیف لڑکا ہی تھا اور کسی مقامی کالج میں پڑھتا تھا۔ خدا جانے کہ ہم کو یہ کیسے خیال آیا کہ وہ لڑکی ہے۔

لاہور پہنچے ہی تھے کہ صوبیدار لاہور کے گوریلا دستوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہی جدید جنگی طریقوں سے ناواقف تھے اور صوبیدار موصوف نہ صرف ہفت ہزاری تھا بلکہ گوریلا لڑائی کا ماہر تھا۔ ہم نے بھی فوراً چڑیا گھر سے سارے گوریلے نکال کر سدھائے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ گوریلا گوریلے پر ٹوٹ پڑا، اور سپاہی تماشہ دیکھتے رہے۔ دشمن نے لڑائی کا رخ بدلا۔ صوبیدار ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگا، اور ہم اسے۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے قریب سے کئی کتراتی گزر جاتیں۔ گرم جوشی کا یہ عالم تھا کہ گھیرے میں لینے کی کوشش میں صوبیدار فوج سمیت جہلم جا پہنچا اور ہم فیروز پور۔ غلطی کا احساس ہوا تو لوٹے۔ اُلّو شناس کے مشورے پر صوبیدار پر ہند کا مروجہ کارآمد نسخہ رشوت آزمایا اور شکست فاش دی۔ شکست کے بعد ہم نے اس سے ہفت ہزار بصد دقت وصول کیا۔ شام کو اُلّو شناس کچھ اور منصب داروں کو لایا جو بالترتیب پنج ہزاری، سہ ہزاری، دو ہزاری تھے۔ کئی روز گرفتار رکھا تب کہیں دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔ دیکھتے دیکھتے عہدیداروں کی قیمتیں گرنے لگیں۔ لوگ پنج صدی، پونے دو صدی، ایک سینکڑی اور پچاسوی تک پہنچ گئے۔ یہ لوگ بڑے لالچی ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی ہزاری بہت چلایا کہ وہ ہزارہ کا رہنے والا ہے لیکن ہم نے اپنا اصول ترک نہیں کیا۔

لاہور سے روانگی

چاہیے تو یہ تھا کہ ان علاقوں میں چند روز رہ کر دادِ عیش و کامرانی دیتے مگر یہاں کی پرانی رسم ہے کہ وہ سیاح جو درہ خیبر سے آتے ہیں انہیں سیدھے دلی جانا پڑتا ہے۔ راستے میں کہیں نہیں ٹھہر سکتے۔

جہلم، چناب، راوی عبور کر چکے تھے، ستلج کو عبور کیا اور پنجاب کے پانچویں دریا کو بہت ڈھونڈا۔ خبر ملی کہ بیاس تو پہلے ہی ستلج سے مل چکا ہے۔ سخت مایوسی ہوئی۔ مصاحبین نے دست بستہ عرض کی کہ ملک کا دستور رہے حملہ آوروں سے اس علاقے میں ضرور لڑتے ہیں۔ اس کے لیے پانی پت، تراوڑی وغیرہ کے میدان مخصوص ہو چکے ہیں۔ ہم نے فرمایا کہ لڑیں تو تب اگر مقابلے میں کوئی فوج آئی ہو۔ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر اہلِ ہند اس علاقے میں نہ لڑیں تو پھر کہیں نہیں لڑتے۔

محمد شاہ کو ہماری تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے ایلچی کو لفافے سمیت شراب کے مٹکے میں دھکیل دیا، اور بولا، ایلچی بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ۔ کسی طبلچی نے حافظ کا یہ مصرع صحیح کرنا چاہا تو محمد شاہ نے اسے بھی مٹکے میں دھکیل دیا۔ آدمی بامذاق معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں تحفہ دینے کا نتیجہ

دلی سے ایک درباری قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ تحفے تحائف سے لدا ہوا تھا اس لیے ہم نے بلا لیا۔ بولا یا شہنشاہ! سُنا ہے کہ آپ تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے اس طرف تشریف لائے ہیں۔ جہاں تک آب و ہوا کا تعلق ہے اس ملک کو یہاں ختم سمجھیے، اس سے آگے سخت گرمی پڑتی ہے۔ رعایا کی التجا ہے کہ آپ دو کروڑ کی حقیر رقم بطور سفر خرچ قبول فرما کر

یہاں سے مراجعت فرما جائیں۔ ہمیں رضامند پا کر وہ نابکار بغلیں بجانے لگا۔ ڈانٹا تو معلوم ہوا کہ یہاں کا رواج ہے۔ ایک تو یہاں کے رسم و رواج نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ واپسی کے لیے سامان بندھوا رہے تھے کہ اُلو شناس نے شبہ کرا دیا کہ اہلِ ہند ہم پر اپنا خوب نسخہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ رقم ہمیں تحفتہً پیش کی جا رہی ہے۔ شام کو وہی درباری بغلیں جھانکتا ہوا پھر حاضر ہوا اور دلّی چلنے کی ترغیب دینے لگا۔ عجیب ڈھلمل یقین لوگ ہیں۔ اُلو شناس نے اصل وجہ بتائی جب درباری مذکور دلّی دربار میں پہنچ کر انعام کا خواہاں ہوا تو کسی نے پوچھا تک نہیں بلکہ خان بہادر کا خطاب کسی حریف کو مل گیا۔ اس نے جل بھن کر دھمکی دی کہ ٹھہرو ابھی لاتا ہوں نادر شاہ کو ——

ہم نے سوچا کہ اب اتنی دور آ گئے ہیں تو دلّی دیکھ کر جائیں گے۔ کرنال کے مقام پہ محمد شاہی فوج دکھائی دی جو ہمیں دیکھتے ہی ادھر ادھر ہو گئی۔ اس نے کہلوا کر بھیجا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس جنگ کو تاریخ میں پانی پت کی تیسری لڑائی کا رتبہ ملے۔ اس پیغام پر باقی ماندہ فوج بھی بھاگ نکلی۔

قطب صاحب کی لاٹھ

نزولِ اقبال دلّی کے باہر ہوا۔ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس نادر شاہی جھنڈے گاڑے گئے۔ یہ لاٹھ قطب صاحب کی تعمیر کردہ ہے لیکن اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ پتہ نہیں قطب صاحب کا ارادہ کیا تھا۔ فرمانبردار خاں نے عرض کیا کہ غالباً قطب صاحب آسمان تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن تجویز کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بصد دقّت اوپر تشریف لے گئے۔ واقعی بہت اونچا مینار ہے۔ آسمان یہاں سے کافی قریب ہے۔ سستانے کے بعد نیچے تشریف لائے۔

حملہ آوری اور برادرم محمد شاہ کی ہماری ذات سے عقیدت

صبح سے محمد شاہ اپنا لشکر لے کر سامنے آیا ہوا تھا مگر ابھی تک سعادتِ زیارت سے مشرف نہ ہوا تھا، دوپہر کو ایک ایلچی رنگین جھنڈا لہراتا آیا اور معروض ہوا کہ محمد شاہ صاحب نے دریافت کیا ہے کہ حملہ کرنے کا کس وقت ارادہ ہے۔ ہم نے پوچھا "ابے حملہ کیسا؟" ایلچی نے عرض کیا "خداوندِ نعمت وہ تو عرصے سے آپ کے حملے کے منتظر ہیں۔ اتنے دنوں سے تیاریاں ہوتی رہی ہیں۔ اگر حملہ نہ ہوا تو سب کو سخت مایوسی ہوگی۔ کل بارش کی وجہ سے لشکر اکٹھا نہ ہو سکا اور پھر یہ رسم چلی آتی ہے کہ درۂ خیبر سے آنے والے۔"

"بس بس! آگے ہمیں پتہ ہے۔" ہم نے اسے ڈانٹا۔

مجبوراً ہم نے حملے کا حکم دے دیا لیکن لڑائی کا لطف نہ آیا۔ وہ لوگ فوراً تتر بتر ہو گئے۔ ہم شہر کے دروازے میں داخل ہوئے تو عزیزی محمد شاہ نے پھولوں کا ہار پہنایا۔ گھوڑے سے اتر کر بغل گیر ہوئے۔ اس کے بعد دو دن تک محمد شاہ کا کوئی پتہ نہ چلا۔ دلّی میں نازل ہو کر ہم نے اور بندگانِ درگاہ نے خوب دادِ عیش دی کہ شیوۂ سیاحاں ہے۔ حمام گئے، الحمد للہ کہ آج پورے ایک سال کے بعد غسل فرمایا۔ صبح سے شام تک تختِ طاؤس پر بیٹھ کر شغلِ خور و نوش فعلیوں اور خوش گپیوں سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرتے اور رعایا کو اپنے دیدار سے فیض یاب کرتے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے جیسا صاف باطن اور نیک دل بادشاہ

تاریخ میں کوئی نہ ہوا ہوگا۔ سکندر نے پورس سے جو سلوک کیا اس سے کہیں بہتر سلوک ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کیا۔ ہر چند کہ اس کی رنگین مزاجی ہمیں نہ بھاتی تھی۔ اس کو مانند اپنے عزیز کے سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ اس نے ہماری اتنی خدمت کی کہ کیا کوئی اپنے بزرگ کی کرتا ہوگا۔

ہمیں شاہی مہمان خانے کے بہترین حصے میں ٹھہرایا گیا جو مرہٹوں کے لیے مخصوص تھا۔ عزیزی محمد شاہ نے شام کو ہمارے لیے مسواکیں، لباسِ شب خوابی، سلیپر بھیجے، چادریں اور غلاف بدلوائے۔ یہ اور بات تھی کہ ہم راستہ بھول گئے اور نہ جانے کہاں پوستین سمیت سیڑھیوں پر سو گئے۔ لال قلعہ باہر سے تو سیدھا سادہ سا قلعہ معلوم ہوتا تھا لیکن اندر نفیس و نازک عمارتوں اور خوشنما باغوں کی بھول بھلیاں میں ہمیں گائیڈ کی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔ ہماری آمد کی خبر پا کر (غالباً ہمیں متاثر کرنے کی غرض سے) حکومت ہند نے امتناعِ شراب کے احکامات جاری کر دیئے تھے لیکن عزیزی کی وساطت سے ہمارے سپاہیوں کے لیے پینے پلانے کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔

تختِ طاؤس

ایک دفعہ جب ہم متواتر دس گھنٹے تختِ طاؤس پر بیٹھے رہے تو عزیزی بولا "معلوم ہوتا ہے کہ تختِ طاؤس سے آپ کو ازحد اُنس ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا اس درجہ طویل قیام تختِ طاؤس کی وجہ سے ہے تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ آپ اسے بخوشی لیجا سکتے ہیں۔"

ایسے خلوص و محبت سے کسی کا دل نہ پسیج جاتا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہم جب یہاں سے عازمِ ایران ہوئے تو تختِ طاؤس ہمراہ لے جائیں گے۔ ہم انکار کر کے ان کا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا — "دلّی کو اپنی ذاتِ بے مثال سے محروم کرنے کی تاریخ سے مطلع فرما دیا جائے۔ تاکہ اہلِ دلّی کو مطلع کر دیا جائے۔ وہ اس دن کے لیے گھڑیاں گن رہے ہیں —"

"کیوں گھڑیاں کیوں گن رہے ہیں، کیا وہ ہم جیسے مشفق بزرگ کو بن بلایا مہمان سمجھتے ہیں؟" ہم نے غیظ و غضب میں فرمایا۔

"جی نہیں، آپ نے غلط سمجھا۔ وہ الوداعی پارٹیوں کا انتظام کرنا چاہتے ہیں —" وہ بولا۔

"ہمیں ان گلیوں کو چھوڑنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں جن کے متعلق کوئی استاد ذوقؔ شعر کہیں گے۔" ہم نے فرمایا۔

"یوں ٹھہرنے کو آپ چھ ماہ، سال، دس سال ٹھہر لیجیے بلکہ ایران کا دارالخلافہ دلّی کو بنوا لیجیے۔" عزیزی بڑی محبت سے ملتمس ہوا۔

"دیکھا جائے گا۔" ہم نے بھی محبت سے فرمایا۔

وہ گلقند والا قصہ

بات کچھ بھی نہ تھی۔ مغلئی دسترخوان کی مرچیں ہمیں تیز معلوم ہوئیں تو حلوے کے مرتبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ بہ مشکل کوئی پاؤ بھر حلوہ کھا سکے ہوں گے کہ فرمانبردار خاں نے بڑی بدتمیزی سے مرتبان ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس معمولی سے واقعہ پر لوگوں نے اتنا لمبا چوڑا افسانہ تراش لیا۔ ہمیں ہرگز علم نہ تھا کہ مرتبان میں حلوے کی جگہ گلقند ہے اور اگر علم ہوتا تو بھی کیا فرق پڑ جاتا۔

ہنوز دلّی دور است

اس فقرے کو ہم نے اہلِ دلّی کا تکیہ کلام پایا۔ جب ہم خیبر میں تھے تو سُنا تھا کہ ہمارے لیے ہنوز دلّی دور تھی۔ جب لاہور

پہنچے تب بھی دور رہی۔ لال قلعے میں پہنچ کر بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہنوز دلّی دور است۔ اچھا بھئی چلو دلّی دور است، بس!

محمد شاہ کا دربار

مسز محمد شاہ لال قلعے میں اس دھوم دھڑکے سے رہتی ہیں کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سیاسی دنگے فساد میں ہمیشہ ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ملک کی خارجی اور اندرونی پالیسی (جب اتفاق سے ہوتی ہے) وہ خود ترتیب دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اعلیٰ حکاموں کی پوسٹنگ وغیرہ بھی خود ہی کرتی ہیں۔ وہ فارسی، عربی، سنسکرت اور مدراسی بول سکتی ہیں لیکن دیگر بیگمات کا خیال ہے کہ وہ سمجھ ایک زبان بھی نہیں سکتیں (ویسے دیگر بیگمات کا ہمیشہ کچھ اور ہی خیال ہوا کرتا ہے) درباری بیگمات بے حد ذہین ہیں۔ ایک برجیس جہاں بیگم نے برجس کو دیکھ کر چوڑی دار پاجامہ ایجاد کیا۔ دوسری نے شلوار کو ساری میں ضرب دیکر دو پر تقسیم کر دیا اور غرارہ دریافت کیا۔ تعجب ہے کہ یہ خیال اسے علی الصبح غرارے کرتے وقت آیا۔

صبح شام شہر کی چیدہ چیدہ خواتین حاضر ہو کر آداب بجالاتی ہیں اور شہر کی دوسری چیدہ چیدہ خواتین کے بارے میں تازہ ترین افواہیں سناتی ہیں۔

عزیزی محمد شاہ بھی لال قلعے ہی میں وہیں کہیں رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے لہٰذا اپنے تئیں شہنشاہِ ہند کہلاتا ہے۔ رنگین خواب دیکھتا ہے۔ رنگین لباس پہنتا ہے۔ رجعت پسند ادب اور تنزل پسند شاعری کا گرویدہ ہے لیکن حرکتیں سب ترقی پسند کرتا ہے۔

کل وزیر جنگ نے بتایا کہ ملک کے کچھ حصوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ عزیزی محمد شاہ خوش ہو کر بولا — اب ملک کا بیشتر حصہ خود مختار ہو چکا ہے۔ جتنے صوبے اور ریاستیں خود مختار ہوں گے اتنا ہی ہمارا کام کم ہو جائے گا۔ ملک کے ریاستوں میں بٹتے ہی ان کی ریاستہائے متحدہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

عزیزی کے تعلقات مرہٹوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ جب مرہٹے بیکار ہوتے ہیں تو سیدھے دلی آدھمکتے ہیں۔ پچھلے ماہ آئے تھے تو نربدا، چنبل اور مالوہ کے علاقے لے کر ٹلے۔ خیر، ہمیں کیا عزیزی جانے اور اس کا کام۔

ہندی فوج کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ لڑنے جاتے ہیں تو پالکیوں میں بیٹھ کر، میدان جنگ میں ڈھال ملازم اٹھاتا ہے ہر وقت صلح کے خواہاں ہیں۔ ہر سپاہی کی وردی مختلف ہے۔ کرنال میں ہم سے لٹنے آئے تو جیسے عید کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہمیں زیادہ نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیئے۔ انسان خاک کا پتلا ہے۔

مینا بازار اور ہم

محمد شاہ کے بزرگوں کے وقت سے رسم چلی آتی ہے کہ موسم بہار میں لال قلعے میں مینا بازار لگتا ہے جس میں طرح طرح کی دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ دکانوں سے زیادہ بیگمات سجتی ہیں اور مختلف اشیاء بازار سے چوگنے نرخ پر خریدتی ہیں۔ ان دنوں تو ذرا سے بہانے پر مینا بازار لگ جاتا ہے۔ ہماری طبیعت حاضر تھی۔ محمد شاہ سے مینا بازار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے ٹالنا چاہا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بزرگ بھی ہیں۔ وہ بولا کہ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو دو دن سمندِ شوق کو لگام دیجیے۔ اس مینا بازار کے ختم ہوتے ہی ایک مردوں کے

ینا بازار کا انتظام کرائے دیتا ہوں۔ جس میں سب مرد ہی مرد ہوں گے۔ پوچھا کہ ہم زنانہ شو میں کیوں نہیں جا سکتے۔ بولا اس میں سوائے ادشاہ ہند کے کسی کا گذر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے فرمایا کہ کچھ دیر کے لیے ہمیں بادشاہ ہند ہی سمجھ لیا جائے۔ آدمی عقلمند تھا مان گیا ہمارا رزند علی قلی خاں بائیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نابالغ سمجھتا ہے، اپنے ہم جنسوں کی صحبت کی بجائے عورتوں میں اٹھنے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے، ہمارے ساتھ مینا بازار جانے پر مُصر ہوا۔ دیکھا کہ ہر طرف نازنینانِ گل بدن رنگ برنگے ملبوس پہنے چہلیں کرتی ہیں، نہ نگاہیں نیچی ہیں، نہ دوپٹے کا خیال ہے، دیکھ کر آنکھوں میں خون اتر آیا (آج صبح بھی ایک مرتبہ خون اترا تھا) ہمارے بارے میں سب کو علم ہو چکا تھا ہمیں گھیر لیا گیا۔ ہمارے دستخط لیے گئے، ساتھ ساتھ مناسب اشعار لکھنے کو کہا گیا۔ ہم سے طرح طرح کے پریشان کن سوالات پوچھے گئے۔

ارادہ ہوا کہ کچھ زنانہ سامانِ آرائش ایران لے جانے کے لیے خرید یں۔ پھر سوچا ہمارے پہنچتے پہنچتے کہیں فیشن نہ بدل جائے۔

ایک ماہ رو نظر پڑی کہ کچھ سامان لیے جاتی ہے۔ ایک دکان کے سامنے اس نے آواز دی "قلی! قلی!!" کیا دیکھتے ہیں کہ پسرِ ناخلف علی قلی خدا جانے کہاں سے بھاگتا ہوا آیا اور اس کا سامان اٹھا لیا۔

"تم قلی ہو —؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں — بالکل —" علی قلی نے جواب دیا۔

اگرچہ ہم علی قلی کے اس قسم کے قلی بن جانے پر خفا تھے مگر اس کی حسِ مزاح پر حیرت ہوئی۔ کیونکہ ہمارا خاندان اس حس سے بے بہرہ ہے۔ ہم میں خود مذاق برداشت کرنے کی تاب نہیں۔ کچھ دیر بعد جب غلطی کا ازالہ ہوا تو نازنین بے حد محظوظ ہوئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی۔ "آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کوئی خاص کام نہیں" علی قلی نے جواب دیا۔

"مست قلندر صاحب کے عُرس پر ایک سرکس آیا ہوا ہے" وہ بدستور معصومیت سے بولی۔

"میں پہلے شو کے لیے دو نشستیں بک کرا لوں گا اور باہر ٹکٹ گھر کے پاس انتظار کروں گا۔ خدا حافظ! میرے ابا مجھے گھور رہے ہیں" علی قلی بھاگا۔

شام کو ہم اس کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ آئینے کے سامنے کھڑا مونچھیں تراش رہا ہے۔ باز پرس کی تو بولا عرس پر جا رہا ہوں۔ ہم نے پوچھا ٹکٹ کی قیمت کون دے گا۔ اس کے منہ سے نکل گیا، چچا محمد شاہ نے دو سیٹیں بک کرا دی ہیں۔ پوچھا دوسری کس کے لیے ہے تو چپ ہو گیا۔

"نامعقول! ایسے ہجوم میں جا کر خواہ مخواہ سکینڈل کروائے گا" ہم نے گرج کر کہا "کچھ ہماری پوزیشن ہی کا خیال کر—"

"ابا جان میں وعدہ کر چکا ہوں — اس نے ایسے عدم تشددانہ انداز سے کہا کہ ہم لوٹ آئے۔

ہندی کلچر

ہندی کلچر کی بے حد تعریفیں سُنی تھیں۔ چنانچہ دیکھنے کا شوق تھا۔ (حملے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی۔ فرمانبردار خاں کو وقت پر سُوجھتی نہیں) عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا، وہ بولا کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں۔ آپ نے ایگری کلچر سنا ہوگا۔ وہ البتہ مشہور ہے۔ ہم مُصر ہوئے تو

کہنے لگا آپ سُنی سنائی باتوں کا یقین نہ کیجیے۔ ویسے ہمارے ہاں چند ایک باتیں واقعی شہرہ آفاق ہیں۔ ایک تو یہی قدیمی دواخانے جن کے اشتہار آپ چپے چپے پر دیکھتے ہیں۔ دوسرے قدیم روایات جن کے لیے بھیس بدل کر شہر میں چلنا ہوگا۔ چنانچہ ہم دونوں گئے۔ ایک جگہ ایک شخص (جو کہ مدرس تھا) بھینسوں کے آگے بین بجا رہا تھا اور بھینسیں متوجہ نہیں تھیں۔ ایک سیاسی جلسے میں بہت سے حضرات اپنے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے۔ وہیں ایک شخص کہ باغیرت معلوم ہوتا تھا۔ چُلّو میں پانی لیے ناک ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو حکامِ شہر ایک پرندے کو کھینچ کر سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرندہ اُلّو تھا۔ ایک نہایت ضعیف بزرگ قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کر رہے تھے۔ محمد شاہ کے متعلق ہم کہہ نہیں سکتے۔ البتہ ہم از حد محظوظ ہوئے۔

علی قلی کی گستاخی اور ہمارا تحمل

آہستہ آہستہ برخوردار علی قلی اور اس لڑکی کا قصہ مشہور ہوتا جا رہا تھا۔ سوچا کہ اس معاملے کو فوراً ختم کیا جائے۔ چنانچہ اس کے کمرے میں گئے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال گھنگھریالے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولا "ابا جان! معاف فرمائیے دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آنا موجودہ آداب کے خلاف ہے ——"

ہمیں سخت غصہ آیا یہ نئی پود ہمیں آداب سکھائے گی، یہ لڑکا دن بدن بگڑتا جا رہا ہے۔

"ہم تجھے جگالی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں—— جب سے دلّی آیا ہے ہر وقت منہ چلتا رہتا ہے —— کیا ہے تیرے منہ میں ——؟"

"پان کھا رہا ہوں —— کسی نے دیا تھا ——" وہ بولا۔

"یہ کسی کون ہے؟ وہی عُرس والی لڑکی تو نہیں —— ؟ وہ تو بے حد معمولی سی ہے ——" ہم نے فرمایا۔

"ابا جان اس کی ٹھوڑی پر جو خوشنما تل ہے وہ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

"مصیبت تو یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان خوشنما تل پر عاشق ہو کر سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں ——"

"ابا جان محبت بڑی چیز ہے۔" وہ سرد آہ کھینچ کر بولا۔

"تو سپاہی ہے تجھے تلوار اور گھوڑے سے محبت کرنی چاہیئے۔ ہم خود گھوڑوں کو چاہتے ہیں۔ گھوڑے جب پیار کریں تو ساریوں اور زیورات کی فرمائش نہیں کرتے۔"

"ابا جان! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے —— اس سے ——"

"خبردار گستاخی کرتا ہے۔ جانتا نہیں کہ تو نادر شاہ ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر کی اولادِ ناخلف ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ دادا جان کا نام شمشیر تھا، شمشیر شاہ ——"

"ابے گستاخ! شمشیر سے مراد تلوار ہے، سمجھا؟"

"سمجھ گیا —— ابا جان کیا آپ مجھے چار روپے آٹھ آنے دے سکیں گے سرکس کے لیے؟"

ایسے نالائق کو ہم اور کیا کہہ سکتے تھے؟

ہمارا اصلاحات رائج کرنا

مصاحبِ حضوری حقہ بردار خاں معروض ہوا کہ شہنشاہوں کا رواج رہا ہے کہ رعایا کی بہبودی کے لیے حسبِ توفیق اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی چند مفید اصلاحات عمل میں لائیں تاکہ اہلِ ہند ہمیں رہتی دنیا تک یاد کیا کریں۔ ہم حیران ہوئے کیونکہ ہمارے خیال میں ہماری ہر حرکت میں اہلِ ہند کے لیے کوئی نہ کوئی اصلاح پوشیدہ تھی۔ جب دیکھا کہ وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فہرست مرتب فرمائی۔

۱۔ درہ خیبر کو ڈھا کر ہموار کرایا جائے۔ وہاں سے دلی تک دس دس میل کے فاصلے پر عالیشان سرائیں تعمیر کرائی جائیں تاکہ حملہ آوروں کو کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔ سڑک پر جگہ جگہ "خوش آمدید" نصب کیا جائے۔ ساتھ ہی ایک محکمہ کھولا جائے جو دوسرے ملکوں میں نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کو ہند میں آنے کی ترغیب دے۔

۲۔ ستلج اور جمنا کے درمیان ایک وسیع علاقہ خشک اور غیر آباد پڑا ہے۔ اس قطعے کو سیراب کرنے کے لیے ایک عظیم الشان دریا کھدوایا جائے۔

۳۔ ہند کے تاریخی مقامات ملک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کو بڑی قباحت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاج محل آگرے میں ہے۔ غار ہائے الورا، الورا میں تو جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں۔ ان ساری تاریخی عمارات کو منہدم کرا کے دلی میں (کہ مرکزی مقام ہے) دوبارہ تعمیر کرایا جائے تاکہ سب کچھ بیک وقت دیکھا جا سکے۔

۴۔ ہر سال درخت اکھاڑنے کا ہفتہ بڑے زور شور سے منایا جائے۔

۵۔ قطب صاحب کی لاٹھ کا نام تبدیل کر کے اگلے حملہ آور کے آنے تک نادر شاہ کی لاٹھ رکھا جائے تاکہ لوگوں کو حملہ آوروں کے نام بآسانی یاد رہ سکیں، اور تاریخ ہند مرتب کرنے میں آسانی ہو۔

وہ اصلاحات گنانے بیٹھیں جو ہم نے اس مختصر سے قیام میں نافذ کرائیں تو بے شمار ہیں۔ ہمیں یاد بھی نہیں رہیں۔ مثلاً بارہ دری کی جگہ تیرہ دری بھی تعمیر کرائی جائیں۔ جنگل میں منگل ہی نہیں بدھ بھی منایا جائے، وغیرہ وغیرہ۔

محبت اور شادی کے متعلق ہمارے خیالات

ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں لیکن نوجوان بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے وہ شادی کے بعد بھی خوب پچھتاتے تھے۔ ہم کبھی نہیں پچھتائے حالانکہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ برخوردار علی قلی شادی پر تلا بیٹھا ہے تو ارادہ ہوا کہ اسے من مانی کرنے دیں۔ کیا یاد کرے گا۔ لیکن ان ہی دنوں ہم ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہوئے جو ہمارے جیسے بزرگ کی شان کے شایان ہرگز نہ تھی۔ ویسے ہم چھپ کر کسی کی

باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں۔ اس روز نہ جانے کیونکر ہم نے یہ برداشت کیا اور اوٹ سے ان دونوں کی گفتگو سُنی۔

لڑکی نے برخوردار علی قلی کی آمدنی کے متعلق پوچھا۔ علی قلی نے ہمارا حوالہ دیا کہ والدِ بزرگ شہنشاہ ہیں۔ وہ بولی" شہزادوں کی تو خدا کے فضل سے یہاں بھی کوئی کمی نہیں۔ ہر تیسرا نوجوان شہزادہ ہے۔ بلکہ غیر شہزادہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

"ہمارے ملک میں تیل کے چشمے ہیں۔" علی قلی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی باچھیں کھل گئیں۔

"تمھارے کنبے کے متعلق امی پوچھ رہی تھیں تم مغل ہو؟"

"مغل وغیرہ کا پتہ نہیں، ویسے ہم ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر ہوتے ہیں —" علی قلی بولا۔

"بہرحال ہمارے کنبے والے ایران سے تمھارے چال چلن کی تصدیق کرائیں گے۔"

"چال تو میں ابھی چل کر دکھا دیتا ہوں —" علی قلی نے بھولپن سے کہا — "رہ گیا چلن، شادی کے بعد ایران چلو گی تو وہاں دیکھ لینا۔"

"ایران جانا تو ذرا مشکل ہے کیونکہ امی جان مجھے بے حد چاہتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ شہزادہ علی قلی ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لیکر آجایا کرے گا یا یوں ہو کہ آبا جان شہنشاہ محمد شاہ سے مل کر تمھیں کوئی ریاست الاٹ کرا دیں۔"

"تجویز تو یہ بھی اچھی ہے —" وہ ناخلف بولا۔ "لیکن اگر میں ایران چلا گیا تو تم اداس رہا کرو گی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں کافی شہزادوں کا آنا جانا ہے۔"

علی قلی بگڑنے لگا۔ "تم پرسوں شام کس شہزادے کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے گئی تھیں؟"

"وہ تو بھائی جان کے دوست ہیں۔ ان کی پالکی بالکل نئے ماڈل کی ہے، تمھارے ساتھ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ شام کا لباس خراب ہو جاتا ہے۔"

ہم بقیہ گفتگو سُنے بغیر تشریف لے آئے۔

علی قلی کا علاج

ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی بہت زیادہ ماڈرن خیالات کی ہے، بیچارے علی قلی کو وہ تگنی کا ناچ نچائے گی کہ نرا زن مرید بن کر رہ جائے گا۔ ہم نے برخوردار خاں فیلسوف سے ذکر کیا۔ اس نے بڑے پتے کی بات کہی۔ یہی کہ وہ دونوں محض فلرٹ کر رہے ہیں، سنجیدہ کوئی بھی نہیں ہے۔ علی قلی لڑکی سے ہمیشہ شام کو ملتا ہے اور شام کو اس کے سانس میں سے رنگین کی بُو ہوتی ہے جسے وہ الائچی پان سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روز اس کی پوستین سے پوست کی کافی مقدار برآمد ہوئی۔

ہمارا تجربہ ہے کہ غروبِ آفتاب کے بعد قندیلوں کی جھلملاتی روشنی میں سب لڑکیاں حسین معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصاً چند گھونٹ بادۂ رنگیں چڑھا لینے کے بعد۔

ہم نے درویشِ کامل شیخ بوٹا شمبر پوری کا نسخہ نکالا جو انھوں نے محبت اُتارنے کے سلسلے میں بتایا تھا۔ اسے علی قلی پر آزمایا۔ اور تیر بہدف پایا۔ شام ہوتے ہی علی قلی کو کہیں باہر کام پر بھیج دیا جاتا۔ پینا پلانا چھڑوا دیا گیا۔ لڑکی لگاتار علی الصبح اسے دکھائی گئی۔ سورج کی

روشنی میں جب علی قلی نے لڑکی کی اصلی شکل بغیر میک اپ کے دیکھی تو بہت سے رازہائے پنہاں آشکار ہوئے۔ چند ہی دنوں میں ایسا بدلا کہ لڑکی سے کوسوں دور بھاگنے لگا۔ دلّی کا رُخ ہی نہ کرتا تھا بلکہ ایک روز معروض ہوا کہ میں تارک الدنیا بننا چاہتا ہوں، ہم نے اسے منع کر دیا۔

شیخ لوٹا شجر پوری کے بقیہ نسخے بھی ان شاء اللہ استعمال کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہند کے بادشاہ گر

ہند کے دو بادشاہ گر سید برادرز حسین علی خاں اور پتا نہیں کیا علی خاں، تقریباً ہر روز پریس کانفرنس منعقد کرتے اور انواع و اقسام کے بیان دیتے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے ملک کی سیاست پر پورا قابو تھا۔ دونوں بھائی اکثر دورے پر رہتے تھے۔ اس لیے ہماری خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ ایک روز ہم نے بازار میں ایک بورڈ دیکھا جس پر "اصلی شہنشاہی بادشاہ گرانِ مملکتِ ہند" لکھا تھا۔ اوقاتِ ملاقات اور مشورے کی فیس بھی درج تھی۔ ہم نے انہیں اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور انھیں بلا کا چُست و چالاک و چار سو بیس پایا۔ کاش کہ ہم ایسے سمارٹ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جا سکتے۔ محمد شاہ سے کہا کہ ہمیں ایک جوڑی بادشاہ گر درکار ہیں۔ وہ ملتمس ہُوا کہ ان ہی کے دم سے تو دلّی میں رونق ہے۔ لِلّٰہ انھیں چھوڑ جائیے، گداگر البتہ حاضر ہیں۔"

"وہ تو ہم ملتان سے خود لے سکتے ہیں —" ہم نے فرمایا۔

ایک رفیقِ دیرینہ سے ملاقات

چاندنی چوک سے گزر رہے تھے کہ شور و غل سنائی دیا۔ دیکھتے ہیں کہ بہت بڑا جلوس آ رہا ہے، آگے آگے ہاروں سے لدا ہوا ایک شخص ہے کہ شکل اس کی زمانہ ساز خاں سے ملتی ہے، یہ زمانہ ساز خاں ہی تھا ہمیں پہچان گیا۔ معانقہ کیا۔ معلوم ہوا کہ ملک کے بڑے لیڈروں میں سے ہے۔ خدا کی شان کہ یہی زمانہ ساز خاں کبھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا اور بھیڑوں کی اون تراشتا، آج اس شان و شوکت سے نکلتا ہے کہ شہنشاہ دیکھیں تو رشک کریں۔ شام کو ہم نے اسے مدعو کر کے اس کی عزت افزائی فرمائی اور اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ اس کی زندگی قربانیوں کا مرقع رہی ہے۔ ملک اور قوم کی خدمت کر کے اس رتبے کو پہنچا ہے۔

شراب کا دور چلا تو بہت جلد آؤٹ ہو گیا۔ ہمارے دوبارہ استفسار کرنے پر اصلی بھید کھلا۔ اس نے اقبال کیا کہ ایران سے یہاں آ کر بکریوں کی اُون تراشنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پوسٹر چسپاں کرنے پر ملازم ہو گیا۔ ایک روز شومئی قسمت سے کوئی پوسٹر لگاتا ہوا گرفتار کر لیا گیا۔ صاحبِ پوسٹر سے جیل میں تعارف ہوا۔ رہائی کے بعد انہوں نے ایک سیاسی جلسے میں بلایا۔ سٹیج کے قریب دھواں دھار تقریر سننے میں ہمہ تن گوش تھا (جو خاک سمجھ میں نہیں آ رہی تھی)، کہ لاٹھی چارج کی مہیب صدا کانوں میں پڑی۔ گھڑی بھر میں افراتفری مچ گئی۔ چنانچہ مخالف سمت میں جست لگائی اور اتفاقاً سٹیج پر اپنے تئیں کھڑا پایا۔ گرفتاری شروع ہوئی تو غلطی سے لیڈروں کے ساتھ دھر لیا گیا۔ جیل میں سیاسی قیدیوں والا سلوک ہوا جو کہ نہایت تسلی بخش تھا۔ رہائی ہوئی تو پبلک نے جھنڈوں، بینڈ باجوں، نعروں اور آتشبازی سے استقبال کیا۔ شہر بھر میں جلوس نکلا۔ گھر پہنچا تو بالکل جی نہ لگتا تھا، اگلے ہفتے سیاسی جلسے میں دانستہ طور پر سٹیج کے قریب رہا۔ لاٹھی چارج ہوتے ہی فوراً لیڈروں میں گھس گیا تاکہ گرفتاری کے وقت آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ بڑے گھر میں قیام و طعام کا انتظام گھر سے

لاکھ درجے بہتر تھا۔ چنانچہ تقریباً ہر ماہ یہی تماشہ ہوتا۔ پبلک بھی اسے بار بار دیکھ کر نوٹس لینے لگی۔ اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ آہستہ آہستہ وہ کچھ لیڈر سا بنتا جا رہا ہے۔ اب اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا۔ کتابوں سے تقریریں نقل کرنے لگا۔ آئینے کے سامنے مشق شروع کر دی۔ خدا نے دن پھیرے اور وہ لیڈروں میں شمار ہونے لگا۔

ہم نے یہ سُنا تو رشک و حسد کے جذبات محسوس فرمائے۔ پھر سوچا کہ موجودہ پوزیشن بھی کوئی خاص بُری نہیں ہے۔ زمانہ ساز خاں معروض ہوا کہ برخوردار علی قلی خاں کچھ کچھ پرولتاری سا معلوم ہوتا ہے، کیوں نہ اس کو اسی لائن پر ڈال دیں۔" ہم نے فرمایا کہ علی قلی خاں روپے پیسے والا ہے۔ یہ تو جب چاہے لیڈر بن سکتا ہے۔ وہ ملتمس ہوا کہ یہ بھی درست ہے۔ لیکن فی زمانہ لیڈری افضل ترین پیشہ ہے۔ ہم نے بات کاٹی اور فرمایا کہ نہیں لیڈری نمبر دو ہے اور پیری مریدی نمبر ایک۔

ہمارا مقامی سیاست میں حصّہ لینا

ان دنوں الیکشن زوروں پر تھی۔ اُلّو شناس معروض ہوا کہ ہم دلّی میں اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ کسی ٹکٹ پہ کھڑے ہو جائیں، ان شاءاللہ کامیاب ہوں گے۔ بادشاہ گردوں سے مشورہ لینا بیکار تھا۔ کیونکہ الیکشن کے معاملے میں وہ بالکل یوں ہی تھے۔ ایک ایک ٹکٹ پر لاتعداد امیدواروں کو نامزد کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات امیدواروں کی تعداد رائے دہندگان سے زیادہ ہو جاتی۔ لطف یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں محمد شاہ بھی تھا۔ فرمانبردار خاں نے حسبِ معمول نہایت مایوس کن خبریں سُنائیں۔ جب ہم نے اس کو بُرا بھلا کہا تو وہ بھی مان گیا کہ واقعی ہم شہر میں بے حد ہردلعزیز ہیں، اور الیکشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ شخص آہستہ آہستہ ہمارے مزاج سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔

سات امیدواروں سے دو کو زرِ کثیر تحفتاً دے کر بٹھایا گیا، تیسرے کو ڈرا دھمکا کر علیحدہ کیا، چوتھے کو سفیر بنا کر باہر بھجوانا پڑا دو کمال درجہ ضدی نکلے، ایک کو زدوکوب کرایا تو مانا، دوسرے نے مشکوک حالات میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ رائے شماری شروع ہوئی حقّہ بردار خاں نے شہر بھر کی دعوت کی۔ لوگوں کو تحفے اور زرِ نقد دیا۔ رائے دینے والوں کو طرح طرح سے خوش کیا۔ اتنی خاطر تواضع کے بعد بھی کوئی بدتمیز نہ مانتا تو اسے ڈنڈے کے زور سے منوایا جاتا کہ ہم سچ مچ ہردلعزیز ہیں۔ ہم جیت تو گئے لیکن اخراجات کی تفصیل دیکھی تو از حد پشیمان ہوئے، افسوس بھی ہوا کہ ناحق ذرا سی خوش وقتی کی خاطر اتنا روپیہ اور وقت برباد کیا۔ معلوم ہوا کہ ہند میں ہر صاحبِ دولت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ الیکشن لڑے۔ سیاسی معاملات میں یہ لوگ سنجیدہ بالکل نہیں ہوتے۔ نتیجے سے زیادہ وقتی ہنگامے کی پروا کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔

ملک ملک کا رواج ہے صاحب۔

دلّی میں سٹیل ہونے کا ارادہ

اُلّو شناس نے مشورہ دیا کہ دنیا میں یوں مارے مارے پھرنے کی بجائے کیوں نہ ہم ایک اچھی سی مملکت میں باقاعدہ سٹیل ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حیثیت مانند ایک رفیوجی کے رہی ہے۔ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا اور رہائش کے لیے لال قلعہ

الاٹ کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بولا لال قلعے میں تو ہم رہتے ہیں۔ آپ قطب صاحب کی لاٹھ الاٹ کرا لیجیے یا شاہی مسجد۔

ہم نے انکار فرمایا اور اپنے مہاجر ہونے کی اہمیت جتائی، وہ بولا، ہم لوگ بھی تو مہاجر ہیں۔ ہمارے آبا ؤ اجداد وسط ایشیا سے آئے تھے۔ ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ وہ مقامی مہاجر ہیں اور ہم نو وارد ہیں جنھیں اب تک نہیں بسایا گیا۔ اس نے گستاخانہ کہا، یوں تو حضرت آدم بھی مہاجر تھے کہ بہشت چھوڑ کر آئے تھے۔

ہمیں سخت غصہ آیا لیکن فوراً اتر گیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے، ہند میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ پہلے جیسا غصہ ہی نہیں آتا لیکن محمد شاہ کو اس گستاخی کی سزا اسی شام کو مل گئی۔ آلوشناس بھاگا بھاگا آیا، بولا محمد شاہ خزانے میں ہے اور زر و جواہرات ادھر ادھر چھپا رہا ہے۔ ہم فوراً موقع پر پہنچے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک وزنی سی چیز اپنی پگڑی میں چھپالی۔ ہند کے رواج کے مطابق ہم نے ازراہِ مروت فرمایا کہ آج سے محمد شاہ اور ہم بھائی بھائی ہیں۔ لٰہذا ہم دونوں اپنی پگڑیاں بدلیں گے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی پگڑی سے کوہِ نور ہیرا برآمد ہوا۔

ہندی وزرا سے شکر رنجی

آلوشناس اور محمد شاہ کے وزرا کی ناچاقی کی وجہ دو کروڑ کی وہ رقم تھی جو شاہی ایلچی ہمارے لیے کرنال میں لے کر آیا تھا۔ وزرا کا اصرار تھا کہ رقم ادا ہو چکی ہے۔ آلوشناس انکار کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رقم دو کروڑ نہیں ڈھائی کروڑ تھی۔ ایلچی اسی کش مکش میں اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ ہم نے محمد شاہ سے فرمایا کہ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ لٰہذا شاہی خزانے سے رقم چکا دی جائے۔ رقم ادا کر دی گئی لیکن شکر رنجی نہ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ اپنے وزیروں سے ڈرتا ہے۔ بولا "اہلِ دربار کی التجا ہے کہ اس مرتبہ آپ سے رسید لکھوائی جائے ہم مان گئے۔ ڈھائی کروڑ کی رسید تیار کی گئی۔ ہم نے دستخط شروع کیے، ابھی چوتھی مرتبہ ہی ابنِ شمشیر لکھا ہو گا کہ وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ کاغذ چھوٹا ہے۔ دستخط مختصر ہونے چاہئیں۔ عزیزی محمد شاہ کے دستخط تو بے حد مختصر ہیں۔ اس نے شکستہ حروف میں محض "ایم ایس رنگیلا" لکھا۔

اب کمبخت محرر کہیں سے آمرا۔ معروض ہوا کہ محاسبِ اعلیٰ کے اعتراض سے بچنے کے لیے رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ چسپاں کیا جائے۔ ٹکٹ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ غلط ٹکٹ تھا، محکمہ مال کا ٹکٹ ہونا چاہیئے۔ پھر کسی نے کہا کہ ایک آنے کا نہیں دو آنے کا ٹکٹ لگے گا۔ مجبوراً اپنی جیب سے دو آنے دئیے۔ اس دفتری کارروائی سے طبیعت بدمزہ سی ہو گئی، اور ساڑھے چار کروڑ کا لطف نہ آیا۔

" ایسے لاجواب وزیر تم نے کہاں سے حاصل کیے؟" ہم نے پوچھا۔

"وزیرستان سے!" وہ بولا۔

" اور یہ وزیر آباد کیا ہے؟"

" یہ یونہی ہے۔"

ایک باکمال بزرگ

قطب الدین خاں جاگیردار کی شادی پر گئے۔ دُولھا کی عجب درگت بنی۔ عورتیں پہلے تو اسے بُرا بھلا کہتی رہیں۔ پھر زدوکوب

کرنے لگیں اور وہ تھا کہ چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سوچا کہ اَن بن ہو گئی ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ شادی کی رسمیں ادا ہو رہی ہیں۔ لاحول پڑھی۔

نکاح سے قبل ہم نے دولہا سے دریافت کیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تاکہ پوری کروا دی جائے۔ وہیں ایک لنگوٹی پوش بزرگ کو دیکھا کہ لمبا سا عصا ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھے ہیں۔ کسی کو علم نہ تھا کہ یہ رہتے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ لیکن کہیں شادی ہو تو ضرور آتے ہیں۔ نکاح شروع ہوا تو ذرا قریب آ گئے۔ جب دولہا نے "قبول کیا" کہا تو بزرگ نے ڈنڈا اچھال کر "پھنس گیا" کا نعرہ لگایا اور غائب ہو گئے۔ ہر شادی میں وہ اسی طرح کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ ہند میں ایسے ایسے باکمال بزرگ بھی موجود ہیں۔

مینا بازاروں کی بھرمار

اب تو مینا بازار ہر ہفتے ہوتا۔ ملک کے مختلف حصوں سے خواتین آرائشی سامان خریدنے کے بہانے آتیں، اپنی دختران وغیرہ کو بھی ساتھ لاتیں۔ نہ جانے کس نے اڑا دی تھی کہ یا تو خدانخواستہ ہم ایک اور شادی کریں گے یا برخوردار علی قلی خاں منگنی کرائے گا۔

لیکن ہم خواتین سے دور ہی رہتے۔ برخوردار علی قلی کو بھی دور دور رکھتے۔ ہم شادی بیاہ کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔

خواتین سے دور رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ ان کے قریب رہ کر ہمیں دیدے مٹکانے، ہاتھ نچانے اور انگلی سے ناک چھو کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دورانِ گفتگو میں ہمارے منہ سے غیر شعوری طور پہ اُف، اوئی، اللہ توبہ، ہائے، نگوڑہ وغیرہ جیسے کلمات بھی نکل جاتے، جس سے بعد میں سخت پشیمانی ہوتی۔ ہم زیورات، کپڑوں اور ساس بہو کے قضیوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ ذرا ذرا سی باتوں پہ جھنجھلا اٹھتے، بات بات پہ لڑنے کو تیار ہو جاتے۔ چنانچہ جب کسی خاتون نے مینا بازار میں ہم سے حملہ آوری کی وجہ پوچھی تو ہم نے پہلے تو بھرے بازار میں اسے کوسنے دیئے کہ اگر ہم نہ آتے تو کوئی اور آ جاتا۔ پھر فائل منگا کر وہ تمام کانفیڈنشل خطوط دکھائے جو ہندی امراء نے وقتاً فوقتاً ہمیں لکھے تھے اور ہمیں حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ہماری حملہ آوری کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے جو فرمانبردار خاں کو یاد نہ رہی۔

جنوبی ہند سے وفد

جنوبی ہند سے وفد برائے نادر یار جنگ بہادر آیا۔ ہم بہادر ضرور ہیں۔ جنگ کا بھی شوق ہے لیکن یار وغیرہ کسی کے نہیں ہیں۔ انھیں گلہ تھا کہ خیبر سے آنے والے حملہ آور دلّی تک آتے ہیں اور وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ جنوب کو بھولے سے بھی نہیں نوازتے۔ ہم چونکہ سیشل ہونے کے اہم مسئلے پہ غور فرما رہے تھے اس لیے معذوری ظاہر کی۔ انھوں نے التجا کی کہ شبیہ مبارک کی ایک تصویر ہی عنایت فرمائی جائے تاکہ کیلنڈروں، جنتریوں میں چھپوا سکیں۔ ہندی بادشاہ تصویر اترواتے وقت ہاتھ میں ایک پھول پکڑ کر سونگھتے ہیں۔ ہم نے جدت پیدا کی اور دونوں ہاتھوں میں دو پھول پکڑ کر سونگھے۔

ایک ترقی یافتہ خاتون

ہمارا اور محمد شاہ کے دربار کی ایک ترقی یافتہ خاتون کا قصہ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ یہ بیان بالکل بے بنیاد ہے۔

کہ ہمیں اس سے لگاؤ تھا۔ دراصل ہمیں تمباکو، شراب، محبت و دیگر منشیات سے بچپن سے نفرت رہی ہے ـــــ خاتون موصوف کو گانے بجانے کا شوق تھا اور ہمیں گانے بجانے سے شغف ہو چلا تھا۔ دربار میں اس نے، "نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی" والی رباعی کچھ ایسے انداز سے گائی کہ یار لوگوں کو شبہ ہوا اور افواہیں اڑنے لگیں۔ شروع شروع میں تو ہمارا خیال اس کی جانب رہا۔ لیکن پھر آلو شناس کے سمجھانے پر سنبھل گئے۔ اس نے بتایا کہ بالائی طبقے میں لڑکیوں کا ایک مدرسۂ فکر ایسا بھی ہے جو چہلیں تو کرتی ہیں نوجوانوں سے اور شادی کرتی ہیں بوڑھے امیروں سے، خواہ ان کی پہلی بیویوں کی تعداد کتنی ہی ہو۔ کبھی کبھار بوڑھے کے پروگرام میں شریک ہو گئیں۔ لیکن زیادہ وقت کزنوں کے ساتھ گزارا۔

ایسا کرنے میں وہ اپنے آپ کو اس لیے حق بجانب سمجھتی ہیں کہ نوجوانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے اور بوڑھوں کے پاس ہے اور باقی چیزیں آنی جانی ہیں۔

ایک روز ہم چڑ گئے، اس نے ایک غزل گائی جس کے شروع کے بول تھے ؎

ساٹھویں سال میں قدم آیا　　زلفِ مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی　　غمزہ و ناز و دل ستانی کی

یہاں ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں۔ ہم ساٹھ کے نہ تھے مگر سمجھ گئے کہ وار ہم پر ہوا ہے۔ دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے رہے لیکن قطعی رائے قائم نہ کر سکے۔ فرمانبردار خاں سے اپنی شکل و صورت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے حسبِ معمول نہایت گستاخ و مایوس کن جملے کہے۔ طیش میں آکر اسے دُرّے لگوانے کا قصد کیا۔ پھر خیال آیا کہ فرمانبردار خاں تو پہلے سے ہی دُرّانی ہے۔ چنانچہ اسے معاف کیا اور آلو شناس کو بلایا۔ وہ نمک خوار دست بدستہ معروض ہوا کہ روئے پُرنور پر وہ پُرہیبت جلال طاری ہے کہ نگاہیں اوپر نہیں اٹھتیں لہٰذا شکل و صورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے بھی ہماری تسلی نہ ہوئی۔

پھر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے معاملے میں مسز محمد شاہ کا ہاتھ ہے۔ محمد شاہ خود ترقی پسند ہے۔ لہٰذا خاتون موصوف میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے۔ عورتوں کا حسد مشہور ہے۔ مسز محمد شاہ ہمیں اس عمر میں بے وقوف بنانا چاہتی ہیں کہ ہم اس طرار حسینہ کو اپنے ہمراہ ایران لے جائیں۔ ہم بھانپ گئے اور اس سے دور دور رہنے لگے۔ خاتون مذکور ہماری بے اعتنائی سے چراغ پا ہو گئی اور ایک جلسے میں ہمارے رجعت پسند ہونے کا اعلان کر کے ہم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا۔

خیر، رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت!

جامعۂ فرقانی

آج صبح مُلّا فرقان اللہ بن برہان اللہ کہ مقامی جامعہ فرقانی کا صدر ہے آستان بوسی کے لیے حاضر ہوا اور ملتمس ہوا کہ جامعہ ہم کو ایک اعزازی سند دے کر عزت افزائی داہی کرنا چاہتا ہے۔

جامعہ میں پورا کورس چھ برس کا ہے۔ بعض فارغ البال اور نیک نفس والدین کے بچے یہ کورس بارہ سال میں کرتے ہیں۔ ان طلباء کو خلیفے کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی بچہ کورس کے اختتام سے پہلے بھاگ جائے تو اس کو صرف علامہ کی سند ملتی ہے۔ کورس پورا کر لے

تو علامۃ الدہر کہلاتا ہے۔ دوسری سندیں مثلاً ابوالبرکات، ابوالغفال، ابوالفضیلت عموماً سرکاری حکاموں، جامعہ کے معلمین کے دوستوں اور ہمارے جیسے سیاحوں، تاجروں اور حملہ آوروں کے لیے وقف ہیں۔ عزیزی محمد شاہ دو مرتبہ ابوالبرکات ہے اور تین مرتبہ ابوالفضیلت۔

جامعہ ہر سال چار سو علامۃ الدہر بناتا ہے جو عموماً بیس پچیس روپے ماہوار کے منشی یا کسی تاجر کے منیم بن جاتے ہیں۔ منشی بننے کے کوئی چار پانچ مہینے کے بعد ان کے والدین کو شادی کی (اپنے ہونہار فرزند کی، اپنی نہیں) فکر پڑ جاتی ہے۔ شادی کرتے وقت شکل و صورت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی (کیونکہ اس ملک میں شکل و صورت نہیں ہوتی)، صرف روپے پیسے کا خیال رکھا جاتا ہے عجیب تماشہ ہے کہ شادی میں لڑکے دُلہن کے علاوہ ایک کثیر رقم کی بھی توقع رکھتے ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ سسرال والے انھیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سمندر پار بھیج دیں تاکہ وہ خوب دادِ عیش دے سکیں۔ ہمارے خیال میں یہ انتہا درجے کی کم ہمتی ہے تبھی اس ملک میں بے چاری لڑکیوں کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوتی جو لڑکوں کی ہوتی ہے۔

جامعہ میں ہماری تقریر

اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خواہ مخواہ تقریر کرنی پڑی۔ حالانکہ نہ ہمیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار تھے۔ پہلے مُلّا فرتان اللہ بن برہان اللہ نے ہماری ذات کا تعارف یوں کرایا:۔

”حضرات! ایسا روزِ سعید جامعہ کی زندگی میں آیا ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ صاحب کی ذاتِ والا صفات کا نزول ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا تعارف محتاجِ بیان نہیں۔ آپ نے جس سلسلے میں دلّی تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے وہ اب واضح ہو چکا ہے۔ سُنا ہے کہ جناب خاں صاحب بین الاقوامی سطح پر ایرانی اور ہندوستانی روپے کی قیمت چکا لے آئے ہیں۔ آپ کی علمیت شبیہ مبارک سے ظاہر ہے۔ آغا صاحب پہلوی زبان کے ہر پہلو سے ماہر ہیں، شہنشاہی سے پہلے آپ کا شغل ——— خیر جانے دیجیے ——— ان کی تقریر کو خاموشی سے سنا جائے کیونکہ آپ شہنشاہ ہیں اور آپ کو اپنی پھوپھی صاحبہ مدظلّہا سے بھی ملاقات مقصود تھی جو اتفاق سے اس ملک میں مقیم نہیں ہیں۔ لیکن ہماری شامتِ اعمال ——— معاف کیجیے ——— اچھا تو حضرات ——— مولانا اور نادر شاہ صاحب ———“

ہم کو اس بدتمیز مُلّا پہ سخت غصّہ آیا کہ ہمارے تئیں کبھی آغا کہتا ہے تو کبھی مولانا، ایک بات پر قائم نہیں رہتا۔ یہ شخص دانستہ طور پہ ہمارا تمسخر اڑاتا ہے۔ اچھا اسے سمجھیں گے۔ ہم تالیوں کے شور میں اٹھے اور فرمایا:

”پیارے اطفال، معلمین حضرات و پرنسپل مُلّا ایف اللہ! آپ نے ہم کو یہاں مدعو کرکے جامعہ کی جو عزت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم آپ سب کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ آپ کو یہ موقعے روز روز کہاں میسر ہوتے ہیں کہ ہم سا شہنشاہ آپ کو اپنی خوش کلامی سے مستفیض کرے۔ اول تو ہمیں آپ حضرات کی زبوں صحت پر تعجب ہوتا ہے۔ رونا بھی آتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں۔ بخدا ہمیں ڈیڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں۔ پرسوں دربار میں کوئی کاریگر بیس گز ڈھاکے کی ململ ایک انگوٹھی میں سے گزار رہا تھا۔ دوسری طرف سے کپڑے کو جھٹکے سے کھینچا گیا تو کاریگر خود بھی انگوٹھی میں سے گزر گیا۔ اس قدر دھان پان انسان ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ یہ آپ کی غذا کا قصور ہے یا آب و ہوا کا۔ آپ کے چہروں پہ کچھ ایسا جمود اور بے حسی ہر وقت رہتی ہے جیسے آپ ہر چیز سے مطمئن ہیں۔ آپ جی کیا رہے ہیں زندگی پر احسان کر رہے ہیں۔ آپ کے قبرستانوں میں کتبے تک غلط ہیں۔ (ہم نے بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا) مثلاً:۔

شیخ خدا بخش مرحوم
فلاں سنہ میں پیدا ہوئے
ساٹھ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

یہ غلط ہے اس کی جگہ یوں ہونا چاہیئے :
شیخ خدا بخش مرحوم
فلاں سنہ میں پیدا ہوئے
پچیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا
ساٹھ برس کی عمر میں دفن ہوئے۔

حضرات و اطفال! ہم ایران سے بڑی بڑی امیدیں لے کر چلے تھے۔ خیال تھا کہ دشمن کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے، کابل میں آئے تو سوچا انھیں زد و کوب کریں گے۔ خیبر پہنچے تو ارادہ ہوا کہ ان سے کشتی لڑیں گے لیکن یہاں کی آب و ہوا کو اس درجہ سکون پرور اور باشندوں کو اس حد تک بااخلاق، وضعدار، نحیف و نزار پایا کہ دن پر قیلولہ کرنے اور یار لوگوں سے گپیں اڑانے کا شغل اختیار کر لیا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا کا اثر نہایت صلح جویانہ ہے۔ یہ خون کو بھی ٹھنڈا کرتی ہے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ دشمن نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔ مفت کی لڑائی بھڑائی سے آخر فائدہ؟ سنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہند کی آب و ہوا اور بھی گئی گزری ہے لیکن ہم اور آگے نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں آپ کی روایات پر۔ آپ کی قومی روایات بے حد شاندار ہیں۔ آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا۔ کئی سو سال سے آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے حکومت کروانا اور تو اور آپ نے خاندانِ غلاماں سے بھی حکومت کروائی ہے اور وسعتِ قلب کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کو ایک دوسرے کی نقل کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ یعنی آپ بھیڑ چال چلتے ہیں۔ (یہاں ہم سٹیج سے نیچے اترے اور بھیڑ چال چل کر دکھائی)

آپ کے ادب و موسیقی کے چرچے ہم نے پہاڑ کے اس پار سُنے تھے۔ آپ کے ہاں تقریباً ہر شخص شعر کہتا ہے اور تخلص کرتا ہے۔ یہ آب و ہوا اور یہ صحت، جیسی کہ آپ کی ہے۔ شعر و شاعری کے لیے نہایت سازگار ہے۔ آپ کی موسیقی کے کیا کہنے، پچھلے ہفتے لال قلعے میں چار پانچ آدمیوں کو قوالی کرتے سُنا۔ وہ لوگ خوب سر دُھنتے اور وجد میں آ کر تالیاں بجاتے۔ یہ لوگ بے حد دانا ہیں۔ گاتے وقت ایک کان پہ ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ غالباً دوسرے کان سے جسے کھلا چھوڑتے ہیں ضرور بہرے ہو جاتے ہوں گے۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا منہ چڑاتا ہے، ہماری طرف عجیب و غریب اشارے کرتا تھا۔ ہمیں غیظ و غضب آیا ہی چاہتا تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ پکے راگ گاتا ہے۔ سنا ہے کہ آپ کے ہاں ہر وقت کا راگ جُدا جُدا ہوتا ہے۔ آپ کی موسیقی کا مطالعہ فرما کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں صبح صبح ہر شخص بیزار ہوتا ہے۔ غالباً رات کو آپ زیادہ نشہ کر جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ ہوا کہ علی الصبح مسرور اٹھے لیکن وقت کے راگ نے غمگین کر دیا۔ رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے راگ سے متاثر ہو کر رنگ رلیاں شروع کر دیں۔

حضرات جب ہم پشاور سے آگے آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سکندر یونانی کے زمانے میں یہاں بہت بڑا جنگل تھا مبارک ہو کہ آپ نے بیشتر جنگلات کو صاف کر دیا ہے۔ آپ کے نزدیک درخت کا صحیح مصرف اس کو کاٹ ڈالنا ہے۔ ہم نے گاؤں میں بچوں کو چھوٹی چھوٹی

کلہاڑیاں لیے تفریحاً درخت کاٹتے دیکھا ہے ——"

ہماری تقریر جو کہ بے ربط تھی۔ مُلّا فرقان اللہ کی گستاخی کا صحیح جواب تھی۔ ہم دیر تک بولتے رہے، ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے اور کیا کچھ کہا۔ اچانک چند بدتمیز طلباء کی جمائیوں اور خراٹوں نے ہمیں چونکا دیا اور ہم بیٹھ گئے۔

سوالات اور جوابات

مُلّا فرقان نے اٹھ کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا" نادر شاہ سے سوال پوچھے جائیں تو آپ ان کا مناسب جواب دیں گے ——"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک کونے میں کھسر پھسر ہونے لگی" کیا آپ ملوکیت پسند ہیں ؟" پوچھا گیا۔

" ہم طوائف الملوکیت پسند ہیں ——" ہم نے جواب دیا۔

" تو گویا آپ شہنشاہ پسند ہوئے ——" کسی اور نے پوچھا۔

" شہنشاہ پسند ؟" ہم نے مُسکرا کر کہا" ہم خود شہنشاہ ہیں"

" کیا آپ کے خیال میں شہنشاہی بیکار سی چیز نہیں —— خصوصاً جب ہم سب کے سب ایک جیسے ہیں" ایک برخوردار بولے۔

" ہاں !" ہم نے فرمایا" جسمانی لحاظ سے تو ایک جیسے ہیں لیکن اوپر والی منزل میں (ہم نے اپنے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا) فرق ہوتا ہے"

" صاف صاف بتائیے قبلہ آپ دائیں جانب ہیں یا بائیں جانب ——"

یہ سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے (مقرر کو ہمیشہ مسکراتے رہنا چاہیے) جواب دیا" ہم شہباز خاں اُلّو شناس کی بائیں جانب ہیں اور مُلّا فرقان اللہ کی دائیں جانب ——"

" کیا آپ ایران سے آئے ہیں —— ؟"

ایسے آسان سوال پر ہم بڑے خوش ہوئے" ہاں ہاں برخوردار ! اور کیا تم ہندوستان میں رہتے ہو ؟"

" شہنشاہی سے پہلے آپ کا ذریعہ معاش کیا تھا —— ؟ ایک طرف سے آواز آئی۔

اگرچہ ہم نے کافی صبر و تحمل دکھایا تھا لیکن اس سوال نے ہمیں سیخ پا کر دیا۔ ہماری آنکھوں میں خون اترنا شروع ہوا۔ میز پر ہمارا مکّا اتنے زور سے پڑا کہ میز ٹوٹ گئی۔ منہ کا جھاگ مُلّا فرقان اللہ پر گرا جس نے جست لگائی اور دوسری میز پر چڑھ گیا۔ ہڑبونگ سی مچ گئی۔ لوگ اپنی پگڑیاں چھوڑ چھوڑ بھاگنے لگے۔

نوازنا مُلّا فرقان اللہ کو

ہمیں یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ سب اُسی ملا کی شرارت ہے۔ پہلے ہمیں خفا کر کے ایسی جلی بھنی تقریر کروانا۔ پھر سوال پوچھنے کا شوشہ جان بوجھ کر چھوڑنا۔ اگلے روز ہم نے اس کی ذاتی حالت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ پتہ چلا کہ مُلّائی کا ڈھونگ ہے، خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کہا کہ اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد آدمی

بھیج کر پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہی ہاتھی کے خور و نوش پر نصف سے زائد اثاثہ نیلام ہو چکا ہے۔ ہم نے دوبارہ دربار میں بلوا کر عزت افزائی کے بہانے ایک اور ہاتھی (جو سفید تھا) مرحمت فرمایا۔ ہفتے عشرے کے انتظار کے بعد خبر ملی کہ ملّا فرقان اللہ نے خودکشی کر لی اور کیفرِ کردار کو پہنچا۔ ہمارے ساتھ کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

اہلِ ہند کو گستاخیوں کا صلہ

ہم نے وہ تقریر کیا کی کہ مصیبت ہی مول لے لی۔ دنیا میں سچ بولنا بھی جرم ہے۔ ذرا سی تنقید بھی ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی۔ احتجاج ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، پوسٹر لگ رہے ہیں۔ آج تو اہلِ ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی۔ گذشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعوتوں میں جاگ کر گزارنا پڑیں۔ چنانچہ طبیعت کچھ گراں ہو گئی۔ شاہی حکیم معائنہ کرنے آئے۔ اتنے میں نہ جانے کس احمق نے شہر میں یہ افواہ اڑا دی کہ نعوذ باللہ ہم اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا بلکہ اسی سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقراء کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں۔ اس کی شہادت یوں ہوئی کہ شہباز خاں آتش شناس کو جو اس وقت جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا، فقیر سمجھ کر کچھ جلیبیاں دی گئیں جنھیں وہ بارگاہِ دولت میں لے کر حاضر ہوا۔ ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پا کر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا۔

ہم دو ہزار ایرانی سپاہی لال قلعے میں رکھا کرتے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آ سکیں۔ مفسدوں نے ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ ہم انھیں ہر شام مقفل کر دیتے ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان سپاہیوں کو قلعے کے اندر چھیڑا گیا۔ ہمارے کچھ سپاہی چاندنی چوک سے گزر رہے تھے ان پر آوازے کسے گئے اور ٹماٹر، شلجم وغیرہ پھینکے گئے۔ ایسی کئی واردات کی اطلاع ہمیں ملی، ہم اسپ نمرود (یہ خطاب ہمارا دیا ہوا تھا) پر سوار ہو کر شہر میں گئے تاکہ رعایا کو شرفِ دیدار بخش کر ان کی غلط فہمی دور کرا دیں۔ اب یہ مشہور ہو گیا کہ اصلی نادر شاہ تو بہشت کو سدھار چکے ہیں۔ یہ کوئی اور شخص ہے جو بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہم تختِ طاؤس پر بیٹھے تھے کہ دور سے "نادر شاہ مردہ باد" کے نعرے سنائی دیئے۔ اسی وقت غیظ و غضب میں تخت سے چھلانگ لگا کر اپنے دو ہزار سپاہیوں کو کھولا اور تلوار کھینچ کر حکم دیا کہ تلوار کے دستوں سے لاٹھی چارج کرو۔ یہ تھا وہ 'قتلِ عام' ـــ ہم چاہتے تو باقاعدہ تلواریں استعمال کرا سکتے تھے۔ گرمی سخت تھی ہم قمیص اتار کر موتی مسجد میں حوض کے کنارے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے۔

قتلِ عام

چنانچہ صاحب قتلِ عام شروع ہوا، ہمارے سپاہیوں نے فقط اہلِ شہر کو زد و کوب کیا تھا۔ اس کے باوجود لاتعداد لوگوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز ایک بزرگ آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور دردناک لہجے میں گویا ہوئے ـــ کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی ـــ

یہ شعر ہم نے پہلے سُن رکھا تھا، چنانچہ ہم نے مسکرا کر دوسرا مصرع ـــ مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی ـــ سنا کر ظاہر کر دیا کہ ہمیں پرانی فرسودہ شاعری زیادہ متاثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں شاعری کی جدید قدروں کا قدردان پا کر انھوں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر ایک آزاد نظم پڑھی جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ سوائے ایک مصرعے کے جس میں ہمیں تلوار نیام میں ڈالنے کو کہا گیا تھا۔ رات بھر

اُگتے رہے تھے۔ گرمی زیادہ تھی، ہمارا دل لپک اٹھا بغلگیر ہونے کی نیت سے آگے بڑھے کہ بزرگ جلدی سے آداب بجا کر چپت ـنے۔ خیر، اب تلوار میان میں ڈالنے کی کوشش جو کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاتھ میں تو شہباز خاں کی تلوار تھی، ہماری تلوار تو پہلے ہی میان میں تھی، گویا کہ سارا قتلِ عام ہی غلط ہوا تھا۔ ہم نے فوراً منادی کرا دی کہ پہلے قتلِ عام غلط ہوا ہے بلکہ ہوا ہی نہیں کیونکہ تلوار میان سے ذرا نہیں نکلی۔ چنانچہ اس مرتبہ دوسرا صحیح قتلِ عام شروع ہوا جو کافی کامیاب رہا۔ دراصل فریقین کو کافی ریہرسل مل چکی تھی۔ ہلے ارادہ تھا کہ اس کے بعد ایک مختصر سا قتلِ خاص بھی کرائیں جو امراء کے لیے ہو۔ پھر سوچا اہلِ دلّی اس قسم کے تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ تیمور کا قتلِ عام تین دن تک ہوتا رہا تھا بھلا ہمیں یہ کب خاطر میں لائیں گے۔

شام کو وہی بزرگ آئے، ایک اور آزاد نظم سنائی (جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی) اور معافی کے خواستگار ہوئے، ہم بھی مسجد ں اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک چکے تھے، مسکرا کر معاف فرمایا اور ازراہِ تلطّف انھیں بغلگیری سے سرفراز فرمایا، وہ فوراً بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو پسلیوں میں درد کی شکایت کرتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں، شاید ہماری بغل گیری کا نتیجہ ہو۔ آئندہ محتاط ہیں گے ان شاء اللہ باری تعالیٰ کارساز ہے۔

ہم پر کمبل ڈلوانے کی کوشش

شام کو دریائے جمنا کے کنارے مچھلی پکڑنے کی نیت سے بیٹھے تھے، مچھلیاں تھیں کہ جلالِ شاہی سے قریب نہ پھٹکتی تھیں۔ اندھیرا ہو چلا تھا، اچانک ہم نے اپنے اوپر کمبل کا دباؤ محسوس فرمایا، سوچا کہ کوئی ہمارا پرستار ہے جو خنکی کا خیال کرتے ہوئے گرم کپڑا لایا ہے، چنانچہ خاموش بیٹھے رہے۔ لیکن ہمیں بالکل ڈھانپ دیا گیا۔ ہمارا دم گھٹنے لگا۔ گستاخ آوازیں سنیں تو معلوم ہوا کہ کوئی شرارت ہے، ہڑبڑا کر اٹھے۔ دونوں لفنگوں کو بغلوں میں دبایا ہی تھا کہ انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر سعادتِ دارین پائی۔ نیا ملک ہے، خبردار رہنا چاہیئے۔

واپسی کا قصد

ایک کباڑیے کی دکان پر پوستین دیکھی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے (فرمانبردار خاں کی آنکھوں میں) ہم کبھی پوستین کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنے چوڑی دار پاجامے اور جالی دار کرتے کو۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پوستین ہماری ہی تھی، اس قدر تنگ ہو چکی تھی کہ کوشش کرنے کے باوجود نہ پہن سکے۔ پہلے سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ دن بھر طرح طرح کے خیالات دل میں آتے رہے دلّی کے قیام نے ہمیں کتنا تبدیل کر دیا ہے۔ ہم موٹے ہو گئے ہیں، رات کو خرّانے لیتے ہیں۔ صبح کی چاء اور تمباکو نوشی کے بغیر بستر سے نہیں اٹھتے۔ قیلولے کی عادت قبیحہ ہمیں شام تک بیزار رکھتی ہے۔ ہماری رنگت سنولاتی جا رہی ہے۔ اگرچہ ہندی شاعری میں سانولا، سنوریا، کالیا وغیرہ کو پسند کیا گیا ہے۔ تاہم یہ پسندیدگی تسلی بخش نہیں کیونکہ ہندی شاعری ہے تو عورت کی زبانی، لیکن شاعر سارے مرد ہیں اور پھر ہم نے جنوبی ہند کے باشندوں کو بھی دیکھ پایا تھا جن کے آباؤ اجداد کبھی اچھے بھلے ہوں گے۔ ادھر ملک میں عجب دھماچوکڑی مچی ہوئی ہے۔ ہماری تقریر اور قتلِ عام سے پبلک دشمن بن گئی ہے۔ ہر روز کہیں بھوک ہڑتال ہو رہی ہے تو کہیں ستیہ گرہ۔ کمبل ڈالنے کے حادثے نے ہمارا موڈ قطعی طور پر خراب کر دیا ہے۔ چنانچہ سیٹل ہونے کے خیال پر لعنت بھیجی اور کوچ کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ہمارا دلّی سے تشریف لے جانے کا حال

خدا کے فضل سے زادِ راہ کافی تھا کہ راستے میں اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ ہم نے از راہِ مروّت محمد شاہ کو اجازت دے دی کہ اگر اس کی نظر میں کوئی ایسی چیز ہو جس کو ہم بطور تحفہ لے جا سکتے ہوں اور غلطی سے یاد نہ رہی ہو تو بے تکلف ساتھ باندھ دے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ لال قلعہ اب خالی خالی سا معلوم ہو رہا ہے حقیقت یہ تھی کہ لال قلعہ ہمیں بھی خالی خالی سا معلوم ہو رہا تھا۔

اسپِ نمرود پر سوار ہو کر در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈال ہی رہے تھے کہ عین چوراہے میں گھوڑے سے نیچے آ رہے۔ اس بے ایمان گھوڑے کو ہم نے زیادہ منہ چڑھا لیا ہے۔ تعزیری طور پر اہلِ ہند کو واپس دے دیا اور عزیزی محمد شاہ سلمہٗ سے فرمایا کہ اس انسان ناشناس کو خطاب سے محروم کر کے تانگے میں جتوایا جائے۔

کابل میں والیٔ کابل سے نجات

والیٔ کابل ہماری خدمت میں ملتمس ہوا کہ آپ ہند سے ہمارے لیے جو تحفے لائے ہیں وہ دیتے جائیں ورنہ مروّت سے بعید ہو گا۔ ہم نے سمجھایا کہ یہ ہزار اونٹوں پر لدے ہوئے تحائف جو وہ دیکھ رہا ہے ہمارے پیارے عزیز محمد شاہ کی نشانیاں ہیں جن سے ہم مرتے دم تک جدا نہیں ہو سکتے، البتہ کچھ پوستینیں، دُنبے یا گلقند درکار ہو تو وہ دے سکتے ہیں۔ والیٔ کابل راضی نہ ہوتا تھا عجب سوفی آدمی ہے، دنیا وی دولت کی ہوس اس کو بہت ہے۔ بہتیرا سمجھایا کہ آدمی کو خدا سے لَو لگانی چاہیئے۔ دنیا آنی جانی ہے۔ شیخ لوٹا شجر پوری کی مثال پیش کی کہ دنیا داری سے مستغنی ہو کر تارک الدنیا بنے ہوئے ہیں۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ گستاخانہ بولا۔ آپ خود تارک الدنیا کیوں نہیں ہو جاتے۔ بہت کہا کہ ہمارے حالات مختلف ہیں۔ وقت آنے پر تارک الدنیا بھی بن کر دکھا دیں گے۔ جب نہ مانا تو ہم نے ٹلنے کو فرمایا کہ تو خود سیاحت پر کیوں نہیں جاتا۔ آدمی سیانا تھا جان گیا کہ پچھلے چالیس پچاس سال کی دولت تو ہم سمیٹ چکے ہیں، اب وہ ہند گیا تو کرکری ہو گی۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ آخر از راہِ پرورش اس کو پانچ شتر تازی، چھ اسپ باسی، دو سو مقامی مینڈھے دُنبے، دو من گلقند، لال قلعے کا کچھ بوسیدہ فرنیچر، نقرئی پنجرے میں ایک ہندی کوا دے کر سرفراز کیا اور اس حریص لیمو نچوڑ سے رہائی پائی۔

ختم شد

تتمہ

ہمارا خلد میں نزول

جس بات کا دیرسے خدشہ تھا آج وہی ہو کر رہی۔ چند نابکاروں نے تنہا پا کر گھیر لیا اور ہمارا کام تمام کیا۔ انّا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ ہند سے ایران واپس پہنچ کر ہم اس نئی سیاحت پر موئے عراق نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں اپنی ناگہانی جوانا مرگ پہ بے حد قلق ہے۔ کیونکہ اس میں مشیتِ ایزدی ہرگز نہ تھی۔ اگر ہم فرمانبردار خاں کا کہا مان لیتے اور اتنی رات گئے تنہا باہر نہ نکلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ خیر، اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ـــ ع عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

دیکھیے آنجہانی بنتے ہیں یا خلد آشیانی یا کچھ اور، ہمارے متعلق یہاں طرح طرح کی مایوس کن افواہیں اڑ رہی ہیں۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

سعادت حسن منٹو

عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی۔ یہی جی میں آیا کہ گھر سے نکل ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل — باغ پہنچنے سے پہلے ظاہر ہے کہ میں نے کچھ بازار اور گلیاں طے کی ہوں گی اور میری آنکھوں نے کچھ دیکھا بھی ہوگا پاکستان تو پہلے ہی کا دیکھا بھالا تھا پر جب سے زندہ باد ہوا وہ کل دیکھا۔ بجلی کے کھمبے پر دیکھا۔ پرنالے پر دیکھا، شہ نشین پر دیکھا، چھجے پر دیکھا۔ غرضکہ ہر جگہ دیکھا اور جہاں نہ دیکھا وہاں دیکھنے کی حسرت لئے گھر لوٹا۔

پاکستان زندہ باد — یہ لکڑیوں کی ٹال ہے — پاکستان زندہ باد، فٹافٹ مہاجر ہیئر کٹنگ سیلون۔ پاکستان زندہ باد، یہاں تالے مرمت کئے جاتے ہیں — پاکستان زندہ باد، گرما گرم چائے — پاکستان زندہ باد، بیمار کپڑوں کا ہسپتال — پاکستان زندہ باد، الحمد للہ کہ یہ دکان سید انوار حسین مہاجر جالندھری کے نام الاٹ ہوگئی ہے

ایک مکان کے باہر یہ بھی لکھا ہوا دیکھا — پاکستان زندہ باد — یہ گھر ایک پارسی بھائی کا ہے..... یعنی حضرت کہیں اسے بھی نہ الاٹ کرا لیجیے گا۔

صبح کا وقت تھا۔ عجب بہار تھی اور عجب سیر تھی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں۔ ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی، میں نے کہا چلو لسی پیتے ہیں دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل تو رہا ہے لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا "یہ الٹے رخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟"

اس نے گھور کر مجھے دیکھا — پنکھے کا رخ قائداعظم محمد علی جناح کی رنگین تصویر کی طرف تھا جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی

میں نے زور کا نعرہ لگایا "پاکستان زندہ باد" اور لسی پیے بغیر آگے چل دیا۔

بند دکان کے تھڑے پر ایک آدمی بیٹھا پوریاں تل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا ابھی پرسوں میں نے اس دکان سے چپل خریدے تھے یہ پوری والا کدھر سے آگیا۔ خیال آیا شاید کوئی دوسری دکان ہو۔ لیکن بورڈ وہی تھا، سامنے وہی فسادات میں جھلسا ہوا مکان تھا جس کی برساتی میں بجلی کا پنکھا لٹک رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا، آگ جلانے میں اس نے بھی کافی مدد دی ہوگی۔ پوری والے نے مجھے مخاطب کیا اور کہا "کیا سوچ رہے ہیں آپ بابو جی! گرما گرم پوریاں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بھئی میں سوچ رہا ہوں کہ جہاں تم بیٹھے ہو یہاں جوتوں کی ایک دکان ہوا کرتی تھی ——"

پوری والا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مسکرایا "جوتوں کی دکان اب بھی ہے لیکن وہ نو بجے شروع ہوتی ہے اور میری صبح چھ بجے سے شروع ہوتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتی ہے۔"

میں آگے بڑھ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں ایک آدمی سڑک پر کانچ کے ٹکڑے بکھیر رہا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بھلا آدمی ہے۔ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ لوگوں کو تکلیف دیں گے اس لئے سڑک پر سے چن رہا ہے۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ چننے کے بجائے وہ بڑی ترتیب سے انہیں ادھر اُدھر گرا رہا ہے تو میں کچھ دُور کھڑا ہو گیا۔

جھولی خالی کرنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے بچھے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی ایک درخت تھا۔ اس پر ایک بورڈ لگا تھا ——

"یہاں سائیکلوں کے پنکچر لگائے جاتے ہیں اور ان کی مرمت کی جاتی ہے۔"

میں نے قدم تیز کر دیے

دکانوں کے سائن بورڈوں میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئی۔ پہلے قریب قریب سب انگریزی میں ہوتے تھے۔ اب کچھ دکانوں پر نام اور تحریر دونوں اُردو لباس میں نظر آئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے جیسا دیس ویسا بھیس۔

تحریر خوشخط تھی اور نام بھی جاذب نظر تھے۔ مثال کے طور پر "آرائش ظاہر" ہے کہ دکان میں آرائش سے متعلقہ سامان ہوگا ایک ہوٹل کھلا تھا۔ اس کی پیشانی پر عربی رسم الخط میں "ماحضر" لکھا تھا۔ آگے چل کر ایک دکان تھی جس کا نام "پاپوشیانہ" تھا، یعنی جوتوں کا آشیانہ۔ ایک دُکان کی پیشانی پہ یہ بورڈ آویزاں تھی۔ "زمہریر"۔ ضرور قلفیوں کی دکان ہوگی۔

میں نے خوش ہو کر پاکستان زندہ باد کہا اور چلتا رہا۔

چلتے چلتے سائیکل کے چار پہیوں پر ایک عجیب وضع کی ہاتھ گاڑی دیکھی۔ پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟" جواب ملا "ہوٹل —— چلتا پھرتا ہوٹل تھا۔ چپاتیاں پکانے کے لئے انگیٹھی اور توا موجود، چار سالن تیار، شامی کباب تلنے کے لئے فرائی پین حاضر، پانی کے دو گھڑے، برف، لیمونڈ کی بوتلیں، دہی کا کونڈا، لیموں نچوڑنے کا کھٹکا، گلاس، پلیٹیں غرضکہ ہر چیز موجود تھی۔

کچھ دور آگے بڑھا تو دیکھا ایک آدمی چھوٹے سے لڑکے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا لڑکا نوکر ہے اور اس نے ایک روپے کا نوٹ گُما دیا ہے۔ میں نے اس ظالم کو جھڑکا اور کہا۔ "کیا ہوا، بچہ ہے۔ کاغذ کا چھوٹا سا پُرزہ ہی تو ہوتا ہے۔ ایک روپے کا نوٹ، کہیں گر پڑا ہوگا۔ خبردار جو تم نے اس پر ہاتھ لگایا۔"

یہ سن کر وہ آدمی مجھ سے اُلجھ گیا اور کہنے لگا۔ "تمہارے نزدیک ایک روپے کا نوٹ کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہے لیکن جانتے ہو کتنی محنت کے بعد یہ کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ملتا ہے آج کل" —— یہ کہہ کر وہ پھر اس بچے کو پیٹنے لگا۔ مجھے بہت ترس آیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکالا اور اس آدمی کو دے کر بچے کی جان چھڑائی۔

چند قدموں ہی کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک آدمی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا۔ "روپیہ دے دیا آپ نے اس خبیث کو؟"

میں نے جواب دیا "جی ہاں! بہت بُری طرح پیٹ رہا تھا بیچارے کو"

"بیچارہ اس کا اپنا لڑکا ہے۔"

"کیا کہا؟"

باپ اور بیٹے دونوں کا یہی کاروبار ہے۔ دو چار روپے روزانہ اسی ڈھونگ سے پیدا کر لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔" اور قدم بڑھا دیے۔

ایک دم شور سا برپا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بنڈل لئے چلا رہے ہیں اور اندھا دُھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے تھے۔ تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں ——— دہلی میں جوتا چل گیا ——— لکھنؤ میں فلاں لیڈر کی کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا ——— پاکستان کے ایک نجومی کی پیشگوئی۔ کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔

سینکڑوں ہی اخبار تھے۔ آج کا تازہ "نوائے صبح" ——— آج کا تازہ "ابوالوقت" ——— آج کا تازہ "سنہرا پاکستان"۔

اخبار فروش لڑکوں کا سیلاب گذر گیا تو ایک عورت نظر آئی۔ عمر یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ، سنجیدہ اور متین صورت، ایک ہاتھ میں تھیلا تھا، دوسرے میں اخباروں کے بنڈل۔ میں نے پوچھا:

"کیا آپ اخبار بیچتی ہیں؟"

مختصر جواب ملا۔ "جی ہاں!"

میں نے دو اخبار خریدے اور دل میں اس اخبار فروش خاتون کا احترام لئے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں کتوں کا ایک غول کا غول نمودار ہوا۔ بھونک رہے تھے اور ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے پیار کر رہے تھے اور کاٹ بھی رہے تھے۔ میں ڈر کر ایک طرف ہٹ گیا۔ کیونکہ پندرہ روز ہوئے ایک کتے نے مجھے کاٹ کھایا تھا اور پورے چودہ دن سُوئی کے ٹیکے مجھے اپنے پیٹ میں ٹھکوانے پڑے تھے۔

میں نے سوچا کیا یہ سب کتے پناہ گیر ہیں یا وہ ہیں جو یہاں سے جانے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ کوئی بھی ہوں ان کا خیال تو رکھنا چاہیئے۔ جو پناہ گیر ہیں ان کو پھر سے آباد کیا جائے اور جو بے آقا ہو گئے ہیں ان کو ان کی نسل کے اعتبار سے ان لوگوں کے نام الاٹ کر دیا جائے جن کے کتے اس پار رہ گئے ہیں ——— اور جن کا کوئی والی وارث نہیں ان کے لئے لکڑی کی ٹانگیں مہیا کی جائیں تاکہ وہ ان ہی سے اپنا شغل پورا کرتے رہیں۔

کتوں کا غول چلا گیا تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے قدم بڑھانے شروع کئے۔

میں نے ایک اخبار کھولا اور اسے دیکھنا شروع کیا۔ سرورق پر ایک فلم ایکٹرس کی تصویر تھی، تین رنگوں میں، ایکٹرس کا جسم نیم عریاں تھا۔ نیچے یہ عبارت درج تھی۔

"فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کیسے کیا جاتا ہے اس کا کچھ اندازہ اوپر کی تصویر سے ہو سکتا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا اور اخبار کو فٹ پاتھ پر پھینک دیا

دوسرا اخبار کھولا۔ ایک چھوٹے سے اشتہار پر نظر پڑی۔ مضمون یہ تھا۔

میں نے کل اپنی سائیکل لائیڈز بنک کے باہر رکھی۔ کام سے فارغ ہو کر جب لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سائیکل پر پرانی گدی کسی ہوئی ہے لیکن نئی غائب ہے میں غریب مہاجر ہوں، جس صاحب نے لی ہو براہ کرم مجھے واپس کر دیں۔"

میں خوب ہنسا اور اخبار تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا

چند گزوں کے فاصلے پر ایک جلی ہوئی دکان دکھائی دی۔ اس کے اندر ایک آدمی برف کی دو موٹی موٹی سلیں رکھے بیٹھا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ "اس دکان کو آخر کار کسی طرف سے ٹھنڈک پہنچ گئی۔"

دو تین سائیکلیں دیکھیں، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد۔ مرد چلا رہے تھے اور ایک ایک برقع پوش عورت پیچھے کیریر پر بیٹھی تھی پانچ چھ منٹ کے بعد ایک اور اسی قسم کی سائیکل نظر آئی لیکن برقع پوش عورت آگے ہینڈل پر بیٹھی تھی۔ دفعۃً خربوزے کے چھلکے پر سے سائیکل پھسلی۔ سوار نے بریک دبائے، پھسلنے اور بریک لگنے کے دوہرے عمل سے سائیکل اُلٹ کر گری۔ میں دوڑا مدد کے لئے۔ مرد عورت کے برقع میں لپٹا ہوا اور عورت بیچاری سائیکل کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ میں نے سائیکل ہٹائی اور اس کو سہارا دے کر اُٹھایا — مرد نے برقع میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ تشریف لے جائیے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھا۔ عورت کے سر پر اوندھا سیدھا برقع اٹکایا اور اس کو ہینڈل پر بٹھا۔ یہ جا وہ جا..... میں نے دل میں دعا کی کہ آگے سڑک پر خربوزے کا کوئی اور چھلکا نہ پڑا ہو۔

تھوڑی ہی دُور دیوار پر ایک اشتہار دیکھا جس کا عنوان بہت ہی معنی خیز تھا۔ "مسلمان عورت اور پردہ"۔

بہت آگے نکل گیا۔ جگہ جانی پہچانی تھی مگر وہ بُت کہاں تھا جو میں دیکھا کرتا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے جو گھاس کے تختے پر استراحت فرما رہا تھا پوچھا۔ "کیوں صاحب یہاں ایک بُت ہوتا تھا وہ کہاں گیا؟"

استراحت فرمانے والے نے آنکھیں کھولیں اور کہا۔ "چلا گیا۔"

چلا گیا — آپ کا مطلب ہے اپنے آپ چلا گیا؟"

وہ مسکرایا "نہیں اسے لے گئے۔"

میں نے پوچھا۔ "کون؟"

جواب ملا "جن کا تھا۔"

میں نے دل میں کہا۔ "تو اب بت بھی ہجرت کرنے لگے — ایک دن وہ بھی آئے گا جب لوگ اپنے اپنے مُردے بھی قبروں سے اُکھاڑ کر لے جائیں گے۔"

یہی سوچتے ہوئے قدم اُٹھانے والا تھا کہ ایک صاحب نے جو میری ہی طرح ٹہل رہے تھے، مجھ سے کہا۔ "بت کہیں گیا نہیں۔ یہیں ہے اور محفوظ ہے۔"

میں نے پوچھا "کہاں؟"

اُنہوں نے جواب دیا "عجائب گھر میں"۔

میں نے دل میں دعا مانگی۔ "اے خدا وہ دن نہ لائیو کہ ہم سب عجائب گھر میں رکھے جانے کے قابل ہو جائیں۔"

احمد ندیم قاسمی

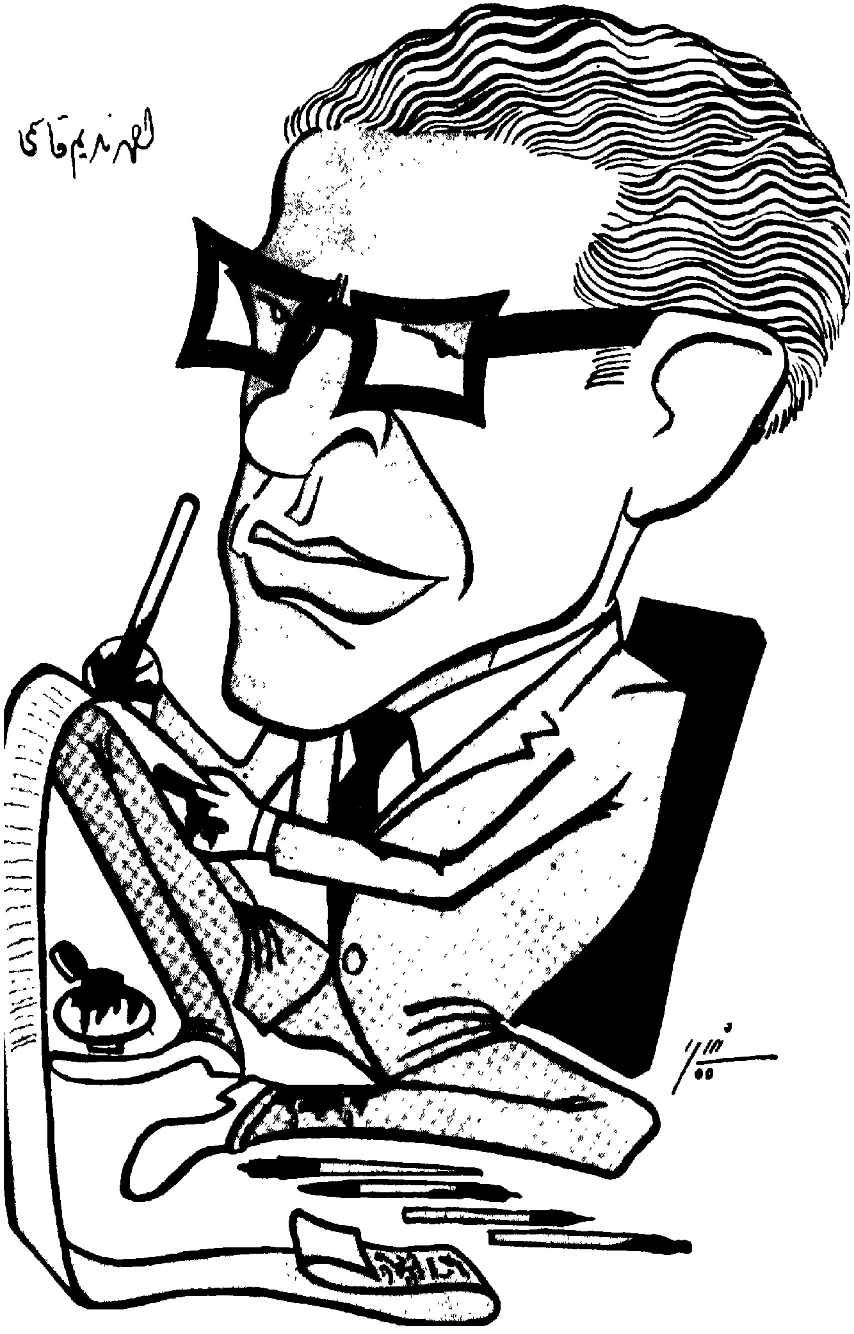

فٹ پاتھ پر ایک دہلوی مہاجر اپنے صاحبزادے کے ساتھ سیر فرما رہے تھے۔ صاحبزادے نے ان سے کہا۔ "ابا جان! ہم آج چھولے کھائیں گے۔"

ابا جان کے کان سرخ ہو گئے۔ "کیا کہا؟"

برخوردار نے جواب دیا۔ "ہم آج چھولے کھائیں گے۔"

ابا جان کے کان اور سرخ ہو گئے۔ "چھولے کیا ہوا چنے کہو"

برخوردار نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "نہیں ابا جان! چنے دلی میں ہوتے ہیں — یہاں سب چھولے ہی کھاتے ہیں —" ابا جان کے کان اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔

میں ٹہلتا ٹہلتا لارنس باغ پہنچ گیا۔ وہی باغ تھا پرانا لیکن وہ چہل پہل نہیں تھی۔ صنف نازک تو قریب قریب مفقود تھی۔ پھول کھلے ہوئے تھے۔ کلیاں چٹک رہی تھیں، ہلکی ہلکی فضا میں خوشبوئیں تیر رہی تھیں۔ میں نے سوچا عورتوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا یہ قید ہیں۔ ایسا خوبصورت باغ، اتنا سہانا موسم، اس سے لطف اندوز کیوں نہیں ہوتیں — لیکن مجھے فوراً ہی اس سوال کا جواب مل گیا جب میرے کانوں میں ایک نہایت ہی بھونڈے اور سوقیانہ گانے کی آواز آئی...... اور جب میں نے لارنس باغ کی روشوں پر چھپی چھپی نگاہوں والے گوشت کے بے ہنگم لوتھڑوں کو بے شرمی سے دیکھا تو مجھے دکھ ہوا اور اس دکھ میں اضافہ ہو گیا جب میں نے سوچا کہ پھول بیکار کھل رہے ہیں۔ کلیاں بے مطلب چٹک رہی ہیں۔ یہ جوان ان کی طرف دیکھے بغیر چلے جا رہے ہیں، یہ جوان ان کے حسن سے بالکل بے خبر ہیں۔ کیا ان کی جگہ اس باغ کے سوا کوئی ذہنی شفاخانہ نہیں کوئی مدرسہ نہیں جہاں ان کے دماغوں کی بند کھڑکیاں کھول جائیں؟ ان کی روحوں کے زنگ آلود تالے توڑے جائیں۔ اگر کوئی ایسا نہیں کر سکتا، میرا مطلب ہے اگر انسان کا ذہن عاجز ہے ان انسانوں کے ذہن کی اصلاح کرنے میں تو کیا وہ انہیں چڑیا گھر میں نہیں رکھ سکتا جو لارنس گارڈن ہی میں قائم ہے۔

میری طبیعت مکدّر ہو گئی۔ باغ سے باہر نکل رہا تھا کہ ایک صاحب نے پوچھا۔ "کیوں صاحب! یہی باغ جناح ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "جی نہیں یہ لارنس باغ ہے۔"

وہ صاحب مسکرائے "آپ چڑیا گھر سے تشریف لا رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

وہ صاحب ہنس پڑے "قبلہ! جب سے پاکستان قائم ہوا ہے اس کا نام باغ جناح ہو گیا ہے۔"

میں نے ان سے کہا۔ "پاکستان زندہ باد۔" وہ اور زیادہ ہنستے ہوئے لارنس باغ میں چلے گئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں دوزخ سے باہر نکلا ہوں ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است — رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت

ہم ایک موٹر خریدیں گے

احمد ندیم قاسمی

کہتے ہیں موٹر سازی کے کارخانوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ہو رہا ہوگا۔ ہماری قسمت میں تو وہی کھڑکھڑاتے ہوئے پہیوں والی بے ڈھنگی سی ٹمٹم ہی لکھی ہے۔ جس پر سوار ہو کر انسان کی قوت خودی اور غرور نفس کو کچھ اس طرح ٹھیس پہنچتی ہے کہ جی میں آتا ہے ابھی جا کر موٹر میں سوار ہو جائیں۔ اور ٹریفک کے اصولوں سے بے پروا ہو کر تنگروں سے ٹکراتے، یکوں کو ٹھکراتے، سائیکلوں کو کچلتے، مکانوں کو ڈھلتے، پیدل چلنے والوں کو پیٹتے ہوئے کہیں نکل جائیں ـــ بہت دور، جہاں ٹمٹموں کا نشان تک نہ ملے۔ جہاں موٹر ہی موٹر ہوں، سریلے ہارنوں والے۔ شیشے کے بنے موٹر۔ ٹمٹم پر بیٹھتے ہی اکثر اس قسم کے خیالات ہمارے دل میں آئے۔ اور کئی دفعہ ہم نے اس خرد جال پر بیٹھے ہوئے اپنے آپ کو موٹروں پر تھرکتے ہوئے محسوس کیا لیکن پہیے کی اچانک چیخ یا ٹٹو کے اچانک بیٹھ جانے سے اکثر ہمارے یہ خواب مادی دنیا کے شور و شغب میں کھو جاتے ہیں! اور ہم کوچبان پر دانت پیسنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے

لیکن ارادہ ہے کہ ہم ایک موٹر خریدیں گے۔ ایسا موٹر جس میں ڈرائیور کی سیٹ عام سطح سے ڈیڑھ گز اونچی ہوگی۔ تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ مشین کے ناخدا کہاں تشریف فرما ہیں۔ ورنہ یوں تو ہرا یرا غیرا مال روڈ پر اُڑتا پھرتا ہے۔

موٹر خرید کر پہلے ہم اپنی اہلیہ محترمہ کو مبارک باد دیں گے۔ ان کے لئے موٹر کی پچھلی سیٹ ریزرو کردی جائے گی۔ شاید اس طرح ان کی پیشانی کی شکنیں کم ہو جائیں گی اور ہمیں کھانا وقت پر مل جایا کرے گا ـــ مابعد شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا جائے گا کہ آج جناب...... صاحب نے موٹر خرید لیا ہے۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ منٹ دو منٹ کے بعد اپنے اردگرد دیکھتا جائے۔ ورنہ اگر کوئی حادثہ ہو گیا تو صاحب موصوف اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے کیونکہ مالک موٹر کو حق حاصل ہے کہ وہ کائنات کے جس حصے میں چاہے موٹر چلائے۔

اس کے بعد پیٹرول میں عرق گلاب اور روح کیوڑہ ملا کر انجن میں ڈالا جائے گا۔ موٹر کی پچھلی سیٹ پر بیگم کو ریشم کی رسّی سے باندھ کر بٹھا دیا جائے گا۔ کیونکہ رفتار کی تیزی یا کسی حادثہ سے ان کے باہر جا پڑنے کا خطرہ ہوگا۔ ہم خود چکر تھام کر پیچ گھما دیں گے اور موٹر کا پنجر چیختا ہوا آگے بڑھے گا۔ آخر یہ خاموش خاموش شرمیلے شرمیلے انجنوں والے موٹر کس کام کے ہیں۔ چپکے سے کھسک جاتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی کہ کوئی صاحب ادھر سے موٹر سائیکل پر سوار نکل گئے، ہمارا موٹر چیختا چلاتا، دھاڑتا اور پھنکارتا ہوا چلے گا سڑک پر یقیناً تماشائیوں اہل ذوق حضرات کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں گے۔ ہم ہر ایک سے سلام لیتے جائیں گے مسکرا مسکرا کر جھک جھک کر، ہارن بجا بجا کر۔ اور پھر کسی پینٹر کی دکان پر جا کر رک جائیں گے اور وہاں سے اس مضمون کے دو تختے بنوا کر موٹر کے آگے پیچھے لٹکا دیں گے۔

اس مضمون میں موٹر کا لفظ مطلقاً صیغۂ مذکر میں استعمال ہوا ہے۔

جو صاحب موٹر میں سوار ہونا چاہیں وہ ہاتھ کھڑا کر دیں۔"

اس طرح سیاسی دنیا کی عظیم الشان تحریک سوشلزم کا پرچار بھی ہوتا رہے گا اور آنے والی نسلیں بھی ہمیں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا کریں گی۔

جہاں "کیپ لیفٹ" (بائیں جانب رہو) لکھا ہوگا، وہاں ہم موٹر کو دائیں طرف سے لے جائیں گے "موٹرز دس وے" لکھا ہوگا۔ وہاں "دیٹ وے" لے جائیں گے۔ جہاں "نو پارکنگ ہیر" کا تختہ لٹک رہا ہوگا۔ وہیں موٹر کھڑا کریں گے۔ آخر دو آنے کی لکڑی کے ایک معمولی سے تختے کے دو الفاظ سے ڈر کر ہمارا چار ہزار روپے والا موٹر کیسے رک سکے گا؟ جہاں پانچ میل رفتار کا حکم ہوگا وہاں پچاس میل پر چھوڑ دیں گے، جہاں "آہستہ چلاؤ" کا حکم ہوگا۔ وہاں ساٹھ ستر۔ اسّی میل فی گھنٹہ کی رفتار پر چلائیں گے۔ اوّل تو ان شاء اللہ ہم اسے الٹنے ہی نہ دیں گے۔ اور اگر الٹ بھی گیا تو پھر سیدھا ہو سکتا ہے۔

یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ موٹر گیرج میں کیوں رکھے جاتے ہیں کیا ان کے مالکوں کو ان کی یاد نہیں ستاتی؟ ہم تو موٹر کو اپنے پاس سے ایک پل کے لئے بھی جدا کرنا گوارا نہ کر سکیں گے۔ کھاٹ کو اس کے انجن سے باندھ کر سو رہیں گے ورنہ اس کے اندر ہی پڑ رہنے میں کیا حرج ہے۔

جو لوگ آج کل ہمیں ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ ہماری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے۔ ہمارے موٹر کو شہر کے دیگر موٹروں میں ایک امتیاز خصوصی حاصل ہوگا اور اس طرح ہم جدھر جائیں گے ہمارے لئے راستہ صاف ہوگا۔ ٹریفک کے اصول ہماری مرضی کے تابع ہوں گے۔ قوت دنیا کی سب سے بڑی حکمران ہے۔ کیا آپ نے وہ واقعہ نہیں سنا۔ ایک دفعہ ایک مسافر ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے ایک شیر آتا ہوا دکھائی دیا۔ آتے ہی کم بخت نے مسافر کی گردن دبوچ لی اور کہنے لگا "بتا شیر انڈے دیتا ہے یا بچے دیتا ہے"؟ مسافر جانتا تھا کہ ہز میجسٹی کنگ آف جنگل اپنی قوت کے بل بوتے پر اس کی معلومات کا امتحان لینے پر تلے ہوئے ہیں اس نے سوچا کہ اگر میرے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا جس سے بادشاہ سلامت کی بادشاہت کو ٹھیس پہنچی تو دم بھر میں انجر پنجر بکھر کر رہ جائے گا اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "حضور شیر مرضی کا مالک ہے، کبھی انڈے دے دیتا ہے اور کبھی بچے دے دیتا ہے"۔ اس طرح اس کا چھٹکارا ہوا۔ موٹر خرید لیں تو ہماری مثال اسی شیر کی سی ہوگی۔

موٹروں کا طوفان مہذب دنیا کی طرف سے ہم غیر مہذب کالے لوگوں کی طرف امڈا چلا آ رہا ہے۔ کہتے ہیں قیامت کے دن داور حشر کے سامنے ہر شخص اپنے اپنے موٹر میں سوار ہو کر حاضر ہوگا۔ اس طرح پروردگار دو جہاں کو لاتعداد گیرج بنوانے پڑیں گے۔ جس نے کن سے دو عالم کی تخلیق فرما دی۔ اس کے آگے دس بارہ کروڑ سنگھ گیرج بنانے میں کیا دیر لگے گی۔ بیچارے فرشتوں پر جو آفت آئے گی اس کا تصور کرتے ہی دماغ میں موٹر چلنے لگتے ہیں۔

آہ ——— موٹر! اکثر چاندنی راتوں میں جب فضائے خموش میں ہر طرف قدرت کی دلفریب نیرنگیاں بے نقاب ہو کر رقص کرتی ہیں، جب کائنات سکوت کے پردوں میں چھپ کر مستقبل کے خواب دیکھا کرتی ہے۔ جب چوراہوں سے ٹریفک کے سنتری چلے جاتے ہیں، جب مال روڈ پر اکے دکے موٹر لہراتے ہوئے سامنے سنہرے مدہم غباروں میں گم ہو جاتے ہیں، جب کسی تنگ گلی میں بے روزگار گریجوایٹ میونسپل کمیٹی کے لیمپ کی روشنی میں بیٹھ کر کسی بیمہ کمپنی کی ایجنٹی کے لئے درخواستیں لکھا کرتے ہیں۔ جب قدرت کے افکار رد

حوادث" اور "مطائبات" کے لشکری یعنی کالجوں کے برخود غلط نوجوان خواب میں کریموں اور پوڈروں کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہیں اس وقت اکثر ہم خیال ہی خیال میں موٹر میں سوار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا موٹر زمین کو چھوئے بغیر تھرکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہم چلے جاتے ہیں — دُور دھندلے افق کے پار — لاانتہا وسعتوں میں — اور پھر بوقلموں فضاؤں کو چیرتے — تاروں کو چومتے — کہکشاں کی پکی سڑک پر تیرنے لگتے ہیں۔ نورانی سنتری ہمیں آگے سے ہٹ ہٹ کر راستہ دیتے جاتے ہیں۔ کائنات سنہرا غبار بن کر ہمارے موٹر کے پہیوں سے لپٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ہم اُڑتے جاتے ہیں' اُڑتے جاتے ہیں' اور آخر چاند کے مرمریں قرص سے ٹکرا جاتے ہیں — اور جب ہماری آنکھ کھلتی ہے تو بیگم ہمیں فرش پر سے اٹھا کر کھاٹ پر ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہوتی ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں: "ہمارے موٹر کو نقصان تو نہیں پہنچا؟" اور جواب ملتا ہے کہ آج آٹا ختم ہو گیا ہے میری بالیاں گرو رکھ کر کچھ پیسے لے آؤ۔ نکھٹو" — آہ — قدرناشناس دنیا' تیرے پاس ہمارے لئے ایک موٹر بھی نہیں؟ تیری ٹمٹموں کو آگ لگے۔ تیرے یکے جل جائیں' تیری سائیکلیں پنچر ہو جائیں' تیری ریلیں پچک جائیں تیرے ہوائی جہاز زمین سے چمٹ جائیں تیرے پاس ہمارے لئے ایک موٹر بھی نہیں — ایک موٹر — یا ایک موٹر کا نمونہ — یا ایک موٹر کا پنجر — جو صرف رینگ سکتا ہو — جو صرف کھڑا رہ سکتا ہو — ایک موٹر — بس ایک موٹر۔

لیکن پھر بھی ہمارا ارادہ ہے کہ ہم ایک موٹر خریدیں گے اور جس طرح پہلے بیان کر دیا گیا ہے ہم اسے اسی نوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلایا کریں گے۔ اگر وہ کبھی الٹ کر ٹوٹ گیا تو ہمارے احباب کا یہ فرض ہو گا کہ اس کے پرزے لندن کے عجائب گھر میں لے جائیں۔ جن کے پاس سنگ مرمر کے ایک تختہ پر موٹر کی شکل بنا کر نیچے یہ حروف کندہ کرائیں :۔

> "ایک ایسے گریجویٹ کے موٹر کے پُرزے جس نے اپنے موٹر کے غرورِ
> نفس کی حفاظت کے لئے ٹریفک کے اصولوں کی مخالفت کی اور آخر
> اسی راہ میں شہید ہو کر حیاتِ جاودانی پا گیا۔ خدا کرے اسے آئندہ زندگی
> میں ایک موٹر نصیب ہو۔"

دماغ چاٹنے والے

ابراہیم جلیس

میرے ملاقاتیوں کی کوئی تعداد معین نہیں ہے۔ مگر ان میں سے چند ملاقاتی ایسے ہیں جن کے بارے میں رہ رہ کر مجھے خیال آتا ہے کہ کاش ان سے میری ملاقات نہ ہوتی یا کاش اب ان سے میری راہ و رسم منقطع ہو جائے۔ یہ ضرور ہے کہ پہلی بار جب میں کسی ملاقاتی سے ملتا ہوں تو عادتاً یہ ضرور کہہ دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"— یہ جملہ تو بالکل رسمی ہے۔ اس کے معنیٰ و مفہوم اور اس کی اہمیت پر غور کئے بغیر خود بخود زبان سے نکل جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس جملے سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے اور اس لئے بار بار ملاقات کی جائے کہ پہلی بار مجھے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تھی"— ویسے اب میں سچ سچ بتادوں کہ اب تو ان ملاقاتیوں سے مل کر مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ذرا ڈھیٹ بن کر، ذرا بے مروت ہو کر صاف صاف کہہ دوں کہ صاحبان — میں آپ سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا مجھے آپ سے مل کر نہ پہلی بار کوئی خوشی ہوئی تھی، اور نہ اب ہوئی ہے، اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔ میں بڑی عاجزی سے درخواست گزار ہوں کہ مجھے معاف کیجئے اور خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔

لیکن کیا اب میں ایسا کہہ سکتا ہوں؟ نہیں نہیں شاید میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میں لاکھ کوشش کروں۔ تب بھی ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھ میں وہ اخلاقی جرأت نہیں ہے جس کی ہر بڑے آدمی نے تلقین کی ہے اور جو ابتدائے آفرینش سے آج تک پیغمبروں اور غیر معمولی آدمیوں کو چھوڑ کر کسی انسان میں پیدا نہ ہو سکی — اس دنیائے آب و گل میں اخلاقی جرأت کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے جتنی کہ اخلاقی بزدلی کو حاصل ہے۔ اخلاقی بزدلی کے لئے دل گردے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اخلاقی جرأت رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لیکن چونکہ میرے دل گردے بہت کمزور ہیں اور فطرتاً تن آسان بھی ہوں۔ اس لئے مجھ میں اخلاقی جرأت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ہر زید، بکر، عمر سے پہلی ملاقات پر میں بے کھٹکے یعنی بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

مگر ازراہِ انصاف آپ فرمائیے کہ سید شاہ ضیاء الحسن سے مل کر کسی صحیح عقل و دماغ رکھنے والے انسان کو خوشی ہو سکتی ہے

مجھے اپنے دوست محمد ریاض کے حال پر بے حد غصہ آتا ہے کہ جس نے سید شاہ ضیاء الحسن سے ایک مبارک یا منحوس دن میرا تعارف کرایا۔ یہ کوئی سخن سازی نہیں، بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس دن بھی سید شاہ ضیاء الحسن شاہ سے کسی شخص کا تعارف ہو گا۔ وہ دن اس شخص کے لئے یقیناً ایک منحوس دن ہو گا۔ چنانچہ میری زندگی میں اب اس منحوس دن کے علاوہ روز بروز منحوس گھڑیوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ سید شاہ ضیاء الحسن روز بروز مجھ سے ملتا ہے۔ میں جتنا اس سے دور بھاگتا ہوں وہ

اتنی ہی تیزی سے میری طرف دوڑتا ہے۔ مجھے پکڑ لیتا ہے اور مجھے اپنی شکست مان کر مجبوراً دانت کھول کر مسکرانا پڑتا ہے، اور پھر یوں پوچھتا ہوں۔

”اوہ! سید شاہ ضیاالحسن صاحب۔ کہیئے مزاج تو اچھے ہیں؟“ اب پھر کچھ نہ پوچھیئے۔ سید شاہ ضیاء الحسن کی زبان چلنے لگتی ہے تو پھر گھنٹوں چلتی رہتی ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ آپ بیٹھئے اور اپنے صبر و ضبط کا امتحان دیتے رہیئے۔ نتیجتاً ناکامی آپ کو یا مجھے ہی ہوگی۔ سید شاہ ضیاالحسن کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔

وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ چونکہ وہ دو دو تین تین گھنٹوں تک بے تکان گفتگو کر سکتا ہے اور سننے والے چپ چاپ اس کی باتیں سنتے رہتے ہیں تو یقیناً اس کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی ہے جبھی تو لوگ اپنے زخم جگر کو دیکھنے کی بجائے ہمہ تن گوش ہو کر بڑے انہماک سے اس کی باتیں سنتے رہتے ہیں۔ سید شاہ ضیاالحسن کبھی یہ جاننے یا محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرے گا کہ آپ کس موڈ میں ہیں۔ وہ اس کی کبھی پروا نہیں کرے گا کہ آپ کو بخار اور دردِ سر ہے۔ یا آپ اپنی محبوبہ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اسے تو بس یہ خوش فہمی ہے کہ وہ بڑا دلچسپ باتونی یا ایک اچھا مجلسی آدمی ہے۔ اسی لئے وہ باتیں شروع کر دیتا ہے، ہر قسم کی باتیں ہر موضوع کی باتیں، ایران کی باتیں، توران کی باتیں، مہمل باتیں، بیکار باتیں — ضیاالحسن باتیں ہی باتیں کرتا رہتا ہے مگر نزدیک سے بغور دیکھنے پر بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا بلکہ اپنے مخاطب کا دماغ چاٹ رہا ہے

میں مانتا ہوں کہ انسان کے حلق میں زبان اسی لئے جڑ دی گئی ہے کہ وہ باتیں کرے۔ باتیں کرنا ہرگز کوئی غیر انسانی حرکت نہیں مگر مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی باک نہیں ہے کہ دماغ چاٹنا یقیناً غیر انسانی حرکت ہے۔

ضیاالحسن جب کبھی ملتا ہے تو پہلے یہ ضرور کہہ دیتا ہے کہ ”نہیں نہیں کوئی خاص بات نہیں، بس ادھر سے گذر رہا تھا سوچا، تم سے دو ایک منٹ کے لئے باتیں کرتا چلوں؟

اب سنیئے اس کی دو ایک منٹ کی باتیں۔

”ارے بھئی — کچھ سنا تم نے — ابھی ابھی ایک بڑا افسوس ناک واقعہ ہوا۔ وہ موہن لال ہے نا — چلتی موٹر سے گر پڑا۔ بیچارے کو بڑی سخت چوٹ آئی۔“

میں پوچھتا ہوں۔

کون موہن لال؟

وہ حیرت سے کہتا ہے — ارے موہن لال کو نہیں جانتے۔ ہاں ہاں موہن لال کو تم نہیں جانتے تم اس سے کبھی ملے ہی نہیں۔ موہن لال بے چارا ایک بڑا پیارا دوست ہے۔ ڈپٹی دیا نرائن کا بھانجا۔ بڑا دلچسپ ہنس مکھ — بالکل ڈپٹی دیا نرائن کی طرح خوش مذاق اور زندہ دل — ہے ہے۔ ڈپٹی دیا نرائن کی کیا تعریف کی جائے۔ ابھی ابھی پچھلی جولائی میں وہ سورگباش ہوئے ہیں — بڑی حسرت ناک موت تھی۔ ہاں اس حسرت ناک موت پر خوب یاد آیا۔ وہ بے چارا قمر الدین بھی تو مر گیا۔ اس کی موت بھی بڑی دردناک تھی۔ قمر الدین کو بھی شاید تم نہیں جانتے — بے چارے کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے

ارے ہاں بھئی۔ تمہارے چھوٹے بچے کا مزاج اب کیسا ہے؟ کون سے ڈاکٹر کا علاج کروا رہے ہو۔ آج کل تو یہاں کوئی اچھا ڈاکٹر رہے ہی نہیں۔ سب نیم حکیم خطرہ جان ہیں۔ اب تو یار میرے علاج کرنے والے بھی ڈاکٹر ہیں، اور کالج پڑھانے والے بھی ڈاکٹر ہیں۔ اس پر ایک بات یاد آگئی۔ وہ جو ڈاکٹر فاروق حسین جو معاشیات کے پروفیسر تھے اُنہوں نے استعفا دے دیا ہے۔ بڑا خوددار آدمی تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں دو ہی خوددار آدمی دیکھے ہیں۔ ایک تو ڈاکٹر فاروق حسین، دوسرا اپنا محمد قاسم طبلہ مرچنٹ۔ تم نے محمد قاسم طبلہ مرچنٹ کا وہ واقعہ تو ضرور سُنا ہوگا کہ ایک بار اُنہوں نے ایک بڑے رئیس کا طبلہ درست کرنے سے اس لئے انکار کر دیا تھا۔ کہ رئیس نے دکان کے باہر ہی سے موٹر میں بیٹھے بیٹھے بڑی رعونت سے کہا تھا کہ۔

"اے میاں طبلے والے، ادھر آؤ۔ اسے درست کرنا ہے"۔

محمد قاسم خوددار آدمی تھا اس نے دیسے دکان میں ہی بیٹھے بیٹھے کہا۔

"غرض پڑی ہے تو موٹر سے اتر کر یہاں آؤ۔ ورنہ اپنا راستہ ناپو"۔ یہ ہے خودداری — تجارت کرتا ہے، آزاد پیشہ آدمی ہے۔ وہ بھلا کسی رئیس کا دبیل کیوں ہو۔ وہ تو اس وقت . . . . ارے بھائی جلیس اُٹھ کھڑے ہو گئے۔ اماں یار بیٹھو — کہاں جا رہے ہو۔ بیٹھو بھئی بیٹھو۔

مگر میں نے جواب دیا کہ مجھے ساڑھے گیارہ بجے ایک صاحب سے ملنا ہے۔ معاف کرنا ضیاء الحسن میں محمد قاسم طبلچی کی داستانِ خودداری پوری طرح نہ سن سکا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اُن صاحب سے ملنا ضروری ہے۔ اور اب گیارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔

اس کے بعد میں وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہوں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ ساڑھے گیارہ بجے مجھے کسی صاحب سے ملنا ہے۔ مگر یہ بالکل سچ ہے کہ مجھے زخمی موہن لال یا اُن کے خوش مذاق، زندہ دل ماموں، ڈپٹی دیا نرائن آنجہانی یا چھوٹے چھوٹے بچوں والے مرحوم قمر الدین یا ڈاکٹر فاروق حسین سابق پروفیسر معاشیات اور خوددار طبلہ مرچنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ موہن لال جسے میں جانتا تک نہیں۔ بھئی اگر موٹر سے گر پڑا تو میں کیا کروں؟ ڈپٹی دیا نرائن بڑے خوش مذاق اور زندہ دل آدمی تھے، تو وہ ہوں گے۔ قمر الدین کی موت بڑی حسرت ناک تھی، تو بھئی اس کی موت میں میرا کیا دخل؟ — ڈاکٹر فاروق حسین نے استعفا دے دیا، تو میرا کیا بگڑا۔ محمد قاسم طبلہ والے اگر خوددار ہیں تو ہوا کریں۔ مجھے تو اُن سے طبلہ درست نہیں کرانا ہے۔

مجھے صرف اکیلے ضیاء الحسن ہی سے شکایت نہیں ہے۔ بلکہ ضیاء الحسن کے سارے بھائیوں سے شکوہ ہے، میرا روئے سخن ضیاء الحسن کے سگے یا رشتے کے بھائیوں کی طرف نہیں ہے بلکہ میری ضیاء الحسن کے پیشے کے بھائیوں یعنی ضیاء الحسن کی طرح دماغ چاٹو لوگوں سے ہے۔ دماغ چاٹنا نہ صرف ایک پیشہ ہے بلکہ اس کا شمار فنونِ لطیفہ میں بھی ہوتا ہے۔

سید شاہ ضیاء الحسن کے ایک ہم پیشہ بھائی ابوالفضل صاحب ہیں۔ یہ ابوالفضل صاحب کسی ضلع کی ایک تحصیل کے پیشکار ہیں۔ اپنی کسی نہ کسی کارروائی کے سلسلے میں ہر اٹھوارے پندرھواڑے شہر آتے رہتے ہیں اور جب بھی مجھ سے ملتے ہیں۔ تو پہلا سوال یہ کرتے ہیں۔

"میاں تم کب آئے؟"

میں جواب دیتا ہوں۔ "جی میں تو یہیں ہوں۔ عرصے سے یہاں رہتا ہوں۔ میں تو پانچ سال سے کسی چھوٹے سے سفر پر بھی نہیں گیا۔"

وہ فرماتے ہیں — "اوہ، وہ شاید آپ کے بھائی ہیں جو بمبئی میں ہیں"۔ میں کہتا ہوں "جی میرے تو کوئی بھائی بمبئی میں نہیں ہیں"۔ وہ مصر ہو جاتے ہیں۔ "ارے کوئی تھے نا میاں تمہارے بمبئی میں؟"

اب میں اُن سے کس طرح بحث کروں۔ اس لئے جھوٹ موٹ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ "اچھا آپ عابد حسین کو پوچھ رہے ہیں۔ جی، وہ تو بمبئی میں فلم ایکٹر بن گئے۔" (حالانکہ عابد حسین تو یہیں ہیں اور یہیں ایک دفتر میں ملازم ہیں) وہ خوش ہو کر فرماتے ہیں۔ "ہاں میں نے کہا تھا نا۔ اچھا اب کیا کر رہے ہیں"۔ جی تو چاہتا ہے کہہ دوں، جھک مار رہا ہوں، مگر چونکہ وہ میرے بزرگوں کے ملنے والوں میں سے ہیں۔ اس لئے جواب دیتا ہوں — "جی ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں"۔ فرماتے ہیں "اخبار کے ایڈیٹر ہو! خوب اچھا، آج کل اخباروں میں کیا چھپ رہا ہے"؟ ایسے سوال کے بعد اپنا اور اُن کا جی ایک کر دینے کو چاہتا ہے۔ مگر انسان بندۂ مجبور ہے اور وہ نہ صرف تحصیل کے پیشکار ہیں۔ مگر میرے بزرگوں کے ملنے جلنے والے ہیں۔

وہ جب کبھی اپنی تحصیل سے شہر آتے ہیں تو ادھر کئے ہوئے سوالات ہر مرتبہ دہراتے ہیں اور دو تین گھنٹے تک برابر دماغ چاٹتے رہتے ہیں، مگر پرسوں میں نے انہیں بڑا چکمہ دیا۔ وہ شہر آئے تھے۔ اتفاق سے عابد روڈ پر نظر آ گئے۔ میں سائیکل پر جا رہا تھا، مجھے دیکھ کر پکارا۔

"میاں۔ ارے ٹھہرو، ٹھہرو بات تو سنو۔"

مگر میں نے بالکل انجان ہو کر پیڈل تیز کئے اور نام پلی سڑک پر مڑ گیا۔ حالانکہ مجھے معظم جاہی مارکیٹ جانا تھا۔

ضیاء الحسن کے تیسرے برادرِ طریقت ہمارے ایک پڑوسی بزرگ بھی محکمہ مالگذاری کے پنشن یافتہ منتظم ہیں انہیں بڑھاپے کی وجہ سے جلدی نیند نہیں آتی اسی لئے بے خوابی کا وقت میرا دماغ چاٹنے میں گذارتے ہیں روزانہ رات کو کھانے کے بعد آ جاتے ہیں اور آتے ہی پہلا سوال یہ کرتے ہیں۔

"سناؤ بابا۔ آج اخبار میں کیا لکھا ہے"؟

میں کوئی حافظِ اخبار تو نہیں ہوں اس لئے عمداً اخبار اُن کی طرف بڑھا دیتا ہوں۔ مگر وہ اخبار جوں کا توں واپس کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "اخبار تو میں صبح کا ہی پڑھ چکا ہوں۔ اس میں کیا رکھا ہے، کچھ تو سناؤ۔ اسٹالن ہندوستان پر کب حملہ بولنے والا ہے!

میرا ارادہ ہے کہ کسی دن جب میرے صبر و تحمل کا پیالہ چھلک جائے گا تو میں اُن سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ قبلہ نہ تو اسٹالن کو باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے اور نہ مجھے کہ میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر دو تین گھنٹوں تک اخبار کا آموختہ پڑھوں۔ آپ پنشن یافتہ ہیں۔ آپ کو بے خوابی کی شکایت ہے تو پھر آپ اپنے گھر بیٹھ کر تارے گنتے رہئیے میرا جوان وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ میرا دماغ کہاں اتنا فالتو ہے کہ آپ بیٹھے چاٹا کیجئے۔ حضرت مجھے سونے دیجئے۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ اپنی بزرگی یا میری سعادت مندی سے للہ ناجائز فائدہ تو نہ اُٹھائیے۔

ضیاء الحسن کے ایک چوتھے ہم مشرب آرٹسٹ ہیں۔ لوگ انہیں صرف مولا کہتے ہیں۔ مگر انہوں نے انتہائی سادگی سے اپنا تخلص بے کمال رکھا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے شاعر، بہت اچھے افسانہ نگار، بہت اچھے مصور، بہت اچھے گویّے اور بہت اچھے لطیفہ گو ہیں۔ بلبل ترنگ بھی بہت اچھا بجاتے ہیں۔ آج کل ناچ بھی سیکھ رہے ہیں۔ مگر ایک اچھائی یا خرابی یہ ہے کہ وہ "سنانے کے مرض" میں گرفتار ہیں۔ جب کبھی میں انہیں نظر آ جاتا ہوں تو بس پکڑ کر زبردستی موٹر میں بٹھا سیدھا گھر لے جاتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ پہلے چائے سگریٹ پی کر تازہ دم ہو جاؤ۔ چائے پی کر پہلا ہی سگریٹ جلاتا ہوں، کہ وہ اپنی نظم یا غزل شروع کر دیتے ہیں۔ اب میں ہوں کہ بات بے بات واہ وا کہنے لگتا ہوں، پندرہ بیس منظومات کا اسٹاک ختم ہو گیا تو وہ اندر سے چمڑے کا موٹا بیگ لے آئے۔ اب افسانے شروع ہوتے ہیں، رومانوی افسانے، سیاسی افسانے، تاریخی افسانے، جاسوسی افسانے۔

دو بج گئے۔ اندر سے دوپہر کا کھانا آیا۔ کھانا کھاتے بھی اپنی نگارشات اور ان کی شانِ نزول زیرِ بحث آ جاتی۔ جب کھانا ختم کرنے کے بعد بچے کھچے مقالے، تقریریں، اقتباسات، ڈائری، کچھ بڑے لوگوں کے خطوط اور کچھ فرضی لڑکیوں کے محبت نامے۔ لیجئے اب پانچ بج گئے شام کی چائے آتی ہے۔ شام کا وقت چونکہ نثر نظم کے سے وزنی پروگراموں کے لئے موزوں نہیں ہوتا اس لئے لطیفہ گوئی اور بیت بازی شروع ہو گئی۔ رات کے آٹھ بج گئے۔ اندر سے رات کا کھانا کھاتے کھاتے ٹیبل ٹاک ہوتی ہے تو نو بج جاتے ہیں۔ اب ذرا سکوت اور سناٹا طاری ہو جاتا ہے مگر اس پر بھی مصوری کے شہکار دکھلانے لگے۔

"یہ تاج محل ہے، یہ نخلستان ہے۔ یہ نسیم جونیر کی تصویر ہے۔

یہ ایک لڑکی ہے جس کا چہرہ عشق کی ناکامی کے تاثرات ظاہر کرنے کی میں نے انتہائی کوشش کی ہے۔

میری یہ تیندوے کی تصویر۔ اب کے سال بمبئی کی آرٹ اگزبیشن میں بھیجی جانے والی ہے۔"

خدا خدا کر کے رات کے دو بج گئے۔ دو بجے سے موسیقی کا پروگرام شروع ہو گیا۔ پھر رات کے پانچ بج گئے۔ اب بلبل ترنگ پر بھیرویں بجانے لگے۔ یہ مجلس راگ و رنگ ابھی جاری تھی کہ قریب میں کسی ٹاپے سے مرغ بول پڑا۔ ایک مسجد سے موذن کی اذان گونجی۔ فرمایا "ارے دیکھا تم نے۔ آرٹسٹ کو گردش شام و سحر کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اچھا اب تمہاری آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔ اب تم سو جاؤ۔ میں ذرا شفق کا نظارہ کر دوں۔"

میں سوچتا ہوں کہ کیا میں سو جاؤں؟ مگر شاید میں نہ سو سکتا ہوں اور نہ سوچ سکتا ہوں کیونکہ میرے سر میں جتنا کچھ مغز تھا۔ آرٹسٹ نے سارے کا سارا چاٹ لیا ہے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئیے۔

اب مجھے یہ کرنا چاہئیے کہ جب بھی مجھے دوبارہ آرٹسٹ صاحب سے ملنا پڑے تو پہلے ہی اپنے بیوی بچوں کو نصیحت کر آؤں تاکہ پھر میں بھی آرٹسٹ بن جاؤں اور مجھے گردشِ شام و سحر کی خبر ہی نہ ہو۔ ظاہر بات ہے کہ جب سارا دماغ چاٹ لیا جائے گا۔ تو گردش شام و سحر کی خبر ہی نہ ہو گی۔

ضیاء الحسن صاحب کے پانچویں بھائی چودھری رام کشن جی ہیں۔ بہت بچپن سے میرے ساتھ پرائمری جماعت میں پڑھتے تھے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد وہ اپنے بابا کی کپڑے کی دکان پر بیٹھ گئے۔ پھر زمانہ گزر گیا۔ میں نے بی اے پاس کر لیا اس کا رام کشن جی کو بھی پتہ چل گیا۔ وہ مجھے بڑا لائق آدمی سمجھنے لگے۔ اپنے کاروباری خطوط پڑھانے اور لکھانے کے علاوہ اپنے راج

پھوڑے کے علاج سے لے کر اپنی لڑکی کی شادی تک ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا بار بار دہرایا جانے والا جملہ یہ ہے :۔

”بھئی تم علم و ادب کے خوب چرچے کرتے ہو۔ کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا دیسی کپڑوں کے ساتھ ولائتی کپڑوں کی بھی تجارت کردوں؟“

”کیا چھوٹے لڑکے کو گرجا کے اسکول میں بھیج دوں؟ یا اپنے سرکاری مدرسہ میں ہی شریک کراؤں؟“

کیا راج پھوڑے کا اپریشن کراؤں یا دوائیاں ہی کھاتا رہوں؟“

کیا دیوان خانے کی دیوار اینٹوں سے چنواؤں یا لکڑی کی جالی ٹھکوا دوں؟“

کیا حقہ چھوڑ کر سگریٹ شروع کر دوں یا صرف پان کھاؤں؟“

غرضیکہ رام کشن جی ہر روز مجھ سے میری قابلیت کا امتحان لینے کے لئے کوئی نہ کوئی صلاح مشورے کرنے ضرور آتے ہیں اور محض اس لئے کہ میں بقول ان کے علم و ادب کے خوب چرچے کر رہا ہوں اور میری کھوپڑی میں بہت بڑا دماغ ہے۔ اب میں رام کشن جی کو کس طرح سمجھاؤں کہ میری کھوپڑی میں جتنا کچھ مغز تھا وہ ضیاء الحسن نے، پیشکار تحقیل نے، پڑوسی بزرگ نے، آرٹسٹ نے، اور — خود آپ نے چاٹ ڈالا ہے۔ اب میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں کہ اپنے راج پھوڑے کا آپریشن کرانا چاہیئے۔

اس لئے اب مجھے معاف کیجئے اور اجازت دیجئے۔ خدا حافظ !

قصّہ پہلے درویش کا

اے حمید

پہلے درویش نے دوسرے درویش کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور اپنے قصّے کی ابتدا غالباً غالب کے اس شعر سے کی کہ ؎

اچھے عیسیٰ ہو، مریضوں کا خیال اچھا ہے
وہ انگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

تینوں درویش اس شعر پر عش عش کرتے ہوئے اُٹھے اور پہلے درویش کا سر دھننے لگا۔ پہلے درویش کی پگڑی کھل گئی۔ اس نے پگڑی باندھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا:۔

بھائیو! اس غلام کمترین کی داستان بڑی المناک ہے، اس قدر المناک کہ رسالہ سویرا" کے ایڈیٹر نے محض اس لئے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا کہ اُسے پڑھ کر کاتب کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میری داستان غریب حمزہ ایک ایسے شہر کے ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوتی ہے جو ہم سے تھوڑی دور ہمارے ارد گرد پھیلا ہوا ہے۔ میں پہلی مرتبہ اس شہر میں وارد ہوا تو شریف آدمیوں کے لباس میں ملبوس تھا چنانچہ اسٹیشن پر ہی پکڑ لیا گیا اور جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ دوسری مرتبہ میں گرہ کٹ کے بھیس میں نمودار ہوا تو ریلوے اسٹیشن پر میری خوب آؤ بھگت اور جاؤ بھگت ہوئی۔ لوگوں نے فرطِ محبت سے میرے گلے میں اتنے ہار ڈالے کہ میرا چہرہ ان میں چھپ گیا تو ایک آدمی نے فرطِ محبت سے مجبور ہو کر میری دونوں جیبیں کاٹیں اور ان میں سے ہوٹلوں کے بل نکال کر لے گیا۔ ایک اور آدمی ہجوم کو چیرتا ہوا میری طرف بڑھا۔ قریب آ کر اس نے اپنے رومال سے میری داہنی مونچھ جھاڑی اور اس پر ایک بوسہ دیا اور جیب سے سموسہ نکال کر کھانے لگے۔ میں نے پوچھا:۔

بھائی یہ بوسہ اور سموسہ کیا ہوا؟

اس پر وہ مردِ بد لگام لیکن خوش کلام یُوں بولا۔

"وہی جو غمزہ اور شتر غمزہ ہوتا ہے"۔

میں دماغ ہی دماغ میں اس آدمی کی عقل پر دنگ رہ گیا۔ اتنے میں لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر لے آئے۔ باہر آ کر ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے باری باری معانقہ کیا اور میرے گلے سے اپنا اپنا ہار اتار کر چلتے بنے۔

ایکا ایکی ایک تانگہ میرے قریب سے گزرا جسے دیکھ کر میرے کندھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس لئے کہ اس کی پچھلی سیٹ

پر ایک لمبے منہ والا گھوڑا حاجیوں والا زرد رومال سر پر باندھے، عینک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یاالٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل — یہ میں کون سے شہر میں آ گیا ہوں۔

خیر تو میرے بھائیو! میں وہاں سے ایک بازار کی جانب چل پڑا۔ ایک جگہ مجھے کچھ بھیڑ نظر آئی۔ پاس جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کتا زمین پر نیم جان سا لیٹا ہے اور اس کی ٹانگ میں سے خون بہہ رہا ہے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اُسے ایک آدمی نے کاٹ کھایا ہے۔ قریب میں تین چار کتے کھڑے تھے۔ ایک کتے نے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے دوسرے کتے سے کہا:

"اسے فوراً ٹیکے لگوانے چاہئیں!"

اتنا سُن کر میں چپکے سے ایک طرف کھسک گیا۔ کیونکہ میرے آس پاس بہت آدمی کھڑے تھے۔

جس بازار سے میں گذر رہا تھا وہ کافی بارونق تھا۔ دونوں طرف کی دکانیں خوبصورت اور آراستہ پیراستہ تھیں۔ چونکہ رمضان شریف کا مہینہ تھا اس لئے لوگ جوق در جوق ریستورانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ریستوران کے دروازے پر چھوٹا سا بورڈ لٹک رہا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"یہ ہوٹل رمضان شریف کے احترام میں بند ہے۔"

نوٹ: کھانا کھانے کے لئے پچھلی گلی سے تشریف لائیں۔

میں ابھی بورڈ پڑھ ہی رہا تھا کہ نزدیکی دکان میں سے دو ننگ دھڑنگ آدمی بھاگتے ہوئے نکلے اور سامنے والی گلی میں گم ہو گئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو دکان کی پیشانی پر سُرخ الفاظ میں لکھا تھا۔

یہاں بھاگتے چوروں کی لنگوٹیاں بکتی ہیں۔"

میں وہاں سے بھاگنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی لنگوٹی کا خیال آیا اور میں پہلے سے بھی زیادہ آہستگی سے چلنے لگا۔ کچھ دور چلنے پر میں نے دیکھا کہ دو آدمی کسی بات پر بڑی گرما گرمی سے جھگڑا کر رہے تھے۔ ایک آدمی دوسرے سے کہنے لگا:

میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا"

دوسرے آدمی نے بڑی لاپروائی سے کہا۔ دیکھ لوں گا جب تم اینٹ سے اینٹ بجاؤ گے۔

اس پر پہلے آدمی نے آگے بڑھ کر سڑک پر پڑی اینٹیں اٹھائیں اور انہیں ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ بجانے لگا۔ اس کے بعد اپنے ہاتھ جھاڑے اور ایک طرف چل پڑا۔ بس پھر کیا تھا۔ دوسرے لوگ ہاتھ جوڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اسی ہجوم میں اچانک ایک کمسن لڑکا ایک بزرگ صورت آدمی کو کان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر نکال لایا اور آنکھیں لال کرتے ہوئے گرجا:

"ابا جان میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ دوپہر کے وقت گھر سے باہر نہ نکلا کریں مگر آپ سُنی ان سُنی کر دیتے ہیں۔" اس بزرگ صورت آدمی نے منہ لٹکا کر اور کانپتے ہوئے کہا:

بیٹا جان! میں تو زمیندار اخبار لینے آیا تھا۔

لڑکے نے کان چھوڑ کر اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کیا اور کہا:

"اب سیدھے گھر جائیے اور اسکول کا سبق یاد کیجئے — مائی گڈنس! کیسے والدین سے سابقہ پڑا ہے۔"

میرے ہم شکل اور میرے ہم عقل بھائیو! میں گھاٹیوں کی ٹکالی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ششدر ہو کر رہ گیا اور وہاں سے جلدی جلدی

بھاگ نکلا۔ آگے بڑے چوک کے وسط میں ایک خوبصورت فوارہ لگا تھا جس میں سے پانی ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر باہر ابل رہا تھا فوارے کے نیچے ایک پرندہ بیٹھا تھا جو اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ اس کے اوپر ایک اور پرندہ درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا۔ ترازو اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ پلڑوں میں پرندے ڈالے انہیں تول رہا تھا۔ فوارے کی داہنی جانب میں نے سبز سبز گھاس پر ایک بڑے ہی پیارے اور معصوم صورت گڈے سے بچے کو دیکھا جو چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے کھیل رہا تھا اور خود بخود ہنس رہا تھا۔ بچہ مجھے اسقدر پیارا لگا کہ میں جو کبھی بچوں کو پیار نہیں کرتا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی محبت سے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا:

ہیلو بے بی! ہیلو سویٹ بے بی! او ہیلو گڈی! بسکٹ کھاؤ گے؟

بچے نے اچانک کھلونے ہاتھ سے رکھ دیے۔ نیکر کی جیب سے لائبریری فریم والی عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور مجھے گھورتے ہوئے بھاری آواز میں بولا:

"مسٹر! مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرو۔"

اے اللہ کے درد یشو! اتنا سننا تھا کہ میری پگڑی اچھل کر مجھ سے دور جا گری۔ جب میں وہاں سے بھاگنے لگا تو بچے نے ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر پڑھا؎

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
میں خود "لایا" نہیں "آیا" گیا ہوں

میرے حواس ابھی اپنے ٹھکانے پر نہیں آئے تھے۔ میں انہیں ٹھکانے پر لانے کے لئے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب میرے حواس مکمل طور پر جمع ہو گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس ہی دستار اور عمامہ پوش ایک بوڑھے بزرگ تشریف فرما ہیں اور کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ان کا منہ کتاب نے ڈھانپ کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو ان سب سے ذرا دو باتیں ہی کر لیں۔ میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

کیوں صاحب آج موسم کیسا ہے؟

دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ میں نے کان صاف کرتے ہوئے اپنا سوال پھر دہرایا۔ جواب میں حسب سابق خاموشی طاری رہی۔ میرے تیسری مرتبہ استفسار کرنے پر وہ بزرگ کتاب پرے ہٹا کر مجھے قہر بھری نگاہوں سے گھورنے لگے۔ انہیں دیکھ کر میرے پنج کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ وہ بزرگ منہ میں چوسنی لئے جلدی جلدی شہد چوس رہے تھے۔ میں وہاں سے سر پر جوتے رکھ کر بھاگا اور شہر کی سب سے بڑی سڑک پر آ کر دم لیا لیکن یہاں آ کر عجیب ہی تماشا دیکھا۔ چوک میں ٹریفک کا سپاہی بے شمار سائیکل سواروں کے درمیان کھڑا ان کا چالان کر رہا تھا۔ اگرچہ دھوپ کافی روشن تھی۔ پھر بھی ان لوگوں کا محض اس لئے چالان ہو رہا تھا کہ وہ صبح کے وقت بغیر بتی کے سائیکل چلا رہے تھے۔ ایک کوچوان میری پگڑی دیکھ کر تانگہ میرے پاس لا کر بولا۔

داتا کے دربار چلیے گا جناب؟

میرے انکار پر کوچوان نے اصرار کرتے ہوئے کہا:

"سرکار پلک جھپکنے میں پہنچا دوں گا۔ پندرہ ہارس پاور کا گھوڑا ہے۔"

میں نے ڈر کر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ گھوڑے نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور ناک چڑھا کر بولا:

جھوٹ بکتا ہے، میں صرف ایک پارس پادر ہوں۔"

جوں جوں شام ہو رہی تھی میرے درویش بھائیو! میرے دل کو یہ فکر دامن گیر تھا کہ رات کہاں گزاری جائے۔ گھومتے گھومتے میں شہر کی چار دیواری میں آ گیا۔ یہاں ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی۔ طبلے بج رہے تھے اور قوال جھوم جھوم کر یہ دوہا بار بار پڑھ رہے تھے ؎

اک ماجرا سناتا ہوں، میں حُسن و عشق کا
"دے لی" کا ایک عاشقِ دیوانہ قیس تھا
بعد فنا تھے دونوں کے مرقد جُدا جُدا
لیکن وہ دونوں قبروں سے آتی تھی یہ صدا

کیا؟

تیرے مکھڑے تے کالا کالا تل وے
وے مُنڈیا سیالکوٹیا

پہلے قوال اُٹھے تو ایک اور قوال صاحب تشریف لائے جو ٹیلر ماسٹر تھے۔ اُنہوں نے بیٹھتے ہی گانا شروع کر دیا ؎

میں نے لاکھوں کے کوٹ سیے ستمگر تیرے لئے

اس پہلے ہی مصرع سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے اُٹھ کر ناچنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے کوٹ پھاڑ ڈالے، درزی قوال کے شاگرد آگے بڑھے اور آن کی آن میں سارے کوٹ جمع کر کے لے گئے۔ میں نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کئے اور آگے چل پڑا

اے میرے پیارے چوتھے درویش! اس سے پیشتر کہ میں کہانی کا آخری حصہ بیان کروں، تو اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر بگلے کا ایک سگریٹ نکال کر مجھے پلا تا کہ میرے حواس باطنیہ حواس خمسہ سے لطف اندوز ہوں!"

اس پر چوتھے درویش نے رونی صورت بناتے ہوئے بگلے کا سگریٹ نکالا اور پہلے درویش کو دیا۔

بگلے کے سگریٹ کا کش کھینچ کر پہلا درویش ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور اپنی داستان بیان کرنے لگا۔

بھائیو! شام ہو چکی تھی۔ میں نے کہیں سے سُن رکھا تھا کہ اس شہر میں شام کے وقت خوشحال لوگ دسترخوان پر کھانا چُن کر مہمانوں کی تلاش میں گلیوں میں چکر لگایا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی امید میں، میں بھی گلیوں میں گھومنے لگا۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اچانک کسی نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور دو آدمی مجھے اٹھا کر کسی پُراسرار ہوٹل میں لے گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھلا کر ایک نے پستول نکال کر باہر رکھ دیا اور باقی دونوں آدمی کرسیاں کھینچ کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔

ہمیں کھانا کھلاؤ یا ہماری گولیاں ٹھنڈی کرو۔

میں سناٹے میں آ گیا۔ اُنہوں نے اس دوران میں طرح طرح کے کھانوں کا آرڈر دیا اور کھا پی کر بل میرے حوالے کر کے چلتے بنے۔ میں نے اُٹھتے ہوئے بل ہوٹل کے منیجر کے حوالے کر دیا اور ہوٹل کے منیجر نے مجھے حوالہ پولیس کر دیا۔ اور پولیس مجھے حوالات میں لے گئی اتفاق دیکھئے کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے کلاہ میں ایک قیمتی پتھر جڑا ہوا ہے اسے بیچ کر میں نے جوہری سے ساڑھے گیارہ روپے وصول کئے۔ پانچ روپے حوالات کے وارڈن کو دیئے، پانچ روپے میں ان لوگوں کا بل ادا کیا جو میزبان کی تلاش میں رات کو گلیوں میں گھوما

کرتے ہیں اور باقی پیسے جیب میں ڈال کر پاک ٹی ہاؤس میں جا بیٹھا اور چائے پینے لگا۔

میرے بالکل سامنے ایک لمبی ناک والا آدمی پلیٹ میں برف ڈالے اس کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ ایک اور آدمی آئس کریم میں کھیرے کے قتلے ڈال کر نوشِ جان کر رہا تھا۔ بچی ہوئی آئس کریم اس نے اپنے بٹوے میں ڈالی، بوٹ کے تسمے کھول کر روپے کا نوٹ نکالا۔ بل پر دستخط کئے اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ایک نوجوان لڑکا چائے کی پیالی سامنے رکھے زار زار رو رہا تھا۔ اور بار بار ایش ٹرے اٹھا کر اس میں آنسوؤں کے قطرے گرا رہا تھا۔ سگریٹ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے اسے چائے کے پیالے میں ڈال کر بجھایا ادھر اُدھر دیکھ کر ایش ٹرے جیب میں ڈال کر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا اس کے عین اوپر لکھا تھا۔

"براہِ مہربانی سگریٹ پیالوں میں مت بجھایئے اور اگر آپ ایسا کرنے پر مجبور ہیں تو بیرے کو کہیے کہ چائے ایش ٹرے میں لائے"

میں اُٹھنے ہی والا تھا کہ دو گنجے سروں والے بقراط ٹائپ آدمی اندر آئے بڑی احتیاط سے میز کے گرد بیٹھ کر انہوں نے ایک پلیٹ بکری کے مغز کا آرڈر دیا اور جب مغز آیا تو بڑی خاموشی سے مغز کھانے لگے۔ اس ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے سوچا کہاں جاؤں؟ کدھر جاؤں؟ دو ادیب میرے پاس سے گاتے ہوئے گذر گئے؎

من کا پنچھی بول اُٹھا ہے

بول سجن تیری جیب میں کیا ہے؟ —— جیب میں کیا ہے؟

میری جیب کی بات نہ پوچھو۔

ہائے کوئی پیسہ نہیں۔

اب میرے سامنے کوئی منزلِ مقصود نہ تھی۔ چنانچہ میں نے یونہی بے مقصد گھومنا شروع کر دیا۔ مصری شاہ کے سامنے باغ میں مجھے دو پولیس کے سپاہیوں نے روک لیا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے کہا:

بھلا درویش!

میرا اتنا ہی جواب سُن کر وہ مجھے پکڑ کر تھانے لے گئے اور آوارہ گردی کے جُرم میں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا اس حوالات میں میری ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو قتل کے جرم میں وہاں رات بھر کے لئے رکھا گیا تھا۔ اس کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے ایک آدمی سے نیکی کی تھی اور پھر اس آدمی کو دریا میں ڈال دیا تھا۔

رات بھر میں اس آدمی سے ڈر کر ایک کونے میں دبکا بیٹھا رہا اور وہ آدمی چیخ چیخ کر پکارتا رہا۔

"نیکی کر دریا میں ڈال۔"

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور پولیس والوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ باہر نکل کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے دُم نکل آئی ہے، میں نے جلدی سے اسے دبایا اور اسٹیشن کی طرف بھاگ اُٹھا۔ کہیں گانا ہو رہا تھا۔

میری گٹھڑی کو لاگا چور

مسافر بھاگ ذرا۔

اور اے میرے درویش بھائیو! اب میں نے اس تکیے میں آ کر دم لیا ہے اور ان شاء اللہ اسی جگہ دم دوں گا۔"

یہ قصہ سن کر دو درویش تو ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور تیسرے درویش نے اچھل کر کہا۔

بھائی! خدا کے لئے مجھے یہ قصہ قلمبند کر دے میں نیا نیا اخبار کا ایڈیٹر ہوا ہوں۔

ہونا قریب الاختتام پہلے درویش کے قصے کا۔

جشنِ جمہوریّت کی ایک دوپہر

غلام احمد فرقت کاکوروی

گورستان عیش باغ لکھنؤ "چمن" نمبر ۵ میں دور تک قبروں کا سلسلہ پھیلا گیا ہے۔ درمیان میں جو حصہ قبروں کی زد سے بچا ہوا ہے۔ اس پر چھوٹی چھوٹی چوکیوں کو ملا کر کچھ اس طرح بچھا دیا گیا ہے کہ اس نے چبوترے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس چوکی دار چبوترے پر ایک میلی کچیلی دری بچھی ہے۔ چوکیوں کے پستہ قد پایوں میں جکڑی ہوئی چار چھڑوں پر ایک سفید پھٹی چادر اس طرح تان دی گئی ہے کہ اس نے خود بہ خود شامیانے کے فرائض انجام دینا شروع کر دیے ہیں۔ اس ننھے منے چبوترے پر گنتی کے چار پانچ افراد بیٹھ کر بارش یا دھوپ سے اپنے کو کم و بیش محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ بقیہ ساٹھ ستر مدقوق اور کرم خوردہ افراد جو اس وقت اس گورستانی جنگل میں منگل مناتے نظر آ رہے ہیں۔ مختلف ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں تقسیم ہیں۔ ان خفیف الجثہ حضرات کے بچے اور ڈھلے عبرتناک جسموں سے کافور کی بو آنے لگی ہے تین چار حضرات شامیانے کی بغل میں بیٹھے پرانے گڑ کی ڈلیوں کو توڑ توڑ کر ننھی ننھی کنکریوں میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس ٹولی کے عقب میں کچھ فاصلے پر چار عرق کشیدہ جسم اپنی مدک، چرس اور گانجے کی کو کلی اور غرارہ کرانے میں مصروف ہیں۔ ایک جگہ بڑی سی دیگ میں چائے کی یخنی بن رہی ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے کچھ لوگ اٹھ اٹھ کر اس میں جھانک بھی لیتے ہیں تاکہ باتوں کی جھک میں یخنی کی تیاری اور عدم تیاری سے باخبر رہیں۔ اتنے میں قبرستان کے پھاٹک سے کچھ لوگ کندھوں پر شاہی وقتوں کے کرم خوردہ دوشالے ڈالے ہاتھوں میں عصا اور بغل میں کابکیں دبائے داخل ہوتے ہیں۔ وضع قطع سے یہ لوگ اس گروہ کے معززین معلوم ہوتے ہیں۔

قبرستان کے پھاٹک پر دفتی کا ایک بڑا سا سائن بورڈ آویزاں ہے جس پر جشنِ جمہوریت ۵۱ء جلی حرفوں میں لکھا ہے چنانچہ ہر نو وارد پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک کر اس سائن بورڈ کو اس طرح پڑھتا نظر آتا ہے جس طرح سینما کے علتی تماشہ گاہ میں داخل ہونے سے پہلے گیلری کی تصاویر پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔ کچھ لوگ سپاٹ قبروں پر چادریں بچھائے بغل میں کابکیں رکھے

سینک سلائی پونڈوں کو ہاتھ روک روک کر احتیاط سے تراش رہے ہیں کہ گنّوں کی سبز چھریوں کی زد سے محفوظ رہے انہی میں ایک صاحب افیون کے فضائل بیان فرما رہے ہیں!

متّے۔ سچ کہیے گا میر صاحب۔ اس معبودِ حقیقی نے جنیا جان کیا شے پیدا کی ہے۔

میر صاحب۔ اے حضرت کیا کہنے۔ نوشدارو کہئے "بل کن" آبِ بقا۔

متّے۔ حضور والا اس کے فضائل کے لئے دفتر چاہییں۔ رنگت یہ نکالے، قوت یہ بخشے، علم یہ سکھائے۔ شب زندہ دار دل و دماغ حاضر۔ پھر پیتے ہی رگ رگ میں طاقت دوڑ جائے۔ عضو عضو میں خون کے عوض طاقت نظر آئے۔

میر صاحب:۔ اے میاں یہ کرامت کیوں نہیں بیان کرتے کہ چاہے ہوش نہ باقی رہے۔ گردن زمین سے مل جائے مگر نیند کا آنا حرام۔ ادھر جھپکی لی اُدھر مراقبہ میں گئے۔ پھر انجام پر نگاہ کیجئے تو یعنی کہ افیونی کی موت پر تو فرشتوں نے رشک کیا ہے، قبلہ عالم انجیل میں دیکھئے تو جگہ جگہ اس کا ذکر آیا ہے۔

آگے بڑھ کر فضا میں طلسم ہوش ربا گھوم رہی ہے۔

"صف آرائی شروع ہوئی، میمنہ و میسرہ و قلب و جناح و ساقہ و کمین گاہ چودہ صفیں مثل سدِ سکندری کے آراستہ ہوئیں۔ سواروں کے آگے پیادے جنگ کے آمادے دیو اور فوج تھے۔ سوار دریائے لشکر میں موج در موج تھے۔ گھوڑے برابر تھوتھنی سے تھوتھنی اور پٹھے سے پٹھا دُم سے دم سُم سے سم ملائے ہوئے تھے۔ نقیب جو آگے بڑھ آتا تھا اس کو پیچھے ہٹاتے تھے۔ گھٹنے ہونے کو آگے بڑھاتے تھے۔ دم بدم باجے زری بجتے تھے۔ مرکب الف ہوتے تھے۔"

(واہ وا سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں اور ایک ساتھ فضا میں یہ آوازیں ارتعاش کرتی سنائی پڑتی ہیں)

"یہ سوچ کر ایک ترنج اُٹھا کر تخت سے شدید کے مارا کہ سینے کے پار ہو گیا۔ غلغلہ اس کے مرنے کا برپا ہوا، پھر افراسیاب نے اپنے ہاتھوں کو ملایا، برقیں دسوں انگلیوں سے لپک کر گریں اور پھر ہمراہیان شدید کے خرمن ہستی کو جلا کر خاک کر دیا۔ بڑی دیر تک شور و غل رہا۔ جب وہ ہنگامہ برطرف ہوا افراسیاب گنبد پر آیا۔ حیرت نے تعظیم کی افراسیاب نے کہا اے حیرت یہ تمہارا بھینا پی بہار کا پہلا سحر تھا کہ شدید آپ میں نہ تھا۔ یہ تمہاری ذات سے اتنا بڑا لشکر میرا ہلاک ہوا۔"

(پھاٹک کی سیدھ میں کچھ فاصلہ پر بعض حضرات بحث و مباحثہ میں مصروف ہیں)

ایک:۔ اماں دتی سنا کہ کوئی شاہ صاحب پیر محمد صاحب کے ٹیلے پہ ٹکے ہیں اور مردے زندہ کرتے ہیں۔

دوسرا:۔ نہیں واللہ۔

تیسرا:۔ سنا تو میں نے بھی ہے بل کن یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ پرسوں فتو کی لڑکی کی خبر اُڑ گئی کہ وہ مر گئی۔ باپ بھائی کا جو حال تھا نہ پوچھو۔ اماں فضل پانی والے کے بڑے لڑکے فجو کو تو بیاہی تھی، فجو کا بُرا حال تھا۔ چنانچہ شاہ صاحب کے پاس سب اس میت کو لے گئے دوسرے دن شام کو لڑکی بھلی چنگی آ گئی۔

چوتھا:۔ اچھا تو آج پلیٹنوں میں چل کر دیکھیں گے واللہ یہ تو معجزہ ہو گیا۔ معجزہ۔ کچھ تفصیل بھی معلوم ہوئی۔

تیسرا:۔ یہ مرزا صاحب بیٹھے تو ہیں۔ اماں مرزا چھوٹونا۔

پہلا: اماں ہاں مرزا صاحب بیان کرو نا۔

(کئی افیونی کھسک کھسک کر قریب آجاتے ہیں۔)

مرزا صاحب: بھائی صاحب وہ شاہ صاحب یہاں کی مخلوق تو ہیں نہیں۔ کہیں عرب درب کی طرف سے ہیں۔ مگر پرسوں جو معجزہ دکھایا ہے قسم قرآن کی پروفیسر معشوق علی بھی اس کے آگے مات۔ جب سے ٹکے ہیں ایک خلقت انہیں دیکھنے چلی آرہی ہے۔ اماں وہ بھیڑ ہے کہ معاذ اللہ سنا ہے کہ دن ہی دن دکھائی پڑتے ہیں۔ ادھر شام ہوئی۔ اُدھر غائب۔ صرف معصوم کنواریوں کو نظر آتے ہیں حالانکہ کسی دخت (وقت) اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔

پہلا: اماں فجو کی لڑکی کا واقعہ بیان کرو۔ اِدھر اُدھر کی اُڑانے لگے۔

مرزا صاحب: ذری چھری تلے دم لو۔ سنی سنائی تو واللہ مجھے بھی یقین نہ آتا مگر آنکھوں دیکھی ہے تو جھوٹ بولنے والے پر خدا کی مار۔

دوسرا: تو ہوا کہ جونہی لاش شاہ صاحب کے سامنے رکھی گئی۔ اُنہوں نے پہلے تو اس کا سرہانا اپنی طرف کیا۔ اس کے بعد فجو کے باپ اور اس کے شوہر کو بلایا اور کچھ کان میں کہا۔ اس کے بعد ذری زور سے بولے۔ "تو تیار ہونا" اس کے بعد جب ان دونوں نے ہامی بھر لی سلفہ حافی ہو گئی تو شاہ صاحب نے ایک استرا نکال کر اپنا سر کاٹ لیا۔ قسم قرآن کی یہ دیکھ کر میرے تو ہوش اُڑ گئے۔ پھر اسی حالت میں ایک بکرا جو ان شاہ صاحب کے سرہانے بندھا تھا۔ اس کا سر کاٹ لیا۔ اس کے بعد اپنے دھڑ پر بکری کا سر رکھا اور بکرے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس پر دونوں میں خوب لڑائی گتھم گتھا ہوئی۔ مرتے ہوتے دونوں کے سر سے ایک شے زرد رنگ کی گری جو نہایت چمکیلی تھی۔ ایسی چمکیلی کہ گوہر شب تاب اس کے آگے مات۔ رفتہ رفتہ اس ذری کا ڈھیر بن گیا اور اس ڈھیر کو اچانک ایک چڑیا نے جو جھپٹ کر نہ جانے کہاں سے آگئی کھا لیا۔ بس مفت چڑیا کو شاہ صاحب نے جھٹ پکڑا اس کا کباب سیخ کیا اتنے میں جو دیکھتے ہیں تو شاہ صاحب کے سر اقدس پر خاص انہیں کا سر تھا۔ شاہ صاحب نے کباب لیکر فجو کی لڑکی کے منہ میں رکھ دیا۔ کیا کہ رکھنا تھا کہ وہ الا اللہ کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ایک دُور کی آواز: اماں جھوٹے مر گئے اور اولاد چھوڑ گئے۔

دوسری آواز: اماں چھٹن صاحب کہاں تھے؟ واللہ تمہاری تلاش میں تو کنوؤں میں بانس ڈال دیئے۔ پچھلے سال نہیں ملے تھے۔ تب کا دن اور آج کی گھڑی ہے کہ عید کا چاند ہو گئے۔ پھر پچھلے اتوار جانی مرزا کے یہاں بھی پالی میں نظر نہیں پڑے۔ اور آج بھی کچھ بجھے بجھے نظر پڑتے ہو۔ (نگالی بڑھاتے ہوئے) لو ایک چھینٹا ابھی اعن صاحب پی کر گئے ہیں تم بھی پیو اور ہمیں بھی پلاؤ۔ واللہ مدت سے تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے چھینٹو کو ترس گئے۔ یاد ہیں بنے نواب کی محل والی صحبتیں۔ اماں کیا زمانہ تھا (بغل میں ایک ساتھی کا شانہ ہلا کر) فجو صاحب دیکھتے ہو۔ یہ کون صاحب تمہارے سامنے آرم یار کھڑے ہیں۔

فجو صاحب: جی ہاں۔ ملاحظہ کیا۔ میں نے تو قسم ہے قرآن کی اسی مارے ان سے میل ملاقات ترک کر دی کہ جب گھر پر جاؤ تو یہ حضرت ندارد۔ اماں ہم تو کہتے ہیں زندگی چند روزہ ہے۔ ہنس بول کر گزار لو۔ نہ جانے کس وقت وہاں سے بلاوا آجائے۔ نہ آج جشن آزادی کے موقع پر پوسٹر کے ذریعہ ان تک ہمارے اس جلسہ کی بھنک پہنچتی۔ اور نہ یہ آج یہاں دکھائی پڑتے۔ اماں ہاں ذری یہ تو بتا نا کہ جلسہ ہے کے بجے سے ۱۲ بجے مجھے بیٹر کو گولی کھلانا ہے۔

وہی صاحب: اماں خیر تو ہے نصیب اعداء۔ یہ بیٹر پر کیا افتاد گزری۔

فجو صاحب: ۔ پرسوں شبن صاحب کے بیڑے سے شد کرنے میں بیڑ مکھی کھا گیا شب بھر طبیعت بدمزہ رہی۔ پرسوں (صبح' پھر بظاہر چاق و چوبند تو ہو گیا مگر اب بھی وقفہ سے اونگھ جاتا ہے حالانکہ مکھی کھاتے ہی میں نے دن سے اوٹھا دمیں تے کرا دی تھی۔

ایک آواز۔ حضرات اب جلسہ شروع ہونے جا رہا ہے آپ سب ادھر شامیانے کی طرف کھسک آئیں۔

دوسری آواز: ۔ ٹھہرو یار آتے ہیں۔ ذری نگالی دھو لیں۔

تیسری آواز: ۔ لو صاحب جلسہ تو شروع ہو گیا۔

چوتھی آواز۔ اماں اچھے آغا چل کر ذری ان کی بھی سن لو۔

پانچویں آواز۔ اماں تمہیں قسم ہے ذری دیکھو تو ہر شخص چوکی پر بیٹھنے کے لئے کتنا بے چین ہے بھئی کیا ننھا سا شامیانہ تان رکھا ہے۔

تیسرا۔ اماں برس برس کے دن ایک بدی لے کر کسی بانس ہی واس پر ٹانگ دی ہوتی۔

پہلا۔ واللہ کیا پیٹ بھروں کی سی باتیں ہیں۔ بیڑوں کی کاکن کے دام میسر نہیں چلے ہیں ادھی بدھی نصب کرنے۔ اماں دیکھ رہے ہو شامیانے کا خرچہ کس مشکل سے نکلا ہے

چوکی پر کی ایک آواز۔ حضرات اب جلسہ شروع ہونے جا رہا ہے۔ میں اس کی صدارت کے لئے اپنے آغا صاحب کا نام پیش کرتا ہوں۔ (سامعین کی چاؤں چاؤں کے ساتھ)

ایک آواز۔ لو نے صاحب رہ گئے۔

دوسری آواز۔ کیوں صاحب دلارے جانی آغا صاحب سے کس چیز میں کم تھے۔ جو انہیں صدر نہیں بنایا گیا۔

تیسری آواز۔ اماں کیا جھک جھک لگا رکھی ہے نکلے دانت اب بیٹھنے سے رہے۔ خوشی کے موقع پر یہ فضول کی باتوں سے کیا حاصل

چوتھی آواز۔ اچھا صاحب آپ جانے سے باہر نہ ہوں لیجئے ہم چپ ہوئے جاتے ہیں۔ اب جو زبان سے بولے اس پر تین حرف

شامیانے سے صدر کی آواز۔ تو چھٹن صاحب۔ آپ کچھ فرمائیں گے؟

چھٹن صاحب۔ (باقر مرزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ جو ایک طرف چوکی پر پیر لٹکائے بیٹھے ہیں۔)

مرزا صاحب۔ واللہ پہلے آپ شروع ہوں۔ میرا نمبر تو آپ کے بعد ہی ہوگا

باقر مرزا۔ جناب صدر نے تو آپ سے درخواست کی ہے نہ کہ اس ناچیز سے۔

صدر۔ مرزا صاحب واللہ معاف فرمائیے گا قسم ہے قرآن کی آپ کچھ اس طرح کیری کی طرح پتوں میں چھپے چھپائے بیٹھے تھے کہ آپ تک نگاہ ہی نہیں گئی تو پھر آئیے نا۔

چھٹن صاحب۔ (مرزا صاحب سے) واللہ بس اب شروع ہو جائیے۔ کچھ کلمات آپ فرما دیں۔ کچھ کھڑے ہو کر میں کہہ دوں گا پھر تو اچھے آغا اپنا حق ادا ہی کریں گے۔

مرزا صاحب بڑے تکلف سے اٹھ کر پہلے تو ہر چار طرف جھک جھک کر کورنش اور تسلیمات عرض کرتے ہیں پھر صدر سے مخاطب ہو کر اشارہ سے اجازت لیتے ہیں۔

صدر :۔ بسم اللہ۔

مرزا صاحب :۔ بھائیو۔ آج پورے ایک سال کے بعد ہم لوگ دوبارہ جشن جمہوریت منانے کی غرض سے اپنے آباؤ اجداد کے اس پرانے نشیمن پر جمع ہوئے ہیں گردوپیش مرنے والوں کی روحیں نہ شرمائیں تو ایک بات عرض کروں کہ پچھلے ایک سال کے عرصہ میں بہت سے ساتھی ہم سے بچھڑ کر پیوند خاک ہو گئے ہم اس بات پر جس قدر بھی اظہار حسرت کریں کم ہے کہ اگرچہ وہ پاک روحیں ہم میں موجود نہیں تاہم وہ ہم سے دُور بھی نہیں۔ وہ ہم عاشقان صادق میں نہ ہوتے ہوئے بھی ہم میں موجود ہیں

؎ ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است پر جریدۂ عالم دوام ما!

ہم میں اور ان حضرات میں اگر بُعد ہے تو صرف گز دو گز کا کہ ہم اوپر بیٹھے جشن آزادی منا رہے ہیں اور وہ اپنی ڈھائی گزی تربتوں میں لیٹے لیٹے جشن کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کہ ہمارے طبقے کی حکومت سے وفاداری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے (جلسے سے واہ وا سبحان اللہ، قسم قرآن کی کیسا گوشہ نکالا ہے۔ جزاک اللہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور مرزا صاحب جُھک جُھک کر سلام کرتے ہیں۔)

حضرات! عمائدین حکومت مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ عرض کروں کہ ہم اور ہمارے جملہ رفقا جن میں سے بیشتر اس وقت ہم میں موجود نہیں ہیں ان کو حکومت سے صرف اس بات کا شکوہ ہے کہ جب سے ہمارے دیس کے نیتاؤں نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی ہے اس وقت سے کاکن کے دام بہت چڑھ گئے ہیں جس کے سبب ہماری پالیاں بے رونق ہو کر رہ گئی ہیں۔ پیٹ بھر کاکن میسر نہ ہونے کے سبب ہمارے اکثر چوٹی کے بیٹر گزر گئے لہٰذا ان بے زبانوں کی طرف سے ہم اس جشن آزادی کے موقع پر حکومت سے دادرسی کے طالب ہیں دوسری چیز اس سلسلہ میں یہ عرض کرنے کی ہے کہ خاتمہ زمینداری کے معاملے میں عمائدین حکومت کی طرف سے جو اقدامات عمل میں لائے جا رہے ہیں ان کی ضرب بھی براہ راست ہم ہی وفاداروں پر پڑ رہی ہے جو باوجود مالی مشکلات کے آپ کی ہر خوشی کو اپنی خوشی اور ہر غم کو اپنا غم تصور کرتے ہیں کیونکہ بڑے بڑے زمیندار جن کے علاقوں میں ہر فصل میں بیٹروں کا شکار لگتا ہے۔ ان کے مٹنے کے سبب ہمارے ہاتھ پاؤں کٹ کر رہ گئے ہیں ہم تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ ہماری حالت ایک یتیم بچے کی سی ہو گئی ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ اچھے بیٹر بازار میں آنا بند ہو گئے جو گھا گر کبھی آٹھ دس آنے کو ملتا تھا یقین جانیے کہ اب وہ پانچ سات روپے میں بھی میسر نہیں آتا۔ درحقیقت زمینداروں کی تباہی ہماری تباہی ہے اور ہمارے مظلوم طبقے کی تباہی زمینداروں کی تباہی ہے کیونکہ نواب غنی صاحب اور بھورے نواب صاحب جن کے دم سے سالہا سال سے چوٹیوں پر اتواریں ہوا کرتی تھیں خاتمہ زمینداری کی آواز سنتے ہی بند ہو گئیں اور حضور یہ واقعہ ہے کہ خاتمہ زمینداری کا اعلان سرکار نے نہ صرف زمینداری کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ ہمارے ڈربے بھی پھونک دیئے ہیں ہمارے بیٹروں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے مگر ہم عمائدین حکومت کو یقین دلاتے ہیں اور وہ چاہے اسے باور کریں یا نہ کریں مگر اس مادی دنیا سے گزرنے کے بعد زمیندار پھر زمیندار ہی رہتا ہے خواہ اس جور و تشدد گزرنے والوں کا کچھ ہی حال کیوں نہ ہو چنانچہ عرض کرتا ہوں ؎

مرنے کے بعد بھی نہ ریاست کی بو گئی
دو گز زمین پا کے زمیندار ہو گئے

(چار جانب سے سبحان اللہ، مکرر ارشاد، ماشاء اللہ، قسم قرآن کی طبیعت خوش کر دی، واللہ مرزا کیا کیا حق ادا کر رہے ہو کی آوازیں بلند ہوتی ہیں)

ایک زور کی آواز۔ مرزا صاحب! واللہ سیری نہیں ہوئی پھر ارشاد ہو (مرزا صاحب جھک جھک کر اور دوہرے ہو ہو کر شعر کو دہراتے جاتے ہیں اور سلام کرتے جاتے ہیں۔)

تو اس سلسلہ میں مجھے آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا ہے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جہاں ہماری سرکار کی طرف سے ملک کے گوشہ گوشہ میں بڑے بڑے فارم اور بڑے بڑے مرغی خانے کھولے جانے کی اسکیم ہے وہاں کچھ فارم ایسے بھی کھلوائے جائیں جہاں ہم بٹیروں کا شکار لگا کر اچھی بٹیریں حاصل کر سکیں۔

ایک آواز۔ حضرت، کچھ افیون، چرس، مدک اور گانجے والوں کی زحمتوں پر بھی روشنی ڈالتے چلئے۔

مرزا صاحب۔ (سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے) تو جن دوسری چیزوں کی طرف میں ارباب حکومت کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادھر بعض حضرات نے مجھے آن کر بتایا کہ ادھر کچھ نشے پانی پر بھی سرکار کی طرف سے بندشیں عائد ہوئی ہیں۔ جس کے سبب دکان داروں نے افیون چرس مدک اور گانجے سے شوق رکھنے والوں کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ جو سرکار برطانیہ کے دور میں بھی نہیں تھیں۔ منشیات پر محصول بڑھ گئے ہیں، افیون بازاروں سے عنقا ہو گئی ہے جس کے سبب ہمارے بہت سے رفقائے کار رشتۂ حیات منقطع ہو گیا ہے اور ہمارے بڑے بڑے کہنہ مشق اساتذہ ہم کو داغ جدائی دے گئے۔ جس کے سبب ہم ان کے فیضان صحبت سے محروم ہو گئے لہٰذا اس جشن آزادی کے موقع پر ہمارا مطالبہ ہے کہ کوآپریٹو سوسائٹیوں اور گاؤں پنچایتوں کے ذمہ داروں کو سرکاری طور پر توجہ دلائی جائے کہ وہ اس ضمن میں ہم کو سہولتیں پہنچائیں اور بٹیروں کی دوا دارو کے لئے جہاں شہروں اور دیہاتوں میں مرغیوں کے ہسپتال قائم کئے جا رہے ہیں۔ وہاں بٹیروں کے لئے بھی سرکاری شفا خانے کھولے جائیں اور ان شفا خانوں میں ہمارے ان آدمیوں کو جگہیں دی جائیں جنہوں نے اپنی عمر کے بہترین حصے بٹیروں پر ریاض کرنے میں صرف کر دیئے ہیں۔

(صف سامعین سے سبحان اللہ، واہ وا، کیا نکات بیان کر رہے ہو۔ مرزا کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور فاضل مقرر گھوم گھوم کر ہر آواز پر دہرے ہو ہو کر سلام کرتا ہے۔)

کئی آوازیں۔ جزاک اللہ

مرزا صاحب۔ (سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے) تاکہ ہمارے طبقے کو بھی احساس ہو کہ ہم آزاد ہوئے۔ ہمارے نیتاؤں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور آئی، اور ہماری غلامی کی بیڑیاں کٹیں۔

صدر (مرزا صاحب سے) واللہ کیا کیا پہلو نکال رہے ہو۔ قسم قرآن کی ختم تقریر پہ چھٹن صاحب کے ہاتھوں کے بنے ہوئے دو چھینٹے میری طرف سے۔

(سامعین میں سے کئی آوازیں۔ مرزا صاحب (پیشگی ختم تقریر پر چھیٹن صاحب کے ہاتھوں کے بنے ہوئے میری طرف سے بھی قبول فرمائیے گا۔)

مرزا صاحب۔ (سلسلہ کلام کو ختم کرتے ہوئے) ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

(سامعین کی صفوں سے پھر ایک شور اور ایک غوغا بلند ہوتا ہے اور "واللہ مرزا صاحب حق ادا کر دیا کیا تیور سے تقریر کی ہے" کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور صدر سبحان اللہ اور واہ وا کے ساتھ مرزا کی پیٹھ تھپ تھپاتے ہیں اس کے بعد)

صدر۔ (سامعین سے مخاطب ہوکر) نواب چھیٹن صاحب جو ہمارے شہر کے مشہور و معروف بیٹر باز ہیں . . . . . اور بیٹروں کے معالج خصوصی بھی ہیں۔ آپ کے سامنے اپنے زریں خیالات پیش کریں گے۔

چھیٹن صاحب :۔ (اپنی جگہ پر کھڑے ہوکر اور صدر سے مخاطب ہوتے ہوئے) بھائی مجھے معاف کرو۔ اب کون سا گوشہ مرزا صاحب نے چھوڑا ہے جس پر بولا جائے بہر حال آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں (جھک کر سلام کرتے ہوئے اور اشارے سے اجازت طلب کرتے ہوئے)

صدر :۔ بسم اللہ چھیٹن صاحب۔

چھیٹن صاحب ۔ بھائیو! میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ مجھے شراب کی بندش کے سلسلے میں صرف اتنی سی بات عرض کرنا ہے کہ ادھر بعض اضلاع سے میرے دوستوں کے خطوط آئے ہیں جن میں وہ لکھتے ہیں کہ وہاں سرکار کے حکم سے شراب کی خرید و فروخت موقوف ہوگئی ہے حتیٰ کہ بیٹروں کے لئے چمچے دو چمچے برانڈی کی ضرورت ہوتی ہے تو سونے کے بھاؤ بھی برانڈی میسر نہیں آتی تو حضرات حکومت کے اس اقدام کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہوئے کیونکہ اس موذی شے کا استعمال شرعاً ناجائز اور مذہباً حرام ہے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اتنی بھی سختی کیا کہ جنور تڑپ تڑپ کر مر جائیں مگر دو بوند شراب نہ ملے۔ چنانچہ پرسوں کانپور سے بڑے آغا نے لکھا ہے کہ ان کا پیارو بیٹر برانڈی دو بوندیں میسر نہ آنے کے سبب راہی ملک عدم ہوگیا۔ پیارو مرحوم کی جیتی ہوئی پالیاں آپ کے سامنے ہیں۔ وہ اس وقت کم از کم ہماری نگری میں بڑا عزت دار بیٹر تھا۔ لہٰذا اس کے اس طرح تڑپ کر مر جانے کا میری دانست میں کیا اپنے کیا پرائے سبھوں کو غم ہوگا (جلسہ گاہ سے اظہار تاسف کی آوازیں) اللہٰذا اس ضمن میں حکومت کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ اتنی سختی بنی نوع انسان تو گوارا کرے گا۔ مگر پرندوں کے بس کی بات نہیں جو وہ ان سختیوں کو برداشت کریں۔ وہ تو اپنی جان ہی سے گزر جائیں گے۔

ایک صاحب :۔ (صف سامعین میں کھڑے ہوکر) جناب چھیٹن صاحب آپ کی یہ اطلاع غلط ہے دواخانوں میں بطور دوا ہر وقت اور ہر جگہ شراب مل سکتی ہے۔ یہ خبر حکومت کے کسی بدخواہ کی اڑائی ہوئی ہے کہ پیارو شراب نہ ملنے کے سبب مر گیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کا کوا بیٹھ گیا تھا۔ جس کے سبب دم گھٹنے سے اس کی وفات واقع ہوئی اس مداخلت کو معاف فرمایا جائے

چھیٹن صاحب۔ اچھا کیا آپ نے اس غلط فہمی کی وضاحت فرما دی بہر حال میں حکومت سے اپنے اس مطالبہ کو واپس لیتا ہوں اور اب اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ نیز جناب صدر سے درخواست کروں گا کہ وہ اس ضمن میں اگر کوئی شکایت رہ گئی ہو

تو بتا کر ہم کو شکریہ کا موقع دیں چار بجے ننھے نواب صاحب کے یہاں جشن آزادی کے سلسلے میں پال ہے اور اس وقت ڈھائی بجنے کو ہیں

صدر:۔ حضرات۔ ان تقریروں کے بعد جو جناب مرزا صاحب اور چھیٹن صاحب نے کیں اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں آپ کے قیمتی وقت کو ضائع کروں جبکہ چار بجے آپ سب حضرات کو ننھے نواب صاحب کے یہاں بھی جانا ہے تاہم طلسم ہوشربا میں ایک مقام پر بے ثباتی عالم کے باب میں بہادری اور جرأت کی تلقین کی گئی ہے چنانچہ اس عبارت کی روشنی میں آپ کو چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اس وقت آپ اپنے مطالبات کی دھن میں پاگل ہو رہے ہیں طلسم ہوش ربا میں ایک جگہ آیا ہے۔

تلوار کی آنچ مشہور ہے گیلے سوکھے دونوں جلتے ہیں سر گردن میں لاگ ہے یہی غضب کی آگ ہے زندگی دونوں کے نام ہیں نام کرلو اے نوجوانو! لڑ بھڑ کر سرخرو ہو۔ جس کا قدم ڈگمگایا وہ کہیں آبرو نہ پائے گا۔"

یہ ٹکڑا میں نے طلسم ہوشربا سے آپ حضرات کے سامنے اس غرض سے پیش کیا کہ اس وقت ہم کو اپنے آباؤ اجداد کی پرانی روایات کو زندہ رکھنا ہے ان کی عزت و ناموس کو برقرار رکھنا ہے۔ اسی کے لئے مرنا اور اسی کے لئے جینا ہے اور جدید سرکاری کی باد حوادث کے جھونکوں سے مردانہ وار مقابلہ کرنا ہے۔ اس وقت ہم کو پورے عزم اور بے باکی کے ساتھ اپنے مطالبات حکومت کے روبرو پیش کرنا ہیں خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

اتنے میں ایک شخص نے قبرستان کے پھاٹک سے جلسہ گاہ میں باآواز بلند اعلان کیا "اماں بھاگو۔ دوڑ آ گئی کسی بدبخت نے مرزا کی تقریر کی پوری پوری رپٹ چوکی پر کرادی۔" یہ سننا تھا کہ جلسہ گاہ میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔ گرتے پڑتے افیونی مدکئے اور چرسئے کابکیں اور پیالیاں چھوڑ چھوڑ کر قبروں کی آڑ اور جھاڑیوں میں چھپ گئے جلسہ ختم ہو گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ دو مسلمان سپاہی سرخ پگڑیاں باندھے۔ اپنے کسی عزیز کی قبر پر فاتحہ پڑھتے عین اسی وقت پھاٹک کے قریب سے گزر رہے تھے جس وقت کہ جلسہ گاہ میں آغا صاحب کی تقریر ہو رہی تھی۔

ٹائم ٹیبل

احمد جمال پاشا

جب اسکول کھل گئے، پڑھائی شروع ہوگئی اور سبق یاد کرنے کا زمانہ آیا تو رفتہ رفتہ ہم نے بھی طے کیا کہ اب تھوڑا بہت پڑھنے لکھنے کا پروگرام بنا لیا جائے۔ پروگرام سے میرا مطلب ہر سال یہ ہوا کرتا ہے کہ ایک ایسا نظامِ حیات جو عملی جد و جہد کا ایک ایسا زندۂ جاوید نمونہ ہو جس سے طالب علموں کی آنے والی نسلیں ابدالآباد تک فیضیات ہوتی رہیں اور جس میں اگر مناسب حد تک تبدیلیاں گوارا کر لی جائیں تو وہ ہر قسم کے پیشہ ور اور پرائیویٹ حضرات و خواتین کے لئے قابلِ قبول ہو سکے جو عملی زندگی میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے رہنے کے باعث کچھ اس قسم کی کتابیں "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" "کامیابی آپ کے قدم چومنے کے لئے بیقرار ہے" "معرفت چھنا مل بکسیلرز اینڈ پبلشرز" "مایوس ہونے کی ضرورت نہیں" "رہنمائے روزگار باتصویر" "مکمل مرغی خانہ" "رضیہ کا شاہی دسترخوان" و "کرامات الر عرف کالا جادو یعنی ساجن موہنی" پڑھنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور خالی وقت میں دریا میں چھلانگ لگانے اور خودکشی کرنے کے تازہ ترین طریقوں پر غور کرتے ہیں۔

اس پروگرام میں اتنی رعایت ضرور کی جاتی ہے کہ یہ پچھلے سال سے ذرا مختلف ہو ورنہ بالکل اسکولی بن کر نہ رہ جائے۔ اسکولی سے میری مُراد میرے اپنے اسکول سے ہے جہاں بیس سال سے وہی پُرانا چپراسی گھنٹہ بجاتا ہے جس کی گھڑی کی سوئیاں نقلی ہیں۔ اور دن دہاڑے اونگھا کرتا ہے۔ اسی سبب اکثر گھنٹہ بھی اونگھ جاتا ہے اور اس کے چونکنے پر کبھی گھنٹہ وقت سے پیشتر اور کبھی بعد میں بجتا ہے جس سے اسکول کا سارا نظامِ اوقات درہم برہم ہو جاتا ہے اگر لڑکے یا اساتذۂ کرام اونگھ جائیں تو کسی کا کچھ نہ جائے گا۔ مگر اس کے اونگھنے سے تو پورا اسکول اونگھ جاتا ہے۔ گھنٹہ تو اسکول کے سب سے ذمہ دار فرد کو بجانا چاہیئے، جو اسکول کے اعمال و افعال کا جوابدہ ہو اور وہ فردِ واحد سوائے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کون ہو سکتا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مدارج پر یہ خوشگوار فرض پرنسپل صاحب، ہیڈ آف دی ڈیپارٹ منٹس یا وائس چانسلر حضرات ہی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اس سے اور ہونے والے بے شمار فائدہ کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اس طرح ایک چپراسی کی تنخواہ بچا لیں گے جس کو آج کل فیشن کی اصطلاح میں چھوٹی بچت کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے اور شہرت کا باعث ہو سکتا ہے۔" اسکولی" میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جن کا یادداشت سے براہِ راست تعلق ہوا کرتا ہے مثلاً جہاں تک ہم کو اور ہمارے دوستوں کو یاد پڑتا ہے ہمارے اسکول کے شمال میں جو ایک تنگ و تاریک کمرہ ہے۔ جس کے سامنے "بمبا" لگا ہوا ہے اور انٹرول میں وہاں دو چار خوانچے والے بھی اپنا سودا فروخت کرنے کے

شوق میں جمع ہوجاتے ہیں اور کثرت سے شور ہوتا ہے اس شور کے سر پر وہ کمرہ ہے جسے عرفِ عام میں 'اُردو کلاس' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی پہچان اس کے وہ واحد مولوی صاحب ہیں وہ صبح سے آکر پڑھانا، اونگھنا اور لڑکوں کو سزائیں دینا شروع کر دیتے ہیں اسی گوشے پر ہماری یادداشت کی تہمت ہے کہ یہاں پر ہمارے بچپن سے اُردو پڑھائی جارہی ہے مگر مسلسل دیکھنے کے بعد بھی آج تک فیصلہ نہ کر سکے کہ کون پڑھا رہا ہے اور کون پڑھ رہا ہے تقریباً اسی قسم کی مثالیں ہیں دوسرے گوشوں سے دوسرے مضامین کے بارے میں آسانی سے مل جاتی ہیں۔

مگر اس پر کچھ کہہ اس وجہ سے نہیں سکتے کہ اس اسکول نے بڑے بڑے نامور پیدا کئے اور پیدا کئے چلا جارہا ہے ۔

میرا یہ خودکاشت پروگرام ایک باضابطہ ٹائم ٹیبل کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے اور اس ٹائم ٹیبل سے مختلف ہو سکتا ہے جو عموماً اسکول والے زبردستی طلباء کے اوپر لاد دیا کرتے ہیں اسکول والوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ نہایت انسان کامل، قسم کا ٹائم ٹیبل پیش کرکے کچھ فاصلے سے ہوجاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو وقت مقرر کردیا گیا ہے اس کے آس پاس گھنٹہ ضرور بجے گا اندازے سے تھوڑی دیر سویر میں لڑکے ضرور آئیں گے۔ اگر ماسٹر صاحبان غیر ارادی طور پر آگئے ہیں تو وہ وقت گذاری کے طور پر اِدھر اُدھر کے بے ربط سوالات، سیاسیاتِ حاضرہ پر تبصرے، موسم پر رننگ کمنٹری، ہیڈ ماسٹر کے اعمال و افعال پر بہت سخت نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ (جو اگر ہم لوگ کریں تو ضرور حرامخور کہلائیں) بار بار بے اختیار اپنے معصوم ہونے کا یقین دلانے کی ناکام کوشش کریں گے ایسے موقعوں پر تجربہ ہے کہ اگر تھوڑا بہت شور ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ اس قسم کی "سُتری" کارروائیوں میں اگر تھوڑی سی تبدیلی محسوس بھی ہوتی ہے تو وہ فن کے اعتبار سے ورنہ تکنیک تو بالکل وہی رہتی ہے مثلاً بڑی جماعتوں میں غیبت کرنے والے کے منہ سے جماعت کے اندر خاص طور پر اور جماعت کے باہر عام طور پر منطق، استدلال، ہیئت، نقد، شعور، لاشعور اور بے شعور وغیرہ مبہم اصطلاحیں سنائی دیتی ہیں اور عام طور پر اس کا اثر آنے والے امتحانوں پر بہ حیثیت مجموعی بہت بڑا پڑتا ہے۔

یہ تو عمل ہوا اور اس کا ردِّ عمل یہ ہوتا ہے کہ اگر اس پر عمل بھی کرنا چاہیں تو کبھی لڑکے غائب اور کبھی استاذ، اجتماعِ ضدین کے اس عمل میں سارا سال گزر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوبارہ اسی ٹائم ٹیبل کو نئے کاغذ پر ٹائپ کرکے نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیا جاتا ہے تاکہ تازہ واردانِ بساط بھی پچھلی بہاروں سے مفت میں فیض یاب ہوسکیں۔

اس قسم کے ٹائم ٹیبل سے ہم کیوں علاقہ رکھیں جس میں صبح سے شام تک ایک ہی استاذ، ایک ہی لڑکے اور ایک ہی قسم کے کمرے ہونے کے سبب ہم فلم کی اصطلاح میں نئے چہروں کو بالکل ترس جاتے ہیں۔ استاد لڑکوں کی نقل و حرکت سے نالاں، لڑکے استاد کی صورت سے بیزار مگر دونوں ایک دوسرے سے رحم کے طالب، ایک کو دوسرے کے فعل پر رحم آرہا ہے مگر فعل جاری ہے کیونکہ ٹائم ٹیبل بتاتا ہے کہ اگر سورج نکلنے سے پہلے بھیج دیئے گئے ہو تو اب کم سے کم چراغ جلے تو گھر لوٹو۔ یہ ٹائم ٹیبل کچھ اس قسم کا ہوا کرتے ہیں مثلاً ریلوے کا ٹائم ٹیبل جسے خریدنے کے بعد آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا مصرف کیا ہو، جس کی وجہ سے ہم نے ان لوگوں کو اکثر رشک و حسد کی نگاہ سے بھی دیکھا ہے جو اس کو سونگھ کر سارے دن کی آنے اور جانے والی تمام گاڑیوں کا زائچہ زبانی کھینچ دیتے ہیں۔ اس قسم کے ٹائم ٹیبل پر سوائے عمل کے سب کچھ ہو سکتا ہے اور عمل اس وجہ سے نہیں کہ یہ عمل سفلی کے مترادف سمجھا گیا ہے جس میں ناکامی کی صورت میں عامل خود اس کا شکار ہو جاتا ہے اس لئے نقل سے عمل کی نوبت آنے ہی نہیں پاتی۔

ہاں تو ایک تو ہوا یہ ٹائم ٹیبل جس کو ہم زیادہ سے زیادہ دیکھتے دیکھتے کسی نہ کسی دن پنسل سے نوٹ کر لیتے ہیں یا پھر کسی لڑکے سے نقل مل جاتی ہے مگر اس نقل سے عمل کا کچھ کردار نہیں اُبھر پاتا یعنی اس کے بعد بھی جس دن جماعت میں سب کے سامنے ڈانٹ پڑنے سے ہم کو اپنی بے قاعدگی کا احساس ہو جائے کہ ہم سب غلطی سے حساب کے بجائے جغرافیہ کی کلاس میں اپنے آپ کو پا رہے ہیں یا ہیں سیکنڈ ایئر میں اور اُٹھائے فرسٹ ایر سے جا رہے ہیں یا خالی گھنٹے میں تواریخ کی کلاس لگنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں اور تواریخ کے گھنٹے کو خالی سمجھ کر گھر کھانا کھانے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر ہنسی اُڑ جائے، سب کو ہنستا دیکھ کر ہم بھی ہنس دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آج پھر گھر جا کر ہم کو ٹائم ٹیبل کی اصلاح کرنا ہے تاکہ اپنے ایک ذاتی اور کامیاب قسم کے پروگرام بنانے میں حتی الامکان مدد مل سکے۔ ایسے آزمائشی دور میں جبکہ ارادہ پکا، نیت صاف، دل حرکت و عمل پر آمادہ ہو، ترقی کرنے کی خواہش بیدار ہو کر انگڑائیاں لیتی ہو اور اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھ جانے کا حوصلہ نچلا نہ بیٹھنے دیتا ہو تو گھر پر سارا وقت اس ٹائم ٹیبل کی تلاش میں صرف ہو جاتا ہے۔ جس کو ہم نے کبھی اسکول میں نقل کیا تھا اور جس کی ضد میں اب ہم ایک کامیاب ٹائم ٹیبل بنا کر اس پر عمل کرنے کے لئے بے چین نظر آ رہے ہیں کسی نے سچ کہا ہے مصیبت کے دن سدا نہیں رہتے اور کسی کی محنت اکارت نہیں جاتی اور آخرکار ہماری یہ سپاہیانہ جد و جہد رنگ لاتی ہے۔ وہ ٹائم ٹیبل کسی میز الماری یا کرسی کے نیچے کسی پرچے، کتاب کے ٹائٹل پیج سینما کے اشتہار یا اقتصادیات کی کاپی کے اس مقام پر بالکل ٹھیک ٹھیک حالت میں، جہاں پر ہم نے حساب کے گھنٹے میں کاٹا گولا کھیلا تھا۔ اور پچھلی اتوار کو اسی صفحہ کے بائیں طرف دھوبن کے کپڑے لکھے تھے۔ ہم کو ہمارا گمشدہ ٹائم ٹیبل مل جاتا ہے جس پر مسلسل غور و فکر کے بعد اکثر کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ آخر یہ کہا گیا ہے۔ خود اپنی عبارت ایک مصیبت بن جاتی ہے لکھا کچھ ہوتا ہے اور پڑھنے میں کچھ آتا ہے اس قسم کی مبہم عبارتوں کا پڑھنے لکھنے پر بھی بُرا اثر پڑ سکتا ہے، ایسے ناشدنی موقعوں پر وہی حصہ سب سے بہتر رہتا ہے جو جلدی میں لکھنا بھول گئے تھے مثلاً ایک بالکل موٹی سی بات ہے کہ اب رہ رہ کر یاد کیا جا رہا ہے کہ انٹرول کہاں ہے؟ باوجود اس کے کھو جانے کے ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ کہیں نہ کہیں پر انٹرول بھی ضرور تھا مگر جو شخص دن میں تین چار انٹرول منائے۔ اس کے لئے یوں بھی اصلی انٹرول کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے اصلی انٹرول اس کو کہتے ہیں جس کا وقفہ مختصر اور بھیڑ بھاڑ زیادہ ہوتی ہے —— —— مگر اس کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہوتی ہے کہ اس موقع پر کوئی روک تھام نہیں ہوتی مگر اس وقت تو انٹرول کی تلاش خود ایک انٹرول ہے۔

غرض ایک تفصیلی چھان بین، تنقید و تحقیق، غور و فکر کے بعد ہمارے ذہن میں عین ہمارے تصورات کے مطابق ایک نہایت ہی واضح نقشہ اس پروگرام کا بن گیا۔ جس کے نہ ہونے سے ہم کو اپنی زندگی عرصے سے نہایت فضول معلوم ہونے لگی تھی۔ اور اکثر اس کے مصرف پر ہم اپنے دل میں غور کرتے اور دماغ سے سوالات کرتے اور جواب نفی میں آتا، تن، بدن میں مایوسی کی ایک لہر کو دوڑنا پڑتا، بے اختیار اپنی بے لبسی کا خیال آ دھمکتا ہے

اس پروگرام نے ہمارے خون کی روانی میں ایک تیزی پیدا کر دی، ایسی تیزی جس نے نوجوانوں کو کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیا لہٰذا بے اختیار اکڑ کر بیٹھ گئے۔ دو چار بار بے اختیار پہلو بدلے، عجب عجب منہ بنائے، لیکن اگر کوئی ہم کو اس وقت دیکھتا تو قطعی یہ اندازہ لگا لیتا کہ اس وقت ہم بے حد خوش و خرم ہیں۔ ایسی فطری خوشی جو طبیعتوں کو موسیقی کی جانب مائل کر دیتی ہے۔

چنانچہ شگون کے طور پر ایک آدھ سیٹی بھی بجا ڈالی اور اس کی دُھن پر ایک فلمی راگ بھی چھیڑ دیا کیونکہ سر کے اوپر سے ایک بڑا بوجھ اتر چکا تھا اور اب جو کچھ رہ گیا تھا اس کی حیثیت دفتری خانہ پُری سے ہرگز زیادہ نہ تھی۔ اس وجہ سے اس کے انجام دینے میں اب ہم قطعی جلد بازی سے کام لینا نہ چاہتے تھے اس لئے ہم نے طبیعت کو سلیف بنانے کے لئے نہانے ہی میں اپنی بہتری سمجھی نہانے کے بعد بہترین کپڑے پہنے، اخبار دیکھا کون فلم کہاں لگا ہے ایک دیکھا ہوا فلم دیکھنے کی خواہش دوبارہ بیدار ہوئی سائیکل اٹھائی سینما کا رُخ کیا۔ موڈ اچھا اور طبیعت آمد پر تھی اس لئے اکثر راستے میں سائیکل کا ہینڈل چھوڑ دیتے اور سائیکل بالکل ایسی چلنے لگتی جیسے "پاکستانی سیاست" پھر جلد ہی اس کی باگ قابو میں لانے کے لئے ہینڈل کو دوبارہ اپنی کمان میں لے لیا۔ راہ گیر بھی مطمئن ہو گئے اور تماشائی بھی منتشر۔

فلم دیکھ کر لوٹے تو ایک قسم کی تکان سی محسوس ہوئی اس لئے پروگرام اونگھتے میں تیار کرنے کے ارادے سے سو گئے شب و روز اسی طرح گذرتے رہے ایک ماہ کی مسلسل محنت، لگاتار غور و فکر کے بعد ہم نے ایک پروگرام تیار کر لیا اتنا مکمل "ٹائم ٹیبل" تو ہم پچھلی بار بھی نہ تیار کر سکے تھے۔ اس میں اوّل تو ہم نے یہ خیال رکھا کہ پچھلے سال جو غلطیاں امتحان پاس کرنے کے سلسلے میں ہم سے سرزد ہو گئی تھیں ان کے دوبارہ ہونے کا احتمال نہ رہے۔ غلطیاں ہونا بُرا نہیں لیکن اگر غلطی نئی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ اس میں شرمندگی کا موقع ذرا کم رہتا ہے ورنہ کچھ مناسب نہیں رہتا۔

ہمارا یہ ٹائم ٹیبل جنگی پیمانے پر تیار کیا گیا تھا اس میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے بارے میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ پروگرام کیا اچھا خاصا کرفیو آرڈر تھا جس کا نفاذ مثل مارشل لا کیا گیا تھا۔ اس ٹائم ٹیبل میں جس قدر بھی مفید مشورے ممکن ہو سکتے تھے ہم نے اپنے آپ کو دے ڈالے تھے اپنی صحت اور اصلاح کا کوئی بھی پہلو نہیں چھوڑا تھا بعض اوقات تو شبہ ہوتا تھا کہ یہ ٹائم ٹیبل ہے یا کسی لیڈر کی الیکشن سے قبل ہونے والی تقریر۔ یہ دراصل کچھ حسب ذیل سا تھا مثلاً روزانہ :-

۴ بجے : (صبح کاذب) زن سے اُٹھ بیٹھیں (اگر ممکن ہو تو ۲ ۱/۲ ہی بجے سے) اگر بیدار ہونے کے لئے روزمرہ میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو بیداری کے لئے احتیاطاً گھڑی کا الارم لگا دیا جائے یا غسل خانے کا پائپ کھلا چھوڑ دیا جائے۔

(ہر طرح ناکامی کی صورت میں چوکیدار کو آواز لگانے کی ہدایت کر دی جائے)

۰۔۴ تا ۵۔۴ : حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کرتے غسل کرنا، عبادت کرنا

۵۔۴ تا ۱۵۔۴ : میل بھر کی دوڑ اور صبح کی سیر (واپسی پر چینے کا پانی پی کر پڑھنے بیٹھ جانا۔)

۱۵۔۴ تا ۱۵۔۷ : دل لگا کر پڑھنا

۱۵۔۷ تا ۲۵۔۷ : ناشتہ کرنا۔

۲۵۔۷ تا ۳۵۔۹ : وہ تمام مضامین پڑھ ڈالنا جو آج اسکول میں پڑھائے جائیں گے اور اسکول کا کام کرنا۔

۳۵۔۹ تا ۴۵۔۹ : کھانا کھا کر کپڑے تبدیل کرکے کتابیں کاپیاں درست کرکے اسکول روانہ ہو جانا تاکہ ٹھیک ۱۰ بجے اسکول پہنچ جائیں۔

۰۔۱۰ تا ۰۔۴ : اسکول، جس میں انٹرول میں کھیل اور خالی وقت میں مطالعہ فطرت میں دلچسپی لینا، پڑھنا، جن استادوں کے پاس امتحان کی کاپیاں جانے کا احتمال ہو، اُن سے تعلقات استوار کرنا، ان کے آپس کے جھگڑوں سے فائدہ اُٹھانا وغیرہ

دیگر ایک مناسب حد تک)

۴-۰ تا ۴-۱۵ : اسکول سے گھر واپس آنا، کپڑے تبدیل کر کے ناشتہ کرنا۔
۴-۱۵ تا ۴-۳۵ : سیر و تفریح
۴-۳۵ تا ۸-۰ بجے شب : وہ سب پڑھ ڈالنا جو آج پڑھایا گیا تھا
۸-۰ تا ۸-۵ بجے شب : رات کا کھانا کھا کر قیلولہ کرنا۔
۸-۵ تا ۱۲-۵ بجے شب۔ مسلسل سبق یاد کرنا
۱۲-۵ تا ۴-۰ ″ صبح : سونا۔

ہفتہ کے دن اسکول سے واپسی پر اگر سینما یا میچ دیکھنے چلے جائیں یا دوستوں کے ساتھ گپ شپ کے لئے کافی ہاؤس وغیرہ کا ایک آدھ چکر لگا لیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا لیکن مناسب ہوگا کہ حتی الامکان پرہیز کیا جائے اتوار اور چھٹیوں میں درمیانی وقفہ (۱۰ تا ۴) میں امتحان کے پرچے تیار کرنا، گھڑی سامنے رکھ کر ان کی مشق کرنا، حل شدہ پرچے پڑھنا، گیس ورک تیار کرنا، ماسٹر صاحب سے امپارٹنٹ پوچھنے جانا وغیرہ۔

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ ایک ایسا جامع پروگرام تھا کہ اس کو محض دیکھ کر ہی بڑی مسرت ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر اس ٹائم ٹیبل کے کچھ حصوں پر عمل کرنے کی بھی کوشش کی گئی نہ جانے کیسے کیا ہوا کچھ کہا نہیں جا سکتا مگر اتنا ضرور علم ہے کہ اسی غور و فکر میں رفتہ رفتہ سال تمام ہوا اور جو کچھ نتیجہ برآمد ہوا اس نے دوبارہ یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اس "ٹائم ٹیبل" میں کیا ایسی چیزیں پھر بھی رہ گئی تھیں جن کو اگر شامل کر دیا جائے تو ایک کامیاب "ٹائم ٹیبل" تیار ہو جائے جس پر عمل کر کے میرا پہلا۔ "ون ایر پلان" کامیابی کا منہ دیکھ سکے۔

حصّہ نظم

اردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر

محمد عبداللہ قریشی

ہنسنے اور ہنسانے کے لیے مخصوص دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ بے وقوف کبھی صحیح طور پہ ہنس نہیں سکتا۔ اردو شاعری میں جب سے غزل غالبؔ شروع ہوئی ہے۔ ہنسی کی باتوں پر شاعر ہنستے اور رونے کی باتوں پہ روتے چلے آئے ہیں۔ اس لیے دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ ظرافت بھی ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ جس کی وجہ سے اردو ادب و شعر کے جوبن پر ایک بہار ہمیشہ طاری رہی ہے۔ دبی دبی مسکراہٹوں سے دل کی کلیاں چٹکتی اور بلند قہقہوں سے زعفران زار کھلتے رہے ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے یہ باغ اسی طرح لہلہاتا رہے گا۔

ظریفانہ شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہجو، ہزل، طنز، تحریف، تمسخر اور بدیہہ گوئی وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔ میں نے اس مقالے میں ہر قسم کے شاعروں کا تذکرہ کیا اور ان کے کلام کے نمونے دے کر ان پر مختصر سا تبصرہ کیا ہے۔ اس میں ان شاعروں کے پہلو بہ پہلو جو اس میدان کے شہسوار ہیں۔ وہ قابلِ ذکر شاعر بھی آ گئے ہیں جنہوں نے محض سیر و تفریح کی غرض سے اس دشت کی سیاحی کی ہے۔ تاہم یہ جائزہ مکمل نہیں

اس مضمون کی تقسیم یوں سمجھئے کہ قدما کا دور میر جعفر زٹلی سے شروع ہو کر ریختی گو شعرا پر ختم ہو جاتا ہے۔ اودھ پنچ کے اجرا سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی ان دونوں دوروں کے درمیان سنگِ میل ہیں۔ ان سے لے کر موجودہ پود تک یہی دور چلا آتا ہے۔ رنگ و آہنگ میں جو جو تبدیلیاں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں، ان کا ذکر اپنی اپنی جگہ آئے گا۔ مختصر یہ ہے کہ چراغ سے چراغ جلتے رہے ہیں مگر ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

جعفر زٹلی

"اردو نظم میں جعفر زٹلی کو پہلا ظریف شاعر یا ہزال مانا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ عالمگیر کا آخری دور ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں دربار کی زبان فارسی تھی اور اردو کا رواج بہت کم تھا۔ اس لیے ان کی شاعری میں زیادہ فارسی کے الفاظ بلکہ پورے پورے فارسی کے مصرعے پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک اس دور کے مذاق کا تعلق ہے، ہر وہ بات جس سے انسان ہنس پڑے خواہ وہ فحش ہی کیوں نہ ہو ظرافت تصور کی جاتی تھی نثر و نظم دونوں میں جعفر کا انداز بالکل ایک سا ہے۔ زٹلی کی ہجویات سے نہ صرف رؤسا بلکہ بادشاہ اور شہزادے تک ڈرتے تھے انہوں نے "شرارت" کے نام سے جو مضمون نثر میں لکھا ہے اس میں بہت سی اچھوتی اصطلاحات ہم کو ملتی ہیں۔ شعر و سخن کے میدان میں بھی انہوں نے انوکھی اضافتیں اور نئے نئے محاورات استعمال کیے ہیں۔" اردو ادب میں طنز و مزاح از فرقت کاکوروی ص ۲۹

میر جعفر زٹلی حقیقت میں ایک ظریف عوامی شاعر تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کا آبائی وطن دہلی تھا یا نارنول (ضلع میرٹھ)۔ بہرحال وہ ۱۶۵۹ء میں بعہدِ شاہ جہاں پیدا ہوئے اور ۱۷۱۳ء میں چوّن سال کی عمر پاکر عالمگیر کے عہد میں انتقال کر گئے۔ انہیں شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ بچپن ہی میں اشعار موزوں کرنے لگے اور رفتہ رفتہ فنا فی الشعر ہو گئے۔ چونکہ اشعار میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لیے لوگ پسند کرتے تھے۔

میر جعفر نے ابو اسحاق اطعمہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ وہ بھی ایک پرانے ہزال تھے۔ اس لیے آپ نے بھی یہی رنگ اختیار کر لیا اور اس میں ایسے کامل الفن ہوئے کہ ان کی شاعری اور ہزالی کا ایک خاص معیار قرار پاگیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ابو اسحاق اطعمہ ایک جابر استاد تھا، لڑکے اس کے تشدد سے عاجز آ گئے تھے۔ میر جعفر بھی اُستاد کے ستم رسیدہ اور آفت کشیدہ تھے انہوں نے استاد کے خلاف پہلے تو ایک نظم "مبعوت بڈارنامہ" کے عنوان سے لکھی پھر کچھ اور لکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب نے میر جعفر کو بیک بینی و دوگوش اپنے مکتب سے نکال دیا۔ میر جعفر تو نکل گئے مگر سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا۔ گویا بارود کو آگ لگ گئی۔ فوراً ایک کھپوا نامہ لکھا جس میں مولوی صاحب کی جی کھول کر ہجو کی۔ اس کا ابتدائی بند یہ ہے ؎

کہتا ہوں کھپوے نامے کو نادر سخن ستی　　سن مرحبا کہوگے مجھے ان کہن ستی

مشہور ہے یہ بات کفو سے زمن ستی　　کھپوے کو شیخ جی نے دعا دی تھی فن ستی

تس کا کروں بیان سنو جان و تن ستی

کھپوا نامہ جیسا کہ تذکرہ خندۂ گل میں لکھا ہے ایسا مشہور ہوا کہ شہزادہ کام بخش کے کانوں تک پہنچا اور میر صاحب طلب ہوئے۔ چونکہ نظم بھی

ہجو کے ساتھ ہی ظرافت کی خوشگوار چاشنی بھی موجود تھی۔ اسی کے اثر سے خوش ہو کر شہزادہ نے مورچھل کی خدمت میر جعفر کو سونپ دی۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ جعفر زٹل نہایت اچھے شاعر ہیں، تو شہزادہ نے امتحاناً ان سے ایک غزل کی فرمائش کی۔ انہوں نے تعمیلِ ارشاد کی اور غزل کہی جس کے ایک دو شعر یہ ہیں

ازعاشقِ بیچارہ مکن نخرہ و گھونگھٹ   تا کے بود ایں گرمیٔ بازار جو ہے تو
تاچند کنی عشوہ بریں رنگ گلابی   یہ رنگ تپنگے کا اوڑن ہار جو ہے تو

شہزادہ نے غزل پسند کی اور اس کی بدولت میر صاحب کی شہرت ایک سے دہ چند ہو گئی۔ مگر خالی شہرت سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت تھی کہ نقد و جنس سے کچھ ان کی امداد کی جاتی مگر ایسا نہ ہوا۔ میر جعفر کا دل تنگ ہو گیا اور اب ان کو مورچھل کی خدمت بار ہو گئی۔ انہوں نے فوراً اس خدمت کی ہجو لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں:

توبہ ازیں وسوسۂ مورچھل   دمبدم از دمدمہ جاں در خلل
توبہ ازیں مسکن روزن فراخ   روز و شب آوازہ پھُس پھوں پٹاخ

توبہ ازیں مسکن پُر شور و شر   مرحلۂ پُرخطر و خوف و ڈر
پُر خس و خاشاک بہ سر نوکری   نزد خرد بہتر ازیں نوکری

جعفر ازیں کوچہ دریں مورچھل
شرم حضوری بکن و لوٹ چل

شہزادہ کو جب اس ہجو کا حال معلوم ہوا، تو بہت ناراض ہوئے۔ جب ان کو یہ خبر ہوئی تو انہوں نے شہزادہ کو لے ڈالا ہجو لکھی اور دل کھول کر لکھی ایک شعر یہ ہے:

زہے شاہ والا گہر کام بخش   کہ مچھی بزد کرد پچی دبخش

اس کے بعد نوکری سے بیزار ہوئے اور دکن کی طرف چل دیے مگر بدقسمتی ہر جگہ ساتھ تھی یہاں بھی روزگار نہ ملا، تو جھنجھلا کر یہ غزل کہی:

تنہا شدی اندر سفر کہہ جعفر اب کیسے بنے   افتادی اندر بحر و بر کہہ جعفر لب کیسے بنے
در بیکسی تا بودۂ با درد و غم آلودۂ   مفلس شدی و در بدر کہہ جعفر اب کیسے بنے
از ہجو آں سلطان خود کردی پریشاں جانِ خود   درماندۂ بے بال و پر کہہ جعفر اب کیسے بنے
اسبابِ غم برداشتی تخمِ فلاکت کاشتی   اکنوں کجا آں سیم و زر کہہ جعفر اب کیسے بنے

اتفاق سے جس زمانہ میں یہ پریشان روزگار دکن کی خاک چھانکتے ہل ہانکتے گودوں پھانکتے پھر رہے تھے۔ اسی زمانہ میں نواب کوکلتاش خاں ستارہ کی مہم پر گئے۔ جعفر نے اس موقع کو غنیمت جانا اور نثر کا ایک رقعہ لکھا نواب پر بڑا اثر پڑا۔ اپنے یہاں ملازم رکھ لیا مگر صرف کھانا ملتا تھا نہ کپڑا مقرر ہوا اور نہ کپڑا بنانے کے لیے کوئی پیسہ ملا۔ مجبوراً ایک عرضداشت منظوم لکھی ؎

حضور جہاں شاہ گیتی پناہ   زبیداد جُواں زُلّی داد خواہ
جُواں پڑگئیں در قباو ازار   نئی آئی مشکل بہ دلّی دیار
اَدھی رات تن بیچ اُٹھی کلبلی   چوں دیدم کہ نوجاں جُواں کی چلی
لڑائی پڑی جُواں سے وقت رات   جُواں کا چلا مُنہ اور چلا میرا ہات
رکت کی جوئیں میری پیاسی پھریں   کہ حیران و ہلکان مجھ کو کریں
لہو میرا پی پی کے موٹی ہوئیں   بغل بیچ دشمن مری ہو رہیں
جواں مارتے مارتے شب گزشت   ولے یک جُواں از میانم نگشت
کروڑوں جوئیں اور اکیلا منم
دونوں ہاتھ سے تا کجا می زنم

خیر اتنا ہُوا کہ یہ عرضی منظور ہوئی اور کپڑے بنا دیے مگر چند روز بعد اور اسباب پیش آئے اور یہ وہاں سے بھی جدا ہو گئے۔

میر صاحب کی زندگی نہایت مفلسی اور مفلوک الحالی پریشان روزگاری میں بسر ہوئی مگر وہ زمانہ کی زبردستیوں سے عاجز آ کر کبھی چیخ نہ اُٹھتے تھے بلکہ نہایت آزادی اور خوشدلی سے ان تمام سختیوں کو برداشت کرتے تھے۔ اسی طرح ان کا مشغلہ شاعری خاص کسی مدح و ذم کا پابند نہ تھا۔ وہ ذاتی خصومت کی بنا پر کسی کی ہجو نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ اس سے تفریح و انبساط مقصود ہوتا تھا۔

میر جعفر کی شادی بدقسمتی سے ایک بدصورت اور بدسلیقہ عورت سے ہوئی۔ اس نے ان کی زندگی تلخ کر دی۔ اپنی مصیبت کا دکھڑا اس طرح روتے ہیں ؎

کھول گھونگٹ کیا دیکھوں بیچ   دھنپت بیٹھا گھونگٹ بیچ
لاکھ روپیہ مہر بندھایا   ایسا مہنگا دھنپت پایا
گھونسی گھانسی لنڈی مُنڈی   مُنہ ایسا جل سانپ کی کنڈی
بالوں کا کیا کروں احوال   جیسے مچھّر کی ہوئے یال

داتوں کا کیا کروں بچار   ٹوٹے پھوٹے اور اجاڑ
ہونٹوں کا کیا کروں بیان   جیسی کرنا بائی کی نان
بات کہے پر نہ آئے بول
جیسے باجے پھُوتر ڈھول

اور پھر چند دن بعد سے

جھگڑا رگڑا ایسا پیارا   ماگے جوتے مارگ مارا
دے دھمادھم ایدھر اودھر   اب میں مولا جاؤں کیدھر
انجر پنجر ٹوٹن لاگے   مرڈے زنڈے سوتے جاگے
بجلی ہے یا آگ بگولا   جیسے نام خدا کا بھولا
نِت اُٹھ گھر کے باسن پھوڑے   آگ لگان پانی کو دوڑے
کام کرے تو ایسا کرے   چولے کی ہانڈی کھڈی دھرے
جیسا مجھ کو ناچ نچایا   جیسا کیا میں ویسا پایا
جعفر پیارے اب کیا کیجے   تن من دھن تقدیر کو دیجے
کرم میں لکھا تھا سو پایا
ناحق میں یہ فند مچایا

ان کی ظرافت اگرچہ ہزل کے درجہ پر پہنچ گئی ہے اور خوش طبعی مسخرا پن کا درجہ رکھتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مسخرا پن ظرافت ہو ہزل ہو کچھ اس درجہ کی ہے جس کا جواب بڑے بڑے اہل کمال نہیں دے سکتے۔ اُن کے ایک ایک لفظ میں ظرافت اور خوش طبعی کا ایک جہاں پوشیدہ ہوتا ہے ۔

جس زمانہ میں میر جعفر کوکلتاش کے یہاں رہتے تھے۔ ایک روز یہ اتفاق پیش آیا کہ مرزا سلیمان کی اہلیہ مرزا سے ناراض ہوگئیں۔ میر جعفر کو خبر ہوئی۔ یہ جانتے تھے کہ مرزا کی بیوی اُونچے گھرانے کی عورت ہے اور یہ ذلیل ہیں۔ انہوں نے چند قطعے لکھ ڈالے جو ہجو بھی ہیں سامان تفریح بھی۔ پند و نصائح بھی۔ عزت بھی۔

جعفر اور جہاں معاذ اللہ   ہر کہ محتاج نان زن باشد
نتواند کہ ضبط بنشاند   گرچہ عفریت واہرمن باشد

جعفرا مفلسے کہ زن بہ کند   آہ آں زن زنست مردک خر
آرزوے دلش بہ دل ماند   خود پئے نان خراب و رسوا تر

بہ زن کردن درافتادم بگرداب پریشانی   دل و دیں رفت و نسیان شد رہ و رسم سخندانی
بلے خوش گفتہ مصرع جعفرا ایں از رہِ فطرت   چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

مرزا اسلیمان کو جب خبر ہوئی، تو بہت بگڑے اور کوکلتاش خاں کے پاس پہنچے۔ میر جعفر کی سخت سے سخت شکایت کی مگر انہوں نے ہنسی میں ڈال دیا اور ٹال دیا۔

ایک موقع پر کوکلتاش خاں نے غنیم کو سخت شکست دی اور بہت کچھ مال پایا۔ جب مالِ غنیمت تقسیم کیا، تو آدھا مال خزانۂ شاہی میں بھیج دیا اور آدھا سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ بیچارے سپاہی تو تھے نہیں کہ کچھ ان کو بھی ملتا۔ میر جعفر کو سخت رنج ہوا۔ نواب کے پاس پہنچ کر کہا کہ مجھ کو بھی حصّہ دیجیے۔ کہا تم سپاہی نہیں۔ مردِ میدان نہیں پھر حصّہ کیسا۔ خیر اس وقت تو جعفر خاموش ہو گئے مگر دوسرے دن اپنا تصنیف کیا ہوا رستم نامہ لے کر پہنچے اور نواب کو سنایا جو یہ ہے۔

من آں رستمِ وقت روئیں تنم   کہ دہ پاپڑ از مشتِ خود بشکنم
کنم روزن اندر چپاتی بہ تیر   برآرم و ما از سرِ مور تیر
کشم گردنِ پشہ را در کمند   مگس چند را من در آرم بہ بند
بپوشم اگر جوشن جنگ را   ہزیمت دہم پسوے لنگ را
بہ صد حملہ بال مگس بر کنم   قطار دو صد مور برہم زنم
دریں دورِ ثانیٔ رستم منم   بتاسا بہ گرزِ گراں بشکنم
چناں بشکنم رشتۂ خام را   کہ سازم خجل رستم و سام را
تہمتن منم گر کشم تیغ خشم   تراشم بدو ضرب یک موئے پشم
چو بیند مرا شوم تھر تھر کند   چوں از گربہ موشے کہ کر کر کند

بیا جعفر ایں قصہ کوتاہ کن
بہ سمتِ جنابِ سخی راہ کن

اتفاق کی بات ہے کہ میر صاحب جب یہ فقرے رجز سُنا رہے تھے اسی وقت خبر آئی کہ مغلیہ فوج مغلوب ہو کر دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگئی ہے۔ کوکلتاش خاں کو بڑا صدمہ ہوا اور ایسے بگڑے کہ میر صاحب کو نکلوا دیا۔ اسی طرح میر صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ دو نظمیں لکھیں، جن میں سے ایک میں اپنی شانِ استغنا کا ذکر تھا۔ دوسری میں نوکری کی برائیاں تھیں چنانچہ دوسری نظم یہ ہے؛

بشنو بیان نوکری جب گانٹھ ہووے کھوکری   تب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
ہر روز مجرا اُٹھ کریں درکار یک سو گِر پڑیں   بے شرم ایسے لڑ مریں یہ نوکری کا خبط ہے
دس بیس مجرے میں گئے دس بیس بخشی نے لیے   دس بیس میں جھگڑے کیے یہ نوکری کا خبط ہے
صاحب عجب بیداد ہے محنت ہمہ برباد ہے   اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا خبط ہے
ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیزار ہیں   یارا ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا خبط ہے

ایک مرتبہ میر صاحب کے یہاں چوری ہوگئی اور کچھ بھی باقی نہ رہا غصہ میں یہ نظم کہی۔

دلاور مفلسی سب سے اکڑ رہ   یہ عالم بے کسی سب سے اکڑ رہ
چکن اور زر کا چیرہ پشم کر بوجھ   پھٹی پگ باندھ کر سب سے اکڑ رہ
اگر شلوار نباشد کس کو غم ہے   لنگوٹا باندھ کر سب سے اکڑ رہ

ایک دفعہ لوگوں نے صلاح دی کہ کوکلتاش خاں سے عفو جرائم کی درخواست کرو، انہوں نے ہرگز منظور نہ کیا اور یہ نظم لکھی

اے تونگر ایں محل آبشورہ تا بکے   شربت قند و گلاب کورہ کورہ تا بکے
کج کلاہ و قرب شاہی عز و جاہ و سال و ماہ   پاندانِ نقرہ و زریں کٹورہ تا بکے
کُلّ شیئٍ ھالکٌ جعفر زباں را بند کن   ایں سخنہائے زٹل پھک الپھکوڑہ تا بکے

اورنگ زیب کی وفات پر میر صاحب نے دو مرثیے لکھے۔ ایک نہایت متین ہے۔ دوسرا اُن کے رنگ کا ہے۔ جس کے دو شعر یہ ہیں؛

اورنگ زیب مر گئے نیکی جگت میں کر گئے   تخت اور چھپر کھٹ دھر گئے آخر فنا آخر فنا
موا خدا کی یاد میں رکھا اورنگ آباد میں   خبریں گئیں بغداد میں آخر فنا آخر فنا

تذکرہ خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ جب اعظم شاہ تخت نشین ہوئے، تو شعرا کے ساتھ میر صاحب نے بھی سکہ نظم کیا اور وہ نہ صرف بادشاہ کو پسند ہوا بلکہ خاص و عام کو پسند آیا۔ بادشاہ نے انعام میں خلعتِ فاخرہ اور ہاتھی اور ایک لاکھ روپیہ دیا۔ مگر ان کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ گھر پہنچنے بھی نہ پائے اور تمام روپیہ راستہ ہی میں صرف کر دیا۔

میر صاحب کے کلیات میں اگرچہ فحش بہت زیادہ ہے پھر بھی وہ انواع و اقسام ظرافت نظم و نثر سے مملو ہے۔ چنانچہ

۱۔ گفتگو نامہ نثر جس میں اردو کے محاورات اور ضرب الامثال کا محل صرف نہایت خوبی سے بتایا گیا۔

۲۔ رقعات نثر جن میں تلازمے اور طرح طرح کی شوخیوں کا وہ عالم ہے کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔

۲۔ عدالتی تحریریں نثر اپنے خاص الخاص رنگ میں جن میں تلازمے۔ ظرافت شوخیاں اپنے اپنے محل پر سبھی کچھ ہیں

۴۔ شرارت نامہ جس کو شاہی یادداشتوں اور تزک کے طرز پر مرتب کیا ہے اور اس میں ضرب الامثال کو اس صورت سے صرف کیا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۵۔ مصطلحاتِ زمانہ۔ یہ لغت کے طریق پر ہے۔ زمانہ کی رسم و رواج اور ضرورت کے موافق اس میں الفاظ کے معانی بیان کیے ہیں۔ اگرچہ اس کو دیکھ کر میر صاحب کے کمالِ ظرافت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ مگر اس کی ایجاد کا سہرا غالباً عبید زاکانی کے سر ہے۔ ان کی لغت بھی ان کے کلیات میں شامل ہے۔ ان کے علاوہ اور اقسام کی نثریں بھی پائی جاتی ہیں۔

حصۂ نظم جس میں ظرافت، واقعات، ہجویات، رقعات، دستور العمل، پند و نصائح، رجز، نسخہ جات، مسلے، غزلیات، مورچھل نامہ، کھوسے نامہ، مسدس، ظفر نامہ، مراثی، اسپش نامہ، تضمین، قطعات، اردو فارسی سبھی کچھ ہیں اور ہر ایک اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔

اگرچہ اُن کا کلام اُن کے رنگ میں سراپا انتخاب ہے مگر ضرورتاً تھوڑا سا انتخاب پیش کرتا ہوں

انتخاب دستور العمل

ہر زن کہ باشد جنگجو، در چال مٹکے مو بمو   دارد بہ شوہر گفتگو اس نار سے انکار بہ
جو ہر دلڑا کا گر بود پر خوف و ڈر آں گھر بود   وہ گھر سدا ابتر بود اس گھر سے گنگا پار بہ
جو نار لچکے چال میں سسکی بھرے ہر حال میں   کالا تو ہے کچھ دال میں از قرب او زنہار بہ
جو رانڈ ہو کاجل کرے جوئے چندن پر من دھرے   چوڑی پہن مہندی کرے بر گردنش تلوار بہ
گھوڑا جو اسواری نہ دے صاحب طلب ساری نہ دے   بیٹا جو وہ یاری نہ دے ایں ہر سہ تن فی النار بہ
سسرا جو ہو دل تنگ جی ممسک خسیس و تنگ جی   داماد سے بیرنگ جی اس سے سگِ مردار بہ

جعفر بہ بوستانِ جہاں دم غنیمت است   شادی نصیب گر نشود غم غنیمت است
در پیازہ و کباب نہ باشد اگر ترا   زاں ساگ طعام بجیہ شلغم غنیمت است
گر اسپ صفا نبود رو بہ کار تو   یک خچر گدھری پالم غنیمت است
آواز شیو برہ نرسد گر بگوش تو   آواز بول بیگم و خانم عنیمت است
تربوز و خربزہ نبود گر میسرت   یک سبز پھانک کھیرہ بالم غنیمت است

ہجو مرزا خدا یار بیگ

زہے قدرتِ پاک پروردگار   کہ مرزا خدا یار ملا پچھار
کردں اب خبر شہر و بازار کو   لگی آہ میری خدا یار کو

خدا یار پر صبر میرا پڑا   کہ تالاب پر یہ بھجڑا پڑا
بدستِ حریفاں گرفتار شد   بہ پشت و سرش مشت و پیزار شید

چہ مرزا چہ رفتار و گفتار او   چہ آواز بیزار و دستار او
تڑا تڑ سڑا سر لگی لاگنے   مشک چال مرزا لگے بھاگنے

پکڑ باندھ کر جب مرنڈا کیا   کشندا اس کا تال گنڈا کیا
دریغا چہ صورت چہ دستار او   چہ پاجامۂ چوڑیاں دار او

چو ایں ماجرا جان بابا شنید   دوا دو دوا دو بپاپے رسید
رہے جان بابا شرافت مآب   کہ کوا چھڑایا لگڑ سے شتاب
جہاں میں کروں آج میں لومڑی   کہ گیدڑ کے منہ سے چھٹی لومڑی
خدا یار مسکین دہماد ہم کٹ   بلیا کے نیچے سے چوہا چھٹا

مدح حسنِ معشوق

جعفر چہ بیبی باشد و کس باغ کی مولی   بر حسن تو جبرئیل گرفتار جو ہے سو

باتیر لیناکانی و برچھی تعنا ملی   امروز مجھے مار نہ لے یار جو ہے سو

جعفر زٹلی نے ایسا کیا   کہ مکھی کو مل کے بھینسا کیا
کشتی جعفر زٹلی در بھنور افتادہ است   ڈبکو ڈبکو می کند دریک توجہ یار کن
کھکڑ لگا دیوار کو جعفر کہ اب کیا کیجیے   خطرہ پڑا بازار کو جعفر کہ اب کیا کیجیے
گھوڑا تو تیرا لنگ ہے کوئی نہ تیرے سنگ ہے   چلنا پڑا بازار کو جعفر کہ اب کیا کیجیے
جعفرا شکر کن کہ در عالم   جا بجا نام تو زٹلی شد
شہرت مرد بہتر از ہر قسم   ہر کہ گم نام زیست ٹلی شد

سودا

مرزا محمد رفیع سودا جن کی شیرا بیانی کی بڑی دھوم ہے اور جن کی ہجو نگاری نے اپنے معاصرین کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ مرزا محمد شفیع کے فرزند تھے، جو کابل سے دہلی میں آکر تجارت پر بسر اوقات کرتے تھے۔ وہ سنہ ۱۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور اپنے زمانے کے رواج کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے بعد شعر و شاعری میں شاہ حاتم کی شاگردی اختیار کی قسمت کی خوبی اور شگفتہ مزاجی نے شاہ عالم بادشاہ کے دربار سے خطاب ملک الشعرائی دلوایا۔ خاندانِ تیموریہ کے چراغِ اقبال کی روشنی ذرا مدھم ہوئی، تو دہلی سے فرخ آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے، جہاں وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر کا دور دورہ تھا۔ یہاں بھی ان کی شایانِ شان عزت ہوئی۔ وہ عالمِ شباب سے پیری تک لکھنؤ میں رہے اور سنہ ۱۱۹۵ھ میں یہیں پیوندِ خاک ہو گئے۔

میر انیس کے پردادا میر ضاحک سے خدا معلوم کس بات پر چل گئی کہ ادھر ادھر دونوں طرف سے ہجووں کی بھرمار رہنے لگی۔ سودا کی شاعرانہ معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ایک ایک اعتراض کے سو سو جواب دیتے تھے اور انہیں سے ان کی ظریف المزاجی اور بذلہ سنجی کا پتہ چلتا ہے، استدادِ زمانہ سے میر ضاحک کی محنت تو ضائع ہو گئی۔ سودا کی لکھی ہوئی ہجویں اب تک موجود ہیں۔ چنانچہ یہ ترجیع بند میر ضاحک کی ہجو میں ہے ؎

جا صبا ضاحک سے کہہ بعد از سلام
کیوں کیا کرتا ہے ہجوِ خاص و عام
آپ کو کہتا ہے تو سید یُوں مَیں
جد مرا پوچھو تو ہے خیر الانام
پس دکھا تو اب کسی کی ہجو میں
ہو اگر ختمِ رسالت کا کلام
کون ہے تیری سیادت کا مقر
جانتے ہیں خاص سے لے تا عوام
تیرے والد کو ہوئی تپ ایک سال
تب حکیموں نے بہ تشخیص تمام
دق سمجھ کر یہ دوا تجویز کی
شیرِ خرہ با قرص کافور ایک دام
مول لے اک مادہ خر پینے لگا
ہر سحر اس شیر خرہ کا بھر کے جام
آخر کار اس مرض کے بھی لئے
وہ جو مادہ خر تھی اس کی آئی کام
ریم سوزاکِ پدر ہے تو شریہ
رحم مادر سے اُلٹ نِکلا ہریسہ

سُن تو ٹک اے نصف انسان نصف خر   ہم نے کیا سید نہیں دیکھے مگر
بیش و کم تجھ میں نہ دیکھا عقل و حمق   نطفہ کی ترکیب کا ہے یہ اثر
گھر سے اپنے کھا کے جاوے جس کے ہاں   جاتے ہی مانگے ہے اس سے ماحضر
عقل کہتی ہے کہ کھائے پر نہ کھا   حمق کہتا ہے کہ ہیضے سے نہ ڈر
سید اے پیرِ مثلث آپ کو   کہنا اتنا ہو کے بے خوف و خطر
ریم سوزاکِ پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے الٹ نکلا ہو میر

ایک دوسری ہجو جو میر ضاحک کے متعلق لکھی ہے اس کا ایک بند دیکھیے۔ متانت پناہ مانگتی ہے۔ ظرافت انگشت بدنداں ہے۔

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا   بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
مجلس میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا   تب شیخ سدو اس پہ غصہ کو کھا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

میر ضاحک کی ہجو میں ایک مخمس کی ابتدا اس بند سے ہوئی ہے۔

یارب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر   ضاحک کے اُڑا دیوے کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچۂ بندر   گلیوں میں نچاتا پھرے وہ شہر کے اندر
روٹی تو کما کھاوے کسی طرح مچھندر

بڑھاپے کی شادی پر ایک مخمس لکھا ہے جس سے ان کی انتہائی ظرافت کا پتہ چلتا ہے۔

نائن کہے ہے شرم سے دولہا ہے سرنگوں   اب کیونکہ تیل رُدئے مقدس کو میں ملوں
شانہ کروں میں ریش کو یا وسمہ سے رنگوں   جی کی امان پاؤں تو اک بات میں کہوں
منہ کو کلنگ اپنے لگاتے ہیں شیخ جی

القصہ شیخ جی کی جو حرمت خدا گنوائے   بارہ برس کی چھوکری باجا بجاتے لائے
آئے دولہن کے گھر سے جو مقنع میں منہ چھپائے   جیسا ہمارے کہنے کو خاطر میں وہ نہ لائے

اپنے کیے کو تیسا ہی پاتے ہیں شیخ جی
جورو کہے ہے شیخ سے اے شیخ تم سنو   کچھوے کو تم نے دی ہے دغا چپکے ہو رہو
میں جانتی ہوں تم کو کہ تم فیلسوف ہو   سودا زیادہ کیا کہے ہے بات گو مگو
جیسے ہیں تیسے جوتیاں کھاتے ہیں شیخ جی

کسی مولوی نے فتویٰ دے دیا کہ کوا حلال ہے۔ سودا کو ظرافت کے لیے ایک مسالہ ہاتھ آیا۔ فوراً ایک ہجو لکھ ڈالی۔ اور وہ وہ اوکھیاں سنائیں کہ آج تک دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ۔

لشکر کے بیچ آج یہی قیل و قال ہے   کھانے کی چیز کھانے کا سب کو خیال ہے
یوں دخل امر و نہی میں کرنا محال ہے   جو فقہ داں ہیں سب کو یہ ان کا خیال ہے
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

حامی انھوں کے قول کا ہوئے ہے چاند خاں   اور دوسرے میں کیا کہوں اک اپنے مہرباں
کچھ شکّ رہا ہے کوّے کی حلّت کے درمیاں   ہم سے جو کوئی پوچھے تو ہم بھی کہیں کہ ہاں
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

یارو بسو ہو تم اسی دیر خراب میں   بیٹھا اوٹھا کرو ہو سدا شیخ و شاب میں
حلّت رکھے ہے زاغ کسو بھی کتاب میں   جتنی کتب ہیں فقہ کی اُن کے جواب میں
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

فدوی ایک پنجابی شاعر تھے۔ ابھی معلومات شاعرانہ بھی اچھی خاصی تھیں، اتفاق سے اُن سے اور سودا سے کچھ بحث ہو گئی۔ سودا نے اس غریب کی اتنی ہجو کی کہ عاجز آ گیا ۔

جہاں میں کون بناتا ہے اُلّو بننے کا   کسی سے بن کوئی آتا ہے اُلّو بننے کا
بہت ہی جان کھپاتا ہے اُلّو بننے کا   بنا بھی کو یہ آتا ہے اُلّو بننے کا

کہ فدوی جگ میں کہاتا ہے اُلّو بننے کا

کیا ہے خرچ بنانے میں اس کے میں یہ ہنر   نہیں ہے اصلی و نقلی میں فرق ذرّہ بھر
جو اور بوم ہو سو مادہ یہ لگے ہے نر   جو راہ باٹ میں آتا ہے صبح و شام نظر
کہے ہے خلق وہ جاتا ہے اُلّو بننے کا

میں کاریگر ہوں اتادیکا سب پہ ہے ظاہر   جو کچھ کہے کوئی کرتا ہوں پیٹ کی خاطر
وہ بوم بننے میں گر نقص سے ہو کچھ ماہر   تو اس کی شکل کروں اور جانور کی پھر
عجب شور مچاتا ہے اُلّو بننے کا

غرض کہ اسی طرح ایک مولوی صاحب کشمیری کی ہجو میر ضاحک کی مذمت مرزا فاخر مکین کا خاکہ مولوی ندرت کشمیری کی لڑکی کی تذلیل اور تضحیک ان کے یہاں موجود ہے جو بوجہ طوالت کے نہیں لکھی جاتی۔

اگرچہ یہ کہنا زیادتی ہے کہ ہجو بھی داخلِ ظرافت ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ہجو نگار بھی تمام مسخرا پن اور ٹھٹھول طعن و طنز و تشنیع کے ذرائع کام میں لاتا ہے اور اسی سے ایک صورتِ ظرافت کی پیدا ہو جاتی ہے۔

گھوڑے کی ہجو میں سوداؔ نے اپنے عہد کے فوجی نظام پر چوٹ کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

اِتنا وہ سنگھوں ہے کہ سب اُڑ گئے ہیں دانت   جبڑے پہ بس کہ ٹھوکروں کی نت پڑے ہے مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن   پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے   شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

گھوڑے کی سُستی

ایک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں   دولہا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار

سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سفید   تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ باردار

پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں   شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار

مرہٹوں کی فوج سے مقابلہ کے لیے گھوڑے کا مالک اس پہ سوار ہو کر جس شان سے نکلا تھا اس کی تصویر اس طرح اتاری ہے

جس شکل سے سوار تھا اُس دن میں کیا کہوں   دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا مُنہ میں باگ   تک تک سے پاشنہ کی مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے توبڑا اسے دکھلائے تھا سئیس   پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

میدانِ جنگ میں پہنچنے پر جو کیفیت گذری ؎

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر   دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار
جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل   لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہُوا شہر کی طرف   القصّہ گھر میں آن کے مَیں نے کیا قرار

گھوڑے کا مالک مفلسی کی وجہ سے دانہ تک فراہم نہیں کر سکتا ؎

نے دانہ و گیاہ نہ تیمار نے سئیس   رکھتا ہُوں جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار
ناطاقتی کا اُس کی کہاں تک کروں بیاں   فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانندِ نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا   ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ تو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال   کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد   اُمیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یُوں چمار

گھوڑے کی بھوک کی شدّت ملاحظہ ہو ؎

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر   دیکھے ہے آسمان کی طرف ہو کے بے قرار
تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھاس کا   چوکے کو آنکھ موند کے دیتا ہے وہ سپار
خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ   ہر دم زمیں پہ آپ کو ٹیکے ہے بار بار

اس کی ناتوانی کا حال ؎

ہے اس قدر ضعیف کہ اُڑ جائے باد سے   میخیں مگر اس کے تھان کی ہو ویں نہ استوار
نے استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں   دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار
سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ   خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار
ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار

میر

خدائے سخن میر تقی میر کے تفصیلی حالات اور واقعات کے لیے ذکرِ میر، فیضِ میر، نکات الشعرا، کلیاتِ میر، آبِ حیات اور لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ملاحظہ فرمائیے۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے بزرگ حجاز سے ہجرت کر کے دکن پہنچے۔ وہاں سے احمد آباد گجرات میں آئے۔ پھر آگرہ میں قیام کیا۔ میر وہیں ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے اور اپنے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس دلی چلے آئے۔ انہیں کے زیرِ سایہ پرورش پائی اور تعلیم و تربیت حاصل کی۔ جوان ہوئے تو نواب آصف الدولہ کے بلانے پر لکھنؤ چلے گئے۔ برسوں وہاں رہے اور نوّے برس کی عمر پا کر ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔

میر نہایت نازک مزاج، خود دار، خود پسند، بے حد قانع اور متوکل شخص تھے۔ ہر صنفِ شعر پر قادر تھے۔ تمام اساتذۂ فن نے اُن کو اُستاد تسلیم کیا ہے۔ چھ دیوان غزلوں کے، دو واسوخت، کئی مخمس اور مثنویاں مثلاً شعلۂ عشق، دریائے عشق، جوشِ عشق، معاملاتِ عشق، خواب و خیال، شکار نامہ، اژدر نامہ اور تذکرۂ نکات الشعرا ان کی یادگار ہیں۔

میر نے سودا کی طرح ہجویں بھی لکھی ہیں مگر سودا سے کمتر درجہ کی ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا "میر نے ذاتیات کے جھگڑوں میں اُلجھنے کی بجائے اپنے ماحول کو ہجو کا نشانہ بنایا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے اپنے گھر کا جس انداز سے مضحکہ اڑایا ہے اور جس طریق سے اس کی جزئیات پر نظر ڈالی ہے وہ بے حد قابلِ تعریف ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ "گھر" کی یہ ہجو میر کے رنگِ طبیعت کے عین مطابق ہے لہذا یہاں وہ اپنی شاعری کے مقامِ بلند پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ میر دراصل نہاں خانۂ دل کے شاعر ہیں اور اپنے شعر میں ماحول کی عکاسی کی بجائے داخلی طریق کار اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے "گھر" میں ایک لحظہ کے لئے جھانکتے ہیں تو دراصل اپنے نہاں خانۂ دل میں جھانک رہے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دل کے انتشار اور بے قراری کی طرح "گھر" کی ابتری اور بے ترتیبی بھی ان کے لئے دلچسپی کا موجب ہے۔ اور یہاں ان کے قلم میں وہی روانی پیدا ہوتی ہے جو ان کی غزلیات کا مابہ الامتیاز ہے علاوہ ازیں "گھر" کی ان ہجویات کے مطالعے سے میر کی وسیع القلبی کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ خود کو نشانۂ تمسخر بنانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔" (اردو ادب میں طنز و مزاح ص ۸۰-۸۱) اس مثنوی کے چند شعر دیکھیے ؂

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال   اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے   سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی   آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
کیا کہے مینہ سقف چھلنی تمام   چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق   سو شکستہ تر از دلِ عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک   کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں گھر ہے کسی چھچھوندر کا   شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے   کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں   پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
دب کے مرنا ہمیشہ مدِ نظر   گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے   برسے ہے اک خرابی گھر در سے
اک چھپر ہے شہرہ دلی کا   جیسے روضہ ہو شیخ چلی کا
شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں   سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں
کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے   سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے
گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا   پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا
جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان   ساری کھاٹوں کی چولیں نکلی ندان
نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو   پائے پٹی لگائے کونے کو
ایسے رہتے ہیں گھر میں تو بیٹھے   جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے

دو طرف سے تھا کتوں کا رستا　　کاش جنگل میں جا کے میں بستا
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں　　چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کوٹھا اچھل ہوا تھا بیٹھ گیا　　پانی جز جز میں اس کی بیٹھ گیا
نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

میر اپنے گھر یا ماحول کا نقشہ کھینچنے میں جتنے کامیاب ہیں۔ افراد کی ہجو کہنے میں اتنے ہی ناکام ہیں۔ بعض بعض ہجوؤں میں تو وہ فحش اور گالی گلوچ کی حد تک چلے گئے ہیں اور خاصے اکھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ ہجویں اثر سے خالی ہیں "خواجہ سرا" اور "بلاس رائے" کی ہجویات میں یہ کیفیت نمایاں ہے۔ ہجو اکول کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

اک ہے پُرخور آشنا بے پیر　　سینہ سوراخ جس سے ہے کف گیر
صد منی دیگ ہے شکم اس کا　　نفسِ اژدہا ہے دم اس کا
آنت شیطان کی ہے اس کی آنت　　دانت اس کا ہے ہاتھی کا سا دانت
گال کلّے سے پھر توے سے سیاہ　　کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ
توند کالی جو کھول جائے لیٹ　　آہنیں ہے تنور اس کا پیٹ
راہ مطبخ میں پڑے ہے جو کبھی　　چاٹ جاتا ہے دیگچوں تک بھی
کھینچے باورچیوں کے کیا کیا ناز　　کتری گئی اس کے چوتڑوں پر پیاز
خام طمعی سے اک کرے ہے آہ　　دیکھ کر شب کو نان ہالۂ ماہ
کھانے پر جب وہ جی چلاتا ہے　　لاٹھی پاٹھی بھی کھائے جاتا ہے
بھوک کا بوُلا جو آتا ہے　　لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے
دہر کا جلنا آگ سے مانوں　　بھوک اس کی جلے تو میں جانوں

جب مرے گا وہ بھوکا روجی   رُوح توشے کی روٹی میں ہوگی
کھانے کی بو جو ناک میں پیٹھے   مر گیا ہووے تو بھی اُٹھ بیٹھے
عقل باور اگرچہ کرتی نہیں   وہ مرے بھوک اس کی مرتی نہیں
بھوک سے اس کا جو جی نکل جائے
گور میں بھی کفن نگل جائے

مُرغ باز

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے   گرم پرخاش مرغ یاں پائے
آدمی جو بڑے کہاتے ہیں   مُرغ ملدے بغل میں آتے ہیں
جمع منگل کو بالی کی ہے دھوم   گلیوں میں روزِ حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش   جس کو دیکھو تو مُرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں   سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پَر جھاڑے یہ بھڑکنے لگے   ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہُوا تو یہ ہیں کج   ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج
مُرغ کی ایک پرفشانی ہے   ان کی صد رنگ بَدزبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ   ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں   لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
ایک کے مُنہ میں مُرغ کی منقار   ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
مُنہ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے   تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے

طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے   بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سر پہ بغل میں مارے مُرغ
لے گئے جیتے ہارے سارے مُرغ

لشکر

جس کسی کو خدا کرے گمراہ   آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ   جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ

فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اداس   بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس   چیتھڑوں بن نہیں کسی کے پاس
یعنی حاضر یراق ہینگے سپاہ

مفلسی سے رہا ہے کس میں حال   خورش و خواب ہینگے خواب و خیال
چار دن عمر کے ہوئے ہیں وبال   زندگی اپنے طور پہ ہے محال
مرگ ملتی نہیں ہے خاطر خواہ

"ہجو نا اہل" میں اپنے کسی حریف سے دو دو چونچیں کی ہیں ؎

سنو اے اہلِ سخن بعد از سلام   چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخمِ حرام
کام مجھ کو کچھ نہیں ہے اور سے   بلکہ اس بھی طرز سے اس طور سے
شاعری کو میری ہو گے جانتے   تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے
میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار   کن کہلاؤں تھا ہجو کا کر شعار

تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا   دردمند و عاشق و دلریش تھا
پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب   غصے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تپ
ایسے کتنے ہیں جواب شاعر بنے   مدتوں یہ لونڈے آئے مجھ کنے
ایک میرے طرز پر کہنے لگا   دوسرا پیرو مرا رہنے لگا
سارے عالم میں ہوں میں چھایا ہوا   مستند ہے میرا فرمایا ہوا
مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر   مردۂ صد سال سا بے نور تر
کاسہ لیس مایہ خبث و حسود   قلیۂ دہ روزے سے بھی بد نمود
باپ اس کا سخت ناداں نادرست   کوڑی کی سی گندی بلی قاق وست
مستی اس کی ساری اب جھڑ جائیگی   دھوم ساری گلیوں میں پڑ جائے گی
ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اٹھائے   چیونٹی کا کیا جگر جو منہ پہ آئے
اک دھکے میں کہاں وہ کامنی   پودنے کی سی ہے اس کی ضامنی
یہ قبول خاطر و لطف سخن   دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن
ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور   اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور
میں نے الٹی اجگروں کی دم میں صف   ادھ موئی سی چھپکلی کیا ہو طرف
رکھتی ہے میری شرافت اشتہار   گویا ناسید کہے ہے کیا چمار
بیت کہنا چاہتا ہے سو ہنر   شاعری سمجھا تھا کیا خالہ کا گھر

نامبارک ہی نہیں سادہ بھی ہے
الو ہے اور الو کی مادہ بھی ہے

مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے انہیں اس قسم کی ہجویں کہنے پر مجبور کیا گیا۔ ورنہ وہ اسے دل پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے طرزِ زندگی اور طرزِ احساس کو سماج کے طرزِ زندگی کے مقابل رکھ کر دونوں کا موازنہ کرتے تھے اور فیصلہ بھی اکثر اپنے خلاف کرتے تھے۔ وہ اپنے اوپر ہنستے بھی تھے اور اپنے آپ پر طنز بھی کرتے تھے۔ ایسا طنز نہیں جس میں تلخی اور بیزاری شامل ہو بلکہ یہ طنز میر کی سب سے انفرادی اور سب سے ممتاز چیز ہے۔ یہاں لاکر وہ دونوں حقیقتوں کو ایک جگہ ملا دیتے ہیں۔ دوسروں کا نقطۂ نظر بھی تسلیم کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کی اہمیت اور برتری کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کرتے ہیں۔ اپنے اوپر ہنستے بھی ہیں اور اپنے آپ سے محبت بھی کرتے ہیں۔ اس طنز میں اپنے آپ سے مایوسی اور نفرت نہیں ملتی بلکہ اپنے آپ سے لطف لینے کی صلاحیت[1]۔ اب آپ میر کے کچھ شعر ایسے سن لیجئے جن کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے ؎

کہتا تھا کسی سے کچھ تکتا تھا کسی کا منہ   کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر   کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

میر صاحب کو دیکھئے جو بنے   اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

کسو وقت پاتے نہیں اس کو گھر   بہت میر نے آپ کو گم کیا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا   تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

شور و شغب کو راتوں کے ہمسائے تمہارے کیا رو دیں   ایسے فتنے کتنے اٹھیں گے میر جی تم سلامت ہو

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی   میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

میر صاحب رلا گئے سب کو   کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں   تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے   جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

---

[1] مضمون "میر جی" از محمد حسن عسکری مطبوعہ ساقی میر نمبر ص ۲۷۷

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار   تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

وحشت ہے بہت میرؔ کو مل آئیے چل کر   کیا جانیے پھر مل سکے کب ہو ملاقات

چل ہم نشیں کہ دیکھیں آوارہ میرؔ کو ٹک   خانہ خراب وہ بھی آج اپنے گھر رہا ہے

سودا ہو تب ہو میرؔ کو تو کریے کچھ علاج   اس تیرے دیکھنے کے دوانے کو عشق ہے

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں   جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا

کس طرح میرؔ جی کا ہم توبہ کرنا مانیں
کل تک تھے داغ مے کے سب ان کے پیرہن پر

انشا

سید انشاء اللہ خاں، حکیم ماشاء اللہ خاں کے فرزند تھے۔ ان کے بزرگ نجفِ اشرف سے ہندوستان آکر دلی میں بس گئے تھے اور اپنے علم و فضل کی بدولت دربار میں رسائی حاصل کر کے سلسلۂ امرا میں داخل ہو گئے تھے۔ سید انشاء اللہ خاں کی ولادت نواب سراج الدولہ کے عہد میں سنہ ۱۷۵۶ء اور سنہ ۱۷۵۵ء کے درمیان مرشد آباد میں ہوئی۔ مولانا عبدالحی گلِ رعنا میں فرماتے ہیں

> "ان کے والد میر ماشاء اللہ خاں فضیلتِ علمی کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی۔ یہ بھی بلا کے ذہین تھے۔ تھوڑے دنوں میں فارسی اور اس کے بعد عربی میں خاصی استعداد پیدا کر لی۔ جب ادب کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ ان کی خاندانی چیز تھی — شاعری کی طرف آئے تو آندھی کی طرح آئے۔"

شاہ عالم کے زمانہ میں انشاؔ باپ کے ہمراہ دلی آئے اور شاہ عالم کے درباریوں میں شامل ہو گئے۔ اس وقت سنہ ۱۷۷۱-۸۲ء سلطنت کا سہاگ لٹ رہا تھا۔ دربار نام کا دربار تھا باقی اللہ کا نام۔ چار و ناچار چند روز نباہی اور اپنی خوش مذاقیوں اور گل افشانیوں سے اس وادیٔ خزاں رسیدہ کو گل و گلزار بنائے رکھا۔ یہاں سے طبیعت اچاٹ ہوئی، تو لکھنؤ کا رخ کیا جہاں شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ نے باپ کے درباری ہونے کا لحاظ کر کے قدر کی اور

غربت کے آنسو پونچھے۔ مگر چند روز بعد نواب سعادت علی خاں کے دربار میں پہنچے اور اس قدر مقرب ہوئے کہ نواب کو اُن کے بغیر کسی وقت چین ہی نہ آتا تھا۔ لکھنؤ کی فضائے انشاؔ کے بگڑے ہوئے مذاق کو جو دہلی کی صحبتوں میں خراب ہو چکا تھا، کچھ ایسا نوازا کہ ان کے اصلی جوہر تمسخر، پھکڑ اور شہدپن کے غبار میں چھپ گئے۔

لکھنؤ میں انشاؔ اور مصحفی میں بڑے معرکے ہوئے جن کی تفصیل آبِ حیات اور دوسرے تذکروں میں موجود ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں

"ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت و غمازی اور ساز و باز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی۔ ہر منہ چڑھا مصاحب دوسرے کے اکھاڑنے اور جمانے کی فکر میں رہتا ہے اور اس میں وہ عیاریاں اور افترا پردازیاں، حرفتیں اور جدّتیں کام میں لائی جاتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انشاؔ، جرات اور مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے۔ اوّل اوّل شاعرانہ چشمک رہی۔ بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ اور فحش و پھکڑ تک پہنچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشاؔ نے وہ کیچڑ اچھالی ہے کہ حیا اور غیرت کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جس کے مزے صاحبِ عالم اور نواب بھی لینے لگے اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آئی۔"
(مقدمہ تذکرہ ریاض الفصحا)

انشاؔ کی طبیعت ہنگامہ پسند ضرور تھی لیکن لکھنؤ میں اس معرکہ کی ابتدا خود مصحفی کی طرف سے ہوئی۔ مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ایک مشاعرہ ہوا جس میں لکھنؤ کے مروّجہ مذاق کے مطابق عجیب قوافی اور ردیف کی طرح دی گئی۔ مصحفی نے غزل کہی جس کا مقطع تھا ؎

تھا مصحفی بہ مائلِ گریہ کہ پس از مرگ　　تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

کسی نے اس شعر میں تصرّف کر کے یوں کر دیا ؎

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ　　تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

مصحفی سمجھے کہ یہ انشاؔ اور اُن کے ہواخواہوں کی شرارت ہے۔ انھوں نے ایک فخریہ غزل کہی جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

مدّت سے ہوں میں سرخوشِ صہبائے شاعری　　ناداں ہے جس کو مجھ سے ہو دعوائے شاعری
میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شعر کو　　برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری
اک طرفہ خر سے مجھ کو پڑا کام ہے کہ ہائے　　سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

اے مصحفی ز گوشۂ خلوت بروں خرام
خالی است از برائے تو خود جائے شاعری

انشآ کی طبیعت اس وقت تک صاف تھی وہ پالکی میں سوار ہو کر مصحفی کے پاس غلط فہمی رفع کرنے گئے لیکن مصحفی نے لاپروائی سے جواب دیا۔ واپس آکر انشا نے بحرِ طویل میں مصحفی کی ہجو کہہ ڈالی۔ یہ اس مناقشہ کی ابتدا تھی اس کی انتہا وہ ہوئی جس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔

اسی زمانہ میں ایک اور مشاعرہ ہوا۔ مصحفی نے غزل کہی جس کا مطلع ہے

سر مشک کا تیرا تو ہے کافور کی گردن   نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

انشآ نے ایک طویل قصیدہ میں اس بات پر اعتراضات کئے۔ بعض شعر یہ ہیں ؎

سن لیجئے گوشِ دل سے مری منشانہ عرض   مانندِ بید غصے سے مت تھر تھرائیے

کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر   مُردے کے پاس زندوں کو لاکر لگائیے

ایسے نجس کثیف قوافی سے نظم میں   دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمائیے

آخری شعر میں در پردہ مصحفی پر چوٹ ہے جو بقول آزآد مسی ملا کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے دانت سیاہ تھے۔ اس کے بعد انہیں ردیف قوافی میں خود غزل کہی ہے ؎

آئینے کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے   سر خر کا منہ خوک کا لنگور کی گردن

توڑوں گا خمِ بادۂ انگور کی گردن   رکھ دوں گا دہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشآ   تو توڑ دے جھٹ بلعمِ باعور کی گردن

مصحفی کب چپ رہنے والے تھے۔ اُنہوں نے جواب میں ایک قطعہ لکھا اور خود انشآ کی غزل پر بہت سے اعتراضات وارد کئے غرض مناقشہ نے جنگ کی صورت اختیار کر لی اور مصحفی کے شاگردوں میں سے گرم اور منتظر نے علاوہ اور ہجویاتِ رکیک کے ایک مثنوی گرم طمانچہ" لکھی جس کے جواب میں انشآ نے بھی ایک مثنوی لکھی اور اس میں مصحفی کے ساتھ غریب مصحفن کو بھی شامل کر لیا ایک باقاعدہ جلوس مرتب کیا گیا ایک شخص ہاتھی پہ بیٹھا ایک گڈے اور گڑیا کو لڑاتا جاتا تھا اور شعر پڑھتا جاتا تھا۔

مصحفی کے ہواخواہوں نے بھی جلوس کا جواب جلوس سے دینا چاہا مگر شہر کے کوتوال نے روک دیا۔ مصحفی کی شکایت پر نواب وزیر آصف الدولہ نے انشآ کو لکھنؤ سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ انشآ حیدر آباد کے لئے روانہ ہوئے ہی تھے کہ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا اور یہ پھر لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ کی فضا کے متعلق انشآ خود دریائے لطافت میں میر غنچہ غینی کی زبان سے فرماتے ہیں: ۔

جب سے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو کہو تو اس میں کچھ لطف نہیں رہا مجھ سے سنئے ریختے میں استاد میاں دلّی ہوئے ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم

> پھر سب سے بہتر مرزا رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ صاحب، پھر حضرت میر درد صاحب جو میرے بھی استاد تھے وہ لوگ تو سب مر گئے ان کی قدردانی کرنیوالے بھی جان بحق تسلیم ہوئے اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ویسے ہی شاعر ہیں اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے تخم تاثیر صحبت اثر۔ سبحان اللہ یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر۔ پوچھو تمہارا خان ہاں کس دن شعر کہتا تھا۔ اور رضا بہادر کا کون سا کلام ہے اور وہ دوسرے میاں مصحفیؔ کہ مطلق شعور نہیں رکھتے۔ اگر پوچھیئے کہ ضرب زید عمراً کی ترکیب تو ذرا بیان کر دو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو اپنا عرق بادیان اور شربت انارین چھوڑ کے شاعری میں آ کے قدم رکھا ہے اور میر انشاء اللہ خاں بچارے میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے آگے پری زاد تھے ہم بھی گھورنے جاتے تھے۔ اب چند روز سے شاعر بن گئے مرزا مظہر جان جاناں کے روزمرے کو نام رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ ایک اور سنئے سعادت یار طہماسپ کا لونڈا ریختے کا آپ کو استاد جانتا ہے رنگین تخلص ہے ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔"

میر انشاء ضرورت سے زیادہ شوخ اور ظریف تھے۔ بعض اوقات حد اعتدال سے بڑھ جاتے تھے۔ اس لئے ۱۸۱۰ میں نواب سے بگڑ گئی اور اس نے حکم دے دیا کہ دربار کے سوا کہیں نہ جائیں دربار میں بھی بن بلائے نہ آئیں اسی پابندی کے عالم میں ۱۸۱۷ میں انتقال کیا۔

انشاء کی تصانیف میں دریائے لطافت سب سے زیادہ مشہور ہے۔ کلیات میں ایک فارسی، ایک اردو اور ایک بے نقط دیوان مثنویاں قصیدے، رباعیاں وغیرہ شامل ہیں۔ سب میں ان کے تمسخر اور مزاح کی شان موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انشاء ظرافت ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ وہ اگر اس کے سوا کچھ بھی نہ کہتے تب بھی ان کا علم و فضل اتنا ہی مسلم ہوتا جتنا اب ہے۔

انشاء کی شاعری کے متعلق مولانا آزاد کی اس رائے کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ "غزلوں کا دیوان عجیب طلسمات کا عالم ہے زبان پر قدرت کامل، بیان کا لطف، محاورہ کی نمکینی، ترکیبوں کی خوشنما تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں ابھی کچھ ہیں۔ جو غزلیں یا غزلوں کے اشعار با اصول ہو گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی ہے وہاں ٹھکانا نہیں۔"

ان کی[1] ظرافت کے اقسام گنانا ایک قسم کی دانستہ غلطی ہے۔ جو شخص بات بات میں ظرافت کے دریا بہاتے، کوئی کہاں تک اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ پھر بھی ریختی کو ان کے ظریفانہ انداز کا سب سے بڑا نمونہ سمجھئے۔ بعد ازاں ماڑواڑی وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ بہرصورت ہم ان کی ہر قسم کی ظریفانہ شوخیوں میں سے کچھ نمونے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں مگر قبل اس کے کہ نظم کا حصہ شروع کریں اُن کے کچھ لطائف لکھ دیتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے از راہ تکلف و تصنع نہ تھا بلکہ ان کی فطرت یہی تھی۔ ان کا وجود اُن کی ہستی محض ہنسنے ہنسانے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ لطف یہ ہے کہ جس رنگ میں کوئی شعر کہتے ہیں یا جس قسم کی ظرافت سے کام لیتے ہیں اس میں کسر باقی نہیں رکھتے۔ کیا مجال کہ کہیں اعتراض کیسا نظر بھر کر دیکھنے کی بھی گنجائش نکل آئے کوئی غلطی سرزد ہو۔ معاذ اللہ۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمر بھر انہوں نے اسی رنگ میں مشق کی ہے اور یہی رنگ عمر بھر رہا ہے وہ انتہا کے شوخ، حاضر جواب تھے۔ چنانچہ چند لطیفے درج کرتا ہوں۔

ایک دن نواب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ گرمی کی وجہ سے صافہ یا پگڑی علیٰحدہ رکھ دی سر گھٹا ہوا تھا نواب کے دل میں جو ترنگ اٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک ٹیپ دی۔ آپ نے جلدی ٹوپی سر پر رکھ کر کہا۔ بزرگوں کی نصیحت پر عمل نہ کرنا بڑی بُری بات ہے نواب

---

[1] تذکرہ خندۂ گل

نے کہا کیا۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ سنا تھا کہ ننگے سر کھانا کھانے سے شیطان دھولیں لگاتا ہے۔

ایک مرتبہ نواب نے دفتر والوں کو حکم دیا کہ بھئی سب خوشخط لکھو اور جو کوئی غلطی کرے گا فی غلطی ایک روپیہ جرمانہ کیا جائے گا۔ اتفاق کی بات ایک بڑے قابل مولوی صاحب نے فرد حساب میں اجناس کا سین بھول کر اجنا لکھ دیا نواب صاحب نے کہیں دیکھ لیا مولوی صاحب نے اس کے معنی بتانا شروع کیے اور تاویلوں کے انبار لگا دیے۔ نواب نے انشاؔ کو اشارہ کر دیا۔ انشاؔ نے یہ رباعیاں نظم کر کے پڑھیں اور غریب مولوی کو دیوانہ کر دیا۔

اجناس کی فرد پر یہ اجنا کیسا — یہاں ابر لغات کا گرجنا کیسا
گو ہوں اجنا کے معنے جو چیز اُگے — لیکن یہ نئی اینچ اینچنا کیسا

اجناس کے بدلے لکھے اجنا کیا خوب — قاموس کے رعد کا گرجنا کیا خوب
از روئے لغت نئی اینچ لے لی ہے — اس تان کے بیچ کا اینچنا کیا خوب

اجناس کے موقعہ پہ یہ اجنا آیا — سلمائے علوم کا یہ سجنا آیا
اجنا چیزے ست کاں بروید ز زمیں — یہ تخم لغت کا لو اپجنا آیا

نواب نے کہیں روزہ رکھا تھا اور یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی نہ آئے۔ پہرہ لگوا دیا تھا مگر انشاؔ کو کوئی ضروری کام تھا آخر عورتوں کا لباس بدل ناک پر انگلی رکھ نواب کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ نواب نے چونکہ حکم دے رکھا تھا کہ کوئی نہ آئے۔ اب یہ پہنچے ذرا تیوری پر بل آئے اُنہوں نے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

میں تو کہتی تھی نہ رکھ اے مرے پیارے روزہ — بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

ایک مرتبہ لب دریا چلے جا رہے تھے ایک حویلی نظر آئی جس پر یہ تاریخ لکھی تھی ع

حویلی علی نقی خاں بہادر کی

کسی نے کہا کہ انشاؔ دیکھو کیا تاریخ کہی ہے ذرا اسے رباعی تو کر دو تو اُنہوں نے فی البدیہہ کہا ؎ ،

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی — نہ سم کی نہ تال کی نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کس لُر کی — حویلی علی نقی خاں بہادر کی

فائق جو اُن کے معاصر تھے اُنہوں نے انشاؔ کی ہجو کہی انشاؔ نے صلہ میں پانچ روپے دیئے اور کہا ؎

فائق بے حیا چو ہجوم گفت   دل من سوخت سوختہ بہ
صلہ اشں تیغ ، دو پیہ دادم   دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

گیان چند ساہو کار کی ماڑواڑی میں ایسی ہجو لکھی ہے کہ تلوار تیغ تیز معلوم ہوتی ہے جس سے اس کی عزت ہتک کا خون بہا دیا گیا ہے۔ بھڑوں کھٹملوں وغیرہ کی ہجوؤں میں پوری پوری مثنویاں نظم کر دیں۔ مصحفی سے اُلجھے وہ وہ اوکھیاں کہیں کہ توبہ ہی توبہ ہے۔ انشا کے لیے کوئی یہی ضروری نہ تھا کہ وہ جب ہزل یا ظرافت یا ہجو کا ارادہ کرتے تب ہی ایسے شعر لکھتے نہیں غزل کہتے اس وقت بھی یہی عالم تھا قصیدہ لکھتے تو بھی یہی رنگ غالب رہتا دو چار شعر اس قسم کے سنئے اس کے بعد ریختی کا رنگ دیکھئے۔

لیا گر عقل نے منھ میں دل بیتاب کا گٹکا   تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا

صنم خانہ میں جب دیکھا بت و ناقوس کا جوڑا   لگا ٹھاکر کے آگے ناچنے طاؤس کا جوڑا

یہ سچ سمجھو کہ انشا ہے جگت سیٹھ اس زمانہ کا   نہیں شعر و سخن میں کوئی اس کی ساکھ کا جوڑا

دل ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا   ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا   تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

رات وہ بولے مجھ سے ہنس کر چاہ میاں کچھ کھیل نہیں   میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں

کوئی دنیا سے کیا بھلا مانگے   یہ تو بیچاری آپ ننگی ہے
ڈرو وحشت کی دھوم دھام سے تم   وہ تو ایک دیونی دبنگی ہے

خیال کیجئے کہ کیا آج کام میں نے کیا   جب اُن نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا   جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں راجہ کے کنڈ پر   بن کر مہنت گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
راجہ جی ایک جوگی کے چیلے پہ غش ہیں آپ   عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لنڈ منڈ پر

جو چاہے تو مجھ سے ہنسوڑے کی خیر
تو یوں دیکھ اس گھوڑے جوڑے کی خیر
کدا دے نشئے کے مرے رخش کو
میاں ساقی اس سلفے کوڑے کی خیر
ہنسایا جو میں نے تو بولے نہیں
نظر آتی کچھ اس نگوڑے کی خیر
لگا بیٹھ انشا کو ٹھوکر تو ایک
ارے اپنے سونے کی توڑے کی خیر

رادھکا کو چین کیا آوے کنہیا جی بغیر
واقعی کافور اُڑ جائے اگر فلفل نہ ہو

جس پاس کہ سو لاکھ روپے کا بھی نہیں ملک
اس شخص پہ اصلا نہیں نواب کی پھبتی

تبّت یدا ابی لہب پڑھ کے اک عزیز
یکچند بھاگ کر کسی کونے میں دب رہے
لوگوں نے ڈھونڈ کر انہیں پوچھا تو بولے آپ
واللہ مورے بھاگنے کا یہیو سبب رہے
ہے مالہٗ وماکسب آیا قرآن میں
ان مال ہوئے یعنی سو وہ ماکسب رہے
اہل و عیال کھائیں پئیں پھر کہاں سے کچھ
مُہنکا رہی کی فکر یہیو روز و شب رہے

جی چاہتا ہے شیخ کی پگڑی اُتارئے
اور تان کر چٹاخ سے اک دھول مارئے

یہ آپ حسن پہ اپنے گھمنڈ کرتے ہیں
کر اپنے شیش محل میں ہی ڈنڈ کرتے ہیں

یہ جو لوڈھا سا ہے دربان تمہارا اے کاش
کوئی چور آوے اور اس کی کوئی گردن مارے

آغا دہ ہیں جو تازہ ولایت سورات کو
مطرب کو ڈوم کہتے ہیں بولے کر دوم ہے

کیوں نہ لڑکے سب کہیں ہوا تمہیں اے شیخ جی
ہے جھوجی کی سی صورت یہ ڈرانی آپ کی

ہردم یہ موچھ آپ کی اے شیخ تکیہ ریش
دکھلاتی ہے مجھے دنب انار کی شبیہ

وہی پی کہاں وہی پی کہاں یہی ایک رٹ ہے جو ہے سو ہے   مہاراج چوٹ سی لگتی ہے مجھے اس پپیہے کی ٹیر سے
سانولے پن پہ غضب ہے دھج بسنتی شال کی   جی میں ہے کہ بیٹھئے اب جپے کنہیا لال کی

غرضکہ اسی طرح بات بات میں ظرافت اور ہنسوڑپن کرتے تھے۔ ریختی ان کا کوئی خاص رنگ نہ تھا بلکہ اپنے دوست میاں رنگین دہلوی کے اتباع میں تفنن طبع کے طریق پر یہ بھی لکھ ڈالی اور لکھی تو ایسی اور اتنی لکھی کہ آج پورا ایک دیوان موجود ہے۔ ان کی ریختی میں خصوصیت سے یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ جان صاحب کی طرح تصنع اور آورد سے سراسر پاک ہے۔ خاص دلّی کی بیگمات کا روزمرہ ہے۔ اکثر اشعار ایسے ذومعنی ہیں جو ریختی اور ہزالی دونوں رنگوں کا نمونہ ہیں جنہیں دیکھنے والے خود سمجھ سکیں گے۔

میں کیا کہوں دوگانا اس کل کے دھڑنے سے   جو حال ہو گیا ہے اس بانوں کی تلی کا
ہاتھوں سے تیرے میں تو کمبخت عاجز آئی   جو کام ہے نگوڑا تیرا سو ہلبلی کا
انشا سوائے اپنے اللہ کے جہاں میں   ہے کون کھونے والا اس دل کی بیکلی کا

اللہ کرے سلامت جم جم رہے یہ بیڑا   ہے جس کے دم قدم سے دنیا کا سب بکھیڑا

تھام تھام اپنے کو رکھتی ہیں بہت سا لیکن   کیا کہوں تھم نہیں سکتا مرا اندر والا
اپنے کوٹھے پہ کچھ اس ڈھب سے زقیلا کہ مری   لے گیا جان اڑا ایک کبوتر والا

ہے یہ نیختی کونسی منزل انشا اس کا نام بتا   ڈر سا میرے دل کے اندر اس منزل میں بیٹھ گیا

اپنا جو دکھاتا ہے ہمیں زور نگوڑا   صدقے اسے کر ڈالئے در گور نگوڑا
میں چیخ پڑوں کیوں نہ جو لے انگلی میں اپنی   ڈالے مسل انگلی کو مری پور نگوڑا

تو قیامت بے سری ہے حد برا تیرا گلا   خوش نہیں آتا ہمیں بی فاختہ تیرا گلا

آگ پینے کو جو آئیں تو کہیں لاگ لگا   بی بی ہمسائی نے دی جس میں مرے آگ لگا
نہ بُرا مانے تو یوں نوچ کوئی مٹھی بھر   بیگما تیری کیاری میں نیا ساگ لگا
شوق سے سُونگھ لے انشاؔ مرے بو بالوں کی   دے چھنیل خور کے ہونٹوں میں تو اک ناگ لگا

مشک کی طرح سے گال اپنے پھلاتا کیوں ہے   ارے او سقہ کے لونڈے تو نہ پانی چھلکا

بس بلائیں مری نہ لے چٹ پٹ   اے دگانا تو ایک ہے نٹ کھٹ
دم دلاسا عبث نہ دے آنا   چل چخی دور ہو پرے بھی ہٹ
چوٹ اک دل کو لگ گئی انشا   جب سنی اس کے پانوں کی آہٹ

انشا سے ملتے کیوں نہیں عشق ہو بھلا تو دیر کیا   جی ہی پہ کھیلے ہو تو پھر لوگوں سے ڈرتے ہو عبث

سارے بھوتوں سے پرے ہے یہ موا خواجا خبیث   مجھ کو گھوڑا ہی کرے ہے یہ موا خواجا خبیث

کالے بادل نہ گھر آتے تو ارے او لوگو   آبرو آج مری مفت میں کیوں کھوتی صبح

کان کی لو میں گھسی موتی سی بالی کیونکر   جس کا ہو سوئی کے ناکے سے بھی ننھا سوراخ

بلائیں میں نے جو لیں اُن کی کل چٹاخ پٹاخ   تو کس مزے سے کہا بیگما نے چل گستاخ

اری بی ایک ہی عیار ہو تم   ناک چوٹی میں گرفتار ہو تم

میں تو کچھ کھیلی نہیں ہوں ایسی کچی گولیاں   جو نہ سمجھوں گی زناخی جان تیری بولیاں

بلا سے اگر آئی ہولی کہار دو   نہ مجھ سے کرو بولی ٹھولی کہار دو

رات بھر اپنا ترستا ہی رہا جی باجی   اب تو نوبت بجی اٹھو اجی باجی باجی

اے لو اس کوٹھری میں میرے ڈرانے کے لیے   اک عبا اوڑھ کے بن بیٹھی ہیں حاجی باجی

ناحق ناحق مجھے جلاتی کیوں ہے   گھر میں مرے آگ لینے آتی کیوں ہے
آئی تو نہیں ٹھہرتی یہ رنجش ہے   بے فائدہ یاں تو آتی جاتی کیوں ہے

متفرقات

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر   فعلِ بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر

ٹک شیخِ سیہ رو کے تبسم کو نہ دیکھو   معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہنستا ہے توا گرم

ہے شیخِ سیہ چہرہ جو مجلس میں بُھدکتا   یاروں کو ہے یاں روٹی کے لنگور کی سوجھی

دیا نامۂ سید انشا تو ان نے   دہتر جڑی اک سرنامہ بر یہ

گھر سے باہر تمہیں آنا ہے اگر منع تو آپ   اپنے کوٹھے پہ کبوتر تو اڑا سکتے ہیں

کالی بلا کی شکل بنا کر چمٹ نہ جا   میں نے کہا کہ دُور رہو مجھ کو نہ تھام چھوڑ

بڑی داڑھیوں پہ نہ جا دلا یہ سب آہوؤں کے ہیں مبتلا   یہ شکار کھیلے ہیں بر ملا انہیں ٹٹیوں کی تو آڑ میں

انشا تو اینڈتے ہیں پڑے میکدے کے بیچ
کہیو سلام زاہدِ شب زندہ دار کو

مصحفی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے والد کا نام ولی محمد اور دادا کا شیخ درویش محمد تھا جو موضع اکبر پور کے رہنے والے تھے مصحفی ۱۱۴۱ھ اور ۱۱۵۶ھ کے درمیان پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں تکمیل شاہجہان آباد میں ہوئی۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں درجۂ کمال حاصل کیا۔ جو کمی رہ گئی تھی وہ دلی اور لکھنؤ پہنچ کر دور ہوگئی۔ یہ ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء کے قریب نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ دلی سے آنے والے بہت سے شعرا فیض آباد اور لکھنؤ میں جمع ہو رہے تھے۔ مصحفی ایسے آئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے اور آخر یہیں ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۵ء میں انتقال کیا۔

مصحفی شاعرانہ کمال اور علم و فضل میں اپنے معاصرین میرؔ، سوداؔ اور انشاؔ وغیرہ سے کسی طرح کم نہ تھے۔ میر انشاؔ کی وساطت سے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں داخل ہوئے اور کچھ درماہہ بھی مقرر ہوگیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں ان کی شاعری کا سکہ جما اور دوسرے باکمالوں کے ساتھ لوگوں کی زبانوں پر ان کا نام بھی آنے لگا اس پر ان کے معاصرین رشک کرنے لگے حسد و نفاق سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ باہم چشمک رہنے لگی۔ پہلے ظرافت اور پھر ہجو کے ناپاک اور گندے ہتھیار استعمال ہوئے سید انشاؔ کی شوخیوں اور بے اعتدالیوں نے ان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور وہ وہ کچھ کہلا کر چھوڑا کہ آج ان کو ہزل اور ہجو گوئی کا استاد ماننا پڑتا ہے۔

انشاؔ اپنی رنگین مزاجی، بذلہ سنجی اور زمانہ سازی کی وجہ سے مرزا سلیمان شکوہ کے مزاج پر حاوی تھے۔ مصحفی سے بگڑے تو اپنی چکنی چپڑی خوشامدانہ باتوں سے مرزا سلیمان شکوہ کو بھی ان سے بدل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے تنخواہ کم کر دی۔ اس پر غریب بڈھے نے جل کر یہ شعر کہے ؎

چالیس برس کا ہے یہ چالیس کے لائق　　تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لائق

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے　　ہم بھی تھے کہیں روز دِل میں پچیس کے لائق

استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر　　ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

اس واقعہ کے بعد انشاؔ اور مصحفی میں رنجش کی ایسی گرہ بیٹھ گئی کہ بات کا تبنگڑ بن گیا اور ہجووں کا ملدڑا اتنا کھچا کہ توبہ ہی توبہ۔

مصحفی تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ اعلیٰ پایہ کے ناقد بھی تھے۔ ان کے فارسی اور اردو شعرا کے تذکرے اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ وہ نہایت ذکی، تیز فہم اور زود گو تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ غزلوں کی غزلیں کہہ کر دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے ان کا دستور تھا کہ جہاں کوئی مشاعرہ ہوتا یہ بہت سے شعر اسی زمین میں کہہ کر رکھ لیا کرتے اور پھر گاہکوں کے ہاتھ حسبِ

حیثیت شعر فروخت کر دیتے۔ اس کے باوجود تین تذکرے، چھ دیوانِ اردو کے اور ایک دیوان فارسی کا ان کی یادگار ہیں۔

"کلیات میں شاعرانہ تعلّی کی بے شمار مثالیں قصیدوں، غزلوں، قطعوں اور رباعیوں میں ملتی ہیں اور انہیں محض رسمی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا دراصل مصحفی ایک شدید ذہنی اور نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا تھے۔ تعلّی تو محض جذبہ خود پرستی کی تسکین کے لئے ایک ذریعۂ اظہار ہے لیکن یہاں محض خود پرستی کا دبا ہوا جذبہ ہی اُبھرنے کے لئے بے چین نظر نہیں آتا بلکہ معاصرین سے چشمک، ان سے مقابلہ، کبھی ان کی شہرت اور قبولِ عام کا اعتراف، کبھی ان کی ہمسری کا دعویٰ، کبھی ان کے میدان کو مکمل کرنے کا اعلان کہیں ان کے مقابلہ میں اپنی برتری کے لئے دلیلیں اور شواہد اور اس سلسلہ میں ان کی تضحیک اور ہجو، غرض طرح طرح کی کیفیتیں نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حریفوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک طرف خاص طور سے میر اور مرزا ہیں، دوسری طرف مصحفی اور ان کے شاگردوں میں گرم اور منتظر ہیں۔ یہ دونوں شاگرد وہی ہیں جو انشا کے معرکے میں بھی پیش پیش تھے میر یا اُن کے شاگردوں سے براہِ راست کبھی بدمزگی کا موقع نہ آیا لیکن سودا کا رنگ عام طور پر لکھنؤ اور دلی میں دونوں جگہ یکساں طور پر مقبول تھا اور مصحفی خود بھی اسی رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے یہ اور بات ہے کہ نہ ان کی طبیعت میں وہ شگفتگی تھی جو سودا کو فطرت نے بخشی تھی نہ ایسا کوئی مربی اور سرپرست انہیں نصیب ہوا کہ اس کی داد و دہش یا کم از کم سرپرستی انہیں ایک طرف فکرِ معاش سے فارغ کر دیتی اور دوسری طرف ان کے حریفوں کا منہ بند ہو جاتا مصحفی سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں ان کے ساتھ بڑی ناانصافی اور ظلم ہوا ہے۔ وہ معاصرین میں اپنے علم و فضل اور فنی لیاقت کے اعتبار سے کسی کو اپنا مقابل تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور یہ واقعہ ہے رنگین اور انشاء کو چھوڑ کر اس وقت کوئی دوسرا شاعر اس علم و فضل کا مالک نہ تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ قدردانی سے محروم رہے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے تعلّی کا یہ انداز اختیار کیا۔ وہ چاہتے تو ہجوگوئی پر بھی اتر آتے۔ لیکن اس کا انہوں نے بار بار اعتراف کیا ہے کہ ان کے بس کی بات نہیں۔ شاید ایسا کرتے تو ان کی طبیعت کی تلخی اور ان کی کسی حد تک کم ہو جاتی۔" (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۱۲۶)

اس پر ستم یہ ہوا کہ ان کی منکوحہ بیوی ایک لڑکی جن کر مر گئی۔ اس کے بعد مصحفی نے ایک "زن مدخولہ بے نکاح و متعہ" سے تعلق پیدا کر لیا۔ لیکن اس کے چال چلن سے گھبرا کر قطع تعلق کر لیا۔ ایک تیسری عورت سے رشتہ جوڑا تو وہ کوچہ گرد نکلی اور چند روز بھی گھر کی چار دیواری میں نہ بیٹھ سکی۔ اس نے کسی دلالہ کے بہکانے سے مصحفی سے جدائی طلب کی۔ ان دونوں عورتوں میں سے ایک کا نام شاید عصمت تھا۔ جس کے متعلق مصحفی کہتے ہیں ؎

ہے حیف تو یہ کہ با جمال چوں حور — عصمت اور ہووے مائلِ فسق و فجور
یہ وہ ہے مثل کہ مصحفی کہتے ہیں — برعکس نہند نام زنگی کافور

اے کاش نہ ہم ایسی محبت کرتے — اور کچھ کرتے تو صبر و طاقت کرتے
گر ہے یہی بے کلی تو اک دن یا رب — مر جاویں گے یونہی عصمت عصمت کرتے

اس کے بعد ایک اور عورت سے بقولِ خود زنا سے بچنے کے لئے متعہ کیا لیکن اس سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس محرومی پر اپنے فرزندانِ معنوی یعنی نظم و نثر کے دفتر دیکھ کر جی خوش کرتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مصحفی کی طبیعت کی تلخی اور زہرناکی اور بڑھ گئی

اس کے باوجود ان کے کلام میں ظرافت کے اس قسم کے نمونے ملتے ہیں ؎

کیوں نہ دل نظارگی کا جائے لوٹ لکھنؤ میں حسن کی بندھی ہے پوٹ

آزاد نے لکھا ہے کہ ایک سقنی کو دیکھ کر شیخ صاحب کی شوخیِ طبع کے منہ میں پانی بھر آیا اس غزل کے چند ظریفانہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

پانی بھرے ہے یارو یہاں قرمزی دوشالا لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا
کاندھے پہ مشک لے کر جب قد کو خم کرے ہے کافر کا نشۂ حسن ہو جائے ہے دوبالا
دریائے خوں میں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں لنگی کے رنگ سے جب واں تک کمر ہو لالا
اس کے در پر میں گیا سوانگ بنائے تو کہا چل بے چل دور ہو کیا لے کے فقیری آیا
سرگرم سیرِ گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا نزلہ سے ہو رہا ہے آپ ہی دماغ ٹھنڈا
جینے عاشق نہ کیوں اس کے موے لے کہ چشم شوخ اس کی ہے مولا
جزاک اللہ بنایا تو نے صیّاد قفس میں از پئے بلبل ہنڈولا

انشا کی منہ زوریاں اور ستم ظریفیاں جب حد سے بڑھ گئیں تو مصحفی نے یہ رجز کہہ کر انشا کو چڑایا ؎

دانش پہ گھمنڈ اپنی جو کرتا ہے بہ شدّت وہ شخص ہے واللہ کہ مجنوں مرے آگے
میں گوز سمجھتا ہوں سدا اس کی صدا کو گر بول اُٹھے اودی کی جوں جوں مرے آگے
قدرت ہے خدا کی کہ ہوئے آج وہ شاعر طفلی میں جو کل کرتے تھے غاں غوں مرے آگے

موسیٰ کا عصا مصحفیؔ ہے خامہ مرا بھی

گو خصم بنے اسود افیوں مرے آگے

اپنی پرانی چارپائی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

یہ جو ہم پاس چارپائی ہے گور ہے یا کنواں ہے کھائی ہے

پٹی پائے تمام ناہموار
اور بانوں کی جھول جیسے کرغار

ڈھانچ ہے اس کا بسکہ اول جلول
کہیں سل بیٹھتی نہیں ہے چُول

پائے ہیں کھنگی سے زرد و سیاہ
سیروں کا ہے حال پھر بھی تباہ

بسکہ ہے ڈھلڈھلی و پوچ دپچر
چول کو روز چاہیئے پچر

اور کستا ہوں جس دن ادوائن
اک ذرا اُس گھڑی تو جائے ہے تن

لیک جس وقت اس پہ پاؤں دھرا
جیسے کوئی کنوئیں میں آن گرا

بان کی اس کے کیا کروں تعریف
تھا وہ بافندہ بسکہ ذات شریف

چھید رکھے ہزار بانوں میں
دیں گرہیں بے شمار بانوں میں

گر گدیلے کا اس پہ ہو بستر
تو بھی چُبھتی ہے پھانس جوں نشتر

آ کے جب رات اس پہ سوتا ہوں
کرکے ضامن کو یاد روتا ہوں

یہ وہی ناتواں پلنگڑی ہے
جس کو کہتے ہیں لُولی لنگڑی ہے

نیچے اُونچے جو اس کے ہیں پائے
ہیں معطل زمیں پہ پڑوائے

بسکہ دل اس سے خوش نہیں ہوتا
مارے غصّہ کے میں نہیں سوتا

جب کہیں آدھی رات جاتی ہے
اونگھ کے مارے نیند آتی ہے

کیونکر اس پہ کوئی دوگانہ ہو
گر ہے مجھ سا جو یگانہ ہو

طول میں میرے قد سے ہے کمتر
عرض میں میرے تن سے ہے لاغر
ایسی جب تنگ چارپائی ہو
بس مسافر کی کیا سمائی ہو
اب بھی جانے تو گھر کو خالی کر
مصحفی اس سے بوریا بہتر

یہ تو مصحفی کی چارپائی تھی، اس میں کھٹملوں کی افراط کا حال سنئے:۔

کھٹملوں کی ز بسکہ ہے افراط
تلخ ہے ان سے اپنا خواب نشاط
کافروں نے یہ سر اوٹھایا ہے
سارے پنڈے کو توڑ کھایا ہے
بسکہ بے چین ہوں میں ان کے ہات
نیند آتی نہیں ہے ساری رات
دم بدم کروٹیں بدلتا ہوں
اِدھر اُدھر پڑا اُچھلتا ہوں
پائچے میں کبھی گھس آتے ہیں
کبھی نیفے میں سرسراتے ہیں
مارتا جاتا ہوں انھیں جوں جوں
کان پر ان کے رینگتی نہیں جُوں
لہو پی پی زبس ہوئے موٹے
ریزۂ لعل ہیں بڑے چھوٹے
الغرض شام سے ہو شب بیدار
کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار
مارے جو موٹے موٹے چن چن کر
چھینٹ کا تھان بن گئی چادر
گھِسے دیوار پر جو کر کے تلاش
کر دیا گھر کو خانۂ نقاش
ہے بجا بسکہ زیں پہ زیاد
کہئے راون کی ان کو گر اولاد
دوڑنے میں ز بسکہ ہیں چالاک
میری آنکھوں میں ڈال جاتے ہیں خاک
کوئی آسان ہاتھ آتے ہیں
گھائیوں میں سے نکلے جاتے ہیں
ان کی بُو سے دماغ عاجز ہے
بلکہ دودِ چراغ عاجز ہے

دشمن جاں یہ مصحفی کے ہیں
تشنۂ خوں یہ ہر کسی کے ہیں

اب مصحفی کے مکان کی حالت دیکھیں۔

اپنے رہنے کا جو ملا ہے مکاں   ہے بعینہٖ وہ صورت زنداں
اس میں مطلق نہیں ہوا کا گزر   سیر یلدا کی وہاں کرے ہے نظر
نہ تو روزن نہ اس میں جالی ہے   دن رات جیسے رات کالی ہے
جائے بول اس کے در کے آگے ہے   جو ہر مغز کو جلائے ہے
خاکبازی ہے اس کی چھت کا کام   خاک اس سے جھڑا کرے ہے مدام
گر نظر جائے جانب دیوار   نظر آتی ہے چینٹیوں کی قطار
رات دن جی صفا کو ترسے ہے   اپنی قسمت کی خاک برسے ہے
گھر میں میرے جو کوئی آتا ہے   اپنی صورت کو بھول جاتا ہے

مصحفی جائے سینہ چاکی ہے
گھر نہیں یہ تو بُرج خاکی ہے

آخر میں مصحفی نے اپنی ناخوشگوار زندگی کی جس طرح ہنسی اڑائی ہے وہ ملاحظہ فرمائیے:

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں   تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں
ہے لب پہ خوشامد اور غضب کے مارے   بیٹھے ہوئے جی میں گالیاں دیتے ہیں

ظاہر میں تو ہاں نعیم کے نوکر ہیں   باطن میں دلے کریم کے نوکر ہیں
یہ عید نہ بقر عید نہ روزے نہ دھار   ہم بھی عجب اک نعیم کے نوکر ہیں

دی بانٹ محل میں چن چن کے تنخواہ   اور ہم کو بہانوں میں ہی ٹالا کئی ماہ
انصاف سے کتنا دور ہے میر نعیم   لاحول ولا قوۃ الا باللہ
دیئے آغا نے روپے چالیس گر   فوت تنخواہ کر گیا یہ خبر
بھاگتے چور کی لنگوٹی ہے   مصحفی ہاتھ گر لگے کر صبر

رنگین

سعادت یار خاں رنگین کے والد طہماس بیگ خاں ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کی فوج کے ساتھ توران سے ہندوستان آئے اور دلی پہنچ کر ترقی کرتے کرتے ہفت ہزاری کا منصب اور اعتقاد جنگ کا خطاب حاصل کیا۔ رنگین ۱۱۷۰ھ میں بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن دلی میں بڑی فارغ البالی اور عیش اور آرام میں گزرا جس کی جھلک رنگین کے مزاج اور افتاد طبع میں پائی جاتی ہے۔ اُنہوں نے پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے اور شاہ حاتم کی شاگردی اختیار کی۔ پہلا دیوان ۱۲۰۲ھ میں مکمل ہوگیا اس وقت سعادت یار خان سپاہی تھے۔ اس کے بعد وہ ملازمت ترک کر کے ریاست بھرت پور چلے گئے اور دو سال وہاں گزار کر ۱۲۰۴ھ میں لکھنؤ پہنچے جہاں وہ شاہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے

رنگین ایک آزاد منش، لاابالی اور عیش پرست انسان تھے۔ تنخواہ اور انعام واکرام سے ان کا شاہانہ خرچ چلتا تھا۔ نو سال کا عرصہ لکھنؤ میں گزار کر نواب آصف الدولہ کی وفات (۲۸ ربیع الاوّل ۱۲۱۲ھ) کے بعد وہ یہاں سے نکلے اور چند سال مرشد آباد، ڈھاکہ اور بنگال کے دوسرے علاقوں کی سیر کرتے اور پھر پھراتے گوالیار پہنچ کر مادھو جی سندھیا کے ملازم ہوگئے نواب کا خطاب اور فوجی پلٹن کی کمان ان کے سپرد ہوئی۔ ایک بڑے علاقے کی سند بھی مل گئی۔ جس کی آمدنی سے اپنا اور رسالے کا خرچ نکال کر باقی رقم سرکاری خزانے میں داخل کرتے۔ چھ سال خوب مزے میں بسر ہوئی۔ پیر میں چکر تھا۔ یہاں سے دل اُچاٹ ہوا تو پہلے میر افضل علی خاں نیّاؔ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہاں سے مختلف شہروں میں گھومتے پھرے۔ تیس سال تک آزاد زندگی بسر کرنے کے بعد وہ باندہ پہنچے۔

اب ان کی عمر تقریباً ستر برس کی ہو چکی تھی۔ اُنہوں نے باندے کے قیام کی فرصت کو غنیمت جانا اور سارے کلام نظم و نثر کو مرتب کرنا شروع کیا۔ انڈیا آفس کی لائبریری میں کئی قلمی نسخے موجود ہیں جو رنگینؔ نے اپنے ہاتھ سے باندے میں بیٹھ کر لکھے تھے۔

اس کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) میں پیام اجل آپہنچا اور ۸۱ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ رنگینؔ کو ۶۶ سال کا طویل زمانہ مشق سخن کے لئے ملا۔ ان کے مجموعۂ کلام میں لاکھوں اشعار اور بے شمار اُردو فارسی نثر کے رسالے موجود ہیں۔ ان کی لیاقت ہمہ گیری اور زباندانی کا یہ عالم تھا کہ وہ بلا تکلف عربی، ترکی، فارسی، اُردو، پنجابی، پُوربی، گجراتی، مرہٹی، پشتو اور کشمیری وغیرہ بول اور لکھ پڑھ سکتے تھے اور تقریباً سترہ زبانوں میں ان کا کلام موجود ہے۔

رنگین کی ذاتی اور گھریلو زندگی نہایت رنگین اور دلچسپ تھی۔ ان کے تعلقات ہر طرح کے لوگوں سے تھے۔ طبیعت شوخ تھی۔ بذلہ سنجی و ظرافت کا رنگ ان کے کلام سے ٹپکتا ہے۔ ہزل اور ریختی میں ایک نہیں پورے دو دیوان آمیختہ اور دیوان انگیختہ موجود ہیں جو ۱۲۲۰ھ میں مرتب ہوئے دیوان آمیختہ کا جو قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے اکسٹھ اوراق پر مشتمل ہے اس کے شروع میں فارسی کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے جو کسی کوک شاستر کا معلوم ہوتا ہے۔ نظم کے حصے میں پہلا اور چوتھا قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ؎

نہ ہووے تو کیوں سزاوار طوق لعنت کا ‫ ‫ تو واقف اس سے ہے جو کام ہے شرارت کا

لعنت میں کوئی شریک نہیں تیرا دوسرا　　　جتنے ہیں رنڈی باز تو اُن کا ہے پیشوا

باقی نظمیں اور قطعے بھی نہایت فحش اور رکیک ہیں۔ دیوان انگیختہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے اور اخلاقی اعتبار سے یہ کوئی زیادہ مستحسن نہیں۔ اس میں ریختی کی ایک سو بارہ غزلیں ہیں۔ رباعیات، فردیات، قطعات، مسدس اور مخمس اس کے علاوہ ہیں۔ رنگین نے ایک شعر میں اپنے آپ کو ریختی کا مُوجد اور انشاؔ کو منہ چڑانے والا بتایا ہے ؎

ریختی کہنی اجی رنگیںؔ کی یہ ایجاد ہے　　　منہ چڑاتا ہے موا انشاؔ جیا کس واسطے

اس کے باوجود اُن کی ریختی میں شاعری کا کوئی بڑا کمال نہیں البتہ اس سے ایک طرف اس ذہنی زوال اور پستی کا پتہ چلتا ہے جس میں اس وقت کا معاشرہ گر چکا تھا۔ اور دوسری طرف اس نفسیاتی کمزوری کی نشاندہی ہوتی ہے جو عام طور پر صحت مند راستوں کے بند ہو جانے پر انسانی جذبات کو غلط راہوں پر ڈال دیتی ہے۔ اظہار خیال کے اس غیر فطری ذریعے سے طوائفوں کی زبان کی نزاکت و نفاست اور اُن کے خاص محاورات محفوظ کئے گئے ہیں۔ حمد اور غزلوں کے یہ اشعار دیکھئے ؎

واری ترے جاؤں میں خالق ہے تو خلقت کا　　　کیا مجھ سے بیان ذرّہ ہوئے تیری قدرت کا

کچھ مجھ کو گناہوں کا خطرہ نہیں محشر میں　　　چھوڑوں گی نہ میں دامن خاتون قیامت کا

اب آٹھ پہر تجھ سے مانگوں ہوں دعا یہ میں　　　بندی کو پڑے ہوکا رنگیںؔ کی نہ چاہت کا

مجھ پہ طوفان نہ رکھ چاہ کا چل دُور ردوا　　　جھوٹ سے منہ کا تری جائے گا اُڑ نُور ردوا

ایک تو شکل ڈرانی سی تری ہیچا سی　　　تس پہ یوں گھور کے دیدے مجھے مت گھور ردوا

رات باتوں میں یہاں تو نے گزاری انّا　　　صدقے تیرے کسی ڈھب سے اُسے لاری انّا

سوچ اس کا نہ ہو گر مجھ کو تو پھر کس کو ہو　　　جانتی تو نہیں کیا پاؤں ہے بھاری انّا

آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی ہے مجھے اس کی چاہ　　　روز و شب رہتے ہیں اشک آنکھوں سے جاری انّا

ہونی جو ہووے سو ہو بندی ملے گی شرطی　　　وصل کی اس سے زباں اب تو میں ہاری انّا

اُٹھتے ہی صبح کو آ جاتی ہے رنگیںؔ کے پاس　　　کیہو سب حال مرا میں ترے واری انّا

چلو چل کر قطب صاحب میں جھولا ڈال کر جھولیں　　　دوگانہ مینہ برستا ہے مہینہ ہے یہ ساون کا
کرو قربان میں پشواز کو جالی کی کرتی پر　　　دوگانہ مجھ سے اُٹھ سکتا نہیں ہے بوجھ دامن کا
ہلا کر سر کیا کر بات تو مجھ سے نہ ہنس ہنس کر　　　زناخی مارتا ہے مجھ کو ڈورا تیری گردن کا
جوانی سے وہ چھل بلے الٰہی حف نظر میری　　　وہ کون انسان ہے جو غش نہیں رنگیں کے جوبن کا

نیند آتی نہیں کمبخت دوانی آ جا　　　اپنی بیتی کوئی کہہ اپنی کہانی آ جا
ہاتھ پر تیرے موئے کس کے ہے چھلے کا داغ　　　دی ہے یہ کس نے تجھے اپنی نشانی آ جا
بال ماتھے کے جو ڈورے سے لئے ہیں تو نے　　　شکل لگتی ہے بڑی آج ڈرانی آ جا
غم ہے رنگیںؔ کو نہ میرا یونہی اس کے پیچھے　　　مفت برباد ہوئی میری جوانی آ جا

جان دی راہ محبت میں الٰہی صد شکر　　　بات جو ہم نے کہی تھی سو نباہی صد شکر

زخم کھا کر جو میں تڑپا تو لگا یوں کہنے　　　اچھا اچھا تو تڑپ کر مری تلوار کو توڑ
ہٹ ہے گر دل ہی پر اس کی تو سلیماں دے ڈال　　　ایک دل کے لئے مت خاطر دلدار کو توڑ

جب کہا میں نے کہ میرے گھر چلو　　　تب مری گوئیاں نے اے رنگیںؔ پکار
گال پہ اُنگلی کو رکھ کر یُوں کہا　　　میں ترے گھر جاؤں گی اے دور پار

دَوڑی پینے کو میں اسے کس دم　　　پاؤں میں میرے موچ آئی کب ،
ہرگز آتی نہیں ہے سانچ کو آنچ　　　پیش جاوے گی یہ بُرائی کب

کل جو میں نے کہا زناخی سے　　　جی میں آتا ہے تجھ سے کیجے عیش
تو لگی کہنے یوں وہ اے رنگیںؔ　　　بس بس اب مجھ کو مت دلاؤ طیش

زہر کر دیتی ہے وہ کھانے کو لڑ کر مجھ سے روز   آج سے میں ساتھ اس کے کھانا کھاؤں دوربار
کیا گئی گزری ہوں میں ایسی کہ جاؤں دوڑ کر   اور منا کر ساتھ اپنے اس کو لاؤں دُور بار
اس نے ہمسائے میں آ کر گھر لیا تو کیا ہوا   اب اسے آواز میں اپنی سناؤں دُور بار

کہاں تک سنوں کان تو اُڑ گئے   تری سُنتے سُنتے حکایات روز
گئے ہیں مرے گھر میں سب تجھ کو تاڑ   کیا کر نہ رنگینؔ اشارات روز

یارب شبِ جدائی تو ہرگز نہ ہو نصیب   بندی کو یوں تو چاہے تو کولھو میں پیل ڈال

تیس دن میں کسی سے ملتی نہیں   ہوں ملاقاتِ گاہ گاہ سے خوش

بھیجتا روز ہے رنگین مجھے پیغامِ سلام   اور میں آگاہ ہوں اس حرف و حکایات سے کم

کوئی پیس کر خوب سی لال مرچیں   ترے دونوں دیدوں میں بھر جائے آلوتی

یُوں لوٹتی ہوں بول بڑا خاک چاٹ کر   گوئیاں کی طرح جھاڑو کی تیلی نہیں ہوں میں
ہیں حرفتیں بھری مری رگ رگ میں کوٹ کر   رنگیںؔ تری طرح سے رنگیلی نہیں ہوں میں

اب تجھ سے خدا سمجھے تو ہے زہر کی اک گانٹھ   تجھ پر کہیں ٹپکی پڑے درگاہ کی گوئیاں

بولے وہ آؤ گے کب میں نے تب اُن سے یہ کہا   بندی ہرگز نہیں اب تک کہیں مہمان گئی
زہر لگتی ہے مجھے تیری یہ چھل بازی   یاں ترے آنے سے باجی تجھے پہچان گئی

شکل باجی کی جو یاد آتی ہے   تو اجی رُوح نکل جاتی ہے

کھو جڑا جائے مری آنکھوں کا   نیند کیوں ان کو نہیں آتی ہے

کل وہ شکر کو سدھارے گا سنا ہے میں نے   جا کے لادے تو مجھے اس کی نشانی باندی
اور تو کیا کسی لونڈے سے تجھے دوں گی بیاہ   لائے گر اس کا تو پیغام زبانی باندی

اتنا بڑا ہی مسا ہے اک اس کی ناک پر   جتنی بڑی دوا مری انگلی کی پور ہے
شاید کہ ہو گیا ترا میٹھا برس شروع   کوکا کچھ ان دنوں تری چاہت کا شور ہے

برسات اس کو کہتے ہیں جی جس بہار میں   سر پہ ہوا کے ہوتی ہے بادل کی اوڑھنی

پھنسا دیا مجھے رنگیںؔ کے دام میں ناحق   کٹے الٰہی کرے ناک میری دائی کی

نکلا عید کا چاند جو گھر سے شکر والا نکلا آج   کیوں نہ پھروں میں اپنی گلی اوپر والا نکلا آج

مجھ کو روتا دیکھ کر بولی دوا زاری نہ کر   تیرے صدقے ہو کے مر جاؤں میں جی بھاری نہ کر

دل ہو خون اور حنا کو بھاگ لگے   اس ندی منصفی کو آگ لگے

ہو گیا چاک جگر کا مجھے سینا بھاری   دشمنوں پہ ہے مرے اب کا مہینا بھاری

بھول کر بھی جو کسی اور کے گھر بھول پڑے   تو الٰہی کرے گوٹیاں میرے گھر بھول پڑے

پڑ گیا اس سے یوں مرا لانجھا   جیسے مفتوں تھا ہیر پہ رانجھا

رنگ رنگین کا ان دنوں ہے نور   کہیں پینے لگا ہے وہ گانجھا
مارا پتھر پہ سر اور سینے پہ پتھر مارا   پر ترا دل نہ ملا ہم نے بہت سر مارا

دل کو رنگیں کے لیا یوں تری الفت نے دبوچ   باز نے جوں کوئی رنگین کبوتر مارا

نشاں رہ جائے ہے مردوں کا باقی   گیا فرہاد لیکن بے ستون ہے

یہ جو بیماری ہے اپنی عشق کہتے ہیں اسے   زر نہیں، رجعت نہیں، وحشت نہیں، سودا نہیں
بے سرانجامی ہے جاوے شیخ کعبہ کس طرح   خر نہیں، خرقہ نہیں، ٹوپی نہیں، کرتا نہیں

چنے ہم نے دانتوں کے ہوتے نہ پائے   بنے پوپلے تب چنے ہاتھ آئے

رنگین نے "مخمس رنگین" کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے۔ دو منظوم خط اور تین داستانیں ہیں۔ ایک حصہ میں چھکو طوائف کی ہجو بیان کی گئی ہے۔ آغاز میں اپنی جوانی اور خوبصورتی کا تذکرہ ہے۔ پھر عشق طاری ہونے کا نقشہ کھینچا ہے۔ لیکن جب وہ کج ادائی کرکے بے وفا ثابت ہوتی ہے۔ تو دل کو سمجھاتے ہیں کہ تم ایسی بے سلیقہ اور بھدی عورت پر جا لٹو ہو جس کے خستہ مکان سے بدبو آتی ہے اور جس کا سراپا یہ ہے:

کہوں کیا سر کو اور موہائے سر کو   کوئی کھٹلے جیسے ناریل کو
یہ تھا اس اوہڈی پیشانی کا عالم   کہ دیکھے سے جسے تنگی کرے دم
ہوا میں دیکھ ان کانوں کو حیراں   جذامی کے سے تھے سوجے ہوئے کان
بہم تو دیکھ لوئیں اوس کی بھووں کو   کہ چھپکلیاں لڑے ہیں جس طرح دو
زبس پڑبال تھے آنکھوں کے اندر   تو یوں دیکھے تھی جیسے گھور کے بندر
یہ تھی پر ناک رخساروں میں بیٹھی   کہ جوں ہو مینڈکی جوتے پہ بیٹھی

زبان کی تشبیہ بہت ہی فحش ہے۔

زنخ ایسی تھی جیسے پکا پھوڑا   ذقن جیسے کہ پھوڑے پہ دو دڑا
کمر اس کی جدھر دیکھو ادھر تھی   بغل سے چوتڑوں تک سب کمر تھی

عجائب اوس اجالی کی تھی انگیب   غرض یہ ہے کہ جالی کی تھی انگیا
نظر آتی تھیں اس میں چھاتیاں یوں   کہ ارتے اوپلے جالی بیچ ہوں جو ل

سبع سیارۂ رنگین کا تیسرا حصہ سبحۂ رنگیں کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ایک سو رباعیاں ہیں جو سب کی سب الٰہی بخش خاں معروف کی ہجویں ہیں۔ چند ایک حسب ذیل ہیں ؎

معروف تو ہے شعر و سخن کا محتاج   پر ہجو کو خلق کی وہ موجود ہے آج
اس کی وہ مثل ہوئی بقول رنگین   چوہا نہ سماوے بل میں اور باندھے چھاج

معروف کے پاس ہے نہ سیم اور نہ زر   اوقات بسر کرتا ہے وہ اپنی بشر
رنگین ہے ان دنوں یہ صورت اس کی   کانا ٹٹو ہے اور بدھو ہے نفر

معروف یہ چاہتا ہے کعبے جا کر   حج کر کے یہاں کہائے حاجی آ کر
سن کر یہ قصد اس کا رنگیں نے کہا   بلی چلی حج کو لاکھ چوہے کھا کر

معروف

یہ وہی معروف ہیں جن کی ہجو میں سعادت یار خاں رنگین نے سبحۂ رنگین نامی کتاب میں پوری ایک سو رباعیاں لکھی ہیں۔ ان کا نام نواب الٰہی بخش خاں تھا اور یہ فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر کے چھوٹے بھائی تھے۔ دہلی میں رہتے تھے۔ درویشوں اور صوفیوں کی مجالس میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے آخری عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر کے عبادت الٰہی میں مصروف رہنے لگے تھے۔ شعر و شاعری کا ابتدا سے شوق تھا مولانا آزاد نے آبحیات میں انہیں ذوق کا شاگرد بتایا ہے حالانکہ وہ شاہ نصیر سے اصلاح لیتے اور ذوق کے استاد بھائی تھے۔ انہوں نے دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے جو ہنوز طبع نہیں ہوئے ۔ سنہ ۱۲۴۲ھ میں انتقال ہوا۔

معروف کوئی ظریف شاعر نہ تھا۔ لیکن انہوں نے دیوانوں کے علاوہ ایک چھوٹی سی کتاب تسبیح زمرد کے نام سے ترتیب دی ہے جس میں سو شعر ہیں اور تمام کے تمام معشوق کی سبزہ رنگی کی تعریف میں ہیں۔ اس التزام اور ندرت کی وجہ سے وہ ظرافت خیز اور تفریح طبع کا سامان بن گئے ہیں۔

چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

کسے تھا سبزہ رنگ اک دم بھروسا اپنے جینے کا   نشانی گر ترا ہوتا نہ چھلا سبز مینے کا

بسکہ سبزہ رنگ ہے قاتل مرا   نت ہرا رہتا ہے زخم دل مرا

کون یہ لے کے ہاتھ میں سبز کمان آگیا   ابروئے سبزہ رنگ کا پھر مجھے دھیان آگیا

حرف سبز اب ترے منہ سے ہے نکلتا بے ڈھب   سبزہ رنگ آج ہے، تو زہر اگلتا بے ڈھب

قتل کی کچھ مرے سبزہ رنگ کو تدبیر آج   دل مرا چاہے ہے سیر سبزہ شمشیر آج

سبزہ رنگوں کے فریبوں میں دل آیا بے طرح   عشق نے پھر سبز باغ اس کو دکھایا بے طرح

جبکہ طفلی میں اماموں کا بنایا تھا فقیر   تھا اسی دن سے دعاگو سبزہ رنگوں کا فقیر

ولا مت دوڑ تو ان سبزہ رنگوں کی صفائی پر   پھسل جاتا ہے اکثر آدمی کا پاؤں کائی پر

کائی مل دو تم مجھے آگے خدا شافی ہے بس   دل جلوں کو سبزہ رنگوں کے یہی کافی ہے بس

دھیان میں یوں ہوں سبزہ رنگ کے غرق   جوں نشے میں ہو کوئی بھنگ کے غرق

تری سبزہ رنگ ایسی صورت ہے صاف   زمرد کی گویا کہ صورت ہے صاف

سبزہ رنگوں پہ نہ اپنا ہو کہیں جی مائل   اس برس رنگ ہے نوروز کا سبزی مائل

کیوں غش نہ سبزہ رنگ پہ دل سے مدام ہوں   میں حضرت امام حسنؓ کا غلام ہوں

آج یہاں کل وہاں گزرے یوں ہی جگ ہمیں   کھوے ہے ہر سبزہ رنگ اس سے ہری چگ ہمیں

کہتے ہیں معروف کو ایک دفعہ معلوم ہوا کہ بھورے خاں آشفتہ نے ایک شعر کہا ہے، جس میں ہری چگ کا لفظ آیا ہے (جو ایک جانور ہوتا ہے) اس وقت تک یہ لفظ ان کے ذہن میں نہ آیا تھا، اس لیے سو روپیہ دے کر یہ لفظ ان سے خرید لیا اور موزوں کیا

اے سبز رنگ ہاتھ سے لے میرے پان تو   یہ برگ سبز تحفۂ درویش جان تو

چمن میں زہر لگتی ہے مجھے آواز طوطی کی   یہ حالت غم میں ہے ان سبز رنگوں کے مرے جی کی
سبزہ رنگوں سے محبت ہے مجھے دن رات کی   چاہتا ہوں ہر جگہ سرسبزی اپنی بات کی
اس بڑھاپے میں بھی کم ہو دیں گے لہری ہم سے   سبزہ رنگوں سے چھنا کرتی ہے گہری ہم سے
یارب سبزہ رنگوں سے اب دل میں غم بھر آیا ہے   کیجو خیر اس بستی کی یہ سبز قدم پھر آیا ہے
دورِ طراوت آنکھوں میں ہے دائم چھاتی ٹھنڈی ہے   یاد میں سبزہ رنگوں کے دل کیا ہے سبزی منڈی ہے

بقا

شیخ بقاء اللہ خاں بن حافظ لطف اللہ خاں خوش نویس اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ اردو میں شاہ حاتم اور فارسی میں مرزا فاخر مکیں کے شاگرد تھے۔ مولوی عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ سخنِ شعرا میں انہیں غلطی سے میر درد کا شاگرد لکھا ہے۔ ابتدا میں غمگیں تخلص کرتے تھے۔ بعد میں بقا بن گئے۔ ترکِ وطن کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ یہیں میر اور سودا سے معرکے ہوئے۔ مگر دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اسی بنا پر ہجو کہنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ بے حد خوش مذاق اور ظریف الطبع تھے۔ اس لیے نوک جھونک میں ظرافت کا رنگ پیدا کر کے نئی روح پھونک دیتے تھے۔ بعض مہذب ہجووں کے چند شعر نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔

ایک دفعہ میر تقی میر نے یہ شعر لکھا ؎

دے دن گئے کہ آنکھیں ندیاں سی بہتیاں تھیں   سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

بقا کو گمان پیدا ہوا کہ میر صاحب نے ان کے دو شعروں سے دوآبہ کا مضمون اڑا لیا ہے ؎

ان آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے   دوآبہ جہاں میں یہ مشہور ہے

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابی میں   ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

بس پھر کیا تھا بگڑ گئے اور ایسے بگڑے کہ یہ قطعہ لکھ ڈالا ؎

میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا   اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
اے خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے   اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی ہو

اس کے بعد میرؔ سے ایسی چل گئی کہ ایک اور قطعہ کہا ؎

میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر   اس میں ہووے جو نام شاعر کا
لے کے دیوان پکارتے پھریے   ہر گلی کوچے کام شاعر کا

ایک جگہ میرؔ اور مرزاؔ دونوں کو لے ڈالا ہے ؎

میرؔ و مرزاؔ کی شعر خوانی نے   بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے   اے بقاؔ جب کہ ہم نے زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن
ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی

تھے ہم استاد ترے در پہ ملے بیٹھ گئے   تو نے چاہا تھا کہ ٹالے نہ ٹلے بیٹھ گئے
آئینہ دیکھا جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں   اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقاؔ واہ رے میں

میر ضاحک

میر ضاحکؔ کا نام میر غلام حسین ابن میر عزیز اللہ تھا۔ میر حسنؔ دہلوی کے والد اور میر انیسؔ کے پردادا تھے۔ علم عربی و فارسی کے عالم و فاضل تھے۔ نظم و نثر خوب لکھتے تھے۔ بغایت فہیم، درویش مزاج، نیک خو، توکل پیشہ، مزاح پسند، ہزل دوست، بذلہ سنج اور نکتہ رس تھے ترک روزگار کر کے تیس پینتیس سال آزادانہ زندگی بسر کی۔ موسیقی سے رغبت اور شعر و شاعری کا شوق تھا۔ نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ مگر ناقدری نے دل توڑ دیا تھا۔ اسی وجہ سے قدیم رنگ عاشقانہ ترک کر کے ہزل گوئی اختیار کر لی تھی۔ مگر اس میں بھی زبان عجیب و غریب ایجاد کی تھی جو بقول میر حسنؔ آدم سے لے کر اب تک کسی نے استعمال نہ کی ہو گی۔ مولوی ساجد اور مرزا سوداؔ کی ہجوؤں میں جولانی طبع اور قدرت زبان کے وہ جوہر دکھلائے کہ اہل زمانہ سن کر پھڑک گئے۔ مگر افسوس کہ ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ چالیس پچاس شعر سے کم کی غزل اور ہزل نہ کہتے تھے۔ اس کے شروع میں تھوڑی سی نثر بھی ضرور لکھتے تھے۔

ان کی غزلوں کے چند اشعار قاضی عبدالودود صاحب نے بڑی تلاش سے فراہم کیے ہیں، وہ حاضر ہیں ؎

ضاحک کا کلام

یاایہا التلانگہ[1] کرو جھلانگہ[2]   کل توپچی پر آئنہ فرد بکاسرہ[3]

درپیش اگر روز اجل آہ نہ ہوتا   قصہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا
کیا دیجئے اصلاح خدائی کو و لیکن   کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

اس آن تھمے آنسو جس آن کہ ڈوبا جی   تب جان سے ہم اٹھے جب دیدہ نم بیٹھے

.... کشافِ حقائق ذکاتِ توحید   آں راکب دوشِ احمدی شاہ شہید
خود معنیٔ آیاتِ کلامِ الٰہی است   تفسیر حسینی است بقرآن مجید

افسوس دلا کہ غمگساراں رفتند   سیمیں زبان و گل عذاراں رفتند
چوں بوئے گل آمدند برباد سوار   درخاک چو قطرہائے باراں رفتند

جب سے اس طفل پری وش نے چھپائیں آنکھیں   بس مراحل نہ سکا رد کے سجائیں آنکھیں

چھدائے کان انھوں نے بالیاں پہنی ہے سنتے ہیں   دوالے ان کے بلبلے ہیں کہ اب نک تنکے چنتے ہیں

فلک پر چاند دیکھا آج سے ماہِ محرم ہے
غضب باغِ جہاں میں صبح سے آئی شب غم ہے
زباں بلبل کی اور پرنم چشم شبنم ہے
لبوں پر گل کے بھی ضاحک نہیں اب تو تبسم ہے

---

[1] جمع تلنگا [2] جمع جھلانگا [3] جمع بکری

میر حسن دہلوی

اردو شاعری کی تاریخ میں میر حسن کا خاندان عدیم المثال ہے وہ تذکرہ شعرائے اردو میں اپنے متعلق خود لکھتے ہیں کہ "میری اصل ہرات سے ہے۔ شجرۂ نسب یہ ہے۔ میر حسن بن میر ضاحک بن خواجہ عزیز اللہ بن امیر امامی۔ میر امامی نور اللہ مرقدہٗ ہفت اقلیم اور فاضل متبحر تھے۔ بہ سبب فضیلت شاہجہاں میں تشریف لاکر اپنے زمانے کے لوگوں میں بڑا مرتبہ پایا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ چنانچہ اس عاجز کا تعلق شاعری سے خاندانی ہے۔ کوئی آج کی بات نہیں۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف میلان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ظرف کے موافق اس فن میں استعداد قبولیت عطا فرمائی۔ اصلاحِ سخن میں نے میر ضیا سے لی ہے۔ لیکن ان کی طرز کو میں کماحقہٗ نباہ نہ سکا اور دیگر بزرگوں مثلاً خواجہ میر دردؔ مرزا رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ کی پیروی اختیار کی۔ شروع جوانی میں گردشِ روزگار ناہنجار کے باعث کہ ہرگز کسی سے وفا نہیں کرتا ہے لکھنؤ اور فیض آباد پہنچا۔ بارے فلک جناب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ کی قدردانی سے معاش کا تھوڑا بہت سہارا ہوگیا..... فقیر نے اس مدت میں قریب سات آٹھ ہزار شعر کہے۔ ایک ترکیب بند اور ایک مثنوی رموز العارفین لکھی ہے۔ جسے لوگوں نے بہت پسند کیا ہے اور وہ بہت مشہور ہے۔"

ان کے والد میر غلام حسین ضاحکؔ بھی بڑے پایہ کے عالم، تیز فہم، مزاج پسند، بذلہ گو اور نکتہ سنج بزرگ تھے۔ یہ وہی ضاحکؔ ہیں جن کے متعلق مرزا رفیع سوداؔ نے ہجویں لکھی ہیں۔ سوداؔ کا کلیات تو موجود ہے جس میں ان کی ہجویات پائی جاتی ہیں۔ ضاحکؔ کا کلام ضائع ہوگیا۔ البتہ میر حسنؔ کی قلمی کلیات میں سوداؔ کی ہجو موجود ہے۔ میر حسنؔ نے باپ کی طرف سے جواب دے کر حقِ پدری تو ادا کر دیا ہے۔ لیکن ہجو میں وہ سوداؔ سے بھی زیادہ جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں اور پھکڑپن پر اُتر آئے ہیں

میر حسنؔ نے سنہ ۱۲۰۱ھ میں وفات پائی۔ اس وقت اُن کی عمر ۵۰ برس تھی، میر انیسؔ انہی کے پوتے تھے۔

مثنوی سحر البیان میں جو سنہ ۱۱۹۲ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔ میر حسنؔ نے اپنے وطن سے بے وطن ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھنؤ کو سچن یعنی دوزخ کہا تھا لکھتے ہیں ؎

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں ۔۔۔۔ نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں

بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا ۔۔۔۔ دے جاگہ جو بد ہوں تو کریں کیا

زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا ۔۔۔۔ کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا

کسی کا آسماں پہ گھر ہوا میں ۔۔۔۔ کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں

نہیں یہ لکھنؤ یہ ہے زمانا   زمانے پر عبث رکھا بہانا
عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی   گہے پستی ہے اور گاہے بلندی
ہر اک کوچہ یہاں تک تنگ تر ہے   ہوا کا بھی بمشکل واں گزر ہے
ہوا ہے راہ چلنا سب کو دشوار   خطر ہے گر پڑے سر پر نہ دیوار
جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر   پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در
لکھوں کیا چوک کی تنگی کا احوال   کمیت خانہ چل سکتا نہیں چال
کسی سودے کو واں گر کوئی جائے   خدائی ہو تو پھر جیتا گھر آئے
زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدد ہے   اگر شیعہ کہیں نیک اس کو بد ہے
عجب کیا ہے اگر حاتم یہاں آئے   تو قاروں کی طرح وہ سوم ہو جائے

سوائے تودۂ خاک اور پانی
یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی

میر حسن کی تصانیف سے مثنوی سحرالبیان، مثنوی گلزار آدم، مثنوی قصر جواہر اور مثنوی رموز العارفین چھپ چکی ہیں۔ کلیات ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اس کی تقسیم اصناف سخن کے اعتبار سے اس طرح ہے

(۱) غزلیات (۲) مثنویات (۳) قصائد (۴) رباعیات (۵) مثلثات (۶) ہجویات (۷) متفرقات مثلاً ترکیب بند ترجیع بند مسدس وغیرہ (۸) فردیات۔

مثنویاں چھوٹی اور بڑی مل کر تعداد میں گیارہ ہیں۔ مثنویوں کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں اشعار کی مجموعی تعداد گیارہ اور بارہ ہزار کے درمیان ہے۔ عام طور پر میر حسن اپنی مثنوی سحرالبیان کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ظرافت کی شاعری میں ان کا کوئی درجہ نہیں۔

کمترین

کمترین کا نام پیر خاں تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ میر حسن دہلوی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ کمترین نواب عمادالملک غازی الدین خاں کی سرکار میں ملازم تھے اور اپنی استعداد کے موافق شعر خوب کہتے تھے۔

میر تقی میرؔ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ہزل کی طرف ان کی طبیعت کا میلان بہت زیادہ تھا وہ خود بھی ان کی "ہجو ہائے رکیکہ" سے بچ نہ سکے۔ کمترین نے ایک شہر آشوب بھی لکھا جس میں ہر قوم کی ہجو کی[1] اس کے یہ چند شعر تذکرہ میر تقی میں درج ہیں ؎

نو خصم گن کر مشلین نے کئے   تو بھی نہیں رہتی دو شاخہ بن دیئے
پلا بش منفت نصرانی تو تاڑی   اگاڑی اصطبل کے جا پچھاڑی
یہ مقصدی نہیں ملتے اگر بھانڈوں سے راتوں کو   تو کیوں پیسے کماتے ہیں یہ نقلیں کر براتوں میں
دیکھو کپوان والی کی مزاخیں   خصم کے روبرو دیتی ہے شاخیں
کے بیڑ دوگے ہم کو نازک بدن پیارے   تم بادشاہ ہند ہو ہم کمترین پیارے

ہُدہُد الشعراء

عبدالرحمٰن نام تھا اور پورب وطن۔ کسی وجہ سے دہلی آئے۔ حکیم آغا جان صاحب عیشؔ کے پڑوس میں مکان لیا اور وہیں لڑکے پڑھانے لگے۔ عجیب وضع قطع تھی۔ گھٹا ہوا سر۔ اس پر لمبی لمبی جٹائیں بالکل کھٹ بڑھیا معلوم ہوتے تھے۔ کان بقول شخصے چھچھوندر کاٹے دو شاخہ نوکدار زاویہ نما داڑھی پر چنبیلی کا تیل ملے اپنی جھونجھ میں خوش و خرم رہتے تھے، حکیم صاحب نے ہُدہُد تخلص تجویز کیا۔ ان کی فرمائش سے کبھی کبھی نعرۂ بے ہنگام بلند کرتے تھے۔ ایک دفعہ بہادر شاہ کی تعریف میں یہ قصیدہ لکھ کر پیش کیا ؎

جو تیری مدح میں میں جو چونچ اپنی وا کردوں   تو رشک باغ ارم اپنا گھونسلا کردوں
جو آکے ریز کرے میرے آگے موسیقار   تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سُرا کردوں
جو سرکشی کرے آگے میرے ہما آکر   تو اس کے نوتح کے پر شکل نیولا کر دوں
میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لیے   فلک کہے ہے مقدر میں باجرا کردوں

بہادر شاہ ظفر نے طائر الاراکین، شہپر الملک، ہدہد الشعراء منقار جنگ بہادر کے خطاب عطا فرمائے اور سات روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کردیا ایک مرتبہ مکان نہ ملتا تھا۔ آپ نے یہ عرضداشت نظم کر ڈالی ؎

---

[1] گلزار ابراہیم صـ ۲۰۶

جز تیرے شاہنشہ کہہ کس کے آگے روئیے　　کس سے کہیے جا کے یہ غم کو ہمارے کھوئیے
تجھ کو ہے حق نے کیا ملکِ سخن کا شہسوار　　ہیں بجا کرنے سمندِ طبع کو یاں پوئیے
حیف آتا ہے کہ فنِ شعر میں کیوں کھوئی عمر　　کاش کے ہم سیکھتے اس سے بنانے بوئیے
سنگلاخ ایسی زمیں ہے دیکھ اے دل تا کجا　　فکر کیجیے صرف اس میں اور پتھر ڈھوئیے

رشتۂ عمرِ شہنشاہِ جہاں ہووے دراز　　یا خدا کھلتے رہیں جب تک جہاں میں ہوئیے
دیدے اس کو بھی زمیں تھوڑی کہ بن گھر گھونسلے　　مارتا پھرتا ترا ہدہد ہے ٹامک ٹوئیے

ایک دفعہ تنخواہ نہ ملی۔ انہوں نے نظم کی ٹانگ توڑ کر دربار کے ایک معزز عہدہ دار میر سامان راجہ دیبی سنگھ کی معرفت ایک درخواست گزران دی ؎

جہاں میں آج دیبی سنگھ توراجوں کا راجہ ہے　　خدا کا فضل ہے جو قلعہ میں تو آج راجہ ہے
سلیماں نے ہے تیرے ہاتھ میں دی رزق کی کنجی　　تو سرداروں کا سردار اور مہاراجوں کا راجہ ہے
شکم اہلِ جہاں کے سب ہیں شکرانے بجا لاتے　　دمامہ جا کے تیرا گنبدِ گردوں پہ باجا ہے
کسی کو دے نہ دے تنخواہ تو مختار ہے اس کا　　مگر ہدہد کو دے دے کیوں یہی ہدہد کا کھاجا ہے

دو قطعے ملاحظہ فرمائیے ؎

ہدہد کا مذاق ہے نرالا سب سے　　انداز ہے اک نیا نکالا سب سے
سر دفترِ لشکرِ سلیماں ہے یہ　　اڑتا ہے سخن میں بالا بالا سب سے
راست آئینوں کو نفرت ہے کج آئینوں سے　　تیر نکلا جو کماں سے تو گریزاں نکلا

آشیاں سے جو غزل پڑھنے کو ہدہد آیا　　غل ہوا پیشروِ ملکِ سلیماں نکلا

حکیم آغا جان عیش کے اشارہ پر ہدہد بلبلانِ سخن کو ٹھونگیں بھی مارتا تھا۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں ایک بے معنی غزل پڑھی

اور کہا کہ غالبؔ کے انداز میں لکھی ہے غزل کا مطلع ہے ؎

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں   ناخنِ قوسِ قزح شبۂ مضراب نہیں

غالبؔ تو سن کر ہنس دیے ہوں گے۔ مومنؔ خاں مومنؔ وغیرہ نے ہدہدؔ کے شکار کو ایک باز تیار کیا اس نے بازی دکھائی۔ مگر اس کا رنگ نہ جم سکا۔ **ہدہد نے** اس کے بھی پر نوچے اور بڑے فخر کے ساتھ کہا ؎

جسے کہتے ہیں ہدہدؔ وہ تو نرشیروں کا دادا ہے   مقابل تیرے کیا ہو تو تو اک جرہ کی مادہ ہے
گر اب کے بازری میدان میں آئی سامنے تیرے   تو دم میں پر نہ چھوڑوں گا یہی میرا ارادہ ہے
مقرر بازؔ جو اپنا تخلص ہے کیا تو نے   ہوا معلوم یہ اس سے کہ گھر تیرا کشادہ ہے
ادب اے بے ادب اب تک نہیں تجھ کو خبر اتنی   کہ ہدہد سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

چند روز کے بعد بازؔ تو اڑنچھو ہو گیا لیکن یار لوگوں نے ایک کالا بھجنگا تیار کر کے اس کا تخلص زاغؔ رکھا۔ ہدہدؔ نے اس کوے کی خبر بھی لی اور وہ کائیں کائیں کرتا ہوا غائب ہو گیا۔ ہدہدؔ نے اس کی ہجو میں یہ شعر لکھے ؎

جون آیا ہے عدو اب کے بدل کوے کی   اس کی ہے پانوں سے تا سر وہی خو کوے کی
وہی کاں کاں وہی کیں کیں وہی ٹیں ٹیں اس کی   بات چھوڑی نہیں ہاں اک سرِ مو کوے کی
پہلے جانا تھا یہی سب نے کہ کوا ہو گا   پھر جو معلوم کیا ہے یہ بہو کوے کی
بن کے کوا جو یہ آیا ہے تو اے ہدہدؔ شاہ   دم کتر دینے کو کچھ کم نہیں تو کوے کی

شاکر ناجی

محمد شاکر نام تھا اور ناجیؔ تخلص۔ شاہ جہان آباد کے رہنے والے تھے۔ اہلِ سخن نے انہیں طبقۂ اول کے ارکان میں شمار کیا ہے محمد شاہی دربار کے ایک رکن امیر خاں تھے۔ یہ ان کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے۔ مگر نہایت تیز مزاج اور شوخ طبع راہ چلتے سے الجھتے اور جس کے گرد ہو جاتے اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ میر تقی میرؔ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ناجیؔ "ایک جوان تھے آبلہ رو۔ سپاہی پیشہ مزاج

زیادہ تر ہزل کی طرف مائل تھا۔ میاں آبرو کے معاصر تھے۔ میں نے ان سے دو ایک ملاقاتیں کی ہیں اپنی ہزل کے اشعار خود پڑھتے تھے لوگوں کو ہنساتے تھے۔۔۔۔۔ خود نہیں ہنستے تھے کبھی کبھی تبسم فرماتے تھے۔ وطن شاہ جہان آباد تھا جوانی ہی میں جہاں سے رخصت ہو گئے۔"

میر حسن نے بھی ان کی طبع ظریف اور لطائف و ظرائف کا تذکرہ کیا ہے۔

طہماسپ قلی نادر شاہ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت ناجی زندہ تھے۔ مولانا آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں:۔

"نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے اس وقت دربار دہلی کا رنگ، شرفا کی خواری، پاجیوں کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور نازپروری کو ایک طولانی مخمس میں دکھایا ہے افسوس کہ اس وقت دو بند اس کے ہاتھ آئے۔"

یہ دو بند آزاد نے مجموعہ نغز سے لے کر نقل کئے ہیں۔ اس شہر آشوب میں نادر شاہی حملے سے دہلی کی تباہی و بربادی کا ماتم بھی کیا ہے اور ہندوستانی فوج کی بزدلی اور عسکریت کے زوال پر طنز و تعریض بھی کی ہے ؎

لڑے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے   دعا کے زور سے دائی دوا کی جیتے تھے

شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے   نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے

گلے میں ہیکلیں بازو اوپر طلا کی نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا   کہ بن نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا

نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ دانا تھا   ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف و مطبخ و دکاں نہ غلہ و بقال

بعض تذکروں سے چند دیگر متفرق اشعار جن پر ناجی کی شوخ مزاجی کی مہریں لگی ہوئی ہیں ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں ان میں زیادہ تر لفظی ہیر پھیر ہے

بے نواؤں سے نہ مل اے موکمر مت پیچ کھا   مونڈ سر لڑکوں کو کرتے ہیں وہ اپنا بالکا

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تک بہلا   چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

اگر ہو وہ بت کافر کبھی اشنان کو ننگا   بھنور میں دیکھ کر جمنا اسے غوطے میں جا گنگا

نہ تو کو یار کو کہ خط رکھاتا یا منڈاتا ہے   مرے نشہ کی خاطر لطف سے سبزی بتاتا ہے

جو کوئی کچھ کہے پگھل جاوے   شمع رو ہے ہمارا موم کی ناک۔

ہمیں تو بوسہ نہ دینے کہا نہ کمر کے دیا   جنھوں سے وعدہ کیا ہے انہیں چھپاتے ہیں

انا الحق بولتے لگتا ہے اس کے زخم کا بسمل   کٹاری آبدار اس شوخ کی منصور خانی ہے

ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہے   یہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

جان ہے جیوڑا دلبر ہے   پر یہ مشکل کر طالب زر ہے

لب جاں بخش آگے تیرے سخن   جو مسیحا کا نام لے خر ہے

جہاں دل بند ہو ناؔجی کا وہاں آوے خلل کرنے   رقیب لا ولد ناصح گویا لڑکوں کا باوا ہے

اس کے رخسار دیکھ لیتا ہوں   عارضی میری زندگانی ہے

ملنے کو نوخطاں کے واعظ بُرا کہے ہے   مجہول ہیں یہ باتیں ہم خوب جانتے ہیں

نمکین حسن دیکھ کر پی کا!   رنگ گل کا مجھے لگا پھیکا

تری نگاہ کی کثرت سے اے کماں ابرو   ہمارے سینے میں تودا ہوا ہے تیروں کا

نہ پوچھو، خود بخود ہے عارض خورشید کی خوبی   لیا ہے ذرہ ذرّہ حسن مہرویاں سے کر چندا

مت کر آزاد دام زلف سے دل   بال باندھا غلام ہے تیرا

محبت سوں علی کی دیکھ ناجی   ہوا ہے دل مرا اب حیدرآباد

انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج اگر ہوتی   جنھوں کی آن پہنچی لڑ مرے وہ ایک چھلے پر

آج تو ناؔجی سجن سے کر تو اپنا عرض حال   مرنے جینے کا نہ کر وسواس ہونی ہو سو ہو

زلف کیوں کھولتے ہیں دن کو صنم   مکھ دکھایا ہے تو نہ رات کرو
وظیفہ راگنی کے سر میں زاہد اکثر ہے پڑھتا مت   نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہے

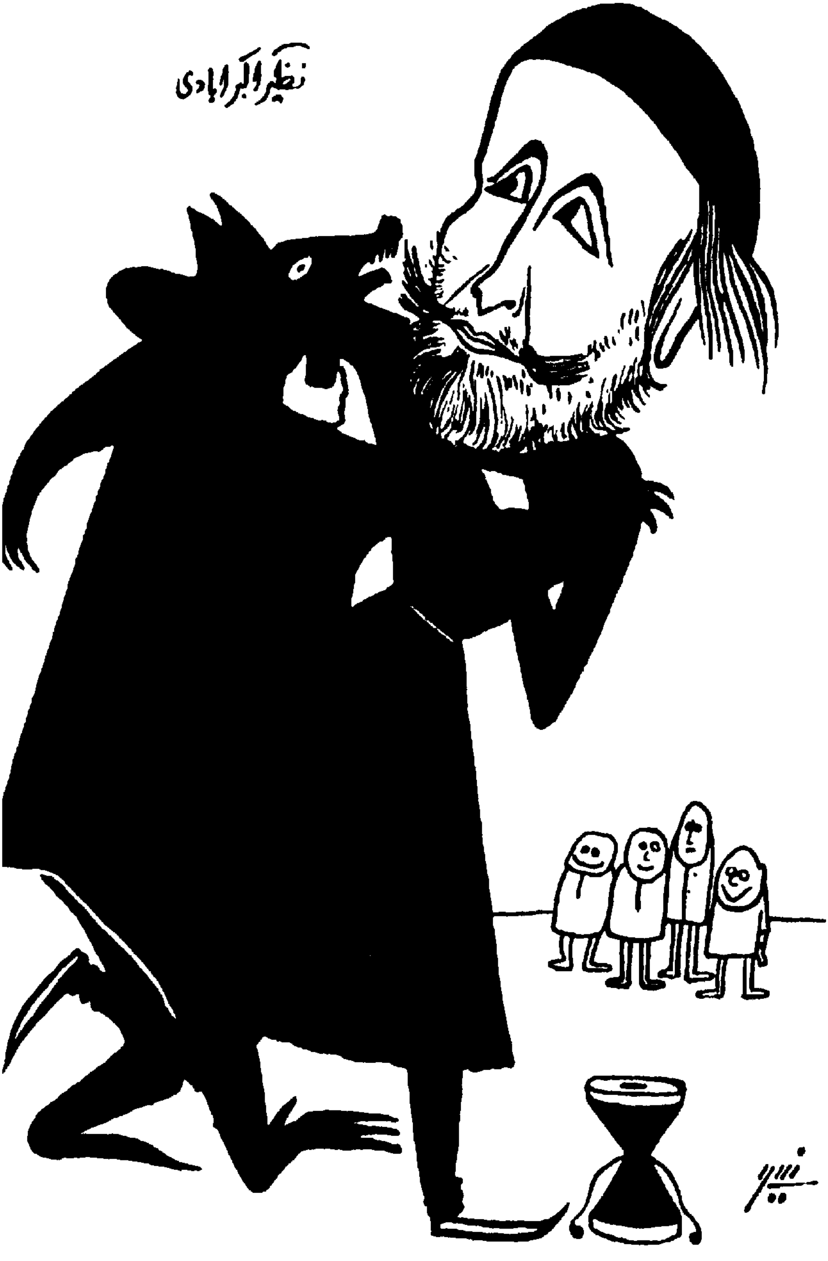
نظیر اکبرآبادی
نیر

نظیر اکبر آبادی

شیخ ولی محمد نام تھا اور نظیر تخلص۔ محمد فاروق کے بیٹے اور دہلی کے باشندے تھے سنہ ۱۱۴۸ھ (۱۷۳۵ء) میں پیدا ہوئے۔ ۲۶ برس کے تھے کہ احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا۔ اس ہلچل میں دہلی سے نکلے اور آگرہ پہنچے۔ وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آگرہ میں روضۂ تاج گنج کے قریب رہتے تھے اور معلّمی پر بسر اوقات تھی۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اردو کلیات خاصا ضخیم ہے۔ فارسی میں نو کتابیں لکھیں۔ ۲۴ صفر ۱۲۴۶ھ (۱۶ اگست ۱۸۳۰ء) کو آگرہ میں انتقال کیا۔ عبدالغفور شہباز نے اپنی کتاب زندگانیٔ بے نظیر میں ان کے دلچسپ حالات لکھے ہیں۔

نظیر نہایت خلیق، وضعدار، صلح کُل، زندہ دل اور بذلہ سنج شاعر تھے۔ جوانی میں نہایت شوقین تھے۔ شہر کے تمام میلے ٹھیلوں، کھیل تماشوں اور جلسے جلوسوں میں شرکت کرتے اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ زبان پر حاکمانہ قدرت اور تخیل میں بلا کی وسعت و دراکی تھی۔ انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ زندگی کا کوئی پہلو، معیشت و معاشرت کا کوئی انداز اور احساس و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو ان کے کلام میں موجود نہ ہو۔ وہ نہایت ذہین، تیز فہم اور زود گو تھے۔ بات بات پر بڑی بڑی نظمیں کہہ دینا ان کے نزدیک معمولی بات تھی۔ اشیاء کے ہر رُخ، ہر پہلو اور زاویہ کو پیش کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ شہر کی مشہور چیزوں، کھانوں، عمارتوں، میلوں، تماشوں، تہواروں اور بازیگروں وغیرہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھ کر مصوّری اور جزئیات نگاری کا حق ادا کیا۔ دنیا کی بے ثباتی، اہلِ جہان کے طور طریقوں، رسم و رواج، دولت، مفلسی، چوری، عیاشی، تماش بینی، بھنگ چرس موسموں کے تغیر و تبدل اور مناظرِ قدرت کو کئی کئی رنگوں میں پیش کر کے ہمہ گیری کا ثبوت دیا۔

نظیر کے ہاں "لفظوں کی وہ افراط ہے کہ ایک زخار دریا موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ معانی کی وہ بہتات کہ شہسوار موتیوں کا انبار نظر آتا ہے۔ بیان کی سلاست ایسی کہ کہیں رکاوٹ کا نام نہیں۔ بندش کی وہ چستی کہ کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے تصویر کشی اور محاکات کا یہ عالم کہ جب تاج گنج کے روضہ کی تعریف پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھیں اس کے ایک ایک نقش و نگار اور ایک ایک جالی کو دیکھ لیتی ہیں۔ جب ریچھ والے کی تعریف نظر آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک قلندر کان چھدوائے سر پر بڑا سا پگڑ باندھے ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لئے ریچھ کے بچے کی نکیل پکڑے اس کو نچا رہا ہے اور اپنے سونٹے سے اس کو سدھا رہا ہے۔ دنیا کی بے بقائی اور عالم کی بے ثباتی کے اشعار سامنے آتے ہیں تو دل کو یقین آ جاتا ہے کہ روپیہ پیسہ دھن دولت، مال و اسباب سب ہیچ ہم اور ہماری خواہشات لایعنی، ہماری بود بے بود، ہماری ہستی عین فنا ہے۔ دیوالی کی تعریف پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں کہ در و دیوار پر چراغاں ہے۔ مٹھائی کی دکانیں سجی ہوئی ہیں۔ بھر لب کھیلیں بیچ رہے ہیں۔ دنیا کی رسم و رواج کے پابند رومالوں میں کھیلیں باندھ باندھ کر لیجا رہے ہیں۔ جواری اپنے اپنے اکھاڑوں میں اترے ہوئے ہیں۔ چھ، نو، آٹھ کے داؤں کی آوازیں ہو رہیں۔ شوقین مزاج گھوم رہے، بازار کی رونق کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ بعض بڈھے اپنے بچوں کی انگلی پکڑے دکان دکان دکھاتے پھر رہے ہیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ غرضکہ اسی طرح ہر ایک نظم میں جزئیات سے بحث کرنا نظیر کا خاص حصہ ہے (تذکرہ خندۂ گل صفحہ ۲۹-۴۲۸)

نظیر کو اُردو کی نیچرل شاعری کا موجد مانا جائے یا نہ مانا جائے۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے فنِ تقابل و تماثل کو اُردو میں

نظیر کے سوا شاید آج تک کسی دوسرے نے نہیں برتا۔ ان کی ظرافت کا کمال سچی بات سیدھے سبھاؤ کہہ دینے میں ہے۔ وہ بقول نیاز فتحپوری چٹکلہ باز تھے۔ دل کی لگن سے زیادہ دل لگی ان کا شیوہ تھا۔ نظیر اردو کے شاید تنہا عوامی شاعر ہیں جو مقامی بھی ہیں۔ انہیں ہنس ہنس کر وار کرنا خوب آتا ہے۔ نظیر کے یہاں طنز و ظرافت کا بڑا اچھا امتزاج ہے اچھا اس لئے کہ اس میں ہر قسم کا طنز اور ہلکی پھلکی ظرافت صرف کی گئی ہے۔ اس کا مزاج بڑا ہی خوشگوار ہے شگفتگی میں تلخی کی ایسی آمیزش جو مذاق صحیح کو ناگوار نہ ہو بڑے سلیقے کا کام ہے۔ نظیر میں یہ سلیقہ ہے اور اس کو ایک ماہر فنکار کی طرح انہوں نے برتا ہے۔ "آدمی نامہ" نظیر کی مشہور نظم ہے۔ یہ تقابلی طنز کی بہترین مثال ہے۔ اردو تو کیا شاید دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی مشکل ہی سے اس کے ہم پایہ کوئی نظم پیش کی جا سکے۔ سودا کے طنز کی دنیا جتنی تنگ اور محدود تھی نظیر کی اتنی ہی وسیع اور نامحدود ہے۔ سودا کا فن طنز کا فن ہے۔ ظرافت اس کا ایک رنگ ہے۔ نظیر کا فن ظرافت کا فن ہے۔ طنز اس کا آہنگ ہے۔ نظیر نے کسی کی ہجو نہیں کی۔ انکے لہجے میں نرمی لوچ اور دھیما پن ہے سودا خاکہ بنا کر رنگ بھرتے ہیں اور کسی رنگ کا بڑا سا دھبہ ڈال کر تصویر کو مضحک بنا دیتے ہیں۔ نظیر آئینہ بند ہیں انہوں نے چاروں طرف آئینے نصب کر کے ایک چیز کے مختلف پہلو روشن کئے۔ ان پہلوؤں کا تضاد چٹکیاں لیتا اور گدگداتا ہے اور ہماری حس لطیف کو جگاتا ہے۔ نظیر نے ایک تماشائی کی طرح جس طرح دنیا کو دیکھا دوسروں کو دکھایا۔ ان کی نظر سیر کرتی، ہر منظر سے لطف اٹھاتی اور ہر کیفیت سے حظ حاصل کرتی ہے۔ نظیر کی ظرافت ہلکی پھلکی اور خوشگوار ہے۔ وہ ہنسی کو خوشی پر، تعریض کو طعن پر، مسرت کو ٹھٹھول پر ترجیح دیتے ہیں۔

نظیر کے یہاں زندگی کی اہمیت ہے۔ ان کا اجتماعی شعور بہت تیز تھا۔ سماج کا کوئی پہلو ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ ان کی نظر تفصیلی ہے۔ وہ ایک ہوشیار نشتر زن کی طرح فساد کو نشتر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کی نظر میں حکیمانہ گہرائی نہیں۔ وہ فساد کی اصلی وجہ نہیں جانتے انہیں زندگی اور اس کی رنگینیاں پیاری ہیں۔ وہ اس کا رس نچوڑنا چاہتے ہیں شاید اس لئے فساد پر ان کی نظر پڑ جاتی ہے زندگی کی رنگا رنگی کو انہوں نے تفصیل کے ساتھ پیش کیا اور یہ ان کی شاعری کا وہ پہلو ہے جو سب سے الگ ہے۔ ان کے فکر و فن کی ہم آہنگی کا راز یہ ہے کہ وہ زبان پر بلا کی قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان کی نظر میں غضب کی وسعت ہے۔ نظیر کا کمال یہ ہے کہ اس نے زندگی کے متنوع اور گوناگوں رنگوں کے تقابل سے مزاح اور طنز پیدا کیا۔ دوسرے شعراء نے رنگ کو شوخ اور گہرا بنا کر اثر پیدا کرنا چاہا۔ نظیر نے مختلف رنگوں کے پس منظر سے یہ کام لیا لیکن طنز کی شدت اور تیزی ان کے یہاں نہیں اور شاید اس لئے نہیں کہ وہ نفرت کرنا نہیں جانتے۔ وہ ننگا کر سکتے ہیں۔ تشہیر کر سکتے ہیں لیکن سر بازار جوتے مارنا اور ذلیل کرنا کسی طرح انہیں گوارا نہیں[1]"

ذیل کے اشعار میں ملا پر تعریض ہے ملاحظہ ہو؎

ملا جو دینے فاتحہ گھر گھر میں جاتے ہیں   حلوا کہیں کہیں وہ چپاتی اڑاتے ہیں

مفلس کوئی بلاوے تو منہ کو چھپاتے ہیں   شکر کا حلوا سنتے ہیں تو دوڑے جاتے ہیں

کہتے ہوئے یہ دل میں اہا ہا ری شب برات

وہ دیکھ شیخ کو لاحول پڑھ کے کہتا ہے   یہ آئے دیکھئے واڑھی لگائے سن کی سی

---

[1] "اردو شاعری میں طنز" از شوکت سبزواری مطبوعہ علی گڑھ میگزین طنز و مزاح نمبر (۱۹۵۳ء) مع اضافہ

"نظیر نے بعض واقعات اور پُر آہنگ الفاظ کی صوتی کیفیت سے بھی مزاح کا رنگ رچایا ہے۔ اس کی ان کے یہاں بےشمار مثالیں ہیں۔ جانوروں کی بولیاں انسان کے اضطراری بولوں کی طرح مضحک ہوتی ہیں، صوتی اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی۔ نظیر نے ان سے بھی کام لیا جوں چوں، کوں کوں، کڑکڑ، سی سی، ہی ہی ہا ہا، ہو ہو سے کلام کو چٹپٹا بنایا۔ لفظی رعایتوں کی بھی ان کے یہاں کمی نہیں "کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ" "پیسہ نہیں چرخے کی مال ہے" "کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں"۔ اس کی چند مثالیں ہیں۔

اوکھی تشبیہات کے استعمال سے بھی ظرافت پیدا کرتے ہیں ککڑی کی چند تشبیہیں ملاحظہ ہوں

فرہاد کی نگاہیں شیریں کی ہنسلیاں ہیں — مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں۔
ٹیڑھی ہے سو تو جوڑی وہ ہیر کی ہری ہے — سیدھی ہے سو وہ یار و رانجھے کی بانسری ہے

نظیر کی ظرافت اگرچہ ہزل اور بعض دفعہ فواحش کی حد تک پہنچ جاتی ہے مگر ان کے الفاظ کا چناؤ اور خیالات کی تازگی اس کو بےمزہ اور پھیکا نہیں ہونے دیتی۔ ان کی طویل نظموں کے جستہ جستہ ٹکڑے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

آدمی نامہ

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بےنوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال غوث قطب ولی آدمی ہوئے — منکر بھی آدمی ہی ہے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کیے — حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا — شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا — یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں   بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نمازیاں   اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بڑھاپا

آگے تو یہ پریزاد یہ کہتے تھے ہیں گھیر   آتے تھے چلے آپ جو لگتی تھی کہیں دیر
لو آکے بڑھاپے نے کیا اور یہ اندھیر   جو دوڑ کے ملتے تھے وہ اب لیتے ہیں منہ پھیر
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ہم بھی تھے جوانی میں بہت عشق کے پورے   وہ کونسے گُرو ہیں جو ہم نے نہیں گھورے
اب آکے بڑھاپے نے کیے ایسے ادھورے   پر جھڑ گئے دُم اُڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تندرستی

جب تندرستیوں کی رہیں دل میں بستیاں   پھر سو طرح کے عیش ہیں اور مے پرستیاں
کھانے کو نعمتیں ہوں و یا فاقہ مستیاں   سب عیش اور مزے ہیں جو ہوں تندرستیاں
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

فقیروں کی صدا

زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا   دکھ اس میں تری روح بہت پائے گی بابا
ہر کھانے کو ہر پینے کو ترسائے گی بابا   دولت جو ترے یاں ہے نہ کام آئے گی بابا
پھر کیا تجھے اللہ سے ملوائے گی بابا

دولت جو ترے پاس ہے رکھ یاد تو یہ بات   کھا تو بھی اور اللہ کی کر راہ میں خیرات
دینے سے اسی کے ترا اونچا رہے پھر ہات   اور یاں بھی تری گزرے گی سو عیش سے اوقات
اور واں بھی تجھے سیر یہ دکھلائے گی بابا

داتا کی مشکل کبھی اٹکی نہیں رہتی   چڑھتی ہے پہاڑوں کے اوپر ناؤ سخی کی
اور تو نے بخیلی سے اگر جمع اسے کی   تو یاد یہ رکھ بات کہ جب آوے گی سختی
خشکی میں تری ناؤ یہ ڈبوائے گی بابا

دُنیا کے تماشے

کھول ٹک چشم تماشا یار باشی پھر کہاں   یہ شکار و صید یہ شکرے و باشی پھر کہاں
مال و دولت سونا رُوپا تولہ ماشے پھر کہاں   دم غنیمت ہے بھلا یہ بود و باشی پھر کہاں
دیکھ لے دنیا کے غافل یہ تماشے پھر کہاں

خوشامد

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے   آدمی جن و پری بھوت بلا راضی ہے

بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے   شاہ مسرور و غنی شاہ و گدا راضی ہے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے   حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجئے — اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجئے
اولیا و انبیا اور رب کی خوشامد کیجئے — اپنے مقدور غرض سب کی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کے سلام — وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام
بڑے عاقل بڑے دانا نے نکالا ہے یہ دام — خوب دیکھا تو خوشامد ہی کی آمد ہے تمام

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

ہولی

ملنے کا ترے رکھتے ہیں ہم دھیان ادھر دیکھ — بھاتی ہے بہت ہم کو تری آن ادھر دیکھ
ہم چاہنے والے ہیں مری جان ادھر دیکھ — ہولی ہے صنم ہنس کے تو اک آن ادھر دیکھ

اے رنگ بھرے نو گل خنداں ادھر دیکھ

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا — کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا — ان سب جگہوں کے گرنے سے آیا جو بچ بچا

وہ اپنے گھر کے صحن میں آ کر پھسل پڑا

کرتی ہے گرچہ سب کو پھسلتی زمین خوار — عاشق کو پر دکھاتی ہے کچھ اور ہی بہار
آیا جو سامنے کوئی محبوب گلعذار — گرنے کا مکر کر کے اُچھل کود ایک بار

اس شوخ گلبدن سے لپٹ کر پھسل پڑا

آٹے کے واسطے ہے ہوس ملک و مال کی　　آٹا جو پالکی ہے تو ہے دال نالکی
آٹے ہی دال سے ہے درستی یہ حال کی　　اس سے ہے سب کی خوبی جو ہے حال قال کی
سب چھوڑ دو بات طوطی و پدری لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

جب آدمی کے پیٹ میں جاتی ہیں روٹیاں　　پھولے نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں　　سینہ اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے　　یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سُن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے　　ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہی جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہل یقین ہیں　　کھانے کو ان کے نعمتیں سو بہترین ہیں
کپڑے بھی ان کے تن پہ نہایت مہین ہیں　　سمجھیں ہیں اسکو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

پیسے ہی کا امیر کے دل میں خیال ہے　　پیسے ہی کا فقیر بھی کرتا سوال ہے
پیسہ ہی فوج پیسہ ہی جاہ و جلال ہے　　پیسے ہی کا تمام یہ رنگ و روال ہے
پیسہ ہی رنگ و روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

پیارے تمہارے اور تو عاشق ہیں نوجوان   اک ہم ہی بوڑھے سب سے ہیں اور پیر ناتواں
وہ تو رہیں گے، ہم ہیں کوئی دن کے میہمان   بس سب کو چھوڑ ہم سے ملو کس لیے کہ جان

پیرے کہ دم ز عشق زند لیس غنیمت است
از شاخ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

یہ نعمتیں ہیں جتنی جو کچھ ملیں سو کھا جا   تاش اور بارے میں اکبار جگمگا جا

باپی بخیل مت بن داتا سخی کہا جا   اک دم تو اپنا ڈنکا من مانا بجا جا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال و دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جب ملی روٹی ہمیں سب نور حق روشن ہوئے   رات دن شمس و قمر شام و شفق روشن ہوئے
زندگی کے تھے جو کچھ نظم و نسق روشن ہوئے   اپنے بیگانوں کے لازم تھے جو حق روشن ہوئے
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

ماں سے کہتا مرا اے جان ہنس لے بول لے   حسن یہ دو دن کا ہے مہمان، ہنس لے بول لے

تازگی جی کی اور ترے تن کی   واہ کیا بات کورے برتن کی

جھمکا نظر آتا ہے ہر اک جنس کی شے کا   دنیا میں عجب روپ جھلکتا ہے روپے کا

مرشد و مولا سے پوچھا میں نے اے پیر زمن   میری کچھ لگتی نہیں اللہ سے دل کی لگن
سن کے بولے وہ بتائیں ہم تجھے اس کا جتن   جا شتاب اور جلد سبزی بیچ کے اک دو چار من

کونڈی سونٹے کو بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل
چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل

جب یار چلا اوڑھ کے کالا سا دوشالا   کمبل کو ادھر ہم نے بھی کاندھے پہ سنبھالا
جا مل گئے اور دل کا بھی ارمان نکالا   منھ اس کے رقیبوں کا کیا خوب سا کالا
کیا وصل کی رکھتی ہے کرامات اندھیری
کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری

جب پھول کا سرسوں کے ہوا آ کے کھلنا   اور عیش کی نظروں سے نگاہوں کا لڑنا
ہم نے بھی دل اپنے کے تئیں کرکے بچپنا   اور ہنس کے کہا یار سے لے لکڑ بھونا
سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

تھے اپنے گلے میں تو کئی من کے پڑے ہار   اور یار کے گجرے بھی تھے اک دھون کی مقدار
آنکھوں میں نشے سے کے اُبلتے تھے دہواں دھار   جو سامنے آتا تھا یہی کہتے تھے للکار
اوروں کی بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

نوچی اور نائکا کی لڑائی

مرتی نہیں بہنیا یہ گزرتی نہیں ڈھڈو   اور قہر خدا سے بھی یہ ڈرتی نہیں ڈھڈو
لب اپنے ذرا بند یہ کرتی نہیں ڈھڈو   کیا سخت خرابی ہے یہ مرتی نہیں ڈھڈو

ایسا جو مرے پاس لگے جائے گی جھاپنو   اک روز مجھے گھر سے نکلوائے گی جھاپنو
سب کھا چکی اب مجھ کو بھی کیا کھائے گی جھاپنو   وہ کون سا دن ہوگا مر جائے گی جھاپنو

نظیرؔ کی نظموں کے مقابلے میں غزلیں کسی قدر پھیکی ہیں، پھر بھی چند منتخب اشعار جن پر شوخی اور ظرافت کی چھاپ ہے یہاں درج کئے جاتے ہیں

لو نہ ہنس ہنس کے تم اغیار کے گلدستوں سے   اتنی ضد بھی نہ رکھو اپنے جگر خستوں سے
پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیرؔ   کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے

کہا جو تم نے ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو   کہا کہ اس لئے تم یاں جو غل مچاتے ہو
کہا لڑاتے ہو کیوں ہم سے غیر کو ہمدم   کہا کہ تم بھی تو ہم سے نگہ لڑاتے ہو
کہا جو حال دل اپنا تو اس نے ہنس ہنس کر   کہا غلط ہے یہ باتیں جو تم بتاتے ہو
کہا جتاتے ہو کیوں ہم کو روز ناز و ادا   کہا کہ تم بھی تو چاہت ہمیں جتاتے ہو
کہا کہ عرض کریں ہم پہ جو گزرتا ہے   کہا غیر ہے ہمیں کیوں زباں پہ لاتے ہو
کہا کہ روتے ہو کیوں ہم سے کیا سبب اسکا   کہا سبب ہے یہی تم جو دل چھپاتے ہو

نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوش ہو   جس کی نوید پونچی ہے رنگ بسنت کو

میں ہنس کے اسلئے منہ چومتا ہوں غنچہ کا   کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی

نظیرؔ آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

جان صاحب

میر یار علی نام، میر امن لکھنوی کے فرزند اور نواب عاشور علی خاں لکھنوی کے شاگرد تھے۔ نہایت ہنس مکھ، ملنسار اور خلیق انسان تھے جب تک لکھنؤ میں رہے پریشان حال رہے، ۱۸۴۷ء میں مجبوراً ترک وطن کرکے دلی چلے گئے۔ مگر وہاں بھی پاؤں نہ جم سکے۔ بھوپال پہنچے تو وہاں بھی بدنصیبی ساتھ رہی۔ آخر والئہ بابانی نے زور کیا اور نواب کلب علی خاں کی قدردانی رام پور کھینچ لے گئی۔ پھر وہیں رہ پڑے اور ۱۲۹۰ھ میں ۶۳ برس کی عمر پاکر وہیں پیوند زمین ہوئے۔

جان صاحب نے شروع ہی سے ریختی گوئی کی مشق کی اور اس کے سوا کسی صنف میں کوئی شعر نہیں کہا۔ وہ مشاعروں میں بھی بالکل زنانہ لباس پہن کر جاتے اور اس انداز سے پڑھتے کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ ہو جاتے۔ اس کے باوجود ان کی ریختی میں آمد کم آورد زیادہ ہے سی تکلف کی وجہ سے رنگین اور انشاکی سی روانی اس میں پیدا نہیں ہوئی وہ خود اعتراف کرتے ہیں ؎

وہ کتنے استاد ان سے جانؔ صاحب تجھ کو کیا نسبت　　کیا پر نام روشن ریختی نے تیری نسبت کا

لفظی رعائتیں ان کے یہاں اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض اوقات کلام بے مزہ ہو جاتا ہے۔ فواحشات کا بھی زور شور ہے۔ یہی وجہ ہ ان کا دیوان عرصہ تک چھپنا قانوناً بند رہا۔ آخر انتخاب شائع ہوا۔ بقول مولانا عبدالباری آسیؔ "اس میں شک نہیں کہ باوجود اس آورد اور تکلف کے ان کے یہاں بیگماتی زبان، لکھنؤ کے روزمرہ، شیریں کلام، عورتوں کے محاورات، رسوم و رواج کا اس قدر ذکر ہے ہ متقدمین میں کسی کے یہاں بھی نہیں۔" (تذکرہ خندہ گل صـ۱۴۸)

جانؔ صاحب کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

غالی کے مہینے میں وہ خالا نہیں رہتا　　در گور مرے پاس ذرا لا نہیں رہتا
کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت　　سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا

کھلا جنگل میں آکر حال ان چڑیوں کی چوں چوں کا　　ہر اک عاشق کو دیتی ہیں یہ پرُسا اپنے مجنوں کا

تم اگر دوگے نہ تن پیٹ کو روٹی کپڑا　　کیا خدا کے بھی نہیں گھر میں ٹھکانا میرا

بچی کے واسطے جو کھلونے منگائے ہیں　　گھر والا گھر کو کہتا ہے ننھا نہ ہو گیا

دلوایا شب برات میں مردوں کا فاتحہ　　لوٹے ڈگھڑے پہ بدہنی پہ مٹکے متھور پر

نہ دیکھ دولھا کو ساس نندوں کے آگے گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر　　نئی نویلی دلہن ہے ابھی ابھی تو دو چار دن حیا کر
نکاحی بیاہی کو چھوڑ بیٹھے متاعی رنڈی کو گھر میں ڈالا　　بنایا صاحب امام باڑہ خدا کی مسجد کو تم نے ڈھا کر
لگائی سوسن نے ایسی مسّی کہ جیسے بطخ نے کھائی کیچڑ　　کسی نے مارا ہے منہ پہ پتھر نہیں یہ آئی ہے بلن کھا کر
نصیب سیدھا اگر ہے میرا چکتی نکلے گی کھاٹ اسکی　　وہ سکھ نہ پائے گی جس نے بھیجا ہے اُلٹی پٹی تمھیں پڑھا کر

ہوں میں بڑھیا پہ جوانوں کے گلے کاٹتی ہوں   اب بھی یہ کند چھری ہے مرے دو چار سے تیز

ملا تھا ایک ہی لیلیٰ کو اے دوا مجنوں   ہزاروں اس سے تو وحشی ہمارے پھرتے ہیں

نہ جاؤ تم پڑو چولھے میں بھیجو میرے بھائی کو   لگے ہیں درد، مرتی ہوں بلا لائے وہ دائی کو

میں گری تو بھی گرا پانوں نہ تیرا ٹوٹا   تیرے دل کو تو کل آئی مرا بھینچا ٹوٹا
قندوالوں کے محلے میں گئی تھی مصری   کھا کے ٹھوکر جو گری پانوں کا گٹا ٹوٹا
اے گُل اندام یہ خوشبو جو چلی آتی ہے   شاید عطار کے کیوڑے کا قرابا ٹوٹا
کھا گئی بوٹ چرا کے تو یہاں تک مارا   سر پہ باندی کے مرے پانوں کا جوتا ٹوٹا
باغ کا میوہ لسے توڑ کے سب بھیج دیا   جان صاحب ہے بڑا اڑال کا آیا ٹوٹا

خدا نے پدمنی کو قوم میں ان کی کیا پیدا   بڑا ہر ایک سے رتبہ نہ کیوں سمجھیں چمار اپنا

چوری ہوئی پتا نہیں ملتا ہے مال کا   گھر گھر اجی کروں گی گلہ کوتوال کا
زیب النسا کی طرح میں کہتی ہوں وہ غزل   مردوں سے ہو جواب نہ میرے سوال کا
ہمسائی میرے سر کی قسم آئیو ضرور   کونڈا کروں گی جمعہ کو سید جلال کا

کیا ہوا چل دُور ہو تجھ سے موئے   بیاہ میرا اور ہی جا ہو گیا

جب سے سایہ جن کا ان کو ہو گیا   بی پری خانم کو سودا ہو گیا
خوب بھڑکایا تھا اس کو سوت نے   میں ہوئی جب گرم ٹھنڈا ہو گیا
مجھ سے موتی کھو گیا جوہر کا. جو   کل تھا جھوٹا آج سچا ہو گیا

بل بہت کرتا تھا نکلے کی طرح ایک ہی جھٹکے میں سیدھا ہو گیا
نوح کا طوفان ہیں آنکھیں مری جس جگہ میں رو دی دریا ہو گیا

گھوڑی حمایتی نے عراقی کے ماری لات سچ ہے مری زبان سے یہ ہاں نکل گیا
بے تے کی مولوی نے نضیلت کی لاگ سے دق ہو کے مدرسے سے الف خاں نکل گیا

نہ پھینکا ڈھیلا نہ کھنکارے چپ چلے آئے کسی کے گھر میں کوئی بے خطر نہیں آتا
لڑائی جھگڑا بکھیڑا کرے بلا میری رہیں وہ کسی کے گھر مجھ کو شتر نہیں آتا
خصم کا مال تو ہے یار کو کھلا رنڈی ہمیں تو لاکھ کا گھر خاک کر نہیں آتا

گرگٹ کی طرح کالا کبھی لال ہو گیا غصہ سے مردوے کا عجب حال ہو گیا
نوروزی جان پورے وہ دن اب کہاں رہے بچہ تو جنتے جنتے تجھے سال ہو گیا
کیچڑ میں کوڑی دیکھیں تو دانتوں سے لیں اٹھا اے اشرفی زمانہ بھی کنگال ہو گیا

آرزو بندی کی ہے خالق سے اک دن میری سوت کھائے پھل تلوار کا اور پھول سونگھے ڈھال کا
برفی خانم بھونک کر خالی نہ کر اپنا دماغ بے ادب لڑکا تھا کتا بن گیا سسرال کا

کوٹھے پہ چڑھ کے رنڈی کرتی ہے تو جو کنگھی میں پیچ خوب سمجھی یہ بھی ہے جال تیرا
کوئی تو آ پھنسے گا اتو موا نگوڑا ہے جعل ساز بجری ہر بال بال تیرا

تف اس بہادری پہ بنا مردوا ہے کیوں چھوڑا پڑاقہ میں نے ترا دل دہل گیا
کیں جس کے آگے باتوں میں مہرن نے گرمیاں پتھر کا دل بھی موم کی صورت پگھل گیا

مالن ہے نوبہار بنی موتیا کا پیڑ   ڈالوں سے ٹھنڈیوں کے بدن سارا پھل گیا
تصویر ان کی دیکھ کے آنسو نکل پڑا   بچہ ہی تھا کھلونے پہ آخر مچل گیا

کہتی ہوں دل میں جب سے مجھے تو نظر پڑا   خالق بچائے جان ہلا کو نظر پڑا
ہونی تھی عید ہم کو سمندر میں اس گھڑی   ٹھہرا جہاز جب کوئی ٹاپو نظر پڑا
جس مردوے کے پیچھے مرا گھر ہوا خراب   برسوں کے بعد پھر وہی الّو نظر پڑا

خصم دو جوروں کا اے بوا چوسر کا پانسہ ہے   بدی جس سے کرے گا سامنا ہوے گا ذلت کا
لگا میٹھا برس جب سے یہ صورت زہر لگتی ہے   کہیں مشاطہ کر پیغام اب مصری کی نسبت کا
بدل لی آنکھ طوطے کی طرح ٹیں ٹیں لگا کرنے   اُڑے دنیا سے جلدی نام ایسے بے مروّت کا
پڑھائی کیوں زلیخا مولوی صاحب یوسف کو   کیا خانہ خراب اس کو دکھائی کوچہ اُلفت کا

کلوارنی پہ مرتا ہے تف اس کی ریش پر   قاضی کے گھر میں کیوں نہ ہو چرچا شراب کا
اماں خدا کے گھر بھی جو ہوتا ہمارا دخل   پانی کے بدلے مینہ برستا شراب کا

اس کو اس باغ میں جینا ہی میں گڑوا دیتی   میرا شمشاد پہ قابو جو صنوبر چلتا
شوم بنیوں سے جلا ہوں ہے جو چوسر کھیلے   چال وہ مجھ سے ملکے گز کی نہ کیوں کر چلتا

پکا نہ تھا کچا تھا وہ جن اے پری خانم   کل سر پہ چڑھا آج نگوڑا اتر آیا

گئی تھی دیکھنے باجی میں سورج کنڈ کا میلہ   بچی ہوں پستی پستی مردودوں کا یہ ہوا ریلا
مجھے کیسی سمجھ کر گھورتا ہے دیکھو میلے میں   مہینوں لڑکا باجی میری گودی میں جو ہے کھیلا

جو سننا مرنا ہے فرہاد لوگو شیریں پر   وہ بیس کی گانٹھ تھا خسرو بھی زہر کھا جاتا
ہیں بات کرتی جو اپنوں میں تم سے اے صاحب   ذلیل ہوتی بندی تمہارا کیا جاتا

کس کے تم غم میں بن گئیں مُردہ   اُوئی درگور کیا یہ حال ہؤا
تو صنوبر سے دوستی کر کے   موئے شمشاد کیا نہال ہؤا

کھانا چرا کے خوب نہیں ماں سے پان کا   منہ کی کہیں کھلائے نہ چسکا زبان کا
بیڑا تو بی اٹھا خدا سرخرو کرے   سرسبز ہوں پتے جو لگے خاصدان کا

پیٹ سے اچھے نکالے تم نے پاؤں   ایک گھر سے دوسرا پیدا کیا

کیا اکلوڑی کیا بچوں کو مری بھابی نے   ان کو وہ کوسا اب تک نہیں بھیا بھولا

اے بُوا پتھر کا دل ہے اس موئے بے پیر کا   تھا نکھٹو گھر میں خالق کے مری تقدیر کا
کیا کیا ہے دھوپ میں باندی نے سر اپنا سفید   آج تک آیا نہ شیریں کو پکانا کھیر کا
اشرفی خانم کی چوری اے پری خانم کھلی   ہے بنایا توڑ کے توڑا مری زنجیر کا

پیسہ تھا پاس رہتے تھے ہر آن آشنا   یا دُور دُور کرتے ہیں اے جانِ آشنا

کرتا رہا وعدہ تو یونہی دھوکے دھڑی کا   مانوں گی میں اقرار نہ ایک گھڑی کا

دور بھی کروا ما ما کلو   کوسا ہوگا کوسا ہوگا
سوکھا ساکھا گورا گورا   کلو کا گھر والا ہوگا

بچی جو موئی میری داماد بہت ردیا   مرنے پہ کھلی الفت ناشاد بہت ردیا

ٹیسوں کا بال بال پہ اب نشانہ ہو گیا   کنگھی جو کی تو سوچ کے یہ شانہ ہو گیا
لیلیٰ سی تو نے پائی ہے کیا ٹوٹی کلموہی   مجنوں کی طرح مردوے دیوانہ ہو گیا

طے کیا عشق کا جھگڑا نہ کسی قاضی نے   اس عدالت میں مواکوئی نہ عادل آیا

کہدی مہتاب سے مہرن نے ملاقات کی بات
پیٹ کی ہلکی ہے اک دن نہ پچی رات کی بات

رات کو خواب میں لیلیٰ نے کہا بندی سے   تو نے پھر زندہ کیا نام مرا میرے بعد
سچ میں کہتی ہوں نبی بخش بڑا ہے داماد   رکھے عزت مری بچی کی خدا میرے بعد
کارخانہ میں خدا کے ہے کسے دخل ہوا   بچہ تم پہلے جنیں بیاہ ہوا میرے بعد

مرجاؤں تو نہ آئے وہ بندی گور پر   کیا ہوں گدھی میں جان دوں بہرام گور پر

جوہر ان کے کھلے ہیں بہوؤں پر   چھریاں تندیں ہیں اور کٹاری ساس
بولوں بڑھ کر تو ذبح کر ڈالے   ہے وہ جلاّد بی ہماری ساس

بد زبانی نہ کرو ان سے بڑھی بوڑھی ہیں
ساس سسروں سے دلہن جان ہے درکار لحاظ

ہر کسی سے نہ اُلجھ جانؔ بقول آتشؔ
بات بڑھ جاتی ہے کھو دیتی ہے تکرار لحاظ

نازنین

مولوی عبدالغفور نسّاخ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ یہ تخلص علی بیگ دہلوی کا تھا جو ذوق کے شاگرد تھے اور جان صاحب سے بہتر ریختی کہتے تھے۔ مگر تذکرہ صابر کا مصنف نازنین کو عورت قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اغلط ہمان ادا شناس کی نظر میں یہ تخلص ہے مرزا علی بیگ نام جوان خوش اسلوب رستم تواں بزور رم قوت سہراب طاقت کا۔ نازنینان کشور جمال اس کے حسن یوسفی پر اگر زلیخائی کا دم بھریں کچھ دور نہیں اور نازک نہالان گلشن حسن اس کے گل رخسار کی نازکی سے اگر آپ کو غنچۂ برگ ریز تصور کریں تو کیا عجب ہے۔ اس کے آگے زور آزمایان ورزش خانہ طاقت کا سر جھکتا ہے۔ اور اس کے نعرۂ مردانہ کے سامنے شیر صولتان بیشۂ شجاعت کا دم بند ہوتا ہے۔ اس حیلہ آفریں شعبدہ ایجاد کا ناز و انداز و غمزہ طرازی و عشوہ سازی گاہ عشاقِ بے قرار سے لطافت کے پردہ میں جان کا خواہاں ہوتا اور گاہ اغیار نامحرم کی بغل میں بے تکلف سوتا ہے وغیرہ بہرحال یہ صاحب ۱۲۷۱ھ تک دہلی میں زندہ موجود تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ لیکن اب دیوان ناپید ہے صرف تذکروں میں کلام ملتا ہے۔ استاد ذوق کے قطعۂ تاریخ کے لفظ لفظ سے محبت و عقیدت کا آبجیات ٹپکتا ہے ؎

نہیں نازنین رنج کرتی کسی کا   گیا جب سے یار اور حرمت ہے کھوئی
بلا سے رکھوں شاد دل کو تو اپنے   اگر میں نے کنبے کی عزت ڈبوئی
خصم جب موا لونڈیوں کو رلایا   کہ اس پردہ میں نام رکھے نہ کوئی
ولیکن مجھے کاملوں سے ہے الفت   غم ذوق میں رات بھر میں نہ سوئی

لکھی ان کی تاریخ اور یہ ہوا غم
میاں ذوق کو میں لوا آپ روئی

اسی رنگ میں ایک اور قطعہ دیکھیے ؎

نازنین اتنا بھی ہرجائی پنا   یہ تمہارے آگیا کیا دھیان میں
روز اک دگھڑے کی ہیں مہمانیاں   روز رہتی ہوں اسی سامان میں۔

ریختی میں عریانی زیادہ ہے۔ نمونہ یہ ہے ؎

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں ناکا   ہوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

میں اپنے سر کو دھوتی ہوں ہوا اور یہ تماشا ہے   موا بیٹھا ہے کیا خوش خوش کہ دن آیا تقاضا کا

کوئی بیٹھا ہو تجھے ہے کام اپنے کام سے   اے نگوڑے آدمی کیا تو تو حیواں ہو گیا

سونا کبھی شوہر کو میسر نہیں ہوتا   عورت انہیں باتوں سے ترا گھر نہیں ہوتا

اے زناخی مردوا ہے بدگماں   تو نہ کر باتیں ہمارے کان میں

دس گھر تو چھٹ چکے ہیں کہاں تک کروں خصم
کس جا بٹھائے دیکھئے اب آسماں مجھے

بیگم

تذکرہ چمن انداز اور ماہ درخشاں میں لکھا ہے کہ ان کا نام رشک محل تھا۔ پنجابن تھیں جو واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے متاع میں آئیں۔ اور پھر انتزاع سلطنت کے بعد بادشاہ کے ہمراہ کلکتے چلی گئیں۔ وہیں انتقال ہوا۔ ریختی کہتی تھیں۔ چند شعر جو تذکروں میں ملتے ہیں درج کئے جاتے ہیں ؎

نہ بھیجوں گی سسرال میں تم کو خانم   نہیں مجھ کو دو بھر ہے کھانا تمہارا

مری کنگھی چوٹی کی لیتی خبر ہو   یہ احسان ہے سر پہ دگانا تمہارا

ہوا بال بیکا جو مرزا ہمارا   تو پھر سنگ ہے اور شانا تمہارا

گھر سہ گانہ کے دگانا مری مہمان گئی
میں یہ انگاروں پہ لوٹی کہ مری جان گئی

تذکرہ خندۂ گل صـ ۱۲۹

عصمت

یہ تخلص امجد علی خاں کا تھا جو حسین علی خاں لکھنوی شاگرد محمد علی خاں مسیحا کے فرزند تھے اور ریختی نہایت عمدہ کہتے تھے۔ تذکرہ خندۂ گل صہ ۳۳۲ میں ان کے چند شعر ملے ہیں جو درج ذیل ہیں ؎

جو کم سنی میں دیکھ چکی منہ ہزار کے   بیٹھے گی کب بھروسے پہ وہ ایک یار کے
بی تم نے کیوں کنوارپنے میں چبائے پان   موتی سے دانت بن گئے دانے انار کے
نرگس کی چھوکری کا وہ دیدہ ہوائی ہے   کندن کو سار دے دیا گہنا اتار کے

نتیجہ اے بوا اچھا نہیں مردوں کی صحبت کا   کھلے گا نو مہینے بعد گل اس عیش و عشرت کا
نہ لیتی نام تک ہرگز نکھٹو کا کبھی ماما   مگر کچھ پاس ہے مجھ کو بڑے بوڑھوں کی عزّت کا
نگوڑے شیخ نے پھر آج افیوں لے کے کھائی ہے   میں ڈرتی ہوں بوا پھر سامنا ہوگا قیامت کا
تری خاطر میں گھر سے دن دہاڑے آتی ہوں ورنہ
کسی نے آج تک آنچل نہیں دیکھا ہے عصمت کا

محسن و عنقا

یہ دونوں تخلص خانپور کے محمد محسن خاں کے تھے جو ریختی گو تھے اور عرصہ تک لکھنؤ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ دیوان چھپ چکا ہے ۔ ان کے کلام میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی زبانوں کے لطف کے ساتھ سماج پر طنز، شوخی، شرارت، رمز، کنایہ سب کچھ موجود ہے ۔ فواحشات کم ہیں۔ خیالات انوکھے اور طرزِ بیان میں جدت ہے ۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

ہوتا بسم اللہ سے آغاز ہے دیوان کا   راز سربستہ ہے وہ باجی درِ قرآن کا
ابنِ مریم تھا ثنا خواں باعثِ قرآن کا   کیوں نہ ہو قرآن پر قربان دل انسان کا
پہلے نفرت تھی ہوا پھر اس سے الفت ہو گئی   ہو گیا یوسف بھی شیدائی زلیخا جان کا
چشمِ یکتائی سے دیکھو تم اگر بھی اسے   خالقِ اکبر ہے مطلب رام اور بھگوان کا
گلشنِ نعتِ نبیؐ میں بلبلِ دیوانہ دار
ہے ترانہ سنج محسنؔ اس گلِ یزداں کا

سراپا عصمت ہیں اور حیا ہیں، ہے شرم باجی شعار اپنا   وہ کبڑوانگا ہے مسخرا ہے بنائیں ہم نوج یار اپنا
ہے باد بندی کو بھی وہ لٹکا، پھر نگیا بھڑوا وہ بھٹکا بھٹکا   نہیں نگوڑے کا کچھ بھی کھٹکا، ہو کوئی دشمن ہزار اپنا
بگاڑوں گی میں بھی حال گھر کا، وہ ڈالیں مجھ پر وبال گھر کا   کھلائیں رنڈی کو مال گھر کا، نکالیں مجھ پر غبار اپنا
ہے آنے ڈولی کھلا ہوا بی، امام باڑہ کربلا بھی   نگوڑے لڑتے ہیں کیوں بوا جی حساب کر لیں کہار اپنا

پھر گیا طبلہ بجانے آج گوہر جان کا   کیسا ننگا ہے نگوڑا باپ چندر بھان کا
خاک گائے گا نگوڑا شیخ اپنی بزم میں   جانتا سُر ہی نہیں بھڑوا جو اپنی تان کا
کیوں نہ رنجیدہ ہو محسنؔ دو مہینے سے ہوا   خط نہیں لاہور سے آیا الٰہی جان کا

عجب بلا میں پھنسی ہوں گوئیاں میں اس نگوڑے سے دل لگا کر   یہ دونوں پھوٹیں جو رات سوئی ہوں میں پلک سے پلک لگا کر
کھلے ہیں ایام حیدری کے، پڑی سہے گھر میں وہ شیخ جی کے   جلائیں گے ہم چراغ گھی کے، ضرور مسجد میں آج جا کر
بلا کی شوخی زبان میں ہے، ستم کا جادو بیان میں ہے   وہ موہنی آن بان میں ہے کہ مار ڈالا لبھا لبھا کر

لگائے گیا کیا وزیر بیگم، نگاہ خونی کے تیر بیگم   بنایا دل کو اسیر بیگم، کمان ابرو چڑھا چڑھا کر
بگاڑتی کیوں ہے اپنا جوبن ہے چند روزہ ہوائے گلشن   نہ سرمہ مسی نہ پان ساتن، اری دیوانی خدا خدا کر
بہار گلشن عیاں ہے اس میں ادائے بلبل نہاں ہے اس میں   وہ عنقا بیگم نہاں ہے اس میں کہ مار ڈالا لبھا لبھا کر

کرے گا خاک موا آنکھ اور ناک کی شرم   نہ جس کی آنکھ میں مطلق ہو ماشما کا لحاظ

وہ اُلٹے الٹے سبق سُنائے کہ مار ڈالا جلا جلا کر   بگاڑا کسی نے ان کو باجی سکھا سکھا کر سکھا سکھا کر
بُوا یہ بیگم ہے لکھنؤ کی، بڑی ہے دھوم اس کی گفتگو کی   ذرا جو آنکھ اس سے دو بدو کی، تو اس نے مارا جلا جلا کر
سگھڑ سیانی تو ہو کے جانی، خراب کرتی ہے زندگانی   جوانی ہوتی تجھے دوانی، مگر نہ یوں شرم معجون کھا کر
کہاں سے لائیگا دم موا وہ، بڑا ہی دمباز ہے بُوا وہ   سراپا شگفتہ ہوا ہوا وہ، چمن نگوڑی اُڑا اُڑا کر
ہو رد برد کی کہ دو بدو کی، نگوڑی ہے بات آبرو کی   اُڑا کے دہلی میں لکھنؤ کی، بگاڑا کیا کیا بنا بنا کر
یہ ریختی ہے پری ہے یا گل، زبان ہے باجی کی مست بلبل   سرور میں ہے بہار سنبل، شمیم محسنؔ اُڑا اُڑا کر

حسین بھی ہیں جوان بھی ہیں، جبیں پہ شاہی نشان بھی ہیں   ادائیں بانکی ہیں آن بھی ہیں، میں واری ان کو نہ ٹال گوہر
سخن کی دلہن بہار پر ہے، بہارِ مضمون اُبھار پر ہے   کلام محسنؔ نکھار پر ہے غزل کی حسرت نکال گوہر

ناچنا رنڈیوں کے سامنے ننگا ہو کر   زیب دیتا نہیں مرشد کو یہ آقا ہو کر
جائے گا شیخ نگوڑا بوا سیدھا ہو کر   شوخیاں کرتا ہے مجھ سے بوا کٹا ہو کر
کر لی مغلانی کی بھی چھوکری رسوا ہو کر   باز آتا نہیں دولہا میرا بوڑھا ہو کر
جب سے کنجڑن کو کیا شیخ نے شیدا ہو کر   رہ گیا سوکھ کے اچور کا چھلکا ہو کر
کیا کہوں کو کلا بیگم کی کہانی گوئیاں   پڑ گئی زاغ کے بس میں موئی عنقا ہو کر

کچھ نہیں شاعرِ گستاخ سے امید وفا   لگتا محسن ہے مجھے زہر کی پڑیا ہوکر

پڑی نگوڑی چمار کے بس، کمہار کے بس، کہار کے بس   بجائے واحد ہزار کے بس، مگر نہ ہرجائی یار کے بس
نہ رُخ کی سرحد میں آپ جائیں، نہ مار کالوں کی آپ کھائیں   نہ دیدہ دانستہ آپ آئیں ہمارے گیسو کی مار کے بس
ہوا تھا گوہر سے پھر جھڑاکا، ہے خام یارا بڑی لڑاکا   کوئی نہ بندا ہُوا خدا کا، ہوا ایسی بے شرم نار کے بس
نہ آئی چمپا کلی نہ مالا ہے کب سے چمپت نگوڑی خالا   ہمارا زیور کھٹائی ڈالا، ہو نوج کوئی سُنار کے بس
فدا جو ہم اس سوار پر ہیں، تو خالہ وہ کب قرار پر ہیں   ذرا وہ پھولوں کے ہار پر ہیں، میں ریشِ انور کے خار کے بس

ہیں چلتے پرُزے کرنے میں ہر بات کا لحاظ   حرکات کی بھی فکر ہے سکنات کا لحاظ
مانا کہ پردہ والی سے کچھ بات ہی نہیں   کیوں بات بات پر ہے مسمات کا لحاظ
کرلو صفائی باجی کہ دولہا ہیں بے خطا   کرتے نہیں عدو کی روایات کا لحاظ
افسوس تو یہی ہے کہ عنقا ہوا نہیں   محسنؔ نگوڑے مارے کو کچھ بات کا لحاظ

بس اسی غم میں ہمارا کنج دل تاریک ہے   وہ نہیں بھڑوا جلانے کا سرمدفن چراغ
دولہا بھائی گر پڑیں، ٹھوکر لگے یا چوٹ آئے   کیوں نہیں رکھتی ہو دُلہن تم پس چلمن چراغ

دکھاؤ تن من گھڑی نہ موہن، گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
ہے چند روزہ یہ حسن و جوبن، گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
نہ رہ تو بیگم لوا کشیدی، جو رکھے رنڈی موا وہ شیدی
توتو بھی جا جا کے کھیل ساون، گھڑی میں کچھ ہے، گھڑی میں کچھ ہے
یہ میخ پردہ میں گاڑ باجی، کسی سے مت تو بگاڑ باجی
اڑے گا یا دفا سے چلمن، گھڑی میں کچھ ہے، گھڑی میں کچھ ہے

کھیل سمجھا ہے سفر بھڑوا عدم آباد کا
حوصلہ دیکھو تو گوئیاں اس دلِ ناشاد کا
کسی کے گھر سے لگا کر بھیجتے ہو پان تم
واہ کیا کہنا ہے مرزا آپ کی اس یاد کا
بات تو شیریں کی رکھ لی تھی ہزاروں میں بوا
گو بلا سے پھٹ گیا سر بھی میاں فرہاد کا
ہو نرے ڈھول خالی شیخ جی تم
خوب ہم نے بجا بجا دیکھا
دے گی وہی کبوتری انڈے میاں کے گھر
ہو جس لنڈوری کو کہیں آشیاں نصیب
آج داروغہ کی کل ڈپٹی کی
رہتی گوہر کو ہے بیگار بہت
جیتے جی شرم نہ محسن کو جب آئی گوئیاں
خاک آئے گی نگوڑی کو حیا میرے بعد
روٹی کپڑے کو بھی اب بیگم بوا محتاج ہے
آ گئی تھی چال میں ڈپٹی کلکٹر دیکھ کر
تربت پہ آ کے بھڑوے نے ماری جو ایک لات
سو سو قدم پہ جا پڑے تختے مزار کے
نہ مارو شیخ کو بے موت باجی
نگوڑا آپ ہی وہ مر رہا ہے
نہ نکلے گھر میں ڈولی کے بھی پیسے
بڑا نواب کا سالا بنا ہے
بناتا ہے موا دل سے کے باتیں
بڑا محسن نگوڑا مسخرا ہے

اکبر الہ آبادی

آپ طنز و ظرافت کی شاہراہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پورا نام سید اکبر حسین رضوی تھا۔ ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آباد کے مشہور قصبہ بارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرکاری سکولوں میں پائی اور انگریزی کی لیاقت اپنے شوق اور محنت سے حاصل کی ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے اور آہستہ آہستہ ترقی کرکے ۱۸۸۸ء میں جج کے عہدے پر پہنچ گئے۔ آخر حکومت سے خان بہادر کا خطاب حاصل کرکے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ بڑے خلیق اور منکسر المزاج تھے اور ظرافت ان کی سرشت میں شامل تھی اور اس کا اظہار بات بات میں ہوتا تھا۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انتقال فرمایا۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں اپنا کلام وحید میاں کو دکھایا کرتے تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ سمجھ کر کہ اب تغزل میں چمکنا مشکل ہے۔ اس جادہ سے ہٹ کر تفنن، سیاست اور تصوف کی راہ پر پڑ لیئے اور اس کے لئے مغربی تمدن کی بے راہ روی پر تنقید کا ایسا نیا میدان ڈھونڈا کہ اس کے موجد بھی ہوئے اور خاتم بھی۔ ۱۸۷۷ء میں جب منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے ہفتہ وار اودھ پنچ نکالا تو اس میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ نثر میں بھی نمونے چھوڑے۔ لیکن اقلیم شاعری میں تو یہ زمین ایسی اپنائی کہ شعبہ کا حقیقی دعویدار اب تک پیدا نہ ہوا بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا، ان کی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر ان کا نام پھیلا ہوا ہے، اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ قوم نے ان کو جانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں، ملک نے ان کو پہچانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں۔"

طنز و مزاح اکبر کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ مگر ان کی طنز مجبور انسان کی دل ٹھنڈا کرنے والی طعن و تشنیع نہیں بلکہ گفتار کی گرمی سے بجلی بن کر گرتی ہے۔ ظرافت بھی ان ہزالوں اور فحاشوں سے بالکل الگ ہے جن کے دیوانوں کا سرمایہ ان کی ہذیان سرائی اور مزخرفات ہیں۔ وہ دلوں کو خوش کرتے، چہروں پر تبسم لاتے مگر جذباتِ سفلی کو بھڑکانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ جوانی تک شوخی جوان رہی۔ عمر کا آفتاب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدرِ کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔ اب اس کی جگہ آفتابِ معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی، صبحِ پیری کے آثار نمودار ہوئے تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی۔ حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی۔ جمالِ حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشمِ بصیرت کو محوِ نظارہ بنایا۔ سوزِ عشق نے سینہ کو گرمایا۔ ذوقِ عرفان نے دل کو تڑپایا اور نورِ معرفت کی شعاعیں خود ان کے مطلعِ قلب سے اس چمک دمک کے ساتھ پھوٹیں کہ تماشائیوں کی آنکھیں قریب تھا کہ چکا چوند میں پڑ جائیں۔ یہی تو بات ہے کہ ان کی ظرافت نہ صرف ظرافت ہے بلکہ پند و نصائح اور قومی، مذہبی، تمدنی، معاشرتی زوال، رسوم، تاریخ، سیاست وغیرہ کا جلی اور مصفیٰ آئینہ ہے۔ ان کی چٹکیوں اور گدگدیوں سے دل کو ایک سچی خوشی اور روح کو صحیح فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اور آدمی اس سے اچھا اثر قبول کرتا ہے۔ حق باتوں کی تلخی اور پند و نصائح کے زہر کو خوش بیانی اور مزاح نے شہد و شکر کے شربت کی مانند ایسا خوش مزہ اور گوارا کر دیا ہے کہ اس سے کبھی سیری نہیں ہوتی حقیقت یہ ہے کہ اس طنز و ظرافت اور طعن و تشنیع سے اکبر نے اصلاحِ قوم کا جو کام کیا ہے وہ کسی دوسرے سے نہ ہو سکا۔

اکبر نے زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اپنے مخصوص رنگ میں نہایت لطیف ظریفانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ وہ خود مذہب کے پابند تھے۔ اس پر مشرقی وضع کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اس لئے آپ کے کلام میں وہی جذبہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ وہ ان تمام باتوں کے خلاف جنگ آزما رہے جن کا تعلق بدمذاقی، اندھا دھند تقلید، بے تمیزی اور تنگ نظری سے ہے وہ جہاں مغرب کی کورانہ تقلید کی مخالفت کرتے ہیں وہاں ان لوگوں کے بھی خلاف ہیں جو مذہب کی آڑ میں دنیا کو دھوکا دیتے ہیں۔ ان کے قطعات، رباعیات اور فردیات میں ظرافت کی وجہ سے انگریزی الفاظ کا کافی استعمال ہے۔

نئی اور انوکھی تشبیہات ہیں مخصوص محاورے۔ لفظی صنعتیں ہیں۔ قافیوں کی بہار ہے۔ پھر خاص خاص مطالب کو ادا کرنے کے لئے خاص خاص الفاظ اور علامتیں ہیں مثلاً مس، شیخ، سید، اونٹ، گائے، گرجا، کلیسا، مندر، بت، صنم، دیر، حرم، بتکدہ، کالج، صاحب، برہمن، لالہ، بدھو، جمن، کلو، ٹٹو، ریل انجن وغیرہ اور یہ عام چیزیں ادبی نقطۂ نظر سے اس لئے اہم ہیں کہ اکبرؔ نے انہیں بڑی قدرت، چابک دستی اور ہوشیاری سے مخصوص اصطلاحی حیثیت دے کر استعمال کیا ہے۔ ان میں ایک سلیقہ اور نفاست بھی ہے اور خوبی و لطافت بھی۔ سر سید کی تحریک، کانگرس، خلافت، گاندھی، علی برادران، یونیورسٹی کی تحریک، متوسط طبقے کی بدلتی ہوئی معاشرت، ہندی اردو کی کشمکش، مسجد و مندر کی آویزش، غرض اس دور کی کوئی تحریک اور کوئی تہذیبی مسئلہ ایسا نہیں جس کی دلکش اور غیر فانی تصویر اکبرؔ کے کلام میں موجود نہ ہو۔

سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے، لیکن جتنا کہہ جانے میں جری تھے اتنا ہی سنانے میں، چھاپنے میں، پھیلانے میں محتاط تھے۔ قدم اتنا پھونک پھونک کر رکھتے کہ مخلصوں اور نیاز مندوں تک کو حیرت کی ہنسی آجاتی اور جو اتنے معتقد و با ادب نہ تھے وہ تو جھنجھلاہٹ میں خدا جانے کیا کچھ کہہ سن ڈالتے۔ خیر ظرافت اس خاص غرض کے لئے یعنی ستر حال کے لئے اخفائے خیال کے لئے ان کے ہاتھ میں ایک اچھے لفافہ کا بڑے کار آمد آلہ کا کام دیتی تھی۔ جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے اسی پردہ میں سنا جاتے۔ کچھ اکیلی سیاسیات پر موقوف نہیں، رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عامی، انگریز و ہندوستانی، ہند و مسلم، سنی شیعہ، سب کی صحبت میں اور مسجد اور مندر، کالج اور سکول، خانقاہ و میکدہ، کاؤنسل اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، بازار اور دفتر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے، ایک ایک شے کا جائزہ غور سے لیتے رہتے۔ اسے جھانکتے، تاکتے، اس کو جانچتے اس کو بھانپتے ایک کو تولتے، دوسرے کو ٹٹولتے۔ لیکن ظرافت کے نقاب کے تار چہرے پر کچھ ایسے گہرے پڑے رہتے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ نگاہیں ہیں کس جانب، بے تکلف صحبتوں میں بارہا یہ کہہ بھی گزرتے۔ کہیں کہیں مطبوعہ کلام میں بھی اقرار کر گئے ہیں۔ ایک جگہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں۔

لغزشیں مدِّ ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر   دوستوں سے التجا ہے کریں اس کو معاف
سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں پر غبار   شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

”موسم“ کا اشارہ زیادہ تر سیاسی فضا کی جانب ہے اور ”ہواؤں“ سے مراد قانونی شکنجے اور سرکاری گرفتیں تھیں۔

ایک جگہ فرمانا یہ منظور تھا کہ سیاسی حقوق جو ہم روز بروز زیادہ حاصل کرتے جاتے ہیں انہیں اپنی ترقی کی علامتیں سمجھ کر ان پر خوش ہو رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حریف نے ہماری حرص و ہوس اور جاہ پرستی کا صحیح اندازہ کر کے ہمارے لئے ایک جال بچھا دیا ہے جس میں ہم اور زیادہ جکڑتے جاتے ہیں[1] اور محکومی و تنزل کے غار میں برابر دھنستے چلے جاتے ہیں اس کو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

---

[1] کلیات اوّل میں ارشاد ہوتا ہے ؎ تڑپو گے جتنا جال کے اندر   جال گھسے گا کھال کے اندر

ہا دن تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی کا　　لیکن ادھر تصوّر جاتا نہیں کسی کا
ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں　　ہر سو اچھل رہے ہیں اور چہچہا رہے ہیں
اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو　　اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

قبلہ رو جماعت،، سے کھلی ہوئی بات ہے کہ مراد مسلمان ہیں۔ کلامِ اکبر کا روئے سخن بیشتر اپنی ہی ملت کی جانب رہتا ہے۔ تعلیمِ اکبری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اصل الزام خود ہم پر ہے۔ ہم اگر حرص و ہوس کے بندے نہ ہوتے تو صیاد جال ڈالنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا کرتا؟
ہا دن اگر نہ ہو تو دستہ چلے کس چیز پر ؟

سرکارِ نامدار کے بعض "نیکنام" محکموں اور سررشتوں کی ذہانت، طباعی قوت خلاقی کے مشاہدہ سے یہ ظریف شاعر بھی دنگ رہ جاتا ہے اور محکمہ پولیس کی کارگذاریوں کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ شاعر غریب کو سیاسی مسائل سے کیا سروکار؟ اس کے اسلاف صدہا برس یار کی کمر کو تلاش کرتے آئے ہیں آج تک پتہ نہ لگا۔ خواجہ خضر کی رہنمائیاں، ہاتف کی دستگیریاں، سروش غیب کی مہربانیاں سب کی سب ناکام رہیں۔ شاعر کا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ اس ہستی معدوم کا اب سرکار کے خفیہ پولیس ہی مدد سے کیوں نہ پتہ چلایا جائے؟ فرماتے ہیں ؎ کیا پوچھتے ہو اکبرؔ شوریدہ سر کا حال۔ خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال ایسا اچھوتا اور نادر سرٹیفکیٹ خفیہ پولیس کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی کیوں ملا ہوگا۔ مگر ظرافت کا رنگ کچھ سیاسیات کیلئے مخصوص تھوڑے ہی تھا جب یہ ہولی کھیلنے پر آتے تو مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم ہر بزم کے بڑے بڑے نیں جناب سفید پوشوں کو اپنی پچکاریوں سے رنگ رنگ کر دیتے ؛؛ (مقالاتِ ماجد)

اکبرؔ کے یہاں ہر قسم کی ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ اوّل وہ ظرافت جو ہر زمانہ اور ہر دور میں قائم رہنے والی ہے۔ دوسری وہ جو ہنگامی واقعات اور زندگی کے تقاضوں سے متعلق ہے۔ تیسری وہ جو محض تفریحی ہے اور جس سے ہر طبقہ کے افراد محظوظ ہو سکتے ہیں ان کی شاعری میں اگرچہ بذلہ سنجی کا عنصر زیادہ ہے مگر اس کو زیادہ تر طنز یا مزاح کی تخلیق میں حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے بیشتر حصہ کلام کا وہ ہے جس میں اسلوب کی نسبت خیال اور مواد پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، رعایت لفظی، محاورہ بندی، ترکیب کی ندرت، قافیہ کی جدت، انگریزی الفاظ کی آمیزش اور دوسروں کے اشعار میں تحریف و تصرف سے طنز کا بھرپور وار کرنے میں خاصی مدد لی گئی ہے

علامہ یوسف علی کے خیال میں اکبر نے مغربی تہذیب کے خلاف پر زور الفاظ میں مشرق کی آواز تو بلند کی مذہب کے زوال پر دلی رنج کا اظہار بھی کیا۔ ریاکاری اور بے ہودگی کے خلاف اپنے جذبات منظرِ عام پر لانے کی کوشش بھی کی لیکن تمدنی ابتری کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔
حالانکہ اکبر سرکاری ملازمت کی جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان سے توقع رکھنا ہی عبث ہے کہ وہ کھل کر کوئی بات کہتے یا اصلاحی لائحہ عمل پیش کرتے پھر بھی انہوں نے طنز و مزاح کے پردے میں ان رجحانات کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا جو ان کی دانست میں قابلِ مذمت تھے اس طرح ان کی پوشیدہ طنز نے جس میں روح افزا گدگداہٹ پائی جاتی ہے مغربی تہذیب کے سیلاب کی تندی اور تیزی کو روک کر اس

میں دھیما پن پیدا کر دیا اور اپنی ادبی، تمدنی اور مذہبی روایات کو یکسر فنا ہونے سے بچا لیا۔

اکبر کی کلیات سے طنز و ظرافت کے چند نمونے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

مہدی سوڈانی کے جہاد کے بعد مصر کو انگریزوں کے پنجہ سے چھڑانے کی خاطر عرابی پاشا نے مصر میں جہاد کا اعلان کیا۔ ہندوستان کا سرحدوں پر بھی جہاد کے فتوے شائع ہوئے۔ یورپ کے سیاستدانوں نے جہاد کو ہوّا بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا وہ طبقہ جو سرکار پرست اور علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھا جہاد کے بارے میں عجیب و غریب توجیہات کرتا تھا۔ جن میں سے اکثر لغو ہوتی تھیں اکبر نے برقِ کلیہ والی نظم لکھ کر اس پر بڑی کامیاب طنز کی ہے۔

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے
دل کش آواز کہ سُن کر جسے بلبل چہکے
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جُھک جائیں
آتشِ حسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی
پہلوئے حسن بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق
بس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی
سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی
ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یا حفیظ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا
عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کہ میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں سامان اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانہ پہ نہیں ہے اثرِ آدمؑ و نوحؑ

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جاں باز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہرِ تیغِ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینہ رو پہ نثار

اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دووے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موجِ کوثر کی کہاں اب، ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ اور یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر　　مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں　　نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تجھ کو اک فرضی لطیفہ　　کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے　　کہ بیٹا تو اگر ایم اے کرے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے　　بلا دقّت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سُنائی　　کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت　　کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے　　ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی　　مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود　　نہیں منظور مغزِ سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفا مرا باحسرت و یاس　　۱۸۹۵ء

عدو کی شست سے بچتے نہیں ہیں　　یہ کالے ہیں مگر کوّے نہیں ہیں

اب تو پیس پیس کر لیا اور چل دیئے گودام کو　　جن سے مسجد گونجتی تھی وہ نمازی اب کہاں
اب ہے بی اے کی طلب تفسیر کا کس کو خیال　　فکرِ روزی ہو رہی ہے فخرِ رازی اب کہاں

رئیس لیڈروں پر طنز سے

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی سے　　محل میں لیٹ کر اب عشقِ قومی میں تڑپتے ہیں

نہ سرگرمی پولس کی ہے نہ جاری مارشل لا ہے   کوئی شورش نہیں ہے ہر طرح سے خیر سلّا ہے
یہ کلکتہ کی شوخی اور ڈھاکہ کی ادا سنجی   وہ اک فرشی کبڈی ہے یہ لفظی گیند بلا ہے

سیّد سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا   چرچا ہے جا بجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تقدیر کو خدا   دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الٰہ کا
ہے تجھ سے ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج   کچھ ڈر نہیں جنابِ رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر   بندہ بنا دیا ہے تجھے حبِّ جاہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج   راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا
افسوس ہے کہ آپ ہیں دنیا سے بے خبر   کیا جانئے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا
یورپ کا پیش آوے اگر آپ کو سفر   گزرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
وہ آب و تاب و شوکتِ ایوانِ خسروی   وہ حاکموں کی شان وہ جلوہ سپاہ کا
آوے نظر علومِ جدیدہ کی روشنی   جس سے خجل ہو نورِ رُخِ مہر و ماہ کا
دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی   کمسن مسوں سے ذکر ہو الفت کی چاہ کا
نوخیز و دلفریب گلُ اندام نازنین   عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رکھے اگر تو ہنس کے کہے بت حسین   ویل مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا
اس وقت قبلہ جھک کے کریں آپ کو سلام   پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا
پتلون و کوٹ و بنگلہ و بسکٹ کی دھن بندھے   سودا جناب کو بھی ہو ترکی کلاہ کا

عنبر یہ یوں تو بیٹھ کے گوشے میں اے جناب
سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

مسلمانوں نے خود ہی مقاماتِ مقدسہ فتح کر کے ترکی کو تباہ کیا پھر وفد لے کر ولایت پہنچے۔ اس پر اکبر نے یہ طنز کی ؎

بھائی کی ٹانگ توڑتے ہیں
غیروں کے ہاتھ جوڑتے ہیں

تعلیم کی خرابی کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ اس کا مضر اثر ذکور سے زیادہ اناث پر پڑتا ہے ؎

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے   خدمت میں ہیں وہ لیڈی اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر   شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

گئے برہمن کے پاس لے کر جو اپنے قضیے کو شیعہ سُنّی   بگڑ کے بولا کہ جاؤ بھاگو ملکش تم بھی ملکش وہ بھی
بڑھی جو تکرار تو وہ لے کر انہیں فرنگی کے پاس پہنچے   وہ بولا ہیں دُور ہو یہاں سے کہ تم بھی نیٹو ہو وہ بھی نیٹو
فلک نے آخر یہ سن کے سب کی کہا کہ تم سب ہو مستِ غفلت   سمجھ لو اس کو کہ تم بھی فانی ہو وہ بھی فانی ہے یہ بھی فانی

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی   اونٹ پہ چڑھ کے تھیئٹر کو چلے ہیں حضرت

شیخ کہتے ہیں کہ پیروں کی پرستش بھی ہے فرض   ماسٹر کہتے ہیں اللہ کو بھی یاد نہ کر

کہیں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہم نشیں   اس میں ہے اک بات آنر کی شفا ہو یا نہ ہو
مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو چھوڑ دے   گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو کہ نہ ہو

ممبری سے آپ پر تو وارنش ہو جائے گی   قوم کی حالت میں اس سے کچھ جلا ہو یا نہ ہو

مری تقریر کا اس مس پہ کچھ قابو نہیں چلتا   جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

پردے کا کیا ہے خود واڑنگا پیدا   خود ہم نے کیا ازار اور انگا پیدا

کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے   نیچر نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

کہا یہ فجر سے واعظ نے دیکھو سادگی میری   نہیں شوقِ نمائش کچھ پہنتا ہوں گزی گاڑھا
کہا اکبر نے میں بھی یونہی کر لیتا نمود اپنی   عطا کرتا خدا مجھ کو جو یہ تن توش یہ داڑھا

ایسا شوق نہ کرنا اکبرؔ   گورے کو نہ بنانا سالا
بھیّا رنگ یہی ہے اچھا   ہم بھی کالے یار بھی کالا

کرزن و کچنر کی حالت پر جو کل   وہ صنم تشریح کا طالب ہوا
کہہ دیا میں نے کہ ہے یہ صاف بات   دیکھ لو تم زن پہ نر غالب ہوا

پری کی زلف میں الجھا نہ ریشِ واعظ میں   دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا

پکا لیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جَو لانا   ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

سیّد کی طرف تو چندہ لانے کی ہے پخ   اور شیخ کے گھر میں پنجگانے کی ہے پخ
بہتر ہے یہی کہ بت پرستی کیجئے   گو اس میں بھی صبح کو نہانے کی ہے پخ

تہمد پہ ہے شبہہ و حقارت کی نظر   پتلون پہ غصّہ و شرارت کی نظر
بہتر ہے یہی کہ ننگے پھریے اکبرؔ   شاید پڑ جائے اُن کی رغبت کی نظر

جو سُن چکے مری غزلیں تو بولے لا چندہ   جو ہنہنایا ہے اتنا تو تھوڑی لید بھی کر

انہیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی   نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز   بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

آپ کی فرقت میں کل میں رات بھر سویا نہیں   لیکن اتنی بات تھی گاتا رہا رویا نہیں

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں   مگر اندھیرے اوجالے پہ چوکتا بھی نہیں

چپکوں دنیا سے کس طرح میں   عورت نے کہا کہ کوند ہوں میں
قومی چندے کدھر سمائیں   کالج نے کہا کہ توند ہوں میں

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں   جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبرؔ   تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

حالِ دنیا سے بےخبر ہیں آپ   گو تقدس مآب بےشک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے   چاہ زمزم کے آپ مینڈک ہیں
شیخ جی کو جو آگیا غصہ   لگے کہنے یہ پھینک کر دُھسا
ہے تمہاری نمود بس اتنی   جس طرح ہو پڑی پریڈ پہ لید

مذہب نے پکارا اے اکبرؔ اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں   یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

اکبرؔ مجھے شک نہیں تیری تیزی میں   اور تیرے بیان کی دل آویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بےخوف   لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ   گلے میں جو اتریں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر   اناالحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو   اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

اضا نہ ہوئی مجھ سے گندم پہ مے   یہ پوتے سے بھی اک خطا ہو گئی
یہ تھی قیمتِ رزق ٹوٹے جو دانت   عوض کوڑی کوڑی ادا ہو گئی

رہا کرتا مرغِ فہم ستا کی   نئی تہذیب کے انڈے ہیں خاکی
چھری سے اُن کی کرڑا کر فلک نے   خدا جانے ہماری ناک کیا کی

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے   کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

سوال اب یہ عبث ہے جب ہے پتلونوں کی ارزانی   چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

کچہریوں میں ہے پرسش گریجویٹوں کی   سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور میٹوں کی
نہیں ہے قدر تو بس علم دین و تقویٰ کی   خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

شیخ صاحب دیکھ کر اُس مِس کو ساکت ہو گئے   ماسٹر صاحب بہت کمزور تھے چت ہو گئے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا   آپ بی اے پاس ہیں تو بندہ بی بی پاس ہے

کہتے ہیں حرج کیا ہے جو باریک ہے وہ پل   بائیسکل پہ گزریں گے ہم پل صراط سے

ہے نورِ خدا ابھی طالب رزق کا دوست   داڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

کچھ شک نہیں کہ حضرت واعظ ہیں خوب شخص   یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں

اُردو کے تین رُبع کے مالک ہنود ہیں
پھر کیا سبب جو اُس سے انہیں انحراف ہیں
یعنی اُردو ہے چیز انہیں کے مذاق کی
اُردو کے تین جزو یہی صاف صاف ہیں

شاہدانِ مغربی کرتے نہیں مجھ کو قبول
ٹال دیتے ہیں یہ کہہ کر آپ کالا لوگ ہیں

واسطہ کم ہو گیا اسلام کے قانون سے
دب گئی آخر مسلمانی مری پتلون سے

اب کہاں تک بتکدے میں صرف ایمان کیجئے
تا کجا عشقِ بتاں سست بیماں کیجئے

ہے یہی بہتر علیگڑھ جا کے سید سے کہیں
ہم سے چندہ لیجئے ہم کو مسلماں کیجئے

ہمارے ملک میں ہوتا ہے کیا تعلیمِ نسواں سے
بجز اس کے کہ باوا اور بھی گھبرائیں اماں سے

ان کو کیا کام ہے مروت سے
اپنے رُخ سے یہ منہ نہ موڑیں گے

جان شاید فرشتے چھوڑ بھی دیں
ڈاکٹر فیس کو نہ چھوڑیں گے

اس اکھاڑے میں اڑنگے دیکھ کر قانون کے
شیخ نے تہمد سے ہجرت کی طرف پتلون کے

راہ تو مجھ کو بنا دی خضر نے
اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے

دھمکا کے بوسہ لوں گا رخِ رشکِ ماہ کا
چندہ وصول ہوتا ہے صاحب دباؤ سے

پردہ در کی رائے سُن کر بیبیاں کہنے لگیں
اب ہمارے وارث ایسے ہی نگوڑے رہ گئے

جو وقتِ ختنہ میں چیخا تو نائی نے کہا ہنس کر
مسلمانی میں طاقت خون ہی بہنے سے آتی ہے

عاشقی کا ہو بُرا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

پردہ کا مخالف جو سُنا بول اٹھیں بیگم
اللہ کی مار اس پہ علی گڑھ کے حوالے

قصۂ منصور سن کر بول اٹھی وہ شوخ مِس
کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا

نکالا شیخ کو مجلس سے اس نے یہ کہہ کر
یہ بے وقوف ہے مرنے کا ذکر کرتا ہے

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولویو
کس کو سونپیں تمہیں اللہ نگہبان رہے

میرے لئے شراب یہاں بھی ہے کیا حرام
اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انہیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

ختنہ قائم ہے مگر وہ مذہبی تعلیم گم
مہر ابراہیم باقی دین ابراہیم گم

میری گردن پہ ہیں شیطان کے احسان بہت
ترک لاحول پہ مجبور ہوا جاتا ہوں

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ
گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور
کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں

تہ دل سے ہم کوستے ہیں مگر
کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

کریما بہ بخشائے برحال بندہ
کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ

عمر گزری ہے اسی بزم کی طراری میں
دوسری پشت ہے چندہ کی طلبگاری میں

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی سے شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

گل پھینکے ہیں یورپ کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے نیچر و سائنس بھلا کچھ تو ادھر بھی

وہ تو گرجا پر رکا اور یہ گیا کعبہ کو پھاند — شیخ کا ٹٹو تو انجن سے بھی بڑھ کر تیز ہے

مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے — اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

کچھ الٰہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے — یہاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

کاش کر دے مجھے وہ شاہد ہوٹل منظور — کیک تو روز ہے اک رات متنجن بھی سہی

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے — لیکن شہید ہو گئے بیگم کی فوج سے

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی — یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

ڈنر سے تم کو کم فرصت یہاں فاقے سے کم خالی — چلو ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

رشتۂ در گردنم افگندہ بیٹ — می برد ہر جا کہ میزاست و پلیٹ

ہوا آج خارج جو میرا سوال — کہا میں نے صاحب سے با صد ملال

کہاں جاؤں اب میں ذرا یہ بتاؤ — وہ جھنجھلا کے بولے جہنم میں جاؤ

یہ سن کر بہت طبع غمگین ہوئی
مگر اس تصور سے تسکین ہوئی
کہ جب اہل یورپ میں بھی ذکر ہے
تو بیشک جہنم بھی ہے کوئی شے

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں ریشے کو کیا کریں
مذہب کے جھگڑے چھوڑیں تو پیشے کو کیا کریں

فرہاد سے کہا کہ مناسب ہے تجھ کو صبر
کہنے لگا بتائیے تیشے کو کیا کریں

شراب اڑتی ہے مجلس میں رواں ہے خون تقوے کا
مزا ہے اب تو رندوں کو نہ مفتی ہیں نہ قاضی ہیں

نام اللہ و رسول اب تو میں کم سنتا ہوں
پہلے رائج تھے یہ الفاظ مسلمانوں میں

یاد کرتا ہے گزشتہ با اثر لاحول کو
شیخ کو طعنے دیا کرتا ہے شیطان ان دنوں

مجال کیا کوئی کہہ دے خوشامدی مجھ کو
اسی سبب سے بہت سہل ہے جناب کی مدح

لاکھ رٹے کر رہے جانتے ہیں اللہ و رسول
دیر کا کورس برہمن نے مگر کم نہ کیا

اطبا کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا
خدا کا کام ہے لطف و کرم کرنا شفا دینا

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب اس کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب الٹ ہی دی اس نے یہ کہہ کے کر ہی لے گا مرا موا کیا

مولوی ہو ہی چکے تھے نذر کالج اس سے قبل
خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

چرخ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار میں
قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

پائپ کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہے آگ   اب بھاگنا ضرور ہوا غور کیا کریں

مفتی شرع نہ ہوں لیڈرِ اسلام تو ہیں   بوئے مسجد نہ سہی کیمپ کے گلفام تو ہیں

اس شرط پہ ہم سے فلک سے صلح آخر ہو گئی   قبریں مہیا وہ کرے تزئین ان کی ہم کریں

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں   ینگ بدھو وارثِ اسلام ہیں

میری نصیحتوں کو سن کر وہ شوخ بولا   نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں

جیسا موسم ہو مطابق اس کے میں دیوانہ ہوں   مارچ میں بلبل ہوں تو جولائی میں پروانہ ہوں

قاعدوں میں حسنِ معنی گم کرو   شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو

خوب لڑوایا بہم دل کھول کر   مار ڈالا راویوں نے قوم کو

جب کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر   ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

وہ دل کو محوِ کلیسا بنا کے چھوڑیں گے   اس اونٹ کو خرِ عیسیٰ بنا کے چھوڑیں گے

کریں گے شوق سے مسلم غذا میں مے داخل   شراب کو بھی ہریسا بنا کے چھوڑیں گے

کمیٹی میں چندا دیا کیجئے   ترقی کے ہجے کیا کیجئے

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے   صرف تعویذ اور گنڈا ہے

کیا ہے باقی جنابِ قبلہ میں   کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے ۔

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے

پیری میں بھی اکبرؔ کی ظرافت نہیں جاتی

تہذیب دم بجود ہے طمع کی گھسیٹ سے
حضرت بھی کام لینے لگے مار پیٹ سے

نجد کے نغمے کہاں ان ٹھمریوں کے سامنے
دیس کو جس نے بھلایا یہ وہی کھماچ ہے

سیٹھ جی کو فکر تھی ایک اک کے دس دس کیجئے
موت آ پہونچی کہ حضرت جان واپس کیجئے

اک ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جان
خدمتِ قومی میں بارے جاں نثاری ہو گئی

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی
لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

یہ مصرع قافیے ہی کے لئے ہے خوب اے اکبرؔ
جو اُجڑا لکھنؤ کچھ غم نہیں پیرس تو باقی ہے

ان کو بسکٹ کے لئے سوجی کی تھیلی مل گئی
کیمپ میں غل مچ گیا مجنوں کو لیلیٰ مل گئی

شکم سے حضرتِ انسان نجات پا نہ سکے
اب اپنے پیٹ میں ہیں پہلے ماں کے پیٹ میں تھے

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا کہوں
گفتنی درجِ گزٹ باقی ہے سب ناگفتنی

آنکھیں ساقی کی تھیں رسیلی
اب تک میں بچا تھا آج پی لی

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں
بیبیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
استاد اچھے ہوں مگر "استاد جی" نہ ہوں

آدم چھٹے بہشت سے گیہوں کے واسطے
مسجد سے ہم نکل گئے گیہوں کی چاٹ میں

وہ اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مرزا غریب چپ ہیں اُن کی کتاب ردی
بدھوا کڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں   کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

قوم پر ممبری کا فیر ہوا   کل جو اپنا تھا آج غیر ہوا
شیخ جی مر گئے کمیٹی میں   غل مچا خاتمہ بخیر ہوا

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو اُبھارا   اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز   جغرافیہ میں عرش کا نقشا نہیں ملا

خدا کی راہ میں اب ریل چل گئی اک دن   جو جان دینا ہو انجن سے کٹ مرو اک دن

وصل کا اُس بتِ خود بیں سے کوئی ہنٹ کہاں   صرف بوسہ میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں

رسماً تو ایک بوسہ ہے کافی دمِ وداع   لیکن مزا جو آئے تو دو تین کیوں نہ لیں

شیطان نے ترکیبِ تنزل یہ نکالی   ان لوگوں کو تم شوقِ ترقی کا دلا دو

کافی ہیں امیروں کو قوانین گورنمنٹ   مذہب کی ضرورت تو غریبوں کے لئے ہے

دل میں اب نورِ خدا کے دن گئے   ہڈیوں میں فاسفورس دیکھئے

دلیری سکھاتی ہیں ہم کو یہ کہہ کر   جہنم سے ڈرنا بڑی بزدلی ہے

برگد کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے
مغرب کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو تلوار نکالو

ضبطی پہ چھپی توحید ہوئی فیر یہ ہے
قل ھو اللہ احد ضبط نہیں خیر یہ ہے

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی
آسماں اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی

حج کو کیونکر جائیں کار خانگی کو چھوڑ کر
اتنی کثرت ہو جو چوہوں کی تو بلی کیا کرے

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پا گئے

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب
فیشن کے انتظامِ صفائی کو کیا کروں

بابو بھی نگل گئے اس عہد میں تو خیر
رہنا پڑا ہے نبیوں کو مچھلی کے پیٹ میں

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق یہ پایا
کہ وہ جامہ سے باہر ہے یہ پاجامہ سے باہر ہے

تعلیم اس کی اچھی جو گھر میں اپنے خوش ہو
مذہب اسی کا بہتر جس کو پولس نہ پکڑے

طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے
جو مارتے تھے مکھی اب مارتے ہیں چوہے

حرج کیا روپیہ جو کاغذ کا چلا
شکر کر روٹی تو گیہوں کی رہی

نبوت کا زمانہ اور تھا اب اور جھُرمٹ ہے
وہاں سینے میں قرآں تھا یہاں سینے میں بسکٹ ہے

شبلی

مولانا شبلی مئی ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ چونکہ حنفی عقیدہ کے پابند تھے اسی مناسبت سے ن کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی نے ان کا نام نعمانی رکھ دیا۔ انہوں نے اپنے دور کے تمام بڑے بڑے علما اور فضلا سے تعلیم حاصل کی جن ں مولانا فاروق چریاکوٹی مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور مولانا احمد علی محدث کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۹ سال کی عمر میں اپنے والد زرگوار کے ساتھ سفر حج کیا۔ واپسی پر ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۲ء تک اعظم گڑھ کے اطراف میں رہے جہاں وکالت کا امتحان دیا۔ ملازمت بھی کی اور تجارت زمینداری کا کام بھی کیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اپنے علمی و ادبی مشاغل کو برابر جاری رکھا۔ کافی عرصہ سر سید احمد خاں کی صحبت میں رہے علم و ادب شوق انہیں ہندوستان سے باہر لے گیا۔ چنانچہ الفاروق کی تصنیف کے سلسلے میں انہوں نے مصر، شام اور ترکی کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ ی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں جن میں شعر العجم، المامون، الغزالی، موازنۂ انیس و دبیر، علم الکلام اور سیرت النبی بڑی اہمیت کی مالک ہیں۔ جنوری ۸۹۱ء میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے انہیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ ۱۹۱۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا شبلی علم و فضل کے ساتھ اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی تھے، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وہ اگرچہ مولوی تھے۔ یکن خشک مُلّا نہ تھے۔ اپنے منصب اور بیش بہا کام کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ہمیشہ سنجیدہ، متین اور وضعدار رہتے تھے۔ لیکن ان کی سنجیدگی سی متقی کی سنجیدگی نہ تھی۔ وہ خود ہنس سکتے اور دوسروں کو ہنسا سکتے تھے، دوستوں سے بے تکلف تھے۔ ان میں رندانہ مذاق بھی تھا اور رأت رندانہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فطری شوخ طبعی اور شگفتہ مزاجی رنگ لائے بغیر نہ رہتی تھی۔ چنانچہ اس کی کچھ کچھ جھلکیاں ان کے مکاتیب ں مل جاتی ہیں۔ "شبلی کے خطوط میں قومی شعور کے گہرے سائے، ادبی دلچسپیاں، کتابوں پر تبصرے، کشمیر کی فضائیں، جذبات کی برانگیختگی، ورتوں کا حسن، موسیقی اور مصوری کیا نہیں ہے؟ خزاں ان کے ہاتھوں میں جا کر بہار بن جاتی ہے۔ ان کے خطوط میں پندار ہے، چشمکیں ہیں۔ طیف اشارے ہیں۔ کہیں پردے گرتے ہیں اور کہیں اُٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔" (تنقیدیں از ڈاکٹر خورشید الاسلام صہ ۲۳)

مولانا شبلی کا دور مشرق و مغرب کی آویزش، ایشیا اور یورپ کی ٹکر، قدیم و جدید کی جنگ، علماء اور انگریزی دانوں کی کشمکش سیاسی لفشار کی ابتدا اور سائنس و مذہب کے محاربات کا دور تھا اس فضا نے انہیں ایک خاص نقطۂ نظر سے سوچنے اور استدلالی و فکری عینک سے صداقت کو پرکھنے کی طرف راغب کیا۔ اس بنا پر ان میں خود اعتمادی اور وثوق کا رنگ پیدا ہوا اور دوسروں کی خامیوں پر مدلل نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں طنز و تعریض کا عنصر بھی اُبھر آیا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "شبلی ایک زبردست مناظر کی طرح مخالف کو بے دست یں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ہیجان خیز فقروں کے ذریعے مخاطبوں کے دماغ کو مسخر اور مرعوب کر لیتے ہیں اور بالآخر اچانک ایک ضرب کاری لگا کر پایۂ ول کر مخالف کو مغلوب بلکہ مفلوج کر دیتے ہیں اس مقصد کے لئے وہ اپنے کارگر ہتھیار طنز و تعریض سے کام لیتے ہیں۔" (بحث و نظر صہ ۱۵۵)

شبلی کی کامیاب طنز کے نثری نمونے دیکھنے ہوں تو "شبلی اور حالی کی معاصرانہ چشمک" والا مضمون ملاحظہ فرمایئے جو مہدی افادی نے

لکھا ہے اور افادات مہدی میں موجود ہے۔ نظموں میں وہ ایک خاص انداز سے مسائل حاضرہ پر طنز کرتے ہیں۔ ان کی یہ نظمیں زیادہ تر الہلال، زمیندار اور ہمدرد میں کشاف اور دوسرے ناموں سے شائع ہوئیں اور اپنی جذباتی اپیل اور طنزیہ کیفیت کے باعث بے حد پسند کی گئیں۔ شبلی نعمانی کی ان طنزیہ نظموں میں مزاح کے عناصر بے شک کچھ زیادہ نہیں ابھرے۔ تاہم تصویر کا دوسرا رُخ دکھانے کی سعی میں انہوں نے بالعموم کامیابی حاصل کی ہے یوں بھی صحافت کی دُنیا میں اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہنگامی واقعات پر طنز کرتے وقت ایک ایسا خاص انداز اختیار کیا جائے کہ بات ملک کے زیادہ سے زیادہ افراد پر اثر انداز ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر شاعر قادر الکلام ہے اور اس کے طنزیہ لہجے میں زہرناکی کے وہ عناصر موجود نہیں جو ردِ عمل کو تحریک دیں تو اس کے دل اور قلم سے نکلی ہوئی بات دور دور تک اثر کرے گی۔ شبلی نعمانی کی بہت سی طنزیہ نظمیں اس قبیل کی ہیں کہ اگرچہ کا موضوع ہنگامی واقعات کے سوا اور کچھ نہیں تاہم ان کے پس پشت خلوص کا ایک ایسا بحر بیکراں موجزن ہے کہ وقت گزر جانے کے باوجود ان کا اثر زندہ و تازہ ہے۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو نمونہ تو صحافتی مزاح کا پیش کرتی ہیں لیکن جن کے ڈانڈے ادبی مزاح سے بھی جا ملتے ہیں۔ (اردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۳۴۰)

شبلی کی چند زندہ رہنے والی نظمیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں وہ ندوۃ العلماء کے اختلافات کو "جنگ زرگری" مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو "درس گاہ دغا کا خال" مسلم لیگ کو بے کار اور بے عمل جماعت اور سینۂ ملک پر بھاری سل" مسلم لیگیوں کی حکام رسی اور خوشامدانہ حکمتِ عملی کو "تمہید سجدہ ہائے جبینِ نیاز" اور لیگ کے مطالبہ سوٹ اپیل حکومت کو غلامی کی منزل اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ کر ہدفِ طعن بناتے ہیں۔

مولویوں کا شغلِ تکفیر

اک مولوی صاحب سے کہا میں نے کہ کیا آپ — کچھ حالت یورپ سے خبردار نہیں ہیں
آمادۂ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں — ہر چند ابھی مائل اظہار نہیں ہیں
تقلید کے پھندوں سے ہوئے جاتے ہیں آزاد — وہ لوگ بھی جو داخل احرار نہیں ہیں
جو نام سے اسلام کے ہو جاتے ہیں برہم — ان میں بھی تعصب کے وہ آثار نہیں ہیں
افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا — یا ہیں تو بقول آپ کے دیندار نہیں ہیں
کیا آپ کے زمرہ میں کسی کو نہیں یہ درد — کیا آپ بھی اس کے لئے تیار نہیں ہیں؟
جھلا کے کہا یہ کہ کیا سوء ادب ہے — کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر
بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں

مولانا شبلی کانگریس کے حامی ہونے کی وجہ سے سرسید کے سیاسی مسلک کو پسند نہ کرتے تھے۔ مسلم لیگ چونکہ علی گڑھ والوں ہی کی وجہ سے عالم وجود میں آئی تھی۔ اس لئے وہ اس کے مخالف تھے۔ لیگ کے ابتدائی اجلاسوں میں چند قراردادیں منظور کی جاتی تھیں جن میں لجاجت اور التجاؤں کا زور ہوتا تھا اس واسطے اس کو چنداں اہمیت حاصل نہ تھی۔

پونا میں لیگ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ لیکن کوئی موزوں صدر دستیاب نہ ہوتا تھا۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد رائٹ آنریبل سید امیر علی کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ صدارت قبول کریں۔ لیکن عین وقت پر وہ بھی تشریف نہ لائے۔ مولانا شبلی کو طنز کا اچھا خاصا موقع ہاتھ آگیا اور انہوں نے ذیل کی نظم کہی ؎

اغماض چلتے وقت مروّت سے دُور تھا   اس وقت پاس آپ کا ہونا ضرور تھا
ہر چند لیگ کا نفسِ واپسیں ہے اب   اس ہستی دور روزہ پہ جس کو غرور تھا
وہ دن گئے کہ شانِ غلامی کیساتھ ہی   ہر بوالہوس خمارِ سیاست میں چور تھا
وہ دن گئے کہ بتکدہ کو کہتے تھے حرم   وہ دن گئے کہ خاک کو دعویٰ نور تھا
وہ دن گئے کہ شارعِ اوّل کا حرف حرف   ہم پایۂ کلامِ سخنگوئے طور تھا
وہ دن گئے کہ فتنۂ آخر زماں کے بعد   گویا کہ اب امامِ زماں کا ظہور تھا
اب معترف ہیں دیدہ ورانِ قدیم بھی   اس نقشِ سیمیا میں نظر کا قصور تھا
اس دستِ مرتعش میں نہ تھی قوتِ عمل   اک کاسۂ تہی یہ سرِ پُر غرور تھا
یہ لمعۂ سراب نہ تھا چشمۂ بقا   یہ تیرگی تھی جس کو سمجھتے تھے نور تھا
آئینِ بندگی میں تملّق کی شان تھی   اخلاق و صدق شائبۂ مکر و زور تھا
ان کی دکان کی وہ ہوا اب اکھڑ چلی   جن کے گھروں میں جنسِ وفا کا وفور تھا
اب یہ کھلا کہ واقفِ سر تھا اسی قدر   جو جس قدر مقامِ تقرّب سے دور تھا
ہر دم برادرانِ وطن کی برائیاں   ظاہر ہوا کہ فتنۂ اربابِ زور تھا
سب مٹ گیا سیاست سی سالہ کا طلسم   اک ٹھیس سی لگی تھی کہ شیشہ یہ چور تھا

لے دے کے رہ گیا تھا سہارا بس آپ کا   یہ جسمِ مُردہ منتظرِ نفخ صور تھا
امید تھی کہ اب کے بدل جائیں گے اصول   مٹ جائے گا نظام میں جو کچھ فتور تھا
ہوگی کچھ اب نظامِ حکومت پہ گفتگو   جس دن کا منتظر کہ ہر اک باشعور تھا
دیں گے برادرانِ وطن کو پیامِ صلح   آویزشِ عبث سے ہر اک دل نفور تھا
یہ کیا ہوا کہ آپ نے بھی بے رخی سی کی   کیا آپ کو بھی رازِ نہاں پہ عبور تھا
یا یہ سبب ہوا کہ پراگندہ تھا مزاج   از بسکہ "آستانہ" میں شورِ نشور تھا

ممکن ہے اور بھی ہوں کچھ اسباب ناگزیر
یہ سب سہی پہ آپ کو آنا ضرور تھا

اس نظم میں طنز اتنی شدید اور تیز ہے کہ ایک بار تو بڑے بڑے مخالف کے پاؤں بھی اکھڑ جاتے ہیں :

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم   جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن
میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے   کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن؟
کانگرس سے مجھ کو اظہارِ برأت کیوں نہیں   کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن۔
خیر میں تو شامتِ اعمال سے جو ہوں وہ ہوں   آپ تو فرمائیے کیوں آپ نے بدلا چلن
آپ نے شملہ میں جا کے کی تھی جو کچھ گفتگو   ماحصل اس کا فقط یہ تھا پس از تمہیدِ فن
سعیِ بازو سے ملیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق   اس میں کچھ حصہ ملے ہم کو بھی بہرِ پنجتنؑ
یعنی جا کر شیر جب جنگل سے کر لائے شکار   لومڑی پہنچے کہ کچھ مجھ کو بھی سرکارِ زمن

لیکن اب تو آپ کی بھی کھلتی جاتی ہے زبان   آپ بھی اب تو اڑاتے ہیں وہی طرزِ سخن
اب تو مسلم لیگ کو بھی خواب آتے ہیں نظر   اب تو ہے کچھ اور طرزِ نغمۂ مرغِ چمن

ملک پر اپنی حکومت چاہتے ہیں آپ بھی   تھا یہی تو منتہائے فکر یارانِ وطن
آپ نے بھی تو نصب العین رکھا ہے وہی   کانگرس کا ابتدا سے ہے جو موضوعِ سخن
آپ بھی تو جادہ (سید) سے اب ہیں منحرف   اب تو اوراقِ وفا پر آپ کے بھی ہے شکن
جب یہ حالت ہے تو پھر ہم پر ہے کیوں چشمِ عتاب
منکرے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن

خطاب بہ احرار

یہ جو لیڈر شکنی آپ نے کی خوب کیا   قوم اب طوقِ غلامی سے ہے بالکل آزاد
لوگ اب حلقۂ تقلید میں ہوں گے نہ اسیر   ٹوٹ جائے گا طلسمِ اثرِ استبداد
ہاں مگر ایک گزارش بھی ہے یہ قابل غور   یہ تو فرمائیے اس باب میں کیا ہے ارشاد
بتکدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا لیکن   شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھئے بنیاد
آبلہ قابلِ نشتر تھا یہ مانا لیکن   دیکھئے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد
آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمع ناجائز تھا   خیر جو کچھ تھا مگر جمع تو تھے کچھ آزاد
اب کوئی مرکزِ قومی ہے نہ توحیدِ خیال   نہ کوئی جادۂ مقصد ہے نہ کچھ توشہ و زاد
خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم   خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ ہو پھر آباد
ذرّے جس طرح سے ہو جاتے ہیں اڑ اڑ کے فنا   یوں ہی ہو جائیگی پھر قوم بھی آخر برباد
نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا   یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو پیش نہاد
بھاپ پُر زور ہے لیکن کوئی انجن بھی تو ہو
کام کیا آئے گا نشتر جو نہ ہو گا فصّاد

سرسید کی سیاسی روش پر چوٹ ؎

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات   روشِ سیّد مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریکِ سیاسی کے خلاف   ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

لیگ والوں سے کہا میں نے کہ باتیں کب تک؟   یہ تو کہئے کہ عمل کی بھی بِنا ڈالی ہے
ایک صاحب نے کہا آپ نہ گھبرائیں ابھی   "حال" بھی آئے گا اب تک تو یہ "قوالی" ہے

کثرتِ تعداد کے باوجود ہندوستانیوں کی بے دست و پائی پر دیکھئے۔ کس خوبصورتی سے چوٹ کی ہے کہ اس نظم کا ایک مصرع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ضرب المثل بن گیا ہے ؎

اک روز جرمنوں نے کہا از رہِ غرور   آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم   اُس پر یہ لطف ہے کہ وہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل   آئیں شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعویٔ غرور   دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے   تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

الہلال کے لب و لہجہ پر طنز کرتے ہوئے "جزر و مد" کے عنوان سے جو نظم مولانا نے لکھی تھی اس کے یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید   سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں؟
رہنماؤں کی یہ تحقیر یہ اندازِ کلام   اس میں کچھ شائبۂ رشک و حسد ہے کہ نہیں؛
اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر   اس میں کچھ قابلِ تسلیم و سند ہے کہ نہیں؛

نکتہ چینی کا یہ انداز یہ آئینِ سخن	بزمِ تہذیب میں مستوجبِ رد ہے کہ نہیں
جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیمایہ لوگ	کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں
شاعروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط	اس میں اُن پر بھی کہیں تو کوئی زد ہے کہ نہیں
پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری	اس دوراہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں
فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذرا دیکھ تو لوں
"جزر" جیسا تھا اسی زور کا "مد" ہے کہ نہیں

لائل مسلم ایسوسی ایشن

جنگِ بلقان کے زمانہ میں جبکہ ہر طرف طرابلس و ٹرکی کے مسلمان بھائیوں سے اظہارِ ہمدردی ہو رہا تھا اور مسلمانوں کی دشمن حکومتوں کے خلاف غیظ و غضب کا دریا موجزن تھا۔ بمبئی میں ایک لائل مسلم ایسوسی ایشن قائم کی گئی جو انگریزوں کی وفاداری کا راگ الاپتی تھی۔ اس انجمن کے ارکان و شرکاء کی تعداد تو ۲½ تھی۔ لیکن انگریزی اخبارات ٹائمز، پاینر، انگلشمین وغیرہ اس کی کارروائیوں، تحریکوں اور تجویزوں کو بڑی آب و تاب سے نمک مرچ لگا کر شائع کرتے تھے۔ حسنِ اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا شبلی بمبئی تشریف لے گئے اور اس ایسوسی ایشن کا چرچا سُن کر ذیل کی نظم لکھی جو سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور عوام کے قہقہہ نے لائل مسلم ایسوسی ایشن کا خاتمہ کر دیا ؎

ایک دن تھا کہ وفاداریِ مسلم کی متاع	ہر جگہ عام تھی اور نرخ میں ارزانی بھی
یک بیک ہو گئی ہنگامۂ بلقان میں گم	قوم کو سخت مصیبت تھی پریشانی بھی
ہاتھ لگنے کا تو کیا ذکر پتہ تک نہ ملا	ڈھونڈنے والوں نے گو خاک بہت چھانی بھی
ہو مبارک تجھے اے بمبئی اے شانِ دکن	کہ ترے تاج میں ہے طرّۂ سلطانی بھی
تیرے بازار میں وہ یوسفِ گم گشتہ ملا	جس کا مشتاق تھا خود یوسفِ کنعانی بھی
یہ الگ بات ہے اوروں کو وہ آئے نہ نظر
گو اسی زمرہ میں ہے شبلی نعمانی بھی

انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں سڑک سیدھی کرتے ہوئے کانپور کی ایک مسجد کا کچھ حصہ مسمار کر دیا تھا جس پر بڑا ہنگامہ ہوا گولی چلی اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ مولانا نے اس موقعہ پر کئی پر جوش نظمیں لکھیں جو ضبط ہو گئیں۔ شہید ہونے والوں میں چند معصوم بچے بھی تھے جن کے متعلق حکومت کے کارندے عجیب عجیب توجیہیں کرتے تھے۔ مولانا نے اس پر تعریض کرتے ہوئے جو نظم لکھی اس کا یہ شعر آج تک لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہے ؎

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں   یہ بچے ہیں انہیں تو جلد سو جانے کی عادت ہے

حکومت نے اس آگ کو دبانے کے لئے بعض علماء سے اپنے حق میں فتوے حاصل کئے جنہوں نے کہا کہ جو حصہ گرایا گیا ہے وہ وضو خانہ ہے۔ اسے مسجد کہنا غلطی ہے۔ علماء کے اس اختلاف پر مولانا نے تجزیہ و تعریہ کے عنوان سے اس طرح چوٹ کی ؎

ہمیں جس چیز نے کھویا وہ تفریق و تجزی تھی   یہی وہ شے ہے جو بربادیِ مسلم کے درپے ہے
مگر اب تو درو دیوار تک اس کا اثر پہنچا   وضو خانہ الگ اک چیز ہے مسجد الگ شے ہے

مولانا بعض اوقات خوش طبعی کا ثبوت بھی دیتے تھے چنانچہ ۱۹۰۷ء میں وہ کسی کام سے الہ آباد گئے اس وقت ان کی ٹانگ اپنی ہی بندوق سے زخمی ہو چکی تھی۔ اکبرؔ الہ آبادی نے انہیں کھانے کی دعوت دیتے ہوئے اپنے خاص رنگ میں لکھا ؎

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی   بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف فرماؤ آج کی رات   کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر ہو جو کچھ دال دلیا   سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

مولانا نے معذرت کرتے ہوئے جواب میں یہ دلچسپ پیرایہ اختیار کیا ؎

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال   لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں   حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا   اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ   جیتے جی مردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

مولانا حالی

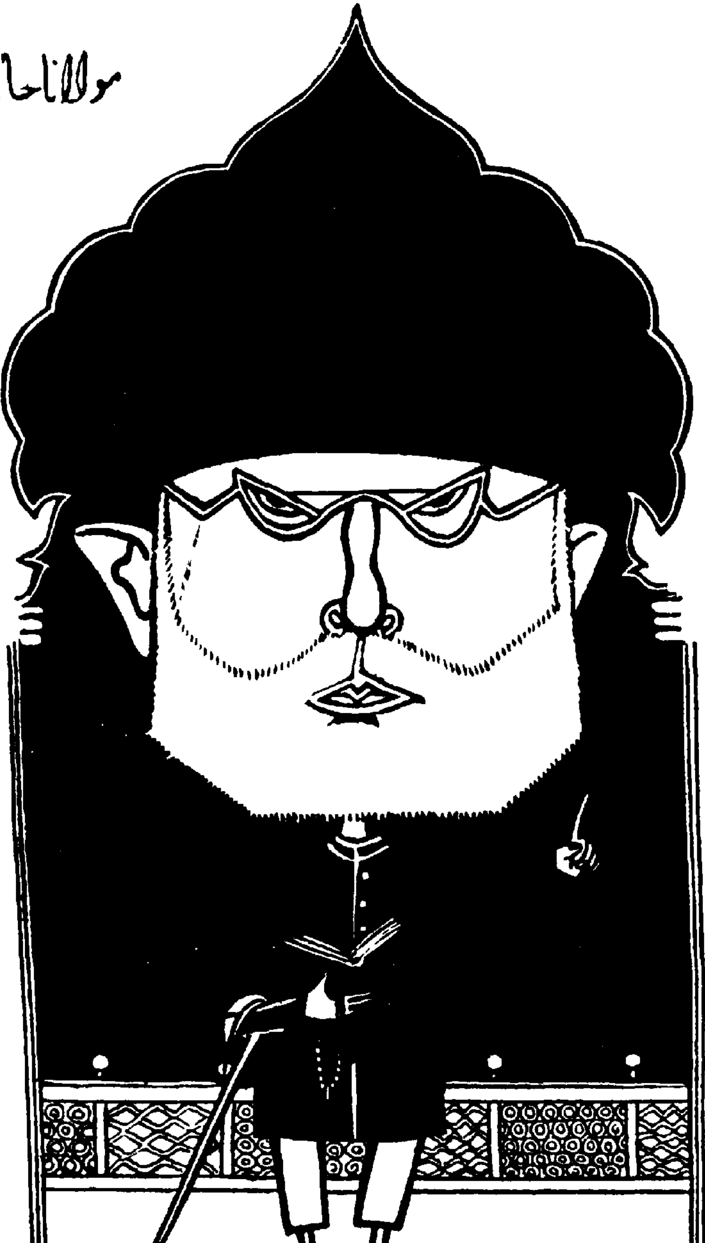

بعض غزلوں کے یہ شعر بھی دیکھئے جن میں کسی قدر شوخی ہے۔

خوب وقت آئے نکیرین جزا دے گا خدا لحد تیرہ میں کیا عالم تنہائی تھا
ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی یوں تو ظاہر میں مقدس تھا یہ شیدائی تھا
تیس دن کے لئے ترک مے و ساقی کر لوں واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کر لوں
پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال ورنہ حاسد تیری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں
اے نکیرین قیامت ہی پہ رکھو پرسش میں ذرا عمر گذشتہ کی تلافی کر لوں
دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے وگرنہ شبلیؔ خوب گزرے فلک دوں سے جو یاری کر لوں

اہل ثروت سے یہ کہہ دو کہ مبارک ہو تمہیں للہ الحمد ابھی ملک میں ہیں رائے فروش

احرار کا طریق عمل ہے اگر یہی پھر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے

اسی قسم کے اشعار کی بنا پر جو مولانا نے ایک خاص وقت، مخصوص سیاست اور موضوع پر لکھے ان کو طنز نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کا اصل میدان یہ نہیں تھا۔ اس رنگ کو بعد میں مولانا ظفر علی خاں نے زیادہ گہرا کیا۔

حالی

مولانا الطاف حسین حالیؔ انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے اور خواجہ ایزد بخش کے فرزند تھے۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع تھا کہ نو سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ علم و ادب کا شوق فطری تھا۔ ۱۸۵۴ء میں گھر بار چھوڑ کر دہلی چلے گئے اور مولانا نوازش علی سے تعلیم حاصل کی۔ غدر کے ہنگامے کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس آئے۔ شاعری میں اگرچہ غالب کے شاگرد تھے مگر انہیں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کی مصاحبت میں رہنے کا اچھا موقع ملا جس سے ان کے علمی و ادبی ذوق کو اور بھی جلا ہوئی۔ ملازمت کے سلسلہ میں دلیؔ کے علاوہ لاہور میں بھی رہے مگر یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے ؂

رہے لاہور میں اکبر سو جانے یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

آخر ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو اس دنیا سے رحلت فرمائی اور پانی پت میں درگاہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے احاطہ میں جگہ پائی۔

حالی مصنف بھی تھے، نقاد بھی اور شاعر بھی۔ انہوں نے سرسید کی فرمائش پر مسدس حالی (مد و جزر اسلام) لکھی جو ان کی مایۂ ناز تصنیف ہے۔ حیات سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید کے علاوہ ان کے مقدمۂ شعر و شاعری کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا کی طبیعت میں سادگی، خلوص اور شرافت تھی۔ وہ بڑے پاکباز اور نیک دل انسان تھے۔ ان کی ہر بات میں یہی نیکی، خلوص اور دھیما پن ملتا ہے۔

حالی کا کلام بظاہر قہقہوں سے خالی ہے۔ غدر ان کے لئے ایک ایسا نفسیاتی سانحہ تھا جس نے ان کی سادہ زندگی کو خوشی سے محروم کر دیا۔ ان کے لبوں پر کبھی کبھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جاتی ہے۔ لیکن اس مسکراہٹ میں صرف افسردگی ہی نہیں ملتی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ پر طنز کر رہے ہیں یا اندرونی خلش اور دل کی ٹیس ہے جو مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام "حالی کے کارنامے خونِ چمن ہیں لیکن ان میں چمن کی رنگینی اور خون کی گرمی نام کو نہیں۔" (تنقیدیں صـ۲۱)

اس کے باوجود "طنز و ظرافت" میں انہوں نے کمال دکھایا ہے۔ مگر ظرافت کو بھونڈے پن، ہزل یا فواحشات کی حد تک نہیں جانے دیا۔ بلکہ بدیہہ گوئی اور بذلہ سنجی تک محدود رکھا، حکیمانہ ظرافت کی تصویر کھینچ کر دکھا دی اور اس متانت کی وہ صورت بنا دی جس پر سے ہزاروں شوخیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ جہاں تک غور کیا جائے مزاح اور خوش دلی کے پیکرِ مجسم کی بے تعداد تصویریں نظر کے سامنے پھر جاتی ہیں ظرافت سے حقیقی مقصود ظرافت حاصل ہوتا ہے۔ بعض جگہ عبرت کو اس انداز سے ظرافت کا ہمدوش کیا ہے کہ دیکھنے والا اتنا متاثر ہوتا ہے کہ اس کے آنسو بھی ساتھ ہی نکل آتے ہیں۔

وہ لوگ کثرت سے ملیں گے جن کے یہاں صرف الفاظ کے رنگ و روغن سے ظرافت کے مجسمے چمکائے جاتے ہیں اور ان کے ماحصل سے سخت غفلت کی جاتی ہے۔ مولانا حالی کے یہاں وہ قالب بے جان اور مجسمہ بے روح نہیں ہیں۔ ان کی ظرافت کو گدگدیاں کہئے یا چٹکیاں، دل و دماغ اس سے مسرور ہو جاتا ہے اور روح کیف نشاط سے مخمور۔ مگر ظاہری متانت کبھی جانے نہیں پاتی۔" (خندۂ گل صـ۱۹۲-۱۹۱)

نمونے ملاحظہ فرمائیے ؎

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر حیف طبع رنگین تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھلانے والی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

کھینچئے وصلِ صنم کی کبھی فرضی تصویر   کیجئے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل   قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

مولانا کے طنز کی بہترین مثال "کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان" والی نظم ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دو ملازم۔ ایک کالا اور گورا دوسرا   دوسرا پیدل۔ مگر پہلا سوار راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں   کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونو خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت   کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی   آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی   چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونو پیش و پس   ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آ کے دونو کی سنی جب سرگزشت   تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھ، تھی جس میں تصدیقِ مرض   اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے   کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند   کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار

ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

اور دیکھئے ؎

کہتے ہیں ایک امیر زادے کو   تھا خدنگ افگنی کا شوق کہیں

خصلتیں جو امیر زادوں میں   لازمی ہیں وہ اس میں بھی سب تھیں

واہ وا سنتے سنتے یاروں کی　　ہو گیا تھا ہنر کا اپنے یقیں
الغرض ایک روز صحرا میں　　جبکہ تھے ساتھ سب جلیس و قریں
مشق تیر افگنی میں تھا مصروف　　کر رہے تھے خوشامدی تحسیں
آ کے دیکھا جو اک ظریف نے حال　　وجہِ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں
جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا　　تیر آماجگہ کے کوئی قریں
کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی　　رکھ کے بالائے طاق سب تمکیں
خاک تودہ پہ ہو کے جا بیٹھا　　لوگ کرتے رہے چنان و چنیں
ناوک انداز بولا چلّا کر　　کوئی تجھ کو جنوں ہے اے مسکیں
عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا　　جبکہ جائے گریز ہو نہ کہیں
زد سے ان بے پناہ تیروں کی　　کہیں جان وار کو اماں نہیں
مجھ کو ہر پھیر کے شش جہت میں حضور　　امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

سیّد احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ　　کس لئے سیّد سے صاف اے حضرت والا نہیں
آپ بھی نام خدا ہیں تارکِ صوم و صلوٰۃ　　اور سلوک اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں
چشم بد دور آپ کا بھی جبکہ ہے مشرب وسیع　　پھر یہ سیّد پر تبرّا آپ کو زیبا نہیں
سن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے　　بات یہ ہے سن لو صاحب تم سے کچھ پروا نہیں
رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں　　بلکہ ساری کوفت اس کی ہے کہ میں ویسا نہیں

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال　　انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اس کی جب یہی دیکھی گئی روش　　پوچھا کسی نے اس سے کہ اسکا سبب ہے کیا

بولا کہ عادت اس لئے کی ہے یہ اختیار چھٹ جائے تاکہ مجھ سے یہ لپکا سوال کا
پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار منت سے عجز سے کبھی ملتا نہیں ٹکا

ایک مسرف نے یہ ممسک سے کہا کب تک اے ناداں یہ حبِ مال و زر
تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر
ہنس کے ممسک نے کہا اے سادہ لوح زر لٹانا رائیگاں اور اس قدر
آج ہی گویا نصیبِ دشمناں آپ کا دنیا سے ہے عزمِ سفر

فقیہہِ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف تو دی چراغ سے اُس کو بہ آب و تاب مثال
کہا فتیلہ، اقرار باللساں ہے ضرور جہاں ہو آتشِ تصدیق و روغنِ اعمال
کہا کسی نے کہ نکلا ہے ان دنوں اک تیل نہیں ضرور فتیلہ کا جس میں استعمال

ہارون نے کہا مصر لگا ہاتھ جب اُس کے فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا
وہ خطہ ملعون تھا یہی جس کی بدولت تھا دل میں خدائی کا خیال اُس کے سمایا
میں بھی اسے اک باغی طاغی کے علی الرغم اک بندۂ بے قدر کو بخشوں گا خدایا
کہتے ہیں خضیب ایک غلام حبشی تھا جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
کی سلطنت مصر کی باگ اس کے حوالے نا اہل کے پنجہ میں اہالی کو پھنسایا
باڑی[1] گئی بہ ایک برس نیل کی رَو میں یہ حادثہ آ اس کو کسانوں نے سنایا
فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اُون ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اٹھایا

---

[1] کپاس کا کھیت

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ اکثر   مردوں کی حکومت میں ہے ملکوں کی حکومت
لیکن بخلاف اس کے ہے عورت کا جہاں راج   واں ملک ہے سرسبز اور آباد رعیت
فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاں داد   قبضہ میں ہے واں عورت کے دولت امکنت
اور سر پہ ہے عورت کے جہاں افسر شاہی   سمجھو کہ ہے اس ملک میں مردوں کی حکومت

غیبت کرنے والوں کی ہجو مولانا ایک رباعی میں اس طرح فرماتے ہیں ؎

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں   بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں   خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمّت میں

فضول اور بے مقصد شاعری کو مولانا "تپ دق" اور خلافِ تہذیب شعر کہنے والوں کو "جہنمی" سمجھتے تھے۔ ایسے ہزل گو شعرا کی نسبت ان کا فتویٰ ہے ؎

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے   عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے   مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

زمانے میں جتنے قلی اور نفر ہیں   کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور ہیں
گویّے امیروں کی نورِ نظر ہیں   ڈفالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں
مگر اس تپ دق میں جو مبتلا ہیں
خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر   عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر   ملک جس سے شرماتے ہیں آسمان پر

ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے ہدف نظر علم انشا ہمارا

حالیؔ جیسے ثقہ عالم جب بزم رنداں میں قدم رکھتے ہیں تو اپنے جبہ و دستار کو ایک گوشہ میں رکھ کر شیخ واعظ اور محتسب پر اس طرح طنز کے تیر برساتے ہیں —

مان لیجئے شیخ جو دعویٰ کرے — اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا
لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ — اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا
دیجئے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے — صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت
واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے — یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت
واعظو دین کا خدا حافظ — انبیا کے ہو تم اگر وارث
شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز — سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث
آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم — تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث
بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی — ان دنوں کم تر ہے کچھ ہم پر لتاڑ
شیخ اللہ رے تیری عیّاری — کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز
رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی — بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

اثنائے وعظ میں ہے تکیہ کلام واعظ
قدرِ قلیل ہے سب مال و منال دنیا
گویا کہ حرص اس کی اس سے کبھی نہیں ہے
ہے جس قدر فراہم پاس اس کے مالِ دنیا

اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر   سیّد احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

افسوس اہلِ دیں بھی مانند اہلِ دنیا   خودکام و خودنما ہیں خودبیں ہیں اور خودآرا
امت کو پھاڑ ڈالا کافر بنا بنا کر   اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمہارا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجئے گا

واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم   کوئی جواب شافی پر اس سے بن نہ آیا

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں   پر آیا جب امتحان کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہئے اب کیا ہے صلاح   فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہاں

جب تک کہ نہ ہو دشمن اخواں پکّا   ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکّا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے   سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکّا

پوچھا جو کل انجام ترقیِ بشر   یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہے گا کوئی انساں میں عیب   ہو جائیں گے پھل پھلا کے سب عیب ہنر

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم   سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت   یا ہے کوئی مولوی وزیرِ اعظم

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ   کافر کہا واعظ نے انہیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت   لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں　　سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہوگا مرقد میں سوال　　تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد　　یہ گر ناصح کو بتلانا پڑے گا
واعظ آتا ہے تو آنے دو اسے　　پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا
آئے گا اور ہم کو شرمائے گا مفت　　اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا
عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم　　ہم پہ منہ آئے گا منہ کی کھائے گا

واعظو! ہے ان کو شرمانا گناہ　　جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ
چھیڑ کر . واعظ کو حالی خلد سے　　بسترا کیوں اپنا پھکواتے ہیں آپ

خبر بھی ہے تمہیں کیا بن رہی ہے بیڑے پر　　ہیں آپ جولنے بیڑے کے ناخدا اے شیخ

وعظ میں گل کترتے ہیں واعظ　　منہ میں ان کے زبان ہے یا مقراض

کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن　　سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ

زاہدو! ہم تو تھے ہی آلودہ
تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف

ریاض خیر آبادی

سید ریاض احمد نام، ریاض تخلص تھا۔ ان کے اجداد کرمان شاہ (ایران) کے رہنے والے تھے۔ غوریوں کے حملے کے وقت اس خاندان کے بعض افراد شاہی ملازمت میں منسلک ہو کر ہندوستان آئے اور سیتاپور، بارہ بنکی اور خیر آباد وغیرہ علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ریاض ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں بمقام خیر آباد پیدا ہوئے لیکن ان کے بچپن اور جوانی کا زمانہ گورکھپور میں گزرا جہاں ان کے والد سیّد طفیل احمد سرکاری ملازم تھے۔ ریاض کے مشہور شعر ہیں۔

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے　　بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور آتا ہے

ریاض اب کیا کریں اس شہر سے ہم نقصد جانے کا　　نصیبوں میں لکھا ہے خاکِ گورکھپور ہو جانا

ریاض مدرسہ عربیہ کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر شاعری میں پہلے اسیر کے اور اس کے بعد امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔ زندگی کی ابتدا پولیس کی ملازمت سے کی، لیکن جلد ہی ملازمت ترک کر کے اخبار نویسی شروع کر دی۔ سب سے پہلے ۱۸۷۲ء میں "لمع رخشاں" کے تاریخی نام سے ایک مطبع قائم کر کے "ریاض الاخبار" اپنے وطن خیر آباد سے جاری کیا اس کے بعد وہیں سے روزانہ "تار برقی" نکالا ۱۸۷۹ء میں خیر آباد ہی سے شعر و سخن کا ایک ماہنامہ "گلکدہ ریاض" جاری کیا لیکن ۱۸۸۱ء میں ریاض الاخبار کو مستقل طور پر گورکھپور میں منتقل کر لیا۔ ۱۸۸۳ء میں "فتنہ" اور "عطر فتنہ" ۱۸۸۵ء میں روزانہ صبح کل اور پھر گلچیں جاری کیا۔

ان اخباری ذمہ داریوں کے ساتھ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۱ء میں ریاض نے رینالڈس کے دو ناولوں لوز آف دی حرم اور مس ایلن پرسی کا ترجمہ (انگریزی نہ جاننے کے باوجود) "حرم سرا" اور "نظارہ" کے نام سے کیا۔ ایک ناول کا سلسلہ "تصویر" کے عنوان سے "ریاض الاخبار" میں شروع کیا مگر وہ مکمل نہ ہو سکا۔ ناول نا شاد بھی ان کی یادگار ہے۔

ریاض نے ۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء (۱۷ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ) کو ۸۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ وہ ایک نغز گفتار شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے نثار، خطیبِ سحر کار، رندِ وضعدار، مسلم دیندار اور وطن کے سچے پرستار بھی تھے۔ ان کی طبعِ رواں کسی بات کی پابند نہ تھی۔ وہ تغزل کے بادشاہ، خمریات کے امام، اقلیمِ نازک خیالی کے شہر یار، بلند پایہ طنز نگار اور ثقہ مزاح نویس بھی تھے۔ ان کی میٹھی میٹھی چٹکیاں، دلآویز چٹکلے، دل میں پیوست ہو جانے والے طنز و تعریض کے تیر، انوکھی اور پھڑکتی ہوئی اصطلاحیں، بولتے ہوئے محاورے، کشتِ زعفران بنا دینے والے جملے اور شوخ اشعار ہر قسم کے حلقوں میں دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔

"انشا پردازی کے سلسلے میں ریاض کے دو معرکے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا معرکہ اودھ پنچ اور اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین سے ہوا۔ اودھ پنچ سے جو لوگ واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس اخبار سے ٹکر لینا کیا معنی رکھتا تھا۔ اس کے طنز اور ظرافت کا جواب دینے

کے لئے سجاد حسین کی سی ذہانت، شوخی اور برجستگی درکار تھی۔ ریاض کے قلم نے اس سلسلے میں بڑی بڑی جولانیاں دکھائیں۔

دوسرا معرکہ میرٹھ کے مشہور اخبار طوطیٔ ہند اور اس کے ایڈیٹر سے رہا اور معرکہ اودھ پنچ کی طرح اس مرتبہ بھی میدان ریاض کے ہاتھ رہا ان معرکوں ہی کی بدولت ریاض کی انشا پردازی کی شہرت ہوئی۔ اس دوران میں انہوں نے نہ کبھی ذاتیات کو بیچ میں آنے دیا اور نہ کبھی عامیانہ زبان و بیان کو دخل دیا۔ اخبار ہفتہ وار تھا۔ لیکن ریاض کی تحریروں میں ایسا لطف تھا کہ پڑھنے والے اس کیلئے بیتاب رہتے تھے (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری صـ ۶۲۱ - ۲)

عقیل احمد جعفری نے ریاض کے مختلف مضامین جمع کر کے "نثرِ ریاض" کے نام سے شائع کئے ہیں۔

میر اور مصحفی کے رنگِ تغزل کی پیروی کرتے ہوئے ریاض نے خود غزل میں ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس میں خمریات، شوخی معاملہ بندی، جذبات نگاری اور نفسیاتی تحلیل و تجزیہ، معرفت و حقیقت، شانِ استغنا اور طنز و ظرافت وغیرہ عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ شوخی اور خمریات تو ان کے دو ایسے محبوب موضوع ہیں کہ انہی دو محوروں پر ان کی بیشتر شاعری گردش کرتی ہے مولوی سبحان خاں عظیم گورکھپوری لکھتے ہیں۔

"منشی ریاض احمد سر سے پاؤں تک اس قدر شوخ تھے کہ متین بننا چاہتے تھے مگر بن نہیں سکتے تھے۔ میں نے اردو کے پچاس شاعروں کا کلام اول سے آخر تک دیکھا ہے جس میں ان کا ابتدائی، متوسط اور آخری دور سب شامل ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے یہ ابتدائی کلام ہے۔ اب متانت آرہی ہے۔ اب متانت آگئی۔ لیکن ریاض کی شوخی کا قدرت کی طرف سے ایسا پختہ رنگ تھا جو کبھی پھیکا نہ پڑا۔"

ان کا دیوان "ریاضِ رضواں" کے نام سے اور اشعار کا انتخاب "میخانۂ ریاض" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دیوان کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۴۸۰ صفحات ہیں اور اشعار کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار چھ سو پچاس کے قریب ہے۔ دوسرا حصہ مختلف اصنافِ سخن کا مجموعہ ہے۔ یہ ۲۱۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

ریاض کے یہاں قدامت کے ساتھ وہ انبساط، وہ شوخی، وہ شگفتگی، وہ دلکشی اور رندانہ مضامین کی افراط ہے کہ بعض نقادوں نے خمریاتِ ریاض کو مطائباتِ ریاض کا نام دیا ہے۔ ان کے دیوان میں کم و بیش ۱۳۶۶ شعر شراب کے موضوع پر ہیں۔ جن لوگوں نے ریاض کو دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ "وہ یکسر بہار تھے۔ بذلہ سنجی ان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ان کا کلام حد درجہ دلنشیں اور شوخ ہے ان کی ساری کائناتِ فکر، جوش و سرمستی میں رچی ہوئی ہے۔ شیخ اور زاہد پر جو طنز انہوں نے کئے ہیں وہ ایسے دلنشیں اور پر کیف ہیں کہ شاید اس کی داد خود محتسب بھی دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے اسلوب بیان میں شوخی ہے۔ شوخی میں ملکات اور محاکات میں مینا بدوش زاہد و محتسب کی نورانی صورتیں چلتی پھرتی اور رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ صحنِ میخانہ کا جو نقشہ وہ پیش کرتے ہیں اس کو پڑھ کر انسان ایسی فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں فردوس کی ہوائیں، کوثر و تسنیم کی روانی، ساغر و مینا کی کھنکیں اور طوبیٰ کا ترنم ساری کائنات پر چھایا ہوا ملتا ہے۔ اس فضا میں جب وہ واعظ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

ارے واعظ کہاں کا لامکاں عرشِ بریں کیسا
چڑھی ہوتی جو کچھ تو ہم خدا جانے کہاں ہوتے

تو بڑے سے بڑا ساغر شکن بھی سوچنے لگتا ہے کہ ذرا چڑھا کر آزمائش تو کروں کہ کہاں پہنچتے ہیں (علی گڑھ میگزین طنز و مزاح نمبر صـ ۷۶)

مگر حقیقت یہ ہے کہ ریاض کی رندی و سرمستی صرف ان کی شاعری تک ہی محدود تھی۔ خود انہوں نے زندگی بھر شراب کا ایک قطرہ تک

نہیں چکھا تھا۔ وہ روزہ اور نماز کے پابند بڑے سچے مسلمان تھے۔ ان کی پارسائی ایسی تھی جیسے جنت میں رہ کر کوئی شے طہور سے دستکش رہے ؎

توبہ کے پاس نے روکا لب کوثر مجھ کو آج پینے کو طبیعت مری چاہی کیسی

اپنی تصویر انہوں نے اشعار میں کھینچی ہے ؎

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں
کچھ عجیب طرح کے ہیں رند ریاضؔ آپ پیتے نہیں پلاتے ہیں

رندانہ مزاجی کی وجہ سے ریاضؔ واعظ کی پگڑی اچھالتے اور اس پر طنز سے مسکراتے ہیں کہ وہ کم نظر اور کوتاہ بیں مجاز کے طلسم سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں نہیں آنا چاہتا بلکہ ظاہر پرست، ریاکار اور ابلہ فریب ہے ؎

توبہ کے گھر میں روز رہی مہماں شراب

ان کی شستہ ظرافت، لطیف اور سبک شوخ نگاری کے چند نمونے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے ؎

دستِ شفقت اس طرح اک رند نے پھیرا ریاضؔ بیٹھ کر یادِ خدا میں جھومنا جاتا رہا
یاں وہ لے دے ہوئی آکر کہ الٰہی توبہ ہم سمجھتے تھے کہ محشر میں تماشا ہوگا
یہ دن ہے حشر کا ہو کر رہے گا وہ جو ہونا ہے ارے جھوٹے کچھ اب قول و قسم سے ہو نہیں سکتا
چھپ کے راتوں کو کہیں آپ نہ آئے نہ گئے بے سبب نام ہوا آپ کا روشن کیسا
مے چھین کر کسی سے جو پیتے تو تھی خطا جب دام دے کے پی تو گنہ کیا کسی کا تھا
یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا
جن چن کے آج شیخ نے انگور کھا لیے اب کیا رہا ہے تاک کا حاصل نکل گیا

پنچی داڑھی نے آبرو رکھ لی
قرض پی آئے اک دکان سے آج

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

حنا لگا کے پہنچتے ہیں گلرخوں میں ریاضؔ
کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

یہ اُلجھے ہیں رندوں سے کیوں شیخ صاحب
بڑھاپے میں کیوں داڑھی رنگوا رہے ہیں

شب کو میخانے میں کیوں پہنچے تھے اے حضرتِ شیخ
کہئے اچھی تو کٹی قبلۂ حاجات کی رات

اک ٹیپ ماری زور سے زاہد کے اے ریاضؔ
اب ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

بوتل کا کاگ زور میں توبہ کو لے اڑا
ہم گل چلوں کے ہاتھ کی گولی رکی نہیں

شیخ صاحب کیا چھپا کر لے چلے رومال میں
کچھ نہ کچھ حصہ رہے یاروں کا بھی اس مال میں

مے ریاضؔ آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سفید
ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں

اُٹھاؤ میز سے مے و ساغر ریاضؔ جلد
آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

ریاضؔ آئے تو لوگوں نے میکدہ میں کہا
کہاں یہ آج بزرگ فرشتہ خو آئے

اہل حرم میں جا کے بنا آج شیخِ وقت
کافر ریاضؔ پیرِ کلیسا کہیں جسے

آئے میخانے میں جب مسجدِ جامع سے ریاضؔ
ساتھ ہی آپ کے قبلہ سے گھٹا بھی آئی

سر بزم واعظ سے دبنا پڑا
وہ خم سے سوا تھا تن و توش میں

واعظ انگور میں ہے دخترِ رز رو بہ نقاب
آنکھیں پھوٹیں جو اُدھر تاک لگائے کوئی

ہمارا عیب کھلتا ہے نہ کھلتی ہے چھپی بوتل　　ہمارے کام کیا کیا جامۂ احرام آتا ہے

وہ آ رہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ　　بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ ملے

منہ زیرِ تاک کھولا واعظ بہت ہی چوکا　　بیلوں نے داڑھی پکڑی خوشوں نے منہ میں تھوکا

کاتبِ اعمال نکلے کام کے　　مل گئے دو دو شریکِ الزام کے

اتر گئی سرِ بازار شیخ کی پگڑی　　گرہ میں دام نہ ہوں گے ادھار پی ہو گی

شیخ جی گر گئے تھے حوض میں میخانے کے　　ڈوب کر چشمۂ کوثر کے کنارے نکلے

بانس پر میکدہ میں تجھ کو چڑھایا اے شیخ　　پھر بھی اُونچے تری مسجد کے منارے نکلے

یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہے　　ہجومِ حشر میں لے آئے ہیں پلا کے مجھے

چھیڑ کر مجمعِ زہاد کو ڈرتا ہوں ریاضؔ　　کہنہ مسجد کے عوض ہو نہ مرمت میری

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی　　میکدے سے اب پرانی جائے گی

اُتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا　　طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا

ناصح کا منہ ہو بند چکھا دو شرابِ خلد　　ساقی ذرا ریاضؔ کی بوتل اٹھا تو لا

سُن کے یہ قبلے سے ابر اٹھے تو پینا ہے ثواب
لٹ رہا تھا میکدے میں ہم نے بھی لوٹا ثواب

آگے کچھ بڑھ کر ملے گی مسجدِ جامع ریاضؔ
اک ذرا مڑ جائیے گا میکدے کے در سے آپ

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہدِ شب زندہ دار کا

یہ مئے تلخ ترے منہ سے لگی ہے کہ نہیں
سچ بتا دے ارے زاہد کبھی پی ہے کہ نہیں

کیا ادھر ہو کے بہا ہے کوئی دریائے شراب
جھومتی قبلے سے کیا مست گھٹائیں آئیں

اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے میں ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

آئیں گے جب فرشتے تو منہ کھلے گا اس کا
بوتل کوئی چھپا کر رکھ دے مرے کفن میں

شیخ یہ کہتا گیا پیتا گیا
ہے بہت ہی بدمزہ اچھی نہیں

بڑے موقع سے تھی ہر چند وہ جنت سے باہر تھی
حرم سے ہٹ کے رستے میں ملی مے کی دکاں مجھ کو

جھومتی قبلے سے آئی تھی ستم ڈھانے کو
وہ گھٹا جھک کے اڑا لے گئی میخانے کو

درِ توبہ نہیں جو بند بھی ہو
کھلا ہر وقت میخانے کا در ہے

کیسا پینا کہاں کی توبہ !
اب میں ہوں خدا ہے بیخودی ہے

شرماؤ ریاضؔ میکشی سے
لمبی ڈاڑھی ہے ہاتھ بھر کی

شیخ جی میکدہ وہ جنت ہے
تم بھی جا کر جوان ہو جاتے

شورِ واعظ کم نہیں ہوتا ہے تو للکار دے
اک ذرا او قلقلِ مینا بلند آواز سے

یہ میکدہ یہ بھیڑ یہ انبوہ یہ ہجوم   ہم تو نکل کے کھوئے گئے خانقاہ سے

شریک مے میں کیا ہوگا آبِ زمزم بھی   ریاضؔ نے لیں توبہ کبھی جو پی ہو گی
ہجوم دیکھ کے سمجھے یہ روزِ محشر ہم   کھلی دکان کسی مے فروش کی ہو گی

خدمتِ میخانہ کرلے ورنہ شیخ   رائگاں یہ زندگانی جائے گی
پینے آئیں تو فرشتہ خود ریاضؔ   حور کے دامن میں چھانی جائیگی

شراب خانے میں ہے رنگ میکشوں کا وہی   نہ خانقاہ نہ وہ اہلِ خانقاہ رہے

توبہ کرکے آج پھر پی لی ریاضؔ   کیا کیا کمبخت تو نے کیا کیا

کیا کیا خوشامدیں ہیں کہ پی لوں بہار میں
بادل کے ٹکڑے سر پہ مرے چھائے جاتے ہیں

کہتی ہے اے ریاضؔ درازی یہ ریش کی   ٹٹی کی آڑ میں ہے مزا کچھ شکار کا

گاندھی بھی اپنے کام میں آندھی سے کم نہیں   کم ہوں تو کام دیں یہ نسیمِ بہار کا

بوتل چرا کے لاتے تھے ہم میکدہ سے روز   موقع ملا تو رات کو خم بار سر بنا

ہزاروں عیب چھپاتی ہے میری ریش سفید   چرائے کوئی خم مے مجھے بتا دینا

خم سے نہ ہوں وہ سیر میں چلو میں سیر ہوں   یہ ظرف شیخ کا ہے یہ مجھ خاکسار کا

ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی
وہ سر پر لیے حوضِ کوثر نہ نکلے

وہ کالی کالی بوتلیں جو ہیں شراب کی — راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی

بن کے مہماں ایک رندِ روزہ دار آنے کو ہے
شام ہونے کو ہے میرے گھر ادبار آنے کو ہے

میکدے میں عید مجھ مفلس کی ہو جائے ریاضؔ
دے کے اک چلو کوئی لے تیس روزوں کا ثواب

اس شیخ کہن سال کی اللہ ری بزرگی — جنت میں بھی یہ جا کے جواں ہو نہیں سکتا

اے پیر مغاں دخترِ رز عمر رسیدہ — بوڑھا ہوں ملے نورِ نظر چرخِ کہن کی

کالی گوری کوئی نہ چھوڑی — افیون کھا کر پی لی ۔ توبہ

کس شوق سے شریکِ جماعت ہوئے تھے ہم — دیکھا سلام پھیر کے تو شیخ جی نہیں

سر ہے ترا بجائے سبو جھوٹ کیوں کہوں — واعظ حرام چیز کبھی میں نے پی نہیں

سایۂ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے — آج شیشے میں اسے ہم نے اتارا کیسا

قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید — مے فروشوں کا ہے واعظ سے تقاضا کیسا

کم بخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا — واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

اچھوتے جام ہیں منت کے کچھ الگ رکھے — کسے پلائیں کوئی پارسا نہیں ملتا

محفلِ وعظ میں بیٹھا سرِ منبر واعظ
لا کے خم کوئی بٹھا دے نہ سرِ خم مجھ کو

شیخ صاحب سوئے میخانہ ریاضؔ آتے ہیں آج
فرشِ راہ میکدہ دستار رہنے دیجئے

جلوۂ ساقی دمے جان لئے لیتے ہیں
شیخ جی ضبط کریں ہم تو پئے لیتے ہیں

نہ لوں راہ میخانہ کس طرح زاہد
یہ بادل جو سر پہ مرے چھا رہے ہیں

کعبہ میں نظر آئے جو صبح اذاں دیتے
میخانہ میں راتوں کو ان کا بھی گزر دیکھا

گھٹا اٹھتے ہی بوچھاریں یہ ہم پر
ارے واعظ کہاں تک ہم پئے جائیں

ہم رند سمجھتے ہیں اسے انجمنِ وعظ
جس بزم میں ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

میخانہ میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر
مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

جام چھلکانے لگے بھر کر مے کوثر سے آپ
حضرت واعظ بہت اونچے گئے منبر سے آپ

اپنی بڑی بڑی اور کھڑی مونچھوں کے بارے میں جو کبھی بل کھاتی ہوئی، کبھی تنی ہوئی ایک فٹ کئی انچ کی تھیں خود فرماتے ہیں ؎

چوٹیاں جتنی تھیں چھوٹی ہو گئیں
میری مونچھیں ان کی چوٹی ہو گئیں

وضع رندانہ رہے ریش رہے صاف ریاضؔ
خوف کی چیز ہے اس وقت مسلمان ہونا

اقبالؔ

جانے کتنے سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی رہی پھر کہیں جاکر ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ اقبالؔ پیدا ہوئے۔ ایک کامیاب تعلیمی زندگی گزارنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں بغرضِ تعلیم انگلستان روانہ ہوئے۔ وہاں مشہور مستشرقین پروفیسر براؤن، نکلسن وغیرہ سے استفادہ کیا۔ جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر انگلستان آکر بیرسٹری کی سند لی۔ ۱۹۲۳ء میں ان کو نائٹ ہڈ یعنی سر کا خطاب ملا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

اقبالؔ ایک وسیع النظر شاعر تھے۔ انہوں نے فلسفۂ مشرق و مغرب دونوں کا عمیق مطالعہ کیا۔ وہ فارسی ادب کے بھی عالم تھے۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نئی ڈگر سے آشنا کیا۔ ان کی شاعری میں ایک آفاقی پیغام ہے۔ انہوں نے غور و فکر کی نئی راہوں کی نشاندہی کی ہے۔ اقبال کا نکتہ رجائی اور زندگی سے بھرپور ان کی تصانیف زبان زدِ عام اور مقبولِ خواص و عوام ہیں۔

اقبال بنیادی طور پر حکیم و فلسفی ہیں اگرچہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ یہ درست ہے کہ اقبالؔ نے طنز و ظرافت کو ایک مستقل موضوع یا فن کی حیثیت سے نہیں اپنایا لیکن ان کا کلام طنز و ظرافت سے خالی بھی نہیں، انہوں نے سماج کی بے بصری اور مسائلِ حیات کی طرف سے برتی جانیوالی انسانی غفلت پر متعدد جگہ ایک ماہر طبیب کی طرح طنز کے نشتر چلائے ہیں اور ان کی تمام شاعری کی طرح ان کی ظرافت بھی ایک بڑے تعمیری مقصد کی حامل ہے۔ انہوں نے صرف انہی چیزوں پر انگلی رکھی ہے جو بطور خود قبیح و مذموم اور نازیبا ہیں اور انہی ہنگاموں کو موردِ الزام قرار دیا ہے جو عقل کے نزدیک قابلِ گرفت ہیں طنز و مزاح سے ان کا مقصد کسی کی دل آزاری یا ذاتی و شخصی منافرت نہیں بلکہ ان نقائص و ذمائم کی اصلاح ہے جو قومی ترقی کے راستے میں روڑا بنے ہوئے تھے۔

ابتدا میں بے شک ایک وقت ایسا آیا کہ انہوں نے اکبرؔ الٰہ آبادی کی پیروی کی اور انہی کے رنگ میں کہا مگر بہت جلد اس کو ترک کر دیا۔ کیونکہ اقبال کی بلند نظری ہنگامی قدروں کے مطالعے کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں ”رگڑا“ کے نام سے چند ٹکوڑے ”نُقل“ کر پیش کئے یہ قطعات مرغوب ایجنسی کی طرف سے شائع ہوئے۔ خواجہ حسن نظام نے اس نظم کا نام ”اکبری اقبال“ رکھا اور اسے پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

> ”لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہیں جن کا نام محمد اقبال ہے اور ڈاکٹر ہے اور بیرسٹر ہے اور پی ایچ۔ڈی ہے۔ وہ شعر گاتے ہیں، شعر بناتے ہیں اور موقع پاتے ہیں تو شعر پیدا بھی کر لیتے ہیں۔
>
> میں نے ان کو آدمی اس ڈر سے کہا کہ لوگ آدمیت کی عینک لگائے ہیں اور اقبالؔ ان کو آدمی ہی نظر آتے ہیں کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ بیٹھیں ورنہ میں اقبال کو پیکرِ خاک نہیں سمجھتا اور ان کے پتلے کو آدم زاد نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں مگر ان کی بشریت فقط ان کے بیوی بچوں یا ان کے لئے مبارک ہو جو ان کو گول چٹا مونچھوں والا عقلمند پروفیسر و بیرسٹر کہتے ہیں۔
>
> میں نے پروفیسر اقبالؔ کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی، سیالکوٹی اقبال کو بھی لاہوری اقبال کو بھی یورپین اقبال کو بھی دیکھا ہے اور لندنی اقبال کو مگر کبھی آدمی نہیں پایا۔ وہ ازل سے حیوان ہیں اور حیاتِ ابدی کے نشان ہیں

ہندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو کم وہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہند کے کسی انسان میں نہیں۔

برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں مگر ایک آدمی کو ستاتا ہے اور مگس بے حیا کا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رُخ پر قربان ہو جاتا ہے اور عبرت ڈھونڈنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رُلاتا ہے۔

اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو اَن دیکھی شمع کا دیوانہ ہے۔ مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھ کر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر قربان ہونے آتے ہیں۔

اقبالؔ ہمیشہ آسمان پر اُڑتے ہیں۔ زمین پر کبھی آنا ہوتا ہے تو اس زمین میں جو آسمان سے زیادہ دور ہوتی ہے اس لئے کہ وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہیں ہیں یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ اقبالؔ کہاں ہیں؟ ہم ان تک کیونکر پہنچیں؟

ایک دن بھری سبھا کے اندر اقبالؔ زمین پر آئے اور چند جملے ان کی زبان میں سنائے جو زمانہ کی زبان کہلاتے ہیں۔ جن کا نام اکبرؔ ہے، جو الٰہ آباد میں بیٹھ کر اللہ کی آبادیاں بساتے ہیں۔ اکبرؔ کے ہم زبان ہو کر بولنا آسان بات نہیں ہے اکبر اشاراتِ ربانی کے حامل ہیں۔ اکبرؔ کو گویا کرنے والا پہلے آنکھ سے دکھاتا ہے پھر قلم سے لکھواتا ہے اکبرؔ کی ہر بات زمین آسمان کو ایک کر دیتی ہے، ہر قول وہ وجود لے کر آتا ہے جس کو انگریزی میں کیرکٹر کہتے ہیں۔ اکبرؔ نے اس دھوپ میں بال سفید کیے ہیں۔ جس نے اسلامی سلطنت کا باغ خشک کر دیا۔ اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ کہا وہ اکبری اقبالؔ ہے۔ خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبالؔ نے کس حد تک اکبری روش کو نباہا ہے اور اکبر کی طرح کیونکر تنگ قافیوں کو کشادہ کیا ہے مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبرؔ کی زبان میں بولتے بولتے اقبال کی زبان میں بھی آیا ہے خدا خیر کرے دیکھیے ان حروف کے پردہ سے کیا نکلنے والا ہے۔

ہندوستان کی بے قراری میں کام کی باتیں درکار ہیں جن میں نتائج ہوں اور چلنے کے لئے راستہ ہو عبرت کے لئے دل خوش کن آگاہی اور تنبیہ ہو۔ اکبرؔ۔ اقبال کا ابتدا سے یہی شیوہ رہا ہے مگر اقبالؔ نے اور طریق سے کہا اور اکبرؔ نے اور پیرایہ سے۔ اس نظم میں جو منشی مرغوبِ رقم صاحب کے ذریعہ شائع ہوئی ہے اقبال نے اکبری نقشِ قدم پہ پاؤں اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ مضبوطی سے ہر نشان پر پاؤں جمایا ہے۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اس نظم پہ وہ لکھوں جس کو لوگ ریویو کہتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کے تیز بہاؤ کی حقیقت پر لیکچر دے۔ موجیں مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے تو کسی کا یہ کہنا کہ کشتیاں چکرائیں گی بادل اٹھیں گے اور زمین پر مینہ برسائیں گے،، فضول ہے۔ جاننے والے خود جانتے ہیں کہ یہ طوفان کسی موسم کی خبر دیا کرتا ہے۔ اس واسطے میں اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور نہ کہنا ہی اس کی اعلیٰ شان کی دلیل ہے،،

اب وہ اشعار دیکھیے ؎

مشرق میں اصولِ دین بن جاتے ہیں   مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلّے   واں ایک کے تین بن جاتے ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی   ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر   وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین   پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں   مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف   "پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے"

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوشمند!   غیرت نہ تجھ میں ہو گی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض   کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہے گی

انسان ہوئے مہذب لیکن مزا تو جب ہے   جنگل میں کہہ رہی تھی ہاتھی سے کل یہ ہتنی
تقریر کو کھڑی ہو کلو میاں کی بیوی   پردھان ہو سبھا میں بنسی کی دھرم پتنی

ہر محکمے میں عہدے تقسیم ہوں برابر   ہوتی نہیں ہے ہم کو جنگ و جدل سے سیری
خفیہ پولیس میں جب سے حد ہو گئی ہے قائم   ہندو ہیں ہیڈ افسر مسلم ہیں آنریری

تعلیمِ مغربی ہے بہت جرأت آفریں   پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ

بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط   آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ
میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں   ان کا یہ حکم دیکھ! میرے فرش پر نہ رینگ
کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور   اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

کہی اچھی نقیبِ انجمن نے — وہ سمجھے گا اسے جو کارواں ہے
خدا واحد ہے دو ناظم ہیں اپنے — دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے

دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانہ میں — ملّا کا محتسب کا خدا کا نبی کا ڈر
دو خوف رہ گئے ہیں ہمارے زمانہ میں — مضمون نگار بیوی کا سی آئی ڈی کا ڈر

کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگدست — تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
ردِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا لیا — تردیدِ حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

جنابِ شیخ کو بلواؤ خاص لندن کی — عجیب نسخہ ہے یہ خود فرامشی کے لئے
ہمارے حق میں تو جینا بتر ہے مرنے سے — جو زندہ ہیں تو فقط آپ کی خوشی کے لئے

ہوا میں جینے سے بیزار جب تو فرمایا
"کہاں سے لاؤ گے بندوق خودکشی کے لئے

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ — دفعِ مرض کے واسطے پل پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض — دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل" پیش کیجئے

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک — چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی — آئیں گے غسّال کابل سے کفن جاپان سے

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے
اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائیگا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن! سنتے ہو کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اُردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں　　ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا؟
میرزا غالب خدا بخشے بجا فرما گئے　　ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں　　نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت　　بنائے خوب آزادی کے پھندے
میاں نجّار بھی چھیلے گئے ساتھ　　نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں　　پرانے جھونپڑوں میں ہو ٹھکانا دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا　　کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

اکبر کے طنز میں تلخی اور تمسخر کا انداز زیادہ نمایاں تھا مگر کوئی پیغام نہ تھا۔ اقبال نے اپنے کلام میں سنجیدگی اور ظرافت کا ایک ایسا امتزاج پیدا کر لیا کہ وہ ہلکے سے تبسم کے ساتھ زندگی کے مدّ و جزر اور نشیب و فراز دیکھتے دکھاتے اور اپنا پیغام پہنچاتے رہے اس طرح انہوں نے اپنی شاعری میں عالمگیر انسانی مسائل پر تنقید کر کے ایک ناگوار چیز کو گوارا بنا کر پیش کیا اور اپنے سنجیدہ مگر شگفتہ مذاق کی بدولت طعن و طنز میں بھی ایک قسم کا

تقدس پیدا کر دیا۔ انہوں نے اجتماعی زندگی کے مصائب کو بے نقاب کرنے میں کہیں شدت، زہرناکی، تلخی اور شوریدگی کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طنز کی نشتر کاری دل کے پار نہیں ہوتی بلکہ مسرت کسک سی پیدا کرتی ہے اسے پڑھ کر ہم اپنا جائزہ لینے پر مجبور ہوتے اور تاریک زندگی میں روشنی حاصل کرتے ہیں مثال کے طور پر دین کی محدود تعبیر اور امامت کے مفہوم کی تنگی پر اس سے زیادہ تنقید کیا ہو سکتی ہے ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

لیکن ہجو کی ہمدردی نے اس کو معاندانہ عیب جوئی اور نکتہ چینی کی بجائے لطیف طنز میں تبدیل کر دیا۔ اقبال کے یہاں شروع سے آخر تک مقصدی پہلو نمایاں ہے۔ وہ اپنے مقصد کے اظہار میں پوری دلسوزی اور خلوص سے کام لیتے ہیں۔ ان کی فطری متحمل مزاجی اور اعتدال پسندی کی وجہ سے ان کی طنزیہ شاعری میں سنجیدگی زیادہ اور ظرافت کم ہے وہ اپنے شکار پر وار کرنے میں عموماً بالواسطہ طریق اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نظم "نصیحت" اس کی بہترین مثال ہے۔ اس میں انہوں نے طنز کا ایک انوکھا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ؎

میں نے اقبال سے از راہِ نصیحت یہ کہا   عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل   دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز
جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے   تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز
درِ حکام ہے تجھ کو مقامِ محمود   پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے   پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز
نظر آ جاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن   اثرِ وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
دست پرورد ترے ملک کے اخبار بھی ہیں   چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے   تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی   تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریکِ تگ و تاز
غمِ صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں   پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغِ پرواز
عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است   حالیہ غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

سُن کے کہنے لگا اقبالؔ بجا فرمایا
بات جو سچ ہے بتاؤں جو نہ ہو فاش یہ راز
ڈھب مجھے قوم فروشی کا کوئی یاد نہیں
اور پنجاب میں ملتا کوئی استاد نہیں

اقبالؔ کی طنزیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ بالکل درست فرمایا ہے کہ "سنجیدگی اور ظرافت کا یہ امتزاج اقبال کی شاعری کا امتیازی نشان ہے۔ وہ کہیں بھی کھل کھلا کر نہیں ہنستے بلکہ بڑے سنجیدہ انداز میں اور اک تبسم زیرلب کے ساتھ زندگی کی ناہمواریوں کو اُجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ خدا سے شکوہ کرتے وقت، ابلیس اور انسان کی فطرت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے "ملا کی سرشت پر چوٹ کرنے کے دوران میں وہ کہیں بھی ظرافت کو سستی جذباتیت کے حوالے نہیں کرتے بلکہ ایک مفکر کے دھیمے تبسم کی رفاقت میں پیش کرتے اور حیرت انگیز طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اقبالؔ کی طنز کو ان دائروں سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو کسی حوض کی شفاف سطح پر ایک کنکر کے ارتعاش سے نمودار ہوتے اور حلقہ در حلقہ بڑھتے اور پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی طنز کا پہلا نشانہ ان کی اپنی ہی قوم ہے لیکن یہاں وہ کہنے کی باتیں کسی کھُردرے اور نصیحت آموز انداز سے پیش نہیں کرتے بلکہ بڑے پیار سے اپنے پُرشفقت ہاتھ ناظر کے شانوں پر رکھ دیتے ہیں اور جب باتیں کرنے لگتے ہیں تو نرم اور خوبصورت الفاظ کے عقب میں طنز کے زہر آلود تیر چھپتے چلے آتے ہیں اور ناظر ان کی چبھن کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ان کی نظمیں "نصیحت" اور "ملّا اور بہشت" اسی زمرے میں شامل ہیں۔

اقبالؔ کی طنز کا دوسرا دائرہ مغربی تہذیب کی ساری بے اعتدالیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وہ جب مغربی ہوا کے طوفانی تھپیڑوں سے اپنی تہذیب کے تناور درختوں کی ٹہنیوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہو جاتے ہیں ؎

شفق نہیں مغربی افق پہ یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

مے خانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

اس دوسرے دائرے میں نمودار ہونے والی طنز کے متعلق یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ مزاح سے بے نیاز نظر آتی ہے اور اگرچہ یہ چیز اصولاً طنزیہ کلام کی خلاف ورزی ہے تاہم بیان کا تیکھا پن بات کی تلخی کو قابلِ برداشت ضرور بنا دیتا ہے۔

اقبالؔ کی طنز کا آخری دائرہ زندگی اور کائنات کے بہت سے مسائل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اقبالؔ ایک مفکر کے دھیمے تبسم کے ساتھ کائناتی مسائل کے رموز و نکات کی تفہیم پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ خالقِ کائنات سے ان کا براہِ راست خطاب اپنے اندر رندی و بیباکی کے علاوہ طنز کے بہت سے تیز نشتر بھی پنہاں رکھتا ہے اور اس کلام کے مطالعے کے بعد ناظر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے بہت بلندی سے زندگی کے نشیب و فراز پر ایک نگاہ ڈالی ہے ؎

اگر کج رَو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی   خطا کس کی ہے یا رب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر   مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا جبریلؑ بھی قرآن بھی تیرا   مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے سارا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا ؟

یہ "حرفِ شیریں" خالقِ کائنات سے مخاطب ہونے کا یہ البیلا انداز قطعاً اقبال کا اپنا انداز ہے لیکن شاید اس انداز کی کامیابی کی اصل وجہ وہ ظرافت ہے جو ان اشعار میں ایک برقی رَو کی طرح دوڑتی ہے اور جو ناظر کے لبوں پر بھی ایک شریر سا تبسم پیدا کر دیتی ہے۔"

اردو ادب میں طنز و مزاح صفحہ ۱۲۱ - ۱۱۹)

ان اشعار میں دیکھیے یورپ کی بے پناہ چالوں اور اس کے بے شمار منصوبوں پر کتنی گہری طنز ہے ؎

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ   مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے   بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

مسولینی اپنے حریفوں اور معترضوں کو منہ توڑ جواب دیتا ہے اور ان کی ابلہ فریب سیاست اور تہذیب کی پردہ دری کرتا ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم   بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں   ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم   تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں   راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آلِ سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے   اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تونے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام   تونے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی!
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

مئی ۱۹۲۲ء میں لاہور کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ایک مندر تعمیر ہوا اس کے قریب ہی ایک چبوترے پر مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے انہوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی رات ہی رات میں وہاں ایک مسجد کھڑی کر دی۔ جو آج بھی موجود ہے۔ اقبال نے اس موقعہ پر مسلمانوں کے مذہبی جوش پر حسب ذیل طنز کی ہے

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں

جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے

گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

چند اور طنزیہ نمونے ملاحظہ فرمائیے ۔

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے   ماجرا اپنی ناتمامی کا

مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو   صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا

اور یہ بسوہ دار بے زحمت   پی گیا سب لہو اسامی کا

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے   کردار بے سوز گفتار واہی

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز   طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام

وہ سادہ مردِ مجاہد وہ مومن آزاد   خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نماز غلام

طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے

ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل   جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت   بیچارہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

محکومی و مسکینی و نومیدئ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

کہا اقبال نے شیخ حرم سے   تہ دیوار مسجد سو گیا کون
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی   فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
ہے حق میں غلاموں کے یہی تربیت اولیٰ
موسیقی و صورت گریٔ علم و نباتات

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکہ میں ملا ہو غازی

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے   حریت افکار کی نعمت ہے خدا داد
چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدہ پارس   چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر   چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا

حق سے جب حضرتِ ملّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی میری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و بہشت و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدلِ قال و اقول
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنّت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

اقبالؔ کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے   ہر ملّتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے   بجلی کے چراغوں سے منور کئے افکار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل   تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجہ سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندہ میں گرفتار

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی   گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں جھک گئے مسجد میں جب وقتِ قیام آیا

ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں ۱۸۷۰ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ میرتھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد محکمۂ ڈاک و تار کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ یہ بھی ۱۸۹۲ء میں علی گڑھ سے ایف۔ اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ اس محکمہ میں ملازم رہے۔ پھر ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ جاکر بی اے کی سند لی اور وہیں نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری بن گئے۔ ان سے سفارشی خطوط لے کر حیدرآباد دکن گئے جہاں کچھ عرصہ فوج میں رہے۔ فوج سے دارالترجمہ میں پہنچے اور چند ہی دنوں میں اسسٹنٹ رجسٹرار ہوگئے۔ سیرِ ظلمات، فسانۂ لندن، ہنری گھونگا اور لارڈ کرزن کی تالیف خیابانِ فارسی اُردو میں ترجمہ کرنے کی وجہ سے خوب شہرت حاصل کی۔ میر عثمان علی خاں کے اتالیق مقرر ہوئے اور ہوم سیکرٹری کے عہدہ تک ترقی کی۔ یہاں انہیں جن لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا ان میں سید محمود، ڈپٹی نذیر احمد، حالی، شبلی، عزیز مرزا، شرر، ڈاکٹر سید حسین بلگرامی، نواب عماد الملک، نواب وقار الملک، نواب مرزا خاں داغ دہلوی، مولوی محفوظ علی بدایونی اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق شامل ہیں مگر مولانا ظفر علی خاں کو حیدرآباد کی فضا راس نہ آئی۔ مجبوراً انہیں وطن واپس آنا پڑا۔

یہاں ان کے والد وزیرآباد سے ہفتہ وار اخبار زمیندار جاری کر چکے تھے۔ یہ بھی اس میں شریک ہوگئے اور اسے لاہور اٹھا لائے۔ طرابلس اور بلقان کی جنگ اور مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے واقعے نے مہمیز کا کام کیا۔ اخبار روزانہ چھپنے لگا اور مولانا ظفر علی خاں کے زورِ قلم سے کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ اس وقت وہ نوجوان تھے، پاک و ہند کی وسیع سرزمین میں ان کا طوطی بولتا تھا، ایک زندگی میں کئی زندگیاں جمع تھیں۔ وہ بلند پایہ ادیب، آتش بیان خطیب، بیباک صحافی، قادر الکلام شاعر، زبردست سیاست دان اور پنجاب کے سب سے بڑے نڈر رہنما تھے ان کے دل میں قوم کا سچا درد تھا۔ وہ مسلمانوں کا دکھ درد محسوس کرتے۔ ہر مصیبت میں کام آتے، ہر آگ میں کود پڑتے اور اپنی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے سے بے شمار ساکن فضاؤں میں تلاطم برپا کر دیتے تھے، سراپا حرکت و حرارت تھے۔ ان کا ایک ایک لمحہ ہنگامہ خیزیوں میں گزرتا تھا۔ صحافت، سیاست، تقریر، تحریر، ادب، شاعری اور تالیف و ترجمہ کے معرکوں میں وہ پیش پیش رہتے تھے اور یہی روشنیٔ طبع ان کے لئے بلا ہو جاتی تھی۔

پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہی "زمیندار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور مولانا ظفر علی خاں کرم آباد میں نظر بند ہوگئے۔ وہاں سے ایک ادبی ہفتہ وار پرچہ "ستارہ صبح" نکالا مگر وہ جلد غروب ہوگیا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی زمیندار پھر افقِ صحافت پہ نمودار ہوا۔ ساتھ ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کی مہم شروع ہوئی اور کانگریس اور خلافت کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ مولانا نے ان تحریکوں میں سرگرم حصہ لیا اور اب جو ضبطیوں اور گرفتاریوں کا سلسلہ چلا تو چلتا ہی گیا۔ مولانا کی مجموعی قید کوئی بارہ سال کے قریب ہوگی۔ آخری عمر میں مرکزی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوگئے تھے۔ آخر طویل علالت کے بعد، ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو یہ ساز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

مولانا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جذبۂ توحید سے سرشار تھے۔ اسلام کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کر گزرتے تھے۔ مسلمانوں کو ہر جگہ سربلند دیکھنا چاہتے تھے۔ انگریز کو بدترین دشمن سمجھتے تھے۔ اس سے ہر میدان میں ٹکر لی ہر معرکہ میں اس سے دست و گریباں ہوئے۔ اس کی پاداش میں جانی و مالی نقصان بھی اٹھایا۔ کئی بار پریس کی ضمانت ضبط ہوئی۔ سالہا سال تک جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند رہے۔ لیکن ان کے عزم و ہمت

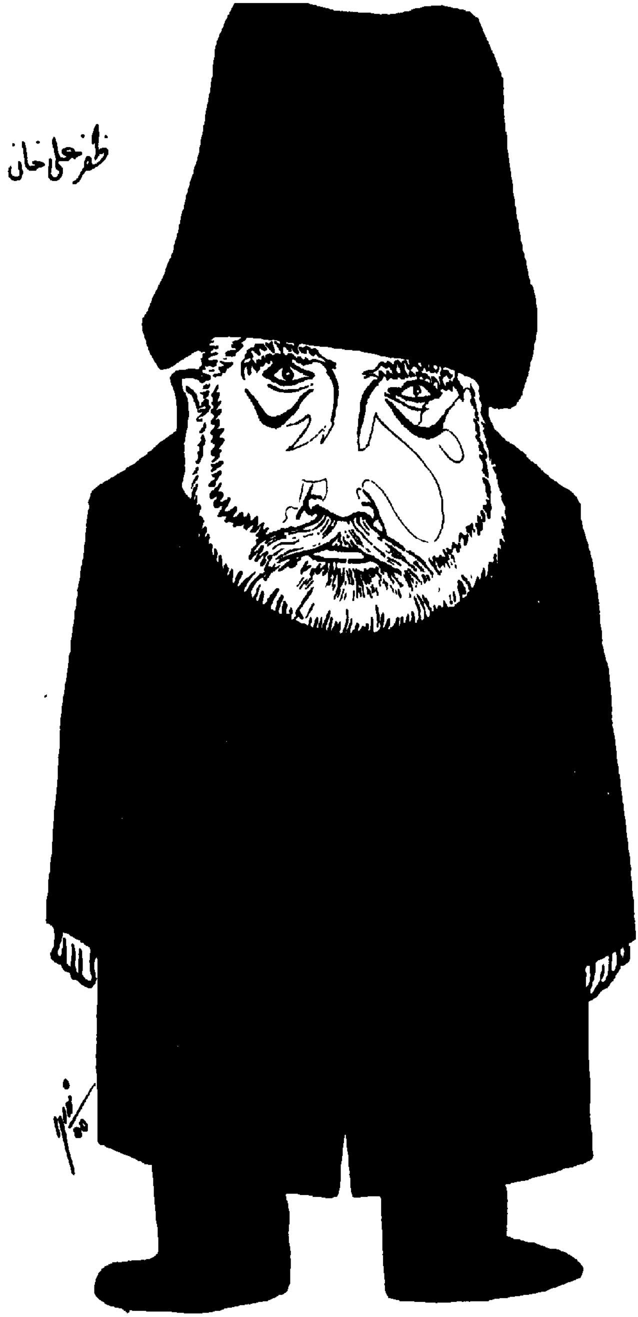
ظفر علی خان

میں فرق نہ آیا۔ جس چیز کو غلط سمجھا اس کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ لیکن جس بات کو صحیح جانا اس کی تائید و حمایت میں پوری جرأت سے سینہ سپر ہوئے انہوں نے ہر تحریک میں حصہ لیا ہر سیاسی جماعت سے رشتہ جوڑا۔ لیکن اپنی شخصیت اور انفرادیت کو ہر جگہ نمایاں رکھا۔ بقول" شورش کاشمیری کانگرس میں گئے تو برہنہ تلوار اس سے نکلے تو ذوالفقار، مجلس خلافت کی روح و رواں تھے لیکن کنارہ کشی اختیار کی تو اپنے ہی ہم عصروں سے دو دو ہاتھ کئے۔ احرار کی عمارت اٹھائی لیکن شہید گنج کے کدال سے گرا بھی دی۔ اتحاد ملت کی بنیاد رکھی لیکن جلد ہی ڈھا دی۔ لیگ میں تھک ہار کر شریک ہو گئے اور اس کو گوشۂ عافیت سمجھا مگر طبیعت کا انداز جوں کا توں رہا۔

مولانا ظفر علی خاں نظم و نثر میں ایک بدیع اور خاص طرز کے موجد تھے۔ انداز بہت شگفتہ، شوخ، پُر سطوت اور حاکمانہ تھا۔ نظموں کے متعدد مجموعے حبسیات، نگارستان، بہارستان، چمنستان وغیرہ کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ بیشتر نظمیں ہنگامی تاثر کی پیداوار ہیں لیکن ان کا انداز انشا بے پناہ ہے کہ ان کو اُردو شاعری کے ذخیرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کا کمال یہ تھا کہ پاکیزہ زبان اور صحیح محاورات کے استعمال سے کیسی ہی مشکل، کھردری اور بنجر زمین کیوں نہ ہو شادابی کا مینہ برسا دیتے تھے۔ قافیے ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے حاضر ہو جاتے اور وہ اپنی غیر معمولی قدرتِ بیان سے انہیں اوزان و بحور کی زنجیروں میں باندھتے۔ اکثر نظموں میں قافیہ ہی مضمون کا رہبر ہوتا ان کے یہاں جذبات دو ہی قسم کے ہیں تعریف اور تعریض۔ مولانا کے بعض ممدوحین تھے جن کی شان میں انہوں نے نظمیں لکھیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے جو ان کے طنز و تضحیک کا نشانہ بنے ان میں اکثر ایسے بھی تھے جو کسی وقت مولانا کے ممدوح رہ چکے تھے اس لحاظ سے ان کے کلام کا بیشتر حصہ، ہجو و طنز کا سرمایہ دار ہے۔ بقول "شورش کاشمیری" جہاں تک معتوبین کا سوال ہے ان کا کوئی معاصر اور جماعت ان کے قلم سے نہیں بچی یہاں تک کہ علامہ اقبال، قائد اعظم، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر جواہر لال نہرو، گاندھی جی بھی انکے قلم کی زد میں آ چکے ہیں اور جماعتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی حال عقیدوں اور نظریوں کا ہے۔ اس طنز بلکہ تضحیک میں ان کا جواب نہیں۔ اس میدان میں انہوں نے اچھے اچھوں کی دستارِ فضیلت کے پیچ کھولے اور بڑے بڑوں کو چاروں شانے چت کیا ہے۔

مولانا سے پہلے ہجو کا انداز شخصی یا ذاتی تھا جس کی بہترین مثالیں سوداؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ کے ہاں ملتی ہیں یا پھر اجتماعی طنز جس کے موجد و خاتم اکبر الٰہ آبادی ہیں۔ ظفر علی خاں نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا اور اس کی بنا قومی و ملکی مقاصد پر رکھی گو ان میں ذاتیات کا زہر بغایت ہے اور یہ ایک بشری تقاضا ہے لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود اس میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ اجتماعی ہے۔ ان ہجوؤں میں جن کا اصل نشانہ برطانوی ڈپلومیسی، ہندو بنیا پن، قادیانی نبوت اور اپنوں کی کاسہ لیسی ہے۔ کہیں کہیں دشنام بھی ہے لیکن تلخ نوائی کے باوجود بعض اچھوتی تشبیہیں، دلچسپ استعارے عمدہ ترکیبیں اور دلآویز کنایے بھی ملتے ہیں گو ایک قاری ان کی درشتی کو محسوس کرتا ہے اور بعض ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں لیکن بیشتر ان اشعار پر سر دھنتے اور صاد کرتے ہیں۔

اس قدرتِ کلام پر مولانا نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ "زمیندار" ان کے ایام صحت تک ایک ادارہ رہا۔ کئی آئے اور کئی گئے۔ عبداللہ العمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہرؔ، عبدالمجید سالکؔ، چراغ حسن حسرتؔ، مرتضیٰ احمد خان میکشؔ اور نصر اللہ خاں عزیزؔ، یہ سب اپنے اپنے وقت پر زمیندار کی وجاہت کے ستون رہے۔ بعض نے علیحدگی اختیار کی تو شعر و سخن اور تضحیک و طعن کا ڈول ڈالا لیکن مولانا کے شباب کا زمانہ تھا جو سامنے آیا مات کھا گیا۔

عجیب زمانہ تھا۔ مسلمان رہنما تحریکِ خلافت کے نتیجوں سے منتشر ہو کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے، مولانا محمد علی

مولانا ظفر علی خاں اور خواجہ حسن نظامی میں بڑے بڑے قلمی معرکے ہو چکے تھے۔ روزنامہ انقلاب" مرحوم ان معرکوں کی دل آویز فصیل تھا۔ مولانا انقلاب پر یورش کی

مجموعہ انقلاب کا اقبال نونؔ میں

انہیں شبہ تھا کہ انقلاب کے اجراء میں علامہ اقبال اور ملک فیروز خاں نون کا ہاتھ ہے۔ بس اس پر ایک معرکہ گرم ہو گیا۔ انقلاب کے ہم نواؤں میں نیاز مندانِ لاہور یعنی مہرؔ و سالکؔ کے علاوہ تاثیرؔ، تبسمؔ، حفیظؔ، پطرسؔ اور ان کے ساتھی۔ اِدھر تنہا ظفر علی خان ——— اِدھر افکار و حوادث اُدھر فکاہات ——— وہاں کئی لکھنے والے، کوئی نظم لکھ رہا ہے کوئی افتتاحیہ اور کوئی افکار و حوادث کے محل سے پتھر برسا رہا ہے ۔ اور مولانا ہیں کہ چومکھی لڑ رہے ہیں ——— ایسے معرکوں میں مولانا کا ادبی نام نقاشؔ ہوتا ——— پھر ایک نام نہیں کئی نام ——— ادھر افتتاحیہ لکھا اُدھر فکاہات اور پھر سنگلاخ سے سنگلاخ زمین میں نئے نئے قوافی، نئی نئی ردیفیں اور بولتی ہوئی نظم ——— گاہے ماہے حسرتؔ نے بھی ہاتھ بٹایا اور ایک آدھ دفعہ اخترؔ شیرانی نے بھی عکاسؔ کے نام سے چند نظمیں کہیں ——— مگر ظفر علی خاں بلا کے شہسوار تھے ——— لڑائی تیز ہو گئی، اعلان کیا ع

زمیندار ایک، آپ اتنے مگر اوجِ صحافت پر
یہ اک تُکّل لڑے گا آپ کی ساری پتنگوں سے

اب فقرے بازی شروع ہے، شعر چل رہے ہیں، مصرعے ہو رہے ہیں ادھر طعن توڑا جا رہا ہے، اُدھر سے جوابِ آں غزل آ رہا ہے کہیں سے طنز سرگرم نوا ہے، کہیں بھبتی آتش فشاں ——— اور پھر ایک آدھ دن کی بات نہیں، ہفتوں یہ دھندہ رہا۔ حریفانِ بذلہ سنج حریفانِ دشنام ہو گئے۔ تو بات مطلع سے مقطع پر آ گئی۔ غنیم چورنگ ہے اور مولانا فاتح ـــ ع

ہم تھے حریفِ بذلہ، وہ دشنام کے حریف

ایکا ایکی دیکھتے کیا ہیں کہ محاذ پھر گرم ہو گیا۔ مولانا نے لکھا ع

انقلابات ہیں زمانے کے   مہرؔ و سالکؔ کے انقلاب کو دیکھ

اب جو مصرعہ اٹھایا تو مشاعرہ ہو گیا۔ ایک غزلہ، دو غزلہ، سہ غزلہ، نظم و نثر کی فراوانی۔ انقلاب کے سبھی ساتھی ادبی اور مولانا کے تمام رفیق سیاسی ——— سالکؔ نے لکھا:

"خلافت کی بلیاں ہمارا کھمبا نوچنے پر آمادہ ہیں۔"

مولانا نے جواب دیا۔

"کیوں حضرت! خلافت کے ابو ہریرہ یعنی مولانا عبدالقادر قصوری کے متعلق کیا ارشاد ہے ——— ؟"

اور پھر یہ معرکے محض مہرؔ و سالکؔ تک ہی محدود نہ تھے ——— ان کا دائرہ پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ بعض حوادث و وقائع پر ایسے برجستہ شعر کہے ہیں کہ ان کا جواب نہیں۔ شنواریوں کی بغاوت سے متعلق "زمیندار" میں افتتاحیہ لکھا تو اس کا سر آغاز تھا ع

جنگ کا کب ہے سلیقہ کسی قنواری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

کسی مسئلہ میں مسٹر جناح سے بھڑ گئے۔ قلم اٹھایا، اور یہ لکھا اور عنوان میں یہ شعر ؎

کیوں کر اس کی نگہ ناز سے جینا ہو گا
زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہو گا

ایک زمانہ میں علی برادران سے گاڑھی چھنتی تھی۔ اب جو اختلاف کی ہوا چلی تو عمارت ہی بیٹھ گئی ؎

دونوں نے مل کے ڈالی ہے اسلامیوں میں پھوٹ
ہے صلح و آشتی سے عسل بھائیوں کی ضد

منڈلا رہے ہیں آج خلافت کی لاش پر
دہلی اور بمبئی کے موٹے موٹے گدھ

اور پھر ایسے ایسے قافیے نکالے کہ مضمون سے قطع نظر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ علامہ اقبال سے عمر بھر دوستانہ تعلقات رہے۔ ایک زمانہ میں حضرت علامہ اقبال نے روزنامہ "احسان" کے ظفر علی خان نمبر کو پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ مولانا کا قلم مصطفےٰ کمال کی تلوار ہے" لیکن سائمن کمیشن کی آمد پر مولانا ان کی تواضع بھی کر چکے تھے ؎

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کا کدال   قبر آزادی کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے
کاٹ لی پنجاب کی ناک آپ اپنے ہاتھ سے   آبروئے ملت کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے

گاندھی جی کے ہمرکاب تھے تو ان کے قصیدے لکھے۔ مثلاً ؎

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

لیکن رو دھے تو پھر منے نہیں۔ زاویۂ نظر ہی بدل گیا ؎

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

الغرض مولانا کا تمام کلام ان شعری سانحات سے بھرا پڑا ہے"

(نقوش شخصیات نمبر)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۲۵ء کو استعمار کی بھینس کا انڈا قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

صدرِ اعظم کی سخاوت میں نہیں ہم کو کلام   لیکن ان سے پوچھتے ہیں ہم کہ ہم کو کیسا دیا
کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لئے   اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا
اپنے پینے کے لئے شمپین بھر لی جام میں   ہند کے رندانِ دردآشام کو ٹھرا دیا
میوہ خوری کے لئے چننے لگے جب گول میز   رکھ لئے خود مغز، چھلکوں پر ہمیں ٹرخا دیا
بھینس استعمار کی گابھن ہوئی مدت کے بعد   اور بڑی دقت سے اصلاحات کا انڈا دیا

(۱۲؍جنوری ۱۹۲۵ء)

اخبار مفت پڑھنے والے نمونہ بازوں پر بالواسطہ چوٹ کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں ؎

پھٹکری سے مجھ کو مطلب ہے نہ ہڑے سے غرض   رنگ بے داموں ہی اس دامن میں چوکھا آئے گا
کارڈ اک بیرنگ لکھا ہے نمونے کے لئے   بند ہو کر ڈاک میں اخبار مفت آجائے گا
اک نئے پرچے کی میں ہر روز کر لیتا ہوں سیر   یوں ہی قاصد سال بھر نامے پہ نامہ لائے گا
کونڈی ڈنڈا مجھ رنگیلے کا سلامت چاہیئے   بھنگ ہر چیلے مرا داتا مجھے پلوائے گا
ہے غرض پرچے سے مطلب اسکے مالک سے نہیں   مجھ کو اس سے کیا وہ اس کو کس طرح چھپوائے گا
کاغذی کا بل کرے گا کس طریقے سے ادا   اور چھپائی کے لئے پیسے کہاں سے لائے گا
فرض ہے اس کا صبوحی میری پلوائے مجھے   بالیاں جی بی کی بیچے پرچہ بھجوائے مجھے

(۲۰؍دسمبر ۱۹۱۶ء)

لالہ نانک چند ناز کی شاعری کا تمسخر اُڑاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کہہ لیتے ہیں نازؔ شعر لیکن   ملتا نہیں پڑھ کے ان کو آنند

ہے شعر وہی جو چٹکیاں لے   دل میں کسی پدمنی کی مانند

یہ نکتہ سُنا تو سر کو دُھن کر   فرمانے لگے رشی دیانند

ہے نازؔ کی نظم کا یہ نقشہ   دندانِ تو جملہ در دہانند

چشمانِ تو زیرِ ابرو انند

(۱۰ جون ۴۴ء)

جب مولانا چھیڑ چھاڑ پر آتے تو اس طرح کی باتیں کرتے تھے

اشنان کرنے گھر سے چلے لالہ لال چند   اور آگے آگے لالہ کے ان کی بہو گئی
پوچھا جو میں نے لالہ للائن کہاں گئیں؟   نیچی نظر سے کہنے لگے وہ بھی چو گئی

میں نے دیا جواب انہیں ازرہِ مذاق   کیا وہ بھی کوئی چھت تھی کہ بارش سے چو گئی

کہنے لگے کہ آپ بھی ہیں مسخرے عجیب   اب تک بھی آپ سے نہ تمسخر کی بو گئی

"چو" ہوشیار پور میں ندی سے ہے مراد   بی بی تمیز بھی وہیں کرنے وضو گئی

میں نے کہا کہ "چو" سے اگر ہے مراد جُو   پھر یوں کہو کہ تا بہ لبِ آبِ جُو گئی

کیوں اینٹھتے ہیں ماش کے آٹے کی طرح آپ   دھوتی سے آپ کی نہیں ہلدی کی بُو گئی

لطفِ زبان سے کیا ہو سروکار آپ کو   دامن کو آپ کے نہیں تہذیب، چھو گئی

ہندی نے آکے جیم کو چے سے بدل دیا   چو آئی کہسار میں گلشن سے جو گئی

لہجہ ہوا درشت زبان ہو گئی کرخت   لطفِ کلام و شستگیٔ گفتگو گئی

معنی کو ہے گلہ کہ ہوا بے حجاب میں   شکوہ ہے لفظ کو کہ مری آبرو گئی

افسوس ملک میں نہ رہی فارسی کی قدر   مستی اُڑی شراب سے پھولوں سے بُو گئی

فوقؔ

منشی محمد الدین فوق کشمیری الاصل تھے۔ فروری ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۰ء میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد جو اس وقت یونیورسٹی کا امتحان تھا۔ سیالکوٹ میں جا کر ہڑوار کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ پھر چند دن جموں میں رہ کر پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۰۱ء میں اپنا ہفتہ وار اخبار پنجہ فولاد جاری کیا جو ۱۹۰۶ء میں بند ہو گیا۔ اس کے بعد ماہنامہ کشمیری میگزین جاری کیا جو ۱۹۱۳ء میں ہفتہ وار اخبار کشمیری بن گیا اور ۱۹۳۴ء تک اور اہل کشمیر کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۱۲ء میں رسالہ طریقت جاری کیا جو چار سال تک رہا ۱۹۱۸ء میں رسالہ نظام جاری کیا مگر وہ جلد بند ہو گیا

منشی محمد الدین فوقؔ بیک وقت شاعر بھی تھے اور ادیب بھی مورخ بھی تھے اور صحافی بھی ان چاروں خصوصیتوں میں انہوں نے نام پیدا آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد سو کے قریب ہے۔ کشمیر کا یہ سب سے بڑا شاعر اور مورخ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو گ

فوقؔ صاحب نے ایک نفیس انسان کی طرح زندگی بسر کی۔ ساری عمر اخبار نویسی کی یا تاریخ پر بیش بہا کتابیں لکھیں۔ ایک مورخ میں جس قسم کی متانت ہونی چاہیے وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ لیکن متین اور سنجیدہ ہونے کے باوجود جب کبھی بے تکلف دوستوں کی صحبت میں کھلتے تو اس وقت آ کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ اخبار نویس کی حیثیت سے بھی آپ کو قارئین کی دلبستگی کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں لطائف و ظرائف کے نام سے آپ کے اخبار میں ایک مستقل کالم ہوتا تھا جس پر آپ کا یہ شعر درج ہوا کرتا تھا ؎

رونی صورت ہو کوئی لاکھ ہنسا دیں اس کو
دل پھڑک جائے لطیفہ وہ سُنا دیں اس کو

آپ کی تالیفات میں دو کتابیں "ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے" اور "استادوں شاگردوں کے لطیفے" بھی اس بات کی گواہ ہیں کہ لطیفہ گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔

کبھی کبھی حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر آپ طنز و مزاح کے تیر بھی برساتے تھے جو بے حد کامیاب ہوتے تھے۔ اس قسم کی نشتر کاری سے آپ "خفتگان کشمیر" کو بیدار کرنے کا کام لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں خاص قسم کی لطیف طنز و ظرافت پائی جاتی ہے مگر آپ کی طنز و ظرافت سمجھنے کے لئے الفاظ کی غرابت کے پردے ہٹانے اور ہر واقعہ کا پس منظر جاننے کی ضرورت ہے اور یہ بات آپ نے خود ہی ہر نظم کی ابتدا میں بیان کر دی ہے۔ اگر یہ سمجھ میں آ جائے تو آپ کی طنز و ظرافت پوری طرح دل میں اُتر جاتی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

۱۹۱۹ء میں لاہور کی نکلسن روڈ پر بمبئی ہیئر کٹنگ سیلون کے نام سے مسٹر محمد اسماعیل باربر کی ایک فیشن ایبل دکان تھی جس میں مس ڈائٹلے نام ایک نوخیز خوبصورت یورپین لڑکی انگریز عورتوں کے بال سنوارنے پر ملازم تھی۔ ایک پنجابی نوجوان اس کو دیکھ کر دلبستہ خطمی ہو گئے، ربط ضبط بڑھایا، کچھ بے تکلفی بھی پیدا کر لی مگر سرکار برطانیہ نے عشق کی گستاخیوں کو اس سے آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہ دی۔ فوقؔ صاحب نے اس واقعہ پر مندرجہ ذیل اشعار لکھے ؎

اتفاقاً کل میں جا نکلا نکلسن روڈ پر   جس جگہ تھے جمع کچھ نظارے سائٹ کیلئے

بمبے میٹر کا سرِ راہ اک وہاں سیلون ہے — شب تو شب جو وقف ہے دن کو بھی لائٹ کیلئے
اک مس کم سن رہے مستِ شباب حسن و عشق — بوالہوس مرتے ہیں جس پر اپنے رائٹ کے لیئے
جب اسے دیکھا جبینِ ناز پر بل آ گئے — گفتگو جب کی ہوئی تیار فائٹ کے لیے

تخلیہ چاہا تو فرمایا کہ فرخ خود شناس !
کوششیں بیکار ہیں کالے کی وائٹ کے لئے

شہر آشوب قسم کی ایک نظم کے چند شعر

گر زبانِ فون سے ہو کچھ بیانِ کاشمیر — ہے یقین بے چین کر دے داستانِ کاشمیر
میر بزمِ فتنہ و شر واعظانِ کاشمیر — عاملانِ شرک و بدعت عالمانِ کاشمیر
ظلم تو آئین ہے اور لب کشائی جرم ہے — بہرِ خاموشی بنی گویا زبانِ کاشمیر
خون کثرت دیکھنا ہو تیغ قلت سے اگر — دیکھیے آ کر کبھی محشرستانِ کاشمیر
ظالموں نے استخوان و پوست تک چھوڑا نہیں — کھا گئے کشمیر کو سب میہمانِ کاشمیر
ایک عالم ہے ثنا خواں خطۂ کشمیر کا — ہم کو قسمت نے بنایا نوحہ خوانِ کاشمیر
چاہے تو اک اردلی گٹھڑی میں سبکو باندھ لے — ہیں بظاہر رشکِ صد رستم جوانِ کاشمیر
ہے ازل ہی سے یہاں ترکِ تشدد پر عمل — ہیں سبق آموزِ گاندھی ساکنانِ کاشمیر
قوم غافل کس طرح بحرِ فنا میں بہہ گئی — کچھ خبر ہے تجھ کو اے آبِ روانِ کاشمیر
مٹ گیا احساسِ حریت اُڑی رُوحِ عمل — ہیں غلامانِ غلام آزادگانِ کاشمیر
کوئی بات اسلام والوں کی نہیں آتی نظر — عالمِ اسلام دیکھا گو جہانِ کاشمیر
مال اور بیگار فارسٹ و مجوزہ اور پولیس — اتنے دشمن اور اک جانِ کسانِ کاشمیر

تیغ جوہر دار برسوں تک، رہی قومی نشان　　　کانگڑی ہے یا پھرن بس اب نشان کاشمیر
نام ہی کے رہ گئے سلطان سلاطین پہاڑ　　　نام ہی کے اب ہیں راجے راجگانِ کاشمیر
چین لینے ہی نہیں دیتی کبھی کشمیر میں　　　قہر آلودہ نگاہِ پاسبانِ کاشمیر
کیا شگفتہ پھول کیا منہ بند کلیاں سب ہیں خشک　　　رحم کر اب اے جفائے باغبانِ کاشمیر

کشمیر میں عام طور پر رشوت کا نام ''ناس مُشکہ'' ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اور کچھ نہیں تو نسوار اور چائے کے لئے ہی کچھ دیتے جاؤ۔ اسی پر زبردست چوٹ کی گئی

کل ایک بی اے پاس مجھے سیر میں ملے　　　لکھ پڑھ کے بھی جو زیر و زبر سے تھے بے خبر
پٹھو کی طرح پیٹھ پہ بستر کا بوجھ تھا　　　بستر بھی تھا وریدہ، ملیدہ، غلیظ تر
یہ بوجھ اور منحنی سا آپ کا وجود　　　بوڑھوں کی طرح جھک گئی تھی آپ کی کمر
دو دن سے پیٹ میں کوئی دانہ گیا نہ تھا　　　یہ حال اور پیش تھا لولاب کا سفر
پوچھا کہ جا رہے ہو کہاں ہانپتے ہوئے　　　بولے کہ تجھ کو میری لیاقت کی کیا خبر
طے کر لئے ہیں مرحلے کالج کے اور اب　　　میں جا رہا ہوں عہدۂ فارسٹ گارڈ پر
میں نے کہا کہ بی۔ اے کی مٹی نہ کر پلید　　　یہ انتہائے علم اور یہ بوجھ یہ سفر
تنخواہ گارڈوں کی ہے چودہ کہ پندرہ　　　وہ بھی ملے گی جنگلوں میں گھوم گھوم کر
بولا وہ بی۔ اے پاس نرا کیا سمجھ مجھے　　　رکھنے تو دے قدم مجھے جنگل میں لحظہ بھر
سب جانتے ہیں اور ہو تم بھی یہ جانتے　　　تنخواہ پر کبھی نہ ہوا ہے نہ ہو گذر
تنخواہ بھی اگر نہ ملے کچھ تو غم نہیں　　　پر ناس مُشکہ کی جو اجازت ہو بے خطر
پھر دیکھئے بہار کہ کیسی بہار ہو　　　پھر دیکھئے کہ گارڈ ہوں یا رینج آفیسر
یہ ناس مشکہ وہ ہے کہ جس کی امید پر　　　پیدل چلا ہوں آؤں گا موٹر میں بیٹھ کر

اس نظم میں اپنے عہد کے صاحب اقتدار طبقہ پر نہایت گہرا طنز ہے ؎

خلقِ نادار کی بھی سُن زاری   نام تیرا ہے خالقِ باری
پی گئے خون تیرے بندوں کا   جن کو بخشی ہے تو نے سرداری
ہم تیرے خوف سے سدا لرزاں   وہ ازل ہی سے محوِ مے خواری
ان کی نظریں ہماری روزی پر   چھین کر لے گئے زمین ساری
ان کا سرمایہ اپنی پامالی   ان کی تفریح اپنی ناداری
خون اتنا سفید ہے ان کا   روزِ روشن میں ہے سیہ کاری
بے زری اپنی کاشفِ ہر عیب   ساتر العیب ان کی زرداری
شغل ان کا تکبر و نخوت   کام ان کا ہے معصیت کاری
کوئی رشتہ میں ہو غریب اگر   اس کے رشتہ سے ہیں یہ انکاری
ان کے کتّوں کو نعمتیں حاصل   تیرے بندوں کو ذلّت و خواری
ٹوک سکتا نہیں کوئی ان کو   ڈر سے خاموش خلق بے چاری
ابھی حرکت میں کیا نہ آئے گی   میرے اللہ تیری قہاری
ہم غریب اور تو غریب نواز   ہے تجھی سے امیدِ غم خواری

ایک ننگِ انسانیت کی ہجو ؎ سن اے محسن کش و احساں فراموش   نماز و روزہ و ایماں فراموش
تو ننگِ خاک و آب و آتش و باد   بباطن خر بظاہر آدمی زاد
تو ننگِ خاندان و ملت و دیں   بد آموز و بد انجام و بد آئیں
بدل کر ذات اے بدذات تو نے   بنایا دن کو کالی رات تو نے

ترے ہاتھوں سے نالاں باپ تیرا　　نہ لے ڈوبے یہ تجھ کو پاپ تیرا
نہ خوش ہو اس قدر مرگِ پدر سے　　یہی امید رکھ اپنے پسر سے
تری جزوِ بدن خوراکِ ناپاک　　ہو تیرا نامۂ اعمال کیا پاک
ترے افعال سب دوزخ کا ایندھن　　ترے اعمال سب دوزخ کا ایندھن
وطن کا فخر تھے تیرے سلف سب　　سلف وہ جن کا تو ہے ناخلف اب
پولس والوں کو یار اپنا بنا کر　　زمینداروں پہ رعب اپنا بٹھا کر
دُرِ ایمان و دیں اپنا گنوا کر　　زمینِ غیر پر قبضہ جما کر
بنا پھرتا ہے رانی خاں کا سالا　　کبھی سمجھے گا تجھ کو حق تعالیٰ
سنبھل اے زادۂ بطنِ کنیزک　　خدا کے خوف سے بے خوف کب تک
مکافاتِ عمل پائے گا اک دن　　گلِ اقبال مرجھائے گا اک دن
گر اے شیطان تو انسان ہوتا　　نہ یوں فرعون بے سامان ہوتا
نہیں گو حق پہ مائل اب ترا دل　　نہ اتنا غیرتِ حق سے ہو غافل
کرے گا تیری کج رائی کو سیدھا
کبھی پیدا کوئی موسیٰ بھی ہو گا

متفرق شوخ، شگفتہ اور ظریفانہ اشعار سے

کھانا نمک بھی اور نمک دال بھی چھوڑنا　　جی چاہتا ہے بھیج دیں اب لام پہ تمہیں
پتلے ہو تم تعصب و فسق و فجور کے　　کہنے کو سب خوشامدی کہہ دیں بشر تمہیں
بات کیا چاہیئے جب مفت کی حجت ٹھہری　　اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

انجام ظلم کا کبھی اچھا نہیں ہوا — سو بار ہم تو کہہ چکے سر پیٹ کر انہیں
بیداد و جور و قہر رعایا پہ جو کریں — کہتے ہیں کاشمر میں سب وادگر انہیں
معلوم ہو حقیقتِ دردِ جنابِ فوقؔ — کشمیر کا بنا دیں گورنر اگر انہیں

مٹ گیا حرفِ غلط کی طرح سب لکھا پڑھا — قیس نے ہم درسِ لیلیٰ ہو کے آخر کیا پڑھا

اُبل پڑنے پہ آمادہ ہیں چشمے دیدۂ تر کے — جسے طوفان سے بچنا ہو سمندر پار ہو جائے
تماشا ہو اگر تو بھی کسی پر جان دے ظالم — مزا ہو گر مسیحا بھی کبھی بیمار ہو جائے

خدا ہی آبرو رکھے تو رکھے فوقؔ اس گھر کی
میاں ہو جس کا جاہل اور ہو اخبار خواں بی بی

ان کی حکومتیں ہیں، اپنی اطاعتیں ہیں — دربارِ خاص ان کا دربارِ عام اپنا
کیوں سومناتھ رکھے اس کو بھلا ملانا — عرفی یہ جس نے لکھا نمرود نام اپنا

گیا لاحول کے پڑھتے ہی شیطاں — اکڑی تو یہ کھلا بوتل کا سب کاک

قحط جائے گا تو جائے گی وبا — ساتھ سالے ہی کے سالی جائے گی
ضعفِ معدہ کی شکایت ہے مجھے — ایک گالی خسر کھا لی جائے گی
تیغ تو اب قید سے آزاد ہے — پر یہ کیا تم سے سنبھالی جائے گی
کیوں ثمر دے گا نہ باغِ اتحاد — "پھوٹ" گر اس سے نکالی جائیگی
میرے گھر بھی آئے گا دانہ کوئی — یا مجوزہ ہی میں ٹالی جائے گی

فوقؔ کو کشمیر میں جانے تو دو
اس کی توبہ آزما لی جائے گی

جب "خزانِ پُر فتن" تیرے طویلے سے کھلے   چر گئے میری امیدوں کی چراگاہیں تمام

گرد و گرما و گدا و گور کی افراط سے   خطۂ لاہور بھی اب خطۂ ملتان ہے

ان میں آخر کیا نبھے گی جن کے اخبارات سے   اک طرف لاحول ہے اور اک طرف شیطان ہے

لاحول نام سے ایک اخبار ایک مسلمان کے اہتمام میں گجرات سے اور شیطان نام سے ایک اخبار ایک ہندو کے اہتمام میں لاہور سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ جون ۱۹۲۶ء کی بات ہے۔

نہ کیڑا ہو اس میں کوئی لیڈری کا   مری تصوف کا امتحاں کیجئے گا

اگر روزے کے دردِ سر سے بچایا   تو واعظ کو پیرِ مغاں کیجئے گا

زمانہ کے سوئے ہوئے جاگ اُٹھے   مرے کمبکرن کو بھی کوئی جگا دے

بھاگتا پھرتا ہوں آبادی سے میں   شاعری ہے یا کوئی خفقان ہے

رہزنِ انساں ہے خود انسانیت   آدمی کا آدمی شیطان ہے

جو اقربا ہیں اپنے عقرب مثال ہیں وہ   جو یار ہم نے دیکھے وہ یار مار دیکھے

ایک وقت تھا کہ کشمیر کے تمام شعبوں پر کانگڑا واسی چھائے ہوئے۔ برق صاحب نے ۱۹۲۳ء میں اس سیاسی اقتدار پر ان الفاظ میں چوٹ کی ہے ؎

چل گئے وہ چال "ماموں بھانجا" کشمیر میں   قافیہ ہے تنگ "عمو جان" کا کشمیر میں !

کاش کچھ ان کے دلوں میں بھی خدا کی یاد ہو   گو زبانوں پر بہت ہے "یا خدا" کشمیر میں

ہو گئیں ٹھنڈی مرے اہلِ وطن کی گرمیاں   "کانگڑی" کی جگہ ہے اب "کانگڑا" کشمیر میں

کافروں سے بھی ہے بدتر وہ مسلماں کے لئے   میرزادہ ہو کہ کوئی میرزا کشمیر میں

خونِ مسلم تیغِ مسلم سے جہاں ہو رات دن
کی یزیدوں نے وہ پیدا کربلا کشمیر میں

قوموں نے گیت بدلے گیتوں نے ساز بدلے
اپنی وہی ہے تو تو اور وہ ہی تمکنارا

ڈھاکہ کے مچھروں کی شکایت سے

نمرود کی طرح نہ کیا تھا کبھی غرور
کیوں تنگ کرتے ہیں مجھے مچھر تمام رات

بیدار طالعی میں مری شک ہے وجہ کفر
ڈھاکہ میں آکے جاگتا ہوں اکثر تمام رات

آزاد ہی رہے یہ تہِ دام آکے بھی
اڑتے رہے مسہری کے اندر تمام رات

دشمن حقیر بھی ہو تو سمجھو نہ تم حقیر
جاری رہا یہ مصرع زباں پر تمام رات

جوشؔ ملسیانی

پنڈت لبھو رام صاحب جوشؔ قصبہ ملسیاں ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کے رہنے والے ہیں آپ کی پیدائش یکم فروری ۱۸۸۲ء کو ہوئی آپ نے جس دیہاتی فضا، جس غیر ادبی ماحول اور جن ناسازگار حالات کے ماتحت تعلیم و تربیت حاصل کی اس کو دیکھتے ہوئے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا لائق شاعر اور قابل ادیب ہونا محض عطیہ الٰہی ہے طبیعت سادگی پسند ہے، لباس اور وضع قطع سے دیہاتی سادگی کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود نہایت رنگین شعر کہتے ہیں شاعری میں داغؔ دہلوی کے شاگرد ہیں اور زبان کی نوک پلک کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

ان کے کلام میں اس قسم کی فکاہی شاعری کے نمونے تو نہیں ملیں گے جو ہزل گو حضرات کا مطمح نظر ہے اور جس میں صرف عامیانہ مذاق اور بازاری لہجۂ کلام اختیار کر کے پھکڑپن کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے بعض بعض جگہ محض زبان کے الٹ پھیر سے ایسی شگفتگی، شوخی، ظرافت اور زندہ دلی کا ثبوت دیا ہے کہ بے اختیار لبوں پر تبسم لہرانے لگتا ہے۔ سماج کی اکثر خامیوں اور کمزوریوں پر طنز بھی کی ہے تندی اور تیزی کو الفاظ کی متانت میں چھپا کر مزاح سے تعمیری کام لیا ہے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے بعد آپ خود اعتراف کر لیں گے کہ ؎

جنابِ جوشؔ جو مشہور تھے اربابِ دانش میں
بڑے آشفتہ دل نکلے بڑے شوریدہ سر نکلے

ان کو شوقِ تن تنا تن تن ننات
مجھ کو ذوقِ فاعلاتن فاعلات

بنگلہ ہی نہیں گور بھی انساں کے لئے ہے
یہ مٹیا محل بھی اسی مہماں کے لئے ہے

شعر خوانی ہم نوائے چنگ ہے
داد لینے کا یہ اچھا ڈھنگ ہے

اہلِ مغرب کے فریب آباد میں صلح کا چرچا پیامِ جنگ ہے
آپ گورے ہیں تو ہم کالے سہی !
عیب کیا ہے اپنا اپنا رنگ ہے

دل دے کے کہتے ہیں کہ نوشت اسکی دیجئے
ایسا نہ ہو کہ بعد میں جھگڑا کرے کوئی

اسیرِ حرص نہ ہو کیوں حریصِ طولِ امل
وہ چاہتا ہے کہ رسی ذرا دراز رہے

کمیٹی کی پرچی سلامت رہے
غریبوں کا یہ آسرا ہو گئی

تپشِ دل میں سب آ سر بیساکھ
مہینا جون کا ہے جنوری میں

روز زر کے ملتے ہیں یہ ڈر ہے انہیں
دلبری نوکری نہ ہو جائے

راہِ عدم میں چور ہی اتنا کرم کرے
چپکے سے لے اڑے مری گٹھڑی گناہ کی

لب پہ توبہ ہاتھ میں جامِ شراب
رندیٔ اربابِ تقویٰ دیکھئے

ہم جانتے ہیں کہ پارسائی کیا ہے
اس کے لئے دریۂ لب کشائی کیا ہے

پی جائیں جسے نام خدا کا لے کر
اس جرم شراب میں برائی کیا ہے

محشر میں سن رہا ہوں صدا واہ واہ کی
یا رب ملی یہ داد مجھے کس گناہ کی

بڑھیں عاشقوں کی وہ ارزانیاں
محبت کا سودا گراں ہو گیا

پرتگالی کا میں دلدادہ نہیں اے ساقی !
انڈیا میڈ اگر ہے تو دکھا کون سی ہے

جو اور مدعا ہو وہ کہیے جناب شیخ
یہ ”چھوڑ دیجیے“ کی صدا چھوڑ دیجیے

پہلا سا اب وہ حسنِ تکلم نہیں رہا — ہر روز بھانت بھانت کی سننے میں بولیاں
عریاں کیا ہے شاہدِ مضموں کے جسم کو — مسکی ہوئی ہیں آج حسینوں کی چولیاں
اے وائے شاعری کہ تخلص مسیحؔ ہے — لیکن جو شعر ہیں وہ مریضوں کی ڈولیاں

یقیں اے دل نہ کر تو حضرتِ واعظ کی باتوں کا
یہ لمبی داڑھیوں والے بڑے عیّار ہوتے ہیں

وہ شست باندھ کے کہتے ہیں لیجیے حضرت — یہ تیر آپ کلیجے کے پار دیکھیں گے

پہلی ہی ضرب آہ سے چکرا گیا فلک، — سچ ہے کہ سو سنار کی اور اک لہار کی

اے شیخ گو نہیں ہیں کوئی ذی شعور ہم — اتنا تو جانتے ہیں کہ تم بے شعور ہو

وعظ تو میں نے سن لیا اب یہ مجھے بتائیے
آئیں اگر وہ سامنے ذوقِ نظر کو کیا کروں

اب اس شکوے سے کیا حاصل کہ رہبر خود غرض نکلا
پرائی آس جو تکتے ہیں اکثر خوار ہوتے ہیں

غم جو کھاتا ہوں تو مجھ کو کھائے جاتا ہے یہ غم
کھاؤں گا پھر کیا میں دنیا بھر کا غم کھانے کے بعد

زمانہ حال کے برہمنوں پر کتنی اچھی طنز ہے ؎

بڑے شکی بڑے وہمی پھر اس پر یہ قیامت ہے   نہ ہاری ملننے والے نہ جیتی ماننے والے
کوئی رازِ خفی پنہاں نہ تھا جن کی نگاہوں سے   وہی اب اونٹ کو بھیڑوں میں ہیں پہچاننے والے
فراخی میں خدا جانے کہاں تک پاؤں پھیلاتے   جو اتنی تنگ حالی میں ہیں لمبی تاننے والے
بنا لیتے ہیں صافی اپنی دستارِ فضیلت کو   بہم مل بیٹھتے ہیں جب یہ گاڑھی چھاننے والے

عدل یہ تھا حُسن والوں سے بھی ہوتی باز پرس   کیوں فرشتوں کو اسیرِ چاہِ بابل کر دیا

نمازِ صبح سے پہلے نہ کی تدبیر حُقّے کی   تمہارے گھر میں فریادی رہی تقدیر حُقّے کی

وہ مدح کی کہ سُنتے ہی قاصد ہوا ہوُا   ہم نے اڑا اڑا کے کبوتر بنا دیا

اے کاش اس کو مجھ کو باہم گلے ملا دیں   دو آدمی یہاں کے دو آدمی وہاں کے

توند کا تمسخر اڑایا ہے، دیکھئے ؎

خالقِ خلق نے پرکار کو گز بھر کھولا   دائرہ کھینچ دیا ناف کا نقطہ لے کر
گز بھی بے کار رہا بازوئے خیاط کے ساتھ   ناپیے آپ ہی حضرت اسے رسّا لے کر
ڈوب جانے کا جنہیں خوف ہے گردابوں میں   مشک پر تیرتے ہیں نام وہ اس کا لے کر
رستہ مرگھٹ کا تو ہے اور طرف کو اے جوش   یہ کدھر جاتی ہے صحت کا جنازہ لے کر

تم اب تو جوش سیہ کاریوں سے باز آؤ   تمہاری ڈاڑھی میں حضرت سفید بال آئے

غیر کی تصویر پر کہتے نہیں اشعار ہم   بے زباں پر کیا کریں تیغِ زباں کا وار ہم

دوبارہ وہی بات کیوں پوچھتے ہو
اگر تم کو ثقلِ سماعت نہیں ہے

بحث مذہب کا نتیجہ کچھ نہیں   حجتِ صغریٰ و کبریٰ کے سوا

تقریر جاہلوں میں اثر خیز چاہیے   نخچیر سخت جاں ہے چھری تیز چاہیے

اب ناچنے گانے میں برائی نہ رہی   عریانیٔ تن پہ جگ ہنسائی نہ رہی
آوارگیٔ طبع سے نفرت تو کجا   ظاہر کی بھی انگشت نمائی نہ رہی

ہاتھ سے کاسہ گدائی کا نہ چھوٹا ایک دن   اور منہ سے تاج شاہی کے ہیں دعویدار ہم

آیئے ہر نوجوان کے دوش پر   تندرستی کا جنازہ دیکھئے

منحصر قوتِ بازو پہ ہے دولتمندی   دیکھ لو زور میں موجود ہے زر ۲/۴
ملک الموت سے دنیا میں ہراساں نہیں کیوں   جس کو کہتے ہیں نڈر اس میں ہے ڈر ۲/۴
ظالمو خوف کرو آہ کو سمجھو نہ حقیر   لفظ اللہ میں ہے اس کا اثر ۲/۴
کھوٹی منزل کیئے دیتی ہے تو اے شامِ شباب   راہ رو کا ابھی باقی ہے سفر ۲/۴

آج کل گرمی کی ہے رفتار گرم   ہر طرف ہے حشر کا بازار گرم
جل گیا جی شعلۂ آواز سے   مولوی صاحب کی ہے گفتار گرم
آتا ہے کھچ کھچ کے خلقت کا ہجوم   برف والوں کا ہوا بازار گرم
دوستوں کی سرد مہری دیکھ کر   اشک نکلے آنکھ سے دو چار گرم
ٹھنڈی آہیں تھیں یہ کچھ آتش نہ تھیں   آپ اتنے کیوں ہوئے سرکار گرم

سر میں سودائے دوئی دل میں بخار
ہے مزاج کافر و دیں دار گرم

ہمارے عشق نے مفہوم لفظوں کا بدل ڈالا
کہ جو دم پر بنا دے ہم اُسے ہمدم سمجھتے ہیں

حشر کا اے حضرتِ واعظ یہی مفہوم ہے
زندگی کے بعد دیکھیں گے تماشا ایک اور

آپ بے وجہ مدعی کیوں ہیں   آپ کا اس سے مدعا کیا ہے

ظریف لکھنوی

سید مقبول حسین ظریف لکھنوی حضرت عشق لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے اور انہی سے مشورۂ سخن لیتے تھے طبیعت میں بلا کی اور ظرافت تھی۔ ان کی زندگی نوابانہ فضاؤں میں بسر ہوئی۔ وہ تفریحاً شعر کہتے تھے، مقصد ہنسنا ہنسانا اور سماجی بے اعتدالیوں کو نشانہ طنز تھا۔ وہ جب کوئی بات اپنے ظریفانہ رنگ میں سمو کر کہتے تو گوناگوں دلچسپیاں پیدا کر دیتے۔ ان کی شہرت اودھ پنچ سے شروع ہوئی مشاعروں سے امنڈ کر تمام دنیائے اُردو پر چھا گئی۔ اب وہ قبر کا کونا آباد کر چکے ہیں۔

میونسپل الیکشن میں کھڑے ہونے والوں کو نام نہاد رہبری اور قومی ہمدردی کے بہانے اپنی عزت اور آبرو لٹا کر دیوانہ وار دد کی تلاش میں جو دربدری حاصل ہوتی ہے اس کا نقشہ ظریف نے ایک مسلسل نظم میں کمال طنز و ظرافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پہلا بند ملاحظہ ہو۔

واہ بی میونسپلٹی جان کیا کہنا ترا   تو بھی لیلیٰ کی عاشق تیرا مجنوں کا چچا
اپنی خودداری کو کھو کر تجھ پہ جو عاشق ہوا   پھر زبانِ حال سے اس کو یہی کہتے سنا
بس کہ دیوانہ شدم عقلِ رسا درکار نیست
عاشقِ میونسپلٹی را حیا درکار نیست

اس کے بعد ووٹ طلب کرنے والوں کے راستے میں جو دو چار سخت مقامات آتے ہیں ان کی تصویر کشی کی ہے ؎

سب سے پہلے ان کو جس ووٹر کے گھر جانا پڑا   شیخ بدھو نام تھا اور تھا جلاہا قوم کا

دھوتی باندھے مرزئی پہنے تنا بیٹھا ہوا   اک سڑا مٹی کا حقہ پی رہا تھا کچھ ادا
جاتے ہی تسلیم کی جب اس کو با صد احترام
منہ کو ٹیڑھا کر کے بولا "کو ہے بالیکم سلام"

اس جگہ سے اُٹھ کے گھر پر ایک صاحب کے گئے   دس برس ناکام رہنے پر ہوئے تھے جو بی اے
ریلوے میں تھے ملازم خود بھی تھے چلتے ہوئے   آپ کی تنخواہ تو کم تھا ٹھاٹھ تھے لیکن بڑے
انگلش اسٹائل پہ رہنے کا جوان کو شوق تھا
بوٹ بیڑی پاؤں میں کالر گلے کا طوق تھا

دیکھ کر صورت کو ان کی اس طرح کہنے لگے   آئی ایم ویری بزی میک ہیسٹ جلدی بولئے
پھر ادھر ٹہلے اُدھر ٹہلے گھڑی کو دیکھ کے   اپنے کتے سے کہا کم اون ان سے گو اوے
پھر کہا یو آر کنڈی ڈیٹ بٹ نو بولڈ مین
تم کو اپنی ووٹ کیسے دیگا صاحب اولڈ مین

اس نظم میں بعض بعض جگہ معنوی اور ظاہری پیروڈی کا دلچسپ امتزاج بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب میونسپل الیکشن کے امیدوار ایک مجتہد صاحب کی خدمت میں ووٹ کیلئے حاضر ہوتے ہیں تو وہ مجتہدانہ اُردو کا کمال دکھاتے ہیں۔ ظریفؔ لکھنوی انکے مخصوص طرزِ گفتگو کی پیروڈی اس طرح کرتے ہیں

ووٹ دے دوں گا عوض میں آپ کو تحسین کے   اتنے ہی ملتے ہیں مجھ کو وعظ کے تلقین کے
حضرتِ والا تو خود پابند ہیں آئین کے   اس سے کم لینا مرادف ہے، مری توہین کے
ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ تقلیل فرما دیجئے
ہے یہ کارِ خیر بس تعجیل فرما دیجئے

مشاعرہ کے عنوان سے ان کی جو نظم ہے اس کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ اس میں انہوں نے "مقامی بولی" کو اپنے اشعار میں جگہ دے کر اور

چُست مکالموں کی ایک مخصوص ظریفانہ کیفیت کی مدد سے نہ صرف کرداروں کو ابھارا ہے بلکہ مقامی رنگ کو بھی واضح کیا ہے ؎

تجھ میں اے ہندوستان کچھ آجکل حد سے سوا
چار سو پھیلی ہوئی ہے شاعری کی اک وبا
اس مرض میں اب تو اسّی فیصدی ہیں مبتلا
مستند شاعر ہے جس نے اک تخلص رکھ لیا

شاعری گو عہدِ ماضی میں تھی پایانِ علوم
اب تخلص میں سمٹ کر آگئی جانِ علوم

ہے بہت تکلیف وہ شاعر کی وہ جنسِ عجیب
جو سُنانے کے لئے بے چین رہتا ہو غریب
اس کو اچھا کر نہیں سکتا کوئی کامل طبیب
شاعری کی جس کو بدہضمی ہو ہیضے کے قریب

چاہتا ہے سب سُنا دوں جو کہوں اک سال میں
مبتلا ہے شاعری کے سخت تر اسہال میں

طرح کا مصرع نہیں بجلی کی ہے اک بیٹری
جڑ دی شاعر میں جہاں اس نے غزل اک ڈھال دی
دعوتِ شعر و سخن اب دل لگی ہے دل لگی
سال میں جتنے ہیں دن تعداد ان سے بڑھ گئی

جس جگہ شرکت نہ کی جائے وہی آزردہ ہے
سب کو خوش کرتا پھرے شاعر ہی کا دل گردہ ہے

تیری پالی دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں عوام
گرد تیرے حلقے کے اک گنوردل اژدہام
وہ غزل پڑھنا خوش الحانی سے تیرا وقتِ شام
واہ وا کا شور پھر جُھک جُھک کے وہ تیرا سلام

جمع ہوتی ہے تجھے ساری خدائی دیکھنے
طرح کے مصرع کے دانے پر لڑائی دیکھنے

اس طرح تعریف کرتے ہیں تری اکثر گزار ؎

بھائی مولا بکس جس بستی میں ہم آباد ہیں
اس جگہ ساعر بڑے بڑھیا ہیں مادر جاد ہیں

ان سبھوں میں سیکھ بدلوا کی جگت استاد ہیں ان کو ہر موئے کی گجلیں منہ جبانی یاد ہیں
جس جگہ استاد نے دو تین گجلیں جھاڑ دیں
ساعروں نے ہو کے سرمندہ بیاجیں پھاڑ دیں
پیسے والوں کی سمجھ میں آگئی ہے اب یہ بات صرف بے جا ناچ گانے کا ہے بالکل واہیات
جب کوئی جلسہ خوشی کا ہو کہیں پر ہو برات منعقد بزمِ سخن ہوتی ہے تا کٹ جائے رات
پہلے اربابِ نشاط آتے تھے گانے کے لئے
اب تو شاعر جاتے ہیں غزلیں سُنانے کے لئے

ظریف زبان اُردو کے سچے بہی خواہ تھے۔ وہ ان لوگوں کے سخت خلاف تھے جو نئی روش اختیار کرکے اُردو کو خراب کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ظریفانہ رنگ میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہتے تھے۔ ان کے اکثر اشعار میں اس قسم کے اشارے ملتے ہیں چند متفرق شعر ملاحظہ ہوں ؎

علم میں جھینگر سے بڑھ کر کامراں کوئی نہیں چاٹ جاتا ہے کتابیں امتحاں کوئی نہیں
لکھنؤ دہلی انہی شہروں پہ کیا موقوف ہے ہر جگہ اہلِ زبان ہیں بے زباں کوئی نہیں

یا تو کپڑے بھی پہنا کر کبھی دکھلا دو ہمیں یا تو باندھا نہ کرو شمع کا عریاں ہونا
ما مقیماں وہ دربار پہ میرا پڑھنا ان کے چہرے کا وہ غصے سے گلستاں ہونا

صفت تو دیکھیے ہر چند ہمت خود مونث ہے زنانہ یہ پہن کر جامۂ مردانہ آتا ہے
ستم ایجاد کہتے ہیں یہ کیوں معشوق کو شاعر ستم بھی کیا کوئی کل ہے جسے ایجاد کرتے ہیں

"سفرنامۂ عراق" ان کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ان کے رنگِ سخن کے تمام پہلو نمایاں ہیں۔ ہم سفر مستورات کا ذکر ہے تو خالص بیگماتی زبان میں ہے ؎

بیوی کی جھاڑو ایسے موئے بدمعاش پر اُترے یہاں یہ کوئی کہاں اس کی لاش پر

نوکر کا ذکر کیا ہے تو اس کی زبان پوربی ہے۔ وہ ملازم سخت نالاں ہے کہ اس کو جہاز کے خلاصیوں میں ٹھونس دیا گیا ہے اور اس کی کوئی

نہیں سُنتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

کھلا سین میں کوئی سنت بھری بات ہے   کپتان سے کہی تو سسر پھاڑ کھات ہے

اور جب خود اپنا حصہ نظم کرنے ہیں تو اپنی زبان ہے اور اپنا بیان ہے

اسٹیشنوں کی بھیڑ بھی اک یادگار تھی
عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی

ذیل میں ان کے ظریفانہ کلام کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

جنوں میں کیوں چلا میں دوڑ کر بھولا جو دم میرا   حماقت کی نشانی بن گیا نقشِ قدم میرا
شمیمِ زلفِ مشکیں سونگھ کر نکسیر پھوٹی ہے   ترے بالوں کی بُو سے ناک میں آیا ہے دم میرا
دفورِ شوق میں معشوق کو دے دے ٹپکتا ہوں   کوئی خلوت سرائے ناز میں دیکھے ادھم میرا
میاں فرہاد و مجنوں شیخ چلّی ہیں جو لڑتے ہیں   یہ کہتے ہیں عرب میرا وہ کہتے ہیں عجم میرا

بگولے ناچتے تھے نجد میں اور قیس عریاں تھا
یہ سب کیا تھا فقط لیلیٰ کی دلچسپی کا ساماں تھا
مرا دل ڈاک بنگلہ اور تصور خانساماں تھا
خیالِ یار جنٹلمین کی صورت سے مہماں تھا
جنوں اک شعبدہ تھا میرے خاک اُڑتے ہوئے دل کا
کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا
ظریفؔ اس کو طلسمِ بحرِ ہستی کیا نظر آتا
جو عاشق ان کا کچھوے کی طرح سر در گریباں تھا

خیالی ہجر میں نزعی مرض غم کا مرجانا
یہ سب کیا ہے سلامت جھوٹ کا پل سے اتر جانا
دولتی سے سمندِ ناز کی غیروں کا مرجانا
یہی تو ہے طویلے کی بلا بندر کے سر جانا
رُخِ روشن کی جھرّی حسن کا گویا ٹھٹھر جانا
قیامت ہے کسی معشوق کا سِن سے اُتر جانا
مری آہوں کی توپوں کا وہ خالی خولی ٹرّانا
وہ ان کا لاٹ صاحب کی طرح غیروں کے گھر جانا

ہجر کی گھڑیاں گنا کرتے ہیں عاشق رات بھر
یہ حسین معشوق بنتے بنتے گھنٹہ گھر بنے

جب سے عاشق ہو گئے اس بُت پہ چوکیدار تک
سونے والو جاگتے رہنا صدا دینے لگے
چھوٹے عاشق اس سے بڑھ کر اور کیا دیتے ثبوت
ہو گئے گندہ دہن بوسے وفا دینے لگے
جب مسیحا سے نہ اچھے ہو سکے بیمارِ غم
ہو گئے کھسیانے سبھوں کو سنکھیا دینے لگے

کوئی دِلِ بیمار کو ڈانٹے کہ ٹھہر بھی
او تھالی کے بینگن تو اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
گر رُخ پہ نقاب اس کے ہے گر ہاتھ میں تلوار
معشوق وہ معشوق جو مادہ بھی ہو نر بھی
سُن لیجئے بغیر اس کے ہے تشبیہ بھی نازک
عیسیٰ ہیں اگر آپ تو اک پالیے خر بھی
تحریر کا عنوان نئی تہذیب نے بدلا
معشوق کے القاب میں ہے مائی ڈیر بھی
یہ حُسن نرالا ہے کہ دو عضو ندارد
معشوق وہ ہے جس کے دہن بھی ہو کمر بھی
کہتی ہے سدا صاحبِ مقدور کی اولاد
ترکہ ملے ہم کو ارے جلدی کہیں مر بھی
بلبل کہو تم شوق سے ایسے شعراء کو
اک چونچ بھی جس کی ہو ظریف اور ہوں پر بھی

دور تک آہ رقیبوں کو بھگا آتی ہے
مچھر اُڑ جاتے ہیں جس وقت ہوا آتی ہے

نفع اتنا تو ہوا اسس مڈ یکل کالج سے   نیرے بیمار کے پینے کو دوا آتی ہے

رنگ غصہ میں بدلتے ہیں وہ گرگٹ کی طرح   حسن کی اپنے دکھاتے ہیں کرامات مجھے

دال دھوئی ماش کی کھالی ہے نازک خوئے دوست   بالش دبستر سے مجھ کو آرہی ہے بوئے دوست
کم حقیقت نیشن زن اغیار ہیں بیٹھے ہوئے   دیکھ لو دیکھے نہ ہوں تم نے اگر پسوئے دوست

جناب شیخ گئے اسپتال بہرِ علاج
ملاحظہ ہو ذرا یہ ادائے رندانہ

موذن صدا سُن کر جو مستِ ناز چونک اُٹھا
تو یہ سمجھا کسی بلی نے پکڑی ٹانگ مٹیّاں کی

کیا کرتے ہیں استعمال جو کھانے میں پاپڑ کا
رہا کرتا ہے ان کے پیٹ میں اک شور گڑبڑ کا

کہا معشوق کو قاتل تو بھنگی کیوں نہیں کہتے
یہ کیا جلاد ہو سکتا ہے بہتر ہو نہیں سکتا

فلک نما ہے بلندی میں آبلا دل کا   جوابِ شیش محل ہے دو منزلا دل کا
حوادث کی چپتیں بہت کراری ہیں   کہیں دماغ نہ ہو جائے پلپلا دل کا
ظریف حشر میں ہو گی تلاشی اعمال
فرشتے کھول کے دیکھیں گے پوٹلا دل کا

احمق پھپھوندوی

مصطفیٰ خاں نام تھا، احمق تخلص۔ پھپھوند ضلع اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ وہیں شورے کی ایک فیکٹری قائم کر رکھی تھی۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں بقدرِ ضرورت دستگاہ رکھتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے، غزلوں میں جا بجا ظرافت شامل ہوتی تھی۔ ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء کی تحریکِ خلافت کے زمانے میں قید ہو گئے۔ اس وقت سے سیاسی مضامین کو بھی داخلِ غزل کر لیا اور ایک چھوٹا سا مجموعہ "زندانِ حماقت" کے نام سے شائع کرایا اور بھی متعدد مختصر مجموعے چھپ کر متبسم گردیدگی کا باعث ہوئے۔ ۸ر اگست ۱۹۵۰ء کو انتقال ہوا۔

احمق کے کلام کو جہاں ایک حیثیت سے کشتِ زعفران کہا جا سکتا ہے وہاں دوسری حیثیت سے دفترِ موعظت و درسِ عبرت کا لقب بھی دیا جا سکتا ہے۔ تغزل کے نقطۂ نظر سے بھی ان کے اکثر اشعار وجدانِ صحیح اور مذاقِ سلیم پر پورے اترتے ہیں۔ وہ کبھی سیاست کو کبھی مذہب کو اور کبھی معاشرت کو اپنے ظریفانہ انداز میں نشانۂ طنز بناتے ہیں۔ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے ؎

نئی حد بندیاں ہونے کو ہیں آئینِ گلشن میں کہو بلبل سے اب انڈے نہ رکھے آشیانے میں
پچھتر لاکھ اک بیکار مد میں صرف کر دیں گے رعایا کے لیے کوڑی نہیں جن کے خزانے میں
جو ارزاں ہے تو ہے ان کی متاعِ آبرو ورنہ ذرا سی چیز بھی بے حد گراں ہے اس زمانے میں
جفا و ظلم نصب العین ہوگا جس حکومت کا یقیناً خاک ہو جائے گی وہ تھوڑے زمانے میں
وہ اک روٹی جو ہم کو برہمن مشکل سے دیتا ہے ہزاروں بت ہوا کرتے ہیں اس کے دانے دانے میں

دل دیوانہ اپنا مبتلائے زلفِ پیچاں ہے بہر صورت ہمارے جیل میں جانے کا ساماں ہے
ہوئے ہیں نامزد جب سے بڑے صاحب کے دفتر میں جنابِ شیخ کا سینہ تجلی زارِ عرفاں ہے

طے کر چکے منازل تہذیب و ارتقا کے ڈالیں اب اہلِ یورپ دنیا میں خوب ڈاکے
ناسوتیوں کے آگے لاہوت کے مسائل آئے ہیں شیخ صاحب شاید کچھ آج کھا کے
سمجھے تھے جاں کنی سے اینٹھے جو خاں بہادر بولی اجل اکڑنا اب تم لحد میں جا کے
ہے فکرِ عیش و راحت لے شیخ تجھ کو ناحق آیا تو ہے فقیری تقدیر میں لکھا کے

ہاں اے نگہِ کونسل وہ زور کا کنزڑ دے   جو خان بہادر کو مدہوشِ دف کر دے
کس طرح سے پھر لڑکے ایمان پہ رہیں قائم   وہ برقِ کلیسا جب اسکول میں لکچر دے
کیا فرض ہے ہم اس پہ ایمان ہی لے آئیں   ہر وہ خبرِ مہمل جو دفترِ ریوڑ دے

دعوئے عہدِ وفا و عشق دشمن ہو گیا   وصل میرا رہ گیا ان سے کرسمس ہو گیا

یہ سمجھ کر بھی بغیر اس بزم کے سیری نہیں   ان کے ہاں کتے کی عزت ہے مگر میری نہیں

بڑھاپے میں انہیں تعلیم انگریزی کی سوجھی ہے   جنابِ شیخ کو بھی فتنہ انگیزی کی سوجھی ہے

شیخ جی کیوں وِرد یا موجود یا مقصود ہے   آپ کا مقصود راہِ عشق میں موجود ہے
جس کے گھر میں کل کے کھانے کے لیے موجود ہے   آج وہ فرعون ہے شدّاد ہے نمرود ہے
کیا ہوا ہم کو اگر نانِ شبینہ بھی نہیں   آپ کی خاطر تو اے صاحب ڈنر موجود ہے

اللہ اللہ کس قدر سہمے ہوئے رکھتے ہیں پاؤں   ناکِ عاشق کیا ہے گویا جرمنی بارود ہے
کہتے ہو کھا جائیں گے کچا ترے دل کو یہ کیا   وہ بھی ہے اک ناشپاتی یا کوئی امرود ہے

میرے سنبھالنے کی فکریں تو بعد کی ہیں   پہلے ذرا تم اپنا پتلون تو سنبھالو
شام و عراق و ٹرکی سب ہیں تمہاری خاطر   مرقد کی فکر کیا ہے چاہو جہاں بنا لو

بھاگنے کی ہے یہاں راہ نہ پٹنے کی سکت   آہ لائی ہے کہاں حسرتِ دیدار مجھے
میں وہ پنڈت ہوں کہ اس دور کے اکثر مہراج   دور سے دیکھ کے کرتے ہیں نمسکار مجھے
آج کل مدِ نظر ہے مجھے صحت کا خیال   ورنہ پینے سے تو ہرگز نہیں انکار مجھے
خدمتِ قوم فروشی کو دعا دیتا ہوں   ورنہ اک عمر سے تھی حسرتِ دربار مجھے

کھڑے ہو کر جنہیں پیشاب کرنا بھی نہیں آتا   وہ ناحق کرسیوں پہ بیٹھنے کی مشق کرتے ہیں
یہ شوخی یہ شرارت یہ دل آرائی کہاں ان میں   مسوں کے چاہنے والے کہیں موڑں پہ مرتے ہیں
وہ گل رخسار جن کے باغ میں بلبل چہکتے تھے   اب ان کی قبر کا سبزہ گدھے اور بیل چرتے ہیں

گئے وہ دن کہ چمپا اور نرگس کی بہاریں تھیں   بس اب یا سمنٹ ہے اس انجمن میں یا لونڈر ہے
رقیب روسیہ کی صورت و سیرت معاذ اللہ   بلا تشبیہہ وہ لنگور کی اولاد بندر ہے
سنبھل او آسماں پتلون کے تسمے ذرا کس لے   کہ میری آہِ سوزاں اب مرے کہنے سے باہر ہے
خدا کی شان کپڑا بھی ہمیں بننا نہیں آتا   کفن کے واسطے بھی احتیاجِ مانچسٹر ہے

پڑھ کے انگریزی دماغ اس کا فلک پر ہو گیا   جانتا ہے خود کو باورچی کہ بٹلر ہو گیا
صحبتِ صالح میں رہ کر ہو گئی اصلاحِ حال   میں گدھا تھا شیخ کے پاس آگے خچر ہو گیا

خانۂ دل میں خیالِ یار رہنے دیجئے
اس مکان کا یہ کرایہ دار رہنے دیجئے

باوجود اس التفاتِ خاص کے بھی شیخ جی   بارہا پکڑے گئے ہیں اس کے گھر جاتے ہوئے
ایسے وعدے سے تو اچھا تھا کہیں انکارِ وصل   دو مہینے ہو گئے ظالم کو ٹرخاتے ہوئے

گلِ عارض پہ ترے بلبلِ شیدا کی طرح   ایک اُلّو بھی تو کم بخت غزل خواں نہ ہوا

چمن جب نذرِ صرصر ہونے والا ہے تو اے بُلبل   یہاں گھونسلے کس واسطے تو نے بنائے ہیں

جنابِ شیخ کی دستار ہے یا دامنِ تقویٰ   کوئی شے میکدے میں اڑ رہی ہے دھجیاں ہو کر

لڑکپن ہی میں جن کو دل چرا لینے کی عادت ہے   ڈکیتی پر بھی آجائیں گے وہ شاید جواں ہو کر

کہہ رہا ہے یہ آپ کا انکار   نوبت آئے گی ہاتھا پائی کی
ہائے تقریب وصل کیا ہو گی   ان کو عادت نہیں مشکشائی کی
سچ تو یہ ہے کہ شیخ جی تم نے   کاٹ لی ناک پارسائی کی

آنکھوں نے رو کے نام ہی بالکل ڈبو دیا   گنگا کا گھاگرا کا اٹک کا چناب کا
شیخ اشتہار بانٹتے پھرتے ہیں شہر میں   نیلام ہونے والا ہے ٹھیکہ شراب کا

اور تھا کیا مجھے پالش کا صلہ کیا ملتا   حضرتِ بوٹ کی سرکار سے ٹھوکر کے سوا

قدرِ موزوں کو جانتا ہوں مجبور   شاعری مجھ کو کر نہیں آتی

تیری نگہ کے واسطے اے فتنہ خو نہیں   دل ہے ہمارے پاس مگر فالتو نہیں

ہم اور عرضِ مطلب ان سے عدو کے گھر میں   دیکھیں تو بال کتنے رہتے ہیں آج سر میں
دل جس پہ مبتلا ہے بس وہی دل آرا   مانا ہیں داغ رُخ پر مانا ہے گنج سر میں
کہتے نہ تھے کہ دیکھو دشمن سے دور رہنا   اب کیا بتائیں تم کو کیوں درد ہے کمر میں
ڈر ہے جنابِ احمق جوتے نہ کھائیں اک دن
چھپ چھپ کے روز قبلہ جاتے ہیں ان کے گھر میں

جوش ملیح آبادی

شاعرِ انقلاب شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بشیر احمد خاں بشیر اور دادا نواب محمد احمد خان احمد دونوں صاحب دیوان شاعر تھے۔ جوش کے پردادا نواب حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویا (شاگرد ناسخ) کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جوش نے شعری فضا میں آنکھ کھولی اور شاعری کی گود میں پرورش پائی۔ ابتدا میں عزیز لکھنوی سے اصلاح لی، لیکن بعد میں اپنے وجدان و ذوق ہی کو رہبر بنایا اور اس فن میں کمال حاصل کیا۔ اب ان کا شمار عصرِ حاضر کے ان شعراء میں ہے جو نظم و نثر پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں۔

روحِ ادب، اوراقِ سحر، مقالاتِ زریں، جذباتِ فطرت، آوازۂ حق، جنون و حکمت، سیل و سلاسل، عرش و فرش، فکر و نشاط، حسین اور انقلاب، شاعر کی راتیں، آیات و نغمات، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، حرفِ آخر، سیف و سبو، پیغمبرِ اسلام، اشارات وغیرہ۔

تقسیمِ ملک سے پہلے جوش دہلی سے ماہنامہ "کلیم" نکالتے تھے۔ تقسیم کے بعد ماہنامہ "آج کل" کے چیف ایڈیٹر ہو گئے۔ مگر بھارت میں اپنا مستقبل تاریک دیکھ کر نومبر ۱۹۵۵ء سے کراچی آ گئے ہیں اور پاکستان کے شہری بن گئے ہیں۔

جوش کے کلام میں شکوہِ الفاظ کے ساتھ ساتھ بڑی رنگا رنگی، وسعت اور تنوع ہے۔ حقائق و معارف، حسن و عشق، خمریات اور طنزیات غرضیکہ کیا نہیں ہے۔

طنز میں ان کی ایک مخصوص روش ہے، جس کا اظہار غزلوں اور رباعیوں میں ہوتا رہتا ہے۔ مگر ان کی نظریات میں جوش و خروش اور نفرت و حقارت زیادہ اور لطافت و گہرائی کم ہے۔ وہ مُلّا اور شیخ کی پگڑی محض اس لیے اچھالتے ہیں کہ وہ ان کی رندی کے راستے میں روک ثابت ہوتے اور ان کو کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ البتہ وہ مہاجن کے حرص و ہوا کا مذاق اڑانے اور انسان کی عالمگیر ناہمواریوں کے مضحک پہلو دکھلانے میں خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ ذیل میں ان کی طنز و ہجو کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے ؎

زاہد رہِ معرفت دکھا دے مجھ کو   یہ کس نے کہا ہے راہزادے مجھ کو
کافر ہوں! ہوئی یہ تو مرض کی تشخیص   اب اس کا علاج بھی بتا دے مجھ کو

قد کی لمبائی سے اک حد تک کمر جھولی ہوئی   سر پہ پٹیا مُردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی
کہنیاں تکیے کے اندر روزن سے دھنستی ہوئی   چُست صدری دائرے پر توند کے پھنستی ہوئی
ہنس کے غوطے آبِ سرد و گرم میں دیتا ہوا   قرض کے طالب علموں کا امتحان لیتا ہوا

(مہاجن)

الاماں خانقاہ کی دنیا — معصیت کی گناہ کی دنیا

دوڑتا ہے یہاں ٹھہر کے سمند — یاں توکل ہے حرص کا پابند
یاں قناعت سے عارفانِ خدا — کام لیتے ہیں سکہ سازی کا

ہر ادا میں ہے تاجرانہ کمال — ہر بُنِ مو ہے اک دستِ سوال

کون بہتر ہے ایزدِ باری — ان کا تقوٰی کہ میری میخواری (خانقاہ)

ہر سانس کو وقفِ صد شرارت کر دیں — اخلاق کی کچھ عجیب حالت کر دیں
مفلس کہ امیروں کے گناتے ہیں گناہ — دولت انہیں دے دو تو قیامت کر دیں

چھین لی تم نے نسائیت سے ہر شیریں ادا — مرحبا اے نازک اندامانِ کالج مرحبا

انکھڑیوں میں عشوۂ ترکانہ درکھے ہوئے — سینٹ کی خوشبو میں ڈوبے ناز پر تولے ہوئے

خال و خد سے جذبہائے صنفِ نازک آشکار — کرزنی چہروں میں زن بننے کے ارماں بے قرار

الاماں! یہ زینتیں منہ پہ ہیں گو اترے ہوئے — ذوق سے گھنگرو کا گیٹس پاؤں میں پہنے ہوئے

ریشمی رومال سے ہے فرقِ نازک پر بہار — اوڑھنی پر دیدنی ہے راہ کا گرد و غبار

پاؤں رکھنے ہر دمِ گلگشت کس کس ناز سے — لے میں قربان رن میں نکلے ہے اس انداز سے

شغلِ زینت سے تمہیں فرصت مگر ملتی نہیں
کیا تمہارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں

(نازک اندامانِ کالج)

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ — پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زاہد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ — ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الٰہ

برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہو گیا
ایماں دلوں میں لرزہ براندام ہو گیا
ہاتھ اس نے فاتحہ کو اُٹھائے جو ناز سے   آنچل ڈھلک کے رہ گیا زُلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے   دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے
پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئی
اک پیر کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی
زاہد حدودِ عشقِ خدا سے نکل گئے   انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے   کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصہ دین، کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہو گیا

اے ہم نشیں فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ   رودادِ جام بخشیٔ پیرِ مغاں نہ پوچھ
بربط سے کیوں بُلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ   کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ

(فتنۂ خانقاہ)

کیا کیا نہ گل کھلے روشِ فیضِ عام سے
کانٹے پڑے زباں میں پھولوں کے نام سے

اُبھرے تو جوشِ بادہ گساراں نہیں رہا   بادل گھرے تو رنگِ بہاراں نہیں رہا
راتیں کھلیں تو رقصِ نگاراں نہیں رہا   بوتل کھُلی تو مجمعِ یاراں نہیں رہا
کوئی سبیل بادہ پرستی نہیں رہی
مستی کی رات آئی تو ہستی نہیں رہی

عاشق جو وصلِ یار سے خورسند ہوگیا فالج گرا دماغ پہ دل بند ہو گیا
اُترا بخارِ عقل کو طاعون ہوگیا پیدا ہوا لہُو تو جگر خون ہو گیا
بخیہ ہُوا تو اور بھی چادر ادھڑ گئی
بندھن کھلے تو جسم کی رگ رگ اکڑ گئی

چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمان ہی کی بات چلی اور نہ رام کی گدی سے کھینچ لی گئی جو زبان تھی عوام کی
حیوان بوکھلا گئے مُنہ کھولنے لگے
انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے

سرو سہی نہ سازد نہ سنبل نہ سبزہ زار بلبل نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جامِ جم نہ جوانی نہ جوئبار گلشن نہ گلبدن نہ گلابی نہ گلعذار
اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

نامِ آزادی

شادؔ عارفی

خاں احمد علی شاد سنہ ۱۹۰۱ء میں ریاست لوہارو میں پیدا ہوئے لیکن قیام رامپور میں ہے۔ سماج ان کی تصنیف ہے۔ نظم اور غزل دونوں میدانوں میں سنبھال کر قدم رکھتے اور نئے نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں خوبصورت الفاظ کے پردے میں بڑی لطیف اور نازک طنز ہوتی ہے اور ہلکی ہلکی ظرافت بھی۔ ایک غزل اور ایک نظم نمونے کے طور پر پیش ہے۔

ہیں پڑوسی ہوں بڑے دین دار کا کیا بگڑتا ہے مگر مے خوار کا؟
ہم وطن کے ہیں وطن سرکار کا حکم چلتا ہے مگر زردار کا

خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے   "کیا کریں گے ابرِ گوہر بار کا"
یہ "چھچھورا شخص" پہچانے اسے؟   خون ہے اس نے کسی سرکار کا
پھر رہا ہے ناک کٹوائے ہوئے   ہائے رتبہ شاعرِ دربار کا
سو گئی ہو جیسے گھوڑے بیچ کر   ہے وہ عالم قسمتِ بیدار کا
واں کسی انصاف کی امید کیا   ہو بڑا اٹکا جہاں سرکار کا
بعض احمق تک رہے ہیں آج بھی   آسرا گرتی ہوئی دیوار کا
جب سے پی ہے پی رہا ہے آج تک   شیخ بھی ہے "آدمی کردار کا"

مجھ سے بہتر ہیں مرے اشعار شاد
باڑھ کاٹے نام ہو تلوار کا

آپ کی تعریف

یہ مدرس ہیں کسی اسکول کے۔

پانچ بچے، ایک بیوی، ایک ماں   بیس ماہانہ، بہت ہیں کم کہاں
ان کے جوتے بخیہ گر سیتے نہیں   سول بھی غائب اگر فیتے نہیں
ٹیوشن چاہیں تو کر سکتے نہیں   سر کھپا کر پیٹ بھر سکتے نہیں
لوٹ کر آئے ہوں جیسے ڈھول میں   یہ مدرس ہیں کسی اسکول میں

حافظِ قرآن ہیں قاری ہیں یہ

گھر پہ بچوں کو دو آنے سبق   قرأت و تجوید پر سعی ادق
پاؤں میں جوتا نہ کپڑا تن پہ ہے   نیستی چھائی ہوئی مسکن پہ ہے
لیتے ہیں صدقاتِ عید الفطر بھی   رہتی ہے دو روٹیوں کی فکر بھی

قوم سے مایوسِ غم خواری ہیں یہ   حافظ قرآن ہیں قاری ہیں یہ
معتصم باللہ نامی مولوی

آپ ہیں پرہیزگار و نیک خو   غسل کی تعلیم ترتیبِ وضو
اب تہجد، چاشت جب، اشراق تب   ہے تیمم کا مگر اطلاق کب
یہ صلہ اُس درس اس تدریس کا   خرچ سو کا اور وسیلہ تیس کا
عہدِ نو میں ہیں سپردِ مفلسی   معتصم باللہ نامی مولوی
"لکھنؤ ٹائپ" پروفیسر ہیں آپ

اچکنیں گرمی میں اور جاڑے میں سوٹ   فخر آبا پہ قصد سے جھوٹ موٹ
روز دو گھنٹے تو لیتے ہیں کلاس   اور لڑکے فیل ہو جائیں کہ پاس
پانسو تنخواہ اور "لاجنگ" فری   ہائے "تنظیم وطن کی زرگری
حافظِ قرآن سے بہتر ہیں آپ   لکھنؤ ٹائپ پروفیسر ہیں آپ
یہ کروڑی مل، ہزاری لال ہیں۔

ڈاکٹر بھی ہیں طبیب و وید ہیں   مطمئن ہیں ان سے بکر و زید بھی
ماہرِ امراضِ چشم و بے سند   ہوں اگر روپے بتانے "بیڈ ریڈ"
نذر بچھڑے بن نہیں ملتا دماغ   مفت کا پرچار، کورا سبز باغ
آدمیت سے نرے کنگال ہیں   یہ کروڑی مل، ہزاری لال ہیں
ڈالیے یہ سب دوائیں صبح و شام
جی نہیں، ہو گی نہ سُرخی دُور کیوں   پھوٹ گیا یہ زخم کا انگور کیوں؟

اس میں پنکی اس میں ڈاہانٹ پنٹ ہے   ہر دوا مخصوص ہے پیٹنٹ ہے
"ریڈ بلو" یہ ہے تو وہ "سلور ڈراپ"   تا کہ اصلیت سمجھ پائیں نہ آپ
سگرٹوں پر جن کے رکھ چھوڑے ہیں نام   ڈالیے یہ سب دوائیں صبح و شام
"مال" پر ٹی۔بی کلینک ان کا ہے

آپ کو تھی عالمِ بالا میں دق   داخلِ فطرت ہے جرثوموں کی شق
منتقل ہو کر چچا میں باپ میں   آپ کے دادا سے آئی آپ میں
پھیپھڑوں کا "اکس رے" کروائیے   فیس، کیا حاجت ہے، اچھا لائیے
مشورہ ہر طرح مہلک ان کا ہے   "مال" پر ٹی۔بی کلینک ان کا ہے
حرص کی دق کھائے جاتی ہے انھیں:

یہ جو الجھن آپ کو دانتوں کی ہے   سب خرابی آپ کو دانتوں کی ہے

ہر مسوڑھا پیپ سے بھرپور ہے   دو روپے فی دانت کا دستور ہے

بدنما چہرے کا غم کیوں کیجیے   ایک بتیسی نہ بنوا لیجیے
نت نئی چالیں سکھاتی ہے انہیں   حرص کی دق کھائے جاتی ہے انہیں
ہیں تو "بی۔ اے" نام ایم اے خاں ہے۔

یہ شکایت ہے خدا سے آپ کو   کیوں نہ مغرب سے اُتارا باپ کو
عقد "کالی ماں" سے فرماتے نہ یہ   اور مشرق میں جنم پاتے نہ یہ
ناچتے جا جا کے "رائل بال" میں   پھانستے شہزادیوں کو جال میں
ان کی "رنگت" پر "توا" حیران ہے   ہیں تو بی اے نام ایم اے خاں ہے

قوم سے مایوسِ غم خواری ہیں یہ
حافظ قرآں ہیں قاری ہیں یہ

معتصم باللہ نامی مولوی

آپ ہیں پرہیزگار و نیک خو
غسل کی تعلیم ترتیبِ وضو
اب تہجد، چاشت جب، اشراق تب
ہے تیمّم کا مگر اطلاق کب
یہ صلہ اس درس اس تدریس کا
خرچ سو کا اور وسیلہ تیس کا
عہدِ نو میں ہیں سپردِ مفلسی
معتصم باللہ نامی مولوی

"لکھنؤ ٹائپ" پروفیسر ہیں آپ

اچکنیں گرمی میں اور جاڑے میں سوٹ
فخر آبا پہ قصد سے جھوٹ موٹ
روز دو گھنٹے تو لیتے ہیں کلاس
اور لڑکے فیل ہو جائیں کہ پاس
پانسو "تنخواہ اور" لاجنگ" فری
ہائے "تنظیمِ وطن کی زرگری
حافظِ قرآں سے بہتر ہیں آپ
لکھنؤ ٹائپ پروفیسر ہیں آپ

یہ کروڑی مل، ہزاری لال ہیں۔

ڈاکٹر بھی ہیں طبیب و وید بھی
مطمئن ہیں ان سے بکر و زید بھی
ماہرِ امراضِ چشم و بے سند
ہوں اگر رد ہے بتانے "ریٹنہ"
نذر بگڑے بن نہیں ملتا دماغ
مفت کا پرچار، کورا سبز باغ
آدمیت سے ترسے کنگال ہیں
یہ کروڑی مل، ہزاری لال ہیں

ڈالیے یہ سب دوائیں صبح و شام

جی نہیں، ہوگی نہ سرخی دور کیوں
پھٹ گیا یہ زخم کا انگور کیوں؟

اس میں پنکی اس میں وہائٹ پنیٹ ہے
ہر دوا مخصوص ہے پیٹنٹ ہے
”رڈ بلو“ یہ ہے تو وہ ”سلور ڈراپ“
تاکہ اصلیت سمجھ پائیں نہ آپ
سگرٹوں پہ جن کے رکھ چھوڑے ہیں نام
ڈالیے یہ سب دوائیں صبح و شام

”مال“ پر ٹی۔بی کلینک ان کا ہے

آپ کو بھی عالمِ بالا میں دق
داخلِ فطرت ہے جرثوموں کی شق
منتقل ہو کر چچا میں باپ میں
آپ کے دادا سے آئی آپ میں
پھیپھڑوں کا ”ایکس رے“ کروائیے
فیس، کیا حاجت ہے، اچھا لائیے
مشورہ ہر طرح مہلک ان کا ہے
”مال“ پر ٹی۔بی کلینک ان کا ہے

حرص کی دق کھائے جاتی ہے انھیں:

یہ جو الجھن آپ کو دانتوں کی ہے
سب خرابی آپ کو دانتوں کی ہے
ہر مسوڑھا پیپ سے بھرپور ہے
دو روپے فی دانت کا دستور ہے

بدنما چہرے کا غم کیوں کیجیے
ایک بتیسی نہ بنوا لیجیے
نت نئی چالیں سکھاتی ہے انہیں
حرص کی دق کھائے جاتی ہے انہیں

ہیں تو ”بی۔اے“ نام ایم اے خاں ہے۔

یہ شکایت ہے خدا سے آپ کو
کیوں نہ مغرب سے اتارا باپ کو
عقد ”کالی ماں“ سے فرماتے نہ یہ
اور مشرق میں جنم پاتے نہ یہ

ناچتے جا جا کے ”رائل بال“ میں
پھانستے شہزادیوں کو جال میں
ان کی ”رنگت“ پہ ”توا“ حیران ہے
ہیں تو بی اے نام ایم اے خاں ہے

لائے ہیں لندن سے بوڑھی میم ساتھ

ڈالیاں، تحفے، سفارش، مے شباب   آئی۔ سی۔ ایس کو کلیدِ فتحِ باب
"فیملی ممبر" بنے تھے اس کے ہاں   چشمِ مغرب میں شعورِ سن کہاں

الغرض پہنچے جو صاحب اپنے گھر   تھے یہ "ناکارہ سیلیپر" ہم سفر
آپ سے پہلے ملاؤ اس سے ہاتھ   لائے ہیں لندن سے بوڑھی میم ساتھ

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن حسرت سنہ ۱۹۰۴ء میں پونچھ (کشمیر) کے ایک گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں لاہور آکر بی۔ اے کا امتحان دیا اور معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا، لیکن کچھ دنوں بعد کلکتہ جا کر اخبار نویسی شروع کر دی اور عصرِ جدید، نئی دنیا، جمہور، استقلال اور پیغام وغیرہ جرائد میں ادارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کولمبس کے نام سے مزاحیہ کالم لکھے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں مولانا ظفر علی خاں انہیں لاہور لے آئے اور یہاں حسرت نے زمیندار، انصاف، احسان، احرار، شہباز، شیرازہ، تہذیبِ نسواں اور دیگر اخبارات کے اداروں میں کام کیا اور سندباد جہازی کے نام سے مزاحیہ کالم لکھے۔

دوسری جنگ کے شروع میں فوجی اخبار کے ایڈیٹر ہو کر برما اور ملایا گئے مگر واپس آکر روزنامہ امروز کی ادارت سنبھالی۔ ۱۰ر جنوری سنہ [illegible]ء کو یہاں سے مستعفی ہو کر ریڈیو پاکستان میں قومی پروگرام مرتب کرنے پر ملازم ہو گئے۔ آخر پھر لاہور آگئے اور نوائے وقت میں "سرِ راہے" کا کالم لکھنے لگے۔ اس دوران میں آپ کو دل کا عارضہ ہو گیا اور آپ ۲۶ر جون سنہ ۱۹۵۵ء کو ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

حسرت ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ بے مثال مزاح نویس اور طنز نگار بھی تھے۔ ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ سیاست کے نشیب و فراز سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور نت نئی سیاسی تحریکات پر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب روشنی ڈالتے اور سیاسی شخصیتوں کے بظاہر سنجیدہ مگر چھپے ہوئے مضحک پہلو نمایاں کرنے میں کمال کر دکھاتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ نے مندرجہ ذیل تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

جغرافیہ پنجاب جدید، مردم دیدہ، دو ڈاکٹر، کیلے کا چھلکا، زدِ ننج کے خطوط اور مطائبات وغیرہ۔ پربت کی بیٹی، اقبال، کشمیر اور سرگذشتِ اسلام بھی آپ کی چند قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔

حسرت طنز و مزاح کی تخلیق میں مبالغہ، موازنہ، واقعہ، بذلہ سنجی، جگت بازی، تحریف و تصرف اور لفظی الٹ پھیر وغیرہ تمام ہتھیاروں سے کام لیتے اور ٹکسالی زبان استعمال کرتے تھے، اس لیے ان کے طنز و مزاح میں ہر قسم کے رنگ ملتے ہیں۔ وہ زیادہ تر نثر ہی میں لکھتے تھے۔ لیکن جب کبھی موج میں آتے تھے، تو ان کے مزاحیہ کالم میں اشعار بھی ٹپک پڑتے تھے۔

اتحاد پارٹی کی شان میں چند شعر دیکھیے ؎

ترے گورے گورے گال — اتحاد پارٹی
ترے لمبے سلمبے بال — اتحاد پارٹی
ترا یار نریندر ناتھ — اتحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے ساتھ — اتحاد پارٹی

جب میاں ممتاز دولتانہ اور میاں عبدالباری یکے بعد دیگرے صوبہ مسلم لیگ کے صدر ہوئے، تو حسرت نے یہ مزیدار گیت لکھا۔

چنا جور گرم

میرا چنا ہے سب سے نیارا — جس کو کھائے عالم سارا
منشی، متصدی، پٹواری — جما، فتا، عبدالباری

چنا جور گرم

میرے چنے کا ڈھنگ نرالا — اس کو کھائے قسمت والا
اس کے گاہک ٹھرے والے — یعنی ہپ ہپ ہرّے والے
سارے مہاجر اور انصاری — چیمہ، لڈن، عبدالباری

چنا جور گرم

حسرت کا اندازِ تحریر شستہ و رفتہ ہونے کے علاوہ نہایت شگفتہ ہوتا تھا۔ وہ جب کسی پر چوٹ کرتے، تو ان کی طبیعت جوہر دکھاتی۔ ایک زمانے میں ہمارے ہاں ادبِ لطیف اور بلینک ورس کا بڑا چرچا تھا۔ لیکن اس مال کی کھپت اس کی پیداوار کی تھا ہو سکی۔ حسرت نے اس صنفِ ادب کا مذاق اڑاتے اڑاتے کئی طنزیہ نظمیں لکھ ڈالیں۔ ایک نظم دیکھیے ؎

چٹنیں لکھتے تھے جب اخبار میں ہم
تو مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پہ
سنا ہے کیا کہا انگور نے آلو بخارے سے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
یہ بھینسیں، آہ یہ بھینسیں!
ہوا میں تیرتے ہیں قہقہے جن کی جگالی کے
میرے کمرے کی تنہائی میں اکثر آنکلتی ہیں
لیے شبنم کی چادر اور کفن نرگس کے بادا کا
کہا سوسن نے مچھر سے
کہ میری رُوح کا نغمہ مرے صندوق میں ہو گا
میں بھول آیا ہوں گچھا چابیوں کا آج دفتر میں
جو امرت سر سے اپنے مجھ کو حصّہ آپ دے دیتے
کسی کا کیک بگڑ جاتا مرا لاہور ہو جاتا

مجید لاہوری

مجید لاہوری کا خاندانی نام عبدالمجید چوہان اور قلمی نام نمک لاہوری تھا۔ ۱۹۱۳ء میں بمقام گجرات پیدا ہوئے اور ۲۶ جون ۱۹۵ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ ذریعہ معاش صحافت تھا۔ کراچی سے پندرہ روزہ نمکدان نکالتے تھے اور روزنامہ جنگ میں فکاہی کالم "حرف و حکایت" لکھتے تھے۔ نعرۂ جنگ کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔ باقی کتابیں ابھی غیر مطبوعہ ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ تصویریں (غزلیں)، کانِ نمک (مزاحیہ نظمیں)، نمک پارے (مزاحیہ مضامین)، دورِ آسمان (غزلیات)، حلقۂ تنگ (کلام)، سفرنامہ۔

مجید لاہوری کی متین شاعری بھی اگرچہ بے حد قابل قدر ہے مگر انہوں نے مزاحیہ نظم و نثر میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ وہ طنز و مزاح کو شیر و شکر کر کے ملک کے ہنگامی واقعات اور معاشرے کے بعض نئے اور غیر صحت مند رجحانات سلامت کو ہدف بناتے اور بھرپور وار کرتے تحریف و تصرّف کے حربے سے بھی کام لیتے ہیں لیکن ان کے پاس موضوعات اور مواد کی کمی نہیں۔ وہ اپنے خیالات کو دلکش انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ 'خندہ ایکٹ'، 'مردم شماری کے بعد'، 'آزادیوں کا دور ہے'، 'دستور بن رہا ہے'، 'گدھے'، 'ایک پیسے میں چار دیکھو'، 'دے خدا کی راہ میں'، 'گل شیر خاں کو ووٹ دو'، 'یہ کیسی آزادی'، 'گڈ بائی'، 'بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں'، 'نئے بھکاری'، 'ملک اپنا ہے، راج اپنا ہے'، 'کل بھی ہم آزاد تھے آج بھی آزاد

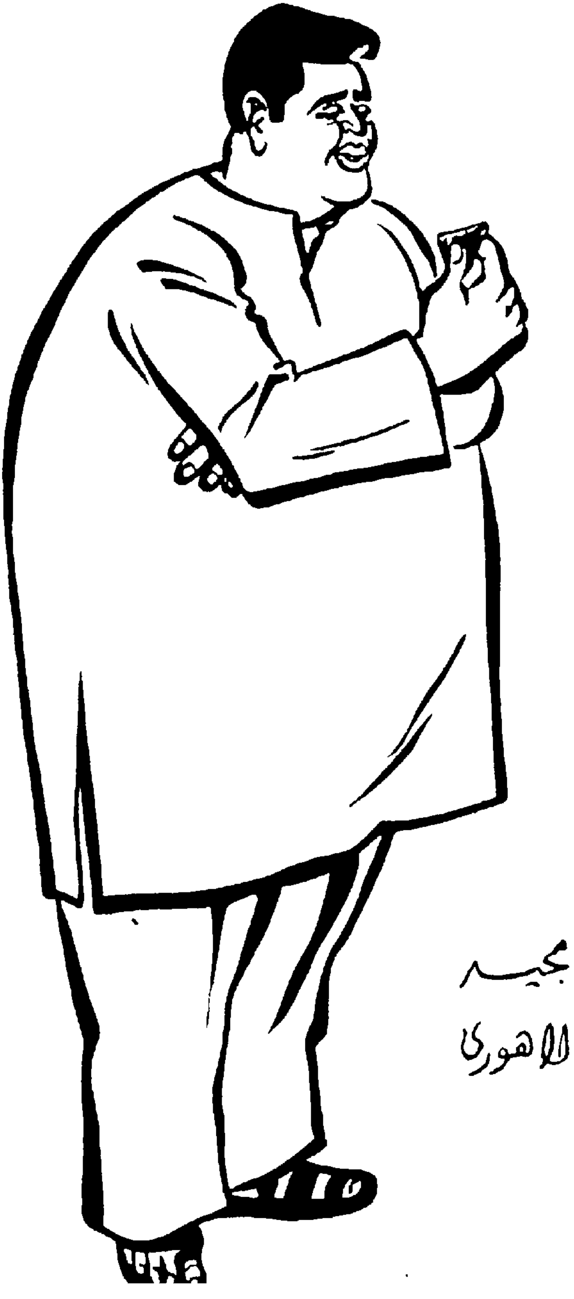
مجید
لاہوری

ہیں۔ بنامِ جہان دار جاں آفریں' عید مبارک' وغیرہ ان کی اچھی اور کامیاب نظموں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔

'منکہ ایک منسٹر ہوں' ان کی بہترین طنزیہ نظم ہے۔ جس میں انہوں نے ہمارے حکمران طبقہ کی اس ذہنیت کا خاکہ اڑایا ہے۔ جس کے تحت وہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں اور بے جانے بوجھے ہر پھٹے میں ٹانگ اڑانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ چند شعر دیکھیے ؎

مرغیوں پر بھی میں کر سکتا ہوں اظہارِ خیال   اور سانڈوں پر بھی ہوں محفل میں سرگرمِ مقال
ریس کے گھوڑوں پہ بھی تقریر کر سکتا ہوں میں   اکبرؔ و اقبال کی تفسیر کر سکتا ہوں میں

ہومیوپیتھک ہو یا دندان سازی کا کمال   باغبانی ہو کہ ہو رومی و رازی کا کمال
بات پھولوں کی ہو یا قومی ترانے کا بیان   چاٹ ہو بارہ مسالے کی کہ ہو اردو زباں
بوعلی سیناؔ کی حکمت بات افلاطون کی   ایگریکلچر ہو یا شق ہو کوئی قانون کی
داغؔ کا دیوان ہو یا ہو وہ ایٹم بم کا راز   ماہی گیری ہو کہ ربط و ضبطِ محمود و ایاز
مسئلہ تاریخ کا ہو یا مبحث علم کا   فلسفہ گلقند کا ہو یا قصہ فلم کا
کشتۂ فولاد ہو یا شربتِ دینار ہو   ہے ضروری سب پہ میری رائے کا اظہار ہو

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا   شوق ہے دل میں مگر قرآن کی تفسیر کا
جتنے بھی شعبے ہیں ان سب پہ ہوں میں چھایا ہوا
ہوں منسٹر مستند ہے میرا فرمایا ہوا

تقسیم کے بعد ہمارے معاشرے کو جن نئے حالات سے دوچار ہونا پڑا ان کا مضحکہ اس طرح اڑاتے ہیں ؎

ہلاکت خیزیوں کی میہمانی ہے جہاں میں ہوں   نہ ابّا ہے نہ دادا ہے نہ نانی ہے جہاں میں ہوں
بس اک شے موت ہے جو خیر سے ملتی ہے بے راشن   وگرنہ ساری چیزوں کی گرانی ہے جہاں میں ہوں
ابھی تک پگڑیوں میں ہے شکوہِ تاجِ سلطانی   ابھی تک رشوتوں کی حکمرانی ہے جہاں میں ہوں
ابھی ہیں چور بازاری سینہ زوریاں باقی   غریبوں مفلسوں کا خون پانی ہے جہاں میں ہوں

ماڈرن آدمی کا ایک بند دیکھیے نظیر اکبر آبادی کی ایک نظم کی کتنی اچھی پیروڈی ہے۔

وہ بھی ہے آدمی جسے کوٹھی ہوئی الاٹ وہ بھی ہے آدمی کہ ملا جس کو گھر نہ گھاٹ
وہ بھی ہے آدمی کہ جو بیٹھا ہے بن کے لاٹ وہ بھی ہے آدمی جو اُٹھائے ہے سر پہ کھاٹ

موٹر میں جا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

رکشا چلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مجید کی ایک نظم "گداگری" بند ہو گئی مگر — اپنے بھرپور تاثر کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتی۔ اس میں انہوں نے بعض خود غرض رہنماؤں کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کیا ہے کہ وہ قوم و ملک کی ترقی و بہبودی کے نام پر سادہ لوح عوام کو لوٹنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔

مجھ کو داتا دلا! ہوگا تیرا بھلا! مجھ کو داتا دلا

اے پلاٹوں کے مالک تری خیر ہو اے الاٹوں کے مالک تری خیر ہو
کوئی کوٹھی دلا، کوئی بنگلہ دلا چھاپہ خانہ دلا، کارخانہ دلا

پمپ پٹرول کا یا سینما دلا بس نہیں کوئی تو بس کا اڈہ دلا

قوم کے نام پر مجھ کو داتا دلا

ہوگا تیرا بھلا

بامِ گردوں پہ تیرا ستارہ ہے زندگی میری کیوں بے سہارا ہے
میرے کشکول میں لیڈری ڈال دے کر کے مرحمت ممبری ڈال دے
کوئی مل یا جننگ فیکٹری ڈال دے کوئی ہوٹل کوئی کمپنی ڈال دے

قوم کے نام پر مجھ کو داتا دلا

ہوگا تیرا بھلا

عالمِ رنگ و بو میں تو پھولے پھلے نام کا تیرے دنیا میں سکہ چلے

یا قیادت دلا یا صدارت دلا   یا وزارت دلا یا سفارت دلا
گنج بخشا! تو گنجِ سعادت دلا   اپنے خادم کو تو بہرِ خدمت دلا
قوم کے نام پر مجھ کو داتا دلا
ہو گا تیرا بھلا

تجھ کو شاد اور آباد رکھے خدا   خوب چشمہ ہو جاری ترے فیض کا
کوئی پرمٹ ملے، کوئی ٹھیکہ ملے   کوئی امپورٹ لائسنس اچھا ملے
جاہ کی بھیک عہدے کا صدقہ ملے   کچھ تو مالِ غنیمت کا حصہ ملے
قوم کے نام پر مجھ کو داتا دلا!
ہو گا تیرا بھلا

شفیع عقیل صاحب نے "مجید لاہوری" نامی کتاب میں مجید کے بہت سے نظم و نثر کے نمونے جمع کر دیے ہیں اور ان پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں زیادہ کی گنجائش نہیں، صرف چند متفرق اشعار دیکھیے جن میں ذرا ذرا سے تصرف سے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی ہے ؎

نوٹ ہاتھوں میں وہ رشوت کے لیے پھرتے ہیں
"کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے"

معرکہ "چالو" ہے ووٹوں کی طلبگاری کا   امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے   اور پھر اس میں مہاجر کو بسایا چاہیے

سولہ پشت سے ہے پیشۂ آبا "گداگری"   کچھ "لیڈری" ذریعۂ عزت نہیں مجھے

کیا ہے مولوی گل شیر نے چیلنج بھولو کو   ادا ہو شکریہ کس طرح امریکہ تیرے گھی کا

"مرا مزاج لڑکپن سے "لیڈرانہ" ہے"
خدا کے واسطے مجھ کو منسٹری دے دو

آ گئی اپنی سیاست میں بھی گرمی "جون" کی
ہر طرف جاری ہیں "کرسی" کے لیے سرگرمیاں

نہ جائیں واعظ و دیں دار ون یونٹ اسمبلی میں
"یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں"

"ڈنر، چائے ہیں جس میں سیاست اس کو کہتے ہیں
"سیاست بے ضیافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"

پیتے ہیں شراب اوّل کھاتے ہیں کباب آخر
زاہد کو سکھا دیجیے آداب یہ مجلس کے

یہ کہہ رہے ہیں کوئی آدمی نہیں ملتا
گدھوں پہ لاد کے ہم بوجھ "ذمہ داری" کا

علامہ حسین میر کاشمیری

سالِ پیدائش ۱۸۹۴ء ہے۔ اس وقت زندگی کی پینسٹھویں بہار دیکھ رہے ہیں۔ تعلیم ثانوی مراحل سے آگے نہ بڑھ سکی مگر عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں اچھی خاصی استعداد رکھتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک ہفت روزہ اخبار مرتب کر کے اس کی تین چار دستی کاپیاں اپنے دوستوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اس پر پرنٹ لائن اور رجسٹرڈ نمبر اہل نقل مطابق اصل لکھا ہوتا تھا۔ اس طرح ان کی معصوم ہابی کا یہ شاندار نتیجہ کسی اچھے اخبار کی جاذبِ توجہ پیروڈی بن جاتا تھا۔

پونے نو سال ریلوے کے تار گھر میں کام کرنے کے بعد جب ہجرت کی تحریک شروع ہوئی تو سب کچھ چھوڑ کر کابل جا پہنچے مگر نہایت کامیابی سے پسپا ہوئے اور اس نقل و حرکت کی مختصر روئداد مرتب کر کے داستانِ ہجرت کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی۔ اس دوران میں مضمون نویسی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ "کشمیری بچے کا قومی گیت" کے عنوان سے اقبال کے قومی ترانے کی پیروڈی روزنامہ پیسہ اخبار کے سرورق پر شائع ہوئی۔ زمانہ اور تعلیمی گزٹ میں بھی دو ایک مضمون چھپے۔ زمیندار میں چھوٹی چھوٹی خبریں مراسلوں کی صورت میں نکلیں۔

ان دنوں تحریکِ خلافت خوب زوروں پر تھی اور امرتسر اس کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور اُن کے رفقا نتائج عواقب سے بے نیاز ہو کر اس میدان میں ڈٹے ہوئے تھے مگر چند افراد جو مولوی کہلاتے تھے قومی بیت المال کو شیرِ مادر سمجھ کر گناہ و ثواب کا خیال کیے بغیر خوب گلچھرے اڑا رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر آپ نے طنز و مزاح کے حربوں سے کام لیا اور ضیافت کمیٹی کے نام سے ایک مختصر سی مجلس مرتب کر لی۔ یہ دراصل خلافت کمیٹی کی پیروڈی تھی۔ اس کا سب سے پہلا شاہکار ایک قدِ آدم پوسٹر تھا جس کا عنوان تھا۔

"آل انڈیا ضیافت کانفرنس"

اس میں لکھا تھا کہ اکتیس نومبر کو رات کے بارہ بجے ایک عظیم الشان جلوس نکلے گا جو شہر کے مختلف حصوں سے گذرتا ہوا قبرستان میں خم وہاں مقامی مقدسین تازہ قبروں میں سے کفن کھسوٹیں گے اور اپنے نام نہاد مذہبی وقار کی آڑ میں محاسبہ سے بے فکر ہو کر اس مشغلہ کو طا تک جاری رکھیں گے اس کے بعد کانفرنس کی کارروائی شروع ہوگی۔ جلوس کی موٹر میں سوار ہونے کی آسان ترکیب۔ تین مرکزی مہما ساتھ تین سو مقامی میزبانوں کی شرکت۔ پلاؤ خوری کے مستند طریقے "چندہ خوری کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جائے"۔ ایک اہم مطالبہ۔ اشتہا چھپوائی اور کاغذ وغیرہ کا خرچ بارہ روپے مگر لینی کے لئے میدے کی قیمت تین سو روپیہ۔ ایک پولیٹیکل ڈکار سے چھ ہزار روپیہ ہضم وغیرہ و

طنز و مزاح کا یہ ہتھیار بے حد نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ عوام کی اکثریت میں مواخذہ و محاسبہ کا احساس پیدا ہوگیا اور یہ بات رفتہ رفتہ خلافت کمیٹی تک جا پہنچی۔ وہاں سے ایک وفد جو مولانا معظم علی، مولانا عرفان اور ایک اور صاحب پر مشتمل تھا۔ امرت سر پہنچا اور اسنور ڈاکٹر کچلو سے ملنے کے بعد حالات کا جائزہ لیا اور ایک خفیہ رپورٹ مرتب کی۔

اس کے ساتھ ہی آپ نے اخبار ضیافت پنچ جاری کیا۔ اور طنز و مزاح کے پردے میں خوب چاند ماری کی۔ حسن اتفاق سے موا ظفر علی خاں امرت سر گئے، وہ ان کی صلاحیتوں سے واقف ہو کر انہیں زمیندار میں لے آئے۔ یہاں ترجمہ کی مشق بھی ہوگئی اور آپ انواع کے مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن بھی دینے لگے۔

علامہ حسین میر ہر اچھے بُرے شاعر کے کلام میں تحریف کر کے اسے اپنا لینے کا ڈھب خوب جانتے ہیں۔ آپ کی مزاح نگاری منظر تو عموماً پلاؤ، قورمہ، قیمہ، بریانی کرنتے، مرغ مسلم جیسے مرغن کھانے ہوتے ہیں لیکن اس کا پس منظر ایک ترکش ہوتا ہے جس کے زہر بجھے ہوئے تیر مشرق و مغرب کی سیاست، ہندوستان کی داخلی و خارجی حکمت عملی، غرض پرست ملکی لیڈروں، دکان دار صوفیوں اور نمائشی کو نشانہ بناتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ نثر بھی جدید ظرافت کی خوبیوں سے معمور ہوتی ہے۔ ایک نقاد کے خیال میں "سچ تو یہ ہے کہ ان کے علم پر ان کی مزاحیہ نگاری نے پردہ ڈالا اور مزاح نگاری کے لئے ان کی مجبور مزدوری سنگ راہ بن رہی ہے۔"

(بہارستان صہ۲۱۶)

اقبال کی مشہور نظم "مرغ اسیر کی فریاد" بانگ درا میں موجود ہے اس کی پیروڈی "لیڈر کی فریاد" ملاحظہ فرمائیں ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ   وہ کانگریس کے چندے وہ سب کا مل کے کھانا
وہ آشرم کے بھوجن وہ میر موٹروں کی   پھولوں میں لد کے آنا پھولوں میں لد کے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم   وہ دیویوں میں مل کر بھارت کے گیت گانا
بھارت پجاریوں کو بلوا کے آشرم میں   چرخے کی شرن لے کر تکلے کے گن بتانا
آتا ہے یاد مجھ کو..........

۱۹۳۹-۴۳ء کی عالمگیر لڑائی کے دوران میں حکومت کی طرف سے جابجا مشاعرے ہوتے تھے اس سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ لائل پور ڈسٹرکٹ ہال میں ہوا جس میں حضرت جگر مرادآبادی نے ایک غزل پڑھی جس کی ردیف تھی "ہوتی جاتی ہے" اور قافیہ مدغم "کم" "عالم" وغیرہ۔ طعام کے وقفے میں آپ نے اس کی پیروڈی کر ڈالی اور شام کی نشست میں یہ غزل سنائی ؎

قیامت ہے کہ زود اشتہا کم ہوتا جاتا ہے   نظامِ جسم کم کھانے سے برہم ہوتا جاتا ہے
جُدائی میں تلخین کی یہ عالم ہوتا جاتا ہے   کہ روزِ عید بھی روزِ محرم ہوتا جاتا ہے!
مدارِ روزگارِ سفلہ پہ درِ رہا تماشا کن!   نصیبِ احمقاں مرغِ مسلّم ہوتا جاتا ہے!
بُھنے تیتر کھلا کر جان ڈالی جسمِ مُردہ میں   ترے ہوٹل کا بٹلر ابنِ مریم ہوتا جاتا ہے
گرائے گوشتوں کے بم یہاں کس رشکِ ہٹلر نے
ہمارا پیٹ بھی قصرِ بکنگھم ہوتا جاتا ہے

جنگی پبلسٹی کے سلسلے میں ایک بہت بڑا سرکاری مشاعرہ لاہور کے منٹو پارک (اقبال پارک) میں منعقد ہوا۔ اس وقت کے وزیرِ تعلیم میاں عبدالحی مرحوم میرِ مشاعرہ تھے جب علامہ کا نام پکارا گیا تو آپ نے اس تمہید کے بعد کہ "زمینی انقلابات تو آپ آئے دن مشاہدہ فرماتے آئے ہیں اب ذرا انقلابِ آسماں" کی جھلکی کا نقشہ بھی ملاحظہ فرمائیں" یہ غزل پڑھی جس کے پانچویں شعر میں سائمن کمیشن کی سفارش پر ملنے والے ڈومینین سٹیٹس کا خلاصہ ہے ؎

کیا خبر تھی انقلابِ آسماں ہو جائے گا   قورمہ قلیہ نصیبِ احمقاں ہو جائے گا
ظلمتِ باطل کے دامن میں چھپے گا نورِ حق   دال کی آغوش میں قیمہ نہاں ہو جائے گا
کیک بسکٹ کھائیں گے اُلّو کے پٹھے رات دن   اور شریفوں کے لئے آٹا گراں ہو جائے گا
کنٹرول اس کے لبِ شیریں پہ گر یوں ہی رہا   کھانڈ کا شربت نصیبِ دشمناں ہو جائے گا
اے بُھنے تیتر نہ ڈر باورچیوں کی قید سے   پیٹ میرا تیری خاطر آشیاں ہو جائے گا
اے سکندر مرغ کا ہے شوربا آبِ حیات   خضر بھی اس کو اگر پی لے جواں ہو جائے گا
جب یہ کہتا ہوں کہ کچھ سامانِ دعوت کیجئے
وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ ہاں ہو جائے گا

حکیم مشرق علامہ اقبال صوبائی کونسل کی رکنیت کے امیدوار بن کر میدانِ انتخاب میں کودے تو علامہ حسین میر نے ان کے مزاحیہ کی پیروڈی کر ڈالی۔ صرف تین شعر دیکھیے ؎

ہم حجرے کے مکینوں کا دل کونسل میں جا اٹکا ہے
واں درشن روز گورنر کے یاں حشر کا ہم کو کھٹکا ہے
انگریز کے خوانِ نعمت پہ گر تاب ہو مرغِ مسلّم کی
اے شیخ و برہمن مت پوچھو قربانی ہے کہ جھٹکا ہے
مسجد میں گیا بانگی نے کوٹھی سے نکالا بیرے نے
اقبال بچارے ٹوڈی کا اس وقت ادھر میں لٹکا ہے

مولانا عبدالمجید سالک نے تحریکِ خلافت کے دنوں میں ایک نہایت ہی شاندار اور بلند پایہ نظم ارشاد فرمائی تھی جو اس طرح شروع ہو

تمھیں سے اے مجاہدو جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

حضرت علامہ کو یہ نظم بہت پسند آئی اور آپ نے اسی کے الفاظ کو اِدھر اُدھر کرکے "پیٹو قوم کا جنگی ترانہ" کے عنوان سے مندرجہ ذیل پیروڈی کہ

تم ہی سے اے شکم ورو توانیِ ادویات ہے   تمھاری توند مایۂ قدورِ راسیات ہے
تمھاری ہی ڈکار سے خروشِ شش جہات ہے   ضیافتی مجاہدو تمھاری کیا ہی بات ہے
جو تم نہ ہو تو بے ضیا یہ ساری کائنات ہے
کرو جو بزم میں کبھی نمائشِ دلاوری   تو کانپ جائے میز پر رکابی اور طشتری
جو گردنِ پرند پر رواں ہو نیشتر چھری   تو جذبۂ شکم دری یہ کہہ اٹھے "ہری ہری"
بٹیر کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
جو کوفتوں کو چکھ چکے تو فیرنی کو چٹ کیا   جو شوربے پہ آگرے تو [illegible] کیا

کلوا سے لے کے تا گلو کا درد تم نے بھٹ کیا قضا جو لائی ہیضے کو تو اُف کیا نہ بٹ کیا
قفس سے بھی جو نہ ڈرے وہ پیٹوؤں کی ذات ہے

کبابِ مُرغ سے اگر سجی ہوئی ہو طشتری تو اس کو کھا کے فربہی میں منتقل ہو لاغری
گھٹیں جو چند بطخیں بڑھیں جہاں میں اُمتی کٹیں جو چند مرغیاں تو قوم کی ہو زندگی
لہو جو ہے خروس کا وہ قوم کی زکوٰۃ ہے

کہاں میں تیغ زن وہی کریں جو ذبح مُرغیاں چھُری سے کھائے خوف جو چلائے کیسے گولیاں
دفاعِ ملک کی وہی اٹھائے ذمہ داریاں جو کھائے سُرخ کوفتے پیے سفید یخنیاں
غلام ہے وہ فطرتاً جو وقفِ دال بھات ہے

اختر شیرانی کی مشہور نظم "اے عشق کہیں لے چل" کے نمونے پر "اے پیٹ کہیں لے چل" اور ابو الاثر حفیظ جالندھری کی نظم "یوں وقت گزرتا ہے فرصت کی تمنا میں" کے وزن پر "یوں وقت گذرتا ہے روٹی کی کشاکش میں" بھی آپ کی پیروڈیاں بہت مقبول ہیں۔

ذیل کی غزل آپ نے ۱۹۲۱ء میں کپورتھلہ (ریاست) کے طرحی مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ اس کا ایک ایک شعر اشتہا انگیز اور آتشِ معدہ کو تیز کرنے والا ہے ؎

بحرِ قلزم جو بہے چائے کا دریا ہو کر عکسِ خورشید نظر آئے گا قلچیا ہو کر
اُترے مہتاب زمیں پر جو پراٹھا ہو کر اخترِ چرخ برس آئیں پکوڑا ہو کر
اُڑ کے بیٹھے جو کوئی دیگ کا چمچہ ہو کر پائے گا اپنی مرادیں یہ طوسلے ہو کر
ہو نہ مغرور سرِ دار پہ چڑھ کر منصورؔ چڑھ گئے سینکڑوں یاں سیخ پہ قیما ہو کر
اے طبیبو! کوئی تجویز نکالو ایسی چائے نسخوں میں لکھی جائے بنفشا ہو کر
کوفتے خواب میں بھی تو جو برہمن کھا لے توڑ دیں تپ کو زنے آلو بخارا ہو کر
عقدِ بریانی کا جس وقت متنجن سے ہوا لٹ گئے مفت میں واں شیخ چھوہارا ہو کر

اپنی ہستی سے گزر جائے جو دنیا میں فروغ   قدرِ شلغم کی ہوئی دیگ میں کشتہ ہو کر

پیشتر ہستیِ مطلق سے مقاماتِ فنا
بچۂ مرغ نے طے کر لیے انڈا ہو کر

ایک غزل کے تین شعر ؎

مدتوں کھاتا رہا ناداریِ ملت کا غم
تب ملے جا کر کہیں شب دیگ کے شلغم مجھے

المدد اے جذبۂ مرغ مسلم! المدد
آج ڈربے میں مچانا ہے ذرا اُدھم مجھے

اپنے مطبخ کا بناؤں آنریری منتظم
گر کہیں مل جائیں ہنڈن برگ یا ولیم مجھے

ایک غزل کا مطلع

میں شہیدِ دیگ ہوں ہوٹل میں ہو تربت مری
خانساماؤں کے کندھوں پر اُٹھے میت مری

ایک غزل کا حاصلِ غزل

آرزو انگیز ہے جاناں کے مطبخ کی فضا
جو دھواں چمنی سے اٹھا عشق پیچاں ہو گیا

خضر تمیمی

میاں مولا بخش خضر تمیمی ایم اے۔ ایل ایل بی ۱۱ مارچ ۱۹۰۹ء کو چنیوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے وہیں ابتدائی تعلیم حاصل پھر لاہور آ کر اسلامیہ کالج سے ایم اے۔ اور لا کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ اس کے بعد کئی روزناموں مثلاً "احرار (۱۹[illegible]ء) جمہور (۱۹۳۰ء) حریت اور ہفتہ وار جہاں نما اور ماہنامہ خیالستان میں کام کیا۔ طبیعت مزاح کی طرف زیادہ مائل ہے۔ شیرازہ اور نمکدان و مزاحیہ پرچوں میں آپ کی اکثر تحریفات شائع ہو کر مقبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ نثر میں آب حیات کی پیروڈی خاص طور پر قابل ہے۔ آپ کی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے حکومت پنجاب کے محکمہ دیہات سدھار و پنچایت نے آپ کو اپنا تعلیمی افسر مقرر کیا۔ اس سلسل میں آپ پنجاب کے گاؤں گاؤں پھرے۔ جگہ جگہ تبلیغ کی اور دیہاتیوں کے مسائل کا گہرا مطالعہ کیا۔ ساتھ ہی محکمہ کے ترجمان اخبار پنچایت مرتب کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۴۰ء کی مسلم لیگ تحریک اور جنگ آزادی میں آپ نے جو قابل قدر خدمات انجام دیں وہ بھی فراموش کر کے قابل نہیں آپ قلندر کے قلمی نام سے نوائے وقت میں بھی مضامین لکھتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ لا کالج لاہور میں لیکچرار بھی رہے اب وکال کرتے ہیں اور اچھے قانون دانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

آپ کی بے شمار تحریفات میں سے چند یہاں نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان سے آپ کے رنگ طبیعت کا اندازہ بخو ہو سکے گا۔ مرزا محمد رفیع سودا کا ایک شہر آشوب ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے

خضر تمیمی نے اپنی نظم "کال کا سماں" میں اس کی پیروڈی کی ہے اور اپنے زمانے کا نقشہ کھینچا ہے ؎

اے خضر عجب رنگ پہ نیرنگِ جہاں ہے
آنکھوں تلے ہر وقت قیامت کا سماں ہے
از بسکہ گرانی کا یہاں سکہ رواں ہے
سر اپنا بھی اب دوش پہ اک بارِ گراں ہے
جینے کے تصور سے بھی ہوتی ہے گرانی
تف عشق پہ اور جائے جہنم میں جوانی

مزدور جو ہیں ان کے لیے کام ملے ہیں   اور مالِ تجارت کے بہت دام ملے ہیں
صنعت کو بھی کچھ اوج کے ایام ملے ہیں   دولت کے تو دیدار ہمیں عام ملے ہیں
پردے میں فراغت کے مگر قحط نہاں ہے

یا دھوپ کے ہوتے ہوئے بارش کا سماں ہے

اب آئے کہاں اطلس و کمخواب کی چادر   اک چادرِ عصمت ہے بہائے آب کی چادر
جی میں ہے پہن لیجیے لبِ خواب کی چادر   یا شب کو چرا لیجیے مہتاب کی چادر
جیتے ہوں تو ملبوس ہوں عریانیِ تن سے
مر جائیں تو آزاد رہیں فکرِ کفن سے

چینی گئی ایسی کہ وہ باہر ہے نہ گھر میں   افسوس کہ اب ہجر ہوا شیر و شکر میں
اس لب پہ شکر خند نہیں آج نظر میں   شیرینی بھی باقی نہیں اشعارِ خضر میں
کہتا ہے کہ یہ فنِ سخن کھیل نہیں ہے
تر کیسے زباں ہو کہ یہاں تیل نہیں ہے

"ہاتھ کی روانی" خضر تمیمی کی ایک لاجواب نظم ہے۔ یہ حضرت اکبر الہ آبادی کی مشہور نظم "آب لوڈدر" کی پیروڈی ہے اس میں کسی شیرِ دسترخوان دوست کی کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے۔

یہ ہے آج ہی رات کی داستاں   کہ تھے مہماں میرے اک مہرباں
غریبانہ کھانوں کو وہ دیکھ کر   ہوئے صورتِ باز کچھ تیز پر
مجھے ٹالنا اس کا دشوار ہے   کہ دُرِّ نظر کا یہ اصرار ہے
دکھاؤں میں حضرت کے کھانے کا ڈھنگ   لکھوں ان کے لقمے اڑانے کا رنگ

مگر کس طرح ماجرا یہ لکھوں   کہوں بھی تو یہ بات کیوں کر کہوں
قلم کانپتا ہے وہ آ ہی نہ جائیں   اور ہڈی سمجھ کر چبا ہی نہ جائیں
زباں بند بتّیس دانتوں میں ہے   کہ پھر شور کچھ ان کی آنتوں میں ہے
جو تھیں دقّتیں کہہ چکا برملا   غرض دیکھیے ہاتھ ان کا چلا
پلیٹوں میں ہلچل مچاتا ہُوا   وہ چمچے سے چمچا لڑاتا ہوا
پلاؤ میں سالن ملاتا ہُوا   وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ بوٹی پہ چڑھ کر لپٹتا ہوا   وہ روٹی سے بڑھ کر چمٹتا ہوا
فقط شوربے سے کھسکتا ہوا   مربّے سے جا کر چپکتا ہوا
گیا دال پر دندناتا ہُوا   وہ مرچوں سے دامن بچاتا ہوا
وہ چمچے سے چپّو بناتا ہوا   وہ آلو کو اُلّو بناتا ہوا
سوّیوں پہ سو جاں سے مرتا ہوا   اِدھر لاڈ لڈّو سے کرتا ہوا
پسند اس پسندے کو کرتا ہوا   تو چٹنی پہ چٹخارے بھرتا ہوا
سموسے میں خود کو سموتا ہوا   اِدھر کھوئے کے ہوش کھوتا ہوا
جلیبی پہ یاں پیچ کھاتا ہوا   کٹورے کہیں کھنکھناتا ہوا
یہ برفی کا دل برف کرتا ہُوا   یہ زردے کا مُنہ زرد کرتا ہوا
پلاؤ پہ پِل پِل کے آتا ہُوا   تو پھرنی[1] پہ پھر پھر کے آتا ہوا
نوالے سے کشتی بناتا ہوا   اور حلوے کے گولے اُڑاتا ہوا
وہ کھلتا ہُوا اور جٹتا ہوا   وہ ہلتا ہوا اور مڑتا ہوا

---

[1] اصل لفظ فرنی ہے۔ شاعر نے پنجابی تصرف کیا ہے۔

وہ جبڑوں میں بوٹی مسلتا ہوا　　اُسے بن چبائے نگلتا ہوا
وہ کلّوں سے ٹیلے بناتا ہوا　　اور آنکھوں کو پیچھے چھپاتا ہوا
لبوں پر زباں کو پھراتا ہوا　　لپٹتے ہوئے پھیل جاتا ہوا
سسکتا، سمٹتا، سرکتا ادھر　　لپکتا، لہکتا، لٹکتا ادھر
بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا　　وہ غازی ہے یوں کھانا کھاتا ہوا
سحر کر رہے گھر کو جائے دعا　　"نہ بلد، نہ تلد، نہ جنبد زجا"
غرض اس طرح ہیں مرے مہرباں　　بس اب دیکھ لیں شاعرِ نکتہ داں
وہ سودا و اکبر کا اب لو دور
یہاں غصہ کی بے زبانی کا زور

سارنگی اور طبلہ

یہ چودھری خوشی محمد ناظرؔ کی نظم "جوگی اور ناظر" کی پیروڈی ہے ؎

دنیا بھر کے بے فکروں نے کل بزم سرود سجائی تھی
کیا دل کو مسلتا تھا طبلہ، کیا سارنگی گھبرائی تھی
بسمل کی رگِ جاں بنتی تھی طاؤس کی تاریں لرزش سے
چائے کا پیالہ دور میں تھا حقے نے دھوم مچائی تھی
رندوں نے جھنڈے گاڑے تھے، زہاد نے ڈیرے ڈالے تھے
اس دیر و حرم کی محفل میں، موسیقی گلنے آئی تھی
یاں اشکوں سے پُر سارنگی واں پیچ و تاب میں تھا طبلہ
گز بھر کی زباں یاں چلتی تھی واں ہاتھوں کی بن آئی تھی

واں تھاپ کے ابر گرجتے تھے نغموں کی پھواریں پڑتی تھیں
یاں ہر دل پر موسیقی کے کُہرے نے قنات لگائی تھی
اُڑتی تھیں فضا بھر میں تانیں تھی چال صبا کی مستانہ
تقدیر سے بیچ میں دونوں کے جا بیٹھا شاعر دیوانہ

سارنگی بولی طبلے سے تم یُونہی شور مچاتے ہو
اے مُنہ پھٹ طبلے دیوانے کیوں کان ہمارے کھاتے ہو
آواز تمہاری کوّے سی اور شکل چھپلادے سی تیری
اِن میٹھی میٹھی تانوں کے تم رنگ میں بھنگ ملاتے ہو
لعنت ہے تمہارے جینے پر آرام نہیں عزّت بھی نہیں
میں گودوں میں جا پھلتی ہوں تم سر اپنا پٹواتے ہو
ہے خام ابھی تک عشق ترا کچھ صبر نہیں کچھ تاب نہیں
یا تان اڑی اک میٹھی سی واں تھام کے دل رہ جاتے ہو
مَیں راج دلاری البیلی ناری ہُوں پریم کنھیا ہوں
تم مونڈی کاٹے مردک ہو ہر جا پر دھکے کھاتے ہو
تہذیب تمہیں منظور نہیں اور عقل کہیں دستور نہیں
تم بھیم کی تانوں میں باہر کیوں آپے سے ہوجلتے ہو
نازوں سے پلی شہزادی ہوں، میں ناری محلوں والی ہوں
تم حبسِ دوام کے قیدی ہو، صندوقوں میں ڈٹ جاتے ہو

جب سارنگی نے طبلے سے یُوں دل شکنی کا کلام کیا
کچھ دیر تو وہ خاموش رہا، پھر بھابھی جان کو سلام کیا
یُوں کہنے لگا سارنگی سے جلتی پہ تیل گراتی ہو

ہم رنج و الم کے مارے ہیں تم آ کر اور ستاتی ہو
عشاق سے مُنہ پھیرا کیوں پھر تم نے ہمیں آ گھیرا کیوں
رہنے دو اسے چپ مجبُوراً کیوں میری زباں کھلواتی ہو
میں زنجبار کا شہزادہ میدان میں آ کر ضیغم سا
جب ایک دَھاڑ لگاتا ہُوں تم پردوں میں ڈر جاتی ہو
پیمانِ وفا جس سے باندھوں مَیں پاس اسی کے رہتا ہوں
تم ہرجائی ہو ہر اک کے پہلو میں دِل بہلاتی ہو
کچھ لطف ہے سینہ کوبی میں سر پھوڑنے میں ہم مستوں کو
بی! یہ تو عشق کے زیور ہیں تم یُونہی ہم کو بناتی ہو
عزّت پہ ہماری حرف زنی! اللہ غنی اللہ غنی
وہ وقت بڑی بی بھول گئیں جب کان اپنے کھچواتی ہو
مَیں تیری شمیم نغمہ کو مانند نسیم اُڑاتا ہوں
یہ میری تھاپ کی برکت ہے دل بزم میں مسلے جاتی ہو
جب لڑکے مل کر گاتے ہیں عرفان کی تانیں اُڑاتے ہیں
ہاتھوں سے میز بجاتے ہیں تم یاد کب ان کو آتی ہو

ہے ملکہ موسیقی سے مجھے نزدیک تریں تجھ سے رشتہ
ہم راہ پہ تجھ کو لاتے ہیں جب لَے میں بھٹک سی جاتی ہو
مَیں آذرِ عشق کی تابش سے دلِ محفل کے گرماتا ہوں
طاؤس طنبورے کو تجکو دن میں تارے دکھلاتا ہوں
یہ سُن کر شمس الدین ڈرے تلوار مبادا چل جائے
یاں طبلہ تڑپتا رہ جائے سارنگی روتی رہ جائے
چمکار کے سارنگی سے کہا تم سیدھی سادی بھولی ہو
زیبا نہیں گر یوں مُنہ میں ترے انجانوں کی سی بولی ہو
طبلے کے وکیل مطلق نے واں ہاتھ سے اس کو سمجھایا
اچھا نہیں خوں کی لہروں سے گر محفل بھر میں ہولی ہو
تم زنجبار کے شہزادے سارنگی مٹھری
پھبتی ہی نہیں شہزادوں کے گر ایسی بولی ٹھولی ہو
خاموش ہوئیں بی سارنگی اور طبلہ "صمٌّ بکمٌ" تھا
یوں جیسے کسی نے زباں اپنی کوثر کے آب سے دھولی ہو
القصہ بچھڑے دوست ملے نے جھگڑا تھا نے شکوہ تھا
نے تن تنا تن تن تن تھی نے تاکڑ تاکڑ دھیا تھا

عاشق محمد غوری

پروفیسر عاشق محمد غوری لاہور کے حکیم محمد جلال الدین کے فرزند ہیں۔ تاریخ پیدائش ۲ ستمبر ۱۹۱۲ء ہے۔ فارسی، انگریزی، اردو تینوں زبانوں کے ایم اے ہیں۔ مشغلہ درس و تدریس ہے۔ ۴۲-۵۰ء میں سکھ نیشنل کالج لاہور کے لیکچرار تھے۔ ۱۹۴۶ء سے دیال سنگھ کالج میں رئیس شعبۂ فارسی ہیں۔ نہایت خاموش اور متین آدمی ہیں۔ شاعری سے خاص لگاؤ ہے۔ پرانی قدروں کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے جدید شاعری کے خلاف اکثر صدائے احتجاج بلند کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے مسلّمہ ادبی قدروں سے انحراف کرنے والے بے راہ رو شاعروں کو راہ پر لانے کے لیے پیروڈی کا حربہ استعمال کیا ہے اور اس میں وہ خاصے کامیاب ہیں۔ وہ تنقید کے کڑوے گھونٹ گوارا بنا کر پیش کرنے کے لیے ظرافت کی چاشنی ملاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کی تحریفات ہمارے لیے غیر معمولی دلچسپی اور جاذبیت کا باعث ہیں۔ "ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں" ان تحریفوں کا معیار اتنا بلند ہے کہ تحریف کے کسی جائزے میں بھی انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

صادق قریشی نے ایک نظم سلمیٰ لکھی تھی۔ پروفیسر عاشق محمد غوری نے اس کی پیروڈی کر کے اصل کی جذباتیت کا بڑی بے رحمی سے مضحکہ اڑایا ہے۔ ذیل میں دونوں نظمیں ملاحظہ فرمائیے۔

سلمیٰ

میں نے اک تصویر بنائی
نیچے لکھا نام کسی کا
سلمیٰ
سلمیٰ شرم و حیا کی دیوی
پیکر اک اخلاص و وفا کا
سلمیٰ
جانے کب چپکے سے سلمیٰ
آ گئی سب کی آنکھ بچا کر

کتا

میں نے اک دن کھیر پکائی
اس کی خوشبو پا کر آیا
کتا
کتا شرم و حیا سے عاری
پیکر گویا حرص و ہوا کا
کتا
جانے کب چپکے سے کتا
آ گیا سب کی آنکھ بچا کر

اندر

سب چیزوں سے ہاتھ اُٹھا کر
اپنی اِس تصویر کی کرلی

چوری

سلمیٰ! خوب رہا یہ دھوکا

تم نے تو ایک چیز چرائی
نقلی

اصل ہے دل کے آئینے پر
کاغذ پر تھی نقل اُتاری

یُوں ہی

اُس کو نہیں چوری کا خطرہ
ہمت ہے تو اس کو چراؤ

آؤ

(صادق قریشی)

اندر

سب چیزوں سے دھیان ہٹا کر
میری تھی جو کھیر کی تھالی

کھالی

کتے! خوب رہا یہ دھوکا

تم نے تو اک چیز ہے چاٹی
نقلی

کھیر ہے اندر الماری میں
تھالی میں تھی پیچ جمائی

یُوں ہی

اُس کو نہیں کتوں کا کھٹکا
ہمت ہے تو اس کو اُڑاؤ

آؤ

(عاشق محمد غوری)

اقبال نے بچوں کے لیے ولیم کوپر کی ایک نظم اُردو میں منتقل کی تھی جو "ہمدردی" کے عنوان سے بانگِ درا میں موجود ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا   بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

پروفیسر عاشق محمد غوری نے اس کی ہو بہو نقل اُتار کر ہمارے لیے ہنسی کا سامان فراہم کیا ہے اور جھوٹی ہمدردی کا مذاق اُڑایا ہے۔

گوشے میں کسی کھنڈر کے تنہا   ملا تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی   جوئیں چننے میں دن گزارا

پہنچوں کس طرح اب مکاں تک   ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سُن کر مُلّا کی آہ و زاری   اُلّو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے   احمق ہوں اگرچہ میں تمھی سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری   میں پیش یہ گھونسلا کروں گا
اللہ نے مجھ کو دی ہے منزل   اک رات یہیں کرو بسیرا

اُلّو ہیں وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

غالب کی ایک غزل میں تضمین کے ذریعے ظرافت کا رنگ بھرا ہے۔ صرف دو بند دیکھیے:

اس مچلنے سے مدعا کیا ہے
میں نے تجھ کو بھلا کہا کیا ہے
تجھ پہ نازل ہوئی بلا کیا ہے
"دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے"

مُنہ میں ہر وقت پان رکھتا ہوں
جیب میں کپتان رکھتا ہوں
ناک رکھتا ہوں کان رکھتا ہوں
"میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مُدعا کیا ہے"

اندر

سب چیزوں سے ہاتھ اُٹھا کر
اپنی اُس تصویر کی کرلی

چوری

سلمٰی! خوب رہا یہ دھوکا

تم نے تو ایک چیز چرائی
نقلی

اصل ہے دل کے آئینے پر
کاغذ پر تھی نقل اُتاری

یُوں ہی

اُس کو نہیں چوری کا خطرہ
ہمت ہے تو اُس کو چراؤ

آؤ

(صادق قریشی)

اندر

سب چیزوں سے دھیان ہٹا کر
میری تھی جو کھیر کی تھالی

کھالی

کتے! خوب رہا یہ دھوکا

تم نے تو اک چیز ہے چاٹی
نقلی

کھیر ہے اندر الماری میں
تھالی میں تھی پیچ جمائی

یُوں ہی

اُس کو نہیں کتوں کا کھٹکا
ہمت ہے تو اُس کو اُڑاؤ

آؤ

(عاشق محمد غوری)

اقبال نے بچوں کے لیے ولیم کوپر کی ایک نظم اُردو میں منتقل کی تھی جو "ہمدردی" کے عنوان سے بانگِ درا میں موجود ہے۔ اس کا پہلا مصرعہ ہے۔

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا   بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

پروفیسر عاشق محمد غوری نے اس کی ہو بہو نقل اُتار کر ہمارے لیے ہنسی کا سامان فراہم کیا ہے اور جھوٹی ہمدردی کا مذاق اُڑایا ہے۔

گوشے میں کسی کھنڈر کے تنہا   مُلّا تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی   جوئیں چننے میں دن گزارا

پہنچوں کس طرح اب مکاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سُن کر مُلّا کی آہ و زاری اُلّو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے احمق ہوں اگرچہ میں ننّھی سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری میں پیش پہ گھونسلا کروں گا
اللہ نے مجھ کو دی ہے منزل اک رات یہیں کرو بسیرا

اُلّو ہیں وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

غالب کی ایک غزل میں تضمین کے ذریعے ظرافت کا رنگ بھرا ہے۔ صرف دو بند دیکھیے:

اس مچلنے سے مدعا کیا ہے
میں نے تجھ کو بھلا کہا کیا ہے
تجھ پہ نازل ہوئی بلا کیا ہے
"دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے"

مُنہ میں ہر وقت پان رکھتا ہوں
جیب میں کپتان رکھتا ہوں
ناک رکھتا ہوں کان رکھتا ہوں
"میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مُدعا کیا ہے"

اختر شیرانی مرحوم کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کی پیروڈی میں معاشرے کی بعض خرابیوں پر طنز کی ہے ؎

او دیس سے آنے والے بتا
برسات میں دلدل بنتے ہیں سب کوچہ و بازار اب کہ نہیں
کیچڑ میں لت پت ہوتے ہیں پیراہن و شلوار اب کہ نہیں
دو چار قدم جو چلتا ہے گرتا ہے، وہ دس بار اب کہ نہیں
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وطن کی گلیوں میں راتوں کو کتے بھونکتے ہیں
اور ان کی عف عف بھوں بھوں سے بیچارے بچے چونکتے ہیں
کیا اب بھی سلمیٰ کے دادا دن رات دمے سے ہونکتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی سحر دم کچھ جوتے مسجد سے چرائے جاتے ہیں
بیچارے غازی بے جوتے چپ چاپ گھروں کو آتے ہیں
رستے میں کوئی مل جائے انہیں تو جھینپتے ہیں کتراتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وطن میں ایسے ہی شام اور سویرا ہوتا ہے

کیا دن کو روشنی ہوتی ہے راتوں کو اندھیرا ہوتا ہے
اور مچھلیوں کا دریا میں یا پیڑوں پہ بسیرا ہوتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا

اختر شیرانی مرحوم ہی کی ایک غزل تھی "دیکھے کوئی بہارِ گلستانِ آرزو" اس کی پیروڈی میں نئے نئے قافیوں کی بہار دیکھئے:

مژدہ ہو آج تم کو مریضانِ آرزو   لاحق مجھے بھی ہو گیا یرقانِ آرزو
مائل ہوا ہے اک بتِ ترسا پہ دل مرا   گرجے میں جا بسا ہے مسلمانِ آرزو
سب کاروبار چھوڑ کے سڑکیں ہوں ناپتا   دیتا تھا کچھ نہ کچھ مجھے تاوانِ آرزو
ملا کے وعظ کا ہوا اثر مجھ پہ کس طرح   سر پر مرے سوار ہے شیطانِ آرزو
میرا رقیب بوجھ سے مرنے کے ہے قریب   پُر حسرتوں سے اس کا ہے دامانِ آرزو
گردن مروڑ ان کی یا دانے کھلا انہیں   چلّا رہے ہیں دیر سے مُرغانِ آرزو
میرے جنوں نے اسے لینے دیا نہ چین   وہ چین حسن ہے تو میں جاپانِ آرزو

مجروح عشق ہو کے رہے گا وہ سنگدل!
عاشق نے بھی ہے سونت لی کرپانِ آرزو

اکبر لاہوری

آپ ۱۹۱۰ء میں بھٹی راجپوتوں کے ایک گاؤں مرل پار میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں لاہور سے دس بارہ میل کے فاصلے پر دریائے را
کے اس پار واقع ہے۔ آپ کے والد مولوی ابراہیم خاں جو پولیس انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اردو، عربی، فارسی کے عالم ہونے کے
اُردو اور پنجابی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ایک ضخیم جلد میں ہیر رانجھا کے قصے کو از سرِ نو نظم کیا ہے۔ اکبر لاہوری کو دراصل شعر و شاعری کا ذوق
باپ سے ورثے میں ملا۔ تعلیم دیال سنگھ کالج لاہور اور یونیورسٹی لا کالج میں پائی۔ جنوری ۱۹۳۱ء سے صوبائی مجلسِ قوانین سے وابستہ
آج کل اسسٹنٹ سیکرٹری ہیں۔

آپ طنز و مزاح کے لیے کوئی خاص موضوع تلاش نہیں کرتے۔ زندگی کے روزمرہ واقعات میں جو کچھ پیش آتا ہے، اسی کے کچھ کہہ دیتے ہیں۔ چھپنے چھپانے کا زیادہ شوق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گمنام ہیں۔

جب آپ اسمبلی کی تقریروں کا ترجمہ کیا کرتے تھے، تو ملتان کے ایک سید صاحب کا نام من و عن لکھنا ہوتا تھا۔ ہر سوال کے سا نام ہر قرار داد کے ساتھ پورا نام اور ہر تقریر کے ساتھ پورا نام۔ مگر ان کا نام بہت طویل تھا: "مخدوم زادہ خان بہادر سید" سے توخیر ہوتا تھا، لیکن نام کے بعد بعد ایک لفظ زائد لکھنے ہوتے تھے۔ ترجمے کے علاوہ بار بار سطر ڈیڑھ نام کی نذر ہو جاتی تھی۔ آپ نے محض طوالت سے تنگ آکر کہا ؎

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شُد — سنتے آئے ہیں بزرگوں کی یہ رٹ
آج لمبی راہ پہ چلتا ہے کون — ہوں نظر کے سامنے جب شارٹ کٹ
دیکھ لو خادم نہ کہلائے کبھی — پیرزادے بن گئے "مخدوم" جھٹ

اسمبلی کے ممبر صاحبان دن رات آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ بعض وطن دوست اس سے پریشان بھی ہوتے تھے۔ آپ نے کی تسلی کے لیے کہا:-

آ بتا دوں تجھ کو اے ہمراز، اک رمزِ حیات — جس کو سُن کر رہبرانِ قوم بھی کہہ دیں کہ "ہاں!
لڑنے بھڑنے کے لیے پیدا کیا انسان کو — ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں!"

یہ حضرات کسی سے اپنی نکتہ چینی سن کر برافروختہ ہو جایا کرتے تھے۔ اصلاحِ احوال کی طرف کم متوجہ ہوتے آپ نے چند مصرعوں کا مکالمہ لکھا:

فراش: حضور! ہال کا قالین ہے بہت گندہ
جو حکم ہو کسی ماہر سے صاف کروا لیں

قانون ساز: ٹھہر کہ مجلسِ قانون بیٹھنے کو ہے
اسی سے کیوں نہ یہ قانون پاس کروا دیں

ہمارے ہال کے قالین کو جو گندہ کہے
وہ بدزبان سزا پائے اور ڈنڈ بھرے

یہی حال بعض انتظامی شعبوں کا تھا۔ مستعد پر جوش اور درد مند اہلکار نیم مردہ، بے حس اور بے خیال افسروں کی افسری کے تلے کراہ رہے تھے۔ اس پر آپ نے کہا:

حافظؒ کے زمانے میں کچھ لوگ حماقت سے ۔۔۔ پالان گدھے والا کس دیتے تھے گھوڑے پر
اور جس کی اذیت سے سنتے ہیں کہ وہ گھوڑا ۔۔۔ رہتا تھا مصیبت میں پاتا تھا تو ترک ترک پر
اکبرؔ کے زمانے کا دستور نرالا ہے ۔۔۔ دیکھا کہ گدھے صاحب اسوار ہیں گھوڑے پر
اور لطف یہ ہے کوئی فریاد نہیں سنتا ۔۔۔ چابک پہ مگر چابک ہنٹر پہ مگر ہنٹر

تم دیر سے مانو گے، ہم نے تو یہ مانا ہے
وہ اور زمانہ تھا، یہ اور زمانہ ہے

ایک دن اخبار میں نکلا کہ ایک نادار کنگال عدالت کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے فاقوں سے تنگ آ کر خودکشی کا اقدام کیا مجسٹریٹ صاحب بہادر نے اسے پچاس روپیہ جرمانہ کر دیا۔ اس پر آپ نے کہا:

ایک روٹی کے نہ ملنے سے ہوا مایوس وہ
اور ڈھونڈی اپنے ہاتھوں ہی سے مرگِ ناگہاں
کل عدالت نے سنایا اس کو اپنا فیصلہ
جمع کروائے خزانے میں وہ نو سو روٹیاں
ساتھ ہی اکبرؔ سزا یہ دی ہے مجھ مجنون کو
جج کو فاضل اور سلامی کہوں قانون کو

اگلے دن ماڈل ٹاؤن میں ایک بھینسے نے آدمی کے ٹکر ماری اور آدمی بیچارا مر گیا۔ آپ نے اس پہ کہا:

اک بھینسے اور انسان کے ٹکراؤ میں یہ نکتہ پنہاں ہے
جو رہ جائے وہ بھینسا ہے، جو مر جائے وہ انساں ہے

ہمارا اصول کچھ ایسا ہے کہ لوگ اپنی پیش رفت کے لیے چاروں طرف درخواستیں داغتے رہتے ہیں۔ ہر شخص کا خیال ہے کہ میں ا
جگہ کی نسبت اوپر والی جگہ کے زیادہ موزوں ہوں۔ وہ حکام کو جا جا کر پریشان کرتے ہیں کہ صاحب نام چھوڑ کر مجھے ضرور فلاں اسا
پر لگائیے۔ اس رجحان پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

راجہ کے دربار میں بھانت بھانت کے لوگ   کچھ راجہ کے لاڈلے، کچھ پرجا کے لوگ
اک منڈل کے منتری، ایک سبھا پردھان   اک جنتا کی جوت ہیں، اک سینا کا مان
ہر گھوڑے کی پیٹھ پہ اک افسر اسوار   صوبے داروں سے بھرا، راجہ کا دربار
ہر ماتھے کی ریکھ میں راجہ کا پرتاب   کون اٹھائے چھتر کو تھامے کون رکاب ؟
اتنے راجہ بن گئے، پرجا نظر نہ آئے
اکبر اب یہ سمے ہے، تو پرجا رہ جائے

سینماؤں میں سگرٹ کی بندش ہوئی، تو آپ نے بعض سگرٹ نوشوں کی بے چارگی پر اس طرح طعن کیا :

دو چار کش لگا کے جو سگرٹ کے دھنیا   دیتا سرور قلب کو سوز و گداز فلم
سگرٹ ہوا ہے بند تو دل کا یہ حال ہے   جیسے کہ پڑھ رہا ہوں دو رکعت نماز فلم

اپنا اپنا قاتل

ایک غالب تھے کہ قاتل نے کیا قتل ان کو   اور کی قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ایک اکبر ہے کہ اس پر یہی آفت بیتی   لیکن اس عہد کے قاتل کی ریا سے توبہ
کی مرے قتل کی اخبار میں تردید اس نے   اور کرا دی مرے احباب سے تائید اس نے

نازش رضوی

سید امام علی نازش رضوی یکم جنوری ۱۹۰۱ء کو بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ اُردو فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سن ۱۲ میں جنگِ عظیم کے دوران آپ نے ایران اور عراق عرب میں سرکاری خدمات انجام دیں اور ۱۹۲۴ء میں وطن واپس آکر صحافت کو ذریعہ بنایا۔ اس سلسلہ میں ۱۹۳۲ء تک آپ دلکش، بہارستان، تازیانہ، ادبی دنیا، نیرنگِ خیال، روزنامہ سیاست اور جمہور وغیرہ اداروں میں ک کرتے رہے۔ اس کے بعد کامل دس سال ہز ماسٹرس وائس گراموفون کمپنی کے دہلی دفتر میں شعبۂ ادب اور نشر و اشاعت کے رکن رہے۔ د اور لاہور کے قیام میں آپ نے چھ کتابیں تصنیف کیں جن میں حرب و ضرب، بزم و رزم، روح المعانی اور سرمایۂ نازش تو سیاسی و ملی نظم غزلوں، گیتوں اور مرثیوں پر حاوی ہیں۔ باقی دو مجموعے ایٹم بم و دیگر افسانے اور شاہ صاحب کا ہاتھی مزاحیہ افسانوں پر مشتمل ہیں شہادت کارزار اور رنگین افسانے ابھی زیرِ طبع تالیف ہیں۔

نازش صاحب اخبار نویسی کے زمانے میں تو ضرورتاً اور بعد میں فرمائش پر ارژنگ، ماہیہ پیارہ۔ ابو نواس۔ ملّا بازی) ۔ اور بعض دوس قلمی ناموں سے زمیندار، سیاست، نگران، ریاست، تازیانہ، امروز، ایشیا اور نوائے وقت وغیرہ میں مزاحیہ نظمیں لکھتے رہے جن کا ”مزاح و عبر“ کے نام سے مرتب ہوا تھا اور اس کا دیباچہ چراغ حسن حسرت مرحوم نے لکھا تھا۔ مگر وہ گزشتہ طوفانی برسات سیلاب کی نذر ہوگیا۔ اس وقت جو چند نمونے دستیاب ہوسکے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے طنز و مزاح میں ”عبرت“ ہے جس سے وعظ کی سی صورت پیدا ہوگئی ہے اور ظرافت دب کر رہ گئی ہے۔ اس سے مخاطب صرف مسکرا سکتا ہے۔ نازش صاح نزدیک جس شعر پر ہنستے ہنستے چہرے کا حلیہ بگڑ جائے وہ مزاح کی ذیل میں نہیں آتا۔ دیکھئے موجودہ چور بازاری، پھوٹ، جھوٹ اد پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ؎

ملے کچہری میں اک روز شیخ حیدراتی   ہے اک زمانے سے ان کی مری علیک سلیک
نہیں ہے جھوٹی گواہی سے اجتناب انہیں   کیا نہ آج تک اس پہ مگر کسی نے اٹیک
علاوہ اس کے امیروں کے ہیں یہ سپلائر   کہ مال کرتے ہیں یہ ان کی حسبِ منشا پیک
ہو جس میں فائدہ وہ کام کر گزرتے ہیں   کبھی فرنٹ میں جاکر نہیں ہوتے بیک
حجاز جاتے ہیں ہر سال سونا لانے کو   یہ بزنس آج تک ان کی کبھی ہوئی نہ سلیک
یہ حج کے دن بھی ہیں ”لبیک“ کے عوض کہتے   خدا کے گھر میں فقط ”ربنا بلیک ! بلیک !“

،، واعظ کے بارے میں اقبال کے ایک ایک مصرعہ کی تضمین اس طرح کی ہے ؎

واعظ اس دور کے بیچارے مسلمانوں کو   آئے دن دعوتِ پیکار و جدل دیتے ہیں
وعظ میں تیغ زباں کے یہ دکھا کر جوہر   زندہ افراد کو پیغامِ اجل دیتے ہیں
گُر لڑائی کے انہیں یاد ہیں صدہا اے دوست   یعنی اس شان سے یہ درسِ عمل دیتے ہیں
الٹے فرماتے ہیں یہ شرحِ کلامِ ربّی   "خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں"

انسان جس طرح انسان کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہا ہے اس پہ طنز ہے ؎

نرغے میں اہلِ علم کے پھر مدتوں کے بعد   کوا بچارا آ کے پھنسا ہے الٰہی خیر
فتوےٰ فقیہہ شہر نے اب تک نہیں دیا   لیکن غریب کوّے کا ہے اب سے حال غیر

سنتے ہیں اہلِ فقہ کا ہے اس پہ اجماع   اس کا مباح ہونا بڑی نیک فال ہے
سودا بھی کہہ گئے ہیں کئی سال پیشتر   لاتعق کے باغ کا کوا حلال ہے
اس دورِ ظلم و جور میں کوّے کا ذکر کیا   اس میں تو آدمی کے لیے بھی نہیں فلاح
پھر حلتِ طیور پہ ہو بحث کس لیے   انسان کا گوشت جبکہ بہر طور ہے مباح

زمانۂ حال کے صوفی کی ہجو ؎

اے فسوں گر تری باتوں میں ہے جادو کا اثر   تو وہ ہے دم سے ترے زندہ ہوا سحرِ قدیم
نقرئی ریش کا وہ جال عیاذاً باللہ   رات دن جس میں پھنسا کرتے ہیں اہلِ زر و سیم
تو چلاتا ہے اس انداز سے تزویر کا تیر   زد میں آجاتا ہے اس کی ہو مسافر کہ مقیم
سرمگیں آنکھ تری جذب و کشش کا مرکز   جس کے ادنیٰ اشارے پہ فدا عقلِ سلیم
تیری اعجاز بیانی قمِ عیسیٰ کی حریف   ہیں ترے حسنِ تکلم میں سب اندازِ کلیم

کیا یہی مسلکِ درویشی ہے او دشمنِ فقر   کیا حقیقت میں طریقت کی یہی ہے تعلیم
اپنا کردار بدل آہ میں سچ کہتا ہوں   آج افعال سے تیرے دلِ ملت ہے دو نیم
تو وہ قطرہ ہے صدف نے جسے مردود کیا
تو کہاں اور کہاں آبروئے درِ یتیم

غزل

حسنِ الفت کا راز کیا جانے   ناز پرور نیاز کیا جانے
یہ غلط ہے کہ اس زمانے میں   مولوی ساز باز کیا جانے
غزنویت میں گم ہوئے باری   قدر اپنی ایاز کیا جانے
میری درگت کا راز وقتِ سرود   کوئی طبلہ نواز کیا جانے
اپنے گھر کی خبر نہ ہو جس کو   وہ میرے دل کا راز کیا جانے
غمِ ملت میں حال باری کا   کوئی بندہ نواز کیا جانے
آج سر پیازہ کے بغیر یہاں
کوئی اوصافِ پیاز کیا جانے

پنڈت ہری چند اختر

ہوشیارپور کے رہنے والے تھے۔ اپریل سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم زیادہ تر لاہور میں حاصل کی۔ فارسی میں منشی فاضل اور انگریزی میں ایم اے پاس کیا۔ ابتدا ہی سے ادب و شعر کا ذوق تھا۔ طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ساری عمر ادبی محفلوں کی جان رہے اور دوستوں کے لیے قہقہوں کا سامان فراہم کرتے رہے۔

ابتدا میں تین چار سال اخبار نویسی کی۔ ہفتہ وار "پارس" کو پارس بنایا۔ "ہیول" اور تہذیب میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ پنجاب اسمبلی، مرکزی محکمہ اطلاعات، جنگی پبلسٹی اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستہ رہے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان چلے گئے تھے اور دہلی یا چنڈی گڑھ

میں رہتے تھے۔ وہیں یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا۔

پنڈت ہری چند اختر نہایت خوش ذوق، سخن فہم، پختہ کار اور باکمال شاعر، زبان اور فن کی باریکیوں کے ماہر، لطیف و نفیس نثر لکھنے والے اور صحیح معنی میں انشا پرداز تھے۔ وہ لطائف و ظرائف کی پوٹ، بے حد خوش طبع، زندہ دل، شائستہ اور بلند اخلاق آدمی تھے۔ ان کی شاعری چند غزلوں اور چند نظموں سے زیادہ نہیں مگر جو کچھ کہا کسی دوسرے کے لیے کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ مزاحیہ اشعار کہنے، دوسروں کے کلام کی پیروڈی لکھنے اور شعرا کے پڑھنے کی نقل اتارنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ افسوس کہ ان کا کلام حاصل نہ ہو سکا۔ چند اشعار دیکھیے:۔

ابھی تو یہی دیکھنا چاہتا ہوں   نہیں چاہتا ان کو یا چاہتا ہوں
مری نیتوں پر نظر رکھنے والو   بتا دو کہ آخر میں کیا چاہتا ہوں
نہ سمجھا کوئی جس کو وہ حرف ہوں میں   غلط ہو چکا ہوں مٹا چاہتا ہوں
میں سمجھا وہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں   وہ سمجھے کہ میں کچھ کہا چاہتا ہوں

زمانے کو کیا دیا دینے والے   ہمیں تو نے ٹرخا دیا دینے والے
زمانے کو توپیں بھی دیں مال و زر بھی   ہمیں تو نے چرخا دیا دینے والے

بیٹھتا ہوں تو درد اٹھتا ہے   درد اٹھتا ہے بیٹھ جاتا ہوں

کہا ہم چین کو جائیں، کہا تم چین کو جاؤ   کہا جاپان کا ڈر ہے، کہا جاپان تو ہوگا
کہا کابل چلے جائیں، کہا کابل چلے جاؤ   کہا افغان کا ڈر ہے، کہا افغان تو ہوگا
کہا ہم اونٹ پر بیٹھیں، کہا تم اونٹ پر بیٹھو   کہا کوہان کا ڈر ہے، کہا کوہان تو ہوگا

چلو چل کر دکھا لائیں تمہیں ٹیگور کی داڑھی !   بڑی ہی شان کی داڑھی بڑے ہی زور کی داڑھی

نعمتوں کو دیکھتا ہے اور ہنس دیتا ہے دل   محو حیرت ہوں کہ آخر کیا ہے میرے دل کے پاس

سیّد محمد جعفری

سید محمد جعفری اس دور کے ذہین ترین طنز نگار شاعر ہیں۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے اور اب ایک ذمّہ دار افسر ہیں۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری ہماری معاشرتی کمزوریوں کے لیے ایک بےرحم آئینہ ہے ع
دیکھتے ہیں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے۔

ان کے طنز میں تلخی نہیں نرمی ہے، علمیت بھی ہے اور شعور بھی۔ وہ افراد کی تحقیر نہیں کرتے بلکہ اداروں اور اجتماعی زندگی کی خامیوں پر انگلی رکھتے اور اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات پر کچھ اس انداز سے ہنستے ہیں کہ پڑھنے والا مزے لیتا اور ان کے ہمنوا ہو جاتا ہے۔ وہ غالب اور اقبال کے مصرعوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی شوخیوں میں رچے ہوئے ذوق کی بدولت ظرافت میں دلآویزی او انوکھا پن پیدا کرتے ہیں۔ اسی سبب ان کے طنز میں شگفتگی اور زندہ دلی ہے، وہ جس نظام کے کل پرزہ ہیں۔ اس کے خلاف بھی متواتر احتجاج کرتے رہتے ہیں۔ لال فیتہ، موٹی موٹی سفارشیں، نمائش، سیاسی نعرے، غرض اور ریاکے سجدے۔ کلرک کا کردار، آزاد شاعری، یو این او جنگیوں کی ہڑتال غرض کوئی چیز ان کی زد سے باہر نہیں۔ وہ جب ان اقتدار پسندوں کو دیکھتے ہیں جن کا حلق اخوت اور مساوات کے سیاسی نعرے لگانے خشک ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کا عمل پھر بھی اس کے سراسر خلاف رہتا ہے، تو وہ اپنی نظم "وزیروں کی نماز" میں نماز" میں نماز کے خالص سیاسی اور خود غرضانہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے یوں طنز کرتے ہیں۔

عیدِ اضحیٰ کی نماز اور وہ انبوہِ کثیر   جبکہ اللہ کے دربار میں تھے پاک وزیر
وہ مصلّوں پہ مسلط تھے بحسنِ تقدیر   تھے "ریزرو" ان کے مصلّے پہ مساواتِ کبیر

آج کل یہ ہے نماز، اور کبھی وہ تھی نماز
"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"

صفِ اوّل میں کھڑے تھے جو خدایانِ مجاز   یہ امیر اور یہ غریب اور یہ نشیب اور یہ فراز
تجھ سے اے خالقِ کل چھپ نہیں سکتا یہ راز   تو حقیقی، وہ مجازی مجھے دونوں سے نیاز

"آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں"
کبھی رکھتے ہی نہیں اور کبھی رکھتے ہیں

عطر میں ریشمی رومال بسایا ہم نے   ساتھ لائے تھے مصلّیٰ وہ بچھایا ہم نے
دور سے چہرہ وزیروں کو دکھایا ہم نے   ہر بڑے شخص کو سینے سے لگایا ہم نے
"پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
کون کہتا ہے کہ ہم لائقِ دربار نہیں
ذکر خطبے میں وزیروں کا جو پایا ہم نے   آسمانوں کو زمینوں سے ملایا ہم نے
کعبۂ دل کو صنم خانہ بنایا ہم نے   سامری کی طرح بچھڑوں کو سجایا ہم نے
خوگرِ پیکرِ محسوس ہے انساں کی نظر
مان لیتا کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر"

یو، این، او کی کارگزاری پر جعفری سے بہتر طنز شاید کسی اور سے نہ کی ہو گی۔ صرف دو بند ملاحظہ فرمائیے۔ اس نظم کی پوری فضا میں غالب کے مصرعے جس آب و تاب سے جگمگا رہے ہیں، اس کی داد نہیں دی جا سکتی ؂

یو، این، او کے پیٹ میں سارے جہاں کا درد ہے   وعدۂ فردا پہ ٹرخانے کے فن میں فرد ہے
گرچہ پٹوا تا فلسطیں میں خود اپنی نرد ہے   ایسی قوموں سے خفا ہے جن کی رنگت زرد ہے
کتنا اچھا فیصلہ کرتا رہا کشمیر کا
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
ڈالئے اس کے گزشتہ کارناموں پہ نظر   وادیٔ کشمیر کے قضیہ کو ٹالا کس قدر
فیصلہ کا وقت جب آیا تو بولا حیلہ گر   "لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ "مہرو" بدگماں ہو جائے گا
یہ نہیں سوچا کہ بدنامِ جہاں ہو جائے گا

جعفری نے کراچی کا نقشہ بھی اس کے حقیقی خدوخال میں پیش کیا۔ یہ خدوخال اگر مضحکہ خیز ہیں تو اس میں جعفری کا کیا قصور، صرف دو تین بند دیکھیے:

اے کراچی ململ اور کھجلی کے دیرینہ وطن   سب کو یہ دو نعمتیں ملتی ہیں تجھ سے تحفتاً
اور شہیدِ ناز ہو جاتے ہیں گلگوں پیرہن   کب تلک ہم سے تغافل کب تلک بیگانہ پن
سرد مہری اور گرمی کا تری کیا آسرا
سندھ صوبہ کی وزارت کی طرح موسم ترا

تیرے بازاروں کی رونق اور شہروں میں کہاں   حسن سے شرما کے بجھ جاتی ہیں اکثر بجلیاں
پر دلِ وحشی کو مل سکتی نہیں پھر بھی اماں   آ کے لٹ جاتا ہے بازاروں میں "بھولا بھالوں"
پھر نہ دنگل کام آتے ہیں نہ کوئی داؤ پیچ
ساری دنیا ہے مریضِ عشق کی آنکھوں میں ہیچ

ہیں ترے نقار خانے میں بہت سی بولیاں   اس میں چپ بیٹھی ہے تنہا طوطیِ شیریں بیاں
یعنی وہ اردو جو ہجرت کر کے آئی تھی یہاں   جنگ آمادہ ہیں اس بیگم سے گھر کی باندیاں
اس کی قدر و منزلت سے دل ترا بیگانہ ہے
"گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے"

بھنگیوں کی ہڑتال کا ایک منظر دیکھیے:

بھنگیوں کی آج کل ہڑتال ہے   کھتر و مہتر کا پتلا حال ہے
گردشِ دوراں نے ثابت کر دیا   رفعِ حاجت بھی بڑا جنجال ہے
ضبط کی حد پر کھڑے ہیں شیخ جی   سانس کھینچے ہیں مگر منہ لال ہے
پیٹ پکڑے پھر رہے ہیں سیٹھ جی   جیسے دھوتی میں بہت سا مال ہے
آگیا دُکے سے رک سکتا نہیں   اپنا اپنا نامۂ اعمال ہے۔

ہر گلی کوچے کی اپنی جھیل ہے
ہر جگہ دلی بنی نینی تال ہے

اب کلرک کے کردار کا مطالعہ کیجیے :

خالق نے جب ازل میں بنایا کلرک کو   لوح و قلم کا جلوہ دکھایا کلرک کو
کرسی پہ پھر اٹھایا بٹھایا کلرک کو   افسر کے ساتھ پن سے لگایا کلرک کو
مٹی گدھے کی ڈال کے اس کی سرشت میں
داخل مشقتوں کو کیا سرنوشت میں

چپراسی خلد میں جو بلانے گیا اسے   حوروں نے کچھ مذاق کیا کچھ ملک ہنسے
حیران تھے کلرک کہ کیسے برے پھنسے   ہاتف نے دی صدا کہ یہ کچھ دن یہیں بسے
آدم کا رف ڈرافٹ ہے کب تک ہنسو گے تم
اپروو ہو کے آیا تو سجدہ کرو گے تم

جنت کو گرچہ ناز تھا اپنے مکین پر   تھا ان کی زندگی کا سہارا روٹین پہ
ٹی اے وصول کرنے کو اترا زمین پر   لفظ کلرک لکھا تھا لوح جبین پہ
ابلیس راستے میں ملا کچھ سکھا دیا
اترا فلک سے تھرڈ میں انٹر لکھا دیا

ظریف جبلپوری

۲۶ نومبر سنہ ۱۹۱۲ء کو بمقام کٹنی (ضلع جبلپور) میں پیدا ہوئے۔ والدین نے حامد رضا نام رکھا لیکن بچپن ہی سے ظریفانہ شعر کہنے کی بدولت ظریف مشہور ہو گئے۔ نسیم بھرت پوری رشتہ میں ان کے دادا کے چھوٹے بھائی تھے۔ ظریف اپنے وطن ہی میں ملٹری انجینئرنگ سروس میں ملازم ہیں۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ سب کچھ کہتے ہیں اور مصرعوں میں جادو بھر دیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں "جنگ اور ہندوستان"، "مادرِ وطن"، غریب کمینک شاعر وغیرہ مشہور ہیں۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے۔ تمام اشعار میں جنگ، گرانی، سیاست پر طنز اور چھیڑ چھاڑ ہے ؎

ہماری قبر کے تختے چرا کے کہتے ہیں ہے کنٹرول کی لکڑی گراں نہیں معلوم ؟

پھانسی منصور کو لگائی ہے وہ سمجھتا ہے نیک نامی ہے

فردوس تک کے در کھلے ماہِ صیام میں اور وا اگر نہ تھا تو تمہارا ہی در نہ تھا

عشق میں اور کیا ہو حبسِ دوام ہجر خود انڈمان ہے پیارے

ہم آپ ہوں گے نہ ہوگا عدد رہے کی کمی کہ جیسے تانگے میں اک ہم نہیں تو کچھ بھی نہیں

آپ کی یاد بن گئی اکسیر خاک میں مل گئی ہماری یاد

سونا مہنگا ہے تو پھر تلنے کے سکّے ہی سہی نوٹ اور وہ بھی پھٹا ہو مجھے منظور نہیں

کیا نمک اُٹھ گیا زمانے سے پھیکا پکوان کھا رہا ہوں میں

کیا نمک پاشی کرے جب ہے نمک پر کنٹرول ہنس رہے ہیں زخمِ دل خالی نمکداں دیکھ

عقلیں درست ہو گئیں مہنگائی کے سبب سب بیوقوف جنگ میں چالاک ہو گئے

کیا سیاست ہے کہ ہیں وہ جنگ سے بیزار بھی غیر کی جانب بھی ہیں اور غیر جانب دار بھی

کپڑا روپوش ہے عریانی چھپائیں کب تک چند اک دن میں لنگوٹی بھی اُتر جائے گی

کپڑا اگر ملے تو گریباں بھی چاک ہو   کیسے پھروں میں چاک گریباں کیے ہوئے

میرے بالوں سے وہ اُلجھتے ہیں   ان کی زلفوں میں پھنس گیا ہوں میں

ڈھونڈتے ہیں وہ میرے سجدوں کو   سنگِ در پہ بڑی کھدائی ہے

اِک غیر تھا کہ پا گیا دس سال کی سزا   اب کوئی درمیان میں حائل نہیں رہا

میں تو نپٹ ہی لوں گا تم منہ سے "ہاں" تو کہہ دو   آخر عدو عدو ہے یا تیس مار خاں ہے

زاہد و رند دونوں ہی یکساں ہیں   اپنی اپنی مگر طبیعت ہے

ترے ایمان کی نیا بھٹکتی پھرتی ہے زاہد   کبھی کوثر کی موجوں میں کبھی گنگا کے دھاروں میں

محفل کی عنایت سے ظریفِ سخن آرا   وہ داد ملی ہے کہ کھجایا نہیں جاتا

اُن کے ملنے کو جو پُوچھا تو تنک کر بولے   تم تو سُنتے ہی نہیں کہہ تو دیا عید کے دن

پڑھتے پڑھتے ہوگئے کالج سے بھی اوورایج ہم   نوکری کرنے کا بھی اب ہم کو ڈر جاتا رہا

دریائے ظرافت میں طوفان کچھ ایسا ظریف اُٹھ آتا ہے   اشعار ہمارے سُن سُن کر سب ہی ہی ہا ہا کرتے رہے

شبِ فراق جسے عاشقی میں کہتے ہیں   وہ رات خود نہیں آتی بلائی جاتی ہے .

ہجومِ عاشقاں دیکھا جو دروازے پہ وہ بولے   ہمیں یہ ٹیم تو آل انڈیا معلوم ہوتی ہے
ہوا کو ایجوکیشن جب سے رائج انڈیا بھر میں   ہر اک تعلیم گاہ اندر سبھا معلوم ہوتی ہے

مجھے دفتر سے اور گھر سے تو فرصت ہی نہ ملتی تھی   گنہ پھر کب کیے آخر کراماً کاتبین میں سے
بتایا اس طرح پُر لطف قصّہ اپنی الفت کا   فسانہ تھا کسی کا اپنی باتیں ٹھونس دیں میں نے

عشاقِ سلف میں اور ہم میں تعلیم کے باعث فرق یہ ہے
وہ ہجر میں رویا کرتے تھے ہم ہجر میں گایا کرتے ہیں

رجسے چاہیں اپنا دل دیں کہ یہ دل تو ہے ہمارا
، عدو کا اس میں جھگڑا نہ تمہارا کچھ اجارہ
تجھے مر کے بھی نہ چھوڑوں کہ ظرایف زندہ دل ہوں
اسے یُوں سمجھ لے ہمدم تو ندی ہے میں کنارہ

وہ دل میں گھس رہے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں	کہ سنگاپور میں جاپان داخل ہوتا جاتا ہے
الفت کے معجزے جو دکھانے لگا ہوں میں	ناصح کو راہِ عشق پہ لانے لگا ہوں میں

جھکانے کو ہر در پہ سر کو جھکا دوں
نمائش کا سجدہ عبادت نہیں ہے

ضمیر جعفری

سید ضمیر جعفری بھی اس دور کے اچھے طنز و مزاح نگاروں میں ہیں۔ آپ اسلامیہ کالج لاہور کی پیداوار اور شیرازہ کے ابتدائی لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی نظم "وبائے الاٹمنٹ" کا ایک بند دیکھیے ؎

وکل مہاجرین پہ تازہ نکھار دیکھ　　مونچھوں کے تاؤ دیکھ نظر کی بہار دیکھ

موٹر پہ اُڑ رہا ہے وہ تلاّ کہار دیکھ　　ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

اے مرحبا یہ حسن ادائے الاٹمنٹ

ان کے طنز و مزاح کا ایک اچھا نمونہ "عورتوں کی اسمبلی اور وزارت" ہے۔ اس میں ایک فرضی مزاحیہ مجلس کا نقشہ پیش کر کے نسوانی فطرت کے بعض مخصوص رجحانات پر چوٹ کی گئی ہے۔ چند بند توجہ طلب ہیں ؎

بوا کو تو دیکھو نہ گہنا نہ پاتا　　فقط اک غرارہ فقط ایک چھاتا

نہیں کچھ بھی نام خدا آتا جاتا　　بجٹ ہاتھ میں جیسے دھوبن کا کھاتا

ادھر ممبری چھڑ گئی ممبری سے

ادھر طفل رونے لگے گیلری سے

بہ آوازِ شور و شغب بولتی ہیں　　بہ اندازِ غیظ و غضب بولتی ہیں

نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں　　پہ جب بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں

شہادت کی انگشت اقبال پہ ہے

کبھی ناک پہ ہے کبھی گال پہ ہے

سپیچوں میں گوٹے کناری کی باتیں　　بہو کی کفالت شعاری کی باتیں

پڑوسن کی پرہیزگاری کی باتیں　　غرض ہر بیاہی کنواری کی باتیں

بلیڈ اور ٹائی پہ "کٹ" ہو رہی ہے
مگر عطر و ریشم کی ہٹ ہو رہی ہے

فرقت کاکوروی

غلام احمد فرقت کاکوروی ایم اے بھی اس دور کے تحریف نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ آپ دہلی کالج میں تاریخ کے لکچرار ہیں آپ کی مندرجہ ذیل کتابیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ مداوا (تنقید)
۲۔ ناروا (ترقی پسند مصنفین کے خاکے)
۳۔ صدف و ہدف (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
۴۔ اردو ادب میں طنز و مزاح (تاریخ اور تمام مزاح نگاروں پر تبصرہ)
۵۔ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

مداوا اور ناروا میں آپ نے جدید شاعری کا خاکہ اُڑایا اور ترقی پسند شاعروں کے کلام کی پیروڈی کر کے ان کے رنگ کو اتنا تیز کر کے پیش کیا ہے کہ مہملیت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی تحریفات کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ اکثر مقامات پر شعوری کاوش کی زیادتی اور ظرافت کی کمی نظر آتی ہے اور نظمیں محض نقل بن کر رہ گئی ہیں۔

ناروا کا ایک نمونہ دیکھیے۔ سلام مچھلی شہری کا تعارف کراتے ہوئے لکھا "آپ سلام ہیں اور آپ کی شاعری وعلیکم ہے۔ سر دست آپ کی شاعری پر تفکر کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن جب بھی شاعری اردو میں باقاعدہ ترجمہ ہو کر آئے گی، تو یقیناً ایک اضافہ ہوگی اس وقت دنیا ہمارے اس نوجوان شاعر، ادیب اور مفکر کے مرتبے کا صحیح اندازہ لگا سکے گی۔ وغیرہ" ان کی ایک نظم کی پیروڈی اس طرح کرتے ہیں۔

بنگال کی رقاصہ

ناچیے ناچیے۔ پائل کے بغیر
جسم عُریاں ہی رہے۔
شعلہ افشاں ہی رہے۔
ناچیے ناچیے۔

بھوک اور موت کا رقص
میرے بنگال کا رقص
ناچیے سوچتی کیا ہیں۔ اٹھیے
آپ بنگال سے کب آئی ہیں
نغمہ و رقص کا پیکر بن کر
جسم کو بیچیے۔ پتھر بن کر
ناچیے۔ ناچیے
میں پاگل ہوں
یوں ہی بکا کرتا ہوں۔ !

راجہ مہدی علی خاں

دورِ جدید کے جن شعرا نے زندگی اور سماج کے چھپے ہوئے ناسوروں پر تیز نشتر چلانے کا آغاز کیا۔ ان میں راجہ مہدی علی خاں کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ وہ مولانا ظفر علی خاں کے خاندان سے تعلق رکھتے اور پیدائشی شاعر ہیں۔ ان کی والدہ شاعری کی دُنیا میں ح۔ ب صاحبہ کے نام سے معروف ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں ماہنامہ عالمگیر، ہفتہ وار خیام، تہذیبِ نسواں اور پھول وغیرہ کے اداروں میں کام کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں چلے گئے تھے۔ اب تک وہیں ہیں۔ مضراب ان کی تصنیف ہے جس کی نظموں میں بقول ڈاکٹر وزیر آغا ”بعض حقائق کو طشت از بام کر کے خواب پرستوں کی ذہنی اڑان کو روکنے کی ایک واضح سعی نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کی نظم چوہا اور خدا میں اگر دعا کی جذباتیت کو نشانۂ طنز بنایا گیا ہے تو ”کلانے کے آنسو“ میں محبت کی سستی جذباتیت کو رُسوا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر جب وہ ان باتوں سے ذرا ہٹ کر ٹھوس حقائق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ”اجی پہلے آپ“ اور ”ملاقاتی“ جیسی تخلیقات معرضِ وجود میں آنے لگتی ہیں اور طنز کی نشتریت تیز تر ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے سلسلے میں راجہ صاحب کی بہترین نظم ”ایک البم پر“ ہے، جس میں انتہائی خوبی اور جرأت سے سماج کی بعض دلچسپ رسوم کے مضحک پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ میری دانست میں اس نظم کی حیرت انگیز کامیابی کا راز ان ناہمواریوں میں بھی ہے، جو ”بڑی بی“ کے الفاظ اور کردار سے پیدا ہوتی ہیں“:۔

بہت خوب صورت بہت نیک تھا وہ   ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

کسی سے بھی رکھی نہ اس نے عداوت   کہ پیشہ تھا اس نوجواں کا شرافت
ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا   خدا اس کو بخشے ہمیں مل کے جاتا
نہ رو رو کے بے حال ہو اے دلہن تو   نہ کر اس قدر آہ رنج و محن تو !
وہ جنت میں خوشیاں منائیگا مت رو   وہ حوروں سے اب دل لگائیگا مت رو
وہ آخر ہمیں بھی تو تھا جاں سے پیارا   مگر دے لیا ہم نے دل کو سہارا

نہ کر بین اتنے نہ رو اتنا پیاری
ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

رضیہ ذرا گرم چاول تو لانا   ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی تو لانا
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ   ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
منگانا ذرا شوربا اور حالہ   بڑھانا ادھر کو ذرا یہ پیالہ
ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا   خدا اس کو بخشے ہمیں مل کے جاتا
پڑا ہے پلاؤ میں گھی ڈالڈے کا   خدا تو ہی حافظ ہے میرے گلے کا
دلہن سے کہو آہ اتنا نہ روئے   بچاری نہ بیکار میں جان کھوئے
اری بوٹیاں تین سالن میں تیرے   یہ چھیچھڑا لکھا تھا مقدر میں میرے
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ   ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
دلہن گھر میں چورن اگر ہو تو لانا   نہیں تو ذرا کھاری بوتل منگانا

نہ کر بین اتنے نہ رو اتنا پیاری
ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

راجہ مہدی علی خاں کی ایک اور نظم " اس سے اور اسی سے " بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے کسی قسم کی نکتہ چینی کیے بغیر ر اور حقیقت کے تصادم کو محض دو تصویروں کی صورت میں پیش کرکے کامیاب طنز کی گئی ہے۔

زمیں کے چاند ترا حُسن آسمانی ہے   ہر ایک جلوہ ترا اک نئی کہانی ہے
زہے نصیب کہ تو ہو مری شریک حیات   ہو تیرے جلووں سے رخشندہ زندگی کی رات
ہے میرے اُجڑے ہُوئے گھر کو انتظار ترا   تو اے بہار اسے آ کے رشکِ خلد بنا
گھر آؤں گا جو سرِ شام ہو کے میں بے حال   نہال دل کو کریں گے یہ تیرے پھول سے گال
گلے میں ہونگے ترے ہار میری بانہوں کے   چمک اُٹھیں گے ستارے تری نگاہوں کے
کرے گی زندہ مجھے تیری دلنشیں گفتار   مرے چمن میں ہمیشہ رہے گا حسن بہار
کھُلے گی دل کی کلی روح شادماں ہوگی   بہشت ہوگی اسی گھر میں تو جہاں ہوگی
قدم نہاد فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

(۲)

خدا کے واسطے کھولو بھی آکے دروازہ   میں کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں چیخ رہا
اگر علیل نہ ہو آپ کا مزاج شریف   تو پنکھا جھلیے ذرا اُٹھ کے کیجیے تکلیف
یہ چارپائی مری ٹیڑھی کیوں بچھائی ہے   بھلا اکنی یہ کیوں فرش پر گرائی ہے
الٰہی کون یہ پانی کا دے گا اتنا بل   خدا کے واسطے کر نل کو بند اے کاہل
چپاتیاں مرے اللہ سب کی سب کچی   تمام عمر ہی شاید رہو گی تم بچی
بس اٹھ بھی اب کوئی ایسا بُرا تو حال نہیں   یہ مجھ غریب کا گھر ہے یہ ہسپتال نہیں
دبا دے پیر مرے اُٹھ کے، اُٹھ بھی او اٹھ اوست

خوجی

رتن ناتھ سرشار

اس افسانہ (فسانۂ آزاد) کی اصل شخصیت آزاد ہے.... اس کے ساتھ خوجی ایک مسخرہ ہے جو ایک بٹیر باز نواب کے مصاحبوں میں شامل تھا۔

"خوجی یا خواجہ بدیع الزماں یا خواجہ بدیعا ایک افیمی شخص ہیں، بوڑھے ہیں مگر وہ اپنے آپ کو جوان اور کبھی بالکل لڑکا سمجھتے ہیں کمزور اتنے کہ اگر ہوا چھو جائے تو گر پڑیں۔ دبلے پتلے ایسے کہ کوئی بچہ چپت جڑ دے تو سات لڑھکنیاں کھائیں بدصورت اس قدر کہ کوئی دیکھے تو ڈر جائے مگر سمجھتے یہ ہیں کہ میں نہایت موٹا تازہ، نہایت طاقتور، نہایت خوبصورت ہوں، حوصلہ ایسا کہ ہزار مرتبہ پٹے جوتیاں کھائیں مگر خم ٹھونک کر پکڑ لڑنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ ساتھ ہی عقلمندی کا دعویٰ ہے۔ حالانکہ پرلے درجہ کے بیوقوف ہیں آپ خیر سے شاعر بھی ہیں اور کسی جگہ تک سے تک ملائے بغیر نہیں رہتے فارسی خوب بولتے ہیں اتنی خوب کہ کبھی تو سمجھ ہی میں نہیں آتی بات بات پر قرولیاں نکالنا آپ کا خاص وصف ہے حالانکہ قرولی کی کبھی خواب میں بھی شکل نہیں دیکھی۔ بہادری کا یہ عالم ہے کہ مارتوں کے پیچھے، اور بھاگتوں کے آگے بہت ہمت کی اور وہ بھی عمر میں ایک مرتبہ تو ڈرتے ڈرتے کسی مردے کے ناک کان کاٹ لئے۔ غرض کہاں تک بیان کیجیے، خواجہ صاحب کی ذات میں دنیا بھر کی بہترین حماقتیں جمع ہو گئی ہیں۔

....خوجی افیمی آدمی، لڑکی کا نام سنتے ہی ہکا بکا ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے کہ خدا ہی خیر کرے۔ ہم سمجھے تھے کہ دل لگی کرتے ہو۔ یہ کیا معلوم تھا کہ سچ مچ تنگ توبڑا چڑھا کر بھاگا ہی چاہتے ہو میاں تم لاکھ عالم و فاضل سہی پھر لڑکے ہی تو ہو۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش آپ کی اور دعویٰ یہ کہ ٹرکی جا کر روسیوں سے لڑیں گے۔ اے تیری قدرت۔ میاں ہوش کی دوا کرو، عقل کے ناخن لو... ایک ذرا سی چنے کے برابر گولی پڑے گی تو ٹائیں سے مر جائیے گا۔ آپ کو کبھی مورچے پر جانے کا شاید اتفاق نہیں ہوا۔ ارے میاں خدا بھلے مانس کو نہ لے جائے۔ غضب کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ گولی پڑی یہ مر گیا۔ گھوڑے کی پیشانی پر جمی دھم سے گرا۔ دائیں دائیں کی آواز بادل کی کڑک کی طرح گونجتی ہے۔ قریب سپاہی کھڑا ہے اور ایک دفعہ ہی لوٹ گیا۔ توپ کا گولہ آیا اور اٹھارہ آدمیوں کو گرا دیا۔ گولہ پھٹا اور بہتر ٹکڑے... دس دس آدمیوں کو دیکھتے ہی دیکھتے اڑا دیا گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اور جو کہیں تلوار چلنے لگی تو اُف او بے جان جاتی ہے.... سو بھئی وہاں جانا کچھ خالہ جی کا گھر تھوڑا ہی ہے۔ اے توبہ ارے توبہ خدا بھلے مانس کو جنگ کے میدان سے بچائے۔

میاں خوجی میں ایک وصف یہ تھا کہ بے سوچے سمجھے، بے دیکھے لڑ پڑتے تھے۔ چاہے اپنے سے دوگنا چوگنا ہو، یہ چمٹ ہی جائیں گے

غصہ کی یہ خاصیت ہے کہ جب آتا ہے کمزور پر۔ مگر میاں خوجی کا نرالا تھا۔ ان کو جب غصہ آتا تو شہ زور پر جوان کو اٹھا کر پھینکے، تو اٹھارہ لڑھکنیاں کھائیں، چاہے کچومر نکل جائے مگر یہ بررنا نہیں چھوڑتے۔

دوسرا وصف یہ تھا کہ پٹ پٹا کر، جھاڑ پونچھ کے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے مگر ممکن کیا کہ ذرا اف کریں وہی تیور وہی دم و خم۔ کسان نے اتنی بڑی گستاخی کی کہ ان کی ٹٹوی کو ان کے سامنے اتنا مارا کہ اس کا بھرکس ہی نکل گیا پھر بھلا ان کو تاب کہاں؛ آفتابہ پھینکا اور تڑ سے گتھ گئے۔ وہ گنوار آدمی اور انتہا کا کرارا۔ یہ دبلے پتلے مہین آدمی ہوا کے جھونکے میں اُڑ جائیں۔ اُس نے ان کی گردن دبوچی اور گد سے زمین پر پھینکا۔ پھر چھٹنے کی کوشش کی تو کسان کی جورو ان سے چمٹ گئی اور لگی ہاتھا پائی ہونے۔ اس نے ایک گھونسا جمایا اور ان کے پٹے کو پکڑ کر پھینکا تو چاروں شانے چت۔ وہ تھپڑ رسید کئے ایک ادھر، ایک اُدھر اور کسان کھڑا ہنس رہا ہے کہ یہ مہرا رو سے جیت پاوت ناہیں یو مشنڈے سے کاڑے لے بھلا۔ کسان کی جورو تو ٹھونک ٹھانک اور پیٹ پاٹ کر چل دی، آپ نے پکارنا شروع کر دیا قسم بابا جان کی جو کہیں چھرا پاس ہوتا تو اس وقت ان دونوں کی لاش پھڑکتی ہوتی۔ وہ تو کہیے خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ میں اپنے زور میں آپ رہا ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ عمر بھر یاد کرتے۔ بات ترے کی نابکار کھڑا تو رہ گیدی روزخی۔۔۔۔"

خوجی اور ایک ڈاکٹر کی دو دو چونچیں:۔

"**خوجی**:۔ (ڈاکٹر سے) کیوں میاں ڈاکٹر کہاں ہیں اس وقت؟

ڈاکٹر:۔ آپ اپنا مطلب کہیے۔

خوجی:۔ اجی تو تم سے کیا واسطہ۔ عجیب قطع کے آدمی ہو، دخل در معقولات دینا کیا معنی تم بس اتنا بتا دو کہ ڈاکٹر کہاں ہیں؟

ڈاکٹر:۔ لاحول ولا قوۃ

خوجی:۔ لاحول ولا قوۃ

ڈاکٹر:۔ کوئی ہے نشتر لاؤ ہم ان کی خبر لیں گے۔

خوجی:۔ کوئی ہے لٹھ لاؤ ہم ان کی خبر لیں گے۔

کمپونڈر:۔ اجی کیا بک بک لگائی ہے۔ یہی تو ڈاکٹر صاحب ہیں میاں۔

خوجی:۔ آداب عرض کرتا ہوں۔۔۔۔"

سرا میں بے بھاؤ کی پڑیں، مگر خوجی کی اکڑفوں وہی رہی۔

ایک دن پچھلے پہر سے کھٹملوں نے میاں خوجی کا ناک میں دم کر دیا۔۔۔۔ افیمی آدمی۔۔۔ ایک دفعہ پینک میں آئے تو ان حضرات نے پنڈلیوں کو بھڑ کی طرح بھنبھوڑ کھایا اور اُنہوں نے پینک سے چونکتے ہی غل مچایا۔۔۔ تو آس پاس کے لوگوں کی نیند حرام ہو گئی چور کا گمان ہوا۔ لینا جانے نہ پائے چور۔ چور۔ چور۔ ارے میاں کہاں؟ کدھر؟ کس رُخ؟ لینا پکڑ لینا ہے۔ دیکھو پکڑے رہنا، بھئی مسافرو ہوشیار۔۔۔ سرا بھر میں ہلڑ مچا ہوا ہے۔۔۔ میاں خوجی نے جو لینا جانے نہ پائے۔ چور۔ چور کی آواز سنی تو خود بھی غل مچانا شروع کر دیا کر ہائیں ہائیں! خبردار جانے نہ پائے۔۔۔ او چور او گیدی ٹھہرا رہنا! یہ خبر ہی نہیں۔۔۔ کہ یہ شگوفہ حضرت ہی نے چھوڑا ہے۔۔۔ قد تو حضور کا ماشاء اللہ پون انچ کا اور دم خم یہ کہ۔۔۔ قرولی کی حضرت عمر بھر صورت بھی نہ دیکھی ہو گی مگر بات بات پر قرولی اور

قرابینچ کی فکر رہتی ہے کوئی اس مسخرے سے اتنا پوچھے کہ اب قرابینچے کا غیتن کہاں؟ شیر بچہ باندھے آپ نے کس کو دیکھا! قرولی کس کی کمر میں نظر آئی نگران کو بک دینے سے مطلب ہے خیر میاں خوجی جو گرمائے تو چھپر کٹ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور لپک ہی پڑے... گلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہے ہیں کہ لینا. لینا... لپکے تو بھٹیاری کو ڈپٹ لیا اور فرمایا کہ تو ہی چور ہے. بھلا بے بھلا پکڑ ہے. **بھٹیاری** نے کہا میاں کچھ خیر ہے ہوش کی باتیں کرو۔ اتنے میں آپ نے دوڑنا شروع کیا. پینک میں سوجھ گئی کہ چور آگے بھاگا جاتا ہے دوڑتے دوڑتے ٹھوکر جو کھاتے ہیں تو اُڑا اُڑا دھوں میاں خوجی گرے بھی تو کہاں جہاں کمہار کے ہنڈے رکھے تھے. گرنا تھا کہ ہنڈے چکنا چور ہو گئے کمہار نے للکارا کر چور چور. اٹھنے کو تھے کہ اس نے آن کر دبوچ لیا اور پکارنا شروع کیا کہ دوڑو چور[1] کا پکڑ لیں... سب کے سب دوڑ پڑے کوئی ڈنڈا لیے ہے کوئی بید گھماتا ہے کوئی لکڑی ملاتا کوئی لٹھ باندھے اندھیری رات گھٹا ٹوپ اندھیرا چو طرفہ چھایا ہوا کسی کو کیا معلوم کہ یہ چور ہے یا میاں خوجی... بے بھاؤ کی حضرت پر پڑنے لگیں یار لوگوں نے زناٹے کے ہاتھ لگائے... خوجی کی سٹی بھولی... خوب پٹ پٹا چکے تو ایک مسافر نے کہا بھئی ذرا ٹھہرو تو یہ خوجی ہیں جو اس کوٹھری میں پانچ سات روز سے ٹکے ہوئے ہیں جو چراغ جلایا گیا تو معلوم ہوا کہ تیرہ صدی کے بالشتیے میاں خوجی ہیں...!

الغرض میاں خوجی کی جان بچائی مگر کب کچومر نکل گیا. انجر پنجر الگ ہو گئے. جب لوگوں نے چپت گاہ کو خوب سہلا دیا تو میاں خوجی چلے....''

''اب خوجی صاحب جھومتے ہوئے چلے آتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ ہات ترے گیدی کی بڑا آزاد بنا ہے... مردود چارپائی پر پڑا خرخر کیا اور ہماری خبر ہی نہیں لی... بڑبڑاتے ہوئے میاں آزاد کی گلی تک چلے آئے. مگر آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ اتنا بھی نہ سوجھا کہ آزاد کھڑے ہیں. جب قریب پہنچے تو میاں آزاد نے یوں کہا... خیر ہم کو تو پیچھے گالیاں دینا. اب یہ بتاؤ کہ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹے.''

خوجی:- ہاتھ پاؤں! ہونہہ. یہ لوہے کی سلاخیں ہیں. آپ اس وقت ہوتے تو دیکھتے کہ بندہ درگاہ نے کیا کیا جوہر دکھائے. پچاس آدمی گھیرے ہوئے تھے... ایک کم نہ ایک زیادہ!''

راوی:- درست اس وقت آپ کو اتنا ہی ہوش تھا کہ آدمی گننے بیٹھتے.... مارے چپتوں کے بولا تو گئے تھے. مگر بے حیا کی بلا دور جھاڑ پونچھ کر پھر موجود.

خوجی:- واللہ میں اس وقت پھلجڑی بنا تھا.... بس یہ کیفیت تھی کہ دس آدمی اِس شانے کو اور دس ہی اس شانے کو پکڑے ہوئے تھے اور میں جو پھرا تو کسی کو اَنٹی دی، دھم سے زمین پر گرا کسی کو کولہے پر لاد کر مارا. کھٹ سے چھپر کھٹ کی پٹی پر ـ دو چار میرے رعب میں آ کے تھرتھرا کے گر ہی تو پڑے. دس پانچ کی ہڈی پسلی چکنا چور کر دی. یہ ڈھیلی کھائی وہ ہو رہا. اُدھر اُبھرا. جو سامنے آیا. اس نے نیچا دیکھا جو منہ چڑھا، منہ کی کھائی.... خدائی بھر میں کوئی ایسا جیوٹ آدمی دکھا تو دیجیے

راوی:- خدائی بھر کا حال تو خدا ہی کو خوب معلوم ہے مگر اتنی گواہی تو ہم بھی دیں گے کہ آپ سا بے حیا، بے غیرت جوتی خورا

---

[1] چور کو پکڑ لیا

سرا بھر میں تو اس سرے سے اس سرے تک کوئی ہمیں نظر نہیں آتا اس ڈینگ پر پھٹکار!"

جس طرح پینک نے کہار سے میاں خوجی کی مرمت کرائی اسی طرح اس کے طفیل نواب کی ایک ملازمہ بوا زعفرانی نے روئی کی طرح توم کے رکھ دیا اور اسی پینک کی بدولت کابلی ہوس بھی ہو آئے اور نہ جانے کہاں کہاں جا پھنسے اور درگت بنوائی۔ دل پر کہار، بوا زعفرانی کا خوف بیٹھ گیا۔ جہاز پر سوار ہونے کی شرطوں میں جہاں یہ خوف نمایاں ہے وہاں آپ کی دوسری دلچسپ خواہشیں بھی ظاہر ہوتی ہیں جو ان کے کردار کا ایک اہم جزو ہیں۔

پہلی شرط:۔ قرولی ہم کو ضرور دے دیجئے اور ایک قرابینچہ بھی ہمارے پاس رہے۔

دوسری شرط:۔ برس بھر کے صرف کے لیے افیم اپ جانب کر دیجئے۔ میں اپنے لادے لاد پھروں گا۔ ورنہ جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی اور بے موت اتنا غفیل ہو جاؤں گا آپ تو عورتوں کی طرح نشے کے عادی نہیں مگر بندۂ درگاہ بے افیم پئے ایک قدم نہ چلیں گے۔ وہاں پردیس میں افیم ملے یا نہ ملے کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔

تیسری:۔ اتنا بتا دیجئے کہ وہاں زعفرانی کی ڈنڈ پیل دیونیاں تو نظر نہ آئیں گی! تو بندہ ابھی سے رخصت ہوتا ہے۔ خدا حافظ۔ اف فوہ! اللہ کیا کس کس کے لاتیں لگائی ہیں اور کیا تان تان کے تکّے بازی کی ہے کہ بھیجن ہی نکال ڈالا۔ روح پر صدمہ ہے واللہ روح

چوتھی:۔ سرائیں ہم اب تمام عمر نہ اتریں گے اور جو جہاز پر کہار ہوئے تو ہم بس ڈوب ہی مریں گے۔ اجی اتفاق ہے۔ ہم ٹھہرے آدمی بھاری بھرکم کہیں پاؤں پھسل گیا اور ایک آدھ ہنڈا ٹوٹ گیا تو کہار الجزبہ بخیر ہی الگ کر دے گا لہٰذا کہاروں کی صحبت آج سے لغو

پانچویں:۔ جس رئیس کی صحبت میں بزاز آتے ہوں گے وہاں ہم نہ جائیں گے نہ جائیں گے۔ اس میں لالہ نین سکھ ہوں یا لالہ بلدیو۔ اجی بزاز تو ٹھہرے زمین کے گز۔ سب کہیں گھوما چاہیں، مگر ہم بہت دیکھ بھال کر جائیں گے۔

چھٹی:۔ جہاں آپ چلتے ہیں وہاں کابلی ہرس تو نہیں ہے کہ گدھے کے دھوکے میں کوئی ہم کو کان پکڑ کے کابلی ہاؤس پہنچائے ذرا یہ دریافت کر لیجئے گا۔

ساتویں:۔ ٹٹو پر ہم سوار نہ ہوں گے اس میں چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔

آٹھویں:۔ میٹھے پلاؤ روز پکیں۔

نویں:۔ ہم کو میاں خوجی نہ کہنا۔ جناب خواجہ صاحب قبلہ کہا کیجئے۔

دسویں:۔ مورچے پر ہم نہ جائیں گے بس باورچی خانہ کا انتظام ہمارے تعلق رہے اور لوٹ مار میں جو کچھ بھی ہاتھ آئے وہ بھی ہماری تحویل میں رکھا جائے

گیارہویں:۔ حسن آرا کے نام ایک خط روز لکھنا اور ہر خط میں ہماری طرف سے بندگی بلکہ دعا۔

بارہویں:۔ گولی کھانے کے تین گھنٹے قبل اور مرنے کے دو گھڑی پیشتر ہمیں اطلاع کر دینا۔

تیرہویں:۔ جو ہم خدانخواستہ جنت میں داخل ہوں تو لاش کو ہندوستان پہنچوانا اور جہاں والد مبرور کی لاش دفن ہے وہاں ہی دفنانا لیکن ہم کو خود ہی نہیں معلوم کہ پدر بزرگوار مرے کب اور دفنائے کہاں گئے اور تھے کون؟ آپ ذرا پتا لگا لیجئے گا اگر ان کی قبر نہ ملے تو کسی قبرستان میں جا کر جو سب سے بہتر قبر بنی ہو بس اسی کے قریب ہم کو بھی دفنانا اور لکھ دینا کہ ان کے والد ماجد کا مزار شریف ہے۔

چودہویں:۔ پینک کے وقت ہم کو ہرگز نہ چھیڑنا۔ اس وقت یہاں استغراق کی کیفیت ہوتی ہے اتنی شرطیں قبول ہوں تو خیر۔ ورنہ نہ خوجی نہ میاں آزاد

حاجی بغلول

منشی سجاد حسین

حاجی صاحب نے سفرِ حج کی زحمت تو خدانخواستہ کبھی خواب میں بھی نہ اُٹھائی تھی، ہاں ٹامس کُک کی بدولت ہزارہا بندگانِ خدا کو اللہ کے گھر کا چالان ضرور کروا دیا تھا۔ یہی حق کمیشن آپ کے نزدیک گھر بیٹھے کم سے کم ایک حج تو مہیا کر دینے کو کافی تھا، پس اگرچہ ہمارے حضرت خدا کی عنایت سے صرف بمبئی تک کے حاجی تھے، مگر یہ سفر ایسا مقبول ہوا تھا کہ واپسی کے بعد ہی سے خلقت نے بے سوچے سمجھے، محض چند زمزمیوں، سرمے کی کنکریوں، خرموں اور تین تولہ روغن بلساں کی چاٹ، سفرِ دریا کی تکالیف، ناخداؤں کی مہربانی دریائے شور کی کہانی، جہازیوں کی چند اصطلاحوں اور بدؤں کی چند بدسلوکیوں کے قصے سُن کر سبز عمامے، نیلی پوشاک اور رسولی ڈاڑھی عین مہملہ اور حائے حطی کو صحیح مخرج سے ادا کرنے کی دستاویز پر بمصداق ظن المومنین خیرا۔ معتبر مستند باضابطہ سرٹیفکیٹ یافتہ حاجی اور وہ حاجی جس کو حج اکبر نصیب ہو چکا ہو، مان رکھا تھا۔

اس لقب نے کچھ تو لوگوں کی لاپروائی اور ضعیف الاعتقادی اور بہت کچھ حاجی صاحب کی بہ نفس نفیس سعی بلیغ سے ایسی شہرت حاصل کی تھی کہ نام نامی اسم گرامی کا جزو لاینفک ہو گیا تھا۔ اگر کوئی ادب ناشناس زبان کا کاہل بدون اس مقدس شاخ کے نام لیتا تو سننے والوں کو اس کی بے ادبی پر سخت برہمی و ناخوشی ہوتی اور خود بدولت تو جامہ نیلین سے باہر، نیلی پیلی آنکھیں بحرِ احمر کی مچھلیاں، ڈاڑھی کے بال وہیل کی مونچھیں، چہرۂ آفتاب ملک عرب کی طرح تمتمایا ہوا، منہ پر بحرِ ظلمات کی طرح کف بے پایاں، مزاج میں مدوجزر کی بلاخیزی، جریب زیتونی لے کر بلا احرام وعمرہ اس پر اس طرح جھپٹ پڑتے کہ صفا اور مروہ کے دوڑنے والے پھسڈی رہ جاتے اور اگر ننھی منی ٹانگوں پر قدمی چال کے ہاتھوں اس تک دسترس نہ ہو سکتا تو رمی جمار میں تو کسی طرح تامل نہ فرماتے اس تکلیف فرمائی اور اہتمام بلیغ کا سبب صرف ترفع ذاتی نہ تھا بلکہ غصے کا بخار بھی ہوتا تھا جو آپ کے والدین خصوص والد بزرگوار اور جناب مولوی بدرالدجی صاحب پر آتا تھا جنہوں نے پیدائش سے کئی سال قبل بہ پیشگی بطور ضمیر قبل الذکر آپ کا نام نامی ایسا رکھ چھوڑا تھا جس کی خرابی مادر مشفقہ بڑی انا اور محلے کے گستاخ بازاری لونڈوں کے ایسی ہوئی تھی کہ بدون لفظ حاجی لگائے نام لینا باتفاق جمہور نہایت گستاخی قرار دیا گیا تھا

نیچر نے بھی صورت شکل بنانے میں توجہ خاص مبذول رکھی تھی مثل اور لوگوں کے آپ کی تعمیر ٹھیکیدار کے سپرد نہ کی تھی، بلکہ دستِ خاص کی صنعت تھی۔ سر اگرچہ چودہ انچ کے دور سے بال دو بال ہی زائد تھا، مگر گدی کی جانب بہت اونچا مابولال کی چڑھائی کی طرح، پیشانی کی طرف ڈھلا ہوا۔ پیشانی پست، نیچے کی جانب جھکی، ابرو چھوٹے مگر بے جبین اور کاواک۔ آنکھوں پر مثل سائبان خس پوش سے لگے

گو ابھرے۔ یعنی شاید قلت فرصت سے ایسی مختصر بنی تھی کہ بانسا معدوم، نتھنے صرف تہ خانے کے روشندان، اوپر کا لب چھوٹا، نیچے کا جبڑا مع زنخداں آگے کو ابھرا، رخساروں کی ہڈیاں بڑی، اوپر کے بہ نسبت نیچے کی بوائی بڑی، اس پر رسولی ڈاڑھی نور علیٰ نور، چہرے کو نوک دار بنائے ہوئے، پتلی گردن اس قدر مختصر کہ ریش مقدس باایں ہمہ اختصار آرزوؤں کے گنج شہیداں (یعنی سینہ) پر جاروب کش بازو اور ہاتھ فی الجملہ دبلے شانے، ڈھیلے وانگلیاں لکھنؤ کی مہین ککڑیاں، شکم مبارک کا بیضاوی دور سینے سے سوا، ٹانگیں چھوٹی موٹی اوپر کا دھڑ بڑا دانہ خوری کی طرح پو قدمی چال۔ یوں تو حضرت کے انسان ہونے میں کسے محل شک ہو سکتا ہے؛ مگر مورخین حکمت اساس میں اختلاف تھا۔ منقولی بہ نظر اختصار از راہ انسانیت آپ کا سلسلۂ نسب بلا شائبہ وسفسطہ حضرت آدم سے ملاتے اور معقولی انسان اور بوزینہ کے سلسلۂ گسستہ کی ایک کڑی بتاتے مگر اس میں کلام نہیں کہ بروقت غیظ و غضب جب حاجی صاحب لب پان خوردہ کھول کر کسی آفت زدہ پر چوٹ کرتے۔ اس وقت ڈارون[1] کے مسئلے کی ضرور تصدیق ہو جاتی۔۔۔

۔۔۔ فرائض مذہبی کے ادا و قضا کا نیا ہی کھاتہ کھولنا کچھ ضرور نہیں۔ ہاں کبھی کبھی اگر ایسی بلاؤں میں پھنستے تو صرف ایک کلی پر اکتفا کر کے بے وضو نماز ادا کر لی چاہیے مہینوں کی چھٹی ہو گئی۔ تارک الصلوٰۃ کے الزام سے بچے۔ رمضان سے اور آپ سے باپ مارے کا بیر تھا

۔۔۔ آپ جانیے اس طرح مجسم ظرافت قدوم میمنت لزوم سے پبلک جلسے اور خوش طبع مزاجوں کے پرائیویٹ مجمع کیونکر خالی رہ سکتے تھے؛ بڑا ہی بے ضابطہ وہ جلسہ ہوتا جہاں حضرت رونق افروز نہ ہوتے اور انتہا کی پھیکی بے مزہ وہ محفل شمار کی جاتی جس میں آپ اپنی مضحک صورت و سیرت سے چہل پہل نہ پیدا کرتے۔ پریسیڈنٹ چیئرمین اور اسپیکر آئیں یا نہ آئیں مگر حضرت ضرور صدر کرسی پر ڈٹے ہوں گے۔ ارباب نشاط، تماشائی اہل محفل ہنوز جمع بھی نہ ہوئے بلکہ ابھی فراش منگیرے شامیانے کی ڈوریاں کھینچ رہے ہیں، فرش کی شکن نکال رہے ہیں اور آپ کی سواری ڈھیکلی کرتی آ پہنچی۔ پھر لطف یہ کہ دنیا کا کوئی مسئلہ معاملہ آپ بلا واقفیت و اجازت پھپندیت ہیڑ کی طرح بولنے کو موجود۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی تجویز پیش ہو اور آپ مخالفت یا کم سے کم ترمیم پیش نہ فرمائیں۔ محفل میں گانے والوں کو بے وقت چیزوں کی فرمائش سے زچ کر دیتے۔ صبح کا وقت اور شام کلیان کی فرمائش، دوپہر رات اور بھیرویں پر اصرار۔۔۔ اگر کبھی کوئی صدا پسند آئی تو مجرے کی تال ورنہ جب تک گانا سنتے سارنگیے طبلچی پر اعتراضوں کی بوچھاڑ فرماتے رہتے۔ کن رسیا اتنے بڑے کہ عمر بھر آپ کو سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی کے موضوع لہ کے ادراک کی لیاقت نہ آئی، راگ راگنی کس جانور کا نام ہے۔ اس پر نائک ہونے کا دعویٰ کہ واجد علی شاہ اور محمد شاہ پیا آپ کے نزدیک طفل دبستاں"۔۔۔"

لکچر

صبح گجردم جبکہ منادِ روز یعنی شمس عالم افروز نے نقارۂ گیتی پر چوب شعاع لگائی، اعلان کر دیا کہ ہر عاقل و فرزانہ، مجنون و دیوانہ حماقت گاہ دنیا کی سیر و تفریح کو نکلے۔۔۔ اعلان ہو گیا خلق خدا کی ملک بادشاہ کا آج پانچ بجے شام کو جناب بڑے بھاری القاب، مولوی قاضی، مفتی، منشی، سیاح جہانیاں جہاں گشت جہاندیدہ حاجی بلغ العلیٰ صاحب مکی مدنی، ثم لکھنوی تحطا کے

---

[1] اس حکیم کی رائے ہے کہ انسان بندر سے پیدا ہے۔

متعلق لکچر موعود دیں گے۔ ہاں اور بہت سی باتیں دین و دنیا کے متعلق بتائیں گے چلو چلو خود اور اپنے ساتھ دوست احباب، اندو بچوں، چینگی پوٹوں صاحب سلامتیوں، جان پہچانیوں ایرے غیرے پچکلیانیوں، اڑوسیوں پڑوسیوں، اہل محلہ، راہ چلتوں کو لیتے آؤ پھر ایسا موقع عمر بھر نصیب نہ ہوگا۔ کڑم دھم۔ کڑم دھم"۔

اس اعلان ظرافت کی آواز حاجی صاحب کے بڑے بڑے کانوں تک بھی کہیں پہنچ گئی۔۔۔ ضبط و قرار نے راہ فرار لی۔ ریشے ریشے میں سیماب داخل ہوا۔۔۔ اور آپ اچھے خاصے بوکھل ہو گئے۔

آج کئی گھنٹے منہ ہاتھ دھونے سرمہ لگانے ڈاڑھی میں کنگھی کرنے، بر رخ مقدس سنوارنے میں صرف فرمائے اور سامنے آئینہ رکھ کے عمامے سے بہت دیر تک گاؤ زوریاں کیں، باندھا کھولا، پھر باندھا پھر کھولا۔ مگر کسی طرح پیچوں کی چول نہیں بیٹھی جہاں چاہیئے وہاں آتا ہی نہیں۔۔۔ کئی دفعہ سر سے اتار تخت پر دے ٹپکا آخر اوندھا کرکے آئینہ ہٹا دیا۔ پھر بیٹھے۔۔۔ عمامہ الجھاؤ میں دماغ چکر میں آخر جب بہت الجھن پڑی تو ناپ شتاپ جس طرح بنا ع بر سر فرزند آدم ہر چہ آید بگزرد کہہ کر پیپیڈین کا مصدر گردانا چلئے سر سے بلا ٹلی۔ ڈاڑھی پر کئی دفعہ ہاتھ پھیر کے جریب زیتونی پر نیل لگایا۔ رومال سے جوتے کی گرد جھاڑ کے بائیں کندھے پر ڈالا اور چل کھڑے ہوئے، کرسیاں بنجلیں بچھ بھی نہ چکی تھیں کہ آپ بطور ضمیر قبل الذکر جا پہنچے اور بیدھڑک صدر کی کرسی پر جائیداد موروثی کی طرح قابض ہو گئے زہے قسمت ان کی جن کو اس روز زیارت نصیب ہوئی، ایک بجھا ہوا گٹھڑا کرسی پر دھرا تھا زمین سے ایک ٹانگ دو اور دوسری ایخ اٹھی ہوئی۔ عمامہ سبز ہے یا شراب کے گیلن پر گھاٹ لگی ہے کرسی پر انسان ہے یا تپائی پر جلا ہوا تھیڑا۔ آپ کندے تولے کہنیاں میز پر رکھے آگو دار جھکے بندوق کے گھوڑے کی طرح ڈیڑھ پلے پر چڑھے مستعد بیٹھے ہیں۔

۔۔۔۔ جب۔۔۔ لوگ امید سے زیادہ آ چکے۔ حضرت نے بلا اجازت صدر و تقریر تمہیدی کرسی چھوڑی، جریب ٹیکی۔ عبا کے دامن آگے سے درست کئے۔۔۔ ریش مبترک پر مکرر سہ کرر ہاتھ پھیرا۔۔۔ رومال سے منہ پونچھا، کھانے کھنکھارے، جماہی لی، کئی دفعہ منہ کھولا اور بند کیا بالآخر یوں تقریر شروع کی۔

۔۔۔ کیا نام کہ بسم اللہ الرحیم (گھبراہٹ میں الرحمٰن الرحیم کی تخفیف بول دی) امابعد کہتا ہے یہ حقیر پر تقصیر کیا نام کہ شیخ فردوسی گلستان میں کہہ گئے ہیں ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق　　کہ یاراں فراموش کردند عشق

آج کل کیا نام کہ پانی نہیں برستا (سکوت پانچ منٹ) (تھوڑے چیرز) پڑ گیا ہے بڑا افسوس ہے کچھ نہیں پیدا ہوا، کھانے کو کہاں سے آئے؟ بقول شخصے اونٹ کے منہ کو زیرا (چیرز) اس ملک سے برکت کی باتیں اٹھ گئیں نہ اگلی سی برساتیں ہوتی ہیں نہ گرمی ہوتی ہے نہ جاڑا، اور نہ کیا نام کہ باپ کو بھائی بیٹے کو بہن، دوست کو دوست نہیں پوچھتے (وقفہ تین منٹ) بھائیو غور کرو کون کون باتیں کہی جائیں تم سب سمجھدار ہو سمجھ جاؤ، کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوستی بڑی عمدہ بات ہے اور اس میں شک نہیں ایک حد تک سب کو کرنا چاہئیے زمانہ برا لگا ہے کیا نام کہ دوست برائیاں کرتے ہیں قسم ہے اللہ پاک کی ہمارے عرب میں غلہ تو کم ہوتا ہے مگر دوستی زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں کی کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ شام کے مردے کو کب تک روئے (چیرز) کیا نام کہ بس دیکھ لیا سب کو۔ اس ملک میں بڑی خرابیاں ہیں۔ اسی سے دوستی و محبت کے نہ ہونے سے دل میں جنبش نہیں ہوتی لوگ دوست کو بنا کر مزے لیتے ہیں

اور جلا جلا کر لطف اٹھاتے ہیں (وقفہ سات منٹ) کیا نام کہ میں آپ سے کہوں بات یہ ہے جو خیال کرنا چاہیئے کیا نام کہ (وقفہ پانچ منٹ) ہاں تو میں کیا کہتا تھا؟ ایک آواز آگے آئی آیت۔

..... حاجی۔ پھر کیا نام کہ اس میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے؟

تا مرد سخن نگفتہ باشد　　عیب و ہنرش نہفتہ باشد
در بیشہ گماں مبر کہ خالیست　　شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

کیا نام کہ دیکھئے وکیل بیرسٹر لوگ ایک ادنیٰ سی بات کو کتنا بڑھاتے ہیں اور مقدمہ والوں کا کتنا روپیہ برباد کرتے ہیں اور ایک بات اور کہوں۔

آتا جاتا کچھ نہیں کرنے چلے تقریر ہیں — مقدمہ نہ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے اور صلاح دے دیتے ہیں۔ بمقدمہ چوپٹ کرا دیتے ہیں بلکہ عرضی دعویٰ تک صحیح لکھنا نہیں جانتے۔ مال کا ہارے گال کا جیتے۔ خدا کی عنایت سے ایک دفعہ اس ناچیز حاجی کو اتفاق ہوا، پس ایک صاحب نے ایسا ڈبویا کہ تھاہ نہ ملی۔ کیا نام کہ کتا چڑھے اونٹ کاٹے (وقفہ تین منٹ) پس یارو ان سے دُور بھاگو۔ یہ سب روپیہ کھا پیتے ہیں آدمی غلّہ کہاں سے لے سب تو سوت نہ کپاس کولی سے لٹھم لٹھا کرتے کرتے خرچ ہوتا ہے (وقفہ سات منٹ) کیا نام کہ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے میں تمہارا رازق ہوں۔ وہ تو کھانے کو دے ہی گا سب کچھ کھانے کو پیدا کیا گیہوں، مٹر، جو، چنا۔ اناج اور میوہ ترکاری، گھاس، پھوس جنگل پہاڑ۔ دریا شیر بھیڑیے۔ چیتے۔ لومڑی، کتا، بلی۔ فبای آلاء ربکما تکذبان۔ تو کس کس بات سے انکار کر سکتے ہو۔ شکر کرو کیا نام کہ شکر ؎

ادیم زمین سفرۂ عام اوست　　بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

اور اس نے تمہارے واسطے کیا نام کہ گھر بار محل کھپر۔ چھپریل (چھپر کھپریل) جھونپڑے۔ میاں بھٹ، بانی سب دیئے ہیں رہو اور اس کی نعمتوں پر شکر بھیجو۔" (وقفہ لا متناہی)

کچھ تو اس معقول تقریر۔ زعفران زار کشمیر کے اثر اور کچھ طول طویل سکوت سے لوگ سمجھے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا۔ اسپیچ تمام شد کار حاجی نظام شد۔ کئی منٹ انتظار کر کے کئی جلد باز اٹھ کھڑے ہوئے اور باوجود حاجی صاحب کی "ہاں ہاں" کے جلسہ خود ہی برخواست ہو گیا کرسیوں، بنچوں کی چرخ چوں سے حاجی کو وحشت لوگوں کے اس طرح اٹھ کھڑے ہونے پر بے حد نفرت ہوئی، خیالات میں پراگندگی ہذیان، زبان میں بڑی لکنت آئی اور بڑی بات یہ کہ دو ایک نے یہ صدا سنائی حضرت اب تکلیف نہ فرمائیے۔ جلسہ برخواست ہو گیا، حاجی نے پھر ایک دفعہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ صرۂ دماغ کے کونے سے ٹٹول ٹٹال کر ایک آدھ ریزگی نکالی۔ مگر نقادان سخن و صیرفیان اسپیچ فہم و فراست کے دیوالہ نکل جانے کے خوف سے دکان بڑھا چکے تھے مجبور و ناچار سکۂ قلب کی طرح واپس دل ہی میں رکھ لی۔ اور داہنے بائیں نیچی نظروں سے دیکھتے رومال سے منہ پونچھتے، مجمع کو چیرتے نہایت ناخوش و برہم چیتھڑوں سے جان سے خفا اس طرح رفو چکر ہوئے کہ دوست احباب نیاز مند سب تلاش ہی کرتے رہے۔

چچا چھکّن نے تصویر ٹانگی

امتیاز علی تاج

چچا چھکن کبھی کبھار کوئی کام اپنے ذمے کیا لیتے ہیں گھر بھر کو تگنی کا ناچ نچا دیتے ہیں۔ آ بے لونڈے۔ جا بے لونڈے یہ کیجو، وہ دیجو۔ گھر بازار ایک ہو جاتا ہے دور کیوں جاؤ، پرسوں پرے روز کا ذکر ہے دکان سے تصویر کا چوکھٹا لگ کر آیا، اس وقت تو دیوان خانے میں رکھ دی گئی کل شام کہیں چچی کی نظر اس پر پڑی تو بولیں ”چھٹن کے ابا تصویر کب سے رکھی ہوئی ہے۔ خیر سے بچوں کا گھر ٹھہرا کہیں ٹوٹ پھوٹ گئی تو بیٹھے بٹھائے روپے دو روپے کا دھکا لگ جائے گا۔ کون ٹانگے گا اس کو؟“

”ٹانگتا اور کون، میں خود ٹانگوں گا۔ کون سی ایسی جوئے شیر لانی ہے۔ رہنے دو میں ابھی سب کچھ خود ہی کیے لیتا ہوں۔“

کہنے کے ساتھ ہی شیروانی اتار چچا تصویر ٹانگنے کے درپے ہو گئے۔ امامی سے کہا ”بیوی سے دو آنے پیسے لے کر میخیں لے آ۔“ ادھر وہ دروازے سے نکلا ادھر مودے سے کہا ”مودے! مودے! جانا امامی کے پیچھے۔ کہیو تین انچ کی ہوں میخیں۔ بھاگ کر جا۔ جا لیجو اسے راستے ہی میں۔“ لیجیے تصویر ٹانگنے کی داغ بیل پڑ گئی اور اب آئی گھر بھر کی شامت۔

ننھے کو پکارا۔ ”او ننھے جانا ذرا میرا ہتھوڑا لے آنا۔ بنوا جاؤ اپنے بستے میں سے جنتی نکال لاؤ اور سیڑھی کی ضرورت بھی تو ہو گی ہم کو۔ ارے بھائی للو! ذرا تم جا کر کسی سے کہہ دیتے سیڑھی یہاں آ کر لگا دے، اور دیکھنا وہ لکڑی کے تختے والی کرسی بھی لیتے آتے تو خوب ہوتا۔ چھٹن بیٹے! چائے پی لی تم نے؟ ذرا جانا تو اپنے ان ہمسائے میر باقر علی کے گھر۔ کہنا ابا نے سلام کہا ہے اور پوچھا ہے آپ کی ٹانگ اب کیسی ہے اور کہیو وہ جو ہے نا آپ کے پاس کیا نام ہے اس کا۔ اے لو بھول گیا۔ بلول تھا کہ ٹلول۔ اللہ جانے کیا تھا خیر وہ کچھ ہی تھا۔ تو یوں کہہ دیجو کہ وہ جو آپ کے پاس آلہ ہے نا جس سے سیدھ معلوم ہوتی ہے، وہ ذرا دے دیجیے تصویر ٹانگنی ہے جائیو میرے بیٹے! پر دیکھنا سلام ضرور کرنا اور ٹانگ کا پوچھنا نہ بھول جانا۔ ...... یہ تم کہاں چل دیے للو؟ کہا جو ہے ذرا یہیں ٹھہرے رہو۔ سیڑھی پر روشنی کون دکھائے گا ہم کو؟ آ گیا امامی؟ لے آیا میخیں؟ مودا مل گیا تھا؟ تین تین انچ ہی کی ہیں نا؟ بس بہت ٹھیک ہیں۔ اے لو سُتلی منگوانے کا تو خیال ہی نہ رہا۔ اب کیا کروں؟ جانا میرا بھائی جلدی سے۔ ہوا کی طرح جا اور دیکھو بس گز سوا گز ہو سُتلی۔ نہ بہت موٹی ہو نہ پتلی۔ کہہ دینا تصویر ٹانگنے کو چاہیے ہے۔ لے آیا؟ او ددو کہاں گیا؟ ددو میاں! اسی وقت سب کو اپنے اپنے کام کی سوجھی ہے یوں نہیں کہ آ کر ذرا ہاتھ بٹائیں۔ یہاں آؤ۔ تم کرسی پر چڑھ کر مجھے تصویر پکڑانا۔“

لیجیے صاحب خدا خدا کر کے تصویر ٹانگنے کا وقت آیا مگر ہونی شدنی، چچا اسے اٹھا کر ذرا وزن کر رہے تھے، کہ ہاتھ سے چھوٹ

گئی۔ گر کر شیشہ چور چور ہو گیا۔ "ہٹی ہے!" کہہ کر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ چچا نے کچھ خفیف ہو کر کرچوں کا معائنہ شروع کر دیا۔ وقت کی بات، انگلی میں شیشہ چبھ گیا۔ خون کی تلّی بندھ گئی۔ تصویر کو بھول اپنا رومال تلاش کرنے لگے۔ رومال کہاں سے ملے؟ رومال تھا شیروانی کی جیب میں۔ شیروانی اتار کر نہ جانے کہاں رکھی تھی۔ اب جناب گھر بھر نے تصویر ٹانگنے کا سامان تو طاق پر رکھا اور شیروانی کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ چچا میاں کمرے میں ناچتے پھر رہے ہیں۔ کبھی اس سے ٹکر کھاتے ہیں کبھی اس سے۔ "سارے گھر میں سے کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ میری شیروانی ڈھونڈ نکالے۔ عمر بھر ایسے نکموں سے پالا نہ پڑا تھا۔ اور کیا جھوٹ کہتا ہوں کچھ؟ چھ چھ آدمی ہیں اور ایک شیروانی نہیں ڈھونڈ سکتے جو ابھی پانچ منٹ بھی تو نہیں ہوئے میں نے اتار کر رکھی ہے۔ بھئی بڑے......"

اتنے میں آپ کسی جگہ سے بیٹھے بیٹھے اُٹھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ شیروانی پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔ "ارے بھئی رہنے دینا۔ مل گئی شیروانی۔ ڈھونڈ لی ہم نے۔ تم کو تو آنکھوں کے سامنے بیل بھی کھڑا ہو تو نظر نہیں آتا۔"

آدھے گھنٹے تک انگلی بندھتی بندھاتی رہی۔ نیا شیشہ منگوا کر چوکھٹے میں جڑا اور تمام قصے طے کرنے پر دو گھنٹے بعد پھر تصویر ٹانگنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اوزار آئے، سیڑھی آئی، چوکی آئی، شمع لائی گئی۔ چچا جان سیڑھی پر چڑھ رہے ہیں اور گھر بھر (جس میں ماما اور کہاری بھی شامل ہیں) نیم دائرے کی صورت میں امداد دینے کو کیل کانٹے سے لیس کھڑا ہے۔ دو آدمیوں نے سیڑھی پکڑی تو چچا جان نے اس پر قدم رکھا۔ اوپر پہنچے۔ ایک نے کرسی پر چڑھ کر میخیں بڑھائیں، ایک قبول کر لی۔ دوسرے نے ہتھوڑا اوپر پہنچایا۔ سنبھالا ہی تھا کہ میخ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ کھسیانی آواز میں بولے "اے لو۔ اب کم بخت میخ چھوٹ کر گر پڑی! دیکھنا کہاں گئی!"

اب جناب سب کے سب گھٹنوں کے بل ٹٹول ٹٹول کر میخ تلاش کر رہے ہیں اور چچا میاں سیڑھی پر کھڑے مسلسل بڑبڑا رہے ہیں۔ "ملی؟ ارے کم بختو ڈھونڈی؟ اب تک تو میں سو مرتبہ تلاش کر لیتا۔ اب میں رات بھر سیڑھی پر کھڑا سوکھا کروں گا۔ نہیں ملتی تو دوسری ہی دے دو اندھو!"

یہ سن کر سب کی جان میں جان آتی ہے تو پہلی میخ ہی مل جاتی ہے۔ اب میخ چچا جان کے ہاتھ میں پہنچاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے اس عرصے میں ہتھوڑا غائب ہو چکا ہے۔

"یہ ہتھوڑا کہاں چلا گیا؟ کہاں رکھا تھا میں نے؟ لاحول ولا قوۃ! الو کی طرح آنکھیں پھاڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو! سات آدمی اور کسی کو معلوم نہیں ہتھوڑا میں نے کہاں رکھ دیا۔

بڑی مصیبتوں سے ہتھوڑے کا سراغ نکالا اور میخ گڑنے کی نوبت آئی۔ اب آپ یہ بھول بیٹھے ہیں کہ ماپنے کے بعد میخ گاڑنے کو دیوار پر نشان کس جگہ کیا تھا۔ سب باری باری کرسی پر چڑھ کر کوشش کر رہے ہیں کہ شاید نشان نظر آ جائے۔ ہر ایک کو الگ الگ نشان کھائی دیتا ہے۔ چچا سب کو باری باری الو گدھا کہہ کہہ کر کرسی سے اتر جانے کا حکم دے رہے ہیں۔ آخر پھر چھٹی لی اور کونے سے تصویر ٹانگنے کی ہ کو دوبارہ ماپنا شروع کیا۔ مقابل کی تصویر کونے سے پچیس انچ کے فاصلے پر لگی ہوئی تھی۔ بارہ اور بارہ اور کے انچ اور؟"

بچوں کو زبانی حساب کا سوال ملا۔ با آواز بلند حل کرنا شروع کیا اور جواب نکالا تو کسی کا کچھ تھا اور کسی کا کچھ۔ ایک نے دوسرے کو غلط بتایا۔ تو تو مَیں مَیں میں سب بھول بیٹھے کہ اصل سوال کیا تھا۔ نئے سرے سے ماپ لینے کی ضرورت پڑ گئی۔

اب کے چچا چھٹی سے نہیں ماپتے۔ سُتلی سے ماپنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سیڑھی پر بیٹھا بیس درجے کا زاویہ بنا کر سُتلی کا سرا کونے تک پہنچانے

کی کوشش میں ہیں کہ کیل ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ آپ لپک کر اسے پکڑنا چاہتے ہیں کہ اس کوشش میں زمین پر آ رہتے ہیں کونے میں ستار رکھا تھا۔ اس کے دو تار چچا جان کے بوجھ سے یک لخت جھنجھنا کر ٹوٹ جاتے ہیں

اب چچا کی زبان سے جو تیکھے ہوئے الفاظ نکلتے ہیں سننے کے قابل ہوتے ہیں مگر بیوی روک دیتی ہیں اور کہتی ہیں "اپنی عمر کا نہیں تو ان بچوں ہی کا خیال کرو۔"

بہت دشواری کے بعد چچا جان از سر نو کیل گاڑنے کی جگہ معین کرتے ہیں بائیں ہاتھ سے اس جگہ کیل رکھتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے ہتھوڑا سنبھالتے ہیں۔ پہلی ہی چوٹ جو پڑتی ہے تو سیدھی ہاتھ کے انگوٹھے پر۔ آپ "سی" کر کے ہتھوڑا چھوڑ دیتے ہیں وہ نیچے آ کر گرتا ہے کسی کے پاؤں پر ہائے ہائے اور افوہ اور مار ڈالا شروع ہو جاتی ہے

چچی جل بھن کر کہتی ہیں "یوں کیل گاڑنا ہوا کرے تو مجھے روز پہلے خبر دے دیا کیجیے میں بچوں کو لے کر میکے چلی جایا کروں۔ ورنہ نہیں تو۔

چچا نادم ہو کر جواب دیتے ہیں۔ یہ عورت ذات بھی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے۔ یعنی ہوا کیا جس پر یہ طعنے دیئے جا رہے ہیں؟ بھلا صاحب کان ہوئے۔ آئندہ ہم کسی کام میں دخل نہ دیا کریں گے

اب نئے سرے سے کوشش شروع ہوئی۔ کیل پر دوسری چوٹ جو پڑی تو اس کا پلستر نرم تھا پوری کی پوری کیل اور آدھا ہتھوڑا دیوار میں اور چچا اچانک کیل گڑ جانے سے دیوار سے ٹکرائے کہ ناک جہت دار ہوتی تو پچک کر رہ جاتی۔

اس کے بعد از سر نو پیمائش اور رسی تلاش کی گئی اور نئے کیل گاڑنے کی نئی جگہ مقرر ہوئی اور کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا کہ خدا خدا کر کے تصویر ٹنگی۔ وہ بھی کیسی؟ ٹیڑھی بینگی اور اتنی جھکی ہوئی کہ جیسے اب سر پہ آئی کہ اب سر پہ آئی۔ چاروں طرف گز گز بھر دیوار کی یہ حالت گویا چاند ماری ہوتی رہی ہے۔ چچا کے سوا باقی سب تھکن سے چور نیند میں جھوم رہے ہیں۔ اب آخری سیڑھی پہ سے دھم سے جو اترتے ہیں تو کہاں غریب کے پاؤں پر پاؤں۔ غریب کے ڈیل تھی۔ تڑپ ہی تو اٹھی۔ چچا اس کی چیخ سن کر ذرا سراسیمہ تو ہوئے۔ مگر پل بھر میں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے "اتنی سی بات تھی لگ بھی گئی۔ لوگ اس کے لئے مستری بلوایا کرتے ہیں!"

مرزا جی

ایم۔ اسلم

مرزا جی جھونپڑے میں بیٹھے محلوں کا خواب دیکھا کرتے اور گنج قارون کی تمنا دل میں لئے رہتے مدت سے دماغ میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ بہت دولت کماتے ہیں۔ بس! ہر وقت اسی دھن میں لگے رہتے کہ کسی طرح بیمہ کمپنی کے ایجنٹ ہو جائیں۔ آخر ایک دوست کے توسل سے یہ آرزو پوری ہو ہی گئی۔ اسی روز سے ہوائی قلعے تعمیر ہونے شروع ہو گئے۔ پہلے ماہ کی آمدنی کا بجٹ تیار ہونے لگا دن بھر بیگم سے یہی بحث رہتی۔ کبھی کبھی دونوں میں تکرار بھی ہو جاتی اور کبھی اڑوس پڑوس والوں کو بھی دخل دینا پڑتا۔

کمپنی والوں نے تمام نشیب و فراز بتا دیئے تھے۔ کہ کامیابی کے لئے دوسرے سے کچھ اس قسم کی باتیں کرنی چاہییں کہ وہ آسانی سے مائل ہو سکے۔ سوچنے لگے کہ سب سے پہلے کس پر کمنڈ ڈالیں۔ اتفاق سے ایک سوداگر سے کچھ علیک سلیک تھی۔ لوگ انہیں خان صاحب کہتے تھے۔ چنانچہ قرعہ فال انہیں کے نام پڑا۔ صبح ہوتے ہی اس کے ہاں جا دھمکے۔ باتوں باتوں میں اس نے پوچھا۔

"سنا ہے آپ بیمہ ایجنٹ بن گئے۔ کہئے کچھ کامیابی بھی ہوئی؟"

آپ مسکرا کر بولے۔

"آپ جانتے ہیں ہم ٹھہرے سپاہی لوگ یہ قلم گھسیوں کے کام بھلا ہم کیا جانیں۔ کمپنی کے "منیجر صاحب بہت روز سے مجبور کر رہے تھے۔ ان کی بات رد نہ کر سکے۔ آخر ماننا ہی پڑا۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے" خان صاحب نے کہا۔ "وقت بھی کٹے گا اور روپے بھی ملیں گے۔"

"اسی خیال سے تو آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"ارشاد!"

"گو بات کہنے کی تو نہیں لیکن ذاتی تعلقات کے پیش نظر کہے بغیر چارہ بھی نہیں۔" آپ نے ذرا مسکرا کر اور دو ایک بار پلکیں جھکا کر کہا

"ہاں! ہاں کہئے؟"

"گستاخی معاف! ہم کئی روز سے آپ کو کچھ مضمحل سا دیکھ رہے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی موذی مرض اندر ہی اندر گھن کی طرح آپ کو کھائے جا رہا ہے۔۔۔"

"ہمیں کیا ہے۔" خان صاحب ٹوک کر بولے "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ میری صحت تو بہت اچھی ہے۔"

"معاف فرمائیے!" آپ بولے۔ "یہ محض احساس کی بات ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ قدرت نے آپ کو طبیعت پر جبر کی طاقت عطا کر رکھی ہے۔ لیکن نیاز مندوں کی کوئی بات اوجھل نہیں رہ سکتی۔ آپ نے سنا ہو گا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ آپ ہزار چھپائیں۔ لاکھ ہنستے چہکتے نظر آئیں لیکن چہرہ کسی وقت دل کے راز دہستگان بھی کر دیا کرتا ہے۔ ہم اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہمیں جب آپ کے پیارے پیارے بچوں کا خیال آتا ہے تو اس وقت جو ہم پر گزرتی ہے وہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔

"اجی حضرت!" خان صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا ہوا ہمارے بچوں کو!"

"قبلہ!" آپ نے جواب دیا۔ "ہمیں بچوں کا فکر کیوں نہ ہو۔ ہونی اور شدنی تو ہر وقت ساتھ لگی ہے۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ نصیب اعدا اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو پھر ان معصوموں کا کیا ہو گا۔ زمانے کا رنگ بھی تو آپ سے کچھ چھپا نہیں۔ سگوں کی آنکھیں پھرتے دیر نہیں لگتی کہ خدا کے فضل و کرم سے آپ کے ہاں دولت کا ہُن برستا ہے۔ لیکن کرامت تو ساری آپ ہی کی ہے۔ پھر دولت تو ڈھلتی چھاؤں ہے اس کا کوئی اعتبار بھی نہیں کہ کبھی قیامت تک آپ کی ہی دہلیز پکڑے بیٹھی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ قرآن عظیم میں فرماتے ہیں۔ کل نفس ذائقۃ الموت۔ اور اتنا تو آپ بھی جانتے ہیں کہ موت کسی کو اطلاع دے کر نہیں آتی۔ کوئی آج کوئی کل۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ آپ بنک میں روپیہ رکھتے ہوں گے لیکن بنک جب چاہے دیوالیہ ہو سکتا ہے اس لئے ہمارا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کا بیمہ ضرور کر ڈالیں۔ آپ کے مرنے کے بعد پسماندگان کو ایک معقول رقم مل جائے گی اور آپ کے جدا ہونے کا صدمہ انہیں ہو گا اس کی کچھ نہ کچھ تلافی بھی ہو جائے گی۔

"بہت اچھا" خان صاحب نے پیچھا چھڑانے کو کہا "سوچوں گا۔"

"لاحول ولا قوۃ!" مرزا جی بولے۔ "کب سوچیں گے آپ! آپ دیکھ رہے ہیں کہ شہر میں وبا پھیل رہی ہے۔ اور گورستان والوں کی چاندی ہو رہی ہے پھر آپ تو ماشاءاللہ کاروباری آدمی ہیں۔ یہ سودا بھی کر دیکھئے۔۔۔۔"

"سودا کیسا؟" خان صاحب نے ٹوک کر پوچھا۔

"اجی واہ!" مرزا جی نے مسکرا کر کہا۔ "اس سے بہتر سودا اور کیا ہو گا۔ بیس پچیس ہزار کا زندگی کا بیمہ کر ڈالیں۔ شاید دو ایک قسطوں کے بعد ہی وارے نیارے ہو جائیں۔"

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"اجی مطلب تو بالکل صاف ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج کل حضرت ملک الموت علیہ السلام جھاڑو پکڑے بیٹھے ہیں۔ کون جانے جو آپ بھی کوڑے کرکٹ کی طرح پیٹ میں آ جائیں۔" مرزا جی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

خان صاحب نے مسکرا کر سر جھکا لیا اور مرزا صاحب نے کہا۔

"موسم کا رنگ ڈھنگ دیکھتے ہوئے تو ہم یہ کہیں گے کہ آپ بچوں کی زندگی کا بیمہ کروا ڈالیں۔ آپ جانتے ہیں بچے کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط نہیں کرتے آج کل جس نے کھانے پینے میں بے احتیاطی کی وہیں کوچ کا ڈنکا بھی بجنے لگا۔ آپ تو ماشاءاللہ بڑے سیانے آدمی ہیں۔ اگر آپ سوچیں تو یہ بھی ایک قسم کی تجارت ہی ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ لیکن اگر ایک دو کی آ ہی گئی تو وہ امر ربی ہے کسی کی مجال نہیں کہ دم مارے۔ اگر بچوں کی زندگی کا بیمہ ہو چکا ہو گا تو گھر بیٹھے آپ کو اتنی بڑی رقم مل جائے گی جو تجارت سے سال بھر میں بھی نہ ملے۔ بچوں کا کیا ہے بچے تو خدا اور بھی دے دے گا۔ دیکھئے حضرت! یہ باتیں آپ کے سوچنے کی ہیں کہ سوداگروں میں بھی چشمک ہوتی ہے

اور آپ کو خدا نے جو عروج عطا کیا ہے آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن ہم جانتے ہیں کہ ساری برادری آپ سے جلتی ہے اس لئے آپ کو چاہیے کہ دکان اور گھر اور گھر میں جو مال اسباب ہے اس کا بھی بیمہ کروالیں۔ کون جانے! کسی وقت کوئی حاسد رات کے اندھیرے میں چنگاری ہی ڈال جائے اور سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے لیکن اگر بیمہ کروا رکھا ہوگا تو ایک بار چھوڑ ہزار بار جلے۔ اجی روز جلے۔ آپ کی ہزار کو اصل سے زیادہ رقم تو آپ کو مل ہی جائے گی۔ حضرت! آج دنیا میں نہ کوئی قرابتداری کو دیکھتا ہے۔ نہ کسی کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔ آج پردھان وہ ہے جس کے پاس دولت ہے۔ داناؤں کا قول ہے کہ عقل مند کو بس اشارہ کافی ہوتا ہے۔"

اس خارسانہ تقریر کا اثر جو خان صاحب پر ہوا ہوگا۔ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

قاضی جی

شوکت تھانوی

(دروازہ پر دستک)

اجمل:۔ "جناب قاضی صاحب۔ قاضی جی تشریف رکھتے ہیں؟"

بیوی:۔ "کون اجمل بھائی؟ میں آ رہی ہوں دروازہ کھولنے۔"

اجمل:۔ (داخل ہوتے ہوئے) "آداب عرض بھابی۔ کہئے کیسے یاد فرمایا تھا اور ہمارے قاضی جی کہاں تشریف لے گئے؟"

بیوی:۔ کیا بتاؤں میں اجمل بھائی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں ان کو سمجھاؤں کس طرح۔ اب یہ دھن سوار ہوئی ہے کہ کسی فلم کمپنی پر قبضہ مل جائے

اجمل:۔ "فلم کمپنی پر قبضہ؟ ان کو کیا معلوم کہ فلم کا سر کدھر ہوتا ہے اور دم کدھر۔"

بیوی:۔ یہی تو میں کہتی ہوں کہ فلم کمپنی تو دوسری چیز ہے زندگی بھر میں مشکل سے دو تین تماشے دیکھے ہوں گے مگر دعویٰ یہ ہے کہ فلم کمپنی اگر مل جائے تو جھنڈے ہی لگا دیں گے

اجمل:۔ مگر یہ فلم کمپنی کی سوجھی کیسے؟

بیوی:۔ اللہ جانے فلم کمپنی نگوڑ ماری کا دورہ کیسے پڑ گیا ہے۔ دو دن سے نہ جانے کیا کیا خرافات لکھ رہے تھے۔ اب یہ رٹ ہے کہ فلم کمپنی لے کر چھوڑ دوں گا خدا جانے کیا کیا خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں۔"

اجمل:۔ "اور تشریف کہاں لے گئے ہیں؟"

بیوی:۔ "جاتے کہاں اندر کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ آؤ تم ہی کچھ سمجھاؤ خدا کرے تمہاری ہی بات سمجھ میں آ جائے"

(دونوں جاتے ہیں)

قاضی جی:۔ "آخاہ۔ اجمل صاحب ہیں۔ بھئی خوب آئے ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو نہایت ضروری مشورے کرنا ہیں بلکہ اب یہ طے ہے کہ یا تو ہم دونوں بن گئے۔ ورنہ جہاں ستیاناس۔ وہاں ساڑھے ستیاناس سہی مگر دوست پھڑک اٹھو گے وہ ترکیب تمہارے اس ہیچمدان کے ذہن میں آئی ہے قسم خدا کی سونے کی کان سمجھو سونے کی کان"

اجمل:۔ "اللہ مبارک کرے مگر کچھ معلوم تو ہو کہ واقعہ کیا ہے"

بیوی:۔ فلم کمپنی کھل رہی ہے۔

قاضی جی:۔ کھل رہی ہے یا یہ سمجھو کہ کھل گئی۔ خدا جانتا ہے کہ اس سے زیادہ نفع کسی کاروبار میں نہیں ہے مٹی سے سونا بناؤ۔ دیکھ لینا یہ دلدر دھل جائیں گے دن پلٹ جائیں گے۔ موٹریں اڑاتے پھرو گے موٹریں۔ ہاں میں تو یہ کہتا ہوں اجمل بھائی کہ زندگی تو یا میں نے

برباد کر دی اور یہ ترکیب اب ذہن میں آئی ہے جب قبر میں پیر لٹک چکے۔ مگر خیر دیر آید درست آید۔"

اجمل:۔ "یہ تو درست ہے مگر قبلہ آپ سے اور فلم کمپنی سے کیا تعلق۔ آپ کو اس کا کیا تجربہ؟"

قاضی جی:۔ بھئی پھر وہی بچوں کی سی بات کی تم نے۔ عزیزمن بہت سی صلاحیتیں انسان میں ایسی ہوا کرتی ہیں جن کا اس کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر مجھ کمبخت کو اپنی صلاحیت کا پہلے سے علم ہوتا تو میں آج بھلا جوتیاں چٹخارتا پھرتا۔ مگر اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میری تو جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ اور اب مجھ کو معلوم ہوا کہ میں دراصل تھا ہی اس کام کے لئے آپ کو حیرت ہوگی کہ دو ہی دن میں اتنا کام میں نے کر لیا ہے کہانی مکمل گانے ختم

اجمل:۔ "یعنی آپ نے لکھے ہیں گانے اور کہانی وغیرہ"

قاضی جی:۔ "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم کو حیرت ہوگی۔ ارے صاحب مجھ کو خود یقین نہیں آتا کہ میں ایسا قابل ہو سکتا ہوں مگر یہ تو مجھ کو کچھ خدا کا فضل نظر آ رہا ہے۔ ہماری کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا۔ استغفر اللہ"۔

اجمل:۔ "استغفر اللہ؟"

قاضی جی:۔ نہیں صاحب یہ تو میں بیگم صاحبہ کے رخ روشن کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں کہ میں تو فلم کمپنی کی باتیں کر رہا ہوں اور وہ اس طرح منہ بنائے ہوئے ہیں گویا میں گھاس کھا گیا ہوں۔ میں خبطی ہوں۔ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ ارے صاحب اب تک تو خیر میرے متعلق جو کچھ یہ کہتیں وہ ایک حد تک ٹھیک تھا مگر اب تو ان کو بجا فخر کرنا چاہیئے کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک گویا ان کا شوہر ہے۔"

بیوی:۔ "میں تو کہتی ہوں کہ خدا جانے میری قسمت میں لکھا کیا ہے تم روز بروز بہکتے ہی جاتے ہو۔ بھلا بتاؤ یہ باتیں میرے ڈرنے کی ہیں یا نہیں تم نے فلم کے لئے کہانی لکھ لی ہے تم نے گانے لکھ ڈالے ہیں تو سچ مچ تمہاری طرف سے بے حد پریشان ہو گئی ہوں کہ خدا جانے میرے مقدر میں کیا لکھا ہے۔"

قاضی جی:۔ "ملاحظہ فرمایئے آپ کی حماقت، خیر تم مجھ کو پاگل ہی سمجھو۔ جس وقت لوگ تم کو میری بیوی سمجھ کر سر آنکھوں پر جگہ دیں گے۔ اس وقت تم کو اس پاگل اس خبطی اس نامعقول شوہر کی قدر و منزلت کا پتہ چلے گا۔ تو خیر ہاں تو اجمل بھائی ہماری فلم کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا اتفاق"۔

اجمل:۔ "اتفاق۔ اتفاق سے آپ کا مطلب اتحاد سے ہے"۔

قاضی جی:۔ "یہی تو خوبی ہے۔ اس نام میں کہ یہ مطلب بھی ہے اور وہ مطلب بھی جو تم نہیں سمجھے۔ کہانی میں نے اس طرح شروع کی ہے کہ ایک بڑا سا تانگہ ہے جس پر پردہ بندھا ہوا ہے گویا اس میں زنانی سواریاں ہیں اور وہ تانگہ نہایت تیزی سے ایک سنسان سڑک سے گزر رہا ہے اور تانگے والا گاتا جا رہا ہے ؎

لمبی چوڑی سڑکوں پہ۔ ہاں پہ۔ ہاں پہ۔ میرا تانگہ فر فر جائے
میرا تانگہ فر فر جائے   میرا گھوڑا ہنٹر کھائے
دم لہرائے   چال دکھائے
لمبی چوڑی سڑکوں پہ۔ ہاں پہ۔ ہاں پہ۔ میرا تانگہ فر فر جائے
پھول سی ہلکی ہلکی سواری   میں واری

بیوی:۔ (ہنس کر) بھئی اللہ۔ بس خدا ہی تم پر رحم کرے"۔

قاضی جی:۔ "لاحول ولا قوۃ۔ اگر اس طرح سنو گی تو میں سنا چکا۔ سمجھنے کی تمیز ہے نہیں اور بھئی اللہ اور واری اللہ شروع کر دیا۔ تم کیا جانو

فلم کے گانے اس طرح ہوتے ہیں یہی گانا جب سازندوں کے ساتھ جاتی ہوئی دھن کی شکل میں آئے گا تو دیکھئے گا کہ کیا قیامت ہوتا ہے

اجمل:۔ بھابی ذرا سن لینے دیجئے مجھے تو بے حد لطف آ رہا ہے۔ قاضی جی کے یہ کمالات تو آج ہی مجھ پر روشن ہوئے ہیں۔"

قاضی جی:۔ "ارے صاحب ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے۔ دم بخود رہ جاؤ گے تم گے سن کر، خیر گانوں کو جانے دو ان کا لطف تو سازندوں پر ہی آئے
مگر کہانی سنو کہ کس قیامت کی ہے تو صاحب وہ تانگے والا اسی طرح گاتا ہوا جا رہا ہے کہ ایک موٹر پر ایک موٹر سے ٹکر ہو جاتی ہے اور
تانگے کی سواری نکل کر سڑک پر گر پڑتی ہے۔ قیامت کا حسن ہے۔ موٹر چلانے والا نوجوان اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور اپنی عالیشان
کوٹھی میں لے آتا ہے اور اس کی تیمار داری کرتا ہے وہاں صاحب ایک واقعہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہوش آ جاتا ہے۔"

بیوی:۔ (ہنس کر) لو اور سنو۔ یہ واقعہ ہوا ہے۔"

قاضی جی:۔ "خیر۔ خیر۔ تم کو تو نکتہ چینی سے مطلب ہے اگر خدا کیلئے کہانی کے لطف کو غارت نہ کرو۔ یہ بڑا پر لطف موقع ہے تو جناب وہ
ہوش میں آتے ہی کہتی ہے۔ میں کہاں۔ وہ جواب دیتا ہے۔ آپ یہاں۔ وہ کہتی ہے۔ الٰہی یہ بیداری ہے یا خواب۔ وہ کہتا ہے۔ میں موٹر
پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ میں تانگے پر جا رہی تھی۔ وہ کہتا ہے۔ میں موٹر پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ تانگے والا گا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے
یہ بھی اتفاق کہ میں سیٹی بجا رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ پھر تانگہ لڑا۔ وہ کہتا ہے آپ کو بالکل ٹھیک یاد پڑا۔"

بیوی:۔ "تو کیا پوری کہانی سناؤ گے اس وقت۔"

قاضی جی:۔ لیجئے یہ ہوئی بے قدر افزائی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ تم پر میری قابلیت کا سکہ جمنا شروع ہو گیا ہو گا مگر وہ مثل کہ بھینس کے آگے بین بجائی
بھینس نے کہا یعنی بھینس بولی۔ گویا بھینس نے کوئی مہمل سا جواب دے دیا خیر تم سے تو مجھ کو اسی قسم کی توقع تھی مگر ان میاں اجمل سے
پوچھو کہ ایمان داری کے ساتھ کہہ دیں کہ کس قیامت کی روانی ہے۔ اس قدر تالیاں بجیں گی اس مکالمہ پر کہ تم ہی صدقہ اتارو گی مجھ پر سے
کہ خدا مجھ کو نظر بد سے بچائے رکھے

اجمل:۔ یہ تو ٹھیک ہے قاضی جی مجھ کو تو اس کہانی پر کوئی اعتراض ہے نہ میں گانے کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مگر فلم کمپنی ان ہی
دو چیزوں پر تو ختم نہیں ہوتی۔ سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی ایسا کام یا اس سے ملتا جلتا کوئی کام شروع سے کیا ہی نہیں ہے۔"

قاضی:۔ "نہ سہی۔ ارے بھئی نہیں کیا ہے تو نہ سہی۔ اب کریں گے اور دیکھ لینا ایسا کریں گے اس کام کو کہ دنیا منہ دیکھ کر رہ جائے گی اور فرض کر
لو کہ نصیب دشمنان شیطان کے کان بہرے۔ نہ چلی یہ کمپنی تو بھی اپنی گرہ سے کیا گیا۔"

بیوی:۔ "ہاں اور کیا تمہارے لیے تو ایک تماشا ہو گیا اور جو لوگ اس کام کو کر سکتے تھے۔ ایک تو ان کا حق مارا گیا دوسرے تمہارے اس
شوق کے پیچھے اپنے پاکستان کی ایک صنعت یوں غارت ہوئی۔"

قاضی جی:۔ "لیجئے آئیں وہ گھما پھرا کر اپنے پاکستان کو اس ذکر میں بھی۔ کوئی پوچھے ان عقلمند سے کہ بھلا اس میں پاکستان کا ذکر تھا۔ مگر
معلوم نہیں یہ پاکستان ان کی زبان پر کیوں اس قدر رچ گیا ہے۔ یہ بات پاکستان وہ بات پاکستان۔ پاکستان نہ ہوا جناب کا تکیہ کلام
ہو گیا اور اگر پاکستان کو آپ میرے لئے کوئی دھونس سمجھتی ہیں تو کان کھول کر سن لیجئے کہ میں بھی کوئی انگلستان کا رہنے والا نہیں ہوں
پاکستان اگر تمہارا ہے تو میرا بھی ہے۔"

اجمل:۔ پاکستان زندہ باد۔ آج تو شکر ہے کہ پاکستان کو آپ نے بھی اپنا لیا۔ اچھا اب جان کی امان پاؤں، تو ایک بات عرض کروں۔"

قاضی جی:۔ "فرمائیے. فرمائیے آپ کے لئے تو ضروری ہے کہ اپنی بھاوج کی طرفداری کریں اس فرض سے بھلا آپ غافل ہو سکتے ہیں. بہرحال آپ کو جو کچھ فرمانا ہے ارشاد فرمائیے میں سننے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ وہ۔ ہائے جانے کتنا لاجواب شعر تھا اس وقت بالکل یاد نہیں آ رہا ہے"

اجمل:۔ "قاضی جی بھابی کا اور میرا مطلب یہ ہے کہ یہ فلم کمپنی ٹمپنی بس کا روگ نہیں ہے. آپ کو اگر کچھ کرنا ہی ہے تو ایسا کام کیجئے جس کا آپ کو کچھ تجربہ ہو جس کی کامیابی کا آپ کو یقین ہو"

بیوی:۔ اور کیا کرنا ہی چاہئے وہ کام جس سے خود اپنے آپ کو بھی فائدہ پہنچے اور ملک اور قوم کو بھی فائدہ پہنچنے کی امید ہو۔"

قاضی جی:۔ خدا کے لئے کبھی تو مجھ نامراد سے اس طرح باتیں کیا کرو۔ جس سے مجھ کو یقین آئے کہ میری بیوی گفتگو کر رہی ہے میں تو کانپ جاتا ہوں. تمہاری زبان سے ملک اور قوم قوم کے الفاظ سن کر۔ ارے صاحب آپ میری اہلیہ ہیں۔ میری رفیقہ حیات ہیں. میری شریک غم ہیں مگر اس قسم کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا بیوی کے بجائے یا تو آپ اخبار بن گئی ہیں یا کوئی بہت بڑی لیڈر واقع ہوئی ہیں۔ اور پھر یہ کہ بات جو کرنی ہیں وہ نہایت مہمل جس کام کا مجھ کو تجربہ ہے وہ کیا خاک کر سکتا ہوں تحصیلداری کی ہے زندگی بھر آپ بتائیے میں تحصیلداری کیسے کر سکتا ہوں"

بیوی:۔ "اچھا تو سوال یہ ہے کہ تم ڈاکٹری کیوں نہیں کرتے۔"

قاضی جی:۔ "ڈاکٹری (قہقہہ لگا کر) بھئی کیا عقل کی پوٹ ہوتی ملی ہے تم کو بھی۔ یعنی میں ڈاکٹری بھلا کیسے کر سکتا ہوں۔ جس کو یہ تمیز نہ ہو کہ نبض انسان کی گردن میں ہوتی ہے یا بغل میں اس کو جناب ڈاکٹری کا مشورہ دے رہی ہیں۔"

بیوی:۔ "بس ٹھیک ہے اسی طرح تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ فلم کس چڑیا کا نام ہے پھر آخر فلم کمپنی کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔"

قاضی جی:۔ "یہ تو صاحب قائل کرنے کا نہایت ہی بیہودہ طریقہ ہے کہ مثالیں دے کر قائل کیا جائے مگر تم خود ہی دیکھ لو کہ آخر میں نے کہانی لکھی ہے یا نہیں گانے تیار کئے ہیں یا نہیں۔"

بیوی:۔ "خدا کے لئے یہ کہانی یا یہ گانے کسی کو سنانا بھی نہیں لوگ مذاق اڑائیں گے۔"

قاضی جی:۔ "کیا مطلب یعنی اس قدر لغو ہیں اس قدر مہمل ہیں۔ اب تم اپنی حقیقی یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ خاص اپنی بیوی ہو کر ایسی باتیں کہہ رہی ہو تو مجھ کو کسی اور سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ وہی سعدی والی بات ہوئی کہ سعدی اپنے ہاتھ ـــــ نہ ـ نہ ـ وہ تو فارسی میں ہے کہ سعدی از دست خویشتن فریاد۔ خدا نہ کرے کہ کوئی شخص اپنے گھر ہی میں ذلیل سمجھ لیا جائے۔ میرا کیا ہے لعنت بھیجو فلم کمپنی پر۔ آج سے اگر کسی فائدے کی بات کا ذکر بھی کروں تو تھو ہے میری اوقات پر۔"

(غصہ میں چلے جاتے ہیں)

کشکول

محمد علی جوہر

اگر نرم دل، نیک نہاد، خلق مجسم، لارڈ ارون، ہم ہندوستانیوں سے فرماتے کہ تم بڑے ضدی ہو، بڑے مفسد ہو، تم نے ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے تم گشتنی اور گردن زدنی ـــ لیکن کوئی کہاں تک تم سے لڑے جھگڑے، لو یہ تمہارا سوراج اب اٹھو ہمارے سامنے سے پھر اپنا کالا منہ ہمیں نہ دکھانا، تو ہم سے قسم لے لو جو برا مانتے، ہم خوش خوش ان کے در دولت سے چلے جاتے اور پھر کبھی ان کی دہلیز پر قدم نہ دھرتے مگر انہوں نے ایک گالی بھی نہیں دی، کسی کو برا بھلا نہیں کہا، نہایت تہذیب، نہایت متانت، نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا کہ مجھے آپ حضرات کے ساتھ بے حد ہمدردی ہے۔ کاش! میں آپ کی درخواست رد نہ کرتا مگر کیا کروں، سخت مجبور ہوں آپ کے جتنے بھی خیر خواہ ہیں ان میں ایک سے ایک بڑھ کر طبیب حاذق ہے، وہ سب یہی کہتے ہیں کہ آپ کے منہ میں سیاسی حقوق کی کھیل اگر نہ جائے یقیناً فاقہ کشی کی تکلیف آپ کو بے حد محسوس ہوتی ہوگی اور آپ میری اور میرے شرکائے حکومت کی شکم سیری پر ضرور رشک کرتے ہوں گے مگر اطبا کی رائے ہے کہ ہم کو تخمے سے موت آئے لیکن آپ کو یہ مرض مبارک نہ ہونے پائے بلکہ آپ ایک سوکھے ٹکڑے کو ترس ترس کر جاں توڑ دیں۔ امید ہے کہ آپ بالکل اب مطمئن ہو گئے ہوں گے خدا حافظ۔

اس پر کوئی کہے تو کیا کہے! اگر یہی لارڈ ارون کی ابتدائی سادہ لوحی نہیں ہے بلکہ انتہائی ہوشیاری ہے، تو میں بھی ہندوستانیوں سے یہی کہوں گا کہ تمہارا خدا حافظ!

اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی ہے۔ ایک خرابی ہو تو اصلاح کی جائے، جب ہر طرف خرابیاں ہی خرابیاں نظر آ رہی ہوں، تو ہجوم یاس سے متاثر نہ ہونا نہایت مشکل ہے۔ کسی سلطنت میں ایک بار کچھ اس قسم کی بارش ہوئی کہ جس پر ایک بوند بھی پڑ گئی وہ فاتر العقل ہو گیا، کوئی کپڑے پھاڑنے لگا، کوئی لوگوں کو مارنے لگا، کوئی گالیاں بکنے لگا، کوئی ننگا ہو کر ناچنے لگا، غرضیکہ عالم و عامی، شریف، رذیل، اعلیٰ و ادنیٰ کوئی بھی اس دیوانگی سے نہ بچ سکا۔

بادشاہ اور وزیر تخلیہ میں کچھ گفتگو کر رہے تھے۔ ان کو نہ اس عجیب و غریب بارش کی کچھ خبر تھی، نہ ان پر ایک چھینٹ پڑنے پائی تھی جب وہ خلوت سے باہر نکلے تو چوب داروں اور خدمت گاروں کو مست پایا۔ افسروں کو حکم دیا کہ اس گستاخی کی خدام بارگاہ کو سزا دی جائے، وہ الٹے بادشاہ اور وزیر پر ہنسنے لگے۔ کوتوال کو حکم دیا کہ سب کی مشکیں کس لے، تو اس نے خود بادشاہ کو گرفتار کرنا چاہا۔ اعلیٰ حضرت پریشان ہو کر حرم سرا میں تشریف لے گئے کہ کچھ دیر وہیں دل بہلائیں مگر وہاں ملکہ اور شہزادی، خواجہ سرا اور باندیاں جس رنگ میں نظر آئیں اس کا

ذکر کرتے بقول بعض ادویہ کا اشتہار دینے والوں کے تہذیب مانع ہے۔"

بادشاہ لٹے پاؤں زنانہ سے مردانے میں آئے اور وزیر باتدبیر سے پوچھا کہ اس کا کیا علاج کیا جائے؟ اس نے کچھ دیر تامل کیا، پھر کہا — جہاں پناہ! مجھے بارش کا پانی پینے کا بہت شوق ہے، ہمارے گھر کے پرنالے کے نیچے دو گھڑے بھرے رکھے ہیں، ایک حضور سر پر ڈال لیں، ایک میں ڈال لوں۔ پھر ہم بھی ان ہی سب کی طرح ہو جائیں گے۔ پھر ہمیں کوئی بھی دیوانہ نظر نہ آئے گا۔ ایک حمام میں سب ہی ننگے۔

بعض وقت یہی جی میں آتا ہے کہ چھوڑ دو سارے دھندے۔ قصر حکومت کی دہلیز پر جبہ سائی کر ڈالو گورنری نہ سہی تو ایگزیکیٹو کونسلری ہی سہی اور وہ بھی نہیں تو ایک منسٹر ہی سے مرد۔

ہندو مسلم اتحاد کیسا؟ تم بھی بے بھاگن کے ہوئی کھیلو، گالیاں یوں ہی کھاتے رہو، خود بھی دینے لگو، کیسی کانگریس اور کس کا سوراج کیسا چرخہ اور کہاں کا کھدر؟ سب پر لعنت بھیجو۔

(۳۰ جنوری ۱۹۲۶ء)

آج مسز بسنٹ دولت مشترکہ ہند کے قانون کا مسودہ لے کر ولایت گئی ہیں۔ جس کا حشر معلوم ہے کہ کیا ہو گا؟ اسے ایسے شخص کے سپرد کیا جائے گا جو پارلیمنٹ کے مسودات کی غلطیاں درست کرتا ہے، اس کی مثال تو بعینہٖ اس شخص کی سی ہے جو راستہ میں کسی چیز کو ڈھونڈھ رہا تھا، لوگوں نے پوچھا کیا تلاش کرتے ہو؟ کہا کہ بھائی ایک نعل مل گیا ہے تین اور اس طرح مل جائیں تو گھوڑا خرید لوں۔

گویا مسودہ قانون میں صرف و نحو کی غلطیاں نہ رہیں گی تو مسودہ ضرور فوراً پاس ہو جائے گا۔

(۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

لکھنؤ کے اشتہار میں شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کا نام بھی درج ہے اللہ اللہ اس پھلواری میں مدت کے بعد پھول آئے ہیں۔

(۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

نہ معلوم کس منحوس گھڑی میں اس صوبہ کا نام صوبہ جات متحدہ رکھا گیا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، اس سے زیادہ صوبہ جات غیر متحدہ کے نام کا کوئی صوبہ جات پنجاب کے سوا مستحق نہ ہو گا۔

(یکم دسمبر ۱۹۲۶ء)

یورپ پر مسلمانوں کی قوت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے اور عام خیال ہے کہ ہر مسلمان کا گھر سو دو سو ہمدیوں اور باندیوں کی حرم سرا ہے اس لئے یورپ کی شوقین لڑکیاں جن کی طبیعت بوس و کنار کو سنیما میں دیکھتے دیکھتے بھر گئی ہے، اس لئے نئی دنیا کے حسن و عشق کی کولمبس بننا چاہتی ہے جس کا نام مشرق ہے اور اس نئے راستہ کی واسکو ڈاگاما ہونے کی خواہش مند ہیں جو "راس امید" سے ہو کر ایک مسافر کو مشرق تک پہنچاتا ہے۔

(۲۲ اکتوبر ۱۹۲۶ء)

لوگوں کو وہ اخبارات پسند ہیں جن کا اصول صحافت یہ ہے کہ ایک پیسہ لوں گا، ایک گالی دوں گا یا جن کی آمدنی کا ذریعہ ان کے

گندے اشتہارات ہیں جن کے پڑھنے ہی سے نہیں بلکہ چھاپنے سے بھی بہتوں کا بھلا ہوتا رہتا ہے

مولانا شوکت علی راقم الحروف کے بڑے بھائی ہیں لیکن اگر بعض ظریف دوستوں کے اس خیال کو مان لیا جائے تو راقم الحروف ان چند ہستیوں میں سے ہے جو پوپ (ایک انگریزی شاعر) کے قول کے مطابق "ترکوں کی طرح کسی بھائی کو تخت کے نزدیک نہیں آنے دیتیں۔"

راقم الحروف اپنے بڑے بھائی مولینا شوکت علی کو کتنا ہی چھوٹا بنانا چاہے مگر ان کی ہستی اس قدر بڑی ہے کہ کسی طرح وہ ایک معمولی انسان کے درجہ پر نہیں آسکتے اور یہ خیال جس قدر ان کے جسم کے متعلق صحیح ہے اس سے کچھ زیادہ ان کی روح کے متعلق درست ہے۔

ایک ایسا شخص جو چار من بچے کی لاش کو روزانہ چھ چھ مرتبہ دفتر خلافت کے سہ منزلہ بالاخانہ پر کھینچ کرلے جایا کرے اور روزانہ صدہا دکانوں کا چکر لگایا کرے اور دو دو آنہ (۲؎) دکان سے لے جاکر دو یا تین روپیہ (فی دکان) تحصیلا کرے ، یقیناً ایک متحرک پہاڑ ہے اور یہ ان کی قوت ہے جو اس پہاڑ کو متحرک کرتی ہے جس وقت سب مایوس ہو جاتے ہیں اس وقت تنہا وہی ایک ہستی ہے جو ہم سب کی مردہ امیدوں میں از سر نو جان ڈالا کرتی ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ ہم سب نے خلافت کے لئے کام کیا ہے لیکن اگر ہر معاملہ کی تہ میں سچائی تلاش کی جائے تو جس طرح فرانس کے خود مختار بادشاہ لوئی چہار دہم نے اپنے قانونی مجسٹریٹ سے جو "قوانین سلطنت" کا بار بار ذکر کرتا تھا کہہ دیا کہ سلطنت ! وہ تو میری ذات ہے اس طرح شوکت بھی کہہ سکتے ہیں کہ "یہ کام تن تنہا میں نے کیا ہے کیونکہ تنظیم خلافت کی ابتدا بھی وہی تھے اور انتہا بھی وہی ہیں۔

فی الحقیقت انہی نے اس تحریک کو شروع کیا اور آج بھی جب کہ سیٹھ چھوٹانی کی بددیانتی اور شدھی و سنگھٹن کا مسلمانوں پر اثر دیکھ کر پس پردہ کام کرنے والے ہاتھ سے بے خبر لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ تحریک خلافت کا خاتمہ قریب آ لگا ہے شوکت نے تن تنہا گاڈرمین کی طرح اس تمام وزن کو اپنے مضبوط اور خم نہ کھانے والے بازوؤں پر سنبھال رکھا ہے وہ خواہ اور کچھ ہوں یا نہ ہوں مگر ایک مضبوط اور ضدی فقیر ضرور ہیں اور ہنس ہنس کر اور ہنسا ہنسا کر لوگوں کو لوٹنے کا راز کچھ انہیں کو معلوم ہے ۔

(۲۴ اگست ۱۹۲۵ء)

آج باجہ کے متعلق باجے سے بھی بلند آواز ان مسلمانوں کی ہوتی ہے جو مشکل سے کبھی نماز پڑھنے مسجد میں جاتے ہوں گے اور گئورکشا کے لئے بعض اوقات وہی آج سب سے زیادہ جوش کا اظہار کرتے ہیں جو کل تک ہمارے ساتھ ولایت میں خوب بیف (گائے کا گوشت) اُڑایا کرتے تھے۔

(۲ دسمبر ۱۹۲۵ء)

فکاہات

ظفر علی خاں

اہل آئرلینڈ اپنی ظرافت و بذلہ سنجی کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہیں اور یہ ملکہ ان میں خداداد ہے۔ لکھے پڑھے تو ایک طرف رہے وہاں کے جٹ گنوار بھی بے ساختہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سن سن کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ دلکش مذاق وہی ہے جس میں چشمۂ حیوانی کا سا قدرتی ابال موجود ہو جس کا رنگ قندیل کی طرح خود بخود جھلکے۔ بناوٹ آئی اور اس کی سب لطافت جاتی رہی۔

پچھلے دنوں آئرلینڈ کی ایک میونسپل کمیٹی نے حسب ذیل رزولیوشن پاس کیا تھا جس کا لطف لائق شنید و قابل داد ہے:-

> حکم ہوا کہ ایک نیا جیل خانہ طیار کیا جائے اور اس کے لئے تمام مسالہ پرانے جیل خانہ کے ملبے سے حاصل کیا جائے لیکن جب تک اس نئے محبس کی عمارت طیار نہ ہولے پرانے محبس کی عمارت بدستور قیدیوں کی سکونت کے لئے کام میں لائی جاتی رہے:

یہ تو میونسپل کمیٹی کے روشن خیال اراکین کا لطیفہ تھا۔ اب ایک گنوار کی پھبتی کی بانگی ملاحظہ ہو جو اس نے ایک قہوہ خانہ میں حاضرین کی پسلیاں دوہری کرنے کے لئے چھوڑی تھی۔

قہوہ خانہ میں چند امریکی گویے بیٹھے ہوئے تھے، دور شراب چل رہا تھا۔ ایک گویے نے جو لاف زنی کے فن میں یکتائے روزگار تھا، باتوں باتوں میں اپنے محبان بادہ پیما سے کہا کہ پہلی دفعہ جب میں نے سٹیج پر کھڑے ہو کر اپنی رسیلی تانیں اڑانی شروع کیں تو حاضرین پر وجد کا ایک عالم طاری ہو گیا اور انہوں نے مجھ پر اتنے گلدستے پھینکے اور اس قدر پھول برسائے کہ میں اس خرمن گل میں دب گیا۔ اور اگلے دن اگر میں چاہتا تو گل فروشی کا ایک کارخانہ انہیں پھولوں کے ڈھیر سے کھول دیتا۔

ایک آئرش گنوار سے جو اس میز پر بیٹھا ہوا حیرت کا دھواں اڑا رہا تھا امریکن گویے کی یہ فخاری نہ سنی گئی اور وہ بے تحاشا بول اٹھا کہ اس کمال میں تو میں تم سے کہیں بڑھا ہوا ہوں۔ پہلی مرتبہ جب میں نے کھلے میدان میں مجلس کو گانا سنایا تو اس کے صلے میں انہوں نے ایک دو منزلہ مکان دے دیا۔

امریکن:- سٹری تو نہیں ہو گئے ہو دو منزلہ مکان دے دیا اور گانے کے صلے میں کیا لغو بات ہے؟

گنوار:- اس میں لغویات کی کیا بات ہے میں نے گانا بھی گایا اور اس کے صلے میں مکان بھی پایا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مکان

مجھے ایک ایک اینٹ کی ان گنت قسطوں میں ملا ہو۔

صفائی کی طرف سے ایک وکیل صاحب فریق ثانی کے گواہ پر جرح کر رہے تھے۔ ان میں اور گواہ میں جو نوک جھوک ہوئی اسے ہم سپرد قلم کئے بغیر نہیں رہ سکتے

وکیل:۔ آپ کا بیان ہے کہ دیوار آٹھ فٹ بلند ہے اور آپ زمین پر کھڑے تھے کوئی سیڑھی بھی نہ تھی جس پر آپ چڑھے ہوں

گواہ:۔ جی ہاں۔ میں اب تک اس بیان پر قائم ہوں

وکیل:۔ (اس انداز سے کہ بس پالا انہوں نے جیت ہی لیا) تو پھر براہ کرم یہ ارشاد فرمایئے کہ جب آپ کا قد پانچ فٹ سے کچھ ہی نکلا ہوا ہے تو آپ آٹھ فٹ بلند دیوار پر سے کس طرح ملزم کے حرکات و سکنات کو ملاحظہ فرما رہے تھے

گواہ:۔ (نہایت دلجمعی سے): جناب اس دیوار میں ایک روزن بھی ہے

حضرت میاں میرؒ کا فیض باطن ہندوستان سے نکل کر ترکستان تک کو اپنا حلقہ بگوش ارادت بنا چکا ہے۔ بدخشاں کے رئیس العلماء و صدر الافاضل ملا شاہ بدخشی تک حلقہ ارادت میں داخل ہو چکے ہیں جن کی طہارت و تقویٰ انہیں حضرت میاں میر کی خلافت سرفراز کراتا ہے۔

لاہور میں وہ صاحب سجادہ ہیں۔ ولی عہد سلطنت شاہزادہ داراشکوہ کو ان سے خاص ارادت ہے جو خود بھی صوفیانہ مزاج رکھتا ہے۔ مگر ملا بدخشی کو اس کی حرکتیں پسند نہیں۔

حضرت کی زیارت کے لئے وہ ایک بار اکبر آباد سے لاہور آتا ہے اور آستانہ خانقاہ پر جبین ارادت گھستا ہے چلتے وقت اپنے لے روحانی ہدایات کی درخواست کرتا ہے۔ جس پر ملا شاہ بدخشی فرماتے ہیں ؎

اے بندہ بپائے و قفل بر دل ہشدار — دے دوختہ چشم و پلے در گل ہشدار
عزم سفر مشرق و رو در مغرب — اے راہ رو بہشت بہ منزل ہشدار

طوبیٰ

دانۂ بارود میری نکتہ چینی ہو گئی — لو مری تحریر ہنری مارٹینی ہو گئی
لوگ کہتے ہیں کہ کالج ہو گیا ریڈیو نوا — بات جو ظنی تھی پہلے اب یقینی ہو گئی
جوتیوں میں دال بٹتی تھی مسلمانوں کے ہاں — میز کل تک دنیوی تھی آج دینی ہو گئی

مبتدا کا ہو گیا قُل پڑتے ہی طبلہ پہ تھاپ
اور خبر "موری گھبریا" کی "نہ لینی" رہ گئی

حیرت کدۂ لاہور

پرنسپل ہنری مارٹن کے محیر العقول کارنامے

انجمن حمایت اسلام کا پُراسرار سکوت

دلم بہ پاکیِ دامانِ غنچہ می لرزد　　کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغباں خاموش

ظہوری کی روح کو مژدہ ہو کہ لاہور بیجا پور ہو گیا اور دنیا جہان کے بربط اور چنگ اور رباب اور ارغنون ابراہیم عادل شاہ کے پردۂ سوز و سرور سے منتقل ہو کر اسلامی کالج لاہور میں جمع ہو گئے۔

مطرب خوش نوا بگو تازہ بہ تازہ نو بہ نو

سنتے ہیں کہ غنائیت نفاق ہے کم از کم اسلامی روایات تو ہمیں یہی بتاتی ہیں کہ رات دن کا تجربہ اگر موسیقی کے نفاق اندوز ہونے پر شاہد نہ ہو تو کم از کم اس بات کا تو گواہ ہے کہ جہاں یا جابجا سریلے نغموں کی زیر و بم سے دل و دماغ میں ارتعاش پیدا ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ مطرب کی صدائے سامعہ نواز صاعقہ ریز محفل ہوئی تو بہیمیت کدۂ دل کے چھوٹے بڑے تمام جذبات رقص والہانہ ہو گئے۔ باور نہ آئے تو ایک دن گیٹی تھیٹر میں جا دیکھئے۔ رات بھر جناب معلم الملکوت ہمرکاب نہ رہیں تو سہی۔

لیکن کہاں کا اسلام اور کیسی انسانیت۔ سنت بالائے طاق۔ کتاب حوالۂ جزدان۔ تجربہ و مشاہدہ باد ہوا۔ یہاں تو اصرار ہے کہ مسلمانوں کے اس دار العلم میں نصاب تعلیم جہاں فزکس اور کیمسٹری، تاریخ اور ریاضی، ادب اور انشا سے مزین ہو وہاں اس کا طغرائے منشور قوالی و طبلہ نوازی بھی ہو کر عمر خیام اور محقق دوانی کے ساتھ باربد ترانہ انداز ریز کا ہونا بھی مثلث ارتقائے مارٹنی کا زاویہ الراس ہے۔

جناب مارٹن صاحب کے ایک حاشیہ نشیں پیرزادہ صاحب ایم اے اتفاقات زمانہ سے تین ہفتہ اور محض تین ہفتہ کے لئے ریواز ہوسٹل کے ہنگامی منتظم مقرر کر دیے جاتے ہیں۔ دنیائے تادب و تخلق میں جو عظیم الشان کارنامے جناب پیرزادہ صاحب کی قوت ندیسے اس عرصہ مدت میں سرمایہ اندوز بطون و ظہور ہوئے ہوں گے ان کی تفصیل سے تو ہم آشنا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ کالج کے مدارج ابتدائیہ کے چند طلبہ نے ان کارناموں کی یادگار میں آپ کو ایک سپاسنامہ پیش کرنا چاہا اور از بس کہ سپاسنامہ کی تہنیت اس ملمع ستارے والے کفش زریں کی مترنمانہ مشاعت کے بغیر کامل و مکمل نہ ہو سکتی تھی جس نے حکومت عالیہ کے جبین نیاز پر تیوریاں چڑھا دی تھیں بیدھی تیوریاں تھیں جنہیں پیرزادہ صاحب کے زمانۂ اڈیٹری میں رسالہ "ظریف" کے ایک پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مضمون نے پیدا کیا تھا اس ضرور ہوا کہ ایک مجلس عیش و طرب بھی برپا کی جائے جس میں قوالوں سے خلاف اخلاق گانے گوائے جائیں طبلہ بجوایا جائے اور وہ سماچوکڑی مچوائی جائے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

ہم کو معلوم ہوا ہے کہ کالج کے کسی عہدہ دار کو کالج کی طرف سے انجمن حمایت اسلام کے شعبہ تعلیم کی مجلس منتظمہ کے استمزاج صواب کے بغیر کسی قسم کا کوئی ایڈریس نہیں دیا جا سکتا اور اس بارہ میں مجلس موقفہ کا ایک باقاعدہ رزولیوشن کتاب الاحکام میں محفوظ۔ یہ تو خیال نہیں ہو سکتا کہ مسٹر مارٹن اپنے مددگار خاص جناب پیرزادہ صاحب بہادر کے بست و سہ روزہ کا زمانہ منتظمی ریواز ہوسٹل کی بے نظیر و فقید المثیل عرق ریزیوں پر اس درجہ لٹو ہو گئے تھے کہ کالج کے آئین و ضوابط کے انقیاد کی حس بھی اس شیفتگی کے سحر کو باطل

نہ کر سکی۔ کالج کمیٹی کے احکام منسوخ ہوتے ہوں تو ہوا کریں۔ کمیٹی کا ضابطہ ٹوٹتا ہے تو ٹوٹا کرے لیکن پیرزادہ عبدالرشید کو تین ہفتہ کی عریض و بسیط خدمات جلیلہ کا صلہ ایک قیامت تھی جو آئے بغیر ٹل ہی نہ ہو سکتی تھی۔

سپاسنامے کی ترتیب و گذارش اور بزم عیش کی تمہید و آرائش رو بظاہر جداگانہ لیکن بہ باطن جزو لائی الفک لازم حقیقتیں ہیں جن کی تفصیل کسی قدر شرح و بسط کی متقاضی ہے۔

ملح لندن

۴ ستمبر ۱۹۱۷ء

ایک پادری صاحب لڑکیوں کے ایک مدرسے میں انجیل کا امتحان لینے کے لئے تشریف لائے۔ ایک لڑکی نے جس کا سن بارہ تیرہ سال ہوگا۔ سب سے اچھا جواب دیا۔ پادری صاحب نے خوش ہو کر جیب سے ایک چمکتا ہوا پنس نکالا اور انعام کے طور پر لڑکی کے حوالے کیا۔ اتنے میں ایک خوانچے والا "اسابری کی قفلی! اسابری کی قفلی" پکارتا ہوا سڑک پر سے گذرا۔ لڑکی دوڑی ہوئی گئی اور اپنے پنس کی قفلی لے کر چٹخی بجاتے میں چکھ گئی۔ پادری صاحب اپنی روحانی کمائی کا یہ دنیوی حشر دیکھ کر بے حد ملول ہوئے۔ اور غم زدہ لہجے میں لڑکی سے فرمانے لگے کہ بیٹا! تبلیغ دین عیسوی کے متعلق میں نے تم سے بہت سوال پوچھے اور تم نے ان سب کا برجستہ و برمحل جواب دیا۔ اسی لئے میں نے تمہیں ایک پنس انعام دیا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ تم یہ رقم تبلیغ فنڈ میں داخل کر کے اپنی سعادت مندی کا ثبوت دو گی، لیکن افسوس تم نے اسے چکھوتیوں میں اڑا دیا۔ لڑکی کس بھولے پن سے جواب دیتی ہے کہ قبلہ! نیت تو میری بھی یہی تھی کہ حضور کا مرحمت کیا ہوا انعام تبلیغ فنڈ ہی میں داخل کر دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس رقم کی قفلی خرید لوں اور خوانچہ والا یہ رقم فنڈ میں داخل کر دے۔ بات ایک ہی ہے۔

ایک لاٹ پادری صاحب ایک مرتبہ گرجا کے منبر پر کھڑے ہوئے تقریر فرما رہے تھے۔ ارادت کیشوں کا ایک جم غفیر ذوق شوق سے وعظ سن رہا تھا۔ وعظ کا موضوع یہ تھا کہ خداوند خدا ہمارے آسمانی باپ نے ہر انسان کو کوئی نہ کوئی انعام اپنے خزانۂ غیب سے ایسا ضرور عطا کیا ہے جس پر اسے گھٹنے ٹیک کر شکر ادا کرنا چاہئیے۔ اس پر کلیسائیوں میں سے ایک نوجوان سر مجلس بے ساختہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔ جناب واعظ کو اس قہقہے نے اپنی طرف متوجہ کیا اور آپ نے فرمایا کہ تم پر ضرور آج کوئی برکت آسمان سے ایسی نازل ہوئی ہے، جو تمہیں یوں وجد میں لے آئی۔ اب تو تمہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا حرف حرف صحیح ہے۔

نوجوان نے نہایت سادگی اور متانت سے جواب دیا "جی ہاں مجھ پر آج گجر دم خداوند خدا کی ایک چہچہاتی ہوئی برکت نازل ہوئی علی الصبح جب میں حاضری کھانے کے لئے بالا خانے سے نیچے اترا تو میرے پیچھے پیچھے میری خوش دامن صاحبہ بھی نزول اجلال فرمانے لگیں سیڑھی پر نارنگی کا ایک چھلکا پڑا ہوا تھا۔ اس سے پاؤں جو رپٹا تو اڑا اڑا دھم گریں اور سر نیچے پاؤں اوپر قلابازیاں کھاتی ہوئی سیڑھی کے نچلے قدم پر آ رہیں۔ خداوند خدا کا شکر ہے کہ ان کی ایک ٹانگ شریف بھی ٹوٹ گئی اور اس وقت وہ شفاخانے میں پڑی ہوئی مزے سے علاج کرا رہی ہیں۔

افکار و حوادث

عبدالمجید سالک

یورپ سے آئے دن اس قسم کی خبریں موصول ہوتی رہتی ہیں کہ وہاں حد سے زیادہ طویل القامت انسانوں کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے یا پست قامت بونوں نے اپنی جماعت کو منظم کرنے کی کوشش کی ہے اور ان انجمنوں میں عام لوگوں سے لے کر بڑے بڑے معززین تک شامل ہیں۔ ہندوستان میں ابھی انجمن سازی اس نوبت تک نہیں پہنچی لیکن کچھ مدت گزری میرٹھ میں ایک کانے صاحب نے ایک جدت فرمائی تھی۔ وہ سن لیجیے

ان یک چشم گل صاحب کو جو دل لگی سوجھی آپ نے چپ چاپ گھر میں بیٹھ کر شہر کے تمام کانوں کی ایک فہرست تیار کی۔ دیکھا تو ان میں بڑے بڑے معزز آدمی اور سرکاری افسر بھی شامل تھے۔ آپ نے ان سب لوگوں کے نام دعوت نامے جاری کر دیے اور اپنے مکان میں کھانے پر مدعو کرلیا یہاں تک کہ ہاتھ دھلانے اور کھانا کھلانے پر جو آدمی مقرر کیے وہ بھی سب کے سب کانے تھے۔

وقت مقررہ پر کانوں کی بھرمار شروع ہوئی جب تک صرف ایک دو تھے کسی کو چنداں خیال نہ آیا لیکن جب چالیس پچاس کانے جمع ہو گئے تو ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بلکہ آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ بعض کو اس ستم ظریفی پر غصہ بھی آیا لیکن وہ یہ سمجھ کر پی گئے کہ چلو اس مجمع میں کوئی ایسا شخص تو نہیں جو انہیں محض یک چشمی کی وجہ سے بچشم حقارت دیکھے۔

جب تمام ہم چشم جمع ہو چکے تو کانا بہشتی کانے میزبان کے حکم سے کانے مہمانوں کے ہاتھ دھلانے لگا۔ کانا تو تھا ہی کہیں پانی کی دھار ایک معزز مہمان کے ہاتھوں کے بجائے اس کے کپڑوں پر جا پڑی۔ اس نے تاؤ کھا کر بہشتی سے کہا۔ ہوش میں آؤ۔ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟" بہشتی نے برجستہ جواب دیا کہ "ہاں صاحب دونوں پھوٹ گئی ہیں۔ لیکن ایک میری تھی اور ایک آپ کی۔"

وہ معزز یک چشم صاحب اس گستاخی کی تاب نہ لا سکے اور اٹھ کر بہشتی کے ایک جڑ دی۔ اس وقت بڑے چھوٹے کا کوئی سوال نہ تھا سب کانے پوری مساوات کے ساتھ اس دعوت میں شریک ہوئے تھے۔ بہشتی نے بھی ترکی بہ ترکی ہاتھ سے جواب دیا۔ تپاڈگی شروع ہو گئی۔ آخر کانوں نے بیچ بچاؤ کر دیا اور کھانا کھانے لگے۔ ایک دوسرے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ کانے کی نگاہ یوں بھی دزدیدہ ہی ہوتی ہے۔ شاعر نے شاید کسی کانے ممدوح ہی کی شان میں یہ مصرع کہا ہے کہ ؏

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

کرنا خدا کا کیا ہوا کہیں شہر کے لوگوں نے اس عجیب و غریب دعوت کے متعلق سن گن پالی۔ انہوں نے کیا کیا گیس کے تین چار بڑے بڑے ہنڈے روشن کر کے باہر گلی میں رکھ دیے اور صدہا لوگ کانوں کی رخصت کا نظارہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ جب یہ لوگ

کھانا کھا کر اور اپنے ہم چشم میزبان کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے تو ایک ہجوم استقبال کے لئے موجود تھا۔ بعض بدتمیزوں نے آوازے بھی کسے لیکن واحد العینوں کی یہ جماعت ایک ایک آنکھ چرا کر گذر گئی اور گھروں میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔

بلجین کانگو سے ایک خبر موصول ہوئی ہے کہ وہاں کے مردم خور وحشی ایک ڈپٹی کمشنر کو پکا کر کھا گئے۔ خدا جانے ان مردم خوروں کی حسِ ذائقہ کو کیا ہو گیا۔ جب کچا ڈپٹی کمشنر اس قدر کڑوا اور بدذائقہ ہوتا ہے تو پکا ہوا بھی یقیناً خوش مزا نہ ہو گا یا شاید کریلوں کی ترکیب کی طرح ان مردم خوروں کو ڈپٹی کمشنر پکانے کا بھی خاص نسخہ معلوم ہو۔

کانگو کی بی ہمسائیاں اس دن آپس میں باتیں کر رہی ہوں گی۔ "کیوں بی پڑوسن آج تمہارے ہاں کیا پکا ہے؟"

"بہن آج تو ایک ڈپٹی کمشنر پکایا تھا۔ کہو تو تھوڑا سا کٹورے میں ڈال کر بھیج دوں؟"

"ہاں بہن! ذرا سا بھیج دو۔ چکھ کے تو دیکھوں تم نے کیسا پکایا۔ میں نے تو پچھلے ہفتے ایک پادری پکایا تھا۔ صبح سے شام تک ہنڈیا تیز آنچ پر رہی، کم بخت بوٹیاں تھیں کہ چیمڑ۔"

وہ کہتی ہوں گی۔ "واہ بہن۔ وہ پادری کوئی بڈھا پھونس ہو گا نہ گلے نہ سڑے۔ ننھے کے ابا خود جنگل جا کر ایک جوان جہان ڈپٹی کمشنر پکڑ کر لائے تھے۔ ایسا نرم کہ ہنڈیا میں ڈالتے ہی گل گیا اور "وہ" اور بچے کھا کر ایسے خوش ہوئے کہ انگلیاں ہی چاٹتے رہ گئے۔ بہن ایسی چیزیں کہیں روز روز پکتی ہیں۔ کب بلجیم سے نیا ڈپٹی کمشنر آئے اور کب پکے"

لیکن ڈپٹی کمشنر کے ہم قوم دوسرے ہی دن جمع ہو کر ان وحشی مردم خوروں پر ٹوٹ پڑے اور ان کا صفایا کر دیا۔ افسوس نہ تو ان لوگوں کو آدم خوری سے ذوق تھا اور نہ غالباً آدم خوروں کا گوشت ہی اچھا ہوتا ہے ورنہ بڑے مزے کی ضیافت رہتی اور یہ گوشت ڈبوں میں بند ہو ہو کر ولایت تک بھیجا جاتا۔

واقعہ نہایت ہولناک ہے لیکن یہ ڈپٹی کمشنر کو پکا کر کھانا بہت دلچسپ رہا۔ آئندہ ڈپٹی کمشنروں کو کسی قدر احتیاط سے رہنا چاہیئے اگر کہیں لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کا گوشت مزے دار ہوتا ہے تو چند روز میں نسل ہی منقطع ہو جائے گی۔

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کوئی حکیم صاحب تھے جنھوں نے پردہ نشین عورتوں کی نبض دیکھنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ رسّی کے ایک سرے سے پردہ نشین خاتون کی کلائی کو باندھ دیا جاتا اور دوسرا سرا پردے کے باہر حکیم صاحب تک پہنچا دیا جاتا۔ حکیم صاحب نبّاضی میں اس قدر ذکی الحس واقع ہوئے تھے کہ رسّی پر اپنی انگلیاں رکھ کر نبض کی کیفیت معلوم کر لیتے تھے اور تشخیص مکمل کر کے نسخہ لکھ دیتے تھے۔

ایک دن یار لوگوں کو دل لگی سوجھی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے حکیم صاحب کو بلا کر لے گئے۔ گھر کے اندر رسّی کے ایک سرے سے ایک بلّی کی ٹانگ کو باندھ دیا اور دوسرا سرا حکیم صاحب کے ہاتھ میں تھما کر عرض کی کہ حضور مریضہ کی نبض دیکھ لیجیے۔

حکیم صاحب نے رسّی پر انگلیاں رکھیں اور فرمانے لگے کہ مریضہ کچا گوشت کھا گئی ہے اور وہ ابھی ہضم نہیں ہوا۔ یار لوگ بے اختیار ہنس دیے اور حکیم صاحب کے کمال نبّاضی کے قائل ہو گئے

اب دہلی کا ایک واقعہ سُنیے۔ ایک سرکاری دفتر کا چپراسی اپنے کسی مرض کے علاج کے لئے دفتر سے چھٹی لے کر دہلی کے ہسپتال میں داخل ہو گیا وہاں ڈاکٹر صاحب نے اس کا قارورہ معائنے کے لئے طلب کیا۔ ایک بھنگن نے پیالے میں اس کا قارورہ لیا اور جب وہ پیالہ اُٹھائے ڈاکٹر صاحب کی طرف جا رہی تھی راستے میں ٹھوکر لگنے سے پیالہ گر کر ٹوٹ گیا۔ بھنگن باز پرس کے خوف سے کانپ اٹھی اس نے غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے کیا کیا' ایک اور پیالہ کہیں سے لے کر اس میں خود پیشاب کیا اور یہ قارورہ ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھ آئی ڈاکٹر صاحب نے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر اس قارورے کا معائنہ کیا اور نتیجے کے کاغذ پر لکھ دیا کہ مریضہ حاملہ ہے۔ اس کو ہسپتال سے چھٹی دے دی جائے۔ وہ پرچہ وارڈ میں پہنچا۔ انچارج نے "چھٹی دے دی جائے" کا حکم دیکھ کر جھٹ چپراسی کو ڈسچارج سرٹیفکیٹ دے دیا۔

جب چپراسی یہ سند حمل لے کر اپنے دفتر میں پہنچا تو بعض کلرکوں نے اس سے پوچھا کہ تم اتنی جلدی کیونکر آ گئے' تو چپراسی نے وہ پروانہ دکھایا۔ اس پر دفتر میں وہ قہقہے لگائے گئے کہ خدا کی پناہ۔ چپراسی بیچارہ پریشان کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ آخر بعض کلرکوں نے پوری تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ وہ قارورہ بھنگن کا تھا اور بھنگن حاملہ تھی۔

ایک اعرابی سے کسی نے پوچھا۔ "تم کھاتے کیا ہو؟"

جواب دیا۔ "اونٹ!"

پوچھا "پیتے کیا ہو؟"

کہا "اونٹ!"

"اوڑھتے کیا ہو؟"

"اونٹ"!

"مکان کاہے کا بناتے ہو؟"

"اونٹ کا!"

"جلاتے کیا ہو؟"

"اونٹ!"

"سواری کیا ہے؟"

"اونٹ"!

سوال کرنے والا پریشان ہو کر کہنے لگا "یہ اونٹ اونٹ کی رٹ سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

اعرابی نے جواب دیا "اونٹ کا گوشت کھاتا ہوں' اونٹنی کا دودھ پیتا ہوں' اونٹ کے بالوں کے کپڑے پہنتا ہوں' انہی کو ھتا ہوں اور بچھاتا ہوں۔ اونٹ کی کھال کا خیمہ بنا کر اس میں رہتا ہوں' اونٹ کی مینگنیاں جلاتا ہوں اونٹ پر چڑھتا ہوں' اونٹ بیچتا ہوں' اونٹ ہی خریدتا ہوں' اونٹ ہی میری دنیا اور میری زندگی ہے۔

ایک فوجی نامہ نگاروں کا بیان ہے کہ میں نے آسام میں ہر طرف بانس ہی بانس کا دور دورہ دیکھا۔ سب سے پہلے میری نظر بانس کے ایک دروازے پر پڑی۔ دروازے میں سے اندر داخل ہوا تو بانس کا بنا ہوا ایک احاطہ تھا جس میں بانس ہی کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں جھونپڑیوں میں گیا تو بانس کی میزیں اور بانس کی چارپائیاں پڑی تھیں جن پر بانس کی نرم چھال کے بنے ہوئے گدے بچھے تھے۔

صرف یہی نہیں بلکہ باورچی خانے میں مرغی کے چوزے بھی بانس ہی کی ٹوکریوں میں بند تھے اور موٹے اور کھوکھلے بانس کا ایک گلاس نما برتن پڑا تھا جس میں گھی ڈال رکھا تھا اور اس کا ڈھکنا بھی بانس ہی کے ٹکڑے کا بنا ہوا تھا۔ آگے چل کر میں نے پانی کے نل دیکھے وہ بھی بانسوں کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ بانس کی کشتیاں، بانس کے چھوٹے چھوٹے سنہری پل۔ غرض جس طرف دیکھا۔ بانس ہی بانس نظر آئے۔

یعنی بانس رہنے سہنے، بیٹھنے اٹھنے، بچھانے، جلانے، باندھنے اور دریا کو پار کرنے میں خوب کام دیتا ہے۔

اس فوجی نامہ نگار کو یہ معلوم نہیں کہ بانس کھانے کے کام بھی آتا ہے۔ مثلاً بانس کا سالن، بانس کا اچار۔ جو بانس صرف چند گھنٹے کا اُگا ہوا اور نرم ہو اس کو تراش کر پانی میں ابال لیتے ہیں۔ پھر اس کے قتلے کاٹ کر اور نمک مرچ مسالہ ڈال کر سالن پکا لیتے ہیں اور بانس کا اچار تو مدیر افکار نے بھی بارہا کھایا ہے اچھا خاصا لذیذ ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے آئندہ سکولوں میں امتحانوں میں لڑکوں سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ اونٹ اور بانس میں کیا فرق ہے؟

بعض شہروں میں لیڈروں کے جلوس اونٹ پر نکالے جاتے ہیں اور بعض اخبار نویس بھی لیڈروں کو خوب بانس پر چڑھاتے ہیں لہذا اونٹ اور بانس کا تعلق ہماری ملکی سیاسیات کے ساتھ بھی بہت گہرا ہے۔ اگرچہ جو شخص پہلے ہی اونٹ پر سوار ہو اسے بانس پر چڑھانا بیکار ہے لیکن بہر حال لیڈروں کے شتر غمزے برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔

مثلاً ہمارے ایک اخبار نویس بھائی آج سے کئی سال پیشتر ہوشیار پور گئے تو وہاں کے لوگوں نے گاڑی یا موٹر کی بجائے انہیں اونٹ پر سوار کر کے ان کا جلوس نکالا۔ اس جلوس کے آگے آگے ایک نوجوان رضاکار نہایت لمبا سا بانس اُٹھائے جا رہا تھا، جس کے اوپر خلافت کا پرچم لہرا رہا تھا۔

لہذا ہماری سیاسیات میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں ـــــ اونٹ اور بانس!

چند سال ہوئے پہلے یورپ سے اور پھر ہمارے ملک کے مختلف حصّوں سے تبدیلِ جنس کی خبریں آنے لگیں۔ اب ترکی سے خبر آئی ہے کہ اچھی خاصی استانی لڑکیوں کو پڑھاتے پڑھاتے مرد بن گئی۔ بقول شاعر ؏

یہ مادین عُزا کے نر ہو گئی

اور اس کے بعد اُس نے مردانہ لباس پہن کر ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لے لیا کہ وہ مرد ہے۔

اب ڈیرہ اسماعیل خان سے خبر آئی ہے کہ وہاں ایک سکھ صاحب کی شادی ہوئی بڑے چاؤ چوچلوں سے ایک چاند سی بنّو بیاہ لائے جب دُلہن سسرال پہنچی تو پہلی ہی رات سردار لاڑا سنگھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ ان کی بیوی، بیوی نہیں بلکہ بیوا ہے۔

سکھ اپنی بات چیت میں ہر مونث کو مذکر بنا لیا کرتے ہیں مثلاً کوے میں والا ڈال دو۔ جیل میں ہم نے اکثر سُنا کہ سکھ قیدی مٹی کو

خاکا کہتے ہیں لیکن مونث کو مذکر بنانے میں ڈیرے کے سردار جی نے کمال کر دیا کہ بیوی بھی لائے تو مذکر ہی لائے۔

اب یہ دونوں میاں بیوی ہیں کہ کریں تو کیا کریں اور نہ کریں تو کیا کریں بقول مرزا غالب ؎

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گھر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو

وہ بار بار دلہن سے پوچھتے ہیں تو برائے وصل کردن آمدی یا برائے فصل کردن آمدی۔ وہ بیچاری گم صم ہے، کچھ جواب نہیں دیتی۔ سکھ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو اس بھنگی نما جھنگن کا معاملہ فوراً اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔

یہ سُن کر کلیجہ منہ کو آگیا کہ بنگال میں آموں کی فصل تباہ ہوگئی ہے اور یو۔ پی میں بھی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِن کُلِّ بَلاءِ الدُّنیا والآخرہ۔ یہ سب ہمارے گناہوں کی شامت ہے۔ جو قوم کفرانِ نعمت کرتی ہے وہ نعمت سے محروم کر دی جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ ایک دوسرے کو نہایت فیاضی و دریا دلی سے آموں کے ٹوکرے بطور تحفہ بھیجتے تھے۔ دلوں سے دعائیں نکلتی تھیں۔ اور آموں کی فصل میں برکت پڑ جاتی تھی۔ آج خست کا دور دورہ ہے لہٰذا فطرت بھی خسیس ہو رہی ہے۔

مولانا نصر اللہ خان عزیز نے جو کبھی مدیر مدینہ (بجنور) کی حیثیت سے یو۔ پی میں گنگا کنارے آم کھایا کرتے تھے۔ لاہور سے ایک اخبار ”زمزم“ کے نام سے جاری کیا ہے۔ پالیسی تو وہی دھوتی پرشادوں کی سی ہے۔ یعنی آپ حسب معمول کانگرسی واقع ہوئے ہیں لیکن اس سیاسی بدمذاقی کے باوجود آموں کے بے حد رسیا ہیں اور یہی ذوق اُن کے اور ہمارے درمیان قدرِ مشترک ہے۔ زمزم جاری کرتے ہی آپ نے اس میں آمیات کا ایک کالم قائم کر دیا ہے جس میں حسبِ سابق آم اور گڑ اور خربوزے کی بحث چھیڑ دی گئی ہے۔

اسی کالم سے معلوم ہوا کہ کوئی صاحب آم کے بجائے پنجاب میں خربوزہ کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے، وہ خربوزے کی کیا کیا خصوصیات شمار کراتے ہیں۔

> ”تر گاؤں میں پیدا ہوتا ہے۔ بیل کی ٹھنڈی چھاؤں میں ٹھنڈا پانی پیتا ہے۔ زمین اس کو چھاتی سے لگا کر رکھتی ہے اس کا رنگ کتنا خوش نما ہوتا ہے۔ اس کے اندر گٹھلی نہیں ہوتی۔ گلا نہیں پکڑتا۔ اس کا چیپ آبلے نہیں ڈالتا۔“

لیکن تقریباً یہی خصوصیات کھیرے اور ککڑی میں بھی موجود ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بدمذاقی کسی کے باوا کی جاگیر نہیں، مولا جس کو دے جس پھل کے نام کا جزوِ اول ”خر“ ہو۔ اور اس کو پھلوں کا بادشاہ قرار دینے والا انسان تو یقیناً نہیں ہو سکتا۔

خربوزے کو یوں تو پہلے ہی کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ہر دلعزیزی کی بنیاد ریت پر ہے۔ جہاں پانی کا ایک چھینٹا پڑا یہ بنیاد بہہ گئی اور خربوزے صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہو گئے اور اگر کہیں کہیں باقی بھی رہے تو پھوٹ کی شکل میں اور پھوٹ ہی وہ چیز ہے جس نے ہندوستان کو غیروں کا غلام بنا رکھا ہے۔

آم کی مقبولیت کی بنیاد سیمنٹ پر ہے۔ جتنا پانی پڑتا ہے اتنی ہی پائدار ہوتی جاتی ہے۔

کیا آپ نے نہیں سنا خربوزے کا نام سنتے ہی گدھے کا خیال آتا ہے صرف اس لئے نہیں کہ اس کا جزوِ اول خر ہے بلکہ خربوزے کے نقل و حمل کے لیے بھی زیادہ تر گدھے کام میں لائے جاتے ہیں اور آم! آم کی بہنگیاں! یعنی یہ ثمرِ بہشت انسانوں کے شانوں پر سوار ہو کر آتا ہے۔

حرف و حکایت

سند باد جہازی

دیرہ بھارت کی روایت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کی پارلیمنٹ میں تقریر کی۔ اس میں ایک رباعی کے یہ دو مصرعے بھی تھے۔

مے خواہی تند و تیز و انگہ بسیار
ایں بادہ فروش ساقیٔ کوثر نیست

ہر چند کہ مولانا نے ان مصرعوں کا ترجمہ انگریزی میں کر کے ممبروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ لیکن مدراسی اور بنگالی ممبر سمجھے تو یہ سمجھے کہ کسی تند و تیز قسم کی وسکی کا ذکر ہے جو جنت ہی میں ملتی ہے اور بافراط ملتی ہے۔

مولانا آزاد کا معاملہ تو یہ ہے کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تحریر ہو یا تقریر ایک آدھا شعر ضرور لاتے ہیں اور جب تک شعر نہ آئے انہیں خود بھی لطف نہیں آتا چنانچہ آج بھی جبکہ پوری پارلیمنٹ میں ان کی زبان کی نکتہ طرازیوں کی داد دینے والا کوئی نہیں۔ وہ اپنی پرانی وضع پر قائم ہیں ؎

حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است
ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

مولانا کی وضع داری مسلّم لیکن وہ یہ انداز کب تک نبھائے جائیں گے۔ کہاں ہندوستان کی پارلیمنٹ اور کہاں ساقیٔ کوثر کا ذکر۔ رطل گراں اور پیر مغاں کی حکایت۔ شحنہ و محتسب کی داستان۔ ان لوگوں کی تربیت مختلف قسم کے ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کا انداز نگاہ اور ہے۔ اسلوب فکر اور۔ انگریزی میں ہزار سمجھانے کی کوشش کیجئے ان کی سمجھ میں یہی کہ یہ اسی شراب کا ذکر ہے جو یورپ سے آتی ہے۔ اور پلومر یا بھولا رام کے ہاں ملتی ہے۔

از فرنگ آمدہ شہر فراواں شد است

مشہور لطیفہ ہے کہ ایک صاحب بہادر اُردو سیکھ رہے تھے کہ ایک موقع پر ان کے سامنے میر کا شعر پڑھا گیا ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اُن کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

صاحب بہادر نے فرمایا ہم سمجھ گیا۔ ہم تُم میر سب کو جیل خانہ بھیجنا مانگتا۔ جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ کے اکثر ممبران صاحب بہادر سے بھی گئے گزرے نکلیں گے۔

پاکستان اگرچہ اس معاملے میں غنیمت ہے لیکن سچ پوچھیے تو اگر پاکستان کی پارلیمنٹ میں بھی فارسی کے اشعار پڑھے جائیں تو بہت کم لوگ انہیں سمجھ سکیں گے۔ اور تو اور اس معاملے میں مغربی پنجاب کی اسمبلی کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ فارسی پڑھتے ہیں وہ اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کے ممبر نہیں بنتے بلکہ تیل بیچتے ہیں یا لڑکوں کو پڑھاتے ہیں یا پھر کلرکی کرتے ہیں اور ایک اچکن ایک کوٹ اور دو پتلونوں میں ساری عمر گذارتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ جو لوگ قانون ساز مجالس کے ممبر بنتے ہیں۔ سکتری اور وزارت کے عہدوں تک جا پہنچتے ہیں وہ فارسی نہیں پڑھتے۔ شعر نہیں سمجھتے اور ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ نہیں پڑھتے اور کچھ نہیں سمجھتے۔ پڑھیں اور سمجھیں تو تقریریں کیونکر کر سکیں۔ سوالات کا جواب کیسے دے سکیں۔ دنیا میں بعض کاروبار ایسے بھی ہیں جنہیں خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لئے ان سے بے خبر ہونا ضروری ہے۔

ایک واقعہ یاد آگیا کہ کسی اونچے گھرانے کے نوجوان نے ملازمت کی درخواست دی جس میں لکھا تھا کہ میں فلاں جاگیردار کا بیٹا ہوں۔ فلاں نواب صاحب میرے ماموں ہیں اور فلاں جج صاحب میرے چچا ہوتے ہیں۔ میرے پردادا ضلع کے حاکم تھے اور ان کے دادا کو شاہی عہد میں پنج ہزاری منصب حاصل تھا۔ جب افسر کے پاس یہ درخواست پیش کی گئی اس نے یہ کہہ کے درخواست واپس کر دی کہ ہمیں نسل کشی کے لیے نہیں بلکہ کلرکی کے لئے پڑھے لکھے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ سنا ہے کہ صاحبزادے کچھ عرصے کے بعد اپنے صوبے کی اسمبلی کے ممبر ہوگئے۔

بدہ ساقی آں مے کہ تادم زنیم — قلم بر سر ہر دو عالم زنیم
مجھے بادۂ مشکبو کر الاٹ — مے ارغواں کا سبو کر الاٹ
عسس سے نہ ڈر محتسب سے نہ ڈر — ہیں دونوں پڑے مست اور بے خبر
ہے مفتی و شیخ اور میر و وزیر — کمندِ ہوا و ہوس کے اسیر
ہے واعظ عمارتوں کے خوابوں میں گم — تموّل کے زریں سرابوں میں گم
سیٹھوں کو ہے کارخانوں کی فکر — دکانوں کی فکر اور مکانوں میں فکر

پلا ساقیا آبِ یاقوت رنگ   کہ اربابِ دولت ہیں مصروفِ جنگ
حجاباتِ مستی اٹھا کر پلا   نگاہوں کی مستی ملا کر پلا
ادھر اہلِ مسجد ادھر اہلِ دیر   سبھی دیکھتے ہیں لڑائی کی سیر
سبک باش و رطل گرانم بدہ   اگر فاش نتواں بہانم بدہ
ہوس نے ہے چھیڑا تباہی کا راگ   گرجتی ہیں توپیں برستی ہے آگ
ادھر دولتانہ شہِ جم سپاہ   سپہدار گردانِ زریں کلاہ
لئے ساتھ حیلوں بہانوں کی فوج   وہ وعدوں کے لشکر فسانوں کی فوج
غرورِ شہی سے نظر تابناک   مگر دامنِ آگہی چاک چاک
وہ فیروز خاں نون مردِ جری   نگاہوں میں ہے جس کی افسونگری
جسے یاد ہیں سب لڑائی کے ڈھنگ   لڑائی کے ڈھنگ آزمائی کے ڈھنگ
کرامت علی گردِ لشکر شکن   جسے مانتے ہیں سب اربابِ فن
سیال اور چیمے۔ ببال اور کھرل   چلے رزم گہ کی طرف دل کے دل
لئے پلٹنیں اور رسالے چلے   کئی ساتھ اخبار والے چلے
چلے اور پرچم اڑاتے چلے   ستاروں سے آنکھیں لڑاتے چلے
کوئی ان میں لندھور کی یادگار   کوئی رستم اور کوئی اسفند یار
کوئی ان میں پوتا ہے کاؤس کا   بھتیجا سگا ہے کوئی طاؤس کا
ادھر خان ممدوٹ مردِ دلیر   وزارت کے بیشے کا غرندہ شیر
شجاعت میں یکتا شہامت میں فرد   بڑھا جانبِ عرصہ گاہِ نبرد
چلا ساتھ اس کے وہ گرگِ کہن   یل نام آور محمد حسن
لئے ساتھ ملتان کے گھڑ چڑھے   مبارک علی اور دستی بڑھے
کسی سمت ہے پاندانوں کی فوج   کسی سمت رنگیں بیانوں کی فوج
چلیں حرص کی پلٹنیں پیش دیس   ادھر بھی ہوس اور ادھر بھی ہوس
ہے کاندھے پہ ہر چند گرزِ گراں   دعاؤں میں مصروف لیکن زباں
جو مل جائے یارب کوئی فیکٹری   میری بھی ہو کشتِ تمنا ہری
وزارت ملے یا صدارت ملے   کوئی مال بہرِ تجارت ملے
الٰہی مجھے بھی سکتّر بنا   کریمہ بہ بخشائے بر حالِ ما
ہوا گرم ہنگامۂ کارزار   نظر آئی دشوار راہِ فرار

وہ گالی کے چھرے وہ طعنوں کے تیر   گئے آن کی آن میں دل کو چیر
کمند اژدھائے مسلسل شکنج   دہن بادکردہ بہ تاراج گنج
بڑا لطف اس ہاتھا پائی میں تھا   مزا کرسیوں کی لڑائی میں تھا

لڑی بڑھ کے جاگیر جاگیر سے   لیا کام نیزے کا تدبیر سے
اُدھر خوب کرسی سے کرسی لڑی   مری سمت سے کس مپر کی لڑی
بڑھے دونوں جانب سے آتش بیاں   بیانوں کی توپوں نے باندھا سماں
بہت خوب اخبار والے لڑے   مکالے سے بڑھ کر مکالے لڑے
نہ پانی گھڑے میں نہ چولہے میں آگ   مگر خوب کھیلے لنگوٹی میں پھاگ

پلا ساقیا بادۂ لعل فام   لنڈھا دے مے ارغوانی کا جام
مے احمریں سے کھلا دے چمن   بیادِ شہیدانِ خونیں کفن
ہوا ختم جاگیرداری کا دور   ٹوانے کا دور اور لغاری کا دور
اُٹھ اور ان سے تیغِ دستاں چھین لے   یہ دونوں کے گرزِ گراں چھین لے

میرا دور ہے اور تیرا دور ہے
زمین اور ہے آسماں اور ہے

میں ۱۹۲۹ء میں پہلی بار علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُن دنوں وہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ شام کا وقت تھا۔ کوٹھی کے صحن میں ململ کا کرتہ پہنے چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ سامنے کرسیاں بچھی تھیں۔ جو آتا کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتا۔ اہلِ محفل میں ہر قسم کے ہر لوگ تھے۔ شاعر۔ اخبار نویس۔ ادیب۔ کلرک۔ پہلوان گفتگو سیاسیات سے شروع ہوئی۔ بیچ میں اُپنشدوں کے فلسفے اور چھ درشنوں کا بھی ذکر آ گیا۔ لیکن یہ محفل بالآخر لطیفوں اور پھبتیوں پر ختم ہوئی۔ اور دوسرے موضوعوں کی طرح ان میں بھی علامہ اقبال کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ یعنی اُنہوں نے یکے بعد دیگرے ایسے فقرے چست کئے کہ محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔

علامہ اقبال کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ اور کبھی کبھی طبیعت لہراتی تو پھبتیوں پہ پھبتیاں اور لطیفوں پہ لطیفے کہتے چلے جاتے تھے۔ لیکن پھبتیوں سے محض خوش وقتی مقصود تھی۔ نہ اُن کے دل میں کسی کے خلاف عناد یا دشمنی کا جذبہ تھا نہ وہ دوسروں کا دل دکھانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں پر پھبتیاں کہی جاتی تھیں۔ وہ خود بھی داد دیتے تھے۔ ایک صاحب پر جو علّامہ کے خاص نیازمندوں میں تھے، سب سے زیادہ نظرِ عنایت تھی۔ یعنی سب سے زیادہ پھبتیاں انہی پر کہی جاتی تھیں۔ ایک دفعہ ان کے بعض اقربا نے ان سے کہا تم اپنے آپ کو علامہ اقبال کے خاص دوستوں میں سے سمجھتے ہو لیکن ان کے ہاں جو تمہاری حیثیت ہے وہ ہمیں معلوم ہو گئی ہے۔ یہ طعنہ سننے کے بعد وہ گھر میں بیٹھ رہے۔ علامہ اقبال کو معلوم ہوا تو انہیں منانے کے لئے ان کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ انہیں جب خبر ملی کہ ڈاکٹر صاحب مجھے منانے کے

نے میرے ہاں آنا چاہتے ہیں تو وہ بیتاب ہو کے خود علامہ کے ہاں پہنچے۔ علامہ اقبال نے پہلے تو ان سے معافی مانگی اور کہا کہ افسوس میری زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس پر آپ مجھ سے ناراض ہو گئے۔ پھر ایک آدھ پھبتی ایسی کہہ دی کہ وہ بے اختیار ہنس پڑے۔

• ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کے کچھ طلبہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ پردے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ پردہ ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ ان دنوں کالجوں کے طلبہ خاص طور پر گورنمنٹ کالج کے طالب علموں میں بننے سنورنے کا شوق حد سے زیادہ تھا بعض طلبہ تو لپ اسٹک تک استعمال کرتے تھے اتفاق سے یہ طلبہ بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ اقبال پہلے تو ان کی باتیں سنتے رہے پھر کہنے لگے کہ آپ تو چاہتے ہیں کہ عورتوں کو پردے سے نکالا جائے اور میں اس فکر میں ہوں کہ لڑکوں کو بھی پردے میں بٹھا دیا جائے۔

علامہ اقبال کے پرانے خادم علی بخش کا بیان ہے کہ وہ شروع شروع میں علامہ کے ہاں ملازم ہوا تو شہر والوں کے طور طریقوں سے ناواقف تھا ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہہ دیا کہ جاؤ بازار سے تباشوں کا مربہ لے آؤ۔ سارے شہر میں پھرا لیکن تباشوں کا مربہ کہاں سے ملتا۔ دکان دار تباشوں کے مربے کا نام سنتے تھے اور ہنستے تھے۔ علی بخش سے ان کا یہ معاملہ آخر تک رہا۔ ایک دن یہ سوال پیش ہوا کہ علی بخش کی مونچھوں کی رنگت کیا ہے۔ کسی نے کہا اگری، کسی نے کہا خاکستری، ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔ علی بخش کی مونچھیں مرچھئی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے ایک مرتبہ "منادی" میں لکھا۔ میں ڈاکٹر اقبال کو ہندوستان کا شاعر اعظم نہیں سمجھتا۔ اسی زمانے میں خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے پاس فاسفورس کا تیل بھیجا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھٹنے میں درد تھا۔ انہوں نے فاسفورس کا تیل استعمال ہو گیا۔ درد کم ہو گیا۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "آپ نے جو تیل بھیجا تھا میں نے اسے استعمال کیا اور مفید پایا"۔ دوسرے دن منادی میں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط چھپ گیا۔ اس کے ساتھ جلی حروف میں چار کالمی عنوان تھا۔ فاسفورس کے تیل کے متعلق ہندوستان کے شاعر اعظم کی رائے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان باتوں کی پروا نہیں تھی۔ لیکن میں نے منادی کے یہ دونوں پرچے انہیں دکھائے تو ہنس کے کہنے لگے خواجہ صاحب بھی سچے ہیں۔ فاسفورس کا تیل استعمال کرنے سے پہلے میں کچھ نہیں تھا۔ اس تیل نے مجھے شاعر اعظم بنا دیا۔

۲۲ اپریل

سچّی باتیں

عبدالماجد دریابادی

خوب گزرے گی جو ......،

"پیکن ۱۱ اگست پیکن کی شہری حکومت نے آج سے فال گیری اور ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کا پیشہ اختیار کرنے کو ممنوع قرار دے دیا ہے اور یہ حکم دے دیا ہے کہ یہ پیشہ ور اپنے روزگار کا کوئی اور ذریعہ تلاش کریں۔ یہ حکم پیکن ایوننگ نیوز میں شائع ہوا ہے۔ اور اس کا بیان ہے کہ شہر میں اس وقت ۸۰۱ فال گیرے موجود ہیں۔"

مضائقہ نہیں۔ جو پیکن کی مقامی سرکار اس جوتش دشمنی پر تل گئی۔ ایسی ناقدری سرکار کے حدود سے تو ان ہنرمندوں کو خود ہی باہر چلا آنا چاہئیے اور سیدھے رُخ ہندوستان کے اس صوبہ کا کرنا چاہئیے جہاں کا وزیرِ اعلا اپنی جوتش نوازی میں نام پائے ہوئے ہے! قدم اس سرزمین پر رکھیں تو عجب نہیں کہ ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں اور قدر دانی کے مزے اٹھائیں! ہندی جوتشیوں اور چینی کاہنوں کا سنگھٹن ایک قابل دید سماں پیدا کر دے گا ہند و چین کے اتحاد کا ایک نیا منظر! بہ قول شخصے

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے "فرزانے" دو!

(۲۹ اگست ۵۸ء)

اُمتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں!

امریکہ کا مشہور اور بین الاقوامی دو کالمی پرچہ "لائف" (۴ اگست ۵۸ء) پیشِ نظر ہے ص ۲۷ سے ص ۲۹ تک تین صفحوں کے ایک ایک کالم۔ امریکہ (سن فرانسسکو) میں ایک بادشاہ اور اُن کی تین وقتی شبانہ داشتاؤں کی تصویروں اور تذکرے کے لئے وقف ہیں۔ بادشاہ نے ایک شب چھوڑ کر جب وہ اپنی شادی شدہ ہمشیر کے ہاں مہمان رہے۔ باقی تین راتیں شہر کی تین حسیناؤں کے ساتھ کھانا کھا کر اور رقص کر کے گزاریں، اور سب لڑکیوں نے شاہ کے "دلکش" ہونے کا بیان رپورٹر کو دیا۔ پہلی مس (عمر ۲۵ سال) سے شاہ نے استعارہ کی زبان میں فرمایا کہ میں تمہارا پرستار ہوں، دوسری مس (عمر ۲۵ سال) نے جو اشتہاروں میں اپنی تصویر دینے کا کاروبار کرتی ہیں، تجربہ کے بعد کہا کہ "یہ بادشاہ بڑے اچھے رقاص ہیں"، تیسری مس صاحبہ (عمر ۲۰ سال) تجربہ شبانہ کے بعد یوں گہر افشا ہوئیں کہ ہم کھاتے اور ناچتے رہے۔ بادشاہ بڑے اچھے قصّہ گو ہیں

مجھے تو بے تکلفی میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ بادشاہ ہیں، اور میں انہیں یور مجسٹی کہہ کر خطاب نہ کر سکی۔"

اس ساری داستان کے بعد آخر میں صرف اتنا سن لیجئے کہ شاہ ذی شان کوئی فرنگی نہیں، آپ ہی کی ملت کے ایک رکن رکین شاہ محمد رضا فرمانروائے ایران ہیں!

بے بس سرکار

ریلوے وزیر کی زبان سے راجیہ سبھا میں :۔

"جون کے مہینے بھر میں گرینڈ ٹرنک ایکسپریس دلی سے مدراس صرف ایک دن اپنے صحیح وقت پر پہنچی!"

کیا کوئی مخالف اگر انتظام ملک کے بدنام کرنے کو کوئی بہتان گڑھتا تو وہ اس حقیقتِ حال سے کچھ زیادہ ہوتا؟ اور پھر انہیں ریلوے وزیر صاحب نے اسی راجیہ سبھا میں فرمایا :۔

"میں نے ریلوے بورڈ کو لکھا ہے کہ کچھ تو کارروائی کریں جس سے وقت کی پابندی سو فیصد نہیں تو کچھ تو ہونے لگے!"

سبحان اللہ! یہ کوئی شوکت تھانوی کوئی مزاحیہ افسانہ سودیشی ریل نہیں لکھ رہے ہیں۔ ریلوے کے سب سے بڑے ذمہ دار افسر ملک کی سب سے زیادہ ذمہ دار مجلس کے سامنے پوری سنجیدگی سے فرما رہے ہیں کہ وقت کی پوری پابندی تو ہمارے بس کی بات ہی نہیں (وہ تو گئی انگریزوں کے ساتھ) اب اگر کچھ تھوڑی بہت بھی کہیں نظر آئے تو وہی غنیمت ہے! قناعت کی اس بے باکانہ شان کا مظاہرہ اس سے پہلے کسی سرکار نے کیوں کیا ہوگا!

اناڑیوں کا علاج

پلاننگ کمیشن کے ممبر شری مان نارائن نے ایک بیان میں کہا ہے کہ "بے روزگاری دوسرے پنج سالہ پلان میں بھی ختم ہوتے نظر نہیں آتی پروگرام یہ تھا کہ اس پلان کے تحت ۶۵ لاکھ اشخاص کے لئے روزگار مہیا کیا جائے لیکن یہ منشا پورا نہ ہوا اور صرف ۵ لاکھ اشخاص کو روزگار مل سکا۔"

لیکن علاج جب اناڑیوں کے ہاتھ میں ہوگا اور ہر اناڑی اپنے زعم و پندار میں اپنے کو طبیب حاذق ہی سمجھے گا تو مرض کے دور ہونے کی صورت ہی آخر کیا ہے؟ روزافزوں بے روزگاری ہو یا ہولناک گرانی۔ اس کے اسباب قدرتی سے کہیں زیادہ مصنوعی یعنی انسان کے اپنے ہاتھ کے پیدا کئے ہیں۔ جس نظام تمدن و نظام تعلیم میں بے پناہ ہوس کا نام "ترقی" رکھ دیا گیا ہو۔ جہاں ہر قسم کے اسراف کو معیار خوش حالی کا ٹھہرا لیا گیا ہو، جہاں عزت و تکریم صرف زر و مال کی بنا پر ہوتی ہو اور جہاں کے فلسفۂ اخلاق میں قناعت کا کوئی درجہ ہی نہ ہو وہاں توقع کس قسم کے نتائج کی کی جا سکتی ہے؟ (۱۱ ستمبر ۵۷)

حاصلِ تہذیبِ لادینی نگر

کیمبرج، ۲۰ اکتوبر۔ کیمبرج یونیورسٹی کے طلبہ کے پرچہ "درسٹی" نے الزام شائع کیا ہے۔ یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے جرائم خلاف وضع فطری کرنے والوں کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یونیورسٹی بدنام ہو جائے گی۔ پرچہ نے اپنے ایڈیٹوریل میں لکھا ہے کہ اب تو لوگ عام طور سے اس بات سے واقف ہو گئے ہیں کہ کیمبرج میں اس عمل کا ارتکاب کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

ذکر کہیں اور کا نہیں۔ خاص الخاص مرکز علم و تحقیق، دانش گاہ اعظم کیمبرج ہے۔ فطری کے بعد غیر فطری! اس کا نمبر آنا ہی تھا۔ مرام آمدنیاں، شراب خواریاں، بے حیائیوں کے بے انداز نظارے، خوف آخرت سے یکسر اعراض، اور اس اعراض پر فخر، فحش کاری کے بے شمار حرکات، یہ سب آخر اور کس منزل پر پہنچاتے؟ یہ جو کچھ پیش آ رہا ہے حیرت اس پر نہیں، حیرت اس پر ہے کہ اس سے بہت زیادہ کیوں نہیں پیش آ رہا ہے۔ دنیا کو یاد رہے اور خوب یاد رہے کہ ہر خدا فروش تہذیب اور ہر لادینی تمدن کا یہی انجام دیر سویر ہو کر رہتا ہی ہے۔

چار بوڑھیاں

لندن سے خبر اکتوبر کے چوتھے ہفتہ میں موصول ہوئی کہ ہاؤس آف لارڈز (پارلیمنٹ کے دارالامرا) میں پہلی بار چار بیگمات بہ طور ممبر داخل ہوئی ہیں جدوجہد اس "حق" کے لئے سالہا سال سے جاری تھی۔ دارالامراد کے مرد ممبر برابر اس کی مخالفت پر اڑے رہے اور کہتے رہے کہ دارالعوام والے چاہیں، اپنے ہاں کریں۔ ہم اپنے دارالامراد کی توہین اور ذلت اس میں سمجھتے ہیں کہ کوئی عورت ممبر ہو کر ہمارے ہاں نشست کرے۔ زمانے کی ہوا کی مخالفت کوئی کب تک اور کہاں تک کرتا۔ آخر مردوں کو اپنی ضد توڑنی پڑی۔ اور عورت تاریخ میں پہلی مرتبہ برطانیہ کے دارالامراد کی ممبر بنی۔ شام وغیرہ تو یہ مبارک قدم پہلے ہی اٹھا چکے ہیں۔ باقی پست و پس ماندہ ملک جو اب تک عورت کو ممبری کے حق سے محروم کئے ہوئے ہیں وہاں کی بیگمات کو مبارک ہو کہ اب ان کی غلامی کی زنجیروں کے ٹوٹنے کا بھی وقت آ پہنچا۔

لیکن اس خوشخبری کے ساتھ یہ کچھ عجیب سی بدشگونی بھی شامل ہے کہ جن چار محترمات کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے شباب کی منزل میں نہیں بلکہ جو سب سے کم سن ہیں۔ وہ بھی ۵۵ سال کی ہیں۔ اور باقی کی عمریں تو ۶۰، ۶۲ اور ۶۴ کی ہیں!

عید ہوئی ذوق دے شام کو (۷ نومبر ۵۸ء)

جب وزیر اعظم کا خون کھولا

وزیر اعظم نہرو کی تقریر اندور میں ۴ نومبر کو (بہ حوالہ قومی آواز)

"عورت کو پردہ میں دیکھ کر میرا خون کھول جاتا ہے۔ میں پردہ کو پنجرا تصور کرتا ہوں۔ جب میں اپنی کسی بہن کو پنجرے میں بند دیکھتا ہے تو میرا خون کھول جاتا ہے۔ پردہ میں رہنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ عورتیں ملکی تعمیر میں حصہ نہ لیں"

آپ نے سن لیا کہ آپ کے وزیر اعظم کا خون کس پر کھولتا ہے — فلمی بیسواؤں پر نہیں، تھیٹر والیوں پر نہیں، گا بجا کر، ناچ تھرک کر ہزارہا مردوں کے سامنے بے محابا اپنے نیم عریاں جسم کی نمائش کرنے والیوں پر نہیں۔ بلکہ ان میں سے اکثر کی تو عزت افزائی ہی طرح طرح پر ہوتی رہتی ہے۔ یہ خون انسانہ طراز اخباریوں پر نہیں کھولتا جو برابر ان کی ہندوستانی تقریروں کو "ہندی" تقریریں کہہ کر چھاپتے رہتے ہیں۔ ان کا خون کھولتا ہے تو ان بیچاریوں پر جو اپنی عفت و ناموس کی خاطر اب تک حجاب و نقاب کی پابند ہیں۔ ہمارے وزیر اعظم اپنی ذات سے جیسے شریف انسان ہیں۔ اور بڑی حد تک مسلمانوں کے حق میں انصاف اور ہمدردی کرنے والے۔ اس کے بعد ان پر کسی حد تک بھی نکتہ چینی قدرتاً قلم کو شاق گزرتی ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اسلامی قدروں کے تحفظ کا جذبہ ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے۔ (۵ دسمبر ۵۸ء)

سر راہے

یہ "سپیشل سروس" کہ چرچل نے مسٹر روزولٹ کی معرفت ہندوستان کو آزادی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور ضامن کامریڈ سٹالین ہیں۔ درست ہی معلوم ہوتی ہے۔ تین چار دن ہوئے علی الصباح ایک صاحب تشریف لائے۔ شکل و صورت اور ہیئت کذائی سے "کامریڈ" ہی معلوم ہوتے تھے۔ شان نزول پوچھی تو ارشاد فرمایا کہ فرصت ہو تو کچھ ضروری باتیں کہنی ہیں۔ ہم نے یہ عرض کی کہ اس وقت تو فرصت نہیں۔ پھر سہ پہر کو سہی۔ جب سہ پہر کو بھی مصروفیت کا عذر کیا تو ایک طرح سے دھرنا ہی مار کر بیٹھ گئے۔ مجبوراً دست بستہ پوچھنا پڑا کہ حضور کا نہایت اہم مشن" کیا ہے؟ فرمایا کہ ہندوستان کو آزاد ہونا چاہئیے۔ ہم نے گذارش کی کہ کون اس سے اختلاف کر سکتا ہے مگر ہندوستان آزاد ہو تو کیسے؟ نہایت سادگی سے فرمایا کہ مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ قائم کیجئے۔ ہم نے ذرا شبہ کا اظہار کیا تو یہ مژدہ سنایا کہ ترقی پسند دنیا آپ کے ساتھ ہے۔

معلوم ہوا کہ حضرت کو بین الاقوامی مسائل سے بہت دلچسپی ہے اور اس حد تک دلچسپی کہ ان کے خیال میں کم از کم مشرق میں اس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہے ان کے مشورہ سے ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی ہو گا ان سے پوچھے بغیر نہیں ہو گا۔ سٹالین سے بہت دوستی ظاہر کی اور کہا کہ سٹالین سے میں ملا تھا اور اسے ہندوستان کا مسئلہ اس طرح سمجھایا ہے کہ وہ بالکل ہمارے ساتھ ہے سٹالین نے ایک بیان بھی مجھے دیا ہے جس میں ہندوستان کے لئے قومی حکومت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ کسی وقت پریس میں اسے شائع کروں گا۔

ہم نے ان کامریڈ صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ سٹالین کا بیان شائع کرنے سے پہلے پروفیسر عبدالمجید صاحب کو ضرور دکھا لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ڈکشنری کھول کر بیٹھ جائیں۔ سٹالین آخر روسی ہے۔ بیان میں انگریزی کی دو چار غلطیاں ضرور نکل آئیں گی۔ پروفیسر صاحب ایک بیان دھر گھسیٹیں گے اور ٹریبیون اسے چھاپ دے گا۔ اور خدشہ ہے کہ کہیں اتحادیوں کے تعلقات نہ بگڑ جائیں۔ بات معقول تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ مشورہ قبول کیا۔ اب وہ پروفیسر صاحب کی تلاش میں ہیں۔ اور جب تک پروفیسر صاحب بیان کی غلطیاں درست نہیں کر دیتے ہم محفوظ ہیں۔

ان کامریڈ کی ٹکر صرف ایک "ڈاکٹر صاحب" دیکھے۔ فرق یہ ہے کہ وہ ہندوستان سے باہر کے مسائل میں ذرا کم دخل دیتے

میں۔ عرصہ ہوا ان سے ملاقات ہوئی تو زمانہ کی ناقدری کا گلہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ "لنلتھگو سے تو بے تکلفی تھی۔ جب کوئی پیچیدہ مسئلہ ہوتا تھا وہ بلاتکلف بلا بھیجتا تھا اور وہی کرتا تھا جو ہم کہتے تھے۔ ڈیول سپاہی اور ذرا اکھڑ سا آدمی ہے۔ سخت ضرورت کے بغیر بلاتا نہیں۔ اور بن بلائے جانے کے ہم عادی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاملات روز بروز خراب تر ہو رہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کے پاس بہت سے جنگی نقشے تھے اور ایک پنسل۔ بار بار ان نقشوں کو نکالتے تھے اور پنسل لگا لگا کر بتاتے تھے کہ دو سال بعد ہٹلر یہاں سے حملہ آور ہوگا۔ سٹالین یہ چال چلے گا۔ انگریز یہاں سے بڑھیں گے۔ اٹلی یہاں مات کھائے گا اور سوا پانچ منٹ بعد ٹھنڈا سانس بھر کے کہتے تھے کہ افسوس ہماری یہ بصیرت رائیگاں جا رہی ہے۔ اپنی حکومت ہوتی اور اس طرح جنگ درپیش ہوتی تو وہ نقشہ بناتا کہ دشمن سٹی بھول جاتا۔

اور بات واقعی افسوس کی ہے کہ ایسے ایسے اہل کمال ہندوستان میں موجود ہیں جو سٹالین، ہٹلر اور چرچل کو برسوں درس دے سکتے ہیں مگر کسی کی نظر ان کے جوہر گراں مایہ پر نہیں جاتی۔ کوئی کسی ہسپتال میں کمپونڈر ہے تو کوئی بالکل بے کار۔ قومی حکومت ہوتی تو یہ لوگ روس۔ امریکہ اور انگلستان میں سفیر ہوتے اور سفارت خانے میں نہ سہی اور "خانے" میں تو ضرور ہوتے۔ اس طرح تباہ حال تو نہ پھرتے۔

سہروردی صاحب چین جا رہے تھے تو بڑا شور تھا کہ نون صاحب بھی ان کے ساتھ جائیں گے۔ چین سے ہم چینی کے توسط سے متعارف تھے۔ عام قاعدہ بھی یہ ہے کہ جب کسی کے ہاں مہمان جاتے ہیں تو اپنے ساتھ کوئی میٹھی چیز لے جاتے ہیں۔ مگر پاکستان میں ان دنوں چینی کی کمی ہے اس لئے سہروردی صاحب نون ہی کو ساتھ لے جا رہے تھے کہ شکر پارے نہ ملے نمک پارہ ہی سہی ع

گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است

لیکن نون صاحب کے چین جانے کے سلسلہ میں یا تو وہ شورا شوری تھی یا یہ بے نمکی کہ سہروردی صاحب نون کے بغیر ہی چین سدھارے۔ کم سے کم منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے تو یہ توشہ ضروری تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت میں سہروردی صاحب کو خیال آیا کہ پاکستان کی ترکیب میں "ن" ضروری ہے ——— لیکن جس نون کو وہ نون اعلانیہ سمجھ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ نون غنہ ہے۔

نون غنہ اور نون اعلانیہ میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے اور نون سے نقطہ خارج ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ نون صاحب وزیر خارجہ ہیں اور وزیر خارجہ کا کام عام طور پر حریفوں کو بے نقط سنانا ہے۔

اس نکتے کو اگر کوئی سمجھا ہے تو سہروردی صاحب نے جب ان کے فارمولے پر نکتہ چینی کی گئی تو وہ چینی کے ساتھ ساتھ نکتہ بھی لے گئے جس سے نون اعلانیہ نون غنہ بن گیا۔ لیکن وہ ہمارے منہ کا مزہ پھیکا کر گئے۔ گویا ہم چینی کو رو رہے ہیں اور سہروردی صاحب نکتہ چینی کو۔ اس کی تلافی اسی طرح ممکن ہے کہ سہروردی صاحب چین سے لوٹتے ہوئے کچھ چینی اپنے ساتھ لے آئیں۔ کوئلہ تو ایک کامریڈ چین سے درآمد کر ہی لیتے ہیں، چینی آ جائے گی تو ملک کا سیہ و سفید ٹھیک ہو جائے گا۔

سہروردی صاحب کے چین جانے پر ان کے بعض احباب چیں بجبیں ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ سہروردی صاحب چین گئے تو ہیں۔ لیکن شاید وہاں انہیں مکمل چین نسیب نہ ہو۔ اس لئے کہ یہ دعوت ان کے دو پیش رؤوں کو راس نہ آئی۔ محمد علی بوگرا نے دعوت قبول کی ہی تھی کہ اُن کی وزارت کی چیں بول گئی۔ اور چوہدری محمد علی کی شرافت نے انہیں اتنا چین لینے ہی نہیں دیا کہ وہ اطمینان سے چین جا سکتے۔ لیکن سہروردی صاحب بے خطر اس راستہ پر چل پڑے۔

یہ صحیح ہے کہ وزارت عظمیٰ کوئی چینا گوند نہیں کہ جو اس گدی پر بیٹھے وہ چپک کر ہی رہ جائے۔ لیکن شہید صاحب بھی طفلی چوں چوں نہیں۔ جب تک وہ صحیح بنیادی اصولوں سے چین چھپڑ نہیں کرتے۔ انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رہا ہو کر لاہور پہنچے تو ان کا استقبال کرنے والوں کی تعداد پندرہ بیس ہزار بلکہ ایک روایت کے مطابق پچیس ہزار تھی۔ جلوس میں تو ان پر جو گزری ستم یہ ہے کہ گھر پہنچ کر بھی اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ وہ رات کے دس بجے تک معانقے کرتے رہے اور بھی جانے کتنے دنوں یونہی مصافحے اور معانقے کرتے رہیں گے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم کسی بڑی جماعت کے امیر چھوڑ کر میر محلہ بھی نہ ہوئے ورنہ ان مصافحوں اور معانقوں میں مرے ہوتے۔

بعض پرانے لیڈروں کو جنہوں نے عدم تعاون کی تحریک کا زمانہ دیکھا ہے، جلوس نکلوانے مصافحے اور معانقے کرنے کا کچھ ایسا ڈھب آ گیا تھا کہ دن بھر میں دو دو تین تین جلوس نکلواتے تھے، ہزاروں عقیدت مندوں سے مصافحہ اور معانقہ کرتے تھے اور ماتھے پر بل تک نہیں پڑتا تھا۔ ہم نے ایسے لیڈر بھی دیکھے ہیں کہ بظاہر مدقوق معلوم ہوتے تھے لیکن لیڈری جو ہاتھ آئی تو اچھے لندھور معلوم ہونے لگے۔ جلوس اور جلسے انہیں خوب راس آئے اپنے نام کے ساتھ زندہ باد سن کر سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔ مصافحہ اور معانقہ کرتے تھے تو بجلی سی کوند جاتی تھی۔ مصافحہ تو خیر کیا بری چیز ہے معانقہ کی یہ کیفیت تھی کہ داہنی طرف ذرا جھک کر بائیں پر آئے اور وہاں سے اس طرف نکل گئے کہ بڑے بڑے "پسلی توڑ" بلکہ "گردن توڑ" معانقہ کرنے والے تکتے رہ گئے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے ؎

خدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

تو وہ ایک حد تک درست ہے لیڈری میں نزاکت کی بجائے پھرتی اور معانقہ کرنے کی مشق کی ضرورت ہے۔

بعض لیڈروں کی تو یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ جلسے یا جلوس کو زیادہ عرصہ ہو جاتا تھا تو یہ مرضِ "عدم جلوس" میں مبتلا ہو جاتے تھے اور یہ مرض جب مزمن ہو جاتا تھا تو کسی بڑے سے بڑے جالینوس سے اس کا علاج نہیں ہو سکتا تھا اور معجون اسطوخودوس بھی بالکل بے کار ہو کر رہ جاتی تھی اس لئے جلسے کثرت سے ہوتے تھے۔ جلوس بھی کثرت سے نکالے جاتے تھے۔ جلسوں کا انتظام بڑے سلیقے سے کیا جاتا تھا۔ یہ بات پہلے طے ہو جاتی تھی کہ اللہ اکبر کا نعرہ کب لگایا جائے۔ زندہ باد کے نعروں کے لئے کون کون سے موقع موزوں ہیں۔ اس غرض کے لئے جلسہ گاہ کے مختلف حصوں میں نعرہ لگانے والے کھڑے کر دیئے جاتے وہ موقع پا کر اس انداز سے نعرے لگاتے کہ سارے اہلِ جلسہ ان کی پیروی کرتے تھے۔

تحریک عدم تعاون کے زمانے میں پنجاب کے ایک مشہور لیڈر نے گجرات کے قومی کارکنوں کو تار دے دیئے۔ لیکن یہ تار وقت پر نہ پہنچے۔ ان کی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی تو کوئی شخص استقبال کے لئے موجود نہیں تھا۔ انہوں نے قلی سے سامان اٹھوایا اور ویٹنگ روم میں جا بیٹھے۔ پھر ایک شخص کے ذریعے گجرات کے کانگریسی اور خلافتی کارکنوں کو پیغام بھیجا کہ "مجھے آکے لے جاؤ" گجرات میں سب لوگ بے خبر بیٹھے تھے۔ یہ پیغام پہنچا تو ہڑبڑا کر اٹھے اور جلوس کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ خدا خدا کر کے شام کے وقت جلوس تیار ہوا اور یار لوگوں نے لیڈر کو گجرات پہنچایا اور اس طرح وہ مرضِ عدم جلوس میں مبتلا ہوتے ہوتے بچا۔

۱۹۲۸ء کے اواخر میں انڈین نیشنل کانگرس اور مجلس خلافت کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوئے تھے۔ کانگرس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو کا جلوس بڑی دھوم سے نکلا۔ مسلمان ہندوؤں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے خلافت کانفرنس کے صدر مولانا محمد علی کا جلوس بڑی شان و شوکت سے نکالا۔ اسی زمانے میں پنجاب کے بعض لیڈروں کو خیال آیا کہ ہمارا جلوس بھی نکلنا چاہیئے ورنہ کہیں عارضہ عدم جلوس لاحق نہ ہو جائے۔ کلکتہ میں پنجابیوں کی دودھ دہی کی دکانیں ہیں۔ امرتسر کے کچھ لوگ شال فروشی بھی کرتے ہیں جب کانگرس اور خلافت کے جلسے قریب الاختتام تھے تو بعض پنجابی لیڈروں کا ایک جلوس نکلا۔ کسی نے پوچھا یہ کس کا جلوس ہے؟ جواب ملا پنجاب کے لیڈروں کا اس نے پوچھا اب تک یہ جلوس کہاں تھا؟ پاس سے کسی نے کہا کاریگر کے پاس تھا۔ اس نے وقت پر بنا کر نہیں دیا۔ عید پیچھے ٹرا اسی کا نام ہے ایک پرزور قہقہہ بلند ہوا۔ راقم الحروف اگرچہ پنجاب کے لیڈروں کی جرأت اور ہمت کا قائل رہا ہے۔ لیکن کلکتے والوں کی بات سن کر بڑا افسوس ہوا۔

حرف و حکایت

احمد ندیم قاسمی

سنا ہے سابقہ پنجاب کے علاقے میں چینی کی چیں بول گئی ہے اور مرکزی حکومت کا راوی چین لکھتا ہے۔ یعنی مرکز کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وہ جو ہم نے تمہیں دسمبر میں چینی دینے کا وعدہ کیا تھا تو وہ وعدہ بدستور موجود ہے لیکن چینی موجود نہیں ہے۔ اس لیے چین کی بنسی بجاؤ۔ اور چیں بجبیں ہونے یا نکتہ چینی پر اتر آنے کے بجائے چینی کا انتظار کرو۔ کیونکہ چینی ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ چینی کا آنا اسی طرح یقینی ہے جس طرح موت کا آنا یقینی ہے۔

ہم ہفتوں پہلے چینی خوروں کو مشورہ دے چکے ہیں کہ چائے میں چینی ڈالنے کے لیے چمچے کے بجائے ڈراپر کا استعمال شروع کر دیجیے۔ اور مہمان کے لیے چائے بناتے وقت اس سے یہ نہ پوچھیے کہ آپ کتنے چمچے پسند فرمائیں گے۔ چینی سے بھرے ہوئے ڈراپر کو بڑی نزاکت کے ساتھ انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے تھام کر اور گردن کو ذرا سا خم دے کر استفسار فرمائیے ”آپ چینی کے کتنے ذرات استعمال کرتے ہیں۔“ مہمان ہزار بے تکلف اور منہ پھٹ ہو مگر وہ ایک سو ذرات سے کیا آگے جائے گا اور مژدہ ہو کہ چینی کے ایک سو ذرات چمچے کا ایک چوتھائی پیٹ بھی نہیں بھر سکتے۔

اس جاہل قاضی کا قصہ تو آپ نے سنا ہوگا جس کا باپ انتقال کر گیا تو دیہات کے لوگ اس کے پاس چاند کی تاریخ پوچھنے آنے لگے۔ حساب کتاب کا کورا تھا۔ اس لیے اس نے مکان کے کونے میں اپنے پلنگ کے ایک طرف کھلے منہ کا ایک برتن رکھ دیا۔ اور جب نیا چاند نکلا تو اس نے برتن میں بکری کی ایک مینگنی ڈال دی۔ دوسرے دن دوسری مینگنی شامل کر دی، اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اب کوئی اس سے چاند کی تاریخ پوچھنے آتا وہ یونہی روا روی میں انگڑائی لیتا۔ ہاتھ لٹکا کر برتن میں پڑی ہوئی مینگنیاں گنتا اور تاریخ بتا دیتا۔

چند روز کے بعد نہ جانے ایک بکری کو کیا سوجھی کہ وہ اس برتن میں بہت سی مینگنیاں بھر کر چلی گئی۔ شام کو کوئی دیہاتی چاتا تاریخ پوچھنے آیا تو قاضی نے انگڑائی لے کر ہاتھ لٹکایا اور پھر جیسے مراقبے میں چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد حیران ہو کر بولا ”اٹھانویں“ ”اٹھانویں کیسے؟“ اور قاضی بولا ”یہ تاریخ بھی میں نے خدا کے خوف کے مارے بتائی ہے، ورنہ میرے حساب سے تو آج چاند کی پا

بہتر دیں تاریخ نکلتی ہے" —— وہ چمچے چائے پینے والوں کے حساب سے چاہے انھیں آپ کے ڈراپر میں سے تین چار ہزار ذرات چینی کی ضرورت ہو مگر وہ بھی خدا کے خوف کے مارے ایک سو سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ آزما کر دیکھ لیجیے۔

کچھ دنوں سے چینی کی کچھ ایسی کیفیت ہو رہی ہے کہ اگر ہماری حکومت مانے تو جلدی جلدی سے چینی کا ایک آدھ من محفوظ کر کے اسے عجائب گھر میں منتقل کر دے۔ تاکہ آئندہ نسلیں جب کتابوں میں چینی کا ذکر پڑھیں تو اسے گڑ نہ سمجھ بیٹھیں۔ چینی کو فوری طور سے نوادرات میں شامل کر لینا بے حد ضروری ہے اور محکمہ آثار قدیمہ اس کام کو جتنی جلدی اپنے ہاتھ میں لے لے اتنا اچھا ہے۔ وقت آنے والا ہے جب اعزہ و احباب خوشی کی تقریبوں پر ایک آدھ چمچہ چینی سونے کی ڈبیوں میں بند کر کے پیش کیا کریں گے اور تحفے قبول کرنے والے جب ڈبیا کھول کر اس میں چینی کا حسن مرمریں دیکھیں گے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔ ان کی آواز بھرا جائے گی اور وہ بڑی رقت سے کہیں گے "اتنی بڑی قربانی؟ یعنی آپ میرے لیے چینی ایسی چیز کا پورا چمچہ لے آئے ہیں۔ نہیں میں اس قابل کہاں۔ میری طرف سے یہ چمچہ اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں پیش کر دیجیے گا۔ شکریہ۔"

یکم دسمبر ۱۹۵۶ء

نظیر اکبر آبادی کی ایک نظم "پری کا سراپا" پڑھتے ہوئے ہمیں اچانک محسوس ہوا کہ نظیر کے محبوب اور عوامی لیگ کے سرکاری گروپ کے درمیان کافی سے زیادہ مماثلتیں اور مشابہتیں موجود ہیں اور اگر نظیر آج کے محبوب کا مقابلہ اس کے ماضی سے کر رہا ہے تو عوامی لیگ کے سرکاری گروپ کا مقابلہ پرانی مسلم لیگ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس پر ہم نے اس ساری نظم کا جائزہ لیا۔ بعض تبدیلیاں کیں۔ بعض نئے الفاظ گھڑے، اکثر مصرعوں کو یونہی رہنے دیا اور اس طرح عوامی لیگ کے سرکاری گروپ کا "سراپا" تیار ہو گیا۔ جو آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے حاضرِ خدمت ہے:۔

ویسی ہی فارن پالیسی مغرب کو جھکاوٹ ویسی ہی   غیروں سے لگاوٹ ویسی ہی اپنوں سے کھچاوٹ ویسی ہی
بالوں میں سیٹو پیکٹوں کی افشاں کی سجاوٹ ویسی ہی   پلکوں کی جھپک پتلی کی پھرت سرمے کی کھلاوٹ ویسی ہی
تیور ویسے ہی بگڑے سے تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہی

بے دردی سی اور بے پروا سی چنچل سی اور چٹکیلی سی   دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
ان نرم رسیلی باتوں میں اک شے ہے سخت کٹیلی سی   آنکھیں ہیں کہ مسلم لیگیں ہیں کچھ سرخ سی اب کچھ پیلی سی
نظروں کی چراوٹ ویسی ہی آنکھوں کی گراوٹ ویسی ہی

بغداد کا پٹکا باندھے ہوئے "سیٹو" میں بیٹھ کے آتی ہے   اپنی ہی زباں کو لہرا کر اپنی ہی زباں کھا جاتی ہے
جب سو سو شکوے کرتی تھی اب ہنستی ہے اور گاتی ہے   اب اس کی سانسوں سے بھی مسلم لیگ کی آواز آتی ہے
زلفوں کی کھلت، پٹی کی پھبت چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہی

اس کافر بینی اور نخوت کے انداز قیامت شان بھرے   اور گہرے چاہ زنخداں میں سو آفت کے طوفان بھرے
وہ باتوں سے جیبیں نخوں سے اور وعدوں سے داماں بھرے   چہرے پہ کھوڑو دبے ہوئے آنکھوں میں بہادر خاں بھرے
بندے کی لٹک جھمکے کی جھمک، بالے کی ہلاوٹ ویسی ہی

اب اپنے بیاں سے باہر ہے وہ کافر حسن ابلا بلا   کچھ آپ نئی کچھ حسن نیا کچھ جوشش جوانی اٹھنے کا
لچکیں جھپکیں ان باہوں کی یارو میں آج کہوں کیا کیا   ہلکے سے ہلنا بازو کا دھیرے سے وہ اٹھنا پاؤں کا
دھڑیوں کی جماوٹ ویسی ہی چھلوں کی چھلاوٹ ویسی ہی

وہ کافر دھج جی دیکھ جسے خود مسلم لیگ کا بھی لرزے   پازیب کڑے، پائل، گھنگھرو، کڑیاں، جھڑیاں، گجرے، توڑے
ہر جنبش میں سو جھنکاریں، ہر ایک قدم پر سو جھٹکے   وہ چنچل چال جوانی کی، اونچی ایڑی، نیچے پنجے،
نقشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہی

اک شورِ قیامت ساتھ چلے، نکلے کافر جس دم بن ٹھن   بل دار کمر، رفتار غضب، ایک ایک قدم سو سو گلشن
مذکور کروں کیا اب یارو اس شوخ کے کیا کیا چنچل پن   کچھ ہاتھ ہلیں، کچھ پاؤں ہلیں، پھڑکیں بازو تھرکے سب تن
بھولی تو نہ ہوگی لیگ تمھیں، انگلی کی نچاوٹ ویسی ہی

"کیا بات کہی؟" — سو بار کہے، جو بات کہوں وہ سب سمجھے   روٹھے، مچلے، سو سوانگ بھرے، باتوں میں لڑے، کھاتوں میں ملے
بیٹھی تو ہے اونچی کرسی پہ، اک آن مگر نچلی نہ رہے   چنچل، اچپل، مٹکے، چٹکے، سر کھولے ڈھانکے ہنس ہنس کے
قصوں میں وہی "دلتانیت" ٹھٹھوں کی اڑاوٹ ویسی ہی

چٹکی لے کر کتنی مارے، چھیڑے، جھڑکے، پھر روٹھے بھی   ہر آن "چہ خوش" ہر دم "چپ چپ" ہر بات پہ کہہ دے "اچھا جی"
تن تن کر جو تقریریں کیں، وہ واپس لے کر بیٹھ رہی   سو کوس پرے سے ہٹ جاتی ہے بات آتی ہے جب مطلب کی
رمزیں بھی وہی غمزے بھی وہی باتوں کی بناوٹ ویسی ہی

اُف اس پہ حکومت کا عالم، وہ عالم لیگ کہاں پاوے   گر پردہ منہ سے دور کرے تو نشتر کو بھی چکر آ جاوے
جب ایسا حسن بھبھوکا ہو، دل تاب بھلا کیونکہ لاوے   وہ مکھڑا لیگ کا ٹکڑا سا جو دیکھے دیکھ کے غش کھاوے
گالوں کی دمک، ماتھے کی چمک، زلفوں کی زلاوٹ ویسی ہی

کچھ ناز و ادا، کچھ مغروری، کچھ شرم و حیا، کچھ بانک پنا   کچھ آمد حسن کے موسم کی، کچھ کافر حسن رہا گدرا!
کچھ شور جوانی اٹھنے کا، جو سندھ میں سیلاب آیا تھا   اپنا بھی اسے ہوش نہیں، کیا ہوش ہو اس کو دنیا کا
چائے میں وہی کیکر کا مزا، آٹے میں ملاوٹ ویسی ہی

جب ایسا حسن کا دریا ہو، کس طور نہ لہروں میں بہیئے   ہم جور و جفا سہتے ہی رہے اس جور و جفا کو بھی سہیئے
اپنے ہی کہے کی لاج نہیں اب اس سے آگے کیا کہیئے   گر دال نہ پنجدریا کو ملی ننگے ہی پڑ کر سو رہیئے
افسوس وطن پہ چھائی ہے اب کے بھی تھکاوٹ ویسی ہی

۱۷ر دسمبر ۱۹۵۶ء

ہم نے بعض اربابِ کراچی کی زبانی سنا ہے کہ "صاحب۔ بسوں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ آتی ہیں تو آتی ہی چلی جاتی ہیں۔ مگر نہیں آتیں تو مہینوں تک نہیں آتیں۔ اور ان اربابِ کراچی سے ہم نے ہمیشہ یہ عرض کیا ہے کہ ذرا لاہور تشریف لائیے اور ایک بس پکڑ کر دکھائیے مگر اتنی احتیاط ملحوظ رہے کہ تہلیس دعائیں بخشوا کر اور وصیت نامے مرتب کر کے تشریف لائیے گا۔ کیونکہ لاہور میں کراچی کی سی (عام سے) عامی بس نہیں چلتی۔ یہاں عامی یا ادنیٰ

بس چلتی ہے اور اہلِ لاہور کا کہنا ہے ؎

عمرِ دو روزہ بس ہی پکڑنے میں کٹ گئی   ہم سے تری جفا کا گلہ بھی نہ ہو سکا

کراچی میں تو کبھی کبھی ایک ہی بس شاپ پر ہر بس سروس کی ایک ایک نمائندہ بس آ کھڑی ہوتی ہے۔ اور یوں بھی ہولے کہ ایک مسافر کا داہنا بازو ایک بس میں رکھا ہے تو بایاں دوسری بس میں، سر تیسری بس کی ایک سیٹ پہ درج ہے تو ٹانگیں چوتھی بس میں کھڑی ہیں اور باقی ماندہ دھڑ نے پانچویں بس کے انتظار میں بس شاپ کا کھمبا تھام رکھا ہے۔ یہاں لاہور میں تو یہ کیفیت ہے کہ والدین نے اپنے بچے کو پرائمری سکول جانے کے لیے بس سٹینڈ پہ کھڑا کیا۔ مگر جب تک بس آتی بچے کی داڑھی مونچھیں نکل آئیں اور والدین اسے دولہا بنانے کے لیے گھر بلا لائے۔

کہتے ہیں ایک غریب مسافر کی چادر چوری ہو گئی۔ تلاشِ بسیار کے باوجود جب چادر دستیاب نہ ہو سکی تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ چادر کے غم میں آئندہ سے داڑھی نہیں منڈوائے گا۔ ایک روز اس نے سرِ راہے ایک پھٹے حال بزرگ کو دیکھا جس کی داڑھی اس کی ناف تک پہنچ رہی تھی۔ قریب جا کر اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا "قبلہ کیا آپ کا پورا بستر کھو گیا ہے؟" سو بسوں کے معاملے میں کراچی والے صرف ایک چادر سے محروم ہوئے ہیں۔ مگر بے چارے اہلِ لاہور تو اپنا اوڑھنا بچھونا سب کچھ کھوئے پھرتے ہیں۔

آج ہی صبح کا واقعہ ہے۔ وہ صبح جس کے بارے میں حضرت جوش نے کہا ہے ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

بس اتنا سا فرق ہے کہ یہ صبح، جولائی کے سورج کی دھوپ میں نہا کر نکلی تھی۔ ہم پون گھنٹے تک ایک بس شاپ پر کھڑے دل ہی دل میں کاتبِ تقدیر کے سامنے ایک مکالمہ بولتے رہے۔ جب یکایک بس ہمارے سامنے آ کر رکی۔ ہم نے دیکھا بس میں جتنے آدمی بیٹھے ہیں اس سے زیادہ کھڑے ہیں اور یوں ٹھنس کر کھڑے ہیں کہ اگر دروازے کے پاس کسی مسافر کے چیونٹی کاٹے تو چبھن بس کے آخری سرے پہ کھڑا ہوا مسافر محسوس کرے۔ غرض پوری بس کے مسافر یک جان و ایک سو کے قریب قالب ہو رہے ہیں۔

ناگاہ بس کا دروازہ کھلا جیسے علی بابا والی انگریزی فلموں میں "کھل جا سم سم" کہنے پر غار کے دہانے پہ رکھی ہوئی چٹانیں کڑکڑاتی ہوئی ہٹتی ہیں۔ پھر بس میں سے ایک مسافر اترا، اترا کیا، برآمد کیا ہوا ٹپک پڑا اور پکارا "پانی" ہم لپکے اور قریب کے ایک ہوٹل سے پانی لے آئے۔ اس کے چہرے پر چھڑکا، اس کے منہ میں ٹپکایا اور اس سے "مزاج شریف" پوچھے۔ بولا "نانی" ہم اس "شارٹ ہینڈ" بولی کو نہ سمجھ سکے۔ مگر قریب ہی کھڑے ہوئے ایک آدمی نے وضاحت کر دی "بے چارے کو نانی یاد آ رہی ہے" سب نے ہمدردی سے نیم بیہوش مسافر کی طرف دیکھا تو وہ نہایت نحیف آواز میں بولا "فانی" اسی شخص نے اس لفظ کی ترجمانی کی "یعنی جب انسان اومنی بس پر سوار ہوتا ہے تو اس کے سامنے انسان کی فنا کا نقشہ کھنچ جاتا ہے" پھر کسی نے نیم دراز مسافر سے پوچھا "کہاں سے چلے تھے آپ؟" مسافر بولا "تھانی" اس لفظ کی شرح یوں کی گئی "کسی پولیس چوکی سے چلے ہیں۔ پولیس اسٹیشن تھانہ ہوتا ہے تو پولیس چوکی تھانی ہوئی" مگر پھر کسی کی آواز آئی۔ "بھائیو! اسے ہسپتال لے چلو۔ مجھے یقین ہے کہ اسے "بس سٹروک" ہو گیا ہے۔"

(روزنامہ امروز۔ لاہور)

آنکھیں میری باقی اُن کا

جو لوگ پرانے لاہور سے آشنا ہیں انہیں یاد ہوگا کہ یہاں فقیروں کی ٹولیاں پو پھٹنے سے پہلے نظر آتی تھیں یا جمعرات کو فجر کی نماز سے دس بجے دن تک — کبھی کبھار کوئی فقیر رات کو بھی آواز دیتا گزر جاتا تھا۔ ہندو فقیر منگل اور سنیچر کو گلیوں میں صدا دیتے۔ مسلمان فقیر جمعرات اور جمعہ کو — صبح آنکھ کھلتی تو فقیروں کے دعائیہ فقرے کانوں میں پڑتے۔ رنگا رنگ دعائیں، چیدہ چیدہ جملے، منتخبہ مصرعے نعتوں کے بول، حمد کے الفاظ، اللہ و رسولؐ کی صفات، غرض دعاؤں کی پھلواری لگی ہوتی — ایک طرف سے آواز آتی ”اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا!“ دوسری سمت سے بول گونجتا ”آنکھیں بڑی نعمت ہیں بابا“ — ایک فقیر پکارتا ہوا نکل جاتا ”میرے مولا بلالو مدینے مجھے“ دوسری طرف سے کانوں میں قند گھل جاتی ”کس شان کی سرکار ہے سرکارِ محمدؐ“

پھر یہ فقیر — چہرے مہرے سے فقیر نظر آتے، ان کے لب و لہجے اور ظاہر و باطن سے پتہ چلتا کہ مانگتے اور دن کاٹتے ہیں —

آج فقیروں کا وہ شیرازہ ہی منتشر ہو چکا ہے۔ نہ ان کی آوازیں نہ ان کے چہرے اور نہ وہ دعائیہ اسلوب، زمانہ کے ساتھ گداگری نے بھی ترقی کی ہے — مطلب ہے صبح کو پھیری لگانے والے فقیر روز بروز گھٹتے گئے۔ خال خال رہ گئے جو گور کنارے ہیں — انھوں نے اپنے لیے خاص خاص گلیاں اور خاص خاص مکان چن رکھے ہیں۔ وہاں صدا دیتے اور خیرات لے کر چلے جاتے ہیں — ان کی جگہ عجیب و غریب فقیروں نے لے لی ہے۔ آپ ایکا ایکی اپنے مخاطب کے فقیرانہ سوال سے ششدر رہ جائیں گے۔ الٰہ العالمین کس سے واسطہ پڑا ہے فقیر ہے یا دوست — کبھی کبھار مخاطب کے سوال کی ترتیب سے مغالطہ ہونے لگتا ہے کہ شاید آپ کسی دوست یا عزیز سے ہم کلام ہیں۔ وہ آپ سے اپنی بپتا کہہ رہا ہے اور آپ مجبور ہیں کہ اس کا ہاتھ بٹائیں۔

مثلاً آپ تنہا چلے جا رہے ہیں — سامنے سے یا عقب سے آواز آئے گی — ”السلام علیکم“ آپ نظریں اٹھا کر یا پلٹ کر دیکھیں گے — وعلیکم السلام — فرمائیے مزاج شریف — جی ہی جی میں آپ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ آپ اس ”اجنبی“ چہرے کو بھولتے کیوں ہیں —

سوال ہوگا — بھائی جان سخت مصیبت میں مبتلا ہوں، روزگار نہیں ملتا۔ گھر میں بیوی بچے بھوکے پڑے ہیں۔ سفید پوش ہوں۔ ہر

شخص کے سامنے ہاتھ پھیلاتے سے طبیعت گھبراتی ہے۔ آپ سے التجا کر رہا ہوں، کچھ اعانت کیجیے۔ ایک وقت کی روٹی مل جائے تو کرم ہوگا۔

آگے بڑھیے تو ایک اور راہ گیر سے مڈبھیڑ ہوگی۔ کوٹ پتلون میں ٹائی لگائے ہوئے۔ آپ سے تخلیہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں — فرمائیے — جی ذرا سڑک سے ہٹ کر، ہاں بھائی کہو، کیا بات ہے؟ — گھر بار مشرقی پنجاب میں لوٹا گیا۔ ماں باپ وہیں قتل ہوگئے — بہنوں کو آنکھوں کے سامنے ظالم لوگوں نے اڑنچھو کر لیا — میں کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچا۔ بہتیری کوشش کی کوئی چیز الاٹ ہو جائے مگر شنوائی نہ ہوئی وہاں سے برباد ہو کر آیا تھا — یہاں بھی برباد ہو رہا ہوں، دنوں فاقے میں کٹ جاتے ہیں کبھی کوئی چہرہ جس سے شرافت مترشح ہو سامنے آجائے تو سوال کرتا ہوں۔ آپ کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ آپ سخی ہیں — بس دو چار روپے کا سوال ہے، دو چار دن گزر جائیں گے — اس قسم کا فقیر دونّی لے کر بھی ٹل جاتا ہے۔

مال روڈ کے قہوہ خانوں سے باہر — کوئی دس برس سے ایک لانبے قد کا فقیر کاندھوں پر بچہ اٹھائے مانگتا نظر آتا ہے۔ وہ گویا کل ہی حصار سے آیا ہے۔ آواز میں انتہائی لجاجت، بابوجی دو دن سے بچے بھوکے ہیں۔ ہم ریفیوجی ہیں، براہِ خدا مدد کیجیے — خدا آپ کو بہت دے گا — اللہ آپ کو چاند سا بیٹا دے گا، میرے بیٹے پر رحم کیجیے — چھوٹے چھوٹے بچے ہیں — اور یہ صدا مسلسل کانوں میں پڑتی چلی جاتی ہے۔

آپ گھر میں بیٹھے ہیں۔ ایک متشرع قسم کے بزرگ تشریف لاتے ہیں — سلام علیکم — کہو بھائی، میاں، بیٹے، اچھے ہو۔ یہ آغا صاحب کا مکان ہے، جی ہاں فرمائیے۔ مجھے آغا صاحب سے ملنا ہے — میں بول رہا ہوں۔ مجھے انہی سے ملنا ہے — حضور میرا نام ہی...... ہے، آپ ہیں؟ معاف کیجیے پہچانا نہیں، وقت کے ساتھ نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔

خوش رہو بیٹے — عمر نے تھکا دیا ہے، نوکری کے قابل نہیں رہا۔ بڑا لڑکا قضائے الٰہی سے فوت ہوگیا۔ فلاں محکمے میں اڑھائی سو روپے ماہوار پر ملازم تھا — چھوٹا بیٹا بی۔ اے۔ میں پڑھتا ہے۔ اس کے داخلے کا سوال ہے، آپ کی تعریف سنی، پھر خیال آیا کہ آپ کے والد مرحوم سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ ہمیشہ عزت و احترام سے ملتے — بڑے نیک انسان تھے، کبھی نماز قضا نہیں کی، پابندِ صوم و صلوٰۃ، باغ و بہار — سوچ سوچ کر تمہارے ہاں چلا آیا ہوں، فرض نہ سمجھو، بھائی کی مدد خیال کرو، میری ڈاڑھی کی طرف دیکھو — جو جی چاہے کہہ لو۔ صرف بچے کے داخلے کے لیے کل ستر روپے کا سوال ہے — اگر بچہ نیک رہا تو قرض اتار دے گا — ورنہ میں تو قبر میں تمہارا یہ احسان ساتھ لے جاؤں گا اور ہاں — قیامت کے دن اس نیکی کا اعتراف کروں گا —!!

اب آپ ہی فرمائیے، ایک ایسا شخص جو اس سے پہلے کبھی آپ سے نہیں ملا — آپ کے والد مرحوم کا دوست بنتا اور ملنے کے ساتھ سوال کرتا ہے — یہ جان لینے کے باوجود کہ گداگر ہے، آپ کے لیے اس کے سوال کی سطح کتنی بلند اور آپ کے جواب کا لہجہ کتنا مختلف ہو جاتا ہے۔

مزید برآں فقیروں کا ایک اور گروہ بھی عام ہوگیا ہے — بعض دعا دینے اور صدا لگانے والے فقیر روپوش ہوگئے ہیں۔ ان کی جگہ گونگے فقیروں نے لے لی ہے۔ کئی فقیر خود زخم کر لیتے ہیں اور اسے پھیلانے کے بعد راہگیروں کو متاثر کرتے ہیں —

اس قسم کے فقیر لاہور میں زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اچانک ایک فقیر آ ٹپکے گا۔ منہ سے رال اور بدن کے لباس سے بدبو آ رہی

ہوگی۔ آپ مجبور ہوں گے کہ جو کچھ کھا رہے ہیں وہ چھوڑ کر بھاگ جائیں یا پھر اسے بھی کچھ دیں ——— اور رخصت کریں ——

گداگری کی ایک اور قسم راہ پا رہی ہے اور وہ بچوں اور عورتوں میں ہے۔ ہاتھ میں کچھ کنگھیاں اور سوئیاں لے کر ریستورانوں کے باہر کھڑے ہیں —— بابوجی، کنگھا لے لو، سوئیوں کا پتہ خرید لو۔ وغیرہ، آپ انکار کریں، ضرورت نہیں۔ اصرار ہوگا کہ بھوکے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، بھائی ہیں —— ضرور لیجیے، دو آنے قیمت ہے —— آپ ٹکا یا آنہ دے کر چھٹکارا حاصل کرنا چاہیں تو ادھر سے انکار ہوگا۔ جی نہیں میں فقیر نہیں، معاف کیجیے —— آپ انکار کر کے آگے بڑھ جائیے —— آواز آئے گی ——

”اچھا بابوجی ٹکا یا آنہ ہی دے دیجیے۔ کیا کریں صبح سے ایک پیسہ نہیں کمایا۔ بھائیوں کے لیے چنے ہی لے جاؤں گا۔ بوڑھی ماں فاقے سے بیٹھی ہوگی“ وغیرہ۔

غرض پرانے فقیر ختم ہو گئے۔ ان کی جگہ نئے فقیروں نے لے لی، جو اپنی صفات کے اعتبار سے ایک موزوں نام کے مستحق ہیں۔ بات یہاں تک نہیں رکتی۔ فقیروں کی ان ٹولیوں میں اب برقعہ پوش عورتوں کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ کچھ سال تو برقعہ سفید رہا۔ اور سوالات بھی سیدھے سادے ہوتے تھے۔ مہاجر ہوں، مرد کٹ مرے، میں چھوٹے چھوٹے بچے لے کر زندہ نکل آئی ہوں۔ خدا کے لیے مدد کیجیے —— اللہ آپ کو دوگنا دے گا —— آپ کے لیے بھائی جان کا کلمہ خطابیہ پُر انداز ہونے کے لیے کافی تھا ——

پھر ان گداگر عورتوں نے دفتروں کا رخ کرنا شروع کیا —— پہلے دفتر کے مالک کا نام اور پتہ معلوم کرتیں۔ تب ملاقات کا حیلہ کرتیں۔ چق اٹھائی اور سیدھے دفتر میں آگھسیں۔ شوہر بیمار ہے۔ بچے خورد سال ہیں۔ دوائی کے لیے پیسہ نہیں، دو دن سے فاقہ ہے، مدد کیجیے —— آپ اٹھنی دیں تو جواب ملے گا، بھائی جان میں گداگر نہیں، صرف بُرے وقت نے مجبور کیا ہے کہ آپ سے سوال کرنے چلی آئی ہوں —— اڑھائی روپے کا تو راشن آتا ہے یہ دیکھ لیجیے میرے پاس راشن کارڈ ہے —— اور چھ روپے کے یہ انجکشن چاہئیں۔ عرض کر چکی ہوں کہ خاوند کئی ماہ سے بیمار پڑا ہے۔ پہلے بازار میں چھابڑی لگا کر دو وقت کی روٹی نکال لیتا تھا، اب وہ کھونٹا ہی اکھڑ گیا ہے۔

فرمائیے آپ کیا جواب دیں گے ——

کچھ دنوں سے کالے برقعوں نے بھی رنگ باندھا ہے۔ یعنی اکثر بھکارنیں کالے برقعے میں آنے لگی ہیں —— راگنی سب کی ایک سی ہوتی ہے۔ شوہر مر گیا ہے، چھوٹے چھوٹے بچے رہ گئے ہیں —— خاوند بیمار ہے، لاچار ہوں۔ دوائی کے لیے پیسے نہیں، کچھ اعانت کیجیے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ لاہور)

حرف و حکایت

مجید لاہوری

— یہ دور

— یہ دور "سلطانیٔ جمہور" کا ان معنوں میں نہیں ہے کہ ہم ہر اُس "نقشِ کہن" کو جو ہمیں نظر آتا ہے، مٹا سکیں۔ لیکن یہ "جمہوری تقاضوں" کا دور ہے اور ہم لوگ مداری کے "بچہ جمورا" کی طرح "بچہ جمورا" بن گئے ہیں۔ ہر بات جمہوری تقاضوں کے لیے ہوتی ہے، ہر آدمی کی آواز "پبلک آواز" ہے۔

"اگر ہم کسی جماعت سے نکلتے ہیں تو — جمہوری تقاضوں کے لیے۔

ایک نئی جماعت بناتے ہیں تو — جمہوری تقاضوں کے لیے۔

جب نئی جماعت نہیں چلتی تو پھر اسی جماعت میں آتے ہیں جس کو ہم کل تک بُرا بھلا کہہ رہے تھے — تو جمہوری تقاضوں کے لیے۔

جماعت کی نئے سرے سے تنظیم کرتے ہیں — تو جمہوری تقاضوں کے لیے۔

انگریز کے دور کو تو ہم خلافِ جمہوریت کہتے تھے اور اس کے ہر عمل کو ظلم و تشدد قرار دیتے تھے، مگر آج کے دور میں:۔

دفعہ ۱۴۴ لگتی ہے تو — جمہوری تقاضوں کے لیے
گولی چلتی ہے تو — جمہوری تقاضوں کے لیے
لاٹھی چارج ہوتا ہے تو — جمہوری تقاضوں کے لیے
سیفٹی ایکٹ لگتا ہے تو — جمہوری تقاضوں کے لیے
مارشل لاء لگتا ہے تو — جمہوری تقاضوں کے لیے

دوسری طرف ان تمام اقدامات کی مخالفت اور شہری آزادی کی حمایت ہوتی ہے تو — جمہوری تقاضوں کے لیے۔

غرض یہ ہے کہ —

ہمارا چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، اوڑھنا بچھونا سب جمہوری تقاضوں کے لیے۔

دسری جمہور کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جمہور کم اور منظور زیادہ ہے۔ اور اب تو ہر جلسہ ایک ڈرامہ ہے جس کا نام ہے:۔

"جمہور عرف منظور"

کراچی کا ”آرام باغ“ اور ”جہانگیر پارک“ ”منظور باغ اور ”منظور پارک“ ہے۔

لاہور کا موچی دروازہ — ”منظور دروازہ“ ہے۔

پشاور کا ”چوک یادگار“ — ”چوک منظور“ ہے۔

راولپنڈی کا کمپنی باغ — ”منظور باغ“ ہے۔

غرضیکہ ہر شہر کا وہ مقام جہاں عموماً جلسے ہوتے ہیں، جلسہ گاہ نہیں بلکہ ”منظور گاہ“ ہے۔ وہاں سے کوئی کبھی مایوس ہو کر نہیں آیا، جو قرارداد پیش کیجیے، لوگ کہتے ہیں :۔

”منظور ہے“!

”منظور ہے“!

آپ ہر شہر میں دو جلسوں کا انتظام کیجیے، ایک جلسہ میں یہ قرارداد پیش کیجیے کہ :۔

”اس ملک میں صحیح معنوں میں جمہوری نظام قائم ہونا چاہیئے —“

اور اس کی حمایت میں تقریریں کرائیے کہ ڈکٹیٹرشپ تباہی کی طرف لے جاتی ہے، اس سے عوام کی بھلائی نہیں ہوتی، اقتدار جن لوگوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے وہ مزے کرتے ہیں، عوام بھوکوں مرتے ہیں، جاگیرداری، سرمایہ داری ختم کرو اور زمین، صنعت اور دوسری چیزوں کو قومی ملکیت بناؤ۔ وغیرہ۔

آپ یقین کیجیے لوگ قرارداد سے اتفاق کریں گے اور جب صدر کہے گا

”منظور ہے؟“

ہر طرف سے آوازیں آئیں گی :۔

”منظور ہے“!

”منظور ہے“!

دوسرا جلسہ آپ ڈکٹیٹرشپ کی حمایت میں کیجیے اور اس میں یہ قرارداد پیش کیجیے :۔

”اس ملک میں ڈکٹیٹرشپ قائم ہونی چاہیئے، کیونکہ ہم ابھی جمہوری نظام کے اہل نہیں ہیں۔“

اور اس قرارداد کی حمایت میں بھی تقریریں کرائیے کہ تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ ہم جمہوریت کے اہل نہیں ہیں۔ ہمارے معدے صدیوں کی غلامی کے سبب جمہوریت ایسی ثقیل چیز کو ہضم نہیں کر سکے۔ ہمیں اپنے فرائض کا احساس نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے مفاد کے لیے قوم کو تباہ کرنے کے لیے تلا ہوا ہے۔ یہ چور بازاری، یہ اسمگلنگ، یہ رشوت ستانی، یہ ذخیرہ اندوزی، یہ ناجائز منافع خوری سب اس وجہ سے چل رہی ہیں کہ کوئی مضبوط ہاتھ اس کو روکنے کے لیے نہیں ہے۔ جو لوگ ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اگر ان کے خلاف کارروائی ہوتی ہے تو سفارشیں پہنچ جاتی ہیں۔ چونکہ حکومت کرنے والے ان لوگوں سے ووٹ لیتے ہیں، اس لیے ان کو ناخوش کرنا نہیں چاہتے۔ لاہور میں مارشل لا کے دنوں میں سب چیزیں ٹھیک ہو گئی تھیں۔ یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا۔ مہنگائی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد آپ یہ کہیے کہ ٹرک

میں اتاترک مصطفیٰ کمال جیسا آدمی پیدا ہوا جس نے چند دن میں اس "مردِ بیمار" کو زندہ کر دیا۔ سب "ڈکٹیٹر شپ" کی برکت تھی۔ ہٹلر نے اپنی قوم کو زندہ کیا، اسٹالن اپنے ملک کا عوامی ڈکٹیٹر تھا، اس نے روس کو زندہ کر دیا۔

پھر صدرِ جلسہ اعلان کریں :۔

"بھائیو! یہ قرارداد آپ کو منظور ہے ؟"

اس پر ہر طرف سے آوازیں آئیں گی :۔

"منظور ہے"

"منظور ہے"

صدرِ جلسہ اگر کہیں گے :۔

"کوئی صاحب اگر اس کے خلاف ہوں تو ہاتھ کھڑا کر دیں"

یقین کیجیے کہ ایک ہاتھ بھی اس کے خلاف نہیں اٹھے گا۔ شاید اس ڈر سے کہ جب سب لوگ "منظور ہے" کہہ رہے ہیں تو اختلاف کرنے سے کہیں بھرے جلسے میں پٹائی نہ ہو جائے۔ ہاں تو جب جمہور کی کیفیت یہ ہو کہ وہ ہر رہبر کے ساتھ تھوڑی دور چلے اور رہبر کو نہ پہچانے تو پھر جمہوری تقاضوں کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے وہ سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی کی زبان میں ــ "سب چلے گا"!

کیوں ؟

اس لیے کہ ــ نہ کوئی روکنے والا ہے

نہ کوئی ٹوکنے والا ہے

جمہوری تقاضے ـــ زندہ باد !

(ہفت روزہ۔ نمکدان۔ کراچی)

اُردو ادیبوں کے دلچسپ لطائف

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مشاہیر ادب اردو کے بعض نہایت دلچسپ و پُر لطف لطائف و ظرائف متعلقہ سوانح عمریوں اور ادبی تاریخوں میں اس کثرت کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں کہ اگر ان کو تلاش کر کے ایک جگہ جمع کیا جائے تو یقیناً ایک خاصی ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ مگر اتنی فرصت کس کے پاس رکھی ہے۔ جو کچھ سامنے آیا بغیر کسی ترتیب کے ہدیہ ناظرین کر رہا ہوں۔ اس مختصر مجموعہ لطائف میں طنز کے نہایت لطیف نشتر بھی ہیں اور پاکیزہ مزاح کے بہترین نمونے بھی ان کے مطالعہ سے جہاں قارئین کرام کو ادبی حظ حاصل ہوگا وہاں ظرافت و تمسخر کا فرق بھی معلوم ہو جائے گا !

سرسیّد احمد خاں

جب سرسیّد احمد خاں نے اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک شروع کی اور جدید تقاضوں کے مطابق قرآنِ کریم کی تفسیر لکھی تو ان کے خلاف سخت طوفان برپا ہوا۔ اور انہیں کافر، ملحد، بے دین، زندیق اور نیچری وغیرہ خطاب دیئے گئے۔ ان کے مددگاروں اور معاونوں کا بھی برا حال کیا گیا۔ مولانا حالیؔ کے مقابلہ میں خالیؔ۔ خیالیؔ اور ڈنالیؔ جیسے حریف اکھاڑے میں اتارے گئے۔ مسدسِ حالیؔ کے جواب میں مسدس خیالی وغیرہ کتابیں لکھی گئیں۔ مولوی نذیر احمد کو "نیچری بھانڈ" کا خطاب مرحمت فرمایا گیا۔ مکہ اور مدینہ تک سے سرسید اور ان کے رفقاء کے لیے کفر کے فتوے بڑی کوشش و کاوش سے منگوائے گئے اور سارے ہندوستان میں شائع کیے گئے۔ انہی علمائے کرام میں سے ایک بزرگ مولوی علی بخش صدر الصدور گورکھپوری بھی تھے جنہوں نے محض سرسیّد کے خلاف علمائے دین سے فتویٰ لانے کے لیے سفرِ حج کا قصد فرمایا۔ جب فتویٰ لے کر واپس آئے تو سرسیّد نے ان کے متعلق لکھا۔

"مولوی علی بخش ہماری تکفیر کا فتویٰ لینے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ چنانچہ ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا۔ سبحان اللہ! ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی، کسی کو ہاجی، کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بنا دیتا ہے —

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

ایک مرتبہ چندہ جمع کرنے کے لیے سرسید پنجاب آئے تو ایک جلسہ میں ان کا تعارف حاضرین جلسہ سے کراتے ہوئے پنجاب کے ایک مشہور سرکار پرست اور خطاب یافتہ رئیس نے فرمایا — "یہ صاحب جن کا نام سرسیّد ہے اور جو اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں مسلمانوں

کی قومی کشتی کے ناکتخدا ہیں۔"

اس پہ "ناکتخدا" کے لفظ پر ساری محفل ہنسنے لگی اور سرسید بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ (بے چارے نے بدحواسی میں بجائے "ناخدائے" "ناکتخدا" کا لفظ استعمال کیا)۔

اس مرتبہ سرسید، مولانا شبلی اور سید ممتاز علی ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سرسید کا ایک بہت ضروری کاغذ گم ہو گیا تھا۔ اسے بے حد تلاش کر رہے تھے مگر ملتا نہ تھا۔ اتفاقاً مولانا شبلی کو وہ کاغذ الگ پڑا ہوا مل گیا۔ انھوں نے مزاحاً اس کاغذ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا کہ سید کو دق کیا جائے مگر سرسید بھانپ گئے کہ کاغذ شبلی دبائے بیٹھے ہیں۔ اس پر انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ جو چیز گم ہو جاتی ہے شیطان اسے اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ حضرت مولانا! ذرا دیکھیے کہیں میرا کاغذ آپ کے ہاتھ کے نیچے تو نہیں؟"

ایک دفعہ ایک شخص نے سرسید کو خط لکھا کہ اگر نماز میں بجائے عربی عبارتوں کے ان کا اردو ترجمہ پڑھ لیا جایا کرے تو کوئی حرج اور نقصان تو نہیں؟ سرسید نے جواب دیا "ہرگز کوئی حرج اور نقصان نہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ نماز نہیں ہوگی۔"

ایک شخص نے سرسید کو خط لکھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ تعریف کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ:۔ "ان کی ساری عمر قوم کی خیرخواہی اور بھلائی میں گزری۔" جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بزرگ آپ ہی ہیں۔ پس میری مشکل اگر حل ہوگی تو آپ ہی سے ہوگی۔" سرسید نے اسے جواب لکھا کہ "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جس کو آپ نے خواب میں دیکھا تھا وہ غالباً شیطان تھا۔"

ایک مولوی صاحب نے سرسید کو خط لکھا کہ میں معاش کی طرف سے بہت تنگ ہوں۔ عربی جانتا ہوں، انگریزی سے ناواقف ہوں۔ سی ریاست میں میری سفارش کر دیں۔ سرسید نے جواب دیا کہ "سفارش کی میری عادت نہیں اور معاش کی تنگی کا آسان حل یہ ہے کہ میری تفسیر قرآن کا رد لکھ کر آپ چھپوائیں۔ کتاب خوب بکے گی اور آپ کی تنگی دور ہو جائے گی۔"

دلّی میں ایک بہت مشہور طوائف رہتی تھی جس کا نام "شیریں" تھا مگر اس کی ماں بہت بیڈول اور بُری شکل کی تھی۔ ایک لس میں یہ "شیریں" اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لیے آئی۔ سرسید بھی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اور ان کے برابر ان کے ایک ایرانی ست بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ شیریں کی ماں کو دیکھ کر کہنے لگے۔ "مادرش بسیار تلخ است۔" اس پہ سرسید نے فوراً جواب دیا:۔

"گرچہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔"

نواب محسن الملک

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک سالانہ جلسہ میں مولوی رضی الدین بسمل نے ایک بڑی درد انگیز قومی نظم حاضرین جلسہ کو سنائی ے سن کر ہر آنکھ پُرنم ہو گئی۔ نظم کے خاتمے پر نواب محسن الملک نے اٹھ کر کہا "مولوی رضی الدین صاحب نے اپنا تخلص تو بسمل رکھا ہ مگر نظم ایسی سنائی کہ دوسروں کو بسمل کر دیا۔"

اپنے ایک لیکچر میں نواب محسن الملک نے یہ لطیفہ سنایا "اب سے پچاس برس پہلے ایسا زمانہ تھا کہ جو مولوی اور حافظ ہوتے وہی منصف اور جج بنائے جاتے تھے۔ گویا یہ عہدے صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص تھے۔ ۴۸۹۱ء میں ایک صاحب منشی بھولا ناتھ

اتفاق سے منصف مقرر ہو گئے۔ چونکہ عام طور پر یہ عہدہ مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص ہو گیا تھا اس لیے تمام روبکاروں پر ان کے نام کے ساتھ مولوی حافظ خان بہادر لکھنے کا عام دستور تھا۔ چنانچہ جب منشی بھولا ناتھ منصف مقرر ہوئے تو سر رشتہ دار نے حسبِ عادت ان کے ساتھ بھی لکھا "روبکار از دفتر خان بہادر مولوی حافظ منشی بھولا ناتھ صاحب" منشی صاحب نے روبکار دیکھی تو جھلا کر سر رشتہ دار سے کہا "کم بخت تو نے مجھے مسلمان بنا دیا" سر رشتہ دار کیوں چوکتا۔ فوراً دست بستہ کہنے لگا "حضور منصف جو ہو گئے اس لیے آپ کے نام کے ساتھ اور کیا لکھتا؟"

مولانا ذکاء اللہ

خان بہادر شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ وقت کے بڑے پابند تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ دن کے ٹھیک ۹ بجے اپنے گھر سے نکل کر کہیں جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب دہلی کے کوچہ چیلاں میں رہتے تھے۔ ایک دن جو باہر نکلے تو سر سید کے لڑکے سید محمود اپنی گھڑی لیے اپنے مکان کے آگے ٹہل رہے تھے۔ مولانا ذکاء اللہ نے پوچھا "میاں یہاں کیوں ٹہل رہے ہو؟" سید محمود نے جواب دیا "جی میں اپنی گھڑی کو کوک دینی بھول گیا، اس لیے وہ بند ہو گئی۔ میں اب آپ کے انتظار میں ٹہل رہا تھا کہ اپنی گھڑی کا وقت درست کر لوں۔"

مولانا حالی

سر سید کے گروہ میں مولانا حالی بہت ہی سنجیدہ بزرگ تھے۔ مگر انہوں نے بھی ہمارے لیے خاصا سامانِ تفریح چھوڑا ہے۔

مولانا نے ۱۹۰۷ء میں ایک ال نامہ لکھ کر اپنے ایک دوست کو بھیجا۔ غور سے پڑھیے اس ال نامہ میں کتنا لطیف طنز ہے۔

المذہب :۔ اعلانِ جنگ
العلم :۔ قسمے از جہلِ مرکب
الیونیورسٹی :۔ کارخانہ کلرک سازی
الانجمن ہائے اسلامیہ :۔ سبزۂ برشگال
الامیر :۔ آنکہ تہی دست و قرضدار باشد
الواعظ :۔ آنکہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند۔

الدین :۔ تقلیدِ آباؤ اجداد
الامتحان :۔ آزمائش لیاقتِ ممتحنان
الکمیشن :۔ وجہ موجہ برائے فیصلہ یک طرفہ
الرئیس :۔ آنکہ از ریاست بے خبر باشد
المولوی :۔ آنکہ جمیع مسلمانان را از دائرۂ اسلام خارج می کند

غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کی بات ہے کہ مولوی محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے وکیل میرٹھ نے مولانا کو اپنی شادی میں پانی پت سے بلایا۔ شادی کے بعد مولانا حالی اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور بعض دوسرے بزرگ بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے مسکراتے ہوئے مولوی محمد یحییٰ تنہا سے کہا "اب آپ اپنا تخلص بدل دیں کیونکہ اب آپ تنہا نہیں رہے۔" اس پر مولانا حالی نے فرمایا کہ "نہیں مولوی صاحب! یہ بات نہیں۔ تن ہا تو یہ ابھی ہوئے ہیں۔" اس پر تمام مجلس مولانا حالی کی جودتِ طبع پر حیران رہ گئی۔

ایک مرتبہ مولانا حالی سہارن پور تشریف لے گئے اور وہاں ایک معزز رئیس کے پاس ٹھہرے جو بڑے زمیندار بھی تھے۔

گرمی کے دن تھے اور مولانا کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اسی وقت اتفاق سے ایک کسان آ گیا۔ رئیس صاحب نے اس سے کہا کہ "یہ بزرگ جو آرام کر رہے ہیں ان کو پنکھا جھل"۔ وہ بے چارہ پنکھا جھلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چپکے سے رئیس صاحب سے پوچھا کہ "یہ بزرگ جو پلنگ پر سو رہے ہیں کون ہیں؟ میں نے ان کو پہلی مرتبہ یہاں دیکھا ہے۔" رئیس نے جواب دیا۔ "کم بخت! تو ان بزرگ کو نہیں جانتا حالانکہ سارے ہندوستان میں ان کا شہرہ ہو رہا ہے۔ یہ مولوی حالی ہیں۔" اس پر غریب کسان نے بڑے تعجب سے کہا "جی کبھی ہالی بھی مولوی ہوئے ہیں؟" (وہ کسان حالی کو ہالی سمجھا جس کے معنی ہل چلانے والے کے ہیں)۔

مولانا لیٹے تھے، سو نہیں رہے تھے۔ کسان کا یہ فقرہ سن کر پھڑک اٹھے فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے اور رئیس صاحب سے فرمانے لگے "حضرت! اس تخلص کی داد آج ملی ہے۔"

مولانا حالی کے مقامی دوستوں میں مولوی وحید الدین سلیم (لٹریری اسسٹنٹ سر سید احمد خاں) تھے۔ جب یہ پانی پت میں ہوتے تو روزانہ مولانا حالی کے پاس جا کر گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز صبح ہی صبح پہنچے۔ مولانا نے رات کو کوئی غزل کہی تھی وہ ان کو سنائی۔ سلیم سن کر پھڑک اٹھے اور کہنے لگے "مولانا! واللہ جادو ہے۔" مولانا کے بالاخانے کے نیچے ایک کوٹھڑی تھی۔ وہ مولانا نے ایک مجذوب فقیر کو رہنے کے لیے دے رکھی تھی۔ وہ مجذوب باہر گلی میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ جب اس کے کان میں یہ فقرہ پڑا تو بے اختیار چلا اٹھا "جادو برحق کرنے والا کافر۔" مولانا نے مسکرا کر سلیم صاحب سے کہا۔ "لیجیے مولوی صاحب سرٹیفکیٹ مل گیا۔"

مولوی وحید الدین سلیم

ایک مرتبہ حسبِ معمول سلیم مولانا حالی کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور مولانا سے پوچھنے لگا "حضرت! میں نے غصے میں آ کر اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ 'تجھ پہ تین طلاق' لیکن بعد میں مجھے اپنے کیے پہ افسوس ہوا۔ میری بیوی بھی راضی ہے مگر مولوی کہتے ہیں کہ طلاق پڑ گئی۔ اب صلح کی کوئی شکل نہیں۔ خدا کے لیے میری مشکل آسان فرمائیں اور کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میری میری بیوی گھر میں دوبارہ آباد ہو سکے۔

ابھی مولانا حالی کوئی جواب نہیں دینے پائے تھے کہ مولوی سلیم اس شخص سے کہنے لگے کہ "بھئی یہ بتا کہ تو نے طلاق ت سے دی تھی یا ط سے؟"

اس شخص نے کہا "جی میں ان پڑھ اور جاہل آدمی ہوں۔ مجھے کیا پتہ کہ ت سے کیسی طلاق ہوتی ہے اور ط سے کیسی ہوتی ہے؟"

سلیم نے اسے سمجھایا کہ میاں یہ بتاؤ کہ تم نے قرأت کے ساتھ کھینچ کر کہا تھا کہ "تجھ پر تین طلاق" جس میں ط کی آواز پوری نکلتی ہے یا معمولی طریقہ پر کہا تھا جس میں ط کی آواز نہیں نکلتی ت کی آواز نکلتی ہے۔

بے چارے غریب سوال کنندہ نے کہا "جی مولوی صاحب! میں نے معمولی طریقہ پہ کہا تھا، قرأت سے کھینچ کر نہیں کہا۔"

یہ سننے کے بعد مولوی سلیم صاحب نے پورے اطمینان کے ساتھ اس سے کہا "ہاں بس معلوم ہو گیا کہ تو نے ت سے

تلاق دی تھی۔ اور ت سے کبھی طلاق پڑ ہی نہیں سکتی۔ ت سے تلاق کے معنی ہیں "آ محبت کے ساتھ مل بیٹھیں"۔ تو بے فکر ہو کر اپنی بیوی کو گھر لے آ۔ اور اگر کوئی مولوی اعتراض کرے تو صاف کہہ دیجو کہ "میں نے تو ت سے تلاق دی تھی ط سے ہرگز نہیں دی۔"

غالب

جب مرزا غالب لکھنؤ گئے تو وہاں ایک روز لکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہونے لگی۔ ایک صاحب نے غالب سے کہا کہ جس موقع پر اہلِ دہلی "اپنے تئیں" بولتے ہیں وہاں اہل لکھنؤ "آپ کو" کہتے ہیں۔ آپ بتائیے کہ فصیح "آپ کو" ہے یا "اپنے تئیں"۔ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ اہلِ لکھنؤ بولتے ہیں۔ مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ "میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں" اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ تو سخت مشکل واقع ہوگی۔ میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے اپنی نسبت سمجھ جائیں۔

ایک مرتبہ غالب ایک قضیہ میں قید ہوگئے۔ جب قید سے رہا ہوکر آئے تو کالے صاحب ایک رئیس کے ہاں آکر فروکش ہوئے۔ کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارک باد دی۔ کہنے لگے "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں۔"

مرزا غالب کے پاس اکثر گمنام خطوط گالیوں سے بھرے ہوئے آیا کرتے تھے جن میں ان کی شاعری پر اعتراض کیے جاتے تھے اور اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ایک روز اسی قسم کا ایک خط آیا جس میں ان کو ماں کی گالی دی گئی تھی۔ پڑھ کر کہنے لگے "اس الو کو گالی دینی بھی نہیں آئی۔ بوڑھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں۔ تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں۔ کیونکہ اسے اپنی بیوی سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرم ساق جو ۷۲ برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ بے وقوف کون ہوگا؟"

ایک دفعہ رمضان کے بعد مرزا قلعہ میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا۔ کتنے روزے رکھے؟" عرض کیا "پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا۔"

ایک پُر لطف شعر و سخن کی محفل میں غالب بیٹھے ہوئے میر تقی میر کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق نے کہا۔ "میرے خیال میں تو سودا کو میر پر ترجیح ہے۔" اس پر غالب نے کہا "واہ شیخ صاحب، میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔"

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کریں تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھو تو بایزید کا۔"

حکیم رضی الدین خاں مرزا کے بڑے دوست تھے مگر ان کو آم بالکل نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر آئے اور برآمدے میں بیٹھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی میں سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ حکیم صاحب نے غالب سے کہا "دیکھیے آم ایسی چیز ہے کہ گدھا بھی نہیں کھاتا۔" غالب نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں گدھا نہیں کھاتا۔"

ایک روز مرزا کے نہایت عزیز شاگرد میر مہدی مجروح اپنے استاد کے پاس بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے کراہ رہے تھے۔ مجروح اٹھ کر مرزا کے پاؤں دبانے لگے۔ مرزا نے کہا "بھئی تو سیدزادہ ہے مجھے گنہگار مت کر۔" مگر مجروح نے نہ مانا اور کہنے لگے "اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پاؤں دبانے کی اجرت دے دیجیے گا۔" مرزا نے کہا "تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔"

جب میر صاحب پاؤں دبا چکے تو کہنے لگے "لائیے استاد! اجرت دیجیے۔" مرزا نے اس پر فوراً جواب دیا "بھیا اجرت کیسی! تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے دابے حساب برابر ہو گیا۔"

ایک رئیس سید سردار مغرب کے بعد مرزا سے ملنے آئے اور تھوڑی دیر ٹھیر کر واپس جانے لگے تو مرزا ہاتھ میں شمعدان لے کر بسبب پیری کھسکتے ہوئے لبِ فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ اس پر سید صاحب کہنے لگے "قبلہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی، میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔" مرزا نے کہا "میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا۔ اس لیے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔"

۱۲۷۷ھ میں غالب نے اپنے مرنے کی تاریخ کہی "غالب مرد" اس سے پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر نے کہا "حضرت ان شاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔" مرزا نے کہا "دیکھو صاحب! ایسی فال منہ سے نہ نکالو۔ اگر یہ مادہ بھی غلط نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔"

ایک دن طوطا پنجرہ میں سر نیچے کیے بیٹھا تھا۔ غالب نے دیکھا تو فرمانے لگے "میاں مٹھو! تمھارے نہ بیوی نہ بچے، تم اتنے غمگین کیوں بیٹھے ہو"؟

غالب کی بہن بیمار ہوئیں تو یہ بیمار پرسی کے لیے گئے اور پوچھنے لگے "کیا حال ہے"؟ وہ بولیں کہ "مرتی ہوں، قرض کی فکر ہے۔" آپ فرمانے لگے "بہن بھلا یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے۔ خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین (صدر الصدور دہلی) بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا دیں گے"؟

ذوق دہلوی

ایک دفعہ ذوق عالمِ محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا آتی اور بار بار ان کے سر پہ بیٹھ جاتی۔ یہ اڑاتے تو وہ پھر آ کر بیٹھ جاتی۔ آخر ذوق ہنس کر کہنے لگے "اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔" حافظ ویراں ایک شاعر بھی پاس بیٹھے تھے کہنے لگے "ہمارے سر پہ تو کبھی نہیں بیٹھتی۔" ذوق نے کہا "بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ ملا ہے۔ عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی احل لکم الصید کی آیت پڑھ کر کلوا واشربوا کی گردان کرتے ہوئے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر گردن پہ چھری رکھ دے گا۔ وہ دیوانی ہے جو تمھارے سر پہ آئے۔"

شیخ امام بخش ناسخ

ایک مرتبہ کوئی صاحب ناسخ سے ملنے آئے اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی چھڑی سے زمین پر پڑے ہوئے ایک ڈھیلے

کو توڑنے لگے۔ ناسخ نے فوراً نوکر کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس سے کہا کہ ایک ٹوکری مٹی کے ڈھیلوں کی بھر کر ان صاحب کے آگے رکھ دو۔ تاکہ اطمینان سے اپنا شوق پورا کریں۔

ان کے ایک شاگرد شاہ غلام اعظم افضل ایک دن آئے اور اسی سیتل پائی پر بیٹھ گئے جس پر استاد بیٹھے تھے۔ پھر سیتل پائی کا ایک تنکا توڑ کر چٹکی سے اس کو مروڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر ناسخ نے ملازم سے جھاڑو منگوائی اور افضل کے سامنے رکھ کر کہنے لگے "اس سے شوق فرمائیے"۔ میری سیتل پائی اس قابل نہیں کہ آپ اس پر مشقِ ستم کریں۔ وہ آپ کے تھوڑے سے التفات سے برباد ہو جائے گی۔"

ایک مرتبہ ایک صاحب ملنے آئے۔ ناسخ اس وقت فکرِ شعر میں بلے انتہا منہمک اور محو تھے۔ مگر وہ ایسے جم کر بیٹھے کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیا۔ یہ بڑے پریشان ہوئے۔ کبھی ٹہلنے لگتے، کبھی آن کر بیٹھ جاتے۔ مگر ان کو نہ اٹھنا تھا نہ اٹھے۔ آخر جب بے حد دق ہوئے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا تو حقہ کی چلم میں سے ایک چنگاری لے کر دالان میں کھڑی ہوئی پھونس کی ٹٹی میں رکھ دی۔ ٹٹی جلنی شروع ہوئی تو وہ صاحب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ناسخ نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگے آپ کو ہرگز نہیں جانے دوں گا۔ اب تو ہم دونوں کو یہیں جل کر مرنا ہے تم نے میرے مضمون کو خاک میں ملا دیا ہے۔ میرے دل کو جلا کر کباب کیا ہے، اب جاتے کہاں ہو۔ یہیں جل کر مرو۔

ایک شخص آکر بیٹھے تو بیٹھے ہی رہے اور فضول باتوں سے دماغ الگ چاٹ گئے۔ جب کسی صورت سے بھی ان صاحب نے اٹھنے کا نام نہ لیا تو ناسخ نے صندوقچہ میں سے مکان کا قبالہ نکال کر ان صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا اور ملازم سے کہا کہ جلدی سے جا کر چند مزدور لے آ۔ تاکہ گھر کا اسباب کسی اور جگہ لے جاؤں۔ مکان پر تو یہ صاحب قبضہ کر چکے۔ میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے، جلدی سے بھاگ کر مزدور لا۔ کہیں مکان کے ساتھ اسباب پر بھی یہ صاحب قبضہ نہ کر لیں۔

سید انشاء اللہ خاں انشاء

ایک دن انشاؔء نواب صاحب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور گرمی کی وجہ سے دستار سر سے اتار کر رکھ دی تھی۔ انشاء کا منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کو شرارت سوجھی۔ ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری جس پر انشاء نے جلدی سے دستار سر پر رکھ لی اور کہنے لگے کہ "سبحان اللہ! بچپن میں بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ جو لوگ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں شیطان ان کو دھولیں لگایا کرتا ہے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ بات سچ ہی تھی۔"

ایک دن دربار میں بعض خاندانی شرفاء کی شرافت اور نجابت کے تذکرے ہو رہے تھے۔ اتنے میں سعادت علی خاں نے کہا "کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں"۔ تقدیر کی مار یا شامتِ اعمال۔ بے اختیار انشاؔء کے منہ سے نکل گیا "حضور! بلکہ انجب" (انجب کے معنی نہایت درجہ شریف کے بھی ہیں اور لونڈی زادہ کے بھی۔ سعادت علی خاں لونڈی کے پیٹ سے تھے) یہ بھرپور طنز سن کر تمام دربار سناٹے میں آگیا اور نواب صاحب بھی دم بخود رہ گئے۔ فوراً ہی انشاؔء کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور بات کہی جا چکی تھی۔ آزاد لکھتے ہیں کہ یہی لطیفہ انشاؔء کے تنزل اور بالآخر ان کی تباہی کا باعث بنا۔

شیخ قلندر بخش جرأت اس دور کے مشہور شاعر تھے اور انشاؔء کے دوست تھے مگر نعمتِ بصارت سے محروم تھے۔ ایک روز انشاؔء کی ملاقات کو گئے۔ دیکھا کہ سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ انشاؔء نے پوچھا کہ "میاں کس فکر میں بیٹھے ہو؟" جرأت نے جواب دیا

"ایک مصرع خیال میں آیا ہے چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔" انہوں نے پوچھا "وہ مصرع کیا ہے؟" جرأت کہنے لگے "مصرع تو بڑا عمدہ ہے مگر جب تک دوسرا مصرع نہ بن جائے گا بتلاؤں گا نہیں۔ ورنہ تم مصرع لگا کر اسے چھین لو گے۔" جب انشاء نے بہت زیادہ اصرار کیا تو آخر جرأت نے مجبور ہو کر یہ مصرع ان کو سنایا ع

اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی

اس پر سید انشاء کی رگِ ظرافت پھڑکی اور انہوں نے فوراً کہا ع

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

چونکہ جرأت نابینا تھے اس لیے یہ پھبتی ان پر چسپاں ہو کر رہ گئی۔ انہیں بڑا غصہ آیا اور وہ لاٹھی لے کر انشاء کو مارنے اٹھے انشاء فوراً کود کر باہر آ گئے۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ

دلّی میں جب ان کی شاعری کا چرچا ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کے پاس بھیجنے لگے۔ بادشاہ نے کوئی غزل اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔ اس کی اصلاح میں دیر ہوئی تو بادشاہ نے تقاضہ کیا۔ اور پوچھا کہ "مرزا! ایک دن میں کتنی غزلیں بنا لیتے ہو؟ مرزا نے کہا "پیر و مرشد! طبیعت حاضر ہو تو دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔" بادشاہ کہنے لگے "واہ! ہم تو پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔" مرزا نے بادشاہ کا خیال کیے بغیر بڑی بے پروائی سے جواب دیا "حضور! پھر ان غزلوں میں سے بُو بھی ویسی ہی آتی ہے۔" یہ کہہ کر چلے آئے اور پھر نہ گئے۔

آخر عمر میں سوداؔ لکھنؤ چلے گئے تھے اور آصف الدولہ کے دربار میں بڑی شان سے رہتے تھے۔ مگر چوکتے اس سے بھی نہ تھے۔ ایک مرتبہ آصف الدولہ شکار کو گئے اور وہاں بھیلوں کے جنگل میں ایک شیر مارا۔ اس پر سوداؔ نے کہا ؎

یارو! یہ ابنِ ملجم پیدا ہوا دوبارہ　　　شیرِ خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

نواب نے شکایت کی کہ "مرزا تم نے ہمیں شیرِ خدا کا قاتل بنا دیا؟" ہنس کر کہنے لگے "حضورِ عالی! جو شیر آپ نے مارا وہ اللہ ہی کا بنایا ہوا تھا۔ اسی لیے میں نے اسے شیرِ خدا کہا (شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی لقب ہے اور ابنِ ملجم حضرت امیر کا قاتل تھا۔ اس مناسبت سے سوداؔ نے یہ دلچسپ شعر کہا)

اشرف علی خاں فغاںؔ

یہ صاحب اپنے زمانہ میں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ عظیم آباد کے رئیس راجہ شتاب رائے کی سرکار میں ملازم تھے۔ انہوں نے ایک روز راجہ صاحب کے دربار میں غزل پڑھی جس کا قافیہ تھا لالیاں اور جالیاں وغیرہ۔ سب حاضرین نے بہت تعریف کی۔ "جگنو میاں" نامی ایک مسخرا راجہ صاحب کا بہت منہ چڑھتا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ آپ نے غزل میں سارے قافیے باندھے مگر تالیاں رہ گئیں۔ فغاںؔ نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر راجہ صاحب نے فرمایا "فغاںؔ صاحب! سنتے ہو جگنو میاں کیا کہہ رہے ہیں؟" انہوں نے کہا "مہاراج! یہ قافیہ میری نظر میں تھا۔ مگر متانت اور سنجیدگی کے خلاف تھا اس لیے میں نے چھوڑ دیا۔" راجہ صاحب نے کہا اور جگنو میاں

نے بھی اصرار کیا کہ نہیں ضرور کہو۔ جب ہر طرف سے فرمائش ہوئی تو آخر فغاں نے کہا ؎

جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو　　سب دیکھ کر اس کو بجاتے ہیں تالیاں

اس پُر زور لطیفہ پر تمام دربار چمک اٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے۔

نواب مرزا داغؔ دہلوی

ایک روز داغؔ نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب ملنے آئے اور ان کو نماز میں مشغول دیکھ کر لوٹ گئے۔ اسی وقت داغؔ نے سلام پھیرا۔ ملازم نے کہا "فلاں صاحب آئے تھے اور چلے گئے۔ فرمانے لگے" دوڑ کر جا۔ ابھی راستے میں ہوں گے۔" وہ بھاگا بھاگا گیا اور ان صاحب کو بلا کر لایا۔ داغؔ نے ان سے پوچھا کہ "آپ آکر چلے کیوں گئے ؟" وہ کہنے لگے آپ نماز پڑھ رہے تھے اس لیے میں چلا گیا۔" داغؔ نے فوراً کہا " حضرت ! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے۔"

ایک طوائف داغؔ کی ملازم تھی۔ ایک روز داغ نے اسے کسی آدمی کے ہاتھ بلایا۔ طوائف اس وقت کسی بات پر بھری بیٹھی تھی آدمی سے کہنے لگی کہ" جا کر کہہ دے کہ میری بلا بھی نہیں آئے گی۔" آدمی نے اسی طرح آکر کہہ دیا۔ بجائے ناراض ہونے کے داغؔ نے اس فقرے کا خوب لطف اٹھایا اور بار بار اس آدمی سے پوچھا کہ ہاں اس نے کیا کہا تھا کہ "میری بلا بھی نہ آئے گی"۔ یہ کہتے کہتے یہ شعر تصنیف کیا ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی　　کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

ایک روز داغ کے پاس عبدالحمید آزاد بیٹھے تھے۔ ان کو اتفاق سے پیاس لگی تو پانی طلب کیا۔ ایک لڑکی پانی لے کر آئی۔ اس وقت ہوا چل رہی تھی جس سے اس کا دوپٹہ اڑنے لگا۔ لڑکی بڑی شرم حضور تھی اس نے پانی کا کٹورا آزادؔ کے ہاتھ میں دیتے ہی فوراً اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ لیے اور اندر بھاگ گئی۔ داغؔ نے دیکھا تو فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

بادِ صبا نے بھی نہ کیا اس کو بے حجاب　　سینے پہ ہاتھ رکھ لیا جب شانہ کھُل گیا

جب داغؔ رام پور میں ملازم تھے تو ایک مرتبہ سیر سپاٹے کے لیے لکھنؤ بھی گئے۔ ان ایام میں لکھنؤ میں مشتری نامی ایک طوائف کی بڑی دھوم تھی۔ داغؔ نے اپنے رفیق سفر نواب بہادر حسین خاں انجمؔ سے کہا "چلو ذرا مشتری سے ملنے چلیں"۔ چنانچہ دونوں وہاں پہنچے۔ مشتری نے نہایت تعظیم و تکریم سے دونوں معزز مہمانوں کی پذیرائی کی اور اس کے بعد داغؔ سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی جس پر داغ نے یہ شعر سنایا ؎

شبِ ہجراں کے جاگنے والے　　ایسے سوئے کہ پھر خبر نہ ہوئی

مشتری خود شاعرہ تھی۔ داغؔ کا یہ شعر سُن کر بے خود ہو گئی اور دیر تک وجد میں آکر یہ شعر بار بار پڑھتی۔ پھر داغؔ نے کہا کہ اب آپ اپنا کلام سنائیے۔ اس پر وہ بیاض لینے دوسرے کمرے میں گئی۔ وہاں اتفاق سے حقہ بھرا ہوا رکھا تھا۔ کسی آدمی کی ٹھوکر لگنے سے چلم فرش پر گر پڑی اور سفید چاندنی جگہ جگہ سے جل گئی۔ خیر آدمی دوڑ پڑے اور انہوں نے جلدی جلدی فرش سے انگارے اٹھائے۔ اس کے بعد مشتری بیاض لے کر آئی تو کسی نے پوچھا "کیا ہوا ؟" داغؔ نے بے ساختہ کہا ـــــ " داغ لگ گیا !"

داغؔ بہت سیہ فام تھے۔ جب پہلے پہل دہلی سے رام پور آئے تو یہاں پہنچ کر وہ شاہی اصطبل کے داروغہ مقرر کیے گئے۔

جس پر کسی دل جلے نے پھبتی کہی ؎

شہرِ دہلی سے آیا ایک مُشکی   آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

پنڈت برجموہن کیفی دہلوی

۱۸۹۴ء میں کیفی لکھنؤ گئے تو وہاں ایک شعر و سخن کی مجلس میں مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا سے جو شعر و ادب کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے، کسی غزل یا نظم کی فرمائش کی۔ ان مرحوم کی طبیعت میں بھی ظرافت کا مادہ بہت تھا۔ کیفی کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا ؎

اکتر۔ بہتر۔ تہتر۔ چوہتر   پچھتر۔ چھہتر۔ ستتر۔ اٹھتر

اس مذاق کو سن کر کیفی نے خوب داد دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب محفل خوب جم رہی تھی تو حامد علی خاں نے کیفی سے کچھ سنانے کے لیے کہا۔ اس پر کیفی نے فی البدیہہ اُسی لہجہ میں حامد علی خاں کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر کہا ؎

اکیاسی۔ بیاسی۔ تراسی۔ چوراسی   پچاسی۔ چھیاسی۔ ستاسی۔ اٹھاسی

اس پر ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی اور دیر تک یہ لطیفہ نقلِ محفل بنا رہا۔

کیفی اپنے اشعار میں بھی لطائف و ظرائف سے نہ چوکتے تھے۔ ایک دفعہ اشعار میں یہ لطیفہ بیان کیا ؎

کل یہ شاگرد سے استاد نے جھلا کے کہا   "تو پڑھے گا نہ کبھی ہٹ میرا بھیجا مت کھا
کُند ہے ذہن ترا۔ ٹھس ہے طبیعت تیری   کچھ نہ آئے گا تجھے قوم کا شاعر بن جا"

ایک مرتبہ اُن کے لڑکے نے ان کو اُنہی کا ایک مضمون دکھایا جو کسی نے بجنسہٖ بغیر کسی رد و بدل کے اپنے نام سے ایک اخبار میں شائع کرا دیا تھا۔ اس پر کیفی ہنس کر کہنے لگے "میاں غنیمت سمجھو کہ چور نے چوری کا مال جوں کا توں بازار میں لا کر رکھ دیا ہے اس کا حلیہ نہیں بگاڑا۔"

ڈاکٹر اقبال

جب اقبال کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی اور وہ سکول میں پڑھتے تھے تو ایک دن ان کو سکول پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ ماسٹر صاحب نے پوچھا کہ "اقبال! آج دیر سے کیوں آئے؟" اقبال نے بے ساختہ جواب دیا "اقبال دیر ہی میں آتا ہے۔" (سیرتِ اقبال)

بچپن میں اقبال کو بٹیریں پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز سبق پڑھ رہے تھے اور ایک بٹیر ہاتھ میں تھی۔ ان کے استاد مولانا میر حسن نے دیکھا تو فرمایا "کم بخت! تجھے ان بٹیروں کو ہر وقت ہاتھ میں تھامے رکھنے میں کیا مزا ملتا ہے؟" اقبال نے برجستہ جواب دیا، "حضرت! ذرا اسے ہاتھ میں لے کے دیکھیے۔"

نوجوانی کے ایام میں لوگوں پر لطیف چوٹیں کرنے میں اقبال بہت مشہور تھے۔ موچی دروازے میں ایک حکیم صاحب رہتے تھے۔ مگر ہاتھ میں شفا نہ تھی۔ ان کے متعلق ایک مرتبہ کہا ؎

موچی دروازے میں ہیں فخرِ اطبائے زماں ان سے امیدِ شفا لیکن خیالِ خام ہے

ایک مرتبہ منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار نے اقبال کی ایک نظم اپنے اخبار میں چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ان کی ہجو ان الفاظ میں کہی ؎

آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت نام محبوبانِ عالم کا یونہی بدنام ہے

لندن کا ذکر ہے کہ جون ۱۹۰۷ء میں ایک معزز خاتون لیڈی ایلیٹ نے ایک پارٹی دی جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔ دفعتاً مس سروجنی داس نہایت پُرتکلف لباس اور جھلملاتے ہوئے زیورات پہنے ہوئے چھم چھم کرتی سامنے آن موجود ہوئیں اور آتے ہی اقبال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "میں تو صرف آپ سے ملنے یہاں آگئی ہوں"۔ اقبال کی ظرافت کا شعلہ چمکا اور انھوں نے فی البدیہہ کہا "تو یہ صدمہ اس قدر ناگہانی ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں سے زندہ سلامت باہر جاسکوں گا یا نہیں ؟"

ولایت میں ایک مرتبہ چند انگریز پروفیسر کالج کے طلباء اور طالبات ایک قدیم باغ کی سیر کو گئے۔ جہاں کسی پرانے بادشاہ نے مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں تعمیر کر رکھی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک مسجد بھی تھی جس کی دیواروں پر جگہ جگہ خدا تعالیٰ کے اسماء عربی رسم الخط میں کندہ تھے۔ سیر کرنے والے انگریزوں نے اقبال سے ان اسماء اور آیات کا مطلب پوچھا۔ اقبال نے اس کے جواب میں کمال سنجیدگی اور بڑی متانت کے ساتھ ان کو یہ قصہ سنایا:۔

"ایک تھا بادشاہ اس کو ایک دن جنت کی ایک حور نظر آئی جس پر وہ بُری طرح فریفتہ ہوگیا اور اس سے کہنے لگا کہ تم مسلمان ہو جاؤ، ایک مسجد بنواؤ۔ بس اسی مسجد میں میرا تمھارا نکاح ہوگا۔ بادشاہ نے حور کے حکم کے مطابق یہ مسجد بنوائی اور بادشاہ کا حور سے نکاح ہوگیا۔ اس مسجد کی دیواروں پر یہی قصہ عربی میں لکھا ہوا ہے۔"

جو ہندوستانی اس وقت وہاں موجود تھے وہ تو اس گلفشانی کو سُن کر مارے ہنسی کے لوٹ گئے۔ مگر اقبال نے ایسی سنجیدگی کے ساتھ یہ قصہ سنایا کہ سارے انگریز حاضرین کو اس کی سچائی پر یقین آگیا۔

ایک دن ایک پیر صاحب اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اتفاقاً اسی وقت ان کا ایک مرید نہایت بے چین اور مضطرب ہانپتا کانپتا آیا اور پیر صاحب کے پیروں پر گر پڑا۔ اور کہا کہ حضور کی آمد کی اطلاع مجھے ملی تو بھاگا بھاگا آیا ہوں۔ حضور میری حالت بڑی خراب ہے۔ دو سو روپے کا قرضدار ہو چکا ہوں، حضور میرے لیے دعا فرمائیں کہ یہ قرض ادا ہو جائے، اور یہ کہہ کر دو روپے نذر کیے۔ پیر صاحب نے دونوں روپے جیب میں داخل کیے اور ہاتھ اٹھا کر مرید کے لیے دعا کرنے لگے۔

یہ نظارہ دیکھ کر اقبال سے نہ رہا گیا۔ آپ نے بھی فوراً آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز سے دعا مانگنی شروع کی " خدایا! آج کل کے پیر گمراہ ہوگئے۔ انہیں ہدایت دے۔ اور اے خدا! آج کل کے مریدوں کو بھی ہدایت دے کہ پیروں کے کہنے میں نہ آئیں۔ یا الٰہی یہ نادان مرید کہتا ہے کہ میں دو سو روپے کا مقروض ہوں مگر یہ نہیں جانتا کہ دو سو روپے کا نہیں بلکہ دو سَو دو روپے کا مقروض ہے۔" اس پر پیر صاحب بہت برہم ہوئے۔ مگر اقبال نے کہا "میں تو یہ دعا اس وقت تک مانگے جاؤں گا جب تک تم یہ دو روپے مرید کو واپس نہیں دے دو گے۔" آخر تنگ آکر پیر صاحب نے دو روپے واپس کیے اور اقبال سے اپنی جان چھڑائی۔ بعد میں اقبال کے کہنے

سے اسے کہیں نوکر کروا دیا جس کے بعد اس کی مالی مشکلات دور ہو گئیں۔

اخبارِ وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں اکثر اقبال سے ملنے ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں اقبال کی رہائش انارکلی بازار میں تھی اور وہیں طوائفیں بھی آباد تھیں۔ میونسپل کمیٹی نے ان کے لیے دوسری جگہ تجویز کی، اور ان کو وہاں سے اٹھا دیا گیا۔ اسی زمانے میں مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر وطن اقبال سے ملنے کئی مرتبہ ان کے ہاں گئے مگر وہ نہ ملے۔ اتفاق سے کئی پھیروں کے بعد مل گئے تو مولوی صاحب نے مزاحاً کہا "ڈاکٹر صاحب! جب سے طوائفیں انارکلی سے اٹھوا دی گئی ہیں آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔"

اقبال نے فی البدیہہ کہا "مولوی صاحب! کیا کیا جائے آخر وہ بھی تو "وطن" کی بہنیں ہیں۔"

ایک صاحب نے دعویٰ کیا کہ "خدا مجھ سے باتیں کرتا ہے۔" اقبال نے کہا "ذرا سنبھل کر رہنا ایسے خدا کی ساری باتیں مان نہ لیا کرو بعض باتیں وہ یونہی بھی کہہ دیتا ہے۔" اس نے اقبال کو یہ خوشخبری سنائی کہ میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن جاؤں گا اور دہلی کو اپنا پایۂ تخت بناؤں گا۔"

اس پر اقبال نے کہا "ہم تو اس وقت کہاں ہوں گے، مگر آپ مہربانی کر کے میرے لڑکے جاوید کو نہ بھولنا۔ اسے مہر دلی کا علاقہ ضرور بخش دینا۔"

مرض الموت میں وہی شخص عیادت کے لیے آیا اور کہنے لگا "آپ نے مجھے پہچانا تو نہ ہو گا۔" اقبال تکلیف کے باوجود ہنسے اور کہنے لگے "واہ! یہ آپ نے کیا بات کہی، ہم اور آپ کو نہ پہچانیں۔ ولی را ولی می شناسد۔"

فقیر سید وحید الدین کے ایک عزیز کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ ایک دن فقیر صاحب اپنے اسی عزیز کی موٹر میں بیٹھ کر اقبال سے ملنے آئے، موٹر میں ان کے کتے بھی تھے۔ یہ لوگ موٹر سے اتر کر اقبال کے پاس جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ اتنے میں اقبال کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور باپ سے کہنے لگی "ابا۔ ابا موٹر میں کتے آئے ہیں۔" اقبال نے آنے والے اصحاب کی طرف اشارہ کر کے کہا "نہیں بیٹا! یہ تو آدمی ہیں۔"

چودھری شہاب الدین نہایت کامیاب وکیل۔ مجلس قانون ساز کے صدر اور کارپوریشن لاہور کے ممبر تھے۔ رنگ بالکل کالا تھا۔ سب سے زیادہ ڈاکٹر اقبال کی پھبتیوں کا نشانہ غالباً یہی بنتے تھے۔ اور اگر وہ برا مانتے تو کہہ دیتے کہ بھئی تمہیں دیکھتے ہی مجھ پہ لطیفوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کے لیے مجھے پھبتی کہنے سے نہ روکا کرو۔" ان میں سے بعض لطیفے یہاں لکھے جاتے ہیں:۔

ایک روز چودھری صاحب سیاہ سوٹ پہنے ہوئے بار روم میں آئے۔ انہیں دیکھتے ہی اقبال چونک کر بولے —— "ہائیں چودھری صاحب! آج آپ ننگے ہی یہاں چلے آئے؟ (کیونکہ سوٹ کا اور چودھری صاحب کے بدن کا رنگ ایک تھا)

ایک دفعہ شاہدرہ میں پارٹی ہوئی۔ بہار کا موسم تھا۔ پارٹی میں اقبال اور چودھری شہاب الدین بھی موجود تھے۔ چودھری صاحب نے ازسرتاپا سفید لباس پہن رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر بے اختیار اقبال بول اٹھے "او دیکھو! کپاہ وچ کٹّا وڑ گیا۔" (یعنی ذرا دیکھو تو سہی کپاس کے کھیت میں بھینس کا کٹڑا گھس گیا)۔

ایک دن رمضان کے مہینے میں چودھری صاحب کی کوٹھی میں افطار کی دعوت تھی۔ افطار کے وقت چودھری صاحب نے ملازم کو آواز دے کر پانی مانگا۔ اس پر فوراً اقبال نے آدمی سے پکار کر کہا "دیکھو بھئی چودھری صاحب کے لیے بالٹی میں پانی لانا۔"

چودھری شہاب الدین نے اپنی جو کوٹھی لاہور میں بنوائی وہ بڑی عظیم الشان اور لمبی چوڑی تھی۔ اکتالیس کنال زمین پر یہ کوٹھی بنوائی گئی تھی اور ہر چیز اس میں بے حد بڑی رکھی گئی تھی۔ جب بن کر تیار ہوئی تو چودھری صاحب نے اقبال سے کہا کہ اس کوٹھی کا نام

کیا رکھنا چاہیئے؟" اقبال نے بے ساختہ جواب دیا "دیو محل"۔

جب چودھری صاحب بلدیہ لاہور کے صدر تھے تو اسی زمانہ میں سر شجاع الملک مہتر چترال لاہور آئے۔ نواب سر ذوالفقار علی نے ان کو اپنی کوٹھی پر ایک شاندار دعوت دی جس میں تمام معززین شہر کو مدعو کیا۔ اس موقع پر نواب صاحب نے اقبال سے کہا کہ آپ تمام معززین شہر کا تعارف ہز ہائنس سے کرائیں۔ چنانچہ اقبال تعارف کرانے کھڑے ہوئے۔ جب چودھری شہاب الدین کی باری آئی تو ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔ "اعلیٰ حضرت! ایں خان بہادر چودھری شہاب الدین صدر بلدیہ لاہور ہستند۔ گویا کہ مہتر لاہوری باشند۔"

اس نہایت لطیف طنز کو مہتر صاحب تو کچھ نہ سمجھے۔ مگر مجلس میں ایک زور کا قہقہہ لگا اور چودھری صاحب جل کر کوئلہ ہو گئے۔

ایک دفعہ اقبال نے چودھری کے متعلق یہ خود تصنیف لطیفہ سنایا :۔

"ایک دن لاہور کے بھنگیوں اور بھنگنوں نے ہڑتال کر دی۔ اس پر چودھری صاحب نے حکم دیا کہ ان سب کو ٹاؤن ہال کے گراؤنڈ میں جمع کیا جائے۔ جب سب جمع ہو گئے تو چودھری صاحب نے پنجابی میں تقریر شروع کی اور کہنے لگے۔ "بھینو تے بھراؤ"۔ ابھی اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ اچانک ایک بھنگن کا ننھا بچہ رونے لگا۔ اس پر اس نے بچے کو مخاطب کر کے کہا "ارے چپ۔ ارے چپ ماموں ماریں گے"

شمس العلماء سیّد میر حسن شاہ (استاد ڈاکٹر اقبال)

ایک مرتبہ حضرت مولانا حکیم نور الدین شاہی طبیب مہاراجہ کشمیر نے سید میر حسن شاہ سے پوچھا کہ "میری تحریروں کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟" شاہ صاحب نے مزاحاً جواب دیا کہ "آپ کے کیا کہنے، آپ تو سوال کا پورا جواب بھی نہیں دیتے۔ ا ہمیشہ تشنہ چھوڑ دیتے ہیں۔" اس کے بعد اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکال کر کہنے لگے۔ "یہ ہے میرے پاس آپ کا بھیجا ہوا ایک خط۔ میں نے آپ سے دوا پوچھی، آپ نے دوائی تو لکھ دی۔ مگر یہ نہ بتایا کہ اسے کھاؤں، سونگھوں، گھس کر لگاؤں، وہ گھوٹ کر پیوں۔ کیا کروں؟ نہ وزن لکھا کہ رتی کھاؤں، ماشہ کھاؤں، تولہ کھاؤں یا ایک من منگوا کر کھا لوں۔" حضرت حکیم صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

ساگر چند نامی ایک شخص ڈسٹرکٹ انسپکٹر تعلیمات تھا۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ اور کوئلے کی مانند تھا۔ وہ ایک دن شاہ صاحب کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوا جب آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی، اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ساگر چند شاہ صاحب سے ملتے ہی کہنے لگا۔ "دیکھیے! آج موسم کیسا خوشگوار اور سہانا ہے۔" شاہ صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔ "پھر آپ بھی تو کالی گھٹا بن کر آ گئے ہیں۔"

ایک روز شاہ صاحب سیالکوٹ میں بازار سے گزر رہے تھے۔ سر راہ ایک میوہ فروش کی دکان تھی۔ وہ کہنے لگا۔ "شاہ صاحب! سردا بہت اچھا ہے لیتے جائیے۔" شاہ صاحب نے پوچھا "بھئی بھاؤ کیا ہے؟" اس نے جواب دیا "آٹھ آنے سیر۔" اس پر شاہ صاحب پنجابی میں کہنے لگے۔ "سردا تو اچھا ہے۔ پر مینوں نئیں سردا۔" یہ کہہ کر آگے روانہ ہو گئے۔

اس زمانہ میں سیالکوٹ میں ایک صاحب تھے منشی میراں بخش۔ وہ ذات کے قصاب اور پیشہ کے لحاظ سے عرض نویس تھے۔ معلوم کیا حادثہ گزرا کہ ان کو شعر کہنے کا لپکا پڑ گیا اور اپنا تخلص انہوں نے جلوہ رکھا۔ شعر کیا کہتے تھے یوں سمجھو کہ کپوڑے

تلا کرتے تھے۔ ان کے ایک ملنے والے خزانے میں کلرک تھے۔ اچھے خاصے لکھے پڑھے اور قابل آدمی تھے۔ جلوہ صاحب روزمرہ ان کے پاس چلے جاتے اور اپنے اشعار سنا کر ان سے داد چاہتے۔ آخر تنگ آ کر ایک روز انہوں نے ان کی ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جلوہ صاحب! اگر آپ اپنی شاعری کے متعلق مجھ سے رائے پوچھتے ہیں تو صاف بات یہ ہے کہ آپ کے اشعار سے مجھے تو چھچھوندوں کی بُو آتی ہے۔"

جلوہ صاحب اس رائے پر بڑے بھنّائے اور بڑے غصّہ میں بھرے ہوئے شاہ صاحب کے پاس آئے اور ان کو اپنے اشعار سُنا کر پوچھنے لگے کہ شاہ صاحب سچ سچ بتائیں میرے اشعار کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ فوراً بتائیں اور اسی وقت بتائیں۔"

شاہ صاحب نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے فرمایا "جلوہ صاحب! اگر آپ فوراً اور اسی وقت اپنے اشعار کے متعلق میری سچی رائے پوچھتے ہیں تو ایمان کی بات یہ ہے کہ آپ نے شعروں کا جھٹکا کر دیا ہے۔" (یہ فقرہ بھی شاہ صاحب نے جلوہ صاحب کی ذات کی مناسبت سے چُست کیا) جلوہ صاحب یہ صاف اور برجستہ طنز سُن کر منہ لٹکائے واپس چلے آئے۔

مولوی ظفر اقبال شاہ صاحب کے شاگرد ہیں۔ ایک دفعہ شاہ صاحب مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے مولوی ظفر اقبال بھی وہاں پہنچ گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد اپنے استاد کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر شاہ صاحب کا جوتا اٹھا لیا اور لے کر چلے تاکہ مسجد کے دروازے پر ان کو پہنا دیں۔ شاہ صاحب نے جو یہ دیکھا تو جھٹ لپک کر ان کے ہاتھ میں سے جوتا چھین لیا اور فرمانے لگے "یہ جوتا میرا ہے کہاں لے کے چلے تھے؟"

ایک مرتبہ کالج میں سٹاف میٹنگ تھی۔ شاہ صاحب میٹنگ میں دو منٹ دیر سے پہنچے۔ انگریز پرنسپل نے شاہ صاحب کو گھڑی دکھا کر کہا "مولوی صاحب! آپ نے پورے دو منٹ انتظار کرایا۔" شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا "پھر کیا ہوا۔ ہم نے بھی تو اس دنیا میں پورے تیس برس آپ کا انتظار کیا۔" (پرنسپل شاہ صاحب سے عمر میں ۳۰ برس چھوٹے تھے)۔

ابھی مشن کالج ڈگری کالج نہ بنا تھا۔ اس وقت اس کے پرنسپل ایک انگریز ٹیگسن نامی تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے کہا کہ آپ کالج کے اوقات سے پہلے مجھے عربی پڑھا دیا کریں۔ شاہ صاحب نے اسے عربی پڑھانی شروع کر دی۔ پرنسپل کے مزاج میں ظرافت بہت تھی ایک روز اثنائے سبق میں کہنے لگا کہ شاہ صاحب! ایک بات پوچھوں، بشرطیکہ آپ بُرا نہ مانیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا "ہاں کہئے کیا بات ہے؟" ٹیگسن نے کہا "یہ کیا بات ہے کہ جب تک دن میں پانچ مرتبہ آپ کے خدا کو نہ پکارا جائے اس وقت تک وہ راضی اور خوش نہیں ہوتا۔ اسی لیے آپ کی مسجدوں میں یہ بات لازمی اور ضروری ہے کہ پانچ وقت اذان دی جائے تاکہ اس سے خدا خوش ہو؟"

شاہ صاحب نے بہت ہی شائستگی اور دلیری کے ساتھ اس کا یہ جواب دیا کہ "ہمارا خدا ایسا نہیں جو صرف آٹھویں دن کی تھوڑی دیر کی ٹن ٹن سے خوش ہو جائے۔" (اس کے بعد ان کی حکمت اور اس کے الفاظ کی بلاغت ایسے عمدہ اور دل نشین پیرائے میں پرنسپل کو سمجھائی کہ بے اختیار وہ بول اٹھا کہ شاہ صاحب آپ گواہ رہیں میں آج سے مسلمان ہوتا ہوں۔ لیکن مصلحت یہی ہے کہ اس امر کو اخفا میں رکھا جائے)

مولوی فیض الحسن سہارنپوری

جس زمانہ میں آپ دہلی میں مقیم تھے تو ایک روز سخت بارش ہونے لگی۔ مولانا اسی حالت میں درس سے فارغ ہوئے۔ گھر کو چلے۔ مگر اس ہیئت سے کہ پائنچے چڑھا لیے، کتابیں بغل میں دبالیں، جوتیاں اتار کر داہنے ہاتھ میں لے لیں۔ پائجامہ کو بائیں ہاتھ سے پکڑ لیا اور بیچ سڑک پر بہتے ہوئے پانی کے درمیان چلنے لگے۔ دلی کے بے فکروں نے جو مولانا کو اس عجیب ہیئت میں دیکھا تو ان کی رگِ ظرافت پھڑکی اور انہوں نے مولانا کا مذاق اڑانا چاہا۔ اور سوچا کہ مولانا کے داہنے ہاتھ میں جوتے ہیں۔ جب ہم انہیں سلام کریں گے تو یہ یقیناً اپنے داہنے ہاتھ کو سلام کا جواب دینے کے لیے اوپر اٹھائیں گے اور اس حرکت پر ہم ان کا مذاق اڑائیں گے۔ چنانچہ جب مولانا پانی کی چھینٹیں اڑاتے قریب آئے تو ان بے فکروں نے سوچی ہوئی سکیم کے مطابق بڑی بلند آواز سے کہا ”حضرت مولانا! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔“ مولانا جہاں بہت بڑے فاضل اور علامہ دہر تھے وہاں ان کی طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ نے فوراً بائیں ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور ساتھ ہی دایاں ہاتھ جس میں جوتے تھے اٹھا کر اور ہلا کر کہا ”مزاج شریف“ اس فی البدیہہ جواب پر وہ سب لوگ نہایت شرمندہ ہوئے اور مولانا آگے بڑھ گئے۔

ایک مرتبہ مولانا کو بھی بڑا خفیف ہونا پڑا۔ ہوا یہ کہ ایک مشاعرے سے رات گئے مولانا اور مرزا غالب واپس آ رہے تھے۔ اپنے اپنے گھر کے لیے دونوں کو ایک تنگ گلی میں سے گزرنا پڑا۔ بیچ گلی میں ایک گدھا کھڑا تھا جس سے راستہ رک گیا تھا۔ غالب نے اپنی جریب سے جو ان کے ہاتھ میں تھی۔ گدھے کو ایک طرف کیا۔ اس پر بطور مزاح مولانا نے کہا مرزا صاحب! دلی میں گدھے بہت ہیں۔ غالب اس طنز کو بھلا کب برداشت کر سکتے تھے، فوراً جواب دیا ”نہیں مولانا! باہر سے آجاتے ہیں“ اس لطیف چوٹ کا جواب مولانا سے بن نہ آیا اور جھینپ کر چپ ہو گئے۔

ایک دن طلبہ کو فلسفہ کا درس دے رہے تھے۔ مضمون یہ تھا کہ انسان کا خیال اضطراری ہے اختیاری نہیں۔ ہر بات اور ہر شے تک بغیر ارادہ اور خیال کے پہنچ جاتا ہے۔

خیر درس کے بعد طلبہ کو لے کر مسجد سے نکلے۔ راہ میں ایک جگہ ناچ ہو رہا تھا اور بہت سے آدمی جمع تھے۔ آپ علم و فضل کے باوجود نہایت رنگین مزاج واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ طلبہ کو چھوڑ کر ناچ دیکھنے میں معروف ہو گئے۔ طلبہ یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے ”ہیں مولانا! کہاں یہ علم و فضل اور کہاں یہ ناچ رنگ۔ یہ حرکت آپ کی بلند اور ارفع شان کے شایان نہیں۔“ مولانا نے ہنس کر جواب دیا کہ ”ابھی تو پڑھ کر آئے ہو اَلتَّصَوُّرُ یَتَعَلَّقُ بِکُلِّ شَیْئٍ۔ پھر مجھ پر اعتراض کیوں کرتے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو اور مجھ کو ناچ سے لطف اٹھانے دو۔“

سہارن پور میں عیدن ایک طوائف تھی۔ بڑی باذوق، سخن فہم اور سلیقہ شعار۔ شہر کے اکثر ذی علم اور معززین اس کے ہاں چلے جایا کرتے تھے۔ ایک دن مولانا بھی پہنچے۔ وہ پرانے زمانے کی عورت نئی تہذیب سے ناآشنا بیٹھی نہایت سادگی سے چرخہ کات رہی تھی۔ مولانا اس کو اس ہیئت میں دیکھتے ہی واپس لوٹے۔ اس نے آواز دی ”مولانا آئیے۔ تشریف لائیے۔

واپس کیوں چلے؟" مولانا یہ فرما کر چل دیئے کہ "ایسی تو اپنے گھر بھی چھوڑ آئے ہیں۔"

ایک واعظ صاحب کو اپنے تقدس پر بڑا ناز تھا۔ ایک روز مولانا کو لے کر بیٹھ گئے اور لگے ان کی آزاد وضعی پر انہیں لعن طعن کرنے۔ مولانا بیٹھے خاموشی سے سنتے رہے۔ لیکن جب ان کی پند و نصیحت ختم ہی نہ ہوئی اور شیطان کی آنت کی طرح طویل ہی ہوتی چلی گئی تو آخر صبر و ضبط کا پیمانہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور فی البدیہہ یہ اشعار حافظ صاحب کو سنائے ؎

ہم وہ نہیں کہ وعظ کریں دن کو بیٹھ کر   اور خلوتوں میں کام کریں چھپ کے رات کو
تفضیح ہے خلافِ مروّت خلافِ دیں   ورنہ دکھا دیں گر کہو ہم پانچ سات کو

اس لطیف طنز کو سن کر حضرت واعظ دم بخود ہو گئے اور پھر کچھ نہ بولے۔ (حسنِ خیال)

مولانا محمد علی جوہر

ایک مرتبہ مولانا عربی جبہ پہنے ہوئے اسمبلی کا اجلاس دیکھنے گئے۔ راستہ میں پنڈت مالویہ سے جو ان دنوں اسمبلی کے ممبر تھے ملاقات ہو گئی۔ پنڈت مالویہ نے کہا "اچھا آپ ہیں۔ میں سمجھا بیگم بھوپال ہیں۔" مولانا نے بے ساختہ جواب دیا "جی ہاں واقعی اس زنانہ مجلس میں مردوں کا کیا کام!"

(حرف و حکایت)

جب کانگرس نے نمک بنانے کی تحریک شروع کی اور گاندھی جی نے مولانا کو بھی نمک بنانے اور سول نافرمانی میں حصہ لینے کی دعوت دی تو مولانا نے فرمایا "میں کیا نمک بناؤں گا۔ قوم کے غم میں دس سال سے شکر جو بنا رہا ہوں (مولانا کو ذیابیطس کا عارضہ تھا)

ایک مرتبہ دہلی کے مفتی کفایت اللہ نے جو کانگرس کے زبردست حامی تھے۔ کسی "قوم پرستانہ" سفر کے سلسلے میں کانگرس سے دو سو روپے بطور سفر خرچ وصول کئے اور اتفاق سے انہی ایام میں اپنی ایک تقریر میں مولانا کے متعلق کوئی غلط بات کہہ دی۔ جس پر مولانا نے ایک خط سالک کو لکھا جس میں تحریر کیا کہ "میں آج سے مفتی کفایت اللہ کو مفتری کفایت اللہ کہا کروں گا۔ کیونکہ ان میں ر کے دو سو عدد شامل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے میرے متعلق یہ افترا کیا۔ . . . . ." (یارانِ کہن)

مولانا شوکت علی

سیاسیات میں ہمیشہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا نام اکٹھا لیا جاتا ہے اور "علی برادران" کے نام سے ان کو پکارا جاتا رہا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ادبیات میں ان کو اکٹھا کیوں نہ رکھا جائے۔ اگرچہ مولانا شوکت علی ادبی آدمی نہیں ہیں۔

ایک دفعہ کسی نے آپ سے پوچھا کہ "آپ کے بڑے بھائی ذوالفقار علی کا تخلص گوہر ہے۔ آپ کے دوسرے بھائی محمد علی کا تخلص جوہر ہے۔ آپ کا کیا تخلص ہے؟" کہنے لگے "شوہر"۔

اگرچہ مولانا عربی نہیں جانتے تھے مگر جب کبھی کوئی عرب آ جاتا تھا تو اس سے عربی میں بات کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دفعہ چند نوجوان سر ہو گئے کہ آپ عربی نہیں جانتے تو عربی میں بات کیسے کر لیتے ہیں؟"

اس پر مولانا بگڑ کر کہنے لگے "واہ! یہ کیا بات ہے۔ ہم عربی خوب جانتے ہیں۔" کسی لڑکے نے پوچھا "اچھا بتائیے گھٹنے کو عربی میں کیا کہتے ہیں؟" مولانا نے بے تامل جواب دیا "گھٹنا عرب میں ہوتا ہی نہیں۔"

اس مضحکہ خیز جواب پر سارے لڑکے مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

عربی میں گفتگو کرنے کا طریقہ مولانا کا یہ تھا کہ پہلے عربی کے دو تین سنے سنائے الفاظ کہے اور پھر جو کمی رہ گئی وہ ہاتھوں اور آنکھوں کے بلیغ اشاروں سے پوری کر دی۔ مثلاً ایک عرب سے باتیں کر رہے تھے۔ یا شیخ المسلمون نائمون (آنکھیں بند کر لیں) فی کل عالم نائمون (انگلی فضا میں گھمائی) خلوص مافش، فلوس مافش ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر (اور اوپر اللہ کی طرف اشارہ کر دیا)

(یارانِ کہن)

مولوی عبدالحق

جب مولوی صاحب اورنگ آباد سے انجمن ترقی اردو کا دفتر دہلی لے آئے تو میں ایک مرتبہ جب دہلی گیا تو مولانا سے بھی دریا گنج جا کر ملا۔ اور مولانا سے کہا کہ اگر پانی پت میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کوئی جلسہ کیا جائے تو کیا آپ تشریف لے آئیں گے؟" مولوی صاحب فرمانے لگے "اگر جہنم میں بھی اردو کی حمایت اور نصرت میں کوئی جلسہ منعقد ہو تو میں وہاں بھی خوشی سے جانے کو موجود ہوں۔"

اکبر الہ آبادی

کلکتہ کی مشہور مغنیہ گوہر جان ایک مرتبہ الہ آباد گئی اور جانکی بائی طوائف کے مکان پر ٹھہری۔ جانکی بائی نے اس کی نہایت خاطر تواضع اور آؤ بھگت کی۔ اس کے اعزاز میں رقص و سرود کا ایک شاندار جلسہ منعقد کیا گیا۔ بڑے اچھے اچھے گانے والے بلائے گئے۔ مثلاً صادق علی۔ دولے خاں۔ منے خاں مشتری جان اور حیدر جان وغیرہ سب ہی آئے۔ اور تین دن تک خوب جشنِ جمشیدی جاری رہا۔ جب گوہر جان رخصت ہونے لگی تو اپنی میزبان سے کہا کہ میرا دل خان بہادر سید اکبر حسین سے ملنے کو بہت چاہتا ہے۔ جانکی بائی نے کہا کہ آج میں وقت مقرر کر لوں۔ کل چلے چلیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن دونوں اکبر الہ آبادی کے ہاں پہنچیں۔ جانکی بائی نے تعارف کرایا اور کہا یہ کلکتہ کی نہایت مشہور و معروف مغنیہ گوہر جان ہیں۔ آپ سے ملنے کا ان کو بے حد اشتیاق تھا۔ لہٰذا ان کو آپ سے ملانے لائی ہوں۔ اکبر نے کہا "زہے نصیب۔ ورنہ میں نہ نبی ہوں نہ امام۔ نہ غوث نہ قطب اور نہ کوئی ولی جو قابلِ زیارت خیال کیا جاؤں۔ پہلے جج تھا اب ریٹائر ہو کر صرف اکبر رہ گیا ہوں۔ حیران ہوں کہ آپ کی خدمت میں کیا تحفہ پیش کروں۔ خیر ایک شعر بطورِ یادگار لکھے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر مندرجہ ذیل شعر ایک کاغذ پہ لکھا اور گوہر جان کے حوالے کیا ؎

خوش نصیبی میں بڑا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

خواجہ عشرت لکھنوی

ایک مرتبہ مدرسہ تکمیل الطب لکھنؤ کے چند طلبہ بیٹھے اس طبی مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے کہ جب غذا بدن میں داخل ہوتی ہے تو جزوِ بدن بن جاتی ہے۔ خواجہ عشرت بھی بیٹھے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ آپ نے فی البدیہہ کہا ؎

حکماء کہتے ہیں ہوتی ہے غذا جزوِ بدن
ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے

(بزمِ خیال)

ریاض خیرآبادی

ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں ریاض کے پاس ہی ایک بزرگ تشریف رکھتے تھے جو اگرچہ خفیہ طور پہ پیرِ مغاں کی بیعت کر چکے تھے۔ مگر صورت بڑی متشرع تھی اور اسی لیے اکثر لوگ ان کو نہایت بزرگ اور واجب التعظیم سمجھتے تھے۔ خود ریاض کے والدان سے بڑے تپاک سے ملتے تھے۔ مگر ریاض کو سب حقیقت معلوم تھی۔ شرارت جو سوجھی تو ان کی شان میں فی البدیہہ ایک شعر تصنیف کر کے حاضرین کو سنایا ؎

شرما ؤ ریاض مے کشی سے
لمبی ڈاڑھی ہے ہاتھ بھر کی

چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ یہ شعر سنتے ہی وہ بزرگ صورت اس قدر آپے سے باہر اور برہم ہوئے کہ خدا کی پناہ۔ بے اختیار اٹھ کر مارنے کو دوڑے۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور بیچ بچاؤ کرا دیا۔ مگر اس جھگڑے نے ایسی خطرناک شکل اختیار کر لی کہ اس سے ڈر کر ریاض نے ہمیشہ کے لیے مشاعرہ میں جانے اور شامل ہونے سے توبہ کر لی۔ اور اس واقعہ کے بعد پھر کبھی کسی پر چوٹ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

(بزمِ خیال)

مولانا ابوالکلام آزاد

جب مولانا نینی تال جیل آلہ آباد میں قید تھے۔ اس زمانہ کا ایک بہت مزے دار لطیفہ خود مولانا کے الفاظ میں سنیئے :۔

"جیل میں میری کوٹھڑی کے عین سامنے ایک دوسری کوٹھڑی میں کوئی چینی قیدی رہتا تھا۔ مگر زبان کی بیگانگی کے باعث ہم دونوں آپس میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دوسرے کا منہ تک کر رہ جاتے تھے ؏

زبانِ یارِ من چینی و من چینی نمی دانم

اس چینی کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں کس جرم میں ماخوذ ہوں۔ غالباً سوچتا رہتا ہوگا۔ آخر ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ لہرانے لگا۔ یعنی یہاں کیسے آئے ہو؟ میں کیا جواب دیتا خاموش رہا۔ تو اس نے پوچھا "اوپیم"؟ یعنی کیا افیم کے معاملہ میں پکڑے گئے ہو؟" میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے اپنے ہاتھ کو اپنے گلے پر چھری کی طرح پھیرا۔ یعنی کسی کو قتل کیا ہے؟ میں نے پھر سر ہلایا۔ تو آخر اس نے پوچھا "گاندھی"۔ اس پر میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بالکل مطمئن ہو گیا۔ گویا اس کے نزدیک گاندھی جی بھی ناجائز افیم اور قتل کی طرح جرائم میں داخل ہے۔
